

معارف القرآن

مدرسہ اسلامیہ دارالافتاء
کونوٹھی، اہل سنت، پاکستان

جلد اول

معارف القرآن

(Quranic Studies: Fushmeh)

مَعَارِفُ الْقُرْآنِ

جلد

۷

لقمان، الم سجدہ، احزاب، سبا، فاطر، یس، صافات، ص، زمر
مومن، خم سجدہ، شوری، زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف
پارہ ۲۱ رکوع ۱۰ تا پارہ ۲۶ رکوع ۴

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتی اعظم پاکستان

مِکْتَبَةُ مَعَارِفِ الْقُرْآنِ کُلِّ حِی



نہم مدبہ سائنس و ادب و ہنر و فن

حکومت پاکستان کاپی رائٹس رجسٹریشن نمبر ۲۷۴۲۲

عرضِ نامہ: اگرچہ معارف القرآن کی تصحیح کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن
کبھی کبھی کتابت، طباعت اور حبلہ بندی میں سہواً غلطی
ہو جاتی ہے۔ اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم
مطلع فرمائیں۔
ادارۃ المعارف کراچی ۱۲
احاطہ دارالعلوم کراچی پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰
فون: ۵۰۳۲۰۲۰، ۵۰۳۹۷۳۳

باہتمام : مجمعِ مشائخِ شیعہ

طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ - اپریل ۲۰۰۸ء

مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر : ادارۃ المعارف کراچی

فون : 5049733 - 5032020

ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

✽ ادارۃ المعارف کراچی

فون: 5049733 - 5032020

✽ مکتبہ معارف القرآن کراچی

فون: 5031565 - 5031566

فہرست مضامین "معارف القرآن" جلد ہفتم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۷	اسلام کا بے نظیر قانون عدل		
۲۸	لقمان کی دوسری وصیت متعلقہ عقائد	۱۷	سُورَةُ لُقْمَانَ
۲۹	تیسری وصیت متعلقہ اصلاح عمل		
۳۰	چوتھی وصیت متعلقہ اصلاح خلق	۱۷	آیات ۱ تا ۹
۳۱	پانچویں وصیت متعلقہ آداب معاشرت	۱۹	وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ
۳۲	آیات ۲۰ تا ۲۲	۲۱	لہو و لعب اور اس کے سامان کے شرعی احکام
۳۳	آیات ۳۳ و ۳۴	۲۳	فحش ناول اور اشعار اور اہل باطل کی کتابیں دیکھنا
۵۲	إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ		جائز نہیں
۵۳	پانچ چیزوں کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں		کھیلوں کے سامان کی خرید و فروخت
۵۴	مسئلہ علم غیب		مباح اور جائز کھیل
۵۵	ایک شبہ اور جواب	۲۴	عمروع و ناجائز کھیل
۵۶	مسئلہ علم غیب کے متعلق اہم فائدہ	۲۵	غمار و مزامیر کے احکام
۵۷	فوائد متعلقہ الفاظ آیت	۲۶	ضروری تنبیہ
۵۸	سُورَةُ الْحَٰجِّ	۲۷	بغیر مزامیر کے خوش آوازی سے مفید اشعار
۵۹	آیات ۱ تا ۳		پڑھنا ممنوع نہیں
۶۰	آیات ۴ تا ۹		
۶۱	روز قیامت ایک ہزار سال کا	۲۸	آیات ۱۰ و ۱۱
۶۲	دنیا کی ہر چیز اپنی ذات میں اچھی ہے، برائی اس کے		وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ
۶۳	غلط استعمال سے آتی ہے۔	۳۴	حضرت لقمان نبی نہیں دلی تھے
۶۴	تخلیق انسانی تمام مخلوقات میں حسین تر ہے۔		وہ حکمت جو حضرت لقمان کو دی گئی
۶۵	آیات ۱۰ تا ۲۲	۳۵	دالین کی اطافرض ہی مگر خلا شرع المؤمن کسی کی اطافرض نہیں
۶۶	قبض روح اور ملک الموت کے متعلق کچھ تفصیلات	۳۶	
۶۷	کیا جانوروں کی روح بھی ملک الموت قبض کرتے ہیں		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۰۳	خندق کی کھدائی کی تقسیم پوری فوج پر	۶۹	نماز تہجد
۱۰۴	صلاحیت کار میں مقامی اور غیر مقامی کا امتیاز		دنیا کے معائب بھی اللہ کی طرف رجوع ہوتے والوں
"	ایک عظیم محبزہ	۷۰	کے لئے رحمت ہیں۔
"	قدرت کی تنبیہات		بعض جرائم کی سزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت
۱۰۵	منافقین کی طعنہ زنی اور ایمانوں کا یقین ایمانی	۷۱	کی سزا اس کے علاوہ ہے۔
	بڑوں کو چھوٹوں کی تکلیف و مصیبت میں شامل	"	آیات ۲۳ تا ۳۰
۱۰۶	رہنے کی ہدایت	۷۳	کسی قوم کا مقتدر بننے کے لئے دو شرطیں
"	مشکلات سے رہائی کا نسخہ	۷۵	زمین کی آبپاشی کا قدرتی نظام عجیب
"	صحابہ کرام کا ایثار		
۱۰۷	ساتھ تین میل لمبی خندق کی کھدائی چھ روز میں	۷۷	سُورَةُ الْحَزَابِ پ
"	حضرت جابرؓ کی دعوت اور ایک کھلا ہوا محبزہ	"	آیات ۱ تا ۲۳
۱۰۸	یہود بنی قریظہ کی عہد شکنی	۷۸	شان نزول
۱۰۹	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جنگی تدبیر	۷۹	آنحضرتؐ کو کفار کے مشوروں پر عمل سے ممانعت
۱۱۰	حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی غیرت ایمانی	۸۲	آیات ۳ و ۵
"	ان کا زخمی ہونا اور دعا پر مقبول	۸۳	رمضانِ جاہلیت کی تین رسوم کی تردید
۱۱۲	غزوہ احزاب میں چار نمازوں کی قصا	۸۵	آیت ۶
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا	۸۷	الَّتِي أُولَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ فِي تَفْسِيرِ
"	فتح کے اسباب کا آغاز	۸۸	وَأُولَىٰ الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي تَفْسِيرِ
"	لحیم بن مسعودؓ کی جنگی تدبیر	۸۹	آیات ۷ و ۸
۱۱۳	حضرت حذیفہؓ کا دشمن کے لشکر میں ایک عجیب واقعہ	۹۰	میشاقِ انبیاء
۱۱۶	آئندہ کفار کے حوصلے پست ہو جائیں گے	"	آیات ۹ تا ۲۷
"	تنبیہ	۱۰۰	غزوہ احزاب کا واقعہ
"	غزوہ بنو قریظہ	۱۰۱	سیاست کے اکھاڑے میں جھوٹ
۱۱۷	اجتہادی اختلاف میں کوئی جانب گناہ نہیں ہوتی	"	اللہ کے علم و کرم کا اعجوبہ
"	کعب بن ربیع بنو قریظہ کی ایک تقریر	۱۰۲	مدینہ منورہ پر سب سے بڑا حملہ
۱۱۸	حضرت سعد بن کاذخہؓ اور وفات	"	مسلمانوں کی جنگی تیاری کے تین رکن : اللہ پر توکل،
۱۱۹	احسان کے بدلے اور غیرت قومی کے دو عجیب نمونے	"	باہمی مشورہ، مادی وسائل بقدر وسعت
		"	خندق کی کھدائی
		۱۰۳	اسلامی لشکر کی تعداد
		"	پندرہ برس کی عمر میں لڑکا بالغ سمجھا جائے گا
		"	انتظامی امتیازات وحدتِ اسلامی کے منافی نہیں

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۵۰	نکاح میں نسبی کفارت کا درجہ	۱۲۰	تنبیہ
۱۵۱	مسئلہ کفارت	۱۲۱	آیات ۲۸ تا ۳۲ ۲۲
۱۵۲	نزول آیات کا ایک اور واقعہ، تَخْفُفٌ فِی تَفْصِیْکِ کی تفسیر	۱۲۶	ازواجِ مطہرات کو چند ہدایات
۱۵۵	لوگوں کی طعن تشنیع سے بچنے کا اہتمام اس حد تک کہ کسی حکم شرعی کے خلاف نہ ہو	۱۲۸	طلاق کے متعلق چند مسائل (فائدہ)
۱۵۶	محافلین کے شبہات کا جواب	۱۲۹	ازواجِ مطہرات کی خصوصیت، ہر عمل کا دو ہر ثواب فائدہ
۱۵۷	انبیاء کے لئے تعدد ازواج کی ایک حکمت	۱۳۰	عالم کو جس طرح نیک عمل کا ثواب زیادہ ملتا ہے گناہ پر عذاب بھی زیادہ ہوتا ہے
۱۵۸	ایک اشکال اور جواب	۱۳۱	ازواجِ مطہرات کو خاص ہدایات
۱۶۰	آیت ۲۰	۱۳۱	کیا ازواجِ مطہرات سائے عالم کی عورتوں سے افضل ہیں؟
۱۶۳	آیت خاتم النبیین کی تفسیر	۱۳۲	عورت کی آواز ستر میں داخل نہیں
۱۶۴	مسئلہ ختم نبوت	۱۳۳	عورتوں کو محمل پرودہ کرنے کی ہدایت
۱۶۵	ختم نبوت نزولِ عیسیٰ ؑ کے منافی نہیں	۱۳۳	پرودہ سے استثنائی صورتیں
۱۶۸	نبوت میں ظلی بروزی کی ایجاد تحریف ہے	۱۳۵	حضرت عائشہؓ کا سفر بصرہ اور جنگِ جمل پر روافض کے ہفوات کا جواب
۱۷۰	آنحضرتؐ کے بعد دعویٰ نبوت کفر ہے	۱۳۸	ازواجِ مطہرات کو ہدایات کا سلسلہ - پانچوں ہدایات سب مسلمانوں کو عام ہیں -
۱۷۳	آیات ۳۱ تا ۳۸	۱۳۹	لَیْسَ بِہِیْکُمْ مَّا الرِّجْسُ اٰہِلُ الْبَیْتِ
۱۷۶	ذکر اللہ ایسی عبادت ہے جس کے لئے کوئی شرط نہیں، ایسی لئے بکثرت کرنے کا حکم ہے	۱۴۰	اہل بیت میں کون لوگ داخل ہیں؟
۱۷۷	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفات	۱۴۱	صحابہ پر احادیثِ رسولؐ کی تبلیغ واجب ہے
۱۷۹	شاہد داعی، مبشر، نذیر اور ان کی تحقیق	۱۴۲	حدیثِ رسولؐ کی حفاظت قرآن کی طرح
۱۸۰	آیت ۲۹	۱۴۳	آیت ۳۵
۱۸۱	طلاق کے بعض مسائل	۱۴۳	قرآن کے عام خطابات مردوں کو ہیں عورتیں ان میں ضمناً شامل ہیں اس کی حکمت
۱۸۱	طلاق کے وقت متعہ یعنی لباس کی تفصیل	۱۴۴	ذکر اللہ کی کثرت کا حکم اور اس کی حکمت
۱۸۲	حسن معاشرت کی بے نظیر تعلیم	۱۴۵	آیات ۳۶ تا ۳۹
۱۸۶	آیات ۵۰ تا ۵۳	۱۴۸	واقعہ نزولِ آیات
۱۸۶	آنحضرتؐ کی بعض خصوصیات متعلقہ	۱۴۸	ایک لطیفہ
۱۹۳	نکاح و ازواج		
۱۹۶	آنحضرتؐ کا تعدد ازواج		
۱۹۶	آیات ۵۳ تا ۵۵		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۲۳	مذکورہ طریقہ صلوٰۃ و سلام کی حکمت	۱۹۸	بعض آداب معاشرت
"	صلوٰۃ و سلام کے احکام شرعیہ	"	دعوت طعام اور مہمانی کے بعض آداب
۲۲۶	آیات ۵۷ تا ۵۸	۱۹۹	مہمان کے لئے ادب
۲۲۹	ایذا پر رسول کفر ہے اس سے بچنے کی ہدایت	"	مہمان کا اکرام
"	کسی مسلمان کو بغیر وجہ شرعی دیکھ پہنچانا حرام ہے	۲۰۰	عورتوں کو پردہ کا حکم
۲۲۹	آیات ۵۹ تا ۶۲	"	پردہ و نسواں کی خاص اہمیت
۲۳۲	منافقین کی طرف سے ایذا پر رسول اور اس کے انسداد کا حکم	"	آیات پردہ اور ان کا شان نزول
۲۳۳	تنبیہ ضروری	۲۰۲	ازواج مہطرات آپ کے بعد کسی سے نکاح نہیں کر سکتیں
"	مرتد کی سزا اسلام میں قتل ہے	۲۰۲	احکام حجاب اور انسداد فواحش کا اسلامی نظام
۲۳۵	آیات ۶۳ تا ۷۱	۲۰۵	انسداد جہانم کے لئے اسباب جہانم پر پابندی
۲۴۰	انبیاء ایسے جسمانی عیوب میں بھی مبتلا نہیں ہوتے	۲۰۷	تنبیہ ضروری
"	جربا عیث نفرت ہوں	۲۰۹	نزول حجاب کی تاریخ
"	زبان کی اصلاح دوسرے تمام اعضاء کی اصلاح کا مؤثر ذریعہ ہے۔	۲۱۱	حجاب اور ستر عورت میں فرق
۲۴۱	قرآنی احکام میں سہولت کا خاص اہتمام	۲۱۳	پردہ شرعی کے درجات اور احکام
۲۴۲	آیت ۷۲ و ۷۳	۲۱۳	پہلا درجہ گھروں کے اندر مستور رہنا
۲۴۲	اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ کی تفسیر	۲۱۵	ازواج مہطرات کے قلوب میں آپ کی عظمت اور عقیدت
۲۴۳	امانت کی تعریف	۲۱۷	پردہ کا دوسرا درجہ (برقعہ)
۲۴۵	آسمان وزمین پر امانت پیش کرنے کا مطلب	"	تیسرا درجہ چہرہ اور قد میں کا استثناء اور اس میں اختلاف فقہاء
۲۴۶	عرض امانت اختیار می تھا جبری نہیں	۲۲۰	آیت اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتْهُ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ کی تفسیر
۲۴۷	عرض امانت کا واقعہ کب ہوا	۲۲۱	صلوٰۃ و سلام کے معنی
۲۴۸	خلافت اہنی کیلئے بار امانت اٹھانے کی صلاحیت ضروری تھی	۲۲۲	ایک شبہ کا جواب
	سُورَةُ سَبَا ۲۲	۲۲۳	صلوٰۃ و سلام کا طریقہ
۲۵۰	آیت ۱ و ۲		
۲۵۱	آیات ۳ تا ۹		
۲۵۶	آیات ۱۰ تا ۱۳		
	حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں کی تسبیح حقیقی تھی آواز کی بازگشت نہ تھی۔		
۲۶۰			

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۹۲	اشتعال انگیزی سے پرہیز	۲۶۱	حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت کی تعلیم اور لوہے کو نرم کرنے کا معجزہ
۲۹۳	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام دنیا کے لئے عالم ہے	۲۶۲	صنعت و حرفت کی فضیلت
۲۹۸	دنیا کی دولت و عزت کو عند اللہ فضیلت سمجھنا	"	صنعت پیشہ لوگوں کو حقیر سمجھنا گناہ ہے
"	قدیم شیطانی فریب ہے	"	حضرت داؤد علیہ السلام کو صنعت زرہ سازی سکھانے کی حکمت
۳۰۰	مال و اولاد کی کثرت اللہ کے نزدیک مقبولیت کی علامت نہیں بلکہ بعض اوقات یہی عذاب ہوتا ہے۔	۲۶۳	خلیفہ وقت اور دینی خدمات کرنیوالے علماء اور مجاہدین کو بیت المال سے اپنا گزارہ لینا جائز ہے۔
۳۰۲	انسان اپنا مال اور قوت و طاقت جو کچھ خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ غیب سے اس کا بدل دیدتی ہیں	۲۶۴	لوگوں سے اپنے عیوب کی تحقیق کرنا
۳۰۳	جو خرچ خلاف شرع ہو اس کے بدل کا وعدہ نہیں	"	حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہوائی سفر
"	جس چیز کا دنیا میں خرچ کم ہو جاتا ہے اس کی پیداوار بھی کم ہو جاتی ہے	۲۶۵	تسخیر جنات کا مسئلہ
۳۱۰	کفار مکہ کو دعوت حق کا ایک خاص انداز	۲۶۷	سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات کے اعمال عجیبہ
۳۱۳	واخذوا من مغان قریب کا مطلب	۲۶۸	مساجد میں محراب کی جگہ کو مستقل مکہ بنانے کا حکم
۳۱۴	ختم سورہ سبا	۲۶۹	شریعت اسلام میں جاندار کی تصویر بنانا حرام ہے
۳۱۵	سورۃ فاطر ۲۲	"	حرمت تصویر پر ایک عام شبہ اور اس کا جواب
۳۱۷	اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اٰتٰیہُم مِّنْ رَّبِّہُمْ اَمَّا لَہُمْ فَاٰیٰتٌ کَثِیْرَةٌ	۲۷۱	فوٹو کی تصویر بھی تصویر ہی ہے
"	یَرْزُقُہُمْ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ فِیْ زَیَادَتٍ کَمَا مَرَادُہُمْ	۲۷۲	شکر کی حقیقت اور اس کے احکام
"	مَا یَفْخَخُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ کِی تَفْسِیْرُ	۲۷۳	حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا عجیب واقعہ
۳۱۸	اللہ پر توکل سب مصائب سے نجات ہے	۲۷۵	تعمیر بیت المقدس کا واقعہ
۳۲۶	کلمات طیبہ کا اللہ کی طرف صعود اور اس کے اسباب و شرائط	۲۷۹	قوم سبا اور ان پر اللہ کے خاص انعامات
۳۲۷	انسان کی عمر میں کمی یا زیادتی کا مطلب	۲۸۱	سیل عرم اور سید مارب کا واقعہ
۳۲۸		۲۸۲	قوم سبا کا زمانہ
۳۲۹		۲۸۵	اصل عذاب آخرت کافروں ہی کے لئے ہے
۳۳۰		۲۸۶	قوم سبا کی بربادی
۳۳۱		۲۹۲	بحث و مناظرہ میں مخاطب کی رعایت

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۵۹	سورۃ یس ۲۲	۳۳۳	قیامت کے روز کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا
۳۶۲	سورۃ یس کے فضائل	۳۳۵	ربط آیات
۳۶۳	مسئلہ: کسی شخص کا نام یس رکھنا	۳۳۶	اختلاف الوان میں کمال قدرت
۳۶۵	جس طرح نیک و بد اعمال لکھے جاتے ہیں اسی طرح اعمال کے اثرات و نتائج بھی۔	۳۳۶	انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء
۳۶۲	واضرِبْ لَهُمْ مَثَلًا آصْحَابَ الْقَرْيَةِ بستی کوئی ہے۔	۳۳۷	اصطلاح قرآن میں عالم کی تعریف اور یہ کہ حروف و کلمات کے معنی جاننے والا عالم نہیں کہلاتا
۳۶۳	اِذْ جَاءَ هَآءِ الْمُرْسَلُونَ میں اصطلاحی رسول مراد ہیں یا عام قاصد	۳۳۲	علماء کی چند علامات و صفات
۳۶۲	رَجُلٌ یَّسْعٰی کی تحقیق اور اس کا قصہ	۳۳۳	اعمال صالحہ کی مثال تجارت سے
۳۶۵	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی بعثت کے پہلے ایمان لائیوالے تین حضرات کا ذکر	۳۳۳	قرآن کے وارث اللہ کے مقبول بندے
۳۶۷	مبلغین اسلام کے لئے اہم ہدایت	۳۳۵	امت محمدیہ خصوصاً اس کے علماء کی خاص فضیلت
۳۶۹	آیات ۳۳ تا ۳۴	۳۳۶	امت محمدیہ کی تین قسمیں
۳۸۳	نباتات کی پیداوار میں انسان کے عمل کو دخل نہیں	۳۳۶	ایک شبہ اور اس کا جواب
۳۸۳	انسانی غذا اور حیوانات کی غذا میں خاص فرق	۳۳۷	نیک صحبت کی تلاش و تمنا
۳۸۴	خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کی تفسیر	۳۳۷	علماء امت محمدیہ کی عظیم فضیلت
۳۸۵	وَالشَّمْسُ شَرُوعٌ لِّمُسْتَقَرٍّ لِّہَا کی مفصل تحقیق	۳۳۹	مردوں کے لئے سونے کا زیور اور ریشمی کپڑا
۳۸۷	آفتاب کے زیر عرش سجدہ کرنے کی تحقیق	۳۳۹	جنت میں حلال دنیا میں حرام
۳۹۳	فائدہ: شمس و قمر متحرک ہیں	۳۵۰	دنیا غموں فکر وں کا گھر ہے اُن سے نجات جنت ہی میں ہوگی۔
۳۹۳	منازل فطر	۳۵۰	جنت کی چند خصوصیات
۳۹۲	قرآن میں ہوائی جہاز کا ذکر	۳۵۱	اَوَلَمْ نَعْمَرْکُمْ مَا یَتَذَكَّرُ فِیْہِ مَنْ یَّذَکَّرْ
۳۹۲	آیات ۳۵ تا ۳۷	۳۵۱	وہ کوئی عمری جو انسان پر اللہ کی حجت تمام کر دیتی ہے؟
۳۹۶	اللہ کا رزق بعض کو بالواسطہ ملنے کی حکمت	۳۵۳	ہُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خُلَیفَہٗ فِی الْاَرْضِ
۳۹۷	آیات ۳۸ تا ۳۸	۳۵۷	عبرت و نصیحت
۴۰۲	قیامت میں اعضاء کے بولنے کی تحقیق	۳۵۷	لَا یُحِیُّ الْمَکْرَ السَّیِّئَ اِلَّا بِاٰیٰتِہِ
			بری تدبیر اپنے ہی گھلے کا ہار بنتی ہے۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۳۸	بری صحت سے بچنے کی تعلیم	۴۰۴	وَمَنْ نُعْزِزْهُ نُيْلِكُمْ فِي الْخَلْقِ کی تفسیر
۴۳۹	موت کے خاتمہ پر تعجب	۴۰۶	آیات ۶۹ تا ۷۵
"	آیات ۶۲ تا ۷۲	۴۰۷	حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شعر و شاعری
۴۴۱	زقوم کی حقیقت		کی نفی کا مطلب
۴۴۲	كَانَ رُءُوسَ الشَّيَاطِينِ کا مطلب	۴۰۹	اشیاء پر ملکیت کی اصلی علت سرمایہ و محنت
"	آیات ۷۵ تا ۸۲		نہیں، بلکہ عطاۓ خداوندی ہے۔
۴۴۴	وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمُ الْبَاقِينَ	۴۱۰	آیات ۷۶ تا ۸۳
۴۴۵	آیات ۸۳ تا ۹۸	۴۱۲	جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا پر بحث
۴۴۸	ستاروں پر نگاہ ڈالنے کا مقصد	۴۱۳	ختم سورہ یونس
۴۴۹	علم نجوم کی شرعی حیثیت		
۴۵۲	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیماری کا مطلب		سُورَةُ الصَّفَاتِ ۲۳
۴۵۴	توریت کا شرعی حکم	۴۱۴	آیات ۱ تا ۱۰
"	آیات ۹۹ تا ۱۱۳	۴۱۵	مضامینِ سورت
۴۵۷	بیٹے کی فتر بانی کا واقعہ	۴۱۶	پہلا مضمون توحید
۴۵۹	وحی غیر متلو کا ثبوت	۴۱۷	نظم و ضبط دین میں مطلوب ہے
۴۶۲	ذبح حضرت اسماعیلؑ تھے یا حضرت اسحاقؑ	"	نماز میں صف بندی اور اس کی اہمیت
۴۶۷	آیات ۱۱۴ تا ۱۲۲	۴۱۸	فرشتوں کی قسم کھانے کی حکمت
۴۶۸	آیات ۱۲۳ تا ۱۳۲	"	حق تعالیٰ کا قسم کھانا اور اس کے احکام وغیرہ
۴۶۹	حضرت الیاسؑ کون تھے	۴۲۱	"شہاب ثاقب" پر اجمالی کلام
۴۷۰	بعثت کا زمانہ اور مقام	۴۲۲	مقصد اصلی
"	قوم کے ساتھ کشمکش	۴۲۳	آیات ۱۱ تا ۱۸
۴۷۲	حیات الیاس علیہ السلام کی تحقیق	۴۲۶	حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا ثبوت
۴۷۴	غیر اللہ کی طرف تخلیق کی صفت منسوب کرنا	۴۲۷	آیات ۱۹ تا ۲۶
	جائز نہیں	۴۳۰	آیات ۲۷ تا ۳۰
۴۷۵	آیات ۱۳۳ تا ۱۳۸	۴۳۲	آیات ۳۱ تا ۶۱
۴۷۶	آیات ۱۳۹ تا ۱۴۸	۴۳۷	ایک جنتی اور اس کا کافر ملاقاتی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۰۴	بڑے لوگوں کو اپنی حاجت کی غلطیوں پر صبر کرنے کی تلقین	۴۷۸	قرعہ اندازی کا حکم
۵۰۴	کسی قسم کے دباؤ سے ہدیہ یا چندہ طلب کرنا	۴۷۹	تسبیح و استغفار سے مصائب دور ہوتے ہیں
	غضب کے حکم میں ہے	۴۸۰	مرزا قادیانی کی تلبیس کا جواب
۵۰۵	شرکت کے معاملات میں احتیاط کی ہدایت	۴۸۱	آیات ۱۶۶ تا ۱۶۹
۵۰۶	سجدۂ تلاوت نماز میں رکوع سے بھی ادا ہو جاتا ہے	۴۸۳	تفسیر آیات
"	سجدۂ تلاوت کے متعلق مسائل	۴۸۴	ہرٹ دھرمی کے وقت الزامی جواب
"	کسی کو غلطی پر متنبہ کرنے کے لئے طریقہ حکمت	۴۸۵	آیات ۱۷۶ تا ۱۷۹
۵۰۷	آیت ۲۶	۴۸۷	اللہ والوں کے غلبہ کا مطلب
"	حضرت داؤد علیہ السلام کو حکومت سیاست کے لئے چند بنیادی اصول کی ہدایت	۴۸۸	آیات ۱۸۰ تا ۱۸۲
۵۰۸	اسلامی ریاست کا بنیادی کام اقامت حق پر	۴۸۹	ختم سورت
"	عدلیہ اور انتظامیہ کا رشتہ		
۵۰۹	ذمہ داری کا عہدہ سپرد کرنے کے لئے سب سے پہلے قابل نظر انسان کا کردار ہے۔		سورۃ ص ۲۳
"	آیات ۲۷ تا ۲۹	۴۹۰	آیات ۱۶ تا ۱۷
۵۱۰	آیات کی لطیف ترتیب	۴۹۳	واقعہ شان نزول
۵۱۱	آیات ۳۰ تا ۳۳	۴۹۵	آیات ۲۰ تا ۲۱
۵۱۲	حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ گھوڑوں کا معائنہ اور اس کی تشریح میں دو قول	۴۹۶	داؤد علیہ السلام کے لئے تسخیر جبال
۵۱۳	سورج کی دایہ کی قصہ ثابت نہیں	۴۹۷	نماز صبحی (امشراق چاشت)
"	خدا کی یاد میں غفلت پر اپنے نفس کو سزا	"	زور بیان اور قوت خطابت بھی ایک نعمت ہے
"	ریاست کے کاموں کی نگرانی امیر کو خود کرنا چاہئے	۴۹۸	آیات ۲۱ تا ۲۵
۵۱۵	ایک عبادت کے معین وقت میں دوسری عبادت میں اشتغال غلطی ہے۔	۴۹۹	حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک امتحان
"	حضرت سلیمان ؑ کی ایک اور آزمائش	"	واقعہ امتحان میں مفسرین کے دو طریقے
		۵۰۰	واقعہ امتحان میں یہودیوں کی خرافات اور اس کی تردید
		۵۰۳	طبعی خوں نبوت یا ولایت کے منافی نہیں
		"	لوگوں کی بے تاعدگی پر حقیقت حال کے منکشف ہونے تک صبر کرنا چاہئے۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۲۳	صبر کا ثواب بے حساب ملے گا۔	۵۱۵	آزمائش کا قصہ قرآن نے مجھ رکھا ہے اسے مجھ ہی رہنا چاہیے۔
۵۲۴	آیات ۲۰ تا ۲۱	۵۱۶	اسرائیلی غلط روایات کی تردید
۵۲۶	فَتَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ اتِّبَاعِ احسن کی تشریح	۵۱۷	آیات ۳۵ تا ۴۰
۵۲۸	آیات ۲۱ تا ۲۳	۵۱۸	مَلِكًا لَا يَفْتِنُ بَنِي إِسْرَءِيلَ بَعْدَ مَوْتِهِ کی تفسیر
۵۲۹	پانی کی حفاظت اور آب رسانی کا عجیب نظام قدرت	۵۱۹	حکومت و اقتدار کی دعاء
۵۵۰	شرح صدر کی علامت	۵۲۰	آیات ۴۱ تا ۴۴ واقعہ ایوب علیہ السلام
۵۵۲	آیات ۲۴ تا ۲۸	۵۲۲	حضرت ایوبؑ کے مرض کی نوعیت
۵۵۳	آیات ۲۹ تا ۳۵	۵۲۳	شرعی حیلہ کی حیثیت اور درجہ
۵۵۶	محشر کی عدالت میں مظلوم کا حق ظالم سے وصول کرنے کی صورت	۵۲۴	کسی نامناسب کام کی قسم کھالے تو قسم توڑے اور کفارہ قسم ادا کرے۔
۵۵۷	ظالم کے سارے اعمال اصحابِ حقوق کو دیدی جائیں گے مگر ایمان نہیں دیا جائے گا۔	۵۲۵	آیات ۴۵ تا ۴۸
۵۵۸	آیات ۳۶ تا ۴۱	۵۲۶	فکر آخرت انبیاء کا امتیازی وصف ہے
۵۶۰	ایک اہم عبرت و نصیحت	۵۲۷	حضرت ایسح علیہ السلام
۵۶۱	آیات ۴۲ تا ۴۵	۵۲۸	زوجین کی عمروں میں تناسب کی رعایت بہتر ہے
۵۶۲	موت اور نیند دونوں میں قبض روح اور دونوں میں فرق۔	۵۲۹	آیات ۶۵ تا ۸۸
۵۶۳	آیات ۴۶ تا ۵۲	۵۳۰	تکلف اور تفتع مذموم ہے۔
۵۶۴	قبولیت دعاء کے لئے ایک عمل مجرب	۵۳۱	سُورَةُ الزُّحْرِ ۲۳
۵۶۵	مشاہرات صحابہ	۵۳۲	آیات ۱ تا ۶
۵۶۷	آیات ۵۳ تا ۶۱	۵۳۳	اعمال کی مقبولیت بمقدار اخلاص ہے
۵۶۸	آیات ۶۲ تا ۶۷	۵۳۴	پہلے زمانہ کے کفار بھی آج کے کفار سے بہتر تھے
۵۶۹	آسمان وزمین کے خزانوں کی کنجیاں	۵۳۵	چاند سورج دونوں حرکت کرتے ہیں
۵۷۰	آیات ۶۸ تا ۷۵	۵۳۶	تخلیق انسانی میں حکمت تدریج
۵۷۱	آیات ۷۶ تا ۸۵	۵۳۷	آیات ۷ تا ۱۰
۵۷۲	آیات ۸۶ تا ۹۵	۵۳۸	کوئی اچھی یا بُری چیز اللہ کے ارادے کے بغیر وجود میں نہیں آتی مگر خدا الہی کا تعلق ضرور اچھی چیزوں کے ہے۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۳۰	منکرین کے انکار کا پیغمبرانہ جواب	۵۷۸	سورۃ المؤمن ۲۲
۶۳۱	کفار فروع اعمال کے مکلف ہیں یا نہیں ؟	۵۸۱	آیات ۱ تا ۹
۶۳۲	اس میں اختلاف فقہاء	۵۸۲	سورۃ المؤمن کی خصوصیات و فضائل
۶۳۳	آیات ۹ تا ۱۲	۵۸۳	ہر بلا سے حفاظت
۶۳۴	آسمان و زمین کی تخلیق میں ترتیب اور ایام تخلیق کی تعیین	۵۸۴	دشمن سے حفاظت
۶۳۹	آیات ۱۳ تا ۲۵	۵۸۵	ایک عجیب واقعہ
۶۴۵	انسان کے اعضاء و جوارح کی محشر میں گواہی	۵۹۱	ان آیات کی تاثر اصلاح خلق میں
۶۴۶	آیات ۲۶ تا ۲۹	۵۹۹	فاروق اعظمؓ کی نصیحت مصلحین کے لئے
۶۴۷	تلاوت قرآن کے وقت خاموش ہو کر سننا واجب ہے	۶۰۰	تنبیہ
۶۴۸	آیات ۳۰ تا ۳۶	۶۰۳	مسلمانوں کے سب سے زیادہ خیر خواہ فرشتے ہیں
۶۵۰	استقامت کے معنی	۶۰۴	آیات ۱۰ تا ۲۲
۶۵۲	جنت کی نعمتیں — احادیث	۶۱۰	آیات ۲۳ تا ۴۶
۶۵۳	آیات ۳۷ تا ۳۹	۶۱۱	مؤمن آل فرعون میں کون تھا
۶۵۴	اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں	۶۱۲	قیامت کو یوم التناد کہنے کی وجہ
۶۵۵	آیات ۴۰ تا ۴۶	۶۱۳	آیت قرآن سے عذاب قبر کا ثبوت
۶۵۸	کفر کی ایک خاص قسم الحاد، تعریف اور احکام	۶۱۶	آیات ۴۷ تا ۶۰
۶۵۹	متاؤل کو کافر نہیں کہنا چاہئے "اس کے بار" میں ایک مغالطہ کا ازالہ	۶۲۰	دعاء کی حقیقت اور شرط قبولیت
۶۶۰	اس زمانہ میں کفر و الحاد کی گرم بازاری	۶۲۲	فضائل دعا
۶۶۱	کتاب اللہ کی حفاظت اللہ کی طرف سے	۶۲۴	قبولیت دعا کا وعدہ
۶۶۳	آیات ۴۷ تا ۵۳	۶۲۵	قبولیت دعا کی شرائط
		۶۲۶	آیات ۶۱ تا ۶۸
		۶۲۷	آیات ۶۹ تا ۷۸
		۶۲۸	آیات ۷۹ تا ۸۵
			سورۃ الحکم سجدہ ۲۳
	سورۃ الشوری ۲۵		آیات ۸ تا ۸
۶۶۹	آیات ۱ تا ۱۲	۶۲۹	آنحضرتؐ کیسے کفار مکہ کی طرف پیشکش آپؐ کا جواب

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۱۳	بشر سے اللہ تعالیٰ کے کلام کریم کی تین صورتیں	۶۷۳	آیات ۱۳ تا ۱۵
	سُورَةُ الزَّخْرَفِ ۲۵	۶۷۷	حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے کفر و شرک نہیں تھا
۷۱۶	آیات ۱ تا ۲۵	۶۷۸	اقامتِ دین فرض اور اس میں تفریقِ حرام و حلال
۷۲۳	سفر کی دعائیں	۶۷۹	ائمہ مجتہدین کے فروعی اختلافات تصدیق ممنوع میں داخل نہیں
۷۲۴	آیات ۲۶ تا ۳۰		آیت کے دس احکام
۷۲۵	ظن سور سے بچنے کے لئے اظہارِ برائت	۶۸۰	آیات ۱۶ تا ۲۰
۷۲۶	آیات ۳۱ تا ۳۲	۶۸۲	شکرِ نعمت (حاشیہ) قلب پر مرض کا حملہ اور اس سے آفاقہ
۷۲۷	شانِ نزول	۶۸۵	رزق کی تنگی سے حفاظت کے لئے ایک تجربہ عمل
۷۲۸	تقسیمِ معیشت کا قدرتی نظام		آیات ۲۱ تا ۲۳
۷۲۹	معاشی مساوات کی حقیقت	۶۸۷	آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و محبت کا مسئلہ
۷۳۲	اسلامی مساوات کا مطلب		آیات ۲۴ تا ۲۶
۷۳۳	آیات ۳۳ تا ۳۵	۶۹۱	توبہ کی حقیقت
۷۳۴	مال و دولت کی زیادتی فضیلت کا سبب نہیں ہے		آیات ۲۷ تا ۳۵
۷۳۵	آیات ۳۶ تا ۴۵	۶۹۲	شانِ نزول اور ربط
۷۳۷	یادِ خدا سے اعراضِ بُری صحبت کا اثر ہے	۶۹۵	دنیا میں دولت کی فراوانی فساد کا سبب ہے
۷۳۸	نیک شہرت بھی دین میں پسندیدہ ہے		جنت اور دنیا کا فرق
۷۳۹	انبیاء کے صحیفوں میں توحید کی تعلیم	۶۹۸	فائدہ
	آیات ۴۶ تا ۶۵		آیات ۳۶ تا ۴۳
۷۴۵	وَلَمَّا ضَرَبَ ابْنُ مَرْثَدٍ مَثَلًا کی شانِ نزول میں	۷۰۰	نعمِ آخرت کے حصول کے لئے شرائط
	متعدد روایات	۷۰۱	مشورہ کی اہمیت اور اس کا طریقہ
۷۴۷	آیات ۶۶ تا ۷۷	۷۰۲	عفو و انتقام میں معتدل فیصلہ
۷۴۹	دوستی درحقیقت وہی ہے جو اللہ کے لئے ہو	۷۰۳	آیات ۴۴ تا ۵۰
۷۵۰	آیات ۷۸ تا ۸۹	۷۰۷	آیات ۵۱ تا ۵۳
۷۵۲	وَقُلْ سَلَامٌ	۷۰۸	
		۷۱۲	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۸۵	آیات ۲۳ تا ۲۶		سُورَةُ الدُّخَانِ پ
۷۸۸	دہریہ زمانہ کو برا کہنے کی ممانعت	۷۵۵	آیات ۹ تا ۱۱
"	آیات ۲۷ تا ۳۷	۷۵۶	فصلیت سورۃ دخان
	سُورَةُ الْاِحْقَافِ پ	۷۵۸	آیات ۱۰ تا ۱۶
۷۹۱	آیات ۱ تا ۱۰	۷۶۰	دخان سے کیا مراد ہے
۷۹۶	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کے متعلق تعاضلات ادب	۷۶۲	آیات ۱۷ تا ۲۳
۷۹۷	آیات ۱۱ تا ۲۰	۷۶۷	زمین و آسمان کا رونا
۸۰۳	ماں کا حق باپ سے زیادہ ہے	۷۶۸	آیات ۲۴ تا ۳۲
۸۰۵	اکثر مذمتِ حل اور اکثر مذمتِ رضاع میں فقہاء اُمت کا اختلاف۔	۷۷۰	قومِ نوح کا واقعہ
۸۰۹	لذائذ دنیا اور تنعم سے پرہیز کی ترغیب	۷۷۱	آیات ۳۳ تا ۵۹
"	آیات ۲۱ تا ۳۲		سُورَةُ الْجَاثِيَةِ پ
۸۱۳	وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجَنِّ مِّنْ جَنَّاتِ كَعِ اِيْمَانِ لَانِے كَادَا قَعِ	۷۷۵	آیات ۱ تا ۱۵
۸۱۵	آیات ۳۳ تا ۳۵	۷۸۰	شانِ نزول
۸۱۶	أَوَلَوْ اَلْعَزِيزُ مِّنْ الرُّسُلِ سَمِعَتْ	۷۸۱	آیات ۱۶ تا ۲۰
		۷۸۳	پچھلی اُمتوں کی شریعتوں کا حکم ہمارے لئے
		"	آیات ۲۱ تا ۲۲
		۷۸۴	عالمِ آخرت اور اس میں جزاء، سزا و عسلاً ضروری ہے

سُورَةُ لُقْمَانَ

سُورَةُ لُقْمٰنٍ

سُورَةُ لُقْمٰنٍ بِمَكِّيَّةٌ وَهِيَ اَرْبَعٌ وَثَلَاثُونَ آيَةً وَارْبَعٌ رُّكُوعًا

سورہ لقمن مکہ میں نازل ہوئی اس کی چونتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الْمَرَّةِ ۱ تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ ۲ هُدًى وَرَحْمَةً

یہ آیتیں ہیں پکی کتاب کی ، ہدایت ہے اور مہربانی

لِلْمُحْسِنِينَ ۳ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ

نیکی کرنے والوں کیلئے ، جو کہ قائم رکھتے ہیں نماز اور دیتے ہیں زکوٰۃ

وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۴ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ السَّٰفِلُونَ ۵ وَمِنَ النَّاسِ مَن

اور وہ ہیں جو آخرت پر ان کو یقین ہے ۔ انھوں نے پائی ہو راہ اپنے رب کی

رَبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ السَّٰفِلُونَ ۵ وَمِنَ النَّاسِ مَن

طرت سے اور وہی مراد کو پہنچے ، اور ایک وہ لوگ ہیں کہ

يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ

خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے تاکہ بچلائیں اللہ کی راہ سے بن سمجھے ،

وَيَتَّخِذْنَ هَاهُنَا حَاوِلَةً وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۶ وَإِذَا

اور ٹھہرائیں اس کو مہنسی وہ جو ہیں ان کو ذلت کا عذاب ہے ، اور جب

تُثَلَّى عَلَيْهِ أَيْ سَنَاوَلِي مُسْتَكْبِرًا كَانَ لَمْ يَمَعَهَا كَانَ فِي

مٹائے اس کو ہماری آیتیں پیٹھ دے جاوے غور سے گویا ان کو سنا ہی نہیں گویا اس کے دونوں

أُذُنَيْهِ وَقَرَّأَ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ

کان۔ ہرے پس سو خوش خبری ہے اس کو دردناک عذاب کی۔ جو لوگ یقین

أَمِنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ۝ خَالِدِينَ

لائے اور کئے بھلے کام اُن کے واسطے ہیں نعمت کے باغ ہمیشہ رہا کریں

فِيهَا وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ⑨

ان میں وعدہ ہو چکا اللہ کا سچا ، اور وہ زبردست ہے حکمتوں والا

مُخْلِصَةٌ تَفْسِيرُ

آلہم راس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں، یہ (جو اس سورۃ یا قرآن میں مذکور ہیں)

آیتیں ہیں ایک پُر حکمت کتاب (یعنی قرآن) کی جو کہ ہدایت اور رحمت (کا سبب) ہے،

نیک کاروں کے لئے جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ لوگ آخرت

کاپورا یقین رکھتے ہیں (سو) یہ لوگ (اس قرآن کے اعتقاد اور عمل کی بدولت) اپنے

رب کے سیدھے رستے پر ہیں اور یہی لوگ (اس ہدایت کی بدولت) فلاح پانے والے

ہیں ریس قرآن اس طرح اُن کے لئے ہدایت اور رحمت کا جس کا اثر فلاح ہی سبب

ہو گیا، پس بعض آدمی تو ایسے ہیں جیسا بیان کیا گیا، اور رہبر خلافت ان کے، بعض آدمی

ایسا بھی ہے جو قرآن سے اعراض کر کے ان باتوں کا خریدار بنتا ہے (یعنی ایسی باتیں

اختیار کرتا ہے (جو اللہ سے) غافل کرنے والی ہیں رسول تو لہو کا اختیار کرنا جب کہ اس

کے ساتھ آیاتِ الہیہ سے اعراض بھی ہو خود ہی کفر اور ضلال ہے، پھر خاص کر جب کہ اس

کو اس غرض سے اختیار کیا جائے، تاکہ اس کے ذریعہ سے دوسروں کو بھی، اللہ کی

راہ (یعنی دین حق سے) بے سمجھے بوجھے گمراہ کرے اور اسی گمراہ کر کے ساتھ اس

(دراہِ حق) کی ہنسی اڑا دے (تاکہ دوسروں کے دل سے بالکل اس کی وقعت اور مایہ

بکھل جادے، تب تو کفر بر کفر اور ضلال کے ساتھ اضلال بھی ہے اور ایسے لوگوں میں سے

(آخرت میں) ذلت کا عذاب (ہونے والا) ہے جیسا کہ ان کے اصدادے سے فلاں

ہونا معلوم ہوا، اور اس شخص مذکور کے اعراض کی یہ حالت ہے کہ جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ شخص تکبر کرتا ہوا ایسی بے التفاتی سے (منہ موڑ لیتا ہو جیسے اس نے سنا ہی نہیں، جیسے اس کے کانوں میں ثقل ہے (یعنی جیسے بہرا ہے) سو اس شخص کو ایک دردناک عذاب کی خبر سناد دیجئے یہ تو اعراض کرنے والے کی سزا کا بیان ہوا، آگے اہل ہڈی کی سزا کا بیان ہو جو کہ فلاح موعود کی تفصیل ہے، یعنی البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کے لئے عیش کی جنتیں ہیں جنہیں ہمیشہ رہیں گے یہ اللہ نے سچا وعدہ فرمایا ہے اور وہ زبردست حکمت والا ہے (پس کمال قدرت سے وعدہ اور وعید کو واقع کر سکتا ہے اور حکمت سے اس کو حسب وعدہ واقع کرے گا) :

معارف و مسائل

يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ، اس آیت میں زکوٰۃ کا حکم ہے، حالانکہ آیت مکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل زکوٰۃ کا حکم مکہ معظمہ ہی میں ہجرت سے پہلے آچکا تھا۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ زکوٰۃ کا حکم ہجرت کے دوسرے سال میں نافذ ہوا اس سے مراد نصابوں کا تقرر اور مقدار واجب کی تفصیلات اور حکومت اسلامیہ کی طرف سے اس کی وصول یابی اور مصروف پر خرچ کرنے کا انتظام ہے، یہ ہجرت کے دوسرے سال میں ہوا ہے۔

ابن کثیر نے سورۃ مزمل کی آیت اَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ کے تحت میں یہی تحقیق فرمائی ہے، کیونکہ سورۃ مزمل تو مکی سورتوں میں بالکل ابتداءً نزولِ قرآن کے زمانے میں نازل ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قرآن کریم کی آیات میں اکثر صلوٰۃ اور زکوٰۃ کو ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے، اس کی فرضیت بھی ساتھ ساتھ ہی ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَرِيِّ لَفْظِ اشْتَرَا کے لغوی معنی خریدنے کے ہیں، اور بعض اوقات ایک کام کے بدلے دوسرے کام کو اختیار کرنے کے لئے بھی لفظ اشترار استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے اَلَّذِيْنَ اشْتَرَوْا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وغیرہ آیات قرآن میں یہی معنی اشترار کے مراد ہیں۔

اس آیت کا شانِ نزول ایک خاص واقعہ ہے کہ فضر بن حارث مشرکین مکہ میں سے ایک بڑا تاجر تھا، اور تجارت کے لئے مختلف ملکوں کا سفر کرتا تھا۔ وہ ملک فارس سے شاہانِ عجم کسریٰ وغیرہ کے تاریخی قصے خرید کر لایا اور مکہ کے مشرکین سے کہا کہ

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو قوم عاد و ثمود وغیرہ کے واقعات سناتے ہیں، میں تمہیں ان کے بہتر رستم اور اسفند یار اور دوسرے شاہانِ فارس کے قصے سناتا ہوں۔ یہ لوگ اس کے قصہ کو شوق و رغبت سے سننے لگے کیونکہ ان میں کوئی تعلیم تو تھی نہیں جس پر عمل کرنے کی محنت اٹھانی پڑے صرف لذیذ قسم کی کہانیاں تھیں۔ ان کی وجہ سے بہت سے مشرکین جو اس سے پہلے کلامِ الہی کے اعجاز اور یکتائی کی وجہ سے اس کو سننے کی رغبت رکھتے اور چوری چوری سنا بھی کرتے تھے، ان لوگوں کو قرآن سے اعراض کا بہانہ ہاتھ آگیا۔ (ذکرہ فی الروح عن سبب النزول للواحدی و مقاتل و ذکر نحوه فی الدر المنثور برایۃ البیہقی) اور درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مذکور الصدر تاجر باہر سے ایک گکانے والی کنیز (لونڈی) خرید کر لایا تھا اور اس کے ذریعہ اس نے لوگوں کو قرآن سننے سے روکنے کی یہ صورت نکالی کہ جو لوگ قرآن سننے کا ارادہ کریں اپنی اس کنیز سے ان کو گانا سنو آتا تھا اور کہتا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو قرآن سنا کر کہتے ہیں کہ نماز پڑھو روزہ رکھو اور اپنی جان دو جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، آؤ تم یہ گانا سنو اور جشنِ طرب مناؤ۔

قرآن کریم کی مذکورہ آیت اسی واقعہ پر نازل ہوئی، اور اس میں اشتراء بہو الخبریت سے۔ وہ قصے کہانیاں شاہانِ عجم کی یا یہ لونڈی گکانے والی مراد ہے۔ واقعہ نزول کے اعتبار سے لفظ اشتراء اپنے حقیقی معنی میں خریدنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور بہو الخبریت کے جو عام معنی آگے بیان ہو رہے ہیں ان کے اعتبار سے لفظ اشتراء بھی اس جگہ عام ہے۔ یعنی ایک کام کے بدلے میں دوسرے کو اختیار کرنا، اس میں سامان بہو کی خریداری بھی داخل ہے۔

اور بہو الخبریت میں لفظ خبریت تو باتوں اور قصے کہانیوں کے معنی میں ہے اور بہو کے لفظی معنی غفلت۔ میں پڑنے کے ہیں۔ جو چیزیں انسان کو ضروری کاموں سے غفلت میں ڈالیں وہ بہو کہلاتی ہیں، اور بعض اوقات ایسے کاموں کو بھی بہو کہا جاتا ہے جن کا کوئی معتد بہ فائدہ نہ ہو، محض وقت گزاری کا مشغلہ یا دل بہلانے کا سامان ہو۔ آیت مذکورہ میں بہو الخبریت کے معنی اور تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ و جابر رضی اللہ عنہم کی ایک روایت میں اس کی تفسیر گکانے بجانے سے کی گئی ہے (رواہ الحاكم وصحیح البیہقی فی الشعب وغیرہ) اور جبہ و صحابہ و تابعین اور عامہ مفسرین کے نزدیک بہو الخبریت عام ہے تمام

ان چیزوں کے لئے جو انسان کو اللہ کی عبادت اور یاد سے غفلت میں ڈالے، اس میں غنہ، مزامیر بھی داخل ہے اور یہودہ قصے کہانیاں بھی۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب الآداب المفرد میں اور بیہقی نے اپنی سنن میں لُہو الحدیث کی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ اس میں فرمایا ہے کہ لُہو الحدیث لُہو الغنہ و لُہو الشبائہ، یعنی لُہو الحدیث سے مراد گانا اور اس کے مشابہ دوسری چیزیں ہیں (یعنی جو اللہ کی عبادت سے غافل کر دیں) اور سنن بیہقی میں ہے کہ اشتراء لُہو الحدیث سے مراد گانے، بجائے والے مرد یا عورت کو خریدنا یا اس کے امثال ایسی یہودہ چیزوں کو خریدنا ہے جو اللہ کی یاد سے غافل کریں۔ ابن جریر نے بھی اسی عام معنی کو اختیار فرمایا ہے (روح ملخصاً) اور ترمذی کی ایک روایت سے بھی یہی عموم ثابت ہوتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ گانے والی لونڈیوں کی تجارت نہ کرو، اور پھر فرمایا فی مثل ہذا انزلت ہذا الایۃ و من الناس من یشترئ الخ لہو ولعب اور اس کے ان احکام کی پوری تفصیل قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ احقر کے سامان کے شرعی احکام مستقل رسالہ السعی الحیث فی تفسیر لُہو الحدیث میں مذکور ہے۔ جس میں غنہ و مزامیر پر بھی مفصل کلام قرآن و حدیث سے پھر فقہاء امت اور صوفیائے کرام کے اقوال سے مذکور ہے، یہ رسالہ بزبان عربی احکام القرآن حزب خامس میں شائع ہو چکا ہے۔ اہل علم اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں، عوام کے لئے اس کا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :-

پہلی بات قابل نظر یہ ہے کہ قرآن کریم نے جتنے مواقع میں لُہو یا لعب کا ذکر کیا ہے وہ مذمت اور برائی ہی کے مواقع ہیں، جس کا ادنیٰ درجہ کراہت ہو (روح المعانی و کشاف) اور آیت مذکورہ لُہو کی مذمت میں بالکل واضح اور صریح ہے۔ اور مستدرک حاکم کتاب الجہاد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”یعنی دنیا کا ہر لُہو (کھیل) باطل ہو مگر تین چیزیں ایک یہ کہ تم یرکان سے کھیلو دوسرے اپنے گھوڑے کو سدھانے کے لئے کھیلو، تیسرے اپنی بی بی کے ساتھ کھیل کرو“

كُلُّ شَيْءٍ مِّنْ لَّهٖ دُنْيَا بَاطِلٌ
إِلَّا ثَلَاثَةٌ اِنتِصَالُكَ بِقَوْمِكَ
وَتَاذِيْبُكَ لِفَرَسِكَ وَ
مَلَا عِبَتِكَ لَا هَلِيكَ فَاكُهِنَّ
مِنَ الْحَقِّ

(حاکم نے اس حدیث کو صحیح علی شرط مسلم کہا ہے، مگر ذہبی وغیرہ نے اس کی سند کے متصل

السند ہونے کو تسلیم نہیں کیا بلکہ حدیث مرسل کہا ہے، مگر جہور محدثین کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے۔

اس حدیث میں ہر لہو کو باطل قرار دیا ہے اور جن تین چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے وہ حقیقت وہ لہو میں داخل ہی نہیں، کیونکہ لہو تو اس کام کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی دینی و دنیوی فائدہ معتد بہا نہ ہو۔ اور یہ تینوں چیزیں مفید کام ہیں جن سے بہت دینی اور دنیوی فوائد وابستہ ہیں۔ تیرا اندازی اور گھوڑے کو سدھانا تو جہاد کی تیاری میں داخل ہیں، اور بیوی کے ساتھ ملاعت توالد و تناسل کے مقصد کی تکمیل ہے۔ ان کو صرف صورت اور ظاہر کے اعتبار سے لہو کہہ دیا گیا ہے وہ حقیقت کے اعتبار سے لہو میں داخل ہی نہیں۔ اسی طرح ان تین چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے کام ہیں جن سے دینی یا دنیوی فوائد متعلق ہیں اور صورت کے اعتبار سے وہ لہو دکھیل (سمجھے جاتے ہیں ان کو بھی دوسری روایات حدیث میں جائز بلکہ بعض کو مستحسن قرار دیا گیا ہے جس کی تفصیل آگے آجائی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو کام حقیقتہً لہو ہوں، یعنی جن میں نہ کوئی دینی فائدہ ہو نہ دنیوی، وہ سب کے سب مذموم اور مکروہ تو ضرور ہی ہیں، پھر ان میں تفصیل ہے۔ بعض تو کفر کی حد تک پہنچ جاتے ہیں، بعض حرام صریح ہیں اور کم سے کم درجہ مکروہ تہزیبی، یعنی خلاف آدلی ہونے کا ہی، جس سے کوئی لہو جو درحقیقت لہو ہو مستثنیٰ نہیں۔ اور جن کھیلوں کو احادیث میں مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ حقیقتہً لہو میں داخل ہی نہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں خود اس کی تصریح موجود ہے۔ ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ میں حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت کتاب الجہاد میں ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں لَیْسَ مِنَ اللّٰہِ وَذَلَالٌ تَّادِیْبُ الرَّجُلِ قَرَسَهُ وَمَلَا عِبَتُهُ اَهْلَکَ وَرَمِیْکَ بِقَوْسِیْہِ وَنَبْلِہِ الْحَدِثُ، (نصب الراية ص ۲۷۳، ج ۲) اس حدیث نے خود یہ تصریح کر دی کہ یہ تین چیزیں جو مستثنیٰ کی گئی ہیں درحقیقت وہ لہو میں داخل ہی نہیں، اور جو حقیقتہً لہو ہے وہ باطل اور مذموم ہے، آگے اس کے مذموم ہونے کے مختلف درجات ہیں۔

۱۔ جو کھیل دین سے گمراہ ہونے یا دوسروں کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بنے وہ کفر ہے۔ جیسا کہ آیت مذکور الصدر و من الناس من یشتوی لہو الخبیث میں اس کا کفر و ضلال ہونا بیان فرمایا گیا، اور اس کی سزا عذاب مہین قرار دی ہے جو کفار کی سزا ہے کیونکہ یہ آیت نصر بن حارث کے جس واقعہ پر نازل ہوئی ہے اس میں اس لہو کو اس نے اسلام کے خلاف لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔ اس لئے یہ لہو حرام

ہونے کے ساتھ کفر تک پہنچ گیا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی لہو لوگوں کو اسلامی عقائد سے تو گمراہ نہیں کرتا مگر ان کو کسی حرام اور معصیت میں مبتلا کرتا ہے۔ وہ کفر تو نہیں مگر حرام اور سخت گناہ ہو جیسو وہ تمام کھیل جن میں قمار اور جوا ہو یعنی ہار جیت پر مال لیں دین ہو، یا جو انسان کو ادا پر فرائض نماز روزہ وغیرہ سے مانع ہوں۔

فحش اور فضول ناول یا فحش اشعار اور اس زمانے میں بیشتر نوجوان فحش ناول یا جرائم پیشہ لوگوں کے اہل باطل کی کتابیں بھی دیکھنا نا جائز ہیں حالات پر مشتمل قصے یا فحش اشعار دیکھنے کے عادی ہیں۔ یہ سب چیزیں اسی قسم لہو حرام میں داخل ہیں۔ اسی طرح گمراہ اہل باطل کے خیالات کا مطالعہ بھی عوام کے لئے گمراہی کا سبب ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، راسخ العلم علماء ان کے جواب کے لئے دیکھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

۳۔ اور جن کھیلوں میں نہ کفر ہے نہ کوئی کھلی ہوئی معصیت، وہ مکروہ ہیں کہ ایک بے فائدہ کام میں اپنی توانائی اور وقت کو ضائع کرنا ہے۔

کھیلوں کے سامان | مذکورہ تفصیل سے کھیلوں کے سامان کی خرید و فروخت کا حکم بھی معلوم کی خرید و فروخت ہو گیا کہ جو سامان کفر و ضلال یا حرام و معصیت ہی کے کھیلوں میں استعمال ہوتا ہے اس کی تجارت اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ اور جو لہو مکروہ میں استعمال ہوتا ہے اس کی تجارت بھی مکروہ ہے۔ اور جو سامان جائز اور مستثنیٰ کھیلوں میں استعمال ہوتا ہے اس کی تجارت بھی جائز ہے۔ اور جس سامان کو جائز اور ناجائز دونوں طرح کے کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے اس کی تجارت جائز ہے۔

مباح اور جائز کھیل | ادھر یہ بات تفصیل سے آچکی ہے کہ مذموم اور ممنوع وہ لہو اور کھیل ہے جس میں کوئی دینی دنیوی فائدہ نہیں۔ جو کھیل بدن کی ورزش، صحت اور تندرستی باقی رکھنے کے لئے یا کسی دوسری دینی و دنیوی ضرورت کے لئے یا کم از کم طبیعت کا تھکان دور کرنے کے لئے ہوں اور ان میں غلو نہ کیا جائے کہ انہی کو مشغلہ بنا لیا جائے اور ضروری کاموں میں ان سے حرج پڑنے لگے تو ایسے کھیل شرعاً مباح اور دینی ضرورت کی نیت سے ہوں تو ثواب بھی ہیں۔

مذکورہ حدیث میں تین کھیلوں کو ممانعت سے مستثنیٰ کرنا اور پر گزر چکا ہے۔ تیر اندازی گھوڑے کی سواری، اپنے اہل کے ساتھ ملاعبت۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک مرفوع حدیث میں ہے: خیر لہو السواۃ من السیاحۃ وخیر لہو السراۃ

المغزل (جامع صغیر بر مز ابن عدی باسناد ضعیف) یعنی مؤمن کا اچھا کھیل تیرا کی ہے اور عورت کا اچھا کھیل چرخہ ہے۔

صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت سلمہ ابن اکوع رضی کی روایت ہے کہ انصارِ مدینہ میں ایک صاحبِ دوڑ میں بڑے ماہر تھے، کوئی ان سے سبقت نہ لے جاسکتا تھا، انھوں نے ایک روز اعلان کیا کہ کوئی ہے جو میرے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کرے؟ میں نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ میں مقابلہ کروں، آپ نے اجازت دیدی تو میں مقابلہ میں آگے بڑھ گیا، اس سے معلوم ہوا کہ پیادہ دوڑ کی مشق کرنا بھی جائز ہے۔

ایک مشہور پہلوان رکابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی ٹھہرائی تو آپ نے اس کو کشتی میں پھنسا دیا (ابوداؤد فی المراسیل)

حبشہ کے کچھ نوجوان مدینہ طیبہ میں فن سپہ گرمی کی مشق کرنے کے لئے نیزوں وغیرہ سے کھیلتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کھیل حضرت عائشہ رضی کو اپنی لپٹ کے پیچھے کھڑا کر کے دکھلایا اور ان لوگوں کو فرمایا کہ اَلْهَوَاۗءُ اَوَّلُ الْعَبُوۡءِ ”یعنی کھیل کو دگرتے رہو“ (رواہ ابیہقی فی الشعب کذا فی الکنز من باب اللہو) اور بعض روایات میں اس کے ساتھ یہ الفاظ بھی آئے ہیں فَاِیَّیْۤ اَکُوۡہُ اَنۡ یُّدْرِیۡ فِیۡ دِیۡنِکُمۡ غَلَطَۃٌ ”یعنی میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ تمھارے دین میں خشکی اور شدت دیکھی جائے“

اسی طرح بعض صحابہ کرام سے منقول ہے کہ جب وہ قرآن و حدیث کے مشاغل میں تھک جاتے تو بعض اوقات عرب کے اشعار یا تاریخی واقعات سے دل بہلاتے تھے (ذکرہ عن ابن عباس رضی فی کف الرعاع)

ایک حدیث میں ارشاد ہے: رَوَّحُوا الْقُلُوبَ سَاعَةً فَسَاعَةً اُخْرَجَ ابوداؤد فی مسلیہ عن ابن شہاب ہر سَلَا، ”یعنی تم اپنے قلوب کو کبھی کبھی آرام دیا کرو“ جس سے قلب و دماغ کی تفریح اور اس کے لئے کچھ وقت نکالنے کا جواز ثابت ہوا۔

شرط ان سب چیزوں میں یہ ہے کہ نیت ان مقاصدِ صحیحہ کی ہو جو ان کھیلوں میں پائے جاتے ہیں، کھیل برائے کھیل مقصد نہ ہو اور وہ بھی بقدر ضرورت ہو، اس میں توسع اور غلو نہ ہو۔ اور وجہ ان سب کھیلوں کے جواز کی وہی ہے کہ درحقیقت یہ جب اپنی حد کے اندر ہوں تو کہنہ کی تعریف میں داخل ہی نہیں۔

بعض کھیل جو صراحۃً اس کے ساتھ بعض کھیل ایسے بھی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر منع فرما دیا ہے، اگرچہ ان میں کچھ فوائد

بھی بتلائے جاویں مثلاً، شطرنج، چوسر وغیرہ اگر ان کے ساتھ ہار جیت اور مال کا لین دین ہو تو یہ حرام ہیں اور یہ نہ ہو محض دل بہلانے کے لئے کھیلے جائیں تب بھی حدیث میں ان کو منع فرمایا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نرد شیر یعنی چوسر کھیلتا ہے وہ ایسا ہے جیسے اس نے اپنے ہاتھ خنزیر کے خون میں رنگے ہوں۔ اسی طرح ایک روایت میں شطرنج کھیلنے والے پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں رعیلی فی الضعفاء عن ابی ہریرۃ کذا فی نصب الرایۃ

اسی طرح کبوتر بازی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناجائز قرار دیا۔ ابوداؤد فی المراسیل عن شریح کذا فی الکتران ان کی ممانعت کی ظاہری وجہ یہ ہے کہ عموماً ان میں مشغولیت ایسی ہوتی ہے کہ آدمی کو ضروری کام یہاں تک کہ نماز اور دوسری عبادت سے بھی غافل کر دیتی ہے۔

غناء و مزامیر کے احکام | آیت مذکورہ میں چند صحابہ کرام نے تو ہوا الحدیث کی تفسیر گانے بجانے سے کی ہے۔ اور دوسرے حضرات نے اگرچہ تفسیر عام قرار دی ہے، ہر ایسے کھیل کو جو اللہ سے غافل کرے کہ ہوا الحدیث فرمایا ہے، مگر ان کے نزدیک بھی گانا بجانا اس میں داخل ہے۔ اور قرآن کریم کی ایک دوسری آیت لَا یَسْمَعُونَ الشَّوْشَہَ میں امام ابو حلیفہ اور مجاہد اور محمد بن الحنفیہ وغیرہ نے زور کی تفسیر غناء (گانے بجانے) سے کی ہے۔

ابو داؤد اور ابن ماجہ نے سنن میں اور ابن حبان نے اپنی کتاب صحیح میں حضرت ابوماک شمریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”میری امت کے کچھ لوگ شراب کو اس کا نام بدل کر پییں گے ان کے سامنے معارف و مزامیر کے ساتھ عورتوں کا گانا ہوگا اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں خسف کر دے گا، اور بعض کی صورتیں مسخ کر کے بندر اور سور بنا دے گا“

لَیْسَ بَيْنَ نَاسٍ مِّنْ أُمَّتِي الْخَمْرُ
يَسْمَوْنَهَا غَيْرَ اسْمِهَا
يُغْنَوْنَ عَلَى رُؤُسِهِمْ
بِالْمَعَارِفِ وَالْمَعْنِيَاتِ،
يَخْسِفُ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ
وَيَجْعَلُ اللَّهُ مِنْهُمْ لِقَاءَ
وَالْخَنَازِيرِ

اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب اور خمر اور طبلہ و سارنگی کو حرام کیا ہے، اور فرمایا کہ ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے۔ (رداۃ الامام احمد و ابوداؤد و ابن حبان)

روى عن ابى هريرة قال قال
رسول الله صلى الله عليه وسلم
اذا اتخذ الفسق دولة والامانة
مغنما والزكاة مغرمًا وتعلم
لغير الدين والطاع الرجل امرأته
وعق أمه وادنى صديقه واقصى
أبائه وظهرت الأصوات في المساجد
وساد القبيلة فاسقهم وكان زعيم
القوم اسذلهم وأكرم الرجل
مخافة شره وظهرت القيان و
المعازف وشربت الخمر ولعن
آخر هذه الأمة أولها فليرتقبوا
عند ذلك ريجا حمراء وزلزلة
وخسفاً وسخاوقنقاوايات
تتابع كنظام بال قطع سلكه
فتتابع بعضه بعضاً ررواه الترمذی
وقال هذا حدیث حسن غریب

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مال غنیمت کو
شخصی دولت بنالیا جائے اور جب لوگوں کی امانت
کو مال غنیمت سمجھ لیا جائے اور جب زکوٰۃ کو ایک
تاوان سمجھا جانے لگے اور جب علم دین کو دنیا
طلبی کے لئے سیکھا جانے لگے اور جب مرد اپنی بیوی
کی اطاعت اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے، اور
دوست کو اپنے قریب کرے اور باپ کو دور
رکھے، اور مسجدوں میں شور و غل ہونے لگے اور
قبیلہ کا سرداران کا فاسق بدکار بن جائے اور
قوم کا سرداران میں ارذل بدترین آدمی ہو جائے،
اور جب شریر آدمیوں کی عزت ان کے شر کے خوف
سے کی جانے لگے، اور جب گانے والی عورتوں
اور باجوں گاجوں کا رواج عام ہو جائے، اور
جب شرابی پی جانے لگیں اور اس امت
کے آخری لوگ پہلے لوگوں پر لعنت کرنے لگیں
تو اس وقت تم انتظار کرو ایک سرخ آندھی کا

اور زلزلہ کا اور زمین خسف ہو جانے اور صورتیں مسخ ہو جانے کا اور قیامت کی ایسی نشانیوں کا جو
یکے بعد دیگرے اس طرح آئیں گی جیسے کسی ہار کی لڑھی ٹوٹ جائے اور اس کے دانے بیک وقت
بکھر جاتے ہیں۔

اس حدیث کے الفاظ کو بار بار پڑھئے اور دیکھئے کہ اس وقت
تنبیہ ضروری کی دنیا کا پورا پورا نقشہ ہے، اور وہ گناہ جو مسلمانوں میں عام
ہو چکے ہیں اور بڑھتے جا رہے ہیں، ان کی خبر جو وہ سو برس پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے دے دی ہے۔ مسلمانوں کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ ایسے حالات سے باخبر رہیں،
اور گناہوں سے بچنے بچانے کا پورا اہتمام کریں۔ ورنہ جب یہ گناہ عام ہو جائیں گے تو
ایسے گناہ کرنے والوں پر آسمانی عذاب نازل ہوں گے، اور پھر قیامت کی آخری علامات
سامنے آجائیں گی۔ ان گناہوں میں سے عورتوں کا گانا اور گانے بجانے کے آلات

طلبہ سازگی وغیرہ بھی ہیں، اس جگہ اس روایت کو اسی مناسبت سے نقل کیا گیا ہے۔
اس کے علاوہ اور بہت سی مستند احادیث ہیں جن میں گانے بجانے کو حرام و ناجائز
فرمایا ہے اور اس پر وعید شدید ہے۔ ان تمام روایات کو احقر نے اپنے رسالہ کشف الغنّاء
عن وصف الغنّاء میں لکھ دیا ہے۔ یہ رسالہ بھی بزبان عربی احکام القرآن حزب خاص میں
شائع ہو چکا ہے، یہاں ان میں سے چند نقل کی گئی ہیں۔

خوش آوازی کے ساتھ بغیر مزامیر کے | اس کے مقابل بعض روایات سے غنا یعنی گانے کا جواز
مفید اشعار کا پڑھنا ممنوع نہیں بھی معلوم ہوتا ہے، یہ روایات بھی رسالہ مذکورہ میں جمع
کر دی گئی ہیں۔ تطبیق ان دونوں میں اس طرح ہے کہ جو گانا اجنبی عورت کا ہو یا اس کے ساتھ
طلبہ سازگی وغیرہ مزامیر ہوں وہ حرام ہے۔ جیسا کہ مذکورہ صدر آیات قرآن اور احادیث
رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوا۔ اور اگر محض خوش آوازی کے ساتھ کچھ اشعار پڑھو
جائیں اور پڑھنے والی عورت یا امرؤ نہ ہوں، اور اشعار کے مضامین بھی فحش یا کسی دوسرے
گناہ پر مشتمل نہ ہوں تو جائز ہے۔

بعض صوفیائے کرام سے جو سماع غنا منقول ہے وہ اسی قسم کے جائز غنا پر
محمول ہے۔ کیونکہ ان کا اتباع شریعت اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب
کی طرح یقینی ہے، ان سے ایسے گناہ کے ارتکاب کا گمان نہیں کیا جاسکتا۔ محققین
صوفیائے کرام نے خود اس کی تصریح فرمائی ہے۔ اس معاملہ میں مذاہب اربعہ کے فقہاء
اور صوفیائے کرام کے اقوال مذکورہ صدر رسالہ میں تفصیل سے جمع کر دیئے گئے ہیں، یہاں
اسی اختصار پر اکتفا کیا گیا۔ واللہ المستعان

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَّرَوْنَہَا وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ حَرِ

بنائے آسمان بغیر ستونوں کے تم اس کو دیکھتے ہو اور رکھ دیتے زمین پر

رَوٰی اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَبَتْ فِیْہَا مِنْ کُلِّ دَابَّةٍ وَاَنْزَلْنَا

پہاڑ کہ تم کو لے کر ٹھک نہ پڑے اور پھیر دیتے اس میں سب طرح کے جانور اور اتارا ہم نے

مِنَ السَّمَاءِ مَآءً فَاَنْبَتْنَا فِیْہَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ ①

آسمان سے پانی پھر اُگائے زمین میں ہر قسم کے جوڑے خاصے،

هَذَا خَلَقَ اللَّهُ فَأَمْرُوْنِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُونِهِ

یہ سب کچھ بنایا ہوا ہے اللہ کا اب دکھلاؤ مجھ کو کیا بنایا ہے اوروں نے جو اس کے سوا ہیں

بَلِ الظَّالِمُوْنَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۱

کچھ نہیں پر بے انصاف صریح بھٹک رہی ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بلا ستون بنایا (چنانچہ) تم ان کو دیکھ رہے ہو اور زمین میں (بھاری بھاری) پہاڑ ڈال رکھے ہیں کہ وہ تم کو بے کراؤ اور ڈول نہ ہونے لگے اور اس (زمین) میں ہر قسم کے جانور پھیلا رکھے ہیں اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس زمین میں ہر طرح کے عمدہ اقسام (نباتات کے) اگائے (اور ان لوگوں سے جو کہ مشرک کرتے ہیں کہتے کہ) یہ تو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں (سو اگر تم دوسروں کو مشرک الوہیت قرار دیتے ہو تو) اب تم لوگ مجھ کو دکھاؤ کہ اس کے سوا جو (معبود تم نے بنا رکھے) ہیں انھوں نے کیا کیا چیزیں پیدا کی ہیں (تاکہ ان کا استحقاق الوہیت ثابت ہو، اور اس دلیل کا مقتضی یہ تھا کہ وہ لوگ ہدایت پر آجاتے، مگر انھوں نے ہدایت کو قبول نہیں کیا) بلکہ یہ ظالم لوگ (بدستور) صریح گمراہی میں (مبتلا) ہیں۔

معارف و مسائل

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا، اسی مضمون کی ایک آیت سورۃ رعد کے شروع میں گزر چکی ہے، اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا، ترکیب نحوی کے اعتبار سے اس عبارت کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:-

ایک یہ کہ تَرَوْنَهَا کو عَمَد کی صفت قرار دیا جائے اور اس کی ضمیر عَمَد کی طرف راجع کی جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جن کو تم دیکھتے ہو، یعنی اگر ستون ہوتے تو تم ان کو دیکھتے، جب ستون نظر نہیں آتے تو معلوم ہوا کہ یہ آسمان کی عظیم الشان چھت بغیر ستونوں کے بنائی گئی ہے، یہ تفسیر حضرت حسنؒ اور قتادہ سے منقول ہے۔ (ابن کثیر)

دوسری صورت یہ ہے کہ تَرَوْنَهَا کی ضمیر سموات کی طرف راجع ہو، اور یہ جملہ

مستقل قرار دیا جائے۔ معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بغیر ستون کے پیدا کیا، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ اور پہلی ترکیب کی صورت میں ایک معنی یہ بھی کئے جاسکتے ہیں کہ آسمان ستونوں پر قائم ہیں ان کو تم دیکھ نہیں سکتے وہ غیر مری ہیں۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ اور عکرمہؓ اور مجاہدؓ سے منقول ہے (ابن کثیر)

بہر صورت اس آیت نے حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی یہ نشانی بتلائی کہ آسمان کی اتنی وسیع و عریض اور اتنی بلند عظیم الشان چھت کو ایسا بنایا ہے کہ اس میں کوئی عمود اور ستون نہیں دیکھا جاتا ہے۔

ایک سوال جواب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آسمان جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں اور عام طور پر مشہور ہے کہ ایک کرہ یعنی گول چیز ہے، اور ایسے گول کرہ میں وہ جہاں بھی ہو عادتاً عمود اور ستون نہیں ہوتے، تو آسمان کی کیا خصوصیت ہے؟ اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح قرآن کریم نے اکثر مواقع میں زمین کو فراش فرمایا، جو گول اور کرہ ہونے کے بظاہر منافی ہے۔ مگر اس کی وسعت کی وجہ سے وہ عام نظروں میں ایک سطح کی طرح دیکھی جاتی ہے، اسی عوامی تخیل کی بناء پر قرآن کریم نے اس کو فراش فرمایا، اسی طرح آسمان ایک چھت کی طرح نظر آتا ہے جس کے لئے عادتاً ستونوں اور عماد کی ضرورت ہوتی ہے، اس عام خیال کے مناسب اس کا بلا ستون ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ اور درحقیقت قدرت کاملہ کے ثبوت کے لئے اتنے بڑے عظیم الشان کرہ کی تخلیق ہی کافی ہے۔ اور بعض مفسرین ابن کثیر وغیرہ کی تحقیق یہ ہے کہ آسمان اور زمین کا مکمل کرہ ہونا قرآن و سنت کی رُو سے ثابت نہیں، بلکہ بعض آیات و روایات سے اس کا ایک قبہ کی شکل میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک صحیح حدیث میں جو ہر روز آفتاب کا تخت العرش پہنچ کر سجدہ کرنا مذکور ہے وہ اسی صورت پر ہو سکتا ہے کہ آسمان مکمل کرہ نہ ہو، اسی صورت میں اس میں فوق و تحت یعنی اوپر نیچے کی جہت متعین ہو سکتی ہے، مکمل کرہ میں کسی جہت و سمت کو اوپر یا نیچے نہیں کہہ سکتے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنْ اشْكُرْ لِلَّهِ وَمَنْ يَشْكُرْ

اور ہم نے دی لقمان کو عقلندی کہ حق مان اللہ کا، اور جو کوئی حق مانے اللہ کا

وَأَنْتُمْ لَا تَشْكُرُونَ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝۱۲

تو مانے گا اپنے بھلے کو اور جو کوئی منکر ہوگا تو اللہ بے پرواہ ہو سب تعریفوں والا

وَإِذْ قَالَ لُقْمَنُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَبْنَىٰ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ ط

اور جب کہا لقمان نے اپنے بیٹے کو جب اس کو سمجھانے لگا اے بیٹے شریک نہ ٹھہرائو اللہ کا،

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝۱۳ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ

بیشک شریک بنانا بھاری بے انصافی ہے، اور ہم نے تاکید کر دی انسان کو اسکے ماں باپ کے واسطے

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصْلُهُ فِي عَامَيْنِ أَنْ

پیٹ میں رکھا اس کو اس کی ماں نے تھک تھک کر اور دودھ چھڑانا ہے اس کا دوا برس میں کہ

أَشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ط إِلَى الْمَرْصِیْمِ ۝۱۴ وَإِنْ جَاهَدَاكَ

حق مان میرا اور اپنے ماں باپ کا آخر بھی تک آنا ہے، اور اگر وہ دونوں تجھ سے

عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ

اڑیں اس بات پر کہ شریک مان میرا اس چیز کو جو تجھ کو معلوم نہیں تو ان کا کہنا مت مان اور

صَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ

ساتھ دے ان کا دنیا میں دستور کے موافق اور راہ چل اس کی جو رجوع ہوا میری

إِلَىٰ ثُمَّ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأَنبِئُكُمْ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝۱۵

طرف، پھر میری طرف ہے تم کو پھر آنا پھر میں بتلا دوں گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے،

يَبْنَىٰ إِنَّهَا أَنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ

اے بیٹے اگر کوئی چیز ہو برابر رائی کے دانہ کی پھر وہ ہو کسی پتھر میں،

أَوْ فِي السَّمَوَاتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللَّهُ ط إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ

یا آسمانوں میں یا زمین میں لا حاضر کرے اس کو اللہ بیشک اللہ جانتا ہے چھپی ہوئی

خَيْرٌ ۝۱۶ يَبْنَىٰ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَامْرًا بِالسَّعَادَةِ وَأَنَّ

چیزوں کو، خبردار ہو۔ اے بیٹے قائم رکھ نماز کو اور سکھلا بھلی بات اور منع کر

عَنِ الشُّكْرِ وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزَمِ الْأُمُورِ ۝۱۷

برائی سے اور تحمل کر جو تجھ پر پڑے بے شک یہ ہیں ہمت کے کام۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّ

اور اپنے گال مت پھلا لوگوں کی طرف اور مت چل زمین پر اتراتا بے شک

اللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝۱۸ وَأَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ

اللہ کو نہیں بھاتا کوئی اتراتا بڑائیاں کرنے والا۔ اور چل بیچ کی چال اور نیچی کر

مِنْ صَوْتِكَ ۚ إِنَّ أُنْثَىٰ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۝۱۹

آواز اپنی، بے شک بُری سے بُری آواز گدھے کی آواز ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے لقمان کو دانشمندی (جس کی حقیقت علم مع العمل ہے) عطا فرمائی اور ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ (سب نعمتوں پر عموماً اور اس نعمتِ حکمت پر کہ افضل النعم ہے خصوصاً) اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے رہو اور جو شخص شکر کرے گا وہ اپنے ذاتی نفع کے لئے شکر کرتا ہے (یعنی اسی کا نفع ہے کہ اس سے نعمت میں ترقی ہوتی ہے) کما قال تع لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ، دینی نعمت میں تو ترقی دنیا میں بھی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی دنیا میں تو شکرِ نعمت سے علم بڑھتا ہے اور توفیقِ عمل میں اضافہ ہوتا ہے اور آخرت میں ثوابِ عظیم ملتا ہے، اور دنیوی میں آخرت کی ترقی یعنی ثواب میں اضافہ تو یقینی ہے اور کبھی دنیا میں شکر کرنے سے نعمت بڑھ جاتی ہے، اور جو ناشکری کرے گا تو (اپنا ہی نقصان کرے گا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (تو) بے نیاز (اور سب) خوبیوں والا ہے (یعنی چونکہ وہ اپنی ذات میں کامل ہے جو مدلول ہے حمید کا اس لئے وہ غنی ہے، اس کو کسی کے شک و شمار کی احتیاج نہیں، کہ اس میں استکمال بالآخر لازم آتا ہے اور چونکہ لقمان موصوف ہیں حکمت یعنی علم و عمل کے ساتھ، اس سے مفہوم ہوا کہ انھوں نے تعلیمِ شکر پر بھی شکر کیا ہوگا پس وہ شاکر بھی تھے اور شاکر ہونے سے ان کی حکمت میں ترقی بھی ہوئی ہوگی، پس وہ اعلیٰ درجہ کے حکیم ہوئے، اور (ایسے حکیم کی تعلیم ضرور قابلِ عمل ہونا چاہئے) سو ان کی تعلیمات ان لوگوں کے سامنے ذکر کیجئے، جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے

کہا کہ بیٹا خدا کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہرانا، بیشک شرک کرنا بڑا بھاری ظلم ہے (ظلم کی حقیقت علماء نے یہ بیان کی ہے کہ کسی چیز کو بے محل استعمال کیا جائے، اور یہ بات شرک میں سب سے زیادہ واضح ہے کہ پیدا کرنے والے کی جگہ بتوں کی پرستش کی جائے، اور درمیان قصہ کے امر توحید کی تاکید کے لئے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے کہ ان کی اطاعت اور خدمت کرے، کیونکہ انھوں نے اس کے لئے بڑی مشقتیں جھیلی ہیں بالخصوص ماں نے چنانچہ اُس کی ماں نے ضحمت پر ضحمت اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا، کیونکہ جوں جوں حمل بڑھتا جاتا ہے حاملہ کا ضعف بڑھتا جاتا ہے اور (پھر) دوبرس میں اس کا دودھ چھوڑتا ہے (ان دونوں میں بھی وہ ہر طرح کی خدمت کرتی ہے، اسی طرح اپنی حالت کے موافق باپ بھی مشقت اٹھاتا ہے، اس لئے ہم نے اپنے حقوق کے ساتھ ماں باپ کے حقوق ادا کرنے کا حکم فرمایا، چنانچہ یہ ارشاد کیا کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر (حق تعالیٰ کی شکر گزاری تو عبادت و اطاعت حقیقیہ کے ساتھ اور ماں باپ کی خدمت و ادائے حقوق شرعیہ کے ساتھ کیونکہ) میری ہی طرف (سب کو) لوٹ کر آنا ہے اس وقت میں اعمال کی جزاء و سزا دوں گا، اس لئے احکام کی بجا آوری ضروری ہے) اور باوجودیکہ ماں باپ کا اتنا بڑا حق ہے جیسا ابھی معلوم ہوا، لیکن امر توحید ایسا عظیم الشان ہے کہ اگر تجھ پر وہ دونوں (بھی) اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرائے جس کے شریک الوہیت ہونے کی تیرے پاس کوئی دلیل (اور سند) نہ ہو اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں کہ جس کے استحقاق شریکت پر کوئی دلیل قائم ہو بلکہ عدم استحقاق پر بہت سی دلیلیں قائم ہیں، پس مراد یہ ہوتی کہ اگر وہ کسی چیز کو بھی شریک الوہیت ٹھہرانے کا تجھ پر زور دیں تو تو ان کا کہنا نہ ماننا اور (ہاں یہ ضرور ہے کہ) دنیا کے حوائج و معاملات میں جیسے ان کے ضروری اخراجات اور خدمت وغیرہ، ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرنا اور دین کے بارے میں صرف اس (ہی) شخص کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع ہو یعنی میرے احکام کا معتقد اور عامل ہو) پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے پھر رانے کے وقت میں تم کو جتلا دوں گا جو جو کچھ تم کرتے تھے اس لئے کسی امر میں میرے حکم کے خلاف مت کرو... آگے پھر تکمیل ہے نصائح لقمانیہ کی کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو اور نصیحتیں بھی کہیں چنانچہ توحید و عقائد کے بارے میں یہ بھی نصیحت کی کہ (بیٹا) حق تعالیٰ کا علم اور قدرت اس درجہ ہے کہ اگر کسی کا کوئی عمل (کیسا ہی مخفی ہو، مثلاً فرض کرو کہ وہ) رانی کے دانہ کے

معارف و مسائل

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَنَ الْحِكْمَةَ، حضرت لقمان علیہ السلام، وہیب بن منبہہ کی روایت کے مطابق حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے، اور مقاتل نے ان کا خالہ زاد بھائی بتلایا ہے۔ اور تفسیر بیضاوی وغیرہ میں ہے کہ ان کی عمر دراز ہوئی، یہاں تک کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ پایا۔ یہ بات دوسری روایات سے بھی ثابت ہے کہ لقمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوئے ہیں۔ اور تفسیر درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ لقمان ایک حبشی غلام تھے، بخاری کا کام کرتے تھے (آخر جہ ابن ابی شیبہ و احمد فی الزمہ و ابن جریر و ابن المنذر وغیرہ) اور حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے ان کے حالات دریافت کئے گئے تو فرمایا کہ پست قد پست ناک کے حبشی تھے، اور مجاہدؓ نے فرمایا کہ حبشی غلام موٹے ہونٹ والے پھٹے ہوئے قدموں والے تھے (ابن کثیر)

ایک سیاہ رنگ حبشی حضرت سعید بن مسیبؓ کے پاس کوئی مسئلہ دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوا تو حضرت سعیدؓ نے اس کی تسلی کے لئے فرمایا کہ تم اپنے کام ہونے پر غم نہ کرو، کیونکہ کالے لوگوں میں تین بزرگ ایسے ہیں جو لوگوں میں سب سے بہتر تھے۔ حضرت بلال حبشیؓ، اور مجتبیٰؓ حضرت عمر بن خطابؓ کے آزاد کردہ غلام اور حضرت لقمان علیہ السلام۔

لقمان علیہ السلام جمہور سلف کے نزدیک ابن کثیر نے فرمایا کہ جمہور سلف کا اس پر اتفاق ہو نبی نہیں بلکہ ولی اور حکیم تھے کہ وہ نبی نہیں تھے، صرف حضرت عکرمہؓ سے ان کا نبی ہونا نقل کیا جاتا ہے، مگر اس کی سند ضعیف ہے۔ اور امام بغویؒ نے فرمایا کہ اس پر اتفاق ہے کہ وہ فقیہ اور حکیم تھے نبی نہیں تھے۔ (منظہری)

ابن کثیر نے فرمایا کہ حضرت قتادہؓ سے ان کے بارے میں ایک عجیب روایت یہ منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت لقمان کو اختیار دیا تھا کہ نبوت لے لیا حکمت انھوں نے حکمت کو اختیار کر لیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ان کو نبوت کا اختیار دیا گیا تھا، انھوں نے عرض کیا کہ اگر اس کے قبول کرنے کا حکم ہے تو میرے سر آنکھوں پر در نہ مجھے معاف فرمایا جائے۔

اور حضرت قتادہؓ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ لقمان علیہ السلام سے کسی نے

پوچھا کہ آپ نے حکمت کو نبوت پر کیوں ترجیح دی، جبکہ آپ کو دونوں کا اختیار دیا گیا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ نبوت بڑی ذمہ داری کا منصب ہے، اگر وہ مجھے بغیر میرے اختیار کے دے دیا جاتا تو حق تعالیٰ خود اس کی کفالت فرماتے کہ میں اس کے فرائض ادا کر سکوں اور اگر میں اپنے اختیار سے اس کو طلب کرتا تو ذمہ داری مجھ پر ہوتی (ابن کثیر)

اور جبکہ لقمان علیہ السلام کا نبی نہ ہونا جمہور کے نزدیک مسلم ہے، تو پھر ان کو وہ حکم جو قرآن میں مذکور ہے اِنْ اَشْكُرْ لِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمَ ہو سکتا ہے جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتا ہے۔ حضرت لقمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے شرعی مسائل میں لوگوں کو فتویٰ دیا کرتے تھے، جب داؤد علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی تو فتویٰ دینا چھوڑ دیا کہ اب میری ضرورت نہیں رہی۔ بعض روایات میں ہے کہ بنی اسرائیل کے قاضی تھے۔ حضرت لقمان علیہ السلام سے کلمات حکمت بہت منقول ہیں۔ وہاب بن منبہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت لقمان علیہ السلام کی حکمت کے دس ہزار سے زیادہ ابواب پڑھے ہیں۔ (قرطبی)

حضرت لقمان ایک روز ایک بڑی مجلس میں لوگوں کو حکمت کی باتیں سنا رہے تھے، ایک شخص آیا اور اس نے سوال کیا کہ کیا تم وہی نہیں جو میرے ساتھ فلاں جنگل میں بکریاں چرایا کرتے تھے؟ لقمان علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں میں وہی ہوں، اس شخص نے پوچھا کہ پھر آپ کو یہ مقام کیسے حاصل ہوا کہ خلق خدا آپ کی تعظیم کرتی ہے اور آپ کے کلمات سننے کے لئے دُور دور سے جمع ہوتی ہے۔ لقمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا سبب میرے دو کام ہیں ایک ہمیشہ سچ بولنا، دوسرے فضول باتوں سے اجتناب کرنا۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت لقمان نے فرمایا کہ چند کام ایسے ہیں جنہوں نے مجھے اس درجہ پر پہنچایا، اگر تم اختیار کرو تو تمہیں بھی یہی درجہ اور مقام حاصل ہو جائے گا۔ وہ کام یہ ہیں: اپنی نگاہ کو پست رکھنا اور زبان کو بند رکھنا، حلال روزی پر قناعت کرنا، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنا، بات میں سچائی پر قائم رہنا، عہد کو پورا کرنا، مہمان کا اکرام کرنا، پڑوسی کی حفاظت کرنا، اور فضول کام اور کلام کو چھوڑ دینا۔ (ابن کثیر)

حکمت جو لقمان علیہ السلام کو لفظ حکمت قرآن کریم میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا دی گئی اس سے کیا مراد ہے؟ ہر علم، عقل، حلم و بردباری، نبوت، اصابت رائے۔ البوحیان نے فرمایا کہ حکمت سے مراد وہ کلام ہے جس سے لوگ نصیحت حاصل کریں

اور ان کے دلوں میں موثر ہو اور جس کو لوگ محفوظ کر کے دوسروں تک پہنچائیں۔ اور ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حکمت سے مراد عقل و فہم اور ذہانت ہے۔ اور بعض حضرات

نے فرمایا کہ علم کے مطابق عمل کرنا حکمت ہے، اور درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں، یہ سبھی چیزیں حکمت میں داخل ہیں۔ اوپر خلاصہ تفسیر میں حکمت کا ترجمہ دانشمندی سے اور اس کی تفسیر علم باعمل سے کی گئی ہے یہ بہت جامع اور واضح ہے۔

آیت مذکورہ میں حضرت لقمان علیہ السلام کو حکمت عطا کرنے کا ذکر فرما کر آگے فرمایا ہے **اِنْ اَشْكُرْ لِي**، اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہاں **قُلْنَا** محذوف مانا جائے۔ مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے لقمان کو حکمت دی اور یہ حکم دیا کہ میرا شکر ادا کیا کرو، اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ **اِنْ اَشْكُرْ لِي** خود حکمت کی تفسیر ہے، یعنی وہ حکمت جو لقمان کو دی گئی ہے تھی کہ ہم نے اس کو شکر کا حکم دیا انھوں نے تعمیل کی۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر گزار ہونا سب سے بڑی حکمت ہے۔ اس کے بعد یہ بتلادیا کہ یہ شکر گزاری کا حکم ہم نے کچھ اپنے فائدہ کے لئے نہیں دیا، ہمیں کسی کے شکر کی حاجت نہیں، بلکہ یہ خود انہی کے فائدے کے لئے دیا ہے۔ کیونکہ ہمارا ضابطہ یہ ہے کہ جو شخص ہماری نعمت کا شکر ادا کرتا ہے ہم اس کی نعمت میں اور زیادتی کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد لقمان علیہ السلام کے کچھ کلمات حکمت کا ذکر فرمایا ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائے تھے، وہ کلمات حکمت قرآن کریم نے اس لئے نقل فرمائے کہ دوسرے لوگ بھی ان سے فائدہ اٹھائیں۔

ان کلمات حکمت میں سب سے اڈل تو عقائد کی درستی ہے، اور ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو سارے عالم کا خالق و مالک بلا شرکت غیرے یقین کرے، اس کے ساتھ کسی غیر اللہ کو شریک عبادت نہ کرے کہ اس دنیا میں اس سے بڑا بھاری ظلم کوئی نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ کی کسی مخلوق کو خالق کے برابر ٹھہرائے، اس لئے فرمایا **يَبْنِيْ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ**، آگے حضرت لقمان کی دوسری نصائح اور کلمات حکمت آئے ہیں جو اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے فرمائے تھے۔ درمیان میں حق تعالیٰ نے شرک کے ظلم عظیم ہونے اور کسی حال اس کے پاس نہ جانے کی ہدایات کے لئے ایک اور حکم ارشاد فرمایا:

والدین کی شکر گزاری اور اطاعت کہ اگرچہ ہم نے اولاد کو اپنے ماں باپ کی اطاعت اور شکر گزاری فرض ہے، مگر حکم الہی کے خلاف کسی کی بڑی تاکید کی ہے، اور اپنی شکر گزاری و اطاعت کے ساتھ والدین کی شکر گزاری اور اطاعت کا حکم دیا ہے لیکن

شرک ایسا ظلم عظیم اور سنگین جرم ہے کہ وہ ماں باپ کے کہنے سے اور مجبور کرنے سے بھی کسی کے لئے جائز نہیں ہوتا، اگر کسی کو اس کے والدین اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو

شریک قرار دینے پر مجبور کرنے لگیں تو اس معاملہ میں والدین کا کہنا بھی ماننا جائز نہیں۔ اور یہاں جبکہ والدین کے حقوق اور ان کی مستکرگزارمی کا حکم دیا گیا تو اس کی حکمت یہ بتلا دی کہ اس کی ماں نے اس کے وجود و بقاء میں بڑی محنت برداشت کی ہے، کہ تو جہینے تو اس کو اپنے شکم میں رکھ کر اس کی حفاظت کی اور اس کی وجہ سے جو روز بروز اس کو ضعف پر ضعف اور تکلیف پر تکلیف بڑھتی گئی... اس کو برداشت کیا، پھر اس کے پیدا ہونے کے بعد بھی دو سال تک اس کو دودھ پلانے کی زحمت برداشت کی جس میں ماں کو خاصی محنت بھی شب و روز اٹھانی پڑتی ہے، اور اس کا ضعف بھی اس سے بڑھتا ہے، اور چونکہ بچے کی پرورش میں محنت و مشقت زیادہ ماں اٹھاتی ہے، اس لئے شریعت میں ماں کا حق باپ کے بھی مقدم رکھا گیا ہے، وَصَيَّنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ وَفِصْلُهُ فِیْ عَامَيْنِ کَايِهِ مَطْلَب ہے اور اس کے بعد وَانْجَاهْدَاکَ میں یہ بتلایا ہے کہ غیر اللہ کو اللہ کے ساتھ شریک کرنے کے معاملہ میں والدین کی اطاعت بھی حرام ہے۔ اسلام کا بے نظیر قانون عدل | اور ایسی صورت میں کہ ماں باپ اس کو شرک و کفر پر مجبور کریں اور اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہو کہ ان کی بات نہ مانو، تو طبعی طور پر انسان حد پر قائم نہیں رہتا۔ اس پر عمل کرنے میں اس کا امکان تھا کہ بیٹا والدین کے ساتھ بدکلامی یا بدخونی سے پیش آئے ان کی توہین کرے۔ اسلام ایک قانون عدل ہے، ہر چیز کی ایک حد ہے، اس لئے شرک میں والدین کی اطاعت نہ کرنے کے حکم کے ساتھ ہی یہ حکم بھی دیدیا کہ:

مَا جِئْتُمَا فِی الدِّیْنِ مَعْرُوفًا، یعنی دین میں تو تم ان کا کہنا نہ مانو، مگر دنیا کے کاموں میں مثلاً ان کی جسمانی خدمت یا مالی اخراجات وغیرہ اس میں کمی نہ ہونے دو، بلکہ دنیوی معاملات میں اس کے عام دستور کے مطابق معاملہ کرو ان کی بے ادبی نہ کرو، انکی بات کا جواب ایسا نہ دو جس سے بلا ضرورت دل آزاری ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے شرک و کفر کے معاملہ میں نہ ماننے سے جو ان کی دل آزاری ہوگی وہ تو مجبوری کے لئے برداشت کرو، مگر ضرورت کو ضرورت کی حد میں رکھو، دوسرے معاملات میں ان کی دل آزاری سے پرہیز کرتے رہو۔

فَاعْلَمْ کہ اس آیت میں جو بچے کے دودھ چھڑانے کی مدت دو سال بتلائی گئی ہے، یہ عام عادت کے مطابق ہے۔ اس میں اس کی کوئی تشریح و تصریح نہیں کہ اس سے زیادہ مدت تک دودھ پلایا جائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ اس مسئلہ کی تشریح سورۃ احقاف کی آیت وَحَمَلَتْهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا کے تحت میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گی۔

دوسری وصیت لقمانی یہ ہے کہ اس کا اعتقاد جازم رکھا جائے کہ آسمان و زمین اور ان کے اندر جو کچھ ہے اس کے ایک ایک ذرہ پر اللہ تعالیٰ کا علم بھی محیط اور وسیع متعلقہ عفت اند ہے اور سب پر اس کی قدرت بھی کامل ہے۔ کوئی چیز کتنی ہی چھوٹی سے چھوٹی ہو جو عام نظروں میں نہ آسکتی ہو اسی طرح کوئی چیز کتنی ہی دور دراز پر ہو اسی طرح کوئی چیز کتنی ہی اندھیروں اور پردوں میں ہو اللہ تعالیٰ کے علم و نظر سے نہیں چھپ سکتی، اور وہ جس کو جب چاہیں جہاں چاہیں حاضر کر سکتے ہیں۔ **يَكُنْ لَهُ الْبَاقِيَ انْ تَكُنْ يَتَقَالِ حَبَّتٍ مِّنْ حَوْذِلٍ** الایۃ کا یہی مطلب ہے۔ اور حق تعالیٰ کے علم و قدرت کا ہر چیز پر محیط ہونا خود بھی اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور عقیدہ توحید کی بہت بڑی دلیل ہے۔

تیسری وصیت لقمانی اعمال واجبہ تو بہت ہیں مگر ان سب میں سب سے بڑا اور اہم عمل نماز متعلقہ اصلاح عمل ہے، اور خود اہم ہونے کے ساتھ وہ دوسرے اعمال کی درستی کا ذریعہ بھی ہے۔ جیسا کہ نماز کے بارے میں ارشادِ باری ہے **اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ** اس لئے اعمالِ صالحہ واجبہ میں سے نماز کے ذکر پر اکتفاء فرمایا **يَكُنْ اَقِمِ الصَّلٰوةَ** یعنی اے میرے بیٹے نماز کو قائم کرو۔ اور جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم صرف نماز پڑھ لینا نہیں بلکہ اس کے تمام ارکان و آداب کو پوری طرح بجالانا اس کے اوقات کی پابندی کرنا اور اس پر مداومت کرنا سب اقامتِ صلوٰۃ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

چوتھی وصیت لقمانی اسلام ایک جماعی دین ہے، فرد کی اصلاح کے ساتھ جماعت کی اصلاح اس نظام کا اہم جزو ہے اس متعلقہ اصلاح خلق نماز جیسے اہم فریضہ کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ذکر فرمایا گیا کہ لوگوں کو نیک کاموں کی دعوت دو اور برے کاموں سے روکو **وَاذْكُرْ اَنْ تَقْرٰۤى وَفِیْ وَاٰتِیْهِ عَنِ الشُّكْرِ** یہ دو فریضے ہیں ایک اپنی اصلاح اور دوسرا عام مخلوق کی اصلاح۔ دونوں ایسے ہیں کہ دونوں کی پابندی میں خاصی مشقت و محنت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اس پر ثابت قدم رہنا آسان نہیں، خصوصاً اصلاحِ خلق کے لئے امر بالمعروف کی خدمت کا صلہ دنیا میں ہمیشہ عداوتوں اور مخالفتوں سے ملا کرتا ہے۔ اس لئے اس وصیت کے ساتھ ہی یہ وصیت بھی فرمائی کہ **وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِّنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ**، یعنی ان کاموں میں نہیں جو کچھ تکلیف پیش آئے اس پر صبر و ثبات سے کام لو۔

پانچویں وصیت لقمانی **وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ**، لا تُصَعِّرْ، صَعَّرَ سے مشتق ہے جو اونٹ کی ایک بیماری ہے جس سے اس کی گردن مڑ جاتی ہے، جیسے متعلقہ آداب معاشر

انسانوں میں لقوہ معروف بیماری ہے جس سے چہرہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے، مراد اس سے رخ پھیر لینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی ملاقات اور گفتگو میں ان سے منہ پھیر کر گفتگو نہ کر دو جو ان سے اعراض کرنے اور تکبر کرنے کی علامت ہو اور اخلاق شریفانہ کے خلاف ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا، مَرَحٌ اکرط کر، اتر کر چلنا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے سارے عناصر سے پست افتادہ بنایا ہے تم اسی سے پیدا ہوئے اسی پر چلتے پھرتے ہو اپنی حقیقت کو پہچاننا اتر کر نہ چلو جو متکبر بن کا طریقہ ہے۔ اسی لئے اس کے بعد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ، یعنی اللہ نہیں پسند کرتا کسی متکبر فخر کرنے والے کو۔ وَاَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ، یعنی اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو، نہ بہت دوڑ بھاگ کر چلو، کہ وہ وقار کے خلاف ہے۔ حدیث میں ہے کہ چلنے میں بہت جلدی کرنا مومن کی رونق ضائع کر دیتا ہے۔ (جامع صغیر عن ابی ہریرۃ) اور اس طرح چلنے میں خود اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو تکلیف بھی پہنچنے کا خطرہ رہتا ہے۔ اور نہ بہت آہستہ چلو، جو یا تو ان تکبر اور تصنع کرنے والوں کی عادت ہو جو لوگوں پر اپنا امتیاز جتاننا چاہتے ہیں، یا عورتوں کی عادت ہے جو شرم و حیا کی وجہ سے تیز نہیں چلتیں، یا پھر بیماروں کی عادت ہو جو اس پر مجبور ہیں۔ پہلی صورت حرام اور دوسری بھی اگر عورتوں کی مشابہت پیدا کرنے کے قصد سے ہو تو ناجائز ہے اور یہ قصد نہ ہو تو پھر مردوں کے لئے ایک عیب ہے۔ اور تیسری صورت میں اللہ کی ناشکری ہے، کہ تندرستی کے باوجود بیماروں کی ہیئت بنائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ صحابہ کرام کو یہود کی طرح دوڑنے سے بھی منع کیا جاتا تھا، اور نصاریٰ کی طرح بہت آہستہ چلنے سے بھی۔ اور حکم یہ تھا کہ ان دونوں چالوں کی درمیانی چال اختیار کرو۔

حضرت عائشہؓ نے کسی شخص کو بہت آہستہ چلتے دیکھا جیسے ابھی مرجائے گا تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ ایسے کیوں چلتا ہے؟ لوگوں نے بتلایا کہ یہ قسار میں سے ہے۔ قسار، قاری کی جمع ہے، اس زمانے میں قاری اس کو بھی کہا جاتا تھا جو تلاوت قرآن کی صحت و آداب کے ساتھ قرآن کا عالم بھی ہو۔ مطلب یہ تھا کہ یہ کوئی بڑا قاری عالم ہے، اس لئے ایسا چلتا ہے۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ عمر بن خطابؓ اس سے زیادہ قاری تھے، مگر ان کی عادت یہ تھی کہ جب چلتے تو تیز چلتے تھے (مراد وہ تیزی نہیں جس کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ اس کے بالمقابل تیزی ہے) اور جب وہ کلام کرتے تھے تو اس طرح کہ لوگ اچھی طرح سن لیں (ایسی پست آواز نہ ہوتی تھی کہ سننے والوں کو پوچھنا پڑے کہ کیا فرمایا)۔

وَ اَخْصَصْ مِنْ صَوْتِكَ، یعنی آواز کو پست کرو، "مراد پست کرنے سے یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ بلند آواز نہ نکالو، اور شور نہ کرو۔ جیسا کہ ابھی حضرت فاروق اعظمؓ کے متعلق گذرا کہ کلام ایسا کرتے تھے کہ حاضرین سن لیں، انھیں سننے میں تکلیف نہ ہو۔ اس کے بعد فرمایا اِنَّ اَنْكَرَ اَلْاَصْوَاتِ اَلْحَمِيْرُ، یعنی چو پاؤں میں سب سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی ہے جو بہت شور کرتا ہے۔"

یہاں آداب معاشرت میں چار چیزیں ذکر کی گئی ہیں: اَدَل لوگوں سے گفتگو اور ملاقات میں متکبرانہ انداز سے رُخ پھیر کر بات کرنے کی ممانعت، دوسرے زمین پر اترا کر چلنے کی ممانعت، تیسرے درمیانی چال چلنے کی ہدایت، چوتھے بہت زور سے شور مچا کر بولنے کی ممانعت۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات و شمائل میں یہ سب چیزیں جمع تھیں۔ شمائل ترمذی میں حضرت حسینؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنے والد علی مرتضیٰؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کے ساتھ بیٹھتے تھے تو آپس میں آپ کا کیا طرز ہوتا تھا؟ انھوں نے فرمایا:

كَانَ دَائِمًا الْبَشَرُ سَهْلًا يَخْلُقُ لَيْنَ الْجَانِبِ لَيْسَ بِفَخٍ وَلَا غَلِيظَ وَلَا صَخَابَ فِي الْأَسْوَاقِ وَلَا فَحَّاشٍ وَلَا عِيَابٍ وَلَا مُشَاحٍ يَتَغَافَلُ عَمَّا لَا يَشْتَمِي وَلَا يُؤَلِّسُ مِنْهُ وَلَا يَجِيبُ فِيهِ قَدْ تَرَكَ نَفْسَهُ مِنْ ثَلَاثِ الْمَرَاءِ وَالْأَكْبَارِ وَمَا لَا يُعْذِيهِ،

"کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ خوش خرم معلوم ہوتے تھے آپ کے اخلاق میں نرمی اور برتاؤ میں سہولت مندی تھی، آپ کی طبیعت سخت نہ تھی، بات بھی درشت نہ تھی، آپ نہ شور مچانے والے تھے نہ فحش گو تھے، نہ کسی کو عیب لگاتے تھے، نہ بخل کرتے تھے، جو چیز دل کو نہ بھاتی اس کی جانب سے غفلت

برتتے تھے (مگر) دوسرے کو اس کی طرف سے ناامید بھی نہ کرتے تھے، اگر حلال ہو اور اس کی رغبت ہو، اور جو چیز اپنی مرغوب نہ ہو دوسرے کے حق میں اس کی کاٹ نہ کرتے تھے، (بلکہ خاموشی اختیار فرماتے تھے) تین چیزیں آپ نے بالکل چھوڑ رکھی تھیں (۱) جھگڑنا (۲) تکبر کرنا (۳) جو چیز کام کی نہ ہو اس میں مشغول ہونا۔"

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مِمَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کام میں لگا دیے جو کچھ ہو آسمان اور زمین میں

وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَن

اور پوری کر دیں تم پر اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی، اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں

يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ۝۲۰ وَإِذَا

جو جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں نہ سمجھ رکھیں نہ سوجھ اور نہ روشن کتاب - اور جب

قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

ان کو کہتے چلو اس حکم پر جو اتارا اللہ نے کہیں نہیں ہم تو چلیں گے اس پر جس پر پایا ہم نے

آبَاءَنَا وَإِنَّا لَفِي سُلُوكِهِمْ يَدْعُوهُمْ إِلَى عَدُوِّ اللَّهِ وَالشَّيْطَانِ يَدْعُوهُمْ إِلَى عَدُوِّ اللَّهِ ۝۲۱

اپنے باپ دادوں کو بھلا اور جو شیطان بلاتا ہو ان کو دوزخ کی طرف تو بھی ۹

وَمَن يَسْلَمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ

اور جو کوئی تابع کرے اپنا منہ اللہ کی طرف اور وہ ہونیکے پر سوا اس نے پکڑ لیا

بِالْعَصَا وَالْوُثْقِ ۝۲۲ وَإِلَى اللَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝۲۳ وَمَن كَفَرَ

مضبوط کڑا اور اللہ کی طرف ہے آخر ہر کام کا - اور جو کوئی منکر ہوا

فَلَا يَحْزَنُكَ كُفْرُ هَٰؤُلَاءِ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا ۝۲۴

تو تو غم نہ کھا اس کے انکار سے ہماری طرف پھر آنا ہو ان کو پھر ہم بتلا دیں گے انکو جو انھوں نے کیا ہو

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝۲۵ نَسْتَعْتِبُكَ قَلِيلًا ۝۲۶

البتہ اللہ جانتا ہی جو بات ہے دلوں میں - کام چلا دیں گے ہم ان کا تھوڑے دنوں پھر

نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ غَلِيظٍ ۝۲۷ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ

پکڑ بلاتیں گے ان کو گھاڑھے عذاب میں - اور اگر تو پوچھے ان سے کس نے بنائے

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ

آسمان اور زمین تو کہیں اللہ تعالیٰ نے، تو کہہ سب خوبی اللہ کو ہر پردہ بہت

لَا يَعْلَمُونَ ۝۲۸ يٰۤاَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۝۲۹ إِنَّ اللَّهَ هُوَ

لوگ سمجھ نہیں رکھتے - اللہ کا ہی جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں بیشک اللہ وہی ہی

الْغَنَى الْحَسِيدُ ۲۶) وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ

بے پروا سب خوبیوں والا۔ اور اگر جتنے درخت ہیں زمین میں قلم ہوں

وَالْبَحْرِ يَسُّدُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ

اور سمندر ہو اس کی سیاہی اس کے پیچھے سات سمندر نہ تمام ہوں باتیں اللہ کی

إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۲۷) مَا خَلَقَكُمْ وَلَا بَعَثَكُمْ إِلَّا كُنُفُسٍ

بے شک اللہ زبردست ہر حکمتوں والا۔ تم سب کا بنانا اور مرنے پیچھے جلانا ایسا ہی ہے جیسا

وَاحِدَةٍ ط إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ۲۸) أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُولِجُ

ایک جی کا، بیشک اللہ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے۔ تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ داخل کرتا ہے

الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور کام میں لگا دیا ہے سورج اور چاند کو

كُلٌّ يَجْرِي إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى وَأَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۲۹)

ہر ایک چلتا ہے ایک مقرر وقت تک اور یہ کہ اللہ خبر رکھتا ہے اس کی جو تم کرتے ہو۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الْبَاطِلُ

یہ اس لئے کہ اللہ وہی ہے ٹھیک اور جس کسی کو پکارتے ہیں سوا اس کے سو وہی جھوٹ ہے،

وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ۳۰) أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي

اور اللہ وہی ہے سب سے اوپر بڑا۔ تو نے نہ دیکھا کہ جہاز چلتے ہیں سمندر

فِي الْبَحْرِ يَنْعَمَتِ اللَّهُ لِيُرِيَكُمْ مِنْ آيَاتِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ

میں اللہ کی نعمت لے کر تاکہ دکھلاؤ تم کو کچھ اپنی قدرتیں البتہ اس میں نشانیاں

تَكُلُّ صَبَاِيرُ شَكُورٍ ۳۱) وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَوَّجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوْا

ہیں ہر ایک کھل کر نیوالے احسان ماننے والے کے واسطے، اور جب سر پر آئے ان کے موج جیسے بادل

اللَّهُ مُخْلِصِينَ لَهُمُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ

بیکار فنے لگیں اللہ کو خالص کر کر اسی کے لئے زندگی، پھر جب بچا دیا ان کو جنگل کی طرف تو کوئی ہوتا ہے انہیں

مُقْتَصِدٌ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ غَفُورٍ ۝۳۲

نیچ کی چال پرہ اور منکر وہی ہوتے ہیں ہماری قدرتوں کے جو قول کے جھوٹے ہیں حق نہ مانتے والے۔

خلاصہ تفسیر

کیا تم لوگوں کو (مشاہدہ و دلائل سے) یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو (بواسطہ یا بلاواسطہ) تمہارے کام میں لگا رکھا ہے جو کچھ آسمانوں میں (موجود) ہیں اور جو کچھ زمین میں (موجود) ہیں اور اس نے تم پر اپنی نعمتیں ظاہری اور باطنی پوری کر رکھی ہیں (ظاہری وہ کہ آنکھ کان وغیرہ سے معلوم ہوں اور باطنی وہ جو کہ عقل سے سمجھی جاتیں) اور مراد نعمتوں سے وہ نعمتیں ہیں جو تسخیر سموات و ارض پر مرتب ہوتی ہیں پس اس سے سب مخاطبین کا مشرف باسلام ہونا لازم نہیں آتا اور باوجودیکہ (اس دلیل سے توحید ثابت ہوتی ہے مگر) بعض آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں (یعنی اس کی توحید میں) بدون واقفیت (یعنی علم ضروری) اور بدون دلیل (یعنی علم استدلال عقلی) اور بدون کسی دشمن کتاب (یعنی علم استدلال نقلی) کے جھگڑا کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کا اتباع کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے (یعنی حق کو ثابت کرنے والے دلائل میں غور کر کے ان کا اتباع کرو) تو (جواب میں) کہتے ہیں کہ (ہم اس کا اتباع نہیں کرتے) ہم (تو) اسی کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا ہے، (آگے ان پر رد ہو کہ) کیا اگر شیطان ان کے بڑوں کو عذاب و دوزخ کی طرف (یعنی مگر اہی کی طرف جو کہ سبب ہے عذاب و دوزخ کا) بلاتا رہا ہو تب بھی (انہی کا اتباع کریں گے) مطلب یہ کہ ایسے معاند ہیں کہ یا وجود اس کے کہ ان کو دلیل کی طرف بلایا جاتا ہے مگر پھر بھی بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل محض گمراہ باپ دادا کی راہ پر چلتے ہیں یہ حالت تو اہل ضلالت کی ہوتی) اور جو شخص (حق کا اتباع کر کے) اپنا رخ اللہ کی طرف ٹھکانے (یعنی فرمانبرداری اختیار کر کے) عقائد میں بھی اعمال میں بھی، مراد اسلام و توحید ہے) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو (یعنی محض ظاہری اسلام نہ ہو) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا (یعنی وہ اس شخص کے مشابہ ہو گیا جو کسی مضبوط رشتی کا حلقہ ہاتھ میں تھام کر گرنے مامون رہتا ہے، اسی طرح یہ شخص ہلاکت و خسران سے محفوظ ہو گیا) اور آخر سب کاموں کا انجام اللہ ہی کی طرف پہنچے گا پس یہ اعمال یعنی اتباع باطل و اتباع حق بھی اسی کے حضور میں پیش

ہوں گے، پس وہ ہر ایک کو مناسب جزاء و سزا دے گا، اور جو شخص (حق کو ثابت کرنے والے دلائل کے باوجود) کفر کرے سو آپ کے لئے اس کا کفر باعثِ غم نہ ہونا چاہئے، (یعنی آپ غم نہ کریں) ان سب کو ہمارے ہی پاس لوٹنا ہے سو ہم ان سب کو جتلا دیں گے جو جو کچھ وہ (دنیا میں) کیا کرتے تھے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ کو (تو) دلوں کی باتیں (تک) خوب معلوم ہیں (تو ظاہری اعمال کا معاملہ ظاہر ہے، پس ہم سے کوئی امر مخفی نہیں سب جتلا دیں گے اور مناسب سزا دیں گے، اس لئے آپ کچھ غم نہ کریں اور یہ لوگ اگر محض چند روزہ عیش پر بھول رہے ہیں تو ان کی بڑی غلطی ہے، کیونکہ یہ دائمی نہیں بلکہ) ہم ان کو چند روزہ عیش دیئے ہوئے ہیں پھر ان کو کشاں کشاں ایک سخت عذاب کی طرف لے آ دیں گے (پس اس پر ناز کرنا جہالت ہی) اور رہم جس توحید کی طرف ان کو بلا رہے ہیں اس کے مقدمات کو خود یہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر اس سے صحیح نتیجہ تک پہنچنے کا کام نہیں لیتے چنانچہ) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے (اس پر) آپ کہتے کہ الحمد للہ (جو مقدمہ مہتمم بالشان تھا وہ تو تھا لے اعتراف سے ثابت ہوا اولہ دوسرا مقدمہ نہایت ہی ظاہر ہے کہ جو خود مخلوق و مصنوع ہو وہ مستحق عبادت نہیں پس مطلوب ثابت ہو گیا، مگر یہ لوگ مطلوب کو نہیں مانتے) بلکہ ان میں اکثر (تو مجموعہ مقدمات کو بھی) نہیں جانتے (چنانچہ دوسرے مقدمہ جلیہ کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے کہ معبود ہونا صرف خالق کا حق ہے اور اللہ کی وہ شان ہے کہ) جو کچھ آسمان و زمین میں موجود ہے سب اللہ ہی کا (مملوک) ہے (پس سلطنت تو ان کی ایسی) اور بیشک اللہ تعالیٰ (خود اپنی ذات میں بھی) بے نیاز (اور) سب خوبیوں والا ہے (پس سزا دینا کو ہیبت دہی ہے) اور اس کی خوبیاں اس کثرت سے ہیں کہ) جتنے درخت زمین بھر میں ہیں اگر وہ سب قلم بن جائیں (یعنی معارف قلم کے برابر ان کے اجزاء کے قلم بنائے جائیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح ایک ایک درخت میں ہزاروں قلم تیار ہوں) اور یہ جو سمندر ہے اس کے علاوہ سات سمندر (روشنائی کی جگہ) اس میں اور شامل ہو جائیں (اور پھر ان قلموں اور اس روشنائی سے حق تعالیٰ کے کمالات لکھنا شروع کریں) تو (سب) روشنائی ختم ہو جائیں اور، اللہ کی باتیں (یعنی وہ کلمات جن سے اللہ تعالیٰ کے کمالات کی حکایت ہوتی ہو) ختم نہ ہوں، بیشک خدا تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے (کہ وہ قدرت میں بھی کامل ہے اور علم میں بھی) اور یہ دونوں صفتیں چونکہ تمام صفات و افعال سے تعلق رکھتی ہیں، شاید اس لئے بعد عموم کے ان کو خصوصاً بیان فرمادیا، اور اس کمالی صفت قدرت کی ایک فرع عالم

آخرت بھی ہے، جس کو بد فہم دشوار سمجھ رہے ہیں، حالانکہ وہ ایسا قادر ہے کہ (تم سب کا) پہلی بار (پیدا کرنا اور (دوسری بار) زندہ کرنا (اس کے نزدیک) بس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کا (پیدا کرنا اور زندہ کرنا۔ گویا ہاں مقصود قرینہ مقام سے بعث کا ذکر فرمانا ہے، لیکن ذکر خلق سے استدلال اور قوی ہو گیا ہے) بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا اور سب کچھ دیکھتا ہے، (پس جو لوگ باوجود ان دلائل کے قیامت کا انکار کر رہے ہیں اور اس جرأت پر فسق و فجور کرتے ہیں ان سب کو سُن رہا ہے دیکھ رہا ہے ان کو سزا دے گا، آگے پھر توحید کا بیان ہی، کہ) اے مخاطب کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ رات کے (جزائر) کو دن میں اور دن کے (جزائر) کو رات میں داخل کر دیتا ہے، اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے کہ ہر ایک مقررہ وقت تک (یعنی قیامت تک) چلتا رہے گا اور (کیا تجھ کو) یہ (معلوم نہیں) کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب عملوں کی پوری خبر رکھتا ہے (پس اس کمال علمی و عقلی کا مقتضی یہ ہے کہ شرک چھوڑ دیا جائے، اور اوپر جو ان افعال مذکورہ کا اختصاص حق تعالیٰ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، یہ (اختصاص) اس سبب سے ہے کہ اللہ ہی سب میں کامل (اور واجب الوجود) ہے اور جن چیزوں کی اللہ کے سوا یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں بالکل ہی لچر ہیں اور اللہ ہی عالی شان اور (سب سے) بڑا ہے اس لئے یہ سب تصرفات اسی کے لئے مختص ہیں، البتہ اگر دوسرے موجودات باطل اور فانی اور ممکن نہ ہوتے، بلکہ نعوذ باللہ کوئی اور بھی واجب الوجود ہوتا تو پھر یہ تصرفات حق تعالیٰ کے ساتھ مختص نہ ہوتے، چنانچہ ظاہر ہے)۔

اے مخاطب کیا تجھ کو (توحید کی) یہ (دلیل) معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے فضل سے کشتی دریا میں چلتی ہے تاکہ تم کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھلا دے (چنانچہ ہر ممکن کا وجود اپنے پیدا کرنے والے کے وجود کی دلیل ہے، اسی طور پر) اس میں (بھی قدرت کی) نشانیاں ہیں ہر ایسے شخص کے لئے جو صابر و شاکر ہو (مراد اس سے مؤمن ہے کہ صبر و شکر میں کامل ہونا اسی کی صفت ہے، نیز صبر و شکر محرک ہے تذکر و تدبیر عالم کو اور استدلال کے لئے تذکر و تفکر ضروری ہے، اسی لئے یہ دونوں وصف یہاں مناسب ہوئے بالخصوص کشتی کی حالت کے اعتبار سے کہ موجوں کا اٹھنا محل صبر ہے، اور بسلاامت کنارہ پر جا لگنا محل شکر ہے، پس جو لوگ ان سب واقعات میں فکر کرتے رہتے ہیں استدلال کی توفیق انہی کو ہوتی ہے) اور (جیسا ادب پر آیت وَلَیُّنَّ سَاءَ لَکُم مَّوَدِّعَاتُ دَلِیلِ کا اعتراف ان کفار کی طرف سے ثابت ہے، بعض اوقات خود نتیجہ دلیل یعنی توحید کا بھی

اعتراف کرتے ہیں جس سے توحید خوب ہی واضح ہو گئی، چنانچہ جب ان لوگوں کو وہیں سائبانوں (یعنی بادلوں) کی طرح (محیط ہو کر) گھیر لیتی ہیں تو وہ خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں، پھر جب ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے، سو بعض تو ان میں اعتدال پر رہتے ہیں (یعنی کبھی شرک کو چھوڑ کر توحید کو جو کہ اعدل الطرق ہے اختیار کر لیتے ہیں) اور (بعض پھر ہماری آیتوں کے منکر ہو جاتے ہیں اور ہماری آیتوں کے بس وہی لوگ منکر ہوتے ہیں جو بد عہد اور ناشکرے ہیں) کہ کشتی میں جو عہد توحید کا کیا تھا اس کو توڑ دیا اور خشکی میں آنے کا مقتضی تھا شکر کرنا اس کو چھوڑ دیا۔

معارف و مسائل

شروع سورۃ میں کفار و مشرکین کو اس پر تنبیہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے علم محیط اور قدرت مطلقہ کے مظاہر دیکھنے کے باوجود یہ لوگ اپنے کفر و شرک پر مصر ہیں، اور ان کے بالمقابل اطاعت شعار مومنین کی مدح اور ان کے انجام خیر کا ذکر تھا۔ درمیان میں حضرت لقمان علیہ السلام کی وصایا کا ذکر بھی ایک حیثیت سے انہی مضامین کی تکمیل تھی۔ آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ کے علم و قدرت کے محیط ہونے اور مخلوق پر اس کے انعامات و احسانات کا ذکر کر کے پھر توحید کی طرف دعوت ہے۔

سَخَّرَ لَكُم مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ، یعنی مسخر کر دیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ مسخر کرنے کے مشہور معنی کسی چیز کو کسی کے تابع فرمان بنادینے کے ہیں۔ یہاں اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اول تو زمین کی سب چیزیں بھی انسان کے تابع فرمان نہیں۔ بلکہ بہت سی چیزیں اس کے مزاج کے خلاف کام کرتی ہیں۔ خصوصاً جو چیزیں آسمانوں میں ہیں ان میں تو انسان کے تابع فرمان ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں۔ جواب یہ ہے کہ دراصل تسخیر کے معنی کسی چیز کو زبردستی کسی خاص کام میں لگا دینا اور اس پر مجبور کر دینا ہے۔ آسمان و زمین کی سب مخلوقات کو انسان کے لئے مسخر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام مخلوقات کو انسان کی خدمت اور نفع رسانی میں لگا دیا۔ ان میں بہت سی چیزوں کو تو اس طرح خدمت میں لگایا کہ ان کو انسان کا تابع فرمان بھی بنا دیا وہ جس وقت جس طرح چاہے ان کو استعمال کرتا ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو انسان کے کام میں لگا دیا گیا ہے کہ وہ انسان کی خدمت میں لگی ہوتی ہیں، مگر

بتقاضائے حکمت ربانی ان کو انسان کے تالیج نہیں بنایا گیا، جیسا کہ آسمانی مخلوق اور سیارات اور برق و باران وغیرہ کہ ان کو انسان کے حکم کا تالیج بنا دیا جاتا تو انسانوں کی طبائع اور مزاجوں اور حالات کے اختلافات کا ان پر اثر پڑتا۔ ایک انسان چاہتا کہ آفتاب جلدی طلوع ہو جائے دوسرے کی ضرورت اس پر موقوف ہوتی کہ اس میں دیر لگے، ایک شخص بارش مانگتا دوسرا سفر میں ہے کھلے میدان میں ہے وہ چاہتا کہ بارش نہ ہو۔ تو یہ متضاد تقاضے آسمانی کائنات کے عمل میں تضاد اور خلل پیدا کرتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کو انسان کی خدمت میں لگا دیا مگر اس کا تالیج حکم نہیں بنایا یہ بھی ایک قسم کی تسخیر ہی ہے۔ واللہ اعلم
وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ ذِخْرَهُ ظَاهِرَهُ وَبَاطِنَهُ، اسباق کے معنی مکمل کرنے کے ہیں
معنی یہ ہیں کہ مکمل کر دیا اللہ تعالیٰ نے تم پر اپنی ظاہری نعمتوں کو اور باطنی نعمتوں کو۔ ظاہری نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو انسان اپنے حواس خمسہ سے محسوس اور معلوم کر لیتا ہے، مثلاً حسن صورت، اعضاءے انسانی کا اعتدال اور ہر عضو کو ایسے تناسب سے بنانا جو انسان کے عمل میں زیادہ سے زیادہ معین بھی ہو اور اس کی شکل و صورت کو بھی نہ بگاڑے۔ اسی طرح رزق مال و دولت، اسباب معیشت، تندرستی اور عافیت یہ سب ظاہری نعمتیں اور محسوس نعمتیں ہیں۔ اسی طرح دین اسلام کو سہل کر دینا اور اللہ و رسولؐ کی اطاعت کی توفیق ہونا اور اسلام کا دوسرے ادیان پر غالب آنا اور دشمنوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد ہونا بھی انہی نعمائے ظاہرہ میں داخل ہیں۔ اور باطنی نعمتیں وہ ہیں جو انسان کے قلب سے متعلق ہوں، جیسے ایمان اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور علم و عقل، حسن اخلاق، گناہوں کی پردہ پوشی، اور جرائم پر فوری سزا نہ ملنا وغیرہ ہیں۔

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ، اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی معلومات اور اپنی قدرت کے تصرفات اور اپنی نعمتوں کی ایک مثال دی ہے کہ وہ غیر متناہی ہیں۔ نہ کسی زبان سے وہ سب ادا ہو سکتے ہیں نہ کسی قلم سے سب کو لکھا جاسکتا ہے۔ مثال یہ فرمائی کہ ساری زمین میں جتنے درخت ہیں اگر ان کی سب شاخوں کے قلم بنائے جائیں اور ان کے لکھنے کے لئے سمندر کو روشنائی بنا دیا جائے اور یہ سب قلم حق تعالیٰ کی معلومات اور تصرفات قدرت کو لکھنا شروع کریں تو سمندر ختم ہو جائے گا اور معلومات و تصرفات ختم نہ ہوں گے۔ اور ایک سمندر نہیں اس جیسے سات سمندر اور بھی شامل کر دیئے جائیں، جب بھی سب سمندر ختم ہو جائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ کلمات اللہ سے مراد اس کے علم و حکمت کے کلمات ہیں (روح و منہری) اور شیون قدرت اور

نعمائے الہیہ بھی اس میں داخل ہیں۔ اور سات سمندر سے مطلب یہ نہیں کہ کہیں سات سمندر موجود ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ ایک سمندر کے ساتھ فرض کر لو اور سات سمندر مل جائیں جب بھی ان سب کلمات اللہ کو ضبط تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ اور سات کا عدد بھی بطور مثال ہے، حصر مقصود نہیں۔ اور دلیل اس کی دوسری آیت قرآن ہے جس میں فرمایا ہے:

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِذًا أَدَّا لِكَلِمَةٍ رَبِّي لَتَنفَذَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَذَ كَلِمَتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا، یعنی اگر سمندر کو کلمات اللہ کو لکھنے کے لئے روشنائی بنا لیا جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا اور کلمات اللہ ختم نہ ہوں گے، اور صرف یہی سمندر نہیں اسی جیسے اور سمندر کو بھی شامل کر دیں تب بھی بات یہی رہے گی۔ اس آیت میں بمثلہ فرما کر اشارہ کر دیا کہ یہ سلسلہ دور تک چلایا جائے کہ اس سمندر کے مثل دوسرا سمندر مل گیا پھر اس کی مثل تیسرا چوتھا، غرض سمندروں کی کتنی ہی مقدار فرض کر لو... ان کی روشنائی کلمات اللہ کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ عقلی طور پر وجہ ظاہر ہے کہ سمندر سات نہیں سات ہزار بھی ہوں وہ بہر حال محدود اور متناہی ہیں اور کلمات اللہ یعنی معلومات اللہ غیر متناہی ہیں، کوئی متناہی چیز غیر متناہی کا احاطہ کیسے کر سکتی ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت احبار یہود کے ایک سوال کے جواب میں نازل ہوئی وجہ یہ تھی کہ قرآن کی آیت ہے وَمَا أُوتِيَ تَمْرًا مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا، یعنی تمہیں نہیں دیا گیا مگر تھوڑا سا علم، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو چند احبار یہود حاضر ہوئے اور اس آیت کے بارے میں معارضہ کیا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ تمہیں تھوڑا علم دیا گیا، یہ آپ نے اپنی قوم کا حال ذکر کیا ہے، یا اس میں آپ نے ہمیں بھی داخل کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری مراد سب ہیں، یعنی ہماری قوم بھی اور یہود و نصاریٰ بھی تو انھوں نے یہ معارضہ کیا کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے تورات عطا فرمائی ہے، جس کی شان تَبْيَانٌ تَحْمِلُ شَيْءً، یعنی ہر چیز کا بیان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ بھی علم الہی کے مقابلہ میں قلیل ہی ہے۔ پھر تورات میں جتنا علم ہے اس کا بھی تمہیں پورا علم نہیں، بقدر کفایت ہی ہے۔ اس لئے علم الہی کے مقابلہ میں ساری آسمانی کتابوں اور سب انبیاء کے علوم کا مجموعہ بھی قلیل ہی ہے۔ اسی کلام کی تائید کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ وَكَوْنَتْ مَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَوْ تَلًّا، (الذیۃ رابن کثیر)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ وَأَخْشَوْا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ

اے لوگو! اپنے رب سے اور ڈرو اس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی باپ اپنے

وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَارٍ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ

بیٹے کے بدلے اور نہ کوئی بیٹا ہو جو کام آئے اپنے باپ کی جگہ کچھ بھی، بیشک اللہ کا وعدہ

حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَتُمْسِكُوا بِسُلْبِكُمْ بِاللَّهِ

سچا ہے، سو تم کو نہ بہکائے دنیا کی زندگانی اور نہ دھوکا دے تم کو اللہ کے نام

الْغُرُورِ ۝۳۳ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ

سے وہ دغا باز۔ بیشک اللہ کے پاس ہے قیامت کی خبر اور اتارتا ہے مینر

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا

اور جانتا ہے جو کچھ بڑیاں کے پیٹ میں، اور کسی جی کو معلوم نہیں کہ کل کو کیا کرے گا،

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝۳۴

اور کسی جی کو خبر نہیں کہ کس زمین میں مرے گا، تحقیق اللہ سب کچھ جانتے والا خبردار ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو (اور کفر و شرک چھوڑ دو) اور اس دن سے ڈرو

جس میں نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کر سکے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی ہو کہ

وہ اپنے باپ کی طرف سے ذرا بھی مطالبہ ادا کر دے (اور یہ دن آنے والا ضرور ہے، کیونکہ اس

کی نسبت اللہ کا وعدہ ہے اور) یقیناً اللہ کا وعدہ سچا (ہوتا) ہے سو تم کو دنیاوی زندگانی

دھوکہ میں نہ ڈالے (کہ اس میں منہمک ہو کر اس دن سے غافل رہو) اور نہ تم کو وہ دھوکہ (بنا

یعنی شیطان) اللہ سے دھوکہ میں نہ ڈالے کہ تم اس کے اس بہکانے میں آ جاؤ کہ اللہ تم کو

عذاب نہ دے گا جیسا کہ کرتے تھے وَلَئِنْ رُجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِنْدَهُ لَلْحَسَنَىٰ،

بیشک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے اور وہی (اپنے علم کے موافق) میںہ برساتا ہے (پس اس کا

علم اور قدرت بھی اسی کے ساتھ خاص ہے) اور وہی جانتا ہے جو کچھ (لڑکا لڑکی حاملہ کے)

رحم میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا عمل کریگا (اس کی بھی اسی کو خبر ہے)۔

اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا اس کی بھی اسی کو خبر ہے اور انہی چیزوں کی کیا تخصیص ہو جتنے غیوب ہیں (بیشک اللہ ہی ان سب باتوں کا جاننے والا اور ان سے) باخبر ہے (کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں)۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر و آیتوں میں سے پہلی آیت میں مؤمن و کافر عام لوگوں کو خطاب فرما کر اللہ تعالیٰ اور قیامت کے حساب کتاب سے ڈرا کر اس کے لئے تیاری کی ہدایت کی گئی ہے **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّ كَمَا تَقُولُونَ** یعنی اے لوگو! ڈرو اپنے پروردگار سے اس جگہ اللہ تعالیٰ کے نام یا کسی دوسری صفت کے بجائے صفت رب کے انتخاب کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف کا جو حکم ہے یہ وہ خوف نہیں جو کسی درندہ یا دشمن سے عادت ہو کر رہتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو تمہارا رب اور پالنے والا ہے، اس سے اس طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ خوف سے مراد اس جگہ وہ خوف ہے جو اپنے بڑوں اور بزرگوں کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے ہونا لازم ہے، جیسے بیٹا اپنے باپ سے شاگرد استاد سے ڈرتا ہے۔ وہ کوئی اس کے دشمن یا ضرر پہنچانے والے نہیں، مگر ان کی عظمت و ہیبت دلوں میں ہوتی ہے، وہی ان کو باپ اور اساذ کی اطاعت پر مجبور کرتی ہے۔ یہاں بھی یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و ہیبت تمہارے قلوب پر حاوی ہونا چاہئے تاکہ تم اس کی مکمل اطاعت آسانی سے کر سکو۔

وَاخْشَوْا يَوْمَآلَ يَجْزِي وَالِدٌ عَنِ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَنِ وَالِدِهِ شَيْئًا، یعنی اس روز سے ڈرو جس میں نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو کوئی نفع پہنچا سکے گا، اور نہ بیٹا باپ کو نفع پہنچانے والا ہوگا،

مراد اس سے وہ باپ اور بیٹے ہیں جن میں ایک مؤمن ہو دوسرا کافر۔ کیونکہ مؤمن باپ نہ اپنے کافر بیٹے کے عذاب میں کوئی کمی کر سکے گا نہ اس کو کوئی نفع پہنچا سکے گا اسی طرح مؤمن بیٹا اپنے کافر باپ کے کچھ کام نہ آ سکے گا۔

وجہ اس تخصیص کی قرآن کریم کی — دوسری آیات اور روایات حدیث میں جن میں اس کی تصریح ہے کہ قیامت کے روز ماں باپ اولاد کی اور اولاد ماں باپ کی شفاعت کریں گے، اور اس شفاعت کی وجہ سے ان کو کامیابی بھی ہوگی۔ قرآن کریم میں ہے **وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ**

”یعنی جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ایمان میں ان کے تابع ہوئی، یعنی وہ بھی مؤمن ہو گئے تو ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے ماں باپ صالحین کے درجہ میں پہنچا دیں گے، اگرچہ ان کے اپنے اعمال اس درجہ کے قابل نہ ہوں مگر صالح والدین کی برکت سے قیامت میں بھی ان کو یہ نفع پہنچے گا کہ والدین کے مقام پر پہنچا دیا جائے گا، مگر اس میں شرط یہی ہے کہ اولاد مؤمن ہو، اگرچہ عمل میں کچھ کوتاہی ہوئی ہو۔“

اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے جَنَّتُ عَدْنٍ تَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ، یعنی ہمیشہ رہنے کی جنتوں میں داخل ہوں گے اور ان کے ساتھ وہ لوگ بھی داخل ہوں گے جو ان کے ماں باپ بیویوں اور اولاد میں سے اس قابل ہوں گے، مراد قابل ہونے سے مؤمن ہونا ہے۔

ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ ماں باپ اور اولاد، اسی طرح شوہر بیوی اگر مؤمن ہونے میں مشترک ہوں تو پھر ایک سے دوسرے کو محشر میں بھی فائدہ پہنچے گا۔ اس طرح متعدد روایات حدیث میں اولاد کا ماں باپ کی شفاعت کرنا منقول ہے۔ اس لئے آیت مذکورہ کا یہ ضابطہ کہ کوئی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو محشر میں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا، یہ اسی صورت میں ہے کہ ان میں سے ایک مؤمن ہو دوسرا کافر (منظری)

فانکلا: یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اس آیت میں باپ، بیٹے کو نفع نہ پہنچا سکے گا یہاں تو جملہ فعلیہ کی صورت میں لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ ذَكَرٍ کے الفاظ سے ذکر فرمایا اور دوسری جانب میں دُو تَغْيِرَ کتے گئے، ایک یہ کہ اس کو جملہ اسمیہ کی صورت میں بیان فرمایا، دوسرے اس میں ذَكَر کے بجائے لفظ مَوْلُو د اختیار فرمایا۔ حکمت اس میں یہ ہو کہ جملہ اسمیہ بہ نسبت فعلیہ کے زیادہ مؤکد ہوتا ہے۔ اس تغیر جملہ میں اس فرق کی طرف اشارہ کر دیا جو باپ اور اولاد میں ہے کہ باپ کی محبت اولاد کے ساتھ اشد ہے، اس کے عکس اولاد کی محبت کا یہ درجہ دنیا میں بھی نہیں ہوتا محشر میں نفع رسانی کی نفی تو دونوں سے کر دی گئی، مگر اولاد کی عدم نفع رسانی کو مؤکد کر کے بیان فرمایا۔ اور لفظ وَ لَد کے بجائے مَوْلُو د اختیار کرنے میں یہ حکمت ہے کہ مَوْلُو د صرف اولاد کو کہا جاتا ہے اور لفظ وَ لَد عام ہے اولاد کی اولاد کو بھی شامل ہے۔ اس میں دوسرے رُخ سے اسی مضمون کی تائید اس طرح ہو گئی کہ خود صلی بیٹا بھی باپ کے کام نہ آئے گا، تو پوتے پڑپوتے کا حال معلوم ہے۔

اور دوسری آیت میں پانچ چیزوں کے علم کا بالخصوص حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا، اس کے سوا کسی مخلوق کو ان کا علم نہ ہونا بیان فرمایا ہے، اور اسی پر سورہ لقمان ختم

کی گئی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَمْرٍ تَقُوتُ، یعنی اللہ ہی کے پاس ہے علم قیامت کا (کہ کس سال کس پانچ میں آئے گی) اور وہی بارش کو اتارتا ہے اور وہی جانتا ہے جو شکم مادر میں ہے (کہ لڑکی ہے یا لڑکا اور کس شکل و صورت کا ہے) اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کو کیا کمائے گا (یعنی خیر و شر میں سے کیا حاصل کرے گا) اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔

پہلی تین چیزوں میں اگرچہ یہ تصریح نہیں کی گئی کہ ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، مگر کلام ایسے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے جس سے اُن چیزوں کے علم کا انحصار علم الہی میں معلوم ہوتا ہے، اور باقی دو چیزوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ انہی پانچ چیزوں کو سورۃ النعام کی آیت میں مفاتیح الغیب فرمایا گیا ہے وَ عِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ، یعنی صرف اللہ ہی کے پاس ہے علم مفاتیح غیب کا، کوئی نہیں جانتا ان کو جس نے اللہ تعالیٰ کے "حدیث میں اس کو مفاتیح الغیب فرمایا گیا ہے" مفاتیح اور مفاتیح مفتاح کی جمع ہے، کنجی یا چابی کو کہتے ہیں، جس سے قفل کھلتے ہیں.... مراد اس سے اصول الغیب ہیں، جن سے معلومات غیب کھلتے ہیں۔

مسئلہ علم غیب | اس مسئلہ کی تفصیل بقدر ضرورت سورۃ نمل کی آیت قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ، کے تحت میں گزر چکی ہے۔

اس آیت میں مطلقاً علم غیب کا حق تعالیٰ کے لئے مخصوص ہونا صراحتاً بیان فرمایا گیا ہے اور یہی پوری اُمت کا عقیدہ سلفاً و خلفاً رہا ہے۔ آیت زیر بحث میں جو صرف پانچ چیزوں کو خصوصیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان کا علم کسی مخلوق کو نہیں، صرف اللہ تعالیٰ ہی ان کو جانتا ہے، یہ کوئی تخصیص کے لئے نہیں، ورنہ سورۃ نمل کی آیت سے تضاد ہو جائیگا بلکہ ان پانچ چیزوں کا خاص اہتمام بتلانے کے لئے یہاں ان کا ذکر فرمایا ہے۔

اور وجہ تخصیص و اہتمام کی یہ ہے کہ عام طور پر جن غیب کی چیزوں کو انسان معلوم کرنے کا شائق ہوتا ہو وہ یہی پانچ چیزیں ہیں نیز علم غیب کا دعویٰ کرنے والے نجومی وغیرہ جن چیزوں کی خبریں لوگوں کو بتا کر اپنا عالم الغیب ہونا ثابت کرتے ہیں وہ یہی پانچ چیزیں ہیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انہی پانچ چیزوں کے متعلق دریافت کیا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جن میں ان پانچوں کے علم کا اللہ تعالیٰ

کے ساتھ مخصوص ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ (روح)

اور حدیث میں جو بروایت ابن عمرؓ و ابن مسعودؓ یہ ارشاد آیا ہے کہ اُوْتِیْتُ مَفَاتِحَ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا الْخُفْسَ (اخراجہ الامام احمد، ابن کثیر، اس میں لفظ اُوْتِیْتُ نے خود یہ بات واضح کر دی کہ ان پانچ چیزوں کے علاوہ جن غائبات کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور وحی دیا گیا تھا، اس لئے وہ علم غیب کی تعریف میں شامل نہیں۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی — اور اولیاء کو بذریعہ الہام جو غیب کی چیزوں کی خبریں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیدی جاتی ہیں وہ حقیقت کے اعتبار سے علم غیب نہیں، جس کی بناء پر ان کو عالم الغیب کہا جاسکے بلکہ وہ اَنْبَاءُ الْغَيْبِ یعنی غیب کی خبریں ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے اپنے فرشتوں اور رسولوں اور مقبول بندوں کو عطا فرمادیتا ہے۔ قرآن کریم میں ان کو اَنْبَاءُ الْغَيْبِ فرمایا گیا ہے مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهَا اِلَيْكَ۔

اس لئے مطلب حدیث کا یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کو تو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ایسا مخصوص فرمایا ہے کہ بطور انباء غیب کے بھی فرشتے اور رسول کو اس کا علم نہیں دیا گیا۔ اس کے علاوہ دوسری مغیبات کا علم بہت کچھ انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی دیدیا جاتا ہے۔

اس تقریر سے بھی ایک اور وجہ ان پانچ چیزوں کے خصوصی ذکر کی معلوم ہو گئی۔

ایک شبہ اور جواب | مذکورہ آیت سے یہ ثابت ہوا کہ مطلق علم غیب جو حق تعالیٰ کی خصوصیت ہے اس میں بھی خاص طور سے پانچ مذکورہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا علم کسی پیغمبر کو بذریعہ وحی بھی نہیں دیا جاتا۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ چیزیں کسی کو کبھی معلوم نہ ہوں، حالانکہ امت کے بہت سے اولیاء اللہ سے ایسے بے شمار واقعات منقول ہیں کہ انھوں نے کہیں بارش کی خبر دی یا کسی حمل کے متعلق کوئی خبر دی، کسی کے متعلق آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی خبر دی، کسی کے مرنے کی جگہ متعین کر کے بتلا دی، اور پھر یہ پیشینگوئی مشاہدہ سے صحیح بھی ثابت ہوئی۔

اسی طرح بعض نجومی یا جفرومل وغیرہ کافن چاندالے ان چیزوں کے متعلق بعض خبریں دیدیتے ہیں، اور بعض اوقات وہ صحیح بھی ہو جاتی ہیں، تو پھر ان پانچ چیزوں کی خصوصیت علم الہی کے ساتھ کس طرح رہی۔

اس کا ایک جواب تو وہی ہے جو سورۃ نمل میں تفصیل سے آچکا ہے، اور اختصاراً

کے ساتھ اوپر مذکور ہوا ہے کہ علم غیب درحقیقت اس علم کو کہا جاتا ہے جو سبب طبعی کے واسطہ سے نہ ہو، بلا واسطہ خود بخود ہو۔ یہ چیزیں انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی اور اولیاء کو بذریعہ الہام اور نجومیوں وغیرہ کو اپنے حسابات و اسباب طبیعیہ کے ذریعہ حاصل ہو جاتیں تو وہ علم غیب نہیں بلکہ انبار الغیب ہیں، جو کسی جزئی و شخصی معاملہ میں کسی مخلوق کو حاصل ہو جانا آیت مذکورہ کے منافی نہیں۔ کیونکہ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کا کئی علم جو تمام مخلوقات اور تمام حالات پر حاوی ہو وہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو بذریعہ وحی یا الہام نہیں دیا، کسی ایک آدمی واقعہ میں کوئی جزئی علم بذریعہ الہام حاصل ہو جانا اس کے منافی نہیں۔

اس کے علاوہ علم سے مراد علم قطعی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، الہام کے ذریعہ جو علم کسی ولی کو حاصل ہوتا ہے وہ قطعی نہیں ہوتا، اس میں مغالطوں کے بہت احتمال رہتے ہیں اور نجومیوں وغیرہ کی خبروں میں تو روزمرہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ دس جھوٹ میں ایک صحیح کا بھی تناسب نہیں ہوتا، اس کو علم قطعی کیسے کہہ سکتے ہیں۔

مسئلہ علم غیب کے متعلق | استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ نے اپنے فوائد ایک فائدہ ہمہ تفسیر میں ایک مختصر جامع بات فرمائی ہے، جس سے مذکورہ قسم کے سبب اشکالات ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ غیب کی دو قسمیں ہیں، ایک احکام غیبیہ ہیں جیسے احکام شرائع جن میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا علم بھی داخل ہے جس کو علم عقائد کہا جاتا ہے، اور وہ تمام احکام شرعیہ بھی جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کون سے کام پسند ہیں کون سے ناپسند، یہ سب چیزیں غیب ہی کی ہیں۔

دوسری قسم ان کو ان غیبیہ یعنی دنیا میں پیش آنے والے واقعات کا علم۔ پہلی قسم کے غائبات کا علم حق تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل کو عطا فرمایا ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ امْرَأَتُصْنِي مِنْ رَّسُولٍ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتے بجز اس رسول کے جس کو اللہ تعالیٰ اس کام کے لئے پسند فرمائیں۔

اور دوسری قسم یعنی ان کو ان غیبیہ، ان کا علم کئی تو حق تعالیٰ کسی کو عطا نہیں فرماتے وہ بالکل ذات حق کے ساتھ مخصوص ہے، مگر علم جزئی خاص خاص واقعات کا جب چاہتا ہے جس قدر چاہتا ہے عطا فرما دیتا ہے۔ اس طرح اصل علم غیب تو سب کا سب حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، پھر وہ اپنے علم غیب میں سے احکام غیب کا علم تو عطا انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی بتلاتے ہی ہیں، اور یہی علم ان کی بعثت کا مقصد ہے۔

اکوان غیب کا علم جزئی بھی انبیاء و اولیاء کو بذریعہ وحی یا الہام جس قدر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے عطا فرمادیتا ہے، جو منجانب اللہ عطا کیا ہوا علم ہے۔ اس کو حقیقی معنی کے اعتبار سے علم الغیب نہیں کہا جاسکتا، بلکہ غیب کی خبریں رانباء الغیب، کہا جاتا ہے۔

فوائد متعلقہ الفاظ آیت | اس آیت میں پانچ چیزوں کے علم کا حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا ایک خاص اہتمام کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے، جس کا ظاہری تقاضا یہ تھا کہ ایک ہی عنوان سے پانچ چیزوں کو شمار کرنا کہہ دیا جاتا کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے کسی مخلوق کو ان کا علم نہیں دیا گیا۔ مگر آیت مذکورہ میں ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ ابتدائی تین چیزوں کے علم کو تو مثبت طور پر اللہ کے لئے خاص ہونے کا ذکر فرمایا اور دو چیزوں میں غیر اللہ سے علم کی نفی فرمائی۔ اور پہلی تین چیزوں میں بھی علم ساعت یعنی قیامت کا ذکر تو اس طرح فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَکَ عَلَمُ السَّاعَةِ، یعنی اللہ ہی کے پاس ہے علم قیامت کا۔ اور دوسری چیز کا ذکر عنوان بدل کر جملہ فعلیہ میں اس طرح ذکر فرمایا یُنَزِّلُ الْغَیْثَ، یعنی اللہ تعالیٰ اتارتا ہے بارش، اس میں بارش کے علم کا ذکر ہی نہیں، بلکہ اس میں اتارنے کا ذکر ہے تیسری چیز کا ذکر پھر عنوان بدل کر اس طرح فرمایا کہ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَنْۡحَامِ، اس تغیر عنوان کو بلاغت کلام کا ایک تفتیش بھی کہا جاسکتا ہے اور غور کرنے سے اس میں کچھ اور حکمتیں بھی معلوم ہوتی ہیں، جو بیان القرآن میں حضرت نے بیان فرمائی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آخری دو چیزیں یعنی آئندہ کل میں انسان کیا کمائے گا، اور یہ کہ وہ کس زمین میں مرے گا خود انسان کی ذات کے متعلق حالات ہیں ان میں احتمال ہو سکتا تھا کہ انسان ان کا علم حاصل کر لے اس لئے ان دونوں میں خصوصیت سے غیر اللہ کے علم کو منفی کر کے بیان فرمایا گیا، جس سے پہلی تین چیزوں کا علم غیر اللہ کے لئے نہ ہونا بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا کہ جب انسان خود اپنے اعمال و کمکاسب کو اور ان کی انتہا یعنی موت اور اس کی جگہ نہیں جانتا تو آسمان اور نزولِ مطر اور شکمِ مادر کی اندھیریوں میں مخفی چیز کو کیا جانے گا؟ اور آخری چیز میں صرف مکانِ موت کا علم انسان کو نہ ہونا بیان فرمایا ہے حالانکہ مکانِ موت کی طرح زمانِ موت بھی انسان کے علم میں نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ مکانِ موت اگرچہ متعین طور پر معلوم نہ ہو مگر ظاہری حالات کے اعتبار سے انسان کچھ سمجھ سکتا ہے، کہ جہاں رہتا ہوتا ہے وہیں مرے گا اور کم از کم وہ مکان جس میں اس کو مرنا ہے دنیا میں موجود تو ہے، بخلاف زمانِ موت کے جو زمانہ مستقبل ہے ابھی وجود میں بھی نہیں آیا، تو جو شخص مکانِ موت کو موجود بالفعل ہونے کے باوجود نہیں جان سکتا، اس کے متعلق

یہ تصور کیسے کیا جائے کہ زمانِ موت جس کا اس وقت وجود ہی نہیں اس کو جان لے۔
خلاصہ یہ ہے کہ یہاں ایک چیز کی نفی سے خود بخود دوسری چیزوں کی نفی بدرجہ اولیٰ
معلوم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کو منفی عنوان سے بیان فرمایا۔ اور پہلی تین چیزیں تو
انسانی دسترس سے ظاہر حالات میں خود ہی خارج ہیں، ان میں انسان کے علم کا دخل نہ ہوتا
واضح ہے۔ اس لئے ان میں مثبت عنوان اختیار کر کے ان کا اختصاص حق تعالیٰ کے ساتھ
بیان کر دیا گیا۔

اور ان میں سے پہلے جملے کو جملہ اسمیہ سے اور بعد کے دونوں جملوں کو فعلیہ کے عنوان
سے ذکر کرنے میں شاید یہ حکمت ہے کہ قیامت تو ایک امر متعین ہے اس میں تجدد نہیں
بمخلاف نزولِ مطر اور حمل کے کہ ان کے حالات میں تجدد ہوتا رہتا ہے، اور جملہ فعلیہ تجدد
پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں میں وہ استعمال کیا گیا، اور ان دونوں میں بھی حمل
کے حالات میں تو علم الہی کا ذکر فرمایا وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَسْحَامِ، اور نزولِ بارش میں علم کا
ذکر ہی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں بارش نازل کرنے کا ذکر کر کے ضمناً یہ بھی بتلادیا کہ بارش
جس سے انسان کے ہزاروں منافع وابستہ ہیں وہ اللہ ہی کے کرنے سے آتی ہے، اور
کسی کے تصرف میں نہیں، اور اس کا علمی اختصاص تو سیاقِ کلام ہی سے ثابت ہو جاتا
ہے۔ وَاللّٰهُ سَمِیعٌ عَلِیْمٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورۃ لقمان بحمدِ اللہ سبحانہ
فی ۵ ذی الحجۃ ۱۳۹۱ھ یوم الاثنين

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُورَةُ السَّجْدَةِ

سُورَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلَاثُونَ آيَةً وَثَلَاثُ رُكُوعَاتٍ

سورۃ سجده مکہ میں نازل ہوئی اس کی تیس آیتیں ہیں اور تین رکوع -

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے -

الَمْ ۱ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَأَرِيْبَ فِيهِ مِنْ سَرِّ الْعَالَمِينَ ۲

اُتارنا کتاب کا اس میں کچھ دھوکا نہیں پر دروگاہِ عالم کی طرف سے ہے

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا

کیا کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ باندھ لایا ہے کوئی نہیں وہ ٹھیک ہو تیرے رب کی طرف تاکہ تو ڈر سدا ان لوگوں

مَا آتَاهُمْ مِنْ نَذِيرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۳

کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈرانے والا تجھ سے پہلے تاکہ وہ راہ پر آئیں -

خُلاصۃ تفسیر

الَمْ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے، (اور) اس میں

کچھ شبہ نہیں (اور) یہ رب العالمین کی طرف سے ہے (جیسا کہ اس کتاب کا اعجاز خود اس

کی دلیل ہے) کیا یہ (منکر) لوگ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ اپنے دل سے بنا

ہے (یعنی یہ کہنا محض لغو اور جھوٹ ہے یہ بنایا ہوا نہیں) بلکہ یہ سچی کتاب ہے آپ کے رب کی طرف سے (آئی ہے) تاکہ آپ

(اس کے ذریعہ سے) ایسے لوگوں کو (عذاب الہی سے) ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرائیوا نہیں آیا تھا تاکہ وہ لوگ راہ پر آجائیں

معارف و مسائل

مَا آتَاهُم مِّن تَنذِيرٍ، نذیر سے مراد اس جگہ رسول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قریش مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا تھا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انبیاء کی دعوت بھی ان کو اب تک نہ پہنچی تھی۔ کیونکہ دوسری آیت قرآن میں واضح طور پر ارشاد ہے وَإِنْ هِيَ إِلَّا خَلْقٌ فِيهَا تَنذِيرٌ، یعنی کوئی امت اور جماعت دنیا میں ایسی نہیں جس میں کوئی اللہ سے ڈرانے والا اور اس کی طرف دعوت دینے والا نہ آیا ہو۔

اس آیت میں لفظ نذیر اپنے عام لغوی معنی میں ہے۔ یعنی اللہ کی طرف دعوت دینے والا وہ خواہ رسول اور پیغمبر ہو یا ان کا کوئی نائب خلیفہ یا عالم دین۔ تو اس آیت سے تمام امتوں اور جماعتوں تک توحید کی دعوت پہنچ جانا معلوم ہوتا ہے، وہ اپنی جگہ صحیح و درست اور حق تعالیٰ کی رحمتِ عامہ کا مقتضا ہے، جیسا کہ ابو حنیان نے فرمایا کہ توحید اور ایمان کی دعوت کسی زمانے اور کسی مکان اور کسی قوم میں کبھی منقطع نہیں ہوتی، اور جب کہیں نبوت پر زمانہ دراز تک گزر جانے کے بعد اس نبوت کا علم رکھنے والے علماء بہت کم رہ گئے تو کوئی دوسرا نبی در رسول مبعوث ہو گیا۔ اس کا مقتضی یہ ہے کہ اقوام عرب میں بھی بقدر ضرورت توحید کی دعوت پہلے سے ضرور پہنچی ہوگی، مگر اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ دعوت خود کوئی نبی در رسول لے کر آیا ہو، ہو سکتا ہے کہ ان کے نابین علماء کے ذریعہ پہنچ گئی ہو۔ اس لئے اس سورۃ اور سورۃ یسین وغیرہ کی وہ آیتیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قریش عرب میں آپ سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا تھا، ضروری ہے کہ اس میں نذیر سے مراد اصطلاحی معنی کے اعتبار سے رسول و نبی ہو۔ اور مراد یہ ہو کہ اس قوم کے اندر آپ سے پہلے کوئی نبی در رسول نہیں آیا تھا، اگرچہ دعوتِ ایمان و توحید دوسرے ذرائع سے یہاں بھی پہنچ چکی ہو۔ زمانہ فرت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بہت سے حضرات کے متعلق یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ دینِ ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام پر قائم تھے، توحید پر ان کا ایمان تھا، بت پرستی اور بتوں کے لئے قربانی دینے سے متنفر تھے۔

روح المعانی میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نبوت سے پہلے آپ سے ملے بھی تھے، مگر نبوت سے پہلے ان کا انتقال اس سال میں ہو گیا جس میں قریش نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی اور یہ واقعہ آپ کی نبوت سے پانچ سال پہلے کا ہے، ان کا حال موسیٰ بن عقبہ نے یہ نقل کیا ہے

کہ قریش کو بہت پرستی سے روکتے تھے، اور بتوں کے نام پر فتر بانی دینے کو بہت برا کہتے تھے، اور مشرکین کے ذبائح کا گوشت نہ کھاتے تھے۔

اور ابو داؤد طیالسی زید بن عمرو بن نفیل کے صاحبزادے حضرت سعید بن زید بن عمرو صحابی میں عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں یہ روایت کیا ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے والد کا جو کچھ حال تھا وہ آپ کو معلوم ہے کہ توحید پر قائم، بت پرستی کے منکر تھے، تو کیا میں ان کے لئے دعائے مغفرت کر سکتا ہوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں ان کے لئے دعا پر مغفرت جائز ہے، وہ قیامت کے روز ایک مستقل امت ہو کر اٹھیں گے (روح) اسی طرح ورقہ بن نوفل جو آپ کے زمانہ نبوت شروع ہونے اور نزول قرآن کی ابتداء کے وقت موجود تھے توحید پر قائم تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنے کا اپنا عزم ظاہر کیا تھا، مگر فوراً بعد ہی ان کی وفات ہو گئی۔ یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ اقوام عرب بھی دعوتِ الہیہ اور دعوتِ ایمان و توحید سے محروم تو نہیں تھیں، مگر خود ان کے اندر کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ واللہ اعلم

ان تینوں آیتوں میں قرآن کی حقانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کا اثبات ہے۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ

اللہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے چھ دن کے

آيَاتٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ مَا لَكُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٍّ

اندر پھر قائم ہوا عرش پر، کوئی نہیں سمقارا اس کے سوائے حمایتی

وَلَا شَفِيعٌ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ ۚ وَن ۝۴ يُدِيرُ الْأُمُورَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى

اور نہ سفارشی پھر کیا تم دھیان نہیں کرتے۔ تدبیر سے اتارتا ہی کام آسمان سے زمین

الْأَرْضِ ثُمَّ يُعِزُّ بِحَمْدِهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِثْلُ نَسْفَةِ الْفَسْفَسَةِ

تک پھر چڑھتا ہی وہ کام اس کی طرف ایک دن میں جس کا پیمانہ ہزار برس کا ہے

مِمَّا تَعْدُونَ ۚ وَن ۝۵ ذَٰلِكَ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزِ

تمھاری گنتی میں۔ یہ ہی جاننے والا چھپے اور اور کھلے کا زبردست

الرَّحِيمُ ۱۰ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ

رحم والا - جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور شروع کی انسان کی پیدائش

مِنْ طِينٍ ۱۱ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ۱۲

ایک گالے سے - پھر بنائی اس کی اولاد پختے ہوئے بے قدر پانی سے -

ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِ رَبِّهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ

پھر اس کو برابر کیا اور پھونکی اس میں اپنی ایک جان اور بنادیئے تمہارے لئے کان اور

الْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ طَقِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۱۳

آنکھیں اور دل تم بہت تھوڑا شکر کرتے ہو

خلاصہ تفسیر

اللہ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو اور اس مخلوق کو جو ان دونوں کے درمیان میں ہو جو ہے چھ روز کی مقدار میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے وہ ایسا عظیم ہو کہ) بدون اس کی رضا و اذن کے نہ تمہارا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارش کرنے والا (البتہ اذن سے شفاعت ہو جائے گی اور نصرت کے ساتھ اذن ہی متعلق نہ ہوگا) سو کیا تم سمجھتے نہیں ہو کہ ایسی ذات کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا اور وہ ایسا ہے کہ آسمان سے لیکر زمین تک (جتنے امور ہیں) ہر امر کی (وہی) تدبیر (اور انتظام) کرتا ہے، پھر ہر امر اسی کے حضور میں پہنچ جائے گا ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہاری شمار کے موافق ایک ہزار برس کی ہوگی (یعنی قیامت میں سب امور اور ان کے متعلقات اس کے حضور میں پیش ہوں گے کقولہ تعالیٰ وَ إِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأُمُورُ كُلُّهُ) وہی ہے جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا زبردست رحمت والا جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی (یعنی جس مصلحت کے لئے اس کو بنایا اس کے مناسب بنایا) اور انسان (یعنی آدم علیہ السلام) کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس (انسان یعنی آدم) کی نسل کو خلاصہ اخلاط یعنی ایک بے قدر پانی سے (یعنی نطفہ سے جو فضلہ ہی مضم رابع غذا کا جس میں چار خلط خون، بلغم، سودا، صفرا بنتے ہیں) بنایا پھر (ماں کے رحم میں) اس کے اعضاء درست کئے اور اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونکی

اور (بجرتولد) تم کو کان اور آنکھیں اور دل (یعنی اور اکات ظاہرہ و باطنہ) دیئے (اور ان سب باتوں کا جو کہ دال علی القدرۃ والا نعام ہیں مقتضایہ تھا کہ خدا کا شکر کرتے جس کی فردا عظم توحید ہے مگر) تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو (یعنی نہیں کرتے) :

معارف و مسائل

روز قیامت کا طول | فی یوم کان مقدماً اربعۃ الف سنۃ قیماً تعدّ وّن، یعنی اس دن کی مقدار تمھاری گنتی کے اعتبار سے ایک ہزار سال کی ہوگی اور سورہ معارج کی آیت میں ہے فی یوم کان مقدماً اربعۃ خمیسین الف سنۃ، یعنی اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی اس کا ایک سیدھا سا جواب تو وہ ہے جو بیان ہتر آن میں اختیار کیا گیا ہے کہ اس دن کے ہولناک ہونے کے سبب یہ ان لوگوں کو بہت دراز محسوس ہوگا۔ اور یہ درازی بمقدار اپنے ایمان و اعمال کے ہوگی جو بڑے مجرم ہیں ان کو زیادہ جو کم ہیں ان کو کم محسوس ہوگی، یہاں تک کہ جو دن بعض کو ایک ہزار سال کا معلوم ہوگا وہ دوسروں کے نزدیک پچاس ہزار سال کا ہوگا۔

تفسیر روح المعانی میں اور بھی متعدد توجیہات علماء اور صوفیاء کرام سے نقل کی گئی ہیں، مگر وہ سب کے سب قیاسات ہی ہیں۔ ایسی چیز جس کو قرآن کا مدلول کہا جاسکے یا جس پر یقین کیا جاسکے کوئی نہیں۔ اس لئے اسلم وہی طریقہ ہے جو سلف صالحین صحابہ و تابعین نے اختیار کیا، کہ اس ایک پچاس کے فرق کو علم الہی کے حوالہ کیا اور خود اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ ہمیں معلوم نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس کے متعلق فرمایا ہما یوم مان ذکرہما اللہ تعالیٰ فی کتابہ اللہ تعالیٰ اعلم بہما واکثرہ ان اقول فی کتاب اللہ مالا اعلم راخرجه عبد الرزاق والحاکم وصححه، یعنی یہ دو دن ہیں جن کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور اللہ ہی ان کی حقیقت کو جانتا ہے، اور میں اس کو برا سمجھتا ہوں کہ قرآن میں وہ بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں۔

دنیا کی ہر چیز اپنی ذات میں حسن اور اچھی ہو | اَللّٰہُ تَعَالٰی اَحْسَنُ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقَ، یعنی اللہ وہ ذات برائی اس کے غلط استعمال سے آتی ہے | جو جس نے ہر چیز کی خلقت کو حسین اور بہتر بنایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس علم میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا فرمایا وہ حکمت اور مصالح عالم کے اقتضاء سے بنایا ہے۔ اس لئے ہر چیز اپنی ذات کے اعتبار سے ایک حسن رکھتی ہے۔

اور ان سب سے زیادہ حسین اور بہتر انسان کو بنایا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: "لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ" یعنی ہم نے انسان کو سب سے زیادہ حسین تقویم اور بہتر شکل و صورت میں پیدا کیا ہے۔

اور دوسری مخلوقات خواہ وہ ظاہر میں کتنی ہی قبیح اور بُری سمجھی جاتی ہوں، گتیا، خنزیر، سانپ، بچھو، شیر اور بھیریا یہ سب زہریلے اور درد مندے جانور عام نظر دل میں بُرے سمجھے جاتے ہیں، مگر مجموعہ عالم کے مصالح کے اعتبار سے ان میں سے کوئی بُرا نہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ۵

نہیں ہر چیز نکمی کوئی زمانے میں ۶ کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

حضرت حکیم الامتہؒ نے فرمایا کہ کُلُّ شَيْءٍ میں تمام جواہر اور اعراض داخل ہیں یعنی وہ چیزیں بھی جو دُور و دور ہری رکھتی ہیں جیسے حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ اور اعراض بھی جن میں اخلاق و اعمال بھی داخل ہیں۔ یہاں تک کہ جو اخلاق بُرے تبتلائے جاتے ہیں جیسے غصہ، حرص، شہوت وغیرہ یہ بھی اپنی ذات میں بُرے نہیں، ان کی بُرائی غیر ضرورت میں صرف کرنے اور بے محل استعمال کرنے سے ہوتی ہے۔ اپنے محل میں رہیں تو ان میں کوئی چیز بُری نہیں۔ لیکن مراد اس سے ان اشیاء کی جہت تخلیق و تکوین ہے، کہ وہ خیر ہی خیر اور حسن ہی حسن ہے۔ اور اعمال کی دوسری جہت انسان کا کسب و کتساب ہے، یعنی اپنے اختیار کو کسی کام کے کرنے میں صرف کرنا۔ تو اس حیثیت سے سب حسن نہیں، بلکہ ان میں تفصیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کی اجازت نہیں دی وہ حسن نہیں، قبیح ہیں۔ واللہ اعلم

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ، اس سے پہلے یہ بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم کی ہر چیز کو حسن بنایا ہے، اس کے بعد انسان کا ذکر فرمایا جو ان سب میں زیادہ حسین ہے۔ اس کے ساتھ کمال قدرت کے اظہار کے لئے یہ بھی بتلادیا کہ جس انسان کو ہم نے سب مخلوق سے زیادہ بہتر بنایا ہے وہ یہ نہیں کہ اس کا مادہ تخلیق کچھ سب سے زیادہ اشرف و اعلیٰ اور بہتر لیا گیا، اس لئے سب سے بہتر ہو گیا۔ بلکہ مادہ تخلیق تو اس کا سب سے کمترین چیز یعنی مٹی کو بنایا گیا، پھر قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ نے اس کمترین چیز کو کہاں سے کہاں پہنچایا کہ اشرف المخلوقات قرار دیا گیا۔

وَقَالُوا أَإِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ بَلْ

اور کہتے ہیں کہ جب ہم رُل گئے زمین میں کیا ہم کو نیا بننا ہے؟ کچھ نہیں

هَمْ يَلْقَآئِ رَبِّهِمْ كَافِرُونَ ۱۰ قُلْ يَتُوفِكُمْ مَلَكَ الْمَوْتِ الَّذِي

وہ اپنے رب کی ملاقات سے منکر ہیں۔ تو کہہ قبض کر لیتا ہی تم کو فرشتہ موت کا جو

وَكُلَّ يَكْمُرُ إِلَى رَبِّكُمْ تَرَجَعُونَ ۱۱ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمَجْرُمُونَ

تم پر مقرر رہی پھر اپنے رب کی طرف پھر جاؤ گے۔ اور کبھی تو دیکھے جس وقت کہ منکر

نَاكِسُو أَرْعُسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ

سر ڈالے ہوئے ہوں گے اپنے رب کے سامنے اور رب ہمارے ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب ہم کو بھیج دو کہ ہم

صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ۱۲ وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًى سَمَا

کر پس پھلے کام ہم کو یقین آگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو بچھایتے ہر جی کو اس کی راہ

وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ

لیکن ٹھیک پڑ چکی میری کہی بات کہ مجھ کو بھرنی ہی دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے

أَجْمَعِينَ ۱۳ فَوَقُوا بِمَآئِسِيَّتِهِمْ لِقَاءَ يُومِكُمْ هَذَا إِنَّا

اکٹھے۔ سو اب چکھو مزہ جیسے تم نے بھلا دیا تھا اس اپنے دن کے ملنے کو ہم نے بھی

نَسِينُكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۱۴

بھلا دیا تم کو اور چکھو عذاب سدا کا عوض اپنے کئے کا۔

إِنَّمَا يُوعِظُ مَنْ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا

ہماری باتوں کو وہی مانتے ہیں کہ جب ان کو سمجھاتے ان سے گر پڑیں سجدہ کر کر

وَسَبِّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۱۵ تَتَجَافَىٰ

اور پاک ذات کو یاد کریں اپنی رب کی خوبیوں کے ساتھ اور وہ بڑائی نہیں کرتے۔ جدا رہتی ہیں

جُنُودُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَ

ان کی کر وٹیں اپنے سونے کی جگہ سے پکارتے ہیں اپنے رب کو ڈر سے اور لالچ سے اور ہمارا

مِمَّا سَرَّ قَنَهُمْ يَنْفِقُونَ ۱۶ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ

دیا ہوا کچھ خرچ کرتے ہیں۔ سو کسی جی کو معلوم نہیں جو چھپا دھری ہوائے واسطے

مِنْ قُرَّةٍ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۷﴾ أَفَمَنْ كَانَ

آنکھوں کی ٹھنڈک، بدلہ اس کا جو کرتے تھے - بھلا ایک جو ہے

مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ ﴿۱۸﴾ أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

ایمان پر کیا برابر ہو اس کے جو نافرمان ہو؟ نہیں برابر ہوتے، سودہ لوگ جو یقین لائے اور کئے

الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۹﴾

کام بھلے تو ان کے لئے باغ ہیں رہنے کے، مہمانی ان کاموں کی وجہ سے جو کرتے تھے

وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ

اور وہ لوگ جو نافرمان ہوئے سو ان کا گھر ہو آگ، جب چاہیں کہ نکل پڑیں اس

يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُقُوا عَذَابَ النَّارِ

میں سے اٹھا دیئے جائیں پھر اسی میں اور کہیں ان کو چکھو آگ کا عذاب

الَّذِينَ كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿۲۰﴾ وَلَنْ يَقْنَهُمْ مِنَ الْعَذَابِ

جو تم جھٹلایا کرتے تھے - اور البتہ چکھائیں گے ہم ان کو تھوڑا

أَلَّا دُنِيَ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۲۱﴾

عذاب درے اس بڑے عذاب کے تاکہ وہ پھر آئیں -

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا إِنَّا

اور کون بے انصاف زیادہ اس سے جو سمجھایا گیا اُس کے رب کی باتوں سے پھر ان کو مٹا دیا ہو؟

مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُتَقَبِّحُونَ ﴿۲۲﴾

ہم کو ان گنہگاروں سے بدلہ لینا ہے

خُلاصۂ تفسیر

اور یہ (کافر) لوگ کہتے ہیں کہ ہم جب زمین میں (میل چل کر) نیست و نابود ہو گئے، تو کیا ہم پھر (قیامت میں) نئے جنم میں آویں گے (اور یہ لوگ اس بعث و نشر پر صرف متعجب ہی نہیں ہیں جیسا کہ ظاہر ان کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے) بلکہ (درحقیقت) وہ لوگ اپنے

وقف غفران

۱۵۰

رب سے ملنے کے منکر ہی ہیں (اور یہ استفہام ان کا انکاری ہے) آپ (جواب میں) فرمادیں گے کہ تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے جو تم پر (اللہ کی طرف سے) متعین ہے، پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹا کر لائے جاؤ گے (جواب میں اصل مقصود تو یہی ہے کہ جو جن سے اور یَتَوَفَّيْكُمْ يَوْمَ يَمُوتُ فِي بَاطِنِ الْأَرْضِ لَمَّا كُنْتُمْ فِي أَعْيُنِنَا جَزَاءً لِمَ كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ میں بڑھا دینا تحویل کے لئے ہے کہ موت بھی فرشتہ کے ذریعہ سے آئے گی جو جان نکلنے کے وقت تم کو مائے دھاڑے گا بھی جیسا دوسری آیت میں ہے وَ لَوْ تَرَىٰ إِذِ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَالْهُلْأُ لَیْسَ مَرَجَاتُہُمْ کا انجام صرف خاک ہی میں مل جانا نہ ہوگا، جیسا تمہارا قول ءِذَا ضَلَلْنَا إِلَیْكَ سَعْدُکَ عَلَیْہِمْ عَلَیْمٌ سے معلوم ہوتا ہے) اور (اس رجوع کے وقت جس پر تَرْجَعُونَ دال ہے) اگر آپ (ان لوگوں کا حال) دیکھیں تو عجب حال دیکھیں جبکہ یہ مجرم لوگ (غایت شرمندگی سے) اپنے رب کے سامنے سر جھکائے (کھڑے) ہوں گے (اور کہتے ہوں گے) کہ اے ہمارے پروردگار بس (اب) ہماری آنکھیں اور کان کھل گئے (اور معلوم ہو گیا کہ پیغمبروں نے جو کچھ کہا سب حق تھا) سو ہم کو (دنیا میں) پھر بھیج دیجئے ہم (اب کے جا کر خوب) نیک کام کیا کریں گے (اب) ہم کو پورا یقین آ گیا اور (یہ کہنا ان کا بے کار محض ہو گا اس لئے کہ) اگر ہم کو (یہ) منظور ہوتا کہ ضرور ہی یہ راہ پر آئیں، تو ہم ہر اس شخص کو اس (کی نجات) کا راستہ (مقصود تک پہنچا دینے کے درجہ میں ضرور) عطا فرماتے (جیسا کہ ہدایت بمعنی مطلوب کا راستہ دکھانا ان کو عطا فرماتی ہے) لیکن میری (تو) یہ (ازلی تقدیری) بات (بہت سی حکمتوں سے) محقق ہو چکی ہے کہ میں جہنم کو جنات و انسان دونوں (میں جو کافر ہوں گے ان) سے ضرور بھر دوں گا (اور بیان بعض حکمتوں کا سورۃ ہود کے اخیر میں ایسی ہی آیت کی تفسیر میں گذرا ہے) تو (ان سے کہا جائے گا کہ) اب اس کا مزہ چکھو کہ تم اپنے اس دن کے آنے کو بھولے رہو، ہم نے تم کو بھلا دیا (یعنی رحمت سے محروم کر دیا جس کو بھلانا مجازاً کہہ دیا) اور (ہم جو کہتے ہیں کہ مزہ چکھو، تو ایک دور و ترکا نہیں بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اپنے اعمال (بد) کی بدولت ابدی عذاب کا مزہ چکھو (یہ تو کفار کا حال اور ان کا مال ہوا۔ آگے مؤمنین کا حال اور مال مذکور ہی، یعنی) بس ہماری آیتوں پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو وہ آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں (جس کی تحقیق سورۃ مریم کے رکوع چہارم میں ہوئی ہے) اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے لگتے ہیں اور وہ لوگ (ایمان سے) تکبر نہیں کرتے (جیسا کافر کا حال آیا ہے وَ لَیْ سَکْرًا، یہ تو ان کی تصدیق و اقرار و اخلاق کا حال تھا اور اعمال کا حال یہ ہے کہ شب کو) ان کے پہلو خواہگا ہوں سے

علحدہ ہوتے ہیں خواہ فرض عشاء کے لئے یا تہجد کے لئے بھی اور اس سے سب روایتیں صحیح ہو گئیں اور خالی علحدہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس طور پر (علحدہ ہوتے ہیں) کہ وہ لوگ اپنے رب کو (ثواب کی) امید سے اور عذاب کے خوف سے پکارتے ہیں اس میں نماز اور دعا و ذکر سب آگیا اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں (مطلب یہ کہ ایمان لانے والوں کی یہ صفات ہیں جن میں بعض تو نفسِ ایمان کا موقوف علیہ ہیں اور بعض کمالِ ایمان کا) سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانہ غیب میں موجود ہے، یہ ان کو ان کے اعمال و نیک کا صلہ ملا ہے (اور جب فریقین کا حال اور مآل معلوم ہو گیا، تو اب بتلاؤ) جو شخص مومن ہو کیا وہ اس شخص جیسا ہو جائے گا جو بے حکم (یعنی کافر) ہو (نہیں) وہ آپس میں نہ حالانہ مالا، برابر نہیں ہو سکتے (چنانچہ معلوم بھی ہوا ہے، اور خاص مآل میں برابر نہ ہونے کی تفصیل تاکید کے لئے پھر بھی سن لو کہ) جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے، سو ان کے لئے ہمیشہ کا ٹھکانہ جنتیں ہیں، جو ان کے اعمال (نیک) کے بدلہ میں بطور ان کی مہمانی کے ہیں (یعنی مثل جہان کے ان کو یہ چیزیں اکرام کے ساتھ ملیں گی نہ کہ سائل محتاج کی طرح بے قدری اور بے وقعتی کے ساتھ) اور جو لوگ بے حکم تھے سو ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے وہ لوگ جب اس سے باہر نکلنا چاہیں گے (اور کنارہ کی طرف کو بڑھیں گے) گو بوجہ گہرائی کے اور دروازوں کے قفل ہونے کے نکل نہ سکیں گے، مگر ایسے وقت میں یہ حرکت طبعی ہوتی ہے (تو پھر اسی میں دھکیل دی جاویں گے) اور ان کو کہا جائے گا کہ دوزخ کا وہ عذاب چکھو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے، (اور یہ عذاب موعود تو آخرت میں ہو گا) اور ہم ان کو قریب کا (یعنی دنیا میں آنے والا) عذاب بھی اس بڑے عذاب (موعود فی الآخرة) سے پہلے چکھا دیں گے (جیسے امراض و اسقام و مصائب کذا فی الدرر مرفوعاً و موقوفاً، کیونکہ امراض و آفات حسب تصریح قرآن اکثر اعمالِ بد کے سبب آتے ہیں) تاکہ یہ لوگ (متاثر ہو کر کفر سے) باز آئیں (کہو کہ تعالیٰ ظہر الفساد والی) میرے جھوٹ، پھر جو باز نہ آئے اس کے لئے عذاب اکبر ہے ہی) اور ایسے لوگوں پر عذاب ہونے سے کچھ تعجب نہ ہونا چاہئے کیونکہ اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو گا جس کو اس کے رب کی آیتیں یاد دلائی جائیں پھر وہ ان سے اعراض کرے (تو اس کے استحقاقِ عذاب میں کیا شبہ ہے، اس لئے) ہم ایسے مجرموں سے بدلہ لیں گے :

معارف و مسائل

قُلْ يَتُوبَ فِكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي ذُكِّرَ بِكُمْ، اس سے پہلی آیت میں مشرکین قیامت کو تنبیہ اور ان کے اس استعجاب کا جواب تھا کہ مرنے اور مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے، اس آیت میں اس کا بیان ہے کہ اپنی موت پر وہ بیان دو اور غور کرو وہ خود حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ایک بڑا منظر ہے، تم اپنی غفلت و جہل سے سمجھتے ہو کہ انسان کی موت خود بخود آجاتی ہے، بات یہ نہیں بلکہ اللہ کے نزدیک تمہاری موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اور اس کے لئے فرشتوں کا ایک خاص نظام ہے۔ جن میں بڑے عزرائیل علیہ السلام ہیں کہ ساری دنیا کی موت ان کے انتظام میں دی گئی ہے۔ جس شخص کی جن وقت، جس جگہ موت مقدر ہو ٹھیک اسی وقت وہ اس کی روح قبض کرتے ہیں۔ آیت مذکورہ میں اسی کا بیان ہے۔ اور اس میں ملک الموت بلفظ مفسر ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد عزرائیل علیہ السلام ہیں۔ اور ایک دوسری آیت میں فرمایا ہے اَلَّذِينَ تَتَوَفَّيْهُمْ الْمَلَائِكَةُ اس میں ملائکہ بلفظ صحیح لایا گیا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ عزرائیل علیہ السلام تنہا یہ کام انجام نہیں دیتے، ان کے ماتحت بہت سے فرشتے اس میں شریک ہوتے ہیں۔

قبض روح اور ملک الموت | امام تفسیر مجاہد نے فرمایا کہ ساری دنیا ملک الموت کے سامنے کے متعلق بعض تفصیلات ایسی ہے جیسے کسی انسان کے سامنے ایک کھلے طشت میں دانے پڑے ہوں، وہ جس کو چاہے اٹھالے۔ یہ مضمون ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے (ذکرہ الفترطی فی التذکرہ)

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک انصاری صحابی کے سرہانے ملک الموت کو دیکھا تو فرمایا کہ میرے صحابی کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو۔ ملک الموت نے جواب دیا کہ آپ مطمئن رہیں، میں ہر مومن کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرتا ہوں اور فرمایا کہ جتنے آدمی شہروں میں یا دیہات اور جنگلوں پہاڑوں میں یا دریا میں آباد ہیں، میں ان میں سے ہر ایک کو دن میں پانچ مرتبہ دیکھتا ہوں۔ اس لئے میں ان کے ہر چھوٹے بڑے سے بلا واسطہ واقف ہوں۔ پھر فرمایا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ جو کچھ ہے اللہ کے حکم سے ہے ورنہ میں اگر ایک پتھر کی روح بھی قبض کرنا چاہوں تو مجھے اس پر قدرت نہیں، جب تک اللہ تعالیٰ ہی کا امر اس کے لئے نہ آجائے۔

کیا جانوروں کی روح بھی ملک الموت قبض کرتے ہیں؟ | مذکورہ روایت حدیث سے معلوم ہوتا ہے

کہ چھپر کی روح بھی باذن خداوندی ملک الموت ہی قبض کرتے ہیں۔ حضرت امام مالکؒ نے ایک سوال کے جواب میں یہی فرمایا ہے، مگر بعض دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے کے ذریعہ قبض روح انسان کے لئے مخصوص ہے، اس کی شرافت و کرامت کے لئے، باقی جانور باذن خداوندی بغیر واسطہ فرشتے کے مرجائیں گے (ذکرہ ابن عطیہ از قرطبی) یہی مضمون ابوالشیخ، عقیلی، دیلمی وغیرہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہائم اور حشرات الارض سب کے سب اللہ کی تسبیح میں مشغول رہتے ہیں (یہی ان کی زندگی ہے) جب ان کی تسبیح ختم ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی روح قبض فرمالتا ہے، جانوروں کی موت ملک الموت کے سپرد نہیں۔

اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت ابن عمرؓ سے بھی روایت کی گئی ہے۔ (منظری) اور ایک روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عزرائیل علیہ السلام کے سپرد ساری دنیا کی موت کا معاملہ کیا تو انھوں نے عرض کیا اے میرے پروردگار! آپ نے مجھے ایسی خدمت سپرد کی کہ ساری دنیا اور سب بنی آدم مجھے برا کہیں گے، اور جب میرا ذکر آئے گا بُرائی سے کریں گے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اس کا تدارک اس طرح کر دیا ہے کہ دنیا میں موت کے کچھ ظاہری اسباب اور امراض رکھ دیئے ہیں جن کے سبب لوگ موت کو ان اسباب و امراض کی طرت منسوب کریں گے آپ ان کی بدگوئی سے محفوظ رہیں گے۔ (قرطبی فی التفسیر والتذکرہ)

اور امام بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جتنے امراض اور درد اور زخم وغیرہ ہیں وہ سب موت کے قاصد ہیں، انسان کو اس کی موت یاد دلاتے ہیں، پھر جب موت کا وقت آجاتا ہے تو ملک الموت مرنے والے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے بندہ خدا میں نے اپنے آنے سے پہلے کتنی خبریں کتنے قاصد یکے بعد دیگرے تجھے خبردار کرنے اور موت کی تیاری کرنے کے لئے بصورتِ امراض و حوادث بھیجے ہیں، اب میں آپہونچا۔ جس کے بعد کوئی اور خبر دینے والا یا کوئی قاصد نہیں آئے گا اب تم اپنے رب کے حکم کو لا محالہ مانو گے خواہ خوشی سے یا مجبوری سے۔ (منظری)

مسئلہ ۱۔ ملک الموت کسی کی موت کا وقت پہلے سے نہیں جانتا، جب تک کہ اس کو حکم نہ دیا جائے کہ فلاں کی روح قبض کر لو (اخر جہ احمد و ابن ابی الدنیا عن معمر، منظری) تَجَافَىٰ جُنُوجُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا، سابعہ۔ آیات میں کفار و مشرکین و منکرین قیامت کو تنہات تھیں۔ اس کے بعد (اِنَّمَا يُؤْمِنُ

یا یٰٰتِیْنٰ) سے مومنین مخلصین کی خاص صفات اور ان کے لئے درجات عظیمہ کا ذکر ہے۔ ان مومنین کی ایک صفت آیت مذکورہ میں یہ بتلائی گئی ہے کہ ان کے پہلو اپنے بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں، اور بستروں سے اٹھ کر اللہ کے ذکر اور دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اللہ کی ناراضی اور عذاب سے ڈرتے ہیں، اور اس کی رحمت اور ثواب کے امیدوار رہتے ہیں۔ یہی امید و بیم کی مہل مہل حالت ان کو ذکر و دعا کیلئے مضطرب رکھتی ہے۔ نماز، تہجد، بستروں سے اٹھ کر ذکر و دعا میں مشغول ہو جانے سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک نماز تہجد اور نوافل ہیں جو سو کر اٹھنے کے بعد پڑھی جاتی ہیں (ہو قول الحسن و مجاہد و مالک و الاوزاعی) اور روایات حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

مسند احمد، ترمذی، نسائی وغیرہ میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھا۔ ایک روز میں دوران سفر میں صبح کے وقت آپ کے قریب ہوا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے جو مجھے جنت میں داخل کرے، اور جہنم سے دور کر دے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے ایک بڑی چیز کا سوال کیا، مگر جس کے لئے اللہ تعالیٰ آسان کر دے اس کو وہ آسان ہو جاتی ہے۔ اور فرمایا کہ وہ عمل یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو، اور بیت اللہ کا حج کرو۔ اور پھر فرمایا کہ اب میں تمہیں خیر یعنی نیکی کے ابواب بتلا دیتا ہوں (وہ یہ ہیں کہ) روزہ ڈھال ہے (جو عذاب سے بچاتا ہے) اور صدقہ آدمی کے گناہوں کی آگ بجھا دیتا ہے، اسی طرح آدمی کی نماز دنیا میں شب میں۔ اور یہ فرما کر قرآن مجید کی آیت مذکورہ تلاوت فرمائی تَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ حضرت ابوالدرداءؓ اور قتادہؓ اور ضحاکؓ نے فرمایا ہے کہ پہلوؤں کے بستروں سے الگ ہو جانے کی یہ صفت ان لوگوں پر بھی صادق ہے جو عشاء کی نماز جماعت سے ادا کریں پھر صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھیں۔ اور ترمذی میں بسند صحیح حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ یہ تَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ کی نماز سے پہلے نہ سونے اور جماعت عشاء کا انتظار کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

اور بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت ان لوگوں سے متعلق ہے جو مغرب اور عشاء کے درمیان نوافل پڑھتے ہیں۔ (رواہ محمد بن نصر) اور حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کے متعلق فرمایا کہ جو لوگ جب آنکھ کھلے اللہ کا ذکر کریں لیٹے، بیٹھے اور کھڑے ہو وہ بھی اس میں داخل ہیں۔

ابن کثیر اور دوسرے کرامتہ تفسیر نے فرمایا کہ ان سب اقوال میں کوئی تضاد نہیں، صحیح بات یہ ہو کہ یہ آیت ان سب کو شامل ہے۔ اور آخر شب کی نماز ان سب میں اعلیٰ و افضل پر بیان قرآن میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

اور حضرت اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو قیامت کے روز جمع فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منادی کھڑا ہوگا جس کی آواز تمام مخلوقات سنیں گی وہ ندا دے گا کہ اہل محشر آج جان لیں گے کہ اللہ کے نزدیک کون لوگ عزت و اکرام کے مستحق ہیں۔ پھر وہ فرشتہ ندا دے گا کہ اہل محشر میں سے وہ لوگ کھڑے ہوں جن کی صفت یہ تھی تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یعنی ان کے پہلو بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں، اس آواز پر یہ لوگ کھڑے ہوں گے جن کی تعداد قلیل ہوگی (ابن کثیر) اور اسی روایت کے بعض الفاظ میں ہے کہ یہ لوگ بغیر حساب کے جنت میں بھیج دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد اور تمام لوگ کھڑے ہوں گے، ان سے حساب لیا جائے گا (مظہری)

وَلَنُنَبِّئَهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الَّاٰذَنِي دُونَ الْعَذَابِ الَّاٰ كَبِيرٍ، لَعَنَهُمْ
يَرْجِعُونَ، ادنیٰ بمعنی اقرب ہے، اور عذاب ادنیٰ سے مراد دنیا کے مصائب و آفات،
اور امراض وغیرہ ہیں، اور عذاب اکبر سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔

دنیا کے مصائب اُن لوگوں | مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو ان کے گناہوں پر
کے لئے رحمت ہیں جو اللہ کی | متنبہ کرنے کے لئے دنیا میں اُن پر امراض اور مصائب و
طوف رجوع کریں ؟؟؟ | آفات مسلط کر دیتے ہیں، تاکہ یہ متنبہ ہو کر اپنے گناہوں سے باز
آجائیں، اور آخرت کے عذاب اکبر سے نجات پائیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ گنہگاروں کے لئے دنیا کے مصائب و آفات اور
امراض و تکالیف بھی ایک قسم کی رحمت ہی ہیں کہ غفلت سے باز آکر عذاب آخرت
سے بچ جائیں۔ البتہ جو لوگ آفات پر بھی اللہ کی طرف رجوع نہ ہوں ان کے لئے یہ
دوہرا عذاب ہو جاتا ہے، ایک اسی دنیا میں نفٹ اور دوسرا آخرت کا عذاب اکبر۔ اور
انبیاء و اولیاء اللہ پر جو آفات و مصائب آتے ہیں ان کا معاملہ ان سب سے الگ ہے وہ
ان کے امتحان اور امتحان کے ذریعہ رفع درجات کے لئے ہوتے ہیں، اور پہچان اس
کی یہ ہے کہ ان لوگوں کو امراض و آفات کے وقت بھی ایک قسم کا قلبی سکون و اطمینان
اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

بعض جرائم کی سزا آخرت پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے۔ مگر بعض روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے، ایک حق کے خلاف جھنڈوں اور نعروں کے ساتھ اعلاناً کوشش کرنا، دوسرے والدین کی نافرمانی، تیسرے ظالم کی امداد۔ (رواہ ابن جریر عن معاذ بن جبل)

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهِ وَ

اور ہم نے دی ہر موسیٰ کو کتاب سو تو مت رہ دھوکے میں اس کے ملنے سے اور

جَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَءِيلَ ۖ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ آيَةً

کیا ہم نے اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے۔ اور کئے ہم نے ان میں پیشوا جو

يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا صَبِرُوا فِئْدًا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ۚ

راہ چلاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ

تیرا رب جو ہر وہی فیصلہ کرے گا ان میں دن قیامت کے جس بات میں کہ وہ اختلاف

يَخْتَلِفُونَ ۚ أَوَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ كُفْرًا كَبِيرًا ۚ

کرتے تھے۔ کیا ان کو راہ نہ سوجھی اس بات سے کہ کتنی غارت کر ڈالیں ہم نے ان سے

الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسْجِدِهِمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً أَفَلَا

پہلے جماعتیں کہ پھرتے ہیں یہ ان کے گھروں میں اس میں بہت نشانیاں ہیں، کیا وہ

يَسْمَعُونَ ۚ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ

سننے نہیں؟ کیا دیکھا نہیں انھوں نے کہ ہم ہانک دیتے ہیں پانی کو ایک زمین چٹیل کی طرف

فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ ۚ أَفَلَا يُبْصِرُونَ ۚ

پھر ہم نکالتے ہیں اس سے کھیتی کہ کھاتے ہیں ان میں سے ان کے چوپائے اور خود وہ بھی، پھر کیا دیکھتے نہیں؟

وَقُولُوا مَتَىٰ هَٰذَا الْفَتْحُ ۚ إِنَّكُمْ صَدَقْتُمْ ۚ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ فیصلہ اگر تم سچے ہو ۔ تو کہہ کہ فیصلہ کے دن

لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۚ ۲۹ ۚ فَأَعْرِضْ

کام نہ آئے گا منکروں کا ایمان لانا اور نہ اُن کو ڈھیل ملے گی ۔ سو تو خیال چھوڑ

عَنْهُمْ ۚ وَانْتَظِرِ ۚ إِنَّهُمْ مُنْتَظَرُونَ ۚ ۳۰

ان کا اور منتظر رہ وہ بھی منتظر ہیں ۔

حُلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (آپ ہی کی طرح) کتاب دی تھی (جس کی اشاعت میں ان کو تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں، اسی طرح آپ کو بھی برداشت کرنا چاہئے، ایک تسلی تو یہ ہوئی، پھر اسی طرح آپ کو بھی کتاب دی) سو آپ (اپنی) اس (کتاب) کے ملنے میں کچھ شک نہ کیجئے (کہ قولہ تعالیٰ وَآتَاكَ لَشَقَّى الْعِشْرَانِ، مطلب یہ کہ آپ صاحب کتاب صاحب خطا ہیں پس جب آپ اللہ کے نزدیک ایسے مقبول ہیں تو اگر مشے چند احمق آپ کو قبول نہ کریں تو کوئی غم کی بات نہیں، ایک تسلی کی بات یہ ہوئی) اور ہم نے اس (کتاب موسیٰ) کو بنی اسرائیل کے لئے موجب ہدایت بنایا تھا (اسی طرح آپ کی کتاب سے بہتوں کو ہدایت ہوگی، آپ خوش رہتے، ایک تسلی یہ ہوئی) اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں بہت سے (دین کے) پیشوا بنا دیئے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے، جبکہ وہ لوگ (تکلیف پر) صبر کرتے رہتے، اور ہماری آیتوں کا یقین رکھتے تھے (اس لئے ان کی اشاعت اور خلق کی ہدایت میں مشقت گوارا کرتے تھے، یہ تسلی ہے مومنین کو کہ تم لوگ صبر کرو، اور جب تم صاحب یقین ہو اور یقین کا مقتضا صبر کرنا ہے تو تم کو صبر ضروری ہے، اس وقت ہم تم کو بھی ائمہ دین بنا دیں گے یہ تو تسلی دنیا کے اعتبار سے ہے، اور ایک تسلی آخرت کے اعتبار سے تم کو رکھنا چاہئے اور امر موجب تسلی یہ ہے کہ) آپ کا رب قیامت کے روز ان سب کے آپس میں (عملی) فیصلہ ان امور میں کر دے گا جن میں یہ باہم اختلاف کرتے تھے (یعنی مومن کو جنت میں اور کفار کو دوزخ میں ڈال دیگا اور قیامت بھی کچھ دور نہیں، اس سے بھی تسلی حاصل کرنا چاہئے، اور اس مضمون کو سن کر کفار دو شبہ کر سکتے تھے، ایک یہ کہ ہم اسی کو نہیں مانتے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا

کفر ناپسند ہے جیسا فیصلہ سے مفہوم ہوتا ہے، دوسرا یہ کہ ہم قیامت ہی کو ناممکن سمجھتے ہیں، آگے دونوں کے دفع کے لئے دو مضمون ہیں، اول یہ کہ ان کو جو کفر کے مبعوض ہونے میں شبہ ہے تو کیا ان کو یہ امر موجب رہنمائی نہیں ہوا کہ ہم ان سے پہلے ان کے کفر و شرک ہی کے سبب کتنی امتیں ہلاک کر چکے ہیں کہ ان کے طریق ہلاکت سے دینار نبی کی پیشینگوئی کے بعد بطور خرق عادت کے واقع ہونے سے خدا کا غضب ٹپکتا تھا جس سے مبعوض ہونا کفر کا صاف واضح ہوتا ہے جن کے رہنے کے مقامات میں یہ لوگ (اشنائے سفر شام میں) آتے جاتے (گزرتے) ہیں اس (امر) میں (تو) صاف نشانیاں (مبعوضیت کفر کی موجود) ہیں کیا یہ لوگ (ان گزشتہ اعم کے قصص) سنتے نہیں ہیں کہ مشہور ہیں اور زبانوں پر مذکور ہیں دوسرا مضمون یہ کہ ان کو جو قیامت میں شبہ عدم امکان کا ہے تو کیا انھوں نے اس بات پر نظر نہیں کیا کہ ہم (بادلوں یا نہروں وغیرہ کے ذریعہ سے) خشک زمین کی طرف پانی پہنچاتے ہیں پھر اس کے ذریعہ سے کھیتی پیدا کرتے ہیں جس سے ان کے مویشی اور وہ خود بھی کھاتے ہیں تو کیا اس بات کو شب و روز دیکھتے نہیں ہیں (یہ صاف نمونہ ہے مرکز زندہ ہونے کا، جیسا کہ اس کی تقریر گزری ہے، پس دونوں شبہ دفع ہو گئے) اور یہ لوگ (قیامت اور فیصلہ کا ذکر سن کر بطور استعجال و استہزاء کے یوں) کہتے ہیں کہ اگر تم (اس بات میں) سچے ہو تو (بتلاؤ) یہ فیصلہ کب ہوگا، آپ فرمادیجئے کہ (تم عبث اس کا تقاضا کرتے ہو تمھارے لئے تو وہ پوری مصیبت کا دن ہے، کیونکہ) اس فیصلہ کے دن کا فروں کو ان کا ایمان لانا (بالکل) نفع نہ دے گا اور یہی ایک صورت ان کے بچاؤ کی تھی اور وہی مفقود ہے) اور (نفع نجات تو کیا ہوتا) ان کو مہلت بھی (تو) نہ ملے گی سو (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے (جن کے خیال سے غم ہوتا ہے) اور آپ (فیصلہ موعود کے) منتظر رہئے یہ بھی (اپنے زعم میں آپ کے ضرر کے) منتظر ہیں (کقولہم نشر تبصیر ربیب المؤمنین، مگر معلوم ہو جائے گا کس کا انتظار مطابق واقع کے ہے اور کس کا نہیں، کقولہ تعالیٰ فی جوابہم قل تتر یصوؤا فانی معکم من المؤمنین یصین) ۛ

معارف و مسائل

فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهِ، لقاء کے معنی ملاقات کے ہیں اس آیت میں کس کی ملاقات کس سے مراد ہے؟ اس میں اہل تفسیر کے اقوال مختلف ہیں۔ ان میں ایک وہ ہے جس کو خلاصہ تفسیر میں اختیار کیا گیا ہے، کہ لِقَائِهِ کی ضمیر کتاب یعنی قرآن کی طرف راجع

قرار دے کر مطلب یہ لیا گیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے کتاب دی آپ بھی اپنی کتاب کے آنے میں کوئی شک نہ کریں، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں قرآن کے متعلق ایسے الفاظ آئے ہیں وَ اِنَّكَ لَتَكْفِي الْقُرْآنَ

اور حضرت ابن عباسؓ اور قتادہؓ سے اس کی تفسیر اس طرح منقول ہے کہ یقیناً کی ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجح ہے، اور اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ آپ اس میں شک نہ کریں کہ آپ کی ملاقات موسیٰ علیہ السلام سے ہوگی۔ چنانچہ ایک ملاقات شب معراج میں ہونا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، پھر قیامت میں ملاقات ہونا بھی ثابت ہے۔

اور حضرت حسن بصریؒ نے اس کی یہ تفسیر فرمائی ہے کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو ایک کتاب دی گئی اور لوگوں نے ان کی تکذیب کی اور ان کو ستایا۔ آپ بھی یقین رکھیں کہ یہ سب چیزیں آپ کو بھی پیش آئیں گی۔ اس لئے آپ کفار کی ایذاؤں سے دلگیر نہ ہوں، بلکہ اس کو سنت انبیاء سمجھ کر برداشت کریں۔

کسی قوم کا مقتدار و امام بننے کے لئے دو شرطیں
وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اٰیٰمَةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنا لَمَّا صَبَرُوْا وَ
كَانُوْا بِالْاٰیٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ، یعنی ہم نے بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگوں کو امام اور پیشوا و مقتدار بنا دیا جو اپنے پیغمبر کے نائب ہونے کی حیثیت سے باذن ربانی لوگوں کو ہدایت کیا کرتے تھے، جبکہ انھوں نے صبر کیا، اور جبکہ وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

اس آیت میں علماء بنی اسرائیل میں سے بعض کو امامت و پیشوائی کا درجہ عطا فرماتے کے سبب ذکر فرمائے ہیں، اول صبر کرنا، دوسرے آیات الہیہ پر یقین کرنا۔ صبر کرنے کا مفہوم عربی زبان کے اعتبار سے بہت وسیع اور عام ہے۔ اس کے لفظی معنی باندھنے اور ثابت رہنے کے ہیں۔ اس جگہ صبر سے مراد احکام الہیہ کی پابندی پر ثابت قدم رہنا اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام یا مکروہ قرار دیا ہے ان سے اپنے نفس کو روکنا ہے۔ جس میں تمام احکام شریعت کی پابندی آجاتی ہے، اور یہ بہت بڑا عملی کمال ہے۔ دوسرا سبب ان کا آیات الہیہ پر یقین رکھنا ہے۔ اس میں آیات کے مفہوم کو سمجھنا پھر سمجھ کر اس پر یقین کرنا دونوں داخل ہیں، یہ بہت بڑا کمال علمی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امامت و پیشوائی کے لائق اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہ لوگ ہیں جو عمل میں بھی کامل ہوں اور علم میں بھی، اور یہاں عملی کمال کو علمی کمال سے مقدم بیان فرمایا ہے۔

کہ ترتیب طبعی میں علم عمل سے مقدم ہوتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ کے نزدیک وہ علم قابل اعتبار ہی نہیں جس کے ساتھ عمل نہ ہو۔

ابن کثیر نے بعض علماء کا قول اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ **بِالصَّبْرِ وَالْيَقِينِ** تَنَالُوا الْإِمَامَةَ فِي الدِّيَارِ، یعنی صبر اور یقین ہی کے ذریعہ دین میں کسی کو امامت کا درجہ مل سکتا ہے **أَوْ لَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ صَفًّا لِّنُخْرِجَ بِهِ زَرْعًا**، یعنی کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم خشک زمین کی طرف پانی کو بعض مواقع میں، زمین پر چلا کر لے جاتے ہیں، جس سے اُن کی کھیتیاں اُگتی ہیں "بِزَرْعٍ خَشِكَ زَمِينَ" کو کہتے ہیں جس میں درخت نہیں اُگتے۔

زمین کی آبپاشی کا ایک خاص حکیمانہ نظام میں جا بجا اس طرح آیا ہے کہ اس زمین پر بارش برسی ہے، اس سے زمین تر و تازہ ہو کر اُگلنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ مگر اس آیت میں بارش کے بجائے پانی کو زمین پر چلا کر خشک زمین کی طرف لے جانے اور اس سے درخت اُگلنے کا ذکر فرمایا ہے۔ یعنی بارش کسی دوسری زمین پر نازل کی جاتی ہے وہاں سے ندی نالوں کے ذریعہ زمین پر چلا کر پانی کو خشک زمین کی طرف لیجا یا جاتا ہے جہاں بارش نہیں ہوتی۔

اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ بعض زمینیں ایسی خام اور نرم ہوتی ہیں جو بارش کی متحمل نہیں ہوتیں، اگر وہاں پوری بارش برساتی جائے تو عمارتیں منہدم ہو جائیں، درخت اکھڑ جائیں۔ اس لئے قدرت نے ایسی زمینوں کے لئے یہ نظام بنایا ہے کہ بارش تو اس زمین پر نازل کی جاتی ہے جو اس کی متحمل ہے، پھر یہاں سے پانی بہا کر ایسی زمینوں کی طرف لے جایا جاتا ہے جو بارش کی متحمل نہیں، جیسے مصر کی زمین ہے۔ اور بعض مفسرین نے یمن اور شام کی بعض زمینوں کو اس کا مصداق قرار دیا ہے دیکھا دی عن ابن عباس الحسن اور صحیح یہ ہے کہ یہ مضمون ایسی تمام زمینوں کو شامل ہے اور مصر کی زمین خصوصیت سے اس میں شامل ہے، جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ مگر بلاد حبشہ افریقہ کی بارشوں کا پانی دریائے نیل کے ذریعہ مصر میں آتا ہے، اور وہاں کی سرخ مٹی ساتھ لاتا ہے، جس میں انبات کا مادہ زیادہ ہے۔ اس لئے مصر کے لوگ اپنے ملک میں بارش نہ ہونے کے باوجود ہر سال نئے پانی اور نئی مٹی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ **فَلْيَبَارِكِ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ** وَلَيَقُولَنَّ مَتَى هَذَا الْفَتْحُ "یعنی کفار یہ کہتے ہیں کہ وہ فتح کب ہوگی" جس کا آپ ذکر کرتے ہیں کہ مومنین کو کفار پر غلبہ ہوگا، ہمیں تو کہیں اس کے آثار نظر نہیں آتے،

ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان خائف ہیں، چپتے پھرتے ہیں۔

اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ، یعنی آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ تم ہماری فتح کا دن ہم سے کیا پوچھتے ہو وہ دن تو تمہاری مصیبت کا ہوگا۔ کیونکہ جس وقت ہماری فتح ہوگی تو اس وقت تم عذاب میں گرفتار ہو چکے ہو گے، خواہ دنیا میں جیسے غزوہ بدر میں ہوا یا آخرت میں۔ اور جب اللہ بجا عذاب کسی کو پکڑ لیتا ہے پھر اس کا ایمان قبول نہیں ہوتا۔ کذا ذکرہ ابن کثیر اور ابن جریر نے اس جگہ مَتٰی هٰذَا الْفَتْحِ کے معنی روز قیامت کے کئے ہیں۔ اوپر خلاصہ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم ۛ

تَسْمِيٰ

سُورَةُ السَّجْدَةِ بِحَسَنِ اللَّهِ تَسْبِيحًا
فِي لَيْلَةِ عَرَفَةَ مِنْ ذِي الْحِجَّةِ ١٣٩١ هـ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سُورَةُ الْاَحْزَابِ

سُورَةُ الْاَحْزَابِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ ثَلَاثٌ وَسَبْعُونَ آيَةً وَتِسْعٌ وَرُكُوعَاتٌ

سورۃ احزاب مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی تہتر آیتیں ہیں اور نو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ

اے نبی! ڈر اللہ سے اور کہانہ مان منکروں کا اور دغا بازوں کا مقرر اللہ ہے

كَانَ عَلَيْهِ سَاحِكِيمًا ① وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ إِنَّ

سب کچھ جاننے والا حکمتوں والا ۔ اور چل اس پر جو حکم آئے تجھ کو تیرے رب کی طرف ، بیشک

اللَّهُ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ② وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ

اللہ تمھارے کام کی خبر رکھتا ہے ۔ اور بھروسہ رکھ اللہ پر اور اللہ

بِاللَّهِ وَكِيلًا ③

کافی ہے کام بنانے والا

مُخْلِصَةٌ تَفْسِير

اے نبی اللہ سے ڈرتے رہتے (اور کسی سے نہ ڈرتے) اور ان کی دھکیول کی ذرا پروا

نہ کیجئے) اور کافروں کا (جو کھلم کھلا دین کے خلاف مشورے دیتے ہیں) اور منافقوں کا (جو درپردہ

ان کے ساتھ متفق ہیں) کہنا نہ مانئے (بلکہ اللہ ہی کا کہنا کیجئے) بیشک اللہ تعالیٰ بڑا علم والا

بڑی حکمت والا ہے (اس کا ہر حکم فائدہ اور مصالح پر مشتمل ہوتا ہے) اور اللہ کا کہنا ماننا یہ ہے کہ آپ کے پروردگار کی طرف سے جو حکم آپ پر وحی کیا جاتا ہے اس پر چلتے (اور اے لوگو) بیشک تم لوگوں کے سب اعمال کی اللہ تعالیٰ — پوری خبر رکھتا ہے رحم میں سے جو ہمارے پیغمبر کی مخالفت اور مزاحمت کر رہے ہیں ہم سب کو سمجھیں گے، اور (اے نبی) آپ (ان لوگوں کی دھمکیوں کے معاملہ میں) اللہ پر بھروسہ رکھتے اور اللہ کافی کارساز ہے (اس کے مقابلہ میں ان لوگوں کی کوئی تدبیر نہیں چل سکتی، اس لئے کچھ فکر نہ کیجئے، البتہ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کسی تبار کو مقتضی ہو اور اس کی وجہ سے کوئی عارضی تکلیف پہنچ جائے تو وہ ضرر نہیں بلکہ عین منفعت ہی) :

معارف و مسائل

یہ مدنی سورۃ ہے اس کے بیشتر مضامین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت اور خصوصیت عند اللہ پر مشتمل ہیں، جس میں آپ کی تعظیم کا واجب ہونا اور آپ کی ایذا رسانی کا حرام ہونا مختلف عنوانات سے بیان ہوا ہے۔ اور باقی مضامین سورۃ بھی انہی کی تکمیل و اتمام سے مناسبت رکھتے ہیں۔

شان نزول اس سورۃ کے سبب نزول میں چند روایات منقول ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہوئے، تو مدینہ کے آس پاس یہود کے قبائل، بنو قریظہ، بنو نضیر، بنو قینقار وغیرہ آباد تھے۔ رحمتہ للعالمین کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کسی طرح یہ لوگ مسلمان ہو جائیں۔ اتفاقاً ان یہودیوں میں سے چند آدمی آپ کی خدمت میں آنے لگے، اور منافقانہ طور پر اپنے آپ کو مسلمان کہنے لگے، دلوں میں ایمان نہیں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو غیبت سمجھا، کہ کچھ لوگ مسلمان ہو جائیں تو دوسروں کو دعوت دینا آسان ہو جائے گا۔ اس لئے آپ ان لوگوں کے ساتھ خاص مدارات کا معاملہ فرماتے، اور ان کے چھوٹے بڑے آنے والوں کا اکرام کرتے تھے، اور کوئی بُری بات بھی ان سے صادر ہوتی تو دینی مصلحت سمجھ کر اس سے چشم پوشی فرماتے تھے۔ اس واقعہ پر سورۃ احزاب کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ (قرطبی)

ایک دوسرا واقعہ ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی سے نقل کیا ہے کہ ہجرت کے بعد کفار مکہ میں سے ولید بن مغیرہ اور شیبہ ابن ربیعہ مدینہ طیبہ آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ پیشکش کی کہ ہم سب قریش مکہ کے آدھے اموال آپ کو دیدیں گے اگر آپ اپنے دعوے کو چھوڑ دیں۔ اور مدینہ طیبہ کے منافقین اور یہود نے آپ کو یہ

دھکی دی کہ اگر آپ نے اپنا دعویٰ اور دعوت سے رجوع نہ کیا تو ہم آپ کو قتل کر دیں گے۔
اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں (روح)

تیسرا ایک واقعہ ثعلبی اور واحدی نے بغیر سند یہ نقل کیا ہے کہ ابوسفیان اور عکرمہ ابن ابی جہل اور ابوالاعور سہمی اس زمانے میں جب واقعہ حدیبیہ میں کفار مکہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ترک جنگ پر معاہدہ ہو گیا تھا تو یہ لوگ مدینہ طیبہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ہمارے معبودوں کا بُرائی سے ذکر کرنا چھوڑ دیں، صرف اتنا کہہ دیں کہ یہ بھی شفاعت کریں گے اور نفع پہنچائیں گے۔ آپ اتنا کر لیں تو ہم آپ کو اور آپ کے رب کو چھوڑ دیں گے، جھگڑا ختم ہو جائے گا۔

ان کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں کو سخت ناگوار ہوئی، مسلمانوں نے ان کے قتل کا ارادہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان سے معاہدہ صلح کر چکا ہوں اس لئے ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں (روح) یہ روایات اگرچہ مختلف ہیں مگر درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں، یہ واقعات بھی آیات مذکورہ کے نزول کا سبب ہو سکتے ہیں۔

ان آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو حکم دیئے گئے: پہلا اَتَّقِ اللہَ یعنی اللہ سے ڈرو، دوسرا لَا تُطِيعُوا الْكٰفِرِیْنَ یعنی کافروں کا کہنا نہ مانو۔ اللہ سے ڈرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ ان لوگوں کو قتل کرنا عہد شکنی ہے جو حرام ہے۔ اور کفار کی بات نہ ماننے کا حکم اس لئے کہ ان تمام واقعات میں کفار کی جو فرمائشیں ہیں وہ ماننے کے قابل نہیں۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللہَ، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اعزاز و اکرام ہے کہ پورے قرآن میں کہیں آپ کو نام لے کر خطاب نہیں کیا گیا، جیسا کہ دوسرے انبیاء کے خطابات میں یَا اٰدَمُ، یَا نُوحُ، یَا اِبْرٰهیمُ، یَا مُوسٰی وغیرہ بار بار آیا ہے، بلکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے قرآن میں جہاں خطاب کیا گیا وہ کسی لقب نبی یا رسول وغیرہ سے خطاب کیا گیا۔ صرف چار مواقع جن میں یہی بتلانا منظور تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، ان میں آپ کا نام ذکر کیا گیا ہے جو ضروری تھا۔

اس خطاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو حکم دیئے گئے۔ ایک خدا تعالیٰ سے ڈرنے کا، کہ مشرکین مکہ سے جو معاہدہ ہو چکا ہے اس کی خلاف ورزی نہ ہونی چاہیے، دوسرے مشرکین اور منافقین و یہود کی بات نہ ماننے کا۔ یہاں جو یہ سوال پیدا ہوتا ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ہر گناہ سے معصوم ہیں، عہد شکنی بھی گناہ کبیرہ ہے، اور کفار و مشرکین کی وہ باتیں جو شانِ نزول میں اوپر بیان کی گئیں، ان کا ماننا بھی گناہ عظیم ہے تو آپ خود ہی اس سے محفوظ تھے۔ پھر اس حکم کی ضرورت کیا پیش آتی؟ روح المعانی میں ہے کہ مراد ان احکام سے آئندہ بھی ان پر قائم رہنے کی ہدایت ہے جیسا کہ اس واقعہ میں آپ ان پر قائم رہے اور اتق اللہ کے حکم کو اس لئے مقدم کیا کہ مسلمانوں نے ان مشرکین مکہ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا جن سے معاہدہ صلح ہو چکا تھا۔ اس لئے عہد شکنی سے بچنے کی ہدایت لفظ اتق اللہ کے ذریعہ مقدم کی گئی۔ بخلاف اطاعت کفار و مشرکین کے کہ اس کا کسی نے ارادہ بھی نہ کیا تھا اس لئے اس کو مؤخر کیا گیا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مراد امت کو سنانا ہے، آپ تو معصوم تھے، احکام الہیہ کی خلاف ورزی کا آپ سے کوئی احتمال نہ تھا۔ مگر قانون پوری امت کے لئے ہے، ان کو سنانے کا عنوان یہ اختیار کیا گیا کہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا جس سے حکم کی اہمیت بہت بڑھ گئی، کہ جب اللہ کے رسول بھی اس کے مخاطب ہیں تو امت کا کوئی فرد اس سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔

اور ابن کثیر نے فرمایا کہ اس آیت میں کفار و مشرکین کی اطاعت سے منع کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ آپ ان سے مشورے نہ کریں، ان کو زیادہ مجالست کا موقع نہ دیں کیونکہ ایسے مشورے اور باہمی روابط اوقات اس کا سبب بن جایا کرتے ہیں کہ ان کی بات مان لیجئے تو اگرچہ ان کی بات مان لینے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی احتمال نہ تھا، مگر ان کے تھا ایسے روابط رکھنے اور ان کو اپنے مشوروں میں شریک کرنے سے بھی آپ کو روک دیا گیا، اور اس کو اطاعت کے لفظ سے اس لئے تعبیر کر دیا کہ ایسے مشورے اور باہمی روابط عادیہ ماننے کا سبب بن جایا کرتے ہیں۔ تو یہاں درحقیقت آپ کو اسباب اطاعت سے منع کیا گیا ہے، نفس اطاعت کا تو آپ سے احتمال ہی تھا۔

رہا یہ سوال کہ آیت مذکورہ میں کافروں کی طرف سے خلافت شرع اور خلافت حق باتوں کا اظہار تو کوئی بعید نہیں، ان کی اطاعت سے منع کرنا بھی ظاہر ہے۔ مگر منافقین نے اگر اسلام کے خلافت کوئی بات آپ سے کہی تو پھر وہ منافقین نہ رہے، کھلے کافر ہو گئے ان کو الگ ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہوتی؟ جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ منافقین نے بالکل کھول کر تو کوئی بات خلافت اسلام نہ کہی ہو، مگر دوسرے کفار کی تائید اور حمایت میں کوئی کلمہ کہا ہو۔

اور منافقین کا جو واقعہ شانِ نزول میں اوپر بیان ہوا ہے، اگر اس کو سببِ نزول قرار دیا جائے تو اس میں اشکال ہی نہیں کیونکہ اس واقعہ کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے روکا گیا ہے کہ ان اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے یہود سے آپ زیادہ مدارات کا معاملہ نہ کریں۔

اس آیت کے آخر میں إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا، فرما کر اس حکم کی حکمت بیان کر دی گئی۔ جو اوپر دیا گیا ہے کہ اللہ سے ڈریں، اور کفار و منافقین کا کہنا نہ مانیں۔ کیونکہ عواقب امور اور نتائج کا جاننے والا اللہ تعالیٰ بڑا حکیم ہے، وہی مصالحِ عباد کو جانتا ہے۔ یہ اس لئے فرمایا کہ کفار یا منافقین کی بعض باتیں ایسی بھی تھیں جن سے شر و فساد کم ہونے اور باہمی رواداری کی فضا قائم ہونے وغیرہ کے فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ مگر حق تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا کہ ان لوگوں کے ساتھ یہ رواداری بھی مصلحتِ خلافت ہے، اس کا انجام اچھا نہیں۔

وَابْتَغِ مَالَكُم مِّن رَّبِّكَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا، یہ پہلے ہی حکم کا تکملہ ہے کہ آپ کفار و منافقین کی باتوں میں نہ آئیں، اُن کی بات نہ مانیں بلکہ جو کچھ اللہ کی طرف سے آپ کو بذریعہ وحی بتلایا گیا ہے بس آپ اور صحابہ اسی کا اتباع کریں۔ چونکہ اس خطاب میں صحابہ کرام اور عام مسلمان بھی شامل ہیں، اس لئے آخر میں بِصِيغَةٍ جَمْعٍ بِمَا تَعْمَلُونَ فرما کر تنبیہ کر دی گئی۔

وَقَوْلُكَ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا، یہ بھی اسی حکم کی تکمیل ہے۔ اس میں ارشاد ہے کہ آپ ان لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھریں، اور اپنے مقصد کی کامیابی میں صرف اللہ پر بھروسہ کریں کہ وہی کافی کارساز ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے آپ کسی کی رواداری کی ضرورت نہیں۔

مَسْئَلَةٌ: آیات مذکورہ سے ثابت ہوا کہ امورِ دین میں کفار سے مشورہ لینا بھی جائز نہیں۔ دوسرے امور جن کا تعلق تجربہ وغیرہ سے ہو ان میں مشورہ لینے میں مصافحت نہیں۔ واللہ اعلم

مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ وَمَا جَعَلَ

اللہ نے رکھے نہیں کسی مرد کے دودل اس کے اندر اور نہیں کیا تمھاری

أَزْوَاجَكُمْ أَلِيًّا تَضَاهَوْنَ مِنْهُمْ أَمْ هُمْ أَدْعِيَاءُ كُمْ

جو روؤں کو جن کو ماں کہہ بیٹھے ہو (بچی) مائیں تمھاری اور نہیں کیا تمھارے پاکوں کو تمھارے

أَبْنَاءَكُمْ قُلْ لَكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ

بیٹے، یہ تمہاری بات ہی اپنے منہ کی، اور اللہ کہتا ہے ٹھیک بات اور

يَهْدِي السَّبِيلَ ۝ أَدْعُوهُمْ لَا بِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ

وہی سچھاتا ہے راہ۔ پکارو لے پاگوں کو ان کے باپ کی طرف نسبت کر کے یہی پورا انصاف اللہ کے یہاں

فَإِنْ لَّمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَإِخوانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ

پھر اگر نہ جانتے ہو ان کے باپ کو تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور رفیق ہیں،

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيهَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ ۚ وَلَكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ

اور گناہ نہیں تم پر جس چیز میں چوک جاؤ، پر وہ جو دل سے ارادہ

قُلُوبُكُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

کرد، اور ہی اللہ بخشنے والا مہربان۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے اور (اسی طرح) تمہاری
اُن بیبیوں کو جن سے تم ظہار کر لیتے ہو تمہاری ماں نہیں بنایا اور اسی طرح سمجھ لو کہ تمہارے
مٹھ بولے بیٹوں کو تمہارا (سچ مچ کا) بیٹا (بھی) نہیں بنادیا یہ صرف تمہارے منہ سے کہنے کی
بات ہے (جو غلط ہے واقع کے مطابق نہیں) اور اللہ تعالیٰ حق بات فرماتا ہے اور وہی
سیدھا راستہ بتلاتا ہے (اور جب تم بولے بیٹے واقع میں تمہارے بیٹے نہیں تو) تم اُن کو
(متبہی بنانے والوں کا بیٹا مت کہو، بلکہ) ان کے (حقیقی) باپوں کی طرف منسوب کیا کرو،
یہ اللہ کے نزدیک راستی کی بات ہے، اور اگر تم ان کے باپوں کو نہ جانتے ہو تو اُن کو اپنا
بھائی یا اپنا دوست کہہ کر پکارو کیونکہ آخر) وہ تمہارے دین کے بھائی ہیں اور تمہارے
دوست ہیں، اور تم کو اس میں جو بھول چوک ہو جائے تو اس سے تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا
لیکن ہاں جو دل سے ارادہ کر کے کہو (تو اس سے گناہ ہوگا) اور (اس سے بھی معافی مانگے
تو معاف ہو جائے گا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۝

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار و منافقین کے مشوروں پر عمل نہ کرنے اور ان کی بات نہ ماننے کی ہدایت ہے۔ آیات مذکورہ میں کفار میں چلی ہوئی تین رسموں اور باطل خیالات کی تردید ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں عرب لوگ لیے شخص کو جو زیادہ ذہین ہو یہ کہا کرتے تھے کہ اس کے سینے میں دو دل ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں اپنی ازواج کے متعلق ایک رسم تھی کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو اپنی ماں کی بیٹھیا یا اور کسی عضو سے تشبیہ دی اور کہہ دیا کہ تو میرے لئے ایسی ہے جیسے میری ماں کی بیٹھیا، اس کو ان کے محاورہ میں ظہار کہا جاتا تھا، جو ظہر سے مشتق ہے، ظہر کے معنی ہیں بیٹھیا۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ جس شخص نے اپنی بیوی سے ظہار کر لیا وہ ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہو گئی۔

تیسرے یہ کہ ان میں ایک رسم یہ تھی کہ ایک آدمی کسی دوسرے کے بیٹے کو اپنا متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) بنا لیتا تھا اور جو اس طرح بیٹا بناتا یہ لڑکا اسی کا بیٹا مشہور ہو جاتا، اور اسی کا بیٹا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اور ان کے نزدیک یہ منہ بولا بیٹا تمام احکام میں اصلی بیٹے کی طرح مانا جاتا تھا۔ مثلاً میراث میں بھی اس کی اولاد کے ساتھ مثل حقیقی اولاد کے شریک ہوتا تھا اور نسبی رشتہ سے جن عورتوں کے ساتھ نکاح حرام ہوتا ہے، یہ منہ بولے بیٹے کے رشتہ کو بھی ایسا ہی قرار دیتے۔ مثلاً جیسے اپنے حقیقی بیٹے کی بیوی سے اس کے طلاق دینے کے بعد بھی نکاح حرام رہتا ہے یہ منہ بولے بیٹے کی بیوی کو بھی بعد طلاق اس شخص کے لئے حرام سمجھتے تھے۔

زمانہ جاہلیت کے یہ تین باطل خیالات در رسوم تھے جن میں سے پہلی بات اگرچہ مذہبی عقیدے یا عمل سے متعلق نہیں تھی۔ اس لئے شریعت اسلام کو اس کی تردید کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ محض فن تشریح و طب کا معاملہ تھا کہ انسان کے سینے میں ایک ہی دل ہوتا ہے یا دو بھی ہوتے ہیں، اس کا ظاہر بطلان ہونا سبھی کو معلوم تھا۔ اس لئے شاید اس کے بطلان کے ذکر کو بھی باقی دو مسئلوں کی تائید و تمہید کے طور پر بیان کر دیا گیا۔ کہ جس طرح اہل جاہلیت کا یہ کہنا باطل ہے کہ کسی ایک انسان کے سینہ میں دو دل ہو سکتے ہیں اور اس کے بطلان کو عام و خاص سبھی جانتے ہیں اسی طرح ظہار اور متبنیٰ کے مسائل میں بھی ان کے خیالات باطل ہیں۔

باقی دو مسئلے ایک ظہار دوسرے متبنیٰ بیٹے کے احکام یہ ان معاشرتی اور عائلی

مسائل میں سے ہیں جن کی اسلام میں خاص اہمیت ہے۔ یہاں تک کہ ان کی جزئیات اور تفصیلات بھی حق تعالیٰ نے قرآن میں خود ہی بیان فرمائی ہیں۔ دوسرے معاملات کی طرح صرف اصول بیان کر کے تفصیلی بیان کو پیغمبر کے حوالہ نہیں فرمایا۔ ان دونوں مسئلوں میں اہل جاہلیت نے اپنی بے بنیاد خواہشات سے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے خود ساختہ قوانین بن رکھے تھے۔ دین حق کا فرض تھا کہ وہ ان باطل رسوم و خیالات کا ابطال کر کے حق بات واضح کرے۔ اس لئے بیان فرمایا وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمُ الْإِنِّی تَطْهِرُورَتِ مِنْهُنَّ أَمْهَاتِكُمْ، یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ اگر کسی نے بیوی کو ماں کی برابر یا مثل کہہ دیا تو وہ حقیقی ماں کی طرح ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہوگئی، تمہارے کہنے سے بیوی حقیقہً ماں نہیں ہو جاتی، تمہاری ماں تو وہی ہے جس سے تم پیدا ہوئے، ہو۔ اس آیت نے اہل جاہلیت کے اس خیال کو تو باطل کر دیا کہ ظہار کرنے سے حرمت مؤیدہ نہیں ہوتی۔ آگے یہ بات کہ ایسا کہنے پر کوئی شرعی اثر مرتب ہوتا ہے یا نہیں، اس کا حکم مستقلاً سورۃ مجادلہ میں بتلایا گیا ہے کہ ایسا کہنا گناہ ہے، اس سے پرہیز واجب ہے، اور ایسا کہنے والا اگر کفارہ ظہار ادا کر دے تو بیوی اس کے لئے حلال ہو جاتی ہے۔ کفارہ ظہار کی تفصیل سورۃ مجادلہ میں آئے گی۔

دوسرا مسئلہ متبنی بیٹے کا تھا۔ اس کے متعلق فرمایا وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ، اَدْعِيَاءُ کی جمع ہے۔ دَعِیٌ وہ لڑکا ہے جس کو منہ بولا بیٹا کہا جاتا، مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک انسان کے پہلو میں دو دل نہیں ہوتے، اور جس طرح بیوی کو ماں کے مثل کہنے سے بیوی ماں نہیں بن جاتی، اسی طرح منہ بولا بیٹا تمہارا بیٹا نہیں بن جاتا۔ یعنی دوسرے بیٹوں کے ساتھ وہ میراث میں شریک ہوگا اور نہ حرمت نکاح کے مسائل اس پر عائد ہوں گے کہ بیٹے کی مطلقہ بیوی باپ پر ہمیشہ کے لئے حرام ہے تو متبنی کی بیوی بھی حرام ہو۔

اور چونکہ اس آخری معاملے کا اثر بہت سے معاملات پر پڑتا ہے۔ اس لئے یہ حکم نافذ کر دیا گیا کہ متبنی بیٹے کو جب پکار دیا اس کا ذکر کرو تو اس کے اصلی باپ کی طرف منسوب کر کے ذکر کرو۔ جس نے بیٹا بنالیا ہے اس کا بیٹا کہہ کر خطاب نہ کرو۔ کیونکہ اس سے بہت سے معاملات میں اشتباہ اور التباس پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہم زید بن حارثہ کو زید بن محمدؓ کہا کرتے تھے (کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

نے ان کو متبہی بنا لیا تھا، اس آیت کے نزول کے بعد ہم نے یہ عادت چھوڑ دی۔
 مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ اکثر آدمی جو دوسروں کے بچوں کو بیٹا کہہ کر بکارتے ہیں
 جب کہ محض شفقت کی وجہ سے ہو متبہی قرار دینے کی وجہ سے نہ ہو تو یہ اگرچہ جائز ہے مگر پھر
 بھی بہتر نہیں کہ سورۃ ممانعت میں داخل ہے (کذا فی الروح عن التحفاجی علی البیضاوی)
 اور یہی وہ معاملہ ہے جس نے قریش عرب کو مغالطہ میں ڈال کر ایک بہت بڑے
 گناہ عظیم کا مرتکب بنا دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگانے لگے کہ آپ نے
 اپنے بیٹے کی مطلق بیوی سے نکاح کر لیا۔ حالانکہ وہ آپ کے بیٹے نہ تھے بلکہ متبہی تھے،
 جس کا ذکر اسی سورۃ میں آگے آنے والا ہے۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ

نبی سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے اور اس کی عورتیں اُن کی مائیں ہیں،

وَأُولَٰئِكَ حَافِظُكُمْ أُولَىٰ بِبَعْضِ فِرْيَاسِ اللَّهِ مِنْ

اور قرابت والے ایک دوسرے سے لگاؤ رکھتے ہیں اللہ کے حکم میں

الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَٰكُمْ

زیادہ سب ایمان والوں اور ہجرت کرنے والوں سے مگر یہ کہ کرنا چاہو اپنے رفیقوں سے

مَعْرُوفًا كَانَ ذَٰلِكَ فِي الذِّكْرِ مَسْطُورًا ⑥

احسان، یہ ہے کتاب میں لکھا ہوا۔

خُلاصۃ تفسیر

نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مؤمنین کے ساتھ تو ان کے نفس (اور ذات) سے بھی زیادہ
 تعلق رکھتے ہیں کیونکہ انسان کا نفس تو کبھی اس کو نفع پہنچاتا ہے کبھی نقصان، کیونکہ اگر
 نفس اچھا ہے اچھے کاموں کی طرف چلتا ہے تو نفع ہے اور بُرے کاموں کی طرف چلنے لگے
 تو خود اپنا نفس ہی اپنے لئے مصیبت بن جاتا ہے، بخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
 کہ آپ کی تعلیم نفع ہی نفع اور خیر ہی خیر ہے۔ اور اپنا نفس اگر اچھا بھی ہو اور نیکی ہی کی

کی طرف چلتا ہو پھر بھی اس کا نفع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفع کی برابر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اپنے نفس کو تو خیر و شر اور مصلحت و مضرت میں مخالطہ بھی ہو سکتا ہے، اور اس کو مصالح و مضار کا پورا علم بھی نہیں، بخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کی تعلیمات میں کسی مخالطہ کا خطرہ نہیں۔ اور جب نفع رسانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری جان اور ہمارے نفس سے بھی زیادہ ہیں تو ان کا حق ہم پر ہماری جان سے زیادہ ہے، اور وہ حق یہی ہے کہ آپ کی ہر کام میں اطاعت کریں اور آپ کی تعظیم و تکریم تمام مخلوقات سے زیادہ کریں اور آپ کی بیبیاں اُن (مؤمنین) کی مائیں ہیں یعنی مذکورہ تقریر سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مؤمنین کے لئے روحانی باپ ہیں جو اُن کی اپنی ذات سے بھی زیادہ اُن پر شفیق و مہربان ہیں، اسی مناسبت سے آپ کی ازواج مطہرات امت کی مائیں ہو گئیں یعنی تعظیم و تکریم میں ان کا حق ماؤں کی طرح ہے۔

اس آیت نے ازواج مطہرات کو صراحۃً امت کی مائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اشارۃً امت کے روحانی باپ قرار دیدیا، تو اس سے بھی اسی طرح کا ایک التباس اور اشتباہ ہو سکتا تھا جس طرح کا اشتباہ متنبیؒ کو اس کے غیر حقیقی باپ کی طرف منسوب کرنے میں ہوتا تھا، جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ امت کے مسلمان سب آپس میں حقیقی بھائی بہن ہو جائیں تو ان کے آپس میں نکاح کا تعلق حرام ہو جائے، اور میراث کے احکام میں بھی ہر مسلمان دوسرے کا وارث قرار دیا جائے، اس التباس کو دور کرنے کے لئے آخر آیت میں فرما دیا وَأُولَٰئِكَ سَاحِمٌ لِّبَعْضِهِمْ آوَالٌ لِّبَعْضٍ اللہ (یعنی) رشتہ دار کتاب اللہ (یعنی حکم شرعی) میں ایک دوسرے سے میراث کا، زیادہ تعلق رکھتے ہیں، بہ نسبت دوسرے مؤمنین اور مہاجرین کے مگر یہ کہ تم اپنے (ان) دوستوں سے (بطور وصیت کے) کچھ سلوک کرنا چاہو تو وہ جائز ہے، یہ بات لوح محفوظ میں لکھی جا چکی ہے، (کہ ابتداءً ہجرت میں ایمانی اخوت کی بناء پر مہاجرین کو انصار کی میراث کا حق دار بنادیا گیا تھا مگر بالآخر تقسیم میراث رشتہ داری اور ارحام کی بنیاد پر رہے گی) :

معارف و مسائل

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے سورۃ احزاب میں بیشتر مضامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور آپ کی ایذا رسانی کے حرام ہونے سے متعلق ہیں۔ شروع سورۃ میں مشرکین و منافقین کی ایذاؤں کا ذکر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایات دی گئی

تھیں۔ اس کے بعد جاہلیت کی تین رسموں کا ابطال کیا گیا، جن میں آخری رسم کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا سے تھا۔ کیونکہ کفار نے حضرت زیدؓ کی مطلقہ بی بی زینبؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے وقت اسی اپنی جاہلانہ رسم متبنی کی بناء پر آپ پر یہ الزام لگایا کہ آپ نے اپنے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیا۔ اس طرح شروع سورۃ سے یہاں تک ایذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مضمون تھا، اس آیت مذکورہ میں آپ کی تعظیم و اطاعت تمام مخلوق سے زیادہ واجب ہونا بیان کیا گیا ہے۔

الَّتِي أُولَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ ، أُولَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ کا جو مطلب خلاصہ تفسیر میں بیان کیا گیا ہو وہ ابن عطیہ وغیرہ کا قول ہے جس کو قسریٰ اور اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ کا حکم ہر مسلمان کے لئے اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ واجب تعمیل ہے۔ اگر ماں باپ آپ کے کسی حکم کے خلاف کہیں ان کا کہنا ماننا جائز نہیں، اسی طرح خود اپنے نفس کی تمام خواہشات پر بھی آپ کے حکم کی تعمیل مقدم ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا مِنْ مُّؤْمِنٍ إِلَّا وَآنَا أُولَىٰ	یعنی کوئی مومن ایسا نہیں جس کیلئے
النَّاسِ بِهٖ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ	میں دنیا و آخرت میں سارے انسانوں
إِقْرَعُوا أَنْ شِئْتُمْ أَلَتِي	سے زیادہ اولیٰ اور اقرب نہ ہوں،
أُولَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ	اگر تمھارا دل چاہے تو اس کی تصدیق

کے لئے قرآن کی یہ آیت پڑھ لو، اَلَّتِي أُولَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ

جس کا حاصل یہ ہے کہ میں ہر مومن مسلمان پر ساری دنیا سے زیادہ شفیق و مہربان ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا لازمی اثر یہ ہونا چاہئے کہ ہر مومن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سب سے زیادہ ہو۔ جیسا کہ حدیث میں یہ بھی ارشاد ہے:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ	یعنی تم میں سے کوئی اس وقت تک
أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ	مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کے
وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ	دل میں میری محبت اپنے باپ، بیٹے
(بخاری و مسلم، مظہری)	اور سب انسانوں سے زیادہ نہ ہو جائے،

وَأَزْوَاجَهُمْ أَهْلَهُمْ، ازواج مطہرات کو اہل بیت کی مائیں فرمانے سے مراد تعظیم و تکریم کے اعتبار سے مائیں ہونا ہے۔ ماں اور اولاد کے دوسرے احکام حرمت

نکاح اور محرم ہونے کی وجہ سے باہم پردہ نہ ہونا اور میراث میں حصہ دار ہونا وغیرہ یہ احکام اس سے متعلق نہیں، جیسا کہ آخر آیت میں اس کو کھول دیا گیا ہے۔ اور ازواجِ مطہرات سے کسی امتی کا نکاح حرام ہونا وہ ایک مستقل آیت میں علیحدہ فرمایا گیا ہے۔ اس لئے غیر درجی نہیں کہ یہ حرمت نکاح بھی مائیں ہونے کی وجہ سے ہو۔

مسئلہ: آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ ازواجِ مطہرات میں سے کسی کی شان میں کوئی ادنیٰ بے ادبی اس لئے بھی حرام ہے کہ وہ امت کی مائیں ہیں، اور اس لئے بھی کہ ان کی ایذا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچے گی جو اشد درجہ کا حرام ہے۔
وَأُولَ الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ، أُولَ الْأَرْحَامِ کے لفظی معنی سب رشتہ داروں اور قرابت داروں کو شامل ہیں، خواہ وہ لوگ ہوں جن کو فقہاء عصبائے کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، یا وہ جن کو خاص اصطلاح کے اعتبار سے عصبائے کے بالمقابل اولوالارحام کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ فقہی اصطلاح جو بعد میں اختیار کی گئی ہے مراد نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ رسول اور ان کی ازواج کا تعلق مومنین امت سے — اگرچہ اس درجہ ہے کہ ماں باپ سے بھی مقدم ہے، مگر میراث کے احکام میں اس کا کوئی دخل نہیں بلکہ میراث نسبی اور قرابتی رشتوں کی بنیاد پر ہی تقسیم کی جائے گی۔
میراث کی حصہ داری شروع اسلام میں ایسا ہی اور روحانی رشتہ کی بنیاد پر تھی، بعد میں اس کو منسوخ کر کے قرابتی رشتوں کی بنیاد پر کر دی گئی جس کی تفصیل قرآن کریم نے خود بتلا دی ہے۔ یہ پوری تفصیل ناسخ اور منسوخ آیتوں کی سورۃ انفال میں گزر چکی ہے۔ اور مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ کے بعد وَالْمُهَاجِرِينَ کا ذکر اس صورت میں ان کا اختصاص امتیاز بتلانے کے لئے ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں مومنین سے مراد انصار اور مہاجرین سے مراد قریش ہیں۔ مہاجرین کے مقابل سے مومنین کا لفظ انصار کے لئے ہونا معلوم ہو گیا۔ اس صورت میں یہ آیت توارث بالہجرۃ کے لئے ناسخ ہوگی۔ کیونکہ ابتداء ہجرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کر کر ان کے باہم وراثت جاری ہونے کا بھی حکم دیا تھا، اس آیت نے اس توارث بالہجرۃ کو بھی منسوخ کر دیا (قرطبی)

إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أُولِيَ الْأَمْوَالِ مِمَّا مَعَكُمْ وَفًا، یعنی وراثت تو صرف رشتہ داری کے تعلق سے ملے گی، غیر رشتہ دار وراثت نہیں ہوگا۔ مگر ایمانی اخوت کی بنا پر جن لوگوں سے

تعلق ہو ان کو کچھ دینا چاہو تو اس کا بہر حال اختیار ہے۔ اپنی زندگی میں بھی بطور ہدیہ تحفہ ان کو دے سکتے ہو اور موت کے بعد ان کے لئے وصیت بھی کر سکتے ہیں۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَرَاحُ وَابْرَاهِيمَ

اور جب لیا ہم نے نبیوں سے ان کا اقرار اور تجھ سے اور نوح سے اور ابراہیم سے

وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ۝ لِّيَسْأَلَ

اور موسیٰ سے اور عیسیٰ سے جو بیٹا مریم کا اور لیا ہم نے ان سے گارڈھا قرار، تاکہ پوچھے

الصَّادِقِينَ عَنْ صِدْقِهِمْ وَأَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا أَلِيمًا ۝

اللہ سچوں سے ان کا پوچھ اور تیار کر رکھا ہے منکروں کے لئے دردناک عذاب۔

خلاصہ تفسیر

اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب کہ ہم نے تمام پیغمبروں سے ان کا اقرار لیا کہ احکام الہیہ کا اتباع کریں جن میں خلق اللہ کو تبلیغ و دعوت اور باہمی تعاون و تناصر بھی داخل ہے اور ان پیغمبروں میں آپ سے بھی (اقرار لیا) اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم (علیہم السلام) سے بھی اور یہ کوئی معمولی عہد و اقرار نہیں تھا بلکہ ہم نے ان سب سے خوب پختہ عہد لیا تاکہ (قیامت کے روز) ان سچے لوگوں سے (یعنی انبیاء علیہم السلام سے) ان کے سچ کی تحقیقات کرے تاکہ اُن کا شرف و اعزاز اور نہ ماننے والوں پر جنت مکمل ہو جائے، اس عہد اور اس کی تحقیقات سے دو باتوں کا وجوب ثابت ہو گیا کہ صاحب وحی پر اپنی وحی کا اتباع واجب ہے، اور جو عام لوگ صاحب وحی نہیں اُن پر اپنے صاحب وحی پیغمبر کے اتباع کا وجوب (اور کافروں کے لئے جو صاحب وحی کے اتباع سے منحرف ہیں) اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

معارف و مسائل

شروع سورۃ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وحی کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ اور گزشتہ آیت اَللّٰہِیُّ اَوَّلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ میں مؤمنین پر صاحب وحی کے احکام کی تعمیل واجب کی گئی ہے۔ انہی دونوں باتوں کے مزید اثبات و اظہار کے لئے

مذکورہ دونوں آیتوں میں بھی دو مضمون بیان ہوئے ہیں، یعنی صاحبِ وحی کو اپنی وحی کا اتباع اور غیر صاحبِ وحی کو صاحبِ وحی کا اتباع کرنا واجب ہے۔

میشاقِ انبیاء | آیت مذکورہ میں جو انبیاء علیہم السلام سے عہد و اقرار لینے کا ذکر ہے وہ اس اقرار عام کے علاوہ ہے جو ساری مخلوق سے لیا گیا ہے۔ جیسا کہ مشکوٰۃ میں بروایت امام احمد مرثوعاً آیا ہے کہ: **خُصُّوا بِمِثْقَاتِ السِّرِّ مَسَالَةَ وَالْمُشْبُوتَةِ وَهُوَ قَوْلُهُ تَعَالَى وَلَئِنْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِثْقَاتَهُمْ لَأَيُّهَا**

یہ عہد انبیاء علیہم السلام سے نبوت و رسالت کے فرائض ادا کرنے اور باہم ایک دوسرے کی تصدیق اور مدد کرنے کا عہد تھا۔ جیسا کہ ابن جریر ابن ابی حاتم وغیرہ نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے۔ اور ایک روایت میں اس عہد انبیاء میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ سب اس کا بھی اعلان کریں کہ **مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ لَا نَبِيَّ بَعْدَكَ** یعنی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

اور یہ میثاقِ انبیاء بھی ازل میں اسی وقت لیا گیا جبکہ عام مخلوق سے **أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ** کا عہد لیا گیا تھا (روح و منظری)

وَمِنْ ذُوِّجِ الْآيَةِ انبیاء علیہم السلام کا عام ذکر کرنے کے بعد ان میں سے پانچ انبیاء کا خصوصی ذکر ان کے اس خاص امتیاز و شرف کی بناء پر کیا گیا، جو ان کو زمرۃ انبیاء میں حاصل ہے۔ اور ان میں بھی لفظ **مِنْكَ** میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو ادراک سے مقدم کیا گیا، اگرچہ آپ کی بعثت سب کے بعد ہے، وجہ اس کی خود حدیث میں یہ بیان فرمائی ہے:

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تخلیق و تکوین میں سارے انسانوں سے پہلا ہوں اور بعثت و نبوت میں سب سے آخری۔

كُنْتُ أَوَّلَ النَّاسِ فِي الْخَلْقِ
وَأَخْرَجَهُمْ فِي الْبَعْثِ، (رواہ
ابن سعد و ابو نعیم فی الحلیۃ عن میسرۃ
الفجر و الطبرانی فی الکبیر عن ابن عباس، چنانچہ)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَ قَوْمُ

اے ایمان والو یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب چڑھ آئیں تم پر

جُنُودُ فَارَ سَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ

فوجیں پھر ہم نے بھیج دی اُن پر ہوا اور وہ فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں، اور ہے

اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ۙ ⑨ اِذْ جَاءُوكُم مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ

اللہ جو کچھ کرتے ہو دیکھنے والا ۔ جب چڑھ آئے تم پر ادھر کی طرف سے اور

أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاذْ نَزَّ غَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ

نیچے سے اور جب بدلنے لگیں آنکھیں اور پہنچے دل گھلوں

الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ۙ ⑩ هَٰذَا لِكِ الْبَلَاءِ الْمُؤْمِنُونَ

تک اور اسکل کرنے لگے تم اللہ پر طرح طرح کی آنکھیں، وہاں جانچے گئے ایمان والے

وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ۙ ⑪ وَإِذْ يَقُولُ الْمُسَافِقُونَ وَالَّذِينَ

اور جھڑ جھڑائے گئے زور کا جھڑ جھڑانا، اور جب کہنے لگے منافق اور جن کے

فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ۙ ⑫

دلوں میں روگ ہے جو وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ نے اور اس کے رسول نے سب فریب تھا۔

وَإِذْ قَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ

اور جب کہنے لگی ایک جماعت ان میں اے یثرب والو! تمھارے لئے ٹھکانہ نہیں

فَارْجِعُوا ۖ وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ

سو پھر چلو، اور رخصت مانگنے لگا ایک فرقہ ان میں نبی سے کہنے لگے ہمارے گھر

بِئْسَ مَا عَوَدْنَا ۖ وَمَا هِيَ بِغُورَةٍ ۖ إِن يَّرِيدُ وَإِنِ الْإِفْسَاسُ ۙ ⑬

کھلے پڑے ہیں، اور وہ کھلے نہیں پڑے ان کی کوئی غرض نہیں مگر بھاگ جانا۔

وَلَوْ دَخَلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سَأَلُوا الْفِتْنَةَ لَأَنفَقُوا

اور اگر شہر میں کوئی گھسی آئے ان پر اس کے کناروں سے پھر ان سے چاہو دین سے بچنا تو مان لیں

وَمَا تَلَبَّسُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ۙ ⑭ وَلَقَدْ كَانُوا عَاهِدُوا اللَّهَ مِنْ

اور دیر نہ کریں اس میں مگر تھوڑی۔ اور اقرار کر چکے تھے اللہ سے

قَبْلُ لَا يُؤْلَوْنَ إِلَّا دَبَاسًا ۖ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا ۙ ⑮ قُلْ

پہلے کہ نہ پھیریں گے پیٹھ، اور اللہ کے قرار کی پوچھ ہوتی ہے۔ تو کہہ

لَنْ يَنْفَعَكُمْ الْفِرَارُ اِنْ قَرَرْتُمْ مِّنَ السَّوْتِ اَوْ الْقَتْلِ وَاِذَا لَا

کچھ کام نہ آئے گا تمھارے یہ بھاگنا اگر بھاگو گے مرنے سے یا مارے جانے سے اور پھر بھی

تُمْتَعُونَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۶ قُلْ مَن ذَا الَّذِي يَعْصِيكُمْ مِّنْ اللّٰهِ

بھل نہ پاؤ گے مگر تھوڑے دنوں۔ تو کہہ کون ہے کہ تم کو بچائے اللہ سے

اِنْ اَسْرَادَ بِكُمْ سُوْءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ

اگر چاہے تم پر بُرائی یا چاہے تم پر مہربانی، اور نہ پائیں گے اپنے واسطے

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيْرًا ۝۱۷ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ

اللہ کے سوائے کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔ اللہ کو خوب معلوم ہیں جو اٹکانے والے ہیں

مِّنْكُمْ وَالْقَائِلِيْنَ لِاٰخِرَانِهِمْ هَلْهُمْ اِلٰيْنَا وَّلَا يَأْتُوْنَ الْبَاسَ

تم میں اور کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو چلے آؤ ہمارے پاس، اور لڑائی میں نہیں آتے

اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۸ اَشْجَعُ عَلَيْكُمْ فَاِذَا جَاءَ الْخَوْفُ رَاٰيْتَهُمْ

مگر کبھی۔ دریغ رکھتے ہیں تم سے پھر جب آئے ڈر کا وقت تو تو دیکھو اُن کو

يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرًا عَيْنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ

کہتے ہیں تیری طرف پھرتی ہیں آنکھیں اُن کی جیسے کسی پر آئے بے ہوشی

السَّوْتِ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِالْسِّنَةِ جِدًا اِشْجَعُ

موت کی، پھر جب جاتا رہی ڈر کا وقت چڑھ چڑھ بولیں تم پر تیز تیز زبانوں کا ڈھلے

عَلَى الْخَيْرِ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ط وَكَانَ

پڑتے ہیں مال پر وہ لوگ یقین نہیں لائے پھر اکارت کر ڈالے اللہ نے ان کے کام، اور یہ ہی

ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۱۹ يَحْسِبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا وَّ

اللہ پر آسان۔ سمجھتے ہیں کہ فوجیں کفار کی نہیں پھر گئیں، اور

اِنْ يَّاتِ الْاَحْزَابُ يَوْدُوْا وَاَلَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ

اگر آجائیں وہ فوجیں تو آؤد کریں کسی طرح، ہم باہر نکلے ہوتے ہوں گا اُن میں

يَسْأَلُونَ عَنْ أَنْبَاءِكُمْ وَلَوْ كَانُوا فِيكُمْ مَا قُتِلُوا إِلَّا قَلِيلًا ۝

پوچھ پیا کریں تمھاری خبریں، اور اگر ہوں تم میں لڑائی نہ کریں مگر بہت تقویٰ -

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ

تمہارے لئے بھلی تھی سیکھنی رسول اللہ کی چال اس کے لئے جو کوئی امید

يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝

رکھتا ہو اللہ کی اور پچھلے دن کی اور یاد کرتا ہو اللہ کو بہت سا - اور جب دیکھی

الْمُؤْمِنُونَ الْآحْزَابُ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ

مسلمانوں نے فوجیں، بولے یہ وہی ہے جو وعدہ دیا تھا ہم کو اللہ نے اور اس کے رسول نے

وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ زَوْمَارِزْهُمْ إِلَّا إِيْمَانًا وَتَسْلِيمًا ۝

اور سچ کہا اللہ نے اور اس کے رسول نے اور ان کو اور بڑھ گیا یقین اور اطاعت کرنا -

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ

ایمان والوں میں کتنے مرد ہیں کہ سچ کر دکھلایا جس بات کا عہد کیا تھا اللہ سے

فَبَدَّلَ لَهُمْ قَضِيَّتِهِمْ مِنْ نَحْبِهِ وَمِنْهُمْ مَن يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا

پھر کوئی تو ان میں پورا کر چکا اپنا ذمہ اور کوئی ہران میں راہ دیکھ رہا، اور بدلا نہیں

تَبَدُّلًا ۝ لِّيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ

ایک ذرہ - تاکہ بدل دے اللہ سچوں کو ان کے سچ کا اور عذاب کرے

الْمُنَافِقِينَ إِن شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ

منافقوں پر اگر چاہے یا توبہ ڈالے ان کے دل پر بیشک اللہ ہے

غَفُورًا رَحِيمًا ۝ وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ

بخشنے والا مہربان - اور پھیر دیا اللہ نے منکروں کو اپنے غصہ میں بھرے ہوئے

لَمَّا نَالُوا خَيْرًا وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللَّهُ

ہاتھ نہ لگی کچھ بھلائی، اور اپنے اوپر لے لی اللہ نے مسلمانوں کی لڑائی، اور ہے اللہ

قِيَا عَزِيزًا ۝۲۵ وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوا مِنْهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ

زور آور زبردست ، اور اتار دیا ان کو جو ان کے پشت پناہ ہوئے تھے اہل کتاب سے

مِنْ صِيَا صِيَهُمْ وَقَدْ فِى قُلُوبِهِمُ الرُّعْبُ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ

ان کے قلعوں سے اور ڈال دی ان کے دلوں میں دھاک کتنوں کو تم جان مارنے لگے،

وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا ۝۲۶ وَأَوْسَرْتُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَ

اور کتنوں کو قید کر لیا۔ اور تم کو دلائی ان کی زمین اور ان کے گھر اور

أَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَمْ تَطْرُدْهَا ط وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ۝۲۷

ان کے مال اور ایک زمین کہ جس پر نہیں پھیرو تم نے اپنی قدم اور ہر اللہ سب کچھ کر سکتا۔

۳
ع
۱۹

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! اللہ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو، جب تم پر بہت سے لشکر چڑھ آئے
یعنی عینہ کا لشکر اور ابوسفیان کا لشکر اور یہودی قرظہ، پھر ہم نے ان پر ایک آندھی
بھیجی جس نے ان کو پریشان کر دیا اور ان کے خیمے اکھاڑ پھینکے، اور فرشتوں کی ایسی فوج
بھیجی جو تم کو (عام طور پر) دکھائی نہ دیتی تھی، مگر بعض صحابہ مثلاً حضرت حذیفہؓ نے بعض ملائکہ
کو بشکل انسان دیکھا بھی اور کفار کے شکر میں یہ جاسوسی کے لئے گئے تھے وہاں یہ آواز بھی
سنی کہ بھاگو بھاگو۔ اور اس واقعہ میں ملائکہ نے قتال نہیں کیا، صرف کفار کے دلوں میں رعب
ڈالنے کے لئے بھیجے گئے تھے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے (اس وقت کے) اعمال کو دیکھتے تھے،
کہ تم نے ایک طویل وعین اور گہری خندق کھودنے میں بڑی محنت اٹھائی، پھر کفار کے
مقابلہ کے لئے بڑے استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہے اور اس پر خوش ہو کر تمہاری امداد
فرما رہے تھے۔ یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا جبکہ وہ (دشمن) لوگ تم پر ہر طرف سے نعرہ
سرایے، آچرٹھے تھے اور ہر طرف سے اور نیچے کی طرف سے بھی (یعنی کوئی قبیلہ مدینہ کے
نشیب کی طرف سے اور کوئی قبیلہ اس کی بلندی کی طرف سے)، اور جب کہ آنکھیں (مارے
دہشت کے) کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں، اور کلچے منہ کو آنے لگے تھے اور تم لوگ اللہ کے ساتھ
طرح طرح کے گمان کر رہے تھے جیسا مواقع شدت میں طبعی طور پر مختلف وسوسے آیا کرتے
ہیں، اور یہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں، اور نہ اس قول کے منافی ہر

جو آگے اہل ایمان کا آئے گا ہنّ اَمَّا رَعَنَ تَا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہُ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہُ، کیونکہ اس میں لفظ ہنّ کا اشارہ احزاب کے چڑھ آنے کی طرف ہے، چونکہ اس کی خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیدی گئی تھی، اس لئے یہ تو متیقن تھا لیکن انجام اس واقعہ کا نہیں بتلایا گیا تھا اس لئے اس میں احتمالات مختلفہ غالب آنے اور مغلوب ہونے کے پیدا ہوتے تھے اس موقع پر مسلمانوں کا دل پورا پورا امتحان کیا گیا جس میں وہ پورے اترے اور سخت زلزلہ میں ڈالے گئے اور یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا جب کہ منافقین اور وہ (وہ) لوگ جن کے دلوں میں رنفاق اور شک کا مرض ہے یوں کہہ رہے تھے کہ ہم سے تو اللہ نے اور اس کے رسول نے محض دھوکہ ہی کا وعدہ کر رکھا ہے جیسا معتب بن قشیر اور اس کے ہمراہیوں نے یہ قول اس وقت کہا تھا کہ خندق کھودنے وقت کدال گنے سے کئی بار آگ کا شرارہ نکلا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بار ارشاد فرمایا کہ مجھ کو فارس اور روم اور شام کے محل اس کی روشنی میں نظر آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی فتح کا وعدہ فرمایا ہے۔ جب احزاب کے اجتماع کے وقت پریشانی ہوئی تو یہ لوگ کہنے لگے کہ یہ تو حالت ہے اور اس پر فتح روم و فارس کی بشارتیں سنا رہے ہیں، یہ محض دھوکہ ہے اور گو وہ اس کو اللہ کا وعدہ نہ سمجھتے تھے نہ آپ کو رسول جانتے تھے، پھر یہ کہنا مَادَعَنَ تَا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہُ یا تو صرف حکایت کے درجہ میں ہے اور یا بطور فرض و استہزاء ہے اور یہ واقعہ اس وقت کا تھا جبکہ ان (منافقین) میں سے بعض لوگوں نے (دوسرے حاضرین معسرہ سے) کہا کہ یثرب (یعنی مدینہ) کے لوگو! (یہاں) ٹھہرنے کا موقع نہیں کیونکہ یہاں رہنا موت کے منہ میں جانا ہے (سو اپنے گھروں کو) لوٹ چلو یہ قول اوس بن قیطی نے کہا تھا اور بھی کچھ لوگ اس میں شریک تھے اور بعض لوگ ان (منافقوں میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (اپنے گھر واپس جانے کی) اجازت مانگتے تھے کہتے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں (یعنی صرف عورتیں بچے رہ گئے ہیں) دیواریں قابل اطمینان نہیں کبھی چور نہ آگسیں، یہ قول ابو عرابہ اور دوسرے بعض بنی حنفہ کا تھا حالانکہ وہ (ان کے خیال میں) غیر محفوظ نہیں ہیں (یعنی ان کو اندیشہ چوری وغیرہ کا ہرگز نہیں اور نہ واپس جانے سے یہ نیت ہے کہ ان کا انتظام قابل اطمینان کر کے چلے آویں گے) یہ محض بھاگنا ہی چاہتے ہیں، اور ان کی یہ حالت ہے کہ اگر مدینہ میں اس کے (سب) اطراف سے ان پر (جب یہ اپنے گھروں میں ہوں) کوئی (شکر کفار کا) آگھے پھر ان سے فساد (یعنی مسلمانوں سے لڑنے) کی درخواست کی جائے تو یہ (فورا) اس (فساد) کو منظور کر لیں اور ان گھروں میں بہت ہی کم ٹھہریں (یعنی اتنا توقف ہو

کہ کوئی ان سے درخواست کرے اور یہ منظور کریں اور اس کے بعد وہ فوراً ہی تیار ہو جائیں اور مسلمانوں کے مقابلہ میں جا پہنچیں، اور کچھ بھی گھروں کا خیال نہ کریں کہ ہم تو دوسروں کو لوٹ مار کرنے جاتے ہیں، کبھی کوئی ہمارے گھر کو لوٹ لے تو اگر ان کا قصد واقعی حفاظت کا ہے تو اب گھروں میں کیوں نہیں رہے، اس سے صاف معلوم ہوا کہ اصل میں ان کو مسلمانوں سے عداوت اور کفار سے محبت ہے، اس لئے تکثیر سوار سے بھی مسلمانوں کی نصرت پسند نہیں کرتے۔

باقی گھروں کا تو یہاں نہ ہے (حالانکہ یہ لوگ (اس سے) پہلے خدا سے عہد کر چکے تھے کہ (دشمن کے مقابلہ میں) پیچھے نہ پھیریں گے) یہ عہد اس وقت کیا تھا جبکہ بدر میں بعض شرکت سے رہ گئے تھے تو بعض منافقین بھی مفت کرم داشتین کے طور پر کہنے لگے کہ افسوس! ہم شریک نہ ہوئے، ایسا کرتے ویسا کرتے، جب وقت آیا ساری قلعی کھل گئی اور اللہ سے جو (اس قسم کا) عہد کیا جاتا ہے اس کی باز پرس ہوگی، آپ (ان سے) فرمادیجئے کہ (تم جو بھاگے بھاگے پھرتے ہو) کما قال تعالیٰ (إِنْ يَرَوْهُ كُونِ الْفِرَارِ) تم کو بھاگنا کچھ نافع نہیں ہو سکتا اگر تم موت سے یا قتل سے بھاگتے ہو اور اس (بھاگنے کی) حالت میں بجز تھوڑے دنوں کے (کہ وہ بقیہ عمر مقدر ہے) اور زیادہ (حیات سے) متمتع نہیں ہو سکتے (یعنی بھاگ کر عمر نہیں بڑھ سکتی، کیونکہ اس کا وقت مقدر ہے، اور جب مقدر ہے تو اگر نہ بھاگتے تو بھی وقت سے پہلے مر نہیں سکتے۔ پس نہ قرار بالقات سے کوئی ضرر اور نہ فرار بالقاء سے کوئی نفع، پھر بھاگنا محض بے عقلی اور اس مسئلہ قدر کی تحقیق کے لئے ان سے) یہ بھی فرمادیجئے کہ وہ کون ہے جو تم کو خدا سے بچا سکے اگر وہ تمھارے ساتھ بُرائی کرنا چاہے (مثلاً تم کو ہلاک کرنا چاہے تو کیا تم کو کوئی بچا سکتا ہے جیسا تم فرار کو نافع خیال کرتے ہو) یا وہ کون ہے جو خدا کے فضل کو تم سے روک سکے اگر وہ تم پر فضل کرنا چاہے (مثلاً وہ زندہ رکھنا چاہے جو کہ رحمت دنیویہ ہے تو کوئی اس کا مانع ہو سکتا ہے؟ جیسا تمھارا خیال ہے کہ ثبات فی المعرکہ کو قاطع حیات سمجھتے ہو) اور (وہ لوگ سن رکھیں کہ) خدا کے سوا نہ کوئی اپنا حمایتی پائیں گے (جو نفع پہنچائے) اور نہ کوئی مددگار (جو ضرر سے بچائے) اب مسئلہ تقدیر کے بعد پھر تشبیح منافقین کا سلسلہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کو (خوب) جانتا ہے جو (دوسروں کو لڑائی میں جانے سے) مانع ہوتے ہیں اور جو اپنی زہنی یا وطنی، بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس آجاؤ (وہاں اپنی جان کیوں دیتے ہو، یہ بات ایک شخص نے اپنے حقیقی بھائی سے کہی تھی اور اس وقت یہ کہنے والا گوشت بریاں اور روٹی کھا رہا تھا۔ مسلمان بھائی نے کہا افسوس! تو اس چین میں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم

ایسی تکلیف میں وہ بولا میاں تم بھی یہاں ہی چلے آؤ، اور ان کی بزدلی اور حرص و بخل کی یہ کیفیت ہے کہ، لڑائی میں بہت ہی کم آتے ہیں (جس میں ذرا نام ہو جائے یہ تو ان کی بزدلی ہے اور آتے بھی ہیں تو) تمھارے حق میں بخیلی لئے ہوئے (یعنی آنے میں بڑی نیت یہ ہوتی ہے کہ سب غنیمت مسلمانوں کو نہ مل جائے برائے نام شریک ہونے سے استحقاق غنیمت کا دعویٰ تو کسی درجہ میں کر سکیں گے) سو جب اُن کا جُھن اور بخل دونوں امر ثابت ہو گئے ہیں تو اس مجموعہ کا اثر یہ ہے کہ (جب کوئی خوف (کا موقع) پیش آتا ہے تو اُن کو دیکھتے ہو کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں چکرائی جاتی ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو (یہ تو بزدلی کا اثر ہوا) پھر جب وہ خوف و دور ہو جاتا ہے تو تم کو تیز تیز زبانوں سے طعنے دیتے ہیں مال (غنیمت) پر حرص لئے ہوئے، (یعنی مال غنیمت لینے کے لئے دل خراش باتیں کرتے ہیں کہ کیوں ہم شریک نہ تھے، ہماری ہی مدد سے تم کو یہ فتح میسر نہیں ہوئی، یہ اثر بخل اور حرص کا ہے۔ یہ معاملہ ان کا تم سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا معاملہ یہ ہے کہ) یہ لوگ (پہلے ہی سے) ایمان نہیں لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام اعمال (نیک پہلے ہی سے) بے کار کر رکھے ہیں (آخرت میں کچھ ثواب نہ ملے گا) اور یہ بات اللہ کے نزدیک بالکل آسان ہے (کوئی اس سے مزاحمت نہیں کر سکتا کہ ہم ان اعمال کا صلہ دیں گے اور یہ حالت تو ان کی اجتہاد احزاب کے وقت تھی مگر ان کا جُھن یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ احزاب کے چلے جانے کے بعد بھی) ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ (ابھی تک) یہ لشکر گئے نہیں اور غایت بزدلی سے ان کی یہ حالت ہے کہ) اگر (بالضرر) یہ (گئے ہوئے) لشکر (پھر لوٹ کر) آجائیں تو (پھر تو) یہ لوگ (اپنی لئے) بھی پسند کریں کہ کاش ہم (کہیں) دیہاتوں میں باہر جا رہیں کہ (وہاں ہی بیٹھے بیٹھے آنے جانے والوں سے) تمھاری خبریں پوچھتے رہیں (اور وہ جگر دوز معرکہ اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں) اور اگر (اتفاق سے) محل یا بعض دیہات میں نہ جاسکیں) بلکہ تم ہی میں رہیں تب بھی (اس وقت کی لے دے سن کر بھی کبھی غیرت نہ آوے اور محض نام کرنے کو) کچھ یوں ہی سالٹیں (آگے) ثبات فی الحرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقتدار و اتباع کا مقتضائے ایمان ہو یا بیان فرماتے ہیں تاکہ منافقین کو عار دلائی جائے کہ باوجود دعویٰ ایمان اس کے مقتضائے سے تخلف کیا، اور مخلصین کو بشارت ملے کہ یہ لوگ ابستہ مصداق کَانَ یَرْجُو اللہ الخ کے ہیں پس ارشاد فرماتے ہیں کہ) تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ سے اور روزِ آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الہی کرتا ہو (یعنی مؤمن کامل ہو اس کے لئے)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا کہ جب آپ ہی شریک رہے تو آپ سے زیادہ کون پیارا ہے کہ وہ اقتداء نہ کرے اور اپنی جان بچائے پھرے، اور آگے منائیں گے مقابلہ میں مؤمنین مخلصین کا ذکر ہے، جب ایمان داروں نے ان لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ وہی (موقع) ہے جس کی ہم کو اللہ، رسولؐ نے خبر دی تھی چنانچہ اس آیت بقرہ میں اس کا اشارہ قریب بصراحت موجود ہے، اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ (الی قولہ) وَذَكِّرْ لَوْ اَکْبَرُ لَکُمْ سُوْرَةُ بَعَثَہ نَزَلَہ میں سورۃ احزاب سے مقدم ہے، کذافی الاتقان) اور اللہ رسولؐ نے سچ فرمایا تھا اور اس (احزاب) کے دیکھنے سے جو کہ مصدق پیشینگوئی ہو ان کے ایمان اور طاعت میں ترقی ہو گئی یہ وصف تو سب مؤمنین میں مشترک ہے اور بعض اوصاف بعض مؤمنین میں خاص بھی ہیں جس کا بیان یہ ہے کہ ان مؤمنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے اس تقسیم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بعض مسلمانوں نے عہد کیا اور سچے نہیں اترے بلکہ یہ تقسیم اس بناء پر ہے کہ بعض نے عہد ہی نہیں کیا تھا اور بلا عہد ہی ثابت قدم رہے۔ ان معاہدین کے ذکر کی تصریح بمقابلہ آیت بالا کے ہے جو منافقین کے حق میں ہے، وَ لَقَدْ کَانُوا عَاهِدُوا لَہُ الْاِخْوَانِ مَعَاہِدِیْنَ سے حضرت انس بن النضر اور ان کے رفقاء ہیں۔ یہ حضرات اتفاق سے غزوہ بدر میں شریک نہیں ہونے پائے تھے تو ان کو افسوس ہوا اور عہد کیا کہ اگر اب کے کوئی جہاد ہو تو اس میں ہماری جان توڑ کوشش دیکھ لی جائے گی۔ مطلب یہ تھا کہ منہ نہ موڑیں گے گومارے جاویں، پھر ان (معاہدین) میں دو قسمیں ہو گئیں، بعض تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے، (مراد وہ عہد ہے جو مثل نذر کے واجب الايقاع ہے۔ مطلب یہ کہ شہید ہو چکے اور اخیر دم تک منہ نہیں موڑا۔ چنانچہ حضرت انس بن نضر احد میں شہید ہو گئے تھے، اسی طرح حضرت مصعب) اور بعض ان میں (اس کے ایفاء کے آخری اثر یعنی شہادت کے) مشتاق ہیں (ابھی شہید نہیں ہوئے) اور (اب تک) انہوں نے (اس میں) ذرا تغیر تبدیل نہیں کیا (یعنی اپنے عزم پر قائم ہیں، پس مجموعہ قوم کا دو قسم پر ہے، ایک منافق جن کا اور پر بیان ہوا، دوسرے مؤمنین۔ پھر مؤمنین کی دو قسم ہیں، معاہد اور غیر معاہد اور ثبات میں دونوں مشترک ہیں۔ لقولہ تعالیٰ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاِخْوَانِ مَعَاہِدِیْنَ دو قسم پر ہیں شہید اور منتظر شہادت، کُل چار قسمیں ان آیات میں مذکور ہیں۔ آگے اس غزوہ کی ایک حکمت بیان فرماتے ہیں کہ) یہ واقعہ اس لئے ہوا تاکہ اللہ تعالیٰ

سچے مسلمانوں کو ان کے سچ کا صلہ دے اور منافقوں کو چاہے سزا دے یا چاہے اُن کو رنفاق سے، توبہ کی توفیق دے کیونکہ ایسے مصائب اور حوادث میں مخلص اور متصنع متمیز ہو جاتا ہے اور احیانا ملامت سے بعض متصنعین بھی متاثر ہو کر مخلص ہو جاتے ہیں اور بعض بحالہ بھی رہتے ہیں، بیشک اللہ غفور رحیم ہے (اس لئے توبہ کا قبول ہو جانا مستبعد نہیں، اس میں ترغیب ہو توبہ کی، اور یہاں تک اس مجمع اسلام کے اقسام مختلفہ کے حالات تھے، آگے کفار مخالفین کی حالت کا ذکر ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے کافروں کو (یعنی مشرکین کو) ان کے غصہ میں بھرا ہوا مدینہ سے، ہٹا دیا کہ ان کی کچھ بھی مراد پوری نہ ہوئی (اور ان کا غصہ بھرا ہوا تھا) اور جنگ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے آپ ہی کافی ہو گیا (یعنی کفار کو قتال متعارف کی نوبت بھی نہ آئی کہ پہلے ہی دفع ہو گئے اور خفیف سی لڑائی متفرق طور پر منفی نہیں ہی) اور (اس طرح کافروں کا ہٹا دینا کچھ عجیب نہ سمجھو، کیونکہ) اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا زبردست ہے (اُس کو کچھ دشوار نہیں۔ یہ تو مشرکین کا حال ہوا) اور (دوسرا گروہ مخالفین میں یہود بنی قریظہ کا تھا آگے ان کا ذکر ہے) جن اہل کتاب نے ان (مشرکین) کی مدد کی تھی ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کے قلعوں سے (جن میں وہ محصور تھے) نیچے اتار دیا اور ان کے دلوں میں ہتھار اربع بٹھلا دیا (جس سے وہ اتر آئے اور پھر) بعض کو تم قتل کرنے لگے اور بعض کو قید کر لیا اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا تم کو مالک بنا دیا، اور ایسی زمین کا بھی (تم کو اپنے علم ازلی میں مالک بنا رکھا ہے) جس پر تم نے (ابھی) قدم (تک) نہیں رکھا (اس میں بشارت ہے فتوحات مستقبلہ کی عموماً یا فتح خیبر کی خصوصاً جو اس سے کچھ بعید ہوا) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے (اس لئے یہ امور کچھ بعید نہیں ہیں) :-

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان اور مسلمانوں کو آپ کے مکمل اتباع و اطاعت کی ہدایت تھی۔ اسی کی مناسبت سے یہ پورے دور کو ع قرآن کے غزوہ احزاب کے واقعہ سے متعلق نازل ہوئے ہیں، جس میں کفار و مشرکین کی بہت سی جماعتوں کا مسلمانوں پر یکبارگی حملہ اور سخت ترغ کے بعد مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد معجزات کا ذکر ہے۔ اور اس کے ضمن میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق بہت سی ہدایات اور احکام ہیں۔ انہی بے بہا ہدایات کی وجہ سے اکابر مفسرین نے اس جگہ واقعہ احزاب کو خاص تفصیل سے لکھا ہے خصوصاً

قرطبی اور منہری وغیرہ نے اس لئے واقعۃ احزاب کی کچھ تفصیل مع ان ہدایات کے لکھی جاتی ہے جس کا اکثر حصہ قرطبی اور منہری سے لیا گیا ہے جو کسی دوسری کتاب سے لیا ہے، اس کا حوالہ لکھ دیا گیا ہے۔

واقعہ غزوۃ احزاب

اَحْزَاب، حزب کی جمع ہے، جس کے معنی پارٹی یا جماعت کے آتے ہیں۔ اس غزوہ میں کفار کی مختلف جماعتیں متحد ہو کر مسلمانوں کو ختم کر دینے کا معاہدہ کر کے مدینہ پر چڑھ آئی تھیں، اسی لئے اس غزوہ کا نام غزوۃ احزاب رکھا گیا ہے۔ اور چونکہ اس غزوہ میں دشمن کے آنے کے راستہ پر بامر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خندق کھودی گئی تھی، اس لئے اس کو غزوۃ خندق بھی کہتے ہیں۔ غزوۃ بنو قریظہ بھی جو غزوۃ احزاب کے فوراً بعد ہوا اور مذکورہ آیات میں اس کا بھی ذکر ہے وہ بھی درحقیقت غزوۃ احزاب ہی کا ایک جز تھا، جیسا کہ واقعہ کی تفصیل سے معلوم ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس سال مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف فرما ہوئے، اس کے دوسرے ہی سال میں غزوۃ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ تیسرے سال میں غزوۃ احد پیش آیا۔ چوتھے سال میں یہ غزوۃ احزاب واقع ہوا۔ اور بعض روایات میں اس کو پانچویں سال کا واقعہ قرار دیا ہے۔ بہر حال ابتداء ہجرت سے اس وقت تک کفار کے حملے مسلمانوں پر مسلسل جاری تھے غزوۃ احزاب کا حملہ بڑی بھرپور طاقت و قوت اور پختہ عزم اور عہد و میثاق کے ساتھ کیا گیا تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام پر یہ غزوہ سب دوسرے غزوات سے زیادہ اشد تھا۔ کیونکہ اس میں حملہ آور احزاب کفار کی تعداد بارہ ہزار سے پندرہ ہزار تک بتلائی گئی ہے، اور اس طرف سے مسلمان کُل تین ہزار وہ بھی بے سر و سامان، اور زمانہ سخت سردی کا۔ قرآن کریم تو اس واقعہ کی شدت بڑی ہولناک صورت میں یہ بیان فرمائی ہے، **وَاَغْتَابَ النَّاسُ** (آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں)، **بَلَخَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ** (دلچے منہ کو آنے لگے)، **وَزُلْزِلُوا زَلْزَلًا شَدِيدًا** (سخت زلزلہ میں ڈالے گئے)۔

مگر جیسا کہ یہ وقت مسلمانوں پر سب سے زیادہ سخت تھا، ویسے ہی اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد سے اس کا انجام مسلمانوں کے حق میں ایسی عظیم فتح و کامیابی کی صورت میں سامنے آیا کہ اس نے تمام مخالف گروہوں، مشرکین، یہود اور منافقین کی کمریں توڑ دیں۔

اور آگے ان کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ مسلمانوں پر کسی حملے کا ارادہ کر سکیں۔ اس لحاظ سے یہ غزوہ کفر و اسلام کا آخری معرکہ تھا، جو مدینہ منورہ کی زمین پر ہجرت کے چوتھے یا پانچویں سال میں لڑا گیا۔

اس واقعہ کی ابتداء یہاں سے ہوئی کہ یہود کے قبیلہ بنی نضیر اور قبیلہ بنی دائل کے تقریباً بیس آدمی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے سخت عداوت رکھتے تھے مکہ مکرمہ پہنچے، اور قریشی سرداروں سے ملاقات کر کے ان کو مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ قریشی سردار سمجھتے تھے کہ جس طرح مسلمان ہماری بت پرستی کو کفر کہتے ہیں اور اس لئے ہمارے مذہب کو برا سمجھتے ہیں یہود کا بھی یہی خیال ہے، تو ان سے موافقت و اتحاد کی کیا توقع رکھی جائے۔ اس لئے ان لوگوں نے یہود سے سوال کیا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان دین و مذہب کا اختلاف ہے اور آپ لوگ اہل کتاب اور اہل علم ہیں، پہلے ہمیں یہ بات بتلائیے کہ آپ کے نزدیک ہمارا دین بہتر ہے یا ان کا۔

سیاست کے اکھاڑے میں | ان یہودیوں نے اپنے علم و ضمیر کے بالکل خلاف ان کو یہ جواب دیا کہ جھوٹ کوئی نئی چیز نہیں | تمہارا دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین سے بہتر ہے۔ اس پر یہ لوگ کچھ مطمئن ہوئے، مگر اس پر بھی معاملہ یہ ٹھہرا کہ بیس آدمی یہ آنے والے اور پچاس آدمی قریشی سرداروں کے مسجد حرام میں جا کر بیت اللہ کی دیواروں سے سینے لگا کر اللہ کے سامنے یہ عہد کریں کہ ہم میں سے جب تک ایک آدمی بھی زندہ رہے گا ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے علم و کرم | اللہ کے گھر میں اللہ کے بیت سے چمٹ کر اللہ کے دشمن اس کے رسول کا ایک عجوبہ !!! | کے خلاف جنگ لڑنے کا معاہدہ کر رہے ہیں، اور مطمئن ہو کر جنگ کا نیا جذبہ لے کر ٹوٹتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علم و کرم کا عجیب منظر ہے۔ پھر ان کے اس معاہدہ کا شر بھی آخر قصہ میں معلوم ہو گا کہ سب کے سب اس جنگ سے منہ موڑ کر بھاگے۔

یہ یہودی قریش مکہ کے ساتھ معاہدہ کرنے کے بعد عرب کے ایک بڑے اور جنگجو قبیلہ غطفان کے پاس پہنچے اور ان کو بتلایا کہ ہم اور قریش مکہ اس پر متفق ہو چکے ہیں کہ اس نئے دین (اسلام) کے پھیلانے والوں کا ایک مرتبہ سب مل کر استیصال کر دیں۔ آپ بھی اس پر ہم سے معاہدہ کریں۔ اور ان کو یہ رشوت بھی پیش کی کہ خیبر میں جس قدر کھجور ایک سال میں پیدا ہوگی وہ اور بعض روایات میں اس کا نصف قبیلہ غطفان کو دیا جانے کا وعدہ کیا۔ قبیلہ غطفان کے سردار عیینہ بن حصن نے اس شرط کے ساتھ ان سے

شرکت کو منظور کر لیا اور یہ لوگ بھی جنگ میں شامل ہو گئے۔

اور باہمی قرارداد کے مطابق مکہ سے قریشیوں کا لشکر چار ہزار جوانوں اور تین سو گھوڑوں اور ایک ہزار اونٹوں کے سامان کے ساتھ ابوسفیان کی قیادت میں مکہ مکرمہ سے بھلا اور مرظہران میں قیام کیا یہاں قبیلہ اسلم اور قبیلہ اشجج اور بنو مکرہ، بنو کنانہ اور فزآرہ اور غطفان کے سب قبائل شامل ہو گئے۔ جن کی مجموعی تعداد بعض روایات میں دس بعض میں بارہ ہزار اور بعض میں پندرہ ہزار بیان کی گئی ہے۔

مدینہ منورہ پر غزوہ بدر میں مسلمانوں کے مقابل آنے والا لشکر ایک ہزار کا تھا، پھر غزوہ احد میں حملہ کرنے والا لشکر تین ہزار کا تھا۔ اس مرتبہ لشکر کی تعداد بھی ہر پہلی مرتبہ سے زائد تھی، اور سامان بھی اور تمام قبائل عرب و یہود کی اتحادی طاقت بھی۔

مسلمانوں کی جنگی تیاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس متحدہ محاذ کے حرکت میں آنے کی اطلاع ملی تو سب پہلا کلمہ جو زبان مبارک پر آیا یہ تھا حَسْبُنَا اللہ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ”یعنی ہمیں اللہ کافی اور وہی ہمارا بہتر کارساز ہے“ اس کے بعد مہاجرین و انصار کے اہل حل و عقد کو جمع کر کے آگ

(۱) اللہ پر توکل (۲) باہمی مشورہ (۳) بقدر وسعت مادی وسائل کی فراہمی

مشورہ لیا۔ اگرچہ صاحب وحی کو درحقیقت مشورہ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ براہ راست حق تعالیٰ کے اذن و اجازت سے کام کرتے ہیں مگر مشورے میں دو فائدے تھے۔ ایک امت کے لئے مشورہ کی سنت جاری کرنا، دوسرے قلوب مؤمنین میں باہمی ربط و اتحاد کی تحریک اور تعاون و تناسر کا جذبہ بیدار کرنا۔ اس کے بعد دفاع اور جنگ کے مادی وسائل پر غور ہوا۔ مجلس مشورہ میں حضرت سلمان فارسیؓ بھی شامل تھے جو ابھی حال میں ایک یہودی کی مصنوعی غلامی سے نجات حاصل کر کے اسلامی خدمات کے لئے تیار ہوئے تھے انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمارے بلاد فارس کے بادشاہ ایسے حالات میں دشمن کا حملہ روکنے کے لئے خندق کھود کر ان کا راستہ روک دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مشورہ قبول فرما کر خندق کھودنے کا حکم دیدیا۔ اور بنفس نفیس خود بھی اس کام میں شریک ہوئے۔

خندق کی کھدائی یہ خندق جبل سلح کے چپے اس پورے راستہ کی لمبائی پر کھودنا طے ہوا جس مدینہ کے شمال کی طرف سے آنے والے دشمن آسکتے تھے، اس خندق کے طول و عرض کا خط خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھینچا۔ یہ خندق قلعہ شیخین سے شروع ہو کر جبل سلح کے مغربی گوشہ تک آئی اور بعد میں اسے بڑھا کر وادی لبطان اور وادی راتونا کے مقام اتصال تک پہنچا دیا گیا۔ اس خندق کی کل لمبائی تقریباً ساڑھے تین میل تھی، چوڑائی اور گہرائی

کی صحیح مقدار کسی روایت سے معلوم نہیں ہوئی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ چوڑائی اور گہرائی بھی خاصی ہوگی جسکو عبور کرنا دشمن کے لئے آسان نہ ہو۔

حضرت سلمانؓ کے خندق کھودنے کے واقعہ میں یہ آیا ہے کہ وہ روزانہ پانچ گز لمبی اور پانچ گز گہری خندق کھودتے تھے (منظری) اس سے خندق کی گہرائی پانچ گز کہی جاسکتی ہو۔ اسلامی لشکر کی تعداد اس وقت مسلمانوں کی جمعیت کل تین ہزار تھی، اور کل چھتیس گھوڑے تھے۔

بلوغ کی عمر پندرہ سال قرار دی گئی | اسلامی لشکر میں کچھ نابالغ بچے بھی اپنے جوش ایمانی سے بھل کھڑے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بچوں کو واپس کر دیا جو پندرہ

سال سے کم عمر والے تھے، پندرہ سالہ نو عمر لے لئے گئے جن میں حضرت عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، ابوسعید خدری، برادر ابن عازب رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ جس وقت یہ اسلامی لشکر مقابلہ کے لئے روانہ ہونے لگا تو جو منافقین مسلمانوں میں رہے رہتے تھے انھوں نے سرکنا شروع کیا۔ کچھ ٹھپ کر بھل گئے، کچھ لوگوں نے جھوٹے اعدا پیش کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واپسی کی اجازت لینی چاہی۔ یہ اپنے اندر سے ایک نئی آفت پھوٹی۔ مذکورہ آیات میں انہی منافقین کے متعلق چند آیات نازل ہوئی ہیں (قرطبی)

قبائلی اور نبی قومیتوں کا | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہاد کے لئے مہاجرین کا جھنڈا انتظامی معاشرتی امتیاز حضرت زید بن حارثہ کے سپرد فرمایا اور حضرات انصار کا جھنڈا اسلامی وحدت اور اسلامی قومیت کے منافی نہیں حضرت سعد بن عبادہ کے سپرد فرمایا۔ اس وقت مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات (بھائی چارے) کے تعلقات بڑی مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم تھے، اور سب بھائی بھائی تھے۔ مگر انتظامی سہولت کے لئے مہاجرین کی قیادت الگ اور انصار کی الگ کر دی گئی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی قومیت اور اسلامی وحدت انتظامی اور معاشرتی تقسیم کے منافی نہیں بلکہ ہر جماعت پر ذمہ داری کا بوجھ ڈال دینے سے باہمی اعتماد اور تعاون و تناصر کے جذبہ کی تقویت ہوتی تھی۔ اور اس جنگ کے سب سے پہلے کام یعنی خندق کھودنے میں اس تعاون و تناصر کا اس طرح مشاہدہ ہوا کہ :-

خندق کی کھدائی کی تقسیم | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے لشکر کے مہاجرین و انصار کو پورے لشکر پر کی گئی !! | دس دس آدمیوں کی جماعت میں تقسیم کر کے ہر دس آدمیوں کو چالیس گز خندق کھودنے کا ذمہ دار بنایا۔ حضرت سلمان فارسیؓ چونکہ خندق کھودنے کا

مشورہ دینے والے اور کام سے واقف اور مضبوط آدمی تھے، اور نہ انصار میں شامل تھے نہ مہاجرین میں ان کے متعلق انصار و مہاجرین میں ایک مسابقت کی فضا پیدا ہو گئی۔ انصار ان کو اپنے میں شامل کرنا چاہتے تھے، مہاجرین اپنے میں۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رفع نزاع کے لئے مداخلت کرنے کی نوبت آئی اور آپ نے یہ فیصلہ دیا کہ سَلَمَانٌ وَمِنَّا أَهْلُ الْبَيْتِ، یعنی سلمان ہمارے اہل بیت میں شامل ہیں۔

صلاحیت کار میں ملکی | آج تو دنیا میں غیر ملکی باشندے اور غیر مقامی کو اپنی برابر کا درجہ دینا غیر ملکی، مقامی اور بیرونی لوگ پسند نہیں کرتے وہاں ہر فرقہ اہل صلاحیت کو اپنے ساتھ شامل کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز

نے ان کو اہل بیت میں خود داخل فرما کر نزاع کو ختم کیا اور عملی طور پر چند انصار اور چند مہاجرین شامل کر کے ان کے دس کی جماعت بنائی، جس میں حضرت عمرو بن عوفؓ اور حدیفہؓ وغیرہ مہاجرین میں سے تھے۔

ایک عظیم معجزہ | اتفاق سے جو حصہ خندق کا حضرت سلمانؓ وغیرہ کے سپرد تھا اس میں ایک سخت اور چکنے پتھر کی بڑی چٹان نکل آئی۔ حضرت سلمانؓ کے ساتھی عمرو بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ اس چٹان نے ہمارے اوزار توڑ دیئے اور ہم اس کے کاٹنے سے عاجز ہو گئے۔ تو میں نے سلمانؓ سے کہا کہ اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس جگہ سے کچھ ہٹ کر خندق

کھودیں اور فوراً سی کچی کے ساتھ اس کو اصل خندق سے ملا دیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چکنے ہوئے خط سے انحراف ہمیں اپنی رائے سے نہیں کرنا چاہئے، آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کر کے حکم حاصل کریں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

قدرت کی تنبیہات | اس ساڑھے تین میل کے میدان میں خندق کھودنے والوں میں کسی کو رکاوٹ پیش نہ آئی جو عاجز کر دے۔ پیش آئی تو حضرت سلمانؓ کو پیش آئی، جنہوں نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا تھا اور اسی کو قبول کر کے یہ سلسلہ جاری ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دکھلا دیا کہ خندق کھودنے اور بنانے میں بھی اللہ کی طرف رجوع کے سوا چارہ نہیں، آلات اوزار سب جواب دے چکے۔ جس میں ان حضرات کو تعلیم تھی کہ مادی اسباب کو بقدر وسعت طاقت جمع کرنا فرض ہے، مگر ان پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔ مومن کا بھروسہ تمام اسباب مادیہ کو جمع کر لینے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ ہی پر ہونا چاہئے۔

حضرت سلمانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بتلایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اپنے حصہ کی خندق میں کام کر رہے تھے، خندق

کی مٹی کو اس جگہ سے منتقل کرنے میں مصروف تھے۔ حضرات برابر بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپؐ کو دیکھا کہ آپؐ کے جسم مبارک کو غبار نے ایسا ڈھانپ لیا تھا کہ پیٹ اور پیچھے کی کھال نظر نہ آتی تھی۔ ان کو کوئی مشورہ یا حکم دینے کے بجائے خود ان کے ساتھ موقع پر تشریف لائے اور دس حضرات صحابہؓ مع سلمانؓ کے جو اس کے کھودنے میں مصروف تھے خندق کے اندر اتر کر آپؐ بھی ان میں شامل ہو گئے۔ اور کدال اپنے دست مبارک میں لے کر اس چٹان پر ایک ضرب لگائی۔ اور یہ آیت پڑھی تَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا یعنی پوری ہو گئی نعمت آپؐ کے رب کی سچائی کے ساتھ اس ایک ہی ضرب سے چٹان کا ایک تہائی حصہ کٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک روشنی پتھر کی چٹان سے برآمد ہوئی۔ اس کے بعد آپؐ نے دوسری ضرب لگائی اور آیت مذکورہ کو آخر تک پڑھا، یعنی قَدَّتْ کَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا، اس دوسری ضرب کا ایک تہائی چٹان اور کٹ گئی، اور اسی طرح پتھر سے ایک روشنی نکلی۔ تیسری مرتبہ پھر وہی آیت پوری پڑھ کر تیسری ضرب لگائی، تو باقی چٹان بھی کٹ کر ختم ہو گئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق سے باہر تشریف لائے۔ اور اپنی چادر جو خندق کے کنارہ پر رکھ دی تھی اٹھالی اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ اس وقت سلمان فارسیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ آپؐ نے جتنی مرتبہ اس پتھر پر ضرب لگائی میں نے ہر مرتبہ پتھر سے ایک روشنی نکلتی دیکھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمانؓ سے فرمایا کہ کیا واقعی تم نے یہ روشنی دیکھی ہے؟ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ میری آنکھوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلی ضرب میں جو روشنی نکلی میں نے اس روشنی میں یمن اور کسریٰ کے شہروں کے محلات دیکھے اور جبریل امینؑ نے مجھے بتلایا کہ آپؐ کی امت ان شہروں کو فتح کرے گی۔ اور جب میں نے دوسری ضرب لگائی تو مجھے رومیوں کے سرخ محلات دکھائے گئے، اور جبریل امینؑ نے یہ خوش خبری دیدی کہ آپؐ کی امت ان شہروں کو بھی فتح کرے گی۔ یہ ارشاد من کر سب مسلمان مطمئن ہوئے، اور آئندہ عظیم الشان فتوحات پر یقین ہو گیا۔

منافقین کی طعنہ زنی اور | اس وقت جو منافقین خندق کی کھدائی میں شامل تھے، وہ مسلمانوں کا بے نظریقین ایمانی کہنے لگے کہ تمہیں محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر حیرت و تعجب نہیں ہوتا۔ وہ تمہیں کیسے باطل اور بے بنیاد وعدے سنار ہے ہیں کہ یثرب میں خندق کی گہرائی کے اندر انھیں حیرہ اور مدائن کسریٰ کے محلات نظر آرہے ہیں، اور

یہ کہ تم لوگ ان کو فتح کرو گے۔ ذرا اپنے حال کو تو دیکھو کہ تمہیں اپنے تن بدن کا تو ہوش نہیں، پیشانی پاخانے کی ضرورت پوری کرنے کی ہمت نہیں، تم ہو جو کسری وغیرہ کے ملک کو فتح کرو گے اسی واقعہ پر آیات مذکورہ صدر میں یہ نازل ہوا اِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا، اس آیت میں الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ میں بھی انہی منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے جن کے دلوں میں نفاق کا مرض چھپا ہوا تھا۔

غور کیجئے کہ اس وقت مسلمانوں کے ایمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پر پورے یقین کا کیسا سخت امتحان تھا کہ ہر طرف سے کفار کے ترغیب اور خطرے میں ہیں، خندق کھودنے کے لئے مزدور اور خادم نہیں، خود ہی یہ محنت ایسی حالت میں برداشت کر رہے ہیں کہ سخت سردی نے سب کو پریشان کر رکھا ہے، ہر طرف سے خوف ہی خوف ہے۔ بظاہر اسباب اپنے بچاؤ اور بقا کے یقین کرنا بھی آسان نہیں، دنیا کی عظیم سلطنت روم و کسریٰ کی فتوحات کی خوش خبری پر یقین کس طرح ہو؟ مگر ایمان کی قیمت سب اعمال سے زیادہ اسی بنا پر ہے کہ اسباب و حالات کے سراسر خلاف ہونے کے وقت بھی ان کو رسولؐ کے ارشاد میں کوئی شک و شبہ پیدا نہ ہوا۔

واقعہ مذکورہ میں امت کے لئے یہ کس کو معلوم نہیں کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص ہدایت کہ بڑوں کو چھوٹوں کی ہر تکلیف و مشقت میں شامل نہ ہونا چاہئے۔ ایسے جاں نثار خادم تھے جو کسی حال بھی یہ نہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اس مزدوری کی محنت شاقہ میں ان کے شریک ہوں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی دل جوئی اور امت کی تعلیم کے لئے اس محنت و مزدوری میں برابر کا حصہ لیا۔ صحابہ کرام کی جاں نثاری، آپ کے اوصاف کمال اور نبوت و رسالت کی بنیاد پر تو تھی ہی، مگر ظاہر اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ہر محنت و مشقت اور تنگی و تکلیف میں آپ سب عوام کی طرح ان میں شریک ہوتے تھے۔ حاکم و محکوم، بادشاہ و رعیت اور صاحب اقتدار و عوام کی تفریق کا کوئی تصور وہاں نہ پیدا ہوتا۔ اور جب سے ملوک اسلام نے اس سنت کو ترک کیا اسی وقت سے یہ تفرقہ پھوٹے، اور طرح طرح کے فتنے اپنے دامن میں لائے۔

مشکلات پر عبور حاصل | واقعہ مذکورہ میں اس ناقابل تسخیر چٹان پر ضرب لگانے کے ساتھ آیت قرآن قَسَمْتُ لَكُمْ بِرَبِّيَ صِدْقًا وَاَعْدَ لَا اُطْلَا مَبِیْنًا لِّکَلِمَتِهِ

تلاوت فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ کسی مشکل کو حل کرنے کے لئے اس آیت کی تلاوت ایک مجرب نسخہ ہے۔

صحابہ کرام کا ایثار اور تعاونِ تناصر | اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ خندق کی کھدائی کے لئے ہر چالیس

گزیدہ آدمی مامور تھے، مگر یہ ظاہر ہے کہ بعض لوگ قوی اور جلد کام کر لینے والے ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام میں سے جن حضرات کا اپنا حصہ کھدائی کا پورا ہو جاتا تو یہ سمجھ کر خالی نہ بیٹھتے تھے کہ ہماری ڈیوٹی پوری ہو گئی، بلکہ دوسرے صحابہ جن کا حصہ بھی مکمل نہیں ہوا تھا ان کی مدد کرتے تھے (قرطبی، منہجری)

ساڑھے تین میل لمبی خندق | صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جدوجہد اور کوشش کا نتیجہ چھ دن میں مکمل ہو گئی | چھ روز میں سامنے آگیا، کہ اتنی طویل اور چوڑی اور گہری خندق کی چھ روز میں تکمیل ہو گئی (منہجری)

حضرت جابرؓ کی دعوت میں | اسی خندق کی کھدائی کے دوران وہ مشہور واقعہ پیش آیا کہ ایک روز ایک کھلا ہوا معجزہ | حضرت جابرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر محسوس کیا کہ بھوک کے سبب آپ متاثر ہو رہے ہیں اپنی اہلیہ سے جا کر کہا کہ تمہارے پاس کچھ ہو تو پکالو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھوک کا اثر دیکھا نہیں جاتا۔ اہلیہ نے بتلایا کہ ہمارے گھر میں ایک صاع بھر جو رکھے ہیں میں ان کو پیس کر آٹا بناتی ہوں۔ ایک صاع ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین سیر کا ہوتا ہے۔ اہلیہ پینے پکانے میں لگی، گھر میں ایک بکری کا بچہ تھا حضرت جابرؓ نے اس کو ذبح کر کے گوشت تیار کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلانے کے لئے چلے۔ تو اہلیہ نے پکار کر کہا کہ دیکھئے حضورؐ کے ساتھ بہت بڑا مجمع صحابہ کا ہے، صرف حضورؐ کو کسی طرح ہتھابلا لائیں، مجھے رسوا نہ کیجئے کہ صحابہ کرام کا بڑا مجمع چلا آئے۔ حضرت جابرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری حقیقت حال عرض کر دی کہ صرف اتنا کھانا ہے، مگر آپؐ نے پورے لشکر میں اعلان فرما دیا کہ چلو جابرؓ کے گھر دعوت ہے۔ حضرت جابرؓ حیران تھے گھر پہنچے تو اہلیہ نے سخت پریشانی کا اظہار کیا، اور پوچھا کہ آپؐ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اصل حقیقت اور کھانے کی مقدار بتلا دی تھی؟ جابرؓ نے فرمایا کہ ہاں وہ میں بتلا چکا ہوں تو اہلیہ محترمہ مطمئن ہوئیں کہ پھر ہمیں کچھ فکر نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم مالک ہیں جس طرح چاہیں کریں۔

واقعہ کی تفصیل اس جگہ غیر ضروری ہے، اتنا نتیجہ معلوم کر لینا کافی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے روٹی اور سالن سب کو دینے اور کھلانے کا اہتمام فرمایا، اور پورے مجمع نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ سب مجمع کے فارغ ہونے کے بعد بھی نہ ہماری ہنڈیا میں سے کچھ گوشت کم نظر آتا تھا اور نہ گوندھی ہوئے آٹے میں کوئی کمی معلوم ہوتی تھی۔ ہم سب گھر والوں نے بھی شکم سیر

ہو کر کھایا باقی پڑوسیوں میں تقسیم کر دیا۔

اس طرح چھ روز میں جب خندق سے فراغت ہو گئی تو احزاب کا لشکر آپہنچا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے جبل سلح کو اپنی پشت کی طرف رکھ کر فوج کی صف بندی کر دی۔

یہودی بنی قریظہ کی عہد شکنی اور احزاب کے ساتھ شرکت

اس وقت دس بارہ ہزار کے با سامان لشکر کے ساتھ تین ہزار بے سر و سامان لوگوں کا مقابلہ بھی عقل و قیاس میں آنے کی چیز نہ تھی۔ اس پر ایک اور نیا اضافہ ہوا کہ احزاب میں قبیلہ بنو نضیر کے سردار حنی بن اخطب نے سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی دشمنی پر جمع کرنے میں بڑا کام کیا تھا، مدینہ پہنچ کر یہود کے قبیلہ بنو قریظہ کو بھی اپنے ساتھ ملانے کا منصوبہ بنایا۔ بنو قریظہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ایک صلح نامہ پر دستخط ہو چکے تھے اور معاہدہ مکمل ہو کر ایک دوسرے سے بے فکر تھے۔ بنو قریظہ کا سردار کعب بن اسد تھا۔ حنی بن اخطب اس کے پاس پہنچا۔ جب کعب کو اس کے آنے کی خبر ملی تو اپنے قلعہ کا دروازہ بند کر لیا، کہ حنی اس تک نہ پہنچ سکے۔ مگر حنی بن اخطب نے آوازیں دیں اور دروازہ کھولنے پر اصرار کیا۔ کعب نے اندر ہی سے جواب دیا کہ ہم تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلح کر چکے ہیں، اور ہم آج تک ان کی طرف سے معاہدہ کی پابندی اور صدق و سچائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا، اس لئے ہم اس معاہدہ کے پابند ہیں، آپ کے ساتھ نہیں آسکتے۔ دیر تک حنی بن اخطب دروازہ کھولنے اور کعب سے باتیں کرنے پر اصرار کرتا رہا اور یہ اندر سے ہی انکار کرتا رہا۔ مگر بالآخر جب کعب کو بہت عار دلایا تو اس نے دروازہ کھول کر حنی کو بلایا اس نے بنو قریظہ کو وہ سبز باغ دکھائے کہ بالآخر کعب اس کی باتوں میں آ گیا، اور احزاب میں شرکت کا وعدہ کر لیا۔ اور کعب نے جب اپنے قبیلہ کے دوسرے سرداروں کو یہ بات بتلائی تو سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ تم نے غضب کیا کہ مسلمانوں سے بلا وجہ عہد شکنی کی اور ان کے ساتھ لگ کر اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دیا۔ کعب بھی ان کی بات سے متاثر ہوا اور اپنے کئے پر ہمت کا اظہار کیا۔ مگر اب بات اس کے قبضہ سے نکل چکی تھی، اور بالآخر یہی عہد شکنی بنو قریظہ کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو اس کی اطلاع ملی تو اس وقت میں ان کی عہد شکنی سے سخت صدمہ پہنچا، اور بہت بڑی فکر اس کی لاحق ہو گئی کہ احزاب کے رستہ پر تو خندق کھود دی گئی تھی، مگر یہ لوگ تو مدینہ کے اندر تھے، ان سے بچاؤ کیسے ہو۔ قرآن کریم

میں جو اس جملہ کے متعلق فرمایا ہو کہ لشکر احزاب کے کفار تم پر چڑھ آئے تھے میں تو قہر
وَمِنْ أَسْفَلٍ مِنْكُمْ اس کی تفسیر میں بعض ائمہ تفسیر نے یہی فرمایا ہے کہ فوق کی جانب سے
مراد بنو قریظہ ہیں اور اسفل سے آنے والے باقی احزاب ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عہد شکنی کی حقیقت اور صحیح صورت حال معلوم
کرنے کے لئے انصار کے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ اور قبیلہ خزرج کے
سردار حضرت سعد بن عبادہؓ کو بصورت وفد کعب کے پاس بھیجا کہ اس سے گفتگو کریں اور
یہ ہدایت دیدی کہ اگر عہد شکنی کا واقعہ غلط ثابت ہو تو سب صحابہ کے سامنے کھل کر بیان
کر دینا اور صحیح ثابت ہو تو آکر گول مول بات کہنا جس سے ہم سمجھ لیں اور عام صحابہ کرام
میں سراپائی پیدا نہ ہو۔

یہ دونوں بزرگ سعد نامی وہاں پہنچے تو عہد شکنی کے سامان کھلے دیکھے۔ ان کے اور
کعب کے درمیان سخت کلامی بھی ہوئی، واپس آکر حسب ہدایت گول مول بات کہہ کر
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عہد شکنی کا واقعہ صحیح ہونے سے باخبر کر دیا۔

اس وقت جب کہ یہود کا قبیلہ بنو قریظہ جو مسلمانوں کا حلیف تھا وہ بھی ہر سر جنگ
آگیا تو جو نفاق کے ساتھ مسلمانوں میں شامل تھے ان کا نفاق بھی کھلنے لگا۔ بعض نے
تو کھل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف باتیں کہنا شروع کر دیں، جیسا کہ اوپر
گزارا اِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ، اور بعض نے حیلے بہانے بنا کر میدان جنگ سے بھاگ
جانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی، جس کا ذکر آیات مذکورہ
(اِنَّ بَيْنَنا وَبَيْنَکُمْ عَوْرَةً) میں آیا ہے۔

اب محاذ جنگ کی یہ صورت تھی کہ خندق کی وجہ سے احزاب کا لشکر اندر نہ آسکتا
تھا۔ اس کے دوسرے کنارہ پر مسلمانوں کا لشکر تھا۔ دونوں میں ہر وقت تیر اندازی کا
کا سلسلہ رہتا تھا۔ اسی حال میں تقریباً ایک مہینہ ہو گیا کہ نہ کھل کر کوئی فیصلہ کن جنگ
ہوتی تھی اور نہ کسی وقت بے فکری دن رات صحابہ کرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
خندق کے کنارے اس کی حفاظت کرتے تھے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی
بنفس نفیس اس محنت و مشقت میں شریک تھے، مگر آپؐ پر یہ بات بہت شاق تھی کہ
صحابہ کرام سب کے سب سخت اضطراب اور بے چینی میں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ قبیلہ
کی ایک جنگی تدبیر غطفان کے رئیس نے ان یہودیوں کے ساتھ شرکت خیبر کے پھل

اور کجور کی طرح میں کی ہے۔ آپ نے غطفان کے دو سردار عیینہ ابن حصن اور ابوالحارث بن عمرو کے پاس قاصد بھیجا کہ ہم تمہیں مدینہ طیبہ کا ایک تہائی پھل دیں گے، اگر تم اپنے ساتھیوں کو لے کر میدان سے واپس چلے جاؤ۔ یہ گفتگو درمیان میں تھی اور دونوں سردار راضی ہو چکے تھے قریب تھا کہ معاہدہ صلح پر دستخط ہو جائیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسبِ عادت ارادہ کیا کہ صحابہ کرام سے اس معاملہ میں مشورہ لیں۔ قبیلہ اوس و خزرج کے دو بزرگ سعد بن سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ کو بلا کر ان سے مشورہ لیا۔

حضرت سعد کی غیرت ایمانی اور عزم شدید کی طرف سے حکم ہوا ہے تو ہمارے کچھ کہنے کی مجال نہیں ہم قبول کریں گے ورنہ بتائیو کہ یہ آپ کی طبعی رائے ہے یا آپ نے ہمیں مشقت و تکلیف سے بچانے کے لئے یہ تدبیر کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ امرا آئی اس کا ہے، اور نہ میری اپنی طبیعت کا تقاضا ہے بلکہ صرف تمہاری مصیبت و تکلیف کو دیکھ کر یہ صورت اختیار کی ہے، کیونکہ تم لوگ ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہو۔ میں نے چاہا فریقِ مقابل کی قوت کو اس طرح فوراً توڑ دیا جائے۔ حضرت سعد بن معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم جس وقت بتوں کو پوچھتے تھے اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانتے تھے نہ اس کی عبادت کرتے تھے، اُس وقت اُن لوگوں کو ہمارے شہر کے پھل میں سے ایک دانہ کی طرح رکھنے کی ہمت نہیں تھی، بجز اس کے کہ وہ ہمارے ہمان ہوں، اور مہمانی کے طور پر ہم ان کو کھلا دیں یا پھر ہم سے خرید کر لے جائیں۔ آج جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی معرفت عطا فرمائی اور اسلام کا اعزاز عطا فرمایا، کیا آج ہم ان لوگوں کو اپنا پھل اور اپنے اموال دیدیں گے۔ ہمیں ان کی مصالحت کی کوئی حاجت نہیں، ہم تو ان کو تلوار کے سوا کچھ نہیں دیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور اُن کے درمیان فیصلہ فرمادیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد کی اولوالعزمی اور غیرت ایمانی کو دیکھ کر اپنا یہ ارادہ چھوڑ دیا اور فرمایا کہ تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔ سعد نے صلح نامہ کا کاغذ ان کے ہاتھوں سے لے کر تحریرِ شادی، کیونکہ ابھی اس پر دستخط نہیں ہوئے تھے۔ غطفان کے سردار عیینہ اور حارث جو خود اس صلح کے لئے تیار ہو کر مجلس میں موجود تھے، صحابہ کرام کی یہ قوت و شدت دیکھ کر خود بھی اپنے دلوں میں متزلزل ہو گئے۔

حضرت سعد بن معاذ کا زخمی ہونا اور ان کی دعا جاری رہا۔ حضرت سعد بن معاذ بنی حارثہ کے قلعہ میں جہاں

عورتوں کو محفوظ کر دیا گیا تھا، اپنی والدہ کے پاس گئے تھے۔ حضرت عائشہ رضی فرماتی ہیں کہ میں بھی اس وقت اسی قلعہ میں تھی، اور عورتوں کو پردے کے احکام اس وقت تک آئے نہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ سعد بن معاذؓ ایک چھوٹی زرہ پہنے ہوئی ہیں جس میں سے ان کے ہاتھ نکل رہے تھے، اور ان کی والدہ ان سے کہہ رہی ہیں کہ جاؤ جلدی کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لشکر میں شامل ہو جاؤ۔ میں نے ان کی والدہ سے کہا کہ ان کے لئے کوئی بڑی زرہ ہوتی تو بہتر تھا۔ مجھے ان کے ہاتھ پاؤں کا خطرہ ہے، جو زرہ سے نکلے ہوئے ہیں۔ والدہ نے کہا کچھ مصالفہ نہیں، اللہ کو جو کچھ کرنا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

حضرت سعد بن معاذؓ لشکر میں پہنچے تو ان کو تیر لگا جس نے ان کی رگ اکھل کر کاٹ ڈالا۔ اس وقت حضرت سعدؓ نے یہ دعا کی کہ یا اللہ اگر آئندہ بھی قریش کا کوئی حملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر ہونا مقدر ہے تو مجھے اس کے لئے زندہ رکھے، کیونکہ اس سے زیادہ میری کوئی تمنا نہیں کہ میں اس قوم سے مقابلہ کروں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا میں پہنچائیں، وطن سے نکالا، اور آپ کی تکذیب کی۔ اور اگر آئندہ آپ کے علم میں یہ جنگ کا سلسلہ ختم ہو چکا ہو تو آپ مجھے موت شہادت عطا فرمائیں، مگر اس وقت تک مجھے موت نہ آئے جب تک کہ بنی قریظہ سے ان کی غداری کا انتقام لے کر میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔

حق تعالیٰ نے آپ کی یہ دونوں دعائیں قبول فرمائیں۔ اس واقعہ احزاب کفار کا آخری حملہ بنا دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کا دور شروع ہوا۔ پہلے خیبر پھر مکہ مکرمہ اور پھر وُسکر بلاد فتح ہوئے۔ اور بنو قریظہ کا واقعہ آگے آتا ہے کہ وہ گرفتار کر کے لائے گئے اور ان کے معاملہ کا فیصلہ حضرت سعد بن معاذؓ ہی کے سپرد کیا گیا۔ ان کے فیصلہ کے مطابق ان کے جوان قتل کئے گئے، اور عورتیں بچے قید کر لئے گئے۔

اس واقعہ احزاب میں صحابہ کرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات بھر خندق کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ اگر کسی وقت آرام کے لئے لیٹے بھی تو ذرا کسی طرف سے شور و شغب کی آواز آتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلحہ باندھ کر میدان میں جاتے تھے۔ حضرت ام سلمہ ام المؤمنینؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات میں کئی کئی مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ آپ ذرا آرام کرنے کے لئے تشریف لائے اور کوئی آواز سنی تو فوراً باہر تشریف لے گئے، پھر آرام کے لئے ذرا کمر لگائی اور پھر کوئی آواز سنی تو باہر تشریف لے گئے۔

ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں بہت سے غزوات غزوہ مزین،

خیبر، حدیبیہ، فتح مکہ اور غزوہ حنین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہی ہوں، آپ پر کسی غزوہ میں ایسی شدت اور مشقت نہیں ہوئی، جیسی غزوہ خندق میں پیش آئی۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کو زخم بھی بہت لگے، سردی کی شدت سے بھی تکلیف اٹھائی، اس کے ساتھ کھانے پینے کی ضروریات میں بھی تنگی تھی (منظری)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چاہا ایک روز مقابل کفار نے یہ طے کیا کہ سب مل کر یکبارگی حملہ کر دو نمازیں اس جہاد میں قضا ہوتیں اور کسی طرح خندق کو عبور کر کے آگے پہنچو۔ یہ طے کر کے بڑی بے جگری سے مسلمانوں کے مقابلہ میں آگے، اور سخت تیر اندازی کی۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو دن بھر ایسا مشغول رہنا پڑا کہ نماز کے لئے بھی ذرا سی مہلت نہ ملی، چار نمازیں عشاء کے وقت میں پڑھی گئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسلمانوں پر شدت کی انتہا ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب کفار کے لئے بددعا کی، اور تین روز پیر، منگل، بدھ کی دعاء

میں مجید فتح کے اندر مسلسل احزاب کی شکست و فرار اور مسلمانوں کی فتح کے لئے دعا کرتے رہے۔ تیسرے روز بدھ کے دن ظہر و عصر کے درمیان دعا قبول ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شادان و فرحان صحابہ کرام کے پاس تشریف لائے، فتح کی بشارت سنائی صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ اس وقت کے بعد سے کسی مسلمان کو کوئی تکلیف پیش نہیں آئی (منظری)۔ کثود کار اور فتح کے دشمنوں کی صفوں میں قبیلہ غطفان ایک بڑی طاقت تھی، حق تعالیٰ اسباب کا آغاز کی قدرت کاملہ نے انہی میں سے ایک شخص نعیم ابن مسعودؓ کے دل

میں ایمان ڈال دیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر انھوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ اور بتلایا کہ ابھی تک میری قوم میں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں، اب مجھے فرمائیں کہ میں اسلام کی کیا خدمت کروں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اکیلے آدمی یہاں کوئی خاص کام نہ کر سکو گے، اپنی قوم میں واپس جا کر انہی میں مل کر اسلام سے مدافعت کا کوئی کام کر سکو تو کرو۔ نعیم ابن مسعودؓ ذہین سمجھدار آدمی تھے، ایک منصوبہ دل میں بنالیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی کہ میں ان لوگوں میں جا کر جو مصلحت دیکھوں کہوں، آپ نے اجازت دیدی۔

نعیم بن مسعودؓ یہاں سے بنو قریظہ کے پاس گئے جن کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں ان کے قدیم تعلقات تھے۔ ان سے کہا کہ اے بنو قریظہ تم جانتے ہو کہ میں تمہارا قدیم دوست ہوں انھوں نے اقرار کیا کہ ہمیں آپ کی دوستی میں کوئی شبہ نہیں، اس کے بعد

حضرت نعیم بن مسعودؓ نے بنو قریظہ کے سرداروں سے ناصحانہ اور خیر خواہانہ انداز میں سوال کیا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ قریش مکہ ہوں یا ہمارا قبیلہ غطفان یا دوسرے قبائل یہود وغیرہ ان کا وطن یہاں نہیں، یہ اگر شکست کھا کر بھاگ جائیں تو ان کا کوئی نقصان نہیں، تمہارا معاملہ ان سب کے مختلف ہے۔ مدینہ تمہارا وطن ہے، تمہاری عورتیں اور اموال سب یہاں ہیں۔ اگر تم نے ان لوگوں کے ساتھ جنگ میں شرکت کی اور بعد میں یہ لوگ شکست کھا کر بھاگ گئے، تو تمہارا کیا بنے گا، کیا تم تہما مسلمانوں کا مقابلہ کر سکو گے؟ اس لئے میں تمہاری خیر خواہی سے یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم لوگ ان کے ساتھ اس وقت تک شریک جنگ نہ ہو جب تک یہ لوگ اپنے خاص سرداروں کی ایک تعداد تمہارے پاس رہیں نہ رکھ دیں، کہ وہ تم کو مسلمانوں کے حوالہ کر کے نہ بھاگ جائیں۔ بنو قریظہ کو ان کا یہ مشورہ بہت اچھا معلوم ہوا، اس کی قدر کی اور کہا کہ آپ نے بہت اچھا مشورہ دیا۔

اس کے بعد نعیم بن مسعودؓ قریشی سرداروں کے پاس پہنچے، اور ان سے کہا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ میں آپ کا دوست ہوں اور محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے بری ہوں، مجھے ایک خبر ملی ہے تمہاری خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ میں وہ خبر تمہیں پہنچا دوں بشرطیکہ آپ لوگ میرے نام کا اظہار نہ کریں۔ وہ خبر یہ ہے کہ یہودی بنو قریظہ تمہارے ساتھ معاہدہ کرنے کے بعد اپنے فیصلہ پر نادم ہوئے، اور اس کی اطلاع محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ کہہ کر بھیج دی ہے کہ کیا آپ ہم سے اس شرط پر راضی ہو سکتے ہیں کہ ہم قریش اور غطفان کے چند سرداروں کو آپ کے حوالے کر دیں کہ آپ ان کی گردن مار دیں، پھر ہم آپ کے ساتھ مل کر ان سب جنگ کریں۔ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات کو قبول کر لیا، اب بنو قریظہ تم سے بطور رہن کے تمہارے کچھ سرداروں کا مطالبہ کریں گے، اب آپ لوگ اپنے معاملہ کو سوچ لیں۔

اس کے بعد نعیم بن مسعودؓ اپنے قبیلہ غطفان میں گئے، اور ان کو یہی خبر سنائی۔ اس کے ساتھ ہی ابوسفیان نے قریش کی طرف سے عکرمہ بن ابی جہل کو اور غطفان کی طرف سے درقہ ابن غطفان کو اس کام کے لئے مقرر کیا کہ وہ بنو قریظہ سے جا کر کہیں کہ اب ہمارا سامان جنگ بھی ختم ہو رہا ہے، اور ہمارے آدمی بھی مسلسل جنگ سے تھک رہے ہیں، ہم آپ کے معاہدے کے مطابق آپ کی امداد اور شرکت کے منتظر ہیں۔ بنو قریظہ نے ان کو اپنی قرار دے کے مطابق یہ جواب دیا کہ ہم تمہارے ساتھ جنگ میں اس وقت تک شریک نہیں ہونگے

جب تک تم دونوں قبیلوں کے چند سردار ہمارے پاس بطور رہن (یرغمال) کے نہ پہنچ جائیں۔ عکرمہ اور ورقہ نے یہ خبر ابوسفیان کو پہنچادی تو قریش اور غطفان کے سرداروں نے یقین کر لیا کہ نعیم بن مسعود نے جو خبر دی تھی وہ صحیح ہے۔ اور بنو قریظہ سے کہلا بھیجا کہ ہم ایک آدمی بھی اپنا آپ کو نہیں دیں گے، پھر آپ کا دل چاہے تو ہمارے ساتھ جنگ میں شرکت کریں اور نہ چاہیں نہ کریں۔ بنو قریظہ کو یہ حال دیکھ کر اس بات پر جو نعیم بن مسعود نے کہی تھی اور زیادہ یقین ہو گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دشمن گروہ میں سے ایک شخص کے ذریعہ ان کے آپس میں پھوٹ ڈال دی، اور ان لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔

اس کے ساتھ دوسری آسمانی افتاد ان پر یہ آئی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سخت اور برفانی ہوا ان پر مسلط کر دی جس نے ان کے خیمے اکھاڑ پھینکے، ہنڈیاں چوڑھوں کاڑیں۔ یہ تو ظاہری اسباب اللہ تعالیٰ نے ان کے پاؤں اکھاڑنے کے لئے پیدا فرما دیئے تھے اس پر مزید اپنے فرشتے بھیج دیئے جو باطنی طور پر ان کے دلوں پر رعب طاری کر دیں، ان دونوں باتوں کا ذکر آیات مذکورہ کے شروع میں بھی اس طرح فرمایا گیا، **وَفَارَسَلْنَا عَلَيْهِمُ رِيحًا وَجُنُودًا لَّهُمْ تَرَوْنَهَا** یعنی ہم نے بھیج دی ان کے اوپر ایک تند و سخت ہوا اور بھیج دیئے فرشتوں کے لشکر۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اب ان لوگوں کے لئے بھاگ کھڑے ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

حضرت حذیفہ کا دشمن کے لشکر میں جانے اور خبر لانے کا واقعہ	دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نعیم بن مسعود کی کارگزاری اور احزاب کے درمیان پھوٹ کے واقعات کی خبر ملی تو ارادہ فرمایا کہ اپنا کوئی آدمی جا کر دشمن کے لشکر کا واقعہ
---	---

اور ان کے ارادوں کا پتہ لائے۔ مگر وہ سخت برفانی ہوا جو دشمن پر بھیج گئی تھی بہر حال پورے مدینہ پر حاوی ہوئی، اور مسلمان بھی اس سخت سردی سے متاثر ہوئے۔ رات کا وقت تھا، صحابہ کرام دن بھر کی محنت و مقابلہ سے جو رچو رخت سردی کے سبب سمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کون ہو جو کھڑا ہو اور دشمن کے لشکر میں جا کر ان کی خبر لائے، اور اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے جان نثار صحابہ کا مجمع تھا مگر حالات نے ایسا مجبور کر رکھا تھا کہ کوئی کھڑا نہیں ہو سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہو گئے، اور کچھ دیر نماز میں مشغول رہنے کے بعد پھر مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہے کوئی شخص جو دشمن کے لشکر کی مجھے خبر لادے اور اس کے عوض میں جنت حاصل کرے۔ اس مرتبہ بھی پورے مجمع میں سناٹا رہا،

کوئی نہیں اٹھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پھر نماز میں مشغول ہو گئے اور کچھ دیر کے بعد پھر تیسری مرتبہ وہی خطاب فرمایا کہ جو ایسا کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ مگر پوری قوم دن بھر کے سخت مکان اور کئی وقت کے فاقہ سے اور بھوک سے اور ادھر سے سردی کی شدت سے ایسی بے بس ہو رہی تھی کہ پھر بھی کوئی نہ اٹھا۔

حضرت حذیفہ بن یمانؓ راوی حدیث فرماتے ہیں کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام لے کر فرمایا کہ حذیفہ تم جاؤ۔ حالت میری بھی سب جیسی تھی، مگر نام لے کر حکم دینے پر اطاعت کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں کھڑا ہو گیا، اور سردی سے میرا تمام بدن کانپ رہا تھا۔ آپؐ نے اپنا دست مبارک میرے سر اور چہرے پر پھیرا اور فرمایا کہ دشمن کے لشکر میں جاؤ اور مجھے صرف خبر لا کر دو اور میرے پاس واپس آنے سے پہلے کوئی کام نہ کرو۔ اور پھر آپؐ نے میری حفاظت کے لئے دعا فرمائی۔ میں نے اپنی تیرکمان اٹھائی اور اپنے کمرے اپنے اوپر باندھ لئے اور ان کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب یہاں سے روانہ ہوا تو عجیب ماجرا یہ دیکھا کہ خیمے کے اندر بیٹھے ہوئے جو سردی سے کپکپی طاری تھی وہ ختم ہو گئی، اور میں اس طرح چل رہا تھا جیسے کوئی گرم حمام کے اندر ہو، یہاں تک کہ میں ان کے لشکر میں پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہوا کے طوفان نے ان کے خیمے اکھاڑ دیئے تھے اور ہانٹیاں اُٹھ دی تھیں۔ ابوسفیان آگ کے پاس بیٹھ کر سینک رہے تھے۔ میں نے یہ دیکھ کر اپنا تیرکمان مستحکم کیا، اور ابوسفیان پر تیر پھینکنے ہی والا تھا کہ مجھے حضورؐ کا یہ فرمان یاد آ گیا کہ کچھ کام وہاں سے واپس آنے تک نہ کرنا۔ ابوسفیان بالکل میری زد میں تھے، مگر اس فرمان کی بناء پر میں نے اپنا تیر الگ کر لیا۔ ابوسفیان حالات سے پریشان ہو کر واپسی کا اعلان کرنا چاہتے تھے، مگر اس کے لئے ضروری تھا کہ قوم کے ذمہ داروں سے بات کریں۔ رات کی تاریکی میں اور سناٹے میں یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی جاسوس موجود ہو اور ان کی بات سن لے۔ اس لئے ابوسفیان نے یہ ہوشیاری کی کہ بات کرنے سے پہلے سارے مجمع کو کہا کہ ہر شخص اپنی برابر والے آدمی کو پہچان لے، تاکہ کوئی غیر آدمی ہماری بات نہ سن سکے۔

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ اب مجھے خطرہ ہوا کہ میری برابر کا آدمی جب مجھ سے پوچھے گا کہ تو کون ہے؟ تو میرا راز کھل جائے گا۔ انھوں نے بڑی ہوشیاری اور دلیری سے خود مسابقت کر کے اپنے برابر والے آدمی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا تعجب ہو تم مجھے نہیں جانتے، میں فلاں ابن فلاں ہوں۔ وہ قبیلہ ہوازن کا آدمی

تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت حذیفہؓ کو گرفتاری سے بچا دیا۔

ابوسفیان نے جب یہ اطمینان کر لیا کہ مجمع اپنا ہی ہے، کوئی غیر نہیں تو اس نے پریشان کن حالات اور بنو قریظہ کی بدعہدی اور سامان جنگ ختم ہو جانے کے واقعات سنا کر کہا کہ میری راتے یہ ہے کہ اب آپ سب واپس چلیں اور میں بھی واپس جا رہا ہوں اسی وقت لشکر میں بھگدڑ مچ گئی، اور سب واپس جانے لگے۔

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں یہاں سے واپس چلا تو ایسا محسوس ہوا کہ میرے گرد کوئی گرم حمام ہی جو مجھے سردی سے بچا رہا ہے۔ واپس پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں مشغول پایا۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو میں نے واقعہ کی خبر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس خبر مسرت سے خوش ہو کر ہنسنے لگے۔ یہاں تک کہ رات کی تاریکی میں آپ کے دندان مبارک چمکنے لگے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے قدموں میں جگہ دی، اور جو چادر آپ اوڑھے ہوئے تھے اس کا ایک حصہ مجھ پر ڈال دیا، یہاں تک کہ میں سو گیا۔ جب صبح ہو گئی تو آپ نے ہی یہ کہہ کر مجھے بیدار فرمایا کہ قُمْ يَا ذُو مَنَا، کھڑا ہو جا اے بہت سونے والے۔

آمدہ کفار کے حوصلے | صحیح بخاری میں حضرت سلیمان بن صرد کی روایت ہے کہ احزاب پست ہو جائیگی خوشخبری کے واپس جانے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

الْآنَ نَغْزُوهُمْ وَ لَا
يَغْزُوْا وَ نَتَّخِذُ نَسِيْرًا
اِثْمِيْهِمْ (بخاری)

یعنی اب وہ ہم پر حملہ آور نہ ہوں گے بلکہ ہم ان پر حملہ کریں گے اور ان کے ملک پر چڑھائی کریں گے (منظری)

یہ ارشاد فرمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام شہر مدینہ میں واپس آ گئے، اور ایک مہینہ کے بعد مسلمانوں نے اپنے ہتھیار کھولے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ صحیح مسلم میں ہے اور یہ مستقلاً ایک

درس عبرت ہے، جو بہت سی ہدایات اور محجزات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہے۔ غور کرنے والے خود معلوم کر لیں گے تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں۔

ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام مدینہ میں واپس پہنچے ہی تھے کہ اچانک جبریل امین علیہ السلام حضرت وحیہ کلبی غزوہ بنو قریظہ

صحابی کی صورت میں تشریف لائے اور فرمایا کہ اگرچہ آپ لوگوں نے اپنے ہتھیار کھول دیے ہیں مگر فرشتوں نے اپنے ہتھیار نہیں کھولے، اللہ تعالیٰ کا آپ کو یہ حکم ہے کہ آپ بنو قریظہ

پر حملہ کریں اور میں آپ سے آگے نہیں جا رہا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اعلان کرنے کے لئے ایک منادی بھیجا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم لوگوں کو سنایا اور پہونچایا لَا یُصَلِّیْنَ أَحَدٌ إِلَّا عَصْرًا إِلَّا فِی بَنِی قُرَیظَةَ، یعنی کوئی آدمی عصر کی نماز نہ پڑھے جب تک کہ بنو قریظہ میں نہ پہونچ جاتے۔

صحابہ کرام سب کے سب اس دوسرے جہاد کے لئے فوراً تیار ہو کر بنو قریظہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں عصر کا وقت آیا تو بعض حضرات نے حکم نبوی کے ظاہر کے موافق راستہ میں نماز عصر ادا نہیں کی، بلکہ منزل مقصد بنو قریظہ میں پہونچ کر ادا کی۔ اور بعض نے یہ سمجھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد عصر کے وقت میں بنو قریظہ پہونچ جانا ہے، ہم اگر نماز راستہ میں پڑھ کر عصر کے وقت میں وہاں پہونچ جائیں تو یہ حضور کے ارشاد کے منافی نہیں۔ انھوں نے نماز عصر اپنے وقت پر راستہ میں ادا کر لی۔

مجتہدین کے اختلاف میں کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام کے اس اختلافِ عمل جانب گناہ یا منکر نہیں ہوتی کی خبر دی گئی، تو آپ نے دونوں فریق میں سے کسی کو ملامت نہیں جس پر ملامت کی جائے فرمائی، بلکہ دونوں کی تصویب فرمائی۔ اس سے علماء امت نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ علماء مجتہدین جو حقیقت مجتہد ہوں اور اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہوں ان کے اقوال مختلفہ میں سے کسی کو گناہ اور منکر نہیں کہا جاسکتا، دونوں فریقوں کے لئے اپنے اپنے اجتہاد پر عمل کرنے میں ثواب لکھا جاتا ہے۔

بنو قریظہ سے جہاد کے لئے نکلنے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے آنے کی خبر سن کر بنو قریظہ قلعہ بند ہو گئے۔ اسلامی لشکر نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

بنو قریظہ کے رئیس بنو قریظہ کا سردار کعب بن جریج نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد کعب کی تقریر توڑ کر احزاب کے ساتھ معاہدہ کیا تھا، اس نے اپنی قوم کو جمع کر کے حالات کی نزاکت بیان کرتے ہوئے تین صورتیں عمل کی پیش کیں:

اول یہ کہ تم سب کے سب اسلام قبول کرو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہو جاؤ، کیونکہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم سب لوگ جانتے ہو کہ وہ حق پر ہیں، اور تمھاری کتاب تورات میں ان کی پیشینگوئی موجود ہے، جو تم پڑھتے ہو۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو دنیا میں اپنی جان و مال اور اولاد کو محفوظ کر لو گے، اور آخرت بھی درست ہو جائے گی۔

دوسری صورت یہ ہو کہ تم اپنی اولاد اور عورتوں کو پہلے خود اپنے ہاتھ سے قتل کر دو اور پھر پوری طاقت سے مقابلہ کرو یہاں تک کہ تم بھی سب مقتول ہو جاؤ۔

تیسری صورت یہ ہو کہ یوم السبت (ہفتہ کے دن) تم مسلمانوں پر یکبارگی حملہ کر دو، کیونکہ مسلمان جانتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں یوم السبت میں قتال حرام ہے، اس لئے وہ ہماری طرف سے اس دن میں بے فکر ہوں گے، ہم ناگہانی طور پر حملہ کریں تو ممکن ہو کامیاب ہو جائیں۔ کعب بن ربیع کی یہ اعتراض کر قوم کے لوگوں نے جواب دیا کہ پہلی بات یعنی مسلمان ہو جانا یہ تو ہم ہرگز قبول نہ کریں گے، کیونکہ ہم تو رات کو چھوڑ کر اور کسی کتاب کو نہ مانیں گے۔ یہی دوسری بات تو عورتوں بچوں نے کیا تصور کیا ہے کہ ہم ان کو قتل کر دیں۔ باقی تیسری بات خود حکمِ تورات اور ہمارے مذہب کے خلاف ہے، یہ بھی ہم نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد سب نے اس پر اتفاق کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیں اور آپ ان کے بارے میں جو فیصلہ فرمادیں اس پر راضی ہو جائیں۔ انصاری صحابہ کرام میں جو لوگ قبیلہ اوس سے متعلق تھے ان کے اور بنو قریظہ کے درمیان قدیم زمانے میں معاہدہ رہا تھا تو اُسی صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ میں ان کا معاملہ تمھارے ہی ایک سردار کے سپرد کر دوں۔ یہ لوگ اس پر راضی ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تمھارے سردار سعد بن معاذ ہیں، اس کا فیصلہ میں ان کے سپرد کرتا ہوں اس پر سب لوگ راضی ہو گئے۔

حضرت سعد بن معاذؓ کو واقعہ خندق میں تیر کا زخم شدید پہنچا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تیمارداری کے لئے مسجد کے احاطہ میں ایک خیمہ لگوا کر اس میں ٹھہرا دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مطابق بنو قریظہ کے قیدیوں کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیا گیا۔ انھوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ان میں سے جو جنگ کرنے والے جوان ہیں وہ قتل کر دی جائیں اور عورتوں، بچوں، بوڑھوں کے ساتھ جنگی قیدیوں کا معاملہ کیا جائے جو اسلام میں معروف ہے۔ یہی فیصلہ نافذ کر دیا گیا، اور اس فیصلے کے فوراً بعد ہی حضرت سعد بن معاذؓ کے زخم سے خون بہہ پڑا، اسی میں ان کی وفات ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دونوں دعائیں قبول فرمائیں ایک یہ کہ آئندہ قریش کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی حملہ نہ ہوگا، دوسرے بنو قریظہ کی غلامی کی سزا ان کو مل جائے وہ اللہ نے انہی کے ذریعہ دلوادی۔

جن کو قتل کرنا تجویز ہوا تھا ان میں سے بعض مسلمان ہو جانے کی وجہ سے آزاد کر دیے

عطیہ قرطی جو صحابہ کرام میں معروف ہیں انہی لوگوں میں سے ہیں۔ انہی لوگوں میں زبیر بن باطا بھی تھے۔ ان کو حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کر کے آزاد کرادیا جس کا سبب یہ تھا کہ زبیر بن باطانے ان پر زمانہ جاہلیت میں ایک احسان کیا تھا۔ وہ یہ کہ جاہلیت کے زمانے کی جنگ بعاث میں ثابت بن قیس قید ہو کر زبیر بن باطا کے قبضہ میں آگئے تھے، زبیر بن باطانے ان کے سر کے بال کاٹ کر ان کو آزاد کر دیا قتل نہیں کیا تھا احسان کے بدلے اور غیرت | حضرت ثابت بن قیس زبیر بن باطا کی رہائی کا حکم حاصل کر کے ان کے قومی کے دو عجیب نمونے پاس گئے اور کہا کہ میں نے یہ اس لئے کیا ہے کہ تمھارے اس احسان کا بدلہ کر دوں، جو تم نے جنگ بعاث میں مجھ پر کیا تھا۔ زبیر بن باطانے کہا کہ بے شک شریف آدمی دوسرے شریف کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا کرتا ہے۔ مگر یہ تو بتلاؤ کہ وہ آدمی زندہ رکھ کر کیا کرے گا۔ جس کے اہل و عیال نہ رہے ہوں۔ یہ سن کر ثابت بن قیس حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ان کے اہل و عیال کی بھی جان بخشی کر دی جائے، آپ نے قبول فرما لیا۔ زبیر بن باطا کو اس کی اطلاع دی، تو یہ ایک قدم اور آگے بڑھے کہ ثابت یہ تو بتلاؤ کہ کوئی انسان صاحب عیال کیسے زندہ رہے گا جب اس کے پاس کوئی مال نہ ہو۔ ثابت بن قیس پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان کا مال بھی ان کو دلوادیا۔ یہاں تک تو ایک مومن کی شرافت اور احسان شناسی کا قصیدہ تھا جو حضرت ثابت بن قیس کی طرف سے ہوا۔

اب دوسرا رخ سنئے کہ زبیر بن باطا کو جب اپنے اور اپنے اہل و عیال کی آزادی اور اپنے مال و متاع سب واپس مل جانے کا اطمینان ہو چکا تو اس نے حضرت ثابت بن قیسؓ سے قبائل یہود کے سرداروں کے متعلق سوال کیا، اور پوچھا کہ ابن ابی الحقیق کا کیا ہوا جس کا چہرہ چینی آئینہ جیسا تھا۔ انھوں نے بتلایا کہ وہ قتل کر دیا گیا۔ پھر پوچھا کہ بنی قریظہ کے سردار کعب بن قریظہ اور عمرو بن قریظہ کا کیا انجام ہوا؟ انھوں نے بتلایا کہ یہ دونوں بھی قتل کر دیئے گئے، پھر دو جماعتوں کے متعلق سوال کیا اس کے جواب میں ان کو خبر دی گئی کہ وہ سب قتل کر دیئے گئے۔

یہ سن کر زبیر بن باطانے حضرت ثابت بن قیس سے کہا کہ آپ نے اپنے احسان کا بدلہ پورا کر دیا، اور اپنی ذمہ داری کا حق ادا کر دیا، مگر میں اب اپنی زمین جائداد کو ان لوگوں کے بعد آباد نہیں کروں گا، مجھے بھی انہی لوگوں کے ساتھ شامل کر دو، یعنی قتل کر ڈالو۔ ثابت بن قیسؓ نے اس کو قتل کرنے سے انکار کر دیا، پھر اس کے اصرار پر کسی دوسرے مسلمان نے اس کو

قتل کیا۔ (قرطبی)

یہ ایک کافر کی غیرت قومی تھی جس نے سب کچھ ملنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے بغیر زندہ رہنا پسند نہ کیا، ایک مؤمن ایک کافر کے یہ دونوں عمل ایک تاریخی یا دگوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بنو قریظہ کی یہ فتح ہجرت کے پانچویں سال میں ماہ ذی قعدہ کے آخر اور ذی الحجہ کے شروع میں ہوئی ہے۔ (قرطبی)

غزوۃ احزاب و بنو قریظہ کو اس جگہ کسی قدر تفصیل سے لانے کی ایک وجہ تو تنبیہ خود قرآن کریم کا ان کو تفصیل سے دو رکوع میں بیان فرمانا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان واقعات میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق بہت سی ہدایات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات و بیانات اور بہت سی عبرتیں ہیں، جن کو اس قصے میں عنوانات دے کر واضح کر دیا گیا ہے۔ اس پورے واقعہ کے معلوم کر لینے کے بعد آیات مذکورہ کی تفسیر کے لئے خلاصہ تفسیر مذکور کا دیکھ لینا کافی ہے، کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں رہتی، صرف چند باتیں قابل نظر ہیں۔

اول یہ کہ اس غزوہ میں مسلمانوں پر شدت اور مختلف قسم کی تکلیفوں میں مبتلا ہونے کا ذکر فرما کر اس اضطراب کے عالم میں ایک حال تو مؤمنین کا بتلایا گیا ہے کہ تَخْلُتُونَ بِاللَّهِ الظُّنُونًا، یعنی تم لوگ اللہ کے ساتھ مختلف قسم کے گمان کرنے لگے تھے۔ ان گمانوں سے مراد غیر اختیاری و سادس ہیں جو اضطراب کے وقت انسان کے دل میں آیا کرتے ہیں کہ موت اب آ ہی گئی، اب نجات کی صورت نہیں رہی وغیرہ وغیرہ۔ ایسے غیر اختیاری خطرات و سادس نہ کمال ایمان کے منافی ہیں نہ کمال ولایت کے۔ البتہ ان سے مصیبت و اضطراب کی شدت کا ضرور پتہ لگتا ہے کہ صحابہ کرام جیسے جبال استقامت کے دلوں میں بھی دسوسے آنے لگے۔

دوسرا حال منافقین کا ذکر فرمایا ہے کہ انھوں نے کھلے طور پر اللہ و رسول کے وعدوں کو دھوکہ فریب کہنا شروع کر دیا، وَ اِذْ يَقُولُ الْمُفِصُّونَ الَّذِيْنَ فِي قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ اِلَّا غُرُورًا، یہ اُن کے باطنی کفر کا اظہار تھا آگے عملی طور پر وہ منافقین جو ظاہر میں مسلمانوں کے ساتھ شریک جہاد تھے ان کے دو طبقوں کا ذکر ہے۔ ایک طبقہ تو بے پوچھے بھاگنے لگا، جس نے کہا يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَاسْرِعُوْا، اور دوسرے طبقے نے حیلے مہانے تراش کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے واپس چلے جانے کی درخواست کی جن کا حال یہ ذکر کیا گیا ہے کہ رِيَسًا ذِي

قَرِيبٌ مِّنْهُمْ النَّبِيُّ يَقُولُونَ اِنْ بُيُوتُنَا عَوْرَتُهُ الْاَيَةُ، قرآن کریم نے ان کے چلے بہانے کو کھول دیا کہ یہ سب جھوٹ ہی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ میدان سے بھاگنا چاہتے ہیں، اِنْ يُّرِيدَنَّ اِلَّا فِرَارًا آگے کسی آیتوں میں ان کی شرارت اور مسلمانوں کے ساتھ عداوت پھر ان کے انجام بد کا ذکر فرمایا۔

اس کے بعد مؤمنین مخلصین کا ذکر فرما کر ان کے ثبات و استقلال کی مدح کی گئی ہے۔ اسی کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع و اقتدار کی تاکید ایک ضابطہ کی صورت میں بیان فرمائی گئی ہے، لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ، اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سب کی اقتدار کا حکم ثابت ہوا، مگر محققین ائمہ تفسیر کے نزدیک اس کی عملی صورت یہ ہو کہ جس کام کا کرنا یا چھوڑنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدرجہ وجوب ثابت ہو اس کا اتباع واجب و لازم ہے۔ اور جس کام کا کرنا یا چھوڑنا بدرجہ استحباب ثابت ہو اس کا کرنا یا چھوڑنا ہم پر بھی درجہ استحباب میں رہے گا کہ اس کی خلاف ورزی گناہ نہ قرار دی جائے گی (قلت الیہ يرجع کلام البصاص فی احکام القرآن) آیات مذکورہ میں سے آخری تین آیتوں میں واقعہ بنو قریظہ کا ذکر ہے وَانْزَلِ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مِّنْ صَيَاصِيهِمْ، یعنی جن اہل کتاب نے اہل احزاب کی مدد کی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا رعب ڈال کر ان کے مضبوط قلعوں سے ان کو نیچے اتار دیا، اور ان کے اموال اور دار و دیار کا مسلمانوں کو وارث بنایا۔

آخری آیت میں آئندہ ہونے والی فتوحات کی خوش خبری دی گئی ہے کہ اب کفار کے حملے ختم ہوئے، اب مسلمانوں کی فتوحات کا دور شروع ہو گا، اور ایسی ایسی زمینیں ان کے قبضہ میں آئیں گی جہاں ان کے قدم بھی اب تک نہیں پہنچے۔ جس کا ظہور صحابہ کرام کے دور میں سب کی آنکھوں نے دیکھ لیا کہ کسریٰ و قیصر کی سب سے بڑی سلطنتیں ان کے زیر نگیں آگئیں۔ وَاللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَنرَ وَاِجْلِكَ اِنْ كُنْتُمْ تُرِيدُونَ الْحَيٰوةَ

اے نبی کہہ دے اپنی عورتوں کو اگر تم چاہتی ہو دنیا کی

الدُّنْيَا وَزِيَارَتِهَا فَتَعَالَيْنَا اُمِّتُكُنَّ وَاَسْرَحُكُنَّ سَرَّاحًا

زندگانی اور یہاں کی رونق تو آؤ کچھ فائدہ پہنچا دوں تم کو اور رخصت کر دوں بھلی طرح

جَمِيلًا ۲۸) وَإِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالْأَخِرَةَ

سے رخصت کرنا۔ اور اگر تم چاہتی ہو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور پچھلے گھر کو

فَإِنَّ اللَّهَ أََعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُمْ أَجْرًا عَظِيمًا ۲۹) يَنْسَاءُ النَّبِيُّ

تو اللہ نے رکھ چھوڑا ہے ان کے لئے جو تم میں نیکی پر ہیں بڑا ثواب۔ اور نبی کی عورتوں !

مَنْ يَأْتِ مِنْكُمْ بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ يُضَعَّفَ لَهَا الْعَذَابُ

جو کوئی کر لائے تم میں کامیابے حیاتی کا صریح دُونا ہو اس کو عذاب

ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۳۰) وَمَنْ يَقْنُتْ

دوہرا اور ہے یہ اللہ پر آسان۔ اور جو کوئی تم میں اطاعت

مِنْكُمْ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعَصَلَ صَالِحًا تُوْتَاهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ

کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور عمل کرے اچھے، دیوین ہم اس کو اس کا ثواب دوبار

وَأَعْتَدْنَا لَهُمُ زُفًا كَرِيمًا ۳۱) يَنْسَاءُ النَّبِيُّ كَأَحَدٍ

اور رکھی ہو ہم نے اس کے واسطے روزی عزت کی۔ اور نبی کی عورتوں تم نہیں ہو جیسے ہر کوئی

مِّنَ النِّسَاءِ إِنْ أَتَيْتُمْ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي

عورتیں اگر تم ڈر رکھو سو تم دب کربات نہ کرو پھر لالچ کرے کوئی جس کے

فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۳۲) وَقُرْنِ فِي بَيْوتِكُنَّ

دل میں روگ ہے اور کہو بات معقول۔ اور سترار پکڑو اپنے گھر میں

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَ

اور دکھلائی نہ پھر جیسا کہ دکھلانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت میں اور قائم رکھو نماز اور

آتَيْنَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ

دیتی رہو زکوٰۃ اور اطاعت میں رہو اللہ کی اور اس کے رسول کی، اللہ یہی چاہتا ہے کہ

لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ

دُور کرے تم سے گندی باتیں اے نبی کے گھر والو اور ستھرا کرے تم کو ایک

تَطْهِيراً ۳۳) وَادْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَ

تسہرائی سے۔ اور یاد کرو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں اللہ کی باتیں اور

الْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ۳۴)

عقلندی کی، مقرر اللہ ہی بھید جانتے والا خبردار

خلاصہ تفسیر

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنی بیبیوں سے فرمادیجئے (تم سے دو ٹوک بات کہی جاتی ہے تاکہ ہمیشہ کے لئے قصہ ایک طرف ہو وہ بات یہ ہے کہ) تم اگر دنیوی زندگی (کی عیش) اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ (یعنی لینے کے لئے متوجہ ہو) میں تم کو کچھ مال و متاع (دنیوی) دیدوں یا تو مراد اس سے وہ جوڑہ ہے جو مطلقہ مدخولہ کو بوقت طلاق دینا مستحب ہے یا مراد نان نفقہ عدت کا ہے، یاد دونوں کو شامل ہے، اور (متاع دے کر) تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کروں (یعنی موافق سنت کے طلاق دیدوں تاکہ جہاں چاہو جا کر دنیا حاصل کرو) اور اگر تم اللہ کو چاہتی ہو اور (مطلب اللہ کو چاہنے کا اس جگہ یہ ہے کہ) اس کے رسول کو (چاہتی ہو، یعنی فقر و افلاس کی موجودہ حالت کے ساتھ رسول کے نکاح میں رہنا چاہتی ہو) اور عالم آخرت کے درجات عالیہ کو (چاہتی ہو جو کہ زوجیت رسول پر مرتب ہونے والے ہیں) تو یہ تمہاری نیک کرداری ہے اور تم میں نیک کرداروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے (آخرت میں) اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے (یعنی وہ ثواب جو مخصوص ہر زوجاتِ نبی کے لئے کہ اور نیک بیبیوں کے اجر سے وہ عظیم ہے۔ اور جس سے زوجیت نبی کو اختیار نہ کرنے کی صورت میں محرومی ہوگی، گو عموم دلائل سے مطلق ایمان و اعمال صالحہ کے ثمرات اس صورت میں بھی حاصل ہوں گے۔ یہاں تک تو مضمون تنخیر کا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ازدواج کو اختیار دیا گیا کہ موجودہ حالت پر قناعت کر کے آپ کی زوجیت میں رہنا پسند کریں، یا پھر آپ سے طلاق حاصل کر لیں آگے حق تعالیٰ ان کو خود خطاب کر کے وہ احکام فرماتے ہیں جو بصورت اختیار زوجیت واجب الایہتمام ہوں گے۔ ارشاد ہے کہ) اے نبی کی بیبیو! جو تم میں کھلی ہوئی بیہودگی کرے گی (مراد اس سے وہ معاملہ ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنگ و پریشان ہوں تو) اس کو (اس پر آخرت میں) ادھر ہی سزا دی جائے گی (یعنی دوسرے

شخص کو اس عمل پر جتنی سزا ملتی اس سے دوہری سزا ہوگی، اور یہ بات اللہ کو بالکل آسان ہے یہ نہیں کہ دنیوی حکام کی طرح احیانا سزا بڑھانے سے کسی کی عظمت اس کو مانع ہو جائے، اور اس سزا کے بڑھنے کی وجہ ابھی تضعیفِ اجر کی تقریر میں آتی ہے، اور جو کوئی تم میں اللہ کی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی یعنی جن امور کو اللہ تعالیٰ نے واجب فرمایا ہے ان کو ادا کرے گی اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زوج ہونے کے جو حقوق اطاعت وغیرہ واجب ہیں وہ ادا کرے گی کیونکہ حیثیت رسالت کے حقوق اللہ کی اطاعت میں داخل ہو گئے، اور (امور غیر واجبہ میں سے جو) نیک کام (ہیں ان کو) کرے گی تو ہم اس کو اس کا ثواب (بھی) دوہرا دیں گے اور ہم نے اُس کے لئے (علاوہ دوہرے اجر موعود کے) ایک (خاص) عمدہ روزی (جو جنت میں ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے اور جو صلہ عمل سے زائد ہے) تیار کر رکھی ہے (اطاعت کی صورت میں دوہرے اجر اور ترکِ اطاعت پر دوہرے عذاب کی وجہ شرفِ زوجیت نبی ہے جس پر ینساء النبی دال ہے۔ کیونکہ اہل خصوصیت کی کوتاہی بھی اوروں کی کوتاہی سے اشد ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی اطاعت بھی اوروں کی اطاعت سے زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ پس وعدہ وعید دونوں میں وہ دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اور خصوصاً مقامِ کلام میں یہ کہنا ممکن ہو کہ حضراتِ اہمات المؤمنین سے خدمت اور اطاعت کا صدور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو راحت افزا زیادہ ہوگا پس آپ کی راحت رسائی موجب زیادتی اجر ہوگئی، علیٰ ہذا اس کی ضد میں سمجھنا چاہئے یہاں تک ازواج سے آپ کے حقوق کے متعلق خطاب تھا آگے عام احکام کے متعلق زیادہ اہتمام کے لئے خطاب ہے کہ) اسے نبی کی بیبیو شخص اس بات پر مت پھول جانا کہ ہم نبی کی بیبیاں ہیں اور اس لئے عام عورتوں سے ممتاز ہیں یہ نسبت اور شرف ہمارے لئے پس ہے، سو یہ وسوسہ مت کرنا یہ بات صحیح ہے کہ) تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو رہیں ان سے ممتاز ہو مگر مطلقاً نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ایک شرط بھی ہے وہ یہ کہ) اگر تم تقویٰ اختیار کرو (تب تو واقعی اس نسبت کے سبب تم کو اوروں سے فضیلت حاصل ہے، حتیٰ کہ ثواب مضاعف ملے گا اور اگر یہ شرط متحقق نہیں تو یہی نسبت بالعکس دوہرے عذاب کا سبب بن جائے گی، جب یہ بات ہے کہ نسبت بلا تقویٰ صحیح ہے) تو (تم کو احکام شرعیہ کی پوری پابندی کرنا چاہئے عموماً اور ان احکام مذکورہ آیت آئندہ کی خصوصاً، اور وہ احکام ہیں کہ) تم (ناحرم مرد سے) بولنے میں (جب کہ بضرورت بولنا پڑے) نزاکت مت کرو

اس کا مطلب یہ نہیں کہ قصداً نزاکت مت کر دیکو کہ اس کا بُرا ہونا تو بدیہی ہے دوسری مخاطب یعنی ازواجِ مطہرات میں اس کا احتمال نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے عورتوں کے کلام کا فطری انداز ہوتا ہے کہ کلام میں نرمی اور نزاکت طبعی ہوتی ہے، اس انداز کو مت برو، کہ (اس سے) ایسے شخص کو (طبعاً خیال) فاسد پیدا ہونے لگتا ہے، جس کے قلب میں خرابی (اور بدی) ہے (بلکہ ایسے موقع پر تکلف اور اہتمام سے اُس فطری انداز کو بدل کر گفتگو کرو) اور قاعدہ (عفت) کے موافق بات کہو (یعنی ایسے انداز سے جس میں خشکی اور روکھاپن ہو کہ یہ حافظ عفت ہے اور یہ بداخلاقی نہیں ہے۔ بداخلاقی وہ ہے جس سے کسی کے قلب کو ایذا پہنچے اور طبع فاسد کے روکنے سے ایذا لازم نہیں آتی۔ اس میں تو بولنے کے متعلق حکم فرمایا) اور (آگے پردہ کے متعلق ارشاد ہے اور امر مشترک دونوں میں فقط عفت ہی یعنی) تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو (مراد اس سے یہ ہے کہ محض کپڑا اور ٹھہ لپیٹ کر پردہ کر لینے پر کفایت مت کرو بلکہ پردہ اس طریقہ سے کرو کہ بدن صحیح لباس نظر نہ آئے، جیسا کہ آجکل شرفاء میں پردہ کا طریقہ متعارف ہے کہ عورتیں گھروں ہی سے نہیں نکلتیں، البتہ مواقع ضرورت دوسری دلیل سے مستثنیٰ ہیں) اور (آگے اسی حکم کی تاکید کے لئے ارشاد ہے کہ) قدیم زمانہ جہالت کے دستور کے موافق مت پھرو (جس میں بے پردگی رائج تھی گو بلا فحش ہی کیوں نہ ہو۔ اور قدیم جاہلیت کے مراد وہ جاہلیت ہے جو اسلام سے پہلے تھی، اور اس کے مقابلہ میں ایک مابعد کی جاہلیت ہے کہ بعد تعلیم و تبلیغ احکام اسلام کے ان پر عمل نہ کیا جائے۔ پس جو تبرج بعد اسلام ہوگا وہ جاہلیت آخری ہے، اس لئے تشبیہ میں تخصیص جاہلیتِ اولیٰ کی ظاہر ہے، کیونکہ مشبہ مشبہ کا تغائر ضروری ہے۔ مطلب یہ کہ جاہلیتِ آخری جاری کر کے جاہلیتِ اولیٰ کا اقتدار نہ کرو جس کے مٹانے کو اسلام آیا ہے۔ یہاں تک احکام متعلقہ عفت کے تھے) اور (آگے دوسرے شرائع کا ارشاد ہے کہ) تم نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ (اگر نصاب کی مالک ہو) دیا کرو کہ دونوں اعظم شعائر سے ہیں، اس لئے ان کی تخصیص کی گئی، اور (بھی جتنے احکام ہیں اور تم کو معلوم ہیں سب میں) اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا مانو (اور ہم نے جو تم کو ان احکام کے اس التزام اور اہتمام کا مکلف فرمایا ہے تو تمہارا ہی نفع ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ کو ان احکام کے بتانے سے تشبیحاً، یہ منظور ہو کہ اے پیغمبر کے (گھر والو تم سے) معصیت دنا فرمانی کی، آلودگی کو دور رکھے، اور تم کو (ظاہراً و باطناً عقیدۃً و عملاً و خلقاً بالکل) پاک صاف رکھے (کیونکہ علم بالا احکام کے سبب محلی لفت سے جو کہ موجب آلودگی اور مانع تطہیر ہے بچنا ممکن ہے) اور (چونکہ ان احکام پر عمل واجب

ہی، اور عمل موقوف ہوا احکام کے جاننے اور ان کے یاد رکھنے پر اس لئے، تم ان آیات الہیہ یعنی قرآن کو اور اس علم (احکام) کو یاد رکھو جس کا تمہارے گھروں میں چرچا رہتا ہے (اور یہ بھی پیش نظر رکھو کہ بیشک اللہ تعالیٰ رازداں ہے کہ اعمالِ قلوب کو بھی جانتا ہے اور پورا خبردار ہے کہ پوشیدہ اعمال کو بھی جانتا ہے، اس لئے ظاہر و باطناً سرّاً و علانیۃ امتثالِ اوامر اور اجتنابِ نواہی کا اہتمام واجب ہے) :

معارف و مسائل

اس سورۃ کے مقاصد میں سے اہم مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا سے اور ہر ایسی چیز سے بچنے کی تاکید ہے جس سے آپ کو تکلیف پہنچے، نیز آپ کی اطاعت اور رضا جوئی کے مؤکداً احکام ہیں۔ غزوۃ احزاب کا تفصیلی واقعہ جو اوپر گزرا ہے اس میں کفار و منافقین کی طرف سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا میں پہنچیں ان کا ذکر اور اس کے ساتھ انجام کار موزی کفار و منافقین کا ذیل و خوار ہونا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر موقع پر فحش اور کامیاب ہونا ذکر کیا گیا تھا، اور اس کے ساتھ ہی مؤمنین مخلصین جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم و اشارہ پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا، ان کی مدح و ثناء اور درجاتِ آخرت کا بیان تھا۔

مذکورہ صدر آیات میں خاص ازواجِ مطہرات کو تعلیم ہے کہ وہ خصوصاً اس کا اہتمام کریں کہ آپ کو ان کے کسی قول و فعل سے ایذا نہ پہنچے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مکمل اطاعت میں لگ جائیں۔ اس سلسلے کے چند احکام ازواجِ مطہرات کو خطاب کر کے بتلائے گئے ہیں۔

شروع آیات میں جوازِ زوجِ مطہرات کو طلاق لینے کا اختیار دینا مذکور ہے، اس کا ایک یا چند واقعات ہیں جوازِ زوجِ مطہرات کی طرف سے پیش آئے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کے خلاف تھے، جن سے بلا قصد و اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچی۔

ان واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت جابرؓ کی روایت سے مفصل آیا ہے، اس میں مذکور ہے کہ ازواجِ مطہرات نے جمع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مطالبہ کیا کہ ان کا نان نفقہ بڑھایا جائے۔ تفسیر بحر محیط میں ابو حیان نے اس کی تشریح یہ بیان کی ہے کہ غزوۃ احزاب کے بعد بنو نضیر پھر

بنو قریظہ کی فتوحات اور اموال غنیمت کی تقسیم نے عام مسلمانوں میں ایک گونہ خوش حالی پیدا کر دی تھی۔ ازواجِ مطہرات کو اس وقت یہ خیال ہوا کہ ان اموال غنیمت میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنا حصہ رکھا ہوگا، اس لئے انہوں نے جمع ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ کسری و قیصر کی بیبیاں طرح طرح کے زیورات اور قیمتی لباسوں میں ملبوس ہیں، اور ان کی خدمت کیلئے کنیزیں ہیں، اور ہمارا حال فقر و فاقہ کا آپ دیکھتے ہیں، اس لئے اب کچھ توسع سے کام لیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہرات کی طرف سے یہ مطالبہ سنا کہ ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو بادشاہوں اور دنیا داروں میں ہوتا ہے تو آپ کو اس سے بہت رنج ہوا کہ انہوں نے بیت نبوت کی قدر نہ پہچانی۔ ازواجِ مطہرات رضہ کو خیال نہ تھا کہ اس سے آپ کو ایذا پہنچے گی، عام مسلمانوں میں مالی وسعت دیکھ کر اپنی لئے بھی وسعت کا خیال دل میں آگیا تھا۔ ابو حیان نے فرمایا کہ اس واقعہ کو غزوہ احزاب کے واقعہ کے بعد بیان کرنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ازواج کا یہ مطالبہ ہی تخییر طلاق کا سبب بنا۔ بعض روایات حدیث میں حضرت زینبؓ کے گھر میں شہر پہننے کا واقعہ جو آگے سورۃ تحریم میں آگے مفصل آئے گا اس میں ازواج کی باہمی غیرت کے سبب جو صورت پیش آئی وہ اس تخییر طلاق کی سبب بنی۔ اگر یہ دونوں چیزیں تدریجی زمانے میں پیش آئی ہوں تو یہ بھی بعید نہیں کہ دونوں ہی سبب ہوں، لیکن آیت تخییر کے الفاظ سے زیادہ تائید اسی کی ہوتی ہے کہ ازواجِ مطہرات کی طرف سے کوئی مالی مطالبہ اس کا سبب بنا ہے۔ کیونکہ اس آیت میں فرمایا ہے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزَيِّنْتُمَهَا الْاٰیۃ

اس آیت نے سب ازواجِ مطہرات کو اختیار دیدیا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودہ حالت یعنی معاشِ عسرت و تنگی کے ساتھ آپ کی زوجیت میں رہنا قبول کریں یا پھر آپ سے طلاق کے ساتھ آزاد ہو جائیں۔ پہلی صورت میں ان کو عام عورتوں کی نسبت سے بہت زیادہ اجر عظیم اور آخرت کے خاص درجات عالیہ عطا ہوں گے، اور دوسری صورت یعنی طلاق لینے میں بھی ان کو دنیا کے لوگوں کی طرح کسی تلخی و تکلیف کی توبت نہیں آئے گی، بلکہ سنت کے مطابق کپڑے کا جوڑا وغیرہ دے کر عزت کے ساتھ رخصت کیا جائے گا۔

ترمذی نے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت تخییر

نازل ہوئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اظہار و اعلان کی ابتدا مجھ سے فرمائی اور آیت سننے سے پہلے فرمایا کہ میں تم سے ایک بات کہنے والا ہوں، مگر تم اس کے جواب میں جلدی نہ کرنا، بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے جواب دینا۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ یہ مجھ پر خاص عنایت تھی کہ مجھے والدین سے مشورہ کے بغیر اظہار رائے سے آپ نے منع فرمایا کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ میرے والدین مجھے کبھی یہ رائے نہ دیں گے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مفارقت اختیار کر لوں۔ میں نے جب یہ آیت سنی تو فوراً عرض کیا کہ کیا میں اس معاملے میں والدین سے مشورہ لینے جاؤں؟ میں تو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دار آخرت کو اختیار کرتی ہوں۔ پھر میرے بعد سب ازواج مطہرات کو قرآن کا یہ حکم سنایا گیا سب نے وہی کہا جو میں نے اول کہا تھا کسی نے بھی دنیا کی فراخی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کے مقابلے میں قبول نہ کیا (قال الترمذی بذی حدیث حسن صحیح)

فائدہ

اختیار طلاق کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ طلاق کا اختیار عورت کے سپرد کر دیا جائے، اگر وہ چاہے تو خود اپنے نفس کو طلاق دے کر آزاد ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ طلاق شوہر ہی کے ہاتھ میں رہے کہ اگر عورت چاہے تو وہ طلاق دیدے۔

آیت مذکورہ میں بعض مفسرین نے پہلی صورت کو اور بعض نے دوسری کو اختیار کیا ہے۔ سیدی حکیم الامتہؒ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ آیت کے الفاظ میں دونوں احتمال ہیں، جب تک کسی صریح نص سے ایک کی تعیین نہ ہو جائے اپنی طرف سے کسی صورت کو متعین کرنے کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب زوجین کی طبیعتوں میں مناسبت نہ ہو تو مستحب یہ ہے کہ بیوی کو اختیار دیا جائے کہ شوہر کی موجودہ حالت پر قناعت کر کے ساتھ رہنا چاہے تو رہے ورنہ سنت کے مطابق طلاق دے کر کپڑے کے جوڑے دے کر عزت کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔

آیت مذکورہ سے اس معاملہ کا استحباب ہی ثابت کیا جاسکتا ہے وجوب پر کوئی دلیل نہیں۔ بعض ائمہ فقہاء نے اس آیت سے وجوب پر استدلال کیا ہے، اور اسی بناء پر ایسے مفلس آدمی کی بیوی کو عدالت کی طرف سے طلاق دینے کا حق دیا کہ جو بیوی کو نفقہ دینے پر قادر نہیں۔ اس مسئلہ کی پوری تفصیل احکام القرآن حزب خامس میں اسی آیت کے تحت میں بزبان عربی مذکور ہے۔

ازواج مطہرات کی ایک خصوصیت اور اس کی وجہ ان پر کڑی پابندی لِيَسَاءَ الْمَنِيَّ مَنَیْ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَذِهِ السَّبِيلَ الَّتِي هِيَ مِنْكُمْ يَتَّبِعُهَا الضَّعِيفُ الْغَلِيظُ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَفْعَلْهُ اللَّهُ يَفْعَلْهُ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَفْعَلْهُ اللَّهُ يَفْعَلْهُ

ان دو آیتوں میں ازواجِ مطہرات کی یہ خصوصیت بیان فرمائی ہے کہ اگر وہ کوئی گناہ کا کام کریں گی تو ان کو دوسری عورتوں کی نسبت سے دو گنا عذاب دیا جائے گا یعنی ان کا ایک گناہ دو کے قاتم مقام قرار دیا جائے گا، اسی طرح اگر وہ نیک عمل کریں گی تو دوسری عورتوں کی نسبت ان کو ثواب بھی دو ہر دیا جائے گا، ان کا ایک نیک عمل دو کے قاتم مقام ہوگا۔ یہ آیت ایک حیثیت سے ازواجِ مطہرات کے لئے ان کے اس عمل کی جزا ہے جو انہوں نے آیتِ تنزیل نازل ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت پر دنیا کی فراخی کو قربان کر دیا۔ اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ایک عمل کو دو کا درجہ دیدیا، اور گناہ کی صورت میں دو ہر عذاب بھی ان کی خصوصی فضیلت اور امتیازی شرافت کی وجہ سے ہوا۔ کیونکہ یہ بات عقلی بھی ہے اور نقلی بھی، کہ جتنا کسی کا اعزاز و احترام ہوتا ہے اتنا ہی اس کی طرف سے غفلت و سرکشی کی سزا بھی بڑھ جاتی ہے۔

ازواجِ مطہرات پر حق تعالیٰ کے انعامات بڑے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زوجیت کے لئے انتخاب فرمایا۔ ان کے گھروں میں وحی الہی نازل ہوتی رہی تو ان کی ادنیٰ غلطی کو تباہی بھی بڑی ہوگی۔ اگر دوسروں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچے تو اس سے کہیں زیادہ اشد ہوگا کہ ان سے کوئی بات ایذا و تکلیف کی سرزد ہو۔ قرآن کریم کے ان الفاظ میں خود اس سبب کی طرف اشارہ ہے وَاذْكُرْنَ مَا يُكَلِّفُ فِي بُيُوتِكُنَّ

ازواجِ مطہرات کی یہ خصوصیت کہ ان کے عمل کا دو ہر ثواب ملے عام اُمت کے اعتبار سے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُمت میں کسی فرد یا جماعت کو کسی خصوصیت

سے ایسا انعام نہ بخشا جائے کہ اس کو دو ہر ثواب ملے چنانچہ اہل کتاب میں سے جو لوگ مسلمان ہو گئے ان کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے اُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ۔

اور قیصر روم کے نام جو نامہ مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمایا اس میں اسی ارشاد قرآنی کی وجہ سے آپ نے قیصر روم کو یہ لکھا کہ يُؤْتِيكَ اللَّهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ۔ اہل کتاب جو اسلام لے آئیں ان کے متعلق تو خود قرآن میں اجرِ مرتین کی تصریح ہے۔

اور ایک حدیث اور بھی ہے جس میں تین آدمیوں کے لئے اسی طرح دو ہر اجر مذکور ہے اس کی تفصیل سورۃ قصص میں آیت یُوْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ کے تحت میں لکھی گئی ہے۔

عالم کے عمل صالح کا ثواب امام ابو بکر جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ جس سبب سے حق تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات کے عمل صالح کا ثواب دوگنا اور ان کی معصیت کا عذاب بھی دوگنا قرار دیا ہے، کہ وہ علوم نبوت اور وحی الہی کی خاص مورد ہیں، یہی سبب علماء دین میں بھی موجود ہے۔ اس لئے جو عالم اپنے علم پر عامل بھی ہو اس کو بھی اس عمل کا ثواب دوسروں سے زیادہ ملے گا، اور اگر وہ کوئی گناہ کرے گا تو عذاب بھی دوسروں سے زیادہ ہوگا۔

بِقَاحِشَةٍ مُّبَيَّنَةٍ، لفظ فاحشہ عربی زبان میں بدکاری اور زنا وغیرہ کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور مطلق معصیت اور گناہ کے لئے بھی یہ لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں فاحشہ کے لفظ سے بدکاری اور زنا مراد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سب پیغمبروں کی ازواج کو اس سخت عیب سے فرمایا ہے، تمام انبیاء علیہم السلام کی ازواج میں کسی سے بھی ایسا فعل صادر نہیں ہوا۔ حضرت لوط اور نوح علیہما السلام کی بیبیاں ان کے دین سے منحرف ہوئیں اور سرکشی اختیار کی جس کی سزا ان کو ملی، لیکن بدکاری کا الزام ان میں بھی کسی پر نہیں تھا۔ ازواجِ مطہرات میں سے کسی عیبی و بدکاری کے صدور کا تو احتمال ہی نہ تھا۔ اس لئے اس آیت میں فاحشہ سے مراد عام گناہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا و تکلیف ہے۔ اور اس جگہ فاحشہ کے ساتھ جو لفظ مَبَيَّنَةٌ آیا ہے یہ اس پر شاہد ہے۔ کیونکہ بے حیائی اور بدکاری کہیں بھی مبیئنہ نہیں ہوتی، وہ تو پردوں میں انقار سے کی جاتی ہے۔ فاحشہ مبیئنہ سے مراد عام گناہ ہیں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا، ائمہ تفسیر میں سے مقاتل بن سلیمان نے اس آیت میں فاحشہ کا مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی یا آپ سے کوئی ایسا مطالبہ قرار دیا ہے جس کا پورا کرنا آپ کے لئے شاق ہو۔ (رواہ البیہقی فی السنن)

اور قرآن کریم نے دوہرے عذاب کے سلسلہ میں تو صرف فاحشہ مبیئنہ پر یہ عذاب مرتب کیا ہے، مگر دوہرے اجر و ثواب کے لئے کئی شرطیں رکھی ہیں وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ مَشْكِنًا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعَمَلْ صَالِحًا، اس میں قنوت یعنی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی شرط ہے، پھر عمل صالح شرط ہے۔ سبب یہ ہے کہ اجر و ثواب تو اسی وقت ملتا ہے جب اطاعت مکمل ہو اور سزا کے لئے ایک گناہ بھی کافی ہے۔

ازواجِ مطہرات کو
يُنْسَاءُ الْمَنِيِّ لَسْتُمْ كَأَحْيٍ مِّنَ الْإِنْسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُمْ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ، سابقہ آیات میں ازواجِ مطہرات کو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے مطالبات کرنے سے روکا گیا ہے جن کا پورا کرنا آپ کے لئے دشوار ہو یا جو آپ کی شان کے مناسب نہ ہوں۔ اور جب انھوں نے اس کو اختیار کر لیا تو ان کا درجہ عام عورتوں سے بڑھا دیا گیا کہ ان کے ایک عمل کو دو کے قائم مقام بنا دیا۔ آگے ان کو اصلاح عمل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و زوجیت کے مناسب بنانے کے لئے چند ہدایات دی گئی ہیں یہ سب ہدایات اگرچہ ازواج مطہرات کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام ہی مسلمان عورتیں ان کی مامور ہیں، مگر یہاں ازواج مطہرات کو خصوصی خطا کر کے اس پر متوجہ کیا ہے کہ یہ اعمال و احکام جو سب مسلمان عورتوں کے لئے لازم و واجب ہیں آپ کو ان کا اہتمام دوسروں سے زیادہ کرنا چاہئے اور لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ سے یہی خصوصیت مراد ہے۔

کیا ازواج مطہرات سائے عالم کی عورتوں سے افضل ہیں؟ تمام دنیا کی عورتوں سے افضل ہیں۔ مگر قرآن کریم کی آیت حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں یہ ہے إِنَّ اللَّهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ، اس سے حضرت مریم کا سائے جہاں کی عورتوں سے افضل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور ترمذی میں حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کافی ہیں تم کو ساری عورتوں میں سے مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد (ام المؤمنین) اور فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آسیہ زوجہ فرعون۔ اس حدیث میں حضرت مریم کی ساتھ اور تین عورتوں کو نساء عالمین سے افضل فرمایا ہے۔

اس لئے اس آیت میں جو ازواج مطہرات کی افضلیت اور فوقیت بیان کی گئی ہے وہ ایک خاص حیثیت یعنی ازواج النبیؐ اور نساء النبیؐ ہونے کی ہے، جس میں وہ تمام عالم کی عورتوں سے بلاشبہ افضل ہیں۔ اس عام فضیلت مطلقہ ثابت نہیں ہوتی جو دوسری نصوص کے خلاف ہو (منظہری)

لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ کے بعد اِنْ تَقِيْنَ يٰہ شرط اس فضیلت کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو نساء نبیؐ ہونے کی وجہ سے بخشی ہے۔ مقصود اس سے اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ فقط اس نسبت و تعلق پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں کہ ہم ازواج رسولؐ ہیں، بلکہ تقویٰ اور اطاعت احکام الہیہ پر فضیلت کی شرط ہے (قرطبی و مظہری)

اس کے بعد چند ہدایات ازواج مطہرات کو دی گئیں:
پہلی ہدایت عورتوں کے پردے سے متعلق آواز اور کلام پر پابندی ہے:-

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ، یعنی کسی غیر محرم سے پس پردہ بات کرنے کی ضرورت بھی پیش آئے تو کلام میں اس نزاکت اور لطافت کے لہجہ سے تکلف پر مہر کیا جائے جو قطرۂ عورتوں کی آواز میں ہوتی ہے۔ مطلب اس نرمی اور نزاکت سے وہ نرمی ہے جو مخاطب کے دل میں میلان پیدا کرے جیسا کہ اس کے بعد فرمایا ہر قِیَظَمَ الَّذِیْ فِیْ قُلُوبِهِ مَرَضٌ، یعنی ایسی نرم گفتگو نہ کرو جس سے ایسے آدمی کو طبع اور میلان پیدا ہونے لگے جس کے دل میں مرض ہو۔ مرض سے مراد نفاق ہے یا اس کا کوئی شعبہ ہے۔ اصلی منافق سے تو ایسی طبع سرزد ہونا ظاہر ہی ہے، لیکن جو آدمی تو من مخلص ہونے کے باوجود کسی حرام کی طرف مائل ہوتا ہے وہ منافق نہ ہی مگر ضعیف الایمان ضرور ہے۔ اور یہ ضعیف ایمان جو حرام کی طرف مائل کرتا ہے درحقیقت ایک شعبہ نفاق ہی کا ہے۔ ایمان خالص جس میں شائبہ نفاق کا نہ ہو اس کے ہوتے ہوئے کوئی حرام کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔ (منظری)

خلاصہ اس پہلی ہدایت کا عورتوں کے لئے اجنبی مردوں سے اجتناب اور پردہ کا وہ اصلی مقام حاصل کرنا ہے کہ جس سے کسی اجنبی ضعیف الایمان کے دل میں کوئی طبع یا میلان پیدا ہو سکے اس کے پاس بھی نہ جائیں۔ پردہ نسواں کی مفصل بحث اسی سورۃ میں آگے آنے والی آیات کے تحت میں بیان ہوگی۔ یہاں ازواج مطہرات کے لئے خصوصی ہدایات کے ضمن میں جو کچھ آیا ہے صرف اس کی تشریح لکھی جاتی ہے۔ کلام کے متعلق جو ہدایت دی گئی ہے اس کو سننے کے بعد بعض اہبات المؤمنین اس آیت کے نزول کے بعد اگر غیر مرد سے کلام کریں تو اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیتیں تاکہ آواز بدل جائے۔ اسی لئے حضرت عمر بن عاصؓ کی ایک حدیث میں ہے اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَعٰی اَنْ یُّکَلِّمَ النِّسَاءَ اِلَّا بِاِذْنِ اَزْوَاجِهِنَّ، (سداۃ الطہراتی بسند حسن مظری)

مسئلہ: اس آیت اور حدیث مذکور سے اتنا تو ثابت ہوا کہ عورت کی آواز ستر میں داخل نہیں، لیکن اس پر بھی احتیاطی پابندی یہاں بھی لگادی اور تمام عبادات اور احکام میں اس کی رعایت کی گئی ہے کہ عورتوں کا کلام چہری نہ ہو جو مرد سنیں۔ امام کوئی غلطی کرے تو مقتدیوں کو لقمہ زبان سے دینے کا حکم ہے، مگر عورتوں کو زبان سے لقمہ دینے کے بجائے یہ تعلیم دی گئی کہ اپنے ہاتھ کی پشت پر دو سرا ہاتھ مار کر تالی بجا دیں جس سے ام متنبہ ہو جائے زبان سے کچھ نہ کہیں۔

دوسری ہدایت: مکمل پردہ کرنے کی ہے وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّتِہِ الْاُولٰٓئِی، یعنی بیٹھو اپنے گھروں میں اور زمانہ قدیم کی جاہلیت الیوں کی طرح نہ پھرو، یہاں جاہلیت ادنیٰ سے مراد وہ جاہلیت ہے جو اسلام سے پہلے دنیا میں

پھیل ہوئی تھی۔ اس لفظ میں اشارہ ہے کہ اس کے بعد دوسری بھی کوئی جاہلیت آنے والی ہے جس میں اسی طرح کی بے حیائی بے پردگی پھیل جائے گی، وہ شاید اس زمانہ کی جاہلیت ہے، جس کا اب مشاہدہ ہر جگہ ہو رہا ہے۔

اس آیت میں پردہ کے متعلق اصلی حکم یہ ہے کہ عورتیں گھروں میں رہیں (یعنی بلا ضرورت شرعیہ باہر نہ نکلیں) اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ جس طرح اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت کی عورتیں علانیہ بے پردہ پھرتی تھیں ایسے نہ پھر۔ لفظ تَبَرُّج کے اصلی معنی ظہور کے ہیں اور اس جگہ مراد اس سے اپنی زینت کا اظہار ہے غیر مردوں پر، جیسا کہ دوسری آیت میں غَيْرِ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ آیا ہے۔

عورتوں کے پردہ کی پوری بحث اور مفصل احکام آگے اسی سورت میں آئیں گے یہاں صرف آیت مذکورہ کی تشریح لکھی جاتی ہے۔ اس آیت سے پردہ کے متعلق دو باتیں معلوم ہوتیں، اول یہ کہ اصل مطلوب عند اللہ عورتوں کے لئے یہ ہے کہ وہ گھروں سے باہر نہ نکلیں، ان کی تخلیق گھر لوگوں کے لئے ہوئی ہے ان میں مشغول رہیں، اور اصل پردہ جو شرعاً مطلوب ہر وہ حجاب بالبیوت ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر بضرورت کبھی عورت کو گھر سے نکلنا ہی پڑے تو زینت کے اظہار کے ساتھ نہ نکلے، بلکہ برقع یا جلباب جس میں پورا بدن ڈھک جائے وہ پہن کر نکلے۔ جیسا کہ آگے اسی سورۃ احزاب کی آیت وَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْہِہُنَّ میں اس کی تفصیل آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

قرآن فی بُیُوْتِکُمْ میں عورتوں پر قرار فی البیوت واجب کیا گیا۔
 ضرورت مستثنیٰ ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ عورتوں کے لئے گھر سے باہر نکلنا مطلقاً ممنوع اور حرام ہو۔ مگر اڈل تو خود اسی آیت وَلَا تَبَرَّجْنَ سے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ مطلقاً خروج بضرورت ممنوع نہیں بلکہ وہ خروج ممنوع ہے جس میں زینت کا اظہار ہو۔ دوسرے سورۃ احزاب کی آیت جو آگے آرہی ہے، اس میں خُودِیْنِ عَلَیْہِنَّ مِنْ جَلَابِیْہِہُنَّ کا حکم یہ بتلا رہا ہے کہ کسی درجہ میں عورتوں کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت بھی ہے بشرطیکہ برقع وغیرہ کے پردہ کے ساتھ نکلیں۔

اس کے علاوہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواضع ضرورت کا اس حکم سے مستثنیٰ ہونا ایک حدیث میں واضح فرمایا جس میں ازواج مبہرات کو خطاب کر کے فرمایا قَدْ اُذِنَ لَکُمْ اَنْ تَخْرُجْنَ لِخَاجَتِکُمْ رواہ مسلم، یعنی تمہارے لئے اس کی اجازت

ہر کہ اپنی ضرورت کے لئے گھر سے نکلے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل آیت حجاب نازل ہونے کے بعد اس پر شاہد ہے کہ ضرورت کے مواقع میں عورتوں کو گھروں سے نکلنے کی اجازت ہے۔ جیسا کہ حج و عمرہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ازواج مطہرات کا جانا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ اسی طرح بہت سے غزوات میں ساتھ جانا ثابت ہے۔ اور بہت سی روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ ازواج مطہرات اپنے والدین وغیرہ ملاقات کے لئے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں اور عزیزوں کی بیمار پرسی اور تعزیت وغیرہ میں شرکت کرتی تھیں، اور عہد نبویؐ میں ان کو مساجد میں جانے کی بھی اجازت تھی۔

اور صرف یہی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یا آپ کے زمانے ہی میں ایسا ہوا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی حضرت سودہ اور زینب بنت جحش وغیرہ کے علاوہ سب ازواج مطہرات کا حج و عمرہ کے لئے جانا ثابت ہے۔ جس پر صحابہ کرام میں سے کسی نے نکیر نہیں کیا۔ بلکہ فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد خلافت میں ازواج مطہرات کو خود اپنے اہتمام سے حج کے لئے بھیجا۔ اور حضرت عثمان غنیؓ اور عبدالرحمن بن عوفؓ کو ان کے ساتھ نگرانی و انتظام کے لئے بھیجا۔ اور ام المومنین حضرت سودہ اور حضرت زینب بنت جحشؓ کا بعد وفات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حج و عمرہ کے لئے نہ جانا اس آیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک حدیث کی بناء پر تھا۔ وہ یہ کہ حجۃ الوداع میں جب ازواج مطہرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ساتھ حج کرا دیا تو واپسی کے وقت فرمایا **هَذِهِ ثَمَرُ لِمَحُومِ الْحَصْرِ**، ہذہ کا اشارہ اس حج کی طرف ہے اور محصر حصیر کی جمع ہے، جس کے معنی بویا کے ہیں۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ تمہارا نکلنا صرف اس کے لئے ہو چکا اس کے بعد اپنے گھروں کے بویوں کو لازم پکڑو، ان سے نہ نکلو۔ حضرت سودہ بنت زمعہ اور زینب بنت جحشؓ نے اس حدیث کا یہ مفہوم قرار دیا کہ تمہارا خروج صرف اسی حجۃ الوداع کے لئے جائز تھا، آگے جائز نہیں۔ باقی اور ازواج مطہرات جن میں صدیقہ عائشہؓ جیسی فقیہہ بھی داخل تھیں سب نے اس کا مفہوم یہ قرار دیا کہ جس طرح کا یہ سفر تھا کہ ایک شرعی عبادت کی ادائیگی کے لئے ہو پس اسی طرح کا خروج جائز ہے، ورنہ اپنے گھروں میں رہنا لازم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت **وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ** کے مفہوم سے باشارات قرآن اور بعن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور باجماع صحابہ مواقع ضرورت مستثنیٰ ہیں، جن میں عبادا حج و عمرہ بھی داخل ہیں، اور ضروریات طبعیہ والدین اور اپنے محارم کی زیارت، عیادت

وغیرہ بھی۔ اسی طرح اگر کسی کے نفقہ اور ضروریات زندگی کا کوئی اور سامان نہ ہو تو پردہ کے ساتھ محنت مزدوری کے لئے نکلا بھی، البتہ مواقع ضرورت میں خروج کے لئے شرط یہ ہو کہ اظہار زینت کے ساتھ نہ نکلیں، بلکہ برقع یا جلباب (بڑی چادر) کے ساتھ نکلیں۔

حضرت ام المؤمنین صدیقہ عائشہؓ کا سفر بصرہ اور جنگ جمل کے واقعے پر روافض کے ہفوات

اور یہ بات وضاحت کے ساتھ آچکی ہے کہ آیت مذکورہ میں وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوتِكُنَّ کا مفہوم خود قرآنی اشارات بلکہ تصریحات کے نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اور آپ کے بعد صحابہ کرام

کے اجماع سے یہ ثابت ہے کہ مواقع ضرورت اس سے مستثنیٰ ہیں جن میں حج و عمرہ وغیرہ دینی ضروریات شامل ہیں۔ صدیقہ عائشہؓ اور ان کے ساتھ حضرت ام سلمہ اور صفیہ رضی اللہ عنہما یہ سب حج کے لئے تشریف لے گئیں تھیں۔ وہاں حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت اور بغاوت کے واقعات نے تو سخت غمگین ہوئیں، اور مسلمانوں کے باہمی افتراق سے نظام مسلمین میں خلل اور فتنہ کا اندیشہ پریشان کئے ہوئے تھا۔ اسی حالت میں حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ اور عثمان بن بشرؓ اور کعب بن عجرہؓ اور چند دوسرے صحابہ کرام مدینہ سے بھاگ کر مکہ معظمہ پہنچے، کیونکہ قاتلان عثمانؓ ان کے بھی قتل کے درپے تھے۔ یہ حضرات اہل بغاوت کے ساتھ شریک نہیں تھے، بلکہ ان کو ایسے فعل سے روکتے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے قتل کے بعد وہ ان کے بھی درپے تھے، اس لئے یہ لوگ جان بچا کر مکہ معظمہ پہنچ گئے، اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور مشورہ طلب کیا۔ حضرت صدیقہؓ نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ آپ لوگ اس وقت تک مدینہ طیبہ نہ جائیں جب تک کہ باغی لوگ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کے گرد جمع ہیں، اور وہ ان قصاص لینے سے مزید فتنہ کے اندیشہ کی وجہ سے رُکے ہوئے ہیں تو آپ لوگ کچھ روز ایسی جگہ جا کر رہیں جہاں اپنے آپ کو مأمون سمجھیں، جب تک کہ امیر المؤمنینؓ انتظام پر قابو نہ پالیں اور تم لوگ جو کچھ کوشش کر سکتے ہو اس کی کرو کہ یہ لوگ امیر المؤمنینؓ کے گرد سے متفرق ہو جائیں، اور امیر المؤمنینؓ ان سے قصاص یا انتقام لینے پر قابو پالیں۔

یہ حضرات اس پر راضی ہو گئے، اور ارادہ بصرہ چلے جانے کا کیا۔ کیونکہ اس وقت وہاں مسلمانوں کے لشکر جمع تھے۔ ان حضرات نے وہاں جانے کا قصد کر لیا تو ام المؤمنینؓ سے بھی درخواست کی کہ انتظام حکومت برقرار ہونے تک آپ بھی ہمارے ساتھ بصرہ میں قیام فرمائیں۔

اور اس وقت قاتلان عثمانؓ اور مفسدین کی قوت و شوکت اور حضرت علیؓ کا اُن کی شرعی جاری کرنے سے بے قابو ہونا خود ہیج البلاغہ کی روایت سے واضح ہے۔ یاد رہے کہ ہیج البلاغہ

کو شیعہ حضرات مستند مانتے ہیں۔ نبیؐ البلاغ میں ہے کہ حضرت امیرؓ سے ان کے بعض اصحابؓ رفقاء نے خود کہا کہ اگر آپ ان لوگوں کو سزا دیدیں جنہوں نے عثمانؓ پر حملہ کیا تو بہتر ہوگا۔ اس پر حضرت امیرؓ نے فرمایا کہ میرے بھائی! میں اس بات سے بے خبر نہیں جو تم کہتے ہو، مگر یہ کام کیسے ہو جبکہ مدینہ پر یہی لوگ چھائے ہوئے ہیں، اور تمھارے غلام اور اس پاس کے اعراب بھی ان کے ساتھ لگ گئے ہیں ایسی حالت میں ان کی سزا کے احکام جاری کر دوں تو نافذ کس طرح ہونگے؟ حضرت صدیقہؓ کو ایک طرف حضرت علیؓ کی مجبوری کا اندازہ تھا دوسری طرف یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے مسلمانوں کے قلوب زخمی ہیں، اور ان کے قاتلوں سے انتقام لینے میں تاخیر جو امیر المؤمنینؓ کی طرف سے مجبوری دیکھی جا رہی تھی اور مزید یہ کہ قاتلان عثمانؓ امیر المؤمنینؓ کی مجالس میں بھی شریک ہوتے تھے۔ جو لوگ حضرت امیر المؤمنینؓ کی مجبوری سے واقف نہ تھے، ان کو اس معاملہ میں ان سے بھی شکایت پیدا ہو رہی تھی۔ ممکن تھا کہ یہ شکوہ و شکایت کسی دوسرے فتنے کا آغاز نہ بن جائے۔ اس لئے لوگوں کو فہمائش کر کے صبر کرنے اور امیر المؤمنینؓ کو قوت پہنچا کر نظم مملکت کو مستحکم کرنے اور باہمی شکوہ و شکایت کو رفع کر کے اصلاح بین الناس کے قصد سے بصرہ کا سفر اختیار کر لیا، جس میں ان کے محرم بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ ان کے ساتھ تھے۔ اپنے اس سفر کا مقصد خود امیر المؤمنینؓ نے حضرت قعقاعؓ کے سامنے بیان فرمایا تھا جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور ایسے شدید فتنہ کے وقت اصلاح بین المؤمنینؓ کا کام جس قدر اہم دینی خدمت تھی وہ بھی ظاہر ہے۔ اس کے لئے اگر امیر المؤمنینؓ نے بصرہ کا سفر محارم کے ساتھ اور پردہ کے آہنی ہودج میں اختیار فرمالیا تو اس کو جو شیعہ اور وفادار نے ایک طوفان بنا کر پیش کیا ہے کہ امیر المؤمنینؓ نے احکام قرآن کی خلاف ورزی کی اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔

آگے منافقین اور مفسدین کی شرارت نے جو صورت جنگ باہمی کی پیدا کر دی اس کا خیال بھی صدیقہؓ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس آیت کی تفسیر کے لئے اتنا ہی کافی ہے آگے واقعہ جنگ جمل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مگر اختصار کے ساتھ حقیقت واضح کرنے کے لئے چند سطور لکھی جاتی ہیں۔

باہمی فتنوں اور جھگڑوں کے وقت جو صورتیں دنیا میں پیش آیا کرتی ہیں ان سے کوئی اہل بصیرت و تجربہ غافل نہیں ہو سکتا۔ یہاں بھی صورت یہ پیش آئی کہ مدینہ سے آئے ہوئے صحابہ کرام کی معیت میں حضرت صدیقہؓ کے سفر بصرہ کو منافقین اور مفسدین

حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰؑ کے سامنے صورت بگھاڑ کر اس طرح پیش کیا کہ یہ سب اس لئے بصرہ جا رہے ہیں کہ وہاں سے لشکر ساتھ لے کر آپ کا مقابلہ کریں، اگر آپ امیر وقت ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ اس فتنہ کو آگے بڑھنے سے پہلے دبا کر روکیں۔ حضرت حسن و حسین و عبداللہ بن جعفر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام نے اس رات سے اختلافت بھی کیا اور مشورہ یہ دیا کہ آپ ان کے مقابلہ پر لشکر کشی اس وقت تک نہ کریں جب تک صحیح حال معلوم نہ ہو جائے، مگر کثرت دوسری طرف رائے دینے والوں کی تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی اسی طرف مائل ہو کر شکر کے ساتھ نکل آئے، اور یہ شریر اہل فتنہ و بغاوت بھی آپ کے ساتھ نکلے۔ جب یہ حضرات بصرہ کے قریب پہنچے تو حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنینؑ کے پاس دریافت حال کے لئے بھیجا۔ انھوں نے عرض کیا کہ اے امیر المؤمنینؑ آپ کے یہاں تشریف لانے کا کیا سبب ہوا؟ تو صدیقہؑ نے فرمایا اے نبیؐ اے صلحاء بین الناس، یعنی میرے پیارے بیٹے! میں اصلاح بین الناس کے ارادہ سے یہاں آئی ہوں۔ پھر حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کو بھی قعقاعؓ کی مجلس میں بلا لیا۔ قعقاعؓ نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ قاتلان عثمانؓ پر حد شرعی جاری کرنے کے سوا ہم کچھ نہیں چاہتے۔ حضرت قعقاعؓ نے سمجھایا کہ یہ کام تو اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مسلمانوں کی جماعت منظم اور مستحکم نہ ہو جائے، اس لئے آپ حضرات پر لازم ہے کہ اس وقت آپ مصالحت کی صورت اختیار کر لیں۔

ان بزرگوں نے اس کو تسلیم کیا۔ حضرت قعقاعؓ نے جا کر امیر المؤمنینؑ کو اس کی اطلاع دیدی وہ بھی بہت مسرور ہوئے اور مطمئن ہو گئے، اور سب لوگوں نے واپسی کا قصد کر لیا، اور تین روز اس میدان میں قیام اس حال پر رہا کہ کسی کو اس میں شک نہیں تھا کہ اب دونوں فریقوں میں مصالحت کا اعلان ہو جائے گا، اور جو تھے دن صبح کو یہ اعلان ہونے والا تھا اور حضرت امیر المؤمنینؑ کی ملاقات حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے ساتھ ہونے والی تھی جس میں یہ قاتلان عثمانؓ غنی شریک نہیں تھے۔ یہ چیز ان لوگوں پر سخت گراں گذری، اور انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ تم اول حضرت عثمانؓ کی جماعت میں پہنچ کر قتل و غارتگری شروع کر دو، تاکہ وہ اور ان کے ساتھی یہ سمجھیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے عہد شکنی ہوئی، اور یہ لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہو کر حضرت علیؑ کے لشکر پر ٹوٹ پڑیں۔ ان کی یہ شیطانی چال چل گئی، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لشکر میں شامل ہونے والے مفسدین کی طرف سے جب حضرت صدیقہؑ کی جماعت پر حملہ ہو گیا تو

وہ سمجھنے میں معذور تھے کہ یہ حملہ امیر المؤمنینؑ کے لشکر کی طرف سے ہوا ہے، اس کی جوابی کارروائی شروع ہو گئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہ ماجرا دیکھا تو قتال کے سوا چارہ نہ رہا، اور جو حادثہ باہمی قتل و قتال کا پیش آنا تھا آگیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون، یہ واقعہ ٹھیک اسی طرح طبری اور دوسرے ثقافت مؤرخین نے حضرت حسن اور حضرت عبداللہ بن جعفر اور عبداللہ بن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے نقل کیا ہے (روح المعانی)

غرض مفسدین و مجرمین کی شرارت اور فتنہ انگیزی کے نتیجے میں ان دونوں مقدس گروہوں میں غیر شعوری طور پر قتال کا واقعہ پیش آگیا، اور جب فتنہ فرو ہو تو دونوں ہی حضرات اس پر سخت غمگین ہوئے۔ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ واقعہ یاد آ جاتا تو اتنا روتی تھیں کہ ان کا دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰؑ کو بھی اس واقعہ پر سخت صدمہ پیش آیا۔ فتنہ فرو ہونے کے بعد مقتولین کی لاشوں کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے تو اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر یہ فرماتے تھے کہ کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر کر قیامتیا ہو گیا ہوتا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت ام المؤمنینؑ جب قرآن میں یہ آیت پڑھتیں

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ توروں نے لگتیں، یہاں تک کہ ان کا دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا۔

(رداء عبداللہ بن احمد فی زوائد الزہد وابن المنذر وابن شیبہ عن مسروق، روح)

آیت مذکورہ پڑھنے پر رونا اس لئے نہ تھا کہ شرارتی البیوت کی خلافت درزی ان کے نزدیک گناہ تھی یا سفر ممنوع تھا بلکہ گھر سے نکلنے پر جو واقعہ ناگوار اور حادثہ شدیدہ پیش آگیا، اس پر طبعی رنج و غم اس کا سبب تھا۔ (یہ سب روایات اور پورا مضمون تفسیر روح المعانی سے لیا گیا ہے)۔

الاذواج مطہرات کو قرآن کی تیسری، چوتھی اور پانچویں ہدایتیں

وَاقِئْنَ الصَّلَاةَ وَالزَّكَاةَ وَأَطِئْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ دو ہدایتیں تفصیل کے ساتھ پہلے گذر چکی ہیں، یعنی غیر مردوں سے

کلام میں نرمی و نزاکت سے اجتناب اور گھروں سے بلا ضرورت نہ نکلنا۔ تین ہدایتیں اس میں آگئیں۔ یہ کُل پانچ ہدایتیں ہیں جو عورتوں کے لئے ہدایت دین میں سے ہیں۔

یہ پانچوں ہدایتیں سب مذکورہ ہدایات میں آخری ہدایات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ اذواج مطہرات کے ساتھ مخصوص ہوں، نماز، زکوٰۃ اور اللہ

رسول کی اطاعت سے کوئی مسلمان مرد و عورت مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ باقی پہلی دو ہدایتیں جو عورتوں کے پردہ سے متعلق ہیں ذرا غور کرنے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بھی

اس کا قرینہ ہے۔ حضرت عکرمہ تو بازار میں منادی کرتے تھے، کہ آیت میں اہل بیت سے مراد ازواج مطہرات ہیں، کیونکہ یہ آیت انہی کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اور فرماتے تھے کہ میں اس پر مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔

لیکن حدیث کی متعدد روایات جن کو ابن کثیر نے اس جگہ نقل کیا ہے اس پر شاہد ہیں کہ اہل بیت میں حضرت فاطمہؓ اور علیؓ اور حضرت حسنؓ و حسینؓ بھی شامل ہیں۔ جیسے صحیح مسلم کی حدیث حضرت عائشہؓ کی روایت سے ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لے گئے اور اس وقت آپ ایک سیاہ ردھی چادر اوڑھے ہوئے تھے حسن بن علیؓ آگے تو ان کو اس چادر میں لے لیا، پھر حسینؓ آگے، ان کو بھی اسی طرح چادر کے اندر داخل فرما لیا، اس کے بعد حضرت فاطمہؓ پھر علیؓ مرتضیٰؓ آگے، ان کو بھی چادر میں داخل فرمایا، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا، اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آیت پڑھنے کے بعد فرمایا: اللَّهُمَّ هَؤُلَاءِ أَهْلُ بَيْتِي (رواہ ابن جریر)

ابن کثیر نے اس مضمون کی متعدد احادیث معتبرہ نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ درحقیقت ان دونوں اقوال میں جو ائمہ تفسیر سے منقول ہیں کوئی تضاد نہیں۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت ازواج مطہرات کی شان میں نازل ہوئی اور اہل بیت وہی مراد ہیں یہ اس کے منافی نہیں کہ دوسرے حضرات بھی اہل بیت میں شامل ہوں۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ لفظ اہل بیت میں ازواج مطہرات بھی داخل ہیں، کیونکہ شان نزول اس آیت کا وہی ہیں، اور شان نزول کا مصداق آیت میں داخل ہونا کسی شبہ کا محتمل نہیں۔ اور حضرت فاطمہؓ و علیؓ و حسنؓ و حسینؓ رضی اللہ عنہم بھی ارشاد نبوی علیہ السلام کے مطابق اہل بیت میں شامل ہیں۔ اور اس آیت سے پہلے اور بعد میں دونوں جگہ نساء النبی کے عنوان سے خطاب اور ان کے لئے صیغہ مؤنث کے استعمال فرمائے گئے ہیں۔ سابقہ آیات میں فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ سے آخر تک سب صیغہ مؤنث کے استعمال ہوئے ہیں، اور آگے پھر وَإِذْ كُنَّ نَائِمَاتٍ میں بصیغہ تانیث خطاب ہوا ہے۔ اس درمیانی آیت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر بصیغہ مذکر عَنْكُمْ اور تَطْهِرْكُمْ فرمانا بھی اس پر شاہد قوی ہے کہ اس میں صرف ازواج ہی داخل نہیں کچھ رجال بھی ہیں۔

آیت مذکورہ میں جو یہ فرمایا ہے کہ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَ تَطْهِرْكُمْ تَطْهِيرًا، ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان ہدایات کے ذریعہ اغواء

شیطان اور معاصی اور قبائح سے حق تعالیٰ اہل بیت کو محفوظ رکھے گا، اور پاک کر دے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ تطہیر شرعی مراد ہے، تکوینی تطہیر جو خاصۃً انبیاء پر وہ مراد نہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ سب معصوم ہوں اور ان سے انبیاء علیہم السلام کی طرح کوئی گناہ سرزد ہونا ممکن نہ ہو، جو تکوینی تطہیر کا خاصہ ہے۔ اہل تشیع نے اس آیت میں جمہور امت سے اختلاف کر کے اول تو لفظ اہل بیت کا صرف اولاد و عصبائے رسول کے ساتھ مخصوص ہونے اور ازواج مطہرات کے ان سے خارج ہونے کا دعویٰ کیا۔ دوسرے آیت مذکورہ میں تطہیر سے مراد ان کی عصمت قرار دے کر اہل بیت کو انبیاء کی طرح معصوم کیا۔ اس کا جواب اور مسئلہ کی مفصل بحث احقر نے احکام القرآن سورۃ احزاب میں لکھی ہے، اس میں عصمت کی تعریف اور اس کا انبیاء اور ملائکہ کے ساتھ مخصوص ہونا اور ان کے علاوہ کسی کا معصوم نہ ہونا دلائل شرعیہ سے واضح کر دیا ہے، اہل علم اس کو دیکھ سکتے ہیں، عوام کو اس کی ضرورت نہیں۔

وَإِذْ كُنَّا فِي بُيُوتِكُمْ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ، آیات اللہ سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور سنت رسول ہے، جیسا کہ عامۃ مفسرین نے حکمت کی تفسیر اس جگہ سنت سے کی ہے۔ اور لفظ اذ کُنَّا کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ان چیزوں کو خود یاد رکھنا جس کا نتیجہ اُن پر عمل کرنا ہے، دوسرے یہ کہ جو کچھ قرآن ان کے گھروں میں ان کے سامنے نازل ہوا یا جو تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیں اس کا ذکر امت کے دوسرے لوگوں سے کریں اور ان کو پہنچائیں۔

فأذن لا:۔ ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی آیت قرآن یا حدیث سنے اس پر لازم ہے کہ وہ اُمت کو پہنچائے، یہاں تک کہ ازواج مطہرات پر بھی لازم کیا گیا کہ جو آیات قرآن ان کے گھروں میں نازل ہوں یا جو تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو حاصل ہوں اس کا ذکر امت کے دوسرے افراد سے کریں، اور یہ اللہ کی امانت ان کو پہنچائیں۔

قرآن کی طرح حدیث | اس آیت میں جس طرح آیات قرآن کی تبلیغ و تعلیم اُمت پر لازم کی گئی ہے اسی طرح لفظ حکمت فرما کر احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ و تعلیم کو بھی لازم کیا گیا ہے۔ اسی لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس حکم کی تعمیل ہر حال میں کی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ واقعہ کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی، لیکن اس کو عام لوگوں کے سامنے اس لئے بیان نہیں کیا کہ خطرہ تھا کہ لوگ اس کو اس کے درجہ میں نہ رکھیں، اور کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں،

لیکن جب اُن کی وفات کا وقت آیا تو لوگوں کو جمع کر کے وہ حدیث سنادی اور فرمایا کہ میں نے اس وقت تک دینی مصلحت سے اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا، مگر اب موت کا وقت قریب ہو اس لئے امت کی یہ امانت ان کو پہنچانا ضروری سمجھتا ہوں۔ صحیح بخاری میں اُن کے الفاظ یہ ہیں **فَاُخْبِرَ بِهِمْ مَعَاذُ عِزِّ مَنْ تُؤْتِيهِمْ تَأْتِيَهُمْ** یعنی حضرت معاذ رضی نے یہ حدیث لوگوں کو وفات کے وقت اس لئے سنادی کہ وہ گناہگار نہ ہوں کہ حدیث رسول امت کو نہیں پہنچائی۔

یہ واقعہ بھی اسی پر شاہد ہے کہ اس حکم و سرآئی کی تعمیل سب صحابہ کرام واجب ضروری سمجھتے تھے، اور صحابہ کرام نے حدیث کو احتیاط کے ساتھ لوگوں تک پہنچانے کا اہتمام فرمایا تھا تو حدیث کی حفاظت بھی ایک درجہ میں قرآن کی حفاظت کے قریب قریب ہو گئی، اس معاملہ میں شبہات نکالنا درحقیقت قرآن میں شبہات نکالنا ہے۔ واللہ اعلم

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَ

تحقیق مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان دار مرد اور ایمان دار عورتیں اور

الْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ

بندگ کرنیوالے مرد اور بندگی کرنیوالی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت جھیلنے والے مرد

وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ

اور محنت جھیلنے والی عورتیں اور بے رنج و دل مرد اور بے رنج و دل عورتیں اور خیرات کرنیوالے مرد اور خیرات کرنیوالی عورتیں

وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ

اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور حفاظت کرنیوالے مرد اپنی شہوت کی جگہ کو اور حفاظت کرنیوالی عورتیں

وَالَّذِينَ كَرِهَ اللَّهُ كَثِيرًا وَالَّذِينَ كَرِهَ اللَّهُ لَكُمُ

اور یاد کرنے والے مرد اللہ کو بہت سا اور یاد کرنیوالی عورتیں رکھی ہے اللہ نے ان کے واسطے

مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ۝۳۵

معافی اور ثواب بڑا۔

خلاصہ تفسیر

بیشک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور

ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں (مسلمین و مسلمات کی اس تفسیر پر اسلام سے مراد اعمال نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ ہوتے اور مؤمنین و مؤمنات میں ایمان سے مراد عقائد ہوتے) جیسا صحیح بخاری و مسلم میں حضرت جبریل علیہ السلام کے پوچھنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام و ایمان کے متعلق بھی یہی جواب دینا منقول ہے) اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اس راست بازی میں صادق القول ہونا بھی داخل ہے صادق العمل ہونا بھی، اور ایمان اور نیت میں صادق ہونا بھی، یعنی ان کے کلام میں کوئی جھوٹ ہو نہ عمل میں کم ہمتی اور سستی اور نہ ریاکاری یا نفاق، اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں (اس میں صبر کی سبب قسमें آگئیں، یعنی طاعات و عبادات پر ثابت قدم رہنا اور معاصی سے اپنے نفس کو روکنا اور مصائب پر صبر کرنا) اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں (لفظ خشوع میں نماز و عبادت کا خشوع بھی داخل ہے کہ قلب سے بھی عبادت کی طرف متوجہ ہو اور اپنے اعضاء و جوارح کو بھی اس کے مناسب رکھے اور اس میں عام تواضع بھی داخل ہے جو تکبر کے بالمقابل ہے۔ یعنی یہ لوگ تکبر اور اپنی بڑائی سے بھی پاک ہیں) اور نماز وغیرہ عبادات میں بھی خشوع و خضوع ان کا وظیفہ ہے) اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں (اس میں زکوٰۃ اور صدقات نافلہ سب داخل ہیں) اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت خدا کی یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں (یعنی جو اذکار فرض کے علاوہ نفلی اذکار کو بھی ادا کرتے ہیں) ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

معارف و مسائل

قرآن کے عام خطابات مردوں کو ہیں عورتیں ضمناً شامل ہیں یہی حکم قرآن کریم کے عام احکام میں اگرچہ مرد و عورت دونوں ہی شامل ہیں، مگر عموماً خطاب مردوں کو کیا گیا ہے، عورتیں اس میں ضمناً شامل ہیں۔ ہر جگہ یا ایہا الذین آمنوا کے الفاظ استعمالی

حکمت

فرما کر عورتوں کو ان کے ضمن میں مخاطب کیا گیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ عورتوں کے سب معاملات تستر اور پردہ پوشی پر مبنی ہیں، اس میں ان کا اکرام و اعزاز ہے۔ خصوصاً پورے قرآن میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت مریم بنت عمران کے سوا کسی عورت کا نام قرآن میں نہیں لیا گیا، بلکہ ذکر آیا تو مردوں کی نسبت کے ساتھ، امراۃ فرعون، امراۃ نوح، امراۃ لوط کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت مریم کی خصوصیت شاید یہ ہو کہ حضرت

علی علیہ السلام کی نسبت کسی باپ کی طرف نہ ہو سکتی تھی، اس لئے ماں کی طرف نسبت کرنا تھا اس نسبت کے لئے ان کا نام ظاہر کیا گیا۔ واللہ اعلم

قرآن کریم کا یہ اسلوب اگرچہ خود ایک بڑی حکمت و مصلحت پر مبنی تھا، مگر عورتوں کو اس کا خیال گزرنا ایک امر طبعی تھا۔ اسی لئے کتب حدیث میں ایسی متعدد روایات ہیں جن میں عورتوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ مردوں ہی کا ذکر قرآن میں فرماتے ہیں، انہی کو مخاطب فرماتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہم عورتوں میں کوئی تیرہ نہیں، ہمیں ڈر ہے کہ ہماری عبادت بھی قبول نہ ہو، رواہ البغوی عن الازواج المہطرات، اور ترمذی میں بسند حسن حضرت ام عمارہ انصاریہ سے اور بعض روایات میں حضرت اسماء بنت عمیسؓ سے اسی طرح کی عرضداشت پیش کرنا منقول ہے، اور ان سب روایات میں آیات مذکورہ کا سبب نزول اسی عرضداشت کو قرار دیا ہے۔

آیات مذکورہ میں عورتوں کی دل جوئی اور ان کے اعمال کی مقبولیت کا خصوصی ذکر فرمایا گیا ہے، جس میں یہ جملہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت اور فضیلت کا مدار اعمال صالحہ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اس میں مرد و عورت میں کوئی امتیاز نہیں۔

ذکر اللہ کی کثرت کا حکم | اسلام کے ارکان پانچ عبادتیں ہیں۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد اور اس کی حکمت لیکن پورے قرآن میں ان میں سے کسی عبادت کو کثرت کے ساتھ کرنے کا حکم نہیں۔ مگر ذکر اللہ کے متعلق قرآن کریم کی متعدد آیات میں بکثرت کرنے کا ارشاد ہے۔

سورۃ انفال، سورۃ جمعہ میں اور اس سورت میں وَالَّذَاکِرُ لِلَّهِ کَثِیْرًا ۙ وَالَّذَاکِرَاتُ فَرَمَا۔ اس کی حکمت غالباً یہ ہے کہ اول تو ذکر اللہ سب عبادات کی اصل روح ہے، جیسا کہ حضرت معاذ بن انسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ کسی شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مجاہدین میں سب سے زیادہ اجر و ثواب کس کا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا جو سب سے زیادہ اللہ کا ذکر کرے۔ پھر پوچھا کہ روزہ داروں میں کس کا ثواب سب سے زیادہ ہے؟ فرمایا جو سب سے زیادہ اللہ کا ذکر کرے۔ پھر اسی طرح نماز، زکوٰۃ اور حج و صدقہ کے متعلق سوالات کئے، ہر مرتبہ آپؐ نے یہی فرمایا کہ جو اللہ کا ذکر زیادہ کرے، وہی زیادہ مستحق اجر ہے۔ رواہ احمد (ابن کثیر)

دوسرے وہ سب عبادات میں سب سے زیادہ سہل ہے۔ شریعت نے بھی اس کے لئے کوئی شرط نہیں رکھی، وضو، بے وضو، لیٹے، بیٹھے، چلتے پھرتے، ہر وقت میں ذکر اللہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ نہ انسان سے کوئی محنت لیتا ہے، نہ کسی فرصت کو مقتضی ہے۔

اور اثر و فائدہ اس کا اتنا عظیم ہے کہ ذکر اللہ کے ذریعہ دنیا کے کام بھی دین اور عبادت بن جاتے ہیں۔ کھانے سے پہلے اور بعد کی دعائے گھر سے نکلنے اور واپس آنے کی دعائیں، سفر میں جانے اور دوران سفر اور وطن کی واپسی کی دعائیں، کوئی کاروبار کرنے سے پہلے اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم فرمودہ دعاؤں کا حاصل ہی یہ ہے کہ مسلمان کسی وقت اللہ سے غافل ہو کر کوئی کام نہ کرے، اور اس نے یہ ماثور دعائیں اپنے کاموں میں پڑھ لیں تو وہ دنیا کے کام بھی دین بن جاتے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا

اور کام نہیں کسی ایمان دار مرد کا اور نہ ایمان دار عورت کا جبکہ مقرر کر دے اللہ اور اس کا رسول

أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَ

کوئی کام کہ ان کو رہبر اختیار اپنے کام کا، اور جس نے نافرمانی کی اللہ کی اور

رَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا ﴿۳۶﴾ وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ

اس کے رسول کی سو وہ راہ بھولا صریح چوک کر۔ اور جب تو کہنے لگا اس شخص کو جس پر اللہ

اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ

نے احسان کیا اور تو نے احسان کیا رہنے دے اپنے پاس اپنی جو روکو اور ڈر اللہ سے

اللَّهُ وَتَخَفِ فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ

اور تو چھپاتا تھا اپنے دل میں ایک چیز جو اللہ کھولا چاہتا ہو، اور ڈرتا تھا لوگوں سے

وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاهَا

اور اللہ سے زیادہ چاہئے ڈرنا تجھ کو پھر جب زید تمام کر چکا اس عورت سے اپنی غرض ہم نے اس کو

لَكَ لَا يَكُونُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ

تیرے نکاح میں دیدیا تا نہ رہو مسلمانوں پر گناہ نکاح کر لینا جو رو دیں اپنے لے پا لکوں کی

إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿۳۷﴾ مَا كَانَ

جب وہ تمام کر لیں ان سے اپنی غرض، اور ہے اللہ کا حکم بجالانا۔ - - -

عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ سُنَّةَ اللَّهِ فِي

کچھ مضائقہ نہیں اس بات میں جو مقرر کر دی اللہ نے اس کے واسطے جیسے دستور رہا ہو اللہ کا

الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَقْدُورًا ۝ (۳۸)

ان لوگوں میں جو گزرے پہلے اور ہر حکم اللہ کا مقرر ٹھہر چکا

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ

وہ لوگ جو پہنچاتے ہیں پیغام اللہ کے اور ڈرتے ہیں اس سے اور نہیں ڈرتے

أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ ۖ وَكَفَى بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝ (۳۹)

کسی سے سوائے اللہ کے اور بس ہو اللہ کفایت کرنے والا

خلاصہ تفسیر

اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا رگو وہ دنیا ہی کی بات کیوں نہ ہو وجوہاً حکم دیدیں کہ (پھر) اُن (مؤمنین) کو ان کے اُس کام میں کوئی اختیار (باقی) رہے (یعنی اس اختیار کی گنجائش نہیں رہتی کہ خواہ کریں یا نہ کریں بلکہ عمل ہی کرنا واجب ہو جاتا ہے) اور جو شخص (بعد حکم و جوبی کے) اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا اور (اس وقت کو یاد کیجئے) جب آپ رہنمائی و مشورہ کے طور سے (اس شخص سے فرما رہے تھے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا کہ اسلام کی توفیق دی جو انعام دینی ہے، اور غلامی سے چھڑایا کہ نعمت دنیویہ ہے) اور آپ نے بھی انعام کیا و تعلیم دین فرمائی، اور آزاد کیا، اور پھوپھی زاد بہن سے نکاح کرایا مراد حضرت زینبؓ ہیں کہ آپ ان کو سمجھا رہے تھے کہ اپنی بی بی (زینبؓ) کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اس کی معمولی خطاؤں پر نظر نہ کر کہ گناہ ہے اس سے ناموافق ہو جاتی ہے اور خدا سے ڈر اور اس کے حقوق میں بھی کوتاہی نہ کر کہ کبھی اس سے ناموافقیت، پیدا ہو جاتی ہے) اور (جب شکایتیں حد سے متجاوز ہو گئیں اور قرآن سے اصلاح و توفیق کی امید نہ رہی تو اس وقت فہمائش کے ساتھ) آپ اپنے دل میں وہ بات (بھی) چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ (آخر میں) ظاہر کرنے والا تھا مراد اس سے آپ کا نکاح ہو حضرت زینبؓ سے جبکہ زیدؓ ان کو طلاق دیدیں جس کو حق تعالیٰ نے ردّ جُنَہُنَّ میں قولاً اور

خود نکاح کر دینے سے فعلاً ظاہر فرمایا) اور اس مشروط اور معلق ارادہ کے ساتھ ہی (آپ لوگوں کے طعن سے (بھی) اندیشہ کرتے تھے کیونکہ اس وقت اس نکاح میں کسی اہم مصلحت دینیہ کا ہونا ذہن مبارک میں نہ آیا ہوگا، محض دنیوی مصلحت خاص حضرت زینبؓ کی، خیال میں ہوگی اور امور دنیویہ میں ایسا اندیشہ ہونا مضائقہ نہیں، بلکہ بعض حیثیتوں سے مطلوب ہی، جبکہ اعتراض سے دوسروں کی دین کی خرابی کا احتمال ہو اور ان کو اس سے بچانا مقصود ہو) اور ڈرنا تو آپ کو خدا ہی سے زیادہ سزاوار ہے (یعنی چونکہ واقع میں اس میں دینی مصلحت ہے، جیسا کہ آگے بھی لایکون الخ میں مذکور ہے، اس لئے خلق سے اندیشہ نہ کیجئے، چنانچہ بعد اطلاق مصلحت دینیہ کے پھر اندیشہ آپ نے نہیں کیا اور ارادۃ نکاح میں تو کیا اندیشہ ہوتا خود نکاح کے بعد بھی اندیشہ نہیں کیا، جس کا قصہ آگے ہے کہ) پھر جب زید کا اُس (زینبؓ) سے جی بھر گیا، (یعنی طلاق دیدی اور عدت بھی گزر گئی تو) ہم نے آپ سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیبیوں کے (نکاح کے) بارے میں کچھ تنگی نہ رہے جب وہ (منہ بولے بیٹے) ان سے اپنا جی بھر چکیں (یعنی طلاق دیدیں، مطلب یہ کہ اس تشریح کا اظہار مقصود تھا) اور خدا کا یہ حکم تو ہونے والا تھا ہی (کیونکہ حکمت اس کو مقتضی تھی۔ آگے طعن کا جواب کہ) ان پیغمبر کے لئے خدا تعالیٰ نے جو بات (تکویناً یا تشریفاً) مقرر کر دی تھی اس میں نہی پر کوئی الزام (اور طعن کی بات) نہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن پیغمبروں کے حق میں بھی یہی معمول کر رکھا ہے جو پہلے ہو گزرے ہیں کہ ان کو جس امر کی اجازت ہوتی ہے بے تکلف وہ اس کو کرتے رہے ہیں اور محل طعن نہیں بنے، ایسے ہی یہ نبی بھی محل اعتراض نہیں، اور اُن پیغمبروں کے بھی اس قسم کے جتنے کام ہوتے ہیں ان سب کے بارے میں بھی، اللہ کا حکم تجویز کیا ہوا (پہلے سے) ہوتا ہے اور اسی کے موافق پھر اُن کو حکم ہوتا ہے اور وہ عمل کرتے ہیں۔ شاید آپ کے قصہ میں اس مضمون کو لانا اور پھر انبیاء کے تذکرہ میں اس کو مکرر لانا اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے امور مثل تمام امور تکوینیہ کے ایسے متضمن حکمت ہوتے ہیں کہ پہلے ہی سے علم الہی میں تجویز ہو چکے ہیں، پھر نبی پر طعن کرنا اللہ پر طعن کرنا ہے۔ بخلاف اُن امور کے جن پر خود حق تعالیٰ ملامت فرمادیں گو وہ مقدر ہونے کی وجہ سے متضمن حکمت ہوں مگر محل ملامت ہونا دلیل ہے، اس کے تضمن مفاسد کی۔ اس لئے ان مفاسد کے اعتبار سے اُن پر نکیر جائز ہے۔ آگے ایک مدح خاص ہے اُن پیغمبروں کی تاکہ آپ کو تسلی ہو یعنی،

یہ سب رسوخیران گذشتہ) ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہونچایا کرتے تھے (اگر تبلیغ قولی کے مامور ہوئے تو قولاً اور اگر تبلیغ فعلی کے مامور ہوئے تو فعلاً) اور (اس باب میں) اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے (پس آپ کو بھی جب تک معلوم نہ تھا کہ یہ نکاح تبلیغ فعلی ہے اندیشہ ہونا مضائقہ نہیں، لیکن آپ کو جب یہ بات معلوم ہو گئی تو آپ بھی اندیشہ نہ کیجئے جیسا کہ مقتضایہ ہے شان رسالت کا۔ چنانچہ اس کے انکشاف کے بعد پھر آپ نے اندیشہ نہیں کیا، اور باوجودیکہ خود آپ کو تبلیغ رسالت میں کسی سے خوف نہیں ہوا، نہ اس کا احتمال تھا پھر بھی انبیاء کا قصہ سنانا زیادہ تقویت قلب کے لئے ہے) اور (آپ کی زیادہ تسلی کے لئے فرماتے ہیں) اللہ (اعمال کا) حساب لینے کے لئے کافی ہے (پھر کسی سے کاہے کا ڈر ہے نیز آپ پر طعن کرنے والوں کو بھی سزا دے گا آپ طعن سے معصوم نہ ہو جئے)۔

معارف و مسائل

یہ بات پہلے کئی مرتبہ معلوم ہو چکی ہے کہ سورۃ احزاب میں زیادہ تر وہ احکام ہیں جن کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و محبت اور مکمل اطاعت سے یا آپ کو کسی قسم کی ایذا و تکلیف پہونچانے کی ممانعت سے ہے۔ آیات مذکورۃ الصدر بھی اسی سلسلے کے چند واقعات سے متعلق نازل ہوئی ہیں۔

ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کسی شخص کے غلام تھے۔ زمانہ جاہلیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بازار عکاظ سے خرید لیا تھا، ابھی عمر بھی کم تھی۔ آپ نے خریدنے کے بعد ان کو آزاد کر کے یہ شرف بخشا کہ عرب کے عمامہ رواج کے مطابق ان کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا اور ان کی پرورش فرمائی۔ مکہ مکرمہ میں ان کو زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے اس کو جاہلیت کی رسم غلط قرار دے کر اس کی ممانعت کر دی کہ منہ بولے بیٹے کو اس شخص کا بیٹا کہہ کر پکارا جائے، اور حکم دیا کہ اس کو اس کے اصلی باپ کی طرف منسوب کیا جائے۔ اسی سلسلے میں وہ آیات نازل ہوئیں جو اسی سورۃ میں پہلے آچکی ہیں اذْعُوهُمْ **لِأَبَائِهِمْ** (الایہ ان احکام کے نازل ہونے کے بعد صحابہ کرام نے ان کو زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنا چھوڑ دیا اور ان کے والد حارثہ کی طرف منسوب کرنے لگے) ایک لطیفہ پورے قرآن میں انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی بڑے سے بڑے

صحابی کا بھی نام ذکر نہیں کیا گیا۔ بحر: حضرت زید بن حارثہؓ کے۔ اس کی حکمت بعض حضرات نے یہی بیان کی ہے کہ ان کی نسبت ولایت کو بحکمِ شرآنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قطع کیا گیا تو ان کے لئے ایک بہت بڑے اعزاز سے محرومی ہو گئی، اللہ تعالیٰ نے اس کا بدلہ اس طرح کر دیا کہ قرآن میں ان کا نام لے کر ذکر فرما دیا۔ اور لفظ زیدؓ قرآن کا ایک لفظ ہونے کی حیثیت سے اس کے ہر لفظ پر حسب وعدہ حدیث دس نیکیاں نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں ان کا نام جب قرآن میں پڑھا جائے تو صرف ان کا نام لینے پر تیس نیکیاں ملتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کا اکرام فرماتے تھے۔ حضرت صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے جب کبھی کسی شکر میں ان کو بھیجا ہے تو امیر شکر انہی کو بنایا ہے (ابن کثیر)۔
تنبیہ: یہ تھی اسلام میں غلامی کی حقیقت کہ ان کو تعلیم و تربیت دے کر جو صاحب صلاحیت ثابت ہوا اس کو مقتداؤں کا درجہ دیا۔

زید بن حارثہؓ جو ان ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نکاح کے لئے اپنی پھوپھی کی لڑکی حضرت زینب بنت جحشؓ کا انتخاب فرما کر پیغام نکاح دیا۔ حضرت زیدؓ پر چونکہ یہ عرفی عیب لگا ہوا تھا کہ آزاد کردہ غلام تھے۔ حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی عبداللہ بن جحشؓ نے اس رشتہ سے انکار کر دیا کہ ہم باعتبار خاندان و نسب کے ان سے اشرف ہیں۔

اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی مَّا كَانَ لِلْمُؤْمِنِينَ وَلَا الْمُؤْمِنَاتِ الْاِیۡۃ جس میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو کسی کام کا حکم بطور وجوب دیدیں تو اس پر وہ کام کرنا واجب ہو جاتا ہے، اس کو نہ کرنے کا اختیار شرعاً نہیں رہتا اگرچہ فی نفسہ وہ کام شرعاً واجب و ضروری نہ ہو، مگر جس کو آپؐ نے حکم دیدیا اس کے ذمہ لازم و واجب ہو جاتا ہے اور جو ایسا نہ کرے آخر آیت میں اس کو کھلی مگر ایسی فرمایا ہے۔ اس آیت کو حضرت زینبؓ بنت جحشؓ اور ان کے بھائی نے سنا تو اپنے انکار سے باز آ گئے، اور نکاح پر راضی ہو گئے چنانچہ یہ نکاح کر دیا گیا۔ ان کا ہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے ادا کیا۔ جو دس دینار سرخ (جو پونے چار تولہ سونا ہوتا ہے) اور ساٹھ درہم (جس کی پونے سولہ تولہ چاندی ہوتی ہے) اور ایک بار برداری کا جانور اور پورا زنانہ جوڑا اور پچاس مد آٹا، (یعنی تقریباً تینتالیس سیر) اور دس مد (ساڑھے آٹھ سیر) ماشہ) بکچو تھا (ابن کثیر) اس آیت کے نزول کا مشہور واقعہ جمہور مفسرین کے نزدیک یہی حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ بنت جحشؓ کے نکاح کا قصہ ہے (ابن کثیر، قرطبی، مظہری)۔

ابن کثیر وغیرہ مفسرین نے اسی طرح کے دو واقعے اور بھی نقل کئے ہیں۔ ان میں بھی یہ مذکور ہے کہ آیت مذکورہ ان واقعات کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک واقعہ حضرت جلیبٹ کا واقعہ ہے کہ ان کا رشتہ ایک انصاری صحابی کی لڑکی سے کرنا چاہا تو اس انصاری اور ان کے گھر والوں نے اس رشتہ اور نکاح سے انکار کر دیا، جب یہ آیت نازل ہوئی تو سب راضی ہو گئے اور نکاح کر دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے وسعت رزق کی دعا فرمائی۔ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ اللہ نے ان کے گھر میں ایسی برکت دی تھی کہ مدینہ طیبہ کے گھروں میں سب سے زیادہ اُجلا اور بڑا خرچ اس گھر کا تھا، بعد میں حضرت جلیبٹ ایک جہاد میں شہید ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجہیز و تکفین اپنے دست مبارک سے فرمائی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ روایات حدیث میں اُمّ کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط کا منقول ہے (ابن کثیر، قرطبی) اور ان میں کوئی تضاد نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح کے متعدد واقعات ہی نزول آیت کا سبب بنے ہوں۔

نکاح میں نسبی کفو کی رعایت کا حکم اور درجہ

نکاح مذکور میں حضرت زینب بنت جحشؓ اور ان کے بھائی عبد اللہؓ نے جو زید بن حارثہؓ سے نکاح کو ابتداء میں نامنظور کیا تھا، اس کی وجہ ان دونوں میں خاندانی اور نسبی کفارت و مماثلت کا نہ ہونا تھا۔ اور یہ وجہ شرعاً خود مطلوب ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لڑکیوں کا نکاح ان کے کفو میں کرنا چاہئے (جس کی تحقیق آگے آئے گی) اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی کا عذر کیوں مقبول نہ ہوا۔ جواب یہ ہے کہ دینی اعتبار سے کفارت و مماثلت زوجین کی تو لازم و ضروری ہے، کسی مسلمان لڑکی کا نکاح کسی کافر سے باجماع امت حلال نہیں، اگرچہ لڑکی اس پر راضی ہو۔ کیونکہ یہ صرف عورت کا حق نہیں جو اس کی رضا مندی سے ساقط ہو جائے بلکہ حق اللہ اور فریضۃ الہیہ ہے بخلاف نسبی اور مالی کفارت کے کہ وہ لڑکی کا حق ہے اور خاندانی کفارت کے حق میں لڑکی کے ساتھ اس کے اولیا بھی شریک ہیں۔ اگر عاقلہ بالغہ لڑکی مالدار خاندان سے ہونے کے باوجود کسی غریب فقیر سے نکاح پر راضی ہو کر اپنا حق ساقط کر دے تو اس کو اختیار ہے اور خاندانی کفارت میں لڑکی اور اس کے اولیا سب اس حق کو کسی دوسری اہم مصلحت کی خاطر چھوڑ کر کسی ایسے شخص سے نکاح پر راضی ہو جائیں جو نسب اور خاندان کے اعتبار سے ان سے کم درجہ ہے تو ان کو اس

حق ہے۔ بلکہ مصالح دینیہ کے پیش نظر اس حق کو چھوڑ دینا محمود و مطلوب ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع میں اس حق کو نظر انداز کرنے اور مصالح دینیہ کی وجہ سے نکاح کر دینے کا مشورہ دیا۔

اور قرآن کریم کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق اپنی امت کے مرد و زن پر سب سے زیادہ ہے، بلکہ اپنے نفس سے بھی زیادہ ہے جیسا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے اَلَّتَّيْ اَوَّلٰی بِالْمَوْتِ مِنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حق مؤمنین پر ان کے اپنے نفس سے بھی زیادہ ہے، اس لئے حضرت زینبؓ اور عبداللہؓ کے معاملہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی کفارت کے حق کو نظر انداز کر کے زید بن حارثہ سے نکاح منظور کر لینے کا حکم دیدیا تو ان کا فرض تھا کہ اس حکم کے سامنے اپنی رائے اور اپنے نفس کے حقوق کو ترک کر دیتے، اس لئے ان کے انکار پر قرآن کریم کا یہ حکم نازل ہوا۔

رہا یہ معاملہ کہ جب نبی کفارت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قابل رعایت ہے تو خود آپؐ نے اس کی رعایت کیوں نہ فرمائی؟ تو اس کا جواب بھی مذکورہ تقریر سے واضح ہو گیا کہ یہ رعایت دوسری دینی مصالح کے بالمقابل قابل ترک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں متعدد نکاح اسی طرح غیر کفو، میں اسی قسم کی دینی مصالح کی بناء پر کئے گئے، اس کا اصل مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مسئلہ کفارت | نکاح ایک ایسا معاملہ ہے جس میں اگر زوجین کی طبائع میں موافقت نہ ہو تو مقاصد نکاح میں خلل آتا ہے، ایک دوسرے کے حقوق

ادا کرنے میں خلل آتا ہے، باہمی جھگڑے نزاع پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے شریعت میں کفارت یعنی باہمی مماثلت کی رعایت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی اعلیٰ خاندان کا آدمی اپنے سے کم خاندان والے آدمی کو رذیل یا ذلیل سمجھے۔ ذلت و عورت کا اصل مدار اسلام میں تقویٰ اور دینداری ہے، جس میں یہ چیز نہیں اس کو خاندانی شرافت کتنی بھی حاصل ہو اللہ کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں، صرف انتظامی معاملات کو استوار رکھنے کیلئے نکاح میں کفارت کی رعایت کا حکم دیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لڑکیوں کا نکاح ان کے اولیاء ہی کے ذریعہ ہونا چاہئے (یعنی بالغ لڑکی کو بھی یہ مناسب نہیں کہ اپنے نکاح کا معاملہ خود طے کرے، حیار کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام اس کے والدین اور اولیاء

کریں) اور فرمایا کہ لڑکیوں کا نکاح ان کے کفو ہی میں کرنا چاہئے۔ اس حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے، مگر صحابہ کرام کے آثار و اقوال سے اس کی تائید ہو کر حدیث قابل استدلال ہو جاتی ہے۔ امام محمد نے کتاب الآثار میں حضرت فاروق اعظم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں یہ حکم جاری کروں گا کہ کسی بڑے اونچے معروف خاندان کی لڑکی کا نکاح دوسرے کم درجہ والے سے نہ کیا جائے، اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت انسؓ نے بھی اس کی تاکید فرمائی کہ نکاح میں کفایت کی رعایت کی جائے، جو متعدد اسانید سے منقول ہے۔ امام ابن ہمام نے بھی فتح القدیر میں اس کی تفصیل لکھی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ نکاح میں کفایت و مماثلت کی رعایت گرامر دین میں مطلوب ہے تاکہ زوجین میں موافقت رہے، لیکن کوئی دوسری اہم مصلحت اس کفایت سے بڑھ کر سامنے آجائے تو عورت اور اس کے اولیاء کو اپنا یہ حق چھوڑ کر غیر کفو میں نکاح کر لینا بھی جائز ہے۔ خصوصاً جب کہ کوئی دینی مصلحت پیش نظر ہو تو ایسا کرنا افضل و بہتر ہے جیسا کہ صحابہ کرام کے متعدد واقعات سے ثابت ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان واقعات سے اصل مسئلہ کفایت کی نفی نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم

دوسرا واقعہ حضرت زینب بنت جحشؓ کا نکاح باہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو گیا، مگر دونوں کی طبیعتوں میں موافقت نہ ہوئی۔ حضرت زیدؓ ان کی تیز زبانی اور لہجہ شرافت کی بناء پر اپنے کو اونچا سمجھنے اور اطاعت میں کوتاہی کرنے کی شکایت کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ بتلادیا گیا تھا کہ زیدؓ ان کو طلاق دیں گے، اس کے بعد زینبؓ آپ کے نکاح میں آئیں گی۔ ایک روز حضرت زیدؓ نے انہی شکایات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ ان کو طلاق دیدیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ منجانب اللہ یہ علم ہو گیا تھا کہ واقعہ یوں ہی پیش آنے والا ہے، کہ زیدؓ ان کو طلاق دیدیں گے، پھر یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں گی، لیکن دو وجہ سے آپ نے حضرت زیدؓ کو طلاق دینے سے روکا۔ اول یہ کہ طلاق دنیا اگرچہ شریعت اسلام میں جائز ہے مگر پسندیدہ نہیں بلکہ ابغض المباحات یعنی جائز چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض و مکروہ ہے، اور تنگونی طور پر کسی کام کا وقوع تشریعی حکم کو متاثر نہیں کرتا۔ دوسرے قلب مبارک میں یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ اگر انھوں نے طلاق دیدی اور پھر زینبؓ کا نکاح آپ سے ہوا تو عرب اپنے دستور جاہلیت کے مطابق یہ طعن دیں گے کہ اپنے

بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ اگرچہ قرآن نے اس دستور جاہلیت کو سورۃ احزاب کی ہی سابقہ آیات میں ختم کر دیا ہے۔ اس کے بعد کسی مؤمن کے لئے تو اس کے دسوسہ کا بھی خطرہ نہ تھا مگر کفار جو قرآن ہی کو نہیں مانتے وہ اپنی جاہلانہ رسم یعنی منہ پونے بیٹے کو تمام احکام میں حقیقی بیٹے کی طرح سمجھنے کی بنا پر زبان طعن دراز کریں گے۔ یہ اندیشہ بھی حضرت زیدؓ کو طلاق دینے سے منع کرنے کا سبب بنا۔ اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے مجوبانہ عتاب قرآن کی ان آیات میں نازل ہوا: **وَرَادُّ تَقْوَلِ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ، أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ،** یعنی آپ اُس وقت کو یاد کریں جبکہ آپ کہہ رہے تھے اس شخص کو جس پر اللہ نے انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا، مراد اس شخص سے حضرت زیدؓ ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ نے پہلا انعام تو یہ فرمایا کہ ان کو مشرف باسلام کر دیا دوسرے آپ کی صحبت کا شرف عطا فرمایا۔ اور آپ نے ان پر ایک انعام تو یہ کیا کہ ان کو غلامی سے آزاد کر دیا، دوسرا یہ کہ اُن کی تربیت فرما کر ایسا بنا دیا کہ بڑے بڑے صحابہ بھی اُن کی تعظیم کرتے تھے۔ آگے وہ قول نقل کیا جو آپ نے زیدؓ سے فرمایا **أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ**، یعنی اپنی بی بی کو آپ اپنے نکاح میں روکیں، طلاق نہ دیں، اور خدا سے ڈریں۔ خدا سے ڈرنے کا حکم اس جگہ اس معنی میں بھی ہو سکتا ہے کہ طلاق ایک مبغوض و مکروہ فعل ہے اس سے اجتناب کریں، اور اس معنی سے بھی ہو سکتا ہے کہ نکاح میں روکنے کے بعد طبعی منافرت کی وجہ سے ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔ آپ کا یہ فرمانا اپنی جگہ صحیح و درست تھا، مگر منجانب اللہ ہونے والے واقعہ کا علم ہو جانے اور دل میں حضرت زینبؓ سے نکاح کا ارادہ پیدا ہو جانے کے بعد زیدؓ کو طلاق نہ دینے کی نصیحت ایک طرح کی رسمی اظہارِ خیر خواہی کے درجہ میں تھی، جو شانِ رسالت کے مناسب نہ تھی، خصوصاً اس لئے کہ اس کے ساتھ لوگوں کے طعنوں کا اندیشہ بھی شامل تھا اس لئے آیت مذکورہ میں عتاب ان الفاظ میں نازل ہوا کہ آپ دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا۔ جب منجانب اللہ حضرت زینبؓ کے ساتھ آپ کے نکاح کی خبر مل چکی، اور آپ کے دل میں ارادۂ نکاح پیدا ہو چکا تو اس ارادہ کو چھپا کر ایسی رسمی گفتگو جو آپ کی شان کے مناسب نہیں تھی کی۔ اور لوگوں کے طعنوں کے اندیشہ پر فرمایا کہ آپ لوگوں سے ڈرنے لگے، حالانکہ ڈرنا تو آپ کو اللہ ہی سے سزاوار ہوا۔ یعنی جب آپ کو یہ معلوم تھا کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والا ہے

اس کی ناراضی کا اس میں کوئی خوف و خطر نہیں تو پھر محض لوگوں کے طعنوں سے گھبرا کر آپ کے لئے یہ گفتگو مناسب نہیں تھی۔

اس واقعہ کی جو تفصیل اوپر لکھی گئی ہے، یہ سب تفسیر ابن کثیر اور سترطی اور روح المعانی سے لی گئی ہے، اور آیت تَخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اَنْذَرْتُکَ مِنْ یَوْمٍ کی یہ تفسیر کہ وہ چیز جس کو آپ نے دل میں چھپایا تھا وہ یہ ارادہ تھا کہ زیدؓ نے طلاق دیدی تو حکم الہی کے مطابق آپ ان سے نکاح کر لیں گے، یہ تفسیر حکیم ترمذی اور ابن ابی حاتم وغیرہ محدثین نے حضرت علی بن حسین زین العابدینؑ کی روایت سے نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

”یعنی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ اطلاع دیدی تھی کہ حضرت زینبؓ کو زیدؓ طلاق دینے والے ہیں اور اس کے بعد وہ آپ کے نکاح میں آئیں گی“

اَوْحٰی اللّٰهُ تَعَالٰی اِلَیَّہِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ اَنَّ زَیْنَبَ سَیْطَلِّقُہَا زَیْدٌ وَیَنْزَوِجُہَا بَعْدَہٗ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
(روح از حکیم ترمذی)

اور ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کے حوالہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:-

”یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو پہلے ہی بتلادیا تھا کہ حضرت زینبؓ بھی ازواج مطہرات میں داخل ہو جائیں گی، پھر جب حضرت زیدؓ انکی شکایت لیکر آپکی خدمت میں آئے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تو آپ سے بتلادیا تھا کہ میں ان آپ کا نکاح کرادوں گا اور آپ اپنے دل میں اس چیز کو چھپا ہوئے تھے“

اِنَّ اللّٰہَ اَعْلَمُ نَبِیَّہٗ اَنْہَا سَتَكُوْنُ مِنْ اَزْوَاجِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّیْتَرَ وَجْہَہَا فَلَمَّا اَقْبَاہُ زَیْدٌ لَمْ یَشْکُوْہَا اِلَیْہِ فَتَالِیْ اَتٰی اللّٰہَ وَاَمْسٰکَ عَلَیْکَ زَوْجَکَ فَقَالَ اَخْبَرْتُکَ اِنِّیْ مُزَوِّجُکَہَا وَتَخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اَنْذَرْتُکَ مِنْ یَوْمٍ
ما اللّٰہُ مَبْدِیْہِ،

جمہور مفسرین زہری، بکر بن العلام، قشیری، قاضی ابوبکر بن العربی نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے کہ جس چیز کے دل میں چھپانے کا ذکر کیا گیا وہ بوحی الہی ارادہ نکاح تھا، اس کے خلاف جن روایات میں مافیٰ نفس کی تفسیر محبت زینبؓ سے منقول ہے، اس کے متعلق ابن کثیر نے فرمایا کہ ہم نے ان روایات کو ذکر کرنا اس لئے پسند نہیں کیا کہ ان میں کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔

اور خود الفاظ قرآن سے تاہید اسی تفسیر کی ہوتی ہے جو حضرت زین العابدینؑ کی

روایت سے اوپر بیان ہوئی ہے، کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود بتلادیا کہ دل میں چھپائی ہوئی چیز وہ تھی جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو اگلی آیت میں ظاہر فرمایا وہ نکاح ہے حضرت زینبؓ کے ساتھ جیسا کہ فرمایا **وَجَنِّمًا** (۳۲) لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنے کے محمود ہر، جب تک کسی مقصود شرعی پر اثر انداز نہ ہو۔ جو سبب عتاب بنا۔ جواب یہ ہے کہ اس معاملہ میں اصل ضابطہ

جو قرآن و سنت سے ثابت ہے یہ ہے کہ جس کام کے کرنے سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہونے اور ان کے طعن و تشنیع میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو تو لوگوں کے دین کی حفاظت اور ان کو طعن و تشنیع کے گناہ سے بچنے کے نیت سے چھوڑ دینا اس صورت میں تو جائز ہے جب کہ یہ فعل خود مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اور کوئی دینی حکم حلال و حرام کا اس سے متعلق نہ ہو، اگرچہ فعل فی نفسہ محمود ہو۔ اس کی نظیر حدیث و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں جب بیت اللہ کی تعمیر کی گئی تو اس میں کئی چیزیں بنا کر ابراہیمؑ کے خلاف کر دی گئی ہیں اول تو کہ بیت اللہ کا کچھ حصہ تعمیر سے باہر چھوڑ دیا، دوسرے بنا کر ابراہیمؑ میں لوگوں کے بیت اللہ میں داخل ہونے کے لئے دو دروازے تھے، ایک مشرقی جانب میں دوسرا مغربی جانب میں، جس کی وجہ سے بیت اللہ میں داخل ہونے اور نکلنے میں زحمت نہ ہوتی تھی، اہل جاہلیت نے اس میں دو تصرف کئے کہ مغربی دروازہ تو بالکل بند کر دیا اور مشرقی دروازہ جو سطح زمین سے متصل تھا اس کو اتنا اونچا کر دیا کہ بغیر سیڑھی کے اس میں داخلہ نہ ہو سکے، جس سے مقصد یہ تھا کہ وہ جس کو اجازت دیں صرف وہ اندر جاسکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نو مسلم لوگوں کے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بیت اللہ کو پھر بنا کر ابراہیمؑ کے مطابق بنا دیتا۔ یہ حدیث سب کتب معتبرہ میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے اپنا یہ ارادہ جو شرعاً محمود تھا اس کو ترک کر دیا، اور منجانب اللہ اس پر کوئی عتاب نہیں ہوا، جس سے اس عمل کا عند اللہ مقبول ہونا بھی معلوم ہو گیا۔ مگر یہ معاملہ بیت اللہ کتبہ ابراہیمؑ کے مطابق دوبارہ تعمیر کرنے کا ایسا نہیں جس پر کوئی مقصد شرعی موقوف ہو یا جس کے احکام حلال و حرام متعلق ہوں۔

بخلاف واقعہ نکاح زینبؓ کے کہ اس سے ایک مقصد شرعی متعلق تھا کہ جاہلیت کی رسم بد اور اس خیال باطل کی عملی تردید ہو جائے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح حرام ہے۔ کیونکہ قوموں میں چلی ہوئی غلط رسموں کو توڑنا عملًا جب ہی ممکن ہوتا ہے جب اس کا عملی مظاہرہ ہو۔ حکم ربانی اسی کی تکمیل کے لئے حضرت زینبؓ کے نکاح سے متعلق ہوا تھا۔ اس تقریر سے بناء بیت اللہ کے ترک اور نکاح زینبؓ پر بارشاد خداوندی عمل کے ظاہری تعارض کا جواب ہو گیا۔

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی قوی تبلیغ جو سورۃ احزاب کی پہلی آیات میں آچکی ہے اس کو کافی سمجھا، اور اس کے عملی مظاہرہ کی حکمت کی طرف نظر نہیں گئی، اس لئے باوجود علم و ارادہ کے اس کو چھپایا۔ اللہ تعالیٰ نے آیات مذکورہ میں اس کی اصلاح فرمائی، اور اس کا اظہار فرمایا لَا يَكُونُ عَلَى النَّبِيِّ مَنَئِنَ حَرْجٍ فِيْ اَشْرَاجٍ اَدْعِيَا كَيْفَم اِذَا قُضُوْا مِنْكُمْ وَاَوْطَرَا، یعنی ہم نے زینبؓ سے آپ کا نکاح اس لئے کیا تاکہ مسلمانوں پر اس معاملے میں کوئی عملی تنگی پیش نہ آئے، کہ منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ بیویوں سے نکاح کر سکیں۔

اور وَجَنَاحُهَا کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ہم ان کا نکاح آپ سے کر دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو یہ امتیاز بخشا کہ خود ہی نکاح کر دیا جو عام شرائط نکاح سے مستثنیٰ رہا، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں ہم نے اس نکاح کا حکم دیدیا اب آپ شرعی قواعد و شرائط کے مطابق ان سے نکاح کر لیں۔ حضرات مفسرین میں بعض نے پہلے احتمال کو ترجیح دی، بعض نے دوسرے احتمال کو۔

اور حضرت زینبؓ کا دوسری عورتوں کے سامنے یہ فرمانا کہ تمہارا نکاح تو تمہارے والدین نے کیا میرا نکاح خود اللہ تعالیٰ نے آسمان پر کیا، جیسا کہ روایات میں آیا ہے، یہ دونوں صورتوں میں صادق ہے۔ پہلی صورت میں زیادہ واضح ہے اور دوسری صورت... بھی اس کے منافی نہیں۔

شہادت و اعتراضات | سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ تَخْلَوْنَ مِنْ قَبْلُ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا
 کے جواب کی تمہید | مَقْدُورًا، یہ تمہید ہی اس نکاح پر پیش آنے والے شکوک و شبہات کی کہ دوسری ازواج کے ہوتے ہوتے اس نکاح کا اہتمام کس لئے کیا گیا۔ ارشاد فرمایا کہ یہ سنت ہوا اللہ کی جو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ سے پہلے انبیاء میں بھی جاری رہی ہے، کہ بمصالح دینیہ بہت سی عورتوں سے نکاح کی اجازت

دی گئی، جن میں حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام زیادہ معروف ہیں کہ داؤد علیہ السلام کے نکاح میں تنہا اور سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں تین سو بیبیاں تھیں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دینی مصالح سے متعدد نکاح کی اجازت ہوتی اور یہ نکاح بھی ان میں شامل ہے تو کوئی وجہ استبعاد نہیں، نہ یہ شان نبوت و رسالت کے منافی ہے نہ زہد و تقویٰ کے آخری جملے میں یہ بھی فرما دیا کہ نکاح کا معاملہ بھی عام رزق کی طرح منجانب الشرطے شدہ ہو کہ کس کا نکاح کس سے ہوگا، تقدیر ازیلی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اس وجہ میں حضرت زیدؓ اور زینبؓ کے درمیان اختلاف طبائع اور زیدؓ کی ناراضی پھر طلاق دینی کا عزم یہ سب اسی تکوینی اور تقدیری امر کی کڑیاں تھیں۔

آگے ان انبیاء علیہم السلام کی خاص صفات کا ذکر ہے جن کے لئے پچھلے زمانے میں متعدد دیویاں رکھنے کی اجازت اور معلوم ہوتی ہے، فرمایا اَلَّذِيْنَ يَبْلُغُوْنَ رِسَالَتِ اللّٰهِ يَعْزُبُ عَنْهُمْ مَغِيْرٌ مِّمَّنْ لَّدُنْهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (سورۃ احزاب ۳۳: ۳۹) یعنی یہ حضرات انبیاء علیہم السلام سبھی اللہ تعالیٰ کے پیغامات اپنی اپنی امتوں کو پہونچاتے ہیں۔

ایک حکمت شاید اس میں انبیاء علیہم السلام کی کثرت ازدواج کی حکمت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ ان کے تمام اعمال و اقوال امت کو پہونچنا ضروری ہیں، اور مردوں کا ایک بڑا حصہ وقت کا اپنے زمانے مکان میں عورتوں اور بچوں کے ساتھ گزرتا ہے، اس وقت میں جو کوئی وحی نازل ہو یا خود پیغمبر کوئی حکم صادر فرمادیں یا کوئی عمل کریں، یہ سب امت کی امانت ہے جس کو ازدواج ہی کے ذریعہ سے باسکانی امت تک پہونچایا جاسکتا ہے۔ دوسری صورتیں مشکلات سے خالی نہیں، اس لئے انبیاء کے لئے اگر بیبیاں زیادہ ہوں تو ان کی خانگی زندگی کے افعال و اقوال اور ان کی خانگی سیرت عام امت تک پہونچنا سہل ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

دوسری صفت انبیاء علیہم السلام کی یہ بیان کی گئی کہ وَ يَخْشَوْنَ اللّٰهَ وَ لَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ، یعنی یہ حضرات اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں، اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ بمصالح دینیہ اگر ان کو کسی کام کی عملی تبلیغ کا نامو کیا جاتا ہے وہ اس میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے، اگر کچھ لوگ اس پر طعنہ کریں تو اس سے نہیں ڈرتے

ایک اشکال اور جواب یہاں جبکہ تمام زمرہ انبیاء کا یہ حال بیان فرمایا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تو اس سے پہلی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ تَخْشَى النَّاسَ (یعنی آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں)

یہ کس طرح درست ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں انبیاء کا غیر اللہ سے نہ ڈرنا تبلیغ رسالات کے معاملے میں بیان ہوا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوف طعنہ زنی کا ایک ایسے کام میں پیش آیا جو بظاہر ایک دنیوی کام تھا، تبلیغ رسالت سے اس کا تعلق نہ تھا۔ پھر جب آیات مذکورہ سے آپ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ نکاح بھی عملی تبلیغ و رسالت کا ایک جز ہے تو اس کے بعد آپ کو بھی کسی کا خوف طعن و تشنیع مانع عمل نہیں ہوا، اور یہ نکاح عمل میں لایا گیا، اگرچہ بہت سے کفار نے اعتراضات کئے اور آج تک کرتے رہتے ہیں۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ

محمد باپ نہیں کسی کا تمھارے مردوں میں سے لیکن رسول اللہ کا

وَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿۳۰﴾

اور مہر سب نبیوں پر اور ہے اللہ سب چیزوں کا جاننے والا۔

خلاصہ تفسیر

پہلی آیات میں نکاح زینب کا تبلیغ عملی ہونے اور سنتِ انبیاء ہونے کی حیثیت سے محمود ہونا بتلایا گیا تھا، آگے ان معترضین کا جواب ہی، جو اس نکاح کو مذموم سمجھ کر طعنہ زنی کرتے تھے، یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں (یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علاقہ اولاد نہیں رکھتے، جیسا کہ اس آیت میں عام صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا رِجَالُكُمْ یعنی تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ اس میں نسبت عام لوگوں کی طرف کی گئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت قطع کی گئی۔ اس لئے اپنے خاندان کے افراد میں سے کسی مرد کا باپ ہونا اس کے منافی نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ عام اُمت کے لوگوں کے ساتھ آپ کو ایسی اُبوت حاصل نہیں جو کسی دلیل صحیح سے ان کی مطلقہ بیوی کے ساتھ نکاح حرام ہونے کا موجب ہو، لیکن وہاں ایک دوسری قسم کی اُبوت روحانی ضرور حاصل ہے، چنانچہ اللہ کے رسول ہیں (اور ہر رسول روحانی مرتبی ہونے کی وجہ سے اُمت کا روحانی باپ ہوتا ہے، اور اس اُبوت روحانیہ میں اس درجہ کامل ہیں کہ سب رسولوں سے افضل و اکمل

ہیں، چنانچہ آپؐ (سب نبیوں کے ختم پر ہیں) اور جو نبی ایسا ہوگا وہ ابوتِ روحانیہ میں سب سے بڑھ کر ہوگا، کیونکہ آپؐ کی ابوتِ روحانیہ کا سلسلہ قیامت تک چلے گا، جس کے نتیجہ میں آپؐ کی روحانی اولاد سب زیادہ ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ امت کے لئے آپؐ کی ابوتِ جسمانی اور نسبی نہیں ہے، جس سے حرمتِ نکاح متعلق ہوتی ہے بلکہ ابوتِ روحانی ہے۔ اس لئے متبنی بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کوئی قابلِ اعتراض نہیں، بلکہ اس روحانی ابوت کا تقاضا یہ ہے کہ سب لوگ آپؐ پر مکمل اعتماد و اعتقاد رکھیں، آپؐ کے کسی قول و فعل پر شک و شبہ نہ کریں، اور (اگر یہ دوسو سو ہو کہ یہ نکاح ناجائز تو نہیں تھا، لیکن اگر نہ ہوتا تو بہتر ہوتا تاکہ لوگوں کو اعتراض اور طعن کا موقع ہی نہ ملتا تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ) اللہ تعالیٰ ہر چیز کے وجود یا عدم کی مصلحت کو خوب جانتا ہے۔

معارف و مسائل

آیت مذکورہ میں ان لوگوں کے خیال کا رد ہے جو اپنی رسم جاہلیت کے مطابق زید بن حارثہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا کہتے تھے، اور ان کی طلاق کے بعد حضرت زینبؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح پر طعن کرتے تھے، کہ بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ اس کے رد کے لئے یہ کہہ دینا کافی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زید کے باپ نہیں بلکہ زید کے باپ حارثہ ہیں، مگر اس میں مبالغہ اور تاکید کے لئے ارشاد فرمایا مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ يَعْنِي مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ بھی نہیں، تو ایسے شخص پر جس کی اولاد میں کوئی بھی مرد نہ ہو یہ طعن دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے، کہ اس کا کوئی بیٹا ہے، اور اس کی مطلقہ بیوی آپؐ کے بیٹے کی بیوی ہونے کی وجہ سے آپؐ پر حرام ہے۔

اس مضمون کے بیان کے لئے مختصر الفاظ یہ تھے کہ (أَبَا أَحَدٍ مِّنْكُمْ) کہا جاتا، اس کے بجائے قرآن حکیم نے لفظ رَجَال کا اضافہ کر کے اس شبہ کو دور کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو چار فرزندوں کے والد ہیں، تین فرزند حضرت خدیجہؓ سے قاسمؓ، طیبؓ، طاہرؓ ہیں، اور ایک حضرت ماریہ قبطیہؓ سے ابراہیمؓ، کیونکہ یہ سب بچپن ہی میں وفات پا گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی رجال کی حد میں داخل نہیں ہوا، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نزولِ آیت کے وقت آپؐ کا کوئی فرزند نہ تھا۔ قاسمؓ، طیبؓ اور طاہرؓ کی وفات ہو گئی تھی، اور ابراہیمؓ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔

مخالفین کے اعتراض اور طعن کا جواب اسی جملہ سے ہو گیا تھا، مگر آگے دوسرے شبہات کے ازالہ کے لئے فرمایا وَلَٰكِنْ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، حرف لیکن عربی زبان میں اس کام کے لئے آتا ہے کہ پچھلے کلام میں جو کوئی شبہ ہو سکتا تھا اس کو دور کیا جائے۔ یہاں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بیان کیا گیا کہ آپ اُمت کے مردوں میں کسی کے باپ نہیں تو اس پر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ہر نبی در رسول اپنی اُمت کا باپ ہوتا ہے، اس لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے سبھی مردوں کے بلکہ ہر مرد و عورت کے باپ ہیں آپ سے اُلوّت کی نفی گویا نبوت کی نفی ہے۔

اس کا جواب لیکن رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے لفظ سے یہ دیا گیا کہ حقیقی اور نسبی باپ ہونا اور چیز ہے جس پر نکاح کے حلال و حرام کے احکام عائد ہوتے ہیں اور بحیثیت نبوت اُمت کا روحانی باپ ہونا دوسری چیز ہے جس سے یہ احکام متعلق نہیں ہوتے، تو گویا مطلب اس پورے جملے کا یہ ہو گیا کہ آپ اُمت کے مردوں میں سے کسی کے بھی نسبی باپ نہیں، لیکن روحانی باپ سب کے ہیں۔

اس میں ایک دوسرے طعن کا جواب بھی ہو گیا، جو بعض مشرکین نے کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ اَبْتَر (یعنی مقطوع النسل) ہیں۔ یعنی کوئی نرینہ اولاد آپ کی نہیں ہے جس سے نسب چلے، اور آپ کا پیغام آگے بڑھے، چند روز کے بعد ان کا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔ الفاظ مذکور نے یہ واضح کر دیا کہ اگرچہ نسبی اولاد نرینہ آپ کی نہیں لیکن آپ کی رسالت و نبوت کے پیغام کو پھیلانے اور قائم رکھنے اور بڑھانے کے لئے نسبی اولاد کی ضرورت نہیں، اس کے لئے روحانی اولاد کام کیا کرتی ہے۔ اور چونکہ آپ رسول اللہ ہیں، اور رسول اُمت کا روحانی باپ ہوتا ہے، اس لئے آپ پوری اُمت کے روحانی باپ ہونے کی حیثیت سے ہم سب کے زیادہ کثیر الادلاد ہیں۔

یہاں جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کا ذکر آیا، اور اس منصب نبوت میں آپ تمام دوسرے انبیاء سے خاص امتیازی فضیلت رکھتے ہیں تو آگے آپ کی مخصوص شان اور تمام انبیاء علیہم السلام پر آپ کا فائق ہونا اس لفظ سے واضح کیا گیا وَخَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ، لفظ خاتم میں دو قراءتیں ہیں، امام حسنؑ اور عہد کی قراءت خاتم بفتح تاء ہے اور دوسرے ائمہ قراءت خاتم بکسر تاء پڑھتے ہیں۔

حاصل معنی دونوں کا ایک ہی ہے، یعنی انبیاء کو ختم کرنے والے، کیونکہ خاتم خواہ بکسر التاء ہو یا بفتح التاء دونوں کے معنی آخر کے بھی آتے ہیں، اور ختم کے معنی میں بھی

یہ دونوں لفظ استعمال ہوتے ہیں، اور نتیجہ دوسرے معنی کا بھی وہی آخر کے معنی ہوتے ہیں کیونکہ
مہر کسی چیز پر بند کرنے کے لئے آخر ہی میں کی جاتی ہے۔ لفظ خاتم یا کسر والفتح دونوں
کے دونوں معنی لغت عربی میں تمام کتابوں میں مذکور ہیں۔ قاموس، صحاح، لسان العرب
تاج العروس وغیرہ اسی لئے تفسیر روح المعانی میں خاتم بمعنی مہر کا حاصل بھی وہی معنی
آخر کے بتلائے ہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں وَالْخَاتِمُ الرَّسْمُ الَّذِي لَهَا يَخْتَمُّ بِهِ
كَالطَّارِيعِ لَهَا يُطْبَعُ بِهِ فَمَعْنَى خَاتِمِ النَّبِيِّينَ الَّذِي خَتَمَ النَّبِيِّينَ بِهِ وَ
مَا لَهُ الْخَيْرُ النَّبِيِّينَ۔ یہی مضمون تفسیر بیضاوی اور احمدی میں بھی مذکور ہے، اور
امام راغب نے مفردات القرآن میں فرمایا وَخَاتِمُ النَّبِيِّينَ لِأَنَّهُ خَتَمَ النَّبِيَّةَ
أَيَّ تَسْمِيَّهَا بِمَجِيئِهِ، یعنی آپ کو خاتم نبوت اس لئے کہا گیا کہ آپ نے نبوت کو اپنے
تشریف لانے سے ختم اور مکمل کر دیا ہے۔

اور محکم ابن سیدہ میں ہے وَخَاتِمُ كُلِّ شَيْءٍ وَخَاتِمَتُهُ عَاقِبَتُهُ وَآخِرُهُ
یعنی ہر چیز کا خاتم اور خاتمہ اس کے انجام اور آخر کو کہا جاتا ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ قرأت خواہ بفتح تاء کی لی جائے یا بکسر تاء کی، معنی دونوں صورتوں
میں یہ ہیں کہ آپ ختم کرنے والے ہیں انبیاء کے، یعنی سب کے آخر اور بعد میں آپ مبعوث
ہوئے ہیں۔

صفت خاتم الانبیاء ایک ایسی صفت ہے جو تمام کمالات نبوت و رسالت میں
آپ کی اعلیٰ فضیلت اور خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔ کیونکہ عموماً ہر چیز میں تدریجی ترقی
ہوتی ہے، اور انتہا پر پہنچ کر اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور جو آخری نتیجہ ہوتا ہے وہی اصل
مقصود ہوتا ہے، قرآن کریم نے خود اس کو واضح کر دیا ہے اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ
دِينَكُمْ وَانْتَسَتْ عَلَيْكُمْ فَعَمَلِي، یعنی آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے
اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے۔

انبیاء سابقین کے دین بھی اپنے اپنے وقت کے لحاظ سے مکمل تھے، کوئی ناقص
نہ تھا، لیکن کمال مطلق اسی دین مصطفویٰ کو حاصل ہوا جو اولین و آخرین کے لئے حجت
اور قیامت تک چلنے والا دین ہے۔

اس جگہ صفت خاتم النبیین کے اضافہ سے اس مضمون کی بھی اور زیادہ وضاحت
اور تکمیل ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقطوع النسل کہنا جہالت ہے، جبکہ
ساری امت کے باپ ہونے کی حیثیت سے آپ متصف ہیں۔ کیوں کہ لفظ

خاتم النبیین نے یہ بھی بتلادیا کہ آپ کے بعد قیامت تک آنے والی سب نسلیں اور قومیں آپ ہی کی امت میں شامل ہوں گی۔ اس وجہ سے آپ کی امت کی تعداد بھی دوسری امتوں سے زیادہ ہوگی اور آپ کی روحانی اولاد دوسرے انبیاء کی نسبت سے بھی زیادہ ہوگی۔

صفت خاتم النبیین نے یہ بھی بتلادیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اپنی اولاد روحانی یعنی پوری امت پر دوسرے تمام انبیاء سے زائد ہوگی، اور آپ قیامت تک پیش آنے والی ضرورتوں کو واضح کرنے کا پورا اہتمام فرمائیں گے۔ کیونکہ آپ کے بعد کوئی نبی اور کوئی وحی دنیا میں آنے والی نہیں، بخلاف انبیاء سابقین کے کہ ان کو اس کی فکر نہ تھی وہ جانتے تھے کہ جب قوم میں گمراہی پھیلے گی تو ہمارے بعد دوسرے انبیاء آکر اس کی اصلاح کر دیں گے، مگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فکر لاحق تھی کہ قیامت تک امت کو جن حالات سے سابقہ پڑے گا ان سب حالات کے متعلق ہدایات امت کو دے کر جائیں، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث شاہد ہیں کہ آپ کے بعد جتنے لوگ قابل اقتدار آنے والے تھے اکثر ان کے نام لے کر بتلادیا ہے۔ اسی طرح جتنے گمراہی کے علمبردار ہیں ان کے حالات اور پتے ایسے کھول کر بتلادیئے ہیں کہ ذرا غور کرنے والے کو کوئی اشتباہ باقی نہ رہ جائے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اِنِّیْ تَرٰکُمْ کُمْ عَلٰی شَرِّ یَّحْتَفِیْ بِیْضًا وَّ لَیْلًا وَّ نَهَارًا وَّ هَا سَوَاءٌ، یعنی میں تم کو ایسے روشن راستے پر چھوڑا ہوں جس میں رات دن برابر ہیں کسی وقت بھی گمراہی کا خطرہ نہیں اس آیت میں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بصفہ رسول آیا ہے، اس کے لئے بظاہر مناسب یہ تھا کہ آگے ”خاتم الرسل“ یا ”خاتم المرسلین“ کا لفظ استعمال ہوتا، مگر قرآن حکیم نے اس کے بجائے ”خاتم النبیین“ کا لفظ اختیار فرمایا۔

وجہ یہ ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک نبی اور رسول میں ایک فرق ہے۔ وہ یہ کہ نبی تو ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو حق تعالیٰ اصلاح خلق کے لئے مخاطب فرمائیں، اور اپنی وحی سے مشرت فرمائیں، خواہ اس کے لئے کوئی مستقل کتاب اور مستقل شریعت تجویز کریں، یا پہلے ہی کسی نبی کی کتاب و شریعت کے تابع لوگوں کو ہدایت کرنے پر مامور ہو، جیسے حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب و شریعت کے تابع ہدایت کرنے پر مامور تھے۔

اور لفظ رسول خاص اس نبی کے لئے بولا جاتا ہے جس کو مستقل کتاب و شریعت

دی گئی ہو۔ اسی طرح لفظ نبی کے مفہوم میں بہ نسبت لفظ رسول کے عموم زیادہ ہے، تو آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ آپ انبیاء کے ختم کرنے والے اور سب آخر میں ہیں خواہ وہ صاحب شریعت نبی ہوں یا صرف پہلے نبی کے تابع۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کی جتنی قسمیں اللہ کے نزدیک ہو سکتی ہیں وہ سب آپ پر ختم ہو گئیں، آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔

امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں فرمایا

فَهَذِهِ الْآيَةُ فِي أَنَّ لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ
وَإِذَا كَانَ لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ فَهَلَا
رَسُولٌ بِالطَّرِيقِ إِلَّا دُونِي لَأَنَّ
مَقَامَ الرِّسَالَةِ أَخَصُّ مِنْ
مَقَامِ النُّبُوَّةِ فَإِنَّ كُلَّ رَسُولٍ
نَبِيٌّ وَلَا يَنْعَكِسُ بِذَلِكَ وَرَدَتْ
الْأَحَادِيثُ الْمُسَوِّاتُ عَنْ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ مِنْ حَدِيثِ جَمَاعَةٍ
مِنَ الصَّحَابَةِ

”یعنی یہ آیت نص صریح ہے اس عقیدہ کے لئے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں اور جب نبی نہیں تو بدرجہ اولیٰ رسول بھی نہیں، کیونکہ لفظ نبی عام اور لفظ رسول خاص ہے، اور یہ وہ عقیدہ ہے جس پر احادیث متواترہ شاہد ہیں جو صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت کی روایت سے ہم تک پہنچی ہیں“

اس آیت کی لفظی تشریح میں کسی قدر تفصیل سے اس لئے کام لیا گیا کہ ہمارے ملک میں مرزا قادیانی مدعی نبوت نے اس آیت کو اپنے راستہ کی رکاوٹ سمجھ کر اس کی تفسیر میں طرح طرح کی تحریفات اور احتمالات پیدا کئے ہیں، مذکور الصدر تفسیر سے الحمد للہ ان سب کا جواب ہو جاتا ہے۔

مسئلہ ختم نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا اور آپ کا آخری پیغمبر ہونا، آپ کے بعد کسی نبی کا دنیا میں مبعوث نہ ہونا اور ہر مدعی نبوت کا کاذب و کافر ہونا ایسا مسئلہ ہے جس پر صحابہ کرام سے لے کر آج تک ہر دور کے مسلمانوں کا اجماع و اتفاق رہا ہے۔ اس لئے ضرورت نہ تھی کہ اس پر کوئی تفصیلی بحث کی جائے، لیکن قادیانی فرقہ نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے بڑا زور لگایا ہے سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں شائع کر کے کم علم لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے احقر نے اس مسئلہ کی پوری تفصیل ایک مستقل کتاب ”ختم نبوت“ میں لکھ دی ہے، جس میں ایک سو آیات اور

دوسرے زائد احادیث اور سینکڑوں اقوال و آثار سلف و خلف سے اس مسئلہ کو پورا واضح کر دیا ہے، اور قادیانی و جل کے شبہ کا مفصل جواب دیا ہے، یہاں اس میں سے چند ضروری باتیں لکھی جاتی ہیں۔

آپ کا خاتم النبیین ہونا آخر زمانہ میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے منافی نہیں

چونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات اور احادیث متواترہ سے یہ ثابت ہو کہ قیامت سے پہلے آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر دنیا میں تشریف لائیں گے، اور

دجال اعظم کو قتل کریں گے، اور اس وقت ہر مگر ابی کو ختم کریں گے، جس کی تفصیل احقر کے رسالہ التصريح بما تواتر فی نزول المسیح میں مذکور ہے۔

مرزائی قادیانی نے عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان میں اٹھایا جانا اور پھر آخر زمانہ میں تشریف لانا جو قرآن و سنت کی بے شمار نصوص سے ثابت ہیں ان کا انکار کر کے خود مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا، اور استدلال میں یہ پیش کیا کہ اگر حضرت عیسیٰ بن مریم نبی بنی اسرائیل کا پھر دنیا میں آنا تسلیم کیا جائے تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے منافی ہوگا۔

جواب بالکل واضح ہے کہ خاتم النبیین اور آخر النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے بعد کوئی شخص عہدہ نبوت پر فائز نہ ہوگا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ سے پہلے جس کو نبوت عطا ہو چکی ہے اُن کی نبوت سلب ہو جائے گی، یا ان میں سے کوئی اس عالم میں پھر نہیں آ سکتا۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو بھی آپ کی اُمت میں اصلاح و تبلیغ کے لئے آئے گا وہ اپنے منصب نبوت پر قائم ہوتے ہوئے اس امت میں اصلاح کی خدمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہی کے تابع انجام دے گا، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں تصریح ہے۔

امام ابن کثیر نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا:-

”یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے سے یہ مراد ہو کہ وصف نبوت آپ کے بعد منقطع ہو گیا، اب کسی کو یہ وصف اور منصب نہیں ملے گا، اس سے اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا جتنے

والمراد بكونه عليه السلام خاتمهم انقطاع حد وصف النبوة في احد من الثقليين بعد تحليته عليه السلام بهما في هذه النشأة ولا يعقد في ذلك ما اجت عليه الامم

واشتهرت فيه الاخبار ولعلها
بلغت مبلغ التواتر لمعتوى و
نطق به الكتب على قول وجب
الايمان به واكفر منكره
كالفلاسفة من نزول عيسى
عليه السلام اخو الزمان لانه
كان نبيا قبل ان يحل نبينا صلى الله

امت کا اجماع ہے اور قرآن اس پر ظن
ہے اور احادیث رسول جو تقریباً درجہ
تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اس پر شاہد ہیں
وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر
زمانے میں نازل ہوں گے، کیونکہ ان کو
نبوت اس دنیا میں ہمارے نبی صلی اللہ
علیہ وسلم سے پہلے مل چکی تھی۔

عليه وسلم بالنبوة في هذه المشاعة

نبوت کے مفہوم کی تحریف | اس مدعی نبوت نے دعویٰ نبوت کا راستہ ہموار کرنے کے لئے ایک
ظلی اور بروز نبوت کی ایجاد | نئی چال یہ چلی کہ نبوت کی ایک نئی قسم ایجاد کی، جس کا قرآن و سنت
میں کوئی وجود و ثبوت نہیں اور پھر کہا کہ یہ قسم نبوت کی حکم و شرآئی ختم نبوت کے منافی
نہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اس نے نبوت کے مفہوم میں وہ راستہ اختیار کیا جو ہندوؤں
اور دوسری قوموں میں معروف ہو کہ ایک شخص کسی دوسرے کے جنم میں دوسرے کے روپ
میں آسکتا ہے، اور پھر یہ کہا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکمل اتباع کی وجہ
سے آپ کا ہم رنگ ہو گیا ہو اس کا آنا گویا خود آپ ہی کا آنا ہے، وہ درحقیقت آپ ہی
کا ظل اور بروز ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے دعوے سے عقیدہ ختم نبوت متاثر
نہیں ہوتا۔

مگر اوّل تو خود یہ نو ایجاد نبوت اسلام میں کہاں سے آئی، اس کا کوئی ثبوت
نہیں۔ اس کے علاوہ مسئلہ ختم نبوت چونکہ عقائد اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے،
اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مختلف عنوانات سے مختلف اوقات میں ایسا
 واضح کر دیا ہے کہ کسی تحریف کرنے والے کی تحریف چل نہیں سکتی۔ اس جواب کی پوری
تفصیل تو احقر کی کتاب ختم نبوت ہی میں دیکھی جاسکتی ہے، یہاں چند چیزیں بقتلہ
ضرورت پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں تمام کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت
اسناد صحیح کے ساتھ آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء
کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے

ان مثلی و مثل الانبياء من
قبلي كمثل رجل بنى بيتا

فاحسنہ واجملہ الاموضع
لبنتہ من زاویۃ فجعل
الناس یطوفون بہ ویعجبون
لہ ویقولون ہلا وضعت
ہذہ اللبنتۃ وانا خاتم
النبین، رواہ احمد النسائی
والترمذی وفي بعض الفاظہ
فكنت اناسا لدت موضع
اللبنتۃ وختم بی البنیان

ایک مکان بنایا ہوا اور اس کو خوب
مضبوط اور مرتب کیا ہو مگر اس کے ایک
گوشہ میں دیوار کی ایک اینٹ کی جگہ
خالی چھوڑ دی ہو تو لوگ اس کو دیکھنے
کے لئے اس میں چلیں پھریں اور تعمیر
کو پسند کریں مگر سب یہ کہیں کہ اس
مکان بنانے والے نے یہ اینٹ بھی
کیوں نہ رکھ دی جس سے تعمیر بالکل مکمل
ہو جاتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ (قصر نبوت کی) وہ آخری اینٹ میں ہوں، اور بعض الفاظ حدیث
میں ہر کہ میں نے اس خالی جگہ کو پُر کر کے قصر نبوت کو مکمل کر دیا۔

اس تمثیل بلیغ کا حاصل یہ ہر کہ نبوت ایک عالی شان محل کی طرح ہے، جس کے ارکان
انبیاء علیہم السلام ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یہ محل بالکل تیار ہو چکا تھا
اور اس میں صرف ایک اینٹ کے سوا کسی اور قسم کی گنجائش تعمیر میں باقی نہیں تھی، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ کو پُر کر کے قصر نبوت کی تکمیل فرمادی، اب اس میں نہ
کسی نبوت کی گنجائش ہے نہ رسالت کی، اگر نبوت یا رسالت کی کچھ اقسام مان لی جائیں
تو اب ان میں سے کسی قسم کی گنجائش قصر نبوت میں نہیں ہے۔

صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک دوسری حدیث
ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

كانت بنو اسرائيل تسوسهم
الا نبياء كلما هلك نبي خلفه
نبي وانه لا نبي بعدى و
سيكون خلفاء فيكثر و
الحديث

”بنی اسرائیل کی سیاست اور انتظام
خود انبیاء کے ہاتھ میں تھا، جب ایک
نبی کی وفات ہو جاتی تو دوسرا نبی اس
کے قائم مقام ہو جاتا تھا، اور میرے
بعد کوئی نبی نہیں، البتہ میرے خلیفہ
ہوں گے جو بہت ہوں گے“

اس حدیث نے یہ بھی واضح کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیین ہیں
اور آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا، تو امت کی ہدایت کا انتظام کیسے ہوگا؟

اس کے متعلق فرمایا کہ آپ کے بعد امت کی تعلیم و ہدایت کا انتظام آپ کے خلفاء کے ذریعہ سے ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے مقاصد نبوت کو پورا کریں گے، اگر ظلی بردری کوئی نبوت کی قسم ہوتی یا غیر شرعی نبوت باقی ہوتی، تو ضرور تھا کہ یہاں اس کا ذکر کیا جاتا کہ اگرچہ عام نبوت ختم ہو چکی مگر فلاں قسم کی نبوت باقی ہے جس سے اس عالم کا انتظام ہوگا۔

اس حدیث میں صاف واضح الفاظ میں بتلادیا کہ نبوت کی کوئی قسم آپ کے بعد باقی نہیں، اور ہدایت خلق کا کام جو پچھلی امتوں میں انبیاء پر ہی اسرائیل سے لیا گیا تھا، وہ اس امت میں آپ کے خلفاء سے لیا جائے گا۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث مرفوعہ ہے:
لَمْ يَبْقَ مِنَ النَّبُوءَةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ،
”یعنی نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہا،
بجز مبشرات کے۔“

مسند احمد وغیرہ میں حضرت صدیقہ عائشہؓ اور ام کز کعبیہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَا يَبْقَى بَعْدِي مِنَ النَّبُوءَةِ شَيْءٌ
إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ قَالَ أَوَيَا رَسُولَ
اللَّهِ وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ قَالَ الرُّوَا
الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الْمُسْلِمُ أَوْ تَرَى
لَهُ (طرائف) اس حدیث کو صحیح کہا ہے کذا
فی الکنتر

اس حدیث نے کس قدر وضاحت سے بتلادیا کہ نبوت کی کوئی قسم شرعی یا غیر شرعی اور بقول مرزا قادیانی ظلی یا بردری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں، صرف مبشرات یعنی سچے خواب لوگوں کو آئیں گے جن سے کچھ معلومات ہو جائیں گی۔
اور مسند احمد اور ترمذی میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنَّبُوءَةَ قَدْ
انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُولَ بَعْدِي
وَلَا نَبِيٍّ، رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَ
”بیشک رسالت اور نبوت میرے بعد
منقطع ہو چکی ہے، میرے بعد نہ کوئی
رسول ہوگا اور نہ نبی۔“

وقال هذا حديث صحيح

اس حدیث نے واضح کر دیا کہ غیر شرعی نبوت بھی آپؐ کے بعد باقی نہیں، اور ظلی بردری تو نبوت کی کوئی قسم ہی نہیں نہ اسلام میں اس طرح کی کوئی چیز معروف ہے۔ اس جگہ مسئلہ ختم نبوت کی احادیث جمع کرنا مقصود نہیں، وہ تو دوسو سے زیادہ سالہ ختم نبوت میں جمع کر دی گئی ہیں، صرف چند احادیث سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ مرزائی قادیانی نے جو بقاء نبوت کے لئے ظلی اور بردری کا عنوان ایجاد کیا ہے، اول تو اسلام میں اس کی کوئی اصل و بنیاد نہیں، اور بالفرض ہوتی بھی تو ان احادیث مذکورہ نے واضح طور پر یہ تہلاد کہ آپؐ کے بعد نبوت کی کوئی قسم کسی طرح کی باقی نہیں ہے۔

اسی لئے صحابہ کرام سے لے کر آج تک امت مسلمہ کے سب طبقات کا اجماع اس عقیدہ پر رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی کسی قسم کا نبی یا رسول نہیں ہو سکتا، جو دعویٰ کرے وہ کاذب، منکر قرآن اور کافر ہے۔ اور صحابہ کرام کا سب سے پہلا اجماع اسی مسئلہ پر ہوا جس کی رد سے مسئلہ کذاب مدعی نبوت سے خلیفہ اول صدیق اکبر کے عہد میں جہاد کر کے اس کو اور اس کے ماننے والوں کو قتل کیا گیا۔

ائمہ سلف اور علماء امت کے اقوال و تصریحات بھی اس معاملہ میں رسالہ ختم نبوت کے تیسرے حصہ میں بڑی تفصیل سے لکھ دیئے گئے ہیں، اس جگہ چند کلمات نقل کئے جاتے ہیں۔

ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے:

”اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث متواترہ میں خبر دی ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ آپؐ کے بعد جو شخص اس مقام نبوت کا دعویٰ کرے وہ کذاب، مفتری، دجال، گمراہ، گمراہ کرنے والا ہے، اگرچہ وہ کتنی ہی شعبہ بازی کرے اور قسم قسم کے جادو اور طلسم اور نیزنگیاں دکھلائے کہ سب کے سب محال اندر

اخبار اللہ تعالیٰ فی کتابہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی السنۃ المتواترۃ عنہ انہ لا نبی بعدہ لیعلموا ان کل من ادعی ہذا المقام بعدہ فهو کذاب افاک دجال ضال مضل و لوط حرق و شعبذ و اتی با نواع السحر و الطلاسم و النیرنجیات فکلہا محال و ضلال عند

اولی الالباب کما اجری اللہ
سُبْحَانَهُ عَلٰی دِیْنِ الْاَسْوٰ الْعَنِی
بَالِیْمِنِ وَهَیْلَتِ الْکَذٰبِ
بَالِیْهَامَتِ مِنَ الْاَحْوَالِ لِقَاسِدٍ
وَالْاَقْوَالِ الْبَارِئَةِ مَا عَلِمَ کُلُّ
ذِی لُبٍّ وَفَہِمٍّ وَحِجِّیْ اَنْہُمَا
کَاذِبَانِ ضَالَّانِ لَعْنَهُمَا اللّٰہُ
تَعَالٰی وَکَذٰلِکَ کُلُّ مُدْعٍ لِّذٰلِکَ
اِلٰی یَوْمِ الْقِیَمَتِ حَتّٰی یُخْتَمَوْا
بِالْمِیْحِ الدَّجَالِ
(ابن کثیر)

اور گمراہی میں عقل والوں کے نزدیک
جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسود عسی (مدعی
نبوت) کے ہاتھ پر یمن میں اور مسلمہ
کذاب (مدعی نبوت) کے ہاتھ پر یمامہ
میں اس طرح کے حالاتِ فاسدہ
اور بیہودہ اقوال ظاہر کرائے، جن کو
دیکھ کر سن کر ہر عقل و فہم والے نے سمجھ
لیا کہ یہ دونوں کاذب اور گمراہ ہیں،
اللہ ان پر لعنت فرمائے، اسی طرح جو
شخص بھی قیامت تک نبوت کا دعویٰ
کرے وہ کاذب و کافر ہے، یہاں تک کہ

مدعیان نبوت کا یہ سلسلہ میح و جال پر ختم ہوگا۔

امام غزالیؒ نے اپنی کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد میں آیت مذکورہ کی تفسیر اور عقیدہ
ختم نبوت کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں:-

اِنَّ الْاُمَّةَ فَهِمَتْ بِالْاِجْمَاعِ مِنْ
هٰذَا اللَّفْظِ وَمِنْ قَرَائِنِ اَحْوَالِہِ
اَنَّہُمْ فَہِمُوْا عَدْمَ رِنِّیْ بَعْدَہٗ اَبَدًا
وَعَدْمَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اَبَدًا وَاِنَّہُ
لَیْسَ فِیْہِ تَاوِیْلٌ وَلَا تَخْصِیْصٌ
(الاقتصاد، طبع مصر ۱۲۸)

”بیشک امت نے اس لفظ (یعنی خاتم
النبیین اور لائتی بعدی) سے اور قرائنِ احوال
سے باجماع یہی سمجھا ہے کہ آپؐ کے بعد
ابد تک نہ کوئی نبی ہوگا، اور نہ کوئی
رسول، اور یہ کہ نہ اس میں کوئی تاویل
چل سکتی ہے نہ تخصیص۔“

اور قاضی عیاضؒ نے اپنی کتاب شفا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دعویٰ
نبوت کرنے والے کو کافر اور کذاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے والا
اور آیت مذکورہ کا منکر کہہ کر یہ الفاظ لکھے ہیں:-

وَاِجْمَعْتَ الْاُمَّةَ عَلٰی حِمْلِ هٰذَا
الکَلَامِ عَلٰی ظَاہِرِہٖ وَاَنَّ مَقْصُوْدَ
الْمُرَادِ بِهِ دَوْنُ تَاوِیْلِ وَلَا

”امت نے اجماع کیا ہے کہ اس کلام
کو اپنے ظاہر پر محمول کیا جائے اور اس پر
کہ اس آیت کا نفس مفہوم ہی مراد ہے

تخصیص فلا شک فی کفر
هو لاء الطوائف کلمها قطعاً
اجماعاً و سماعاً

بغیر کسی تاویل یا تخصیص کے اس لئے ان
تمام فرقوں کے کفر میں کوئی شک نہیں
رجو کسی مدعی نبوت کی پیروی کریں

بلکہ ان کا کفر قطعی طور سے اجماع امت اور نقل یعنی کتاب و سنت سے ثابت ہے۔
رسالہ ختم نبوت کے تیسرے حصہ میں ائمہ دین اور ہر طبقے کے اکابر علماء کے بہت سے
اقوال جمع کر دیئے گئے ہیں، اور جو یہاں نقل کئے گئے ہیں ایک مسلمان کے لئے وہ بھی کافی ہیں
واللہ اعلم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ۖ (۳۱) وَسَبِّحُوهُ

اے ایمان والو یاد کرو اللہ کی بہت سی یاد - اور پاکی بولتے رہو اس کی

بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۖ (۳۲) هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ

صبح اور شام - وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے

لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ

تاکہ نکالے تم کو اندھیروں سے اُجالے میں، اور ہے ایمان والوں پر

رَحِيمًا ۖ (۳۳) تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ ۚ وَأَعَدَّ لَهُمْ أَجْرًا

مہربان - دعا، ان کی جس دن اس سے ملیں گے سلام ہے، اور تیار رکھا ہے ان کے واسطے

كَرِيمًا ۖ (۳۴) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَهِيدًا وَمُبَشِّرًا

ثواب عزت کا - اے نبی ہم نے تجھ کو بھیجا ہے بتانے والا اور خوش خبری سنانے والا

وَنَذِيرًا ۖ (۳۵) وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۖ (۳۶)

اور ڈرانے والا، اور بلانے والا اللہ کی طرف اس کے حکم سے اور چمکتا ہوا چراغ

وَبَشِيرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ۖ (۳۷) وَلَا تَطِغِ

اور خوش خبری سنانے ایمان والوں کو کہ ان کیلئے ہے خدا کی طرف بڑی بزرگی، اور کہا مت مان

الْكُفْرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعَا أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ كِيلًا ۖ (۳۸)

منکروں کا اور دغا بازوں کا اور چھوڑ دے ان کا ستانا اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ بس ہر کام بنانے والا۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو تم راہِ احساناتِ الہیہ کو عموماً اور ایسے اکمل رسل کی بعثت کے احسان کو خصوصاً یاد کر کے اس کا یہ شکر ادا کرو کہ اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو اور اس میں سب طاعات آگئیں اور اس ذکر و طاعت پر دوام رکھو پس (صبح و شام یعنی علی الدوام) اس کی تسبیح (و تقدیس) کرتے رہو یعنی دل سے بھی اور اعضا سے بھی، اور زبان سے بھی پس جملہ اولیٰ سے عموم اعمال و طاعات کا اور جملہ ثانیہ میں عموم اذمنہ و اوقات کا حاصل ہو گیا یعنی نہ تو ایسا کرو کہ کوئی حکم بجالائے اور کوئی نہ بجالائے، اور نہ ایسا کرو کہ کسی دن کوئی کام کر لیا کسی دن نہ کیا، اور جیسا اس نے تم پر بہت احسان کئے ہیں اور آئندہ بھی کرتا رہتا ہے پس بالضرورۃ مستحق ذکر و شکر ہے، چنانچہ وہ ایسا (رحیم) ہو کہ وہ (خود بھی) اور (اس کے حکم سے) اس کے فرشتے (بھی) تم پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں (اس کا رحمت بھیجتا تو رحمت کرنا ہے اور فرشتوں کا رحمت بھیجتا رحمت کی دعا کرنا ہے) کما قال الذین یحملون العرش (الہی قولہ) و رحمہم السّیّات، اور یہ رحمت بھیجتا اس لئے ہے تاکہ حق تعالیٰ (برکت اس رحمت کے) تم کو رجہالت و ضلالت کی تاریکیوں سے (علم اور ہدایت کے) نور کی طرف لے آئے (یعنی خدائی رحمت اور دعا ملائکہ کی برکت ہو کہ تم کو علم اور ہدایت کی توفیق اور اس پر ثبات حاصل ہے کہ یہ ہر وقت متحدہ ہوتی رہتی ہے) اور (اس سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ مؤمنین پر بہت مہربان ہے (اور یہ رحمت تو مؤمنین کے حال پر دنیا میں ہی اور آخرت میں بھی وہ مورد رحمت ہوں گے، چنانچہ وہ جس روز اللہ سے ملیں گے تو ان کو جو سلام ہو گا وہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ خود ان سے ارشاد فرمائے گا) اَسْلَامٌ عَلَیْکُمْ (کہ اے خود سلام ہی علامت اعزاز کی ہے، پھر جب کہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام ہو کما قال سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَحِیْمٍ اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اہل جنت سے فرمائے گا اَسْلَامٌ عَلَیْکُمْ رواہ ابن ماجہ وغیرہ اور یہ سلام تو روحانی انعام ہے جس کا حاصل اکرام ہے) اور (آگے جسمانی انعام کی خبر بعنوان عام ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان (مؤمنین کے لئے) عمدہ صلہ (جنت میں) تیار کر رکھا ہے کہ ان کے جانے کی دیر ہے، یہ گئے اور وہ ملا، آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہو کہ اے نبی! آپ مٹے چند معترضین کے طعن سے مغموں نہ ہوں، اگر یہ سفہاء آپ کو نہ جانیں تو کیا ہوا ہم نے تو ان بڑی بڑی

نعمتوں اور رحمتوں کا جو کہ خطابِ مؤمنین میں مذکور ہوئی ہیں، آپ ہی کو واسطہ بنایا ہو اور آپ کے مخالفین کی سزا کے لئے خود آپ کا بیان کافی قرار دیا گیا ہو کہ اُن کے مقابلہ میں آپ سے ثبوت نہ لیا جلتے گا، پس اس سے ظاہر ہے کہ آپ ہمارے نزدیک کس درجہ محبوب و مقبول ہیں، چنانچہ ہم نے بے شک آپ کو اس شانِ کارِ رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ قیامت کے روز امت کے اعتبار سے خود سرکاری گواہ ہوں گے کہ آپ کے بیان کے موافق اُن کا فیصلہ ہوگا کما قال اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا مِّمَّا هُمْ عَلٰیہِمْ اور ظاہر ہے کہ خود صاحبِ معاملہ کو دوسرے فریقِ اہلِ معاملہ کے مقابلہ میں گواہ قرار دینا اعلیٰ درجہ کا اکرام اور علو شان ہے جس کی قیامت کے روز ظہور ہوگا اور دنیا میں جو آپ کی صفاتِ کمال ظاہر ہیں وہ یہ ہیں کہ آپ (مؤمنین کے) بشارت دینے والے ہیں اور (کفار کے) ڈرانے والے ہیں اور (عام طور پر سب کو) اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں (اور یہ تبشیر و انذار و دعوتِ تبلیغاتی) اور ایوں خود اپنی ذات و صفات و کمالات و عبادات و عادات و غیرہ مجموعی حالات کے اعتبار سے) آپ (سرمایہ بنوئے ہدایت ہونے میں بمنزلہ) ایک روشن چراغ (کے) ہیں کہ آپ کی ہر حالت طالبانِ انوار کے لئے سرمایہ ہدایت ہے، پس قیامت میں ان مؤمنین پر جو کچھ رحمت ہوگی وہ آپ ہی کی ان صفاتِ بشیر و نذیر و داعی و سراجِ منیر کے واسطہ سے ہی۔ پس آپ اس غم و پریشانی کو الگ کیجئے اور اپنے منصبی کام میں لگئے یعنی مؤمنین کو بشارت دیجئے کہ ان پر اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہونے والا ہے اور اسی طرح کافروں اور منافقوں کو ڈراتے رہئے جس کو ایک خاص عنوان سے تعبیر کیا ہو وہ یہ کہ کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ کیجئے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تو امکان ہی نہ تھا کہ آپ کفار و منافقین کے کہنے میں آکر تبلیغ و دعوت چھوڑ دیں، لیکن لوگوں کی طعن و تشنیع سے بچنے کے لئے ممکن تھا کہ آپ اس عملی تبلیغ میں جو نکاحِ مزینہ کے ذریعہ مقصود تھی کوئی سستی کریں اس کو کفار کا کہنا ماننے سے تعبیر کر دیا گیا) اور ان (کافروں اور منافقوں) کی طرف سے جو (کوئی) ایذا پہونچے (جیسا اس نکاح میں کہ تبلیغ فعلی ہو ایذا قولی پہونچی) اس کا خیال نہ کیجئے اور (فعلی ایذا کا بھی اندیشہ نہ کیجئے) اور اگر اس کا وسوسہ آئے تو اللہ پر بھروسہ کیجئے اور اللہ کافی کارِ ساز ہے، وہ آپ کو ہر ضرر سے بچائے گا اور اگر تبلیغ میں کوئی ظاہری ضرر پہونچتا ہے وہ باطناً نفع ہوتا ہے، وہ وعدہ کفایت و وکالت کے منافی نہیں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم اور آپ کی ایذا رسانی سے بچنے کے لئے ہدایات کے ضمن میں حضرت زید اور زینبؓ کا قصہ اور اس کی مناسبت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا بیان ہوا ہے، آگے بھی آپ کی صفات کمال کا بیان آنے والا ہے۔ اور آپ کی ذات و صفات سب مسلمانوں کے لئے دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہیں، ان کا شکر ادا کرنے کے لئے آیت مذکورہ میں ذکر اللہ کی کثرت کا حکم دیا گیا ہے

ذکر اللہ ایسی عبادت ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا**، حضرت جس کے لئے کوئی شرط نہیں اور اس ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے بندوں پر ذکر اللہ کے سوا کے بکثرت کرنے کا حکم ہے کوئی ایسی عبادت عائد نہیں کی جس کی کوئی خاص حد مقرر نہ ہو، نماز پانچ وقت کی اور ہر نماز کی رکعات متعین ہیں، روزے ماہ رمضان کے متعین اور مستر ہیں، حج بھی خاص مقام پر خاص اعمال مقررہ کرنے کا نام ہے، زکوٰۃ بھی سال میں ایک ہی مرتبہ فرض ہوتی ہے، مگر ذکر اللہ ایسی عبادت ہے کہ نہ اس کی کوئی حد اور تعداد متعین ہے، نہ کوئی خاص وقت اور زمانہ مقرر ہے، نہ اس کے لئے کوئی خاص ہیئت قیام یا نشست کی مقرر ہے، نہ اس کے لئے طاہر اور با وضو ہونا شرط ہے۔ ہر وقت ہر حال میں ذکر اللہ بکثرت کرنے کا حکم ہے، سفر ہو یا حضر، تندرستی ہو یا بیماری خشکی میں ہو یا دریا میں، رات ہو یا دن ہر حال میں ذکر اللہ کا حکم ہے۔

اسی لئے اس کے ترک میں انسان کا کوئی عذر مسموع نہیں، بجز اس کے عقل و حواس ہی نہ رہیں بے ہوش ہو جائے، اس کے علاوہ دوسری عبادات میں بیماری اور مجبوری کے حالات میں انسان کو معذور قرار دے کر عبادت میں اختصار اور کمی یا معافی کی رخصتیں بھی ہیں، مگر ذکر اللہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی شرط نہیں رکھی۔ اس لئے اس کے ترک میں کسی حال کوئی عذر مسموع بھی نہیں، اور اس کے فضائل و برکات بھی بیشمار ہیں

امام احمد نے حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو خطاب کر کے فرمایا کہ کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتلا دوں جو تمہارے سب اعمال سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول ہے، اور تمہارے درجات بلند کرنے والی ہے، اور تمہارے لئے سونے چاندی کے صدقہ و خیرات سے بہتر ہے اور اس سے بھی بہتر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلو اور تمہارا دشمن سے

مقابلہ ہو تم ان کی گردنیں مار دو وہ تمھاری، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کونسی چیز اور کونسا عمل ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذِکْرُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ ”یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد (ابن کثیر)

نیز امام حماد اور ترمذی نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دعا سنی ہے جس کو میں کبھی نہیں چھوڑتا،

وہ یہ ہے:

”یا اللہ مجھے ایسا بنادے کہ میں تیرا شکر	اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ اَعْظَمُ مُشْكُرًا
بہت کروں اور تیری نصیحت کا تابع	وَاتَّبِعُ نَصِيحَتَكَ وَاُكْثِرُ
رہوں اور تیرا ذکر کثرت سے کیا کروں	ذِكْرَكَ وَاَحْفَظُ وَصِيَّتَكَ
اور تیری وصیت کو محفوظ رکھوں“	(ابن کثیر)

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے اس کی دعا کی کہ ذکر اللہ کی کثرت کی توفیق عطا ہو۔

ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اسلام کے اعمال و فرائض و واجبات تو بہت ہیں، آپ مجھے کوئی ایسی مختصر جامع بات بتلا دیں کہ میں اس کو مضبوطی سے اختیار کر لوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

”یعنی تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر	لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا
سے تر و تازہ رہنی چاہئے“	بِذِكْرِ اللّٰهِ تَعَالٰی
	(مسند احمد، ابن کثیر)

اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

”یعنی تم اللہ کا ذکر اتنا کرو کہ دیکھنے	اُذْكُرُوا اللّٰهَ تَعَالٰی حَتّٰی
والے تمہیں دیوانہ کہنے لگیں“	يَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ (ابن کثیر از مسند)

اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ کسی مجلس میں بیٹھیں جس میں اللہ کا ذکر نہ آئے تو قیامت کے روز یہ مجلس ان کے لئے حسرت ثابت ہوگی۔ (رداء احمد، ابن کثیر)

وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا، یعنی اللہ کی پاکی بیان کرو صبح و شام۔ صبح و شام سے مراد یا تو تمام اوقات ہیں، یا پھر صبح و شام کی تخصیص اس لئے ہے کہ ان اوقات

میں ذکر اللہ کی تاکید بھی زیادہ ہے اور برکت بھی۔ ورنہ ذکر اللہ کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص و محدود نہیں ہے۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُہٗ، یعنی جب تم ذکر اللہ کی کثرت کے عادی ہو گئے اور صبح و شام کی تسبیح پر مداومت کرنے لگے تو اس کا اعزاز و اکرام اللہ کے نزدیک یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحمت نازل فرمائے گا اور اس کے فرشتے تمہارے لئے دعا کریں گے۔

آیت مذکورہ میں لفظ صلوٰۃ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے اور فرشتوں کے لئے بھی، لیکن مصداق صلوٰۃ کا الگ الگ ہے۔ اللہ کی صلوٰۃ تو یہ ہے کہ وہ رحمت نازل فرمائے، اور فرشتے خود تو کسی کام پر قادر نہیں ان کی صلوٰۃ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے نزول رحمت کی دعا مانگیں۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ صلوٰۃ اللہ کی طرف سے رحمت ہے اور فرشتوں کی طرف سے استغفار یعنی دعا و مغفرت، اور باہم ایک دوسرے کی طرف سے دعا۔ لفظ صلوٰۃ ان تینوں معنی کے لئے شامل ہے جو عموم مشترک جائز قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک یہ لفظ معنی میں مشترک ہی، اور تینوں مراد ہیں جو عموم مشترک کو قواعد عربیہ کی رُو سے جائز نہیں سمجھتے وہ بطور عموم مجاز کے ان سب معنوں پر لفظ صلوٰۃ کا اطلاق قرار دیں گے۔

تَجِيئَتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَكَ سَلَامٌ، یہ اسی صلوٰۃ کی توضیح و تفسیر ہے جو اللہ کی طرف سے مومن بندوں پر ہوتی ہے، یعنی جس روز یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے ملیں گے تو اس کی طرف سے ان کا اعزاز و ازلی خطاب سلام سے کیا جائے گا یعنی اَسَلَامٌ عَلَيْكُمْ کہا جائے گا۔ اللہ سے ملنے کا دن کو نسا ہو گا ہاں آم راغب وغیرہ نے فرمایا کہ مراد اس سے روز قیامت ہے، اور بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ جنت میں داخلہ کا وقت مراد ہے، جہاں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی سلام پہنچے گا اور سب فرشتے بھی سلام کریں گے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اللہ سے ملنے کا دن موت کا دن قرار دیا ہے کہ وہ دن سائے عالم سے چھوٹ کر صرف ایک اللہ کے سامنے حاضری کا دن ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ملک الموت جب کسی مومن کی رُوح قبض کرنے کے لئے آتا ہے تو اوّل اس کو یہ پیام پہنچاتا ہے کہ تیرے رب نے تجھے سلام کہا ہے۔

اور لفظ لِقَاء ان تینوں حالات پر صادق ہو اس لئے ان اقوال میں کوئی تضاد و تعارض نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سلام تینوں حالات میں ہوتا ہو۔ (روح المعانی) مسئلہ: اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے باہم ایک دوسرے کا تحیہ لفظ اسلام علیکم ہونا چاہیے خواہ بڑی کی طرف سے چھوٹے کے لئے ہو یا چھوٹے کی طرف سے بڑے کے لئے ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَهِيدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا
وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِآذِينِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا، یہ پھر خود ہے

کی خاص صفت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفات کمال اور مناقب کی طرف، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ صفات کا ذکر فرمایا۔ شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ سراج منیر، شاہد سے مراد یہ ہے کہ آپ قیامت کے روز امت کے لئے شہادت دیں گے جیسا کہ صحیح بخاری، نسائی، ترمذی وغیرہ میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے ایک طویل حدیث روایت ہے جس کے بعض جملے یہ ہیں کہ قیامت کے روز نوح علیہ السلام پیش ہوں گے تو ان سے سوال کیا جائے گا کہ کیا آپ نے ہمارا پیغام اپنی امت کو پہنچا دیا تھا وہ عرض کریں گے کہ میں نے پہنچا دیا، پھر ان کی امت پیش ہوگی، وہ اس سے انکار کرے گی کہ ان کو اللہ کا کوئی پیغام پہنچا ہوا۔ اس وقت حضرت نوح علیہ السلام سے پوچھا جائیگا کہ آپ جو پیغام حق پہنچانے کا دعویٰ کرتے ہیں اس پر کوئی آپ کا شاہد بھی ہے؟ وہ عرض کریں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت گواہ ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ گواہی میں امت محمدیہ کو پیش کریں گے، یہ امت ان کے حق میں گواہی دے گی، تو امت نوح علیہ السلام ان پر یہ جرح کرے گی کہ یہ ہمارے معاملہ میں کیسے گواہی دے سکتے ہیں، یہ تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، ہمارے زمانے سے بہت طویل زمانے کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ اس جرح کا جواب امت محمدیہ سے پوچھا جائے گا، وہ یہ جواب دے گی کہ بیشک ہم اس وقت موجود نہیں تھے، مگر ہم نے اس کی خبر اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی، جس پر ہمارا ایمان و اعتقاد ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی امت کے اس قول کی تصدیق کے لئے شہادت لی جائے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شہادت کے ذریعہ اپنی امت کی تصدیق و توثیق فرمائیں گے کہ بیشک میں نے ان کو یہ اطلاع دی تھی۔

اور امت پر شاہد ہونے کا ایک مفہوم عام یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اپنی اُمت کے سب افراد کے اچھے بُرے اعمال کی شہادت دیں گے۔ اور یہ شہادت اس بنا پر ہوگی کہ اُمت کے اعمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر روز صبح و شام اور بعض اوقات میں ہفتہ میں ایک روز پیش ہوتے ہیں، اور آپ اُمت کے ایک ایک فرد کو اس کے اعمال کے ذریعہ پہچانتے ہیں۔ اس لئے قیامت کے روز آپ اُمت کے شاہد بنائے جائیں گے (رواہ ابن المبارک عن سعید بن المسیب، منہجی)

اور مبشر کے معنی بشارت دینے والا، مراد یہ ہے کہ آپ اپنی اُمت کے نیک باشرع لوگوں کو جنت کی خوش خبری سنانے والے ہیں۔ اور مذکور کے معنی ڈرانے والا، مراد یہ ہے کہ آپ اُمت کے لوگوں کو در صورت خلافت درزی و نافرمانی کے عذاب سے ڈرانے والے بھی ہیں۔

داعی الی اللہ سے مراد یہ ہے کہ آپ اُمت کو اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید اور اطاعت کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔ داعی الی اللہ کو باذنیہ کے ساتھ مشروط فرمایا کہ آپ لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیں اور صلائے اللہ ہی کے اذن و اجازت سے ہیں۔ اس قید و شرط کا اضافہ اس اشارہ کے لئے ہے کہ تبلیغ و دعوت کی خدمت سخت دشوار ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اذن اور اعانت کے بغیر انسان کے بس میں نہیں آسکتی۔ سراج کے معنی چراغ اور منیر کے معنی روشن کرنے والا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچویں صفت اس میں یہ بیان فرمائی گئی کہ آپ روشن کرنے والے چراغ ہیں، اور بعض حضرات نے سراج منیر سے مراد قرآن لیا ہے، مگر نسق کلام سے قریب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے۔

بہقی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر منہجی میں فرمایا کہ آپ کی صفت داعی الی اللہ تو ظاہر اور زبان کے اعتبار سے ہے، اور سراج منیر آپ کی صفت آپ کے قلب مبارک کے اعتبار سے ہے کہ جس طرح سارا عالم آفتاب سے روشنی حاصل کرتا ہے اسی طرح تمام مومنین کے قلوب آپ کے نور قلب سے متور ہوتے ہیں اسی لئے صحابہ کرام جنہوں نے اس عالم میں آپ کی صحبت پائی وہ ساری اُمت کے افضل و اعلیٰ قرار پائے۔ کیونکہ ان کے قلوب نے قلب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ عیاناً فیض اور نور حاصل کیا، باقی اُمت کو یہ نور صحابہ کرام کے واسطے سے واسطہ درودا ہو کر پہنچا (انہی کلام) اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تمام انبیاء خصوصاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے گزرنے کے بعد بھی اپنی قبروں میں زندہ ہیں انکی

یہ حیات برزخی عام لوگوں کی حیات برزخی سے بدرجہا زیادہ فائق و ممتاز ہوتی ہو جس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

بہر حال اس حیات کی وجہ سے قیامت تک مومنین کے قلوب آپ کے قلب مبارک سے استفادہ تو رکرتے رہیں گے، اور جو جتنی محبت و تعظیم اور درود و شریف کا زیادہ اہتمام کرے گا اس نور کا حصہ زیادہ پائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کو چراغ سے تشبیہ دی گئی، حالانکہ آپ کا نور باطن آفتاب کے نور سے کہیں زیادہ ہے، آفتاب سے صرف دنیا کا ظاہر روشن ہوتا ہے لیکن آپ کے قلب مبارک سے سارے جہان کا باطن اور مومنین کے قلوب روشن ہوتے ہیں۔ وجہ اس تشبیہ کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ چراغ کی روشنی سے استفادہ خستہ کاری ہے، ہر وقت کر سکتے ہیں، اس تک رسائی بھی آسان ہے، اس کا حاصل کرنا بھی آسان ہے بخلاف آفتاب کے کہ وہاں تک رسائی بھی متعذر ہو اور اس سے استفادہ ہر وقت نہیں کیا جاسکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفات جیسے قرآن میں آئی ہیں قرآن سے پہلے تورات میں بھی مذکور ہیں جیسا کہ امام بخاری نے نقل کیا ہے کہ حضرت عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ میں ایک روز حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے ملا، تو ان سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات تورات میں آئی ہیں وہ مجھے بتلائیے۔ انھوں نے فرمایا بیشک میں بتلاتا ہوں، خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض صفات جو قرآن میں مذکور ہیں وہ تورات میں بھی موجود ہیں، اور فرمایا:-

اے نبی! ہم نے آپ کو بھیجا ہوا شاہد بنا کر
اور بشارت دینے والا اور ڈرنے والا
اور پناہ و حفاظت امین یعنی عرب
کی آپ میرے بندے اور رسول ہیں!
میں نے آپ کا نام متوکل دیا یعنی اللہ
پر بھروسہ کرنے والا رکھا، نہ آپ
تند خو ہیں نہ سخت مزاج اور بازاروں
میں شور مچانے والے، اور آپ بُرائی
کا بدلہ بُرائی سے نہیں دیتے، بلکہ معاف
کر دیتے ہیں، اور آپ کو اللہ تعالیٰ

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَهِيدًا وَمُبَشِّرًا
وَنَذِيرًا وَحُزْنَ لِّلْأُمِّيِّينَ
أَنْتَ عَبْدِي وَرَسُولِي سَمَّيْتُكَ
الْمُتَوَكِّلَ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَائِبٍ
وَلَا سَخَابٍ فِي الْأَسْوَاقِ
وَلَا يَدُ فَعْمٍ السَّيِّئَةِ بِالسَّيِّئَةِ
وَلَكِنْ يَغْفِرُوا وَيُخْفِرُونَ لَنْ يَقْبِضَهُ
اللَّهُ تَعَالَى حَتَّى يُقِيمَ بِهِ الْمِلَّةَ
أَلْعَوْجَاءُ بَانَ يَقُولُوا لَا إِلَهَ إِلَّا
اللَّهُ وَيَفْتَحُ بِهِ أَعْيُنًا عُمَيَّا

اِذَا نَا صَبَّأًا وَّقُلُوبًا غُلْفًا، | و نیا سے اُس وقت تک نہیں واپس
 لائیں گے جب تک کہ آپ کے ذریعہ طرہی اُمت کو سیدھا نہ کر دیں کہ وہ لا الہ الا اللہ
 کہنے لگیں، آپ کے ذریعہ اللہ اندھی آنکھوں، بہرے کاتوں اور بند دلوں کو کھول دے گا،

بنی بنی

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ

اے ایمان والو جب تم نکاح میں لاؤ مسلمان عورتوں کو پھر ان کو چھوڑ دو
 مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَلُونَ وَنَهَايَ
 پہلے اس سے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ سو ان پر تم کو حق نہیں عدت میں بٹھلانا کہ گنتی پوری کراؤ

فَمَتَّعُوهُنَّ وَسَرَخُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝۴۹

سو ان کو دو کچھ فائدہ اور رخصت کرو بھل طرح سے۔

خُلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (تمہارے نکاح کے احکام میں سے تو ایک حکم یہ ہے کہ) جب تم
 مسلمان عورتوں سے نکاح کرو (اور) پھر ان کو قبل ہاتھ لگانے کے (کسی وجہ سے) طلاق
 دیدو تو تمہاری ان پر کوئی عدت (واجب) نہیں جس کو تم شمار کرنے لگو (تا کہ ان کو اس عدت
 میں نکاح ثانی سے روک سکو جیسا کہ عدت واجب ہونے کی صورت میں شرعیہ روکنا جائز
 بلکہ واجب ہے اور جب اس صورت میں عدت نہیں) تو ان کو کچھ (مال، متاع دیدو اور
 خوبی کے ساتھ ان کو رخصت کر دو) اور مومنات کی طرح کتابیات کا بھی یہی حکم ہے،
 آیت میں مومنات کی قید بطور شرط کے نہیں بلکہ ایک ترغیبی ہدایت ہے، کہ مومن کو اپنی
 نکاح میں مسلمان عورت ہی کا انتخاب کرنا بہتر ہے۔

اور ہاتھ لگانا کنایہ ہے صحبت سے خواہ حقیقۃً یا حکماً، جیسے باہم خلوت صحیح ہو جائے
 تو یہ بھی صحبت کے حکم میں ہے، اور صحبت حقیقۃً ہو یا حکماً دونوں صورتوں میں عدت
 واجب ہے۔ کذا فی الہدایہ وغیرہ، اور اگر مہر مقرر ہو چکا ہے تو یہ متاع نصف ہر کی ادائیگی
 ہے۔ اور سراح جمیل یہ ہے کہ ان کو بغیر حق کے نہ روکے، اور جو متاع دنیا واجب ہے

وہ ادا کر دے اور دیا ہوا واپس نہ لے، زبان سے بھی کوئی سخت بات نہ کہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند صفات کمال اور آپ کی مخصوص شان کا ذکر تھا آگے بھی آپ کی ان خصوصیات کا ذکر آنے والا ہے، جو نکاح و طلاق کے معاملات میں آپ کے ساتھ ایک گونہ خصوصیت رکھتی ہیں، اور عام امت کی نسبت سے آپ کو ان میں ایک امتیاز حاصل ہے۔ اس سے پہلے بطور تمہید کے ایک عام حکم متعلقہ طلاق ذکر کیا گیا ہے، جو سب مسلمانوں کے لئے عام ہے۔

آیت مذکورہ میں اس کے متعلق تین احکام بیان کئے گئے ہیں :-

پہلا حکم یہ کہ کسی عورت سے نکاح کر لینے کے بعد خلوت صحیحہ سے پہلے ہی کسی وجہ سے طلاق کی نوبت آجائے، تو مطلقہ عورت پر کوئی عدت واجب نہیں، وہ فوراً ہی دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔ آیت مذکورہ ہاتھ لگانے سے مراد صحبت اور صحبت کا حقیقی یا حکمی ہونا اور دونوں کا ایک حکم ہونا خلاصہ تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے، اور صحبت حکمی خلوت صحیحہ ہو جانا ہے۔

دوسرا حکم یہ ہے کہ مطلقہ عورت کو شرافت اور حسن خلق کے ساتھ کچھ سامان دے کر رخصت کیا جائے، کچھ سامان دے کر رخصت دینا ہر مطلقہ کے لئے مستحب و مسنون ہے اور بعض صورتوں میں واجب ہے۔ جس کی تفصیل خلاصہ تفسیر میں گذر چکی ہے اور سورۃ بقرہ کی آیت لَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوْهُنَّ کے تحت میں گذر چکی ہے، اور ان الفاظ قرآنی میں لفظ متاع اختیار فرمانا شاید اس حکمت سے ہو کہ یہ لفظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے، ہر اس چیز کے لئے جس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس میں عورت کے حقوق واجبہ ہر وغیرہ بھی شامل ہیں کہ اگر اب تک ہیر نہ دیا گیا ہو تو طلاق کے وقت خوش دلی سے ادا کر دیں، اور غیر واجب حقوق مثلاً مطلقہ کو رخصت کے وقت کپڑوں کا ایک جوڑا دے کر رخصت کرنا یہ بھی داخل ہے جو ہر مطلقہ عورت کو دینا مستحب (کذا فی المبسوط والمحیط، روح) اس لحاظ سے متعویٰ ہیں کا صیغہ امر عام ترغیب کے لئے ہے، جس میں واجب اور غیر واجب دونوں قسمیں شامل ہیں (روح)

امام حدیث عبد بن محمد نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ متعویٰ یعنی متاع

سامان دیتا ہر مطلقہ کے لئے، خواہ اس کے ساتھ خلوتِ صحیحہ ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو اور اس کا مہر مقرر ہو یا نہ ہو۔

طلاق کے وقت متعہ | بدائع میں ہے کہ متعہ طلاق سے مراد وہ لباس ہے جو عورت گھر سے نکلنے یعنی لباس کی تفصیل کے وقت ضروری استعمال کرتی ہے۔ اس میں پاجامہ، کرتہ، اور سہنی اور ایک بڑی چادر جو سر سے پاؤں تک بدن کو چھپا سکے شامل ہے۔ اور چونکہ لباس قیمت کے اعتبار سے اعلیٰ، ادنیٰ، اوسط ہر طرح کا ہو سکتا ہے، اس لئے فقہاء نے اس کی یہ تفصیل فرمائی کہ اگر شوہر بیوی دونوں مالدار گھرانوں کے ہیں تو کپڑے اعلیٰ قسم کے دیئے جائیں، اور دونوں غریب ہیں تو کپڑے ادنیٰ درجہ کے دیئے جائیں، اور ایک غریب اور دوسرا مالدار ہی تو اوسط درجہ کا لباس دیا جائے۔ (کذا قال التخصاٹ فی النفقات)

اسلام میں حسن معاشرت | دنیا میں حقوق کی ادائیگی عام طور پر صرف دوستوں عزیزوں کی بے نظیر تعلیم اور زیادہ سے زیادہ عام لوگوں تک محدود رہتی ہے، حسن اخلاق حسن معاشرت کا سارا زور صرف یہیں تک خرچ ہوتا ہے، اپنے مخالف اور دشمن کے بھی حقوق پہچاننا اس کے لئے قوانین وضع کرنا صرف شریعتِ اسلام ہی کا کام ہے۔ اس زمانہ میں اگرچہ حقوقِ انسانیت کی حفاظت کیلئے دنیا میں بہت سے مستقل ادارے قائم کئے گئے ہیں، اور اس کے لئے کچھ ضابطے قاعدے بھی بنائے ہوئے ہیں، اس مقصد کے لئے اقوامِ عالم سے لاکھوں روپیہ کا سرمایہ بھی جمع کیا جاتا ہے، مگر اول تو ان اداروں پر سیاسی مقاصد چھائے ہوئے ہیں۔ جو کچھ مصیبت زدگان کی امداد کی جاتی ہے وہ بھی بے غرض اور ہر جگہ نہیں، بلکہ جہاں اپنے سیاسی مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ اور بالفرض یہ ادارے بالکل صحیح طور پر بھی خدمتِ خلق انجام دیں تو ان کی زیادہ سے زیادہ اس وقت پہنچ ہو سکتی ہے جب کسی خطہٴ زمین میں کوئی عام حادثہ طوفان، دہائی امراض وغیرہ کا پیش آجائے۔ افراد و احاد کی مصیبت و تکلیف کی کس کو خبر ہوتی ہے، کون مرد کو پہنچ سکتا ہے؟ شریعتِ اسلام کی حکیمانہ تعلیم دیکھئے کہ طلاق کا معاملہ ظاہر ہے کہ باہمی مخالفت غصے اور ناراضی سے پیدا ہوتا ہے، اور اس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ جو تعلق انتہائی یگانگت اور محبت و الفت کی بنیاد پر قائم ہوا تھا وہ اب اس کی نفیض بن کر نفرت، دشمنی، انتقامی جذبات کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت مذکورہ اور اسی قسم کی بہت سی آیات نے عین طلاق کے موقع پر جو مسلمان کو ہدایات دی ہیں وہی ایسی ہیں کہ ان میں حسنِ خلق اور حسن معاشرت کا پورا امتحان ہوتا ہے۔ نفس کا تقاضا ہوتا ہے کہ جس عورت نے

ہیں ستایا اذیت دی یہاں تک کہ قطع تعلق پر مجبوری ہوئی اس کو خوب ذلیل کر کے نکالا جائے اور جو انتقام اس سے لیا جاسکتا ہے لے لیا جائے۔

مگر قرآن کریم نے عام مطلقہ عورتوں کے لئے تو ایک بڑی پابندی عدت کی اور ایام عدت کو شوہر کے مکان میں گزارنے کی لگادی۔ طلاق دینے والے پر فرض کر دیا کہ اس مدت کے اندر عورت کو اپنے گھر سے نہ نکالے، اور اس کو بھی پابند کر دیا کہ ایام عدت میں اس گھر سے نہ نکلے۔ دوسرے شوہر پر فرض کر دیا کہ طلاق دیدینے کے باوجود اس زمانہ عدت کا نفقہ بدستور جاری رکھے۔ تیسرے شوہر کے لئے مستحب کیا کہ عدت پوری ہونے کے بعد بھی جب اس کو رخصت کرے تو متاع یعنی لباس دے کر عدت کے ساتھ رخصت کرے، صرف وہ عورتیں جن کے ساتھ صرف نکاح کا بول پڑھا گیا ہے رخصتی اور خلوت و صحبت کی نوبت نہیں آتی وہ عدت سے مستثنیٰ قرار دی گئیں، لیکن ان کے متاع کی تاکید بہ نسبت دوسری عورتوں کے زیادہ کر دی گئی۔ اسی کے ساتھ

تیسرا حکم یہ دیا گیا کہ سَرَّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَبِيْلًا، یعنی ان کو رخصت کر دینی کے ساتھ، جس میں یہ پابندی لگادی گئی کہ زبان سے بھی کوئی سخت بات نہ کہیں، طعن و تشنیع کا طریقہ اختیار نہ کریں۔

مخالفت کے وقت مخالف کے حقوق کی رعایت وہی کر سکتا ہے جو اپنے نفس کے جذبات پر قابو رکھے، اسلام کی ساری تعلیمات میں اس کی رعایت رکھی گئی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الَّتِي آتَيْتَ أَجُورَهُنَّ

اے نبی ہم نے حلال رکھیں تجھ کو تیری عورتیں جن کے ہر تودے چکا ہے،

وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ

اور جو مال ہو تیرے ہاتھ کا جو ہاتھ لگا دے تیرے اللہ اور تیرے چچا کی بیٹیاں

وَبَنَاتِ عَمَّتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَتِكَ الَّتِي هَاجَرْنَ

اور پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالازوں کی بیٹیاں جنھوں نے وطن

مَعَكَ وَأَمْرًا مُّؤَمَّنَةً إِنْ وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ

چھوڑا تیرے ساتھ اور جو عورت ہو مسلمان اگر بخش دے اپنی جان نبی کو اگر نبی

النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ط

چاہے کہ اس کو نکاح میں لاتے، یہ خاص ہے تیرے لئے سوائے سب مسلمانوں کے،

قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ

ہم کو معلوم ہو جو مقرر کر دیا ہو ہم نے ان پر ان کی عورتوں کے حق میں اور ان کے ہاتھ کے مال میں

لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ط وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۵۰

تانا رہے تجھ پر تنگی اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان ۔

تُرْجَى مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْتَى إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ ط وَمَنْ

پیچھے رکھ دے تو جس کو چاہے ان میں سے اور جگہ دے اپنی پاس جس کو چاہے اور جس کو

أَتَغَيَّتْ مِنْ عَزَلَتْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ذَلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ تَقَرَّ

جی چاہے تیرا ان میں سے جن کو کنائے کر دیا تھا تو کچھ گناہ نہیں تجھ پر اس میں قریب ہو کہ ٹھنڈی

أَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَ وَيَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْنَهُنَّ كُلُّهُنَّ ط وَاللَّهُ

رہیں آنکھیں ان کی اور غم نہ کھائیں اور راضی رہیں اس پر جو تو نے دیا ان سب کی سب کو، اور اللہ

يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ط وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا ۵۱ لَا يَحِلُّ

جانتا ہو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہو اور ہے اللہ سب کچھ جاننے والا تحمل والا ۔ حلال نہیں

لَكَ الْبَسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ

تجھ کو عورتیں اس کے بعد اور نہ یہ کہ ان کے بدلے کر لے اور عورتیں

وَلَوْ أَحْبَبْتَ حُسْنَهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ ط وَكَانَ

اگرچہ خوش لگے تجھ کو ان کی صورت مگر جو مال ہو تیرے ہاتھ کا اور ہے

اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ رَقِيبٌ ۵۲

اللہ ہر چیز پر نگہبان ؛ ؛

خلاصہ تفسیر

اے نبی! بعض احکام آپ کے ساتھ مخصوص ہیں جن آپ کا اختصاص اور شرف

سہولت کی رعایت فرماتے ہیں، اور سہل احکام میں بھی کوتاہی ہو جانے پر احیاناً مغفرت فرماتے ہیں جو دلیل غایت رحمت ہی ہو بنا۔ ہے سہولت احکام و رفع حرج کی اور یہ تو بیان تھا ان عورتوں کی اقسام کا جو آپ کے لئے حلال کی گئیں، آگے اس کا بیان ہو کہ جو اقسام حلال کی گئیں ہیں ان میں سے جتنی جس وقت آپ کے پاس ہوں ان کے کیا احکام ہیں ایسے حکم ششم یہ ارشاد ہو کہ (ان میں سے آپ جس کو چاہیں (اور جب تک چاہیں) اپنے سے دور رکھیں (یعنی اس کو باری نہ دیں) اور جس کو چاہیں (اور جب تک چاہیں) اپنے نزدیک رکھیں (یعنی اس کو باری دیں) اور جن کو دور کر رکھا تھا ان میں سے پھر کسی کو طلب کریں تب بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں (مطلب یہ ہوا کہ ازدواج میں شب ناشی کی باری وغیرہ کی رعایت آپ پر واجب نہیں اور اس میں ایک بڑی ضروری مصلحت ہے وہ یہ کہ) اس میں زیادہ توقع ہے کہ ان (بیبیوں) کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی (یعنی خوش رہیں گی) اور آزر وہ خاطر نہ ہوں گی اور جو کچھ بھی آپ ان کو دیدیں گے اُس پر سب کی سب راضی رہیں گی (کیونکہ بناءً بخی کی عادت دعویٰ استحقاق کا ہوتا ہے، اور جب معلوم ہو جائے کہ جو کچھ مال یا توجہ مبذول ہوگی وہ تبرع محض ہی، ہمارا حق واجب نہیں ہو تو کسی کو کوئی شکایت نہ رہے گی، اور لونڈیوں کا حق باری میں نہ ہونا سب ہی کو معلوم ہے) اور (اے مسلمانو!) یہ احکام مختصہ سن کر دل میں یہ خیالات مت پکالینا کہ یہ احکام عام کیوں ہوئے اگر ایسا کرو گے تو خدا تعالیٰ کو تم لوگوں کے دلوں کی سب باتیں معلوم ہیں (ایسا خیال پکالینے پر تم کو سزا دے گا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حسد ہی، جو موجب تعذیب ہی) اور اللہ تعالیٰ (یہی کیا) سب کچھ جاننے والا ہے (اور معترضین کو جو عاجلاً سزا نہیں ہوتی تو اس سے نفی علم لازم نہیں آتی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) بر دبار (بھی) ہے (اس لئے کبھی سزا میں ڈھیل دیتا ہے، آگے بقیہ احکام مختصہ بحضرة الرسالة ارشاد فرماتے ہیں جن میں بعض تو احکام بالا کا نتیجہ ہیں اور بعض جدید ہیں، پس ارشاد ہے کہ اوپر جو حکم سوم و پنجم میں منکوحہ عورتوں میں ہجرت اور ایمان کی قید لگائی ہے سو) ان کے علاوہ اور عورتیں (جن میں یہ قید نہ ہو) آپ کے لئے حلال نہیں ہیں (یعنی اہل قرابت میں سے غیر مہاجرات حلال نہیں اور دوسری عورتوں میں سے غیر مومنات حلال نہیں، یہ تو تتمہ ہوا حکم بالا کا) اور (آگے حکم ہفتم جدید ہو کہ) نہ یہ درست ہے کہ آپ ان (موجودہ) بیبیوں کی جگہ دوسری بیبیاں کر لیں (اس طرح سے کہ ان میں سے کسی کو طلاق دیدیں اور بجائے

ان کی دوسری کر لیں اور یوں بدون ان کے طلاق دیئے ہوئے اگر کسی سے نکاح کر لیں تو اس کی ممانعت نہیں اسی طرح اگر بلا قصد تبدل کسی کو طلاق دیدیں تو اس کی بھی ممانعت ثابت نہیں، بلکہ لفظ تبدل اس مجموعہ کی ممانعت پر دال ہے، پس یہ تبدل ممنوع ہے، اگرچہ آپ کو ان دوسریوں کا حسن اچھا معلوم ہو مگر جو آپ کی مملوکہ ہو کہ وہ حکم پنجم اور ہفتم دونوں سے مستثنیٰ ہے، یعنی وہ کتابیہ ہونے پر بھی حلال ہے، اور اس میں تبدل بھی درست ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کی حقیقت اور آثار و مصالح کا پورا نگران ہے اس لئے ان سب احکام میں مصالحتیں و حکمتیں ہیں گو عام مکلفین کو وہ تعیناً بتلائی جائیں، اس واسطے کسی کو سوال یا اعتراض کا منصب مستحق نہیں۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں نکاح و طلاق وغیرہ متعلق ان شایات احکامات کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہیں۔ اور یہ خصوصیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک امتیازی شان اور خصوصی اعزاز کی علامت ہیں، ان میں سے بعض احکام تو ایسے ہیں کہ ان کی خصوصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بالکل واضح اور جلی ہے اور بعض ایسے ہیں جو اگرچہ سب مسلمانوں کے لئے عام ہیں مگر ان میں کچھ قیدی شرطیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہیں، اب ان کی تفصیل دیکھئے۔

پہلا حکم اِنَّا اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الَّتِي اَمْسَكَتَ اُجُورَهُنَّ، یعنی ہم نے حلال کر دیا آپ کے لئے آپ کی سب موجودہ ازواج کو جن کے ہر آپ نے ادا کر دیئے ہیں، یہ حکم بظاہر سبھی مسلمانوں کے لئے عام ہے، مگر اس میں وجہ خصوصیت یہ ہے کہ نزولِ آیت کے وقت آپ کے نکاح میں چار سے زیادہ عورتیں موجود تھیں اور عام مسلمانوں کے لئے چار سے زائد عورتوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حلال نہیں، تو یہ آپ کی خصوصیت تھی کہ چار سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں رکھنا آپ کے لئے حلال کر دیا گیا۔

اور اس آیت میں جو آئتی اَمْسَكَتَ اُجُورَهُنَّ، فرمایا ہے یہ کوئی قید احترازی یا شرطِ حلت نہیں بلکہ واقعہ کا اظہار ہے کہ جتنی عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں آپ نے سب کا ہر نقد ادا کر دیا اور ہمارے رکھا۔ آپ کی عادت شریفیہ یہ تھی کہ جس چیز کا دینا آپ کے ذمہ عائد ہو اس کو فوراً دیکر سبکدوش ہو جاتے تھے،

بلا ضرورت تاخیر نہ فرماتے تھے۔ اس واقعہ کے اظہار میں عام مسلمانوں کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب ہے۔

دوسرا حکم: وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ، یعنی آپ کے لئے حلال کر دیا ان عورتوں کو جو آپ کی ملک میں ہوں اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کا مالک بنا دیا ہو اس آیت میں لفظ آفاء، فئی سے مشتق ہے۔ اصطلاحی معنی کے لحاظ سے وہ مال جو کفار سے بغیر جنگ کے یا بطور مصالحت کے حاصل ہو جائے، اور کبھی مطلق مال غنیمت کو بھی لفظ فئی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں اس کا ذکر کسی شرط کے طور پر نہیں کہ آپ کے لئے صرف وہ کنیز حلال ہوگی جو مال فئی یا غنیمت میں سے آپ کے حصہ میں آتی ہو، بلکہ جس کو آپ نے قیمت دے کر خرید لیا ہو وہ بھی اس حکم میں شامل ہے۔

لیکن اس حکم میں بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی اختصاص و امتیاز نہیں، پوری امت کے لئے یہ حکم ہے، جو کنیز مال غنیمت سے حصہ میں آئے یا جس کی قیمت دے کر خریدیں وہ ان کے لئے حلال ہے، اور بظاہر سیاق ان تمام آیات کا یہ چاہتا ہو کہ ان میں جو احکام آئے ہیں وہ کچھ نہ کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہوں۔ اسی لئے روح المعانی میں کنیزوں کی حلت سے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت یہ بتلائی ہے کہ جس طرح آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات میں سے کسی کا نکاح کسی امتی سے حلال نہیں۔

اسی طرح جو کنیز آپ کے لئے حلال کی گئی ہے آپ کے بعد وہ کسی کے لئے حلال نہ ہوگی، جیسا کہ حضرت ماریہ قبطیہؓ ہیں جن کو مقوقس بادشاہ روم نے آپ کے لئے بطور ہدیہ بھیجا تھا۔ تو جس طرح آپ کی وفات کے بعد ازواج مطہرات کا نکاح کسی سے جائز نہیں تھا ان کا بھی نکاح کسی سے جائز نہیں رکھا گیا۔ اس لحاظ سے مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ آیتِ غنیمت کے حلال ہونے میں بھی آپ کی ایک خصوصیت ثابت ہو گئی۔

اور سیدی حضرت حکیم الامتہ قدس سرہ نے اور دو خصوصیتیں بیان القرآن میں بیان فرمائی ہیں، جو مذکورہ خصوصیت سے زیادہ واضح ہیں:

اول یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ اختیار خصوصی دیا گیا تھا کہ مال غنیمت کو تقسیم کرنے سے پہلے آپ اس میں سے کسی چیز کا اپنے لئے انتخاب فرمائیں تو وہ آپ کی ملک خاص ہو جاتی تھی، اس خاص چیز کو اصطلاح میں صفی النبی کہا جاتا تھا، جیسا کہ غزوہ خیبر کی غنیمت میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

حضرت صفیہؓ کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا تو ملک یمن کے مسئلہ میں یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دارالحرب سے کسی غیر مسلم کی طرف سے اگر کوئی ہدیہ مسلمانوں کے امیر المؤمنین کے نام پر آئے تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کا مالک امیر المؤمنین نہیں ہوتا بلکہ وہ بیت المال شرعی کی ملک قرار دیا جاتا ہے، بخلاف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ ایسا ہدیہ آپ کے لئے خصوصیت سے حلال کر دیا گیا، جیسا ماریہ قبطیہ کا معاملہ ہے کہ مقوقس نے ان کو بطور ہدیہ تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، تو یہ آپ ہی کی ملک قرار پائیں۔ واللہ اعلم

تیسرا حکم: بَنَتْ عَقِيْلًا وَبَنَتْ عَقِيْلًا الْاِيَةِ، اس آیت میں عقم اور خال کو مفرد اور عمات اور خالات کو جمع لانے کی توجیہات علماء نے بہت لکھی ہیں، تفسیر روح المعانی نے ابو حیان کی اس توجیہ کو اختیار کیا ہے کہ محاورہ عرب کا اسی طرح ہے، اشعار عرب اس پر شاہد ہیں کہ عقم کی جمع استعمال نہیں کرتے مفرد ہی استعمال ہوتا ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ آپ کے لئے چچا اور بھوپھی کی لڑکیاں اور ماموں خالہ کی لڑکیاں حلال کر دی گئیں، چچا بھوپھی میں باپ کے خاندان کی سب لڑکیاں اور ماموں خالہ میں ماں کے خاندان کی سب لڑکیاں شامل ہیں، اور ان سے نکاح کا حلال ہونا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں، سب مسلمانوں کا یہی حکم ہے۔ لیکن ان میں یہ قید کہ انھوں نے آپ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے ہجرت کی ہو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ عام امت کے لئے تو باپ اور ماں کے خاندان کی یہ لڑکیاں بغیر کسی شرط کے حلال ہیں، خواہ انھوں نے ہجرت کی ہو یا نہ کی ہو، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان میں سے صرف وہ حلال ہیں جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو۔ ساتھ ہجرت کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ سفر میں آپ کی معیت رہی ہو یا ایک ہی وقت میں ہجرت کی ہو، بلکہ مراد نفس ہجرت میں معیت و موافقت ہے۔ ان میں سے جس نے کسی وجہ سے ہجرت نہیں کی اس سے آپ کا نکاح حلال نہیں رکھا گیا، جیسا کہ آپ کے چچا ابوطالب کی بیٹی آمنہؓ ہانی نے فرمایا کہ مجھ سے آپ کا نکاح اس لئے حلال نہیں تھا کہ میں نے مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی، بلکہ میرا شمار طلقاء میں تھا۔ طلقاء ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کو فتح مکہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر دیا تھا نہ قتل کیا نہ غلام بنایا۔ (روح وجصاص)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے لئے مہاجرات کی شرط صرف اپنا مال باپ کے خاندان کی لڑکیوں میں تھی، عام امت کی عورتوں میں ہجرت کی شرط نہ تھی، بلکہ ان کا صرف مسلمان ہونا کافی تھا۔ اور خاندان کی لڑکیوں میں ہجرت کی شرط لگانے میں شاید یہ حکمت ہو کہ عموماً خاندان کی لڑکیوں کو اپنے خاندان کا ایک ناز اور فخر ہوتا ہے، اور رسول کی زوجیت کے لئے یہ شایان شان نہیں، اس کا علاج ہجرت کی شرط سے کیا گیا۔ کیونکہ ہجرت صرف وہی عورت کرے گی جو اللہ و رسول کی محبت کو اپنے سارے خاندان اور وطن و جاہ تہداد کی محبت سے غالب رکھے۔ نیز ہجرت کے وقت انسان کو طرح طرح کی تکلیفیں پیش آتی ہیں اور اللہ کی راہ میں جو تکلیف و مشقت اٹھانی جائے اس کو اصلاح اعمال میں خاص دخل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ماں باپ کے خاندان کی لڑکیوں سے نکاح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک خصوصی شرط یہ ہے کہ انھوں نے مکہ سے ہجرت کرنے میں آپ کا ساتھ دیا ہو۔

چوتھا حکم: وَامْرَاةٌ مُّؤْمِنَةٌ اِنَّ وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَسْتَنكِحَهَا خَالِصَةً لِّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ، یعنی اگر کوئی مسلمان عورت اپنے نفس کو آپ کے لئے ہبہ کر دے، یعنی بغیر مہر کے آپ سے نکاح کرنا چاہے، اگر آپ اس سے نکاح کا ارادہ کریں تو آپ کے لئے بلا مہر کے بھی نکاح حلال ہے، اور یہ خاص حکم آپ کے لئے ہے دوسرے مؤمنین کے لئے نہیں۔

اس معاملہ کی خصوصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بالکل واضح ہے کیونکہ عام لوگوں کے لئے نکاح میں مہر شرط لازم ہے، یہاں تک کہ اگر بوقت نکاح کسی مہر کا ذکر نہ ہو یا نفی کے ساتھ آیا کہ عورت نے کہا کہ مہر نہیں لوں گی، یا مرد نے کہا کہ نکاح اس شرط پر کرتے ہیں کہ مہر نہیں دیں گے، دونوں صورتوں میں ان کا کہنا اور شرط شرعی حیثیت سے لغو ہوگی، اور شرعاً مہر مثل واجب ہوگا۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت نکاح بلا مہر حلال کیا گیا ہے جبکہ عورت بلا مہر نکاح کرنے کی خواہش مند ہو۔

فائدہ: یہ حکم کہ جو عورت آپ کے لئے اپنے آپ کو ہبہ کر دے، یعنی بلا مہر کے نکاح کرنا چاہے وہ آپ کے لئے حلال ہے، اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کوئی ایسا واقعہ پیش بھی آیا، نہیں، بعض نے فرمایا کہ کسی ایسی عورت سے رسول اللہ علیہ وسلم کا نکاح کرنا ثابت نہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ نے کسی ہبہ کرنے والی عورت سے نکاح نہیں کیا، اور بعض حضرات نے بعض ایسی عورتوں سے نکاح ہونا ثابت کیا ہے۔ (روح المعانی)

اس حکم کے ساتھ جو جملہ خالصتہً لک کا آیا ہے، اس کو بعض حضرات نے صرف اسی حکم چہارم کے ساتھ مخصوص کہا ہے، اور زنجشیری وغیرہ مفسرین نے اس جملے کو ان تمام احکام کے ساتھ لگایا ہے جو اوپر مذکور ہوئے ہیں، کہ یہ سب خصوصیات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں۔ اس کے آخر میں فرمایا لَکُمُ الْکَیْلَ یَا کُؤْنُ عَلَیْکَ حَرْجٌ، یعنی یہ خصوصی احکام آپ کے لئے اس لئے دیئے گئے ہیں کہ آپ پر کوئی تنگی نہ ہو۔ جو احکام مخصوصہ اوپر بیان ہوئے ہیں ان میں پہلا حکم یعنی چار سے زائد بیبیاں آپ کے لئے حلال کر دینگیں اور حکم چہارم کہ بغیر مہر کے نکاح حلال کر دیا گیا، ان میں تو تنگی کا رفع کرنا اور مزید سہولت دیا جاتا نظر ہے، مگر باقی تین حکم یعنی دوم و سوم اور پنجم ان میں تو بظاہر آپ پر کچھ مزید قیدیں لگا دی گئیں جن سے تنگی اور بڑھتی چاہئے۔ مگر اس میں اشارہ فرمادیا کہ اگرچہ ظاہر میں یہ قیدیں ایک تنگی بڑھاتی ہیں، مگر ان میں آپ کی ایسی مصلحتوں کی رعایت ہے کہ یہ قیدیں نہیں تو آپ کو بڑی تکلیف پیش آتی جو ضیق قلب کا سبب بنتیں، اس لئے قید زائد میں بھی آپ کی تنگی رفع کرنا ہی مقصود ہے۔

پانچواں حکم: جو آیات مذکورہ میں مؤمنہ کی قید سے مستفاد ہوتا ہے یہ کہ اگرچہ عام مسلمانوں کے لئے یہود و نصاریٰ کی عورتوں یعنی کتابیات سے نکاح بنص قرآن حلال ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عورت کا مؤمن ہونا شرط ہے، کتابیات سے آپ کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

ان پانچوں احکام کی خصوصیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیان فرماتے کے بعد عام مسلمانوں کا حکم اجمالاً ذکر فرمایا ہے، قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَیْہِمْ فِیْ اَزْوَاجِہِمْ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُمْ، یعنی احکام مذکورہ آپ کے لئے مخصوص ہیں، باقی مسلمانوں کے نکاح کے لئے جو ہم نے فرض کیا ہے وہ ہم جانتے ہیں، مثلاً عام مسلمانوں کا نکاح بغیر مہر کے نہیں ہو سکتا، اور کتابیات سے ان کا نکاح ہو سکتا ہے اسی طرح سابقہ احکام میں جو قیدیں شرطیں آپ کے نکاح کے لئے ضروری قرار دی گئی ہیں وہ اوروں کے لئے نہیں ہیں۔

آخر میں فرمایا لَکُمُ الْکَیْلَ یَا کُؤْنُ عَلَیْکَ حَرْجٌ، یعنی نکاح کے معاملے میں آپ کے لئے یہ خصوصی احکام اس لئے ہیں کہ آپ پر کوئی تنگی نہ ہو، اور جو قیدیں شرطیں آپ پر بہ نسبت دوسرے مسلمانوں کے زائد لگائی گئی ہیں اگرچہ بظاہر وہ ایک قسم کی تنگی ہے مگر جن مصالح اور حکمتوں کے پیش نظر آپ کے لئے یہ شرطیں لگائی ہیں ان میں

غور کریں تو وہ بھی آپ کی روحانی پریشانی اور تنگ دلی کو دور کرنے ہی کے لئے ہیں۔ یہاں تک نکاح کے متعلق پانچ احکام آئے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی نہ کوئی خصوصیت رکھتے ہیں۔ آگے دو حکم اپنی پانچ احکام سے متعلق بیان فرمائیں مثلاً چھٹا حکم: **مَنْ دَخَلَ مِنْ نِسَاءِ مَنْ تَزَوَّجَ إِلَيْكَ مِنْ نِسَاءِ مَنْ تَزَوَّجَ، إِرْجَاءَ** سے مشتق ہے، جس کے معنی مؤخر کرنے کے ہیں، اور تَوَّجَ، ایوار سے مشتق ہے جس کے معنی قریب کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کو اختیار ہے کہ ازواج مطہرات میں سے جس کو چاہیں مؤخر کر دیں جس کو چاہیں اپنے قریب کریں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص حکم ہے، عام امت کے لوگوں کے لئے جب متعدد بیویاں ہوں تو سب میں برابری کرنا ضروری ہے، اس کے خلاف کرنا حرام ہے۔ برابری سے مراد نفقہ کی برابری اور شب باشی میں برابری ہے کہ جتنی راتیں ایک بیوی کے ساتھ گزاریں اتنی دوسری اور تیسری کے ساتھ گزارنا چاہئے، کمی بیشی ناجائز ہے۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاملے میں مکمل اختیار دیدیا گیا سب ازواج میں برابری کے حکم سے مستثنیٰ کر دیا گیا، اور آخر آیت میں یہ بھی اختیار دیدیا کہ جس بی بی سے ایک مرتبہ اجتناب کا ارادہ کر لیا پھر اگر چاہیں تو اس کو پھر قریب کر سکتے ہیں، **وَمِنْ أَتَخَيَّرْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ** کا یہی مطلب ہے۔

حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعزاز بخشا کہ ازواج مطہرات میں برابری کرنے کے حکم سے مستثنیٰ فرما دیا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس استثناء و اجازت کے باوجود اپنے عمل میں ہمیشہ برابری کرنے کا التزام ہی فرمایا۔ امام ابو بکر جصاصؓ نے فرمایا کہ حدیث کی روایت یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے نزول کے بعد بھی ازواج مطہرات میں برابری کی رعایت ہمیشہ رکھتے تھے، پھر انسانی اسناد کے ساتھ حضرت صدیقہ عائشہؓ سے یہ حدیث نقل کی جو مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابوداؤد وغیرہ میں بھی موجود ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب ازواج میں برابری فرماتے تھے اور یہ عار کیا کرتے تھے کہ یا اللہ جس چیز میں میرا اختیار ہو اس میں تو میں برابری کر لی یعنی نفقہ اور شب باشی وغیرہ میں، مگر جس میں میرا اختیار نہیں اس میں

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْسِمُ فَيَعْدِلُ فَيَقُولُ اللَّهُمَّ هَذَا أَقْسَمِي فِيمَا أَمْلِكُ فَلَا تُلْزِمْنِي فِيمَا لَا أَمْلِكُ قَالَ أَبُو دَاوُدَ يَعْنِي الْقَلْبَ

اور صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ ہی کی روایت ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی بی بی کی نوبت میں ان کے یہاں جانے سے کوئی عذر ہو تو آپ اس سے اجازت لیتے تھے، جب کہ یہ آیت بھی نازل ہو چکی تھی، تَعْرِجُ أَكِيْلَكَ الْاَيَّة (جس میں — بیویوں میں برابری کرنے کا فرض آپ سے معاف کر دیا گیا)۔

یہ حدیث بھی سب کتب حدیث میں معروف ہے، کہ مرض و فوات میں جب آپ کو ازواجِ مطہرات کے گھروں میں روزانہ منتقل ہونا مشکل ہو گیا تو آپ نے سب سے اجازت حاصل کر کے حضرت صدیقہ عائشہؓ کے بیت میں بیماری کے دن گزارنا اختیار فرمایا تھا۔

انبیاء علیہم السلام خصوصاً سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہی تھی کہ جن کاموں میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی رخصت آپ کی آسانی کے لئے دی جاتی تھی تو اس کی شکر گزاری کے طور پر آپ عموماً عزیمت پر عمل کرتے اور رخصت کو صرف ضرورت کے وقت استعمال فرماتے تھے۔

ذَلِكَ اَدْنٰى اَنْ تَقْرَءَ عَلَيْهِمْ وَلَا يَخْرُجُ وَيَرْضٰى الْاَيَّة یہ حکم ششم یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ازواجِ مطہرات میں برابری کی فرضیت کا اٹھا دینا اور آپ کو ہر طرح کا اختیار دیدینا، اس کی علت و حکمت کا بیان ہے آپ کو یہ عام اختیار دینے کی مصلحت یہ ہے کہ سب ازواجِ مطہرات کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ اپنے حصہ پر راضی رہیں۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ حکم تو بظاہر ازواجِ مطہرات کی مرضی اور منشا کے خلاف اور ان کے رنج کا سبب ہو سکتا ہے، اس کو ازواج کی خوشی کا سبب کیسے قرار دیا گیا؟ اس کا جواب خلاصہ تفسیر میں اوپر آچکا ہے کہ دراصل ناراضی کا اصل سبب انما استحقاق ہوتا ہے، جس شخص کے متعلق انسان کو یہ معلوم ہو کہ میرا فلاں حق اس کے ذمہ واجب ہے، اگر وہ اس کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو رنج و غم پیش آتا ہے اور جس شخص پر ہمارا کوئی حق واجب نہ ہو پھر وہ جو کچھ بھی ہربانی کرے وہ خوشی ہی خوشی ہوتی ہے، یہاں بھی جب یہ بتلا دیا گیا کہ ازواج میں برابری کرنا آپ پر واجب نہیں، بلکہ آپ مختار ہیں تو اب جس بی بی کو جتنا حصہ بھی آپ کی توجہ اور صحبت کا ملے گا، وہ اس کو ایک احسان و تبرع سمجھ کر خوش ہوگی۔

آخر میں فرمایا وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا نَّصِيْحًا

یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اور وہ بڑے علم والا بڑے حلم والا ہے۔ آیات مذکورہ میں اوپر سے یہاں تک ان احکام کا ذکر چلا آتا ہے جو دربارہ نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی طرح کی خصوصیت رکھتے ہیں، آگے بھی ایسے ہی بعض احکام کا بیان آرہا ہے، درمیان میں یہ آیت کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کا حال جانتا ہے اور علیم حلیم ہے، بظاہر ماقبل اور مابعد سے کوئی جوڑ نہیں رکھتا۔ روح المعانی میں فرمایا کہ احکام مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے چار سے زیادہ ازواج کی اجازت اور بلا ہر کے نکاح کی اجازت سے کسی کے دل میں شیطانی وساوس پیدا ہو سکتے تھے، اس لئے درمیان میں اس آیت نے یہ ہدایت دیدی کہ مسلمان اپنے دلوں کی ایسے وساوس سے حفاظت کریں، اور اس پر ایمان کو پختہ کریں کہ یہ سب خصوصیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں جو بہت سی حکمتوں اور مصالح پر مبنی ہیں، نفسانی خواہشات کی تکمیل کا یہاں گذر نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعداء اسلام نے ہمیشہ مسئلہ تعدد ازواج اور خصوصیت کی زایدانہ زندگی اور اس کے ساتھ تعدد ازواج کا مسئلہ

مخالفت میں موضوع بحث بنایا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کو سامنے رکھا جائے تو کسی شیطان کو بھی شان رسالت کے خلاف وسوسہ پیدا کرنے کی گنجائش نہیں رہتی جس سے ثابت ہے کہ آپ نے سب سے پہلا نکاح پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے کیا، جو بیوہ سن رسیدہ صاحب اولاد اور دو شوہروں کے نکاح میں رہنے کے بعد آئی تھیں، اور پچاس سال کی عمر تک صرف اسی ایک سن رسیدہ بیوی کے ساتھ شباب کا پورا زمانہ گزارا۔ یہ پچاس سالہ دورِ عمر مکہ کے لوگوں کے سامنے گزرا۔ چالیس سال کی عمر میں اعلان نبوت کے بعد شہر میں آپ کی مخالفت شروع ہوئی، اور مخالفین نے آپ کے ستانے اور آپ پر عیب لگانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ساحر کہا، شاعر کہا، مجنون کہا، مگر کبھی کسی دشمن کو بھی آپ کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرنے کا موقع نہیں مل سکا، جو تقویٰ و طہارت کو مشکوک کر سکے۔

پچاس سال عمر شریف کے گزرنے اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضرت سودہؓ نکاح میں آئیں یہ بھی بیوہ تھیں۔

ہجرت مدینہ اور عمر شریف چوں سال ہو جانے کے بعد سلسلہ ہجری میں حضرت صدیقہ عائشہؓ کی رخصتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ہوئی۔ اس کے ایک سال بعد حضرت حفصہؓ سے اور کچھ دنوں کے بعد حضرت زینب بنت خزیمہ سے نکاح ہوا۔ یہ

حضرت زینبؓ چند ماہ کے بعد وفات پا گئیں۔ سلسلہ ہجری میں حضرت ام سلمہؓ جو صاحبہ اولاد بیوہ تھیں آپ کے نکاح میں آئیں۔ سلسلہ ہجری میں حضرت زینب بنت جحش سے حکم خداوندی نکاح ہوا، جس کا ذکر سورۃ احزاب کے شروع میں آچکا ہے۔ اُس وقت آپ کی عمر شریف اٹھاون سال تھی۔ آخری پانچ سال میں باقی ازواجِ مطہراتؓ آپ کے حرم میں داخل ہوئیں۔ پیغمبر کی خانگی زندگی اور گھریلو معاملات سے متعلق احکام دین کا ایک بہت بڑا حصہ ہوتے ہیں۔ ان نوازدواجِ مطہرات سے جس قدر دین کی اشاعت ہوئی اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف حضرت صدیقہ عائشہؓ سے دو ہزار دوسو دس احادیث اور حضرت ام سلمہؓ سے تین سو اڑسٹھ احادیث کی روایت معتبر کتب حدیث میں جمع ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ نے جو احکام و فتاویٰ لوگوں کو بتلاتے ان کے متعلق حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے، دوسو سے زیادہ حضرات صحابہ حضرت صدیقہ عائشہؓ کے شاگرد ہیں، جنہوں نے حدیث اور فقہ و فتاویٰ ان سے سیکھے ہیں۔

اور بہت سی ازواج کو حرمِ نبویؐ میں داخل کرنے میں ان کے خاندان کو اسلام کی طرف لانے کی حکمت بھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اس اجمالی نقشہ کو سامنے رکھیں تو کیا کسی کو یہ کہنے کی گنجائش رہ سکتی ہے کہ یہ تعدد اور کثرت ازواج معاذ اللہ کسی نفسانی اور جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے ہوا تھا، اگر یہ ہوتا تو ساری عمر تخریب و یا ایک بیوہ کے ساتھ گزارنے کے بعد عمر کے آخری حصہ کو اس کام کے لئے کیوں منتخب کیا جاتا۔ یہ مضمون پوری تفصیل کے ساتھ، نیز اصل مسئلہ تعدد ازواج پر شرعی اور عقلی فطری اور اقتصادی حیثیت سے مکمل بحث معارف القرآن جلد دوم سورۃ نساء کی تیسری آیت کے تحت میں آچکی ہے وہاں دیکھا جائے (معارف جلد دوم، ص ۲۸۵ تا ۲۹۲)

ساتواں حکم: لَا يَجِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ أَنْ تَكُونَ مِنْ بَعْدِ مِرِّ
ازواج و نساؤک تجب لک من بعد ذلک، یعنی اس کے بعد آپ کے لئے دوسری عورتوں سے نکاح حلال نہیں، اور یہ بھی حلال نہیں کہ موجودہ ازواج میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری بدلیں۔

اس آیت میں لفظ مِنْ بَعْدِ کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ مِنْ بَعْدِ سے مراد یہ کہ بعد اُن نو عورتوں کے جو اس وقت آپ کے نکاح میں ہیں، اور کسی سے آپ کا نکاح حلال نہیں، بعض صحابہ اور ائمہ تفسیر سے بھی یہی تفسیر منقول ہے، جیسا کہ حضرت انسؓ نے

فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو اختیار دیا کہ دنیا طلبی کے لئے آپ سے جدائی اختیار کریں یا پھر تنگی و فراخی جو کچھ پیش آئے اس پر قناعت کر کے آپ کی زوجیت میں رہیں تو سب ازواج مطہرات نے اپنے نفقہ کی زیادتی کے مطالبہ کو چھوڑ کر اسی حال میں زوجیت کے اندر رہنا اختیار کیا تو اس پر بطور انعام کے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات گرامی کو بھی اپنی نوا ازواج کے لئے مخصوص کر دیا، ان کے سوا کسی سے نکاح جائز نہ رہا (رواہ البیہقی فی سننہ کذا فی الروح)۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو آپ کے لئے مخصوص فرما دیا کہ آپ کے بعد بھی وہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتیں، اسی طرح آپ کو بھی ان کے لئے مخصوص فرما دیا کہ آپ ان کے علاوہ اور کوئی نکاح نہیں کر سکتے حضرت عکرمہؓ سے بھی ایک روایت میں یہی تفسیر منقول ہے۔

اور حضرت عکرمہؓ، ابن عباسؓ اور مجاہد ائمہ تفسیر سے ایک روایت میں لفظ مِنْ بَعْدِ کی یہ تفسیر نقل کی گئی ہے کہ مِنْ بَعْدِ الْأَصْنَافِ الثَّمَنِيَّةِ كَوْرَمَةٍ یعنی شروع آیت میں آپ کے لئے جتنی اقسام عورتوں کی حلال کی گئی ہیں، اس کے بعد یعنی ان کے سوا کسی اور قسم کی عورتوں سے آپ کا نکاح حلال نہیں۔ مثلاً شروع آیت میں اپنے خاندان کی عورتوں میں سے صرف وہ حلال کی گئیں جنہوں نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ ہجرت کرنے میں آپ کی موافقت کی تھی، خاندان کی عورتوں میں غیر مہاجرات سے آپ کا نکاح حلال نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح مؤمنہ کی قید لگا کر آپ کے لئے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح ناجائز قرار دیدیا گیا۔ تو آیت کے جملہ مِنْ بَعْدِ کا مطلب یہ ہے کہ جتنی قسمیں آپ کے لئے حلال کر دی گئی ہیں صرف انہی میں سے آپ کا نکاح ہو سکتا ہے، عوام عورتوں میں تو مسلمان ہونا ہی شرط ہے اور خاندان کی عورتوں میں مسلمان ہونے کے ساتھ مہاجرہ ہونا بھی شرط ہے۔ جن میں یہ دو شرطیں موجود نہ ہوں، ان سے آپ کا نکاح حلال نہیں۔ اس تفسیر کے مطابق یہ جملہ کوئی نیا حکم نہیں، بلکہ پہلے ہی حکم کی تاکید و توضیح ہے، جو شروع آیت میں بیان ہوا ہے۔ اور اس آیت کی وجہ سے نو کے بعد کسی اور عورت سے نکاح حرام نہیں کیا گیا، بلکہ غیر مؤمنہ اور خاندان کی غیر مہاجرہ سے نکاح ممنوع ہوا ہی، جو پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے، باقی عورتوں سے مزید نکاح آپ کے اختیار میں رہا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک روایت سے بھی اس دوسری تفسیر کی تائید ہوتی ہے، کہ آپ کیلئے مزید نکاح کرنے کی اجازت رہی ہے۔ واللہ اعلم

وَلَا أَنْ تَبْدُلَ مِنْ آرْوَاحٍ، آیت مذکورہ کی اگر دوسری تفسیر اختیار کی جائے تو اس جملے کا مطلب واضح ہے کہ اگرچہ آپ کو موجودہ ازواج کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح بشرائط مذکورہ جائز ہے، مگر یہ جائز نہیں کہ ایک کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری کو بدلیں یعنی خالص تبدیلی کی نیت سے کوئی نکاح جائز نہیں، بغیر لحاظ و نیت تبدیلی کے جتنے چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔

اور اگر آیت مذکورہ کی پہلی تفسیر مراد لی جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ آئندہ نہ کسی عورت کا اضافہ موجودہ ازواج میں آپ کر سکتے ہیں، اور نہ کسی کی تبدیلی کر سکتے ہیں، کہ اس کو طلاق دے کر اس کے قائم مقام کسی اور عورت سے نکاح کر لیں۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ

اے ایمان والو! مت جاؤ نبی کے گھروں میں مگر جو تم کو حکم

دے کہ تم اس گھر میں داخل ہو۔ وَلَكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا

لیکن اگر تم کو بلائے جائے، لیکن جب تم کو بلائے تب جاؤ

فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مَسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَلِكُمْ

پھر جب کھا چکو تو آپ کو چلے آؤ اور نہ آپس میں جی لگا کر بیٹھو باتوں میں، اس بات سے تمہاری

حاجت یُوْذَى النَّبِيِّ فَيَسْتَجِیْ مِنْكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَجِیْ مِنْ أَحَدٍ سِوَاكُمْ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُ

تکلیف تھی نبی کو پھر تم سے شرم کرتا ہی اور اللہ شرم نہیں کرتا ٹھیک بات بلائے میں اور جب مانگے جاؤ

مَتَا سَأَلْتُمُوهُ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقَوْلِكُمْ

بسیوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پیرے کے باہر سے، اس میں خوب ستھرائی ہے تمہارے دل کو

وَقُلُوبِكُمْ بِهِنَّ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ

اور ان کے دل کو اور تم کو نہیں پہنچتا کہ تمہاری طرف سے رسول کو اور نہ یہ کہ نکاح

تَنْكِحُوا أَنْسَاءَهُ مِنْ بَعْدِهَا أَبَدًا إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ

کرو اس کی عورتوں سے اس کے پیچھے کبھی، البتہ یہ تمہاری بات اللہ کے یہاں بڑا

عَظِيمًا ۵۳) اِنْ تَبَدُّوا شَيْئًا وَتَحْفَوْهُ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ

گناہ ہے۔ اگر کھول کر کہو تم کسی چیز کو یا اس کو چھپاؤ سو اللہ ہے ہر چیز کو

شَيْءٍ عَلَيْهِمَ ۵۴) لَا جُنَاحَ عَلَيْهِمْ فِي آبَائِهِمْ وَلَا أَبْنَائِهِمْ

جانے والا۔ گناہ نہیں ان عورتوں کو سامنے ہونے کا اپنی باپوں سے اور نہ اپنے بیٹوں سے

وَلَا إِخْوَانِهِمْ وَلَا أَبْنَاءَ إِخْوَانِهِمْ وَلَا أَبْنَاءَ أَخَوَاتِهِمْ

اور نہ اپنے بھائیوں سے اور نہ اپنے بھائی کے بیٹوں سے اور نہ اپنے بہن کے بیٹوں سے،

وَلَا نِسَاءَهُمْ وَلَا مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ ۖ وَالتَّقِيْنَ اللَّهَ إِنَّ

اور نہ اپنی عورتوں سے اور نہ اپنے ہاتھ کے مال سے اور ڈرتی رہو اے عورتو اللہ سے بیشک

اللَّهُ كَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ۵۵)

اللہ کے سامنے ہے ہر چیز

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو نبی کے گھروں میں رہے بلائے، مت جایا کرو مگر جس وقت تم کو کھانے کے لئے (آنے کی) اجازت دی جائے (تو جانا مضائقہ نہیں، مگر تب بھی جانا) ایسے طور پر (ہو) کہ اس (کھانے) کی تیاری کے منتظر نہ رہو (یعنی بے دعوت تو جاؤ مت اور دعوت ہو تب بھی بہت پہلے سے مت جا بیٹھو) لیکن جب تم کو بلا یا جائے (کہ اب چلو کھانا تیار ہے) تب جایا کرو، پھر جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھا کرو (کیونکہ) اس بات سے نبی کو ناگواری ہوتی ہے سو وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں (اور زبان سے نہیں فرماتے کہ اٹھ کر چلے جاؤ) اور اللہ تعالیٰ صاف بات کہنے سے (کسی کا) لحاظ نہیں کرتا (اس لئے صاف صاف کہہ دیا گیا) اور (اب سے یہ حکم کیا جاتا ہے کہ حضرت کی بیبیاں تم سے پردہ کیا کریں گی تو اب سے) جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر (کھڑے ہو کر وہاں) سے مانگا کرو (یعنی بے ضرورت تو پردہ کے پاس جانا اور بات کرنا بھی نہ چاہئے، لیکن ضرورت میں کلام کا مضائقہ نہیں، مگر رویت نہ ہونا چاہئے) یہ بات (ہمیشہ کے لئے) تمہارے دلوں اور ان کے دلوں کے پاک رہنے کا عمدہ ذریعہ ہے (یعنی جیسے اب تک جانبین کے دل

پاک ہیں اس سے آئندہ بھی احتمال عدم طہارت کا مندرج ہو گیا جو کہ غیر معصوم کے اعتبار سے
فی نفسہ محتمل ہو سکتا تھا، اور حرمت ایذا نبوی صرف فضولِ جسم کر بیٹھ جانے ہی کی صورت
میں منحصر نہیں بلکہ علی الاطلاق حکم ہے کہ تم کو کسی امر میں جاتز نہیں کہ رسول اللہ
(صلی اللہ علیہ وسلم) کو کلفت پہونچاؤ اور نہ یہ جاتز ہے کہ تم آپ کے بعد آپ کی بیبیوں
سے کبھی بھی نکاح کر دینا خدا کے نزدیک بڑی بھاری (معصیت کی) بات ہے (اور جس طرح
یہ نکاح ناجائز ہے ایسے ہی اس کا زبان سے ذکر کرنا یا دل میں ارادہ کرنا سب گناہ ہوسو)
اگر تم (اس کے متعلق) کسی چیز کو (زبان سے) ظاہر کرو گے یا اس (کے ارادہ) کو (دل میں)
پوشیدہ رکھو گے تو اللہ تعالیٰ (کو دو دنوں کی خبر ہوگی، کیونکہ وہ) ہر چیز کو خوب جانتا ہے
(پس تم کو اس پر سزا دیں گے اور ہم نے جو اوپر حجاب کا حکم دیا ہے اس سے بعضے مستثنیٰ
بھی ہیں جن کا بیان یہ ہے کہ) پیغمبر کی بیبیوں پر اپنے باپوں کے سامنے ہونے کے بارہ
میں کوئی گناہ نہیں اور نہ اپنے بیٹوں کے (یعنی جس کے بیٹا ہو) اور نہ اپنے بھائیوں
کے اور نہ اپنے بھتیجوں کے اور نہ اپنے بھانجوں کے اور نہ اپنی (دین شریک) عورتوں
کے اور نہ اپنی لونڈیوں کے (یعنی ان کے سامنے آنا جائز ہے) اور (اے پیغمبر کی بیبیوں!)
ان احکام مذکورہ کی تعمیل میں، خدا سے ڈرتی رہو (کسی حکم کے خلاف نہ ہونے پائی)
بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر حاضر ناظر ہے (یعنی اس سے کوئی چیز مخفی نہیں جو اس
کے خلاف کرے گا اس کو سزا سے ڈرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں اسلامی معاشرت کے چند آداب و احکام کا بیان ہے جس کا
تعلق سابقہ آیات سے یہ ہے کہ جو آداب ان آیات میں تلقین کئے گئے وہ ابتداءً آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان اور آپ کی ازواج کے بارے میں نازل ہوئے ہیں، اگرچہ حکم
ان کا آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرَ نَظِيرِ بْنِ إِدْنَةَ وَلَكِنْ إِذَا	پہلا حکم، دعوتِ طعام اور مہمان کے بعض آداب
دُعِيَكُمْ فَأَدْخُلُوا قَادًا طَعِمْتُمْ فَأَنْشِرُوا وَلَا مَسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ،	

اس میں دعوتِ طعام اور مہمانی کے متعلق تین احکام کا بیان ہے اور حکم اگرچہ
سب مسلمانوں کے لئے عام ہے، مگر سببِ نزول چونکہ خاص واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے مکان میں ہوا، اس لئے عنوان میں بیوت النبی کا ذکر فرمایا گیا۔ پہلا یہ ہے کہ نبی کے مکانات میں بغیر اجازت داخل نہ ہوا لَآ تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّا اَنْ یُّوْذَنْ لَّکُمْ

دوسرا ادب ہے کہ جب داخل ہونے کی اجازت بلکہ کھانے کی دعوت بھی ہو تو وقت سے پہلے آکر کھانا تیار ہونے کے انتظار میں نہ بیٹھ جاؤ۔ غَیْرَ نَاطِلِیْنَ اِنَّہٗ نَاطِرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ اِلَیْہِمْ یَوْمَئِذٍ اِلَّا اَنْ یُّوْذَنْ لَّکُمْ کا بلفظ انا بکسر حمزہ کھانا پکے کو کہتے ہیں۔ آیت میں لَآ تَدْخُلُوْا سے ایک استثناء تو اِلَّا اَنْ یُّوْذَنْ لَّکُمْ کا بلفظ اِلَّا کہا گیا ہے، یہ دوسرا استثناء بلفظ غیر ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ بلا اجازت داخل ہوا ورنہ وقت سے پہلے آکر کھانا پکے کا انتظار کرو۔

بلکہ وقت پر جب بلایا جائے اس وقت مکان میں داخل ہو و لَیْکِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا تیسرا ادب یہ ہے کہ کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے اپنے کاموں میں منتشر ہو جاؤ، دعوت کے گھر میں باہم باتیں کرنے کے لئے جم کر نہ بیٹھو، فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَ لَا مُسْتَأْنِسِیْنَ لِیَحِیْثُ

مسئلہ: یہ عام حالات میں ہے جہاں عادیہ مہمانوں کا کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے رہنا میزبان کے لئے باعث کلفت ہو، خواہ اس لئے کہ وہ فارغ ہو کر اپنے دوسرے کاموں میں لگنا چاہتا ہے یا اس لئے کہ ان کو فارغ کر کے دوسرے مہمانوں کو کھانا مقصود ہو۔ اور جہاں حالات اور عادت سے یہ معلوم ہو کہ کھانے کے بعد مہمانوں کا دیر تک باہمی باتوں میں مشغول رہنا میزبان کے لئے موجب کلفت نہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہوگا، جیسا کہ آجکل کی پارٹیوں اور دعوتوں میں رواج ہو گیا ہے۔ دلیل اس کی آیت کا اگلا جملہ ہے جس میں ارشاد ہے اِنْ ذَٰلِکُمْ کَانَ یُوْذٰی النَّبِیِّ فِیْ سَبْحِیْ مِنْکُمْ وَ اللّٰہُ لَا یَسْتَحِیْ مِنْ الْحَیْثُ یعنی کھانے کے بعد باتوں میں مشغول ہونے کی ممانعت کا سبب یہ ہے کہ ایسا کرنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہونچتی تھی۔ کیونکہ مہمانوں کے کھانے کا انتظام زمانہ مکان میں ہوتا تھا، وہاں مہمانوں کا دیر تک ٹھہرنا گھر والوں کے لئے موجب کلفت ہونا ظاہر ہے۔ آیت میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ مہمانوں کے اس طریقہ عمل سے تکلیف پہونچتی ہے مگر چونکہ خود اپنے گھر کے مہمان ہیں اس حالت میں ان کو ادب سکھانے سے حیا مانع ہوتی ہے، مگر حق بات کے اظہار میں اللہ تعالیٰ حیا نہیں کرتا۔

مسئلہ: اس جملے سے مہمانوں کے اکرام اور خاطر داری کا کتنا بڑا اہتمام معلوم ہوا کہ اگرچہ مہمانی کے آداب سکھانا آپ کے فرائض میں تھا، مگر اپنا مہمان ہونے کی حالت میں آپ نے اس کو بھی مؤخر کیا۔ یہاں تک کہ خود حق تعالیٰ نے قرآن میں یہ ادب

سکھانے کا اہتمام فرمایا۔

دوسرا حکم عورتوں کا پردہ

واقعہ کی بناء پر بیان اور تفسیر میں خاص ازواج مطہرات کا ذکر ہے، مگر حکم ساری اُمت کے لئے عام ہے۔ خلاصہ حکم کا یہ ہے کہ عورتوں سے اگر دوسرے مردوں کو کوئی استعمالی چیز برتن، کپڑا وغیرہ لینا ضروری ہو تو سامنے آکر نہ لیں، بلکہ پردہ کے پیچھے سے مانگیں۔ اور فرمایا کہ یہ پردہ کا حکم مردوں اور عورتوں دونوں کے دلوں کو نفسانی وساوس سے پاک رکھنے کیلئے دیا گیا ہے۔

پردہ نسواں کی اس جگہ یہ بات قابل نظر ہے کہ یہ پردے کے احکام جن عورتوں مردوں کو خاص اہمیت دیتے گئے ہیں ان میں عورتیں تو ازواج مطہرات ہیں، جن کے دلوں کو پاک صاف رکھنے کا حق تعالیٰ نے خود ذمہ لے لیا ہے، جس کا ذکر اس سے پہلی آیت لِيُنْزِلَ عَلَيْكُمْ مِنْكُمْ الْمَلَائِكَةُ فِي الْمَبَیِّتِ میں مفصل آچکا ہے۔ دوسری طرف جو مرد مخاطب ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام ہیں جن میں بہت سے حضرات کا مقام فرشتوں سے بھی آگے ہے۔

لیکن ان سب امور کے ہوتے ہوئے ان کی جہارت قلب اور نفسانی وساوس سے بچنے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ مرد و عورت کے درمیان پردہ کرایا جائے۔ آج کون ہی جو اپنے نفس کو صحابہ کرام کے نفوس پاک سے اور اپنی عورتوں کے نفوس کو ازواج مطہرات کے نفوس سے زیادہ پاک ہونے کا دعویٰ کر سکے، اور یہ سمجھے کہ ہمارا اختلاط عورتوں کے ساتھ کسی خرابی کا موجب نہیں ہے؟

آیات مذکورہ کے اسباب نزول کے ان آیات کے سبب نزول میں چند واقعات بیان کئے جاتے ہیں، جن میں کوئی تضاد نہیں، ہو سکتا ہے کہ مجموعہ واقعات نزول آیات کا سبب بنیں۔ شروع آیت میں جو مہمانی کے آداب بیان ہوئے کہ بغیر بلاتے کھانے کے لئے نہ جائیں، اور کھانے کے انتظار میں نہ بیٹھیں۔ اس کا سبب نزول ابن ابی حاتم نے سلیمان بن ارقم سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت ان ثقلاء اور بھل لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو بغیر دعوت کے کسی کے مکان میں جا بیٹھیں اور کھانے کا انتظار کریں۔

اور امام عبد بن حمید نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اُن بعض لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو انتظار میں رہتے اور کھانے کے وقت سے پہلے رسول اللہؐ

صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں جا کر بیٹھ جاتے اور باہمی باتوں میں مشغول رہتے، یہاں تک کہ کھانا تیار ہو جاتا تو اس میں شریک ہو جاتے تھے۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ ہدایات جاری ہوئیں جو شروع آیت میں مذکور ہیں۔ یہ واقعات پردہ کے احکام نازل ہونے سے پہلے کے ہیں، جب عام مرد و زنانہ مکان میں آتے جاتے رہتے تھے۔

دوسرا حکم جو عورتوں کے پردہ سے متعلق ہے اس کے شان نزول میں امام بخاری کی دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت حضرت انسؓ سے یہ ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کے پاس نیک و بد ہر طرح کے آدمی آتے جاتے ہیں، اگر آپ ازواج مطہرات کو پردہ کرنے کا حکم دیدیں تو بہتر معلوم ہوتا ہے، اس پر یہ آیت حجاب نازل ہوئی۔

صحیحین بخاری و مسلم میں حضرت فاروق اعظمؓ کا یہ قول منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا:

وَأَفَقْتُ رَبِّي فِي ثَلَاثٍ قُلْتُ
يَا رَسُولَ اللَّهِ لَوِ اتَّخَذَتْ فِي
مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مَصْلً فَاَنْزَلَ
اللَّهُ تَعَالَى وَاتَّخَذُوا مِنْ
مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مَصْلً وَقُلْتُ
يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنْ نِسَاءً لَكَ
يَدْخُلْنَ عَلَيْكَ الْمُبَرَّاتِ فَاجِرُ
فَلَوْ حَجَبْتَهُنَّ فَاَنْزَلَ اللَّهُ
آيَةَ الْحِجَابِ وَقُلْتُ لِأَزْوَاجِ
النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
لَمَّا تَبَايَعْنَ فِي الْغَيْرَةِ
عَلَى رَبِّهِنَّ أَنْ طَلَّقْنَ أَنْ
يُبَيِّنَ لَهُنَّ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِنْكُمْ
فَنَزَلَتْ كَذَلِكَ

میں نے موافقت کی اپنے رب کے ساتھ
تین چیزوں میں ایک یہ کہ میں نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مقام
ابراہیمؑ کو اپنی جائے نماز بنالیں اس
پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی،
وَاتَّخَذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مَصْلً اور
میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض
کیا کہ آپ کی ازواج مطہرات کے سامنے
ہر نیک و بد انسان آتا ہے، بہتر ہو کہ
آپ ان کو پردہ کرائیں، اس پر آیت
حجاب نازل ہو گئی۔ اور جب ازواج
مطہرات میں باہمی غیرت و رشک بڑھنے
لگا تو میں نے ان سے کہا کہ اگر رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں طلاق دیدیں تو

بجید نہیں کہ اللہ آپ کو تم سے بہتر ازواج عطا فرمادیں، چنانچہ ٹھیک اپنی الفاظ کے
ساتھ قرآن نازل ہو گیا،

فائز کا: حضرت فاروق اعظمؓ کا اپنے کلام میں ادب قابلِ نظر ہے کہ بظاہر کہنا یہ تھا کہ تین چیزوں میں میرے رب نے میری موافقت فرمائی۔

ایک دوسرا واقعہ حضرت انس رضی کی روایت سے صحیح بخاری میں یہ آیا کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ آیت حجاب کی حقیقت سے میں سب سے زیادہ واقف ہوں، کیوں کہ میں اس واقعہ میں حاضر تھا جب کہ حضرت زینب بنت جحش رضی نکاح کے بعد رخصت ہو کر حرم نبویؐ میں داخل ہوئیں، اور مکان میں آپؐ کے ساتھ موجود تھیں۔ آپؐ نے ولیمہ کے لئے کچھ کھانا پکوا یا اور لوگوں کو دعوت دی، کھانے کے بعد کچھ لوگ وہیں جم کر آپس میں باتیں کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ ترمذی کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہیں تشریف رکھتے تھے، اور ام المؤمنین زینبؓ بھی اسی جگہ موجود تھیں جو حیا کی وجہ سے دیوار کی طرف اپنا رخ پھیرے ہوئے بیٹھی تھیں۔ ان لوگوں کے اس طرح دیر تک بیٹھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوئی، آپؐ گھر سے باہر تشریف لائے اور دوسری ازواج مطہرات کے پاس ملاقات و سلام کے لئے تشریف لے گئے، جب آپؐ پھر گھر میں واپس آئے تو یہ لوگ وہیں موجود تھے۔ آپؐ کے ٹوٹنے کے بعد ان لوگوں کو احساس ہوا تو منتشر ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکان کے اندر تشریف لائے تو تھوڑا سا وقت گزرا تھا کہ آپؐ پھر باہر تشریف لائے میں وہاں موجود تھا۔ آپؐ نے یہ آیت حجاب جو اسی وقت نازل ہوئی تھی پڑھ کر سنائی، **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ** الآية،

حضرت انسؓ نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ میں ان آیات کے نزول میں سب سے زیادہ قریب ہوں، کہ میرے سامنے ہی نازل ہوئی ہیں (الترمذی، کتاب التفسیر) آیات حجاب کے نزول کے اسباب میں یہ تین واقعات روایات حدیث میں مذکور ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں ہو سکتا ہے کہ تینوں واقعات کا مجموعہ ہی ان آیات کے نزول کا سبب بنا ہو۔

تیسرا حکم | ازواج مطہرات کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی نکاح جائز نہیں، **وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُعْذُوا وَارْتَدَّ اللَّهُ وَلَا أَنْ**

تَنْكِحُوا آذواجہ من بعدہ آمداً، اس کے پہلے جملے میں تو عام الفاظ میں ایسے ہر قول و فعل کو حرام کر دیا گیا، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا و تکلیف پہونچے، اس کے بعد یہ حکم دیا گیا کہ آپؐ کی ازواج مطہرات سے آپؐ کی وفات کے بعد کسی کا نکاح حلال نہیں۔

آیت مذکورہ میں اوپر جتنے احکام آئے ہیں ان میں اگرچہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات کو ہوا ہے، مگر حکم عام ہے ساری اُمت کے لئے، بجز اس آخری حکم کے کہ عام اُمت کے لئے قانون یہ ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد جب عدت گزر جائے تو اس کی بیوی دوسرے آدمی سے نکاح کر سکتی ہے، ازواج مطہرات کے لئے یہ خصوصی حکم ہے کہ وہ آپ کی وفات کے بعد کسی سے نکاح نہیں کر سکتیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ بنص قرآن اہبات المؤمنین ہیں، اور اگرچہ اُن کے اہبات ہونے کا اثر ان کی اولاد و دھانی پر نہیں پڑتا کہ وہ سب بہن بھائی ہو کر باہم نکاح نہ کر سکیں، مگر ان کی اپنی ذات کی حد تک امتناع نکاح کا حکم دیا گیا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں آپ کی وفات کا درجہ ایسا ہے جیسا کوئی زندہ شوہر گھر سے غائب ہو، اسی لئے آپ کی میراث تقسیم نہیں ہوئی، اسی بنا پر آپ کی ازواج کا وہ حال نہیں جو عام شوہروں کی وفات پر ان کی ازواج کا ہوتا ہے۔

یہ حکمت بھی ہے کہ شرعی قاعدے سے جنت میں ہر عورت اپنے آخری شوہر کے ساتھ رہے گی۔ حضرت حذیفہؓ نے اپنی زوجہ کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر تم جنت میں میری بیوی رہو تو میرے بعد کوئی دوسرا نکاح نہ کرنا، کیونکہ جنت میں عورت اپنی آخری شوہر کو ملے گی (قرطبی)۔

اس لئے ازواج مطہرات کو جو شرف حق تعالیٰ نے دنیا میں آپ کی زوجیت کا عطا فرمایا ہے اس کو آخرت اور جنت میں بھی باقی رکھنے کے لئے ان کا نکاح کسی دوسرے سے حرام کر دیا گیا۔

اس کے علاوہ طبعی طور پر کوئی شوہر اس کو پسند نہیں کرتا کہ اس کی بیوی دوسرے کے نکاح میں جائے، مگر اس طبعی خواہش کا پورا کرنا عام لوگوں کے لئے شرعاً ضروری نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طبعی خواہش کا بھی حق تعالیٰ نے احترام فرمایا، یہ آپ کا خصوصی اعزاز ہے۔

مسئلہ: اس پر قوامت کا اتفاق ہے کہ جو ازواج مطہرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک آپ کے حرم میں رہیں اُن سب کا یہی حکم ہے، لیکن جن کو آپ نے طلاق دیدی، یا کسی دوسری وجہ سے وہ آپ کی زوجیت سے علیحدہ ہو گئیں اُن کے بارے میں فقہاء اُمت کے مختلف اقوال ہیں، جن کو قرطبی نے تفصیل سے لکھا ہے۔

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طرح سے انداز و تکلیف پہنچانا یا آپ کی وفات کے بعد آپ کی ازواج سے نکاح کرنا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا گناہ ہے۔

اِنَّ قُلُوْبَ رَاٰثِبِيْنَ اَوْ تَخَفُوْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا آخر آیت میں پھر اس مضمون کو دہرایا گیا کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے ارادوں اور خیالات سے بھی واقف ہے، تم کسی چیز کو چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ تعالیٰ کے سامنے سب ظاہر ہی ہے۔ اس میں تاکید ہے کہ مذکورہ احکام میں کسی قسم کا شک و شبہ یا دوسوہ دل میں پیدا نہ ہونے دیں، اور احکام مذکورہ کی مخالفت سے بچنے کا پورا اہتمام کریں۔

آیت مذکورہ میں تین احکام بیان کئے گئے ہیں، ان میں عورتوں کے پردہ کا مسئلہ کئی وجہ سے تفصیل طلب ہے، اس لئے بقدر ضرورت لکھا جاتا ہے:-

احکامِ حجاب

انسدادِ فواحش کا اسلامی نظام

فواحش، بدکاری، زنا اور اس کے مقدمات دنیا کی اُن مہلک برائیوں میں سے ہے جن کے مہلک اثرات صرف اشخاص و افراد کو نہیں بلکہ قبائل اور خاندانوں کو اور بعض اوقات بڑے بڑے ملکوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں جتنے قتل و غارت گری کے واقعات پائے جاتے ہیں اگر صحیح تحقیق کی جائے تو اکثر واقعات کے پس منظر میں کوئی عورت اور شہوانی جذبات کا جال نظر آئے گا یہی وجہ ہے کہ جب دنیا پیدا ہوئی ہے اس میں کوئی قوم کوئی مذہب، کوئی خطہ ایسا نہیں جو اس کی بُرائی اور مہلک عیب ہونے پر متفق نہ ہو۔

دنیا کے اس آخری دور میں یورپین اقوام نے اپنی مذہبی حدود اور قدیم دینی روایات سب کو توڑ کر اگرچہ زنا کو اپنی ذات میں کوئی جرم ہی نہیں رکھا، اور تمدن و معاشرے کو ایسے سانچوں میں ڈھال دیا ہے جن میں ہر قدم پر جنسی انار کی اور فواحش کو دعوت عام ہے، مگر ان کے ثمرات و نتائج کو وہ بھی جرائم سے خارج نہ کر سکے۔ عصمت فروشی، زنا بالجبر، منظر عام پر فحش حرکات کو تعزیری جرم قرار دینا پڑا، جس کی مثال اس کے سوا کچھ نہیں کہ کوئی شخص آگ لگانے کے لئے سوختہ کا ذخیرہ جمع کرے پھر اس پر تیل چھڑکے، پھر اس میں آگ لگائے، اور جب اس کے شعلے بھڑکنے لگیں تو ان شعلوں پر پابندی لگانے

اور روکنے کی فکر کرے، ہنڈیا پکانے کے لئے اس کے نیچے آگ جلاتے پھر اس کے اُبال اور جوش کو روکنا چاہیے۔

اس کے خلاف اسلام نے جن چیزوں کو جرائم اور انسانیت کے لئے مضر قرار دیکر قابلِ سزا جرم کہا ہے، ان کے مقدمات پر بھی پابندیاں عائد کیں، اور ان کو ممنوع قرار دیا۔ اس معاملے میں مقصود اصلی زنا اور بدکاری سے بچانا تھا تو اس کو نظر نہی رکھنے کے قانون سے شروع کیا، عورتوں مردوں کے بے محابا اختلاط کو روکا، عورتوں کو گھروں کی چار دیواری میں محدود رکھنے کی ہدایت کی اور ضرورت کے وقت باہر نکلنے کے لئے بھی برقع یا لمبی چادر سے پورا بدن چھپا کر نکلنے اور سڑک کے کنارے چلنے کی ہدایت کی، خوشبو لگا کر یا بجنے والا زوہ پہن کر نکلنے کی ممانعت کی۔ پھر جو شخص ان سب حدود و قیود اور پابندیوں کے حصار کو پھاند کر یا ہر نکل جائے اس پر ایسی سخت عبرت آموز سزا جاری کی کہ ایک مرتبہ کسی بدکردار پر جاری کر دی جائے تو پوری قوم کو مکمل سبق مل جائے۔

اہلِ یورپ اور ان کے مقلدین نے اپنی فحاشی کے جواز میں عورتوں کے پردہ کو عورتوں کی صحت اور اقتصادی اور معاشی حیثیت سے معاشرہ کے لئے مضر ثابت کرنے اور پردہ رہنے کے فوائد پر بحثیں کی ہیں۔ ان کا مفصل جواب بہت سے علمائے اہلِ عصر نے مفصل کتابوں میں لکھ دیا ہے، اس کے متعلق یہاں اتنا سمجھ لینا بھی کافی ہے کہ فائدہ اور نفع سے تو کوئی جرم و گناہ بھی خالی نہیں۔ چوری، ڈاکہ، دھوکہ فریب ایک اعتبار سے بڑا نفع بخش کاروبار ہے، مگر جب اس کے ثمرات و نتائج میں آنے والی ہملک مضرتیں سامنے آتی ہیں تو کوئی شخص ان کو نافع کاروبار کہنے کی جرأت نہیں کرتا۔ بے پردگی میں اگر کچھ معاشی فوائد بھی ہوں مگر جب پورے ملک و قوم کو ہزاروں فتنہ و فساد میں مبتلا کر دے تو پھر اس کو نافع کہنا کسی دانشمند کا کام نہیں ہو سکتا۔

اسنادِ جرائم کے لئے اسلام جس طرح اصولی عقائد، توحید، رسالت، آخرت، تمام انبیاء میں سیدِ ذرائع کا تدبیر اصول، علیہم السلام کی شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلے آئے ہیں اور اس میں راہِ اعتدال ہے، اسی طرح عام معاصی اور فواحش و منکرات ہر شریعت و مذہب میں حرام قرار دیئے گئے ہیں، لیکن شرائع سابقہ میں ان کے اسباب و ذرائع کو مطلقاً حرام نہیں کیا گیا تھا، جب تک کہ ان کے ذریعہ کوئی جرم واقع نہ ہو جاتے۔ شریعتِ محمدیہ علی صاجہا الصلوٰۃ والسلام چونکہ قیامت تک رہنے والی شریعت تھی، اس لئے اس کی حفاظت کا منجانب اللہ خاص اہتمام یہ کیا گیا کہ جرائم و معاصی تو حرام تھے ہی

ان اسباب و ذرائع کو بھی حرام قرار دیدیا گیا جو عادت غالبہ کے طور پر ان جرائم تک پہنچانے والے ہیں۔ مثلاً شراب نوشی کو حرام کیا گیا تو شراب کے بنانے، بیچنے، خریدنے اور کسی کو دینے کو بھی حرام قرار دیدیا گیا۔ سود کو حرام کرنا تھا تو سود سے ملتے جلتے معاملات کو بھی ناجائز کر دیا گیا۔ اسی لئے حضرات فقہاء نے تمام معاملات فاسدہ سے حاصل ہونے والے نفع کو سود کی طرح مالِ خبیث قرار دیا۔ شرک و بت پرستی کو قرآن نے ظلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی جبرم قرار دیا، تو اس کے اسباب و ذرائع پر بھی کڑی پابندی لگا دی۔ آفتاب کے طلوع، غروب، اور وسط میں ہونے کے اوقات میں چونکہ مشرکین آفتاب کی پرستش کرتے تھے، ان اوقات میں نماز پڑھی جاتی تو آفتاب پرستوں کے ساتھ ایک طرح کی مشابہت ہو جاتی، پھر یہ مشابہت کسی وقت خود شرک میں مبتلا ہونے کا سبب بن سکتی تھی، اس لئے شریعت نے ان اوقات میں نماز اور سجدہ کو بھی حرام و ناجائز کر دیا۔ بتوں کے مجسمات اور تصویریں چونکہ بت پرستی کا قریب ذریعہ تھیں، اس لئے بت تراشی، اور تصویر سازی کو حرام اور ان کے استعمال کو ناجائز کر دیا گیا۔

اسی طرح جبکہ شریعت نے زنا کو حرام قرار دیا تو اس کے تمام اسباب قریبہ اور ذرائع کو بھی محرمات میں داخل کر دیا، کسی اجنبی عورت یا مرد پر شہوت سے نظر ڈالنے کو آنکھوں کا زنا قرار دیا، اس کا کلام سننے کو کانوں کا، اس کے چھونے کو ہاتھوں کا، اس کے لئے جدوجہد میں چلنے کو پاؤں کا زنا فرمایا، جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے، انہی جرائم سے بچانے کے لئے عورتوں کے واسطے پردہ کے احکام نازل ہوئے۔

مگر اسباب و ذرائع کا قریب و بعید ایک طویل سلسلہ ہے، اگر دور تک اس سلسلے کو روکا جائے تو زندگی دشوار ہو جائے، اور عمل میں بڑی تنگی پیش آجائے، جو اس شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کا اس کے بارے میں کھلا ہوا اعلان یہ ہے کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ یعنی دین میں تمھارے اوپر کوئی تنگی نہیں لگائی گئی۔ اس لئے اسباب و ذرائع کے معاملے یہ حکیمانہ فیصلہ کیا گیا کہ جو افعال و اعمال کسی معصیت کا ایسا سبب قریب ہوں کہ عام عادت کے اعتبار سے اس کا ارتکاب کرنے والا اس معصیت میں ضرور مبتلا ہو ہی جاتا ہے، ایسے اسباب قریبہ کو شریعت اسلام نے اصل معصیت کے ساتھ ملحق کر کے ان کو بھی حرام کر دیا، اور جو اسباب بعیدہ ہیں کہ ان کے عمل میں لانے سے معصیت میں مبتلا ہونا عادتاً لازم و ضروری تو نہیں، مگر کچھ نہ کچھ دخل معصیت میں ضرور ہے ایسے اسباب و ذرائع کو مکروہ قرار دیا۔

اور جو اسباب ان سے بھی زیادہ ابعید ہیں کہ معصیت میں ان کا دخل شاذ و نادر ہے ان کو نظر انداز کر کے مباحات میں داخل کر دیا۔

پہلے مسئلہ کی مثال شراب فروشی ہے کہ یہ شراب نوشی کا سبب قریب ہے، اس کو بھی شریعت نے اسی طرح حرام کر دیا جس طرح شراب نوشی حرام ہے۔ کسی غیر عورت کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگانا اگرچہ عین زنا نہیں، مگر اس کا سبب قریب ہی شریعت نے اس کو اسی کی طرح حرام قرار دیدیا۔

اور دوسرے مسئلے کی مثال یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کے ہاتھ انگور فروخت کرنا جس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ اس سے شراب ہی بناتا ہے اس کا پیشہ یہی ہے یا اس نے صراحت کہہ دیا ہے کہ میں اس کام کے لئے خرید رہا ہوں، یہ اگرچہ شراب فروشی کے درجہ میں حرام تو نہیں مگر مکروہ و ناجائز یہ بھی ہے۔ یہی حکم سینما گھر بنانے یا سودی بینک چلانے کے لئے زمین مکان کرایہ پر دینے کا ہے کہ معاملہ کے وقت جب معلوم ہو کہ یہ اس مکان کو ناجائز کام کے لئے رہا ہے تو کرایہ پر دینا مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے۔

تیسرے درجہ کی مثال یہ ہے کہ عام لوگوں کے ہاتھ انگور فروخت کئے جائیں جن میں یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص ان سے شراب کشید کر لے مگر نہ اس نے اس کا اظہار کیا نہ ہمالے علم میں وہ ایسا شخص ہو جو شراب کشید کرتا ہو تو شرعاً اس طرح کی بیع و شراء مباح و جائز و شراردی۔

تنبیہ ضروری یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ شریعت اسلام نے جن کاموں کو گناہ کا سبب قریب درجہ اول کا قرار دے کر حرام کر دیا، اس حکم حرمت کے بعد وہ سب کے لئے مطلقاً حرام ہے، خواہ ابتلا گناہ کا سبب بنے یا نہ بنے اب وہ خود ایک حکم شرعی ہے جس کی مخالفت حرام ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ سمجھئے کہ عورتوں کا پردہ بھی شرعاً اسی سبب ذرائع کے مہول پر مبنی ہے کہ ترک پردہ سبب ہے معصیت میں مبتلا ہونے کا، اس میں بھی اسباب کی مذکورہ قسموں کے احکام جاری ہوں گے۔ مثلاً کسی جوان مرد کے سامنے جوان عورت کو اپنا بدن کھولنا ابتلا گناہ کا ایسا سبب قریب ہے کہ عادت اکثر یہ کے اعتبار سے اس پر گناہ کا مرتب ہونا لازمی جیسا ہے، اس لئے یہ تو شرعاً زنا کی طرح حرام ہو گیا، کیونکہ شرعاً اس عمل کو حکم فاحشہ کا دیدیا گیا ہے، اب وہ مطلقاً حرام ہے۔ اگرچہ معاملہ کسی معصوم کے ساتھ ہو یا کوئی شخص اپنے نفس پر مکمل قابو رکھنے کی وجہ سے

مطلن ہو کر گناہ سے بچ جائے گا۔ مواقع ضرورت علاج وغیرہ کا مستثنیٰ ہونا الگ چیز ہے، اس سے اصل حرمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مسئلہ اوقات اور حالات سے بھی متاثر نہیں ہوتا۔

قرن اول اسلام میں بھی اس کا حکم وہی تھا جو آج فسق و فجور کے زمانے میں ہے۔ دوسرا درجہ ترک حجاب کا یہ ہے کہ گھروں کی چار دیواری سے باہر برقع یا لابی چادر سے پورا بدن چھپا کر باہر نکلے۔ یہ سبب بعید ہے فتنہ کا۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ایسا کرنا سبب فتنہ ہو تو ناجائز ہے اور جہاں فتنہ کا خوف نہ ہو وہاں جائز ہے۔ اسی لئے اس کا حکم زمانے اور حالات کے بدلنے سے بدل سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس طرح کا عورتوں کا خروج موجب فتنہ نہیں تھا، اسی لئے آپ نے عورتوں کو برقع وغیرہ میں سارا بدن چھپا کر مسجدوں میں آنے کی چند شرائط کے ساتھ اجازت دی تھی، اور ان کو مسجد میں آنے سے روکنے کو منع فرمایا تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی ان کو ترغیب اسی کی دی تھی کہ نماز اپنے گھروں میں ادا کریں، کیونکہ ان کے لئے مسجدوں میں آنے سے زیادہ ثواب گھر میں پڑھنے کا ہے، مگر فتنہ کا خوف نہ ہونے کے سبب منع نہیں فرمایا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد صحابہ کرام نے دیکھا کہ اب عورتوں کا مسجدوں میں آنا فتنہ سے خالی نہیں رہا، اگرچہ برقع چادر وغیرہ لپیٹ کر آئیں، تو ان حضرات نے باجماع و اتفاق عورتوں کو مسجدوں کی جماعت میں آنے سے روک دیا۔ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج کے حالات کو دیکھتے تو ضرور عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے روک دیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے سے مختلف نہیں، بلکہ آپ نے جن شرائط کی بناء پر اجازت دی تھی، اب شرائط نہ رہیں تو حکم آپ ہی کے فیصلے سے بدل گیا۔

عورتوں کے پردہ کا بیان قرآن کریم کی سات آیتوں میں آیا ہے۔ تین سورۃ نور میں گذر چکی ہیں، چار آیتیں سورۃ احزاب میں ہیں، جن میں سے ایک پہلے آچکی ہے، ایک زیر نظر ہے باقی آگے آئیں گی جن میں پردہ کے درجات کی تعیین اور احکام کی تفصیل اور جو اس سے مستثنیٰ ہیں، ان کا مفصل بیان ہے۔ اسی طرح ستر سے زیادہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں قولاً اور عملاً پردہ کے احکام بتلائے گئے ہیں، ان سب کو یک جا معلوم کرنے کے لئے احقر نے ایک مستقل رسالہ بنام "تفصیل الخطاب فی تفسیر آیات الحجاب" لکھ دیا ہے جو بزبان عربی احکام القرآن سورۃ احزاب کا جز ہو کر شائع ہو چکا ہے اس تفسیر قرآن میں ہر آیت کی تفسیر تو اپنی جگہ پر آتی ہے باقی مضامین سالہ کے چند ضروری اقتباسات یہاں لکھے جاتے ہیں۔

نزولِ حجاب کی تاریخ

عورتوں اور مردوں میں بے محابا اختلاط تو دنیا کی پوری تاریخ میں آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی زمانے میں درست نہیں سمجھا گیا، اور صرف اہل شراک ہی نہیں دنیا کے عام شریف خاندانوں میں ایسے اختلاط کو روا نہیں رکھا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفرِ مذین کے وقت جن عورتوں کا اپنی بکریوں کو پانی پلانے کے لئے الگ روکے ہوئے کھڑے ہونے کا ذکر ہے، اس کی وجہ یہی بتلائی گئی ہے کہ ان عورتوں نے مردوں کے ہجوم میں گھسنا پسند نہ کیا، سب کے بعد بچے ہوئے پانی پر قناعت کی۔ حضرت زینب بنت جحش جن کے نکاح کے وقت پہلی آیتِ حجاب نازل ہوئی ہے اس کے نازل ہونے سے پہلے بھی جامع ترمذی کی روایت میں ان کی گھر میں نشست کی یہ صورت بیان کی ہے وَهِيَ مُوَلَّيَةٌ وَجْهَهَا إِلَى الْحَاظِطِ، یعنی وہ اپنا رخ دیوار کی طرف پھیرے ہوئے بیٹھی تھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نزولِ حجاب سے پہلے بھی عورتوں مردوں میں بے محابا اختلاط اور بے تکلف ملاقات و گفتگو کا رواج شریف اور نیک لوگوں میں کہیں نہ تھا۔ قرآن کریم میں جس جاہلیتِ اولیٰ اور اس میں عورتوں کے تبرج و ظہور کا ذکر ہے وہ بھی عرب کے شریف خاندانوں میں نہیں بلکہ لوطیوں اور آوارہ عورتوں میں تھا عرب کے شریف خاندان اس کو معیوب سمجھتے تھے۔ عرب کی پوری تاریخ اس کی شاہد ہے۔ ہندوستان میں ہندو بدھ مت، اور دوسرے مشرکانہ مذاہب والوں میں عورتوں مردوں کے درمیان بے محابا اختلاط گوارا نہ تھا۔ یہ مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کے دعوے اور بازاروں اور سڑکوں پر پریدہ کرنے اور تعلیم سے لے کر ہر شعبہ زندگی میں مرد و زن کے بے تکلف اختلاط ضیافتوں اور کلبوں میں بے تکلف ملاقاتوں کا سلسلہ صرف یورپین اقوام کی بے حیائی اور فحاشی کی پیداوار ہے، جس میں یہ اقوام بھی اپنے ماضی سے ہٹ جانے کے بعد مبتلا ہوئی ہیں۔ قدیم زمانے میں ان کی بھی یہ صورت نہ تھی۔ حتیٰ تعالیٰ نے جس طرح عورت کی جسمانی تخلیق کو مردوں سے ممتاز رکھا ہے اسی طرح ان کی طبیعتوں میں ایک فطری حیا کا جوہر بھی رکھا ہے، جو ان کو فطری طور پر عام مردوں سے الگ تھلگ رہنے اور ستر پر آمادہ کرتی ہے۔ اور یہ فطری اور طبعی حیا کا پردہ عورتوں مردوں

کے درمیان ابتداء آفرینش سے حائل رہا ہے، ابتداء اسلام میں بھی باہمی پردہ کی یہی نوعیت تھی۔
پردہ نسوان کی یہ خاص نوعیت کہ عورتوں کا اصل مقام گھروں کی چار دیواری ہو، اور
جب کسی شرعی ضرورت سے باہر نکلتا ہو تو پورے بدن کو چھپا کر نکلیں یہ ہجرت مدینہ کے
بعد ششہ ہجری میں جاری ہوا ہے۔

جس کی تفصیل یہ ہے کہ باتفاق علمائے امت اس پردہ کے متعلق پہلی آیت وہ ہے
جو اوپر مذکور ہوئی ہے لَا تَلْبَسُوا ثِيَابَ الْغِيَا، اور یہ آیت حضرت زینب بنت جحش
کے نکاح اور حرم نبویؐ میں داخلہ کے وقت نازل ہوئی ہے۔ اس نکاح کی تاریخ میں حافظ
ابن حجر نے اصحابہ میں اور ابن عبد البر نے استیعاب میں دو قول نقل کئے ہیں کہ ششہ ہجری
میں ہوا یا ششہ ہجری میں ہوا۔ ابن کثیر نے ششہ ہجری کو ترجیح دی، ابن سعد نے حضرت
انسؓ سے بھی ششہ ہجری نقل کیا ہے، حضرت صدیقہ عائشہؓ کی بعض روایات سے بھی اسی
کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

آیت مذکورہ میں عورتوں کو پس پردہ رہنے کا حکم دیا اور مردوں کو حکم یہ ملا کہ
اگر ان سے کوئی چیز مانگنا ہے تو پردہ کے پیچھے سے مانگیں۔ اس میں پردہ کی خاص تاکید
پائی گئی کہ بلا ضرورت تو مردوں عورتوں کو الگ ہی رہنا ہے، ضرورت کے وقت ان
سے بات کرنا ہو تو پس پردہ کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم میں پردہ نسوان اور اس کی تفصیلات کے متعلق سات آیتیں نازل
ہوئی ہیں، چار سورہ احزاب میں اور تین سورہ نور میں گذر چکی ہیں۔ اس پر سب کا اتفاق
ہے کہ پردہ کے متعلق سب سے پہلے نازل ہونے والی یہی آیت ہے لَا تَلْبَسُوا ثِيَابَ الْغِيَا
الَّتِي فِيهَا يَكُنُ مَعَكُمْ الْآيَةُ، سورہ نور کی تینوں آیتیں اور سورہ احزاب کے
شروع کی آیت جس میں ازواج مطہرات کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے گھروں میں بیٹھیں،
وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ، یہ سب اگرچہ ترتیب قرآن میں پہلے ہے مگر نزول کے اعتبار سے
مؤخر ہیں۔ سورہ احزاب کی پہلی آیت میں اس کی تصریح موجود ہے کہ یہ حکم اس وقت
دیا گیا ہے جب کہ ازواج مطہرات کو منجانب اللہ اختیار دیا گیا تھا کہ اگر دنیا کی وسعت
چاہتی ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طلاق لے لیں، اور آخرت کو ترجیح دے کر دنیا
کی معیشت میں موجودہ حالت پر قناعت کریں تو نکاح میں رہیں۔

اس واقعہ تجزیر میں یہ بھی مذکور ہو کہ جن ازواج کو یہ اختیار دیا گیا تھا ان میں
حضرت زینب بنت جحش بھی شامل تھیں اس سے معلوم ہوا کہ ان کا نکاح اس

آیت سے پہلے ہو چکا تھا، یہ آیت بعد میں نازل ہوئی، اس طرح سورۃ نور کی آیتیں جن میں پردہ کے متعلق تفصیلات ہیں، یہ اگرچہ ترتیب قرآنی میں مقدم ہیں مگر نزول کے اعتبار سے وہ بھی اس کے بعد قصۃ افک کے ساتھ نازل ہوئی ہیں، جو غزوہ بنی المصطلق یا مریح سے واپسی میں پیش آیا تھا۔ یہ غزوہ سلسلہ ہجری میں ہوا ہے۔ اور پردہ شرعی کے احکام اس وقت سے جاری ہوئے ہیں جبکہ حضرت زینبؓ کے نکاح میں آیت پردہ نازل ہوئی، سورۃ نور کی آیات متعلقہ حجاب سورۃ نور میں گزر چکی ہیں۔

ستر عورت کے احکام | مرد و عورت کا وہ حصہ بدن جس کو عربی میں عورت اور اردو فارسی میں ستر اور حجاب نسائ میں فرق کہتے ہیں جس کا سب سے چھپانا شرعی، طبعی اور عقلی طور پر فرض ہے، اور ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض جس پر عمل ضروری ہے، وہ ستر عورت یعنی اعضا مستورہ کا چھپانا ہے۔ یہ فریضہ تو ابتداء آفرینش سے فرض ہے، تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں فرض رہا ہے، بلکہ شرائع کے وجود سے بھی پہلے جب جنت میں شجر ممنوعہ کھا لینے کے سبب حضرت آدم و حوا علیہما السلام کا جنتی لباس اتر گیا اور ستر کھل گیا تو وہاں بھی آدم علیہ السلام نے ستر کھلا رکھنے کو جائز نہیں سمجھا۔ اسی لئے آدم و حوا دونوں نے جنت کے پتے اپنے ستر پر باندھ لئے طِفْقًا يَخْصِفَانِ مَكِيهَتَيْنِ ذَرَقِ الْجَنَّةِ کا یہی مطلب ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر پیغمبر دین کی شریعت میں ستر چھپانا فرض رہا ہے۔ اعضا مستورہ کی تعیین اور تحدید میں اختلاف ہو سکتا ہے، کہ ستر کہاں سے کہاں تک ہے، مگر اصل فرضیت ستر عورت کی تمام شرائع انبیاء میں مسلمہ ہے، اور یہ فرض ہر انسان مرد و عورت پر فی نفسہ عائد ہے، کوئی دوسرا دیکھنے والا ہو یا نہ ہو اسی لئے اگر کوئی شخص اندھیری رات میں ننگا نماز پڑھے حالانکہ ستر چھپانے کے قابل کپڑا اُس کے پاس موجود ہو، تو یہ نماز بالاتفاق ناجائز ہے، حالانکہ اس کو ننگا کسی نے دیکھا نہیں (بجر الرائق) اسی طرح نماز اگر کسی ایسی جگہ پڑھی جہاں کوئی دوسرا آدمی دیکھنے والا نہیں اس وقت بھی اگر نماز میں ستر کھل گیا تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ (کما فی عامۃ کتب الفقہ)

خارج نماز لوگوں کے سامنے ستر پوشی کے فرض ہونے میں تو کسی کا اختلاف ہی نہیں، لیکن خلوت میں جہاں کوئی دوسرا دیکھنے والا موجود نہ ہو وہاں بھی صحیح قول یہی ہے کہ خارج نماز بھی بلا ضرورت شرعیہ یا طبیعہ کے ستر کھول کر ننگا بیٹھنا ناجائز نہیں۔ (کما فی البحر عن شرح المنیہ)

یہ حکم تو ستر عورت کا تھا، جو اول اسلام سے بلکہ اول آفرینش سے تمام مشراییہ انبیاء میں فرض رہا ہے، جس میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ خلوت و جلوت میں بھی برابر ہیں، جیسے لوگوں کے سامنے نہنگا ہونا جائز نہیں، ایسے ہی خلوت و تنہائی میں بھی بلا ضرورت نہنگا رہنا جائز نہیں۔

دوسرا مسئلہ: حجاب اور پردہ کا ہے کہ عورتیں اجنبی مردوں سے پردہ کریں۔ اس مسئلہ میں بھی اتنی بات تو انبیاء و صلحاء اور شرفاء میں ہمیشہ سے رہی ہے کہ اجنبی مردوں کے ساتھ عورتوں کا بے محابا اختلاط نہ ہو۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی دو لڑکیوں کا قصہ جو قرآن کریم میں پڑھا میں آیا ہے اس میں لڑکیاں اپنی بکریوں کو پانی پلانے کے لئے بستی کے کنوئیں پر گئیں جہاں لوگوں کا ہجوم تھا وہ اپنے اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے تو قرآن کریم میں ہے کہ یہ لڑکیاں ایک طرف الگ کھڑی ہو گئیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کا اس وقت اتفاقی طور پر مسافرانہ انداز میں وہاں گذر ہوا تو ان لڑکیوں کو علیحدہ کھڑے دیکھ کر سبب پوچھا تو لڑکیوں نے رد باتیں بتلائیں۔

اول یہ کہ اس وقت یہاں مردوں کا ہجوم ہے ہم اپنے جانوروں کو پانی اس وقت پلائیں گے جب یہ لوگ فارغ ہو کر چلے جائیں گے۔ دوسری بات یہ بھی بتلائی کہ ہمارے والد بوڑھے ضعیف ہیں جس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جانوروں کو پانی پلانے کے لئے نکلنا یہ عرف و عادت کے اعتبار سے عورتوں کا کام نہیں تھا، مگر والد کے ضعف و مجبوری اور کسی دوسرے آدمی کے موجود نہ ہونے کے سبب یہ کام ہمیں کرنا پڑ گیا۔

یہ حال قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی لڑکیوں کا بتلایا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس زمانے اور ان کی شریعت میں بھی عورتوں مردوں کا دوش بدوش چلنا اور بے محابا اختلاط پسند نہیں تھا، اور ایسے کام جن میں مردوں کے ساتھ اختلاط ہو وہ عورتوں کے سپرد ہی نہیں کئے جاتے تھے۔ بہر حال اس مجموعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو باقاعدہ پردہ میں رہنے کا حکم اس وقت نہیں تھا، اسی طرح ابتداء اسلام میں بھی یہی صورت جاری رہی۔ ۳۷ یا ۳۸ میں عورتوں پر اجنبی مردوں سے پردہ کرنا فرض کر دیا گیا، جس کی تفصیلات آگے آتی ہیں۔

اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ ستر عورت، اور حجاب نسائے دو مسئلے الگ الگ ہیں، ستر عورت ہمیشہ سے فرض ہے، حجاب نسائے ہجری میں فرض ہوا۔ ستر عورت

مرد و عورت دونوں پر فرض ہے اور حجاب صرف عورتوں پر، ستر عورت لوگوں کے سامنے اور خلوت دونوں میں فرض ہے حجاب صرف اجنبی کی موجودگی میں یہ تفصیل اس لئے لکھی گئی کہ ان دونوں مسئلوں کو غلط ملط کر دینے سے بہت سے شبہات مسائل اور احکام قرآن کے سمجھنے میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں ستر عورت سے باجماع مستثنیٰ ہیں، اسی لئے نماز میں چہرہ اور ہتھیلیاں کھلی ہوں تو نماز بالاتفاق و باجماع جائز ہے۔ چہرہ اور ہتھیلیاں تو اتر دئے نص مستثنیٰ ہیں، قدیمین کو فقہاء نے ان پر قیاس کر کے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

لیکن اجنبی مردوں سے پردہ میں بھی چہرہ اور ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں یا نہیں، اس میں اختلاف ہے، جس کی تفصیل سورۃ نور کی آیت لَا یُبْصِرُ یُنَظِّرُ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کے تحت گذر چکی ہے، جس کا خلاصہ آگے آتا ہے۔

حجاب شرعی کے درجات اور | پردہ نسوان کے متعلق قرآن مجید کی سات آیات اور حدیث ان کے احکام کی تفصیل کی ستر روایات کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مطلوب

شرعی حجاب اشخاص ہے، یعنی عورتوں کا وجود اور ان کی نقل و حرکت مردوں کی نظروں سے مستور ہو، جو گھروں کی چار دیواری یا خیموں اور معلق پردوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنی صورتیں حجاب کی منقول ہیں وہ سب ضرورت کی بناء پر اور وقت ضرورت اور قدر ضرورت کے ساتھ مقید اور مشروط ہیں۔

اس طرح پردہ کا پہلا درجہ جو اصل مطلوب شرعی ہے وہ حجاب اشخاص ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں رہیں۔ لیکن شریعت اسلامیہ ایک جامع اور مکمل نظام ہے جس میں انسان کی تمام ضروریات کی رعایت پوری کی گئی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ عورتوں کو ایسی ضرورتیں پیش آنا ناگزیر ہے کہ وہ کسی وقت گھروں سے نکلیں اس کے لئے پردہ کا دوسرا درجہ قرآن و سنت کی رو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر سے پاؤں تک برقع یا لائبی چادر میں پورے بدن کو چھپا کر نکلیں۔ راستہ دیکھنے کے لئے چادر میں سے صرف ایک آنکھ کھولیں، یا برقع میں جو جالی آنکھوں کے سامنے استعمال کی جاتی ہے وہ لگالیں، ضرورت کے مواقع میں پردہ کا دوسرا درجہ بھی پہلے کی طرح سب علماء و فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے۔

ایک تیسرا درجہ بھی بعض روایات سے مفہوم ہوتا ہے، جس میں صحابہ و تابعین اور فقہاء ائمہ کی رائیں مختلف ہیں۔ وہ یہ کہ عورتیں جب بضرورت گھروں سے باہر نکلیں تو

وہ اپنا چہرہ اور ہتھیلیاں بھی لوگوں کے سامنے کھول سکتی ہیں بشرطیکہ سارا بدن مستور ہو، پردہ شرعی کے ان تینوں درجوں کی تفصیل یہ ہے کہ:-

پہلا درجہ حجاب اشخاص بالبیوت | قرآن و سنت کی رو سے اصل مطلوب یہی درجہ ہی سورۃ احزاب کی زیر بحث آیت **فَاَسْكُوْهُنَّ مِنْ دَاخِلِ اَسْوَاقِنَا** متاعاً

فَاَسْكُوْهُنَّ مِنْ دَاخِلِ اَسْوَاقِنَا، اس کی واضح دلیل اور اس سے زیادہ واضح سورۃ احزاب ہی کے شروع کی آیت **وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ** ہی۔ ان آیتوں پر جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا، اس سے اور زیادہ اس کی تشریح سامنے آ جاتی ہے۔

یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ پردہ نسواں کے متعلق پہلی آیت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے وقت نازل ہوئی، روایات حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس واقعہ حجاب کو اور سب زیادہ اس لئے جانتا ہوں کہ میں اس وقت حضور ص کی خدمت میں موجود تھا۔ جب پردہ کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، تو آپ نے مردوں کے سامنے ایک چادر وغیرہ کا پردہ ڈال کر حضرت زینبؓ کو اندر مستور کر دیا۔ یہ نہیں کیا کہ ان کو برقع یا چادر میں مستور کر دیتے، شان نزول میں جو واقعہ حضرت عمر بن خطابؓ کا اوپر گزر چکا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا مقصد یہ تھا کہ اہمات المؤمنینؓ مردوں کی نظروں سے الگ اندر رہیں۔ جیسا کہ ان کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے **يَدْخُلُ عَلَيْكَ الْبُرْءُ وَالْفَاجِرُ**

صحیح بخاری باب غزوہ موتہ میں حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زید بن حارثہ اور جعفرؓ اور عبد اللہ بن رواحہؓ کی شہادت کی خبر ملی تو آپ مسجد نبویؐ میں تشریف رکھتے تھے، آپ کے چہرہ مبارک پر سخت غم و صدمہ کے آثار تھے، میں حجرہ کے اندر دروازہ کی ایک شق دریں سے یہ سب ماجرا دیکھ رہی تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اُم المؤمنینؓ اس حادثہ کے وقت بھی باہر آ کر برقع کے ساتھ مجمع میں شامل نہیں ہوئیں بلکہ دروازہ کی شق سے اس جلسہ کا مشاہدہ کیا۔

اور صحیح بخاری کتاب المغازی عمرۃ القضاء کے باب میں ہے کہ حضرت عروہ ابن زبیر صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے اور عبد اللہ بن عمرؓ مسجد نبویؐ میں حضرت صدیقہ عائشہؓ کے حجرے کے باہر متصل تشریف رکھتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمروں کے متعلق باہم گفتگو کر رہے تھے۔ ابن عمرؓ فرماتے ہیں، کہ اسی درمیان میں ہم نے حضرت صدیقہؓ کی مسواک کرنے اور حلق صاف کرنے کی آواز حجرہ کے اندر سے سنی۔ آگے واقعہ میں

عمرات نبیؐ کا ذکر ہے۔ اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ آیاتِ حجاب نازل ہونے کے بعد ازواجِ مطہرات کا معمول یہ ہو گیا تھا کہ گھروں میں رہ کر پردہ کرتی تھیں۔

اسی طرح صحیح بخاری باب غزوة الطائف میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پانی کے برتن میں کلی کر کے حضرت ابوموسیٰ اور بلالؓ کو عطا فرمایا کہ اس کو پی لیں اور اپنے چہرے پر مل لیں۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ پر وہ کے پیچھے یہ واقعہ دیکھ رہی تھیں انھوں نے اندر سے آواز دے کر ان دونوں بزرگوں سے کہا کہ اس تبرک میں سے کچھ اپنی ماں یعنی ام سلمہؓ کے لئے چھوڑ دینا۔

یہ حدیث بھی شاہد ہے کہ نزولِ حجاب کے بعد ازواجِ مطہرات گھروں اور پردوں کے اندر رہتی تھیں۔

فائدہ: اس روایت میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ ازواجِ مطہرات بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات کی ایسی ہی شائق تھیں جیسے دوسرے مسلمان۔ یہ بھی آپ کی ذاتِ اقدس ہی کی خصوصیت تھی ورنہ بیوی سے جو بے تکلف تعلق شوہر کا ہوتا ہے، اس کے ساتھ اس کے تقدس و عظیم کا یہ درجہ قائم رہنا عادتاً ناممکن ہے۔

اور صحیح بخاری کتاب الادب میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ وہ اور ابوطحہؓ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیسٹا کہیں جا رہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر سوار تھے، آپ کے ساتھ ام المؤمنین حضرت صفیہؓ بھی سوار تھیں، راستہ میں اچانک اونٹ کے ٹھوکر لگی، اور ابوطحہ کے بیان کے مطابق آپ اور حضرت صفیہؓ اونٹ سے گر گئے۔ تو ابوطحہؓ آپ کے پاس حاضر ہوئے، اور عرض کیا اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کر دے آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، تم عورت کی خبر لو، ابوطحہؓ نے پہلے تو اپنا چہرہ کپڑے میں چھپایا، پھر حضرت صفیہؓ کے پاس پہنچے اور ان کے اوپر کپڑا ڈال دیا تو وہ کھڑی ہو گئیں۔ پھر اسی طرح پردہ میں مستوران کو ان کی سواری پر سوار کیا۔

اس واقعہ میں بھی جو ایک حادثہ کی صورت میں اچانک پیش آیا، صحابہ کرام اور ازواجِ مطہرات کا — پردہ کے معاملہ میں اتنا اہتمام اس کی بڑی اہمیت کا شاہد ہے۔

اور جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِذَا خَرَجْتَ الْمَرْأَةُ اسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ رَقَالَ التَّرْمَذِيُّ هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ) معنی یہ ہیں کہ عورت جب گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاک لیتا ہے (یعنی اس کو مسلمانوں میں بُرائی پھیلانے کا ذریعہ بناتا ہے)۔

اور ابن حزمیہ و ابن حبان نے اس حدیث میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں: "وَأَقْرَبُ مَا تَكُونُ مِنْ دُجْبَةٍ تَهَادِي فِي قَعْرِ بَيْتِهَا" یعنی عورت اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے گھر کے بیچ میں مستور ہو۔

اس حدیث میں بھی اس کی شہادت موجود ہے کہ اصل عورتوں کے لئے یہی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھیں باہر نہ نکلیں (ضرورت کے مواقع مستثنیٰ ہیں)۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کَيَسَ لِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ فِي الْخُرُوجِ إِلَّا مُصْطَرَّةً (رواہ الطبرانی کذا فی الکونین ص ۲۶۳ ج ۸) یعنی عورتوں کا باہر نکلنے کے لئے کوئی حصہ نہیں، بجز اس کے کہ باہر نکلنے کے لئے کوئی اضطراری صورت پیش آجائے۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ میں ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، آپ نے صحابہ کرام سے سوال فرمایا اَيُّ شَيْءٍ خَيْرٌ لِلْمَرْأَةِ (عورت کے لئے کیا چیز بہتر ہے) صحابہ کرام خاموش رہے، کوئی جواب نہیں دیا، پھر جب میں گھر میں گیا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا سے میں نے یہی سوال کیا تو انھوں نے فرمایا لَا يَرْثِيَنَّ الرَّجُلُ وَلَا يَرْثِيَنَّ الرَّجُلُ، یعنی عورتوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ نہ وہ مردوں کو دیکھیں اور نہ مرد ان کو دیکھیں۔ میں نے ان کا یہ جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نقل کیا، تو آپ نے فرمایا صَدَقَتْ اِنَّهَا بَصِيحَةٌ مِيَّتِي (انھوں نے درست کہا بیشک وہ میرا ایک جزیرہ ہیں)۔ واقعہ انک میں جو سبب حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے جنگل میں رہ جانے کا پیش آیا وہ یہی تھا

کہ ازواج مطہرات کا پردہ صرف برقع چادر ہی کا نہیں تھا بلکہ وہ سفر میں بھی اپنے ہودج (شعف) میں رہتی تھیں، یہ شعف ہی اونٹ کے اوپر سوار کر دیا جاتا تھا اور اسی طرح اتارا جاتا تھا۔ شعف مسافر کا مثل مکان کے ہوتا ہے۔ اس واقعہ میں جب قافلہ چلنے لگا تو حسب عادت خادموں نے شعف کو یہ سمجھ کر اونٹ پر سوار کر دیا کہ اُمّ المؤمنین اس کے اندر موجود ہیں، اور واقعہ یہ تھا کہ وہ اس میں نہیں تھیں، بلکہ طبعی ضرورت کے لئے باہر گئی ہوئی تھیں۔ اس مخالطہ میں قافلہ روانہ ہو گیا اور اُمّ المؤمنین جنگل میں تنہا رہ گئیں۔ یہ واقعہ بھی اس بات کا قوی شاہد ہے کہ حجاب شرعی کا مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات نے یہی سمجھا تھا کہ عورتیں اپنے مکانات میں، سفر میں ہوں تو اپنے شعف میں رہیں، ان کا وجود مردوں کے سامنے نہ آئے، اور جب سفر کی حالت میں حجاب انک میں

دوسرا درجہ حجاب بالبرقع | ضرورت کے مواقع میں جب عورت کو گھر سے باہر جانا پڑے تو اس وقت کسی برقع یا لمبی چادر کو سر سے پیر تک اوڑھ کر نکلنے

کا حکم ہے، جس میں بدن کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو۔ یہ سورۃ احزاب کی اس آیت سے ثابت ہو جو آگے آرہی ہے، **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّزَوْجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبٍ**، یعنی اے نبی! آپ اپنی ازواج مطہرات اور بنات طاہرات کو اور عام مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیں کہ اپنی جلباب استعمال کریں، جلباب اس لمبی چادر کو کہتے ہیں جس میں عورت سر سے پیر تک مستور ہو جائے (ردی ذلک عن ابن عباسؓ)

ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے استعمالِ جلباب کی صورت یہ نقل کی ہے کہ عورت سر سے پاؤں تک اس میں لپیٹی ہوتی ہو اور چہرہ اور ناک بھی اس سے مستور ہو، صرف ایک آنکھ راستہ دیکھنے کے لئے کھلی ہو۔ اس آیت کی پوری تفسیر آگے آتی ہے، یہاں صرف یہ بتلانا منظور ہے کہ ضرورت کے وقت جب عورت گھر سے نکلنے پر مجبور ہو تو اس کو پردہ کا یہ درجہ اختیار کرنا ضروری ہے کہ جلباب وغیرہ میں سر سے پاؤں تک مستور ہو اور چہرہ بھی بجز ایک آنکھ کے چھپا ہوا ہو۔

یہ صورت بھی باتفاق فقہائے اُمت ضرورت کے وقت جائز ہے، مگر احادیث صحیحہ میں اس صورت کے اختیار کرنے پر بھی چند پابندیاں عائد کی ہیں، کہ خوشبو نہ لگائے ہو، نہ بجنے والا کوئی زیور نہ پہنا ہو، راستہ کے کنارے پر چلے، مردوں کے ہجوم میں داخل نہ ہو وغیرہ۔ یہ ہو کہ سر سے پیر تک سارا بدن مستور ہو، مگر چہرہ اور ہتھیلیاں کھلی ہوں، جن حضرات نے **إِلَّا مَا ظَهَرَ** کی تفسیر چہرے اور ہتھیلیوں سے کی ہے، ان کے نزدیک چونکہ چہرہ اور ہتھیلیاں حجاب سے مستثنیٰ ہو گئیں، اس لئے ان کو کھلا رکھنا جائز ہو گیا۔ (کمار دی عن ابن عباسؓ)

اور جن حضرات نے **مَا ظَهَرَ** سے برقع، جلباب وغیرہ مراد لی ہے وہ اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ (کمار دی عن ابن مسعودؓ) جنھوں نے جائز کہا ہے اُن کے نزدیک بھی یہ شرط ہے کہ فتنہ کا خطرہ نہ ہو، مگر چونکہ عورت کی زینت کا سارا مرکز اس کا چہرہ ہے، اس لئے اس کو کھولنے میں فتنہ کا خطرہ نہ ہونا شاذ و نادر ہے، اس لئے انجام کار عام حالات میں ان کے نزدیک بھی چہرہ وغیرہ کھولنا جائز نہیں۔

ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ تین اماموں نے تو پہلا مذہب اختیار کر کے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی مطلقاً اجازت نہیں دی، خواہ فتنہ کا خوف ہو یا

نہ ہو، امام اعظم ابو حنیفہؒ نے اگرچہ دوسرا مسلک اختیار فرمایا مگر خوفِ فتنہ کا نہ ہونا شرط قرار دیا، اور چونکہ عادتاً یہ شرط مفقود ہو اس لئے فقہاء حنفیہ نے بھی غیر محرموں کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی اجازت نہیں دی۔

مذاہب ائمہ اربعہ کی روایتیں ان مذاہب کی مستند کتابوں کے حوالہ سے رسالہ تفصیل الخطاب بجز احکام القرآن میں مفصل بیان کر دی گئی ہیں، حنفیہ کا اصل مذاہب چونکہ چہرے اور ہتھیلیوں کو حجاب کے مستثنیٰ ہونے کا ہے اس لئے اس جگہ مذاہب حنفیہ کی چند روایات نقل کی جاتی ہیں، جن میں بوجہ خوفِ فتنہ ممانعت کرنے کا حکم مذکور ہے۔

”سمجھ لو کہ کسی عضو کے ستر میں داخل نہ ہونے اور اس کی طرف نظر کے جائز ہونے میں کوئی تلازم نہیں، کیونکہ نظر کا جواز تو اس پر موقوف ہے کہ شہوت کا خطرہ نہ ہو حالانکہ وہ عضو ستر میں داخل نہیں اسی وجہ سے اجنبی عورت کا چہرہ یا کسی بے ریش لڑکے کے چہرے کی طرف نظر کرنا حرام ہے، جب کہ شہوت پیدا ہونے میں شک ہو حالانکہ چہرہ ستر میں داخل نہیں“

إِعْلَمَنَّ أَنَّهُ لَا مُلَاسَمَةَ بَيْنَ كَوْنِهِ لَيْسَ عَوْرَةً وَجَوَازِ النَّظَرِ إِلَيْهِ فَحُلُّ النَّظَرِ مَنُوطٌ لِّعَدَمِ خَشْيَةِ الشَّهْوَةِ مَعَ انْتِقَاءِ الْعَوْرَةِ وَلِذَا احْتَرَأَ النَّظَرُ إِلَى وَجْهِهَا وَوَجْهِهِ إِلَّا مُرِدَّ إِذَا شَلَقَ فِي الشَّهْوَةِ وَلَا عَوْرَةً ،

فتح القدیر، ص ۱۸۱ ج ۱

فتح القدیر کی مذکورہ عبارت سے خطرہ شہوت کی یہ تفسیر بھی معلوم ہو گئی کہ اگرچہ بالفعل کوئی شہوانی نیت نہ ہو مگر ایسا خیال پیدا ہو جانے کا شک ہو۔ جب ایسا شک ہو تو نہ صرف اجنبی عورتوں کے بلکہ بے ریش لڑکوں کے چہرے کو دیکھنا بھی حرام ہے، اور خیال شہوت پیدا ہونے کی تشریح جامع الرموز میں یہ کی ہے کہ نفس میں اس کے قریب ہونے کا میلان پیدا ہو جائے، اور یہ ظاہر ہے کہ نفس میں اتنا میلان بھی پیدا نہ ہو، یہ چیز تو سلف کے زمانے میں بھی شاذ تھی۔ حدیث میں حضرت فضل کو ایک عورت کی طرف دیکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے چہرے کو اپنے ہاتھ سے دوسری طرف پھیر دینا اس کی واضح دلیل ہے تو اس زمانہ فساد میں کون کہہ سکتا ہے کہ اس خطرے سے خالی ہے۔

اور شمس الاممہ سرخسی نے اس مسئلہ پر مفصل بحث کے بعد لکھا ہے :

وَهَذَا أَكْلُهُ إِذَا لَمْ يَكُنِ النَّظَرُ

”یہ چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف نظر کا

عَنْ شَهْوَةٍ فَإِنْ كَانَ يَعْلَمُ
أَنَّهُ إِنْ نَظَرَ أَشْتَهَى
كَمْ يَجِلُّ لَهُ النَّظَرُ إِلَى
شَيْءٍ مِّنْهَا
(مبسط، ص ۱۵۲، ج ۱۰)

جائز ہونا صرف اس صورت میں ہی
جبکہ یہ نظر شہوت سے نہ ہو، اور اگر
دیکھنے والا جانتا ہے کہ چہرہ دیکھنے سے
بُرے خیالات پیدا ہو سکتے ہیں تو اس
کو عورت کی کسی چیز کی طرف بھی نظر کرنا
حلال نہیں۔

اور علامہ شامی نے رد المحتار کتاب الکراہیۃ میں فرمایا ہے:-

فَإِنْ خَافَ الشَّهْوَةَ أَوْ شَقَّ
إِمْتِنَاعَ النَّظَرِ إِلَى وَجْهِهَا
فَجِلُّ النَّظَرِ مُقَيَّدٌ بِإِعْدَالِ
الشَّهْوَةِ وَإِلَّا فَحَرَامٌ وَهَذَا
فِي زَمَانِهِمْ وَأَمَّا فِي زَمَانِنَا
فَمَنْعٌ مِنَ الشَّابَةِ إِلَّا النَّظَرُ
لِحَاجَةٍ كَقَاضٍ وَشَاهِدٍ يَحْكُمُ
وَمِثْلِهِمْ وَأَيْضًا قَالَ فِي شَهْوَةِ
الصَّلَاةِ وَتَمْنَعُ الشَّابَةِ مِنْ
كَشْفِ الْوَجْهِ بَيْنَ رَجَالٍ
لَا لِأَنَّهُ عَوْرَةٌ بَلْ لِخَوْفِ
الْفِتْنَةِ

”اگر شہوت کا خطرہ یا شک ہو تو عورت
کے چہرے کی طرف نظر ممنوع ہوگی،
کیونکہ نظر کا حلال ہونا شہوت نہ ہونے
کے ساتھ مشروط ہے، اور جب یہ شرط
نہ ہو تو حرام ہے، اور یہ بات سلف کے
زمانے میں تھی لیکن ہمارے زمانے میں تو
مطلقاً عورت کی طرف نظر ممنوع ہے
مگر یہ کہ کسی حاجت شرعیہ کی وجہ سے
نظر کرنا پڑے، جیسے قاضی یا شاہد
جن کو کسی معاملہ میں اس عورت کے
متعلق شہادت یا فیصلہ دینا پڑے
اور مشروط صلوة میں فرمایا کہ جوان عورت کو (جب)

تلاصہ اس بحث و اختلاف فقہاء کا یہ ہے کہ امام شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ
نے جو ان عورت کی طرف نظر کرنے کو عادت عامہ کی بناء پر سبب فتنہ قرار دے کر اس کے
مطلقاً منع کر دیا، خواہ واقع میں فتنہ ہو یا نہ ہو، جیسے شریعت کے بہت سے احکام میں
اس کی نظائر موجود ہیں۔ مثلاً سفر چونکہ عادت مشقت و محنت کا سبب ہوتا ہے، اس لئے
خود سفر ہی کو مشقت کا حکم دے کر تمام احکام رخصت کے سفر متحقق ہونے پر دائر کر دئے
خواہ کسی شخص کو سفر میں کوئی بھی مشقت نہ ہو، بلکہ اپنے گھر سے زیادہ آرام ملے، مگر قصر نماز
اور رخصت روزہ وغیرہ کے احکام اس کو بھی شامل ہیں۔ اسی طرح نیند کی حالت میں
چونکہ انسان بے خبر ہوتا ہے اور عادت ریاح خارج ہو جاتی ہیں، اس لئے خود نیند ہی کو

خروج ریح کے قائم مقام قرار دے کر نیند سے وضو ٹوٹ جانے کا حکم دیدیا خواہ واقع میں ریح خارج ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

مگر امام اعظم ابوحنیفہؒ نے عورت کے چہرے اور ہتھیلیاں کھولنے کو یہ درجہ نہیں دیا کہ چہرہ کھولنے ہی کو فتنہ کا قائم مقام قرار دیدیں، بلکہ حکم اس پر دائر رکھا کہ جہاں فتنہ یعنی عورت کی طرف قریب ہونے کے میلان کا خطرہ یا احتمال ہو وہاں ممنوع ہے اور جہاں یہ احتمال نہ ہو جائز ہے۔ مگر اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ اس زمانے میں ایسا احتمال نہ ہو باکھل شاذ و نادر ہے اس لئے متاخرین فقہاء حنفیہ نے بھی بالآخر وہ بھی حکم دیدیا جو ائمہ ثلاثہ نے دیا تھا، کہ جو عورت کے چہرے یا ہتھیلیوں کی طرف بھی نظر ممنوع ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ اب باتفاق ائمہ اربعہ یہ تیسرا درجہ پردہ کا ممنوع ہو گیا کہ عورت برقع چادر وغیرہ میں پورے بدن کو چھپا کر مگر صرف چہرہ اور ہتھیلیوں کو کھول کر مردوں کے سامنے آئے۔ اس لئے اب پردے کے صرف پہلے ہی دو درجے رہ گئے، ایک اصل مقصود یعنی عورتوں کا گھروں کے اندر رہنا بلا ضرورت باہر نہ نکلنا، اور دوسرا یعنی برقع وغیرہ کے ساتھ نکلنا ضرورت کی بناء پر بوقت ضرورت و بقدر ضرورت۔

مسئلہ: پردہ کے احکام مذکورہ میں بعض صورتیں مستثنیٰ بھی ہیں، مثلاً بعض مرد یعنی محارم پردہ سے مستثنیٰ ہیں اور بعض عورتیں مثلاً بہت بوڑھی وہ بھی پردے کے عام حکم کی قدر مستثنیٰ ہیں۔ ان کی تفصیل کچھ تو سورۃ نور میں گذر چکی ہے کچھ آگے سورۃ احزاب کی ان آیات میں آئے گی جن میں یہ استثنا مذکور ہے۔

پردہ کے مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر اپنے رسالہ تفصیل الخطاب فی احکام الحجاب کا کچھ خلاصہ یہاں لکھ دیا ہے جو عوام کے لئے کافی ہے، پوری تحقیق مطلوب ہو تو رسالہ مذکورہ میں دیکھی جاسکتی ہے، یہ رسالہ احکام القرآن تفسیر سورۃ احزاب میں شائع ہو چکا ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر، اے ایمان والو !

صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ⑤۱

رحمت بھیجو اس پر اور سلام بھیجو سلام کہہ کر

خلاصہ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں ان پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اے ایمان والو تم بھی آپ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو (تاکہ آپ کا حق عظمت جو تمھارے ذمہ ہے ادا ہو جائے)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ خصوصیات و امتیازات کا ذکر تھا، جن کے ضمن میں ازواجِ مطہرات کے پردہ کا حکم آیا تھا، اور آگے بھی کچھ احکام پردے کے آئیں گے، درمیان میں اس چیز کا حکم دیا گیا جس کے لئے یہ سب خصوصیات و امتیازات رکھے گئے ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان کا اظہار اور آپ کی عظمت و محبت اور اطاعت کی ترغیب ہے۔

اصل مقصود آیت کا مسلمانوں کو یہ حکم دینا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام بھیجا کریں، مگر اس کی تعبیر و بیان میں اس طرح فرمایا کہ پہلے حق تعالیٰ نے خود اپنا اور اپنے فرشتوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عملِ صلوٰۃ کا ذکر فرمایا، اس کے بعد عام مؤمنین کو اس کا حکم دیا، جس میں آپ کے شرف اور عظمت کو اتنا بلند فرما دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جس کام کا حکم مسلمانوں کو دیا جاتا ہے وہ کام ایسا ہے کہ خود حق تعالیٰ اور اس کے فرشتے بھی وہ کام کرتے ہیں تو عام مؤمنین جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات بے شمار ہیں ان کو تو اس عمل کا بڑا اہتمام کرنا چاہئے۔ اور ایک فائدہ اس تعبیر میں یہ بھی ہے کہ اس سے درود و سلام بھیجنے والے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی فضیلت یہ ثابت ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کام میں شریک فرمایا جو کام حق تعالیٰ خود بھی کرتے ہیں اور اس کے فرشتے بھی۔

صَلَوٰۃ وَّسَلَامٌ کے معنی | لفظ صَلَوٰۃ عربی زبان میں چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، رحمت، دعا، مدح و ثناء، آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ

کی طرف نسبتِ صلوٰۃ کی ہے اس سے مراد رحمت نازل کرنا ہے، اور فرشتوں کی طرف سے صلوٰۃ ان کا آپ کے لئے دعا کرنا ہے، اور عام مؤمنین کی طرف سے صلوٰۃ کا مفہوم دعا اور مدح و ثناء کا مجموعہ ہے۔ عامۃ مفسرین نے یہی معنی لکھے ہیں۔ اور امام بخاریؒ نے

ابو العالیہ سے یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ سے مراد آپ کی تعظیم اور فرشتوں کے سامنے مدح و ثناء ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف آپ کی تعظیم دنیا میں تو یہ ہے کہ آپ کو بلند مرتبہ عطا فرمایا کہ اکثر مواقع اذان و اقامت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ آپ کا ذکر شامل کر دیا ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دین کو دنیا بھر میں پھیلادیا، اور غالب کیا، اور آپ کی شریعت پر عمل قیامت تک جاری رکھا، اس کی بنا پر آپ کی شریعت کو محفوظ رکھنے کا ذمہ حق تعالیٰ نے لے لیا۔ اور آخرت میں آپ کی تعظیم یہ ہے کہ آپ کا مقام تمام خلایق سے بلند و بالا کیا، اور جس وقت کسی پیغمبر اور فرشتے کو شفاعت کی مجال نہ تھی اس حال میں آپ کو مقام شفاعت عطا فرمایا، جس کو مقام محمود کہا جاتا ہے۔

اس معنی پر جو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ صلوٰۃ و سلام میں تو روایات حدیث کے مطابق آپ کے ساتھ آپ کے آل و اصحاب کو بھی شامل کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور مدح و ثناء میں آپ کے سوا کسی کو کیسے شریک کیا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب روح المعانی وغیرہ میں یہ دیا گیا ہے کہ تعظیم اور مدح و ثناء وغیرہ کے درجات بہت ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا اعلیٰ درجہ حاصل ہے، اور ایک درجہ میں آل و اصحاب اور عام مؤمنین بھی شامل ہیں۔

اور ایک لفظ صلوٰۃ سے بیک وقت متعدد معنی رحمت، دعا، تعظیم و ثناء مراد لیتا جو اصطلاح میں عموم مشترک کہلاتا ہے، اور بعض حضرات کے نزدیک وہ جائز نہیں، اس لئے اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ لفظ صلوٰۃ کے اس جگہ ایک ہی معنی لئے جائیں، یعنی آپ کی تعظیم اور مدح و ثناء اور خیر خواہی پھر یہ معنی جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں تو اس کا حاصل رحمت ہوگا، اور فرشتوں کی طرف منسوب ہوں تو دعا و استغفار ہوگا، عام مؤمنین کی طرف منسوب کیا جائے تو دعا اور مدح و ثناء و تعظیم کا مجموعہ ہوگا۔

اور لفظ سلام مصدر بمعنی السلامة ہے، جیسے سلام بمعنی ملائت مستعمل ہوتا ہے۔ اور مراد اس سے نقائص و عیوب اور آفتوں سے سالم رہنا ہے۔ اور اَلْسَلَامُ عَلَیْکَ کے معنی یہ ہیں کہ نقائص اور آفات سے سلامتی آپ کے ساتھ رہے۔ اور عربی زبان کے قاعدہ سے یہاں حرف غلی کا موقع نہیں، مگر چونکہ لفظ سلام معنی ثناء کو متضمن ہے، اس لئے حرف غلی کے ساتھ عَلَیْکَ یا عَلَیْکُمْ کہا جاتا ہے۔

اور بعض حضرات نے یہاں لفظ سلام سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات لی ہے،

کیونکہ سلام اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ہے تو مراد اَلْسَّلَامُ عَلَیْکَ کی یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت و رعایت پر متولی اور کفیل ہے۔

صَلوٰۃ و سلام کا طریقہ صحیح بخاری و مسلم وغیرہ سب کتب حدیث میں یہ حدیث آئی ہے کہ حضرت کعب بن عجرہ نے فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی

تو ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ (آیت میں) میں دو چیزوں کا حکم ہے (صلوٰۃ اور سلام) سلام کا طریقہ تو میں معلوم ہو چکا ہے کہ اَلْسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ کہتے ہیں (صلوٰۃ کا طریقہ بھی بتلا دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ الفاظ کہا کرو اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰهٖمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرٰهٖمَ اِنَّکَ تَحِبُّ الْحَمْدَ اَللّٰهُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰهٖمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرٰهٖمَ اِنَّکَ تَحِبُّ الْحَمْدَ۔ دوسری روایات میں اس میں کچھ کلمات اور بھی منقول ہیں۔

اور صحابہ کرام کے سوال کرنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کو سلام کرنے کا طریقہ تو تشہد (یعنی الخیات) میں پہلے سکھایا جا چکا تھا کہ اَسَلِّمُ عَلَیْکَ اَیُّهَا الْمُنٰنِیُّ وَ سَلِّمَ اللّٰہُ وَ بَرَکَاتُہُ کہا جائے، اس لئے لفظ صلوٰۃ میں انہوں نے اپنی طرف سے الفاظ مقرر کرنا پسند نہیں کیا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر کے الفاظ صلوٰۃ متعین کرائے۔ اسی لئے نماز میں عام طور پر اپنی الفاظ کے ساتھ صلوٰۃ کو اختیار کیا گیا ہی، مگر یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس میں تبدیلی ممنوع ہو، کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلوٰۃ یعنی درود شریف کے بہت سے مختلف صیغے منقول و ماثور ہیں صلوٰۃ و سلام کے حکم کی تعمیل ہر اس صیغہ سے ہو سکتی ہے جس میں صلوٰۃ و سلام کے الفاظ ہوں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعینہ منقول بھی ہوں، بلکہ جس عبارت سے بھی صلوٰۃ و سلام کے الفاظ ادا کئے جاتیں اس حکم کی تعمیل اور درود شریف کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جو الفاظ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں وہ زیادہ بابرکت اور زیادہ ثواب کے موجب ہیں، اسی لئے صحابہ کرام نے الفاظ صلوٰۃ آپ سے متعین کرانے کا سوال فرمایا تھا۔

مسئلہ: قعدۂ نماز میں توقیامت تک الفاظ صلوٰۃ و سلام اُسی طرح کہنا

مسنون ہے، جس طرح اوپر منقول ہوئے ہیں اور خارج نماز میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود مخاطب ہوں جیسا کہ آپ کے عہد مبارک میں وہاں تو وہی الفاظ الصلوٰۃ و اَلْسَّلَامُ عَلَیْکَ کے اختیار کئے جاتے تھے، آپ کی وفات کے بعد روضۂ اقدس کے سامنے

جب سلام عرض کیا جائے تو اس میں بھی صیغۃ السلام علیک کا اختیار کرنا منسوخ ہے۔ اس کے علاوہ جہاں غائبانہ صلوٰۃ و سلام پڑھا جائے تو صحابہ و تابعین اور ائمہ امت سے صیغۃ غائب کا استعمال کرنا منقول ہے، مثلاً "صلی اللہ علیہ وسلم" جیسا کہ عام محدثین کی کتابیں اس سے لبریز ہیں۔

صلوٰۃ و سلام کے مذکورہ جو طریقہ صلوٰۃ و سلام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک طریقہ کی حکمت اور آپ کے عمل سے ثابت ہوا اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم سب مسلمان آپ کے لئے اللہ تعالیٰ سے رحمت و سلامتی کی دعا کریں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقصود آیت کا تو یہ تھا کہ ہم آپ کی تعظیم و تکریم کا حق خود ادا کریں، مگر طریقہ یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق تعظیم و اطاعت پورا ادا کرنا ہمارے کسی کے بس میں نہیں، اس لئے ہم پر یہ لازم کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں (روح)

نماز کے تعدد اخیرہ میں صلوٰۃ (درود شریف) سنت مؤکدہ تو صلوٰۃ و سلام کے احکام سب کے نزدیک ہے، امام شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ کے

نزدیک واجب ہی جس کے ترک سے نماز واجب اعادہ ہو جاتی ہے۔
مسئلہ: اس پر بھی جمہور فقہاء کا اتفاق ہے جب کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرے یا نئے تو اس پر درود شریف واجب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حدیث میں آپ کے ذکر مبارک کے وقت درود شریف نہ پڑھنے پر وعید آئی ہے، جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: رَغِمَ أَنْفٌ رَجَلٌ ذُكِرْتُ عَنْهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ، یعنی ذلیل ہو وہ آدمی جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے (قال الترمذی حدیث حسن درواہ ابن السنی باسناد جید)

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے اَلْبَحِيلُ مَنْ ذُكِرْتُ عَنْهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ یعنی بخیل وہ شخص ہے جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

مسئلہ: اگر ایک مجلس میں آپ کا ذکر مبارک بار بار آئے تو صرف ایک مرتبہ درود پڑھنے سے واجب ادا ہو جاتا ہے، لیکن مستحب یہ ہے کہ جتنی بار ذکر مبارک خود کرے یا کسی سے سنے ہر مرتبہ درود شریف پڑھے۔ حضرات محدثین سے زیادہ کون آپ کا ذکر کر سکتا ہے کہ اُن کا ہر وقت کا مشغلہ ہی حدیث رسولؐ ہے، جس میں ہر وقت بار بار آپ کا

ذکر آتا ہے تمام ائمہ حدیث کا دستور یہی رہا ہے کہ ہر مرتبہ درود و سلام پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ تمام کتب حدیث اس پر شاہد ہیں۔ انھوں نے اس کی بھی پروا نہیں کی کہ اس تکرار صلوٰۃ و سلام سے کتاب کی ضخامت کافی بڑھ جاتی ہے کیونکہ اکثر تو چھوٹی چھوٹی حدیثیں آتی ہیں جن میں ایک دو سطر کے بعد نام مبارک آتا ہے، اور بعض جگہ تو ایک سطر میں ایک سے زیادہ مرتبہ نام مبارک مذکور ہوتا ہے، حضرات محدثین کہیں صلوٰۃ و سلام ترک نہیں کرتے۔

مَسْئَلَةٌ: جس طرح زبان سے ذکر مبارک کے وقت زبانی صلوٰۃ و سلام واجب ہے اسی طرح قلم سے لکھنے کے وقت صلوٰۃ و سلام کا قلم سے لکھنا بھی واجب ہے، اور اس میں جو لوگ حروف کا اختصار کر کے "صلعم" لکھ دیتے ہیں یہ کافی نہیں، پورا صلوٰۃ و سلام لکھنا چاہئے۔

مَسْئَلَةٌ: ذکر مبارک کے وقت افضل و اعلیٰ اور مستحب تو یہی ہے کہ صلوٰۃ اور سلام دونوں پڑھے اور لکھے جائیں، لیکن اگر کوئی شخص ان میں سے ایک یعنی صرف صلوٰۃ یا صرف سلام پر اکتفا کرے تو جمہور فقہاء کے نزدیک کوئی گناہ نہیں۔ شیخ الاسلام نوویؒ وغیرہ نے دونوں میں سے صرف ایک پر اکتفا کرنا مکروہ فرمایا ہے۔ ابن حجر ہیتمیؒ نے فرمایا کہ ان کی مراد کراہت سے خلاف اولیٰ ہونا ہے، جس کو اصطلاح میں مکروہ تنزیہی کہا جاتا ہے۔ اور علماء امت کا مسلسل عمل اس پر شاہد ہے کہ وہ دونوں ہی کو جمع کرتے ہیں، اور بعض اوقات ایک پر بھی اکتفا کر لیتے ہیں۔

مَسْئَلَةٌ: لفظ صلوٰۃ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کے لئے استعمال کرنا جمہور علماء کے نزدیک جائز نہیں۔ امام بیہقی نے اپنے سنن میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے: لَا يُصَلِّي عَلَى أَحَدٍ إِلَّا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيَكُنْ يَدْعِي الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ بِالْإِسْتِغْفَارِ

امام شافعیؒ کے نزدیک غیر نبی کے لئے لفظ صلوٰۃ کا استعمال مستقلاً مکروہ ہے، امام اعظم ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا بھی یہی مذہب ہے، البتہ تبعاً جائز ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام کے ساتھ آل و اصحاب یا تمام مومنین کو شریک کر لے اس میں مضائقہ نہیں۔

اور امام جوینیؒ نے فرمایا کہ جو حکم لفظ صلوٰۃ کا ہے وہی لفظ سلام کا بھی ہے کہ غیر نبی کے لئے اس کا استعمال درست نہیں، بجز اس کے کہ کسی کو خطاب کرنے کے وقت بطور تحیہ کے التسلام علیکم کہے، یہ جائز و مستنون ہے۔ مگر کسی غائب کے نام کے ساتھ

”علیہ السلام“ کہنا اور لکھنا غیر نبی کے لئے درست نہیں (تخصائص کبریٰ سیوطی ص ۲۶۲) علامہ لقانی نے فرمایا کہ قاضی عیاض نے فرمایا ہے کہ محققین علماء امت اس طرف گزریں اور میرے نزدیک بھی یہی صحیح ہے، اور اسی کو امام مالک، سفیان اور بہت سے فقہاء و مکتبین نے اختیار کیا ہے کہ صلوٰۃ تسلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کے لئے مخصوص ہے غیر نبی کے لئے جائز نہیں، جیسے لفظ سبحانہ اور تعالیٰ، اللہ جل شانہ کے لئے مخصوص ہے۔ انبیاء کے سوا عام مسلمانوں کے لئے مغفرت اور رضا کی دعا ہونا چاہئے، جیسے قرآن میں حضرات صحابہ کے متعلق آیا رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ وَ رَضُوا عَنْہُ (روح المعانی) صلوٰۃ و سلام کے احکام کی مفصل بحث احقر کے رسالہ تنقیح الکلام فی احکام الصلوٰۃ والسلام میں ہو جو بزبان عربی احکام القرآن سورۃ احزاب کا جزم ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَ

جو لوگ ستاتے ہیں اللہ کو اور اس کے رسول کو اُن کو پھٹکارا اللہ نے دنیا میں اور

الْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا ۝۵۸ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ

آخرت میں اور تیار رکھا ہوا ان کے واسطے ذلت کا عذاب۔ اور جو لوگ تہمت لگاتے ہیں مسلمان

الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَغْيٍ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدْ احْتَمَلُوا

مردوں کو اور مسلمان عورتوں کو بدون گناہ کئے تو اٹھایا انھوں نے بوجھ

كُفْرًا وَ اِثْمًا مُّبِينًا ۝۵۹

جھوٹے گناہ اور صریح گناہ کا

خُلاصۃ تفسیر

بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رقصداً

ایذا دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر دنیا و آخرت میں لعنت کرتا ہے اور ان کے لئے ذلیل

کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے، اور (اسی طرح) جو لوگ ایمان والے مردوں اور ایمان

والی عورتوں کو بدون اس کے کہ انہوں نے کچھ (ایسا کام) کیا ہو (جس سے وہ مستحق سزا ہو جائیں) ایذا پہنچاتے ہیں

تو وہ لوگ بہتان اور صریح گناہ کا (اپنے اوپر) بار لیتے ہیں (یعنی اگر وہ ایذا قبولی ہے تو بہتان ہے اور اگر فعلی ہے تو مطلق گناہ ہے)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں مسلمانوں کو ان چیزوں پر تنبیہ کی گئی تھی جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا و تکلیف پہنچتی تھی، مگر کچھ مسلمان ناواقفیت یا بے توجہی کی وجہ سے بلا قصد ایذا اس میں مبتلا ہو جاتے تھے، جیسا کہ آپ کے پیوت میں بلا دعوت چلے جانا یا دعوت کے وقت بہت پہلے آکر بیٹھ جانا یا کھانے کے بعد آپ کے گھر میں یا بھی بات چیت میں مشغول ہو کر دیر لگانا وغیرہ جن پر آیت **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُدْعُوا إِلَيْكُمْ فِيهَا** میں تنبیہ کی گئی ہے۔ یہ وہ ایذا تھی جو بلا قصد و ارادہ غفلت سے پہنچ جاتی تھی، اس پر تو صرف تنبیہ کر دینا کافی سمجھا گیا۔ مذکورہ صدر و آیاتوں میں اس ایذا و تکلیف کا ذکر ہے جو مخالفین اسلام کفار و منافقین کی طرف سے قصداً آپ کو پہنچاتی جاتی تھی۔ اسی لئے خلاصہ تفسیر میں یہاں قصد کا لفظ بڑھایا ہے، جس میں جسمانی ایذائیں بھی داخل ہیں، جو مختلف اوقات میں کفار کے ہاتھوں آپ کو پہنچتی ہیں اور روحانی ایذائیں بھی جو آپ پر طعن و تشنیع اور ازدواج مطہرات پر بہتان تراشی کے ذریعہ پہنچاتی گئیں۔ اس بالا ارادہ ایذا پہنچانے پر لعنت اور عذاب شدید کی وعید بھی آیت مذکورہ میں آتی ہے۔

اس آیت کے شروع میں جو یہ ارشاد ہوا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچاتے ہیں اس میں ایذا پہنچانے سے مراد وہ افعال و اقوال ہیں جو عادتاً ایذا کا سبب بنا کرتے ہیں۔ اگرچہ حق تعالیٰ کی ذات پاک ہر تاثر و انفعال سے بالاتر ہے کسی کی مجال ہی نہیں کہ اس تک کوئی تکلیف پہنچا سکے، لیکن ایسے افعال جن سے عادتاً ایذا پہنچا کرتی ہے ان کو ایذا اللہ سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

اس میں ائمہ تفسیر کا اختلاف ہے کہ یہاں پر اللہ کو ایذا دینے سے کیا مراد ہے؟ بعض ائمہ تفسیر نے ان افعال و اقوال کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے، جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی احادیث میں بتلایا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایذا کا سبب ہیں، مثلاً حوادث و مصائب کے وقت زمانہ کو برا کہنا کہ درحقیقت فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہے، یہ لوگ زمانہ کو فاعل سمجھ کر گالیاں دیتے تھے تو درحقیقت وہ فاعل حقیقی تک پہنچتی تھیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ جان دار چیزوں کی تصویریں بنانا اللہ تعالیٰ کی ایذا کا سبب ہے۔ تو آیت میں اللہ کو ایذا دینے سے مراد یہ اقوال یا افعال ہوئے۔ اور دوسرے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ یہاں درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی ایذا سے روکنا اور اس پر وعید کرنا مقصود ہے۔ مگر آیت میں ایذا پر رسول کو ایذا حق تعالیٰ کے عنوان سے تعبیر کر دیا گیا، کیونکہ آپ کو ایذا پہونچانا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو ایذا پہونچانا ہے جیسا کہ حدیث میں آگے آتا ہے۔ اور قرآن کے سیاق و سباق سے بھی ترجیح اسی دوسری قول کی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ پہلے بھی ایذا پر رسول کا بیان تھا اور آگے بھی اسی کا بیان آ رہا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا کا اللہ تعالیٰ کے لئے ایذا ہونا حضرت عبدالرحمن بن مغفل مرنی کی روایت سے ثابت ہے کہ:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو اللہ سے ڈرو ان کو میرے بعد اپنی اعتراضات و تنقیدات کا نشانہ نہ بناؤ، کیونکہ ان سے جس نے محبت کی میری محبت کی وجہ سے کی او جس نے بغض رکھا میرے بغض کی وجہ سے رکھا، اور جس نے ان کو ایذا پہونچائی اس کو مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا دی اور جس نے اللہ کو ایذا دی تو قریب ہو کہ اللہ تعالیٰ اس سے گرفتار ہو۔

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللَّهَ فِي أَصْحَابِي لَا تَتَّخِذُوا هُمْ غُرَضًا مِنْ بَعْدِي فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحَبِّي أَحَبَّهُمْ وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِي أَبْغَضَهُمْ وَمَنْ أَذَاهُمْ فَقَدْ أَذَانِي وَمَنْ أَذَى لِي فَقَدْ أَذَى اللَّهِ وَمَنْ أَذَى اللَّهِ يُوَسِّدْكَ أَنْ يَأْخُذَ

(ترمذی)

اس حدیث سے جیسا یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا سے اللہ تعالیٰ کی ایذا ہوتی ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام میں سے کسی کو ایذا پہونچانا یا ان کی شان میں گستاخی کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا ہے۔ اس آیت کے شان نزول کے متعلق متعدد روایات ہیں بعض ہیں کہ یہ حضرت صدیق عاشرہؓ پر بہتان لگانے کے متعلق نازل ہوئی ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہو کہ جس زمانہ میں حضرت صدیق عاشرہؓ پر بہتان باندھا گیا تو عبداللہ بن ابی منافق کے گھر میں کچھ لوگ جمع ہوئے اور اس بہتان کو پھیلانے چلتا کرنے کی باتیں کرتے تھے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے اس کی شکایت فرمائی کہ یہ شخص مجھے ایذا پہونچاتا ہے۔ (مظہری)

بعض روایات میں ہے کہ حضرت صفیہؓ سے نکاح کے وقت کچھ منافقین نے طعن کیا اس کے متعلق نازل ہوئی۔ اور صحیح بات یہی ہے کہ یہ آیت ہر ایسے معاملہ کے متعلق

نازل ہوئی ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچے اس میں صدیقہ عائشہؓ پر بہتان بھی داخل ہے اور حضرت صفیہؓ اور زینبؓ کے نکاحوں پر طعن و تشنیع بھی شامل ہے دوسرے صحابہ کرام کو برا کہنا اور ان پر تبرّاء کرنا بھی داخل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طرح کی ایذا پہنچانے کا کفر ہے | **مَسَّ عَلَیْهِ** جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طرح کی ایذا پہنچائے، آپ کی ذات یا صفات میں کوئی عیب نکالے خواہ صراحت ہو یا کنایت وہ کافر ہو گیا، اور اس آیت کی رو سے اُس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت دنیا میں بھی ہوگی اور آخرت میں بھی (کذا قال القاضی ثناء اللہ فی التفسیر المنطوری)

دوسری آیت میں عام مؤمنین کو ایذا پہنچانے کے حرام اور بہتان عظیم ہونے کو بیان کیا ہے جبکہ وہ شرعاً اس کے مستحق نہ ہوں۔ عام مؤمنین میں یہ قید اس لئے لگائی کہ ان میں دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس کے بدلے میں اس کو ایذا دینا شرعاً جائز ہے، اور پہلی آیت میں چونکہ معاملہ اللہ و رسول کی ایذا کا تھا اس میں کوئی قید نہیں لگائی اس لئے کہ وہاں جائز ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں۔

کسی مسلمان کو بغیر وجہ شرعی | **عَظِيمًا** سے کسی مسلمان کو بغیر وجہ شرعی کے کسی قسم کی ایذا دیکھ پہنچانا حرام ہے اور دیکھ پہنچانے کی حرمت ثابت ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:-

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَ يَدِهِ وَ اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلَى دِمَائِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ (منطوری)

”مسلمان تو صرف وہ آدمی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے سب مسلمان محفوظ ہوں کسی کو تکلیف نہ پہنچائے، اور مؤمن تو صرف وہی ہے جس سے لوگ اپنے خون اور مال کے معاملہ میں محفوظ و مامون ہوں“

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَنِّ وَاٰجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ

اے نبی کہہ دے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں کو

مِّنْ زِينَةٍ عَلَيْهِنَّ مِّنْ جَلَا بِسِيْهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰی اَنْ يَّعْرَفْنَ

نیچے لٹکالیں اپنے اوپر کھوڑی سی اپنی چادریں، اس میں بہت قریب ہے کہ پہچانی پڑیں تو

فَلَا يُؤْذِينَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ

کوئی ان کو دستانے، اور ہر اللہ بخشنے والا مہربان - البتہ اگر باز نہ آئے

الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي

منافق اور جن کے دل میں رگ ہے اور جھوٹی خبریں اڑانے والے

الْمَدِينَةِ لَنُغْرِبَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۝

مدینہ میں تو ہم لگا دیں گے تجھ کو ان کے پیچھے پھرنے رہنمائی تیرے ساتھ اس شہر میں مگر تھوڑی دنوں

مَلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثَقِفُوا أَخَذُوا وَقَتْلُوا تَقْتِيلًا ۝ سُنَّةَ اللَّهِ

پھٹکائے ہوئے، جہاں پائے گئے پکڑے گئے، اور مائے گم جان سے - دستور پڑا ہوا ہے اللہ کا

فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝

ان لوگوں میں جو پہلے ہو چکے ہیں اور تو نہ دیکھے گا اللہ کی حیل بدلتی -

خلاصہ تفسیر

اے پیغمبر اپنی بیبیوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ (سرے) نیچی کر لیا کریں اپنے (چہرے کے) اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں اس سے جلدی پہچان ہو جایا کرے گی تو آزار نہ دی جایا کریں گی یعنی کسی ضرورت سے باہر نکلنا پڑے تو چادر سے سر اور چہرہ بھی چھپا لیا جائے جیسا کہ سورۃ نور کے ختم کے قریب غُیُورُ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ میں اس کی تفسیر روایت سے گذر چکی ہے، چونکہ کنیزوں کے لئے سر فی نفہ داخل ستر نہیں، اور چہرہ کھولنے میں ان کو آزاد عورتوں سے زیادہ رخصت ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی خدمت میں لگی رہتی ہیں، اس لئے کام کاج کے لئے ان کو باہر نکلنے اور چہرہ وغیرہ کھولنے کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے، بخلاف آزاد عورتوں کے کہ وہ اتنی مجبور نہیں، اور چونکہ او با ش لوگ آزاد عورتوں کو چھیڑنے کی ہمت ان کی خاندانی وجاہت و حما کی وجہ سے نہ کرتے تھے، کنیزوں کو چھیڑتے تھے، بعض اوقات کنیزوں کے دھوکے میں آزاد عورتوں کو بھی چھیڑنے لگتے تھے، اس لئے اس آیت نے آزاد عورتوں کو کنیزوں سے ممتاز کرنے کے لئے بھی اور اس لئے بھی کہ سر اور گردن وغیرہ ان کا ستر میں داخل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج و بنات اور عام مسلمانوں کی بیبیوں کو یہ حکم دیا کہ

لمبی چادر میں مستور ہو کر نکلیں جس کو سر سے کچھ نیچے چہرے پر لٹکالیا کریں جس کو ارد میں گھونٹ کر ناکہتے ہیں۔ اس حکم سے پردہ شرعی کے حکم کی تعمیل بھی ہو جائے گی اور بہت سہولت کے ساتھ اوباش اور شریر لوگوں سے حفاظت بھی رہے گی۔ غیر حرائر یعنی کنیزیں سوان کی حفاظت کا انتظام اگلی آیت میں آئے گا، اور اس چہرہ کے اور سر کے ڈھانکنے میں اگر کوئی کمی یا بے احتیاطی بلا قصد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (اس کو معاف کر دے گا) آگے ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی جو کنیزوں کو چھیڑا کرتے تھے اور ان لوگوں کو بھی جو ایک دوسری شرارت کے مرتکب تھے کہ مسلمانوں کے خلاف غلط افواہیں پھیلا کر ان کو پریشان کرنا چاہتے تھے (فرمایا) یہ (خاص اصل) منافقین اور (عام منافقین میں سے) وہ لوگ جن کے دلوں میں (شہوت پرستی کی) خرابی ہے (جس کی وجہ سے کنیزوں کو چھیڑتے اور پریشان کرتے ہیں) اور (انہی منافقین میں) وہ لوگ جو مدینہ میں (جھوٹی اور پریشان کرنے والی) افواہیں اڑایا کرتے ہیں (یہ لوگ) اگر (اپنی ان حرکتوں سے) باز نہ آئے تو ضرور (ایک نہ ایک دن) ہم آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے (یعنی ان کے مدینہ سے اخراج کا حکم کر دیں گے) پھر اس حکم کے بعد (یہ لوگ آپ کے پاس مدینہ میں بہت ہی کم رہنے پائیں گے وہ بھی (ہر طرف سے) پھٹکارے ہوئے (یعنی مدینہ سے نکل جانے کا سامان کرنے کے لئے جو کچھ قلیل مدت معین کی جائے گی اس مدت میں تو یہ یہاں رہ لیں گے اور اس مدت میں بھی ہر طرف سے ذلیل و خوار ہوں گے، پھر نکال دیے جائیں گے اور نکالنے کے بعد بھی کہیں امن نہ ہوگا بلکہ جہاں ملیں گے پکڑ دھکڑ اور مار دھار کی جائے گی (وجہ یہ کہ ان منافقین کے کفر کا مقتضا تو یہی تھا، لیکن نفاق کی آرٹ میں ان کو پتہ ملی ہے جب علی الاعلان ایسی مخالفتیں کرنے لگیں گے، تو وہ مانع اٹھ گیا اس لئے ان کے ساتھ بھی کفر کے اصلی اقتضاء کے موافق معاملہ ہوگا کہ ان کا اخراج اور قید اور قتل سب جائز ہے، اور اگر خروج کے لئے کچھ مدت معین ہو جائے تو اس مدت کے اندر بوجہ معاندانہ کے مامون ہوں گے، اس کے بعد جہاں ملیں گے عہد ختم ہو جانے کی بنا پر ان کے قتل و قید کی اجازت ہوگی۔ منافقین کو جو یہ دھمکی دی گئی اس میں کنیزوں کو چھیڑنے کا بھی انتظام کیا اور دوسری شرارت افواہیں پھیلانے کا بھی انسداد ہو گیا۔

مطلب آیت کا یہ ہو گیا کہ اگر یہ لوگ علی الاعلان مخالفت احکام اور مسلمانوں کے خلاف حرکتوں سے باز آگئے گو اپنی درپردہ منافقانہ چالوں میں لگے رہیں۔ تو یہ سزا جاری نہ ہوگی، ورنہ پھر عام کفار کے حکم میں داخل ہو کر سزاوار سزا ہو جائیں گے، اور فساد و شورش پر سزا جاری کرنا کچھ انہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان (مفسد) لوگوں میں بھی

اپنا ہی دستور (جاری) رکھا ہو جو (ان سے) پہلے ہو گزرے ہیں کہ ان کو آسمانی سزائیں۔
یا انبیاء کے ہاتھ سے جہاد کے ذریعہ سزائیں دلوائی ہیں، پس اگر پہلے ایسا نہ ہو چکتا تو ایسی سزا
میں کچھ استبعاد ہو سکتا تھا، اور اب تو اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں، اور آپ اللہ تعالیٰ
کے دستور میں کسی شخص کی طرف سے رد و بدل نہ پائیں گے کہ خدا تو کوئی حکم جاری کرنا چاہا
اور کوئی اس کو روک سکے، لفظ سنتہ اللہ میں تو اس کا اظہار کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و
ارادہ سے پہلے کوئی کام نہیں کر سکتا، اور وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا، میں یہ بتلا دیا کہ جب
اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرمالیں تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا،

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں عام مسلمانوں مردوں اور عورتوں کو ایذا پہنچانے کا حرام اور گناہ
کبیرہ ہونا اور خصوصاً سید المؤمنین صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا کا کفر موجب لعنت ہونا بیان
فرمایا گیا ہے۔ منافقین کی طرف سے دو طرح کی ایذایں مسلمانوں کو اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچتی تھیں، آیات مذکورہ میں ان ایذاؤں کے السداد کا انتظام
ہو، اور اس کے ضمن میں عورتوں کے پردے کے کچھ مزید احکام کا بیان ایک مناسبت
سے آیا ہے جو آگے معلوم ہو جائے گی۔ ان دونوں ایذاؤں میں ایک یہ تھی کہ منافقین کے
عوام اور آوارہ قسم کے لوگ مسلمانوں کی باندیوں کنیزوں کو جب وہ کام کاج کے لئے باہر
نکلتیں چھیڑا کرتے تھے، اور کبھی کنیزوں کے شبہ میں حرائر کو ستاتے تھے، جس کی وجہ سے
عام مسلمانوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچتی تھی۔

دوسری ایذا یہ تھی کہ یہ لوگ ہمیشہ ایسی جھوٹی خبریں اڑاتے تھے کہ اب فلاں غنیم
مدینہ پر چڑھائی کرنے والا ہے وہ سب کو ختم کر دے گا۔ آیات مذکورہ میں پہلی ایذا سے
حرائر آزاد بیبیوں کو بچانے کا فوری اور سہل انتظام یہ ہو سکتا تھا کہ ان کو یہ لوگ
ان کے خاندان کی وجاہت اور حمایت کی وجہ سے بالقصد چھیڑنے کی جرأت نہ کرتے تھے،
کبھی کنیزوں کے شبہ میں یہ بھی ان کی چھیڑ چھاڑ کی زد میں آجاتی تھیں، اگر ان کی پہچان ہو جاتی
تو یہ نوبت نہ آتی، اس لئے ضرورت پیش آتی کہ حرائر کا کوئی خاص امتیاز ہو جائے تاکہ آسانی
کے ساتھ خود بخود ہی کم از کم حرائر تو ان شریروں کے فساد سے فوری طور پر محفوظ ہو جائیں
اور کنیزوں کا دوسرا انتظام کیا جائے۔

دوسری طرف شریعت اسلام نے حرائر اور کنیزوں کے پردہ شرعی میں بصورت

ایک فرق بھی رکھا ہے کہ کنیزوں کا شرعی پردہ وہ ہے جو حرائر کا اپنے محرموں کے سامنے ہوتا ہو کہ مثلاً چہرہ وغیرہ کھولنا جو حرائر کے لئے اپنے محرموں کے سامنے جائز ہے، کنیزوں کے لئے باہر بھی اس کی اجازت اس لئے دی گئی کہ ان کا کام ہی اپنے آقا اور اس کے گھر کی خدمت ہو جس میں ان کو باہر بھی بار بار نکلنا پڑتا ہے، اور چہرہ اور ہاتھ مستور رکھنا مشکل ہوتا ہے، بخلاف حرائر کے کہ ان کو کسی ضرورت سے باہر نکلنا بھی پڑے تو کبھی کبھی ہوگا جس میں پورے پردے کی رعایت مشکل نہیں، اس لئے حرائر کو یہ حکم دیدیا گیا کہ وہ لمبی چادر جس میں مستور ہو کر نکلتی ہیں اس کو اپنے سر پر سے چہرے کے سامنے لٹکا لیا کریں تاکہ چہرہ اجنبی مردوں کے سامنے نہ آئے اس سے ان کا پردہ بھی مکمل ہو گیا، اور باندیوں کنیزوں سے امتیاز خاص بھی ہو گیا، جس کے سبب وہ شریر لوگوں کی پھیڑ چھاڑ سے خود بخود مامون ہو گئیں۔ اور کنیزوں کی حفاظت کا انتظام ان منافقین کو سزا کی وعید سننا کر کیا گیا کہ اس سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں بھی اپنے نبی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سزا دلوائیں گے۔

آیت مذکورہ میں حرۃ (آزاد) عورتوں کے پردہ کے لئے یہ حکم ہوا ہے کہ یُنِیْنِ عَلَیْہُنَّ مِنْ جَلَابِیْبٍ ھُنَّ، اس میں یُنِیْنِ، اِدْنًا سے مشتق ہے، جس کے لفظی معنی قریب کرنے کے ہیں اور لفظ عَلَیْہُنَّ کے معنی اپنے اوپر اور جَلَابِیْب جمع جَلَاب کی جو ایک خاص لمبی چادر کو کہا جاتا ہے، اس چادر کی ہیئت کے متعلق حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ وہ چادر ہے جو دو پٹہ کے اوپر اوڑھی جاتی ہے (ابن کثیر) اور حضرت ابن عباسؓ نے اس کی ہیئت یہ بیان فرمائی ہے۔

”اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے نکلیں تو اپنے سروں کے اوپر سے یہ چادر لٹکا کر چہروں کو چھپالیں اور صرف ایک آنکھ (راستہ دیکھنے کے لئے) کھلی رکھیں۔“

أَمَرَ اللّٰهُ نِسَاءَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا خَرَجْنَ مِنْ بُیُوْتِهِنَّ فِیْ حَاجَۃٍ اَنْ یَّغْطِیْنَ وُجُوْھَهُنَّ مِنْ فَوْتٍ رُّوْسِهِنَّ بِالْجَلَابِیْبِ وَیُبْدِیْنَ عِیْنًَا وَّاحِدَةً رَّاہُنَّ کَثِیْرًا

اور امام محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبیدہ سلمانیؓ سے اس آیت کا مطلب اور جلابیاب کی کیفیت دریافت کی تو انھوں نے سر کے اوپر سے چادر... چہرہ پر لٹکا کر چہرہ چھپالیا، اور صرف بائیں آنکھ کھلی رکھ کر اِدْنًا جَلَابِیْب کی تفسیر عملاً بیان فرمائی۔

سر کے اوپر سے چہرہ پر چادر لٹکانا جو حضرت ابن عباسؓ اور عبیدہ سلمانی کے بیان میں آیا ہے یہ لفظ عَلَیْہِمْ کی تفسیر ہے کہ اپنے اوپر چادر کو قریب کرنے کا مطلب چادر کو سر کے اوپر سے چہرہ پر لٹکانا ہے۔

اس آیت نے بصراحت چہرہ کے چھپانے کا حکم دیا ہے جس سے اس مضمون کی مکمل تائید ہو گئی جو اوپر حجاب کی پہلی آیت کے ذیل میں مفصل بیان ہو چکا ہے، کہ چہرہ اور ہتھیلیاں اگرچہ فی نَفْسِ سِتْرِ میں داخل نہیں مگر بوجہ خوفِ فتنہ کے ان کا چھپانا بھی ضروری ہے، صرف مجبوری کی صورتیں مستثنیٰ ہیں۔

اس آیت میں حُرّہ عورتوں کو ایک خاص طرح کے پردہ کی ہدایت

تنبیہ ضروری

فرمائی کہ چادر کو سر کے اوپر سے لٹکا کر چہرے کو چھپالیں، تاکہ عام کنیزوں سے ان کا امتیاز ہو جائے اور یہ شریر لوگوں کے فتنہ سے محفوظ ہو جائیں۔ مذکور الصدر بیان میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام نے عصمتِ عفت کی حفاظت میں حرائر اور کنیزوں کے درمیان کوئی فرق کر دیا کہ حرائر کی حفاظت کرائی، کنیزوں کو چھوڑ دیا، بلکہ درحقیقت یہ فرق ادبِ باشِ شریر لوگوں نے خود کر رکھا تھا، کہ حرائر پر دست اندازی کی تو جرأت و ہمت نہیں کرتے تھے، مگر امار یعنی کنیزوں کو چھیڑتے تھے، شریعت اسلام نے ان کے اختیار کردہ اس فرق سے یہ فائدہ اٹھایا کہ عورتوں کی اکثریت تو خود انہی کے مسلمہ عمل کے ذریعہ — خود بخود محفوظ ہو جائے، باقی رہا کنیزوں کا معاملہ سو ان کی عصمت کی حفاظت بھی اسلام میں ایسی ہی فرص و ضرورت ہے جیسی حرائر کی۔ مگر اس کے لئے قانونی تشدد اختیار کئے بغیر چارہ نہیں، تو اگلی آیت میں اس کا قانون بتلا دیا کہ جو لوگ اپنی اس حرکت سے باز نہ آئیں گے ان کو کسی طرح معاف نہ کیا جائے گا، بلکہ جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے، اور قتل کر دیئے جائیں گے اس نے کنیزوں کی عصمت کو بھی حرائر کی طرح محفوظ کر دیا۔

اس سے واضح ہو گیا کہ علامہ ابن حزم وغیرہ نے جو مذکورہ شبہ سے بچنے کے لئے آیت کی تفسیر جمہور علماء سے مختلف کرنے کی تاویل کی ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں، شبہ تو جب ہوتا جبکہ کنیزوں کی حفاظت کا انتظام نہ کیا گیا ہوتا۔

جو شخص مسلمان ہونے کے بعد مرتد | آیت مذکورہ میں منافقین کی دو شرائط کا ذکر کر کے ان سے ہو جائے اس کی سزا قتل ہے | باز نہ آنے کی صورت میں جس سزا کا ذکر کیا گیا ہے کہ مَاحِوَرِیْنِ اَیْنَمَا یَقْفُوْا اَخِیْذُوْا وَ قَتِلُوْا تَقْتِیْلًا، یعنی یہ لوگ جہاں رہیں گے لعنت

اور پٹھکاران کے ساتھ ہوگی، اور جہاں ملیں گے گرفتار کئے جائیں گے اور قتل کر دیئے جائیں گے، یہ سزا عام کفار کی نہیں، بے شمار نصوص قرآن و سنت اس پر شاہد ہیں کہ عام کفار کے لئے شریعت اسلام میں یہ قانون نہیں ہے، بلکہ قانون یہ ہے کہ اول ان کو دعوت اسلام دی جائے ان کے شبہات دور کرنے کی کوشش کی جائے اس پر بھی وہ اسلام نہ لائیں تو مسلمانوں کے تابع ذمی بن کر رہنے کا حکم دیا جائے، اگر وہ اس کو قبول کر لیں تو ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت مسلمانوں پر مسلمانوں ہی کی طرح فرض ہو جاتی ہے، ہاں جو اس کو بھی قبول نہ کریں اور جنگ ہی پر آمادہ ہو جائیں تو ان کے مقابلہ میں جنگ کرنے کا حکم ہے۔ اس آیت میں ان لوگوں کو مطلقاً قید و قتل کی سزا سنائی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاملہ منافقین کا تھا جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے۔ اور جب کوئی مسلمان احکام اسلام کی کھلی مخالفت اور انکار کرنے لگے تو وہ اصطلاح شرع میں مرتد کہلاتا ہے، اس کے ساتھ شریعت اسلام میں کوئی مصالحت نہیں، بجز اس کے کہ وہ تائب ہو کر پھر مسلمان ہو جائے، اور احکام اسلام کو قولاً و عملاً تسلیم کر لے ورنہ پھر اس کو قتل کیا جائے گا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات اور صحابہ کرام کے اجماعی تعامل سے ثابت ہے۔ میلہ کذاب اور اس کی جماعت کے خلاف باجماع صحابہ جنگ و جہاد اور میلہ کا قتل اس کی کافی شہادت ہے، اور آخر آیت میں اس کو اللہ تعالیٰ کی قدیم سنت و دستور قرار دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ انبیاء سابقین کی شرائع میں بھی مرتد کی سزا قتل ہی تھی۔ مذکورہ صدر خلاصہ تفسیر میں ان سزاؤں کو عام کفار کے ضابطہ میں لانے کے لئے جو توجیہ کی گئی ہے اس تقریر سے اس کی ضرورت نہیں رہتی۔

اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ :-

چند مسائل

(۱) عورتوں کو جب کسی ضرورت کی بناء پر گھر سے نکلنا پڑے تو لمبی چادر سے تمام بدن چھپا کر نکلیں، اور اس چادر کو سر کے اوپر سے لٹکا کر چہرہ بھی چھپا کر چلیں، مروجہ برقع بھی اس کے قائم مقام ہے۔

(۲) مسلمانوں میں ایسی افواہیں پھیلانا حرام ہے جن سے ان کو تشویش اور پریشانی ہو اور نقصان پہونچے۔

يَسْأَلُ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ وَمَا

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت کو، تو کہہ اس کی خبر ہی اللہ ہی کے پاس، اور تو کیا

يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا ۝۶۳ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ

جانے شاید وہ گھڑی پاس ہی ہو۔ بے شک اللہ نے پھٹکار دیا ہر منکروں کو

وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيرًا ۝۶۴ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا لَا يَجِدُوْنَ وِلِيًّا

اور رکھی ہر ان کے واسطے دہکتی آگ۔ رہا کریں اسی میں ہمیشہ نہ پائیں کوئی حمایتی

وَلَا نَصِيْرًا ۝۶۵ يَوْمَ تَقْلَبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ

اور نہ مددگار۔ جس دن اوندھے ڈالے جائیں گے ان کے منہ آگ میں کہیں گے

يٰلَيْتَنَا اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلًا ۝۶۶ وَقَالُوْا رَبَّنَا اِنَّا

کیا اچھا ہوتا جو ہم نے کہا مانا ہوتا اللہ کا اور کہا مانا ہوتا رسول کا۔ اور کہیں گے اے رب ہم نے

اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرٰآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلًا ۝۶۷ رَبَّنَا ارْحِمِ

کہا مانا اپنے سرداروں کا اور اپنے بڑوں کا پھر انھوں نے چکا دیا ہم کو راہ سے۔ اے رب ان کو دے

ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنَهُمُ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝۶۸

دوگنا عذاب اور پھٹکار ان کو بڑی پھٹکار۔

خلاصہ تفسیر

یہ منکر لوگ آپ سے قیامت کے متعلق (منکرانہ) سوال کرتے ہیں کہ کب ہوگی آپ (ان کے جواب میں) فرمادیجئے کہ اس (کے وقت) کی خبر بس اللہ ہی کے پاس ہے، اور آپ کو کیا خبر کہ کب ہے، البتہ اجمالاً ان لوگوں کو جان رکھنا چاہئے کہ عجب نہیں کہ قیامت ابھی واقع ہو جائے (کیونکہ جب کوئی وقت معین نہیں تو قریب زمانے میں اُس کے واقع ہو جانے کا بھی احتمال نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جس کا مقتضاء یہ تھا کہ یہ لوگ انجام سے ڈرتے اور اس کی تیاری میں لگتے، منکرانہ سوالات اور استہزاء سے بچتے۔

اور قیامت کو قریب فرمانے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قیامت ہر روز قریب ہی ہوتی جا رہی ہے، اور جو چیز سامنے سے آرہی ہو اس کو قریب ہی سمجھنا دانشمندی ہے۔ اور اس لحاظ سے بھی قیامت کو قریب کہا جاسکتا ہے کہ قیامت کے ہولناک واقعات اور شداد کے پیش نظر یہ ساری دنیا کی عمر بھی قلیل نظر آئے گی، اور ہزاروں سال کی یہ مدت چند روز

کی برابر محسوس ہوگی، بے شک اللہ تعالیٰ نے کافروں کو رحمت سے دور کر رکھا ہے، اور ان کے لئے آتش سوزاں تیار کر رکھی ہے، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، (اور) نہ کوئی یار پائیں گے اور نہ کوئی مددگار جس روز ان کے چہرے دوزخ میں الٹ پلٹ کئے جائیں گے (یعنی چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے) کبھی چہرے کی اس کروٹ پر کبھی دوسری کروٹ پر، اور اس وقت غایت حسرت سے یوں کہیں گے اے کاش! ہم نے (دنیا میں) اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی (تو آج اس مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے) اور (حسرت کے ساتھ اپنے گمراہ کرنے والوں پر غصہ آئے گا تو) یوں کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم اپنے سرداروں کا، (یعنی اہل حکومت کا) اور اپنے بڑوں کا (جن میں کسی دوسری وجہ سے یہ صفت پائی جاتی تھی کہ انکی بات ماننا اور اتباع کرنا ہمارے ذمے ضروری تھا) کہنا ماننا تھا سوا انھوں نے ہم کو (سیدھے) رستہ سے گمراہ کیا تھا اے ہمارے رب ان کو دہری سزا دیجئے اور ان پر بڑی لعنت کیجئے یہ ایسا مضمون ہے جیسا سورۃ اعراف کے چوتھے رکوع میں پہلے آچکا ہے، رَبَّنَا هُوَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ فَاتَّخِذْ عَلَيْنَا آيَاتٍ ذِكْرًا لِّعَلَّانَا نَتَّقُكَ يَا أَزْهَى الْآيَاتِ يَا كَرِيمَ

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اللہ و رسول کی مخالفت کرنے والوں کو دنیا اور آخرت میں لعنت و عذاب کی وعید سنائی گئی تھی، اور کفار کے بہت سے فرقے خود قیامت اور آخرت ہی کے منکر تھے اور انکار کی وجہ سے بطور استہزاء کے پوچھا کرتے تھے کہ وہ قیامت کب آئے گی؟ آخر سورۃ میں ان کا جواب مذکورہ آیات میں دیا گیا ہے، جن کی تفسیر اوپر آچکی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ إِذْ وَاسَىٰ مُوسَىٰ فَبَرَّاهُ

اے ایمان والو! تم مت ہو ان جیسے جنھوں نے ستایا موسیٰ کو پھر بے عیب کھلایا

اللَّهُ مِمَّا قَالُوا وَكَانَ عِنْدَ اللَّهِ وَجِيهًا ﴿٦٩﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

اس کو اللہ نے ان کے کہنے سے اور تھا اللہ کے یہاں آبرو والا۔ اے ایمان والو

آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٧٠﴾ يُصْلِحْ لَكُمْ

ڈرتے رہو اللہ سے اور کہو بات سیدھی، کہ سنو اور تمھارے واسطے

أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

تمھارے کام اور بخش دے تم کو تمھارے گناہ اور جو کوئی کہنے پر چلا اللہ کے اور اس کے رسول

فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۴۱

کے اس نے پائی بڑی مراد -

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو تم ان لوگوں کی طرح مت ہونا جنہوں نے (کچھ تہمت تراش کر) موسیٰ (علیہ السلام) کو ایذا دی تھی سو ان کو خدا تعالیٰ نے بری ثابت کر دیا اس چیز سے جو وہ کہتے تھے (یعنی ان کو نو کچھ نقصان پہنچا تہمت لگانے والے ہی کذاب اور مستحق سزا ٹھہرے) اور وہ (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اللہ کے نزدیک بڑے معزز (پیغمبر) تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی برائت ظاہر فرمادی جیسا کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے لئے اس طرح کی تہمتوں سے برائت عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم رسول کی مخالفت کر کے ان کو ایذا نہ دینا کیونکہ ان کی مخالفت اللہ کی مخالفت ہے، ورنہ اس کے نتیجے میں تم خود اپنا ہی نقصان کرو گے اس لئے ہر کام میں اللہ و رسول کی اطاعت کرنا جس کا حکم آگے آتا ہے کہ) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو (یعنی ہر امر میں اس کی اطاعت کرو) اور (بالخصوص کلام کرنے میں اس کی بہت رعایت رکھو کہ جب بات کرو) راستی کی بات کہو (جس میں عدل و اعتدال سے تجاوز نہ ہو) اللہ تعالیٰ اس کے صلہ میں تمھارے اعمال کو قبول کرے گا اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا (کچھ ان اعمال کی برکت سے کچھ توبہ کی برکت سے جو تقویٰ اور قولِ سدید میں داخل ہے) اور (یہ ثمرات اطاعت کے ہیں اور اطاعت ایسی چیز ہے کہ) جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں اللہ و رسول کی ایذا کا مہلک اور خطرناک ہونا بیان کیا گیا تھا اس آیت میں خاص طور سے مسلمانوں کو اللہ و رسول کی مخالفت سے بچنے کی ہدایت ہے کیونکہ یہ مخالفت ان کی ایذا کا سبب ہے۔

پہلی آیت میں ایک واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جس میں ان کی قوم نے ان کو ایذا پہنچائی تھی ذکر کر کے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا۔ اس کے لئے یہ ضروری

نہیں کہ مسلمانوں سے کوئی ایسا کام سرزد ہوا ہو بلکہ حفظِ مآقداً کے طور پر ان کو یہ قصہ سننا کہ ہدایت کی گئی ہے۔ اور ایک روایت میں جو قصہ بعض صحابہ کا منقول ہے اس کا محمل بھی یہی ہے کہ ان کو اس وقت اس طرف توجہ نہ ہوئی ہو گی کہ یہ کلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا کا موجب ہے، بالقصد ایذا پہنچانے کا کسی صحابی سے امکان نہیں، جتنے قصے بالقصد ایذا کے ہیں وہ سب منافقین کے ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما کر اس آیت کی تفسیر بیان فرمادی ہے جس کو امام بخاری نے کتاب التفسیر اور کتاب الانبیاء میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت فرمایا ہے، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت حیا کرنے والے اور اپنے بدن کو چھپانے والے تھے، ان کے بدن کو کوئی نہ دیکھتا تھا، جب غسل کی ضرورت ہوتی تو پردہ کے اندر غسل کرتے تھے، ان کی قوم بنی اسرائیل میں عام طور پر یہ رواج تھا کہ مرد سب کے سامنے ننگے ہو کر نہاتے تھے، تو بعض بنی اسرائیل کہنے لگے کہ موسیٰ علیہ السلام جو کسی کے سامنے نہیں نہاتے اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے بدن میں کوئی عیب ہے، یا تو برص ہی یا خصیتین بہت بڑھے ہوئے ہیں، یا کوئی اور آفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی اس طرح کے عیوب کے برائے کا اظہار فرمادیں۔ ایک روز موسیٰ علیہ السلام نے خلوت میں غسل کرنے کے لئے اپنے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیئے، جب غسل سے فارغ ہو کر اپنے کپڑے لینا چاہا تو یہ پتھر حکمِ خداوندی حرکت میں آگیا، اور کپڑے لے کر بھاگنے لگا۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی لاسٹھی اٹھا پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے چلے تو بنی حجاز حَجَرٌ، یعنی اے پتھر میرے کپڑے، اے پتھر میرے کپڑے، مگر پتھر چلتا رہا یہاں تک کہ یہ پتھر ایسی جگہ جا کر ٹھہرا جہاں بنی اسرائیل کا ایک مجمع تھا، اس وقت بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو سر سے پاؤں تک نہنگا دیکھا تو بہترین صحیح و سالم بدن دیکھا جس میں ان کا منسوب کیا ہوا کوئی عیب نہ تھا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی برائے ان عیوب سے سب کے سامنے ظاہر فرمادی۔ پتھر یہاں پہنچ کر ٹھہر گیا تھا، موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے اٹھا کر پہن لئے، پھر موسیٰ علیہ السلام نے پتھر کو لاسٹھی سے مارتا شروع کیا۔ خدا کی قسم! اس پتھر میں موسیٰ علیہ السلام کی ضرب سے تین یا چار یا پانچ اثر قائم ہو گئے۔

یہ واقعہ بیان فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کی اس آیت کا یہی مطلب ہے۔ یعنی آیت مذکورہ کا لُذِیْن اَذُوْا مُوسٰی کا، آیت مذکورہ میں

موسیٰ علیہ السلام کی جس ایذا کا ذکر ہے اس کی تفسیر اس قصہ میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ بعض صحابہ کرام سے ایذا رسولی علیہ السلام کا ایک قصہ اور بھی مشہور ہے وہ بھی اس کے ساتھ ضرور ملحق ہے، مگر تفسیر آیت وہی راجح ہے جو مرفوع حدیث میں موجود ہے۔

وَكَانَ عِشَّةَ اللَّهِ وَجِبْهًا یعنی تھے موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نزدیک صاحبِ جاہ

اللہ کے نزدیک کسی کی وجاہت اور جاہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول فرمائیں اس کی خواہش کو رد نہ کریں چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مستجاب الدعوات ہونا قرآن میں ان واقعات کثیرہ سے ثابت ہے جن میں انھوں نے کسی چیز کی دعا مانگی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح قبول فرمایا۔ ان میں سب سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ ہارون علیہ السلام کو پیغمبر بنانے کی دعا کی اللہ تعالیٰ نے قبول فرما کر ان کو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ شریک رسالت بنا دیا، حالانکہ منصب نبوت کسی کو کسی کی سفارش پر نہیں دیا جاتا۔ (ابن کثیر)

عَادَةُ اللَّهِ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو اس واقعہ میں قوم کے عیب لگانے سے براءت کا حق تعالیٰ ایسے جسمانی عیوب سے بھی بری رکھا اور موسیٰ علیہ السلام اضطرابِ لوگوں کے سامنے ننگے آگئے جاتا ہے جو موجب نفرت ہوں

یہ اہتمام اس کی نشان دہی کرتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے انبیاء کے اجسام کو بھی قابلِ نفرت و تحقیر عیوب سے عموماً پاک اور بری رکھتا ہے، جیسا کہ حدیث بخاری سے یہ بات ثابت ہے کہ انبیاء سب کے سب عالی نسب میں پیدا کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ عرفاً جس نسب اور خاندان کو لوگ حقیر سمجھتے ہوں اس کی بات سننے ماننے کے لئے تیار ہونا مشکل ہے۔ اسی طرح تاریخ انبیاء میں کسی پیغمبر کا نابینا، بہرا، گونگ یا ہاتھ پاؤں سے معذور ہونا ثابت نہیں، اور حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ سے اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا، کہ وہ بحکمت خداوندی ایک خاص ابتلاء و امتحان کے لئے چند روزہ تکلیف تھی پھر ختم کر دی گئی۔ واللہ اعلم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۚ إِنَّ اللَّهَ يُصَلِّحُ لِكُلِّ شَيْءٍ سَبِيلًا ۚ وَيَعْفِ عَنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ قَوْلُ سَدِيدٍ صَدَقَ كَيْفًا، بعض نے مستقیم اور بعض نے صواب وغیرہ کی۔ ابن کثیر نے سب کو نقل کر کے فرمایا کہ سب حق ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم اس جگہ صادق یا مستقیم وغیرہ کے الفاظ چھوڑ کر سدید کا لفظ اختیار فرمایا، کیونکہ لفظ سدید ان تمام اوصاف کا جامع ہے۔ اسی لئے کاشفی نے روح البیان میں فرمایا

کہ قول سدید وہ قول ہے جو سچا ہو جھوٹ کا اس میں شائبہ نہ ہو، صواب ہو جس میں خطا کا شائبہ نہ ہو، ٹھیک بات ہو، ہزل یعنی مذاق و دل لگی نہ ہو، نرم کلام ہو و لہذا شائش نہ ہو۔

زبان کی اصلاح باقی سب اعضاء و اعمال کی اصلاح میں موثر ذریعہ ہے۔ اس آیت میں اصل حکم سب مسلمانوں کو یہ دیا گیا ہے کہ إِتَّقُوا اللَّهَ یعنی تقویٰ اختیار کرو جس کی حقیقت تمام احکام الہیہ کی مکمل اطاعت ہے کہ تمام اداہ کی تعمیل کر لے اور تمام منہیات و مکروہات سے اجتناب کر لے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کام انسان کے لئے آسان نہیں، اس لئے إِتَّقُوا اللَّهَ کے بعد ایک خاص عمل کی ہدایت ہے، یعنی اپنے کلام کی درستی اور اصلاح۔ یہ بھی اگرچہ تقویٰ کا ہی ایک جز ہے مگر ایسا جز ہے کہ اس پر قابو پایا جائے تو باقی اجزاء تقویٰ خود بخود حاصل ہوتے چلے جاتیں گے جیسا کہ خود آیت مذکورہ میں قول سدید اختیار کرنے کے نتیجہ میں يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ کا وعدہ ہے یعنی اگر تم نے اپنی زبان کو غلطی سے روک لیا، اور کلام درست اور بات سیدھی کہنے کے خوگر ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی اصلاح فرمائیں گے، اور سب کو درست کر دیں گے۔ اور آخر آیت میں یہ وعدہ فرمایا کہ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ یعنی جس شخص نے اپنی زبان پر قابو پایا، راست گوئی اور سیدھی بات کا عادی بن گیا، اللہ تعالیٰ اس کے باقی اعمال کی بھی اصلاح فرمادیں گے اور جو لغزشیں اس سے ہوئی ہیں انکو معاف فرمادیں گے۔

مستراتی احکام میں قرآن کریم کے عام اسلوب میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کوئی تسہیل کا خاص اہتمام حکم ایسا دیا گیا جس کی تعمیل میں کچھ مشقت و دشواری ہو تو ساتھ ہی اس کے آسان کرنے کا طریقہ بھی بتلادیا گیا ہے۔ اور چونکہ سارے دین کا خلاصہ تقویٰ ہے اور اس میں پورا اثرنا بڑی مشقت ہے، اس لئے عموماً جہاں إِتَّقُوا اللَّهَ کا حکم دیا گیا ہے تو اس سے پہلے یا بعد ہی کوئی ایک عمل ایسا بتلادیا ہے جس کے اختیار کرنے سے تقویٰ کے باقی ارکان پر عمل منجانب اللہ آسان کر دیا جاتا ہے۔ اسی کی ایک نظیر اس آیت میں إِتَّقُوا اللَّهَ کے بعد قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا کی تلقین ہے، اور اس سے پہلی آیت میں إِتَّقُوا اللَّهَ سے پہلے وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ اذواؤسی فرما کر اس بات کی طرف ہدایت فرمادی کہ تقویٰ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اللہ کے نیک اور مقبول بندوں کو ایذا دینا ہے اسے چھوڑ دو تو تقویٰ آسان ہو جائے گا۔

ایک آیت میں ارشاد فرمایا إِتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ، اس میں تقویٰ کو آسان کرنے کے لئے ایسے لوگوں کی صحبت و مجالست کی تلقین فرمائی جو بات کے سچے ہوں اور عمل کے بھی سچے ہوں، جس کا حاصل ولی اللہ ہونا ہے۔ اور دوسری آیت میں إِتَّقُوا اللَّهَ کے ساتھ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَيْرِ بڑھا دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسان کو

اس کی فکر چاہئے کہ اس نے نکل یعنی روز محشر کے لئے کیا سامان بھیجا ہے؟ جس کا خلاصہ فکر آخرت ہو، اور یہ فکر تقویٰ کے تمام ارکان کو آسان کر دینے والی چیز ہے۔

زبان و کلام کی درستی دین دنیا حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو دونوں کے کام درست کر دیوالی ہو ترجمہ اس آیت کا کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس

آیت میں جو سیدھی بات کا عادی ہونے پر اصلاح اعمال کا وعدہ ہے وہ صرف دینی اعمال ہی نہیں، بلکہ دنیا کے سب کام بھی اس میں داخل ہیں، جو شخص قول سید کا عادی ہو جائے یعنی کبھی جھوٹ نہ بولے، سوچ سمجھ کر کلام کرے جو خطا و لغزش سے پاک ہو، کسی کو فریب نہ دے، دل خراش بات نہ کرے، اس کے اعمال آخرت بھی درست ہو جائیں گے، اور دنیا کے کام بھی بن جائیں گے۔ حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ یہ ہو کہ (کہو بات سیدھی کہ سنو ار دے تم کو تمھارے کام)۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ

ہم نے دکھلائی امانت آسمانوں کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو

فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ

پھر کسی نے قبول نہ کیا کہ اس کو اٹھائیں اور اس سے ڈر گئے اور اٹھالیا اس کو انسان نے

إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝۴۳ لِيَعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ

یہ ہے بڑا بے ترس نادان، تاکہ عذاب کرے اللہ منافق مردوں کو

وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى

اور عورتوں کو اور شرک کرنے والے مردوں کو اور عورتوں کو اور معاف کرے اللہ

الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝۴۴

ایمان دار مردوں کو اور عورتوں کو، اور ہر اللہ بخشنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر

ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی یعنی ان میں کچھ شعور پیدا کر کے جو کہ اب بھی ہے ان کے بددہرو اپنے احکام اور بصورت ماننے کے اس پر انعام و اکرام اور بصورت نہ ماننے کے

اس پر تعذیب و آلام پیش کر کے ان کو لینے نہ لینے کا اختیار دیا۔ اور حاصل اس پیش کرنے کا یہ تھا کہ اگر تم ان احکام کو اپنے ذمہ رکھتے ہو تو ان کے موافق عمل کرنے کی صورت میں تم کو ثواب ملے گا اور خلاف کرنے کی صورت میں عذاب ہوگا، اور اگر نہیں لیتے تو مکلف نہ بناؤ جاؤ گے، اور ثواب و عذاب کے بھی مستحق نہ ہو گے، تم کو دونوں اختیار ہیں، کہ اس کو نہ لینے سے نافرمان نہ ہو گے جس قدر ان کو شعور تھا وہ اجمالاً اس قدر مضمون سمجھ لینے کے لئے کافی تھا، چونکہ ان کو اختیار بھی دیا گیا تھا، سو انھوں نے (خوف و عذاب کے سبب

احتمال ثواب سے بھی دست برداری کی اور) اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس (کی ذمہ داری) سے ڈر گئے کہ خدا جانے کیا انجام ہو، اور اگر وہ اپنے ذمہ رکھ لیتے تو مثل انسان کے ان کو بھی عقل عطا کی جاتی، جو تفصیل احکام و منویات و عقوبات کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے، چونکہ اس کو نہیں منظور کیا، اس لئے عقل کی بھی ضرورت نہ ہوتی۔ غرض انھوں نے تو عذر کر دیا، اور (جب ان سموات و ارض و جبال کے بعد انسان کو پیدا کر کے اس سے یہی بات پوچھی گئی تو) انسان نے (ہر جہ اس کے کہ علم آہی میں اس کا خلیفہ ہوتا مقرر تھا) اس کو اپنے ذمہ لے لیا (غالباً اس وقت تک اس میں بھی اتنا ہی ضرورت کے قدر شعور ہوگا اور غالباً یہ پیش کرنا اخذ میثاق سے مقدم ہے، اور وہ میثاق اسی حمل امانت کی فرع ہے، اور اس میثاق کے وقت اس میں عقل عطا کی گئی ہوگی، اور یہ کسی خاص انسان سے مثل آدم علیہ السلام کے نہیں پوچھا گیا، بلکہ مثل اخذ میثاق کے یہ عرض بھی عام ہوگا اور التزام بھی عام تھا۔ پس سموات و ارض و جبال مکلف نہ ہوئے اور یہ مکلف بنا دیا گیا۔ آیت میں اس کا یاد دلانا غالباً اسی حکمت سے ہے جیسا کہ میثاق یاد دلایا، یعنی ان احکام کا تم نے از خود التزام کیا ہے تو پھر نباہنا چاہئے۔ اور چونکہ مکلف جن بھی ہے اس لئے غالباً اس عرض اور حمل میں شریک ہی، مگر تخصیص ذکر انسان کی صرف اس لئے ہے کہ اس مقام میں کلام اسی سے ہو رہا ہے، پھر اس التزام کے بعد انسان کی حالت باعتبار اکثر افراد کے یہ ہوتی کہ وہ (انسان عملیات میں) ظالم ہے (اور عملیات میں) جاہل ہے (یعنی دونوں امر میں اعمال میں بھی اور عقائد میں بھی خلاف ورزی کرتا ہے یہ تو حالت باعتبار اکثر افراد کے ہے، باقی مجموعہ کے اعتبار سے اس ذمہ داری کا) انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کو (کہ یہ لوگ احکام کے ضائع کرنے والے ہیں) سزا دے گا اور مؤمنین و مؤمنات پر توبہ (اور رحمت) فرمائے گا اور (بعد مخالفت بھی اگر کوئی باز آجائے تو پھر اس کو بھی مؤمنین و مؤمنات کے زمرہ میں شامل کر لیا جائیگا

کیونکہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۔

معارف و مسائل

اس پوری سورۃ میں تعظیم و تکریم رسولؐ اور ان کی اطاعت پر زور دیا گیا ہے آخر سورۃ میں اس اطاعت کا مقام بلند اور اس کا درجہ بتلایا گیا ہے، اس میں اللہ و رسولؐ کی اطاعت اور ان کے احکام کی تعمیل کو امانت سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کی وجہ آگے آجائے گی۔ امانت سے کیا مراد ہے | اس جگہ لفظ امانت کی تفسیر میں ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین وغیرہم کے بہت سے اقوال منقول ہیں۔ فرائض شرعیہ، حفاظت عفت، امانات اموال، غسل جنابت نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج وغیرہ، اسی لئے جہور مفسرین نے فرمایا ہے کہ دین کے تمام وظائف و اعمال اس میں داخل ہیں (قرطبی) تفسیر منطہری میں فرمایا کہ شریعت کی تمام تکلیفات امر و نہی کا مجموعہ امانت ہے، ابو حنیفہ نے بحر محیط میں فرمایا:-

”یعنی ہر وہ چیز جس میں انسان پر عہد کیا جاتا ہے یعنی امر و نہی اور ہر حال جس کا دین یا دنیا سے تعلق ہو اور شریعت پوری کی پوری امانت ہی یہی جہور کا قول ہے“

الظَّاهِرُ أَتَّكَلُّ مَا يُوعَى تَمَنُّ عَلَيْهِ مِنْ أَمْرِ وَ نَهْيٍ وَ شَأْنٍ دِينٍ وَ دُنْيَا وَ الشَّرْعُ كُلُّهُ أَمَانَةٌ وَ هَلْ أَقُولُ الْجَمْعُ هُوَ

خلاصہ یہ ہے کہ امانت سے مراد احکام شرعیہ کا مکلف و مامور ہونا ہے، جن میں پورا اترنے پر جنت کی دائمی نعمتیں اور خلاف ورزی یا کوتاہی پر جہنم کا عذاب موعود ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ امانت سے مراد احکام الہیہ کا بار اٹھانے کی صلاحیت و استعداد ہے جو عقل و شعور کے خاص درجہ پر موقوف ہے، اور ترقی اور تحقیق خلاۃ الہیہ اسی خاص استعداد پر موقوف ہے جن اجناس مخلوقات میں یہ استعداد نہیں ہے وہ اپنی جگہ کتنا ہی اونچا اعلیٰ مقام رکھتے ہوں مگر وہ اس مقام سے ترقی نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے آسمان زمین وغیرہ میں یہاں تک کہ فرشتوں میں بھی ترقی نہیں جس کا جو مقام قرب ہے بس وہی ہے، ان کا حال کیا مَآمِنًا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ۔ یعنی ہم میں سے کوئی نہیں مگر اس کا ایک معین مقام ہے۔ امانت کے اس مفہوم میں تمام روایات حدیث جو امانت کے متعلق آئی ہیں مربوط و مطابق ہو جاتی ہیں، جہور مفسرین کے اقوال بھی اس میں تقریباً متفق ہو جاتے ہیں۔ صحیحین بخاری و مسلم اور مسند احمد میں حضرت حذیفہ رضی کی روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دو حدیثیں سنائی تھیں، ان میں سے ایک کو تو ہم نے خود آنکھوں سے دیکھ لیا، دوسری کا انتظار ہے۔

پہلی حدیث یہ ہے کہ اول رجال دین کے قلوب میں امانت نازل کی گئی، پھر قرآن اتارا گیا، تو اہل ایمان نے قرآن سے علم حاصل اور سنت سے عمل حاصل کیا۔

اس کے بعد دوسری حدیث یہ سنائی کہ (ایک وقت ایسا آنے والا ہے جس میں آدمی سو کر اٹھے گا تو اس کے قلب سے امانت سلب کر لی جائے گی اور اس کا کچھ اثر و نشا ایسا رہ جائے گا جیسے تم کوئی آگ کا انگارہ اپنے پاؤں پر لڑھکادو وہ انگارہ تو چلا گیا مگر اس کا اثر پاؤں پر ورم یا چھالے کی صورت میں رہ گیا حالانکہ اس میں آگ کا کوئی جزو نہیں رہا) قول: یہاں تک کہ لوگ باہم معاملات اور معاہدات کریں گے، مگر کوئی امانت کا حق ادا نہ کرے گا اور (امانتدار آدمی کا ایسا قحط ہو جائے گا کہ) لوگ یہ کہا کریں گے کہ فلاں قبیلہ میں ایک آدمی امانتدار ہے۔

اس حدیث میں امانت ایک ایسی چیز کو قرار دیا ہے جس کا تعلق انسان کے قلب سے ہے، اور وہی تکالیف شرعیہ اور وظائف دینیہ کے مکلف ہونے کی صلاحیت استعدا رکھنا ہے اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں ایسی ہیں کہ جب وہ تمہیں حاصل ہو جائیں تو دنیا کی اور کوئی چیز تمہیں حاصل نہ ہو تو کوئی افسوس کی بات نہیں، (وہ چار چیزیں یہ ہیں) :- امانت کی حفاظت، بات کی سچائی، حُسنِ خلق اور لقمہ حلال۔ (از ابن کثیر)

عرض امانت کی تحقیق آیت مذکورہ میں یہ ارشاد ہے کہ ہم نے امانت کو آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا تو سب نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا، اور اس سے ڈر گئے، کہ ہم اس کا حق ادا نہ کر سکیں گے، اور انسان نے یہ بوجھ اٹھا لیا۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ آسمان، زمین، پہاڑ جو غیر ذی روح اور بظاہر بے علم و شعور ہیں ان کے سامنے پیش کرنے اور ان کے جواب دینے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ بعض حضرات نے تو اس کو مجاز اور تمثیل قرار دیدیا جیسے قرآن کریم نے ایک موقع پر بطور تمثیل کے فرمایا: **لَوْ أَنزَلْنَاهُ لَفَلَتِ الْأَعْيُنُ عَنْ آيَاتِهِ خَائِشَاتٍ مُّتَّصِفَاتٍ غَائِبَاتٍ عَشِيقَاتٍ** اللہ، ”یعنی ہم اگر یہ قرآن پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ وہ بھی اس کے بوجھ سے جھک جاتا، اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اللہ کے خوف سے“ کہ اس میں بطور فرض کے یہ مثال دی گئی ہے، یہ نہیں کہ حقیقت پہاڑ پر اتارا ہو۔ ان حضرات نے

آیت اِنَّا عَرَضْنَا لَکُمُوهَا اسی طرح کی تمثیل و مجاز قرار دیدیا۔
 مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ صحیح نہیں، کیونکہ جس آیت سے تمثیل پر استدلال کیا گیا
 ہو وہاں تو قرآن کریم نے حرفِ نون کے ساتھ بیان کر کے اس کا قضیہ فرضیہ ہونا خود واضح
 کر دیا ہے، اور آیت اِنَّا عَرَضْنَا لَکُمُوهَا ایک واقعہ کا اثبات ہے، جس کو مجاز و تمثیل پر حمل کرنا
 بغیر کسی دلیل کے جائز نہیں۔ اور اگر دلیل میں یہ کہا جائے کہ یہ چیزیں بے حس و بے شعور ہیں،
 ان سے جواب سوال نہیں ہو سکتا، تو یہ قرآن کی دوسری تصریحات سے مردود ہے۔ کیوں کہ
 قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے، وَ اِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلاَّ اِنَّا بَصِيصٌ بِمَا یَعْمَلُونَ، یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو
 اللہ کی حمد و تسبیح نہ پڑھتی ہو، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہچانتا اور اس کو خالق و مالک اور
 سب سے اعلیٰ و برتر جان کر اس کی تسبیح کرنا بغیر ادراک و شعور کے ممکن نہیں۔ اس لئے اس
 آیت سے ثابت ہوا کہ ادراک و شعور تمام مخلوقات میں یہاں تک کہ جمادات میں بھی موجود ہے
 اسی ادراک و شعور کی بنا پر ان کو مخاطب بھی بنایا جاسکتا ہے اور وہ جواب بھی دے سکتے ہیں
 جواب کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، الفاظ و حروف کے ذریعہ بھی، ہو سکتا ہے، اور اس میں
 عقلی امتناع نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان جمادات، آسمان زمین اور پہاڑوں کو نطق و گویائی عطا
 فرمادیں۔ اس لئے جمہور ائمہ کے نزدیک آسمان زمین اور پہاڑوں پر عرض امانت حقیقی طور
 پر کیا گیا اور انھوں نے حقیقی طور پر ہی اپنا اس بار سے عاجز ہونا ظاہر کیا، اس میں کوئی تمثیل
 یا مجاز نہیں۔

عرض امانت اختیاری تھا | رہا یہ سوال کہ جب حق تعالیٰ شانہ نے آسمان زمین وغیرہ پر اس
 امانت کو خود پیش فرمایا تو ان کو مجال انکار کیسے ہوئی، حکم الہی
 جبری نہیں
 سے روگردانی کی تھی تو ان کو نیست و نابود ہو جانا چاہئے تھا، اس کے علاوہ آسمان زمین
 کا مطیع اور تابع فرمان ہونا قرآن کریم کی آیت اَتَيْنَا طَائِفًا مِّنْهَا سے بھی ثابت ہے یعنی
 جب حق تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حکم دیا کہ (ہمارے حکم کی تعمیل کے لئے) آ جاؤ خواہ
 اپنی خوشی یا زبردستی سے، تو دونوں نے یہ جواب دیا کہ ہم تعمیل حکم کے لئے خوشی سے حاضر ہیں
 جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں ان کو ایک حاکمانہ پابندی کا حکم دیدیا گیا تھا، جس
 میں یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ تم اس حکم پر دل سے راضی ہو یا نہ ہو بہر حال یہ حکم ماننا پڑے گا
 بخلاف اس آیت عرض امانت کے کہ اس میں امانت کو پیش کر کے ان کو اختیار دیدیا گیا تھا کہ
 قبول کریں یا نہ کریں۔

ابن کثیر نے متعدد سندوں کے ساتھ متعدد صحابہ و تابعین ابن عباس رضی اللہ عنہما

مجاہد وغیرہ سے عرضِ امانت کی یہ تفصیل نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اول آسمان پر پھر زمین پر پھر پہاڑوں پر اختیاری صورت میں یہ پیش کیا۔ کہ ہماری امانت (یعنی طاعتِ احکام) کا بار اٹھا لو اس معاوضہ کے ساتھ جو اس کے لئے معسر رہے۔ ہر ایک نے سوال کیا کہ معاوضہ کیا ہے تو بتلایا گیا کہ امانت (یعنی طاعتِ احکام) تم نے پوری طرح کی تو تمہیں جزاء و ثواب اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعزاز خاص ملے گا اور اگر تعمیلِ احکام نہ کی یا اس میں کوتاہی کی تو عذاب و سزا ملے گی۔ ان سب بڑے بڑے اجسام نے یہ سن کر جواب دیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم اب بھی آپ کے تابع فرمان چل رہے ہیں، لیکن (جب ہمیں اختیار دیا گیا تو) ہم اس بار کو اٹھانے سے اپنے کو عاجز پاتے ہیں، ہم نہ ثواب چاہتے ہیں نہ عذاب کے تحمل ہیں۔

اور تفسیر قرطبی میں حکیم ترمذی کے حوالہ سے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (آسمان زمین وغیرہ پر عرضِ امانت اور ان کے جواب کے بعد) حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خطاب فرمایا اور فرمایا کہ ہم نے اپنی امانت آسمان زمین کے سامنے پیش کی تو وہ اس کا بار اٹھانے سے عاجز ہو گئے، تو آپ اس بار امانت کو اٹھائیں گے مع اس چیز کے جو اس کے ساتھ ہے۔ آدم علیہ السلام نے سوال کیا کہ اے پروردگار وہ چیز جو اس کے ساتھ ہے کیا ہے؟ جواب ملا کہ اگر حملِ امانت میں پورے اترے (یعنی طاعتِ مکمل کی) تو آپ کو جزاء ملے گی، (جو اللہ تعالیٰ کے قرب درضا اور جنت کی دائمی نعمتوں کی صورت میں ہوگی) اور اگر اس امانت کو ضائع کیا تو سزا ملے گی۔ آدم علیہ السلام نے (اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا میں ترقی ہونے کے شوق میں) اس کو اٹھا لیا، یہاں تک کہ بار امانت اٹھانے پر اتنا وقت بھی نہ گزرا تھا جتنا ظہر سے عصر تک ہوتا ہے کہ اس میں شیطان نے ان کو مشہور لغزش میں مبتلا کر دیا، اور جنت سے نکالے گئے۔

عرضِ امانت کا واقعہ | ابھی جو روایت حضرت ابن عباسؓ کی اوپر گزری ہے اس سے معلوم کس زمانے میں ہوا؟ ہوتا ہے کہ یہ عرضِ امانت آسمان، زمین وغیرہ پر تخلیقِ آدم سے پہلے ہوا تھا، پھر جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا تو ان کے سامنے یہ بھی بیان فرمایا گیا کہ کہ آپ سے پہلے آسمان زمین پر بھی یہ امانت پیش کی جا چکی ہے، جس کی ان کو طاقت نہ تھی، اس لئے عذر کر دیا۔

اور ظاہر یہ ہے کہ یہ عرضِ امانت کا واقعہ میثاقِ ازل یعنی عہدِ اَلَسْتُ سے پہلے کا ہے کیونکہ عہدِ اَلَسْتُ پر ہی اسی بار امانت کی پہلی کڑی اور اپنی منصب کا حلف اٹھانے کے قائم مقام ہے۔

حق تعالیٰ نے تقدیر ازیٰ میں آدم علیہ السلام کو زمین میں اپنا
 خلیفہ بنانا طے فرمایا تھا اور یہ خلافت اسی کو سپرد کی جاسکتی تھی،
 اٹھانے کی صلاحیت ضروری تھی جو احکامِ الہیہ کی اطاعت کا بار اٹھائے، کیونکہ اس خلافت کا حاصل ہی یہ ہے کہ زمین پر اللہ
 کے قانون کو نافذ کرے، خلیفہ خدا کو احکامِ الہیہ کی اطاعت پر آمادہ کرے۔ اس لئے تکوینی
 طور پر حضرت آدم علیہ السلام اس امانت کے اٹھانے کے لئے آمادہ ہو گئے، حالانکہ دوسری
 بڑی بڑی مخلوقات کا اس سے عاجز ہوتا بھی معلوم ہو چکا تھا۔ (منظری و بیان لقرآن)
 إِنَّكَ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا، ظُلوم سے مراد اپنے نفس پر ظلم کرنے والا، اور جہول سے
 مراد انجام سے ناواقف۔ اس جملے سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مطلقاً انسان کی مذمت میں
 آیا ہے کہ اس نادان نے اپنی جان پر ظلم کیا کہ اتنا بڑا بار اٹھا لیا۔ جو اس کی طاقت سے باہر
 تھا، مگر قرآنی تصریحات کے مطابق واقعہ ایسا نہیں، کیونکہ انسان سے مراد حضرت
 آدم علیہ السلام ہوں یا پوری نوع انسانی، ان میں آدم علیہ السلام تو نبی معصوم ہیں،
 انھوں نے جو بار اٹھایا تھا اس کا حق بھی یقینی طور سے ادا کر دیا۔ اسی کے نتیجہ میں ان کو
 خلیفۃ اللہ بنا کر زمین پر بھیجا گیا، ان کو فرشتوں کا سجدہ بنایا گیا، اور آخرت میں ان کا مقام
 فرشتوں سے بھی بلند و بالا ہے۔ اور اگر نوع انسانی ہی مراد ہو تو اس پوری نوع میں لاکھوں
 تو انبیاء علیہم السلام ہیں اور کروڑوں وہ صالحین اور اولیاء اللہ ہیں جن پر فرشتے بھی
 رشک کرتے ہیں، جنھوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ اس امانتِ الہیہ کے اہل
 اور مستحق تھے۔ انھیں حق امانت کو ادا کرنے والوں کی بنا پر قرآن حکیم نے نوع انسانی کو
 اشرف المخلوقات ٹھہرایا۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ، اس سے ثابت ہوا کہ نہ آدم علیہ السلام
 قابل مذمت ہیں نہ پوری نوع انسانی، اسی لئے حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ جملہ مذمت
 کے لئے نہیں بلکہ اکثر افراد نوع کے اعتبار سے بیان واقعہ کے طور پر ارشاد ہوا ہے۔ مطلب
 یہ کہ نوع انسانی کی اکثریت ظلوم و جہول ثابت ہوئی، جس نے اس امانت کا حق ادا نہ کیا،
 اور خسارہ میں پڑی، اور چونکہ اکثریت کا یہ حال تھا، اس لئے اس کو نوع انسانی کی طرف
 منسوب کر دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ آیت میں ظلوم و جہول خاص ان افراد انسانی کو کہا گیا ہے جو احکام
 شرعیہ کی اطاعت میں پورے نہ اترے۔ اور امانت کا حق ادا نہ کیا، یعنی امت کے
 کفار و منافقین اور فاسق و فجار اور گناہگار مسلمان۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن جریر
 حسن بصری وغیرہ سے منقول ہے۔ (قرطبی)

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ لفظ ظلوم و جہول اس جگہ بھولے بھالے کے معنی میں بطور محبانہ خطاب کہے گئے ہیں کہ اس نے اللہ جل شانہ کی محبت اور اس کے مقام قرب کی جستجو میں اور کسی انجام کو نہیں سوچا۔ اسی طرح یہ لفظ پوری بنی نوع کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ تفسیر منطہری میں حضرت محمد و الف ثانیؐ اور دوسرے صوفیائے کرام سے اسی طرح کا مضمون منقول ہے۔

لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ ۖ يَعْنِي تَأْثَنَهُ عَذَابِ دَعَا اللّٰهُ تَعَالٰی منافق مردوں اور منافق عورتوں کو، اور شرکیں مردوں اور عورتوں کو اور رحمت و مغفرت سے نوازے گا مؤمنین و مؤمنات کو، لِيُعَذِّبَ میں حرف لام بیان علت و غرض کے لئے نہیں بلکہ اصطلاح عربیت کے لحاظ سے لام عاقبت ہے۔ یعنی جو کسی چیز کا انجام بیان کرے جیسے ایک عربی شعر میں ہے ۛ لِنُؤَاۤءِلِ الْمَوْتِ وَابْتِئُوا۟ الْخَرَابِ ۚ ۛ یعنی پیدا ہو موت کے لئے اور تعمیر کر ویران ہونے کے لئے ۛ مراد یہ ہو کہ ہر پیدا ہونے والے کا انجام موت اور ہر تعمیر کا انجام ویرانی ہے۔

اس جملے کا تعلق حملہا الْاِنْسَانُ سے ہے، یعنی انسان کے بار امانت اٹھانے کا انجام یہ ہوگا کہ نوع انسانی میں دو فرق ہو جائیں گے، ایک کفار و منافق و غیرہ جو اطاعت الہیہ سے سرکش ہو کر امانت کے ضائع کرنے والے ہو گئے، ان کو عذاب دیا جائے گا، دوسرے مؤمنین و مؤمنات جو اطاعت احکام شرعیہ کے ذریعہ حق امانت ادا کر چکے، ان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ ہوگا۔

اس آخری جملے میں بھی ظلوم و جہول کے الفاظ کی اس تفسیر کی تائید ہوتی جو اکثر ائمہ تفسیر سے اوپر نقل کی گئی ہے، کہ یہ تمام نوع انسانی کے لئے نہیں بلکہ خاص اُن افراد کے لئے ہے جنہوں نے امانت الہیہ کو ضائع کیا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

مَسَائِد

سُورَةُ الْاَحْزَابِ بِعَوْنِہٖ تَعَالٰی وَحَمْدِہٖ
لِلْعِشْرِیْنِ مِنْ مَّحَرِّمِ الْحَرَامِ السَّامِیِّ
یَوْمَ الْمَثَلَتَاءِ

سُورَةُ السَّابِئِ

سُورَةُ السَّابِئِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ أَرْبَعٌ وَتِسْعُونَ آيَةً وَسِتُّ رُكُوعَاتٌ

سورۃ سبا مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں چوں آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

سب خوبی اللہ کی ہے جس کا ہر جو کچھ کہ ہے آسمان اور زمین میں

وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْآخِرَةِ ط وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ① يَعْلَمُ

اور اسی کی تعریف ہے آخرت میں اور وہی ہر حکمتوں والا سب کچھ جاننے والا ۔ جانتا ہے

مَا يَلْبِغُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ

جو کچھ کہ اندر گھستا ہے زمین کے اور جو کچھ کہ نکلتا ہے اس سے اور جو اترتا ہے آسمان سے

وَمَا يَعْصِرُ فِيهَا ط وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ ②

اور جو چڑھتا ہے اس میں اور وہی ہے رحم والا بخشنے والا ۔

خُلاصَةُ تَفْسِيرِ

تمام تر حمد و ثناء اسی اللہ کو سزاوار ہے جس کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے

اور جو کچھ زمین میں ہے اور جس طرح وہ فی الحال مستحق حمد ہے اسی طرح اسی کو حمد و ثناء

آخرت میں (بھی) سزاوار ہے اس کا ظہور اس طرح ہوگا کہ اہل جنت جنت میں داخل

ہونیکے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد ان الفاظ سے کریں گے، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ہَدٰ اَنَا لِهٰذَا، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَّقَنَا وَعَدَاہُ، وغیرہ) اور وہ حکمت والا ہے کہ آسمان و زمین کی تمام مخلوقات کو بے شمار مصالح اور منافع پر مشتمل بنایا ہے، اور وہ (خبردار) بھی ہے کہ ان مصالح اور منافع کو پیدا کرنے سے پہلے سے جانتا ہے، ہر چیز میں مصالح اور منافع بڑی حکمت کے ساتھ رکھ دیئے اور وہ ایسا خبیر ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو چیز زمین کے اندر داخل ہوتی ہے (مثلاً بارش کا پانی) اور جو چیز اس میں سے نکلتی ہے (مثلاً درخت اور عام نباتات) اور جو چیز آسمان سے اُترتی ہے اور جو چیز اس میں چڑھتی ہے (مثلاً فرشتے جو آسمان سے اُترتے ہیں اور چڑھتے رہتے ہیں، اور مثلاً احکام شرعیہ جو آسمان سے اتارے جاتے ہیں اور اعمال صالحہ جو آسمان میں لے جاتے جاتے ہیں، اور چونکہ ان سب چیزوں میں جسمانی یا روحانی منافع ہیں جن کا مقتضایہ ہے کہ سب لوگ پورا شکر ادا کریں، اور جو کوتاہی کرے وہ مستحق سزا ہو، لیکن) وہ (اللہ) رحیم (اور) غفور (بھی) ہے، (اور اپنی رحمت کی) صغیرہ گناہ کو نیک اعمال سے اور کبیرہ کو توبہ سے، اور کبھی دونوں قسم کے گناہوں کو بخش اپنے اپنے فضل سے معاف فرمادیتا ہے۔ اور جو گناہ کفر و شرک کی حد تک پہنچ جائے اس کو ایمان لانے سے معاف کر دیتا ہے)۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا لَا تَأْتِنَا السَّاعَةُ ط قُلْ بَلٰی وَ سَرِیُّ

اور کہنے لگے منکر نہ آئے گی ہم پر قیامت، تو کہہ کیوں نہیں قسم ہر میرے رب کی

لَتَأْتِیَنَّکُمْ عَلَیْمُ الْغِیْبِ لَا یَعْزُبُ عَنْہُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی

البتہ آئے گی تم پر اس عالم الغیب کی، غائب نہیں ہو سکتا اس سے کچھ ذرہ بھر آسمانوں

السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِکَ وَلَا اَکْبَرُ اِلَّا

میں اور نہ زمین میں اور کوئی چیز نہیں اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی جو

فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝۳ لِّیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ط

نہیں ہر کھلی کتاب میں۔ تاکہ بدلہ دے ان کو جو یقین لائے اور کئے بھلے کام۔

اُولٰٓئِکَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ کَرِیْمٌ ۝۴ وَالَّذِیْنَ سَعَوْا فِی

وہ لوگ جو ہیں ان کیلئے ہر معافی اور عزت کی روزی۔ اور جو لوگ دوڑے ہماری

إِلَيْنَا مُعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رَّجْزِ الْيُسْرِ ۝۵ وَ

آیتوں کے ہر آنے کو ان کو ہلاک کا عذاب ہے دردناک ۔ اور

يَرَى الَّذِينَ أَوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ

دیکھ لیں جن کو ملی ہے سمجھ کہ جو تجھ پر اترا تیرے رب سے وہی

الْحَقُّ لَوْ يَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝۶ وَقَالَ الَّذِينَ

ٹھیک ہی، اور سمجھاتا ہے راہ اس زبردست خوبیوں والے کی ۔ اور کہنے لگے

كَفَرُوا أَهْلَ نَدِ تُكُمُ عَلَى رَجُلٍ يُلَيِّسُكُمْ إِذَا مُزِقْتُمْ كَلَّ مَزَقٍ لَا

منکر ہم بتلائیں تم کو ایک مرد کہ تم کو خبر دیتا ہے جب تم پھٹ کر ہو جاؤ گے ٹکڑے ٹکڑے

إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝۷ أَفَتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَيْدًا أَمْ بِهِ جِنَّةٌ

تم کو پھرنے سے بنا ہے ۔ کیا بتالایا ہو اللہ پر جھوٹ یا اس کو سودا ہے

بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ

کچھ بھی نہیں پر جو یقین نہیں رکھتے آخرت کا آفت میں ہیں اور دور جا پڑے

الْبَعِيدِ ۝۸ أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّن

غلطی میں ۔ کیا دیکھتے نہیں جو کچھ اُن کے آگے ہے اور پیچھے ہے

السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ لَنَا نَحِيفَ بِهِمُ الْأَرْضِ أَوْ لُسِقُطُ

آسمان اور زمین سے اگر ہم چاہیں دھنسا دیں ان کو زمین میں یا گرا دیں

عَلَيْهِمْ كَسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ۝۹

ان پر ٹکڑا آسمان سے ، تحقیق اس میں نشانی ہے ہر بندے رجوع کرنے والے کے واسطے ۔

خلاصہ تفسیر

اور یہ کافر کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہ آئے گی، آپ فرمادیجئے کہ کیوں نہیں (آوے گی)

قسم اپنے پروردگار عالم الغیب کی کہ وہ ضرور تم پر آوے گی اس کا علم ایسا وسیع اور محیط

ہو کہ، اس کے علم سے کوئی ذرہ برابر بھی غائب نہیں نہ آسمانوں میں نہ زمین میں

(بلکہ سب اس کے علم میں حاضر ہیں) اور نہ کوئی چیز اس (مقدار مذکور) سے چھوٹی ہے اور نہ کوئی چیز اس سے بڑی ہے مگر یہ سب (بوجہ احاطہ علم الہی کے) کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ) میں (مرقوم) ہے قیامت کے متعلق کفار کے کئی شبہات تھے، ایک یہ کہ اگر آنے والی ہو تو اس کا وقت بتلائیے، کما قال تعالیٰ آیات مژمہا، دوسرا یہ کہ جن اجزاء کو جمع کر کے اُن میں حیات پیدا کرنا بتلایا جاتا ہے، ان کا کہیں نشان بھی نہ رہے گا پھر جمع کیسے ہوں گے؟

اس مضمون اثبات علم غیب سے شبہ اول کا جواب ہو گیا، کہ اس کا علم بوجہ حکمت کے مختص ہے باری تعالیٰ کے ساتھ، اگر نبی کو اس کا معین وقت معلوم نہ ہو تو لازم نہیں آتا کہ اس کا وقوع ہی نہ ہو، کما قال تعالیٰ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُنَا عِنْدَ اللَّهِ اور مضمون اثبات علم محیط سے دوسرے شبہ کا جواب ہو گیا ہے کہ ان تمام اجزاء کے زمین میں منتشر اور ہوا میں پھیل جانے کے باوجود وہ ہمارے علم سے خارج نہ ہوں گے، ہم جب چاہیں گے جمع کر لیں گے کما قال تعالیٰ أَفَلَمْ يَرَوْا الْخِزَابِ قِيَامَتِ كِي غَايَتِ بَتَلَاتِ یَسْ کہ وہ قیامت اس لئے آئے گی تاکہ ان

لوگوں کو صلہ (نیک) دے جو ایمان لائے تھے اور انھوں نے نیک کام کیا تھا (سو) ایسے لوگوں کے لئے مغفرت اور رہشت میں عزت کی روزی ہے، اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کے متعلق ران کے ابطال کی، کوشش کی تھی (نبی کو) ہرانے کے لئے (گو اس کوشش میں ناکام ہی ہے) ایسے لوگوں کے واسطے سختی کا دردناک عذاب ہوگا اور آیات قرآنیہ کی تکذیب پر یہ سزا ہونی ہی چاہئے، کیونکہ اول تو قرآن فی نفسه امر حق منزل من اللہ ہے اور ایسے امر حق کی تکذیب خود حق تعالیٰ کی تکذیب ہے، اس پر جتنی سزا ہو بجا ہے۔ دوسرے قرآن راہ راست کی تعلیم و ہدایت کرتا ہے، جو شخص اس کو نہ مانے گا وہ راہ راست سے قصداً دور رہے گا، نہ اس کو عقائد حقہ کا پتہ لگے گا نہ اعمال صالحہ کا اور یہی طریقہ تھا نجات کا۔ پس طریقہ نجات سے قصداً دور رہنے پر سزا کا ہونا بے جا نہیں ہے، اور قرآن کا حق اور ہادی ہونا ایسا واضح ہے کہ علاوہ اس کے اور دلائل سے ثابت ہے۔ ایک سہل طریق اس کے ثبوت کا یہ ہے کہ جن لوگوں کو (آسمانی کتابوں کا) علم دیا گیا ہے وہ اس قرآن کو جو کہ آپ کے رب کی طرف سے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے ایسا سمجھتے ہیں کہ وہ حق ہے اور وہ خدائے غالب محمود (کی رضا) کا راستہ بتلاتا ہے اس استدلال کی تقریر شروع رکوع اخیر سورۃ شعراء میں گذر چکی ہے۔ اور شاید منجملہ جمیع امور واجبۃ الایمان کے، بیان حقیقت قرآن کا اہتمام اس لئے فرمایا ہو کہ یہ اُن امور واجبۃ الایمان پر مشتمل ہے بالخصوص خبر قیامت پر جس میں اس مقام میں کلام ہے۔ پس اس بنا پر

حاصل یہ ہوا کہ قیامت کے روز اسی قیامت کی تکذیب پر بھی سزا ہوگی، اور آگے پھر قیامت کا اثبات ہے یعنی یہ کافر (آپس میں) کہتے کہ کیا ہم تم کو ایک ایسا آدمی بتائیں جو تم کو یہ (عجیب) خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو (اس کے بعد قیامت کو) تم ضرور ایک نئے جہنم میں آؤ گے معلوم نہیں اس شخص نے خدا پر (قصداً) جھوٹ بہتان باندھا ہے یا اس کو کسی طرح کا جنون ہے کہ بلا قصد جھوٹ بول رہا ہے، کیونکہ یہ امر تو محال ہے تو اس کے وقوع کی خبر ضرور غلط ہے، خواہ قصد سے ہو یا فسادِ تخیل سے ہو۔ حق تعالیٰ ان دونوں شقوں کو رد فرماتے ہیں کہ ہمارے نبی تو مفتری اور مجنون کچھ بھی نہیں، بلکہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے (وہی) عذاب اور دردِ دراز گمراہی میں (مبتلا) ہیں، اس گمراہی کا حالی اثر یہ ہے کہ سچے بھی مفتری اور مجنون نظر آتے ہیں، اور مالی اثر یہ ہے کہ عذاب بھگتنا پڑے گا۔ اور یہ جاہل جو اس جمع و احیاء جزاء متفرقہ جہاد یہ کو محال بعید از قدرت سمجھ رہے ہیں) تو کیا انھوں نے (دلائل عظمتِ قدرتِ الہیہ میں سے) آسمان اور زمین کی طرف نظر نہیں کی جو ان کے آگے (بھی) اور ان کے پیچھے (بھی) موجود ہیں (کہ جد دیکھیں وہ نظر آرہے ہیں۔ پس ان اجرامِ عظیمہ کا ابتداء پیدا کرنے والا کیا اجسامِ صغیرہ کے ثانیاً پیدا کرنے پر قادر نہیں، کما قال اللہ تعالیٰ تَخْلُقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَکْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ الخ اور باوجود وضوح دلائل حق کے پھر بھی انکار و عناد کرنے کی وجہ سے یہ ہیں تو اس قابل کہ انکو ابھی سزا دی جائے اور سزا بھی ایسی کہ یہ دلائل قدرتِ آسمان و زمین جو ان کے لئے نعمتِ عظیمہ بھی ہیں انہی کو ان کے لئے آلہ تعذیب بنا دیا جائے کہ جس نعمت کا کفران ہو اسی نعمت کو نعمت یعنی عذاب بنانے سے سخت حسرت ہوتی ہے۔ اور ہم اس سزا پر بھی قادر ہیں چنانچہ) اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا (اگر چاہیں تو) ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں (لیکن حکمت مقتضی ہے تاخیر کو اس لئے ہمت دے رکھی ہے، غرض ان لوگوں کو دفع تو ہم استحالہ کے لئے آسمان و زمین پر نظر کرنا چاہتے ہیں کیونکہ) اس (دلیل مذکور) میں (قدرتِ الہیہ کی) پوری دلیل ہے (مگر) اس بندہ کے لئے جو (خدا کی طرف) متوجہ (بھی) ہو اور حق کی طلب ہو یعنی دلیل تو کافی ہے مگر ان کی طرف سے طلب نہیں اس لئے محسوس ہیں)۔

معارف و مسائل

عَالِمِ الْغَيْبِ، یہ صفت رب کی ہے جس کی اوپر قسم کھائی گئی ہے، اور اللہ جل شانہ

کی تمام صفات میں سے اس جگہ صفت علم غیب و علم محیط کو شاید اس لئے خاص کیا گیا کہ کلام منکرین قیامت کے معاملہ میں ہے، اور قیامت کے انکار کا بڑا سبب کفار کے لئے یہ تھا کہ جب سب انسان مر کر مٹی ہو جائیں گے اور اس مٹی کے ذرات بھی دنیا میں منتشر ہو جائیں گے تو سارے جہان میں پھیلے ہوئے ذرات کو جمع کرنا پھر ہر ایک انسان کے ذرات کو دوسرے انسانوں کے ذرات سے الگ کر کے ہر ایک کے ذرات اسی کے وجود میں پیوست کرنا کیسے ممکن ہے؟ اور اس کو ناممکن سمجھنا اسی بنا پر تھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت اپنے علم و قدرت پر قیاس کر رکھا تھا۔ حق تعالیٰ نے بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ کا علم سارے عالم پر ایسا محیط ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو چیز بھی ہے اس کو سب معلوم ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے، کوئی ذرہ مخلوقات کا اس کے علم سے باہر نہیں، اور یہ علم محیط حق تعالیٰ کی خصوصیت ہو، کسی مخلوق کو خواہ فرشتہ ہو یا پیغمبر ایسا علم محیط کہ کوئی ذرہ جہاں کا اس سے خارج نہ ہو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور جس ذات کو ایسا علم محیط حاصل ہو اس کے لئے ایک انسان کے ذرات کو الگ الگ سارے جہان میں سے جمع کر لینا اور اس سے ان کے اجسام کو دوبارہ مرکب کر دینا کیا مشکل ہے۔

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا، اس جملہ کا تعلق اس سے پہلے جملے لَتَأْتِيَٰنَّكُمْ سے ہے، یعنی قیامت ضرور آئے گی، اور قیامت آنے کا مقصد یہ ہوگا کہ ایمان والوں کو جزا اور بہترین رزق جنت کا دیا جائے اور ان کے مقابل الَّذِينَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا، یعنی وہ لوگ جنھوں نے ہماری آیات پر اعتراض کئے اور لوگوں کو ان کے ملنے سے روکنے کی کوشش کی۔ مُعْجِزَاتِنَا یعنی ان کی یہ کوشش گویا اس لئے تھی کہ وہ ہمیں گرفت سے عاجز کر دیں گے اور قیامت کی حاضری سے چھوٹ جائیں گے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رَّجْزٍ اَلِيْمٍ، یعنی ایسے لوگوں کے لئے عذاب ہوگا رَجْزٍ اَلِيْمٍ کا جس کے معنی سخت عذاب کے ہیں جو دردناک ہو۔

وَيٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰوْتُوْا الْعِلْمَ، یہ منکرین قیامت کے بالمقابل ان مومنین کا ذکر ہے جو قیامت پر ایمان لائے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا وہ اس علم سے مستفید ہوئے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُوكُمْ عَلٰٓى رَجُلٍ يُّنٰبِيْكُمْ اِذَا مُرِّقْتُمْ كِلًا مِّنْ رِّقِّ اِثْكُمۡ لَعَنَ خَلْقَ جِدِّدٍ، یہ کفار منکرین قیامت کا قول نقل کیا گیا ہے، جو بطور تحقیر و استہزاء کے یوں کہا کرتے تھے کہ آؤ ہم تمہیں ایک ایسے عجیب شخص کا پتہ دیں جو یوں

الْأَنبَاءُ الْحَدِيدَ ۝۱۰ أَنْ أَعْمَلَ سَبْعِينَ وَفِي السَّرْدِ

نرم کر دیا ہم نے اس کے آگے لوہا، کہ بنا زریں کشادہ اور اندازے سے جوڑ کر طیاں

وَأَعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۱۱ وَلَسَكُمْ مِنَ الْيَمِّ

اور کرو تم سب کام بھلا میں جو کچھ تم کرتے ہو دیکھتا ہوں۔ اور ایمان کے آگے ہوا کو

عَذَابٌ وَهَّاشٌ ۝۱۲ وَأَسْلَمْنَا لَهُ مِنَ الْفِطْرِ وَمِنَ

صبح کی منزل کی ایک مہینہ کی اور شام کی منزل ایک مہینہ کی اور یہاں ہم نے اس کے واسطے چیمہ بچھلے ہوئے تابو کا،

الْجِنِّ مَنْ يَعْمَلْ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ

اور جنوں میں کتنے لوگ تھے جو محنت کرتے اس کے ساتھ اس کے رب کے حکم سے اور جو کوئی پھرے ان میں سے

عَنْ أَمْرِنَا ذُنُوبُهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ۝۱۳ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا

ہمارے حکم سے چکھائیں ہم اس کو آگ کا عذاب۔ بناتے اس کے واسطے جو کچھ

يَشَاءُ مِنْ تَحَارِيْبٍ وَتَمَائِيلٍ وَجَفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقَدْ وَرِ

چاہتا قلعے اور تصویریں اور لگن جیسے تالاب اور دیگیں

رُسُلَاتٍ أَعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ

پوٹھوں پر بھی ہوئی، کام کر دے داؤد کے گھر والو احسان مان کر اور تھوڑے ہیں میرے بندوں میں

الشُّكُورِ ۝۱۴ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَى مَوْتِهِ

احسان ماننے والے۔ پھر جب مقرر کیا ہم نے اس پر موت کو نہ بتلایا ان کو اس کا مرنا

إِلَّا دَابَّةَ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَاتَهُ ۖ فَلَمَّا خِرَّ تَبَيَّنَتْ الْجِنُّ

مگر کیڑے نے گھن کے کھاتا رہا اس کا عصا، پھر جب وہ گر پڑا معلوم کیا جنوں نے

أَنْ لَّوْكَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ۝۱۵

کہ اگر خبر رکھتے ہوتے غیب کی نہ رہتے ذلت کی تکلیف میں۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو اپنی طرف سے بڑی نعمت دی تھی (چنانچہ

ہم نے پہاڑوں کو حکم دیا تھا کہ) اے پہاڑو! داؤد کے ساتھ بار بار تسبیح کرو (یعنی جب یہ ذکر میں مشغول ہوں تم بھی ان کا ساتھ دو) اور اسی طرح (پرنندوں کو بھی حکم دیا کہ ان کے ساتھ تسبیح کرو) وَمَا قَالَ اللَّهُ تَعَالَىٰ إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحُونَ بِالْحَمْدِ وَالْأَشْرَاقِ وَالظُّلُمِ مَحْشُورَةً الخ شاید اس میں ایک حکمت یہ ہو کہ ان کو ذکر میں نشاط ہوگا، اور یہ بھی حکمت ہو کہ آپ کا ایک معجزہ ظاہر ہوگا اور غالباً یہ تسبیح ایسی ہوگی کہ سننے والے بھی سمجھ لیں ورنہ غیر مفہوم تسبیح تو عام ہے، اس میں معیت داؤد علیہ السلام کی کیا تخصیص ہے؟ وَمَا قَالَ تَعَالَىٰ قَدْ مَنَ شَيْءٌ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدٍ وَلَٰكِنْ لَا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيحَهُمْ (اور ایک نعمت یہ دیدی کہ) ہم نے ان کے واسطے لوہے کو (مثل موم کے) نرم کر دیا (اور یہ حکم دیا) کہ تم (اس لوہے کی اچھی) پوری زریں بناؤ اور (کڑیوں کے) جوڑنے میں (مناسب) اندازہ رکھا خیال رکھو اور (جیسے ہم نے تم کو نعمتیں دی ہیں اُن کے شکریں) تم سب (یعنی داؤد علیہ السلام اور ان کے متعلقین) نیک کام کیا کرو میں تمہارے سب کے اعمال کو دیکھ رہا ہوں (اس لئے رعایتِ حدود کا پورا اہتمام رکھو) اور سلیمان (علیہ السلام) کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا کہ اس (ہوا) کا صبح کا چلنا مہینے بھر کی مسافت تھی اور (اسی طرح) اس کا شام کا چلنا مہینے بھر کی مسافت تھی (یعنی وہ ہوا سلیمان علیہ السلام کو اتنی اتنی دور پہنچاتی تھی) وَمَا قَالَ تَعَالَىٰ وَنَسَخَرْنَا لَهُ الْمَرْيَمَ نَجْرِي بِأَمْرِهِ (اور ایک نعمت اُن کو یہ دی کہ) ہم نے ان کے لئے تانبے کا چشمہ بہا دیا (یعنی تانبے کو اس کے معدن میں رستین سیال کر دیا تاکہ اس سے مصنوعات بنانے میں بدون آلات کے سہولت ہو، پھر وہ منجمد ہو جاتا، یہ بھی ایک معجزہ ہے) اور (ایک نعمت یہ تھی کہ ہم نے جنات کو ان کے تابع کر دیا تھا چنانچہ جنات میں بعضے وہ تھے جو اُن کے آگے (طرح طرح کے) کام کرتے تھے ان کے رب کے حکم (تسخیری) سے (یعنی چونکہ پروردگار نے مسخر کر دیا تھا) اور (حکم تسخیری کے ساتھ ان کو حکم تشریعی بھی مع وعید یہ دیا تھا کہ) ان میں جو شخص ہمارے (اس) حکم سے (کہ سلیمان علیہ السلام کی اطاعت کرو) سرتابی کرے گا (یعنی تسلیمِ انقیاد سے کام نہ کرے گا) گو بوجہ تسخیر کے سلیمان علیہ السلام اس سے جبراً کام لینے پر قادر ہوں گے جیسے بیگاریوں سے کام لیا جاتا ہے تو) ہم اس کو (آخرت میں) دوزخ کا عذاب چکھا دیں گے (اس سے یہ بھی مفہوم ہوا کہ جو تسلیم و انقیاد سے کام کرے گا اور پورا انقیاد یہ ہے کہ ایمان بھی اختیار کرے کیونکہ ہر نبی اپنے محکومین کو اس کا امر کرتا ہے تو بدون اس کے انقیاد نہیں پس حاصل یہ کہ جو جن ایمان و اطاعت اختیار کرے گا وہ عذابِ سعیر سے محفوظ رہے گا، جیسا کہ

ایمان کا مقتضا ہے آگے ان کاموں کو بتلاتے ہیں جن پر جنات مامور تھیں، یعنی وہ جنات ان کے لئے وہ وہ چیزیں بناتے جو ان کو (بنوانا) منظور ہوتا بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن، (ایسے بڑے) جیسے حوض اور بڑی بڑی، دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں (ہلائے بل نہ سکیں اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا کہ جیسے ہم نے تم کو نعمتیں بھی دی ہیں) اے داؤد کے خاندان والو (یعنی سلیمان علیہ السلام اور ان کے متعلقین) تم سب ان نعمتوں کے (شکریہ میں نیک کام کیا کرو اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں) اس لئے اس شکر گزاری کرنے سے جس کا طریق مقصود عمل صالح ہے تم کو خلق کثیر پر امتیاز ہو جائے گا پس اس جملہ میں تحریر ہو گئی شکر و عمل صالح پر جیسے داؤد علیہ السلام کو بھی اِعْمَلُوا صَالِحًا حکم ہوا تھا اور اسی طرح وہاں تسخیر جبال و طیور تھی، اور یہاں تسخیر ریخ و جن مذکور ہوئی اور وہاں لوگوں کو نرم کر دینا تھا یہاں تانبے کو، غرض زندگی بھر سلیمان علیہ السلام کے سامنے جنات کا یہ معاملہ رہا، پھر جب ہم نے ان پر (یعنی سلیمان علیہ السلام پر) موت کا حکم جاری کر دیا، (یعنی انتقال فرما گئے) تو ایسے طور پر موت واقع ہوئی کہ جنات کو خبر نہیں ہوئی وہ یہ کہ سلیمان علیہ السلام موت کے قریب عصا کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کو زیرِ ذقن لگا کر تخت پر بیٹھ گئے اور اسی حالت میں رُوح قبض ہو گئی اور اسی طرح سال بھر تک بیٹھ رہے، جنات آپ کو بیٹھا دیکھ کر زندہ سمجھتے رہے، یہ کسی کی مجال نہ تھی کہ پاس جا کر یا خوب گھور کر دیکھ سکے، خصوصاً جب کہ کوئی وجہ شبہ کی نہ ہو اور زندہ سمجھ کر بدستور کام کرتے رہے اور کسی چیز نے اُن کے مرنے کا پتہ نہ بتلایا مگر گھن کے کیڑے نے کہ وہ سلیمان (علیہ السلام) کے عصا کو کھاتا تھا (یہاں تک کہ ایک حصہ اس کا کھا لیا، تو وہ عصا گر پڑا، اس کے گرنے سے سلیمان علیہ السلام گر پڑے) سو جب وہ گر پڑے (اور گھن کے کھانے کا تخمینہ لگانے سے معلوم ہوا کہ ان کو تو وفات پائے ہوئے ایک سال ہوا) تب جنات کو اپنے دعویٰ غیب دانی کی حقیقت معلوم ہوئی (وہ یہ کہ) اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو (سال بھر تک) اس ذلت کی مصیبت میں نہ رہتے (مراوا اعمالِ شاقہ ہیں جن میں بوجہ محکومیت کے ذلت بھی تھی اور مشقت کی وجہ سے مصیبت بھی ہے)۔

معارف و مسائل

اوپر منکرین قیامت کفار سے خطاب تھا، جو مرنے اور جسم کے اجزاء منتشر ہو جانے کے بعد دوبارہ ان کے جمع کرنے اور ان میں حیات پیدا کرنے کو خلاف عقل سمجھ کر انکار کیا

کرتے تھے، آیات مذکورہ میں ان کا استبعاد دور کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے قصے اس لئے ذکر فرمائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں اسی دنیا میں ایسے کاموں کا مشاہدہ کرا دیا جن کو یہ لوگ محال سمجھا کرتے تھے، مثلاً لوہے کو موم بنا دینا، ہوا کو تابع فرمان بنا دینا، تانبے کو ایک سیال چیز پانی کی طرح کر دینا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا، ”یعنی عطا کیا ہم نے داؤد کو اپنا فضل“ فضل کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں، مراد وہ خاص صفات ہیں جو دوسروں سے زائد ان کو عطا کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی و پیغمبر کو بعض خاص صفات امتیازی عطا فرمائی ہیں جو انکی مخصوص فضیلت سمجھی جاتی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی مخصوص صفات یہ تھیں کہ ان کو اپنی نبوت و رسالت کے ساتھ پوری دنیا کی سلطنت و حکومت بھی عطا فرمائی تھی۔ اور خوش آوازی کی ایسی صفت عطا فرمائی تھی کہ جب آپ اللہ کے ذکر یا زبور کی تلاوت میں مشغول ہوتے تو پرندے ہوا میں اڑتے ہوئے سننے کو جمع ہو جاتے تھے، اسی طرح متعدد معجزات خصوصی عطا ہوئے تھے جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

يَا حَبَّالُ أَؤَيِّبُ، ”اؤییب سے مشتق ہے، جس کے معنی دُہرانے اور لوٹانے کے آتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو حکم دیدیا تھا کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کا ذکر و تسبیح کریں تو پہاڑ بھی وہ کلمات پڑھ کر لوٹائیں۔

اسی طرح حضرت ابن عباسؓ نے اؤییب کی تفسیر سبجی سے فرمائی ہے (ابن کثیر) یہ پہاڑوں کی تسبیح جو وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ کرتے تھے اس عام تسبیح کے علاوہ ہے جس میں کُل مخلوقات شریک ہیں، اور جو ہر جگہ ہر وقت ہر زمانے میں جاری ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے وَمَا مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُوا سَوْنِ تَسْبِيحَهُمْ، یعنی دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی تسبیح نہ پڑھتی ہو مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔ یہاں جس تسبیح کا ذکر ہے وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے یہ ظاہر ہے کہ اس تسبیح کو عام سننے والے بھی سننے سمجھتے ہوں گے، ورنہ پھر معجزہ ہی نہ ہوتا۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ داؤد علیہ السلام کی آواز کے ساتھ پہاڑوں کا آواز ملنا اور تسبیح کو دُہرانے کا آواز بازگشت کے طور پر نہ تھا جو عام طور پر گنبد یا کنوئیں وغیرہ میں آواز دینے کے وقت آواز کے لوٹنے سے سنی جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے اس کو حضرت داؤد علیہ السلام پر خصوصی فضل و انعام کی حیثیت میں ذکر فرمایا ہے، آواز بازگشت

میں کسی کی فضیلت و خصوصیت سے کیا تعلق ہے وہ تو ہر انسان چاہے کافر ہی ہو بازگشت کی جگہ میں اس کی آواز بھی ٹوٹتی ہے۔

وَالطَّيْرُ، یہ لفظ نحوی ترکیب میں سخر نامزد و کامفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے (روح) معنی یہ ہیں کہ ہم نے پرندوں کو حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے مسخر کر دیا تھا مراد اس تسخیر سے یہ ہے کہ پرندے بھی آپ کی آواز پر ہوا میں جمع ہو جاتے۔ اور آب کے ساتھ پہاڑوں کی طرح تسبیح کرتے تھے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں مذکور ہے، إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحُنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً یعنی ہم نے پہاڑوں کو داؤد علیہ السلام کا مسخر کر دیا تھا کہ صبح شام ان کے ساتھ تسبیح کیا کریں اور پرندوں کو بھی مسخر کر دیا۔

وَأَنشَأَهُ الْفَحْيَیْنَ أَنِ اعْمَلْ لِّسَبْعَةِ رُقَعٍ فِی السَّرَادِ، یہ دوسرا معجزہ ہے کہ لوہے کو ان کے لئے نرم کر دیا تھا۔ حسن بصری، قتادہ، اعمش وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ کے لوہے کو ان کیلئے موم کی طرح نرم بنا دیا تھا کہ اس سے کوئی چیز بنانے میں نہ ان کو آگ کی ضرورت پڑتی تھی اور نہ کسی ہتھوڑے یا دوسرے آلات کی۔ آگے آیت میں اس کا بیان ہے کہ لوہے کو ان کے لئے نرم اس لئے بنایا گیا تھا کہ وہ لوہے کی زرہ آسانی سے بنا سکیں، اور ایک دوسری آیت میں یہ بھی مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زرہ سازی کی صنعت آپ کو خود سکھائی تھی وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ، یعنی ہم نے سکھائی ان کو صنعت زرہ بنانے کی، اور اس آیت میں بھی آگے جو قَدَرِی السَّرَادِ آیا ہے، یہ بھی اس صنعت کے سکھانے کی تکمیل ہے۔ لفظ قَدَرٌ تقدیر سے مشتق ہے جس کے معنی ایک اندازے پر بنانے کے ہیں، اور سَرَادِ کے لفظی معنی بننے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زرہ کے بنانے میں اس کی کڑیوں کو متوازن اور متناسب بنائیں، کوئی چھوٹی کوئی بڑی نہ ہو، تاکہ وہ مضبوط بھی بنے اور دیکھنے میں بھی بھلی معلوم ہو۔ قَدَرٌ فِی السَّرَادِ کی یہ تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی سے منقول ہے (ابن کثیر)

فَاعْلَمْ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صنعت میں ظاہری خوش نمائی کی رعایت بھی پسندیدہ چیز ہے کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاص ہدایت فرمائی۔

فَاعْلَمْ: بعض حضرات نے قَدَرٌ فِی السَّرَادِ کی تفسیر میں تقدیر سے یہ مراد لیا کہ اس صنعت کے لئے ایک مقدار وقت کی معین کر لینا چاہئے۔ سارے اوقات اس میں صرف نہ ہو جائیں، تاکہ عبادت اور امور سلطنت میں اس کی وجہ سے خلل نہ آئے۔ اس تفسیر پر

معلوم ہوا کہ صنعت کار اور محنت کش لوگوں کو بھی یہ چاہئے کہ عبادت اور اپنی معلومات حاصل کرنے کے لئے اپنے کام سے کچھ وقت بچا یا کریں اور اوقات کا انضباط رکھیں۔ (روح المعانی) صنعت و حرفت کی آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ اشیاء ضرورت کی ایجاد و صنعت ایسی اہم بڑی فضیلت ہے۔ چیز ہے کہ حق تعالیٰ نے خود اس کی تعلیم دینے کا اہتمام فرمایا، اور اپنے عظیم الشان پیغمبروں کو سکھلایا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھانا اسی آیت سے ثابت ہوا، حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کی صنعت اسی طرح سکھائی گئی، **وَاصْنِعِ الْفُلْكَ يَا عِيسَىٰ** یعنی ہمارے سامنے کشتی بناؤ، سامنے بنانے کا مطلب یہی ہے کہ جس طرح ہم بتلاتے ہیں اسی طرح بناؤ۔ اسی طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کو بھی مختلف صنعتیں سکھانا بعض روایات سے ثابت ہے۔ **الطَّبَّ النَّبِيُّ** کے نام سے ایک کتاب امام حدیث حافظ شمس الدین ذہبی کی طرف نسبت کے ساتھ چھپی ہے، اس میں تو ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ انسانی زندگی کے لئے جتنی اہم اور ضروری صنعتیں ہیں مثلاً مکان بنانا، کپڑا بنانا، درخت بونا اور اگانا، کھانے کی چیزیں تیار کرنا، حمل و نقل کے لئے پہیوں کی گاڑی بنا کر چلانا وغیرہ یہ سب ضروری صنعتیں اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے انبیاء علیہم السلام کو سکھلائی تھیں۔

صنعت پیشہ لوگوں کو | عرب میں مختلف آدمی مختلف صنعتیں اختیار کرتے تھے، کسی صنعت حقیر سمجھنا گناہ ہے۔ کو حقیر یا ذلیل نہیں سمجھا جاتا تھا، اور پیشہ و صنعت کی بنیاد پر کسی شخص کو کم یا زیادہ نہ سمجھا جاتا تھا، نہ پیشوں کی بنیاد پر کوئی برادری بنتی تھی۔ پیشوں کی بنیاد پر برادریاں بنانا اور بعض پیشوں کو بحیثیت پیشہ حقیر و ذلیل سمجھنا یہ ہندوستان میں ہندوؤں کی پیداوار ہے، ان کے ساتھ رہنے بہنے سے مسلمانوں میں بھی یہ اثرات قائم ہو گئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو | تفسیر ابن کثیر میں امام حدیث حافظ ابن عساکر کی روایت سے صنعت زرہ سکھانے کی حکمت نقل کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنی خلافت و سلطنت کے زمانہ میں بھیس بدل کر بازاروں وغیرہ میں جاتے، اور مختلف اطراف سے آنے والے لوگوں سے پوچھا کرتے تھے کہ داؤد کیسا آدمی ہے؟ چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی سلطنت میں عدل و انصاف عام تھا، اور سب انسان آرام و عیش کے ساتھ گزارہ کرتے تھے، کسی کو حکومت سے کوئی شکایت نہ تھی، اس لئے جس سے سوال کرتے وہ داؤد علیہ السلام کی مدح و ثناء اور عدل و انصاف پر اظہارِ شکر کرتا تھا۔

حق تعالیٰ نے ان کی تعلیم کے لئے اپنے ایک فرشتے کو بشکل انسان بھیج دیا، جب

داؤد علیہ السلام اس کام کے لئے نیکے تو یہ فرشتہ ان سے ملا۔ حسب عادت اس سے بھی وہی سوال کیا، فرشتے نے جواب دیا کہ داؤد بہت اچھا آدمی ہے اور سب آدمیوں سے وہ اپنے نفس کے لئے بھی اور اپنی امت و رعیت کے لئے بھی بہتر ہے، مگر اس میں ایک عادت ایسی ہے کہ وہ نہ ہوتی تو وہ بالکل کامل ہوتا۔ داؤد علیہ السلام نے پوچھا وہ کیا عادت سے؟ فرشتے نے کہا کہ وہ اپنا کھانا پینا اور اپنے اہل و عیال کا گزارہ مسلمانوں کے مال یعنی بیت المال میں سے لیتے ہیں۔

یہ بات سن کر حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف الحاح و زاری اور دعا کا اہتمام کیا کہ مجھے کوئی ایسا کام سکھا دیں جو میں اپنے ہاتھ کی مزدوری سے پورا کروں، اور اس کی اجرت سے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا گزارہ کروں، اور مسلمانوں کی خدمت اور سلطنت کے تمام کام بلا معاوضہ کروں۔ ان کی دعا کو حق تعالیٰ نے قبول فرمایا، ان کو زرہ سازی کی صنعت سکھا دی، اور پیغمبرانہ اعزاز یہ دیا کہ لوہے کو ان کے لئے موم بنا دیا تاکہ یہ صنعت بہت آسان ہو جائے، اور تھوڑے وقت میں اپنا گزارہ پیدا کر کے باقی وقت عبادت اور امور سلطنت میں لگا سکیں۔

مَسْئَل : خلیفہ وقت یا سلطان کو جو اپنا پورا وقت امور سلطنت کی انجام دہی میں صرف کرتا ہے شرعاً یہ جائز ہے کہ اپنا متوسط گزارہ بیت المال سے لے لے، لیکن کوئی دوسری صورت گزارہ کی ہو سکے تو وہ زیادہ پسند ہے۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کے خزانے کھول دیئے تھے، اور زر و جواہرات اور تمام اشیاء ضرورت کی بڑی فراوانی تھی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو بیت المال کے مال میں حسب منشاء ہر تصرف کی اجازت بھی دیدی گئی تھی۔ آیت قَامُنْجُ آوْ اَمْسِلْ یَغْنِیْ حِسَابِ میں یہ بھی اطمینان دلایا تھا کہ آپ جس طرح چاہیں خرچ کریں، آپ کے ذمہ حساب دینا نہیں ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کو حق تعالیٰ جس مقام بلند پر رکھنا چاہتے ہیں اس کے تقاضہ سے یہ واقعہ پیش آیا اور اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام اتنی بڑی سلطنت کے ہوتے ہوئے اپنی مزدوری سے اپنا گزارہ پیدا کرتے اور اسی پر قناعت کرتے تھے۔

علماء جو تعلیم و تبلیغ کی خدمت مفت انجام دیتے ہوں، اور قاضی و مفتی جو لوگوں کے کام میں اپنا وقت صرف کرتے ہوں اُن کا بھی یہی حکم ہے کہ بیت المال سے اپنا خرچ لے سکتے ہیں، مگر کوئی دوسری صورت گزارہ کی ہو جو دینی خدمت میں خلل انداز بھی نہ ہو تو

وہ بہتر ہے۔

فائدہ: حضرت داؤد علیہ السلام کے اس طرز عمل سے کہ اپنے اعمال و عبادت کے متعلق لوگوں کی رائیں بے تکلف آزادانہ معلوم کرنے کا اہتمام فرماتے تھے یہ ثابت ہوا کہ اپنے عیوب چونکہ آدمی کو خود معلوم نہیں ہوتے، اس لئے دوسروں سے تحقیق کرنا چاہئے۔ حضرت امام مالکؒ بھی اس کا اہتمام فرماتے تھے کہ یہ معلوم کریں کہ عام لوگ ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحُ عُدُوُّهَا شَرْمُورٌ وَرَوَّاحُهَا شَمُرُّ، حضرت داؤد علیہ السلام کے خصوصی فضائل و انعامات کے ذکر کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر فرمایا اور ارشاد ہوا کہ جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا، اسی طرح سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو مسخر فرما دیا تھا، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت کو جس پر وہ مع اپنے اہل و بار کے بڑی تعداد میں سوار ہوتے تھے، ہوا ان کے حکم کے تابع جہاں وہ چاہتے لے جاتی تھی۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ تسخیر ہوا کا معجزہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس عمل کے صلہ میں عطا ہوا تھا کہ ایک روز وہ اپنے گھوڑوں کے معائنہ میں مشغول تھے، اس میں ایسی مشغولیت ہوئی کہ عصر کی نماز قضا ہو گئی، چونکہ گھوڑے اس غفلت کا سبب ہوئے تھے، اس سبب غفلت کو ختم کرنے کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان گھوڑوں کو ذبح کر کے قربان کر دیا کیونکہ سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں گائے بیل کی طرح گھوڑے کی قربانی بھی جائز تھی، اور یہ گھوڑے خود حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملک میں تھے، اس لئے بیت المال کے نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور قربانی کی وجہ سے اپنا مال ضائع کرنے کا اشکال بھی نہیں ہوتا۔ اس کی پوری تفصیل سورہ ص میں آئے گی، چونکہ سلیمان علیہ السلام نے اپنی سواری کے جانور قربان کر دیئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بہتر سواری عطا فرمادی۔ (تشریحی)

عُدُوُّهَا شَمُرُّ وَرَوَّاحُهَا شَمُرُّ، عُدُو کے معنی صبح کو چلنے اور رَوَّاح کے معنی شام کو چلنے کے ہیں۔ مطلب آیت کا یہ ہوا کہ صبح سے دوپہر تک یہ تخت سلیمانی ہوا کے کاندھوں پر ایک مہینہ کی مسافت طے کر لیتا تھا، اور پھر شام سے رات تک ایک مہینہ کی اس طرح دو مہینے کی مسافت ایک دن میں طے کرتا تھا۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام صبح کو بیت المقدس سے

روانہ ہوتے تو دوپہر کو صطخر میں جا کر قیام فرماتے، اور دوپہر کا کھانا کھاتے تھے، پھر یہاں سے بعد ظہر واپس چلتے تو کابل میں جا کر رات ہوتی تھی، اور بیت المقدس اور صطخر کے درمیان اتنی مسافت ہے جو تیز سواری پر چلنے والا ایک ماہ میں طے کر سکتا ہے، اسی طرح صطخر سے کابل تک کی مسافت بھی تیز سواری پر چلنے والا ایک ماہ میں طے کر سکتا ہے۔ (ابن کثیر)

وَأَسْلَمْنَا لَهُ عَلَيْنَا الْفِطْرَ، یعنی بہادیاہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے چشمہ تانبے کا یعنی تانبے جیسی سخت دھات کو اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے لئے پانی کی طرح بہنے والا سیال بنا دیا، جو پانی کے چشمہ کی طرح جاری تھا اور گرم بھی نہ تھا، تاکہ آسانی کے ساتھ اس کے برتن اور دوسری ضروریات بنا سکیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ چشمہ اتنی دور تک جاری ہوا جس کی مسافت تین دن تین رات میں طے ہو سکے، اور یہ ارض یمن میں تھا۔ اور مجاہد کی روایت میں ہے کہ یہ چشمہ صنعاء یمن سے شروع ہوا اور تین دن تین رات کی مسافت تک پانی کے چشمہ کی طرح جاری رہا، خلیل نحوی نے فرمایا کہ لفظ قِطْر جو اس آیت میں آیا ہے اس سے مراد پگھلا ہوا تانبہ ہے (قرطبی)

وَمِنَ الْجِنِّ مَن يَحْمِلُ بَيْنَ يَدَيْهِ، یہ جملہ بھی تسخیر نامحذوف سے متعلق ہے یعنی یہ ہیں کہ مسخر کر دیا، ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات میں سے ایسے لوگوں کو جو ان کے سامنے ان کے کام انجام دیں اپنے رب کے حکم کے موافق، بَيْنَ يَدَيْهِ یعنی ان کے سامنے کے الفاظ بڑھانے سے شاید یہ بتلانا ہو کہ سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات کی تسخیر اس طرح کی نہیں جس طرح چاند سورج وغیرہ کو انسان کے لئے مسخر کرنے کا ارشاد قرآن میں آیا ہے، بلکہ یہ تسخیر ایسی تھی کہ جنات نوکروں چاکروں کی طرح ان کے سامنے مفوضہ خدمات میں لگے رہتے تھے۔

تسخیر جنات کا مسئلہ جنات کی تسخیر جو اس جگہ مذکور ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے، اس میں تو کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا، اور بعض صحابہ

کرام کے متعلق جو روایات میں آیا ہے کہ جنات ان کے مسخر اور تابع تھے، تو یہ تسخیر بھی اسی قسم کی تسخیر باذن اللہ تھی جو بطور کرامت ان حضرات کو عطا کی گئی تھی اس میں کسی عمل و وظیفہ کا کوئی دخل نہیں تھا، جیسا کہ علامہ شربینی نے تفسیر سراج المنیر میں اس آیت کے تحت میں حضرت ابوہریرہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، عمر بن خطاب، ابوایوب انصاری، زید بن ثابت وغیرہ رضی اللہ عنہم کے متعدد واقعات ایسے لکھے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جنات ان کی اطاعت و خدمت کرتے تھے۔ مگر یہ سب محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم

تھا کہ سلیمان علیہ السلام کی طرح کچھ جنات کو ان حضرات کا مسخر بنادیا، لیکن جو تسخیر عملیات کے ذریعہ عاملوں میں مشہور ہے وہ قابل غور ہے، کہ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ قاضی بدرالدین شمس الحنفی جو آٹھویں صدی کے علماء میں سے ہیں انھوں نے جنات کے احکام پر ایک مستقل کتاب "آکام المرجان فی احکام الجنان" لکھی ہے۔ اس میں بیان کیا ہے کہ جنات سے خدمت لینے کا کام سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے باذن اللہ بطور معجزہ کے کیا ہے، اور اہل فارس جمشید بن اورنجیان کی طرف منسوب کرتے ہیں، کہ انھوں نے جنات سے خدمت لی ہے۔ اسی طرح آصف بن برخیا وغیرہ جن کا تعلق حضرت سلیمان علیہ السلام سے رہا ہے، ان کے متعلق بھی استخداً جن کے واقعات مشہور ہیں، اور مسلمانوں میں سب سے زیادہ شہرت ابو نصر احمد بن ہلال البکیل اور ہلال بن وصیف کی ہے جن سے استخداً جنات کے عجیب عجیب واقعات مذکور ہیں۔ ہلال بن وصیف نے ایک مستقل کتاب میں جنات کے کلمات جو انھوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے پیش کئے اور جو عہد و میثاق سلیمان علیہ السلام نے ان سے لئے ان کو جمع کر دیا۔ قاضی بدرالدین نے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ عام طور سے تسخیر جنات کا عمل گرنیوالے عاملین کلمات کفریہ شیطانیہ سے اور سحر سے کام لیتے ہیں، جن کو کافر جنات و شیاطین پسند کرتے ہیں، اور ان کے مسخر و تابع ہونے کا راز صرف یہ ہے کہ وہ ان کے اعمال کفریہ شرکیہ سے خوش ہو کر بطور رشوت کے ان کے کچھ کام بھی کر دیتے ہیں، اور اسی لئے بکثرت ان عملیات میں قرآن کریم کو نجاست یا خون وغیرہ سے لکھتے ہیں، جس سے کفار جن اور شیاطین راضی ہو کر ان کے کام کر دیتے ہیں۔ البتہ ایک شخص ابن الامام کے متعلق لکھا ہے کہ یہ خلیفہ معتز باللہ کے زمانہ میں تھا، جنات کو اس نے اسماء الہیہ کے ذریعہ سے مسخر کیا تھا، اس میں کوئی بات خلاف شرع نہیں تھی۔ (آکام المرجان، ص ۱۰۰)

خلاصہ یہ ہے کہ جنات کی تسخیر اگر کسی کے لئے بغیر قصد و عمل کے محض منجانب اللہ ہو جائے جیسا کہ سلیمان علیہ السلام اور بعض صحابہ کرام کے متعلق ثابت ہے وہ تو معجزہ یا کرامت میں داخل ہے، اور جو تسخیر عملیات کے ذریعہ کی جاتی ہے اس میں اگر کلمات کفریہ یا اعمال کفریہ ہوں تو کفر، اور صرف معصیت پر مشتمل ہوں تو گناہ کبیرہ ہے، اور جن عملیات میں ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن کے معنی معلوم نہیں ان کو بھی فقہاء نے اس بنا پر ناجائز کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان کلمات میں کفر و شرک یا معصیت پر مشتمل کلمات ہوں، قاضی بدرالدین نے "آکام المرجان" میں ایسے نامعلوم المعنی کلمات کے استعمال کو بھی ناجائز لکھا ہے۔

اور اگر یہ عمل تسخیر اسماءِ آہیہ یا آیاتِ قرآنیہ کے ذریعہ ہو اور اس میں نجاست وغیرہ کے استعمال جیسی کوئی معصیت بھی نہ ہو، تو وہ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ مقصود اس جنات کی ایذا سے خود بچنا یا دوسرے مسلمانوں کو بچانا ہو، یعنی دفعِ مضرت مقصود ہو جو جلبِ منفعت مقصود نہ ہو۔ کیونکہ اگر اس کو کسبِ مال کا پیشہ بنایا گیا تو اس لئے جائز نہیں کہ اس میں استرقاقِ حر یعنی آزاد کو اپنا غلام بنانا اور بلا حق شرعی اس سے بیگار لینا ہے، جو حرام ہے۔ واللہ اعلم

وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا ذُنُوبُهُ مِنَ عَذَابِ السَّعِيرِ، یعنی ہم نے جنات کو سلیمان علیہ السلام کی خدمت و اطاعت کا جو حکم دیا ہے اگر ان میں کوئی فرد اس اطاعت سے انحراف کرے گا تو اس کو آگ کا عذاب دیا جائے گا، اکثر مفسرین نے اس سے ... آخرت کا عذاب جہنم مراد لیا ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک فرشتہ کو مسلط کر دیا تھا کہ جو جن سلیمان علیہ السلام کی اطاعت میں کوتاہی کرے اس کو آتشیں کوڑے مار کر کام کرنے پر مجبور کرتا تھا (تشرطی) اور اس پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جنات تو خود آگ سے بنے ہوئے ہیں، آگ اُن پر کیا اثر کرے گی۔ کیونکہ جنات کے آگ سے بننے کا مطلب وہی ہے جو انسان کے مٹی سے بننے کا مطلب ہے، یعنی عنصر غالب انسان کے وجود کا مٹی ہے، مگر اس کو مٹی پتھر سے مارا جائے تو تکلیف پہنچتی ہے اسی طرح جنات کا عنصر غالب آگ ہے، مگر خالص اور تیز آگ سے وہ بھی جل جاتے ہیں۔

يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِبٍ وَ تَمَانِيْلٍ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ ظُهُورٍ مُّسَبِّتٍ، اس آیت میں اُن کاموں کی کچھ تفصیل ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام جنات سے لیتے تھے۔ محارِب، محراب کی جمع ہے جو مکان کے اشرف و اعلیٰ حصہ کو کہنے کے لئے بولا جاتا ہے، بادشاہ اور بڑے لوگ جو اپنے لئے حکومت کا کمرہ بناتے ہیں اس کو بھی محراب کہا جاتا ہے۔ اور لفظ محرابِ حرب بمعنی جنگ سے مشتق ہے، کوئی آدمی جو اپنا حکومت کدہ خاص بناتا ہے اس کو دوسروں کی رسائی سے محفوظ رکھتا ہے، اس میں کوئی دست اندازی کرے تو اس کے خلاف لڑائی کرتا ہے۔ اس مناسبت سے مکان کے مخصوص حصہ کو محراب کہتے ہیں۔ مساجد میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو بھی اسی امتیاز کی بنا پر محراب کہتے ہیں، اور کبھی خود مساجد کو محاریب کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں محاریب بنی اسرائیل اور اسلام میں محاریب صحابہ سے ان کی مساجد مراد ہوتی ہیں۔

مساجد میں محراب کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد تک امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو ایک علیحدہ مکان کی حیثیت سے بنانے کے کھڑے ہونے کی جگہ کو ایک علیحدہ مکان کی حیثیت سے بنانے

کا رواج نہیں تھا، قرآنِ اولیٰ کے بعد سلاطین نے اس کا رواج اپنے تحفظ کے لئے دیا۔ اور عام مسلمانوں میں اس کا رواج اس مصلحت سے بھی ہوا کہ امام جس جگہ کھڑا ہوتا ہے وہ پوری صفِ خالی رہتی ہے۔ نمازیوں کی کثرت اور مساجد کی تنگی کے پیش نظر صرف امام کے کھڑے ہونے کی جگہ دیوارِ قبلہ میں گہری کر کے بنادی جاتی ہے، تاکہ اس کے پیچھے پوری صفوں کھڑی ہو سکیں، چونکہ یہ طریقہ قرآنِ اولیٰ میں نہ تھا، اس لئے بعض علمائے اس کو بدعت کہہ دیا ہے۔ شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اس مسئلہ پر مستقل رسالہ بنام اعلام الارباب فی بدعت المحارب لکھا ہے۔ اور تحقیق اور صحیح بات یہ ہے کہ اگر اس طرح کی محرابیں نمازیوں کی سہولت اور مسجد کے مصالح کے پیش نظر بنائی جائیں اور ان کو سنتِ مقصودہ نہ سمجھا جائے تو ان کو بدعت کہنے کی کوئی وجہ نہیں، ہاں اس کو سنتِ مقصودہ بنا لیا جائے اس کے خلاف کرنے والے پر تکبر ہونے لگے تو اس غلو سے یہ عمل بدعت میں داخل ہو سکتا ہے۔

مسئلہ: جن مساجد میں محراب امام ایک مستقل مکان کی صورت میں بنائی جاتی ہے وہاں امام پر لازم ہے کہ اس محراب سے کسی قدر باہر اس طرح کھڑا ہو کہ اس کے قدم محراب سے باہر نمازیوں کی طرف رہیں، تاکہ امام الگ مکان میں تہنا کھڑا ہو، اور سب مقتدی ورنہ یہ صورت مکروہ و ناجائز ہے کہ امام الگ مکان میں تہنا کھڑا ہو، اور سب مقتدی دوسرے مکان میں۔ بعض مساجد محراب اتنی وسیع و عریض بنائی جاتی ہے کہ ایک مختصر سی صفِ مقتدیوں کی بھی اس میں آجائے، ایسی محراب میں اگر ایک صفِ مقتدیوں کی بھی محراب میں کھڑی ہو اور امام ان کے آگے پورا محراب میں کھڑا ہو تو امام و مقتدیوں کے مکان کا اشتراک ہو جانے کی وجہ سے کراہت نہیں رہے گی۔

تمثال، تمثال کی جمع ہے۔ قاموس میں ہے کہ تمثال بفتح التاء مصدر ہے اور بکسر التاء تمثال تصویر کو کہا جاتا ہے۔ ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ تمثال یعنی تصویر دو طرح کی ہوتی ہے، ایک ذی روح جاندار چیزوں کی تصویر، دوسرے غیر ذی روح بے جان چیزوں کی۔ پھر بے جان چیزوں میں دو قسمیں ہیں، ایک جماد جس میں زیادتی اور نمو نہیں ہوتا، جیسے پتھر مٹی وغیرہ، دوسرے نامی جس میں نمو اور زیادتی ہوتی رہتی ہے، جیسے درخت اور کھیتی وغیرہ۔ جنات حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے ان سب قسم کی چیزوں کی تصویریں بناتے تھے۔ اول تو لفظ تمثال کے عموم ہی سے

یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ یہ تصاویر کسی خاص قسم کی نہیں، بلکہ ہر قسم کے لئے عام تھیں۔

دوسرے تاریخی روایات میں تخت سلیمان پر پرندوں کی تصاویر ہونا بھی مذکور ہے۔

شرع اسلام میں جاندار کی تصویر | آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بنانے اور استعمال کرنے کی ممانعت کی شریعت میں جان داروں کی تصاویر بنانا اور استعمال

کرنا حرام نہیں تھا، مگر چونکہ پچھلی امتوں میں اس کا مشاہدہ ہوا کہ لوگوں کی تصاویر ان کی یادگار کے طور پر بنائیں اور ان کو اپنے عبادت خانوں میں اس غرض کے لئے رکھا کہ ان کو دیکھ کر ان کی عبادت گزاری کا نقشہ سامنے آئے تو خود ہمیں بھی عبادت کی توفیق ہو جائیگی مگر رفتہ رفتہ ان لوگوں نے انہی تصویروں کو اپنا معبود بنا لیا، اور بت پرستی شروع ہو گئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ پچھلی امتوں میں جانداروں کی تصاویر بت پرستی کا ذریعہ بن گئیں،

شریعت اسلام کے لئے چونکہ قیامت تک قائم اور باقی رکھنا تقدیر الہی ہے، اس لئے اس میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ جس طرح اصل حرام چیزوں اور معاصی کو حرام و ممنوع کیا گیا ہے، اسی طرح ان کے ذرائع اور اسباب قریبہ کو بھی اصل معاصی کے ساتھ ملحق کر کے حرام کر دیا گیا ہے۔ اصل جرم عظیم شرک و بت پرستی ہے، اس کی ممانعت ہوتی تو جن راستوں سے بت پرستی آسکتی تھی ان راستوں پر بھی شرعی پہرہ بٹھا دیا گیا اور بت پرستی کے ذرائع اور اسباب قریبہ کو بھی حرام کر دیا گیا۔ ذی روح کی تصاویر کا بنانا اور استعمال کرنا اسی اصول کی بنا پر حرام کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ و متواترہ سے اس کی حرمت ثابت ہے۔

اسی طرح شراب حرام کی گئی تو اس کی خرید و فروخت، اس کو لانے لے جانے کی مزدوری اس کی صنعت سب حرام کر دی گئی جو شراب نوشی کے ذرائع ہیں۔ چوری حرام کی گئی تو کسی کے مکان میں بلا اجازت داخل ہونا بلکہ باہر سے جھانکنا بھی ممنوع کر دیا گیا زنا حرام کیا گیا تو غیر محرم کی طرف بالقصد نظر کرنے کو بھی حرام کر دیا گیا۔ شریعت اسلام میں اس کی بے شمار نظائر موجود ہیں۔

حرمت تصویر پر ایک عام | یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک شبہ اور اس کا جواب | میں تصاویر کو جس حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا وہ ذریعہ

بت پرستی بن سکتی تھی، لیکن آجکل تصویر سے جس طرح کے کام لئے جاتے ہیں، ملزموں کی شناخت، تجارتوں کے خاص مارک، دوستوں عزیزوں سے ملاقات و واقعات و حالات کی تحقیق میں امداد وغیرہ جس کی وجہ سے وہ ضروریات زندگی میں داخل کر لی گئی ہیں

اس میں بت پرستی اور عبادت کا کوئی تصور درود و رنج نہیں، تو یہ ممانعت جو بت پرستی کے خطرہ سے کی گئی تھی اب مرتفع ہو جانی چاہئے۔

جواب یہ ہے کہ اولاً یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ آجکل تصویر ذریعہ بت پرستی نہیں رہی، آج بھی کتنے فرقے اور گروہ ہیں جو اپنے پیروؤں کی تصویر کی پوجا پاٹ کرتے ہیں، اور جو حکم کسی علت پر دائر ہو، یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر فرد میں پایا جاتے۔ اس کے علاوہ تصویر کی ممانعت کا سبب صرف ایک ہی نہیں کہ وہ بت پرستی کا ذریعہ ہے، بلکہ احادیث صحیحہ میں اس کی حرمت کی دوسری وجہ بھی مذکور ہیں۔ مثلاً یہ کہ تصویر سازی حق تعالیٰ کی صفت خالق کی نقالی ہے، موصوّر حق تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ہے، اور صورت گری درحقیقت اسی کے لئے سزاوار اور اسی کی قدرت میں ہے کہ مخلوقات کی ہزاروں اجناس اور انواع اور ہر نوع میں اس کے کرداروں افراد ہوتے ہیں، ایک کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی، انسان ہی کو لے لو تو مرد کی صورت اور عورت کی صورت میں نمایاں امتیاز، پھر عورتوں اور مردوں کے کرداروں افراد میں دو فرد بالکل یکساں نہیں ہوئے۔ ایسے کھلے ہوئے امتیاز ہوتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو کسی تامل اور غور و فکر کے بغیر ہی امتیاز واضح ہو جاتا ہے۔ یہ صورت گری اللہ رب العزت کے سوا اس کی قدرت میں ہے، جو انسان کسی جاندار کا مجسمہ یا نقوش اور رنگ سے اس کی تصویر بناتا ہے وہ گویا عملی طور پر اس کا مدعی ہے کہ وہ بھی صورت گری کر سکتا ہے۔ اسی لئے صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث میں ہے کہ قیامت کے روز تصویریں بنانے والوں کو کہا جائے گا کہ جب تم نے ہماری نعت اتاری تو اس کو مکمل کر کے دکھلاؤ، اگر تمھارے بس میں ہو کہ ہم نے تو صرف صورت ہی نہیں بنائی اس میں روح بھی ڈالی ہے، اگر تمھیں اس تخلیق کا دعویٰ ہے تو اپنی بنائی ہوئی صورت میں روح بھی ڈال کر دکھلاؤ۔

ایک سبب تصویر کی ممانعت کا احادیث صحیحہ میں یہ بھی آیا ہے کہ اللہ کے فرشتوں کو تصویر اور کتے سے نفرت ہے جس گھر میں یہ چیزیں ہوتی ہیں، اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے، جس کے سبب اس گھر کی برکت اور نورانیت مٹ جاتی ہے، گھر میں بسنے والوں کو عبادت و طاعت کی توفیق گھٹ جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ مشہور مقولہ بھی غلط نہیں کہ ”خانہ خالی را دیومی گیرد“ یعنی خالی گھر پر جن بھوت قبضہ کر لیتے ہیں جب کوئی گھر رحمت کے فرشتوں سے خالی ہوگا تو شیاطین اس کو گھیر لیں گے اور ان کے بننے والوں کے دلوں میں گناہوں کے دوسوے اور پھر ارادے پیدا کرتے رہیں گے۔

ایک سبب بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ تصویریں دنیا کی زائد از ضرورت زینت ہیں اور اس زمانے میں جس طرح تصاویر سے بہت سے فوائد حاصل کئے جاتے ہیں ہزاروں جرائم اور فحاشی بھی انہی تصاویر سے جنم لیتے ہیں۔ غرض شریعت اسلام نے صرف ایک وجہ سے انہیں بہت سے اسباب پر نظر کر کے جاندار کی تصاویر بنانے اور اس کے استعمال کرنے کو حرام قرار دیدیا ہے۔ اب اگر کسی خاص فرد میں فرض کر لیں کہ وہ اسباب اتفاق سے موجود نہ ہوں تو اس اتفاقی واقعہ سے قانون شرعی نہیں بدل سکتا۔

صحیح بخاری و مسلم میں بروایت عبداللہ بن مسعودؓ یہ حدیث آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْمُصَوِّرُونَ، یعنی سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے روز تصویر بنانے والے ہوں گے۔

اور بعض روایات حدیث میں تصویر بنانے والوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے، اور صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ، الحدیث، یعنی ہر مصوِّر جہنم میں جائے گا۔

اس مسئلہ کے متعلق روایات حدیث اور تعامل سلف کے شواہد تفصیل کے ساتھ احقر نے اپنے رسالہ ”التصویر لاحکام التصویر“ میں جمع کر دیئے ہیں، اور لوگوں کے شبہات کے جوابات بھی اس میں مفصل ہیں، ضرورت ہو تو اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔

فوٹو کی تصویر بھی بعض لوگوں کا یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ فوٹو تصویر سے خارج ہے، کیونکہ وہ تصویر ہی ہے وہ تو ظل اور عکس ہے، جیسے آئینہ اور پانی وغیرہ میں آجاتا ہے تو جس طرح آئینہ میں اپنی صورت دیکھنا جائز ہے ایسے ہی فوٹو کی تصویر بھی جائز ہے۔ جواب واضح ہے کہ عکس اور ظل اُس وقت تک عکس ہے جب تک وہ کسی ذریعہ سے قائم اور پائدار نہ بنا لیا جائے، جیسے آئینہ یا پانی میں اپنا عکس جس وقت پانی کے مقابلہ سے آپ ہٹ جائیں گے ختم ہو جائے گا، اگر آئینہ کے اوپر کسی مسالہ یا آلہ کے ذریعہ اس صورت کے عکس کو پائدار بنادیا جائے تو یہی تصویر ہو جائے گی، جس کی حرمت و ممانعت احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ فوٹو کی مفصل بحث بھی رسالہ مذکور تصویر میں لکھ دی گئی ہے۔

جَفَّان، جَفْنۃ کی جمع ہے، جو پانی کے بڑے برتن جیسے تشلہ یا ٹب وغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ گالَجِبَاب، جَابِیۃ کی جمع ہے، چھوٹے حوض کو جَابِیۃ کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ پانی نبھرنے کے بڑے برتن ایسے بناتے تھے جس میں چھوٹے حوض کے برابر پانی آتا ہے۔ قُنْدُور قِدْر بکسر القاف کی جمع ہے، ہنڈیا کو کہا جاتا ہے۔

رَاسِیَاتٍ، اپنی جگہ ٹھہری ہوئی۔ مراد یہ ہے کہ اتنی ذرئی اور بڑی دیگیں بناتے تھے جو ہلا سے نہ ملیں، اور ممکن ہو کہ یہ دیگیں پتھر سے تراش کر پتھر ہی کے چوڑھوں پر لگی ہوئی بناتے ہوں جو ناقابل حمل و نقل ہوں۔ امام تفسیر ضحاک نے قُدُورِ رَاسِیَاتِ کی یہی تفسیر کی ہے۔
إِعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا وَ قَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّاكِرِينَ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے نوازا اور مخصوص انعامات عطا فرمائے، ان کا بیان فرمانے کے بعد ان کو مع ان کے اہل و عیال کے شکر گزاری کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے۔

شکر کی حقیقت | قربانی نے فرمایا کہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا اعتراف کرے کہ یہ نعمت اور اس کے احکام | فلاں منعم نے دی ہے، اور پھر اس کو اس کی طاعت و مرضی کے مطابق استعمال کرے، اور کسی کی دی ہوئی نعمت کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کرنا ناشکری اور کفرانِ نعمت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شکر جس طرح زبان سے ہوتا ہے اسی طرح عمل سے بھی شکر ہوتا ہے، اور عملی شکر اس نعمت کا منعم کی طاعت و مرضی کے مطابق استعمال ہے۔ اور ابو عبد الرحمن اسلمی نے فرمایا کہ نماز شکر ہے، روزہ شکر ہے اور ہر نیک کام شکر ہے، اور محمد بن کعب قرظی نے فرمایا کہ شکر تقویٰ اور عملِ صالح کا نام ہے۔ (ابن کثیر)

آیت مذکورہ میں قرآن حکیم نے حکم شکر کے لئے مختصر لفظ الشُّكْرُ ذُرِّیٌّ کے بجائے إِعْمَلُوا شُكْرًا استعمال فرما کر شاید اس طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ آلِ داؤد سے مطلوب شکر عملی ہے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام اور ان کے خاندان نے قول و عمل دونوں سے اس طرح کی کہ ان کے گھر میں کوئی وقت ایسا نہ گذرتا تھا جس میں گھر کا کوئی فرد اللہ کی عبادت میں نہ لگا ہوا ہو۔ افراد خاندان پر اوقات تقسیم کر دیے گئے تھے۔ اس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کا مصلیٰ کسی وقت سنانہ پڑھنے والے سے خالی نہ رہتا تھا۔ (ابن کثیر)

بخاری و مسلم میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نمازوں میں اللہ کے نزدیک محبوب تر نماز داؤد علیہ السلام کی ہے، وہ نصف رات سوتے تھے پھر ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے تھے، پھر آخری چھٹے حصہ میں سوتے تھے اور سب روزوں میں محبوب تر اللہ کے نزدیک صیام داؤد علیہ السلام ہیں کہ وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ (ابن کثیر)

حضرت فضیلؓ سے منقول ہے کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ حکم شکر نازل ہوا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا اے میرے پروردگار میں آپ کا شکر کس طرح پورا کر سکتا ہوں جب کہ میرا شکر قوی ہو یا عملی وہ بھی آپ ہی کی عطا کردہ نعمت ہے، اس پر بھی مستقل شکر واجب ہے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلَا نَشْكُرُكَ يٰۤاَدُّوْا۟، یعنی اے داؤد اب آپ نے شکر ادا کر دیا، کیونکہ حق شکر ادا کرنے سے اپنے عجز و قصور کو سمجھ لیا، اور اعتراف کر لیا۔

حکیم ترندی اور امام ابو بکر جصاص نے حضرت عطاء بن یسارؓ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اَعْمَلُوْا۟ اَلۡ دَاوۡدَ شُكْرًا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے اور اس آیت کو تلاوت فرمایا پھر ارشاد فرمایا کہ تین کام ایسے ہیں کہ جو شخص ان کو پورا کر لے تو جو فضیلت آل داؤد کو عطا کی گئی تھی وہ اس کو بھی مل جائے گی۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ وہ تین کام کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ رضا اور غضب کی دونوں حالتوں میں انصاف پر قائم رہنا، اور غنا اور فقر کی دونوں حالتوں میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا، اور خفیہ اور علانیہ دونوں حالتوں میں اللہ سے ڈرنا و ترسنا، احکام القرآن، جصاص،

وَقَلِيْلٌ مِّنۡ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ، شکر کے حکم اور تاکید کے بعد اس واقعہ کا بھی اظہار فرما دیا کہ میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوں گے۔ اس میں بھی مومن کے لئے تنبیہ اور تحریض ہے شکر پر۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَیْہِا الْوَتَّ الْاَیَّ، آیت میں لفظ منساة عصاء اور لاٹھی کے معنی میں ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے، بمعنی عصاء، اور بعض نے فرمایا کہ عربی لفظ ہے۔ نساء کے معنی ہٹانے اور موخر کرنے کے ہیں، لاٹھی کے ذریعے انسان مضر چیزوں کو ہٹاتا ہے، اس لئے اس کو منساة کہا گیا، یعنی ہٹانے کا آلہ۔ اس آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا واقعہ عجیبہ بیان فرما کر بہت سی عبرتوں اور ہدایتوں کا دروازہ کھول دیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا عجیب واقعہ | اس واقعہ میں بہت سی ہدایات ہیں، مثلاً یہ کہ حضرت سلیمان

علیہ السلام جن کو ایسی بے مثل حکومت و سلطنت حاصل تھی کہ صرف ساری دنیا پر ہی نہیں بلکہ جنات اور طیور اور ہوا پر بھی ان کی حکومت تھی، مگر ان سب سامانوں کے باوجود موت سے ان کو بھی نجات نہ تھی۔ اور یہ کہ موت

تو مقررہ وقت پر آئی تھی، بیت المقدس کی تعمیر جو حضرت داؤد علیہ السلام نے شروع کی، پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی تکمیل فرمائی، اس میں کچھ کام تعمیر کا باقی تھا، اور یہ تعمیر کا کام جنات کے سپرد تھا، جن کی طبیعت میں سرکشی غالب تھی، حضرت سلیمان علیہ السلام کے خون سے کام کرتے تھے، ان کی وفات کا جنات کو علم ہو جائے تو فوراً کام چھوڑ بیٹھیں، اور تعمیر رہ جائے۔ اس کا انتظام حضرت سلیمان علیہ السلام نے باذن ربانی یہ کیا کہ جب موت کا وقت آیا تو موت کی تیاری کر کے اپنی محراب میں داخل ہو گئے، جو شفاف شیشے سے بنی ہوئی تھی، باہر سے اندر کی سب چیزیں نظر آتی تھیں، اور اپنے معمول کے مطابق عبادت کے لئے ایک سہارا لے کر کھڑے ہو گئے کہ روح پرواز کرنے کے بعد بھی جسم اس عصا کے سہارے اپنی جگہ جم رہا ہے۔ سلیمان علیہ السلام کی روح وقت مقرر پر قبض کر لی گئی، مگر وہ اپنے عصا کے سہارے اپنی جگہ جمے ہوئے باہر سے ایسے نظر آتے تھے کہ عبادت میں مشغول ہیں، جنات کی یہ مجال نہ تھی کہ پاس آکر دیکھ سکتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو زندہ سمجھ کر کام میں مشغول رہے، یہاں تک کہ سال بھر گزر گیا، اور تعمیر بیت المقدس کا بقیہ کام پورا ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ نے گھن کے کپڑے کو جس کو فارسی میں دیوک اور اردو میں دیک کہا جاتا ہے، اور قرآن کریم نے اس کو دابة الارض کے نام سے موسوم کیا ہے، عصا کے سلیمانی پر مسلط کر دیا۔ دیک نے عصا کی لکڑی کو اندر سے کھا کر کمزور کر دیا، عصا کا سہارا ختم ہوا تو سلیمان علیہ السلام گر گئے، اس وقت جنات کو ان کی موت کی خبر ہوئی۔

جنات کو اللہ تعالیٰ نے دو دراز کی مسافت چند لمحات میں قطع کر لینے کی قوت عطا فرمائی ہے وہ بہت سے ایسے حالات و واقعات سے واقف ہوتے تھے، جن کو انسان نہیں جانتے، جب وہ انسانوں کو ان واقعات کی خبر دیتے تو انسان یہ سمجھتے تھے کہ یہ غیب کی خبر ہے اور جنات کو بھی علم غیب حاصل ہے، خود جنات کو بھی علم غیب کا دعویٰ ہو تو بعید نہیں، موت کے اس عجیب واقعہ نے اس کی بھی حقیقت کھول دی۔ خود جنات کو بھی پتہ چل گیا اور سب انسانوں کو بھی کہ جنات عالم الغیب نہیں ہیں، کیونکہ ان کو غیب کا علم ہوتا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت سے ایک سال پہلے ہی باخبر ہو جاتے۔ اور یہ سال بھر کی محنت و مشقت جو ان کو زندہ سمجھ کر برداشت کرتے رہے اس سے بچ جاتے۔ آیت کے آخری جملے میں اسی کا بیان ہے فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنَّ اَنْ لَّوْكَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعِلٰلِ اب الْمُهِينِ، اس میں عذاب ہمیں سے مراد وہ محنت و مشقت کا کام ہے جس پر تعمیر بیت المقدس کی تکمیل کے لئے ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے لگا دیا تھا۔ سلیمان علیہ السلام کی

موت کا یہ عجیب واقعہ کچھ تو خود قرآن کی اس آیت میں مذکور ہی، باقی تفصیل حضرت ابن عباس وغیرہ ائمہ تفسیر سے منقول ہے جو ابن کثیر وغیرہ سب تفاسیر میں نقل کی گئی ہے۔

اس عجیب واقعہ سے یہ عبرت بھی حاصل ہوئی کہ موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں، اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کو جو کام لینا ہوتا ہے اس کا جس طرح چاہیں انتظام کر سکتے ہیں، جیسا اس واقعہ میں ہوا کہ موت کے باوجود سلیمان علیہ السلام کو سال بھر تک اپنی جگہ قائم رکھ کر جنات کے کام پورا کرالیا۔ اور یہ بھی کہ دنیا کے سارے اسباب و آلات اسی وقت تک اپنا کام کرتے ہیں جب تک منظورِ حق ہوتا ہے، جب منظور نہیں ہوتا تو آلات و اسباب جواب دیدیتے ہیں، جیسے یہاں عصا کا سہارا دیمک کے ذریعہ ختم کر دیا گیا۔ اور یہ بھی کہ سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد خطرہ تھا کہ لوگ جنات کے حیرت انگیز عمل اور کارناموں اور بظاہر غیب کی چیزوں سے ان کے باخبر ہونے وغیرہ کے اعمالِ عجیبہ کو دیکھ کر کہیں انہی کو اپنا معبود نہ بنا بیٹھیں، اس خطرہ کو بھی اس واقعہ موت نے ختم کر دیا، سب کو جنات کی بے خبری اور بے بسی معلوم ہو گئی۔

تقریر مذکور سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سلیمان علیہ السلام نے موت کے وقت اس خاص طریقہ کو دو وجہ سے اختیار کیا تھا، اول یہ کہ تعمیر بیت المقدس کا باقی ماندہ کام پورا ہو جائے، دوسرے یہ کہ ان لوگوں پر جنات کی بے خبری اور بے بسی واضح ہو جائے تاکہ ان کی عبادت کا خطرہ نہ رہے۔ (قرطبی)

امام نسائی نے باسناد صحیح حضرت عبداللہ بن عمرو سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ سے چند دعائیں کیں، جو مقبول ہوئیں۔ ان میں سے ایک دعا، یہ ہو کہ جو شخص اس مسجد میں صرف نماز کی نیت سے داخل ہو (اور کوئی دنیاوی غرض نہ ہو) اس مسجد سے نکلنے سے پہلے اس کو تمام گناہوں سے ایسا پاک کر دے جیسا کہ اس وقت پاک تھا جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔

اور سدی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہونے پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے بطور شکرانہ کے بارہ ہزار گائے بیل اور بیس ہزار بکریوں کی قربانی کر کے لوگوں کو دعوتِ عام دی، اور اس دن کی خوشی منائی، اور حجرۃ بیت المقدس پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں مانگیں کہ ”یا اللہ آپ نے ہی مجھے یہ قوت اور وسائل عطا فرمائے، جن سے تعمیر بیت المقدس مکمل ہوئی تو یا اللہ مجھے اس کی

بھی توفیق دیجئے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں اور مجھے اپنے دین پر وقت دیجئے اور ہدایت کے بعد میرے قلب میں کوئی زلیخ اور کجی نہ ڈالتے۔ اور عرض کیا کہ اے میرے پروردگار جو شخص اس مسجد میں داخل ہو میں اس کے لئے آپ سے پانچ چیزیں مانگتا ہوں۔ ایک یہ کہ جو گناہگار توبہ کرنے کے لئے اس مسجد میں داخل ہو تو آپ اس کی توبہ قبول فرمائیں اور اس کے گناہوں کو معاف فرمادیں۔ دوسرے یہ کہ جو آدمی کسی خوف و خطرہ سے بچنے کے لئے اس مسجد میں داخل ہو تو آپ اس کو امن دیدیں، اور خطرات سے نجات عطا فرمادیں۔ تیسرے یہ کہ جو بیمار آدمی اس میں داخل ہو اس کو شفا عطا فرمادیں۔ چوتھے یہ کہ جو فقیر آدمی اس میں داخل ہو اس کو غنی کر دیں۔ پانچویں یہ کہ جو شخص اس میں داخل ہو جب تک وہ اس میں رہے آپ اپنی نظر عنایت و رحمت اس پر رکھیں بجز اس شخص کے جو کسی ظلم یا بے دینی کے کام میں مشغول ہو۔ (قرطبی)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر کا کام حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیات میں مکمل ہو چکا تھا، مگر جو واقعہ اوپر مذکور ہوا ہے وہ کچھ اس کے منافی نہیں کہ اصل تعمیر مکمل ہونے کے بعد بڑی تعمیرات میں کچھ کام رہا کرتے ہیں وہ باقی ہوں ان کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے مذکورہ تدبیر اختیار کی ہو۔

حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ موت کے بعد عصائے سہارے حضرت سلیمان علیہ السلام ایک سال کھڑے رہے۔ (قرطبی) اور بعض روایات میں ہے کہ جب جنات کو یہ معلوم ہوا کہ سلیمان علیہ السلام کی موت کو عرصہ ہو گیا، ہم بے خبر رہے تو مدت موت معلوم کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک لکڑی پر دیکھ چھوڑ دی، ایک دن رات میں جتنی لکڑی دیکھنے لکھائی اس سے حساب لگایا کہ عصائے سلیمانی پر ایک سال اس طرح گزرا۔ فائدہ: بغوی نے علماء تاریخ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر کل تریپن سال کی ہوئی، اور ان کی سلطنت و حکومت چالیس سال رہی، تیسرے سال کی عمر میں سلطنت کا کام سنبھال لیا تھا، اور بیت المقدس کی تعمیر اپنی سلطنت کے چوتھے سال میں شروع کی تھی (منظری، قرطبی)

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكِهُمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالِهِ
تحقیق قوم سبا کو تھی ان کی بستی میں نشانی، دوبارہ دانے اور بائیں،

كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلَدًا طَيِّبَةً رَبُّكُمْ غَفُورٌ ۝۱۵

کھاؤ روزی اپنے رب کی اور اس کا شکر کرو، شہر ہی پاکیزہ اور رب، گناہ بخشو والا۔

فَاعْرَضُوا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ

سو دھیان میں نہلاتے پھر چھوڑ دیا ہم نے انہر ایک نالا زور کا اور دیگر ہم نے انکو بدلے ان دو

جَنَّتَيْنِ ذَوَاتِیْ اَكْلٍ خَمِطٍ وَّاَثَلٍ وَشَيْءٌ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ ۝۱۶ ذٰلِكَ

باغوں کے دو اور باغ جن میں کچھ میوہ کیلا تھا اور جھاڑ اور کچھ بیر تھوڑے سے - یہ بدلہ

جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوا وَاُولٰٓئِكَ نَجْزِيْ اِلَّا الْكَافِرَ ۝۱۷ وَجَعَلْنَا

دیا ہم نے اُن کو اس پر کہ ناشکری کی، اور ہم یہ بدلہ اُسی کو دیتے ہیں جو ناشکر ہو۔ اور رکھی تھیں ہم

بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا

ان میں اور ان بستیوں میں جہاں ہم نے برکت رکھی ہے ایسی بستیاں جو راہ پر نظر آتی تھیں اور منزلیں مقرر

فِيْهَا السَّرِيْرَ سِيْرًا فِيْهَا لِيَالِيْ وَاَيَّامًا اَمِيْنًا ۝۱۸ فَقَالُوْا رَبَّنَا

کر دیں ہم نے انہیں آنے جانے کی بھردان میں راتوں کو اور دنوں کو امن سے - پھر کہنے لگے اور ب

بَعْدَ بَلَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ اَحَادِيْثَ

دراز کردے ہمارے سفروں کو اور آپ اپنا بُرا کیا بھر کر ڈالا ہم نے ان کو کہانیاں،

وَمَزَقْنَاهُمْ كُلَّ مَرْقٍ اِنْ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۱۹

اور کر ڈالا چیر کر ٹکڑے ٹکڑے اس میں پتے کی باتیں ہیں ہر صبر کرنے والے شکر گزار کو۔

خلاصہ تفسیر

سبار کے لوگوں کے لئے (خود) اُن کے دطن (کی مجموعی حالت) میں (وجوب اطاعت خداوندی کی) نشانیاں موجود تھیں (ان میں سے ایک نشانی) دو قطاریں تھیں باغ کی (ان کی سڑک کے) دہنے اور بائیں (یعنی ان کے تمام علاقہ میں دو طرفہ متصل باغات چلے گئے تھے کہ جس میں آمدنی بھی وافر پھل بھی اس قدر کہ ختم کئے ختم نہ ہوں اسایہ بھی رونق بھی ہم نے انبیاء علیہم السلام وناصحین کی معرفت ان کو حکم دیا کہ) اپنے رب کا (دیا ہوا)

رزق کھاؤ اور (کھا کر) اس کا شکر کرو یعنی اطاعت کرو کہ دو قسم کی نعمتیں مقتضی اطاعت ہیں، ایک دنیوی کہ رہنے کو عمدہ شہر اور (ایک اخروی کہ در صورت ایمان و اطاعت کے اگر کچھ کوتاہی ہو جائے تو گناہ بخشنے کو) بخشنے والا پروردگار ہو پس ایسے مقتضی پر مقتضی کا ترقب ضرور ہونا چاہیے سو (اس پر بھی) انھوں نے (اس حکم سے) سرتابی کی (شاید یہ لوگ آفتاب پرست بھی ہوں جیسے بعض کی نسبت سورہ نمل میں ہے وَجَدْتَهُمَا وَتَوَّهَّمَا لَيَجِدُنَّ لِلشَّمْسِ) تو ہم نے (اُن پر اپنا قہر اس طرح نازل کیا کہ اُن پر بند کا سیلاب چھوڑ دیا یعنی جو سیلاب بند سے رُکار ہوتا تھا بند ٹوٹ کر اس سیلاب کا پانی چڑھ آیا جس سے اُن کے وہ دروہ باغات سب غارت ہو گئے) اور ہم نے ان کے ان دروہ باغوں کے بدلے اور دو باغ دیدیے جن میں یہ چیزیں رہ گئیں، بد مزہ پھل اور جھاؤ اور قدرے قلیل بری (اور وہ بھی شہری نہیں جنگلی خود رو جس میں کانٹے بہت اور پھل میں لطافت ندارد) ان کو یہ سزا ہم نے اُن کی ناسپاسی کے سبب دی اور ہم ایسی سزا بڑے ناسپاس ہی کو دیا کرتے ہیں (ورنہ معمولی خطاؤں پر تو ہم درگزر ہی کرتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کفر سے بڑھ کر کیا ناسپاسی ہوگی جس میں وہ مبتلا تھے)۔ اور اس نعمت مذکورہ عامہ للمساکن کے علاوہ ایک اور نعمت خاص متعلق سفر کے تھی وہ یہ کہ ہم نے ان کے اور اُن بستیوں کے درمیان میں جہاں ہم نے (باعستبار پیداوار وغیرہ کے) برکت کر رکھی ہے بہت سے گاؤں آباد کر رکھے تھے جو (سڑک پر سے) نظر آتے تھے کہ مسافر کو سفر میں بھی وحشت نہ ہو اور کہیں ٹھہرنا چاہے تو وہاں جانے میں تکلف و تردد بھی نہ ہو) اور ہم نے ان دیہات کے درمیان ان کے چلنے کا ایک خاص اندازہ رکھا تھا یعنی ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک چال کے حساب سے ایسا مناسبت فاصلہ رکھا تھا کہ دوران سفر میں عادت کے مطابق آرام کرے، وقت پر کوئی نہ کوئی گاؤں مل جاتا جہاں کھاپی سکے آرام کر سکے) کہ بے خوف و خطر اُن میں (چاہو) راتوں کو اور (چاہو) دنوں کو چلو یعنی نہ خطرہ رہزن کا کہ پاس پاس گاؤں تھے نہ خطرہ آب و دانہ و زادراہ کے میسر نہ ہونے کا کہ ہر جگہ ہر سامان ملتا تھا) سو ان نعمتوں کی انھوں نے جیسے اصلی شکر گزاری یعنی طاعتِ الہیہ نہیں کی، ایسے ہی ظاہری شکر گزاری یعنی نعمتِ الہیہ کو غنیمت سمجھنا اور اس کی قدر کرنا ہے وہ بھی نہیں کی چنانچہ وہ کہنے لگے اے ہمارے پروردگار (ایسے پاس پاس دیہات ہونے سے سفر کا لطف نہیں آتا، لطف تو اسی میں ہے کہ کہیں زادراہ ختم ہو گیا کہیں پیاس ہے اور پانی نہیں ملتا، اشتیاق ہے انتظار ہے کہیں چوروں کا اندیشہ ہو، نوکر پہرہ دے رہے ہیں، ہتھیار بندھے ہوئے ہیں، جیسے

بنی اسرائیل مَنْ و سُلُوْمی سے اُکٹا گئے تھے اور بقل و قثاء (ترکاری اور گلڑی کھیرے) کی درخواست کی تھی و نیز اس حالت موجودہ میں ہم کو اپنی امارت کے اظہار کا موقع بھی نہیں ملتا، امیر غریب سب یکساں سفر کرتے ہیں، اسی لئے یوں جی چاہتا ہے کہ ہمارے سفروں میں درازی (اور فاصلہ) کر دے (یعنی بیچ کے دیہات اجاڑ دے کہ منزلوں میں خوب فاصلہ ہو جائے) اور (علاوہ اس ناشکری کے) انھوں نے (اور بھی نافرمانیاں کر کے) اپنی جانوں پر ظلم کیا سو ہم نے انکو افسانہ بنا دیا اور ان کو بالکل تیر بتر کر دیا (یا تو اس طرح کہ بعض کو ہلاک کر دیا کہ ان کے قصے ہی رہ گئے اور بعض کو پریشان کر دیا اور یا بحیثیت اس حالت تنعم کے سب ہی افسانہ ہو گئے، یعنی وہ سامان تنعم سب کا جاتا رہا اور یا باین معنی کہ ان کی حالت کو عبرت بنا دیا ای بَجْعَلْنَاهُمْ ذَاتَ حِکَايَا یَعْتَبِرْنَ بِهَا، غرض خود ان کے مساکن و باغات بھی اور انکی وہ متصل بستیاں بھی سب ویران ہو گئے) بے شک اس (قصہ) میں ہر صابر شاکر (یعنی مومن) کے لئے بڑی بڑی عبرتیں ہیں۔

معارف و مسائل

منکرین نبوت و رسالت اور منکرین قیامت کو حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر متنبہ کرنے اور انبیاء سابقین کے ہاتھوں فوق القیاس حیرت انگیز واقعات و معجزات کے صدور کے سلسلے میں پہلے حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعات کا ذکر فرمایا، اب اسی سلسلہ میں قوم سبا پر اللہ کے بے حساب انعامات کا پھر ان کی ناشکری کی وجہ سے ان پر عذاب آنے کا ذکر آیات مذکورہ میں کیا گیا۔

قوم سبا اور ان پر اللہ تعالیٰ ابن کثیر نے فرمایا کہ سبا یمن کے بادشاہوں اور اس ملک کے خاص انعامات باشندوں کا لقب ہے۔ تبایعہ جو اس ملک کے مقتدر و پیشوا تھے وہ بھی اسی قوم سبا میں سے تھے، اور ملک بلقیس جن کا واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ سورۃ نمل میں گذر چکا ہے وہ بھی اسی قوم میں سے تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے رزق کے دروازے کھول دیئے تھے، اور ان کے شہر میں آرام و عیش کے تمام اسباب جمیا کر دیئے تھے، اور اپنے انبیاء کے ذریعے ان کو اللہ کی توحید اور اس کے احکام کی اُطاعت کے ذریعہ نعمتوں کے شکر کا حکم دیا گیا تھا۔ ایک مدت تک یہ لوگ اس حال پر قائم اور ہر طرح کی راحت و عیش سے مالا مال رہے، پھر ان میں عیش و عشرت میں اہنماک خدا تعالیٰ سے غفلت بلکہ انکار تک نہایت پہنچ گئی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تنبیہ کے لئے اپنے تیرہ انبیاء بھیجے

جنہوں نے ان کی ہمائش اور راہ راست پر لانے کی پوری کوشش کی، مگر یہ لوگ اپنی غفلت بے ہوشی سے باز نہ آئے تو ان پر ایک سیلاب کا عذاب بھیجا گیا، جس نے ان کے شہر اور باغات سب کو دیران و برباد کر دیا (رواہ محمد بن اسحق، ابن کثیر)

امام احمد حضرت ابن عباس رضی سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سبأ جس کا قرآن میں ذکر ہے یہ کسی مرد یا عورت کا نام ہے یا زمین کے کسی حصہ کا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ایک مرد کا نام ہے، جس کی اولاد میں دس لڑکے ہوئے، جن میں سے چھ یمن میں آباد رہے، اور چار شام میں چلے گئے یمن میں رہنے والوں کے نام یہ ہیں:- مذحج، اکثدہ، ازد، اشعری، انمار، حمیر، (ان چھ لڑکوں سے چھ قبیلے پیدا ہوئے، جو انہی مذکورہ ناموں سے معروف ہیں)۔

اور شام میں بسنے والوں کے نام یہ ہیں لخم، جذام، عاملہ، غسان، (ان کی نسل کے قبائل انہی ناموں سے مشہور ہوئے)۔ یہ روایت حافظ امام ابن عبد البر نے بھی اپنی کتاب رالقصد والامم بمعرفۃ انساب العرب والعجم میں نقل کی ہے۔

ابن کثیر کی تحقیق بحوالہ علماء نسب یہ ہے کہ یہ دس لڑکے سبا کے صلبی اور بلا واسطہ بیٹے نہیں تھے، بلکہ سبا کی دوسری تیسری یا چوتھی نسل میں یہ لوگ ہوئے ہیں پھر ان کے قبیلے شام و یمن میں پھیلے، اور انہی کے ناموں سے موسوم ہوئے۔ اور سبا کا اصل نام عبد شمس تھا، سبا عبد شمس بن لثحب بن یعرب بن قحطان سے ان کا نسب نامہ واضح ہو جاتا ہے۔ اور اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ سبا عبد شمس نے اپنے زمانے میں نبی آخر الزماں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت سنائی تھی ممکن ہے کہ ان کو اس کا علم کتب قدیمہ تور و انجیل سے ہوا ہو، یا انجومیوں کا ہمنوں کے ذریعہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اس نے چند عربی اشعار بھی کہے ہیں جن میں آپ کی بعثت کا ذکر کر کے یہ تمنا کی ہے کہ کاش میں ان کے زمانے میں ہوتا تو میں ان کی مدد کرتا، اور اپنی قوم کو ان پر ایمان لانے اور مدد کرنے کی تلقین کی ہے۔

اور حدیث مذکور میں جو یہ مذکور ہے کہ سبا کے دس لڑکوں میں سے چھ یمن میں آباد ہوئے، چار شام کی طرف چلے گئے، یہ واقعہ ان پر سیلاب کا عذاب آنے کے بعد کا ہے، کہ سیلاب آنے کے وقت یہ لوگ مختلف سمتوں اور شہروں میں منتشر ہو گئے (ابن کثیر) قرطبی نے بحوالہ قشیری قوم سبا کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے زمانہ فرت نقل کیا ہے۔

سیلِ عِرم

اور سِدِّ مَارَبِّ

فَاَسْلَمْنَا عَلٰیھِمْ سَبِيلَ الْعِرم، لفظِ عِرم کے عربی لغت کے اعتبار سے کئی معنی معروف ہیں، اور علماء تفسیر نے ہر معنی کے اعتبار سے اس آیت کی تفسیر فرمائی ہے، مگر ان میں سیاق و سرائف کے مناسب وہ معنی ہیں جو قاموس اور صحاح جوہری وغیرہ کتب لغت میں ہیں کہ عِرم کے معنی سد یعنی بند کے ہیں جو پانی روکنے کے لئے بنایا جاتا ہے جو آجکل ڈیم کے نام سے معروف ہے، حضرت ابن عباسؓ نے بھی عِرم کے معنی سد یعنی بند کے بیان فرمائے ہیں (قرطبی)

واقعہ اس بند (ڈیم) کا حسب بیان ابن کثیرؒ یہ ہے کہ ملکِ یمن میں اس کے دار الحکومت صنعاء سے تین منزل کے فاصلہ پر ایک شہر مَارَب تھا، جس میں قوم سبأ آباد تھی۔ دو پہاڑوں کے درمیان وادی میں شہر آباد تھا، دونوں پہاڑوں کے درمیان سے اور پہاڑوں کے اوپر سے بارش کا سیلاب آتا تھا، یہ شہر ہمیشہ ان سیلابوں کی زد میں رہتا تھا۔ ایک شہر کے بادشاہوں نے رجن میں ملکہ بلقیس کا نام خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے (ان دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک بند (ڈیم) نہایت مستحکم مضبوط تعمیر کیا، جس میں پانی اتر نہ کر سکے۔ اس بند کے پہاڑوں کے درمیان سے آنے والے سیلابوں کو روک کر پانی کا ایک عظیم الشان ذخیرہ بنادیا، پہاڑوں کی بارش کا پانی بھی اس میں جمع ہونے لگا، اس بند کے اندر اوپر نیچے پانی نکالنے کے لئے تین دروازے رکھے گئے تاکہ پانی کا یہ ذخیرہ انتظام کے ساتھ شہر کے لوگوں کے اور ان کی زمین باغ کی آب پاشی کے... کام آوے۔ پہلے اوپر کا دروازہ کھول کر اس سے پانی لیا جاتا تھا، جب اوپر کا پانی ختم ہو جاتا تو اس سے نیچے کا اور اس کے بعد سب سے نیچے کا تیسرا دروازہ کھولا جاتا تھا، یہاں تک کہ دوسرے سال کی بارشوں کا زمانہ آکر پھر پانی اوپر تک بھر جاتا۔ بند کے نیچے ایک بہت بڑا تالاب تعمیر کیا گیا تھا، جس میں پانی کے بارہ راستے بنا کر بارہ نہریں شہر کے مختلف اطراف میں پہونچائی گئی تھیں، اور سب نہروں میں پانی یکساں انداز میں چلتا اور شہر کی ضرورتوں میں کام آتا تھا (منظری)

شہر کے داہنے بائیں جو دو پہاڑ تھے ان کے کناروں پر باغات لگائے گئے تھے جن میں پانی کی نہریں جاری تھیں، یہ باغات ایک دوسرے کے متصل مسلسل دور و در پہاڑوں کے کناروں پر تھے، یہ باغات اگرچہ تعداد میں بہت تھے، مگر قرآن کریم نے ان کو جَلَّتَان یعنی دو باغ کے لفظ سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ ایک رُخ کے تمام باغوں کو بوجہ اتصال کے ایک باغ اور دوسرے رُخ کے تمام باغوں کو دوسرا باغ قرار دیا ہے۔ ان باغوں میں ہر طرح کے درخت اور ہر قسم کے پھل اس کثرت سے پیدا ہوتے تھے

کہ ائمہ سلف قتادہ وغیرہ کے بیان کے مطابق ان باغوں میں ایک عورت اپنے سر پر خالی ٹوکری لے کر چلتی تو درختوں سے ٹوٹ کر گرنے والے پھلوں سے خود بخود بھر جاتی تھی، اس کو ہاتھ بھی لگانا نہ پڑتا تھا (ابن کثیر)

سُكُّوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ بَلَدًا طَيِّبَةً وَرَبِّ غَفُورًا، حق تعالیٰ نے اپنی انبیاء کے ذریعہ ان کو یہ حکم دیا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس رزق وسیع کو استعمال کرو اور اس کی شکر گزاری اعمال صالحہ اور اطاعت احکام الہیہ کے ساتھ کرتے رہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس شہر کو بلدہ طیبہ بنایا ہے، جس میں سردی گرمی کا بھی اعتدال تھا اور آب ہوا ایسی صحت بخش نظیف و لطیف تھی کہ ان کے پورے شہر میں مچھرا مکھی، پسوا اور ساتپ بچھو جیسے موذی جانوروں کا نام و نشان نہ تھا، بلکہ باہر سے آنے والے مسافر جب اس شہر میں پہنچتے تو اگر ان کے کپڑوں میں جوئیں یا دوسرے موذی حشرات ہوتے تھے وہ یہاں پہنچ کر خود بخود مر جاتے تھے۔ (ابن کثیر)

بَلَدًا طَيِّبَةً کے ساتھ رَبِّ غَفُورًا، فرما کر اپنی نعمت کو اس طرح مکمل کر دیا کہ یہ عیش و راحت صرف دنیا کی زندگی تک نہیں، بلکہ اگر تم شکر گزاری پر قائم رہے تو آخرت میں اس سے بڑی اور دائمی نعمتوں کا بھی وعدہ ہے، کیونکہ ان تمام نعمتوں کا خالق و مالک اور تمہیں پالنے والا غفور ہے، کہ اگر کبھی اتفاقی طور پر شکر گزاری میں کمی یا غفلت کو تاہی بھی ہو گئی تو اس کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا۔

فَاعْرِضُوا قَارًا سَلْنَا عَلَيْهِمْ مَسِيلَ الْغَمِّ، یعنی اللہ تعالیٰ کی ایسی وسیع نعمتوں اور انبیاء علیہم السلام کی تنبیہات کے باوجود جب قوم سبا کے لوگوں نے اللہ کے احکام سے سرکشی اور روگردانی کی تو ہم نے اُن پر سیلِ غم چھوڑ دیا۔ غم کے معنی اوپر گزر چکے ہیں کہ بند کے ہیں اس سیلاب کو غم کی طرف اس لئے منسوب کیا کہ جو غم ان کی حفاظت اور خوش حالی کا ذریعہ تھا اسی کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آفت و مصیبت بنا دیا۔ واقعہ اس کا حضرت ابن عباسؓ و ہرب بن منبہ، قتادہ، ضحاک وغیرہ ائمہ تفسیر نے یہ بیان کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو سزا دینے کے لئے سد مأرب یعنی غم کو توڑ کر سیلاب سے تباہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس پانی کے عظیم الشان بند پر اندھے چوہے مسلط کر دیئے جنہوں نے اس کی بنیاد کو کھوکھلا اور کمزور کر دیا۔ جب بارش اور سیلاب کا وقت آیا تو پانی کے دباؤ نے اس کمزور بنیاد کو توڑ کر رخنے پیدا کر دیئے، اور بالآخر اس بند کے پیچھے جمع شدہ پانی اس پوری وادی میں پھیل گیا جس میں یہ شہر مأرب واقع تھا۔ تمام مکانات منہدم اور درخت تباہ ہو گئے، اور دو طرفہ پہاڑوں پر

جو باغات تھے ان کا پانی خشک ہو گیا۔

وہب بن منبہ کی روایت میں ہے کہ ان لوگوں کی کتابوں میں یہ بات لکھی چلی آتی تھی کہ اس بند کی خرابی و تباہی چوہوں کے ذریعہ ہوگی، جب لوگوں نے اس بند کے قریب چوہوں کو دیکھا تو خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس کی تدبیر یہ کی گئی کہ بند کے نیچے بہت سی بلیاں پالی گئیں جو چوہوں کو بند کے قریب نہ آنے دیں مگر جب تقدیر الہی نافذ ہوئی تو یہ چوہے بلیوں پر غالب آ گئے اور بند کی بنیاد میں داخل ہو گئے۔ (ابن کثیر)

اور تاریخی روایات میں یہ بھی ہے کہ کچھ ہوشیار دور اندیش لوگوں نے چوہوں کو دیکھ کر ہی یہ جگہ چھوڑ کر کسی دوسری طرف منتقل ہو جانے کا قصد کر لیا اور تدریجاً انتظام کر کے بکھل گئے، باقی لوگ وہاں رہے، مگر جب سیلاب شروع ہوا، اس وقت منتقل ہو گئے، اور بہت دہیں سیلاب کی نذر ہو گئے۔ غرض یہ پورا شہر تباہ و برباد ہو گیا، شہر کے کچھ باشندے جو دوسرے ملکوں میں شہروں کی طرف چلے گئے، ان کی کچھ تفصیل مسند احمد کی حدیث میں جو اوپر گزر چکی ہے مذکور ہو چھ قبیلے ان کے یمن میں پھیلے اور چار شام میں، مدینہ طیبہ کی آبادی بھی اپنی قبائل میں سے بعض سے شروع ہوئی، جس کی تفصیل کتب تاریخ میں مذکور ہے۔ سیلاب آنے اور شہر تباہ ہونے کے بعد دور وہ باغات کا جو حال ہوا وہ آگے اس طرح ذکر فرمایا کہ:-

وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتِ الْأَكْأَلِ نَخْمِطُ الْأَثْلَ وَشَيْءٌ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے قیمتی پھلوں اور میوؤں کے درختوں کے بدلے اس میں ایسے درخت اُگادیتے، جن کے پھل بدمزہ خراب تھے۔ لفظ نَخْمِطُ کے معنی اکثر حضرات مفسرین درخت اراک کے کہتے ہیں، اور جو ہری لغوی نے لکھا ہے کہ درخت اراک کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس پر کچھ پھل ہوتا ہے اور کھایا جاتا ہے، مگر اس درخت کے پھل بھی بدمزہ تھے۔ اور ابو عبیدہ نے فرمایا کہ نَخْمِطُ ہر ایسے درخت کو کہا جاتا ہے جو خاردار بھی ہو کڑوا بھی۔ اور لفظ آثْلُ جہور مفسرین کے نزدیک ایک قسم طفاء کی ہے، جس کو اردو میں جھاڑ کہا جاتا ہے۔ اس پر کوئی پھل کھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ آثْلُ بمعنی سُمر یعنی بول اور کیکر کا درخت جو خاردار ہوتا ہے جس کا پھل بکریوں کو کھلایا جاتا ہے۔

سدر کے معنی بری کے ہیں۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہے، ایک وہ جو باغات میں اہتمام سے لگائی جاتی ہے، اس کا پھل شیریں خوش ذائقہ ہوتا ہے، اس کے درخت میں کانٹے کم اور پھل زیادہ ہوتا ہے۔ دوسری قسم جنگلی بری کی ہے جو جنگلوں میں خود رو اور خاردار جھاڑیاں ہوتی ہیں ان میں کانٹے زیادہ اور پھل کم ہوتا ہے، اور پھل بھی ترش ہوتا ہے۔ آیت مذکورہ میں

سین کے ساتھ قلیل کے لفظ سے غالباً اشارہ اس طرف ہے کہ بیری بھی جنگلی خود رو تھی جس پر پھل کم اور ترش ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

ذَٰلِكَ جَزَاؤُنَا لَهُمْ بِمَا كَفَرُوا، یعنی یہ سزا ہم نے ان کو اس لئے دی کہ انہوں نے کفر کیا۔ کفر کے معنی ناشکری کے بھی آتے ہیں، اور دین حق سے انکار کے بھی آتے ہیں۔ یہاں دونوں معنی ہو سکتے ہیں، کیونکہ انہوں نے ناشکری بھی کی اور جو تیرہ انبیاء اُن کی طرف بھیجے گئے تھے ان کی تکذیب بھی کی۔

فَاذْكُرُوا: اس واقعہ میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ سبا کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے تیرہ پیغمبر بھیجے تھے، اور اس کے ساتھ یہ بھی اوپر گزر گیا ہے کہ اس قوم اور سبیلِ عزم کا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے درمیانی زمانے میں تھا جس کو زمانہ فترت کہا جاتا ہے، اور جمہور علماء کے نزدیک اس زمانے میں کوئی نبی پیغمبر مبعوث ہی نہیں ہوا، اسی لئے اس کو فترت کے زمانے سے تعبیر کرتے ہیں، تو یہ تیرہ انبیاء کی بعثت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ روح المعانی میں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ واقعہ سبیلِ عزم کا فترت کے زمانے میں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ انبیاء بھی اسی زمانے میں آئے ہوں ہو سکتا ہے کہ انبیاء کی بعثت اس قوم کی طرف زمانہ فترت سے پہلے ہو اور ان کی سرکشی اور کفر زمانہ فترت میں بڑھی ہو جس پر سبیلِ عزم کا عذاب زمانہ فترت میں اُن پر بھیجا گیا ہو واللہ اعلم

وَهَلْ نُجْزِي إِلَّا الْكَافِرَ، کافر کا صیغہ مبالغہ ہے، جس کے معنی ہیں بہت کفر کرنے والا اور آیت کے معنی یہ ہوتے کہ ہم بہت کفر کرنے والے کے سوا کسی کو سزا نہیں دیتے۔ یہ بظاہر اُن تمام آیات قرآن اور احادیث صحیحہ کے خلاف ہے جن سے ثابت ہے کہ مسلمان گناہگاروں کو بھی جہنم کی سزا اُن کے عمل کے مطابق دی جائے گی، اگرچہ آخر کار سزا بھگتنے کے بعد وہ ایمان کی وجہ سے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ اس اشکال کے جواب میں بعض حضرات نے فرمایا کہ مراد یہاں مطلق عذاب نہیں، بلکہ ایسا عذاب عام جیسا کہ قوم سبا پر بھیجا گیا یہ کافروں کے ساتھ مخصوص ہے، مسلمان گناہگاروں پر ایسا عذاب نہیں آتا (روح)

اس کی تائید ایک تابعی ابن خیرہ کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ انہوں نے فرمایا

جَزَاءُ الْمَعْصِيَةِ الْوَهْنُ فِي الْعِبَادَةِ وَالْضَيِّقُ فِي الْمَعِيشَةِ وَالنَّعْسُ فِي اللَّذَّةِ

قَالَ لَا يُصَادِفُ لَذَّةٌ حَلَالًا إِلَّا جَاءَهَا مِنْ يَنْغَصُّهَا، یعنی معصیت کی سزا یہ ہے کہ عبادت میں سستی پیدا ہو جائے، معیشت میں تنگی پیدا ہو جائے، اور لذت میں تعسر یعنی

دشواری پیدا ہو جائے۔ جس کا مطلب ابن خیرہ نے یہ بیان فرمایا کہ جب اس کو کوئی حلال لذت نصیب — ہوتی ہے تو کوئی نہ کوئی ایسا سبب پیدا ہو جاتا ہے جو اس لذت کو مکدر کر دیتا ہے۔ (ابن کثیر) معلوم ہوا کہ مؤمن گناہگار کی سزائیں دنیا میں اس قسم کی ہوتی ہیں، اس پر آسمان کے یا زمین سے کوئی کھلا عذاب نہیں آتا، یہ کفار ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: - صَدَقَ اللَّهُ الْعَظِيمُ لَا يُعَاقَبُ بِمِثْلِ فِعْلِهِ إِلَّا الْكَفُورُ، یعنی اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا کہ بُرے عمل کی سزا اس کے برابر بجز کفور کے کسی کو نہیں دی جاتی۔ (ابن کثیر) کیونکہ غیر کفور یعنی مؤمن کو اس کے گناہوں میں بھی کچھ چھوٹ دی جاتی ہے۔

اور روح المعانی میں بحوالہ کشف اس آیت کے مفہوم کی توجیہ یہ کی ہے کہ کلامِ اپنی حقیقت پر یہ کہ سزا بطور سزا کے تو صرف کافر کو دی جاتی ہے اور مؤمن گناہگار کو جو تکلیف آگ وغیرہ کی دی جاتی ہے وہ صرف صورت سزا کی ہوتی ہے، درحقیقت اس کو گناہ سے پاک کرنا مقصود ہوتا ہے، جیسے سونے کو بھٹی میں ڈال کر تپانے سے اس کا میل دور کرنا مقصود ہوتا ہے اسی طرح مؤمن کو بھی اگر کسی گناہ کی یاداش میں جہنم میں ڈالا گیا تو اس لئے کہ اس کے بدن کے وہ اجزاء جل جائیں جو حرام سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور جب یہ ہو چکتا ہے تو وہ جنت میں جانے کے قابل ہو جاتا ہے، اس وقت جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمُ الْوَادِيَّ الَّتِي بَيْنَ الْفُرَاتَيْنِ الَّتِي بَيْنَ الْفُرَاتَيْنِ ظَاهِرَةً وَقَدْ ذُكِّرْنَا فِيهَا

السَّيْرُ الْآيَةُ، اس آیت میں اہل سباء پر اللہ تعالیٰ کی ایک اور نعمت کا اور اس پر اہل سباء کی ناشکری اور نادانی کا ذکر ہے کہ انھوں نے خود اس نعمت کو بدل کر شدت کی دعا اور تمنا کی۔ الْفُرَاتَيْنِ الَّتِي بَيْنَهُمَا مَعْرُوفٌ ظَاهِرٌ، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزولِ رحمت کا ذکر متعدد آیتوں میں ملکِ شام ہی کے لئے آیا ہے۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ جن بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے صاحبِ برکت بنایا تھا، یعنی ملکِ شام کی بستیاں اور ان لوگوں کو اپنی تجارت وغیرہ کے لئے ملکِ شام کا سفر اکثر کرنا پڑتا تھا۔ عام دنیا کے حالات کے مطابق شہرِ مارب سے ملکِ شام کا طویل فاصلہ ہے، راستے ہموار نہیں اللہ تعالیٰ نے قومِ سباء پر یہ انعام فرمایا کہ ان کے شہرِ مارب سے لے کر ملکِ شام تک تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بستیاں بنا دی تھیں، یہ بستیاں لبِ سمرک تھیں۔ اس لئے ان کو قری ظاہرہ فرمایا۔ ان مسلسل بستیوں کا فائدہ یہ تھا کہ ان کا مسافر گھر سے نکل کر دوپہر میں آرام کرنا یا کھانا کھانا چاہتا تو آسانی سے کسی بستی میں پہنچ کر معمول کے مطابق

کھانا کھا کر آرام کر سکتا تھا۔ پھر اسی طرح ظہر کے بعد روانہ ہو کر آفتاب کے غروب ہونے تک اگلی بستی میں پہنچ کر رات گزار سکتا تھا، قَدْ رَافَتْهَا الشِّرَالَا یہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ بستیاں ایسے متوازن اور مساوی فاصلوں پر بنائی گئی تھیں کہ ایک مفترکہ وقت کے اندر ایک بستی سے دوسری بستی تک پہنچ جاتے۔

سَيُورُ وَافِيهَا لَيَالِي وَآيَاتُ مَا أَمِينِينَ، یہ ایک تیسری نعمت کا ذکر ہے جو قوم سبا پر مبذول ہوئی تھی، کہ اس کی بستیاں ایسے مساوی اور متوازن فاصلوں پر تھیں کہ قطع مسافت میں کمی بیشی نہ ہوتی تھی، اور راستے سب مامون تھے، کسی چور ڈاکو کا وہاں گزرنہ تھا، رات دن میں ہر وقت بے فکر سفر کیا جاسکتا تھا۔

فَمَا لَوْ اَرَبْنَا بَعِيْنَ بَلِيْنَ اَسْفَادِنَا وَظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَرْقُطَهُمْ كُلَّ مَمْزُوْقٍ، یعنی ان ظالموں نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی کہ سفر کی تکلیف ہی نہ رہے ناقدری اور ناشکری کر کے خود یہ دعاء مانگی کہ ہمارے سفر میں بحد پیدا کر دے، قریب قریب کے گاؤں نہ رہیں، جنگل بیابان آئے، جس میں کچھ محنت مشقت بھی اٹھانی پڑے۔ اُن کی مثال وہی ہے جو بنی اسرائیل کی تھی کہ بے محنت بہترین رزق من و سلوٰی ان کو ملتا تھا، اس سے اکتا کر اللہ سے یہ مانگا کہ اس کے بجائے ہمیں سبزی ترکاری دیدیجئے، حق تعالیٰ نے ان کی ناشکری اور نعمت کی بے قدری پر وہ مڑا جاری فرمائی جو اوپر سیل غم کے عنوان سے مذکور ہوئی ہے۔ اسی کا آخری نتیجہ اس آیت میں یہ بیان فرمایا کہ ان کو ایسا تباہ و برباد کیا کہ دنیا میں ان کی عیش و عشرت اور دولت و نعمت کے قصے ہی رہ گئے، اور یہ لوگ افسانہ بن گئے۔

مَرْقُطُهُمْ، تمزین سے مشتق ہے، جس کے معنی ٹکڑے ٹکڑے اور پارہ پارہ کرنے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس مقام شہر مارب کے بسے والے کچھ ہلاک ہو گئے، کچھ ایسے منتشر ہو گئے کہ اُن کے ٹکڑے مختلف ملکوں میں پھیل گئے، عرب میں قوم سبا کی تباہی اور منتشر ہونا ایک ضرب المثل بن گیا، ایسے مواقع میں عرب کا محاورہ ہے قَفَرًا قُوْا اَيَادِي سَبَا، یعنی یہ لوگ ایسے منتشر ہوئے جیسے قوم سبا کے نعمت پروردہ لوگ منتشر ہو گئے تھے۔

ابن کثیر وغیرہ مفسرین نے اس جگہ طویل قصہ ایک کاہن کا کہن کا نقل کیا ہے، کہ سیلاب کا عذاب آنے سے کچھ پہلے اس کاہن کو اس کا علم ہو گیا تھا۔ اس نے ایک عجیب تدبیر کے ذریعہ پہلے تو اپنی زمین جائداد مکان وغیرہ سب فروخت کر دیا، جب رقم اس کے ہاتھ آگئی تو اس نے اپنی قوم کو آنے والے سیلاب و عذاب سے باخبر کیا، اور کہا کہ جس کو اپنی جان سلا رکھنا ہو وہ فوراً یہاں سے نکل جائے۔ اس نے لوگوں کو یہ بھی بتلایا کہ تم میں جو لوگ سفر لعین

اختیار کر کے محفوظ مقام کا ارادہ کریں، وہ عمان چلے جائیں اور جو لوگ شراب اور خمیری روٹی اور پھل وغیرہ چاہیں وہ ملک شام کے مقام بصریٰ میں چلے جائیں، اور جو لوگ ایسی سواریاں چاہیں جو کچھڑ میں ثابت قدم رہیں، اور قحط کے زمانے میں کام آئیں، اور جلدی سفر کی ضرورت کے وقت ساتھ دیں تو وہ یثرب (مدینہ منورہ) چلے جائیں جس میں کھجور کثرت سے ہے۔ اس کی قوم نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ قبیلہ ازد عمان کی طرف چلے گئے اور غسان بصریٰ ملک شام کی طرف اور اوس و خزرج اور بنو عثمان یثرب ذات النخل کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ بطن مر کے مقام پر پہنچ کر بنو عثمان نے تو اسی جگہ کو پسند کر لیا اور یہیں رہ پڑے، اور اسی انقطاع کی وجہ سے بنو عثمان کا لقب خزاعہ ہو گیا۔ یہ بطن مرہ میں جو مکہ مکرمہ کے قریب ہو رہ پڑے، اور اوس و خزرج یثرب پہنچ کر مقیم ہو گئے۔ ابن کثیر میں طویل قصہ کے بعد لوگوں کے متفرق مقامات میں منتشر ہو جانے کی یہی تفصیل بسند سعید عن قتادہ عن الشعبي نقل کر کے فرمایا کہ اس طرح یہ قوم سبا ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی، جس کا ذکر فَسَبَّأْنَاهُمْ كُلَّ مَسْرَاقٍ میں آیا ہے۔ إِنِّي ذَالِكٌ لَا يَآتِيكَ إِلَّا كَلٌّ صَبَّارٍ شَكُورٍ، یعنی قوم سبا کے عروج و نزول اور ان کے احوال کے انقلاب میں بڑی نشانی اور عبرت ہے، اس شخص کے لئے جو بہت صبر کرنے والا اور بہت شکر کرنے والا ہو۔ یعنی کوئی مصیبت و تکلیف پیش آئے تو اس پر صبر کرے، اور کوئی نعمت و راحت حاصل ہو تو اس پر اللہ کا شکر کرے، اس طرح وہ زندگی کے ہر حال میں نفع ہی نفع کھاتا ہے۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کا حال عجیب ہے، کہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی تقدیر کا حکم نافذ فرماتے ہیں سب خیر ہی خیر اور نفع ہی نفع ہوتا ہے، کہ اگر اس کو کوئی نعمت و راحت اور اس کی خوشی کی چیز حاصل ہوتی ہے تو یہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے وہ اس کی آخرت کے لئے خیر اور نفع بن جاتا ہے اور اگر کوئی تکلیف و مصیبت پیش آجائے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے جس کا اس کو بہت بڑا اجر و ثواب ملتا ہے، اس طرح یہ مصیبت بھی اس کے لئے خیر اور نفع بن جاتی ہے۔ (از ابن کثیر)

اور بعض حضرات مفسرین نے لفظ صَبَّار کو صبر کے عام معنی میں لیا ہے، جس میں طاعا پر ثابت قدم رہنا اور معاصی سے پرہیز کرنا بھی داخل ہے، اس تفسیر پر مومن ہر حال میں صبر و شکر کا جامع رہتا ہے اور ہر صبر شکر ہے اور ہر شکر صبر بھی ہے، واللہ اعلم

وَلَقَدْ صَدَقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۰﴾

اور سچ کر دکھلائی اُن پر ابلیس نے اپنی اھل پھراس کی راہ چلے مگر تھوڑے سے ایمان دار۔

وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِم مِّن سُلْطٰنٍ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يُّؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ

اور اس کا اُن پر کچھ زور نہ تھا مگر اتنے واسطے کہ معلوم کر لیں ہم اس کو جو یقین لاتا ہے آخرت پر جدا کر کے

مِن مَّنْ هُوَ مِثْلُ فَاثِلٍ ۚ وَرَبُّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِیْظٌ ﴿۲۱﴾

اس جو رہتا ہے آخرت کی طرف دھوکہ میں، اور تیرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور واقعی ابلیس نے اپنا گمان ان لوگوں کے بارے میں (یعنی بنی آدم کے بارے میں) صحیح پایا (یعنی اس کو جو یہ گمان تھا کہ میں آدم کی اکثر ذریت کو گمراہ کر دوں گا، کیونکہ یہ مٹی سے اور میں آگ سے پیدا ہوا ہوں) (درمختور) اس کا یہ گمان صحیح نکلا، کہ یہ سب اسی راہ پر ہوئے مگر ایمان والوں کا گردہ (کہ ان میں ایمان کامل والے تو بالکل محفوظ رہے، اور ضعیف الایمان گو گناہوں میں مبتلا ہو گئے، مگر شرک و کفر سے وہ بھی محفوظ ہے) اور ابلیس کا ان لوگوں پر (جو) تسلط (بطور اغواء کے ہے وہ) بجز اس کے اور کسی وجہ سے نہیں کہ ہم کو (ظاہری طور پر) اُن لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے (الگ کر کے) معلوم کرتا ہے جو اس کی طرف سے شک میں ہیں (یعنی مقصود امتحان ہے کہ مؤمن و کافر میں امتیاز ہو جائے، تاکہ بمقتضائے عدل و حکمت ثواب و عذاب کے احکام جاری ہوں) اور (چونکہ) آپ کا رب ہر چیز کا نگران ہے (جس میں لوگوں کا ایمان و کفر بھی داخل ہے، اس لئے ہر ایک کو مناسب جزاء و سزا ملے گی)۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

تو کہہ پکارو ان کو جن کو گمان کرتے ہو سوائے اللہ کے وہ مالک نہیں ایک

ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِن شَيْءٍ ۚ

ذرہ بھر کے آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کچھ سا بچھا ہے

وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِّن ظٰهِرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا

اور نہ اُن میں کوئی اس کا مددگار - اور کام نہیں آتی سفارش اس کے پاس، مگر

لِمَنْ أَذِنَ لَهُ طَحْتِي إِذَا فُزِعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ ط

اس کو کہ جس کے واسطے حکم کر دے یہاں تک کہ جب گھبراہٹ دور ہو جائے ان کے دل سے کہیں کیا فرمایا تمہارے رب نے

قَالُوا الْحَقُّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ۝۲۳ قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَوَاتِ

وہ کہیں فرمایا جو واجب ہے اور وہی ہی سب سے اوپر بڑا۔ تو کہہ کون روزی دیتا ہو تم کو آسمان سے

وَالْأَرْضِ ط قُلْ اللَّهُ وَإِنَّا أَوْ أَيْبَاكُمْ نَعْلَمُ هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ

اور زمین سے بتلا دے کہ اللہ اور یا ہم یا تم بیشک ہدایت پر ہیں یا پڑے ہیں مگر اہی میں

مُبَيِّنٍ ۝۲۴ قُلْ لَا تَسْأَلُونَنَا عَنْ آجْرِنَا وَلَا تَسْأَلُ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝۲۵

صریح۔ تو کہہ تم سے پوچھ نہ ہوگی اس کی جو ہم نے گناہ کیا اور ہم سے پوچھ نہ ہوگی اکی جو تم کرتے ہو

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ

تو کہہ جمع کر گیا ہم سب کو رب ہمارا پھر فیصلہ کر گیا ہم میں انصاف کا، اور وہی قصہ چکانے والا سب کچھ

الْعَلِيمُ ۝۲۶ قُلْ أَرُونِي الَّذِينَ أَلْحَقْتُمْ بِهِ شُرَكَاءَ كَلَّا بَلْ

جاننے والا ہے، تو کہہ مجھ کو دکھاؤ تو وہی جن کو اس سے ملاتے ہو ساجھی قرار دیکر، کوئی نہیں وہی

هُوَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝۲۷

اللہ ہے زبردست حکمتوں والا۔

خُلاصۂ تفسیر

آپسداں لوگوں سے) فرمائیے کہ جن (معبودوں) کو تم خدا کے سوا (دخیل خدائی)

سمجھ رہے ہو ان کو (اپنی حاجتوں کے لئے) پکارو (تو وہی معلوم ہو جائے گا کہ کتنی قدرت اور

اختیار رکھتے ہیں ان کی حالت واقعہ تو یہ ہے کہ) وہ ذرہ برابر کسی چیز کا (اختیار نہیں رکھتے

نہ آسمانوں کی کائنات) میں اور نہ زمین (کی کائنات) میں اور نہ ان کی ان دونوں کے پیدا

کرنے) میں کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا (کسی کام میں) مددگار ہے، اور خدا

کے سامنے (کسی کی) سفارش کسی کے لئے کام نہیں آتی (بلکہ سفارش ہی نہیں ہو سکتی) مگر

اس کے لئے جس کی نسبت وہ (کسی سفارش کرنے والے کو) اجازت دیدے، (کفار و

مشرکین میں کچھ جاہل تھے تو ایسے تھے جو پتھر کے خود تراشیدہ بتوں ہی کو حاجت روا

اور کار فرما اور خدائی کا شریک سمجھتے تھے، اُن کے رد کے لئے تو آیت کے پہلے جملے آئے،
 وَلَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَمَا لَهُمْ فِيهَا مِنْ شَرِّ لٍ، اور بعض لوگ اتنا قادر تو نہیں
 کہتے تھے مگر یہ عقیدہ رکھتے کہ یہ بت خدا تعالیٰ کے کاموں میں اس کے مددگار ہیں، اُن کے
 رد کے لئے یہ فرمایا (مَالِكُمْ مِنْ ظَاهِيَةٍ) اور کچھ ایسے سمجھدار تھے کہ ان بے جان بتوں کو کسی
 چیز کا خالق یا خالق کا مددگار تو نہیں مانتے تھے، مگر یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ اللہ کے نزدیک
 مقبول ہیں کہ جس کی سفارش کر دیں اس کا کام بن جاتا ہے، جیسا کہ وہ کہا کرتے تھے (هَؤُلَاءِ
 شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ) ان کے رد کے لئے فرمایا (وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ) جس کا
 حاصل یہ ہے کہ ان بتوں میں کسی قابلیت کے تو تم بھی قائل نہیں مگر تم اس دھوکہ میں ہو
 کہ ان کو اللہ کے نزدیک مقبولیت حاصل ہے۔ یہ محض تمہارا خیال بے بنیاد ہے، نہ ان میں
 کوئی قابلیت اور نہ اللہ کے نزدیک مقبولیت۔ آگے یہ ارشاد فرمایا کہ ان میں تو نہ کوئی قابلیت
 ہو نہ مقبولیت، جن میں قابلیت بھی موجود ہو اور مقبولیت بھی جیسے اللہ کے فرشتے وہ بھی
 کسی کی سفارش کرنے میں خود مختار نہیں، بلکہ ان کے لئے شفاعت کا قانون یہ ہے کہ جس
 شخص کے لئے سفارش کرنے کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل جائے صرف اس کی
 سفارش کر سکتے ہیں اور وہ بھی بڑی مشکل سے۔ کیونکہ وہ خود اللہ تعالیٰ کی ہیبت و
 جلال سے مغلوب ہیں جب اُن کو کوئی عام حکم دیا جاتا ہے یا کسی کے لئے سفارش
 ہی کا حکم ملتا ہے تو وہ حکم سننے کے وقت ہیبت سے مدہوش ہو جاتے ہیں۔ جب یہ
 ہیبت کی کیفیت رفع ہو جاتی ہے اس وقت حکم پر غور کرتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے
 سے پوچھ کر تحقیق کر لیتے ہیں کہ ہم نے جو حکم سنا ہے وہ کیا ہے، اس تحقیق کے بعد وہ
 حکم کی تعمیل کرتے ہیں جس میں کسی کی سفارش کا حکم بھی داخل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ کے فرشتے جو قابلیت بھی رکھتے ہیں، مقبولیت عند اللہ
 بھی، وہ بھی کسی کی سفارش از خود بلا اجازت نہیں کر سکتے، اور جب کسی کے لئے اجازت
 ملتی بھی ہے تو خود ہیبت سے مدہوش جیسے ہو جاتے ہیں، اس کے بعد جب مدہوشی دور
 ہوتا ہے تو سفارش کرتے ہیں، تو یہ پتھروں کے خود تراشیدہ بت جن میں نہ کسی طرح کی
 قابلیت ہو نہ مقبولیت، وہ کیسے کسی کی سفارش کر سکتے ہیں؟ فرشتوں کے مدہوش ہو جانے
 وغیرہ کا ذکر آگے آیت میں اس طرح آیا ہے کہ یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے
 گھبراہٹ (جو حکم سننے کے وقت طاری ہوتی تھی) دور ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے
 سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے پروردگار نے کیا حکم فرمایا وہ کہتے ہیں کہ (فلان) حق بات

کا حکم فرمایا (جیسے طالب علم سبق پڑھنے کے بعد استاد کی تقریر کو صحیح کرنے اور یاد کرنے کے لئے باہم اس کا اعادہ کیا کرتے ہیں، یہ فرشتے بھی اپنے سُننے ہوئے حکم کی باہم ایک دوسرے سے تحقیق و تصدیق کرتے ہیں۔ اس کے بعد حکم کی تعمیل کرتے ہیں) اور اس کے رو برو فرشتوں کا ایسا حال ہو جانا کیا بعید ہے) وہ عالی شان سب سے بڑا ہے۔

اور آپ (ان سے تحقیق و توحید کے لئے یہ بھی) پوچھئے کہ تم کو آسمان و زمین سے (پانی برساکر اور نباتات نکال کر) کون روزی دیتا ہے (چونکہ اس کا جواب ان کے نزدیک ہی متعین ہے، اس لئے) آپ (یہی) کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ (روزی دیتا ہے) اور یہ بھی کہتے کہ اس مسئلہ (توحید میں) بیشک ہم یا تم ضرور راہِ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں (یعنی یہ تو ہونہیں سکتا کہ دو متضاد چیزیں توحید اور شرک دونوں صحیح اور حق ہوں، اور دونوں طرح کے عقیدے رکھنے والے اہل حق ہوں بلکہ ضروری ہے کہ ان دونوں عقیدوں میں سے ایک صحیح و دوسرا غلط ہو۔ صحیح عقیدے کے رکھنے والے ہدایت پر اور غلط کا عقیدہ رکھنے والے گمراہی پر ہونگے۔ اب تم غور کرو کہ ان میں سے کونسا عقیدہ صحیح ہے اور کون حق و ہدایت پر ہے کون گمراہی پر) آپ (ان سے اس بحث و مناظرہ میں یہ بھی) فرما دیجئے (کہ ہم نے کھول کر حق و باطل کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے، اب تم اور ہم ہر ایک اپنے عمل کا ذمہ دار ہے) تم سے ہمارے جرائم کی باز پرس نہ ہوگی اور ہم سے تمہارے اعمال کی باز پرس نہ ہوگی اور (آپ اُن سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (ایک وقت ضرور آنے والا ہے جس میں) ہمارا رب سب کو (ایک جگہ) جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ (عملی) کر دے گا اور وہ بڑا فیصلہ کنیوالا اور (سب کا حال) جاننے والا ہے، آپ (یہ بھی) کہتے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی شانِ عالی اور قدرتِ کاملہ کے دلائل سُن لئے اور اپنے بتوں کی بے بسی بھی دیکھ لی، مجھ کو ذرا وہ تو دکھلاؤ جن کو تم نے شریک بنا کر (استحقاقِ عبادت میں) خدا کے ساتھ ملا رکھا ہے، ہرگز اس کا کوئی شریک (نہیں بلکہ) واقع میں (وہی ہے اللہ یعنی معبودِ برحق) زبردست حکمت والا۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں حکیم ربانی کے نزدیک کے وقت جو فرشتوں کا مدہوش ہو جانا پھر آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ پچھ کرنے کا ذکر ہے، اس کا بیان صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے اس طرح آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کوئی حکم نافذ فرماتے ہیں تو سب فرشتے خشوع و خضوع سے اپنے پر مارنے لگتے ہیں (اور مدہوش جیسی ہو جاتے ہیں)۔

جب ان کے دنوں سے گھبراہٹ اور ہیبت و جلال کا وہ اثر دور ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ دوسرے کہتے ہیں کہ فلاں حکیم حق ارشاد فرمایا ہے۔ الحدیث اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارا رب تبارک اسمہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو عرش کے اٹھائیوں فرشتے تسبیح کرنے لگتے ہیں، ان کی تسبیح کو سن کر ان کے قریب والے آسمان کے فرشتے تسبیح پڑھنے لگتے ہیں، پھر ان کی تسبیح کو سن کر اس سے نیچے والے آسمان کے فرشتے تسبیح پڑھنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ یہ نوبت سماء دنیا (نیچے کے آسمان) تک پہنچ جاتی ہے (اور سب آسمانوں کے فرشتے تسبیح میں مشغول ہو جاتے ہیں) پھر وہ فرشتے جو حملہ عرش کے قریب ہیں ان سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے رب نے کیا فرمایا وہ بتلا دیتے ہیں، پھر اسی طرح ان سے نیچے کے آسمان والے اور والدوں سے یہی سوال کرتے ہیں، یہاں تک کہ سوال و جواب کا یہ سلسلہ سماء دنیا تک پہنچ جاتا ہے۔ الحدیث (مظہری)

وَإِنَّا أَوْأَيُّكُمْ تَعَلَّىٰ هُكْدَىٰ أَوْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ، یہ مشرکین کو خطاب ہے۔ کفار کے ساتھ خطاب ہے۔ دلائل واضحہ سے اللہ تعالیٰ کا خالق و مالک ہونا اور قادر و مطلق ہونا واضح کر دیا گیا، بتوں اور غیر اللہ کی بے بسی اور کمزوری کا مشاہدہ کر دیا گیا، ان سب باتوں کے بعد موقع اس کا تھا کہ مشرکین کو خطاب کر کے کہا جاتا کہ تم جاہل اور گمراہ ہو کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں اور شیاطین کی پرستش کرتے ہو۔ مگر قرآن حکیم نے اس جگہ جو حکیمانہ عنوان اختیار فرمایا وہ دعوت و تبلیغ اور مخالفین اسلام اور اہل باطل سے بحث و مناظرہ کرنے والوں کے لئے ایک اہم ہدایت نامہ ہے کہ اس آیت میں ان کو کافر گمراہ کہنے کی بجائے عنوان یہ رکھا کہ ان دلائل واضحہ کی روشنی میں یہ تو کوئی سمجھدار آدمی کہہ نہیں سکتا کہ توحید و شرک دونوں باتیں حق ہیں، اور اہل توحید اور شرک دونوں حق پرست ہیں، بلکہ یقینی ہے کہ ان دونوں میں سے ایک حق پرست اور گمراہی پرست ہے۔ اب تم خود سوچ لو اور فیصلہ کر لو کہ ہم حق پر ہیں یا تم۔ مخاطب کو خود کافر گمراہ کہنے سے اس کو اشتعال ہوتا، اس سے گریز کیا گیا، اور ایسا مشفقانہ عنوان اختیار کیا کہ سنگدل مخالف بھی غور کرنے پر مجبور ہو جائے۔ (از قرطبی و بیان القرآن)

یہ پیغمبرانہ دعوت و موعظت اور مجادلہ بالحق ہی احسن کا طریقہ جو علماء کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہئے، اس کے نظر انداز ہونے ہی سے دعوت و تبلیغ اور بحث و مناظرہ بے اثر بلکہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ مخالفین ضد پر آجاتے ہیں ان کی گمراہی اور پختہ ہو جاتی ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ

اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو سارے لوگوں کے واسطے خوشی اور ڈر سنانے کو لیکن

أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۸﴾

بہت لوگ نہیں سمجھتے۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کے واسطے (خواہ جن ہوں یا انسان، عرب ہوں یا عجم موجود ہوں یا آئندہ ہونے والے ہوں سب کے لئے) پیغمبر بنا کر بھیجا ہے (ایمان لانے پر ان کو ہماری رضا و ثواب کی) خوش خبری سنانے والا اور (ایمان نہ لانے پر ان کو ہمارے غضب و عذاب سے) ڈرانے والا، لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے (جہالت یا عناد کی وجہ سے انکار و تکذیب میں لگ جاتے ہیں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں توحید اور حق تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے کا بیان تھا، اس آیت میں رسالت کا اور بالخصوص ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تمام اقوام عالم موجودہ و آئندہ کے لئے عام ہونا بیان کیا گیا ہے۔

كَافَّةً لِّلنَّاسِ لفظ کافۃ، عربی محاورہ میں کسی چیز کے سب کو عام و شامل ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جس میں کوئی مستثنیٰ نہ ہو۔ اصل عبارت ترکیبی کا تقاضا یہ تھا کہ لِّلنَّاسِ کافۃً کہا جاتا، کیونکہ لفظ کافۃ حال ہے ناس کا، مگر عموم بعثت بیان کرنے کا اہتمام واضح کرنے کے لئے لفظ کافۃ کو مقدم کر دیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاء مبعوث ہوئے ہیں، ان کی رسالت و نبوت کسی خاص قوم اور خاص خطہ زمین کے لئے تھی۔ یہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی فضیلت ہے کہ آپ کی نبوت ساری دنیا کے لئے عام ہے۔ اور صرف انسان ہی نہیں جنات کے لئے بھی ہے اور صرف ان لوگوں کے لئے نہیں جو آپ کے زمانہ میں موجود تھے بلکہ قیامت تک آنے والی انسانی نسلوں کے لئے عام ہے۔ اور آپ کی نبوت و رسالت کا تا قیامت باقی اور مسلسل رہنا ہی اس کا مقصد ہی ہے کہ آپ خاتم النبیین ہوں آپ کے

بعد کوئی نبی مبعوث نہ ہو۔ کیونکہ دوسرا نبی اس وقت مبعوث ہوتا ہے جب پہلے کی شریعت اور تعلیمات مسخ و محرف ہو جائیں، تو دوسرا نبی اصلاح خلق کے — مقصد کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اور اپنی کتاب قرآن کی حفاظت کا تا قیامت خود وہ لے لیا ہے، اس لئے وہ قیامت تک اپنی اصلی حالت میں قائم رہے گی اور کسی اور نبی کے مبعوث ہونے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں۔ ایک یہ کہ میری مدد اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا رعب دے کر فرمائی کہ ایک ہینہ کی مسافت تک لوگوں پر میرا رعب چھا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ میرے لئے پوری زمین کو مسجد اور طہور قرار دیا گیا ہے۔ (پچھلے انبیاء کی شریعتوں میں ان کی عبادت خاص عبادت گاہوں ہی میں ہوتی تھی، ان کی مساجد سے باہر میدان یا گھر میں عبادت نہ ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کے لئے پوری زمین کو اس معنی میں مسجد بنا دیا کہ ہر جگہ نماز ادا ہو سکتی ہے۔ اور زمین کی مٹی کو پانی نہ ملنے یا پانی کا استعمال مضر ہونے کی صورت میں طہور یعنی پاک کرنے والا بنا دیا کہ اس سے تیمم کر لیا جائے تو وضو کے قائم مقام ہو جاتا ہے)۔ تیسرے یہ کہ میرے لئے مالی غنیمت حلال کر دیا گیا، مجھ سے پہلے کسی امت کے لئے یہ مال حلال نہیں تھا بلکہ حکم یہ تھا کہ جنگ میں جو مال کفار کا ہاتھ آتا اس کو جمع کر کے ایک جگہ رکھ دیں، وہاں ایک آسانی آگ بجلی وغیرہ آکر اس کو جلا دے گی، اور یہ جلا دینا ہی اس جہاد کی مقبولیت کی علامت ہوگی۔ امت محمدیہ کے لئے مالی غنیمت کو قرآن کے بتلائے ہوئے اصول کے مطابق تقسیم کر لینا اور اپنی ضروریات میں صرف کرنا جائز کر دیا گیا، چوتھے یہ کہ مجھے شفاعت کبریٰ کا مقام دیا گیا (یعنی حشر کے میدان میں جس وقت کوئی پیغمبر شفاعت کی ہمت نہ کرے گا، مجھے اس وقت شفاعت کا موقع دیا جائے گا) پانچویں یہ کہ مجھ سے پہلے ہر نبی اپنی مخصوص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، مجھے تمام اقوام عالم کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے (ابن کثیر)

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٩﴾ قُلْ لَكُمْ

اور کہتے ہیں کب ہے یہ وعدہ اگر تم سچے ہو تو کہہ دیجئے

مَّيِّعَادِ يَوْمٍ لَا تَسْأَخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْقِدُونَ ﴿٣٠﴾

لئے وعدہ ہر ایک دن کا نہ دیر کرو گے اس سے ایک گھڑی نہ جلدی

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاللَّيْنُ نُوْمٌ مِّنْ يَّهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي

اور کہنے لگے منکر ہم ہرگز نہ مانیں گے اس قرآن کو اور نہ اس سے

بَيِّنَ يَدَیْہِ وَلَا تُتْرَکِیْ اِذَا الظَّالِمُوْنَ مَوْقُوفُوْنَ عِنْدَ رَبِّہُمْ ۖ

اگلے کو، اور کبھی تو دیکھے جب کہ گنہگار کھڑے کئے جائیں اپنے رب کے پاس،

یَرْجِعُ بَعْضُہُمْ اِلٰی بَعْضٍ اِلْقَوْلَ الَّذِیْ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اسْتَضْعِفُوْا

ایک دوسرے پر ڈالتا ہے بات کو، کہتے ہیں وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے تھے

لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا لَوْلَا اَخْتَمْتُمْ لَکُنَّا مُؤْمِنِیْنَ ۝۳۱ قَالَ

بڑائی کرنے والوں کو اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایمان دار ہوتے۔ کہنے لگے

الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَضْعِفُوْا اَنَحْنُ صَدَدٌ لَّکُمْ عَنِ

بڑائی کرنے والے اُن سے جو کہ کمزور ہو گئے تھے کیا ہم نے روکا تم کو

الْہُدٰی بَعْدَ اِذْ جَاۤءَ کُمْ بِالْکِتٰبِ مُجْرِیْمِیْنَ ۝۳۲ وَقَالَ الَّذِیْنَ

حق بات سے تمہارے پاس پہنچ چکے کے بعد کوئی نہیں تم ہی تھے گنہگار۔ اور کہنے لگے

اسْتَضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا اَبْلَ مَکْرٍ اَلِیْلٍ وَالنَّہَارِ اِذْ

وہ لوگ جو کمزور گئے تھے بڑائی کرنے والوں کو کوئی نہیں ہر فریق رات دن کے جب

تَاْمُرُوْنَ اَنَّا نَنْکُفُّ بِاللّٰہِ وَنَجْعَلُ لَّہٗ اٰنَدًا وَّاَسْرُوْا

تم ہم کو حکم کیا کرتے کہ ہم نہ مانیں اللہ کو اور ٹھہرائیں اس کے ساتھ برابر کے ساجھی اور چھپی

النَّدَامَۃَ لَمَّا رَاۤءُ الْعَذَابَ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْۤ اَعْنَاقِ

پچھانے لگے جب دیکھ لیا عذاب، اور ہم نے ڈالے ہیں طوق گردنوں میں

الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۖ هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۳۳

منکروں کے، وہی بدلہ پاتے ہیں جو عمل کرتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور یہ لوگ قیامت کے متعلق مضامین صحیح بیننا ربنا ثم یفتح الخ منکر کہتے ہیں

کہ یہ وعدہ کب (واقع) ہوگا اگر تم (یعنی بنی اور آپ کے متبعین) سچے ہو (تو بتلاؤ) آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے واسطے ایک خاص دن کا وعدہ (مقرر) ہے اس سے نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکتے ہو اور نہ آگے بڑھ سکتے ہو (یعنی گو ہم وقت نہ بتلائیں گے جو تم پوچھ رہے مگر آئے گی ضرور جس کا اس پوچھنے سے انکار کرنا تمہارا مقصود ہے) اور یہ کفار (دنیا میں تو خوب خوب باتیں بناتے ہیں اور) کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور نہ اس سے پہلی کتابوں پر اور (قیامت میں یہ ساری لمبی چوڑی باتیں ختم ہو جائیں گی چنانچہ) اگر آپ (ان کی) اس وقت کی حالت دیکھیں (تو ایک ہولناک منظر نظر آئے) جبکہ یہ ظالم اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے ایک دوسرے پر بات ڈالتا ہوگا جیسا کوئی کام بگڑ جانے کے وقت عادت ہوتی ہے چنانچہ) ادنیٰ درجہ کے لوگ (یعنی متبعین) بڑے لوگوں سے (یعنی اپنے مقتداؤں سے) کہیں گے کہ (ہم تو تمہارے سبب برباد ہوئے) اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان لے آئے ہوتے (اس پر) یہ بڑے لوگ ان ادنیٰ درجہ کے لوگوں سے کہیں گے کہ کیا ہم نے تم کو ہدایت (پر عمل کرنے) سے (زبردستی) روکا تھا اور اس کے کہ وہ (ہدایت) تم کو پہنچ چکی تھیں نہیں بلکہ تم ہی قصور وار ہو (کہ حق کے ظاہر ہونے کے بعد بھی اس کو قبول نہ کیا، اب ہمارے سر دھرتے ہو) اور (اس کے جواب میں) یہ کم درجہ کے لوگ ان بڑے لوگوں سے کہیں گے کہ (ہم یہ نہیں کہتے کہ تم نے زبردستی کی تھی) نہیں، بلکہ تمہاری رات دن کی تدبیروں نے روکا تھا جب تم ہم سے فراموش کرتے رہتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لئے شریک قرار دیں (تدبیر سے مراد ترغیب و ترہیب ہی، یعنی رات دن کی ان تعلیمات اور ان تدبیرات کا اثر ہو گیا، اور تباہ و برباد ہوئے۔ پس ہم کو تم ہی نے خراب کیا) اور (اس گفتگو میں تو ہر شخص دوسرے پر الزام دے گا، مگر دل میں اپنا اپنا قصور بھی سمجھیں گے۔ مصلحتیں سمجھیں گے کہ واقعی ہم نے ایسا کیا تو تھا اور ضالین سمجھیں گے کہ گواہوں نے ہم کو غلط راستہ بتلایا تھا، لیکن آخر ہم بھی تو اپنا نفع نقصان سمجھ سکتے تھے، ضرور ہمارا بھی بلکہ زیادہ ہمارا ہی قصور ہو گیا) وہ لوگ (اپنی اس) پشیمانی کو (ایک دوسرے سے) مخفی رکھیں گے جبکہ (اپنے اپنے عمل پر) عذاب (ہوتا ہوا) دیکھیں گے (تاکہ نقصان مایہ کے ساتھ شہادت ہمسا یہ نہ ہو، لیکن آخر میں شدت عذاب سے وہ تحمل جاتا رہے گا) اور ان سب کو مشترک یہ عذاب دیا جائے گا کہ ہم کافروں کی گردلوں میں طوق ڈالیں گے (اور ہاتھ پاؤں میں زنجیر پھر مشکیں کسا ہوا جہنم میں جھونک دیا جائے گا) جیسا کرتے تھے ویسا ہی تو بھرا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ

اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا گر کہنے لگے وہاں کے آسودہ لوگ جو تمہارے ہاتھ بھیجا گیا

بِهِ كِفْرُونَ ﴿٣٢﴾ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا ۖ وَمَا نَحْنُ

ہم اس کو نہیں مانتے۔ اور کہنے لگے ہم زیادہ ہیں مال اور اولاد میں، اور ہم پر آفت

بِمُعَدَّيْنِ ۝٣٥ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ

نہیں آنے والی ، تو کہہ میرا رب ہی جو کشادہ کر دیتا ہے روزی جسکو چاہی اور ماپ کر دیتا ہے

وَلَكِنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾ وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا

لیکن بہت لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ اور تمھارے مال اور تمھاری اولاد

أَوْلَادُكُمْ يَا لَيْتِي تُقَرُّ بِكُمْ عِنْدَ نَارِ لُغْيَ إِلَّا مَنْ أَمِنَ وَعَمِلَ

وہ نہیں کہ نزدیک کر دیں ہمارے پاس تمہارا درجہ پر جو کوئی یقین لایا اور بھلا

صَالِحًا زَاوَا لِيَعْلَمَ لَهُمْ جَزَاءُ الضَّعْفِ بِسَاعِدِلَوْا وَهُمْ فِي

کام کیا سو ان کے لئے ہے بدلہ دونا ان کے کئے کام کا اور وہ بھروسوں

الْعُرْفِ اٰمِنُوْنَ ﴿٣٤﴾ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْ اٰيٰتِنَا مُعْجِزِيْنَ

یہیں بیٹھے ہیں دل جمعی سے، اور جو لوگ دوڑتے ہیں ہماری آیتوں کے ہزارے کو

أُولَئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ ﴿٣٨﴾

مِنْكَ مَالًا وَاعْرِضْكَ نَفَرًا) اور یہ دلیل ہے ہمارے مکرم و مقبول عند اللہ ہونے کی پس ہم کو کبھی عذاب نہ ہوگا اور یہی بات کفار کہہتے ہیں مگر اَلَّذِينَ كَفَرُوا وَالَّذِينَ آمَنُوا اَسَى الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَّتَقَامًا، پس غم نہ کیجئے، البتہ ان کے قول کو رد کیجئے اور ان سے یوں کہہ دیجئے کہ وسعتِ رزق کا مدار قبول عند اللہ نہیں ہے، بلکہ محض مشیت ہے، چنانچہ میرا پروردگار جس کو چاہتا ہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے (اور اس میں حکمتیں ہوتی ہیں، لیکن اکثر لوگ (اس سے) واقف نہیں کہ مدار اس کا دوسری مصلحتوں پر قبولیت عند اللہ پر نہیں ہے) اور (اے کفار یہ بھی سن رکھو کہ جس طرح تمہارے اموال و اولاد دلیل و علامت قرب عند اللہ کے نہیں اسی طرح) تمہارے اموال و اولاد ایسی چیزیں نہیں جو تم کو درجہ میں ہمارا مقرب بنا دے (یعنی مؤثر و علت قرب کی بھی نہیں پس نہ اموال و اولاد قبولیت پر مقرب ہیں، اور نہ اموال و اولاد پر قبولیت مرتب ہے) ہاں مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے (یہ دونوں چیزیں البتہ سببِ قرب ہیں) سو ایسے لوگوں کے لئے ان کے (نیک) عمل کا دونا صلہ ہے (یعنی عمل سے زیادہ خواہ دوئے سے بھی زیادہ لقولہ تعالیٰ مَنْ جَاءَ بِحَسَنَةٍ فَلَهُ عَشْرُ مِثَالِهَا) اور وہ (بہشت کے) بالائخانوں میں چین سے رہیں گے اور جو لوگ (ان کے خلاف محض اموال و اولاد پر مغرور ہیں اور ایمان و عمل صالح کو اختیار نہیں کرتے بلکہ وہ) ہماری آیتوں کے متعلق (ان کے ابطال کی) کوشش کر رہے ہیں (نبی کو) ہرانے کے لئے ایسے لوگ عذاب میں لائے جائیں گے۔

معارف و مسائل

دنیا کی دولت و عزت کو | ابتداء دنیا سے دنیا کی دولت اور عیش و عشرت کے نشہ میں مخمور
مقبولیت عند اللہ کی دلیل | ہونے والوں نے ہمیشہ حق کی آواز کی مخالفت اور انبیاء و صلحاء سے
سمجھنے کا قدیم شیطانی فریب | عداوت کا طریقہ اختیار کیا ہے، اَلَا مَا شَاءَ اللہ، اس پر طرہ یہ کہ
وہ اہل حق کے مقابلہ میں اپنی موجودہ حالت پر مگن اور مطمئن ہونے کی یہ دلیل بھی
دیتے تھے کہ اگر ہمارے اعمال و عادات اللہ کو پسند نہ ہوتے تو ہمیں دنیا کی دولت عزت
حکومت کیوں دیتے؟ قرآن کریم نے اس کا جواب متعدد آیات میں مختلف عنوانات
دیا ہے۔ آیات مذکورہ کا نزول بھی اسی طرح کے ایک واقعہ سے متعلق اور اس لغو
دلیل کا جواب ہے۔

حدیث میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں دو شخص ایک کاروبار میں شریک تھے،

پھر ان میں سے ایک یہ جگہ چھوڑ کر کسی ساحلی علاقہ میں چلا گیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، آپ کی نبوت و رسالت کا چرچا ہوا تو ساحلی ساتھی نے مکی ساتھی کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ ان کے دعوائی نبوت کا تم لوگوں نے کیا اثر لیا؟ اس پر مکی ساتھی نے جواب لکھا کہ قریش میں سے تو کوئی بھی ان کا تابع نہیں ہوا، صرف غریب مسکین بے حیثیت لوگ ان کے پیچھے لگے ہیں۔ ساحلی ساتھی وہاں کی اپنی تجارت چھوڑ کر مکہ مکرہ آیا، اور اپنے ساتھی سے کہا کہ مجھے ان کا پتہ بتلاؤ جو نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ ساحلی ساتھی کچھ کتب قدیمہ تورات و انجیل وغیرہ کا مطالعہ کیا کرتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور دریافت کیا کہ آپ کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں؟ آپ نے اپنی دعوت اسلام کے اہم اجزاء کا ذکر فرمایا، دعوت اسلام کو آپ کی زبان مبارک سے سنتے ہی اس نے کہا اَشْهَدُ اَنْكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ، یعنی میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ اس نے عرض کیا کہ (آپ کی دعوت کا حق ہونا تو عقل سے سمجھا اور اس کی علامت یہ دیکھی کہ) جتنے انبیاء علیہم السلام پہلے آئے ہیں سب کے ماننے والے ابتداء میں قوم کے غریب و فقیر دنیا میں کم حیثیت لوگ ہوتے ہیں، اس پر یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی مَا اَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ مِّنْ يَّرِاْ اِلَّا قَالِ مُتَرَفُوْهَا (ابن کثیر و مظہری) مُتَرَفٌ، تَرَفٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی ناز و نعمت کی فراوانی کے آتے ہیں۔ مُتَرَفِيْنَ سے مراد اغنیاء اور مالدار اور قوم کے رؤساء ہیں۔ قرآن کریم نے مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں فرمایا ہے کہ جب کبھی ہم نے کوئی رسول بھیجا ہو تو مال و دولت کے نشر اور ناز و نعمت میں پلے ہوئے لوگوں نے اس کا مقابلہ کفر و انکار ہی سے کیا ہے۔

دوسری آیت میں اُن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ نَحْنُ اَمْوَاْلَا وَّ اَوْلَادَا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَدِّيْنَ، یعنی ہم تم سے مال و دولت میں بھی زیادہ اولاد میں بھی زیادہ، اس لئے ہم عذاب میں مبتلا نہیں ہو سکتے « (بظاہر اُن کے قول کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہم قابل عذاب ہوتے تو ہمیں اتنی دولت و عزت کیوں دیتا، قرآن کریم نے تیسری اور چوتھی آیت میں اُن کا یہ جواب دیا ہے قُلْ اِنْ رَّبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ اور مَا اَمْوَالُكُمْ وَّلَا اَوْلَادُكُمْ اِلَّا مَتَاعٌ، خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ دنیا میں مال و دولت یا عزت و جاہ کی کمی بیشی اللہ کے نزدیک مقبول یا مردود ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ تکوینی مصالح کے پیش نظر دنیا میں تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے مال و دولت و فراوانی کے ساتھ دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے، جس کی تکوینی حکمت

کو وہی جانتا ہے، مگر مال و اولاد کی بہتات کو اللہ کے نزدیک مقبولیت کی دلیل سمجھنا جہالت ہے، کیونکہ اس کے نزدیک مقبولیت کا مدار صرف ایمان اور عمل صالح پر ہے جس کو یہ حامل نہیں مال و اولاد کتنا ہی زیادہ ہو وہ اس کو اللہ کے نزدیک مقبول نہیں بنا سکتا۔

اسی مضمون کو قرآن کریم نے متعدد آیات میں بیان فرمایا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے اَيَحْسَبُونَ اَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَبَنِينَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِى الْخَيْرَاتِ بَلْ لَا يَشْعُرُونَ، یعنی کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم جو مال اور اولاد کی بہتات سے ان کی امداد کرتے ہیں یہ کچھ ان کے لئے انجام و آخرت کے اعتبار سے خیر ہے رہ کر نہیں، بلکہ یہ لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں کہ جو مال و اولاد انسان کو اللہ سے غافل کرے وہ اس کے لئے وبال ہے۔

دوسری آیت میں فرمایا فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ اَلَّذِى لَا يُؤْتِهِمْ اَنْفُسَهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ، یعنی ان کافروں کے مال و اولاد سے آپ تعجب نہ کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کو اسی مال و اولاد کے ذریعے دنیا میں مبتلا کرے عذاب کر دے، اور انجام کار ان کی جان اسی حالت کفر میں بکھل جائے جس کا نتیجہ آخرت کا دائمی عذاب ہو۔ مال و اولاد کے ذریعے دنیا میں عذاب دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں مال و دولت کی محبت میں ایسے مبتلا ہو جائیں کہ اپنے انجام اور خدا و آخرت کی طرف کبھی التفات نہ ہو جس کا انجام دائمی عذاب ہے، اور بہت سے مال و اولاد والوں کو اس دنیا میں بھی مال و اولاد ہی کی خاطر بلکہ انہی کے ذریعے ہزاروں مصائب و تکالیف بھیلنے پڑتی ہیں، ان کی سزا و عذاب تو اسی عالم سے شروع ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو اور تمہارے اموال کو نہیں دیکھتا، وہ تو تمہارے دلوں کو اور اعمال کو دیکھتا ہے (رواہ احمد، ابن کثیر)

فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضَّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِى الْغُرٰٓفَاتِ اٰمُوْنَ، یہ ایمان و عمل صالح والوں کا حال بتلایا گیا ہے، کہ اللہ کے نزدیک مقبول یہی لوگ ہیں، دنیا میں کوئی ان کی قدر پہچانے یا نہ پہچانے، آخرت میں ان کو جزا سے ضعف ملے گی۔ ضعف بکسر ضا د مصدر ہے جس کے معنی ایک شے کے مثل یا امثال کے آتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں دولت والے اپنی دولت کو بڑھانے میں لگے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کی جزا کو آخرت میں بڑھا دیں گے، کہ ایک عمل کی جزا اس کے مثل امثال ہوں گے، اور اس میں بھی منحصر نہیں اس کے اخلاص عمل اور دوسرے اسباب کے ایک عمل کی جزا اس کے سات سو گنا تک ملنا

بھی احادیث صحیحہ میں ثابت ہے۔ اور اس میں بھی حصر نہیں، اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے، اور یہ لوگ جنت کے غرفوں میں مامون اور ہمیشہ کے لئے ہر بخ و غم سے محفوظ رہیں گے۔ غرفات غرفہ کی جمع ہے، مکان کا جو حصہ دوسرے حصوں سے ممتاز اور اعلیٰ سمجھا جائے اس کو غرفہ کہتے ہیں (منظری)۔

قُلْ إِنْ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ وَمَا

تو کہ میرا رب ہر جو کشادہ کر دیتا ہے روزی جس کو چاہے اپنے بندوں میں اور پکڑ دیتا ہے اور

أَنْفَقَ مِنْ شَيْءٍ فَهُمْ يَخْلِفُوهُ وَهُوَ خَيْرُ الرَّزِقِينَ (۳۹)

جو خرچ کرتے ہو کچھ چیز وہ اس کا عوض دیتا ہے اور وہ بہتر ہے روزی دینے والا۔

خلاصہ تفسیر

آپ (مؤمنین سے) یہ فرما دیجئے کہ میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے فراخ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہے تنگی دیتا ہے اور (خرچ میں امساک اور بخل سے رزق بڑھ نہیں سکتا، اور شریعت کے مطابق خرچ کرنے سے گھٹ نہیں سکتا، اس لئے تم مال سے دل نہ لگاؤ بلکہ جہاں جہاں اللہ کے حقوق اور اپنے عیال کے حقوق اور فقراء و مساکین وغیرہ میں خرچ کرنے کا حکم ہے بے دھڑک خرچ کرتے رہو، کہ اس سے رزق مقسوم و مقدر میں تو کسی کمی کا ضرر نہ ہوگا اور آخرت میں اس سے نفع حاصل ہوگا، کیونکہ جو چیز ہم (حکیم خداوندی کے مواقع میں) خرچ کر دو گے تو اللہ تعالیٰ اس کا آخرت میں تو ضرور اور اکثر دنیا میں بھی بدلہ دے گا اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔

معارف و مسائل

یہ آیت تقریباً اپنی الفاظ کے ساتھ ادھر گزری ہے (قُلْ إِنْ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ) یہاں بظاہر یہی مضمون مکرر آیا ہے مگر ایک فرق کے ساتھ کہ اس جگہ مَنْ يَشَاءُ کے بعد مِنْ عِبَادِهِ اور يَقْدِرُ کے بعد لَهُ کا اضافہ ہے۔ مَنْ عِبَادِهِ کے لفظ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ حکم اپنے مخصوص بندوں یعنی مؤمنین کے لئے ارشاد ہوا ہے، اور مقصود اس سے یہ ہے کہ ایمان والے مال کی محبت میں ایسے نہ لگیں کہ اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے حقوق و مواقع

میں خرچ کرنے سے دل تنگ ہونے لگیں اور اس سے پہلی جو آیت اسی مضمون کی آئی ہے اس کا خطاب کفار و مشرکین کو تھا جو دنیا کے مال و اولاد پر فخر کرتے اور ان کو اپنی آخرت کی فلاح کی دلیل بتاتے تھے۔ اس طرح مخاطب اور مقصود کلام کے اعتبار سے تکرار نہ رہا، خلاصہ تفسیر میں جو شروع آیت کی تفسیر میں مومنین کا لفظ بڑھایا ہے یہ اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اور بعض حضرات نے ان دونوں آیتوں میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ پہلی آیت میں تو مختلف انسانوں میں تقسیم رزق کا ذکر تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مصالح عالم کے پیش نظر کسی کو مال زیادہ کسی کو کم دیتے ہیں، اور اس آیت میں ایک ہی شخص کے مختلف احوال کا ذکر ہے کہ ایک شخص کو کبھی مال کی فراخی اور وسعت عطا ہوتی ہے، کبھی اسی کو تنگی اور تنگ دستی بھی پیش آتی ہے۔ لفظ کہ جو اس آیت میں یقید کے بعد آیا ہے اس میں اس طرف اشارہ نکلتا ہے اس تقریر کے مطابق بھی تکرار نہ رہا بلکہ پہلی آیت مختلف افراد کے متعلق اور یہ آیت ایک ہی فرد کے مختلف احوال کے متعلق ہو گئی۔

وَمَا آتَيْنَاكَ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُ۔ اس آیت کے لفظی معنی یہ ہیں کہ تم جو چیز بھی خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ نجیب سے تمہیں اس کا بدلہ دیدیتے ہیں، کبھی دنیا میں اور کبھی آخرت میں اور کبھی دونوں میں۔ کائنات عالم کی تمام چیزوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ آسمان سے پانی نازل ہوتا ہے انسان اور جانور اس کو بے دھڑک خرچ کرتے رہتے ہیں، کھیتوں اور درختوں کو سیراب کرتے ہیں وہ پانی ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا اس کی جگہ اور نازل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زمین سے کنواں کھود کر جو پانی نکالا جاتا ہے اس کو جتنا نکال کر خرچ کرتے ہیں اس کی جگہ دوسرا پانی قدرت کی طرف سے جمع ہو جاتا ہے، انسان غذا کھا کر بظاہر ختم کر لیتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسری غذا جمیا کر دیتے ہیں، بدن کی نقل و حرکت اور محنت سے جو اجزاء تحلیل ہو جاتے ہیں ان کی جگہ دوسرے اجزاء بدل مایتحلل بن جاتے ہیں۔ غرض انسان دنیا میں جو چیز خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی عام عادت یہ ہے کہ اس کے قائم مقام اسی جیسی دوسری چیز دیدیتے ہیں، کبھی کسی کو سزا دینے کے لئے یا کسی دوسری تکوینی مصلحت سے اس کے خلاف ہو جاتا اس ضابطہ الہیہ کے منافی نہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر روز جب لوگ صبح میں داخل ہوتے ہیں دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں اور یہ دعاء کرتے ہیں اَللّٰهُمَّ اعْطِ مَنْفَقًا خَلْفًا وَاَعْطِ مَسْجَا تَلْفًا، یعنی یا اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا فرما اور بخل کرنے والے کا مال ضائع کر دے، اور ایک دوسری حدیث میں ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ارشاد فرمایا ہے کہ آپ لوگوں پر خرچ کریں میں آپ خرچ کروں گا۔

جو خرچ شریعت کے مطابق نہ ہو | حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک کام صدقہ ہے، اور کوئی آدمی جو اپنی نفس یا اپنے عیال پر خرچ کرتا ہے وہ بھی صدقہ کے حکم میں ہے موجب ثواب ہے، اور جو شخص کچھ خرچ کر کے اپنی آبرو بچائے وہ بھی صدقہ ہے، اور جو شخص اللہ کے حکم کے مطابق کچھ خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا ہے کہ اس کا بدل اس کو دے گا، مگر وہ خرچ جو در فضول زائد از ضرورت) تعمیر میں یا کسی گناہ کے کام میں کیا ہو اس کے بدل کا وعدہ نہیں۔

حضرت جابرؓ کے شاگرد ابن المنکدر نے یہ حدیث سن کر ان سے پوچھا کہ آبرو بچانے کے لئے خرچ کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ جس شخص کے متعلق یہ خیال ہو کہ نہیں دیں گے تو عیب جوئی کرے گا، بُرا کہتا پھرے گا یا بدگوئی کرے گا اس کو اپنی آبرو بچانے کے لئے دینا مراد ہے (رواہ الدارقطنی، قرطبی)

جس چیز کا خرچ گھٹ جاتا ہے | اس آیت کے اشارہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو اشیا اس کی پیداوار بھی گھٹ جاتی ہے | صرف انسان اور حیوانات کے لئے پیدا فرمائی ہیں، جب تک وہ خرچ ہوتی رہتی ہیں ان کا بدل منجانب اللہ پیدا ہوتا رہتا ہے، جس چیز کا خرچ زیادہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی پیداوار بھی بڑھا دیتے ہیں۔ جانوروں میں بکرے اور گائے کا سب سے زیادہ خرچ ہے کہ ان کو ذبح کر کے گوشت کھایا جاتا ہے، اور شرعی قربانیوں اور کفارات و جنایات میں ان کو ذبح کیا جاتا ہے، وہ جتنے زیادہ کام آتے ہیں اللہ تعالیٰ اتنی ہی زیادہ اس کی پیداوار بڑھا دیتے ہیں جس کا ہر جگہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ بکروں کی تعداد ہر وقت چھری کے نیچے رہنے کے باوجود دنیا میں زیادہ ہر کتے بلی کی تعداد اتنی نہیں، حالانکہ کتے بلی کی نسل بظاہر زیادہ ہونی چاہئے کہ وہ ایک ہی پیٹ سے چار پانچ بچے تک پیدا کرتے ہیں اگر بکری زیادہ سے زیادہ دُوبچے دیتی ہے، گائے بکری ہر وقت ذبح ہوتی رہتی ہے، کتے، بلی کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا، مگر پھر یہ مشاہدہ ناقابل انکار ہے کہ دنیا میں گائے اور بکروں کی تعداد بہ نسبت کتے بلی کے زیادہ ہے۔ جب سے ہندوستان میں گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگی ہے اس وقت سے وہاں گائے کی پیداوار اسی نسبت سے گھٹ گئی ہے، ورنہ ہر بستی اور ہر گھر گایوں سے بھرا ہوا ہوتا جو ذبح نہ ہونے کے سبب بچی رہیں۔

عرب نے جب سے سواری اور بار برداری میں اونٹوں سے کام لینا کم کر دیا وہاں

اونٹوں کی پیداوار بھی گھٹ گئی، اس سے اس لمحہ شبہ کا ازالہ ہو گیا جو احکام قربانی کے مقابلہ میں اقتصادی اور معاشی تنگی کا اندیشہ پیش کر کے کیا جاتا ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَهْلُوا لِي يَا كُمْ

اور جس دن جمع کرے گا ان سب کو پھر کے گا فرشتوں کو کیا یہ لوگ تم کو بوجا

گانو اَعْبُدُون (۴۰) قَالُوا سُبْحَانَكَ أَنْتَ وَلِيِّنَا مَنْ دُونِهِمْ

کرتے تھے ؟ وہ کہیں گے پاک ذات ہر تیری ہم تیری طرف میں ہیں ان کی طرف میں نہیں

بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ (۴۱) قَالِيَوْمَ

پر پوجتے تھے جنوں کو یہ اکثر انہی پر اعتقاد رکھتے تھے۔ سو آج تم

لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَفَعًا وَلَا ضَرًّا وَنَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا

مالک نہیں ایک دوسرے کے بھلے کے نہ بُرے کے، اور کہیں گے ہم اُن گنہگاروں کو

ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ (۴۲)

چکھو تکلیف اس آگ کی جسکو تم جھوٹ بتلاتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور وہ دن قابل ذکر ہے، جس روز اللہ تعالیٰ ان سب کو (میدان قیامت میں) جمع فرمائے گا، پھر فرشتوں سے ارشاد فرمائے گا کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کیا کرتے تھے (ملائکہ سے یہ سوال مشرکین کو لا جواب کرنے کے لئے ہو گا، جو ملائکہ اور غیر ملائکہ کو اس خیال سے پوجتے تھے کہ یہ راضی ہو کر ہماری شفاعت کریں گے، جیسے ایک آیت میں اسی طرح کا سوال حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا ہے، اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ - مطلب سوال کا یہ ہے کہ کیا تمہاری رضا سے تمہاری عبادت کیا کرتے تھے، و نیز جواب میں بھی اسی قید کا قرینہ ہے جیسا ترجمہ جواب معلوم ہو گا) وہ (اول حق تعالیٰ کا شریک سے بالاتر اور پاک ہونا ظاہر کرنے کے لئے) عرض کریں گے کہ آپ (شریک سے) پاک ہیں (یہ جواب پہلے اس لئے کہا گیا کہ ان کی طرف جو نسبت الی الشریک کی حکایت کی گئی ہے اس سے گہرا پہلے یہ جملے عرض کئے پھر آگے اس سوال کا جواب یہ دیں گے کہ) ہمارا تو (محض) آپ سے تعلق ہے نہ کہ ان سے (اس سے

رضا اور مردوں کی نفی ہو گئی۔ یعنی نہ ہم نے ان سے کہا نہ ہم ان کے فعل سے راضی ہم تو آپ کے مطیع ہیں جو چیز آپ کو ناپسند ہو مثل شرک وغیرہ اس سے ہم بھی ناخوش ہیں، جب اس شرک میں نہ ہمارا امر ہے نہ رضا تو فی الواقع یہ ہماری عبادت نہ کرتے تھے، بلکہ یہ لوگ شیاطین کو پوجا کرتے تھے کیونکہ شیاطین ہی اس کی ترغیب بھی دیتے تھے اور اس سے راضی بھی تھے اس لئے وہی ان کے معبود ہوئے۔ کیونکہ عبادت مستلزم ہے اطاعت مطلقہ کو کہ اس کے سامنے اور کسی کی اطاعت نہ کرے، اسی طرح ایسی اطاعت مطلقہ مستلزم ہے عبادت کو پس جب ہماری طرف سے امر و رضا تحقق نہیں تو ہماری اطاعت نہ ہوئی، اور جب شیاطین کی اطاعت مطلقہ کی تو عبادت بھی درحقیقت انہی کی ہوئی، گو یہ لوگ اس کا نام کچھ ہی رکھیں، عبادت ملائکہ کہیں یا بتوں کی عبادت مگر واقع میں وہ عبادت شیاطین ہی کی ہے اور جیسا تقریر مذکور سے ان لوگوں کا عابد شیاطین ہونا لازم آیا اسی طرح ان میں اکثر لوگ (التراما بھی) انہی (شیاطین) کے معتقد تھے (یعنی قصداً بھی بہت سے ان کو پوجتے تھے، جیسے سورۃ جن کی آیت میں ہے وَرَأَوْنَهُمْ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِنَ الْاٰیَاتِ) سو کافروں سے کہا جائے گا کہ جن سے تم امیدیں رکھتے تھے (آج) خود ان کی اس برأت سے بھی اور ان کے عجز و بے بسی سے بھی تمھارے گمان کے خلاف یہ حالت ظاہر ہوئی کہ تم (مجموع عابدین و معبودین) میں سے نہ کوئی کسی کو نفع پہنچانے کا اختیار رکھتا ہے اور نہ نقصان پہنچانے کا (مطلب تو یہ ہے کہ یہ معبودین تم کو نفع نہیں پہنچا سکتے، مگر مبالغہ کے لئے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ سے تعبیر فرمایا تاکہ اس ابہام سے دونوں کی برابری اس امر میں ثابت ہو جائے کہ جیسی تم عاجز ہو وہ بھی عاجز ہیں اور ضرر کا ذکر تعجیم عجز کے لئے ہے اس سے کلام اور بھی موکد ہو گیا) اور (اُس وقت) ہم ظالموں (یعنی کافروں) سے کہیں گے کہ جس دوزخ کے عذاب کو تم جھٹلایا کرتے تھے (اب) اس کا مزہ چکھو۔

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا یَنْتَوٰی وَاَقَالُوْا مَا هٰذَا اِلَّا رَجُلٌ یَّرِیْدُ

اور جب پڑھی جائیں ان کے پاس ہماری آیتیں کھلی کھلی کہیں اور کچھ نہیں مگر یہ ایک مرد ہو چاہتا ہو

اَنْ یَّصُدَّكُمْ عَنْ مَا کَانَ یَعْبُدُ اَبَاؤُكُمْ وَاَقَالُوْا مَا هٰذَا اِلَّا

کہ روک دے تم کو ان سے جن کو پوجتے رہی تمھارے باپ دادے، اور کہیں اور کچھ نہیں یہ

إَفْكَ مُفْتَرًى وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ إِنَّ هَذَا

جھوٹ ہی باندھا ہوا، اور کہتے ہیں منکر حق بات کو جب پہنچے اُن تک اور کچھ نہیں یہ

إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۳۳﴾ وَمَا آتَيْنَاهُمْ مِنْ كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا وَمَا

ایک جادو ہے صریح۔ اور ہم نے دی نہیں ان کو کچھ کتابیں کہ جن کو وہ پڑھتے ہوں اور

أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَذِيرٍ ﴿۳۴﴾ وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ

بھیجا نہیں ان کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا۔ اور جھٹلایا ہے ان سے

قَبْلِهِمْ ۚ وَمَا بَلَغُوا مَعَشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۚ

اگلوں نے اور یہ نہیں پہنچے دسویں حصہ کو اس کے جو ہم نے ان کو دیا تھا پھر جھٹلایا انھوں نے میرے بھیجے ہوؤں کو

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿۳۵﴾ قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ أَنْ تَقُومُوا

تو کیسا ہوا انکار میرا۔ تو کہہ میں تو ایک ہی نصیحت کرتا ہوں تم کو کہ اٹھ کھڑے ہو

لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفِرَادًى ثُمَّ تَتَفَكَّرُونَ ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ ۚ

اللہ کے نام پر دو دو ایک ایک پھر دھیان کرو کہ اس تمہارے رفیق کو کچھ سورا نہیں

إِنَّ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ﴿۳۶﴾

یہ تو ایک ڈرانے والا ہے تم کو ایک بڑی آفت کے آنے سے۔

قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۚ إِنِ اجْتَبَىٰ إِلَا عَٰلَ

تو کہہ جو میں نے تم سے مانگا ہو کچھ بدلہ سودہ تم ہی رکھو میرا بدلہ ہے اُسی

اللَّهِ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۳۷﴾ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَقْذِفُ بِالْحَقِّ

اللہ پر اور اس کے سامنے ہے ہر چیز۔ تو کہہ میرا رب پھینک رہا ہے سچا دین

عَلَامُ الْغُيُوبِ ﴿۳۸﴾ قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِيهِ الْبَاطِلُ ۚ وَمَا يُعِيدُ

اور وہ جانتا ہی چھپی چیزیں۔ تو کہہ آیا دین سچا اور جھوٹ تو کسی چیز کو نہ پیدا کرے اور نہ بھیر کر لائے۔

قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۚ وَإِنِ اهْتَدَيْتُ

تو کہہ اگر میں بہکا ہوا ہوں تو بہکوں گا اپنے ہی نقصان کو اور اگر ہوں سیدھے راستہ پر

فَيَسْأَلُ رَجُلًا إِلَىٰ رَبِّهِ أَتَىٰ سَمِيعٌ قَرِيبٌ ۝۵

تو اس سبب کے کہ وحی بھیجتا ہے مجھ کو میرا رب بیشک سب کچھ سنا ہی نزدیک ہے

خلاصہ تفسیر

اور جب ان لوگوں کے سامنے ہماری آیتیں جو (حق اور ہادی ہونے کی صفت میں) صاف صاف ہیں پڑھیں جاتی ہیں تو یہ لوگ (پڑھنے والے یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت) کہتے ہیں کہ (نحوہ باللہ) یہ محض ایک ایسا شخص ہی جو یوں چاہتا ہے کہ تم کو ان چیزوں (کی عبادت) سے باز رکھے جن کو (قدیم سے) سمجھا لے بڑے پوجتے (آ رہے) تھے (اور ان سے باز رکھ کر اپنا تابع بنانا چاہتا ہے۔ مطلب ان کم بختوں کا یہ تھا کہ یہ نبی نہیں اور ان کی دعوت منجانب اللہ نہیں بلکہ اس میں خود ان کی ذاتی غرض اپنی ریاست کی ہے) اور (قرآن کی نسبت) کہتے ہیں کہ (نحوہ باللہ) یہ محض ایک تراشا ہوا جھوٹ ہے (یعنی خدا کی طرف اس کی نسبت کرنا محض تراشی ہوئی بات ہے) اور یہ کافر اس (مرحق یعنی قرآن) کی نسبت جبکہ وہ ان کے پاس پہونچا داس اعتراض کے جواب کے لئے کہ اگر یہ تراشا ہوا جھوٹ ہے تو پھر بہت سے عاقل اس کا اتباع کیوں کرتے ہیں اور یہ ایسا موثر کیوں ہے) یوں کہتے ہیں کہ یہ محض ایک صریح جادو ہے جس اس کو سن کر لوگ مغلوب (العقل اور فریفتہ ہو جاتے ہیں) اور ان کو تو قرآن کی اور نبی کی بڑی قدر کرنا چاہئے تھی، کیونکہ ان کے لئے تو یہ محض غیر مترقبہ نعمتیں تھیں اس سبب کے کہ ہم نے (اس قرآن سے پہلے) ان کو کبھی آسمانی کتابیں نہیں دی تھیں کہ ان کو پڑھتے پڑھاتے ہوں جیسے بنی اسرائیل کے پاس کتابیں تھیں تو ان کے حق میں تو قرآن بالکل ایک نئی چیز تھی، اس لئے اس کی قدر کرنا چاہئے تھا (اور اسی طرح) ہم نے آپ سے پہلے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا (یعنی پیغمبر) نہیں بھیجا تھا تو ان کے حق میں نبی بھی ایک نئی دولت تھی، اس لئے ان کی بھی قدر کرنا چاہئے تھی۔ خصوصاً جبکہ علاوہ نعمت جدیدہ ہونے کے خود ان کی تمنا بھی تھی کہ ان کے پاس کوئی نبی آئے تو یہ اس کا اتباع کریں جیسا اس آیت میں ہے **وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَهُمْ مِنْ نَبِيٍّ لِّكُونُوا مِنْ أَهْلِ الْوَيْلِ إِلَيْهِمْ** مگر ان لوگوں نے پھر بھی قدر نہ کی، لہذا قال تعالیٰ **فَلَمَّا جَاءَهُمْ مِنْ نَبِيٍّ لِّكُونُوا مِنْ أَهْلِ الْوَيْلِ إِلَيْهِمْ** بلکہ تکذیب کی) اور یہ لوگ تکذیب کر کے بے فکر نہ ہو بیٹھیں کیونکہ تکذیب کا وبال بڑا سخت ہے چنانچہ ان سے پہلے جو (کافر) لوگ تھے انھوں نے (بھی انبیاء اور وحی کی) تکذیب کی تھی اور یہ (مشرکین عرب) تو اس سامان کے جو ہم نے اُن کو دے رکھا تھا دسویں

آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں نے تم سے اس تبلیغ پر کچھ معاوضہ مانگا ہو تو وہ تمہارا ہی رہا یعنی تم اپنے ہی پاس رکھو یہ محاورہ نفی ہے طلب اجر کی بطریق مبالغہ میرا معاوضہ تو بس (حسب وعدہ فضل) اللہ ہی کے ذمہ ہو اور وہی ہر چیز پر اطلاع رکھنے والا ہے پس وہ آپ ہی میرے حال کے لائق مجھ کو اجر دیدیں گے معاوضہ میں مال اور جاہ یعنی ریاست سب آگیا۔ کیونکہ اعیان و اعراض دونوں میں اجر بننے کی صلاحیت ہے، مطلب یہ کہ میں تم سے کسی غرض کا طالب نہیں ہوں جو شبہ ریاست کا کیا جائے۔ رہا یہ معاملہ کہ میں لوگوں کے معاملات اور حالات کی اصلاح کرتا ہوں، مجرم کو سزا دیتا ہوں، باہمی جھگڑوں میں فیصلہ کرتا ہوں تو یہ موجب شبہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ اس میں میری کوئی غرض نہیں۔ چنانچہ آپ کے طرز معاشرت اور معیشت سے صاف ظاہر ہے کہ ان چیزوں سے آپ نے کوئی ذاتی منفعت حاصل نہیں کی بلکہ خود قوم ہی کا نفع تھا کہ ان کی جان، مال، آبرو محفوظ رہتے تھے۔ باپ جو اپنے چھوٹے بچوں کی حفاظت اور ان کی تادیب محض خیر خواہی سے کرتا ہے اس کو خود غرضی اور طلب ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا، جب نبوت بھی ثابت ہو چکی اور شبہ مقامیہ بھی دفع ہو گیا آگے اس کی نفیض کے ابطال کو اس کے اثبات پر متفرع فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب حق بات کو یعنی ایمان اور ثبوت ایمانیات کو باطل یعنی کفر اور انکار ایمانیات، غالب کر رہا ہے (محتاجہ و مکالمہ سے بھی، چنانچہ ابھی دیکھا اور مقاتلہ اور مصارمہ کا بھی سامان کرنے والا ہے، غرض ہر طرح حق غالب ہو اور وہ علام الغیوب ہی (اس کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ حق غالب ہوگا اور دن کو تو اب وقوع کے بعد معلوم ہوا اور اسی طرح اس کو معلوم ہے کہ آئندہ غلبہ بڑھے گا۔ چنانچہ فتح مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اگلی آیت کو پڑھنا کما رواہ ابن کثیر عن اشیخین وغیرہما قرینہ ہے کہ اس مضمون میں جو غلبہ کی خبر دی گئی ہے اس میں غلبہ بالسیف بھی داخل ہے۔ آگے اسی مضمون کی زیادہ توضیح کے لئے ارشاد ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کہہ دیجئے کہ (دین) حق آگیا اور (دین) باطل نہ کرنے کا رہانہ دھرنے کا (یعنی محض گنہ گرا ہوا) اس کا یہ مطلب نہیں کہ اہل باطل کو کبھی شوکت و قوت حاصل ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے اس دین حق کے آنے سے پہلے کبھی باطل پر شبہ حق ہونے کا ہو جایا کرتا تھا اب باطل اس صفت کی حیثیت سے بالکل نیست و نابود ہو گیا۔ یعنی اس کا بطلان خوب ظاہر ہو گیا، اور ہمیشہ قرب قیامت تک یوں ہی ظاہر رہے گا، آگے حق بات کے ثابت اور واضح ہو جانے کے بعد نجات کا اس کے اتہار میں منحصر ہونا بیان فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (جب اس دین کا حق ہونا ثابت ہو گیا

تو اس سے یہ بھی لازم آگیا کہ اگر (بالفرض) میں (اس حق کو چھوڑ کر) گمراہ ہو جاؤں تو میری گمراہی مجھ ہی کو بال ہوگی (دوسروں کا کیا ضروری) اور اگر میں (اس حق کا اتباع کر کے) راہ (راست) پر رہوں تو یہ بدولت اس قرآن (اور دین) کے ہے جس کو میرا رب میرے پاس بھیج رہا ہے اور اصل مقصود مخاطبین کو سنانا ہے کہ باوجود وضوح کے اگر تم نے حق کا اتباع نہ کیا تو تم بھگتو گے میرا کیا بگڑے گا اور اگر راہ پر آگئے تو یہ راہ پر آنا اسی دین حق کے اتباع کی بدولت ہو گا پس تم کو چاہئے کہ راہ راست پر آنے کے لئے اس دین کو اختیار کرو اور گمراہ ہونا کسی کا یا راہ پر آنا خالی نہ جائے گا کہ بے فکری کی گنجائش ہو، بلکہ ہر ایک کا حال اللہ کو معلوم ہے کیونکہ وہ سب کچھ سنتا (اور) بہت نزدیک ہے (وہ ہر ایک کو اس کے مناسب جزا دے گا)۔

معارف و مسائل

وَمَا يَلْعَنُوا إِعْشَارًا مِّمَّا آتَيْنَاهُمْ ، لفظ معشار بعض نے بمعنی عشر کہا ہے۔ یعنی دسواں حصہ اور بعض علماء نے عشر العشر یعنی سوواں حصہ اور بعض نے عشر العشر یعنی ہزارویں حصہ کو معشار کہا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس لفظ میں یہ نسبت عشر کے مبالغہ ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ دنیا کی ثروت و دولت و حکومت اور عرطویل اور صحت قوت وغیرہ جو پچھلی امتوں کو دی گئی تھی اہل مکہ کو اس کا دسواں بلکہ ہزارواں حصہ بھی حاصل نہیں، اس لئے ان کو چاہئے کہ ان پچھلی اقوام کے حالات اور انجام بد سے عبرت حاصل کریں کہ وہ لوگ رسولوں کی تکذیب کر کے خدا تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہوئے اور وہ عذاب آگیا تو ان کی قوت و شجاعت اور مال و دولت اور محفوظ قلعے کچھ کام نہ آ سکے۔

کفار مکہ کو دعوت | اِنَّمَا آخِظْكُمْ بِوَاحِدَةٍ ، اس میں اہل مکہ پر حجت تمام کرنے کے لئے ان کو تحقیق حق کا ایک مختصر راستہ بتلایا گیا ہے کہ صرف ایک کام کر لو کہ اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ دو دو اور ایک ایک اللہ کیلئے کھڑے ہوئے مراد جی کھڑا ہونا نہیں کہ بیٹھے یا لیٹے ہوئے آٹھ کھڑا ہو جائے، بلکہ اس سے مراد محاورہ کے مطابق کام کا پورا اہتمام کرنا ہے۔ اور یہاں قیام کے ساتھ لفظ اللہ بڑھا کر یہ بتلانا منظور ہے کہ خالص اللہ کے راضی کرنے کے لئے پچھلے خیالات و عقائد سے خالی الذہن ہو کر حق کی تلاش میں لگو تا کہ پچھلے خیالات اور اعمال قبول حق کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ اور دو دو یا ایک ایک میں کوئی عدد خاص مقصود نہیں، مطلب یہ ہے کہ غور کرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں، ایک خلوت و تنہائی میں خود غور کرنا، دوسرا اپنے احباب و اکابر سے مشورہ اور باہم بحث و تمحیص کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنا۔ ان دونوں طریقوں کو یا ان میں سے جو پسند ہو اس کو اختیار کرو۔

ثُمَّ تَتَفَكَّرُونَ ۱۲، اس جملہ کا عطف اَنْ تَتَفَكَّرُوا پر ہو جس میں قیام کے مقصد کو واضح کیا گیا ہے کہ سب خیالات سے خالی الذہن ہو کر خالص اللہ کے لئے اس کام کے واسطے تیار ہو جاؤ کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں غور و فکر سے کام لو کہ حق ہے یا نہیں خواہ یہ غور و فکر تنہا تنہا کر دیا دوسروں کے ساتھ مشورہ اور بحث و تمحیص کے ساتھ۔

آگے اس غور و فکر کی ایک واضح راہ بتلائی گئی۔ وہ یہ کہ ایک اکیلا آدمی جس کے ساتھ نہ کوئی طاقتور حجتا اور جماعت ہے نہ مال و دولت کی بہتات وہ اپنی پوری قوم بلکہ پوری دنیا کے خلاف کسی ایسے عقیدہ کا اعلان کرے جو صدیوں سے ان میں راسخ ہو چکا ہے اور وہ سب اس پر متفق ہیں، ایسا اعلان صرف دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ کہنے والا بالکل مجنون دیوانہ ہو جو اپنے نفع نقصان کو نہ سوچے اور پوری قوم کو اپنا دشمن بنا کر مصائب کو دعوت دے، دوسرے یہ کہ اس کی وہ بات سچی ہو کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہے، اس کے حکم کی تعمیل میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔

اب تم خالی الذہن ہو کر اس میں غور کرو کہ ان دونوں باتوں میں کونسی بات واقع میں ہے۔ اس طریقے سے غور کرو گے تو تمہیں اس یقین کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا کہ یہ دیوانے اور مجنون نہیں ہو سکتے ان کی عقل و دانش اور کردار و عمل سے سارا مکہ اور سب قریش واقف ہیں۔ ان کی عمر کے چالیس سال اپنی قوم کے درمیان گزرے، بچپن سے جوانی تک کے سارے حالات ان کے سامنے ہیں کبھی کسی نے ان کے کسی قول و فعل کو عقل و دانش اور سنجیدگی و مبراہنت کے خلاف نہیں پایا، اور صرف ایک کلمہ لاکہ الا اللہ جس کی یہ دعوت دیتے ہیں اس کے سوا آج بھی کسی کو ان کے کسی قول و فعل پر یہ گمان نہیں ہو سکتا، کہ یہ عقل و دانش کے خلاف ہے۔ ان حالات میں یہ تو ظاہر ہو گیا کہ یہ مجنون نہیں ہو سکتے، اسی کا اظہار آیت کے اگلے جملے میں اس طرح فرمایا: مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِسْ میں لفظ صَاحِبُکُمْ سے اس طرف اشارہ ہے کہ کوئی اجنبی مسافر باہر سے آجائے جس کے حالات معلوم نہ ہوں، اس کی کوئی بات پوری قوم کے خلاف نہیں تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ دیوانہ ہے، لیکن یہ تو تمہارے شہر کے رہنے والے تمہاری برادری سے اور دن رات کے تمہارے ساتھی ہیں، جن کی کوئی حالت و کیفیت تم سے مخفی نہیں، اور تم نے بھی کبھی اس سے پہلے ان پر اس طرح کا کوئی شبہ نہیں کیا۔

اور جب پہلی صورت کا نہ ہونا واضح ہو گیا تو دوسری صورت متعین ہو گئی، جس کا ذکر آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے، اِنَّ هُوَ اِلَّا الَّذِیْنَ یُرِکُّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابِ شَرِّیْنَ، یعنی آپ کا حال اس کے سوا نہیں کہ وہ لوگوں کو قیامت کے آنے والے عذاب شدید سے بچانے

کے لئے اس سے ڈرانے والے ہیں۔

إِنَّ رَبِّي يَقْذِرُ بِالْحَقِّ عِلَامَ الْغُيُوبِ، یعنی میرا پروردگار جو علام الغیوب ہو وہ حق کو باطل پر دے مارتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باطل پاش پاش ہو جاتا ہے، لکھا قال تعالیٰ فَإِذَا هُوَ رَاهِقٌ، لفظ قَذَرُ کے لغوی معنی پھینک مارنے کے ہیں، یہاں باطل کے مقابلہ میں حق کو پیش کرنا مراد ہے، اور لفظ يَقْذِرُ سے تعبیر کرنے میں شاید یہ حکمت ہو کہ باطل پر حق کی زد پڑنے کا اثر بتلانا مقصود ہو۔ یہ ایک تمثیل ہے کہ جس طرح کوئی بھاری چیز کسی نازک چیز پر پھینک دی جائے تو وہ چیز پاش پاش ہو جاتی ہے، اسی طرح حق کے مقابلہ میں باطل پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اسی لئے آگے فرمایا وَمَا يُبْدِيهِ الْبَاطِلُ وَمَا يُعْيِدُ، یعنی حق کے مقابلہ میں باطل ایسا پست و ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ وہ کسی چیز کی ابتداء کرنے کے قابل نہیں رہتا نہ دوبارہ ٹوٹانے کے۔

وَكُنتَ إِذْ فَزَعُوا أَفْلا فُوتَ وَأُخِذُوا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ۝۵۱

اور کبھی تو دیکھے جب یہ گھبراہٹیں پھر نہ بچیں بھاگ کر اور پکڑے ہوئے آئیں نزدیک جگہ سے

وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ وَأَنَّى لَهُمُ التَّنَازُلُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ۝۵۲ وَقَدْ

اور کہنے لگیں ہم نے اس کو یقیناً لیا اور اب کہاں ان کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے بعید جگہ سے۔ اور اس سے

كَفَرُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِرُ فُتُونًا بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ۝۵۳

منکر رہی پہلے سے، اور پھینکتے رہے بن دیکھے نشانے پر دور کی جگہ سے۔

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِمْ مِّنْ

اور رُکاوٹ پڑ گئی ان میں اور ان کی آرزو میں جیسا کہ کیا گیا ہو ان کے طریقہ والوں کے ساتھ

قَبْلُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مَُّرِيبٍ ۝۵۴

اس سے پہلے وہ لوگ تھے ایسے تردد میں جو چین نہ لینے دے

خلاصہ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ وہ وقت ملاحظہ کریں (تو آپ کو حیرت ہو)

جب یہ کفار (قیامت کے ہول و ہیبت) گھبرائے پھر بٹکے پھر نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور پاس کے پاس ہی سے (یعنی فوراً) پکڑ لئے جاؤ گے اور اس وقت کہیں گے کہ ہم اس حق پر ایمان لے آئے (اور جتنے اموال میں مبتلا ہو گئے ہیں سب کو مان لیا اس لئے ہماری توبہ قبول کر لیجئے خواہ وہ بار دنیا میں بھیج کر یا بغیر بھیجے ہوئی اور تیری دوزخ کے دوا لیا گیا، انکے ہاتھ آنا کہا ممکن ہے، یعنی ایمان لانیسی جگہ بدیہ دار العمل ہونیکے دنیا تھی جو بڑی دور ہو گئی، اب آخرت کا عالم ہے جو دار العمل نہیں دارالجزا ہے، اس میں ایسا مقبول نہیں کیونکہ اب جو ایمان ہوگا وہ ایمان بالغیب نہیں بلکہ مشاہدہ کے بعد ہے، مشاہدہ کے بعد کسی چیز کا اقرار کرنا تو طبعی امر ہے، اس میں اطاعت حکم کا کوئی پہلو نہیں، حالانکہ پہلے سے (دنیا میں) یہ لوگ اس حق کا انکار کرتے رہے اور ان کا انکار بھی ایسا جس کا کوئی صحیح منشاء نہ تھا بلکہ بے تحقیق باتیں دور ہی دور سے ہانکا کرتے تھے، دور کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تحقیق سے دور تھے، یعنی دنیا میں تو کفر کرتے رہے اب ایمان سو بھا ہے، اور اس کے مقبول ہونے کی آرزو ہے، اور چونکہ آخرت دار العمل نہیں ہے اس لئے ان میں اور ان کے (قبول ایمان کی) آرزو میں ایک آڑ کر دی جائے گی (یعنی ان کی آرزو پوری نہ ہوگی، جیسا کہ ان کے ہم مشربوں کے ساتھ دیکھی، یہی رہتاؤں کیا جائے گا جو ان سے پہلے (کفر کر چکے) تھے، یہ سب بڑے شک میں تھے جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا تھا۔

معارف و مسائل

وَأَخِذُوا مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ، اکثر مفسرین کے نزدیک یہ حال روز حشر کا ہے کہ کفار و فجار گھبرا کر بھاگنا چاہیں گے تو چھوٹ نہ سکیں گے۔ اور یہ بھی نہ ہوگا جیسے دنیا میں کوئی مجرم بھاگ جائے تو اس کو تلاش کرنا پڑتا ہے، بلکہ سب کے سب اپنی ہی جگہ میں گرفتار کر لئے جاؤ گے، کسی کو بھاگ نکلنے کا موقع نہ ملے گا۔ بعض حضرات نے اس کو وقت نزع اور موت کا حال قرار دیا ہے، کہ جب موت کا وقت آجائے گا اور ان پر گھبراہٹ طاری ہوگی تو فرشتوں کے ہاتھ سے چھوٹ نہ سکیں گے، اور وہیں اپنی جگہ سے رُوح قبض کر کے پکڑ لئے جائیں گے۔

وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ وَأَنَّى لَهُمُ التَّنَادُ شُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ، تنادش کے معنی ہاتھ بڑھا کر کسی چیز کو اٹھا لینے کے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ہاتھ بڑھا کر وہی چیز اٹھائی جاسکتی ہے جو بہت دور نہ ہو ہاتھ وہاں تک پہنچ سکے۔ مضمون آیت کا یہ ہے کہ کفار و منکرین قیامت کے روز حقیقت سامنے آ جانے کے بعد کہیں گے ہم قرآن پر یا رسول پر ایمان لے آئے، مگر ان کو معلوم نہیں کہ ایمان کا مقام ان سے بہت دور ہو چکا ہے۔ کیونکہ ایمان صرف دنیا کی

زندگی کا مقبول ہو، آخرت دارالعمل نہیں وہاں کا کوئی عمل حساب میں نہیں آ سکتا۔ اس لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ دولت ایمان کو ہاتھ بڑھا کر اٹھالیں۔

وَقَدْ كَفَرُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ وَيَقْذِفُونَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ، قَذْفُ کے معنی کوئی چیز پھینک کر مارنے سے آتے ہیں۔ عرب کا محاورہ ہے کہ جو شخص بلا دلیل محض اپنے خیال سے باتیں کرتا ہے اس کو رجیم بالغیب اور قذف بالغیب کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، کہ یہ اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں جس کا کوئی نشانہ نہیں ہوتا، اور یہاں مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ کے الفاظ سے مراد یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں ان کے دلوں سے دور ہوتا ہے دل میں اس کا عقیدہ نہیں رکھتے۔

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ، یعنی ان لوگوں کو جو چیز محبوب اور مقصود تھی ان کے اور اس چیز کے درمیان پردہ حائل کر کے ان کو محروم کر دیا گیا۔ یہ مضمون قیامت کے حال پر بھی صادق ہے کہ قیامت میں یہ لوگ نجات اور جنت کے طالب ہوں گے وہاں تک نہ پہنچ سکیں گے اور دنیا میں وقت موت پر بھی صادق ہے کہ دنیا میں ان کو یہاں کی دولت و سامان مقصود تھا موت نے ان کے اس مطلوب کے درمیان حائل ہو کر ان کو اس سے جدا کر دیا۔

كَمَا فَعَلْ بِآشْيَاءِ عِهِمْ، اشیاء شیعہ کی جمع ہے، کسی شخص کے تابع اور بخیال کو اس کا شیعہ کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو عذاب ان کو دیا گیا کہ اپنے مطلوب محبوب سے محروم کر دیئے گئے، یہی عذاب اس سے پہلے انہی جیسے اعمال کفر کرنے والوں کو دیا جا چکا ہے۔ کیونکہ یہ سب لوگ شک میں پڑے ہوئے تھے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کے کلام الہی ہونے پر ان کو یقین و ایمان نہیں تھا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

تَمَّتْ سُورَةُ سَبَاءٍ الْحَمْدُ لِلَّهِ

لَا خَيْرَ يَوْمٍ مِنَ الْمَحْرَمِ الْحَرَامِ ۝ ۱۳۹۲

سُورَةُ فَاطِرٍ

سُورَةُ فَاطِرٍ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانِيَةٌ وَأَرْبَعُونَ آيَةً وَخَمْسٌ رُكُوعَاتٌ

سورۃ فاطر کہ میں نازل ہوئی اس میں پینتالیس آیتیں ہیں اور پانچ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد ہریان نہایت رحم والا ہے ۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَكَةِ

سب خوبی اللہ کو ہی جس نے بنا نکالے آسمان اور زمین جس نے ٹھہرایا فرشتوں کو

رُسُلًا أُولَىٰ أَجْنَحَةٍ مِّثْلِي وَثَلَاثَ وَرُبْعَ طَيْرٍ فِي الْخَلْقِ

پیغام لانے والے جن کے پر ہیں دو دو اور تین تین اور چار چار، بڑھا دیتا ہر پیدائش میں

مَا يَشَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ① مَا يَفْتِ اللَّهُ لِلنَّاسِ

جو چاہے، بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے ۔ جو کچھ کہہ لے اللہ لوگوں پر

مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا هُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكُ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ

رحمت میں سے تو کوئی نہیں اس کو روکنے والا اور جو کچھ روک رکھے تو کوئی نہیں اس کو بھیجنے والا

مِنْ بَعْدِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ② يَا أَيُّهَا النَّاسُ ارْكَعُوا

اس کے سوائے اور وہی ہی زبردست حکمتوں والا ۔ اے لوگو! یاد کرو

نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ط هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرِ اللَّهِ يَرِيكُمْ فُكْرُكُمْ

احسان اللہ کا اپنے اوپر، کیا کوئی ہے بنانے والا اللہ کے سوائے روزی دیتا ہو تم کو

مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ط لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَآيَ تَوْفَلُونَ ③

آسمان سے اور زمین سے کوئی حاکم نہیں مگر وہ پھر کہاں اُلٹے جاتے ہو ۔

خلاصہ تفسیر

تمام تر حمد و ثناء اسی (اللہ کو لائق ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، جو فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار پردار بازو ہیں) پیغام سے مراد انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی لانا ہے خواہ وہ شرائع احکام سے متعلق ہو یا محض بشارت وغیرہ سے، اور بازوؤں کی تعداد کچھ چار چار ہی میں منحصر نہیں بلکہ وہ پیدائش میں جو چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے (یہاں تک بعض فرشتوں کے چھ سو بازو پیدا کئے ہیں جیسا حدیث میں حضرت جبریل کے متعلق آیا ہے) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے (اور قادر بھی ایسا جس کا کوئی مزاحم نہیں کہ وہ) اللہ جو رحمت لوگوں کے لئے کھول دے (مثلاً بارش، نباتات اور عام رزق) تو اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں اور جس کو بند کرے تو اس کے (بند کرنے کے) بعد اس کا کوئی جاری کرنے والا نہیں (البتہ وہ خود ہی بند و کشادہ کر سکتا ہے) اور وہی غالب (یعنی قادر اور) حکمت والا ہے (یعنی کھولنے اور بند کرنے پر قادر بھی ہو اور بند و کشادہ ہمیشہ حکمت کے ساتھ ہوتی ہے) اے لوگو! جیسے اس کی قدرت کامل ہے اسی طرح اس کی نعمت بھی کامل ہے، اس کی نعمتوں کی کوئی شمار نہیں، اس لئے تم پر جو اللہ کے احسان ہیں ان کو یاد کرو اور ان کا شکر ادا کرو اور وہ شکر یہ ہے کہ توحید اختیار کرو و شرک چھوڑو کم از کم اس کی دو بڑی نعمتوں میں غور کرو جو مخلوقات کی ایجاد پھر ان کو باقی اور قائم رکھنا ہے، کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق ہے جو تم کو آسمان و زمین سے رزق پہنچاتا ہو (یعنی اس کے سوا نہ کوئی تخلیق و ایجاد کر سکتا ہے اور نہ کوئی ایجاد کردہ کو باقی اور قائم رکھنے کے لئے رزق پہنچانے کا کام کر سکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ ہر طرح کامل ہے تو یقیناً، اس کے سوا کوئی لائق عبادت (بھی) نہیں تو درجہ معبود ہونا اسی کا حق ہے تو تم (شرک کر کے) کہاں اُلٹے جا رہے ہو۔

معارف و مسائل

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا، فرشتوں کو رسول یعنی اللہ تعالیٰ کا پیغام اور احکام پہنچانے والا بنانے کا مطلب ظاہر یہ ہے کہ ان کو انبیاء علیہم السلام کی طرف اللہ کا قصد و رسول بنا کر بھیجا جاتا ہے وہ اللہ کی وحی اور احکام ان کو پہنچاتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسول سے مراد اس جگہ واسطہ ہو اللہ تعالیٰ اور اس کی عام مخلوقات کے درمیان

جن میں انبیاء علیہم السلام سب افضل و اعلیٰ ہیں، ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان بھی وحی کا واسطہ بنتے ہیں، اور مخلوقات تک اللہ تعالیٰ کی رحمت یا عذاب پہنچانے کا بھی واسطہ فرشتے ہی ہوتے ہیں۔
 اُرِیْ اَاجِنَحَیْ مِثْنٰی وَ ثَلَاثَ و رُبَاعَ ، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پروانے باز و عطا فرماتے ہیں، جن سے وہ اڑ سکتے ہیں حکمت اس کی ظاہر ہے کہ وہ آسمان سے زمین تک کی مسافت بار بار طے کرتے ہیں، یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کو سرعت سیر کی قوت عطا کی جائے اور وہ اڑنے ہی کی صورت میں ہوتی ہے۔

اور لفظ مِثْنٰی وَ ثَلَاثَ و رُبَاعَ ، ظاہر یہ ہے کہ آجنگہ کی صفت ہے کہ فرشتوں کے پر مختلف تعداد پر مشتمل ہیں۔ بعض کے صرف دو دو پر ہیں بعض کے تین تین بعض کے چار چار اور اس میں کوئی حصر نہیں، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث سے جبریل علیہ السلام کے چھ سو پر ہونا ثابت ہوتا ہے، بطور تمثیل کے چار تک ذکر کر دیا گیا ہے (قرطبی، ابن کثیر) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ مِثْنٰی وَ ثَلَاثَ رُسُلًا کی صفت ہو یعنی یہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسالات دنیا میں پہنچاتے ہیں، کبھی دو دو گتے ہیں کبھی تین تین یا چار چار، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی چار کا عدد حصر کے لئے نہیں، محض تمثیل کے طور پر ہے، کیونکہ اس سے بہت زیادہ مقدار میں فرشتوں کا نزول خود قرآن کریم سے ثابت ہے (ابو حیان فی البحر المحیط)

یَزِیْنُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَاءُ ، یعنی اللہ تعالیٰ کو سب اختیار ہے کہ اپنی مخلوقات کی تخلیق میں جتنی چاہے اور جس قسم کی چاہے زیادتی کرے۔ اس کا تعلق بظاہر تو آجنگہ ہی کے ساتھ ہے، کہ فرشتوں کے پروانہ باز و کچھ دو چار میں منحصر نہیں، اللہ تعالیٰ چاہے تو اس سے بہت زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اکثر مفسرین کا قول یہی ہے، اور زہری، قتادہ وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس زیادت خلق سے عام معنی مراد ہیں، جس میں فرشتوں کے پروانہ باز کی زیادتی بھی شامل ہے، اور مختلف انسانوں کی تخلیق میں خاص خاص صفات کی زیادتی بھی۔ جس میں حُسن صورت، حُسن سیرت، حُسن صوت وغیرہ سب داخل ہیں۔ ابو حیان نے بحر محیط میں اسی کو اختیار کر کے فرمایا ہے کہ اس زیادت خلق میں حُسن خلق، حُسن صوت اور حُسن خط اور حُسن صورت کمال عقل و علم، شیریں کلامی وغیرہ سب داخل ہیں۔ اس دوسری تفسیر سے ثابت ہوا کہ کسی چیز کا بھی حُسن کمال جو انسان کو حاصل ہو وہ اللہ تعالیٰ کی عطا، اور نعمت ہے، اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

مَا یَفْتَحُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَتٍ قَلًا مِّمَّا سَلَکَ لَهَا ، یہاں لفظ رحمت عام ہے اس میں دینی اور اخروی نعمتیں داخل ہیں، جیسے ایمان اور علم اور عمل صالح اور نبوت و

ولایت وغیرہ اور دنیوی نعمتیں بھی، جیسے رزق اور اسباب اور آرام و راحت اور صحت و تندرستی اور مال و عزت وغیرہ۔ معنی آیت کے ظاہر میں اللہ تعالیٰ جس شخص کے لئے اپنی رحمت کھولنے کا ارادہ کرے اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔

اسی طرح دوسرا جملہ و مایمیک عام ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ روکتا ہے اس کو کوئی کھول نہیں سکتا۔ اس میں دنیا کے مصائب و آلام بھی داخل ہیں، کہ جب اللہ ان کو اپنے کسی بندے سے روکنا چاہیں تو کسی کی مجال نہیں کہ ان کو کوئی گزند و مصیبت پہنچائے اور اس میں رحمت بھی داخل ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی کسی حکمت سے کسی شخص کو رحمت سے محروم کرنا چاہیں تو کسی کی مجال نہیں کہ اس کو روک سکے (الوحیان)

اسی مضمون آیت کے متعلق ایک حدیث اس طرح آتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے عامل (گورنر) کو فہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو خط لکھا کہ مجھے کوئی حدیث لکھ کر بھیجو جو تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔ حضرت مغیرہؓ نے اپنے میرمنشی رواد کو بلا کر لکھوایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس وقت جبکہ آپ نماز سے فارغ ہوئے یہ کلمات پڑھتے ہوئے سنا اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيٍّ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَبْدِ مِنْكَ الْجَدُّ (یعنی یا اللہ جو چیز آپ کسی کو عطا فرمادیں اس کا کوئی روکنے والا نہیں، اور جس کو آپ روکیں اس کو کوئی دینے والا نہیں، آپ کے ارادے کے خلاف کسی کوشش کرنے والے کی کوشش نہیں چلتی) (ابن کثیر از مسند احمد)

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت یہ ہے کہ یہ کلمہ آپ نے رکوع سے سر اٹھانے کے وقت فرمایا اور اس کلمہ سے پہلے فرمایا اَحَقُّ مَا قَالِ الْعَبْدُ وَكُنَّا لَكَ، (یعنی یہ کلمہ ان تمام کلمات میں جو کوئی بندہ کہہ سکتا ہے سب زیادہ احق اور مقدم و اعلیٰ ہی اللہ پر توکل و اعتماد سا کہ آیت مذکورہ نے انسان کو جو سبق دیا ہے کہ غیر اللہ سے نفع و ضرر کی مصائب سے نجات ہے۔) کی امید و خوف نہ رکھے، صرف اللہ تعالیٰ کی طرف نظر رکھے۔ دین و دنیا کی درستی اور دائمی راحت کا نسخہ اکسیر ہے، اور انسان کو ہزاروں غموں اور فکروں سے نجات دینے والا ہے (روح)

حضرت عامر بن عبد قیسؓ نے فرمایا کہ جب میں صبح کو چار آیتیں قرآن کریم کی پڑھ لوں تو مجھے یہ فکر نہیں رہتی صبح کو کیا ہوگا شام کو کیا، وہ آیتیں یہ ہیں۔ ایک یہی آیت مَا يَنْفَعُ النَّاسَ مِنْ رَحْمَتِيْ فَلَا تَمْسِكْ لَهَا وَ مَا يُمْسِكُ فَلَا مُمْسِكٌ لَهُ مِنْ رَحْمَتِيْ دوسری آیت اسی کے ہم معنی یہ ہے اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ...

إِلَّا هُوَ، وَإِنْ تُدْرِكْ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ، تيسری آیت سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ
يُسْرًا، جو تھی دُعا میں دُعا کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا (اخراجہ ابن المنذر (۷۳)

اور حضرت ابو ہریرہؓ جب بارش ہوتے دیکھتے تو فرمایا کرتے تھے مَطَرٌ نَا بِنُوعِ الْفَتْحِ
اور پھر آیت مَا يَفْتَحُ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ ذِكْمَةٍ يَرْغَبُونَ تھے یہ عرب کے باطل خیالات کی تردید ہے،
جو بارش کو خاص خاص ستاروں کی طرف منسوب کر کے کہا کرتے کہ ہمیں یہ بارش فلاں ستارے
کی وجہ سے ملی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ بارش آیت فتح سے ملی ہے۔ مراد
آیت فتح سے یہی مذکورہ آیت ہے جن کو وہ ایسے وقت تلاوت فرمایا کرتے (رواہ مالک فی الموطا)

وَإِنْ يَكْذِبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ ۖ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ

اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو جھٹلائے گئے کتنے رسول تجھ سے پہلے اور اللہ تک پہنچتے ہیں

الْأُمُورُ ۝ يَأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمْ

سب کام۔ اے لوگو! بیشک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہی سونہ بہکتے تم کو

الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۖ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللَّهِ الْغُرُورُ ۝ إِنَّ الشَّيْطَانَ

دنیا کی زندگی اور نہ دغا دے تم کو اللہ کے نام سے وہ دغا باز۔ تحقیق شیطان

لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبْتَلٍ ۖ فَاتَّخِذُوا عَدُوَّائِنَا أَعْدَاءَ لَكُمْ ۚ إِنَّكُمْ لَمِنْ

تمہارا دشمن ہے سو تم بھی سمجھ رکھو اس کو دشمن، وہ تو بلاتا ہے اپنی گروہ کو اس واسطے کہ ہوں

مِنَ أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالْهُمْ عَذَابُ شَدِيدٍ ۚ

دوزخ والوں میں، جو منکر ہوئے ان کو سخت عذاب ہے،

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝

اور جو یقین لائے اور کئے بھلے کام ان کے لئے ہے معافی اور بڑا ثواب۔

أَفَمَنْ زُجِرَ لَهُ سَوْءُ عَمَلِهِ فَرَاهُ حَسَنًا فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ

بھلا ایک شخص کہ بھلی سمجھائی گئی اس کو اس کے کام کی بُرائی، پھر دیکھا اس کو بھلا، کیونکہ اللہ بھٹکا تاہو

مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ

جو چاہی اور بھٹاتا ہے جو چاہے، سو تیرا جی نہ جاتا رہے

عَلَيْهِمْ حَسْرَاتٌ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ﴿۸﴾

ان پر پچھا پچھا کر، اللہ کو معلوم ہے جو کچھ کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اور راسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہ لوگ (در بارۃ توحید و رسالت وغیرہ) آپ کو جھٹلائیں تو آپ غم نہ کریں کیونکہ آپ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر جھٹلائے جا چکے ہیں، (ایک تو اس سے تسلی حاصل کیجئے) اور دوسری بات یہ کہ سب امور اللہ ہی کے روپر وپست کئے جاویں گے وہ خود سب سے سمجھ لے گا آپ کیوں فکر میں پڑے۔ آگے عام لوگوں کو خطاب ہے کہ اے لوگو! اللہ تبارک و تعالیٰ (جس میں قیامت کی خبر ہے اس کو سن کر تعجب و استبعاد مت کرنا) اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ضرور سچا ہے، سو ایسا نہ ہو کہ یہ دنیوی زندگی تم کو دھوکہ میں ڈالے رکھے کہ اس میں منہمک ہو کر اس یوم موعود سے غافل رہو) اور ایسا نہ ہو کہ تم کو دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکہ میں ڈال دے کہ تم اس کے اس بہکانے میں نہ آ جاؤ کہ اللہ تعالیٰ تم کو عذاب نہ دے گا جیسا کہ کہا کرتے تھے وَلَئِنْ رُجِيتُمْ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِندَهُ لَلْحُسْنٰی اور یہ شیطان (جس کے دھوکہ کا اوپر ذکر ہے) بیشک تمہارا دشمن ہے سو تم اس کو (اپنا) دشمن (ہی) سمجھتے رہو وہ تو اپنے گردہ کو (یعنی اپنے متبعین کو) محض اس لئے (باطل کی طرف) بلاتا ہے تاکہ وہ لوگ دوزخیوں میں سے

ہو جاویں پس جو لوگ کافر ہو گئے اور اس کی دعوت و غرور میں پھنس گئے ان کے لئے سخت عذاب ہو اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے اور اس کی دعوت و غرور میں نہیں پھنسے ان کے لئے (معاصی کی) بخشش اور ایمان و عمل صالح پر بڑا اجر ہے (اور جب کافر کا انجام) شدید اور مؤمن کا انجام مغفرت و اجر کبیر ہے) تو کیا (دونوں مساوی ہو سکتے ہیں یعنی) ایسا شخص جس کو اس کا عمل بد اچھا کر کے دکھلایا گیا، پھر وہ اس کو اچھا سمجھنے لگا اور ایسا شخص جو بُرے کو بُرا سمجھتا ہے کہیں برابر ہو سکتے ہیں؟ پہلے شخص سے مراد کافر ہے جو اغوا بہ شیطان سے باطل کو حق اور مضر کو نافع سمجھتا ہے، اور دوسرے شخص سے مراد مؤمن ہے جو اتباع انبیاء و مخالفت شیطان سے باطل کو باطل، حق کو حق، مضار کو مضار، نافع کو نافع جانتا ہے۔ یعنی دونوں برابر کہاں ہوتے بلکہ ایک جہنمی اور دوسرا جنتی ہے۔ پس شیطان کے دھوکہ میں آنے والے اور اس کو دشمن سمجھنے والوں میں یہ تفاوت ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں لَا يَخْسَرُنَّكُمْ اور إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ دَعُوٌّ، اور اگر اس پر تعجب ہو کہ عاقل آدمی بد کو نیک کیسے سمجھ لیتا ہے (سورہ اس کی وجہ

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسکو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے (اس کی عقل اکٹھی ہو جاتی) اور جسکو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے (اس کا اور اک صحیح رہتا ہے) پھر جب ہدایت و اضلال کا اصل مدار مشیت ہی تو ان پر افسوس کر کر کے کہیں آپ کی جان نہ جاتی رہے (یعنی کچھ افسوس نہ کیجئے صبر سے بیٹھے رہتی) اللہ تعالیٰ کو ان کے کاموں کی خبر ہے (وقت پر ان سے سمجھ لے گا)۔

معارف و مسائل

لَا يَخْشَى تَكْفُرًا بِاللَّهِ الْغَافِلُونَ، غرور بفتح غین مبالغہ کا صیغہ ہے، جس کے معنی ہیں بہت دھوکہ دینے والا، اور مراد اس سے شیطان ہے کہ اس کا کام ہی لوگوں کو دھوکہ میں ڈال کر کفر و معصیت میں مبتلا کرنا ہے۔ اور لَا يَخْشَى تَكْفُرًا بِاللَّهِ یعنی وہ تمہیں اللہ کے معاملہ میں دھوکہ نہ دیدے، اس دھوکہ سے مطلب یہ ہے کہ شیطان برے کاموں کو اچھا ثابت کر کے تمہیں اس میں مبتلا نہ کر دے اور تمہارا حال یہ ہو جائے کہ گناہ کرتے رہو اور ساتھ ہی یہ سمجھتے رہو کہ ہم اللہ کے نزدیک مقبول ہیں ہمیں عذاب نہیں ہوگا (قرطبی)

وَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ، امام بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عہد کی تھی کہ یا اللہ اسلام کو عزت و قوت عطا کر دے، عمر بن خطاب کے ذریعہ یا ابو جہل کے ذریعہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے عمر بن خطاب کو ہدایت دے کر اسلام کی عزت و قوت کا سبب بنا دیا اور ابو جہل اپنی گمراہی میں رہا۔ (مظہری)

وَاللَّهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَسُقْنَاهُ إِلَى بَدْرٍ

اور اللہ ہے جس نے چلائی ہیں ہوائیں پھر وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پھر ہانکے گئے ہم اس کو

مَيِّتٍ فَأَحْيَيْنَاهُ بِالْأَرْضِ بَعْدَ مَوْتِهِمَا كَذَلِكَ النُّشُورُ ⑨

ایک مردہ دیس کی طرف پھر زندہ کر دیا ہم نے اس زمین کو اس کے مرجانے کے بعد اسی طرح ہو گا جی اٹھنا۔

مَنْ كَانَ يُرِيدِ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا إِلَيْهِ يَصْعَدُ

جسکو چاہئے عزت تو اللہ کے لئے ہی ساری عزت، اس کی طرف چڑھتا ہے

الْكَلِمِ الطَّيِّبِ وَالْعَمَلِ الصَّالِحِ يَرْفَعُهُ وَالَّذِينَ

کلام ستھرا، اور کام نیک اس کو اٹھا لیتا ہے اور جو لوگ

يَسْكُرُونَ السَّيَّاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ

داؤ میں ہیں برائیوں کے اُن کے لئے سخت عذاب ہے اور ان کا داؤ ہے

هُوَ يَبُورُ ⑩ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْقَةٍ ثُمَّ

ٹوٹے کا۔ اور اللہ نے تم کو بنایا مٹی سے پھر بوند پانی سے پھر

جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ

بنایا تم کو جوڑے جوڑے اور نہ پیٹ رہتا ہے کسی مادہ کو اور نہ وہ جنتی ہو بن خبر اس کے

وَمَا يَعْشَرُ مِنْ مَّعْشَرٍ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ ط

اور نہ عمر پاتا ہے کوئی بڑی عمر والا اور نہ گھٹتی ہے کسی کی عمر مگر لکھا ہے کتاب میں

إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ⑪ وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ ۚ هَٰذَا عَذَابٌ

بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔ اور برابر نہیں دو دریا، یہ میٹھا ہے

فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَٰذَا أَمِلٌ حَامٍ ط وَمِنْ كُلِّ

پیاس بجھاتا ہے خوشگوار اور یہ کھارا کڑوا، اور دونوں میں سے

تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حَلِيَّةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَىٰ

کھاتے ہو گوشت تازہ اور نکالتے ہو گہنا جسکو پہنتے ہو اور تو دیکھو

الْفُلُكَ فِيهِ مَوَٰخِرٌ لِّتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَلَكُمْ تَشْكُرُونَ ⑫

جہازوں کو اس میں چلتے ہیں پانی کو بچھاڑتے تاکہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم حق مانو،

يُوجِبُ اللَّيْلُ فِي النَّهَارِ وَيُوجِبُ النَّهَارُ فِي اللَّيْلِ ۚ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ

رات گھساتا ہے دن میں اور دن گھساتا ہے رات میں اور کام میں لگا دیا سورج

وَالْقَمَرَ ۚ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ

اور چاند کو ہر ایک چلتا ہے ایک مقررہ وعدہ تک، یہ اللہ ہی تمہارا رب اسی کے لئے

الْمُلْكُ ۚ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ

بادشاہی ہے اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوائے وہ مالک نہیں کجور کی گھٹلی کے

قَطْمِيرٌ ۱۴) اِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ سَبِعُوا

ایک چھلکے کے، اگر تم ان کو پکارو سنیں نہیں تمہاری پکار اور اگر سنیں پہنچیں

مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ

نہیں تمہارے کام پر اور قیامت کے دن منکر ہوئے تمہارے شریک ٹھہرائے سے

وَلَا يَنْبِئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ۱۵)

اور کوئی نہ بتلائے گا تجھ کو جیسا بتلائے گا خبر رکھنے والا

خلاصہ تفسیر

اور اللہ ایسا (قادر) ہے جو (بارش سے پہلے) ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ (ہوائیں) بادلوں کو اٹھاتی ہیں جس کی کیفیت سورۃ روم کے رکوع پنجم آیۃ اللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیَّاحَ کی تفسیر میں گذری ہے) پھر ہم اس بادل کو خشک قطعہ زمین کی طرف بانٹ لے جاتے ہیں جس سے وہاں بارش ہوتی ہے) پھر ہم اس کے ذریعہ سے یعنی اس بادل کے پانی کے ذریعہ سے زمین کو (نباتات سے) زندہ کرتے ہیں اس کے خشک ہونے کے بعد (اور جس طرح زمین کے مناسب اسکو جیسا عطا فرمائی) اسی طرح (قیامت میں آدمیوں کا) جی اٹھنا ہے، کہ ان کے مناسب حیات اُن کو عطا ہوگی وجہ تشبیہ ظاہر ہے کہ دونوں میں ایک زائل شدہ صفت کا احداث و اعادہ ہے۔ گو زمین میں صرف ایک امر عرضی یعنی نشوونما کا تعلق ہوا ہے، اور اعضا میں ایک امر جوہری یعنی روح کا یہ مضمون حشر و نشر کا دلائل توحید کے ضمن میں تبعاً آگیا ہے۔ پھر اس نشر کی مناسبت ایک اور مضمون ہر وہ یہ کہ جب قیامت میں زندہ ہونا ہے تو وہاں کی ذلت و خواری سے بچنے کی فکر کرنا ضروری ہے۔ اس بارے میں مشرکین نے اپنے خود ساختہ معبودوں کو شیطان کے فریب میں آکر حصول عزت کا ذریعہ قرار دے رکھا تھا، وہ کہتے تھے ہَبْؤْا لَہٗ شَفَعَاؤُنَا عِنْدَ رَبِّہٖ یعنی یہ ہمارے علی الاطلاق شفیع ہیں دنیاوی حوائج میں بھی اور اگر قیامت کوئی چیز ہو تو نجات اخروی کے لئے بھی جیسا حق تعالیٰ نے سورۃ مریم میں ارشاد فرمایا ہے وَاتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللّٰہِ اٰلِہٖمَّ لَیْسَ کُوْنُوْا اِلَہَمْ عِزًّا اس کے متعلق ارشاد ہے کہ، جو شخص (آخرت میں) عزت حاصل

نہ کسی کی عمر زیادہ (مقرر) کی جاتی ہے اور نہ کسی کی عمر کم (مقرر) کی جاتی ہے مگر یہ سب
 لوح محفوظ میں (لکھا ہوا) ہوتا ہے (جو حق تعالیٰ نے اپنے علم قدیم کے موافق اس
 میں ثبت فرمادیا ہے) اور گو معلومات بے شمار اور لامتناہی ہیں، مگر یہ تعجب نہ کرو کہ قبل
 از وقوع سب واقعات کو کیسے مقدر و مقرر فرمایا کیونکہ یہ سب اللہ کو آسان ہے (کیونکہ
 اس کا علم ذاتی ہے جس کی نسبت جمیع معلومات کے ساتھ قبل از وقوع و بعد از وقوع
 یکساں ہے) اور آگے قدرت کے اور دلائل سنو کہ باوجودیکہ پانی مادہ واحدہ ہے مگر باوجود
 وحدت قابل کے اس میں اختلاف افعال سے دو مختلف قسمیں پیدا کر دیں (دونوں دریا برابر
 نہیں ہیں بلکہ) ایک تو شیریں پیاس بجھانے والا ہے جس کا پینا بھی (بوجہ قبول طبیعت
 کے) آسان ہو اور ایک شور تلخ ہے (تو یہ امر بھی عجائب قدرت سے ہے) اور (دوسرے
 دلائل قدرت بھی ہیں جو دلالت علی القدرة کے ساتھ دال علی النعمۃ بھی ہیں بعض تو اپنی
 دریاؤں کے متعلق ہیں مثلاً یہ کہ) تم ہر ایک (دریا) سے (مچھلیاں نکال کر ان کا) تازہ گوشت
 کھاتے ہو اور (نیز) (یور) (یعنی موتی) نکالتے ہو جو کو تم پہنتے ہو اور (اے مخاطب) تو کشتیوں
 کو اس میں دیکھتا ہے پانی کو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم (ان کے ذریعہ سے سفر کر کے)
 اس کی روزی ڈھونڈو اور تاکہ (روزی حاصل کر کے تم (اللہ کا) شکر کرو (اور بعض
 اور نعمتیں ہیں مثلاً یہ کہ) وہ رات (کے اجزاء) کو دن (کے اجزاء) میں داخل کر دیتا ہے،
 اور دن (کے اجزاء) کو رات (کے اجزاء) میں داخل کر دیتا ہے (جس سے دن اور رات
 گھٹنے بڑھنے کے متعلق منافع حاصل ہوتے ہیں) اور (مثلاً یہ کہ) اس نے سورج اور چاند
 کو کام میں لگا رکھا ہے (ان میں سے) ہر ایک وقت مقرر (یعنی یوم قیامت) تک (اسی طرح)
 چلتے رہیں گے، یہی اللہ (جس کی یہ شان ہے) تمہارا پروردگار ہے، اسی کی سلطنت ہے، اور
 اس کے سوا جن کو پکارتے ہو وہ تو کجور کی گھٹلی کے چمکے کے برابر بھی اختیار نہیں رکھتے،
 چنانچہ جمادات میں تو ظاہر ہے اور ذوات الارواح میں بایں معنی کہ بالذات اختیار نہیں
 رکھتے اور ان کی یہ حالت ہے کہ) اگر تم پکارو تو بھی وہ تمہاری پکار (اقل تو) سنیں گے نہیں (جمادات
 تو اس لئے کہ ان میں سننے کی صلاحیت نہیں اور ذوات الارواح بایں معنی کہ مرنے کے
 بعد ان کا سننا لازمی اور دائمی نہیں، جب اللہ چاہے سنا دے جب نہ چاہے نہ سنا دے) اور اگر
 (بالفرض) سن بھی لیں تو تمہارا کہنا نہ کریں گے، اور قیامت کے روز وہ (خود) تمہارے
 شرک کرنے کی مخالفت کریں گے (بقولہ تعالیٰ مَا كَانُوا اِيَّانَا يَعْبُدُونَ وَخَيْرُ ذَلِكَ مِنَ الْاِيَّانَا)
 اور رہم نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے صدق میں ذرا شک و شبہ نہیں کیونکہ ہم حقائق امور

کی پوری خبر رکھنے والے ہیں اور اے مخاطب! تجھ کو خبر رکھنے والے کی برابر کوئی نہیں بتلائے گا، پس ہمارا بتلانا سب سے زیادہ صحیح ہے۔

معارف و مسائل

اَلَّذِي يَصْعَدُ الْكَلِمَ الطَّيِّبُ وَ الْكَاسِلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ اس سے پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جو شخص عزت و قوت کا طلب گار ہو تو اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کے بس میں نہیں۔ جن چیزوں کو انھوں نے معبود بنا رکھا ہے یا جن سے عزت کی توقع پر دوستی کر رکھی ہے وہ کسی کو عزت نہیں دے سکتے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ سے عزت و قوت حاصل کرنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے، جس کے دو احزاب ہیں، ایک کلم طیب، یعنی کلمہ توحید اور اللہ کی ذات و صفات کا علم دوسرے عمل صالح یعنی دل سے ایمان لانا پھر اس کے مقتضی کے موافق تابع شریعت عمل کرنا۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے موضح القرآن میں فرمایا کہ حصول عزت کا یہ نسخہ بالکل صحیح و مجرب ہے، شرط یہ ہے کہ ذکر اللہ اور عمل صالح پر مداومت ہو، یہ مداومت ایک حد متعین پر پہنچ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے کرنے والے کو وہ لازوال عزت دینا و آخرت میں نصیب فرماتے ہیں جس کی نظیر نہیں۔

آیت مذکورہ میں ان دونوں جزؤں کی تعبیر ان الفاظ سے کی گئی ہے کہ اچھا کلام اللہ کی طرف چڑھتا اور پہنچتا ہے، اور عمل صالح اس کو اٹھاتا ہے، اور پہنچاتا ہے۔ اَلْكَاسِلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ کی ترکیب بخوبی میں چند احتمال ہیں، ہر احتمال کے اعتبار سے جملے کے معنی الگ ہو جاتے ہیں۔ ائمہ تفسیر نے ان احتمالوں کے مطابق تفسیر اپنی اپنی صواب دید کے مطابق کی ہے۔ پہلا احتمال تو وہی ہے جس کے مطابق خلاصہ تفسیر میں ترجمہ کیا گیا ہے کہ یَرْفَعُهُ کی ضمیر فاعل عمل صالح کی طرف راجع ہو، اور ضمیر مفعول کلم طیب کی طرف، اور معنی یہ ہوں کہ کلم طیب اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتے ہیں، مگر ان کے چڑھانے کا ذریعہ عمل صالح ہوتا ہے۔ جہور ائمہ تفسیر ابن عباسؓ، حسن بصریؒ، ابن جریرؒ، مجاہدؒ، ضحاکؒ، شہر بن حوشبؒ وغیرہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور اللہ کی طرف چڑھنے اور چڑھانے سے مراد اللہ کے نزدیک مقبول ہونا ہے۔ اس لئے خلاصہ اس جملے کا یہ ہو گا کہ کلم طیب خواہ کلمہ توحید ہو یا دوسرے اذکار تسبیح و تحمید وغیرہ ان میں سے کوئی چیز بغیر عمل صالح کے عند اللہ مقبول نہیں ہوتی۔ اس میں عمل صالح کا اہم جز، تصدیق قلبی ہے، یعنی دل سے اللہ پر اور اس کی توحید پر ایمان لانا یہ تو مطلقاً قبولیت اعمال کی شرط لازم ہے، اس کے بغیر نہ کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مقبول ہو نہ کوئی دوسرا ذکر۔

اور عمل صالح کے دوسرے اجزاء نماز، روزہ وغیرہ اعمالِ صالحہ اور محرمات و مکروہات سے پرہیز ہے۔ یہ اگرچہ مطلقاً قبولیت کی شرط نہیں، مگر قبولیتِ تامہ کی شرط یہ اعمال بھی ہیں۔ تو اگر ایک شخص دل میں ایمان و تصدیق ہی نہیں رکھتا تو وہ کتنا بھی زبان سے کلمہ توحید پڑھے اور تسبیح و تحمید کرے اللہ کے نزدیک اسکو کوئی حصہ قبولیت کا حاصل نہ ہوگا، اور جو تصدیق و ایمان تو رکھتا ہے مگر دوسرے اعمالِ صالحہ نہیں کرتا یا ان میں کوتاہی کرتا ہے اس کا ذکر اللہ اور کلمہ توحید بالکل ضائع تو نہیں ہوگا صرف انتہا کام دے گا کہ ہمیشہ کے عذاب اس کو نجات مل جائے گی، مگر مکمل قبولیت اس کو حاصل نہیں ہوگی، جس کا یہ اثر ہوگا کہ بعت دراپنے ترکِ عمل کے اور کوتاہی کے عذاب بھگتے گا۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قول کو بغیر عمل کے اور کسی قول و عمل کو بغیر نیت کے اور کسی قول و عمل اور نیت کو بغیر مطابقتِ سنت کے قبول نہیں کرتا (قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ مکمل قبولیت کی شرط سنت کے مطابق ہونا ہے، اگر قول بھی عمل بھی اور نیت بھی، یہ سب درست بھی ہوں مگر طریقہ عمل سنت کے مطابق نہ ہو تو قبولیتِ تامہ حاصل نہیں ہوگی۔

اور بعض مفسرین نے اس جملہ کی ترکیبِ نحوی یہ قرار دی ہے کہ یہ فاعل کی ضمیر فاعل کلم طیب کی طرف اور ضمیر مفعول عمل صالح کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں معنی جملہ کے پہلے سے بالکل مختلف یہ ہو گئے کہ کلم طیب یعنی ذکر اللہ عمل صالح کو چڑھاتا اور اٹھاتا ہے، یعنی قابلِ قبول بناتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوگا کہ جو شخص عمل صالح کے ساتھ ذکر اللہ بھی بکثرت کرتا ہے تو یہ ذکر اللہ اس کے عمل کو مزین اور قابلِ قبول بنا دیتا ہے۔

اور حقیقت یہی ہے کہ جس طرح صرف کلمہ توحید اور تسبیحات بغیر عمل صالح کے کافی نہیں اسی طرح عمل صالح ادا و نواہی کی پابندی بھی بغیر کثرتِ ذکر اللہ کے بے رونق رہتی ہے، ذکر اللہ کی کثرت ہی اعمالِ صالحہ کو مزین کر کے قابلِ قبول بناتی ہے۔

وَمَا يُعْمَرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَلَا يُنْقِصُ مِنْ عُمُرٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ، اس آیت کا مفہوم جہوز مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو عمر طویل عطا فرماتے ہیں وہ پہلے ہی لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے، اسی طرح جس کی عمر کم رکھی جاتی ہے وہ بھی سب لوح محفوظ میں پہلے ہی درج ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں عمر کا طول اور نقص فرد واحد کے متعلق مراد نہیں، بلکہ کلام نوع انسانی کے متعلق ہے کہ اس کے کسی فرد کو عمر طویل دی جاتی ہے

کسی کو اس سے کم۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے ابن کثیر نے نقل کی ہے۔ جصاص نے حسن بصری اور ضحاک کا یہی قول نقل کیا ہے، اسی لئے ابن جریر، ابن کثیر، روح المعانی وغیرہ عام تفاسیر میں اسی کو جمہور کی تفسیر قرار دیا ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اگر عمر کی کمی زیادتی کو ایک ہی شخص کے متعلق کہا جائے تو عمر میں کمی کرنے کا یہ مطلب ہو کہ ہر شخص کی جو عمر اللہ تعالیٰ نے لکھ دی ہو وہ یقینی ہے، اور جو دن گذرتا ہے اس مقررہ مدتِ عمر میں سے ایک دن کی کمی کر دیتا ہے، دو دن گذرتے ہیں تو دو کم ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہر دن بلکہ ہر سانس اس کی عمر کو گھٹاتا رہتا ہے۔ یہ تفسیر شعبی، ابن جریر، البرمالک، ابن عطیہ اور سدی سے منقول ہو (روح) اسی مضمون کو اس شعر میں ادا کیا گیا ہے، ۵

حَيَاتُكَ الْفَاسُ تُحْدِلُ فَكَلَّمَا ۖ مَضَى نَفْسٌ مِّنْهَا انْقَضَتْ بِهٖ حَيَاتُ
یعنی تیری زندگی چند گنے ہوئے سانسوں کا نام ہو، تو جب بھی ایک سانس گذرتا ہے
تیری عمر کا ایک جز گھٹ جاتا ہے۔

امام نسائی نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت انس بن مالکؓ سے یہ روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: مَنِ اسْرَاكَ اَوْ دَبَّاسًا لَّهٗ فِي رِزْقِهٖ وَيُسَامَا فِي اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحْمَتُهٗ۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد نے بھی یہ حدیث یونس بن یزید اہلی کی روایت سے نقل کی ہے۔ معنی حدیث کے یہ ہیں کہ جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت اور عمر میں زیادتی ہو تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے یعنی اپنی ذی رحم رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرے۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلہ رحمی سے عمر بڑھ جاتی ہے، مگر اس کا مطلب ایک دوسری حدیث نے خود واضح کر دیا ہے یہ ہے: ابن ابی حاتم نے حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس (مضمون کا ذکر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ (عمر تو اللہ کے نزدیک ایک ہی مثل ہے اور مقدر ہے) جب مقررہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو کسی شخص کو ذرا بھی مہلت نہیں دی جاتی۔ بلکہ زیادتی عمر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اولاد صالح عطا فرما دیتا ہے وہ اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔ یہ شخص نہیں ہوتا ہے اور ان لوگوں کی دعائیں اس کو قبر میں ملتی رہتی ہیں (یعنی مرنے کے بعد بھی ان کو وہ فائدہ پہنچتا رہتا ہے، جو خود زندہ رہنے سے حاصل ہوتا ہے، اسی طرح گویا اس کی عمر بڑھ گئی۔ یہ دونوں روایتیں ابن کثیر نے نقل کی ہیں) خلاصہ یہ ہے کہ جن احادیث میں بعض اعمال کے متعلق یہ آیا ہے کہ ان سے عمر بڑھ جاتی ہے، اس سے مراد عمر کی برکت کا بڑھ جانا ہے۔

وَمِنْ كُلِّ تَاجُودٍ لَحْمًا طَيِّبًا وَتَسْتَخْرِجُونَ حَلِيبًا تَلْبَسُونََهَا، یعنی دریائے شور
 و شیریں دونوں سے تمہیں تازہ گوشت کھانے کو ملتا ہے، مراد اس سے مچھلی ہے۔ اس آیت میں
 مچھلی کو گوشت کے لفظ سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ مچھلی خود بخود حلال
 گوشت ہے اس کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں۔ بخلاف دوسرے بڑی جانوروں کے کہ جب تک
 ان کو اللہ کے نام پر ذبح نہ کر دے وہ حلال نہیں۔ مچھلی میں یہ شرط نہیں اس لئے وہ بنا بنا یا گوشت
 ہے۔ اور حلیہ کے معنی زیور کے ہیں، مراد اس سے موتی ہیں۔ آیت سے معلوم ہوا کہ موتی جس طرح
 دریائے شور میں پیدا ہوتے ہیں شیریں دریاؤں میں بھی ہوتے ہیں جو عام شہرت کے خلاف ہے
 کیونکہ معروف و مشہور یہی بات ہے کہ موتی دریائے شور (سمندر) میں پیدا ہوتے ہیں، اور
 حقیقت یہی ہے جو قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ دونوں میں موتی پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ
 شیریں دریاؤں میں بہت کم اور سمندر میں بہت زیادہ پیدا ہوتے ہیں زیادتی کی وجہ سے یہ
 شہرت ہو گئی کہ موتی صرف دریائے شور سے نکلتے ہیں۔

اور تَلْبَسُونََهَا میں صیغہ مذکر استعمال کرنے سے اس طرف اشارہ ہو گیا کہ موتیوں کا
 استعمال مردوں کے لئے بھی جائز ہے بخلاف سونے چاندی کے کہ ان کا بطور زیور استعمال کرنا
 مردوں کے لئے جائز نہیں (روح)

إِنْ خَلَّ عَوْهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ وَكَوَسَمِعُوا أَمَّا اسْتَجَابُوا لَكُمْ، یعنی یہ بتایا
 بعض نبیاء یا فرشتے جن کو تم خدا سمجھ کر پرستش کرتے ہو اگر ان کو مصیبت کے وقت پکارو گے
 تو وہ لایہ تمھاری بات سن ہی نہ سکیں گے، کیونکہ بتوں میں تو سننے کی صلاحیت ہے ہی نہیں، انبیاء
 اور فرشتوں میں اگرچہ صلاحیت ہے مگر نہ وہ ہر جگہ موجود ہیں نہ ہر ایک کے کلام کو سنتے ہیں۔
 آگے فرمایا کہ اگر بالعرض وہ سن بھی لیں جیسے فرشتے اور انبیاء تو پھر بھی وہ تمھاری درخواست
 پوری نہ کریں گے۔ کیونکہ ان کو خود قدرت نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اس سے کسی
 کی سفارش نہیں کر سکتے۔

سماع موتی کا مسئلہ جو پہلے گذر چکا ہے اس آیت سے نہ اس کا اثبات ثابت ہوتا
 ہے نہ نفی، اس بحث کے دلائل دوسرے ہیں جن کا ذکر سورۃ روم میں مفصل آچکا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (۱۵)

اے لوگو! تم ہو محتاج اللہ کی طرف، اور اللہ وہی ہے جو سب تعریفوں والا

إِنْ يَشَاءُ ذَهَبَكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ۝۱۶ وَمَا ذَلِكُ عَلَى اللَّهِ

اگر چاہے تم کو لے جائے اور لے آئے ایک نئی خلقت ، اور یہ بات اللہ پر

بِعَزِّيزٍ ۝۱۷ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَإِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ

مشکل نہیں ۔ اور نہ اٹھائیکا کوئی اٹھانے والا بوجھ دوسرے کا اور اگر بچہ کوئی بوجھل اپنا بوجھ

حِمْلَهَا لَا يَحْمِلُ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ إِنَّمَا تُنْفِذُ الَّذِينَ

بٹانے کو کوئی نہ اٹھائے اس میں سے ذرا بھی ، اگرچہ ہو قریبی ، تو تو ڈر سنا دیتا ہوں ان کو

يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ ۖ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۖ وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا

جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے دیکھے اور قائم رکھتے ہیں نماز ، اور جو کوئی سنوریکا تو یہی ہو کہ

يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ۖ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ۝۱۸ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ

سنوریکا اپنی فائدہ کو اور اللہ کی طرف ہر سب کو پھر جانا ۔ اور برابر نہیں اندھا

وَالْبَصِيرُ ۝۱۹ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۖ وَلَا الظِّلُّ وَلَا

اور دیکھتا ، اور نہ اندھیرا اور نہ اُجھالا ، اور نہ سایہ اور

الْحَرُورُ ۖ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ

نہ تو ۔ اور برابر نہیں جیتے اور نہ مردے ، اللہ

يُسْمِعُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ ۝۲۰ إِنْ

سنا تاہی جو کو چاہے اور تو نہیں سنانے والا قبر میں پڑے ہوؤں کو ، تو تو بس

أَنْتَ إِلَّا نَذِيرٌ ۝۲۱ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا

ڈر کی خبر پہنچانے والا ہے ۔ ہم نے بھیجاہی تجھ کو سچا دین دیکر خوشی اور ڈر سنانے والا ،

وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝۲۲ وَإِنْ يَكُنْ بِوَلَدِكَ

اور کوئی فرقہ نہیں جس میں نہیں ہو چکا کوئی ڈر سنانے والا ۔ اور اگر وہ تجھ کو جھٹلائیں تو آگے

كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِالْبَيِّنَاتِ

جھٹلا چکے ہیں جو لوگ کہ ان سے پہلے تھے ، پہنچے ان کے پاس رسول ان کے لیکر کھلی باتیں ،

وَبِالْزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ۝۲۵ ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِينَ كَفَرُوا

اور صحیفے اور روشن کتاب - پھر پکڑا میں نے منکروں کو

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ۝۲۶

سو کیسا ہوا انکار میرا -

خلاصہ تفسیر

اے لوگو تم (ہی) خدا کے محتاج ہو اور اللہ (تو) بے نیاز (اور خود تمام) نبیوں والا ہے (پس تمھاری حسیاج دیکھ کر تمھارے لئے توحید وغیرہ کی تعلیم کی گئی ہے، اگر تم نہیں مانو گے تو تم اپنا ضرر کرو گے۔ باقی حق تعالیٰ کو تو بوجہ غنائے ذاتی و کمال ذاتی کے تمھاری یا تمھارے عمل کی کوئی حاجت ہی نہیں، کہ اس کے ضرر کا احتمال ہو اور کفر پر جو ضرر ہونے والا ہے خدا تعالیٰ اس کے فی الحال ایقاع پر بھی قادر ہے، چنانچہ اگر وہ چاہے تو (تمھارے کفر کی سزائیں) تم کو فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق پیدا کر دے (جو تمھاری طرح کفر و انکار نہ کریں) اور یہ بات خدا کو کچھ مشکل نہیں لیکن مصلحت مہلت دے رکھی ہے۔ غرض یہاں تو وہ ضرر محض محتمل الوقوع ہے، لیکن قیامت میں وہ ضرر واقع ہو جائے گا، اور اس وقت یہ حالت ہوگی کہ کوئی دوسرے کا بوجھ (گناہ کا) نہ اٹھاوے گا اور (خود تو کوئی کسی کی کیا رعایت کرتا یہ حالت ہوگی کہ) اگر کوئی بوجھ کا لدا ہوا (یعنی کوئی گنہگار) کسی کو اپنا بوجھ اٹھانے کیلئے بلائے گا (بھی) تب بھی اس میں سے کچھ بھی بوجھ نہ ہٹایا جائے گا، اگرچہ وہ شخص (جس کو اس نے بلایا تھا اس کا) قرابت دار ہی (کیوں نہ) ہو پس اس وقت پورا ضرر اس کفر و بد عمل کا خود ہی بھگتنا پڑے گا یہ تو تحریر منکرین کی ہو گئی۔ آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تسلیہ ہے، کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اُن کے انکار پر جس کی سزا یہ ایک دن ضرور بھگتیں گے اس قدر غم و افسوس کیوں کرتے ہیں، آپ تو ایسا ڈرانا جس پر نفع مرتب ہو، صرف ایسے لوگوں کو ڈرا سکتے ہیں جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں (مراد اس الذین سے مؤمنین ہیں، یعنی آپ کے انداز سے صرف مؤمنین منتفع ہوتے ہیں فی الحال ہوں یا باعتبار آئندہ کے اور امر مشترک دونوں میں طلب حق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ طالب حق کو نفع ہو اگر تباہی یہ لوگ طالب حق ہیں ہی نہیں، اُن سے امید نہ رکھئے) اور آپ ان کے ایمان نہ لانے سے اس قدر فکر کیوں کرتے ہیں، جو شخص (ایمان لا کر شرک و کفر سے) پاک ہوتا ہے وہ اپنے

رفع کے لئے پاک ہوتا ہے اور جو نہیں ایمان لاتا وہاں بھگتے گا، کیونکہ سب کو اللہ کی طرف لوٹکر جانا ہے (پس نفع ہے تو ان کا، آپ کیوں غم کرتے ہیں، اور ان لوگوں سے کیا توقع رکھی جائے کہ ان کا علم و ادراک مثل ادراک مؤمنین کے ہو، اور مؤمنین کی طرح یہ بھی حق کو قبول کر لیں، اور قبول حق کے ثمرات دینی میں بھی یہ لوگ شریک ہو جائیں، کیونکہ مؤمنین کی مثال حق یعنی میں بنی آدمی کی سی اور ان کی مثال عدم ادراک حق میں اندھے آدمی کی سی ہے۔ اور اسی طرح مؤمن نے ادراک حق کے ذریعہ سے جس طریق ہدایت کو اختیار کیا ہے اس طریق حق کی مثال نور کی سی ہے، اور کافر نے عدم ادراک حق سے جس طریقہ کو اختیار کیا ہے اس کی مثال ظلمت کی سی ہے کما قال تعالیٰ وَجَعَلْنَا لَكُمُ نُورًا قَائِمًا يَبِيدُ فِي النَّاسِ كَمَثَلِ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا، اور اسی طرح جو ثمرہ جنت وغیرہ اس طریق پر مرتب ہوگا اس کی مثال ظلِ بار کی سی ہے، اور جو ثمرہ جہنم وغیرہ طریق باطل پر مرتب ہوگا، اس کی مثال جلتی دھوپ کی سی ہے، کما قال تعالیٰ ظِلٌّ مِّمَّا يَخُورُ فِي السُّمُومِ اور ظاہر ہے کہ) اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں، اور نہ تاریکی اور روشنی اور چھاؤں اور دھوپ پس نہ ان کا اور مؤمنین کا علم و ادراک برابر ہوگا اور نہ ان کا طریقہ اور نہ اس طریقہ کا ثمرہ اور (مؤمن اور کافر میں جو تفاوت بنیاداً بنا کا سا کہا گیا ہے تو اس سے مقصود نفی کمی کی ہے نہ کہ زیادتی کی۔ کیونکہ ان میں تفاوت مردہ اور زندہ کا سا ہے، پس ان کی برابری کی نفی کیلئے یوں بھی کہنا صحیح ہے کہ) زندے اور مردے برابر نہیں ہو سکتے (اور جب یہ مردے ہیں تو مردوں کو زندہ کرنا تو خدا کی قدرت میں ہی، بندہ کی قدرت میں نہیں۔ پس اگر خدا ہی اُن کو ہدایت کر دے تب تو اور بات ہے، کیونکہ) اللہ جس کو چاہتا ہے سنوا دیتا ہے (باقی آپ کی کوشش سے یہ لوگ حق کو قبول نہیں کریں گے، کیونکہ ان کی مثال تو مردوں کی آپ نے سن لی) اور آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں (مدفون) ہیں۔ لیکن اگر یہ نہ مانیں تو آپ غم میں نہ پڑیے کیونکہ) آپ تو کافروں کے حق میں (صرف ڈرانے والے ہیں) (آپ کے ذمہ یہ نہیں کہ وہ کافر ڈر کر مان بھی جائیں۔ اور یہ ڈرانا آپ کا اپنی طرف سے نہیں جیسا منکرینِ نبوت کہتے تھے بلکہ ہماری طرف سے ہے کیونکہ) ہم ہی نے آپ کو (دین، حق دے کر) (مسلمانوں کو) خوش خبری سنانے والا اور (کافروں کو) ڈرسانے والا... بنا کر بھیجا ہے اور یہ بھیجا کوئی انوکھی بات نہیں جیسا کافر کہتے تھے بلکہ) کوئی ایسی امت نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرسانے والا (یعنی پیغمبر) نہ گذرا ہو اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلا دیں تو آپ ان گزشتہ پیغمبروں کا جن کا ابھی اجمالاً ذکر ہوا ہے اور تفصیلاً دوسری آیات میں ذکر ہو، کافروں کے ساتھ معاملہ یاد کر کے اپنے دل کو سمجھا لیجئے، کیونکہ) جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے بھی (اپنے وقت کے پیغمبروں کو)

جھٹلایا تھا (اور) اُن کے پاس بھی ان کے پیغمبر معجزے اور صحیفے اور روشن کتابیں لے کر آئے تھے، یعنی بعض صحائف اور بعض بڑی کتابیں اور بعضے صرف معجزات تصدیق نبوت کے لئے اور احکام انبیاء سابقین لے کر آئے، پھر (جب انھوں نے جھٹلایا تو) میں نے ان کافروں کو پکڑ لیا سو رو دیکھو میرا کیسا عذاب ہوا اسی طرح ان کے وقت پر اُن کو سزا دوں گا۔

معارف و مسائل

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ، یعنی قیامت کے روز کوئی آدمی دوسرے آدمی کے گناہوں کا بوجھ نہ اٹھا سکے گا، ہر ایک کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا پڑے گا۔ اور سورۃ عنکبوت میں جو آیا ہے کہ وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ یعنی گمراہ کرنے والے لوگ اپنے گمراہ ہونے کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اتنا ہی دوسرا بوجھ اس کا اٹھائیں گے کہ انھوں نے دوسروں کو گمراہ کیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جن کو گمراہ کیا تھا اُن کا بوجھ یہ لوگ کچھ ہلکا کر دیں گے، بلکہ ان کا بوجھ اپنی جگہ ان پر پورا رہے گا، اور گمراہ کرنے والوں کا جرم دہرا ہونے کی وجہ سے ان کا بوجھ بھی دہرا ہو جائے گا، ایک گمراہ ہونے کا دوسرا دوسروں کو گمراہ کرنے کا۔ اُن لئے ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں (روح)

اور حضرت عکرمہؓ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ اس روز ایک باپ اپنے بیٹے سے کہے گا کہ تم جانتے کہ میں تمہارا کیسا شفیق اور مہربان باپ تھا وہ اقرار کرے گا کہ بیشک آپ کے احسانات بے شمار ہیں، اور میرے لئے آپ نے دنیا میں بہت کھفیتیں اٹھاتی ہیں۔ اب باپ کہے گا کہ بیٹا آج میں تمہارا محتاج ہوں، اپنی نیکیوں میں سے تھوڑی مجھے دید و کمبری نجات ہو جائے۔ بیٹا کہے گا کہ ابا جان آپ نے بہت تھوڑی سی چیز طلب کی، مگر میں کیا کروں اگر میں وہ آپ کو دیدوں تو میرا یہی حال ہو جائے گا، اس لئے مجبور ہوں۔ پھر وہ اپنی زوجہ سے یہی کہے گا کہ میں دنیا میں تم پر اپنا سب کچھ قربان کیا، آج مجھے تمہاری تھوڑی نیکیوں کی ضرورت ہے، وہ دید و۔ بیوی بھی وہی جواب دیگی جو بیٹے نے دیا تھا۔

حضرت عکرمہؓ نے فرمایا کہ یہی مراد ہے اس آیت کی، لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ، اور فرمایا کہ قرآن کریم نے متعدد آیات میں اس مضمون کو بیان فرمایا ہے، ایک جگہ لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدٍ وَلَا مَوْلَاٌ هُوَ جَارٍ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا، یعنی اس روز نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو عذاب چھڑا سکے گا نہ بیٹا باپ کو۔ مراد یہی ہے کہ کوئی دوسرے کا گناہ اپنے سر پر لے کر اس کو نہ بچائے گا۔ شفاعت کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں

فرمایا یَوْمَ یَفْرَأُ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ، یعنی اس روز انسان بھاگے گا اپنے بھائی اور ماں باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اولاد سے، بھاگنے کا حاصل یہی ہر وہ ڈرے گا کہ کہیں یہ اپنا گناہ مجھ پر ڈالنے کی یا میری کسی نیکی کو لینے کی فرمائش نہ کریں (ابن کثیر)

وَمَا أَنْتَ بِمُشِيرٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ، اس آیت کے شروع میں کفار کی مثال مردوں سے اور مؤمنین کی زندوں سے دی گئی ہے۔ اسی کی مناسبت سے یہاں مَنْ فِي الْقُبُورِ سے مراد کفار ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے ان زندہ کافروں کو بھی نہیں سنا سکتے۔

اس آیت نے خود یہ بات واضح کر دی کہ یہاں سنانے سے مراد وہ سنانا ہے جو مفید مؤثر اور نافع ہو، ورنہ مطلق سنانا تو کفار کو ہمیشہ ہوتا ہی رہا، اور مشاہدہ میں آتا رہا ہے کہ ان کو تبلیغ کرتے اور وہ سنتے تھے۔ اس لئے مراد اس آیت کی یہ ہے کہ جس طرح آپ مردوں کو کلام حق سنا کر راہِ حق پر نہیں لاسکتے کیونکہ وہ دنیا کے دارِ العمل سے آخرت کے دارِ الجزاء میں منتقل ہو چکے ہیں اداں اگر وہ ایمان کا اقرار بھی کر لیں تو معتبر نہیں اسی طرح کفار کا حال ہر اس ثابت ہوا کہ مردوں کے سنانے کی جو نفی اس آیت میں کی گئی ہے اس سے مراد خاص اسما سے نافع ہے جس کی وجہ سے سننے والا باطل کو چھوڑ کر حق پر آجائے۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ مسئلہ سماعِ موتی سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں، مسئلہ اپنی جگہ مستقل ہے کہ مردے زندوں کا کلام سننے میں یا نہیں۔ اس کی مفصل تحقیق سورۃ روم میں اور سورۃ نمل میں گذر چکی ہے۔

الْمَرْتَرَانِ أَنَّهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَخَرَجْنَا بِهِ شَرَابٍ

کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نے اُتارا آسمان سے پانی پھر ہم نے نکالے اس سے میوے

مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَحُمْرٌ مُخْتَلِفٌ

طرح طرح کے ان کے رنگ، اور پہاڑوں میں گھاٹیاں ہیں سفید اور سرخ طرح طرح کے

أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ (۲۷) وَمِنَ النَّاسِ وَالْدَّابِّ وَالْأَنْعَامِ

ان کے رنگ اور بھنگے کالے، اور آدمیوں میں اور کیڑوں میں اور چوپاؤں میں

مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ

کتنے رنگ ہیں اسی طرح، اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں جن کو سمجھ ہے،

إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ۲۸

تحقیق اللہ زبردست ہر بخشنے والا

خلاصہ تفسیر

راے مخاطب، کیا تو نے اس بات پر نظر نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا پھر ہم نے (پانی) کے ذریعہ مختلف رنگتوں کے پھل لگائے (خواہ اس طرح کہ ان کی انواع و اقسام ہی الگ الگ ہوں یا ایک ہی نوع اور ایک ہی قسم کے پھل مختلف رنگتوں کے ہوں) اور (اسی طرح) پہاڑوں کے بھی مختلف ہوتے ہیں (بعض سفید اور (بعض) سُرخ کہ پھر خود اُن سفید سُرخ) کی بھی رنگتیں مختلف ہیں، (بعض بہت سفید اور بہت سُرخ، بعض ہلکے سفید اور ہلکے سُرخ) اور (بعض نہ سفید نہ سُرخ بلکہ) بہت گہرے سیاہ اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپاؤں میں بھی بعض ایسے ہیں کہ ان کی رنگتیں مختلف ہیں، (بعض اوقات اختلاف اقسام و اصناف کے ساتھ یہ اختلاف رنگ ہوتا ہے، اور بعض اوقات ایک ہی قسم میں مختلف رنگ ہوتے ہیں، تو جو لوگ دلائل قدرت میں غور کرتے ہیں، ان کو خدا تعالیٰ کی عظمت کا علم ہوتا ہے، اور خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں (اگر علم عظمت کا محض اعتقادی اور عقلی ہے تو یہ خشیت بھی اعتقادی عقلی ہی رہے گی اور اگر علم عظمت درجہ حال تک پہنچ گیا ہو تو خشیت بھی درجہ حال کی ہوگی کہ اس کے خلاف سے طبعی نفرت و تکلیف ہونے لگے گی) واقعی اللہ تعالیٰ (سے ڈرنائی نفسہ بھی ضروری ہے کیونکہ وہ) زبردست ہے، (کہ سب کچھ کر سکتا ہے اور اپنے مطلب کے لئے بھی ضروری ہے کیونکہ وہ ڈرنے والوں کے گناہوں کا) بڑا بخشنے والا ہے۔

معارف و مسائل

رابط آیات | بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ان آیات میں عود ہے مضمون توحید کی طرف جس کو دلائل قدرت سے مدلل کیا گیا ہے۔ اور بعض نے فرمایا ہے کہ سابقہ آیات میں لوگوں کے احوال کا مختلف ہونا اور اس کی تمثیلات بیان فرمائی ہیں، وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمُتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ، یہ اسی کا مزید بیان و توضیح ہے کہ مخلوقات الہیہ میں باہمی تفاوت ایک خلقی اور طبعی امر ہے، اور نباتات و جمادات تک میں موجود ہے، اور یہ اختلاف صرف صورت اور رنگ ہی میں نہیں بلکہ طبائع میں بھی ہے۔

ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا، ثمرات میں اختلافِ الوان کو ترکیبِ نحوی کے اعتبار سے حال بنا کر مُخْتَلِفًا منصوب ذکر فرمایا ہے۔ اور آگے پہاڑوں میں رنگتوں کا اختلاف اسی طرح انسانوں اور چوپایوں وغیرہ میں یہ اختلاف بصورتِ صفت بیان فرمایا ہے۔ اسی لئے مُخْتَلِفٌ مرفوع لایا گیا۔ اس میں یہ اشارہ ہو سکتا ہے کہ ثمرات کا اختلافِ الوان تو ایک حال پر نہیں، وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بدلتا رہتا ہے، بخلاف پہاڑوں کے اور انسانوں اور جانوروں کے کہ ان کے جو رنگ ہیں وہ عموماً قائم رہنے والے ہیں بدلتے نہیں۔

اور پہاڑوں میں مُجَدِّدُ فرمایا، یہ جُدَّة کی جمع ہے جس کے معروف معنی اس چھوٹے سے رستہ کے ہیں جس کو جاوہ بھی کہا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے جُدَّة بمعنی قطعہ حصہ قرار دیا ہے۔ مطلب دونوں صورتوں میں پہاڑوں کے اجزاء کا مختلف الوان ہونا ہے، جن میں سب سے پہلے سفید کا اور آخر میں سیاہ کا ذکر فرمایا، درمیان میں احمر یعنی سرخ کے ذکر کے ساتھ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُ فرمایا اس میں اس طرف اشارہ نکل سکتا ہے کہ اصل رنگ دنیا میں دو ہی ہیں، سفید، سیاہ، اور باقی رنگ اسی سفیدی اور سیاہی کے مختلف درجوں سے مرکب ہو کر بنتے ہیں۔

كَذَٰلِكَ اَنۡشَاَ يَحۡشَى اللّٰهُ مِنۡ عِبَادٍۭہِ الْعُلَمَآءُ، اس جگہ لفظ كَذَٰلِكَ پر جمہور کے نزدیک وقف ہے، جو اس کی علامت ہے کہ یہ لفظ پچھلے مضمون کے ساتھ متعلق ہے۔ یعنی مخلوقات کو مختلف انواع و اقسام اور مختلف الوان پر بڑی حکمت کے ساتھ بنانا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی خاص نشانی ہے۔

اور بعض روایات سے مستفاد ہوتا ہے کہ اس لفظ کا تعلق اگلے جملے سے ہے۔ یعنی جس طرح ثمرات، پہاڑ، حیوانات اور انسان مختلف رنگوں پر منقسم ہیں اسی طرح خشیت اللہ میں بھی لوگوں کے درجات مختلف ہیں، کسی کو اس کا اعلیٰ درجہ حاصل ہے، کسی کو کم، اور مدار اس کا علم پر ہے جس درجہ کا علم ہر اسی درجہ کی خشیت بھی ہے (روح)

سابقہ آیات میں ارشاد فرمایا تھا اِنۡمَآ تُنۡذِرُ الْاٰنۡیَیۡنَ یَحۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ۔ جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے فرمایا تھا کہ آپ کے انذار و تبلیغ کا فائدہ تو صرف وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو غائبانہ اللہ تعالیٰ سے خوف و خشیت رکھتے ہیں اس کی مناسبت سے آیت اِنۡمَآ یَحۡشَى اللّٰهُ مِنۡ عِبَادٍۭہِ الْعُلَمَآءُ میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جن کو اللہ تعالیٰ کی خشیت حاصل ہے۔ اور جیسا پہلے کفار و منکرین کا اور ان کے احوال کا ذکر آیا ہے، اس میں خاص اولیاء اللہ کا ذکر ہے۔ لفظ اِنۡمَآ عربی زبان میں حصر بیان کرنے کے لئے آتا ہے، اس لئے اس جملے کے معنی بظاہر یہ ہیں کہ صرف علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں

مگر ابن عطیہ وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ حرف اِئْتَا جیسے حصر کے لئے آتا ہے ایسے ہی کسی کی خصوصیت کے بیان کرنے کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے، اور یہاں یہی مراد ہے کہ خشیت اللہ علماء کا وصف خاص اور لازم ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ غیر عالم میں خشیت نہ ہو (بجرحیط، ابو حیان) اور آیت میں لفظ علماء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ جل شانہ کی ذات و صفات کا کما حقہ علم رکھتے ہیں، اور مخلوقات عالم میں اس کے تصرفات پر اور اس کے احسانات و انعامات پر نظر رکھتے ہیں۔ صرف عربی زبان یا اس کے صرف و نحو اور فنون بلاغت جاننے والوں کو قرآن کی اصطلاح میں عالم نہیں کہا جاتا جب تک اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت مذکورہ طریق پر حاصل نہ ہو۔ حسن بصریؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ عالم وہ شخص ہے جو خلوت و جلوت میں اللہ سے ڈرے، اور جس چیز کی اللہ تعالیٰ نے ترغیب دی ہے وہ اس کو مرغوب ہو اور جو چیز اللہ کے نزدیک مبغوض ہے اس کو اس سے نفرت ہو۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:-

”یعنی بہت سی احادیث یاد کر لیتا یا
بہت باتیں کرنا کوئی علم نہیں بلکہ علم وہ ہے
جس کے ساتھ اللہ کا خوف ہو۔“

لَيْسَ الْعَالِمُ بِكَثْرَةِ الْحَدِيثِ
وَلَكِنَّ الْعِلْمَ عَنِ كَثْرَةِ
الْخَشْيَةِ

حاصل یہ ہے کہ جس قدر کسی میں خدا تعالیٰ کا خوف ہے وہ اسی درجہ کا عالم ہے۔ اور احمد بن صالح مصری نے فرمایا کہ خشیت اللہ کو کثرت روایت اور کثرت معلومات سے نہیں پہچانا جاسکتا بلکہ اس کو کتاب و سنت کے اتباع سے پہچانا جاتا ہے (ابن کثیر) شیخ شہاب الدین مہروردیؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جس شخص میں خشیت نہ ہو وہ عالم نہیں (منظری) اس کی تصدیق اکابر سلف کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ربیع بن انسؒ نے فرمایا:-

”یعنی جو اللہ سے نہیں ڈرتا وہ عالم نہیں۔“

مَنْ لَمْ يَخْشَ فَلَيْسَ بِعَالِمٍ

اور مجاہدؒ نے فرمایا:-

”یعنی عالم تو صرف وہی ہے جو اللہ سے ڈرے“

إِنَّمَا الْعَالِمُ مَنْ خَشِيَ اللَّهَ

سعد بن ابراہیم سے کسی نے — پوچھا کہ مدینہ میں سب سے زیادہ آفقہ کون ہے؟ تو فرمایا: اَتَقَاهُمْ لِرَبِّهِ ”یعنی جو اپنے رب سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔“ اور حضرت علی مرتضیٰؒ نے فقیہ کی تعریف اس طرح فرمائی:-

”فقیہ مکمل فقیہ وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی

إِنَّ الْفَقِيهَ حَقَّ الْفَقِيهِ مَنْ تَمَّ

يَقْنُطُ النَّاسُ مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ
وَلَمْ يَرْخُصْ لَهُمْ فِي مَعَاصِي
اللَّهِ تَعَالَى، وَلَمْ يُؤْمِنْهُمْ مِنْ
عَذَابِ اللَّهِ تَعَالَى وَلَمْ يَدْعُ
النَّاسَ أَنْ رَغِبَتْ عَنْهُ إِلَى غَيْرِهِ
أَنَّهُ لَا خَيْرَ فِي عِبَادَتِهِ لَا عِلْمَ
فِيهَا وَلَا عِلْمَ لَا فَتْنَةَ فِيهِ وَلَا
قِرَاعَةَ لَا تَنْبَرُ فِيهِ
(قرطبی)

رحمت سے مایوس بھی نہ کرے اور ان کو
گناہوں کی رخصت بھی نہ دے اور ان کو
اللہ کے عذاب سے مطمئن بھی نہ کرے، اور
قرآن کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی طرف
رغبت نہ کرے، (اور فرمایا) اس عبادت
میں کوئی خیر نہیں جو بے علم کے ہو اور اس
علم میں کوئی خیر نہیں جو بے فقہ یعنی بے سمجھ
بوجھ کے ہو اور اس قرأت میں کوئی خیر
جو بغیر تدبر کے ہو۔

مذکورہ تصریحات سے یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ بہت سے علماء کو دیکھا جاتا ہے کہ ان میں
خدا کا خوف و خشیت نہیں۔ کیونکہ تصریحات بالا سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک صرف عربی
جاننے کا نام علم اور جاننے والے کا نام عالم نہیں جس میں خشیت نہ ہو وہ قرآن کی اصطلاح
میں عالم ہی نہیں۔ البتہ خشیت کبھی صرف اعتقادی اور عقلی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے آدمی
بہ تکلف احکام شرعیہ کا پابند ہوتا ہے، اور کبھی یہ خشیت حالی اور ملکہِ راستہ کے درجہ میں ہو جاتی
ہے جس میں اتباع شریعت ایک تقاضائے طبیعت بن جاتا ہے۔ خشیت کا پہلا درجہ مأمور
اور عالم کے لئے ضروری ہے، دوسرا درجہ افضل و اعلیٰ ہے ضروری نہیں (از بیان القرآن)

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا

جو لوگ پڑھتے ہیں کتاب اللہ کی اور سیدھی کرتے ہیں نماز اور خرچ کرتے ہیں کچھ
رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تَجَارَةً لَّنْ تَبُورَ ۚ (۳۹) لِيُؤْفِقَهُمُ
ہمارا دیا ہوا چھپے اور کھلے امیدوار ہیں ایک بیوپار کے جس میں ٹوٹا نہ ہو، تاکہ پورا دے ان کو

أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ (۴۰)

ثواب ان کا اور زیادہ دے اپنے فضل سے، تحقیق وہ ہی بخشنے والا شکر دان۔

وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا

اور جو ہم نے تجھ پر اتاری کتاب وہی ٹھیک ہے تصدیق کرنے والی اپنے سے

بَيْنَ يَدَيْهِ إِنَّ اللَّهَ بِعِبَادِهِ لَخَبِيرٌ بَصِيرٌ ۝ (۳۱) ثُمَّ آوَيْنَا الْكِتَابَ

اگلی کتابوں کی، بیشک اللہ اپنی بندوں سے خبردار ہی دیکھنے والا۔ پھر ہم نے وارث کئے کتاب

الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فِيهِمْ خَلَامٌ لِنَفْسِنَا وَمِنْهُمْ

کے وہ لوگ جن کو چن لیا ہم نے اپنی بندوں میں سے، پھر کوئی ان میں بُرا کرتا ہو اپنی جان کا اور کوئی انہیں

مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ذَلِكَ هُوَ

توزیع کی چال پر اور کوئی ان میں آگے بڑھ گیا ہو لیکر خوبیاں اللہ کے حکم سے، یہی ہے

الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ۝ (۳۲) جَنَّاتٌ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ

بڑی بڑی۔ باغ ہیں بسنے کے جن میں وہ جائیں گے وہاں ان کو گھنا پہنایا جائے گا

أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ۝ (۳۳) وَقَالُوا

کسنگ سونے کے اور موتی کے اور ان کی پوشاک وہاں ریشمی ہو۔ اور کہیں گے

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ ۝ (۳۴)

شکر ہے اللہ کا جس نے دور کیا ہم سے غم بیشک ہمارا رب بخشنے والا قدردان ہے

الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمَقَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ

جس نے اتارا ہم کو آباد رہنے کے گھر میں اپنے فضل سے نہ پہنچے ہم کو اس میں مشقت،

وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ ۝ (۳۵) وَالَّذِينَ

اور نہ پہنچے ہم کو اس میں تھکنا، اور جو لوگ

كَفَرُوا وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فِيمَوتُوا وَلَا يَخَفُ

مسکریں ان کے لئے ہر آگ دوزخ کی، نہ تو ان پر حکم پہنچے کہ مر جائیں اور نہ ان پر ہلکی

عَنْهُمْ مَنْ عَذَابُهَا كَذَلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ ۝ (۳۶) وَهُمْ يَصْطَرِّخُونَ

وہاں کی کچھ کلفت، یہ سزا دیتے ہیں ہم ہر ناشکر کو۔ اور وہ چلاتے ہیں

فِيهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۝

اس میں ارب ہم کو نکال کہ ہم کچھ بھلا کام کر لیں وہ نہیں جو کرتے رہے،

أَوَلَمْ نَحْصِرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمْ النَّذِيرُ

کیا ہم نے عمر نہ دی تھی تم کو اتنی کہ جس میں سوچ نے جس کو سوچنا ہو اور پہنچا تھا کہ پاس ڈرانے والا

فَذُرُوا أَفْئَالَ الظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ (۳۷)

اب چھو کہ کوئی نہیں گنہگاروں کا مددگار۔

خلاصہ تفسیر

اور جو لوگ کتاب اللہ (یعنی قرآن) کی تلاوت (مع العمل) کرتے رہتے ہیں اور (خصوصاً) واہتمام کے ساتھ نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ (جس طرح بن پڑتا ہے) خرچ کرتے ہیں وہ (بوجہ وعدۃ الہیہ کے) ایسی (دائم النفع) تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ماند نہ ہوگی (کیونکہ اس سودے کا خریدار کوئی مخلوقات میں سے نہیں ہے جو کبھی تو سودے کی قدر کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا خریدار خود حق تعالیٰ ہوگا جو ضرور حسب وعدہ اپنی غرض سے نہیں بلکہ محض اُن کی نفع رسانی کے لئے اس کی قدر کرے گا) تاکہ ان کو اُن کے اعمال کی اجر تیں (بھی) پوری (پوری) دیں (جس کا بیان آگے آئے گا، جنت عدن الخ) اور علاوہ اجرت کے) اُن کو اپنے فضل سے اور زیادہ (بھی) دیں، (مثلاً یہ کہ ایک نیکی کا ثواب دس کے برابر دیں) کما قال تعالیٰ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ مَثَلًا بَلْ يَزِيدُ فَرِحًا بَعْدَ فَرِحٍ (پس ان کے اعمال میں کچھ کوتاہی رہ بھی گئی تب بھی اس کی ایسی قدر کی کہ اجرت کے علاوہ انعام بھی دیا) اور قرآن مجید پر عمل کرنے کی برکت سے جو ان کو اجر و فضل ملا سو واقعی قرآن مجید ایسی ہی چیز ہے (کیونکہ) یہ کتاب جو ہم نے آپ کے پاس وحی کے طور پر بھیجی ہے یہ بالکل ٹھیک ہو جو کہ اپنے سے پہلی کتابوں کی بھی (بائیں معنی) تصدیق کرتی ہے کہ ان کو اصل کے اعتبار سے منزل من اللہ بتلاتی ہے، اگرچہ بعد میں محرف ہو گئی ہوں، غرض یہ کتاب ہر طرح کامل ہے، اور چونکہ (يَفْتِنَا اللَّهُ تَعَالَىٰ اٰیَاتِهِ بَعْدَ ذٰلِكَ) کی (حالت کی) پوری خبر رکھنے والا (اور ان کی مصلحتوں کو) خوب دیکھنے والا ہے (اس لئے اس وقت ایسی ہی کتاب کامل کا نازل کرنا قرین حکمت بھی تھا اور کتاب کامل کا عامل مستحق جزائے کامل ہی کا ہوگا جو کہ مجموعہ ہر اصل اجر اور مزید فضل کا پس اس اجر و فضل کے افاصلہ کے لئے یہ کتاب ہم نے اول آپ پر نازل کی اور) پھر یہ کتاب ہم نے ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچائی جن کو ہم نے اپنے (تمام دنیا جہان کے) بندوں میں سے (باعتبار ایمان کے) پسند فرمایا،

مراد اس سے اہل اسلام ہیں جو اس حیثیت ایمان سے تمام دنیا والوں میں مقبول عند اللہ ہیں گوان میں کوئی دوسری وجہ مثل بد عملی کے موجب ملامت بھی ہو۔ مطلب یہ کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں وہ کتاب پہنچائی، پھر ان منتخب اور پسندیدہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں، (۱) بعضے تو ان میں کوئی گناہ کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعضے ان میں (جو نہ گناہ کرتے ہیں اور نہ طاعات میں ضروریات سے تجاوز کرتے ہیں) متوسط درجہ کے ہیں اور بعضے ان میں وہ ہیں جو خدا کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کئے چلے جاتے ہیں رکہ گناہوں سے بھی بچتے ہیں اور فرائض کے ساتھ غیر فرائض کی بھی ہمت کرتے ہیں۔ غرض ہم نے تینوں قسم کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں وہ کتاب پہنچائی اور یہ (یعنی ایسی کتاب کامل کا پہنچا دینا خدا کا) بڑا فضل ہے (کیونکہ اس پر عمل کرنے کی بدولت کیسے اجر و ثواب کے مستحق ہو گئے آگے اس اجر و فضل مذکورہ بالا کا بیان ہے کہ) وہ (اجر و فضل) باغات ہیں ہمیشہ رہنے کے جس میں یہ لوگ (مذکورین آیت *إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ الْكِتَابَ*) داخل ہوں گے (اور) ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے، اور پوشاک اُن کی وہاں رشیم کی ہوگی اور وہاں (داخل ہو کر) کہیں گے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر جس نے ہم سے (ہمیشہ کے لئے بچ و) غم دور کیا بیشک ہمارا پروردگار بڑا بخشنے والا بڑا قادر دان ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا جہاں نہ ہم کو کوئی تکلف پہنچے گی، اور نہ ہم کو کوئی خستگی پہنچے گی (یہ تو عاملان کتاب اللہ و احکام کا حال ہوا) اور جو لوگ (برخلاف انکے) کافر ہیں ان کے لئے دوزخ کی آگ ہے، نہ تو ان کو موت ہی آئے گی کہ مر ہی جاویں (اور) مر کر چھوٹ جاویں) اور نہ دوزخ کا عذاب ہی اُن سے ہلکا کیا جائے گا، ہم ہر کافر کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں اور وہ لوگ اس (دوزخ) میں دپڑے ہوئے (چلا دیں گے) کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو (یہاں سے) نکال لیجئے ہم (اب خوب) اچھے (اچھے) کام کریں گے برخلاف ان کاموں کے جو (پہلے) کیا کرتے تھے (ارشاد ہو گا کہ) کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی کہ جس کو سمجھنا ہو تا وہ سمجھ سکتا اور (صرف عمر ہی دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ) تمہارے پاس (ہماری طرف سے) ڈرانے والا (یعنی پیغمبر) بھی پہنچا تھا (خواہ بواسطہ یا بلا واسطہ) مگر تم نے ایک نہ سنی، سو (اب اُس نہ ماننے کا) مزہ چکھو کہ ایسے ظالموں کا (یہاں) کوئی مددگار نہیں (ہم تو بوجہ ناراضی کے مدد نہ کریں گے) اور دوسرے لوگ بوجہ عدم قدرت)۔

معارف و مسائل

ان آیات سے پہلی آیت میں علماء حق جو عارف باللہ ہوں ان کی ایک ایسی صفت کا ذکر تھا جس کا تعلق قلب سے ہے، یعنی خشیت اللہ۔ مذکور الصدر پہلی آیت میں انہی اولیاء اللہ کی چند ایسی صفات کا ذکر ہے جو اعضاء و جوارح سے ادا ہوتی ہیں۔ ان میں پہلی صفت تلاوت قرآن ہی اور مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو تلاوت کتاب اللہ پر مداومت کرتے ہیں۔ یَتْلُوْنَ بِصَبْغٍ مَضْرُوعٍ اس کی طرف مشیر ہے۔ اور بعض حضرات نے اس جگہ یَتْلُوْنَ اس کے لغوی معنی میں لیا ہے یعنی وہ عمل میں اتباع کرتے ہیں قرآن کا، مگر پہلی تفسیر راجح ہے۔ اگرچہ سیاق و سباق سے یہ بھی متعین ہے کہ تلاوت وہی معتبر ہے جس کے ساتھ قرآن پر عمل بھی ہو، مگر لفظ تلاوت اپنے معنی معنی میں ہے۔ اسی طرح حضرت مطرف بن عبد اللہ ابن شخیخ نے فرمایا ہے هَذِهِ آيَةُ الْفُقَرَاءِ یعنی یہ آیت قرآن کے لئے ہے، جو تلاوت قرآن کو اپنا مشغلہ زندگی بناتے ہیں۔

ان کی دوسری صفت اقامت صلوٰۃ اور تیسری اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا ہے۔ خرچ کرنے کے ساتھ ستر و علانیۃً فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ اکثر عبادات میں ریاہ سے بچنے کے لئے خفیہ کرنا بہتر ہوتا ہے، مگر بعض اوقات مصالح دینیہ اس کو بھی مقتضی ہوتی ہیں کہ اعلان کے ساتھ کیا جائے، جیسے نماز جماعت کہ میناروں پر اذان دے کر اور زیادہ سے زیادہ اجتماع کے ساتھ علانیہ طور پر ادا کرنے کا حکم ہے۔ اسی طرح بعض اوقات اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا اظہار بھی دوسروں کی ترغیب کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ حضرات فقہائے نماز اور اتفاق فی سبیل اللہ دونوں میں یہ تفصیل فرمائی ہے کہ فرض و واجب یا سنت مؤکدہ ہے اس کو تو علانیہ کرنا بہتر ہے اس کے سوا نفلی نماز کا خفیہ ادا کرنا بہتر ہے۔ اسی طرح جہاں مال خرچ کرنا فرض یا واجب ہے، جیسے زکوٰۃ فرض یا صدقۃ الفطر یا قربانی ان میں علانیہ خرچ کرنا بہتر اور افضل ہے، باقی صدقات نافلہ کو خفیہ خرچ کرنا افضل ہے۔

جو لوگ ان تینوں صفات کے حامل ہوں یعنی تلاوت قرآن پر مداومت اور اقامت صلوٰۃ اور اللہ کی راہ میں خوش دلی کے ساتھ مال خرچ کرنا کہ صرف فرض و واجب ہی کی حد تک نہ رہے بلکہ نفلی صدقات بھی کریں۔ آگے ان کی ایک صفت یہ بتائی کہ یَرْجُوْنَ تَجَارَةً تَرْجُوْنَ تَبَوُّرًا، تَرْجُوْنَ تَبَوُّرًا، بَوَّارًا مشتق ہے، جس کے معنی ضائع ہو جانے کے ہیں۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ صفات مذکورہ کے پابند مومنین ایک ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس میں کبھی خسارہ نہیں ہوتا۔ امیدوار

ہونے کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ مومن کو دنیا میں اپنے کسی بھی نیک عمل پر یقین کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ ہمیں ضرور بخشوا دے گا، اور اس کا اجر و ثواب ہمیں یقینی ملے گا۔ کیونکہ مکمل مغفرت اور بخشش تو کسی انسان کی بھی صرف اس کے عمل سے نہیں ہو سکتی، کیونکہ انسان کتنا بھی عمل صالح کرے مگر وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و عبادت کے حق کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے مغفرت سب کی اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر نہیں ہوگی، جیسا کہ ایک حدیث میں اس مضمون کی تصریح آئی ہے۔ اس کے علاوہ ہر نیک عمل کے ساتھ آدمی کو اس خطرہ سے بھی غافل نہیں ہونا چاہئے کہ بہت سے نیک اعمال میں کوئی مخفی کید شیطانی یا نفسانی شامل ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ مقبول نہیں ہوتا، یا بعض اوقات ایک نیک عمل کے ساتھ کوئی بُرا عمل ایسا ہو جاتا ہے جو نیک عمل کی مقبولیت سے بھی مانع ہو جاتا ہے۔ اس لئے آیت میں لفظ یزجرون لاکر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ سارے اعمال صالحہ کی پابندی کے بعد بھی کسی کو اپنی نجات اور درجات عالیہ کا یقین کر لینے کا حق نہیں، بس زیادہ سے زیادہ امید ہی کر سکتے ہیں۔ (روح)

اعمال صالحہ کی مثال تجارت سے | اس آیت میں ان اعمال صالحہ مذکورہ کو بطور تشبیہ و مثال ایک تجارت سے تعبیر کیا گیا، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کو تجارت سے تعبیر فرمایا ہے: هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ تَوُفُّوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ، تجارت کی مثال اس وصف میں ہے کہ تاجر اپنا سرمایہ اور وقت کسی کام میں اس وقت لگاتا ہے کہ اس سے اس کا سرمایہ بڑھ جائے گا، اور نفع پہونچے گا۔ لیکن دنیا کی ہر تجارت میں نفع کے ساتھ نقصان و خسارہ کا بھی احتمال لگا رہتا ہے۔ آیت مذکورہ میں تجارت کے ساتھ کج تبوّر کا لفظ بڑھا کر اشارہ کر دیا کہ اس تجارت آخرت میں نقصان و خسارہ کا کوئی احتمال نہیں۔ اور اللہ کے نیک بندے جو اعمال صالحہ میں مشقت و محنت اٹھاتے ہیں وہ عام تجارتوں کی طرح تجارت نہیں کرتے، بلکہ ایک ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس میں کبھی خسارہ نہیں ہوتا۔ اور ان کی امیدواری کا ذکر کرنا اشارہ خفی اس طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کریم الکرم ہیں، وہ امیدواروں کی امید کو قطع نہیں کریں گے بلکہ پورا کریں گے، بلکہ اگلے جملے میں یہ بھی فرمادیا کہ ان کی امید تو صرف اپنے عمل کا پورا بدلہ ملنے تک محدود ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ان کی امیدوں سے بھی زیادہ عطا فرمائیں گے۔ یَوْفِیْهِمْ أَجْرَهُمْ وَبِزَيَادَةٍ مِّنْ فَضْلِهِ، لفظ یَوْفِیْهِمْ کا تعلق لَنْ تَبُورَ سے ہے۔ یعنی ان کی تجارت خسارے کی محتمل

نہیں بلکہ ان کے اجر و ثواب ان کو پورے پورے ملیں گے، اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے منظورہ اجر و ثواب سے بھی کہیں زیادہ عطا فرمائیں گے۔

اس فضل و زیادتی میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی شامل ہے کہ مؤمن کے عمل کا اجر حق تعالیٰ چند در چند کر کے عطا فرماتے ہیں، جس کی ادنیٰ مقدار عمل کا دس گنا اور زیادہ سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے، اور دوسرے گناہگاروں کے حق میں ان کی سفارش قبول کرنا اس فضل میں شامل ہے جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس فضل کی تفسیر میں یہ روایت کی ہے کہ ان لوگوں پر دنیا میں جس نے احسان کیا تھا یہ لوگ اس کی سفارش کریں گے تو باوجود سزائے جہنم کے مستحق ہونے کے ان کی سفارش سے ان کو نجات ہو جائے گی۔ (تفسیر منطہری بحوالہ ابن ابی حاتم) اور یہ ظاہر ہے کہ شفاعت صرف اہل ایمان کے لئے ہو سکے گی، کافر کی شفاعت کی کسی کو اجازت نہ ہوگی، اسی طرح جنت میں حق تعالیٰ کا دیدار بھی اس فضل کا جزو اعظم ہے۔

ثُمَّ آدُرُّنَا ذَٰلِكَ كِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِكَ، حرف ثمّ عطف کے لئے آتا ہے اور اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس حرف سے پہلے اور بعد کی دونوں چیزیں اصل وصف میں مشترک ہونے کے باوجود تقدیم و تاخیر رکھتی ہیں۔ پہلی چیز مقدم اور بعد کی چیز مؤخر ہوتی ہے، پھر یہ تقدیم و تاخیر کبھی زمانے کے اعتبار سے ہوتی ہے، کبھی رتبہ اور درجہ کے اعتبار سے۔ اس آیت میں حرف ثمّ عطف ہو اس سے پہلی آیت کے لفظ اَوْحَيْنَا پر، معنی یہ ہیں کہ ہم نے یہ کتاب یعنی قرآن جو خالص حق ہی ہے، اور تمام پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، پہلے بطور وحی آپ کے پاس بھیجی، اس کے بعد ہم نے اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنادیا جن کو ہم نے منتخب اور پسند کر لیا ہے اپنے بندوں میں سے۔ یہ اول و آخر اور مقدم و مؤخر ہونا رتبہ اور درجہ کے اعتبار سے تو ظاہر ہے ہی کہ قرآن کا بذریعہ وحی آپ کے پاس بھیجنا رتبہ اور درجہ میں مقدم ہے اور امت محمدیہ کو عطا فرمانا اس سے مؤخر ہے۔ اور اگر امت کو وارث قرآن بنانے کا مطلب یہ لیا جائے کہ آپ نے اپنے بعد کے لئے امت کے واسطے زر و زین کی وراثت چھوڑنے کے بجائے اللہ کی کتاب بطور وراثت چھوڑی، جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی شہادت موجود ہے کہ انبیاء و رہم و دینار کی وراثت نہیں چھوڑا کرتے، وہ وراثت میں علم چھوڑتے ہیں، اور ایک دوسری حدیث میں علماء کو وارث انبیاء فرمایا ہے، تو اس لحاظ سے یہ تقدیم و تاخیر زمانی بھی ہو سکتی ہے کہ ہم نے یہ کتاب آپ کو عنایت فرمائی ہے پھر آپ نے اس کو امت کے لئے بطور وراثت چھوڑا۔ وارث بنانے کا مراد عطا کرنا ہے، اس عطا کو بلفظ میراث تعبیر کرنے میں قرآن اشارہ ہے کہ جس طرح وارث میراث کا حصہ بغیر کسی عمل اور

کوشش کے مل جاتا ہے، قرآن کریم کی یہ دولت بھی ان منتخب بندوں کو اسی طرح بغیر کسی محنت و مشقت کے دیدی گئی ہے۔

اُمّتِ محمدیہ خصوصاً اس کے علماء اَذِیْنَ اَصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا، یعنی جن کو ہم نے منتخب اور پسندیدہ کی ایک اہم فضیلت و خصوصیت قرار دیدیا اپنے بندوں میں سے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد اُمّتِ محمدیہ ہے، اس کے علماء بلا واسطہ اور دوسرے لوگ بواسطہ علماء۔ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اَذِیْنَ اَصْطَفَيْنَا سے مراد اُمّتِ محمدیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر اس کتاب کا وارث بنایا ہے جو اس نے اتاری ہے، (یعنی قرآن سب کتب سابقہ کی تصدیق و حفاظت کرنے والی کتاب ہونے کی حیثیت سے۔ تمام آسمانی کتابوں کے مضامین کی جامع ہے، اس کا وارث بننا گویا سب آسمانی کتابوں کا وارث بننا ہے) پھر فرمایا قَدْ اِلٰھُمْ يُخَفِّرُ لَهُمْ مَقْتَصِدٌ هُمْ يَحْتَسِبُ حِسَابًا يَسِيرًا وَ سَابِقُهُمْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ، یعنی اُس اُمّت کا ظالم بھی بخشا جائے گا اور میانہ روی کرنے والے سے آسان حساب لیا جائے گا، اور سابق بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا (ابن کثیر)

اس آیت میں لفظ اَصْطَفَيْنَا سے اُمّتِ محمدیہ کی سب سے بڑی عظیم فضیلت ظاہر ہوئی۔ کیونکہ لفظ اصطفاء قرآن کریم میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے لئے آیا ہے، اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنْ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنْ النَّاسِ، اور ایک آیت میں ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓ اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَّ اٰلَ عِمرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ، آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اُمّتِ محمدیہ کو اصطفاء یعنی انتخاب میں انبیاء اور ملائکہ کے ساتھ شریک فرمادیا، اگرچہ اصطفاء کے درجہ مختلف ہیں، انبیاء و ملائکہ کا اصطفاء اعلیٰ درجہ میں اور اُمّتِ محمدیہ کا بعد کے درجہ میں ہے۔

اُمّتِ محمدیہ کی تین قسمیں | فَمِنْهُمْ طٰٓئِفٌ لِّنَفْسٍ مِّنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ یہ جملہ پہلے جملے کی تفسیر و توضیح ہے۔ یعنی ہم نے اپنی جن بندوں کو منتخب اور پسند فرما کر ان کو قرآن کا وارث بنایا ہے، ان کی تین قسمیں ہیں، ظالم، مقتصد، سابق۔

ان تینوں قسموں کی تفسیر امام ابن کثیرؒ نے اس طرح بیان فرمائی ہے کہ ظالم سے مراد وہ آدمی ہے جو بعض واجبات میں کوتاہی کرتا ہے اور بعض محرمات کا بھی ارتکاب کر لیتا ہے اور مقتصد یعنی درمیانی چال چلنے والا، وہ شخص ہے جو تمام واجبات شرعیہ کو ادا کرتا ہے اور تمام محرمات سے بچتا ہے، مگر بعض اوقات بعض مستحبات کو چھوڑ دیتا ہے اور بعض مکروہات میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور سابق بالخیرات وہ شخص ہے جو تمام واجبات اور مستحبات کو ادا کرتا ہے، اور تمام محرمات و مکروہات سے بچتا ہے، اور بعض مباحات

کو اشتغال عبادت یا شبہ حرمت کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے۔

یہ ابن کثیر کا بیان ہے۔ دوسرے مفسرین نے ان تین قسموں کی تفسیر میں بہت مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ روح المعانی میں بحوالہ تحریر تینتالیس اقوال کا ذکر کیا ہے، مگر غور کیا جائے تو ان میں سے اکثر کا حاصل وہی ہے جو اد پر ابن کثیر کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک شبہ اور جواب [مذکورہ تفسیر سے یہ ثابت ہوا کہ الَّذِیْنِ اصْطَفَيْنَا سے مراد اُمتِ محمدیہ ہے اور اس کی یہ تین قسمیں ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس کی پہلی قسم یعنی ظالم بھی الَّذِیْنِ اصْطَفَيْنَا یعنی اللہ کے منتخب بندوں میں شامل ہے، اس کو بظاہر مستبعد سمجھ کر بعض لوگوں نے کہا کہ یہ اُمتِ محمدیہ اور اصطفینا سے خارج ہے۔ مگر بہت سی احادیث صحیحہ معتبرہ سے ثابت ہے کہ یہ تینوں قسمیں اُمتِ محمدیہ کی ہیں اور اصطفینا کے وصف سے خارج نہیں۔ یہ اُمتِ محمدیہ کے مؤمن بندوں کی انتہائی خصوصیت اور فضیلت ہے کہ ان میں جو عملی طور پر ناقص بھی ہیں وہ بھی اس شرف میں داخل ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے اس جگہ وہ سب روایات حدیث جمع کر دی ہیں۔ ان میں بعض یہ ہیں :-

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ الَّذِیْنِ اصْطَفَيْنَا کی تینوں قسموں کے متعلق فرمایا کہ یہ سب ایک ہی مرتبے میں ہیں اور سب جنت میں ہیں۔ (رداۃ احمد ابن کثیر) ایک مرتبہ میں ہونے سے مراد یہ ہے کہ سب کی مغفرت ہو جائے گی اور سب جنت میں جائیں گے، یہ مطلب نہیں کہ درجات کے اعتبار سے ان میں تفاضل نہ ہوگا۔

اور حضرت ابوالدرداءؓ سے باسانید متعدد ایک حدیث منقول ہے، ابن کثیر نے ان سب کو نقل کیا ہے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو ابن جریر نے ابو ثابتؓ سے نقل کی ہے کہ وہ ایک روز مسجد میں گئے تو وہاں ابوالدرداءؓ پہلے سے بیٹھے تھے، ابو ثابتؓ ان کے برابر جا کر بیٹھ گئے اور یہ دعا کرنے لگے، اَللّٰهُمَّ اِنِّسْ وَحْشَتِيْ وَارْحَمْ غُرْبَتِيْ وَكَيْسِرِيْ جَلِيْسًا صَالِحًا، یعنی یا اللہ میری قلبی وحشت و پریشانی کو دور فرما، اور میری حالتِ مسافرت پر رحم فرما، اور مجھے کوئی جلس (رہنشین) صالح نصیب فرما دے (یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سلف صالحین میں جلس صالح کی طلب و تلاش کا کیا درجہ تھا کہ اس کو اہم مقصد اور سب پریشانی کا علاج سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے اس کی دعائیں مانگتے تھے) ابوالدرداءؓ نے یہ دعا سنی تو فرمایا کہ اگر آپ اپنی اس دعا و طلب میں سچے ہیں تو میں اس معاملہ میں آپ سے زیادہ خوش نصیب ہوں۔ (مطلب یہ ہے کہ مجھے اللہ نے آپ جیسا جلس صالح بے مانگے دیدیا) اور فرمایا کہ

میں آپ کو ایک حدیث سنا تا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، مگر جب سے میں نے اس کو سنا ہے اب تک کسی سے بیان کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ یہ ہو کہ آپ نے اس آیت کا ذکر فرمایا ثُمَّ أَوْرَثْنَا لِكُلِّ شَيْءٍ أَصْطَفَيْنَا الْأَيَّةَ پھر فرمایا کہ ان تین قسموں میں سے جو سابق بالخیرات ہیں وہ تو بے حساب جنت میں جاتیں گے اور جو مقتصد یعنی درمیانہ ہیں ان سے ہلکا حساب لیا جائے گا، اور ظالم یعنی جو اعمال میں کوتاہی کرنے والے اور گناہوں کی لغزش میں مبتلا ہوئے ہوں، ان کو اس مقام میں سخت رنج و غم طاری ہوگا، پھر ان کو بھی جنت میں داخلہ کا حکم ہو جائے گا، اور سب رنج و غم دور ہو جائیں گے۔ اسی کا ذکر اگلی آیت میں آیا ہے:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ "یعنی وہ کہیں گے شکر ہے اللہ کا جس نے ہمارا غم دور کر دیا۔"

اور طبرانی نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وَكُلُّكُمْ مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ، یعنی یہ تینوں قسمیں اسی اُمتِ محمدیہ میں سے ہوں گی۔ اور ابو داؤد و طیالسی نے عقبہ ابن صہبان بنائی سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے اُمّ المؤمنین حضرت صدیقہ عائشہؓ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی تو انھوں نے فرمایا، بیٹیا یہ تینوں قسمیں جنتی ہیں۔ ان میں سے سابق بالخیرات تو وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں گزر گئے، جن کے جنتی ہونے کی شہادت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیدی، اور مقتصد وہ لوگ ہیں جو ان کے نشان قدم پر چلے، اور سابقین کی اقتداء پر قائم رہیں۔ ان کے ساتھ مل گئے، باقی رہی ظالم لنفسہ، تو ہم تم جیسے لوگ ہیں۔ یہ صدیقہ عائشہؓ کی تو واضح تھی کہ اپنے آپ کو بھی انھوں نے تیسرے درجہ میں یعنی ظالم لنفسہ میں شمار کیا حالانکہ وہ احادیث صحیحہ کی تصریحات کے مطابق سابقین و تین میں سے ہیں۔

اور ابن جریر نے حضرت مجاہد بن حنفیہؓ سے نقل کیا، فرمایا کہ یہ اُمتِ اُمّتِ مرحومہ ہے اس کا ظالم بھی مغفور ہو اور مقتصد یعنی میانہ رُوح جنت میں ہے، اور سابق بالخیرات اللہ کے نزدیک درجات عالیہ میں ہے۔

اور حضرت محمد بن علی باقر رضی اللہ عنہ نے ظالم لنفسہ کی تفسیر میں فرمایا الَّذِي خَلَطَ عَمَلًا صَلَاحًا وَآثَرَ سَيِّئًا، یعنی وہ شخص جس نے نیک و بد دونوں طرح کے اعمال میں خلط ملط کیا ہو۔

علامہ امت محمدیہ کی عظیم الشان فضیلت | اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ہم نے

اپنی کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جو ہمارے بندوں میں منتخب اور برگزیدہ ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کتاب اللہ اور علوم نبوت کے بلا واسطہ وارث حضرات علماء ہیں، جیسا کہ حدیث میں بھی ارشاد ہے **أَلْحَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ**۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن و سنت کے علوم کا مشغلہ اخلاص کے ساتھ نصیب فرمایا یہ اس کی علامت ہے کہ وہ اللہ کے برگزیدہ اولیاء ہیں، جیسا کہ حضرت ثعلبہ بن حکمؓ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز علماء برائمت سے خطاب فرما کر کہیں گے کہ میں نے تمہارے سینوں میں اپنا علم و حکمت صرف اسی لئے رکھا تھا کہ میرا ارادہ یہ تھا کہ تمہاری مغفرت کر دوں عمل تمہارے کیسے بھی ہوں (یہ ادھر معلوم ہو چکا ہے کہ جس شخص میں خشیت اور خوف خدا نہیں وہ علماء کی فہرست ہی سے خارج ہے۔ اس لئے یہ خطاب اپنی لوگوں کو ہو گا جو خشیت اللہ میں رنگے ہوئے ہوں ان سے یہ ممکن ہی نہیں ہو گا کہ بے فکری سے گناہوں میں ملوث رہیں، ہاں طبیعت بشریہ کے تقاضوں سے کبھی کبھی لغزش اُن سے بھی ہوتی ہے۔ اسی کو اس حدیث میں فرمایا کہ عمل تمہارے کیسے بھی ہوں تمہارے لئے مغفرت مقدر ہے)۔

یہ سب روایات تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں، اور آخری حدیث جو حضرت ثعلبہؓ سے روایت کی گئی ہے اس کو طبرانی نے بھی روایت کیا ہے، جس کی سند کے سب رجال ثقاہ ہیں۔ (تفسیر منطہری) اور تفسیر منطہری میں بحوالہ ابن عساکر حدیث مذکور کا یہی مضمون ابو عمر صنعانی سے بھی روایت کیا ہے، اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں اللہ اپنے سب بندوں کو جمع فرما دیں گے پھر ان میں سے علماء کو ایک ممتاز مقام پر جمع کر کے فرما دیں گے:

اِنِّیْ لَمَّا ضَعَّ عَلَیْکُمْ اِلَہً	یعنی میں نے اپنا علم تمہارے قلوب
لَعَلَّیْ بِکُمْ وَ لَمَّا ضَعَّ عَلَیْکُمْ	میں اسی لئے رکھا تھا کہ میں تم سے دان
فَیْکُمْ لَا عَیْنَ بِکُمْ اِنطَلِمْ	تمہارا کہ تم اس امانت علم کا حق ادا کر گئے
قَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ	میں نے اپنا علم تمہارے سینوں میں اس لئے

نہیں رکھا تھا کہ تمہیں عذاب دہاؤں میں نے تمہاری مغفرت کر دی (منطہری)
فائدہ:۔ اس آیت میں سب سے پہلے ظالم کو پھر مقتصد کو آخر میں سابق بالخیرات کو ذکر فرمایا ہے۔ اس ترتیب کا سبب شاید یہ ہو کہ تعداد کے اعتبار سے ظالم نفسہ سب سے زیادہ ہیں ان سے کم مقتصد اور ان سے کم سابق بالخیرات ہیں، جن کی تعداد زیادہ تھی ان کو مقدم کیا گیا۔

ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ جَنَّتٌ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَيُؤْتَوْنَ عُقَاقِيبًا سُمُّهُمْ فِيهَا حَرِيسٌ، شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ منتخب لوگوں کی تین قسمیں بتلائی ہیں، پھر فرمایا ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ، یعنی ان تینوں کو برگزیدہ بندوں میں شمار کرنا یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔ آگے ان کی جزاء کا بیان ہے کہ یہ جنت میں جائیں گے، ان کو سونے کے کنگن اور موتیوں کے زیور پہنائے جائیں گے، اور لباس ان کا ریشمی ہوگا۔

دنیا میں مردوں کے لئے سونے کا زیور پہننا بھی حرام ہے اور ریشمی لباس بھی، اس کے عوض میں ان کو جنت میں یہ سب چیزیں دی جائیں گی۔ اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جاتے کہ زیور پہننا تو عورتوں کا کام ہے، مردوں کے شایانِ شان نہیں، کیونکہ آخرت اور جنت کے حالات کو دنیا کے حالات پر قیاس کرنا بے عقلی ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کے سروں پر تاج موتیوں سے مرتع ہوں گے، ان کے ادنی موتی کی روشنی ایسی ہوگی کہ مشرق سے مغرب تک پورے عالم کو روشن کر دے گی۔ (رواہ الترمذی والحاکم وصححہ الدبیہقی، از مظہری)

امام قرطبی نے فرمایا کہ حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ ہر جنتی کے ہاتھ میں کنگن پہنائے جائیں گے، ایک سونے کا ایک چاندی کا ایک موتیوں کا۔ جنتی کنگن کے متعلق ایک آیت میں چاندی کے اور دوسری میں سونے کے مذکور ہیں۔ اس تفسیر سے ان دونوں آیتوں میں تطبیق بھی ہوگئی۔

جو شخص دنیا میں سونے چاندی کے برتن اور ریشمی لباس استعمال کرے گا جنت میں ان محروم ہوگا۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ریشمی لباس نہ پہننا، اور سونے چاندی کے برتنوں میں پانی نہ پیو، اور نہ اُن کی پلیٹ کھانے میں استعمال کرو، کیونکہ یہ چیزیں دنیا میں کفار کے لئے ہیں اور تمھارے لئے آخرت میں (بخاری و مسلم) اور حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس مرد نے دنیا میں ریشمی کپڑا پہنا وہ آخرت میں نہ پہن سکے گا۔ (بخاری و مسلم) اور حضرت ابوسعید خدریؓ کی ایک روایت میں ہے کہ دنیا میں ریشمی لباس پہننے والا مرد آخرت میں اس سے محروم ہوگا، اگرچہ جنت میں چلا بھی جائے۔ (مظہری)

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ، یعنی اہل جنت جنت میں داخل ہونے کے وقت کہیں گے، شکر ہے اللہ کا جس نے ہمارا غم دور کر دیا۔ اس غم سے کیا مراد

اس میں ائمہ تفسیر کے مختلف اقوال ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ سارے ہی رنج و غم اس میں داخل ہیں دنیا میں انسان کتنا ہی بڑا بادشاہ بن جائے یا بی ودلی رنج و غم کسی کو چھٹکارا نہیں دے دریں دنیا کسے بے غم نباشد۔ وگر باشد بنی آدم نباشد۔ اس دنیا میں غموں اور فکروں سے کسی نیک یا بد کو نجات نہیں، اسی لئے اہل دانش دنیا کو دارالاحزان کہتے ہیں۔ اس آیت میں جس غم کے دور کرنے کا ذکر ہے اس میں یہ دنیا کے غم بھی سب کے سب داخل ہیں، دوسرا غم و فکر قیامت اور حشر و نشر کا، تیسرا حساب کتاب کا، چوتھا جہنم کے عذاب کا، اہل جنت سے اللہ تعالیٰ یہ سب غم دور فرمادیں گے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کلمہ لا الہ الا اللہ والوں میں نہ موت کے وقت کوئی وحشت ہوتی ہے، نہ قبر میں اور نہ حشر میں۔ گویا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ جس وقت یہ لوگ اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو یہ کہتے ہوں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا اَلْحَزْنَ (رواہ الطبرانی، منہری)

اور حضرت ابوالدرداء کی حدیث جو ادھر گزری ہو اس میں جو یہ فرمایا ہے کہ یہ قول اُن لوگوں کا ہوگا جو ظالم لنفسہ ہیں۔ کیونکہ حشر میں ان کو ابتداء سخت رنج و غم اور اضطراب پیش آئے گا۔ آخر میں دخول جنت کا حکم مل کر یہ رنج و غم دور ہو جائے گا۔ اس حدیث ابن عمر کے منافی نہیں، کیونکہ ظالم لنفسہ کو دوسروں کے غموں سے زیادہ ایک غم حشر میں بھی پیش آئے گا، جو دخول جنت کے وقت دور ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ قول تو سہی اہل جنت کہیں گے، خواہ سابقین میں سے ہوں یا مقتصدین میں سے یا ظالم لنفسہ، لیکن ہر ایک کے غموں کی فہرست الگ الگ ہونا کچھ مستبعد نہیں۔

امام جصاص نے فرمایا کہ مؤمن کی شان یہی ہے کہ دنیا میں فکر و غم سے خالی نہ رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ کے حالات میں ہے کہ یہ حضرات اکثر محزون و مغموم نظر آتے تھے۔

الَّذِیْ اٰخَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا اَلْغُوْبُ، اس آیت میں جنت کی چند خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ اول یہ کہ وہ دارالمقام ہے اس کے زوال یا وہاں سے نکالے جانے کا کسی وقت خطرہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہاں کسی کو کوئی غم پیش نہ آئے گا۔ تیسرے یہ کہ وہاں کسی کو تکلیف محسوس نہیں ہوگا جیسے دنیا میں آدمی کو تکلیف ہوتا ہے، کام چھوڑ کر نیند کی ضرورت محسوس کرتا ہے، جنت اس

سے بھی پاک ہوگی۔ بعض روایات حدیث میں بھی یہ مضمون مذکور ہے (منظری)

أَوَلَمْ نَعَبِّرْكُمْ بِمَآئِمِّنْ مَّا بَيْنَ يَدَيْهِ مَنْ تَنَزَّلَ وَجَاءَ كُودُ النَّارِ جُودًا، یعنی جیب جہنم میں یہ فریاد کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار آپ ہمیں اس عذاب سے نکال دیجئے اب ہم نیک عمل کریں گے اور پچھلی بد اعمالیوں کو چھوڑ دیں گے۔ اس وقت یہ جواب دیا جائے گا کہ کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر کی مہلت نہیں دی تھی جس میں غور کرنے والا غور کر کے صحیح راستہ پر آجائے۔ حضرت علی ابن حسین زین العابدین رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے مراد سترہ سال کی عمر ہے۔ اور حضرت قتادہؓ نے اٹھارہ سال کی عمر بتلائی اور مراد اس سے عمر بلوغ ہے، اور سترہ اٹھارہ کا فرق بلوغ میں ہو سکتا ہے کہ کوئی سترہ سال میں بالغ ہو کوئی اٹھارہ سال میں۔ عمر بلوغ شریعت میں پہلی حد ہے جس میں داخل ہو کر انسان کو منجانب اللہ اتنی عقل دیدی جاتی ہے کہ اپنے پچھلے برے کو سمجھنے لگے۔ اس لئے یہ خطاب عام کفار سے ہوگا، خواہ طویل العمر ہوں یا قصیر العمر۔ البتہ جس کو عمر طویل ملی اور پھر بھی اس نے ہوش نہ سل بھالا، اور دلائل قدرت کو دیکھ کر اور انبیاء کی باتیں سن کر حق کو نہ پہچانا وہ زیادہ مستحق ملامت ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کو صرف عمر بلوغ ملی اس کو بھی قدرت نے اتنا سامان دیدیا تھا کہ حق و باطل میں امتیاز کر سکے جب نہ کیا تو وہ بھی مستحق ملامت و عذاب کا ہے، لیکن جس کو زیادہ عمر طویل ملی اس پر اللہ تعالیٰ کی حجت اور زیادہ پوری ہو گئی وہ اگر اپنے کفر و معصیت سے باز نہ آیا وہ زیادہ مستحق عذاب و ملامت ہے۔

حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا وہ عمر جس پر اللہ تعالیٰ نے گناہگار بندوں کو عار دلانی ساٹھ سال ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے ایک روایت میں چالیس اور دوسری میں ساٹھ سال کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ وہ عمر ہے جس میں انسان پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے، اور انسان کو کوئی عذر کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ ابن کثیر نے حضرت ابن عباسؓ کی اس دوسری حدیث کو ترجیح دی ہے۔

تقریر مذکور سے واضح ہو چکا ہے کہ سترہ اٹھارہ سال کی روایات اور ساٹھ سال کی روایات میں کوئی تعارض نہیں۔ اگرچہ انسان سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں اس قابل ہوتا ہے کہ غور و فکر کرے حق و باطل میں تمیز کرے، اسی لئے اسی عمر بلوغ سے اس کو احکام شریعیہ کا مکلف قرار دیا گیا ہے، مگر ساٹھ سال ایسی عمر طویل ہے کہ اگر اس میں بھی کسی نے حق کو نہ پہچانا تو اسے کسی عذر کی گنجائش نہیں رہی، اس پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری طرح تمام ہو چکی۔ اسی لئے امت مرحومہ کی عام عمر میں ساٹھ سال سے ستر سال تک مقدریں، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے :-

أَعْمَارًا مَّتًى مَّا بَيْنَ الْيَسْتَيْنِ
إِلَى السَّبْعِينَ وَآقَلَهُمْ مَّتًى
يَجُوزُ ذَلِكَ، (رواه الترمذی و

ابن ماجہ، ابن کثیر)

یعنی میری امت کے عمریں ساٹھ سے
ستر سال تک ہوں گی، کم لوگ ہوں گے
جو اس سے تجاوز کریں گے ۱۱

آخر آیت میں فرمایا وَجَاءَ كُمُ الْمَتْنِ بَرٌّ، اس میں اشارہ ہے کہ انسان کو عمر بلوغ
کے وقت سے اتنی عقل و تمیز منجانب اللہ عطا ہو جاتی ہے کہ کم از کم اپنے خالق و مالک کو پہچانے
اور اس کی رضا جوئی کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے۔ اتنے کام کے لئے خود انسانی عقل بھی کافی
تھی، مگر اللہ جل شانہ نے صرف اسی پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ اس عقل کی امداد کے لئے نذیر
بھی بھیجے، نذیر کے معنی ارد میں ڈرانے والے کے کئے جاتے ہیں، درحقیقت نذیر وہ شخص
ہو جو اپنی رحمت و شفقت کے سبب اپنے لوگوں کو ایسی چیزوں سے بچنے کی ہدایت کرے
جو اس کو ہلاکت یا مضرت میں ڈالنے والی ہیں اور ان چیزوں سے لوگوں کو ڈرائے۔ مراد اس سے
معروف معنی کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء ہیں۔ حاصل آیت کا یہ
ہو کہ ہم نے حق و باطل کو پہچاننے کے لئے عقل بھی دی، اس کے ساتھ اپنے پیغمبر بھی بھیجے جو
حق کی طرف ہدایت کریں باطل سے بچائیں۔

اور حضرت ابن عباس رضی عنہما، اور امام جعفر باقر سے منقول ہے کہ نذیر سے مراد
بڑا مصاپے کے سفید بال ہیں، کہ جب وہ ظاہر ہو جائیں تو وہ انسان کو — اس کی ہدایت
کرتے ہیں کہ اب رخصت کا وقت قریب آگیا ہے۔ یہ قول بھی پہلے قول سے متعارض نہیں
کہ سفید بال بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نذیر ہوں اور انبیاء و علماء بھی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کو بالغ ہونے کے بعد سے جتنے حالات پیش آتے ہیں اس
کے اپنے وجود اور گرد و پیش میں جو تغیرات و انقلابات آتے ہیں، وہ سب ہی اللہ تعالیٰ کی
طرف سے نذیر اور انسان کو متنبہ کرنے والے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمُ غَيْبِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ عَلِيمُ بِذَاتِ

اللہ بھید جاننے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اس کو خوب معلوم ہے جو بات ہے

الصُّدُورِ ۳۸) هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَسَنُ

دلوں میں، وہی ہے جس نے کیا تم کو قائم مقام زمین میں پھر کوئی

كُفِّرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ط وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

ناشکری کرے تو اس پر پڑے اس کی ناشکری، اور منکروں کو نہ بڑھے گی ان کے انکار سے ان کے رنجے سامنے

إِلَّا مَقْتَبًا وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرَهُمْ إِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾ قُلْ

مگر بیزاری، اور منکروں کو نہ بڑھے گا ان کے انکار سے مگر نقصان۔ تو کہہ بھلا

أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَ كُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي

دیکھو تو اپنے شریکوں کو جن کو پکارتے ہو اللہ کے سوائے دکھلاؤ تو مجھ کو

مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ أَمْ

کیا بنایا انھوں نے زمین میں یا کچھ ان کا سا جھاپے آسمانوں میں، یا ہم نے

أَتَيْنَهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَى بَيِّنَةٍ مِّنْهُ بَلْ إِنَّا نَعِدُ الظَّالِمُونَ

دی ہر ان کو کوئی کتاب سو یہ سندر رکھتے ہیں اس کی، کوئی نہیں پر جو وعدہ بتلاتے ہیں گنہگار

بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ﴿۴۰﴾ إِنَّ اللَّهَ يُبْسِكُ السَّمَوَاتِ وَ

ایک دوسرے کو سب فریب ہے۔ تحقیق اللہ تھام رہا ہے آسمانوں کو اور

الْأَرْضِ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ

زمین کو کہ ٹل نہ جائیں، اور اگر ٹل جائیں تو کوئی نہ تھام سکے اُن کو

مِّنْ بَعْدِهَا إِنَّهُ كَانَ خَلِيفًا غَفُورًا ﴿۴۱﴾

اس کے سوائے وہی تحمل والا بخشنے والا۔

خُلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ وہی، جاننے والا ہے آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کا بیشک وہی جاننے والا ہے دل کی باتوں کا پس کمال علی تو اس کا ایسا ہے، اور کمال عملی جو کہ قدرت اور نعت دونوں پر دلالت کرتا ہے یہ ہے کہ وہی ایسا ہی جس نے تم کو زمین میں آباد کیا، (اور ان دلائل احسانات کا مقتضایہ تھا کہ استدلالاً و شکرًا توحید و اطاعت اختیار کر لیتے، مگر بعض نے اس کے خلاف کفر و عداوت پر مصر ہیں) سو (کسی دوسرے کا کیا بگڑتا ہے، بلکہ) جو شخص کفر کریگا

اس کے کفر کا وبال اسی پر پڑے گا اور اس وبال کی تفصیل یہ ہے کہ (کافروں کے لئے ان کا کفر ان کے پروردگار کے نزدیک ناراضی ہی بڑھنے کا باعث ہوتا ہے (جو دنیا ہی میں متحقق ہو جاتی ہے اور نیز) کافروں کے لئے ان کا کفر آخرت میں (خسارہ بڑھنے کا باعث ہوتا ہے (کہ وہ حرامان ہے۔ حنث سے اور کُندہ بننا ہے جہنم کا اور یہ جو کفر و شرک پر مصر ہیں) آپ (ان سے ذرا یہ تو) کہتے کہ تم اپنے قرار دادہ شریکوں کا حال تو بتلاؤ جن کو تم خدا کے سوا پوجا کرتے ہو، یعنی مجھ کو یہ بتلاؤ کہ انھوں نے زمین کا کونسا حصہ بنایا ہے یا ان کا آسمان (بنائے) میں کچھ سا جھا ہے، (تاکہ دلیل عقلی سے ان کا استحقاق عبادت ثابت ہو، یا ہم نے ان کافروں) (کو کوئی کتاب دی ہے (جن میں شرک کے اعتقاد کو درست لکھا ہو) کہ یہ اس کی دلیل پر قائم ہوں (اور اس دلیل نقلی سے اپنے دعوے کو ثابت کر دیں۔ اصل یہ ہے کہ نہ دلیل عقلی ہے نہ دلیل نقلی ہی، بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے نری دھوکہ کی باتوں کا وعدہ کرتے آئے ہیں کہ ان کے بڑوں نے ان کو بے سند غلط بات بتلا دی کہ (لَهُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُشْفَعُونَ عِندَ اللَّهِ) حالانکہ واقع میں وہ محض بے اختیار ہیں، پس وہ مستحق عبادت نہیں ہو سکتے۔ البتہ مختار مطلق حق تعالیٰ ہے تو وہی قابل عبادت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے مختار اور دوسروں کے غیر مختار ہونے کے دلائل میں سے نمونہ کے طور پر ایک مختصر سی بات بیان کرتے ہیں کہ دیکھو یہ تو یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو (اپنی قدرت سے) تھامے ہوئے ہے کہ وہ موجودہ حالات کو چھوڑ نہ دیا اور اگر (بالفرض) وہ موجودہ حالت کو چھوڑ بھی دیں تو پھر خدا کے سوا اور کوئی ان کو تھام بھی نہیں سکتا۔ (جب ان سے پیدا شدہ عالم کی حفاظت بھی نہیں ہو سکتی تو عالم کو وجود میں لانے اور ایجاد کرنے کی ان سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے، پھر استحقاق عبادت کیسا اور باوجود بطلان کے شرک کرنا مقتضی اس کو تھا کہ ان کو ابھی سزا دی جاوے مگر چونکہ وہ حلیم (ہے) اس لئے مہلت دے رکھی ہے، اور اگر اس مہلت میں یہ لوگ حق کی طرف آجاویں تو چونکہ وہ (غفور (بھی) ہے، اس لئے سب گزشتہ شرارتیں ان کی معاف کر دی جاویں)۔

معارف و مسائل

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ، خلافت خلیفہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں نائب اور قائم مقام۔ مراد یہ ہے کہ ہم نے انسانوں کو یہ بعد دیگرے زمین و مکان وغیرہ کا مالک بنایا ہے ایک جاتا ہی تو دوسرے کو اس کی جگہ ملتی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے لئے بڑی عبرت ہے۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ خطاب امت محمدیہ کو

ہو کہ ہم نے پچھلی قوموں کے بعد ان کے خلیفہ کی حیثیت سے تم کو مالک و متصرف بنایا ہے، لہذا تمہارا فرض ہے کہ اپنے سے پہلے لوگوں کے حالات سے عبرت حاصل کرو، عمر کے قیمتی لمحات کو غفلت میں نہ گزارو۔

إِنَّ اللَّهَ يُسَيِّرُ السَّمَوَاتِ، آسمانوں کو روکنے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی حرکت بند کر دی بلکہ مراد اپنی جگہ سے ہٹ جانا اور ٹل جانا ہے، جیسا کہ لفظ اَنْ تَزُولَا اس پر شاید ہر اس لئے اس آیت میں آسمان کے متحرک یا ساکن ہونے میں سے کسی جانب پر کوئی دلیل نہیں۔

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْدِيهِمْ لَئِنْ جَاءَهُمْ نَذِيرٌ لَّيَكُونُنَّ

اور قسمیں کھاتے تھے اللہ کی تاکید کی قسمیں اپنی کہ اگر آئے گا ان کے پاس ڈر سنانے والا البتہ بہتر

أَهْدَىٰ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا مِرًّا فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُمْ

راہ چلیں گے ہر ایک اُمت سے پھر جب آیا ان کے پاس ڈر سنانے والا اور زیادہ ہو گیا

إِلَّا لُفُورًا ۚ (۳۲) إِنْ تَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَكْرُ السَّيِّئِ لَا يَحِيقُ

ان کا بد کنا، غرور کرنا ملک میں اور داؤ کرنا بُرے کام کا اور بُرائی کا داؤا لٹر گا

الْمَكْرُ السَّيِّئِ إِلَّا بِأَهْلِهِ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ج

انہی داؤ والوں پر، پھر اب وہی راہ دیکھتے ہیں پہلوں کے دستور کی،

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ۚ (۳۳)

سو تو نہ پائے گا اللہ کا دستور بدلتا، اور نہ پائے گا اللہ کا دستور ٹلتا۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ

کیا پھرے نہیں ملک میں کہ دیکھ لیں کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو

مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ

ان سے پہلے تھے اور تھے ان سے بہت سخت زور میں اور اللہ وہ نہیں جسکو تھکائے

مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ۚ (۳۴)

کوئی چیز آسمانوں میں اور نہ زمین میں وہی ہر سب کچھ جانتا کر سکتا۔

وَلَوْ يَوَاحِدُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهَا مِنْ

اور اگر پکڑ کرے اللہ لوگوں کی آن کی کمائی پر نہ چھوڑے زمین کی پیٹھ پر ایک بھی

ذاتِ آبِ وَلَٰكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ

پلنے چلنے والا پر اُن کو ڈھیل دیتا ہوا ایک مقرر وعدہ تک ، پھر جب آئے گا ان کا وعدہ

قَالَ اللَّهُ كَانَ بِعِبَادِي بَصِيرًا ﴿۲۵﴾

تو اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے سب بندے

خلاصہ تفسیر

اور ان کفار (قریش) نے (قبل بعثت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) بڑی زوردار قسم

کھائی تھی کہ اگر ان کے (یعنی ہمارے) پاس کوئی ڈرانے والا (یعنی پیغمبر) آئے تو وہ (یعنی ہم)

ہر ہر امت سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں (یعنی یہود و نصاریٰ وغیرہ کی طرح ہم تکذیب

نہ کریں گے سو پہلے سے تو یہ قسمیں کھایا کرتے تھے) پھر جب اُن کے پاس ایک پیغمبر (یعنی رسول

صلی اللہ علیہ وسلم) آ پہنچے تو بس ان کی نفرت ہی کو ترقی ہوئی دنیا میں اپنے کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے

اور صرف نفرت ہی پر اکتفا نہیں ہوا بلکہ ان کی بُری تدبیروں کو بھی ترقی ہوئی، یعنی تکبر

کی وجہ سے آپ کے اتباع سے عار تو ہوئی ہی تھی، مگر یہ بھی نہ کیا کہ نہ اتباع ہوتا اور نہ ورپے آثار

ہوتے، بلکہ آپ کی ایذا رسانی کی فکر میں لگ گئے۔ چنانچہ ہر وقت اُن کا اسی میں لگا رہنا معلوم

(مشہور ہے) اور (یہ جو کچھ ہمارے رسول کے لئے بُری بُری تدبیریں کر رہے ہیں خود اپنا ہی ضرر

کر رہے ہیں، کیونکہ) بُری تدبیروں کا وبال (حقیقی) ان تدبیروں ہی پر پڑتا ہے (گو ظاہر میں

کبھی اس شخص کو بھی ضرر پہنچ جائے جس کو ضرر پہنچانا چاہا ہے، لیکن وہ ضرر دنیوی ہے

بخلاف ظالم ضرر رسال کے کہ اُس پر اخروی ضرر و وبال پڑے گا اور دنیوی ضرر اخروی ضرر

کے سامنے لاشے ہے۔ پس اس ضرر حقیقی کے اعتبار سے حصر بالکل واقعی ہے) سو (یہ جو

آپ کی عداوت اور ضرر رسانی پر مصر ہیں تو) کیا یہ (اپنے ساتھ بھی حق تعالیٰ کے) اسی دستور

کے منتظر ہیں جو اگلے (کافر) لوگوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے (یعنی عذاب و ہلاکت) سو (واقعی

ان کے لئے بھی یہی ہوتا ہے کیونکہ) آپ خدا کے (اس) دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پادیں گے کہ

ان پر بجائے عذاب کے عنایت ہونے لگے) اور (اسی طرح) آپ — خدا کے (اس) دستور

کو بھی منتقل ہوتا ہوا نہ پادیں گے کہ ان کی جگہ دوسروں کو جو ایسے نہ ہوں عذاب ہونے لگے

مطلب یہ کہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ کافروں کو عذاب ہوگا، خواہ دنیا میں بھی خواہ صرف آخرت میں، اور حق تعالیٰ کا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔ پس نہ یہ احتمال ہے کہ ان کو عذاب نہ ہو اور نہ یہ احتمال ہے کہ دوسرے بے گناہوں کو عذاب ہونے لگے۔ مقصود اس تکریر سے تاکید ہے وقوع عذاب کی، اور یہ جو سمجھتے ہیں کہ کفر موجب تعذیب نہیں ہے تو ان کی بڑی غلطی ہے۔ کیا یہ لوگ زمین میں (مثلاً شام اور یمن کے سفروں میں عادی و محمود قوم لوط علیہ السلام کی بستوں میں، چلے پھرے نہیں جن میں دیکھتے بھالتے کہ جو (منکر) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا (آخری) انجام (اسی تکذیب کے سبب) کیا ہوا کہ معذب ہوئے، حالانکہ وہ قوت میں ان سے بڑھے ہوئے تھے اور (کسی میں خواہ کیسی ہی قوت ہو لیکن) خدا ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز رقت والی (اس کو ہر ادے نہ آسمان میں اور نہ زمین میں) کیونکہ وہ بڑے علم والا (اور) بڑی قدرت والا ہے پس علم سے اپنے ہر ارادہ کے نافذ کرنے کا طریقہ جانتا ہے اور اپنی قدرت سے اس کو نافذ کر سکتا ہے، اور دوسرا کوئی ایسا ہے نہیں۔ پھر اس کو کون چیز ہرا سکتی ہے) اور اگر یہ اس دھوکہ میں ہوں کہ اگر ہم کو عذاب ہونا ہوتا تو ہو چکتا، اور اس سے اپنے شرک و کفر کے اچھے ہونے پر استدلال کریں تو یہ بھی ان کی غلطی ہے، کیونکہ بمقتضائے حکمت ان کے لئے فوری عذاب تجویز نہیں کیا گیا ورنہ اگر اللہ تعالیٰ (ان) لوگوں پر ان کے اعمال (کفریہ) کے سبب (فوراً) دار و گیر فرمانے لگتا تو روسے زمین پر ایک متنفس کو نہ چھوڑتا، (کیونکہ کفار تو کفر سے ہلاک ہو جاتے اور اہل ایمان بوجہ قلت کے دنیا میں نہ رکھو جاتے۔ کیونکہ نظام عالم بمقتضائے حکمت مجموعہ کے ساتھ وابستہ ہے، اور یہ ضرور نہیں کہ وہ اسی عذاب سے ہلاک ہوتے۔ اور دوسری مخلوقات اس لئے کہ مقصود ان کی تخلیق کا انتفاع بنی آدم ہے، جب یہ نہ ہوتے تو وہ بھی نہ رہتے) لیکن اللہ تعالیٰ ان کو ایک میعاد معین یعنی قیامت تک ہمت دے رہا ہے، سو جب ان کی وہ میعاد آپہنچے گی اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آپ دیکھ لے گا یعنی ان میں جو کفار ہوں گے ان کو سزا دے لے گا۔

معارف و مسائل

وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئِ إِلَّا بِأَهْلِهِ، لَا يَحِيقُ کے معنی لَا يَحِيطُ یا لَا يُصِيبُ کے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ بُری تدبیر کا وبال اور کسی پر نہیں پڑتا، بلکہ خود ایسی تدبیر کرنے والے ہی پر پڑتا ہے۔ یعنی جو شخص دوسروں کا بُرا چاہتا ہے وہ خود بُرائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس پر جو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں تو بہت مرتبہ یہ بھی مشاہدہ ہوتا ہے کہ بُری

تدبیر کرنے والے کی تدبیر حل جاتی ہے اور جس کو نقصان پہنچانا ہوتا ہے اس کو نقصان پہنچ جاتا ہے اس کا ایک جواب تو خلاصہ تفسیر میں آگیا ہے کہ اس کو جو تکلیف یا نقصان پہنچا وہ تو دنیا کا نقصان ہے، اور ایسی بُری تدبیر کرنے والے کا نقصان آخرت کا عذاب ہے، جو اشد بھی ہے اور دائمی بھی، اس کے مقابلہ میں اس کا دنیوی نقصان کا عدم ہے۔

دوسرا جواب بعض حضرات نے یہ بھی دیا ہے کہ کسی بے گناہ کے خلاف تدبیر کرنے اور اس پر ظلم کرنے کا وبال ظالم پر اکثر دنیا میں بھی پڑ جاتا ہے۔ محمد بن کعب قرظی نے فرمایا کہ تین کام ایسے ہیں جن کا کرنے والا دنیا میں بھی وبال و عذاب سے نہیں بچتا، ایک کسی بے گناہ کے حق میں بُری تدبیر کر کے اس کو ایذا پہنچانا، دوسرے عام ظلم، تیسرے عہد شکنی (ابن کثیر) خصوصاً جو کسی ایسے شخص پر کیا جائے جو بے گناہ ہو، انتقام پر قدرت نہ رکھتا ہو یا باوجود قدرت انتقام کے صبر کرے، اس پر ظلم کے وبال سے دنیا میں بھی کسی کو بچتے نہیں دیکھا ہے بس تجربہ کر دیکھ دریں دیر مکافات ۛ؎ بادر دکشاں ہر کہ در افتاد براققاد اس کا حاصل یہ ہو گا کہ آیت میں جو حصر یہاں کیا گیا ہے وہ اکثری قاعدہ کے اعتبار سے ہے کھلی نہیں۔ واللہ اعلم ۛ؎

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُورَةُ الْفَاتِرِ بِحَسَنِ اللّٰهِ
فِي تَاسِعِ صَفَرِ ثَلَاثَةِ اَلْفِ ثَلَاثِ مِائَةٍ وَتِسْعِ يَوْمِ السَّبْتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُورَةُ يُسْ

سُورَةُ يُسْ بِمَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلَاثٌ وَثَمَانُونَ آيَةً وَتَجُوزُ بِرُكُوعَاتٍ

سورۃ یس مکہ میں نازل ہوئی اس میں تراسی آیتیں ہیں اور پانچ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

يُس ۱ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ ۲ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۳

یس ۱ تم ہے اس پختہ قرآن کی ، تو تحقیق ہے بھیجے ہوؤں میں سے

عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۴ تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۵ لِيُنذِرَ

ادب سیدھی راہ کے ، اتار اُتار دستِ رحم والے نے ، تاکہ تو ڈرائے

قَوْمًا مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ ۶ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ

ایک قوم کو کہ ڈر نہیں سنا ان کے باپ دادوں نے سو ان کو خبر نہیں ، ثابت ہو چکی ہر بات

عَلَى أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۷ إِنَّا جَعَلْنَا فِيْ أَعْيُنِهِمْ

ان میں بہتوں پر سو وہ نہ مانیں گے ۔ ہم نے ڈالے ہیں ان کی گردنوں میں

عہ آج جبکہ میں سورۃ یس کی تفسیر شروع کر رہا ہوں ماہ صفر کی نویں تاریخ ہے، ماہ صفر ۱۳۵۵ھ میں اسی تاریخ

کو میرے والد ماجد مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تھی اس سورۃ کے ساتھ نام ہیں شترانگ

اور تاریخ وفات نے ان کی یاد کو تازہ کر دیا مطالعہ کرنے والے حضرات درخواست ہے کہ احقر اور میرے والدین

کے لئے دعا، مغفرت فرمادیں اور کوئی ہمت کرے اور سورۃ یس پڑھ کر ایصالِ ثواب کرے تو سبحان اللہ

أَغْلَا فِيهِ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُونَ ⑧ وَجَعَلْنَا مِنْ

طوق سودہ میں ٹھوڑیوں تک پھر ان کے سر اُٹل رہی ہیں، اور بنائی ہم نے
بَیِّنَ آيِدٍ يَّهِيْمٍ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ
ان کے آگے دیوار اور پیچھے دیوار پھر اوپر سے ڈھانک دیا سو ان کو

لَا يَبْصُرُونَ ⑨ وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنذِرَتْهُمْ أَمْ لَمْ يُنذِرْهُمْ

کچھ نہیں سوجھتا - اور برابر ہے ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے،

لَا يُؤْمِنُونَ ⑩ إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَنَ

یقین نہیں کریں گے - تو تو ڈر سنائے اس کو جو چلے سمجھائے پر اور ڈرے رحمن سے

بِالْغَيْبِ فَلْيَشْرِكْ بِمَغْفِرَةِ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ ⑪ إِنَّا نَحْنُ الْمُغْنِي

بن دیکھے سو اس کو خوش خبری دے معافی کی اور عزت کے ثواب کی - ہم ہیں جو زندہ کرتے ہیں مردوں

وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ وَكُلُّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ

کو اور لکھتے ہیں جو آگے بھیج چکے اور جو نشان ان کے پیچھے رہا اور ہر چیز گن لی ہم نے ایک

مُبَيِّنٍ ⑫

کھلی اصل میں۔

خلاصہ تفسیر

یٰس (اس کی مراد اللہ ہی کو معلوم ہے) قسم ہے قرآن باحکمت کی کہ بیشک آپ مہملہ
پیغمبروں کے ہیں (اور) سیدھے رستہ پر ہیں (کہ اس میں جو آپ کی پیروی کرے خدا تک پہنچ
جائے نہ کہ جیسا کفار کہتے ہیں تَسْتُمُوسِدًا، یعنی آپ رسول نہیں، یا کہتے تھے بَلْ افْتَرَاهُ
یعنی آپ نے خود گھڑ لیا ہے، جس کے لئے گمراہ ہونا لازم ہے اور قرآن تعظیم ہدایت کے ساتھ
آپ کی رسالت و نبوت کی دلیل بھی ہے کیونکہ یہ قرآن خدا سے زبردست مہربان کی طرف سے
نازل کیا گیا ہے (اور آپ پیغمبر اس لئے بنائے گئے ہیں) تاکہ آپ (اولاً) ایسے لوگوں کو غذا
خداوندی سے (ڈراویں جن کے باپ دادا (قریب کے کسی رسول کے ذریعہ سے) نہیں ڈرا
گئے تھے، سو اسی سے یہ بے خبر ہیں) کیونکہ گو عرب میں بعض مضامین شرايع رسل سابقہ کے

منقول بھی تھے جیسا اس آیت میں ہے (اَمْ جَاءَهُمْ مَا كَانُوا يَنتَظِرُونَ) یعنی کیا قرآن ان کے پاس کوئی ایسی چیز لایا ہے جو ان کے آباء کے پاس نہیں آئی تھی، یعنی دعوتِ توحید کوئی نئی چیز نہیں، یہ ہمیشہ ان کے آباء و اجداد میں بھی جاری رہی ہے، مگر پھر بھی نبی کے آنے سے جس قدر تنبیہ ہوتا ہے محض اس کے بعض احکام و اخبار نقل ہو کر پہنچنے سے جبکہ وہ ناتمام اور متغیر بھی ہو گئے ہوں ویسا تنبیہ نہیں ہوتا۔ اور اولاً ڈرانا آپ کا قریش کو تھا، اس لئے اس جگہ انہی کا ذکر فرمایا، پھر عام لوگوں کو بھی آپ نے دعوت فرمائی، کیونکہ بعثت آپ کی عام ہے اور باوجود آپ کی صحت رسالت و صدق قرآن کے یہ لوگ جو نہیں مانتے آپ اس کا غم نہ کیجئے، کیونکہ ان میں اکثر لوگوں پر (تقدیری) بات ثابت ہو چکی ہے (وہ بات یہ ہے کہ یہ ہدایت کے رستہ پر نہ آئیں گے) سو یہ لوگ ہرگز ایمان نہ لائیں گے (یہ حال ان کے اکثر کا تھا اور بعض کی قسمت میں ایمان بھی تھا وہ ایمان بھی لے آئے اور ان لوگوں کی مثال ایمان سے دوری میں ایسی ہو گئی کہ گویا ہم نے ان کی گردنوں میں (بھاری بھاری) طوق ڈال دیئے ہیں پھر وہ ٹھوڑیوں تک (اڑ گئے) ہیں جس سے ان کے سر اُپر کو اُلل گئے (یعنی اُٹھ رہ گئے، نیچے کو نہیں ہو سکتے، خواہ اس وجہ سے کہ طوق میں جو موقع تحت ذقن رہتے کا ہر دہاں کوئی میخ وغیرہ ایسی ہو جو ذقن میں جا کر اڑ جاوے، اور یا طوق کا چکلا ایسا ہو کہ اس کی نگر ذقن میں اڑ جاوے۔ بہر حال دونوں طور پر وہ راہ دیکھنے سے محروم رہے) اور نیز ان کی مثال بعد عن الایمان ایسی ہو گئی کہ گویا ہم نے ایک آڑان کے سامنے کر دی اور ایک آڑان کے پیچھے کر دی جس سے ہم نے (ہر طرف سے) ان کو (پردوں میں) گھیر دیا سو وہ (اس احاطہ حجابات کی وجہ سے کسی چیز کو) نہیں دیکھ سکتے، اور (دونوں تمثیلوں سے حاصل یہ ہے کہ) ان کے حق میں آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں، یہ کسی حالت میں بھی (ایمان نہیں لائیں گے) اس لئے آپ اُن سے مایوس ہو کر راحت حاصل کر لیجئے، بس آپ تو ایسا ڈرانا جس پر نفع مرتب ہو، صرف ایسے شخص کو ڈرا سکتے ہیں جو نصیحت پر چلے اور خدا سے بے دیکھے ڈرے (کہ ڈر ہی سے طلب حق ہوتی ہے اور طلب وصول اور یہ ڈرتے ہی نہیں) سو (جو ایسا شخص ہو) آپ اس کو (گناہوں کی) مغفرت اور (طاعت پر) عملہ عوض کی خوش خبری سنا دیجئے (اور اسی سے اس پر بھی دلالت ہو گئی کہ جو ضلالت اور اعراض کا مرتکب ہو وہ مغفرت اور اجر سے محروم اور مستحق عذاب ہے، اور گودنیا میں اس جزا و سزا کا ظہور لازم نہیں، لیکن بیشک ہم (ایک روز) مردوں کو زندہ کریں گے (اس وقت ان سب کا ظہور ہو جائے گا) اور (جن اعمال پر جزا و سزا ہوگی) ہم ان کو برابر) لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال

بھی جن کو لوگ آگے بھیجتے جاتے ہیں اور ان کے وہ اعمال بھی جنکو چھوڑے جاتے ہیں (ما قذمو) سے مراد جو کام اپنے ہاتھ سے کیا اور آثارِ ہم سے مراد وہ اثر جو اس کام کے سبب پیدا ہوا اور بعد موت بھی باقی رہا، مثلاً کسی نے کوئی نیک کام کیا اور وہ سبب ہو گیا دوسروں کی بھی ہدایت کا یا کسی نے کوئی بُر کام کیا اور وہ سبب ہو گیا دوسروں کی بھی گمراہی کا۔ غرض یہ سب لکھے جا رہے ہیں اور وہاں ان سب پر جزاء و سزا مرتب ہو جائے گی اور ہمارا علم تو ایسا وسیع ہے کہ ہم اس کتابت کے بھی محتاج نہیں جو بعد الوقوع ہوئی ہے کیونکہ ہم نے (تو) ہر چیز کو (جو کچھ کیا) تک ہو گا وقوع سے پہلے ہی، ایک واضح کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں ضبط کر دیا تھا (محض بعض حکمتوں سے اعمال کی کتابت ہوتی ہے۔ پس جب قبل وقوع ہم کو سب چیزوں کا علم ہے تو بعد وقوع تو کیوں نہ ہوتا، اس لئے کسی عمل سے مکر نے یا پوشیدہ رکھنے کی گنجائش نہیں، ضرور سزا ہوگی اور لوح محفوظ کو واضح باعتبار تفصیل اشیاء کے کہا گیا ہے۔

معارف و مسائل

فضائل سورۃ یس | حضرت معقل بن یسارؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یس قلب القرآن، یعنی سورۃ یس قرآن کا دل ہے۔ اور اس حدیث کے بعض الفاظ میں ہے کہ جو شخص سورۃ یس کو خالص اللہ اور آخرت کے لئے پڑھتا ہے اس کی مغفرت ہو جاتی ہے اس کو اپنے مردوں پر پڑھا کر مردہ راہ احمد و ابوداؤد و النسائی و ابن حبان و الحکم وغیرہم، کذا فی الروح و المنظری

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ سورۃ یس کو قلب قرآن فرمانے کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ اس سورۃ میں قیامت اور حشر و نشر کے مضامین خاص تفصیل اور بلاغت کے ساتھ آئے ہیں اور اصولِ ایمان میں سے عقیدۂ آخرت وہ چیز ہے جس پر انسان کے اعمال کی صحت موقوف ہے۔ خوفِ آخرت ہی انسان کو عملِ صالح کے لئے مستعد کرتا ہے اور وہی اس کو ناجائز خواہشات اور حرام سے روکتا ہے۔ تو جس طرح بدن کی صحت قلب کی صحت پر موقوف ہے اسی طرح ایمان کی صحت فکرِ آخرت پر موقوف ہے (روح) اور اس سورۃ کا نام جیسا سورۃ یس معروف ہے اسی طرح ایک حدیث میں اس کا نام عظیمہ بھی آیا ہے (احشر جہ ابونصر سجزی عن عائشہ رضی اللہ عنہا) اور ایک حدیث میں ہے کہ اس سورۃ کا نام تورات میں معجزہ آیا ہے، یعنی اپنے پڑھنے والے کے لئے دنیا و آخرت کی خیرات و برکات عطا کرنے والی۔ اور اس کے پڑھنے والے کا نام شریف آیا ہے اور فرمایا کہ قیامت کے روز اس کی

شفاعت قبیلہ ربیعہ کے لوگوں سے زیادہ کے لئے قبول ہوگی۔ (رواہ سعید بن منصور و ابیہقی
عن حسان بن عطیہ) اور بعض روایات میں اس کا نام مدافع بھی آیا ہے، یعنی اپنے پڑھنے والے
والے سے بلاؤں کو دفع کرنے والی اور بعض میں اس کا نام قاضیہ بھی مذکور ہے، یعنی حاجات
کو پورا کرنے والی (روح المعانی)۔

اور حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ جس مرنے والے کے پاس سورۃ یس
پڑھی جائے تو اس کی موت کے وقت آسانی ہو جاتی ہے (رواہ الدیلمی ابن حبان، مظہری)
اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے فرمایا کہ جو شخص سورۃ یس کو اپنی حاجت کے آگے
کریے تو اس کی حاجت پوری ہو جاتی ہے (اخرجہ المحاملی فی امالیہ، مظہری)۔

اور یحییٰ بن کثیرؓ نے فرمایا کہ جو شخص صبح کو سورۃ یس پڑھ لے وہ شام تک خوشی اور
آرام سے رہے گا، اور جو شام کو پڑھ لے تو صبح تک خوشی میں رہے گا۔ اور فرمایا کہ مجھے یہ بات
ایسے شخص نے بتلائی ہے جس نے اس کا تجربہ کیا ہے (اخرجہ ابن الفریس، مظہری)۔
یس، اس لفظ کے متعلق مشہور قول تو وہی ہے جس کو ادھر خلاصہ تفسیر میں لیا

ہے کہ حروف مقطعات میں سے ہے، جن کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے عام بندوں کو نہیں دیا
اور ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ امام مالکؒ نے فرمایا کہ اللہ کے ناموں میں سے
ایک نام ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی ایک روایت یہی ہے کہ اسماء الہیہ میں سے
ہے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں اے انسان
اور مراد انسان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور حضرت ابن جبرؒ کے کلام سے یہ استفاد
ہے کہ لفظ یس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے۔ روح المعانی میں ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ان دو عظیم الشان حروف سے رکھنا، یعنی یا اور سین اس میں بزرگ رازیں
یس کسی کا نام امام مالکؒ نے اس کو اس لئے پسند نہیں کیا کہ ان کے نزدیک یہ اسماء الہیہ
رکھنا کیسا ہے میں سے ہے، اور اس کے صحیح معنی معلوم نہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ کوئی

ایسے معنی ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، جیسے خالق، رازق، وغیرہ البتہ اس لفظ
کو یاسین کے رسم الخط سے لکھا جائے تو یہ کسی انسان کا نام رکھنا جائز ہے۔ کیونکہ قرآن کریم
میں آیا ہے سَلَامٌ عَلَیْہِ اَیُّہَا یَسِیْنُ (ابن عربی)، آیت مذکورہ کی معروف قرأت اَیُّہَا یَسِیْنُ
ہے مگر بعض قراءتوں میں اَیُّہَا یَسِیْنُ بھی آیا ہے۔

لَسْتُ نَذِیْرًا قَوْمًا مَّا اُنْذِرَ اَبَاؤُھُمْ، مراد اس سے عرب ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ ان کے
آباء واجداد میں کوئی نذیر یعنی پیغمبر عرصہ دراز سے نہیں آیا۔ اور آباء واجداد سے مراد قریبی

آباد و اجداد ہیں ان کے جدِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھ حضرت اسمعیل علیہ السلام کے بعد کئی صدیوں سے عرب میں کوئی پیغمبر نہیں آیا تھا۔ اگرچہ دعوت و تبلیغ اور انذار و توبہ شہر کا سلسلہ برابر جاری رہا جس کا ذکر قرآن کریم کی آیت میں بھی ہے جو خلاصہ تفسیر میں آچکی ہے اور آیت **إِنْ يَنْزِلُ أَمْرٌ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ** کا بھی یہی مقتضی ہے، کہ رحمت خداوندی نے کسی قوم و ملت کو دعوت و انذار سے کسی زمانے اور کسی خطہ میں محروم نہیں رکھا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ انبیاء کی تعلیمات ان کے نائبوں کے ذریعہ پہنچنا وہ اثر نہیں رکھتا جو خود نبی یا پیغمبر کی دعوت و تعلیم کا ہوتا ہے۔ اس لئے آیت مذکورہ میں عربوں کے متعلق یہ فرمایا گیا کہ ان میں کوئی نذیر نہیں آیا۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ عرب میں عام طور پر پڑھنے پڑھانے اور تعلیم کا کوئی مستحکم نظام نہیں تھا، اسی وجہ سے ان کا لقب اُمّیّین ہوا۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ، إِنَّا جَعَلْنَا فِي آخِنَا فِيهِمْ
أَعْلَٰلًا الا یہ مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے کفر و ایمان اور جنت و دوزخ کے دونوں راستے انسان کے سامنے کر دیئے، اور ایمان کی دعوت کے لئے انبیاء اور کتابیں بھی بھیج دیں، پھر انسان کو اتنا اختیار بھی دیدیا کہ وہ اپنے بھلے بُرے کو پہچان کر کوئی راستہ اختیار کرے۔ جو بد نصیب نہ غور و فکر سے کام لے نہ دلائل قدرت میں غور کرے، نہ انبیاء کی دعوت پر کان دھرے نہ اللہ کی کتاب میں غور و تدبر کرے تو اس نے اپنے اختیار سے جو راہ اختیار کر لی تو حق تعالیٰ اس کے سامان اس کے لئے جمع فرمادیتے ہیں، جو کفر میں لگ گیا پھر اس کے واسطے کفر بڑھانے ہی کے سامان ہوتے رہتے ہیں۔ اسی کو اس طرح تعبیر فرمایا، **لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ**، یعنی ان میں سے بیشتر لوگوں پر تو ان کے سوا اختیار کی بناء پر یہ قول حق جاری ہو چکا ہے کہ یہ ایمان نہ لائیں گے۔

آگے ان کے حال کی ایک تمثیل بیان فرمائی ہے، کہ ان کی مثال ایسی ہے کہ جس کی گردن میں ایسے طوق ڈال دیئے گئے ہوں کہ اس کا چہرہ اور آنکھیں اوپر اٹھ جائیں، نیچے رہنے کی طرف دیکھ ہی نہ سکے۔ تو ظاہر ہے کہ اپنے آپ کو کسی گھڑ میں گرنے سے نہیں بچا سکتا دوسری مثال یہ دی کہ جیسے کسی شخص کے چاروں طرف دیوار حائل کر دی گئی ہو وہ اس چار دیواری میں محصور ہو کر باہر کی چیزوں سے بے خبر ہو جاتا ہو، ان کافروں کے گرد بھی اتنی جہالت اور اس پر عناد و ہٹ دھرمی نے محاصرہ کر لیا ہے، کہ باہر کی حق باتیں ان تک گویا پہنچتی ہی نہیں۔

امام رازیؒ نے فرمایا کہ نظر سے مانع دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک مانع تو ایسا ہوتا ہے

کہ خود اپنے وجود کو بھی نہ دیکھ سکے، دوسرا یہ کہ اپنی گرد و پیش کو نہ دیکھ سکے۔ ان کفار کیلئے حق بینی سے دونوں قسم کے مانع موجود تھے، اس لئے پہلی مثال پہلے مانع کی ہو کہ جس کی گردن نیچے کو جھک سکے وہ اپنے وجود کو بھی نہیں دیکھ سکتا، اور دوسری مثال دوسرے مانع کی ہو کہ گرد و پیش کو نہیں دیکھ سکتا (روح)

جمہور مفسرین نے آیت مذکورہ کو ان کے کفر و عناد کی تمثیل ہی قرار دیا ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس کو بعض روایات کی بنا پر ایک واقعہ کا بیان قرار دیا ہے، کہ ابو جہل اور بعض دوسرے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے یا ایذا پہنچانے کا پختہ عزم کر کے آپ کی طرف بڑھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، عاجز ہو کر واپس آ گئے۔ اسی طرح کے متعدد واقعات کتب تفسیر ابن کثیر، روح المعانی، قرطبی، مظہری وغیرہ میں منقول ہیں، مگر وہ بیشتر روایات ضعیفہ ہیں اس پر مدار آیت کی تفسیر کا نہیں رکھا جاسکتا۔

وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ، یعنی ہم لکھیں گے ان اعمال کو جو انھوں نے آگے بھیجے ہیں۔ عمل کرنے کو آگے بھیجنے سے تعبیر کر کے یہ بتلادیا کہ جو اعمال اچھے یا بُرے اس دنیا میں کئے ہیں وہ یہیں ختم نہیں ہو گئے، بلکہ وہ تمہارا سامان بن کر آگے پہنچ گئے ہیں جن سے اگلی زندگی میں سابقہ پڑنا ہے، اچھے اعمال ہیں تو جنت کی باغ و بہار بنیں گے، بُرے ہیں تو جہنم کے انگارے۔ اور ان اعمال کو لکھنے سے اصل مقصود ان کو محفوظ رکھنا ہے، لکھنا بھی اس کا ایک ذریعہ ہے کہ خطا و نسیان اور زیارت و نقصان کا احتمال نہ رہے۔

اعمال کی طرح اعمال
کے اثرات بھی لکھے جاتے ہیں۔
وَآثَارَهُمْ، یعنی جس طرح ان کے کئے ہوئے اعمال لکھے جاتے ہیں اسی طرح اُن کے آثار بھی لکھے جاتے ہیں۔ آثار سے مراد اعمال کے وہ ثمرات و نتائج ہیں جو بعد میں ظاہر ہوتے اور باقی رہتے ہیں، مثلاً کسی نے لوگوں کو دین کی تعلیم دی، دینی احکام بتلائے، یا اس کے لئے کوئی کتاب تصنیف کی جس سے لوگوں نے دین کا نفع اٹھایا یا کوئی وقف کر دیا، جس سے لوگوں کو اس کے بعد نفع پہنچا، یا اور کوئی ایسا کام کیا جس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا، تو جہاں تک اس کے اس عمل خیر کے آثار پہنچیں گے اور جب تک پہنچتے رہیں گے وہ سب اس کے اعمال نامہ میں لکھے جاتے رہیں گے۔ اسی طرح بُرے اعمال جن کے بُرے ثمرات و آثار دنیا میں باقی رہیں، مثلاً ظالمانہ قوانین جاری کر دیئے، ایسے ادارے قائم کر دیئے جو انسانوں کے اعمال و اخلاق کو خراب کر دیتے ہیں، یا لوگوں کو کسی غلط اور بُرے راستہ پر ڈال دیا۔ تو جہاں تک اور جب تک اس کے عمل کے بُرے نتائج اور مفاسد وجود میں آتے رہیں گے، اس کے نامہ اعمال میں لکھے جاتے رہیں گے، جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا ہے۔ حضرت جریر بن عبد اللہ بجلي سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ
أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا
مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْقُصَ
مِنْ أَجْرِ هَيْمٍ شَيْءٌ وَمَنْ
سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ
وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ
بَعْدِهِ لَا يُنْقُصُ مِنْ أَجْرِ هَيْمٍ
شَيْءًا، ثُمَّ قُلَا وَتَكْتُبُ مَا
وَدَّ مُؤَاوَاثُ هَيْمٍ، (ابن کثیر
عن ابن ابی حاتم)

”جس شخص نے کوئی اچھا طریقہ جاری کیا
تو اس کو اس کا بھی ثواب ملے گا اور جو
آدمی اس طریقہ پر عمل کریں گے ان کا بھی
ثواب اس کو ملے گا بغیر اس کے کہ ان
عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی
آوے۔ اور جس نے کوئی بُرا طریقہ جاری
کیا تو اس کو اس کا بھی گناہ ہوگا اور جتنے
آدمی جب تک اس بُرے طریقہ پر عمل
کرتے رہیں گے ان کا گناہ بھی اس کو
ہوتا رہے گا بغیر اس کے کہ عمل کرنے والوں
کے گناہوں میں کمی آوے۔“

آثار کے ایک معنی نشان قدم کے بھی آتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ انسان جب نماز کے
لئے مسجد کی طرف چلتا ہے تو اس کے ہر قدم پر نیکی لکھی جاتی ہے۔ بعض روایات حدیث سے
معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں آثار سے مراد یہی نشان قدم ہیں جس طرح نماز کا ثواب بھی
لکھا جاتا ہے اسی طرح نماز کے لئے جانے میں جتنے قدم پڑتے ہیں ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی
ہے۔ ابن کثیر نے ان روایات کو اس جگہ جمع کر دیا ہے جن میں یہ مذکور ہے کہ مدینہ طیبہ میں جن
لوگوں کے مکانات مسجد نبوی سے دُور تھے انھوں نے ارادہ کیا کہ مسجد کے قریب مکان بنالیں
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ جہاں رہتے ہو وہیں رہو، دُور سے چل کر آؤ گے تو یہ
وقت بھی ضائع نہ سمجھو، جتنے قدم زیادہ ہوں گے اتنا ہی تمہارا ثواب بڑھے گا۔

اس پر جو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ سورۃ مکئی ہے، اور جو واقعہ ان احادیث میں مذکور ہے
وہ مدینہ طیبہ کا ہے۔ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ آیت تو اپنے عام معنی میں ہو کہ اعمال کے
اثرات بھی لکھے جاتے ہیں اور یہ آیت مکہ ہی میں نازل ہوئی ہو، پھر مدینہ طیبہ میں جب
واقعہ پیش آیا تو آپ نے بطور استدلال کے اس آیت کا ذکر فرمایا۔ اور نشان قدم کو بھی ان
آثار باقیہ میں شمار فرمایا ہے جن کے لکھے جانے کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے۔ اس
طرح ان دونوں تفسیروں کا ظاہری تضاد بھی رفع ہو جاتا ہے (مکمل صرح بہ ابن کثیر و اختارہ)

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ ۝۱۳

اور بیان کران کے واسطے ایک مثل اس گاؤں کے لوگوں کی جب کہ آئے اس میں بھیجے ہوئے۔

إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا

جب بھیجے ہم نے اُن کی طرف دو تو ان کو جھٹلایا، پھر ہم نے توت دی تیسرے سے تب کہا انھوں نے

إِنَّا إِلَيْكُمْ مُّرْسَلُونَ ۝۱۴ قَالُوا مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَا

ہم تمھاری طرف آئے ہیں بھیجے ہوئے۔ وہ بولے تم تو یہی انسان ہو جیسے ہم، اور

أَنْزَلَ الرَّحْمَنُ مِنْ شَيْءٍ ۚ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ۝۱۵ قَالُوا

رحمن نے کچھ نہیں اتارا، تم سارے جھوٹ کہتے ہو، کہا

رَبَّنَا عَلِّمْنَا لَنَا لِيَكُنَّا مَرْضِيًّا ۝۱۶ وَمَا عَلَّمْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ

ہمارا رب جانتا ہے ہم بیشک تمھاری طرف بھیجے ہوئے ہیں۔ اور ہمارا ذمہ ہی ہی پیغام پہنچا دینا

الْمُبِينِ ۝۱۷ قَالُوا إِنَّا نَطِيرُ نَابِكُمْ لَيْسَ لَكُمْ تَنْتَهُوَا

کھول کر۔ بولے ہم نے نامبارک دیکھا تم کو، اگر تم باز نہ رہو گے تو

لَنَرْجِمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۸ قَالُوا

ہم تم کو سنگسار کریں گے اور تم کو پہنچے گا ہمارے ہاتھ سے عذاب دردناک۔ کہنے لگے

طَائِفُكُمْ مَعَكُمْ طَائِفٌ مِّنْكُمْ طَائِفٌ مِّنْكُمْ طَائِفٌ مِّنْكُمْ طَائِفٌ مِّنْكُمْ

تمھاری نامبارک کی تمھارے ساتھ ہے کیا اتنی بات پر کہ تم کو سمجھایا، کوئی نہیں پر تم لوگ ہو کہ

مُسْرِفُونَ ۝۱۹ وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ رَجُلٌ

حد پر نہیں رہتے، اور آیا شہر کے پرے پرے سے ایک مرد

يَسْعَى قَالَ يَدْعُوكم اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ ۝۲۰ اتَّبِعُوا مَن لَّا

دوڑتا ہوا بولائے قوم چلو راہ پر بھیجے ہوؤں کی، چلو راہ پر ایسے شخص کی جو تم

يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُّهْتَدُونَ ۝۲۱

سے بدلہ نہیں چاہتے اور وہ ٹھیک رہتے ہیں۔

وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدَ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۳۲﴾

اور مجھ کو کیا ہوا کہ میں بندگی نہ کروں اس کی جس نے مجھ کو بنایا اور اسی کی طرف سب پھر جاؤ گے

وَأَتَّخِذُ مِنْ دُونِهِ آلِهَةً إِنْ يُرِدْنِ الرَّحْمَنُ بِضُرٍّ لَا تُغْنِ

بھلا میں پکڑوں اس کے سوائے اور وہ کو بوجھا کہ اگر مجھ پر چاہے رحمن تکلیف تو کچھ کام نہ آئے

عَنِّي شِفَاعَتُهُمْ شَيْءٌ وَلَا يُنْقِذُونِ ﴿۳۳﴾ إِنْ أَرَادْتُ إِذًا لِي ضَلَالٌ

مجھ کو ان کی سفارش اور نہ وہ مجھ کو بچھڑائیں۔ تو تو میں بھٹکتا رہوں

مُبِينٌ ﴿۳۴﴾ إِنْ أَمَدْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُونِ ﴿۳۵﴾ قِيلَ

صریح۔ میں یقین لایا تمہارے رب پر مجھ سے سُن لو۔ حکم ہوا

ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يَلِيَّتْ قَوْمِي يَعْلمُونَ ﴿۳۶﴾ بِمَا غَفَرْتُ لِي

چلا جا بہشت میں، بولا کسی طرح میری قوم معلوم کر لیں، کہ بخش مجھ کو

رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرِمِينَ ﴿۳۷﴾ وَمَا أَنْزَلْنَاهُ قَوْمِهِ

میرے رب نے اور کیا مجھ کو عزت والوں میں۔ اور نہیں اتاری ہم نے اس کی قوم پر

مِنْ بَعْدِهِ مِنْ جُنْدٍ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِينَ ﴿۳۸﴾

اُس کے پیچھے کوئی فوج آسمان سے اور ہم (فوج) نہیں اتارا کرتے۔

إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ خِلْدُونَ ﴿۳۹﴾ يَحْسَرَةً

بس یہی تھی ایک چنگھاڑ پھر اسی دم سب بچھ گئے۔ کیا افسوس ہے

عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۴۰﴾

بندوں پر کوئی رسول نہیں آیا ان کے پاس جس سے ٹھٹھا نہیں کرتے۔

الْمَرِيرَ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا

کیا نہیں دیکھتے کتنی غارت کر چکے ہم ان سے پہلے جماعتیں کہ وہ ان کے پاس پھر کر

يَرْجِعُونَ ﴿۴۱﴾ وَإِنْ كُلُّ لَمَّا جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿۴۲﴾

نہیں آئیں گی، اور ان سب میں کوئی نہیں جو اکٹھے ہو کر نہ آئیں ہمارے پاس پکڑے ہوئے

خلاصہ تفسیر

اور آپ ان (کفار) کے سامنے اس غرض سے کہ رسالت کی تائید اور ان کو انکارِ توحید و رسالت پر تہدید ہو) ایک قصہ یعنی ایک بستی والوں کا قصہ اس وقت کا بیان کیجے جبکہ اس بستی میں کئی رسول آئے یعنی جبکہ ہم نے اُن کے پاس (اول) دو کو بھیجا سو ان لوگوں نے اول و ثل کو جھوٹا بتلایا پھر تیسری (رسول) سے ان دونوں کی تائید کی (یعنی تائید کیلئے پھر تیسری کو دہا جائیکا حکم دیا) سو ان تینوں نے ان بستی والوں سے کہا کہ ہم تمہارے پاس (خدا کی طرف سے) بھیجے گئے ہیں، (تاکہ تم کو ہدایت کریں کہ توحید اختیار کرو اور بت پرستی چھوڑ دو کیونکہ وہ لوگ بہت پرست تھے، کمابذل علیہ قولہ تعالیٰ وَمَا لِيَ لَا آتِبُ الذِّنِّی قَطَرِنِیْ وَقَوْلُهُ عَاثَخِیْ مِنْ دُرِّیْہِ الْیَہَاقُہِ) ان لوگوں نے (یعنی بستی والوں نے) کہا کہ تم تو ہماری طرح (محض) معمولی آدمی ہو (تم کو رسول ہونے کا امتیاز حاصل نہیں) اور تمہاری کیا تخصیص ہے، مسئلہ رسالت ہی خود بے اصل ہے اور (خدا سے رحمن نے) کوئی چیز (کتاب و احکام کی قسم سے کبھی) نازل (ہی) نہیں کی، تم نہرا جھوٹ بولتے ہو اُن رسولوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار علیم ہے کہ بے شک ہم تمہارے پاس (بطور رسول کے) بھیجے گئے ہیں اور اس قسم سے یہ مقصود نہیں کہ اسی سے اثباتِ رسالت کرتے ہیں بلکہ بعد اقامتِ دلائل کے بھی جب انھوں نے نہ مانا تب آخری جواب کے طور پر مجبور ہو کر قسم کھائی جیسا آگے خود ان کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ) ہمارے ذمہ تو صرف واضح طور پر (حکم کا) پہنچا دینا تھا (چونکہ واضح ہونا اس پر موقوف ہے کہ دلائل واضح سے دعوے کو ثابت کر دیا جائے، اس سے معلوم ہوا کہ اول دلائل قائم کر چکے تھے، آخر میں قسم کھائی غرض یہ کہ ہم اپنا کام کر چکے تم نہ مانو تو ہم مجبور ہیں) وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں (یہ یا تو اس لئے کہا کہ ان پر قحط پڑا تھا (کما فی المعالم) اور یا اس لئے کہا کہ جب کوئی نئی بات سنی جاتی ہے، گو لوگ اس کو قبول نہ کریں، مگر اس کا چرچا ضرور ہوتا ہے، اور اکثر عام لوگوں میں اس کی وجہ سے گفتگو اور اس گفتگو میں اختلاف اور کبھی نزاع و نا اتفاقی کی نوبت پہنچ ہی جاتی ہے۔ پس مطلب یہ ہوگا کہ تمام لوگوں میں ایک فتنہ جھگڑا ڈال دیا، جس سے منظر میں پہنچ رہی ہیں، یہ نحوست ہے۔ اور اس نحوست کے سبب تم ہو) اور اگر تم (اس دعوت اور دعوے سے) باز نہ آئے تو (یاد رکھو) ہم پتھروں سے تمہارا کام تمام کر دیں گے اور (سنگساری سے پہلے بھی) تم کو ہماری طرف سے سخت تکلیف پہنچے گی (یعنی اور طرح طرح سے ستا دیں گے، نہیں مانو گے تو اخیر میں سنگسار

کر دیں گے) اُن رسولوں نے کہا کہ تمھاری نحوست تو تمھارے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے (یعنی جس کو تم مضرت و مصیبت کہتے ہو اس کا سبب تو حق کا قبول نہ کرنا ہے، اگر حق مقبول کرنے پر متفق ہو جاتے نہ یہ جھگڑے اور فتنے ہوتے، نہ قحط کے عذاب میں مبتلا ہوتے رہا پہلا اتفاق بت پرستی پر تو ایسا اتفاق جو باطل پر ہو خود فساد و فتنہ ہے جس کو چھوڑنا لازماً ہے اور اس زمانے میں قحط نہ ہونا وہ بطور استدراج کے اللہ کی طرف سے ڈھیل دی ہوئی تھی، یا اس وجہ سے تھا کہ اس وقت تک ان لوگوں پر حق واضح نہیں ہوا تھا۔ اور اللہ کا قانون ہے کہ حق کو واضح کرنے سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیتے، جیسا کہ ارشاد ہے کہ حَتَّىٰ يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ، اور یہ ڈھیل یا حق کا نہ ہونا بھی تمھاری ہی غفلت، جہالت اور شامت اعمال تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر حال میں اس نحوست کا سبب خود تمھارا فعل تھا) کیا اس کو نحوست سمجھتے ہو کہ تم کو نصیحت کی جاوے (جو بنیاد سعادت ہو یہ تو واقع میں نحوست نہیں) بلکہ تم (خود) حد (عقل و شرع) سے نکل جانے والے لوگ ہو (پس مخالفت شرع سے تم پر یہ نحوست آئی اور مخالفت عقل سے تم نے اس کا سبب غلط سمجھا) اور (اس گفتگو کی خبر جو شائع ہوئی تو) ایک شخص (جو مسلمان تھا) اس شہر کے کسی دور مقام سے (جو یہاں سے دور تھا یہ خبر سنکر اپنی قوم کی خیر خواہی کے لئے کہ ان رسولوں کا وجود قوم کی فلاح تھی، یا رسولوں کی خیر خواہی کیلئے کہ کہیں یہ لوگ اُن کو قتل نہ کر دیں) دوڑتا ہوا (یہاں) آیا (اور ان لوگوں سے) کہنے لگا کہ اے میری قوم ان رسولوں کی راہ پر چلو (ضرور) ایسے لوگوں کی راہ پر چلو جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتے، اور وہ خود راہِ راست پر بھی ہیں (یعنی خود غرضی جو مانع اتباع ہو وہ بھی نہیں) راہِ راست پر ہونا جو حقیقی اتباع ہو وہ جو ہو پھر اتباع کیوں نہ کیا جاوے اور میرے پاس کو نسا عذر ہے کہ میں اُس (معبود) کی عبادت نہ کروں جس نے مجھ کو پیدا کیا (جو کہ مجملہ دلائل استحقاق عبادت کے ہے) اور (اپنے اوپر رکھ کر اس لئے کہا کہ مخاطب کو اشتعال نہ ہو جو کہ مانع تدبیر ہو جاتا ہے اور اصل مطلب یہی ہے کہ تم کو ایک اللہ کی عبادت کرنے میں کو نسا عذر ہے) تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے (اس لئے دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے رسولوں کا اتباع کرو۔ یہاں تک تو معبودِ حق کے استحقاق عبادت کا بیان کیا، آگے معبوداتِ باطلہ کے عدم استحقاق عبادت کا مضمون ہے یعنی) کیا میں خدا کو چھوڑ کر اور ایسے ایسے معبود قرار دے لوں (جن کی کیفیت بے بسی کی یہ ہے) کہ اگر خدا سے رحمن مجھ کو کچھ تکلیف پہنچانا چاہا ہے تو نہ اُن معبودوں کی سفارش میرے کچھ کام آوے گی اور نہ وہ مجھ کو (خود اپنی قدرت و زور کے ذریعہ اس تکلیف سے)

چھڑا سکیں یعنی نہ وہ خود قادر ہیں نہ قادر تک واسطہ سفارش بن سکتے ہیں، کیونکہ اول تو جماعت میں شفاعت کی اہلیت ہی نہیں، دوسرے شفاعت وہی کر سکتے ہیں جن کو اللہ کی طرف سے اجازت ہو اور، اگر میں ایسا کروں تو صریح گمراہی میں جا پڑا رہے گا اور یہ بھی اپنے اوپر رکھ کر ان لوگوں کو سنانا ہی میں تو تمھارے پروردگار پر ایمان لا چکا سو ہم (بھی) میری بات سن لو اور ایمان لے آؤ، مگر ان لوگوں پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ اس کو پتھروں سے یا آگ میں ڈال کر یا گھلا گھونٹ کر (کافی الدار المنثور) شہید کر ڈالا، شہید ہوتے ہی اس کو خدا کی طرف سے، ارشاد ہوا کہ جا جنت میں داخل ہو جا، اس وقت بھی اس کو اپنی قوم کی فکر ہوئی، کہنے لگا کہ کاش میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے پروردگار نے ایمان اور اتباعِ رسل کی برکت سے، مجھ کو بخش دیا اور مجھ کو عزت و اوروں میں شامل کر دیا (تو اس حال کو معلوم کر کے وہ بھی ایمان لے آتے اور اسی طرح وہ بھی مغفور اور مکرم ہو جاتے) اور جب اُن بستی والوں نے رسل اور متبع رسل کے ساتھ یہ معاملہ کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور انتقام لینے کے لئے، ہم نے اس (شخص شہید) کی قوم پر اس (کی شہادت) کے بعد کوئی لشکر (فرشتوں کا) آسمان سے نہیں اُتارا اور نہ ہم کو اتارنے کی ضرورت تھی، (کیونکہ اُن کا ہلاک کرنا اس پر موقوف نہ تھا کہ اس کے لئے کوئی بڑی جمعیت لائی جاتی رکند افسرہ ابن مسعود فیما نقل ابن کثیر عن ابن اُحمر حیث قال ما کاثرنا ہم بالجموع فان الامر کان الیسر علینا من ذلک، بلکہ وہ سزا ایک آواز سخت تھی (جو جبریل علیہ السلام نے لردی، کذا فی المعالم، یا اور کسی فرشتہ نے کر دی ہو۔ یا صیححہ سے مطلق عذاب مراد ہو جس کی تعین نہیں کی گئی، جیسا کہ سورۃ مؤمنون کی آیت فَاَحْزَنُوا شَرُھُمْ اَصْحٰبُہٗ کی تفسیر میں گذر چکا ہے) اور وہ سب اسی دم (اس سے) بچھ کر (یعنی مکر) رہ گئے (آگے قصہ کا) انجام بتلانے کے لئے مکذبین کی مذمت فرماتے ہیں کہ) افسوس (ایسے) بندوں کے حال پر کہ کبھی اُن کے پاس کوئی رسول نہیں آیا جس کی انھوں نے ہنسی نہ اڑائی ہو کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کیا کہ ہم ان سے پہلے بہت سی امتیں (اسی تکذیب و استہزاء کے سبب) غارت کر چکے کہ وہ (پھر) اُن کی طرف (دنیا میں) لوٹ کر نہیں آتے، (اگر اس میں غور کرتے تو تکذیب و استہزاء سے باز آ جاتے اور یہ سزا تو مکذبین کو دنیا میں دی گئی) اور (پھر آخرت میں) ان سب میں کوئی ایسا نہیں جو مجمع طور پر ہمارے رد ہو جائے نہ کیا جاوے (وہاں پھر سزا ہوگی اور وہ سزا دائمی ہوگی)۔

معارف و مسائل

وَاضْرِبْ لَهُم مِّثْلًا مِّمَّا أَصْحَبَ الْقُرْآنَ، ضرب مثل کسی معاملے کو ثابت کرنے کے لئے اسی جیسے واقعہ کی مثال بیان کرنے کو کہتے ہیں۔ اور چون منکرین نبوت و رسالت کفار کا ذکر آیا ہے، اس کو متنبہ کرنے کے لئے قرآن کریم بطور مثال کے پہلے زمانے کا ایک قصہ بیان کرتا ہے جو ایک بستی میں پیش آیا تھا۔

وہ کونسی بستی ہو جس کا ذکر قرآن کریم نے اس بستی کا نام نہیں بتلایا، تاریخی روایات میں محمد بن حنفیہ نے حضرت ابن عباسؓ اور کعب احبار، وہب بن منبہ سے نقل کیا ہے، اس قصہ میں آیا ہے؟

کہ یہ بستی انطاکیہ تھی۔ اور جبہ مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ ایو حیان اور ابن کثیر نے فرمایا کہ مفسرین میں اس کے خلاف کوئی قول منقول نہیں۔ معجم البلدان کی تصریح کے مطابق انطاکیہ ملک شام کا مشہور عظیم الشان شہر ہے، جو اپنی شادابی اور استحکام میں معروف ہے، اس کا قلعہ اور شہر پیادہ کی دیوار ایک مثالی چیز سمجھی جاتی ہے۔ اس شہر میں نصاریٰ کے عبادت خانے کیسا بے شمار اور بڑے شاندار سونے چاندی کے کام سے مزین ہیں، اسلی شہر ہے، زمانہ اسلام میں اس کو فاتح شام حضرت امین اللامۃ ابو عبیدہ بن جراح نے فتح کیا، معجم البلدان میں یا قوت جموی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حبیب بن جراح اس آیت میں آگے آ رہا ہے، اس کی قبر بھی انطاکیہ میں معروف ہے، دور دور سے لوگ اس کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ ان کی تصریح سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس شریہ کا ذکر اس آیت میں آیا ہے وہ یہی شہر انطاکیہ ہے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ انطاکیہ ان چار مشہور شہروں میں سے ہے جو دین عیسوی اور نصرانیت کے مرکز سمجھے گئے ہیں، یعنی قدس، رومیہ، اسکندریہ اور انطاکیہ۔ اور فرمایا کہ انطاکیہ سب سے پہلا شہر ہے، جس نے دین مسیح علیہ السلام کو قبول کیا۔ اسی بنا پر ابن کثیر کو اس میں تردد ہو کہ جس شریہ کا ذکر اس آیت میں ہے وہ مشہور شہر انطاکیہ ہو، کیونکہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق یہ قریہ منکرین رسالت و نبوت کی بستی تھی، اور تاریخی روایات کے مطابق وہ بہت پرست مشرکین تھے تو انطاکیہ جو دین مسیح اور نصرانیت کے قبول کرنے میں سب سے اولیت رکھتا ہے، وہ کیسے اس کا مصداق ہو سکتا ہے۔

نیز قرآن کریم کی مذکورہ آیات ہی سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس واقعہ میں اس پوری بستی پر ایسا عذاب آیا کہ ان میں کوئی زندہ نہیں بچا۔ شہر انطاکیہ کے متعلق تاریخ میں اس کا ایسا

کوئی واقعہ منقول نہیں کہ کسی وقت اس کے سارے باشندے بیک وقت مر گئے ہوں۔ اس لئے ابن کثیر کی رائے میں یا تو اس آیت میں جس قریہ کا ذکر ہے وہ انطاکیہ کے علاوہ کوئی اور بستی ہے یا پھر انطاکیہ نام ہی کی کوئی دوسری بستی ہے جو مشہور شہر انطاکیہ نہیں ہے۔

صاحب فتح المنان نے ابن کثیر کے ان اشکالات کے جوابات بھی دیے ہیں، مگر سہل اور بے غبار بات وہی ہے جس کو سیدی حضرت حکیم الامتؒ نے بیان القرآن میں اختیار فرمایا ہے، کہ آیات قرآن کا مضمون سمجھنے کے لئے اس بستی کی تعیین ضروری نہیں، اور قرآن کریم نے اس کو مبہم رکھا ہے، تو ضرورت ہی کیا ہے کہ اس کی تعیین پر اتنا زور خرچ کیا جائے۔ سلف صالحین کا یہ ارشاد کہ ابھیئوا ما ابھیئتم اللہ، یعنی جس چیز کو اللہ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اسے مبہم ہی رہنے دو، اس کا مقتضی بھی یہی ہے۔

اِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ ؕ اِذْ اٰمَرْنَا اِلَیْهِمْ اَتْنِیْنِ فَاٰتَوْهُمَا نَحْنُ زَنَّا نَثَلِیْتْ فَاَنۡکَرُوۡا اَنَّا اَلِیۡکُمْ مُّرْسَلُوۡنَ ؕ مَذٰکُوۡرَہٗ بستی میں تین رسول بھیجے گئے تھے، پہلے ان کا بیان اجمالی اِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ میں فرمایا، اس کے بعد اس کی تفصیل دی گئی کہ پہلے دو رسول بھیجے گئے تھے، بستی والوں نے ان کو جھٹلایا اور ان کی بات نہ مانی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تائید تقویت کے لئے ایک تیسرے رسول بھیج دیا۔ پھر ان تینوں رسولوں نے بستی والوں کو خطاب کیا اِنَّا اَلِیۡکُمْ مُّرْسَلُوۡنَ، یعنی ہم تمہاری ہدایت کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

اس بستی میں جو رسول بھیجے گئے لفظ رسول اور مرسل قرآن کریم میں عام طور پر اللہ کے نبی پیغمبر ان سے کیا مراد ہے اور وہ کون حضرات تھے

انبیاء مرسلین ہیں۔ ابن اسحق نے حضرت ابن عباسؓ، کعب احبارؓ اور وہب بن منبہؓ کی روایت یہی نقل کی ہے کہ یہ تینوں بزرگ جن کا اس قریہ میں بھیجے کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، ان کے نام اس روایت میں صادق، صدوق اور مشکوم مذکور ہیں، اور ایک روا میں تیسرے کا نام شمعون آیا ہے۔ (ابن کثیر)

اور حضرت قتادہؓ سے یہ منقول ہے کہ یہاں لفظ مرسلون اپنے اصطلاحی معنی میں نہیں بلکہ قاصد کے معنی میں ہے، اور یہ تین بزرگ جو اس قریہ کی طرف بھیجے گئے خود پیغمبر نہیں تھے، بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریں میں سے تھے۔ انہی کے حکم سے یہ اس قریہ کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے (ابن کثیر) اور چونکہ ان کے بھیجنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول تھے، ان کا بھیجنا بھی بالواسطہ اللہ تعالیٰ ہی کا بھیجنا تھا اس لئے آیت میں

ان کے ارسال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ مفسرین میں سے ابن کثیر نے پہلے قول کو اور قرطبی وغیرہ نے دوسرے کو اختیار کیا ہے، ظاہر قرآن سے بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ حضرات اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے۔ واللہ اعلم

قَالُوا إِنَّا تَطَيَّرُ نَا بِكُمْ، تطیر کے معنی بد فالی لینے اور کسی کو منخوس سمجھنے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس شہر کے لوگوں نے اللہ کے ان فرستادوں کی بات نہ مانی، اور یہ کہنے لگے کہ تم لوگ منخوس ہو۔ بعض روایات میں ہے کہ ان کی نافرمانی اور رسولوں کی بات نہ ماننے کے سبب اس بستی میں قحط پڑ گیا تھا، اس لئے بستی والوں نے ان کو منخوس کہا، یا اور کوئی تکلیف پہنچی ہوگی تو جیسے کفار کی عام عادت یہی ہے کہ کوئی مصیبت آئے تو اس کو ہدایت کرنے والے انبیاء و صلحاء کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں، اس کو بھی ان حضرات کی طرف منسوب کر دیا۔ جیسا کہ قوم موسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن میں ہے: فَإِذَا جَاءَهُمْ نَحْسٌ فَأَنذَرُوا لَنَا هَذَا ۖ وَإِنْ تُصِيبَهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَيِّرُوا بِالْمُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ ۚ اِیسی طرح قوم صالح علیہ السلام نے ان کو کہا تَطَيِّرُ نَا بِكُمْ وَبِمَنْ مَعَكَ۔

قَالُوا طَائِفُكُمْ مَعَكُمْ، یعنی تمہاری نخوست تمہارے ہی ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ طائر کا لفظ اس میں بد فالی کے لئے بولا جاتا ہے، اور کبھی بد فالی کے اثر یعنی نخوست کے معنی میں بھی آتا ہے یہاں یہی مراد ہے (ابن کثیر، قرطبی) وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَى، پہلی آیت میں اس مقام کو جس میں قصہ پیش آیا لفظ قریہ سے تعبیر کیا گیا، جو عربی زبان کے اعتبار سے صرف چھوٹے گاؤں کو نہیں بلکہ مطلق بستی کو کہتے ہیں، چھوٹی بستی ہو یا بڑا شہر۔ اور اس آیت میں اس مقام کو لفظ مدینہ سے تعبیر کیا، جو صرف بڑے شہر ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس بستی میں یہ واقعہ ہوا ہے وہ کوئی بڑا شہر تھا، اس سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے جس میں اس کو انطاکیہ قرار دیا ہے۔ أَقْصَى الْمَدِينَةِ سے مراد شہر کے کسی گوشہ سے آنا ہے۔ رَجُلٌ يَسْعَى، لفظ یسعی سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی دوڑ کر چلنے کے ہیں۔ اس لئے معنی یہ ہوئے کہ شہر کے کسی دور گوشہ سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا، اور کبھی لفظ سعی اہتمام کے معنی چلنے کے معنی میں بھی آتا ہے چاہے دوڑ کر نہ چلے، جیسے سورۃ جمعہ میں فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ میں یہی معنی مراد ہیں۔

گوشہ شہر سے آنے والے | قرآن کریم نے اس کو بھی مبہم رکھا ہے، اس شخص کا نام اور حال
شخص کا واقعہ !!! | ذکر نہیں فرمایا۔ تاریخی روایات میں ابن اسحق نے حضرت ابن عباس

اور کعب احبار اور وہیب بن منبہ کے حوالے سے یہ نقل کیا ہے کہ اس شخص کا نام حبیب تھا، اس کے پیشہ کے متعلق مختلف اقوال ہیں، ان میں مشہور یہ ہے کہ نجار تھا لکڑی کا کام کرتا تھا راجہ کشن اور تاریخی روایات۔ جو مفسرین نے اس جگہ نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بھی شروع میں بت پرست تھا، دو رسول جو پہلے اس شہر میں آئے اس کی ملاقات ان سے ہوئی ان کی تعلیم سے اور بعض روایات کے اعتبار سے ان کا حجرہ یا کرامت دیکھ کر اس کے دل میں ایمان پیدا ہوا۔ بت پرستی سے تائب ہو کر مسلمان ہو گیا اور کسی غار وغیرہ میں عبادت میں مشغول ہو گیا جب اس کو یہ خبر ملی کہ شہر کے لوگ ان رسولوں کی تعلیم و ہدایت کو جھٹلا کر ان کے درپے آزار ہو گئے، اور قتل کی دھمکیاں دے رہے ہیں، تو یہ اپنی قوم کی خیر خواہی اور ان رسولوں کی ہمدردی کے لیے جھلے جذبے سے جلدی کر کے اپنی قوم میں آیا اور ان کو رسولوں کا اتباع کرنے کی نصیحت کی۔ اور پھر اپنے قوم میں ہونے کا اعلان کر دیا۔ اِنِّیْ اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْا یعنی میں تمہارے رب پر ایمان لے آیا ہوں تم سن لو۔ اس کا مخاطب اس کی قوم بھی ہو سکتا ہو، اور اس میں اللہ تعالیٰ کو ان کا رب کہنا انہما حقیقت کے لئے تھا، اگرچہ وہ اس کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خطاب رسولوں کو ہو، اور فَاَسْمَعُوْنَ کہنے کا مقصد یہ ہو کہ آپ سن لیں اور اللہ کے سامنے میرے ایمان کی شہادت دیں۔

قِيلَ اَدْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ الذِّیَّةَ، یعنی اس شخص کو جو گوشتہ شہر سے رسولوں پر ایمان لانے کی تلقین کے لئے آیا تھا اس کو کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب کسی فرشتے کے ذریعے ہوا ہے، کہ جنت میں چلے جاؤ۔ اور مراد جنت میں داخل ہونے سے یہ خوش خبری دینا ہے کہ جنت تمہارا مقام متعین ہو چکا ہے، جو اپنے وقت پر حشر و نشر کے بعد حاصل ہو گا۔ (قرطبی)

اور یہ بھی بعید نہیں کہ ان کو ان کا مقام جنت اس وقت دکھلا دیا گیا ہو، اس کے علاوہ برزخ میں بھی اہل جنت کو جنت کے پھل پھول اور راحت کی چیزیں ملتی ہیں۔ اس لئے ان کا عالم برزخ میں پہنچنا ایک حیثیت سے جنت ہی میں داخل ہونا ہے۔

قرآن کریم کے اس لفظ سے کہ اس کو کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس شخص کو شہید کر دیا گیا تھا، کیونکہ دخول جنت یا آثار جنت کا مشاہدہ بعد موت ہی ہو سکتا ہے۔

تاریخی روایات میں حضرت ابن عباس، مقاتل، مجاہد ائمہ تفسیر سے منقول ہے کہ یہ شخص حبیب ابن اسماعیل نجار تھا، اور یہ ان لوگوں میں ہے جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

پر آپ کی بعثت چھ سو سال پہلے ایمان لایا ہے۔ جیسا کہ شیخ اکبر کے متعلق منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کتب سابقہ میں پڑھ کر آپ کی ولادت سے بہت پہلے آپ پر ایمان لایا تھا۔ تیسرے بزرگ آدمی جو آپ پر آپ کی بعثت اور دعوت سے پہلے ایمان لائے وہ ابن نوفل ہیں جن کا ذکر صحیح بخاری کی حدیث ابتداء وحی کے واقعات میں آیا ہے۔ یہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپ کی ولادت و بعثت سے پہلے آپ پر یہ تین آدمی ایمان لے آئے تھے یہ معاملہ کسی اور رسول و نبی کے ساتھ نہیں ہوا۔

وہب بن منبہ کی روایت میں ہے کہ یہ شخص جذامی تھا، اور ان کا مکان شہر کے سب سے آخری دروازہ پر تھا۔ اپنے مفروضہ معبودوں سے دعا کرتا تھا کہ مجھے تندرست کر دیں جس پر ستر سال گزر چکے تھے۔ یہ رسول شہر انطاکیہ میں اتفاقاً اسی دروازے سے داخل ہوئے تو اس شخص سے پہلے پہل ملاقات ہوئی تو انھوں نے اس کو بت پرستی سے باز آنے اور ایک خدا تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت دی۔ اس نے کہا کہ آپ کے پاس آپ کے دعویٰ کی کوئی دلیل و علامت صحت بھی ہے؟ انھوں نے کہا ہاں ہے۔ اس نے اپنی جذام کی بیماری بتلا کر پوچھا کہ آپ یہ بیماری دور کر سکتے ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں ہم اپنے رب سے دعا کریں گے، وہ تمہیں تندرست کر دے گا۔ اس نے کہا کہ کیا عجیب بات کہتے ہو، میں ستر سال سے اپنے معبودوں سے دعا مانگتا ہوں کچھ فائدہ نہیں ہوا، تمہارا رب کیسے ایک دن میں میری حالت بدل دے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ہمارا رب ہر چیز پر قادر ہے، اور جن کو تم نے خدا بنا رکھا ہے ان کی کوئی حقیقت نہیں، یہ کسی کو نفع نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ سن کر یہ شخص ایمان لے آیا، اور ان بزرگوں نے اس کے لئے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا تندرست کر دیا کہ بیماری کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ اب تو اس کا ایمان پختہ ہو گیا، اور اس نے عہد کیا کہ دن بھر میں جو کچھ کماے گا اس کا آدھا اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا۔ جب ان رسولوں پر شہر کے لوگوں کی یلغار کی خبر پائی تو یہ دوڑ کر آیا، اور اپنی قوم کو سمجھایا اور اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ پوری قوم اس کی دشمن ہو گئی، اور سب مل کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ لاتوں اور ٹھوکروں سے سب نے مل کر اس کو شہید کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اس پر تھوڑے ساے، اور اس وقت بھی ان سب کی بے تحاشا مار پڑنے کے وقت وہ کہتا جاتا تھا رَبِّ اِهْدِنِی صِرَاطَکَ الَّذِیْ اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ سَبِیْلَہٗ ۝ اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ

بعض روایتوں میں ہے کہ ان لوگوں نے تینوں رسولوں کو بھی شہید کر دیا مگر کسی صحیح روایت میں اس کا ذکر نہیں ہو کہ ان کا کیا حال رہا بظاہر وہ مقتول نہیں ہوئے (قرطبی)

لَیْسَتْ قَوْمٌ یَعْلَمُونَ بِمَا غَفَرَ لِي رَیُّی وَجَعَلَنِی مِنَ الْمَكْرَمِیْنَ

یہ بزرگ چونکہ بڑی بہادری کے ساتھ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے، حق تعالیٰ نے ان کے ساتھ خاص اکرام و اعزاز کا معاملہ فرمایا، اور جنت میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ اس نے انعام و اکرام اور جنت کی نعمتوں کا مشاہدہ کیا، تو پھر اپنی قوم یا وائی، اور تمنا کی کہ کاش میری قوم کو میرا حال معلوم ہو جاتا کہ رسولوں پر ایمان لانے کی جزاء میں مجھے اعزاز و اکرام اور دائمی نعمتیں کیسی ملیں تو شاید ان کو بھی ایمان کی توفیق ہو جاتی۔ اس تمنا کا اظہار مذکورہ آیت میں فرمایا گیا ہے۔

پیغمبرانہ دعوت و اصلاح کا طریقہ اس بستی کی طرف جو تین رسول بھیجے گئے، انھوں نے مشرکین و مبتغین اسلام کیلئے اہم ہدایت کفار سے جس طرح خطاب کیا اور ان کی سخت و تلخ باتوں اور

دھمکیوں کا جس طرح جواب دیا اسی طرح ان کی دعوت سے مسلمان ہونے والے حبیب نجار نے اپنی قوم سے جس طرح خطاب کیا ان سب چیزوں کو ذرا مکرر دیکھئے، تو اس میں تبلیغ دین اور اصلاح خلق کی خدمت انجام دینے والوں کے لئے بڑے سبق ہیں۔

ان رسولوں کی ناصحانہ تبلیغ و تلقین کے جواب میں مشرکین نے عین باتیں کہیں :-

(۱) تم تو ہمیں جیسے انسان ہو ہم تمھاری بات کیوں مانیں؟

(۲) اللہ رحمن نے کسی پر کوئی پیغام اور کتاب نہیں اتاری۔

(۳) تم خالص جھوٹ بولتے ہو۔

آپ غور کیجئے کہ بے غرض ناصحانہ کلام کے جواب میں یہ اشتعال انگیز گفتگو کیا جو آپ

چاہتی تھی، مگر ان رسولوں نے کیا جواب دیا۔ صرف یہ کہ رَبَّنَا یَعْلَمُ اَنَّا اِلَیْکُمْ لَمُرْسَلُونَ یعنی ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم تمھاری طرف بھیجے ہوئے آتے ہیں، اور مَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِیِّنُ، یعنی ہمارا جو کام تھا وہ کر چکے کہ تمھیں اللہ کا پیغام واضح کر کے پہونچا دیا، آگے تمھیں اختیار ہے، مانو یا نہ مانو۔ دیکھئے ان کے کسی لفظ میں کیا ان کی اشتعال انگیزی کا کوئی تاثر ہے؟ کیسا مشفقانہ جواب دیا۔

پھر ان لوگوں نے اور آگے بڑھ کر یہ کہا کہ تم لوگ منحوس ہو، تمھاری وجہ سے ہم مصیبت میں پڑ گئے۔ اس کا متعین جواب یہ تھا کہ منحوس تم خود ہو، تمھارے اعمال کی شامت تمھارے گھلے میں آرہی ہے۔ مگر ان رسولوں نے اس بات کو ایسے مجمل الفاظ میں ادا کیا جس میں ان کے منحوس ہونے کی تصریح نہیں فرمائی، بلکہ یہ فرمایا طَائِرٌ کُمْرٌ مَعَكُمْ یعنی تمھاری بدفالی تمھارے ساتھ ہے۔ اور پھر وہی مشفقانہ خطاب کیا، اِنَّ ذِکْرَکُمْ یعنی تم یہ تو سوچو کہ ہم نے تمھارا کیا بگاڑا ہے، ہم نے تو صرف تمھیں خیر خواہانہ نصیحت کی ہو

بس سب سے بھاری جملہ جو بولا تو یہ کہ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِقُونَ یعنی تم لوگ حد و دوسے تجاوز کرنے والے ہو۔ بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہو۔

یہ تو ان رسولوں کا مکالمہ تھا، اب وہ مکالمہ دیکھتے جو ان رسولوں کی دعوت پر ایمان لانے والے نو مسلم نے کیا۔ اس نے پہلے تو اپنی قوم کو دو باتیں بتا کر رسولوں کی بات ماننے کی دعوت دی۔ اول یہ کہ ذرا یہ تو سوچو کہ یہ لوگ دور سے چل کر تمہیں نصیحت کرنے آئے ہیں، سفر کی تکلیف اٹھا رہے ہیں اور تم سے کچھ مانگتے نہیں، یہ بات خود انسان کو غور کی دعوت دیتی ہے کہ یہ بے غرض لوگ ہیں ان کی بات میں غور تو کر لیں۔ دوسرے یہ کہ جو بات کہہ رہے ہیں وہ سراسر عقل و انصاف اور ہدایت کی بات ہے۔ اس کے بعد قوم کو ان کی غلطی اور گمراہی پر متنبہ کرنا تھا کہ اپنے پیدا کرنے والے قادر مطلق کو چھوڑ کر تم لوگ خود تراشیدہ بتوں کو اپنا حاجت روا سمجھ بیٹھے ہو، جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ نہ وہ خود تمہارا کوئی کام بنا سکے ہیں اور نہ اللہ کے یہاں ان کا کوئی مقام اور درجہ ہے کہ اس سے سفارش کر کے تمہارا کام کرا دیں۔

مگر جب تجارتی یہ ساری باتیں ان کی طرف منسوب کرنے کے بجائے اپنی طرف منسوب کرنے کا عنوان اختیار کیا کہ میں ایسا کروں تو بڑی گمراہی کی بات ہوگی، وَمَا لِيْ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ الْاٰیۃِ یہ سب اس لئے کہ مخالف کو اشتعال نہ ہو، بات میں ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ پھر جب اس کی قوم نے اس کی شفقت و رحمت کا بھی کچھ اثر نہ لیا، اور ان کو قتل کرنے کے لئے ان پر پل پڑی تو اس وقت بھی ان کی زبان پر کوئی بددعا کا کلمہ نہ آیا بلکہ یہی کہتے ہوئے جان دیدی کہ رَبِّ اِهْلِكْ ثَوْرِيْ یعنی میرے پروردگار میری قوم کو ہدایت فرما دے۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ قوم کے اس ظلم و ستم سے شہید ہونے والے کو جب اللہ کی طرف سے انعام و اکرام اور جنت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہوا تو اس وقت بھی اپنی ہی ظالم قوم یاد آئی، اور اس کی خیر خواہی و ہمدردی سے یہ تمنا کی کہ کاش میری قوم میرے حالات انعام و اکرام سے واقف ہو جاتی، تو شاید وہ بھی اپنی گمراہی سے باز آکر ان نعمتوں کی شریک بن جاتی۔ سبحان اللہ خلق اللہ کی خیر خواہی ان کے مظالم کے باوجود کس طرح ان حضرات کی رگ دپے میں پیوست ہوتی ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے قوموں کی کایا پلٹی ہے، کفر و ضلالت سے نکال کر وہ مقام بخشا ہے کہ فرشتے بھی ان پر رشک کرتے ہیں۔

آجکل کے مبلغین اور خدمت دعوت و اصلاح کے انجام دینے والوں نے عموماً اس پیغمبرانہ اسوہ کو چھوڑ دیا ہے، اسی لئے ان کی دعوت و تبلیغ بے اثر ہو کر رہ گئی ہے۔ تقریر و خطاب میں غصہ کا اظہار، مخالف پر فقرے چست کرنا بڑا کمال سمجھا جاتا ہے،

جو مخالفت کو اور زیادہ ضد و عناد کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مُتَّبِعِيْنَ لِسُنَنِ اَنْبِيَائِكَ
وَرَفَقَتِنَا مُتَّحِبِيْنَ وَتَرْضَاہِ

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلٰی قَوْمِهِ مِنْ بَعْضٍ مِّنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَہ
اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ تَحَامِلُوْنَ۔ یہ اس قوم پر آسمانی عذاب کا ذکر
ہے جس نے رسولوں کی تکذیب کی اور حبیبِ نجار کو مار مار کر شہید کر دیا تھا۔ اور عذاب کی تمہید
میں یہ فرمایا کہ اس قوم کو عذاب میں پکڑنے کے لئے ہمیں آسمان سے کوئی فرشتوں کا لشکر بھیجنا
نہیں پڑا اور نہ ایسا لشکر بھیجنا ہمارا دستور ہے۔ کیونکہ اللہ کا تو ایک ہی فرشتہ بڑی بڑی قوی
بہادر قوموں کو تباہ کر دینے کے لئے کافی ہے، اس کو فرشتوں کا لشکر بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔
پھر ان پر آنے والے عذاب کو بیان فرمایا کہ بس اتنا ہوا کہ فرشتے نے ایک زور کی آواز لگائی
جس سے یہ سب کے سب ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔

روایات میں ہے کہ جبریل امین نے شہر کے دروازے کے دونوں بازو پکڑ کر ایک
سخت ہیبتناک آواز لگائی جس کے صدمہ کو کسی کی روح برداشت نہ کر سکی سب کے سب
مرے رہ گئے۔ اُن کے مرجانے کو قرآن نے غَايِدُوْنَ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ خود آگ بجھ جانے
کے معنی میں آتا ہے، جاندار کی حیات حرارتِ غریزی پر موقوف ہے، جب یہ حرارت ختم ہو جائے
تو اسی کا نام موت ہے۔ غَايِدُوْنَ یعنی بجھنے والے ٹھنڈے ہو جانے والے۔

وَاٰیۃٌ لّٰہِمُ الْاَرْضُ الَّتِیۡنَا وَآخَرُجْنَا مِنْہَا حَبًا

اور ایک نشانی ہر ان کے واسطے زمینِ مُردہ اس کو ہم نے زندہ کر دیا اور نکالا اس میں سے اناج

فَمِنْہٗ یَاۡکُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلْنَا فِیۡہَا جَنَّتٍ مِّنْ نَّخِیْلِ وَّاعْنَابٍ

سو اسی میں سے کھاتے ہیں۔ اور بنائے ہم نے اس میں باغ کھجور کے اور انگور کے

وَفَجَّرْنَا فِیۡہَا مِنَ الْعِیۡوُنِ ﴿۳۴﴾ لِیَاۡکُلُوْا مِنْ ثَمَرِہَا وَّمَا عَمِلَ تہ

اور بہا دیں اس میں بعضے چشے، کہ کھائیں اس کے میوؤں سے اور اس کو بنایا نہیں

اٰیۡدِیۡہِمۡ طَآفِلًا یَّشْکُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ سُبْحٰنَ الَّذِیۡ حَقَّقَ الْاَزْوَاجَ

ان کے ہاتھوں نے پھر کیوں شکر نہیں کرتے۔ پاک ذات ہر جس نے بنائے جوڑے

كُلُّهَا مِمَّا تُنْبِئُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۶﴾ وَ

سب چیز کے اس قسم میں سے جو اگتا، زمین میں سے اور خود ان میں سے اور ان چیزوں میں کہ جن کی ان کو خبر نہیں اور

آيَةُ لَهُمُ اللَّيْلُ بِمَا تَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارُ فَإِذَا هُمْ مُظْلِمُونَ ﴿۳۷﴾ وَ

ایک نشانی ہوا ان کے واسطے رات، کھینچ لیتے ہیں ہم اس پر سے دن کو پھر تب ہی یہ رہ جاتے ہیں اندھیرے میں، اور

الشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿۳۸﴾

سورج چلا جاتا ہوا پڑ ٹھہرے ہوئے رستہ پر یہ سادھا اس زبردست باخبر نے۔

وَالْقَمَرَ قَدْ رَزَقْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ﴿۳۹﴾

اور چاند کو ہم نے بانٹ دی ہیں منزلیں یہاں تک کہ پھر آ رہا جیسے ٹہنی پُرانی،

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ تُسَابِقُ

نہ سورج سے ہو کہ پکڑے چاند کو اور نہ رات آگے بڑھے دن

النَّهَارُ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿۴۰﴾ وَآيَةُ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا

سے، اور ہر کوئی ایک چکر میں پیرتے ہیں۔ اور ایک نشانی ہوا ان کے واسطے کہ ہم نے اٹھالیا

ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿۴۱﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ

ان کی نسل کو اس بھری ہوئی کشتی میں۔ اور بنا دیا ہم نے ان کے واسطے کشتی جیسی

مَائِرَ كَبُورٍ ﴿۴۲﴾ وَإِنْ نَشَأْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيحَ لَهُمْ وَلَا هُمْ

چیزوں کو جس پر سوار ہوتے ہیں، اور اگر ہم چاہیں تو ان کو ڈبا دیں پھر کوئی نہ پہنچے ان کی فریاد کو اور نہ وہ

يُنْقِذُونَ ﴿۴۳﴾ إِلَّا رَحْمَةً مِنَّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿۴۴﴾

بچھڑائے جائیں، مگر ہم اپنی مہربانی سے اور ان کا کام چلانے کو ایک وقت تک۔

خلاصہ تفسیر

اور قدرت کی نشانیاں اور عظیم الشان نعمتیں جو توحید کے دلائل بھی ہیں، ان میں سے

ایک نشانی ان لوگوں کے استدلال کے لئے مردہ زمین ہے (اور اس میں نشانی کی بات یہ

ہے کہ، ہم نے اس کو (بارش سے) زندہ کیا اور ہم نے اس (زمین) سے (مختلف) غلے نکالے

سو ان میں سے لوگ کھاتے ہیں اور دیتے ہیں، ہم نے اس (زمین میں) کھجوروں اور انگوروں کے باغ لگائے اور اس میں رہا کی آب پاشی کے لئے (چشمے اور نالے) جاری کئے تاکہ (مثل غلے کے) لوگ باغ کے پھلوں میں سے (بھی) کھائیں اور اس (پھل اور غلے) کو ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا اور گو تخم ریزی اور آب پاشی بظاہر انہی کے ہاتھوں ہوتی ہو مگر بیج سے درخت اور درخت سے پھل پیدا کرنے میں ان کا کوئی دخل نہیں، خاص خدا ہی کا کام ہے) سو ایسے دلائل دیکھ کر بھی کیا شکر نہیں کرتے (جس کا اول زینہ اللہ کے وجود اور توحید کا اقرار ہے۔ یہ استدلال تو زمینی اور آفاقی خاص نشانیوں سے تھا، آگے عام زمینی اور نفسیاتی نشانیوں سے استدلال ہی یعنی وہ پاک ذات ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا، نباتات زمین کی قسم سے بھی (خواہ مقابلہ مماثلت کا ہو جیسے ایک غلے، ایک پھل، خواہ مقابلہ مضاد و مخالفت کا ہو جیسے گہوا اور جواد شیریں پھل اور ترش پھل) اور (خود) ان آدمیوں میں سے بھی (جیسے مرد اور عورت) اور ان چیزوں میں بھی جن کو (عام) لوگ نہیں جانتے (مقابلہ کے عام مفہوم کے اعتبار سے مخفی چیزوں میں بھی کوئی شے مقابل سے خالی نہیں اور اسی سے حق تعالیٰ کا بے مقابل ہونا معلوم ہو گیا۔ یہاں سے آیت وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ کی بھی توضیح ہو گئی) اور (آگے بعض آیات آفاقیہ سماویہ اور ان کے بعض آثار سے استدلال ہو یعنی، ایک نشانی ان لوگوں کے لئے رات (کا وقت) ہے کہ (بوجہ اصل ہونے ظلمت کے گویا اصل وقت وہی تھا اور نور آفتاب عارضی تھا، گویا اس ظلمت کو دن نے چھپا لیا تھا، جیسے بکری کے گوشت کو اس کی کھال چھپا لیتی ہے پس) ہم (اسی عارض کو زائل کر کے گویا) اس (رات) پر سے دن کو اتار لیتے ہیں سو یکایک (پھر رات نمودار ہو جاتی ہے اور) وہ لوگ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں اور (ایک نشانی) آفتاب (ہے کہ وہ) اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے، (یہ عام ہو اس نقطہ کو بھی جہاں سے چل کر سالانہ دورہ کر کے پھر اسی نقطہ پر جا پہنچتا ہے اور نقطہ افقیہ کو بھی، کہ حرکت یومیہ میں وہاں پہنچ کر غروب ہو جاتا ہے) اور یہ اندازہ باندھا ہوا ہے اس (خدا) کا جو زبردست (یعنی قادر ہو اور) علم والا ہے کہ علم سے ان انتظامات میں مصلحت و حکمت جانتا ہے اور قدرت سے ان انتظامات کو نافذ کرتا ہے) اور (ایک نشانی) چاند (ہے کہ اُس کی چال) کے لئے منزلیں معتر رکھیں (کہ ہر روز ایک منزل قطع کرتا ہے) یہاں تک کہ (اپنے آخر دورے میں پتلا ہوتا ہوتا) ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی (کہ پتلی اور خمدار ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ ضعف نور کی وجہ سے زردی میں بھی تشبیہ کا اعتبار کیا جاوے اور سورج اور چاند کی چال اور رات و دن کی آمد و رفت ایسے انداز اور انتظام سے رکھی گئی ہے کہ نہ آفتاب کی چال ہے کہ چاند کو اس کے ظہور نور کے وقت

میں یعنی رات میں جبکہ وہ منور ہو جا پکڑے یعنی قبل از وقت خود طلوع ہو کر اس کو اور اس کے وقت
یعنی رات کو ہٹا کر دن بنا دے جیسا کہ قمر بھی اسی طرح آفتاب کو اس کے ظہور نور کے وقت نہیں
پکڑ سکتا کہ دن کو ہٹا کر رات بنا دے اور اس میں قمر کا نور ظاہر ہو جائے اور (اسی طرح) نہ رات
دن کے زمانہ مقررہ کے ختم ہونے سے پہلے آسکتی ہے (جیسے دن بھی رات کے زمانہ
مقررہ کے ختم ہونے سے پہلے نہیں آسکتا) اور (چاند اور سورج) دونوں ایک ایک کے
دائرہ میں رحاب سے اس طرح چل رہے ہیں جیسے گویا تیر رہے ہیں اور حساب سے باہر نہیں
ہو سکتے کہ رات دن کے حساب میں خلل واقع ہو سکے اور آگے آیات آفاقہ ارضیہ میں سے
ایک خاص نشانی سفر اور سواری وغیرہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں یعنی ایک نشانی ان کے
لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا، (اپنی) اولاد کو اکثر لوگ تجارت
کے لئے سفر میں بھیجتے تھے، پس اس تعبیر میں تین نعمتوں کی طرف اشارہ ہو گیا۔ اول بھری ہوئی
کشتی کو جو بوجھل ہونے کی وجہ سے پانی میں غرق ہونے والی چیز ہے سطح آب پر رواں کرنا،
دوسرے ان لوگوں کو اولاد عطا فرمانا، تیسرے رزق و سامان دینا جس سے خود گھریں رہیں
اور اولاد کو کارندہ بنا کر بھیجیں اور (سفر خشکی کے لئے) ہم نے ان کے لئے کشتی ہی جیسی یسی
چیزیں پیدا کیں جن پر یہ لوگ سوار ہوتے ہیں (مراد اس سے اونٹ وغیرہ ہیں اور تشبیہ کشتی
کے ساتھ اس خاص وصف کے اعتبار سے ہے کہ اس پر بھی سواری اور بار برداری اور
قطع مسافت کی جاتی ہے اور اس تشبیہ کا حسن اس سے بڑھ گیا کہ عرب میں اونٹ کو سفینۃ البر
یعنی خشکی کی کشتی کہتے کا محاورہ شائع تھا۔ آگے کشتی کے ذکر کی مناسبت سے کفار کے لئے
ایک وعید عذاب کی بیان فرمائی کہ) اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں پھر نہ تو (جن چیزوں
کو وہ پوجتے ہیں ان میں سے) ان کا کوئی فریاد رس ہو (جو غرق سے بچالے) اور نہ یہ (بعد
غرق کے موت سے) خلاصی دیئے جائیں (یعنی نہ کوئی موت سے چھڑا سکے) مگر یہ ہماری ہی
ہربانی ہے اور ان کو ایک وقت معین تک (دنیاوی زندگی سے) فائدہ دینا (منظور) ہے
اس لئے ہمت دے رکھی ہے۔

معارف و مسائل

سورۃ یس میں زیادہ تر مضامین آیات قدرت اور اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات
بیان کر کے آخرت پر استدلال اور حشر و نشر کے عقیدے پر بچتہ کرنے سے متعلق ہیں۔
مذکورہ صدر آیات میں قدرت الہیہ کی ایسی ہی نشانیاں بیان فرمائی ہیں جو ایک طرف

اس کی قدرت کاملہ کے دلائل واضح ہیں اور دوسری طرف انسان اور عام مخلوقات پر حق تعالیٰ کے خاص انعامات و احسانات اور ان میں عجیب و غریب حکمتوں کا اثبات ہے۔

پہلی آیت میں زمین کی ایک مثال پیش فرمائی ہے جو ہر وقت ہر انسان کے سامنے ہے کہ خشک زمین پر آسمان سے پانی برستا ہے تو زمین میں ایک قسم کی زندگی پیدا ہوتی ہے جس کے آثار اس میں پیدا ہونے والی نباتات اور اشجار اور ان کے ثمرات سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ان درختوں کے پڑھانے اور باقی رکھنے کے لئے زیر زمین اور سطح زمین پر چشموں کا جاری کرنا ذکر فرمایا: **لِيَاْكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ** یعنی ہواؤں بادلوں اور زمین کی ساری قوتوں کو کام میں لگانے کا منشاء یہ ہے کہ لوگ ان کے پھل کھائیں۔ یہ سب چیزیں تو آنکھوں سے مشاہدہ کی ہیں، جو ہر انسان دیکھنا جانتا ہے کہ آگے انسان کو اس چیز پر متنبہ کیا گیا جس کے لئے یہ سارا کارخانہ قائم کیا گیا۔ فرمایا

نباتات کی پیداوار میں انسان کے عمل کا دخل نہیں **وَمَا عَلَيْكُمْ أَلَّا يَأْكُلُوا**، جبہر مفسرین نے اس میں حرف مآ کو نفی کے لئے قرار دے کر یہ ترجمہ کیا ہے کہ نہیں بنایا ان پھلوں کو ان

لوگوں کے ہاتھوں نے۔ اس جملے نے غافل انسان کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ ذرا اپنے کام اور محنت میں غور کر کہ تیرا کام اس باغ و بہار میں اس کے سوا کیا ہے کہ تو نے زمین میں بیج ڈال دیا، اس پر پانی ڈال دیا، زمین کو نرم کر دیا، کہ نازک کو نپل نکالنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو، مگر اس بیج میں سے درخت اُگنا، درخت پر پتے اور شاخیں نکالنا پھر اس پر طرح طرح کے پھل پیدا کرنا ان سب چیزوں میں تیرا کیا دخل ہے۔

یہ تو خالص قادر مطلق حکیم و دانایا ہی کا فعل ہو سکتا ہے۔ اس لئے تیرا فرض ہے کہ ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے وقت اس کے خالق و مالک کو فراموش نہ کرے۔ اسی کی نظیر سورۃ واقعہ کی آیت **أَفَوَيْتُمْ مَّا تَحَرُّثُونَ** **ءَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَ** **أَمْ نَحْنُ الْمُزَارِعُونَ** یعنی دیکھو تو جو چیز تم بوتے ہو اس کو نشوونما دے کر درخت تم نے بنایا ہے یا ہم نے؟ خلاصہ یہ ہوا کہ اگرچہ ان پھلوں کے بنانے میں انسان کا کوئی دخل نہیں، مگر ہم نے اپنے فضل سے ان کو پیدا بھی کیا اور انسان کو ان کا مالک بھی بنا دیا اور اس کو اس کے کھانے اور فائدہ اٹھانے کا سلیقہ بھی سکھا دیا۔

انسانی غذا اور حیوانات اور ابن جریر وغیرہ بعض مفسرین نے **وَمَا تَحْمِلَتْنِي** میں لفظ مآ کو نفی کے لئے نہیں بلکہ اسم موصول بمعنی **الَّذِي** قرار دے کر یہ ترجمہ کیا ہے

کہ یہ سب چیزیں اس لئے پیدا کی ہیں کہ لوگ ان کے پھل کھائیں، اور ان چیزوں کو بھی کھاویں جو ان نباتات اور پھلوں سے خود انسان اپنے ہاتھوں کے کسب و عمل سے تیار کرتا ہے مثلاً

پھلوں سے طرح طرح کے حلوے، اچار، چٹنی، تیار کرنا اور بعض پھلوں سے تیل وغیرہ نکالنا جو انسانی کسب و عمل کا نتیجہ ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوگا کہ یہ پھل جو قدرت نے بنائے ہیں بغیر کسی عمل اور انسانی تصرف کے بھی کھانے کے قابل بنائے گئے ہیں، اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ سلیقہ بھی دیا ہے کہ ایک ایک پھل سے طرح طرح کی خوش ذائقہ اور مفید چیزیں تیار کر لے۔

اس صورت میں پھلوں کا پیدا کرنا اور انسان کو اس کا سلیقہ دینا کہ ایک پھل کو دوسری چیزوں سے مرکب کر کے طرح طرح کی اشیاء خوردنی خوش ذائقہ اور مفید تیار کر لے، یہ دوسری نعمت ہے۔ ابن کثیر نے ابن جریر کی اس تفسیر کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ اس تفسیر کی تائید حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی قرأت سے بھی ہوتی ہے، کیونکہ ان کی قرأت میں لفظ عا کے بجائے عَمَّا آیا ہے یعنی مِمَّا عَمِلْتُمْ اٰیِدْہُمْ۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ دنیا کے تمام حیوانات بھی نباتات اور پھل کھاتے ہیں، کچھ جانور گوشت کھاتے ہیں کچھ مٹی کھاتے ہیں، لیکن ان سب جانوروں کی خوراک مفردات ہی سے ہے۔ گھاس کھانے والا خالص گھاس، گوشت کھانے والا خالص گوشت کھاتا ہے، ان چیزوں کو دوسری چیزوں سے مرکب کر کے طرح طرح کے کھانے تیار کرنا، نمک، مرچ، شکر، ترشی وغیرہ سے مرکب ہو کر ایک کھانے کی دس قسمیں بن جاتی ہیں۔ یہ مرکب خوراک صرف انسان ہی کی ہے اسی کو مختلف چیزوں سے ایک مرکب غذا تیار کرنے کا سلیقہ دیا گیا ہے۔ یہ گوشت کے ساتھ نمک، مرچ، مسالے اور پھلوں کے ساتھ شکر وغیرہ کا امتزاج انسان کی صنعت کاری ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس کو سکھادی ہے۔ قدرت کی ان عظیم الشان نعمتوں اور ان میں قدرت کی صنعت کاری کی بے مثال آیتوں کو ذکر فرمانے کے بعد آخر میں فرمایا اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ، کیا یہ عاقل لوگ ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد شکر گزار نہیں ہوتے؟ آگے اس زمینی پیداوار اور آب و ہوا کے ذکر کے بعد انسان اور حیوانات کو بھی شامل کر کے قدرت مطلقہ کی ایک اور نشانی سے آگاہ کیا جاتا ہے، مَسْبُحْنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَنۡثٰ وَاجَعًا مِّمَّا مَشَّکَبُتِ الْاَسۡرَاصِ وَ مِنْ اَنۡفُسِہِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ، اس میں لفظ ازواج زوج کی جمع ہے، جوے جوڑے کے معنی میں آتا ہے۔ جوڑے میں دو متقابل چیزیں ہوتی ہیں، ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کا زوج کہا جاتا ہے۔ جیسے مرد و عورت ہیں مرد کو عورت کا اور عورت کو مرد کا زوج کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حیوانات کے نر و مادہ باہم زوج ہیں، نباتات کے بہت سے درختوں میں بھی نر اور مادہ کا اور اک کیا گیا ہے۔ کھجور اور پیپتہ کے درختوں میں تو معرود و مشہور ہی ہے، اوروں میں بھی ہو تو کچھ بعید نہیں۔ جیسا کہ سائنس کی جدید تحقیقات میں تمام پھلدار اور پھلدار

درختوں میں نرودادہ ہوتے ہیں، ان میں توالد و تناسل ہونا بتلایا گیا ہے۔ اسی طرح اگر یہی مخفی سلسلہ جمادات اور دوسری مخلوقات میں بھی ہو تو کیا بعید ہے جس کی طرف وَمَا لَا يَعْلَمُونَ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور عام طور پر حضرات مفسرین نے ازواج کو بمعنی انواع و اقسام لکھا ہے، کیونکہ جس طرح نرودادہ کو باہم زوجین کہا جاتا ہے اسی طرح دو متقابل چیزوں کو بھی زوجین کہتے ہیں جیسے سردی گرمی، خشکی تری، بچ خوشی، بیماری تندرستی، پھر ان میں ہر ایک کے اندر اعلیٰ ادنیٰ، متوسطہ کے اعتبار سے بہت درجات اور انواع و اقسام بن جاتی ہیں، اسی طرح انسانوں اور جانوروں میں رنگ و ہیئت اور زبان اور طرز معیشت کے اعتبار سے بہت سی انواع و اقسام ہیں۔ لفظ ازواج ان تمام انواع و اقسام کو شامل ہے۔ آیت مذکورہ میں پہلے تو وَمَا تَنْبِكُ الْكَرْهَىٰ یعنی نباتات کی انواع و اقسام کا بیان فرمایا ہے، اس کے بعد مِنْ أَنْفُسِهِمْ یعنی خود انسانی نفوس کے انواع و اقسام کا ذکر ہے، اور اس کے بعد مِمَّا لَا يَعْلَمُونَ میں ہزاروں مخلوقات شامل ہیں جن کا آج تک بھی لوگوں کو انکشاف نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ زمین کی تہہ میں اور دریاؤں اور پہاڑوں میں کتنی انواع و اقسام حیوانات، نباتات اور جمادات کی ہیں۔

وَأَيُّ لَّهُمْ أَلِيلٌ نَّسْتَكْمُ مِنْهُ اللَّيْلَارَ، زمین کی مخلوقات میں قدرت خداوندی کی نشانیاں بیان فرمانے کے بعد آسمانی اور آفاقی مخلوقات کا ذکر ہے۔ سَلَخَ کے لفظی معنی کھال اتارنے کے ہیں، کسی جانور کے اوپر سے کھال یا دوسری چیزوں پر سے غلاف اتار دیا جائے تو اندر کی چیز ظاہر ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مثال میں اشارہ فرمایا ہے کہ اس جہان میں اصل تو ظلمت اور اندھیرا ہے، روشنی عارضی ہے جو سیارات اور ستاروں کے ذریعہ زمین پر چھا جاتی ہے۔ تقدیری نظام میں مقررہ وقت پر یہ روشنی جو دنیا کی اندھیری پر چھائی ہوئی ہوتی ہے اس کو اوپر سے ہٹا لیا جاتا ہے تو ظلمت و اندھیری رہ جاتی ہے، اسی کو عورت میں رات کہا جاتا ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ، آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آفتاب چلتا رہتا ہے، اپنے مستقر کی طرف مستقر جائے قرار کو بھی کہا جاتا ہے، اور وقت قرار کو بھی یعنی مستقر زمانی بھی ہو سکتا ہے مکانی بھی۔ اور لفظ مستقر منہائے سیر و سفر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہی بلا کسی وقفہ اور سکون کے دوسرا دورہ سفر شروع ہو جائے (ذکرہ ابن کثیر)

بعض حضرات مفسرین نے تو اس جگہ مستقر سے مستقر زمانی مراد لیا ہے، یعنی وہ وقت جبکہ آفتاب اپنی حرکت مقررہ پوری کر کے ختم کر دے گا، اور وہ وقت قیامت کا دن ہے۔

مُسْتَقَرُّهَا تَحْتَ الْعَرْشِ، بخاری نے اس روایت کو متعدد مقامات پر نقل کیا ہے اور ابن ماجہ کے علاوہ تمام کتب ستہ میں یہ روایت موجود ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی اسی مضمون کی حدیث منقول ہے، اس میں کچھ زیادتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ روزانہ آفتاب تحت العرش پہنچ کر سجدہ کرتا ہے اور نئے دورے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ اجازت پا کر نیا دورہ شروع کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن ایسا آئے گا جب اس کو نیا دورہ کرنے کی اجازت نہیں ملے گی، بلکہ یہ حکم ہوگا کہ جس طرف سے آیا ہے اسی طرف لوٹ جا۔ یعنی مغرب کی طرف سے زمین کے نیچے جا پھر مغرب ہی کی طرف سے لوٹ کر مغرب سے طلوع ہو جا۔ جس روز ایسا ہوگا تو یہ قیامت کے بالکل قریب ہونے کی علامت ہوگی، اور اس وقت توبہ کرنے اور ایمان لانے کا دروازہ بند کر دیا جائے گا، اس وقت کسی مبتلائے گناہ کی گناہ سے اور مبتلائے شرک و کفر کی کفر سے توبہ قبول نہ ہوگی (ابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق)۔

سجود شمس یعنی آفتاب کے | ان روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقر سے مراد مکانی مستقر ہے زیر عرش سجدہ کرنے کی تحقیق | یعنی وہ جگہ جہاں آفتاب کی حرکت کا ایک دورہ پورا ہو جائے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ جگہ تحت عرش ہے۔ اس صورت میں مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ہر روز آفتاب ایک خاص مستقر کی طرف چلتا ہے، پھر وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کر کے اگلے دورے کی اجازت مانگتا ہے، اجازت ملنے پر دوسرا دورہ شروع کرتا ہے۔

لیکن واقعات و مشاہدات اور ہیئت و فلکیات کے بیان کردہ اصول کی بناء پر اس میں متعدد قوی اشکالات ہیں۔

اول یہ کہ عرشِ رحمن کی جو کیفیت قرآن و سنت سے سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام زمینوں اور آسمانوں کے اوپر محیط ہے۔ یہ زمین اور سب آسمان مع سیارات و انجم کے سب کے سب عرش کے اندر محصور ہیں، اور عرشِ رحمن ان تمام کائناتِ سماویہ کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، اس لحاظ سے آفتاب تو ہمیشہ ہر حال اور ہر وقت ہی زیر عرش ہے، پھر غروب کے بعد زیر عرش جانے کا کیا مطلب ہوگا؟

دوسرے یہ کہ مشاہدہ عام ہے کہ آفتاب جب کسی ایک جگہ سے غروب ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع ہوتا ہے، اس لئے طلوع و غروب اس کا ہر وقت ہر حال میں جاری ہے، پھر بعد الغروب تحت العرش جانے اور سجدہ کرنے کے کیا معنی ہیں؟

تیسرے یہ کہ اس حدیث کے ظاہر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب اپنے مستقر پر پہنچ کر وقفہ کرتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کر کے اگلے دورے کی اجازت لیتا ہے، حالانکہ

آفتاب کی حرکت میں کسی وقت بھی انقطاع نہ ہونا کھلا ہوا مشاہدہ ہے۔ اور پھر چونکہ طلوع و غروب آفتاب کا مختلف مقامات کے اعتبار سے ہر وقت ہی ہوتا رہتا ہے، تو یہ وقفہ اور سکون بھی ہر وقت ہونا چاہئے، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ آفتاب کو کسی وقت بھی حرکت نہ ہو،

یہ اشکالات صرف فنون ریاضی اور فلکیات ہی کے نہیں، مشاہدات اور واقعات کے ہیں جن سے صرف نظر نہیں ہو سکتا، اور فنی اعتبار سے فلک الافلاک کے تابع آفتاب کی یہ میہ حرکت اور آفتاب کا چوتھے آسمان میں مرکوز ہونا جو بطلمیوسی نظریہ ہے، جس کے خلاف اس سے پہلے بھی فیثاغورث نے اس نظریہ کی مخالفت کی تھی، اور آجکل کی نئی تحقیقات بطلمیوسی نظریہ کی غلطی اور فیثاغورث کے نظریہ کی صحت کو قریب بہ یقین کر دیا ہے، اور حالیہ خلائی سفروں اور چاند تک انسان کی رسائی کے واقعات نے اتنی بات تو یقینی کر ہی دی ہے کہ تمام سیارات آسمان سے نیچے کی فضا میں ہیں، آسمانوں کے اندر مرکوز نہیں۔ قرآن کریم کی آیت جو عنقریب آرہی ہے **ذُكِّلْ فِي قُلُوبِ يَبْصُحُونَ**، اس سے بھی اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے، اس نظریہ میں یہ بھی ہے کہ یہ روزانہ کا طلوع و غروب آفتاب کی حرکت سے نہیں بلکہ زمین کی حرکت سے ہے۔ اس فنی نظریہ کے اعتبار سے حدیث مذکور میں ایک اور اشکال بڑھ جاتا ہے۔

اس کا جواب سمجھنے سے پہلے یہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ جہاں تک آیت مذکورہ کی تصریح ہے اس پر مذکورہ شبہات و اشکالات میں سے قرآن پر کوئی بھی اشکال نہیں ہوتا۔ اس کا مفہوم تو صرف اتنا ہے کہ آفتاب کو حق تعالیٰ نے ایک ایسی منظم اور مستحکم حرکت پر لگایا ہوا ہے کہ وہ اپنے مستقر کی طرف برابر ایک حالت پر چلتا رہتا ہے۔ اگر اس مستقر سے مراد تفسیر قتادہ کے مطابق مستقر زمینی لیا جائے یعنی روز قیامت، تو معنی اس کے یہ ہیں کہ آفتاب کی یہ حرکت قیامت تک دائمی ایک حال پر چلتی رہے گی پھر اس روز ختم ہو جائے گی۔ اور اگر مستقر مکانی مراد لیں تو بھی اس کا مستقر مدار شمسی کے اس نقطہ کو کہا جاسکتا ہے جہاں سے اول تخلیق کے وقت آفتاب نے حرکت شروع کی اسی نقطہ پر پہنچ کر اس کا شبانہ روز کا ایک دورہ مکمل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی نقطہ اس کا انتہائی سفر ہے، اس پر پہنچ کر نئے دورہ کی ابتداء ہوتی ہے۔ رہا یہ کہ اس عظیم الشان دائرہ کا وہ نقطہ کہاں اور کونسا ہے جہاں سے آفتاب کی حرکت ابتداء آفرینش میں شروع ہوئی، قرآن کریم اس قسم کی فضول بحثوں میں انسان کو نہیں الجھاتا جس کا تعلق اس کے کسی دینی یا دنیوی فائدے سے نہ ہو۔ یہ اسی قسم کی بحث ہے، اس لئے اس کو چھوڑ کر قرآن کریم نے اصل مقصد کی طرف توجہ دلائی۔ اور وہ مقصد حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت کاملہ کے خاص مظاہر کا بیان ہے، کہ اس جہان میں سب سے بڑا اور سب سے روشن ترین کرہ آفتاب کا ہے

وہ بھی نہ خود بخود بن گیا ہے اور نہ خود بخود اس کی کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے نہ باقی رہ سکتی ہے، وہ اپنی اس مشابہہ روز کی حرکت میں ہر وقت حق تعالیٰ کی اجازت و مشیت کے تابع چلتا ہے۔

جتنے اشکالات اوپر لکھے گئے ہیں آیات مذکورہ کے بیان پر ان میں سے کوئی بھی مشبہہ اور اشکال نہیں، البتہ احادیث مذکورہ جن میں یہ آیا ہے کہ وہ غروب کے بعد زیر عرش پہنچ کر سجدہ کرتا ہے اور اگلے دورے کی اجازت مانگتا ہے یہ سب اشکالات اس سے متعلق ہیں۔ اور اس آیت کے ذیل میں یہ بحث اسی لئے چھڑی کہ حدیث کے بعض الفاظ میں اس آیت کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ اس کے جوابات محدثین و مفسرین حضرات نے مختلف دیئے ہیں، ظاہر الفاظ کے اعتبار سے جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ آفتاب کا یہ سجدہ دن رات میں صرف ایک مرتبہ بعد از غروب ہوتا ہے، جن حضرات نے حدیث کو اسی ظاہری مفہوم پر محمول کیا ہے انہوں نے غروب کے متعلق تین احتمال بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ معظم معمرہ کا غروب مراد ہو، یعنی اس مقام کا جہاں کے غروب پر اکثر دنیا کی آبادی میں غروب ہو جاتا ہے، یا خط استواء کا غروب، یا افق مدینہ کا غروب۔ اس طرح یہ اشکال نہیں رہتا کہ آفتاب کا غروب و طلوع تو ہر وقت ہر آن ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں ایک خاص افق کے غروب پر کلام کیا گیا ہے، لیکن صاف بے غبار جواب وہ معلوم ہوتا ہے جو حضرت استاذ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مقالے ”سجدہ شمس میں خستیاں فرمایا ہے، اور متحدہ دائرہ تفسیر کے کلام سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس کے سمجھنے سے پہلے پیغمبرانہ تعلیمات و تعبیرات کے متعلق یہ اصولی بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ آسمانی کتابیں اور ان کے لانے والے انبیاء علیہم السلام خلق خدا کو آسمان و زمین کی مخلوقات میں غور و فکر اور تدبیر کی طرف مسلسل دعوت دیتے ہیں، اور ان سے اللہ تعالیٰ کے وجود و توحید و علم و قدرت پر استدلال کرتے ہیں، مگر ان چیزوں میں تدبیر اسی حد تک مطلوب شرعی ہے جس حد تک اس کا تعلق انسان کی دنیوی اور معاشرتی ضرورت سے یا دینی اور اخروی ضرورت سے ہو۔ اس سے زائد نری فلسفیانہ تدقیق اور حقائق اشیاء کے کھوج لگانے کی فکر میں عام خلق اللہ کو نہیں ڈالا جاتا۔ کیونکہ اول تو حقائق اشیاء کا مکمل حقیقی علم خود حکماء و فلاسفہ کو بھی باوجود عمریں صرف کرنے کے نہیں ہو سکا، بیچارے عوام تو کس شمار میں ہیں، پھر اگر وہ حاصل بھی ہو جائے اور اس سے نہ ان کی کوئی دینی ضرورت پوری ہو اور نہ کوئی صحیح مقصد دنیوی اس سے حاصل ہو تو اس لا یعنی اور فضول بحث میں دخل دینا اضاعتِ عمر اور اضاعتِ مال کے سوا کیا ہے۔

قرآن اور انبیاء کا استدلال آسمان و زمین کی مخلوقات اور ان کے تغیرات و انقلابات

سے صرف اس حد تک ہوتا ہے جو ہر انسان کو مشاہدہ اور ادنیٰ غور و فکر سے حاصل ہو سکے۔ فلسفہ اور ریاضی کی فنی تدقیقات جو صرف حکماء و علماء ہی کر سکتے ہیں نہ ان پر استدلال کا مدار رکھا جاتا ہو نہ ان میں غور و غوض کی ترغیب دی جاتی ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ پر ایمان اور اس کے پیغام پر عمل ہر انسان کا فرض ہے۔ عالم ہو یا جاہل، مرد ہو یا عورت، شہری ہو یا دیہاتی، کسی پہاڑ اور جزیرہ میں رہتا ہو یا کسی متمدن شہر میں، اس لئے پیغمبرانہ تعلیمات عوام کی نظر اور ان کی عقل و فہم کے مطابق ہوتی ہیں جن میں کسی فنی مہارت کی ضرورت نہ ہو۔

نماز کے اوقات کی پہچان، سمت قبلہ کا متعین کرنا، مہینوں اور سالوں اور تاریخوں کا کادراک، ان سب چیزوں کا علم ریاضی کے حسابات کے ذریعہ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے، مگر شریعت اسلام نے ان میں سے کسی چیز کا مدار ریاضی کی فنی تحقیقات پر رکھنے کے بجائے عام مشاہدات پر رکھا ہے۔ مہینے اور سال اور ان کی تاریخیں قمری حساب رکھیں اور چاند کے ہونے نہ ہونے کا مدار صرف رویتِ ہلال اور مشاہدہ پر رکھا۔ روزے اور حج کے ایام اسی بنیاد سے متعین کئے گئے۔ چاند کے گھٹنے بڑھنے چھپنے اور بھر طلع ہونے کا راز بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اس کا جواب قرآن نے یہ دیا کہ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ النَّاسِ وَالْحَجِّ، یعنی آپ کہہ دیں کہ چاند کے یہ سب تغیرات اس مقصد کے لئے ہیں کہ تم ان سے مہینے کا شروع اور ختم اور اس کی تاریخیں معلوم کر کے حج وغیرہ کے دن متعین کر سکو۔ اس جواب نے ان کو اس پر تنبیہ فرمادی کہ تمہارا سوال لایعنی اور فضول ہے، اس کی حقیقت معلوم کرنے پر تمہارا کوئی کام دین یا دنیا کا اٹکا ہوا نہیں، اس لئے سوال اس چیز کا کرو جس کا تعلق تمہاری دینی یا دنیوی ضرورت سے ہو۔

اس تہید کے بعد اصل معاملہ پر غور کیجئے، کہ آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ملکہ اور حکمت بالغہ کے چند مظاہر کا ذکر کر کے انسان کو اللہ کی توحید اور علم و قدرت کا ملکہ پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اس میں سب سے پہلے زمین کا ذکر کیا، جو ہر وقت ہمارے سامنے ہے وَآيَةٌ لَهُمُ اللَّائِيَةُ، پھر اس پر پانی برسا کر درخت اور نباتات اگانے کا ذکر کیا، جو ہر انسان دیکھتا اور جانتا ہے، آخِیَّتِنَا هَا الْاٰیَةُ، اس کے بعد آسمان اور فضا سے آسانی سے متعلق چیزوں کا ذکر شروع کر کے پہلے لیل و نہار کے روزانہ انقلاب کا ذکر فرمایا وَآيَةٌ لَهُمُ اللَّیْلُ الْاٰیَةُ، اس کے بعد سورج اور چاند جو سیارات و انجم میں سب سے بڑے ستارے ہیں ان کا ذکر فرمایا۔ ان میں پہلے آفتاب کے متعلق فرمایا وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ اس میں غور کیجئے کہ مقصد اس کا یہ بتلانا ہے کہ آفتاب

خود بخود اپنے ارادے اور اپنی قدرت سے نہیں چل رہا بلکہ یہ ایک عزیز و علیم یعنی قدرت والے اور جاننے والے کے مقرر کردہ نظم کے تابع چل رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غروب آفتاب کے قریب حضرت ابوذر غفاریؓ کو ایک سوال و جواب کے ذریعہ اسی حقیقت پر متنبہ ہونے کی ہدایت فرمائی، جس میں بتلایا کہ آفتاب غروب ہونے کے بعد عرش کے نیچے اللہ کو سجدہ کرتا ہے اور پھر اگلا دورہ شروع کرنے کی اجازت مانگتا ہے، جب اجازت مل جاتی ہے تو حسب دستور آگے چلتا ہے، اور صبح کو جانب مشرق سے طلوع ہو جاتا ہے۔ اس کا حاصل اس سے زائد نہیں کہ آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت عالم دنیا میں ایک نیا انقلاب آتا ہے، جس کا مدار آفتاب پر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انقلابی وقت کو انسانی تنبیہ کے لئے موزوں سمجھ کر یہ تلقین فرمائی کہ آفتاب کو خود مختار اپنی قدرت سے چلنے والا نہ سمجھو، یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اذن و مشیت کے تابع چل رہا ہے۔ اس کا ہر طلوع و غروب اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوتا ہے، یہ اس کی اجازت کے تابع ہے، اس کے تابع فرمان حرکت کرنے ہی کو اس کا سجدہ قرار دیا گیا۔ کیونکہ سجدہ ہر چیز کا اس کے مناسب حال ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن نے خود تصریح فرمادی ہے کُلُّ شَيْءٍ قَدْ عَلِمَ مَوْاقِعَ وَتَسْبِيحِهِ یعنی ساری مخلوق اللہ کی عبادت اور تسبیح میں مشغول ہے، مگر ہر ایک کی عبادت و تسبیح کا طریقہ الگ الگ ہے، اور ہر مخلوق کو اس کی عبادت و تسبیح کا طریقہ سکھلا دیا جاتا ہے۔ جیسے انسان کو اس کی نماز و تسبیح کا طریقہ بتلا دیا گیا ہے، اس لئے آفتاب کے سجدہ کے یہ معنی سمجھنا کہ وہ انسان کے سجدہ کی طرح زمین پر ماتھا ٹیکنے ہی سے ہو گا صحیح نہیں۔

اور جبکہ قرآن و سنت کی تصریحات کے مطابق عرش خداوندی تمام آسمانوں، سیاروں، زمینوں پر محیط ہے، تو یہ ظاہر ہے کہ آفتاب ہر وقت ہر جگہ زیر عرش ہی ہے۔ اور جبکہ تجربہ شاہد ہے کہ آفتاب جس وقت ایک جگہ غروب ہو رہا ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع بھی ہو رہا ہوتا ہے، اس لئے اس کا ہر لمحہ طلوع و غروب سے خالی نہیں، تو آفتاب کا زیر عرش رہنا بھی دائمی ہر حال میں ہے، اور غروب و طلوع ہونا بھی ہر حال میں ہے۔ اس لئے حاصل مضمون حدیث کا یہ ہوا کہ آفتاب اپنے پورے دورے میں زیر عرش اللہ کے سامنے سجدہ ریز رہتا ہے یعنی اس کی اجازت اور فرمان کے تابع حرکت کرتا ہے، اور یہ سلسلہ اسی طرح قریب قیامت تک چلتا رہے گا، یہاں تک کہ قیامت کی باکھل قریبی علامت ظاہر کرنے کا وقت آجائے گا، تو آفتاب کو اپنے مدار پر اگلا دورہ شروع کرنے کے بجائے پیچھے لوٹ جانے کا حکم ہو جائیگا، اور وہ پھر مغرب کی طرف سے طلوع ہو جائے گا۔ اس وقت دروازہ توبہ کا بند ہو جائے گا، کسی کا ایمان و توبہ اس وقت مقبول نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ غروب آفتاب کی تخصیص اور اس کے بعد زیر عرش جانے اور وہاں سجدہ کرنے اور اگلے دورے کی اجازت مانگنے کے جو واقعات اس روایت میں بتلائے گئے ہیں پیغمبرانہ موثر تعلیم کے مناسب بالکل عوامی نظر کے اعتبار سے ایک تمثیل ہے۔ نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ انسان کی طرح زمین پر سجدہ کرے، اور نہ سجدہ کرنے کے وقت آفتاب کی حرکت میں کچھ وقفہ ہونا لازم آتا ہے۔ اور نہ یہ مراد ہے کہ وہ دن رات میں صرف ایک ہی سجدہ کسی خاص جگہ جا کر کرتا ہے، اور نہ یہ کہ وہ صرف غروب کے بعد تحت العرش جاتا ہے۔ مگر اس انقلابی وقت میں جبکہ سب عوام یہ دیکھ رہے ہیں کہ آفتاب ہم سے غائب ہو رہا ہے اس وقت بطور تمثیل ان کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ درحقیقت آفتاب کے زیر عرش تابع فرمان چلتے رہنے سے ہو رہا ہے، آفتاب خود کوئی قدرت و طاقت نہیں رکھتا، تو جس طرح اس وقت اہل مدینہ اپنی جگہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اب آفتاب سجدہ کر کے اگلے دورے کی اجازت لیگا اس طرح جہاں جہاں وہ غروب ہوتا جائے گا سب کے لئے یہی سبق حاصل کرنے کی تلقین ہوگی اور حقیقت معاملہ یہ نکلی کہ آفتاب اپنے مدار پر حرکت کے درمیان ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ بھی کرتا ہے اور آگے چلنے کی اجازت بھی مانگتا رہتا ہے، اور اس سجدہ اور اجازت کے لئے اس کو کسی سکون اور وقفہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس تقریر پر حدیث مذکورہ میں نہ مشاہدات کی رو سے کوئی مشبہ ہوتا ہے نہ قواعد ہیئت و ریاضی کے اعتبار سے اور نظام شمسی اور حرکت سیارات میں بطلیموسی تحقیق صحیح ہو یا فیثاغورث والی تحقیق جو آجکل نئی تحقیقات سے مؤید ہو گئی ہے، دونوں صورتوں میں حدیث مذکورہ پر کوئی مشبہ اور اشکال باقی نہیں رہتا۔

رہا یہ سوال کہ حدیث مذکور میں جو آفتاب کا سجدہ کرنا اور اگلے دورے کی اجازت طلب کرنا مذکور ہے، یہ کام تو حیات اور علم و عقل کا ہے، آفتاب و ماہتاب بے جان بے شعور مخلوقات ہیں، ان سے یہ افعال کیسے صادر ہوئے؟ تو اس کا جواب قرآن کی آیت **وَلَا يَسْبِقُهَا شَيْءٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ** کے تحت میں آچکا ہے کہ ہم جن چیزوں کو بے جان اور بے عقل و بے شعور سمجھتے ہیں، وہ بھی درحقیقت رُوح اور جان اور عقل و شعور کا ایک خاص حصہ رکھتے ہیں۔ البتہ ان کی حیات اور عقل و شعور انسان و حیوان کے مقابلہ میں کم اور اتنی کم ہے کہ عام احساسات اس کا ادراک نہیں کر سکتے، مگر اس کی نفی پر بھی کوئی شرعی یا عقلی دلیل موجود نہیں اور قرآن کریم نے آیت مذکورہ میں ان کا ذی حیات اور ذی عقل و شعور ہونا ثابت کر دیا ہے، اور نئی تحقیقات نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

فائدہ ۱۔ قرآن وحدیث کی مذکورہ تصریحات سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوئی کہ شمس و قمر دونوں متحرک ہیں، ایک میعاد کے لئے چل رہے ہیں اس سے اس نئے نظریہ کی نفی ہوتی ہے جو آفتاب کی حرکت کو تسلیم نہیں کرتا، اور جدید ترین تحقیقات نے خود بھی اس کو غلط ثابت کر دیا ہے۔
وَالْقَمَرَ قَدْ رَآهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْوَةِ الْيُسْوَیِ عَرَبُونَ، کھجور کے درخت کی خشک شاخ کو کہا جاتا ہے جو مڑ کر کمان جیسی ہو جاتی ہے۔

منازل قمر | منازل، منزل کی جمع ہے، جائے نزول کو منزل کہا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ نے چاند اور سورج دونوں کی رفتار کے لئے خاص حدود مقرر فرمائی ہیں جن

میں سے ہر ایک کو منزل کہا جاتا ہے۔ چاند چونکہ اپنا دورہ ایک مہینہ میں پورا کر لیتا ہے اس لئے اس کی منزلیں تیس یا اسیٹیس ہوتی ہیں، مگر چونکہ ہر مہینہ میں چاند کم از کم ایک دن غائب رہتا ہے، اس لئے عموماً اس کی منزلیں اٹھائیس کہی جاتی ہیں۔ اہل ہیئت و ریاضی نے ان منزلوں کے خاص نام ان ستاروں کی مناسبت سے رکھ دیئے ہیں جو ان منازل کی محاذات میں پائے جاتے ہیں۔ جاہلیت عرب میں بھی انہی ناموں سے منزلوں کی تعیین کی جاتی تھی۔ قرآن کریم ان اصطلاحی ناموں سے بالاتر ہے، اس کی مراد صرف وہ فاصلے ہیں جن کو چاند خاص خاص دلوں میں طو کرتا ہے۔ سورۃ یونس میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے، جو معارف القرآن جلد چہارم کے صفحہ ۵۰۵

و ۵۰۶ میں بیان ہوئی ہے، اس کو دیکھ لیا جائے۔ سورۃ یونس کی آیت میں شمس و قمر دونوں کی منزلوں کا ذکر ہے۔ جَعَلَ الشَّمْسُ جَنَّتًا وَّ الْقَمَرَ نُورًا وَقَدْ رَآهُ مَنَازِلَ الْاٰیَةِ فرق اتنا ہے کہ چاند کی منزلیں مشاہدہ سے پہچانی جاتی ہیں اور آفتاب کی منزلیں ریاضی کے حسابات سے۔
حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْوَةِ الْيُسْوَیِ میں چاند کی کیفیت آخر مہینہ کی بتلائی ہے جب وہ مکمل بد ہونے کے بعد گھٹا گھٹا ایک قوس کی صورت اختیار کر لیتا ہے، عربوں کے ماحول کے مناسب اس کی مثال کھجور کی خشک شاخ سے دی گئی ہے، جو ہلالی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ یَّسْبَحُونَ، یعنی آفتاب و ماہتاب دونوں اپنے اپنے مدار میں تیرتے رہتے ہیں۔ فلک کے لفظی معنی آسمان کے نہیں، بلکہ اس دائرہ کے ہیں جس میں کوئی سیارہ حرکت کرتا ہے۔ یہ آیت سورۃ انبیاء میں بھی گزر چکی ہے، جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ چاند کسی آسمان کے اندر مرکوز نہیں، جیسا کہ بطلموسی نظریہ ہیئت میں ہے، بلکہ وہ آسمان کے نیچے ایک خاص مدار میں حرکت کرتا ہے، اور آجکل کی نئی تحقیقات اور چاند تک انسان کی رسائی کے واقعات نے اس کو بالکل یقینی بنا دیا ہے۔

وَ اٰیٰۃٌ لَّہُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَہُمْ فِي الْفُلْکِ الْمَشْجُونِ وَ خَلَقْنَا لَہُمْ

مِنْ تَمَثَّلَ مَا يَرْكَبُونَ وہ پہلے زمینی مخلوقات کا پھر آسمانی کا بیان اور ان میں اللہ تعالیٰ شانہ کی حکمت و قدرت کے مظاہر کا بیان آچکا ہے۔ اس آیت میں بحر اور اس سے متعلقہ اشیاء میں مظاہر قدرت کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کشتیوں کو خود وزنی بوجھ سے بھری ہوئی ہونے کے باوجود پانی کی سطح پر چلنے کے قابل بنا دیا کہ پانی ان کو غرق کرنے کے بجائے دور ملکوں تک پہنچاتا ہے۔ اور آیت میں ارشاد یہ ہے کہ ہم نے ان کی ذریت کو کشتیوں میں سوار کیا، حالانکہ سوار ہونے والے خود یہ لوگ تھے۔ ذریت کا ذکر شاید اس لئے کیا کہ انسان کا بڑا بوجھ اس کی اولاد و ذریت ہوتی ہے، خصوصاً جبکہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ صرف یہی نہیں کہ تم خود ان کشتیوں میں سوار ہو سکو بلکہ چھوٹے بچے اور ضعیف آدمی اور ان کے سب سامان یہ کشتیاں اٹھاتی ہیں۔ اور خَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی سواری اور بار برداری کے لئے صرف کشتی ہی نہیں بلکہ کشتی کی مثل اور بھی سواری بنائی ہے۔ اس سے اہل عرب نے اپنی عادت کے مطابق اونٹ کی سواری مراد لی ہے، کیونکہ اونٹ بار برداری میں سب جانوروں سے زیادہ ہے، بڑے بڑے بوجھ کے انبار لے کر ملکوں کا سفر کرتا ہے، اسی لئے عرب اونٹ کو سفینۃ البر یعنی خشکی کی کشتی کہا کرتے تھے۔

قرآن میں ہوائی جہاز کا ذکر | مگر یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے اس جگہ اونٹ یا کسی خاص سواری کا نام نہیں لیا، بلکہ مبہم چھوڑا ہے، جس میں ہر ایسی سواری داخل ہے جو انسان اور اس کے اسباب و سامان کو زیادہ زیادہ اٹھا کر منزل مقصود پر پہنچا دے۔ اس زمانے کی نئی ایجاد ہوائی جہازوں نے یہ واضح کر دیا کہ مِنْ تَمَثَّلَ کا سب سے بڑا مصداق ہوائی جہاز ہیں، اور کشتی کے ساتھ اس کی تمثیل بھی اس کی زیادہ مؤید ہے، کہ جس طرح پانی کا جہاز پانی پر تیرتا ہے پانی اس کو غرق نہیں کرتا، ہوائی جہاز ہوا پر تیرتا ہے ہوا اس کو نیچے نہیں گرائی، اور عجب نہیں کہ قرآن حکیم نے اسی لئے مِنْ تَمَثَّلَ مَا يَرْكَبُونَ کو مبہم رکھا ہو تا کہ قیامت تک ایجاد ہونے والی سب سواریاں اس میں شامل ہو جائیں۔ واللہ اعلم

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّقُوا مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ

اور جب کہتے ان کو بچو اس سے جو تمہارے سامنے آتا ہو اور جو پیچھے چھوڑتے ہو شاید کہ تم پر

قُرْحُهُمْ ۝۴۵ وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا

رحم ہو۔ اور کوئی حکم نہیں پہنچتا ان کو اپنے رب کے حکموں سے جس کو

كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿۳۶﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ

وہ ٹلاتے نہ ہوں - اور جب کہتے ان کو خرچ کرو کچھ اللہ کا

اللَّهُ يَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْطَعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ

دیا، کہتے ہیں منکر ایمان والوں کو ہم کیوں کھلائیں ایسوں کو کہ اللہ

اللَّهُ أَطْعَمَهُ قَالُوا أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿۳۷﴾

چاہتا تو اس کو کھلا دیتا، تم لوگ تو بالکل بہک رہے ہو صریح -

خلاصہ تفسیر

اور جب ان لوگوں سے (دلائل توحید اور اس کے نہ ماننے پر عذاب کی وعید سنا کر) کہا جاتا ہے کہ تم لوگ اس عذاب سے ڈرو جو تمہارے سامنے (یعنی دنیا میں آسکتا) ہو (جیسے اوپر کی آیت) اِنْ نَّشَأْ نُغَسِّقْهُمْ میں بیان فرمایا کہ کشتی کا صحیح سالم منزل پر پہنچانا اللہ کی قدرت و مشیت سے ہے، وہ چاہے تو غرق کر سکتا ہے۔ غرض دنیا میں غرق کا عذاب بھی آسکتا ہے اور دوسرے عذاب بھی، اور جو تمہارے (مرے) پیچھے (یعنی آخرت میں یقینی آنے والا) ہے، (مطلب یہ ہے کہ انکار توحید کی وجہ سے جو عذاب تم پر آنے والا ہے، خواہ صرف آخرت میں یا دنیا میں بھی، تم اس عذاب سے ڈرو اور ایمان لے آؤ) تاکہ تم پر رحمت کی جائے (تو وہ اس ترہیب اور عذاب سے ڈرانے کی ذرا پرواہ نہیں کرتے) اور (اسی بات کے نہ ماننے کی کیا تخصیص ہو وہ تو ایسے سنگدل ہو گئے ہیں کہ) ان کے رب کی آیتوں میں سے کوئی آیت بھی ان کے پاس ایسی نہیں آتی جس سے یہ سرتابی نہ کرتے ہوں اور جس طرح وعید عذاب سے وہ متاثر نہیں ہوتے اسی طرح ثواب اور جنت کی ترغیب بھی ان کو نافع نہیں ہوتی چنانچہ جب ان کو نعم الہیہ یاد دلا کر، اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں فقیروں مسکینوں پر) خرچ کرو تو شرارت اور استہزاء کے طور پر یہ کفار ان مسلمانوں سے (جنہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کہا تھا) یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے لوگوں کو کھانے کو دیں جن کو اگر خدا چاہے تو (بہت کچھ) کھانے کو دیدے، تم صریح غلطی میں (پڑے) ہو۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ کے مظاہر قدرت و حکمت، زمین، آسمان وغیرہ میں بیان کر کے خدا شناسی اور توحید کی دعوت دی گئی تھی، اور اس کے قبول کرنے پر جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کا وعدہ تھا، اور نہ ماننے پر عذاب شدید کی وعید۔ آیات مذکورہ اور ان کے بعد آنے والی آیات میں کفار اہل مکہ جو اس کے بلا واسطہ مخاطب تھے اُن کی کج روی کا بیان ہے، کہ نہ اُن پر ترغیبِ ثواب کا اثر ہوتا ہے، نہ ترہیبِ عذاب کا۔

اس سلسلے میں کفار کے ساتھ مسلمانوں کے دو مکالمے ذکر کئے گئے ہیں کہ جب مسلمان ان سے یہ کہتے ہیں کہ تم اللہ کے عذاب سے ڈرو جو تمہارے سامنے دنیا میں بھی آ سکتا ہے، اور تمہارے مرنے کے بعد آخرت میں تو آنا ہی ہے، اگر تم نے اس عذاب سے ڈر کر ایمان قبول کر لیا، تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ مگر یہ سن کر بھی اعراض کرتے ہیں۔ الفاظِ قرآن میں اس جگہ ان کے اعراض کا ذکر صراحتہً اس آیت میں نہیں کیا، کیونکہ اگلی آیت میں جو اعراض کا ذکر ہے اس سے خود بخود یہاں بھی اعراض کرنا ثابت ہو جاتا ہے۔ اور نحوی قاعدہ سے اِذَا قِيلَ لَهُمْ کی شرط کی جنسراء آغَوْضُوا مَحْذُوف ہے، جس کے محذوف ہونے پر اگلی آیت کے الفاظ شاہد ہیں، کہ اُن کے پاس اُن کے رب کی جو بھی آیت آتی ہے وہ اس سے اعراض ہی کرتے ہیں۔

اللہ کا رزق بعض کو | دوسرا مکالمہ یہ ہے کہ جب مسلمان کفار کو غریبوں، فقیروں کی امداد کرنے | بالواسطہ ملنے کی حکمت اور بھوکوں کو کھانا کھلانے کے لئے کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو تمہیں دیا ہے تم اس میں سے محتاجوں کو دیا کرو، تو یہ لوگ بطور استہزاء کہتے ہیں کہ جب تم یہ کہو ہو کہ رازق سب مخلوق کا اللہ تعالیٰ ہے اور اس نے ان کو نہیں دیا، تو ہم کیوں دیں تم جو ہمیں نصیحت کرتے ہو کہ ہم ان کو رزق دیا کریں یہ تو تمہاری گمراہی ہے کہ ہمیں رازق بنانا چاہتے ہو۔ یہ کفار بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ کے رازق ہونے کا اقرار کرتے تھے جیسا کہ قرآن کریم میں ہُوَ الَّذِي سَاءَ لَكُمْ مِمَّنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لِيَقُولَنَّ اللَّهُ "یعنی اگر آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ آسمان سے پانی کس نے نازل کیا، جس سے زمین میں حیات نباتی پیدا ہوئی، اور طرح طرح کے پھل پھول نکلے، تو وہ اقرار کریں گے کہ یہ پانی اللہ ہی نے نازل کیا ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی رزاق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے، مگر مسلمانوں کے جواب میں بطور استہزاء کے یہ کہا کہ جب خدا تعالیٰ رازق ہے تو وہی غریبوں کو بھی دے گا

ہم کیوں دیں۔ گویا ان احمقوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور غریبوں کو دینے کو اللہ کی رزاقیت کے منافی سمجھا۔ اور یہ نہ سمجھا کہ رزاق مطلق کا قانون حکیمانہ یہ ہے کہ ایک انسان کو دے کر اس کو دوسروں کے لئے واسطہ بناتا ہے، اور بالواسطہ دوسروں کو دیتا ہے، اگرچہ وہ اس پر بھی یقیناً قادر ہے کہ سب کو خود ہی بلا واسطہ رزق پہنچا دے، جیسا کہ حیوانات میں عموماً اسی طرح ہر کھڑے کوڑے اور درندے پرندے کو بلا واسطہ رزق ملتا ہے۔ ان میں کوئی مالدار کوئی غریب نہیں، کوئی کسی کو نہیں دیتا، سب کے سب قدرتی دسترخوان سے کھاتے ہیں۔ مگر انسانوں میں نظام معیشت اور باہمی تعاون و تناصر کی روح پیدا کرنے کے لئے رزق پہنچانے میں بعض کو بعض کے لئے واسطہ بناتا ہے، تاکہ خرچ کرنے والے کو ثواب ملے اور جس کو دیا جائے وہ اس کا احسان مند ہو۔ کیونکہ انسانوں کا باہمی تعاون و تناصر جس پر سارا نظام عالم قائم ہے، یہ جی بھی باقی رہ سکتا ہے جبکہ ہر ایک کو دوسرے کی حاجت ہو، غریب کو مالدار کے پیسے کی حاجت ہے اور مالدار کو غریب کی محنت کی ضرورت، ان میں سے کوئی کسی سے بے نیاز نہیں۔ اور غور کریں تو کسی کا کسی پر احسان بھی نہیں ہر شخص جو کچھ کسی کو دیتا ہے وہ اپنے مطلب کے لئے دیتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ مسلمانوں نے کفار کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم کس بنا پر دیا جبکہ ان کا ایمان ہی اللہ پر نہیں اور بتصریح فقہاء وہ احکام فرعیہ کے مخاطب بھی نہیں۔ سو اس کا جواب واضح ہے کہ مسلمانوں کا یہ کہنا کسی شرعی حکم کی تعمیل کرانے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ انسانی ہمدردی اور شرافت کے مروجہ اصول کی بنا پر تھا۔

وَقُولُوا مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۸﴾ مَا يَنْظُرُونَ

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو۔ یہ تو راہ دیکھتے ہیں

إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ ﴿۳۹﴾ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ

ایک چنگھاڑ کی جو اُن کو آ پکڑے گی جب آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے، پھر نہ کر سکیں گے

تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ ﴿۴۰﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم

کہ کچھ کہہ ہی میں اور نہ اپنے گھر کو پھر کر جاسکیں گے۔ اور پھونکی جائے۔ صور پھر تب ہی وہ

مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ ﴿۴۱﴾ قَالُوا يٰوَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا

قبروں سے اپنے رب کی طرف پھیل پڑیں گے۔ کہیں گے او خرابی ہماری کس نے اٹھا دیا

مِنْ مَّرْقَدٍ نَامَتْ هَذِهِ أَمَّا وَعَدَ الرَّحْمَنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ﴿۵۲﴾

ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے یہ وہ ہی جو وعدہ کیا تھا رحمن نے اور سچ کہا تھا پیغمبروں نے

إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿۵۳﴾

بس ایک چنگھاڑ ہوگی پھر اسی دم وہ سارے ہمارے پاس پکڑے چلے آئیں۔

فَالْيَوْمَ لَا تَظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۵۴﴾

پھر آج کے دن ظلم نہ ہوگا کسی جی پر ذرا اور وہی بدلہ پاؤ گے جو کرتے تھے۔

إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغْلٍ فَاكِهِونَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ

تحقیق بہشت کے لوگ آج ایک مشغلہ میں ہیں باتیں کرتے ، وہ اور ان کی عورتیں

فِي ظِلٍّ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَكِعُونَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُمْ مَا

سایوں میں تختوں پر بیٹھے ہیں تکیہ لگائے۔ ان کے لئے وہاں ہر میوہ اور ان کے لئے

يَدَّعُونَ ﴿۵۷﴾ سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبِّ رَحِيمٍ ﴿۵۸﴾ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ

جو کچھ مانگیں۔ سلام بولنا ہے رب ہر بان سے ، اور تم الگ ہو جاؤ آج

أَيُّهَا الْمَجْرُمُونَ ﴿۵۹﴾ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَبْنَىٰ أَدَمَ أَنْ لَا

اے گنہگارو۔ میں نے نہ کہہ رکھا تھا تم کو اے آدم کی اولاد کہ

تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۶۰﴾ وَأَنْ أَعْبُدُونِي

نہ پوجو شیطان کو وہ کھلا دشمن ہے تمہارا۔ اور یہ کہ پوجو مجھ کو ،

هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا أَفَلَمْ

یہ راہ ہے سیدھی۔ اور وہ بہکالے گیا تم میں سے بہت خلقت کو ، پھر کیا

تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ﴿۶۲﴾ هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۶۳﴾

تم کو سمجھ نہ تھی۔ یہ دوزخ ہے جس کا تم کو وعدہ تھا۔

إِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۶۴﴾ الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ

جاڑو اس میں آج کے دن بدلہ اپنے کفر کا۔ آج ہم مہر لگا دیں گے ان کے

أَفَوَاهِهِمْ وَيُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٦٥﴾

منہ پر اور بولیں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور بتلائیں گے اُن کے پاؤں جو کچھ وہ کماتے تھے۔

وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلَى أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَأَنَّى يُبْصِرُونَ ﴿٦٦﴾

اور اگر ہم چاہیں مٹا دیں ان کی آنکھیں پھر دوڑیں رستہ پانے کو پھر کہاں سے

یُبْصِرُونَ ﴿٦٦﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَمَمَسْنَاهُمْ عَلَى مَكَانَتِهِمْ فَمَا

سُجَّحَ - اور اگر ہم چاہیں صورت مٹ کر دیں ان کی جہاں کی تہاں پھر نہ آگے

اسْتَطَاعُوا مُضِيًّا وَلَا يَرْجِعُونَ ﴿٦٧﴾ وَمَنْ نَعْمِرْهُ نَكْسِفْهُ

چل سکیں اور نہ وہ اُلٹے پھر سکیں - اور جس کو ہم بڑھا کریں اوندھا کریں

فِي الْخَلْقِ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٨﴾

اس کی پیدائش میں پھر کیا ان کو سمجھ نہیں۔

خُلاصۂ تفسیر

اور یہ (کافر) لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین سے بطور انکار کہتے ہیں کہ یہ وعدہ (قیامت کا جو اوپر آیت میں مذکور ہے اور ویسے بھی اکثر اس کی خبر دیا کرتے ہو وہ) کب ہوگا اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو تو بتلاؤ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ جو بار بار پوچھ رہے ہیں تو گویا یہ لوگ بس ایک آواز سخت (یعنی نفخہ اولی) کے منتظر ہیں جو اُن کو (یعنی مطلق کفار کو) اُچھڑے گی اور وہ سب (اس وقت) باہم (عام معمول کے مطابق اپنے معاملات میں) لڑ جھگڑ رہے ہوں گے سو اس آواز کے ساتھ معاً اس طرح فنا ہو جائیں گے کہ نہ تو وصیت کرنے کی فرصت ہوگی، اور نہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر جائیں گے (بلکہ جو جس حال میں ہو گا مر کر رہ جائے گا) اور (پھر دوبارہ) صور پھونکا جائے گا تو وہ سب یکایک قبروں سے (نکل نکل کر) اپنے رب کی طرف (یعنی جہاں حساب ہوگا) جلدی جلدی چلنے لگیں گے اور وہاں کی ہول و ہیبت دیکھ کر کہیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی ہم کو ہماری قبروں سے کس نے اٹھا دیا، (کہ یہاں کی نسبت سے تو وہاں ہی راحت میں تھے، فرشتے جواب دیں گے کہ) یہ وہی (قیامت) ہے جس کا رحمان نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبر سچ کہتے تھے (مگر تم نے نہ مانا تھا، آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) وہ (نفخہ ثانیہ صور کا) بس ایک زور کی آواز ہوگی (جیسے نفخہ اولی بھی صیحہ واحدہ تھا، لہذا قال تعالیٰ

مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً، اسی طرح یہ بھی ایک آواز ہوگی، جن سے یکایک سب جمع ہو کر ہمارے پاس حاضر کر دیئے جائیں گے۔ پہلے موقف کی طرف چلنا مذکور تھا اور یہاں پہنچ جانا اور یہ چلنا اور پہنچنا جبراً و قہراً ہوگا۔ قرآن کریم کے الفاظ مُحْضَرُونَ اور حَاجَاتُ كُلِّ نَفْسٍ مِّنْهَا سَائِبِقٌ سے معلوم ہوتا ہے، پھر اُس دن کسی شخص پر ذرا ظلم نہ ہوگا اور تم کو بس انہی کاموں کا بدلہ ملے گا جو تم (دنیا میں کفر وغیرہ) کیا کرتے تھے (یہ تو اہل جہنم کا حال ہوا اور) اہل جنت (کا حال یہ ہے کہ وہ) بیشک اس روز اپنے مشغلوں میں خوش دل ہوں گے وہ اور ان کی بیبیاں سایوں میں مہریوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے (اور) ان کے لئے وہاں (ہر طرح کے) میوے ہوں گے اور جو کچھ مانگیں گے ان کو ملے گا (اور) ان کو پروردگار مہربان کی طرف سے سلام فرمایا جائے گا (یعنی حق تعالیٰ فرمائیں گے، اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ، رواہ ابن ماجہ) اور آگے پھر تمہارے قصہ اصحاب جہنم کا کہ ان کو موقف میں حکم ہوگا کہ اے (کفر کے ارتکاب کرنے والے) مجرمو آج (اہل ایمان سے) الگ ہو جاؤ (کیونکہ اُن کو جنت میں بھیجا ہے اور تم کو دوزخ میں اور اُس وقت اُن سے ملامت کے طور پر یہ فرمایا جائے گا کہ) اے اولاد آدم (اور اسی طرح جنت سے بھی خطاب ہوگا، اِنَّ عَلَيْهِ قَوْلَ تَعَالٰی يَمْشُرُ الْجَنَّةِ وَالْاِنْسِ الْاِنْسِ) کیا میں نے تم کو تاکید نہیں کر دی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا صریح دشمن ہے اور یہ کہ میری (ہی) عبادت کرنا یہی سیدھا راستہ ہے (مراد عبادت سے اطاعت مطلقہ ہے و ہذا کقولہ تعالیٰ لَا تَشْبَعُوا خَطَايَا الشَّيْطَانِ وَلَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ) اور (نیز تم کو شیطان کی نسبت یہ بات بھی معلوم کرانی تھی کہ) وہ تم میں (یعنی تمہاری بنی نوع میں) ایک کثیر مخلوق کو گمراہ کر چکا ہے جن کی گمراہی کا وبال بھی پھیلی کافر قوموں کے واقعات عذاب کے سلسلے میں بتلا دیا گیا تھا، سو کیا تم (اتنا) نہیں سمجھتے تھے کہ اگر ہم اس کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہو جاویں گے تو ہم بھی اسی طرح مستحق عذاب ہوں گے (واب) یہ جہنم ہے جس کا تم سے (کفر کی نفیر پر) وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔ آج اپنے کفر کے بدلے اس میں داخل ہو آج ہم اُن کے مومنوں پر مہر لگا دیں گے (جس سے یہ جھوٹے عذر پیش نہ کر سکیں، جیسا شروع شروع میں کہیں گے وَالشِّرَارُ بِنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ) اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ یہ لوگ کیا کرتے تھے، (یہ عذاب تو آخرت میں ہوگا) اور اگر ہم چاہتے تو (دنیا ہی میں ان کے کفر کی سزائیں) ان کی آنکھوں کو ملیا میٹ کر دیتے (خواہ آنکھ کی بنیائی کو یا خود آنکھ کے عضو ہی کو) پھر یہ بے ستے کی طرف (چلنے کے لئے) دوڑتے پھرتے سو اُن کو کہاں نظر آتا (جیسا قوم لوط پر ایسا ہی عذاب آیا تھا، کَمَا قَالَ تَعَالٰی فُطِسْنَا) اور اس سے بڑھ کر (اگر ہم چاہتے تو) ان کی سزائے کفر میں

ان کی صورتیں بدل ڈالتے، (جیسے پہلے بعضے لوگ بندرا درخزیر ہو گئے) اس حالت سے کہ یہ جہاں ہیں وہیں رہ جاتے (یعنی مسخ کے ساتھ یہ بھی ہوتا کہ ان کو جانور بنا دیتے اور جانور بھی اپنا ج جو اپنی جگہ سے نہ ہل سکیں) جس سے یہ لوگ نہ آگے کو چل سکتے ہیں اور نہ پیچھے کو لوٹ سکتے ہیں اور اس کا کچھ تعجب نہ کرنا چاہئے کہ آنکھوں کا طمس اور صورتوں کا مسخ کیسے ہو جاتا ہے دیکھو اس کی ایک نظیر ہمارے قدرت شاہد ہے کہ ہم جس کی زیادہ عمر کر دیتے ہیں (یعنی بہت بوڑھا کر دیتے ہیں) تو اس کو طبعی حالت میں الٹا کر دیتے ہیں (طبعی حالت سے مراد عقل و شعور اور سننے دیکھنے وغیرہ کی قوتیں اور قوت ہاضمہ، نامیہ، وغیرہ اور رنگ و ردغن و حسن و جمال ہیں) اور الٹا کرنے سے مراد ہے ان کا انقلاب اور تغیر حالات اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف (الچھے سے برے کی طرف) پس طمس و مسخ بھی ایک قسم کا تغیر ہے کامل سے ناقص کی طرف) سو کیا اس حالت کو دیکھ کر بھی وہ لوگ نہیں سمجھتے (کہ جب ایک تغیر پر قدرت ہے تو دوسری پر بھی ہے) بلکہ قدرت کی نسبت تو جمیع ممکنات کے ساتھ مساوی ہے گو ان میں تناظر و تماثل بھی نہ ہو سو ان لوگوں کو اس پر نظر کر کے ڈرنا اور کفر کو ترک کر دینا چاہئے)

معارف و مسائل

مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً، یہ اُن کفار کا جواب ہے جو استہزاء و انکار کے طور پر مسلمانوں سے پوچھا کرتے تھے کہ تم جس قیامت کے آنے کے قائل ہو وہ کب کہیں سال اور کس تاریخ میں آئیگی۔ يَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ، ان لوگوں کا یہ سوال درحقیقت کسی تحقیق واقعہ کے لئے نہیں بلکہ بطور تمسخر و استہزاء کے تھا اور بالفرض تحقیق کے لئے بھی ہوتا تو رب العلیٰ کی حکمت کا مقتضی یہ ہے کہ قیامت کب سال اور تاریخ کا پورا یقینی علم کسی کو نہ دیں، یہاں تک کہ اپنے انبیاء و رسل کو بھی نہیں دیا۔ ان احمقوں کا یہ سوال بالفرض تحقیق طلبی ہی کے لئے ہوتا بھی لغو و مہمل تھا۔ اس لئے اس کے جواب میں قیامت کی تاریخ بتانے کے بجائے ان لوگوں کو اس پر تنبیہ فرمائی کہ جو چیز یقینی طور پر آنے والی ہے عقلمند کا کام یہ ہے کہ اس کی تیاری میں لگے، نہ یہ کہ اس کے وقت اور تاریخ کی تحقیق میں وقت ضائع کرے۔ مقتضی عقل کا یہ تھا کہ قیامت کی خبر سن کر ایمان لاتے اور وہ کام کرتے جس سے اُس عالم میں فلاح حاصل ہو، مگر یہ لوگ اپنی غفلت میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں گویا اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ جب قیامت آئے تو کچھ سوچیں۔ اس لئے فرمایا کہ یہ قیامت کے منتظر ہیں۔ اور قیامت کا حال یہ ہوگا کہ وہ ایک ہی زور کی آواز صور کی ہوگی جو سب کو اچانک اس طرح پکڑے گی کہ لوگ اپنے اپنے کاروبار میں

اور باہمی معاملات کے جھگڑوں میں لگے ہوئے ہوں گے سب کے سب اسی حال میں مگر رہ جائیں گے حدیث میں ہے کہ دو آدمی ایک کپڑے کی خرید و فروخت میں لگے ہوئے ہوں گے، کپڑا پھیلا یا ہوا ہوگا، کہ اچانک قیامت آجائے گی، اور وہ کپڑا لٹے نہ کر پائیں گے، کوئی آدمی اپنے حوض کو مٹی سے لپ کر درست کر رہا ہوگا، کہ اسی حال میں مر رہ جائے گا رواہ ابو نعیم عن ابی ہریرۃ قرطبی

فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ ۝ یعنی اس وقت جو لوگ مجتمع ہوں گے وہ آپس میں کسی کو کسی کام کی وصیت کرنے کی ہمت نہیں پائیں گے اور جو گھروں سے باہر ہوں گے وہ اپنے گھروں میں واپس آنے کی بھی ہمت نہیں پائیں گے، اسی جگہ مرے کے مرے رہ جائیں گے۔ یہ بیان قیامت کے نفع، اولیٰ کا ہے، جس سے سارا عالم زمین و آسمان تباہ ہو جائے اس کے بعد فرمایا: ۝ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ، اجداث جدت کی جمع ہے بمعنی قبر اور نسلون نسلان سے مشتق ہے جس کے معنی تیز چلنے کے ہیں، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں یَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ يَسْرَاعًا، آیا ہے کہ یہ لوگ اپنی قبروں سے جلدی کرتے ہوئے نکلیں گے۔ اور ایک آیت میں جو ارشاد ہے فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنظُرُونَ ۝ یعنی حشر کے وقت لوگ اپنی قبروں سے اٹھ کر کھڑے دیکھتے رہیں گے، یہ اس کے منافی نہیں۔ کیونکہ ابتداء حیرت سے کھڑے ہو کر دیکھنے کا واقعہ ہوا اور بعد میں تیزی سے حشر کی طرت دوڑنا، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اور جیسا کہ آیات قرآن سے ثابت ہے کہ فرشتے ان سب کو پکار کر میدان حشر میں لائیں گے ماس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی حاضری حشر اپنی خوشی سے نہیں بلکہ جبری طور پر ہوگی اور فرشتوں کے پکارنے کی وجہ سے دوڑتے ہوئے حشر میں آجائیں گے۔

قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا ۚ کفار اگرچہ قبروں میں بھی عذاب قبر میں مبتلا تھے، وہاں کچھ آرام نہ تھا، مگر قیامت کے عذاب کے مقابلہ میں وہ پہلا عذاب کا عدم معلوم ہوگا اس لئے پکاریں گے کہ ہمیں کس نے قبروں سے نکال لیا، وہیں رہتے تو اچھا ہوتا۔ اس پر فرشتے یا عام مؤمنین جواب دیں گے:-

هٰذَا اَمَّا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ۝ یعنی یہ وہی قیامت ہے جس کا رحمن نے وعدہ کیا تھا، اور اس کے رسولوں نے اس کی سچی خبر تم کو سنائی تھی، تم نے توجہ نہ دی۔ اس مقام پر اللہ کی صفات میں سے لفظ رحمن اختیار کرنے میں اشارہ ہے کہ اس نے تو اپنی رحمت سے تمہارے لئے اس عذاب سے بچنے کے بہت سامان کئے تھے، اور قبل از وقت اس کا

وعدہ اور اپنی کتابوں اور انبیاء کے ذریعہ اس کی خبر تم تک پہنچانا بھی صفت رحمت ہی کا اقتضا تھا،
 اِنَّ اَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغْلٍ ذَاكِرُوْنَ ہ اصحاب جہنم کی پریشانیوں کا ذکر کرنے
 کے بعد قیامت میں اصحاب جنت کا حال ذکر فرمایا کہ وہ اپنی تفریحات میں مشغول ہونگے۔ فَاکُونُ، فَاکُونُ کی
 جمع ہے، خوش دل خوش حال کو کہا جاتا ہے، اور اس سے پہلے فِي شُغْلٍ کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے
 کہ وہ اصحاب جہنم کو پیش آنے والی پریشانیوں سے بالکل بے غم ہوں گے۔ (کمالہ بعض المفسرین)
 اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ یہ لفظ فِي شُغْلٍ اس خیال کے دفع کرنے کے لئے بڑھایا ہو
 کہ جنت میں جبکہ نہ کوئی عبادت ہوگی نہ کوئی فرض و واجب اور نہ کسب معاش کا کوئی کام ہو کیا اس
 بیکاری میں آدمی کا جی نہ گھرائے گا؟ اس لئے فرمایا کہ ان کو اپنی تفریحات ہی کا بڑا شغل ہوگا، جی گھبرانے
 کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

هَمٌّ وَاَزْوَاجُهُمْ، ازواج میں جنت کی عورتیں بھی داخل ہیں اور دنیا کی بیبیاں بھی۔
 وَلَهُمْ مَّا يَدْعَوْنَ، يَدْعَوْنَ دعوت سے مشتق ہے، جس کے معنی بلانے کے ہیں۔ یعنی اہل
 جنت جس چیز کو بلا دیں گے وہ ان کو مل جائے گی۔ قرآن کریم نے اس جگہ يَسْأَلُوْنَ کا لفظ نہیں
 فرمایا، کیونکہ کسی چیز کا سوال کر کے حاصل کرنا بھی ایک محنت مشقت ہے جس سے جنت پاک ہی
 بلکہ وہاں ہر ضرورت کی چیز حاضر و موجود ہوگی۔

وَاِمْتَاٰزُ الْيَوْمِ اَيْحَا الْمُجْرِمُوْنَ ہ میدانِ حشر میں اول جب لوگ اپنی قبروں کے
 اٹھیں گے تو سب گڈ گڈ منتشر ہوں گے، جیسا کہ قرآن میں فرمایا اَتَّخَمُ جَزَاؤُ مُنْفِشِرٍ یعنی
 وہ منتشر ٹڈیوں کے دل کی طرح ہوں گے۔ مگر بعد میں ان کے گردہ گردہ اپنے اعمال کے اعتبار سے
 الگ کر دیئے جائیں گے، کفار ایک جگہ مؤمن دوسری جگہ، فجَّار قساق الگ، صلحاء اور معتبول
 بندے الگ۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے رَاٰذِلُ الْفُؤُسِ ذُوْجَتٍ یعنی جبکہ نفوس جوڑ جوڑ کر ڈکی
 جائیں گے۔ آیت مذکورہ میں بھی اسی امتیاز کا بیان ہے۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ مِّلَّتِيْ اِذْ مَّ اَنْ لَا تَعْبُدُوْا الشَّيْطٰنَ، یعنی تمام بنی آدم کو
 (بلکہ جنات کو بھی) مخاطب کر کے قیامت میں کہا جائے گا کہ کیا میں نے دنیا میں تم کو یہ ہدایت
 نہ کی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا۔ یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ کفار عموماً شیطان کی تو عبادت
 نہ کرتے بنوں کو یا دوسری چیزوں کو پوجتے تھے، اس لئے اُن پر عبادت شیطان کا الزام کیسے عائد
 ہوا؟ جواب یہ ہے کہ کسی کی اطاعت مطلقہ کرنا کہ ہر کام ہر حال میں اس کا کہنا مانے اسی کا نام عبادت
 ہے چونکہ ان لوگوں نے ہمیشہ شیطانی تعلیم ہی کی پیروی کی، اس لئے ان کو عابد شیطان کہا گیا جیسا
 کہ حدیث میں اس شخص کو جو مال یا بیوی کی محبت میں آکر ہر وہ کام کرنے لگے جس سے مال بڑھے

یا بیوی راضی ہو اگرچہ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہو ایسے شخص کو حدیث میں عید الدہم اور عبد الزوجہ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بعض صوفیائے کرام کے کلمات میں جو اپنے نفس کے لئے بت پرستی کے الفاظ آئے ہیں، اس سے مراد نفس کی خواہشات کا اتباع کرنا ہے، کفر و شرک مراد نہیں۔ جیسا کہ بعض نے فرمایا
مودہ گشت از سجدہ راہ مبتاں پیشانیم
چند برخود تہمت دین مسلمانانہم

اَلَيْسَ لَكُمْ نَحْمٌ عَلٰٓى اٰفْوٰ اٰهِيْہِمۡ، محشر میں حساب کتاب کے لئے پیشی میں اول تو ہر شخص کو آزادی ہوگی جو چاہے عذر پیش کرے، مگر مشرکین وہاں قہیں کھا کر اپنے شرک و کفر سے مکر جائیں گے وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشْرِکِیْنَ۔

اور بعض یہ بھی کہیں گے کہ فرشتوں نے ہمارے نامہ اعمال میں جو کچھ لکھ دیا ہے ہم تو اس سے بری ہیں اس وقت اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے کہ بول نہ سکیں، اور ان کے مقابلہ میں خود انہی کے ہاتھ پاؤں اور اعضا، کو سرکاری گواہ بنا کر ان کو بولنے کی صلاحیت دیدیگی وہ ان کے تمام اعمال کی گواہی دیں گے۔ آیت مذکورہ میں تو ہاتھ پاؤں کا بولنا ذکر کیا گیا ہے دوسری آیت میں انسان کے کان، آنکھ، اور کھال کا بولنا مذکور ہے، شَہِدَ عَلَیْہِمْ تَمَعُہُمْ وَاَبْصَارُہُمْ وَجُلُوْدُہُمْ، اور ایک جگہ جَوَّشَہُ عَلَیْہِمْ اَلِیْسَتْہُمْ اَیَّٰہِیْ، یعنی خود ان کی زبانیں گواہی دیں گی۔ یہ اس کے منافی نہیں کہ ان کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی، کیونکہ مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار سے کچھ نہ بول سکیں گے، اُن کی زبان ان کی مرضی کے خلاف چلے گی، اور شہادت دے گی۔

رہا یہ اشکال کہ ان اعضا میں گویائی کیسے پیدا ہوگی تو اس کا جواب خود قرآن نے دیدیا اَنْطَقْنَا اللّٰہُ الَّذِیْ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ، یعنی یہ اعضا کہیں گے جس اللہ نے ہر گویائی والے کو گویا کیا ہے، اس نے ہمیں بھی گویائی دیدی۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْہٖ نُنَّکِسْہٖ فِی الْخَلْقِ اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ، نُعْمَر، تعمیر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں عمر دراز دینے کے، اور نُنَّکِسْہٖ، تنکیس سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اوندھا لٹا کر دینے کے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے ایک اور منظر کا بیان فرمایا ہے کہ ہر انسان و حیوان ہر وقت اللہ تعالیٰ کے زیر تصرف ہے، قدرت کا عمل اس میں مسلسل جاری ہے، ایک گندے اور بے جان قطرہ سے اس کا وجود شروع ہوا، بطن مادر کی تین اندھیریوں میں اس خلاصہ کائنات اور عالم اصغر کی تخلیق ہوئی، کیسی کیسی نازک

مشینیں اس کے وجود میں پیوست کی گئیں پھر روح ڈال کر زندہ کیا گیا، نوہینے بطن مادر کے اندر اس کی تربیت اور نشوونما ہو کر ایک مکمل انسان بنا اور اس دنیا میں آیا۔ تو مکمل ہونے کے باوجود اس کی ہر چیز ضعیف و کمزور ہے۔ قدرت نے اس کے مزاج کے مناسب غذا مائیں کی چھاتیوں میں پیدا کر دی جس سے اس کو تدریجی توانائی ملی، اور اس وقت سے جوانی تک کتنے مراحل سے گذر کر اس کے سب قوی مضبوط ہوئے، قوت و شوکت کے دعوے ہوئے لگے، ہر مقابل کو شکست دینے کے حوصلے پیدا ہوئے۔

پھر جب خالق و مالک کو منظور ہوا تو اب ان سب طاقتوں قوتوں میں کمی شروع ہوئی، کمی بھی بے شمار مراحل سے گذرتے ہوئے بالآخر بڑھاپے کی آخری عمر تک پہنچی۔ جہاں پہنچ کر غور کیا جائے تو پھر وہ اس منزل میں پہنچ گیا جس سے بچپن میں گذرا تھا۔ ساری عادتیں خصلتیں بدلنے لگیں، جو چیزیں سب سے زیادہ محبوب تھیں وہ مبغوض نظر آنے لگیں، جن سے راحت ملتی تھی اب وہ موجب کلفت بن گئی ہیں۔ اسی کو قرآن کریم نے تنکيس یعنی اوندھا کر دینے سے تعبیر فرمایا ہے، ونعم قال ۵

مَنْ عَاشَ اخْلَقَ الْاَيَّامَ حَذَّاهُ ۖ وَخَانَهُ ثِقَاتُ السَّمْعِ وَالْبَصَرِ
یعنی جو شخص زندہ رہے گا تو زمانہ اس کی حدت و شدت کو بوسیدہ اور پرانا کر دے گا،
اور اس کے سب بڑے دو ثقہ دوست یعنی شنوائی اور بینائی کی طاقتیں بھی اس سے
خیانت کر کے الگ ہو جائیں گی ۵

یعنی انسان کو دنیا میں سب سے زیادہ اعتماد اپنی آنکھ سے دیکھی یا کان سے سنی ہوئی چیز پر ہوتا ہے۔ بڑھاپے کی آخر عمر میں یہ بھی قابل اعتماد نہیں، اگر ان گوشوں کے سبب بات پوری سمجھنا مشکل، ضعف بینائی کے سبب صحیح صحیح دیکھنا مشکل۔ منتہی نے اسی مضمون کو کہا ہے ۵
وَمَنْ صَحَّبَ الدُّنْيَا طَوِيلًا تَقَلَّبَتْ ۖ عَلَىٰ عَيْنِهِ حَتَّىٰ يَرَىٰ صِدْقَهَا كَذِبًا
یعنی جو شخص دنیا میں زیادہ زندہ رہے گا دنیا اس کی آنکھوں کے سامنے ہی پلٹ جائیگی
یہاں تک کہ جس چیز کو پہلے سچ جانتا تھا وہ جھوٹ معلوم ہونے لگے گی ۵

انسان کے وجود میں یہ انقلابات قدرت حق تعالیٰ شانہ کا عجیب و غریب منظر تو ہے ہی،
اس میں انسان پر ایک عظیم احسان بھی ہے، کہ خالق کائنات نے جتنی طاقتیں انسان کے وجود
میں ودیعت فرمائی ہیں، وہ درحقیقت سرکاری مشینیں ہیں، جو اس کو دیدی گئی ہیں، اور یہ
بھی بتلادیا گیا ہے کہ یہ تیری ملک نہیں اور دائمی بھی نہیں، بالآخر تجھ سے واپس لی جائیں گی۔
اس کا تقاضا ظاہری یہ تھا کہ جب وقت مقدر آجاتا سب طاقتیں بیک وقت واپس لیتیں

مگر مولائے کریم نے ان کی واپسی کی بھی بڑی طویل قسطیں کر دی ہیں اور تدریجی طور پر واپس لیا ہے تاکہ انسان متنبہ ہو کر سفر آخرت کا سامان کر لے۔ واللہ اعلم

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ

اور ہم نے نہیں سکھایا اس کو شعر کہنا اور یہ اس کے لائق نہیں یہ تو خاص نصیحت ہی اور قرآن ہی

مُبِينٌ ﴿٦٩﴾ لِيُنذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٧٠﴾

صاف۔ تاکہ ڈر سنائے اس کو جس میں جان ہو اور ثابت ہو الزام منکروں پر۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ آيِدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ

کیا اور نہیں دیکھتے وہ کہ ہم نے بنادئے ان کے واسطے اپنی ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں سے جو پائے

لَهُمَا مَلِكُونِ ﴿٧١﴾ وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ ﴿٧٢﴾

پھر وہ ان کے مالک ہیں۔ اور عاجز کر دیا انکو ان کے آگے پھر انہیں کوئی ہوائی سواری اور کسی کو کھاتے ہیں۔

وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾ وَاتَّخَذُوا

اور ان کے واسطے چارپایوں میں فائدہ ہی ہے اور پینے کے گھاٹ پھر کیوں شکر نہیں کرتے۔ اور پکڑتے ہیں

مِنْ دُونِ اللَّهِ إِلَهَةً لَّعَلَّهُمْ يَنْصَرُونَ ﴿٧٤﴾ لَا يَسْتَطِيعُونَ

اللہ کے سوائے اور حاکم کہ شاید ان کی مدد کریں۔ نہ کر سکیں گے

نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُونَ ﴿٧٥﴾

ان کی مدد اور یہ اُن کی فوج ہو کر پکڑے آئیں گے۔

خُلاصہ تفسیر

راور یہ کفار جو نبوت کی نفی کرنے کے لئے آپ کو شاعر کہتے ہیں یہ محض باطل ہے کیونکہ ہم نے آپ کو شاعری (یعنی خیالی مضامین مرتب کرنے کا) کا علم نہیں دیا اور وہ (شاعری) آپ کے شایان شان بھی نہیں وہ (یعنی آپ کو عطا کیا ہوا علم جس کو یہ لوگ شاعری کہتے ہیں) تو محض نصیحت (کا مضمون) اور ایک آسمانی کتاب ہے جو احکام کی ظاہر کرنے والی ہے تاکہ (بیان احکام کے اثر سے) ایسے شخص کو (نافع ڈرانا) ڈر دے جو (حیات قلبیہ کے اعتبار سے) زندہ ہو

اور تاکہ کافروں پر (عذاب کی) حجت ثابت ہو جاوے۔ کیا ان (مشرک) لوگوں نے اس پر نظر نہیں کیا کہ ہم نے ان کے (نفع کے) لئے اپنے ہاتھ کی ساختہ چیزوں میں سے مویشی پیدا کئے اور دہلے مالک بنانے سے یہ لوگ ان کے مالک بن رہے ہیں اور آگے اس نفع کی کچھ تفصیل ہے کہ ہم نے ان مویشی کو ان کا تالچ بنا دیا سو وہ ان کے کام میں لانے سے کام دیتے ہیں چنانچہ ان میں بعض تو ان کی سواریاں ہیں اور بعض کو وہ کھاتے ہیں اور ان میں ان لوگوں کے لئے اور بھی نفع ہیں (جیسے بال، کھال، ہڈی وغیرہ مختلف طریقوں سے استعمال میں آتے ہیں، اور ان میں ان لوگوں کے) پیٹنے کی چیزیں بھی ہیں (یعنی دودھ) سو کیا (اس پر بھی) یہ لوگ شکر نہیں کرتے اور شکر کا سب سے مقدم اور اہم درجہ توحید پر ایمان ہے، اور انھوں نے (بجائے شکر اور توحید کے کفر اور شرک اختیار کر رکھا ہے چنانچہ) خدا کے سوا اور معبود قرار دے رکھے ہیں اس امید پر کہ ان کو (ان معبودین کی طرف سے) مدد ملے (لیکن) وہ ان کی کچھ مدد کر ہی نہیں سکتے اور (مدد تو کیا کرتے اور اُٹے) وہ (معبودین) ان لوگوں کے حق میں ایک فریق (مخالفت) ہو جا دیں گے جو (موقف حساب میں بالاطرام حاضر کئے جائیں گے) اور وہاں حاضر ہو کر ان کی مخالفت کا اظہار کریں گے کما قال تعالیٰ فی سورۃ مریم وَیَكُونُونَ عَلَيْهِمْ صِدًّا وَ قَالَ تعالیٰ فی سورۃ یونس قَالَ مَثَلَهُمْ تَمَكُنْتُمْ اَیَّانَا تَعْبُدُونَ وَغَیْرُ ذَٰلِكَ مِنْ اٰلَاٰتِی۔

معارف مسائل

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ، چونکہ منکرین نبوت و رسالت قرآن کی تاثیرات عجیبہ اور دلوں پر اثر انداز ہونے کی کیفیت جو عام مشاہدہ میں تھی — انکار نہیں کر سکتے تھے، اس لئے کبھی تو اس کلام الہی کو سحر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر کہتے تھے اور کبھی اس کلام کو شعر اور آپ کو شاعر کہہ کر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ یہ تاثیرات عجیبہ کلام الہی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ یا تو یہ جادو کے کلمات ہیں جو دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں یا شاعرانہ کلام ہے وہ بھی عام دلوں پر اثر انداز ہوا کرتا ہے۔

حق تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں فرمایا کہ ہم نے نبی کو شعر و شاعری نہیں سکھلائی اور نہ ان کی شان کے مناسب تھی، آپ کو شاعر کہنا باطل اور غلط ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرب تو وہ قوم ہے جن کی فطرت میں شعر و شاعری پڑی ہوئی ہے، عورتیں بچے بے ساختہ شعر کہتے ہیں، وہ شعر کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں، انھوں نے قرآن کو شعر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کس اعتبار سے کہا؟ کیونکہ نہ تو قرآن

وزن شعری کا پابند ہے نہ کہیں ردیف قافیہ کا، اس کو تو جاہل شعر و شاعری سے ناواقف بھی شعر نہیں کہہ سکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شعر دراصل خیالی خود ساختہ مضامین کو کہا جاتا ہے خواہ نظم میں ہو یا نثر میں ان کا مقصد قرآن کو شعر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہنے سے یہ تھا کہ آپ جو کلام لائے ہیں وہ محض خیالی افسانے ہیں یا پھر شعر کے معنی معروف کے اعتبار سے شاعر کہا تو اس مناسبت سے کہ جس طرح نظم اور شعر خاص اثر رکھتا ہے اس کا اثر بھی ایسا ہی ہے۔

امام جصاصؒ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ سے کسی نے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کوئی شعر پڑھتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں، البتہ ایک شعر ابن طرفہ کا آپ نے پڑھا تھا۔

سنبی لك الايام ما كنت جاهلاً ۛ ويا تيك بالاخبار من لم تزود

اس کو آپ نے وزن شعری کو توڑ کر من لم تزود بالاخبار پڑھا۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ یہ شعر اس طرح نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ میں شاعر نہیں، اور نہ میرے لئے شعر و شاعری مناسب ہے۔

یہ روایت ابن کثیرؒ نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کی ہے، اور ترمذی، نسائی، امام احمد نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود کوئی شعر تصنیف کرنا تو کیا آپؐ و سہروں کے اشعار بھی پڑھنے کو اپنے لئے مناسب نہ سمجھتے تھے۔ اور بعض روایات میں جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وزن شعری کے مطابق کچھ کلمات منقول ہیں وہ بقصد شعر نہیں اتفاقاً ہیں اور ایسے اتفاقاً کوئی ایک دو شعر موزوں ہو جانے سے کوئی آدمی شاعر نہیں کہلاتا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فطری حال سے جو بڑی حکمتوں پر مبنی تھا یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقاً شعر کوئی مذموم ہے جیسا کہ شعر و شاعری کے احکام کی تفصیل سورۃ شعراء کے آخری رکوع میں گذر چکی ہو وہاں دیکھ لیا جائے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِن مَّاءٍ عَيْلًا يَتَّبِعُوْنَ اٰيِدِيْنَ يَنَا اَلْعَمَاءُ مَا فَمَهُمْ لَهَا مَا يَكُوْنُ

اس آیت میں چوپائے جانوروں کی تخلیق میں انسانی منافع اور ان میں قدرت کی عجیب و غریب صنعتکاری کا ذکر فرمانے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ایک اور احسان عظیم کو بتلایا گیا ہے کہ یہ چوپائے جانور جن کی تخلیق میں کسی انسان کا کوئی دخل نہیں، خالص دست قدرت کے بنائے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کیا کہ انسان کو ان چوپاؤں سے نفع اٹھانے کا موقع ملا اور اجازت دیدی بلکہ اس کو ان کا مالک بنا دیا کہ وہ ان میں ہر طرح کے مالکانہ تصرفات کر سکتے ہیں، خود نفع اٹھائیں

یا ان کو فروخت کر کے ان کی قیمت سے فائدہ اٹھائیں۔

ملکیتِ اشیاء کی اصل علت | آجکل نئے نئے معاشی ازموں اور نظریات میں یہ بحث چھڑی ہوئی ہے
عطا برحق ہے نہ سرمایہ نہ محنت | کہ تخلیقِ اشیاء اور ان کی ملکیت میں سرمایہ اور دولت اصل ہے
یا محنت؟ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے قائل دولت و سرمایہ کو اصل قرار دیتے ہیں اور سوشلزم
اور کمیونزم والے محنت کو اصل علتِ تخلیق و ملکیت کی قرار دیتے ہیں۔ قرآن مجید کے اس فیصلے نے
بتلا دیا کہ تخلیقِ اشیاء اور ان کی ملکیت میں دونوں کا کوئی دخل نہیں، تخلیق کسی چیز کی انسان کے
قبضہ میں نہیں، وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہے۔ اور عقل کا تقاضا ہے کہ جو کسی چیز کو پیدا کرے
وہی اس کا مالک بھی ہو۔ اس طرح اصل اور حقیقی ملکیت اشیاء عالم میں حق تعالیٰ کی ہے، انسان
کی ملکیت کسی بھی چیز میں صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی
اثباتِ ملکیت اور انتقالِ ملکیت کا قانون اپنے پیغمبروں کے ذریعہ نازل فرما دیا ہے۔ اس قانون
کے خلاف کوئی کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا۔

وَدَلَّلْنَاهَا لَهُمْ اس میں ایک اور احسان و انعام کی طرف اشارہ فرمایا کہ اکثر جانور
اونٹ، گھوڑا، ہاتھی، بیل وغیرہ اگر دیکھو تو طاقت میں انسان سے بہت زیادہ ہیں، انسان ان کے
مقابلہ میں کمزور ہے۔ اس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ ان جانوروں پر قابو نہ پاسکتا، مگر حق تعالیٰ نے
جیسا ان جانوروں کی تخلیق کا انعام انسان کو بخشا اسی طرح یہ بھی فطرت بنا دی کہ ان مست
جانوروں کو انسان کے سامنے مسخر اور تابع بنا دیا۔ ایک لڑکا ایک قوی گھوڑے کے منہ میں
لگام ڈال دیتا ہے، اور پھر اس کی پشت پر سوار ہو کر جہاں چاہے لے پھرتا ہے۔ یہ بات بھی
انسان کا کوئی اپنا کمال نہیں، صرف حق تعالیٰ کی عطاء اور بخشش ہے۔

وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحَضَّرُونَ اس آیت کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو اد پر خلاصہ تفسیر
میں بیان ہوا ہے کہ جُنْد سے مراد فریقِ مخالف لیا جائے، اور مطلب آیت کا یہ ہو کہ جن چیزوں
کو انھوں نے دنیا میں معبود بنا رکھا ہے، یہی قیامت کے روز ان کے مخالف ہو کر ان کے
خلاف گواہی دیں گے۔

اور حضرت حسن و قتادہؓ سے اس کی تفسیر یہ منقول ہے کہ ان لوگوں نے بتوں کو خدا تو
اس لئے بنایا تھا کہ یہ ان کی مدد کریں گے، اور ہو یہ رہا ہے کہ وہ تو ان کی مدد کرنے کے قابل نہیں
خود یہی لوگ جو ان کی عبادت کرتے ہیں ان کے خدام اور ان کے سپاہی بنے ہوئے ہیں انکی حفاظت
کرتے ہیں کوئی ان کے خلاف کام کرے تو یہ ان کی طرف سے لڑتے ہیں۔ (قرطبی)

فَلَا يَحْزُنُكَ قَوْلُهُمْ إِنَّآ نَعْلَمُ مَا يَسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٤٦﴾

اب تو غمگین مت ہوان کی بات سے ہم جانتے ہیں جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں ۔

أَوَلَمْ يَرِ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ

کیا دیکھتا نہیں انسان کہ ہم نے اس کو بنایا ایک قطرہ سے پھر تب ہی وہ ہو گیا جھگڑنے

مُبِينٌ ﴿٤٧﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي

لوٹنے والا ۔ اور بھلاتا ہی ہم پر ایک مثل اور بھول گیا اپنی پیدائش کہنے لگا کون زندہ کرے گا

الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿٤٨﴾ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ط

ہڈیوں کو جب کھوکھری ہو گئیں ؟ تو کہہ ان کو زندہ کر گیا جس نے بنایا ان کو پہلی بار

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٤٩﴾ إِنَّ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ

اور وہ سب بنانا جانتا ہے ۔ جس نے بنادی تم کو سبز درخت سے

نَارًا فَإِذَا آنْتُمْ مِنْهُ تُوقِدُونَ ﴿٥٠﴾ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ

آگ پھر اب تم اس سے ملگاتے ہو ۔ کیا جس نے بنائے آسمان اور

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بِقَدِيرٍ عَلٌّ أَنَّ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ ط بَلَىٰ ق

زمین نہیں بنا سکتا ان جیسے ؟ کیوں نہیں ،

وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ﴿٥١﴾ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنَّ

اور وہی ہر اصل بنانے والا سب کچھ جاننے والا ۔ اس کا حکم یہی ہو کہ جب کرنا چاہے کسی چیز کو تو

يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٥٢﴾ فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ

کہے اس کو ہو وہ اسی وقت ہو جائے ۔ سو پاک ہو وہ ذات جس کے ہاتھ ہے حکومت

كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٥٣﴾

ہر چیز کی اور اسی کی طرف پھر کر چلے جاؤ گے ۔

خلاصہ تفسیر

(جب یہ لوگ ایسے واضح اور کھلے ہوئے امور میں بھی خلاف ہی کرتے ہیں) تو ان لوگوں

کی باتیں (انکار توحید و رسالت سے متعلق) آپ کے لئے آزر دگی کا باعث نہ ہونا چاہئے (کیونکہ آزر دگی ہوتی ہو امید، اور امید ہوتی ہے مخاطب کے عقل و انصاف سے اور ان لوگوں میں نہ عقل ہو نہ انصاف تو ان سے کسی چیز کی امید ہی نہیں ہو سکتی، پھر غم کیوں ہو۔ آگے دوسرے طریقہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی ہے) بیشک ہم سب جانتے ہیں جو کچھ یہ دل میں رکھتے ہیں اور جو کچھ (زبان سے) اظہار کرتے ہیں (اس لئے) وقت مقرر پر ان کو ان کے عمل کی سزا ملے گی (کیا اس آدمی کو (جو) قیامت کا انکار کرتا ہے) یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو (ایک حقیر) لطفہ سے پیدا کیا (جس کا تقاضا یہ تھا کہ اپنی ابتدائی حالت کو یاد کر کے اپنی حقارت اور خالق کی عظمت کو دیکھ کر خود شرماتا کہ گستاخی کی جرأت نہ کرتا دوسرے خود اپنے حالات سے اس پر استدلال کرتا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دینا اس کی قدرت سے کیا بعید ہے) سو اس نے ایسا نہ کیا بلکہ (تقضائے مذکور کے خلاف) وہ علامتِ اعتراف کرنے لگا (اور وہ اعتراف یہ کہ) اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا (عجیب اس لئے کہ اس سے انکار قدرت لازم آتا ہے) اور اپنی اصل کو بھول گیا (کہ ہم نے اس کو لطفہ حقیر سے ایک کامل انسان بنایا) کہتا ہے کہ بڑیوں کو جبکہ وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں کون زندہ کر دے گا۔ آپ جواب دیدیجئے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی مرتبہ ان کو پیدا کیا ہے۔ (کہ پہلی تخلیق کے وقت اُن بڑیوں کا زندگی سے کوئی تعلق ہی نہ تھا اور اب تو ایک مرتبہ ان میں حیات پیدا ہو کر ایک قسم کا تعلق حیات سے ہو چکا ہے اب ان میں حیات پیدا کرنا کیا مشکل ہے) اور وہ ہر طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے (یعنی ابتداءً کسی چیز کو پیدا کر دینا یا پیدا شدہ کو فنا کر کے دوبارہ پیدا کر دینا) وہ ایسا (قادر مطلق) ہے کہ (بعض) ہرے درخت سے تمھارے لئے آگ پیدا کر دیتا ہے، پھر تم اس سے اور آگ سلگالیتے ہو (جیسا کہ عرب میں ایک درخت تھا، مَرَّخ دوسرا عقار، ان دونوں درختوں سے چقماق کا کام لیتے تھے، دونوں کے ملانے سے آگ پیدا ہو جاتی تھی، تو جس قادر نے ہرے درخت کے پانی میں آگ پیدا فرمادی تو دوسرے جمادات میں حیات پیدا کر دینا اس کے لئے کیا مشکل ہے) اور جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے ہیں کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے آدمیوں کو (دوبارہ) پیدا کر دے، ضرور قادر ہے اور وہ بڑا پیدا کرنے والا خوب جاننے والا ہے (اور اس کی قدرت ایسی ہے کہ) جب وہ کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہو تو اس کا معمول تو یہ ہے کہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے تو ان سب مقدمات سے ثابت ہو گیا کہ اس کی پاک ذات ہو جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا پورا اختیار ہو اور یہ بات سب شبہات سے سالم رہ گئی کہ تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے (یعنی قیامت کے روز)

معارف ومسائل

اَوَلَمْ يَرِ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْقَةٍ سَوِيَّةٍ، سورۃ یس کی یہ آخری پانچ آیتیں ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہیں، جو بعض روایات میں اُبی بن خلف کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور بعض میں عاص بن وائل کی طرف۔ اور اس میں بھی کوئی بُعد نہیں کہ دونوں سے ایسا واقعہ پیش آیا ہو پہلی روایت یہی ہے کہ شعب الایمان میں اور دوسری روایت ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے نقل کی ہے کہ عاص بن وائل نے بطحارہ مکہ سے ایک بوسیدہ ہڈی اٹھائی، اور اس کو اپنے ہاتھ سے توڑ کر ریزہ ریزہ کیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ کیا اللہ اس ہڈی کو زندہ کرے گا، جس کا حال یہ دیکھ رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں اللہ تعالیٰ تجھے موت دے گا، پھر زندہ کرے گا پھر تجھ کو جہنم میں داخل کرے گا (ابن کثیر)

خَصِيمٌ مُّبِينٌ یعنی یہ نطفہ حقیر سے پیدا کیا ہوا انسان کیسا کھل کر مقابلہ پر آنے لگا کہ اللہ کی قدرت کا انکار کر رہا ہے۔

حَرَبَ لَنَا مَثَلًا یہاں ضربِ مثل سے مراد اس کا یہ واقعہ ہے کہ بوسیدہ ہڈی کو ہاتھ سے ریزہ ریزہ کرتے ہوئے اس کے دوبارہ زندہ ہونے کو محال یا مستبعد سمجھا۔ اس کے بعد فرمایا وَ لَيْسَى خَلْقَتَهُ یعنی اس مثال کے بیان کرنے کے وقت وہ خود اپنی پیدائش کو بھول گیا کہ ایک حقیر اور ناپاک قطرۂ بے جان میں جان ڈال کر اس کو پیدا کیا ہے۔ اگر وہ اپنی اس اصل کو نہ بھولتا تو ایسی مثالیں پیش کر کے قدرتِ الہیہ کے انکار کی جرأت نہ کرتا۔

جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا عرب میں دو درخت معروف تھے۔ ایک
مَرْخ دوسرا عفار۔ عرب لوگ ان دونوں درختوں کی دو شاخیں مثل مسواک کے کاٹ لیتے تھے
جو بالکل ہری تازہ پانی سے بھری ہوتی تھی، ایک کو دوسری پر گر گرنے سے آگ پیدا ہو جاتی تھی۔
ہرے درخت سے آگ پیدا کرنے میں اسی طرف اشارہ ہے۔ (قرطبی) اور اگر درختوں کے آخری
انجام کو دیکھا جائے تو ہر درخت شروع میں ہر ابھرا ہونے کے بعد آخر میں خشک ہو کر آگ کا
ذریعہ بنتا ہے۔ اس طرح ہر درخت بھی اس کا مصداق ہو سکتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کی
اس آیت میں بظاہر یہی مراد ہے اَنْزَعُ يَشْمُ النَّارِ الَّتِي تُورُونَ اَنْشَأْ شُمْ
شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنِشِقُونَ، یعنی کیا تم اس آگ کو نہیں دیکھتے جس کو تم سلکا کر
اپنے کام میں لیتے ہو کیا اس آگ سے شعلہ بننے والے درخت کو تم نے پیدا کیا یا ہم نے ؟
لیکن آیت مذکورہ میں چونکہ شجر کے ساتھ اخضر کی صفت بھی ذکر کی گئی ہے اس لئے

یہاں ظاہر ہی ہے کہ وہ خاص درخت مراد ہیں جن سے ہرے بھرے ہونے کے باوجود آگ پیدا ہوتی ہے۔

اِنَّمَا اَمْرٌكَ اِذَا ارَادَ شَيْئًا اَنْ يَقُوْلَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ مراد آیت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہیں تو انسانی مصنوعات کی طرح ان کو اس کی ضرورت نہیں پڑتی کہ پہلے مواد جمع فرمائیں پھر اس کے لئے کارِ گیر بنالائیں، پھر ایک مدت تک کام کر کے وہ چیز تیار ہو بلکہ وہ جب اور جس وقت جس چیز کو پیدا فرمانا چاہیں ان کو صرف حکم دیدینا کافی ہوتا ہے کہ ”پیدا ہو جا“ تو جس چیز کو یہ حکم ملتا ہے وہ فوراً اس کے حکم کے مطابق وجود میں آجاتی ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر چیز کی تخلیق دفعی اور فوری ہی ہو۔ بلکہ حکمت خالق کے تابع جس چیز کا فوری طور پر پیدا ہو جانا مصلحت ہو وہ فوری طور پر بلا تدریج و مہلت پیدا ہو جاتی ہے، اور جس چیز کا پیدا ہونا کسی حکمت و مصلحت کی بناء پر تدریج مناسب سمجھا گیا وہ اسی تدریج کے ساتھ وجود میں آجاتی ہے خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ اس کو پہلے ہی حکم میں خاص تدریج کے ساتھ پیدا ہونا بتلایا گیا ہو یا ہر مرحلہ پر اس کو جداگانہ حکم کُن کا خطاب ہوتا ہو۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

قد قمت سورۃ یس بحمد اللہ وعونه لثمانی وعشرین

من شہر صفر سنۃ ۱۳۹۲ یوم الخمیس وبتمامہ

تم الحمد للہ الحزب الخامس من

الاحزاب لسبعة القرآنیۃ فالحمد

للہ اولاً و آخراً و ظاہراً

و باطناً

ۛ

سُورَةُ الصَّفَاتِ

سُورَةُ الصَّفَاتِ بِمَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَاثْنَتَانِ قِمَامُونَ آيَةٌ وَخَمْسُونَ حُرُوفًا

سورۃ صافات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو بیاسی آیتیں ہیں اور پانچ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

وَالصَّفَاتِ صَفًّا ۱ ۱ فَالزُّجَرِ زَجْرًا ۲ ۲ فَالتِّلِيَتِ ذِكْرًا ۳ ۳

قسم پر صفا باندھنے والوں کی قطار ہو کر، پھر ڈانٹنے والوں کی جھڑک کر، پھر پڑھنے والوں کی یاد کر کر،

إِنَّ إِلَهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۴ ۴ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

بیشک حکم تم سب کا ایک ہے ۔ رب آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے

وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۵ ۵ إِنَّا زَيْنَا السَّمَاءِ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ ۶ ۶

اور رب مشرقوں کا ۔ ہم نے رونق دی درلے آسمان کو ایک رونق جو تارے ہیں ۔

وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ۷ ۷ لَا يَسْمَعُونَ إِلَى الْإِذَا

اور بچاؤ بنایا ہر شیطان سرکش سے ۔ سن نہیں سکتے اوپر کی مجلس

الْأَعْلَىٰ وَيُقَذَّرُونَ مِّنْ كُلِّ جَانِبٍ ۸ ۸ دُحُورًا وَلَهُمْ عَذَابٌ

تک اور پھینکے جائے ہیں اُن پر ہر طرف سے بھگانے کو اور اُن پر مار ہے

وَاصِبٌ ۹ ۹ إِلَّا مَن خَطِفَتِ الْخَطْفَةَ فَاتَّبَعَهُ شَرَابٌ ثَائِبٌ ۱۰ ۱۰

ہمیشہ کو ، مگر جو کوئی اُچک لایا جھپ سے پھر پیچھے لگا اس کے انگارا چمکتا ۔

خلاصہ تفسیر

قسم ہوا ان فرشتوں کی جو عبادت میں یا حق تعالیٰ کا حکم سننے کے وقت صاف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں جیسا اسی سورت میں آگے آئے گا **وَإِنَّا لَنَحْنُ الصّٰفّٰتُونَ** (پھر قسم ہے ان فرشتوں کی جو شہاب ثاقب کے ذریعہ آسمانی خبریں لانے سے شیاطین کی بندش کرنے والے ہیں جیسا کہ اسی سورت میں عنقریب آ رہا ہے) پھر (قسم ہے) ان فرشتوں کی جو ذکرِ الہی تسبیح و تقدیس کی تلاوت کرنے والے ہیں جیسا کہ اسی سورت میں آئے گا، **وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبّحُونَ**، غرض ان سب کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تمھارا معبود (ہر حق) ایک ہے (اور اس توحید کی دلیل یہ ہے کہ وہ پروردگار ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے) یعنی ان کا مالک اور متصرف) اور پروردگار ہے (سب ستاروں کے) طلوع کرنے کے مواقع کا (اور) ہم ہی نے رفتی دیا ہے اس طرف والے آسمان کو ایک عجیب آرائش یعنی ستاروں کے ساتھ اور راہی ستاروں کے ساتھ اس آسمان کی یعنی اس کی خبروں کی حفاظت بھی کی ہے ہر شریر شیطان سے (جس کا طریقہ آگے بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی حفاظت کے انتظام کی وجہ سے) وہ شیاطین عالم بالا (یعنی ملائکہ) کی باتوں کی طرف کان بھی نہیں لگا سکتے (یعنی اکثر تو مار کھانے کے ڈر سے دور ہی دور رہتے ہیں) اور (اگر کبھی اتفاقاً اس کی کوشش کرتے بھی ہیں تو) وہ ہر طرف سے (یعنی جس طرف بھی جو شیطان جائے) مار کر دھکے دیدیو جاتے ہیں (یہ عذاب اور ذلت تو انہیں فی الحال ملتی ہے) اور (پھر آخرت میں) ان کے لئے (جہنم کا) دائمی عذاب ہوگا (غرض کوئی آسمانی خبر سننے سے پہلے ہی انہیں مار بھگایا جاتا ہے، وہ سننے کا ارادہ لے کر آتے ہیں مگر ناکام رہتے ہیں) مگر جو شیطان کچھ خبر لے ہی بھاگے تو ایک دھککا ہوا شعلہ اس کے پیچھے لگ لیتا ہے کہ اس کو جلا کر پھونک دیتا ہے، لہذا جو کچھ سنا ہے اسے دوسروں تک پہنچانے میں ناکام رہتا ہے۔ یہ تمام انتظامات و تصرفات توحیدِ خداوندی پر دلالت کرتے ہیں)۔

معارف و مسائل

سورت کے مضامین | یہ سورت مکی ہے، اور دوسری مکی سورتوں کی طرح اس کا بنیادی موضوع بھی ایمانیات ہیں اور اس میں توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد کو مختلف طریقوں سے مدلل کیا گیا ہے۔ اسی ضمن میں مشرکین کے عقائد کی تردید بھی ہے، اور آخرت میں جنت و دوزخ کے حالات کی منظر کشی بھی جو عقائد تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں شامل رہے ان کو مدلل کرنے اور کفار کے شبہات و اعتراض کو دور کرنے کے بعد یہ بیان کیا گیا ہے کہ ماضی میں

جن لوگوں نے ان عقائد کو تسلیم کیا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ کیا رہا؟ اور جنہوں نے کفر و شرک کی راہ اختیار کی ان کا کیا انجام ہوا؟ چنانچہ اس ضمن میں حضرت نوح، حضرت ابراہیم، اور ان کے صاحبزادگان، حضرت موسیٰ و ہارون، حضرت الیاس، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کے واقعات کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں۔

مشرکین مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے، آخر میں اس عقیدے کی مفصل تردید کی گئی ہے۔ اور سورت کے مجموعی طرز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت میں شرک کی اس خاص قسم (یعنی فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینے) کی تردید بطور خاص پیش نظر رہی ہے۔ اسی لئے سورت کو فرشتوں کی قسم کھا کر اور ان کے اوصاف بندگی کو ذکر کر کے شروع کیا گیا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم، پہلا مضمون توحید | سورت کو عقیدہ توحید کے بیان سے شروع کیا گیا ہے، اور پہلی چار آیتوں کا اصل مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ اِنَّ الْهٰکُمْ لَوَاحِدٌ (بلاشبہ تمہارا معبود ایک ہی) لیکن اس بات کو بیان کرنے سے پہلے تین قسمیں کھائی گئی ہیں۔ ان قسموں کا ٹھیکہ لفظی ترجمہ یہ ہے:

”قسم صفت باندھ کر کھڑے ہونے والوں کی، پھر قسم بندش کرنے والوں کی،

پھر قسم ذکر کی تلاوت کرنے والوں کی“

یہ ”صفت باندھ کر کھڑے ہونے والے“، ”بندش کرنے والے“ اور ”ذکر کی تلاوت کرنے والے“ کون ہیں؟ قرآن کریم کے الفاظ میں اس کی صراحت نہیں ہے، اس لئے اس کی تفسیر میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان سے مراد اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے وہ غازی ہیں جو صفت باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں، تاکہ باطل کی قوتوں پر بندش لگائیں، اور صفت آرا ہوتے وقت ”ذکر“ و تسبیح اور تلاوت قرآن میں بھی مشغول رہتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ ان سے مراد وہ نمازی ہیں جو مسجد میں صفت باندھ کر شیطانی افکار و اعمال پر بندش عائد کرتے ہیں، اور اپنا پورا دھیان ”ذکر و تلاوت“ پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی) اور اس کے علاوہ بھی بعض تفسیریں بیان کی گئی ہیں، جو الفاظ قرآن کے ساتھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتیں۔

لیکن جمہور مفسرین کے یہاں جس تفسیر کو سب سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا، وہ یہ ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہیں، اور یہاں ان کی تین صفات بیان کی گئی ہیں:-

پہلی صفت الصَّفَاتِ صَفَاتٍ ہے۔ یہ لفظ ”صفت“ سے نکلا ہے اور اس کے معنی ہیں ”کسی جمیعت کو ایک خط پر استوار کرنا“ (قرطبی) لہذا اس کے معنی ہوتے ”صفت باندھ کر کھڑے ہونے والے“

فرشتوں کی صف بندی کا ذکر اسی سورت میں آگے چل کر بھی آیا ہے۔ فرشتے خود اپنی بارے میں کہتے ہیں قَدْ اِنَّا لَنَخْلُقُ الصّٰفّٰتِیْنَ یعنی بلاشبہ ہم سب صف باندھے کھڑے رہتے ہیں؟ یہ صف بندی کب ہوتی ہے؟ اس کے جواب میں بعض حضرات مفسرین مثلاً حضرت ابن عباسؓ، حسن بصریؒ اور قتادہؒ نے یہ فرمایا کہ فرشتے ہمیشہ فضا میں صف باندھے اللہ کے حکم کے لئے گوش برآواز رہتے ہیں، اور جب کوئی حکم ملتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ (منہری) اور بعض حضرات نے اُسے عبادت کے وقت کے ساتھ مخصوص کیا ہے، یعنی جب فرشتے عبادت اور ذکر و تسبیح میں مشغول ہوتے ہیں تو صف باندھ لیتے ہیں (تفسیر کبیر) نظم و ضبط دین میں مطلوب ہے اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر کام میں نظم و ضبط اور ترتیب و سلیقہ کا لحاظ رکھنا دین میں مطلوب ہے یا اس کے احکام کی تعمیل، یہ دونوں مقصد اس طرح بھی حاصل ہو سکتے تھے کہ فرشتے صف باندھنے کے بجائے ایک غیر منظم بھیڑ کی شکل میں جمع ہو جایا کریں، لیکن اس بد نظمی کے بجائے انھیں صف بندی کی توفیق دی گئی، اور اس آیت میں ان کے اچھے اوصاف میں سب سے پہلے اسی وصف کو ذکر کر کے بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند ہے۔

نماز میں صفوں کی درستی چنانچہ انسانوں کو بھی عبادت کے دوران اس صف بندی کی ترغیب اور اس کی اہمیت تاکید کی گئی ہے۔ حضرت جابر بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا: ”تم (نماز میں) اس طرح صف بندی کیوں نہیں کرتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے حضور کرتے ہیں؟“ صحابہؓ نے پوچھا: ”فرشتے اپنے رب کے حضور کس طرح صف بندی کرتے ہیں؟“ آپؐ نے جواب دیا: ”وہ صفوں کو پورا کرتے ہیں، اور صف میں پیوست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں (یعنی بیچ میں خالی جگہ نہیں چھوڑتے)۔“ (تفسیر منہری) نماز میں صفوں کو پورا کرنے اور سیدھا رکھنے کی تاکید میں اتنی احادیث وارد ہوئی ہیں کہ ان سے ایک پورا رسالہ بن سکتا ہے۔ حضرت ابو مسعود بدریؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہمارے کندھوں کو ہاتھ لگا کر فرمایا کرتے تھے: ”سیدھے رہو آگے پیچھے مت ہو، ورنہ تمھارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔“ (جمع الفوائد بحوالہ مسلم و نسائی ص ۹۲) فرشتوں کی دوسری صفت فَالزَّجْرٰتِ زَجْرًا بیان کی گئی ہے۔ یہ لفظ ”زجر“ سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں ”روکنا“، ”ڈانٹنا“، ”پھٹکارنا“۔ حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ ”بندش کرنے والے“ سے کیا ہے، جو لفظ کے ہر ممکن مفہوم کو جامع ہے۔ فرشتے کس چیز پر بندش عائد کرتے ہیں؟ قرآن کریم کے سیاق کے پیش نظر زیادہ تر مفسرین نے اس کا

یہ جواب دیا ہے کہ یہاں ”بندش عائد کرنے سے“ مراد فرشتوں کا وہ عمل ہے جس کے ذریعہ وہ شیاطین کو عالم بالا تک پہنچنے سے روکتے ہیں اور جس کا تفصیلی ذکر خود قرآن کریم میں آگے آ رہا ہے۔ تیسری صفت قَالَتِیْلَیْتُ ذِکْرًا ہے۔ یعنی یہ فرشتے ”ذکر“ کی تلاوت کرنے والے ہیں۔ ”ذکر“ کا مفہوم ”نصیحت کی بات“ بھی ہے اور ”یا خدا“ بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں کے ذریعہ جو نصیحت کی باتیں نازل کی ہیں یہ ان کی تلاوت کرنے والے ہیں۔ اور یہ تلاوت حصول برکت اور عبادت کے طور پر بھی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے وحی لانے والے فرشتے مراد ہوں کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے سامنے ان کتب نصیحت کی تلاوت کر کے انھیں اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں جبکہ ”ذکر“ سے مراد یا خدا والی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہر دم ان کلمات کی تلاوت میں مصروف رہتے ہیں، جو اللہ کی تسبیح و تقدیس پر دلالت کرتے ہیں۔

یہاں قرآن کریم نے فرشتوں کی یہ تین صفات ذکر کر کے بندگی کے تمام اوصاف کو جمع کر دیا ہے۔ یعنی عبادت کے لئے صفت بستہ رہنا، طاغوتی طاقتوں کو اللہ کی نافرمانی سے روکنا، اور اللہ کے احکام و مواعظ کو خود پڑھنا، اور دوسروں تک پہنچانا۔ اور ظاہر ہے کہ بندگی کا کوئی عمل ان تین شعبوں سے خالی نہیں ہو سکتا، لہذا چاروں آیتوں کا مفہوم یہ ہو گیا کہ جو فرشتہ تمام اوصاف بندگی کے حامل ہیں ان کی قسم، تمھارا معبود برحق ایک ہی ہے۔

فرشتوں کی قسم | اس سورت میں خاص طور پر فرشتوں کی قسم کھانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ کیوں کھائی گئی؟ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا۔ اس سورت کا مرکزی موضوع شرک کی اس خاص قسم کی تردید ہے جس کے تحت اہل مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔ چنانچہ سورت کی ابتدا ہی میں فرشتوں کی قسم کھا کر ان کے وہ اوصاف بیان کر دیئے گئے جن سے ان کی محمل بندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا مطلب یہ ہے کہ فرشتوں کے ان اوصاف بندگی پر غور کرو گے تو وہ خود تمھارے سامنے اس بات کی گواہی دیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا رشتہ باپ بیٹی کا نہیں، بلکہ بندہ و آقا کا ہے۔

حق تعالیٰ کا قسم کھانا اور اس کے | قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے ایمان و عقائد کے بہت سے اصولی متعلق احکام اور سوال و جواب | مسائل کی تاکید کے لئے مختلف طرح کی قسم کھائی ہے، کبھی

اپنی ذات کی، کبھی اپنی مخلوقات میں سے خاص خاص اشیاء کی۔ اس کے متعلق بہت سے سوالات ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن شریف کی تفسیر میں یہ ایک مستقل اصولی مسئلہ بن گیا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے اس پر ایک مستقل کتاب ”التبیان فی اقسام القرآن“ لکھی ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے اپنی

اصول تفسیر کی کتاب "اتقان" میں مباحث کی سرسٹھویں نوع اس کو قرار دے کر مفصل کلام کیا ہے۔ یہاں کچھ ضروری اجزاء لکھے جاتے ہیں۔

پہلا سوال: اللہ تعالیٰ کی قسم کھانے میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اغنی الاغنیاء ہیں، ان کو کیا ضرورت ہو کہ کسی کو یقین دلانے کے لئے قسم کھائیں؟

اتقان میں ابوالقاسم قشیریؒ سے اس سوال کے جواب میں یہ مذکور ہے کہ حق تعالیٰ کو تو کوئی ضرورت قسم کھانے کی نہ تھی، مگر اس کو جو شفقت و رحمت اپنی مخلوق پر ہے وہ اس کی داعی ہوتی کہ کسی طرح یہ لوگ حق کو قبول کریں اور عذاب سے بچ جائیں۔ ایک اعرابی نے جب آیت **وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ۝ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ سَتَىٰ تَوَكُّبُهُ لَكَ** کہنے لگا کہ اللہ جیسی عظیم شان ہستی کو کس نے ناراض کیا ہے کہ اس کو قسم کھانے پر مجبور کر دیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ شفقت علی الخلق اس کی داعی ہے کہ جس طرح دنیا کے جھگڑے چھکانے اور اختلافات مٹانے کا معروف طریقہ یہ ہے کہ دعوے پر شہادت پیش کی جائے شہادت نہ ہو تو قسم کھائی جائے، اسی طرح حق تعالیٰ نے انسان کے اس مانوس طریقہ کو اختیار فرمایا ہے کہ اس میں تو شہادت کے الفاظ سے مضمون کی تاکید فرمائی جیسے **شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ - الْآيَةُ**، اور کہیں قسم کے الفاظ سے جیسے **إِنِّي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ وَغَيْرُهُ**

دوسرا سوال یہ ہے کہ قسم اپنے سے بہت بڑے کی کھائی جاتی ہے، حق تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کی قسم کھائی جو ہر حیثیت سے کمتر ہیں؟

جواب یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ سے بڑی کوئی ذات نہ ہو نہ ہو سکتی ہے، تو یہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی قسم عام مخلوق کی قسم کی طرح نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حق سبحانہ و تعالیٰ نے کہیں اپنی ذات پاک کی قسم کھائی ہے جیسے **رَأَيْتُ ذُرِّيَّتِي ۚ** اور اس طرح ذات حق کی قسمیں قرآن میں سات جگہ آئی ہیں۔ اور کہیں اپنے افعال و صفات کی اور قرآن کی قسم کھائی ہے، جیسے **وَالسَّمَاءِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَالْأَرْضِ وَمَا طَحْتَهَا ۚ وَنَفْسٍ ۚ وَمَا سَوَّيْتُهَا ۚ وَغَيْرُهُ** اور بیشتر قسمیں اپنے مفعول و مخلوق کی استعمال ہوئی ہیں، جو معرفت کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے اسی کی ذات کی طرف راجع ہو جاتی ہیں۔ کذا ذکرہ ابن قیمؒ

مخلوقات میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، کہیں تو اس سے اس چیز کو عظمت و فضیلت کا بیان کرنا مقصود ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی قسم آئی ہے **لَعَمْرُكَ إِنَّكُمْ كَفَىٰ سَكْرَتِهِمْ يَعْنِي هُوَ** ابن مردودہ نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق اور کوئی چیز دنیا میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے زیادہ معزز اور مکرم نہیں پیدا کی یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں کسی نبی و رسول کی ذات کی قسم نہیں آئی، صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی قسم آیت مذکورہ میں آئی ہے۔ اسی طرح رَوَّالْطُّورِ وَكِتَابٍ مُّسْتَوٍ کی قسم بھی طور اور کتاب کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے آئی ہے۔

اور بعض اوقات کسی مخلوق کی قسم اس لئے کھائی گئی ہے کہ وہ کثیر المنافع ہے، جیسے وَالَّتَيْنِ وَالَّذِي تُوْنِ۔ اور بعض جگہ کسی مخلوق کی قسم اس لئے کھائی ہے کہ اس کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کا مظہر اور معرفتِ صانعِ عالم کا اہم ذریعہ ہے۔ اور عموماً جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے اس کو اس مضمون کے ثبوت میں کچھ دخل ضرور ہوتا ہے جس مضمون کے لئے قسم کھائی ہے، جو ہر جگہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ شریعت کا مشہور حکم عام انسانوں کے لئے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قسم کھانا جائز نہیں، حق تعالیٰ کی طرف سے خود مخلوقات کی قسم کھانا کیا اس کی دلیل نہیں کہ دوسروں کے لئے بھی غیر اللہ کی قسم جائز ہے؟ اس کے جواب میں حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا ہے:-

”اللہ تعالیٰ کو اختیار ہو وہ اپنی مخلوقات میں سے جس چیز کی چاہو قسم کھالے، مگر کسی دوسرے کے لئے اللہ کے سوا کسی کی قسم کھانا جائز نہیں“

إِنَّ اللَّهَ يَقْسِمُ بِمَا شَاءَ مِنْ خَلْقِهِ وَلَيْسَ لِأَحَدٍ أَنْ يَقْسِمَ إِلَّا بِاللَّهِ رَوَاهُ ابْنُ أَبِي حَاتِمٍ (از مظہری)

مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ جل شانہ پر قیاس کرنا غلط اور باطل ہے، جب شریعت الہیہ میں عام انسانوں کے لئے غیر اللہ کی قسم ممنوع کر دی گئی تو اللہ تعالیٰ کے اپنے ذاتی فعل سے اس کے خلاف استدلال کرنا باطل ہے۔

اس کے بعد آیات مذکورہ کی تفسیر پر غور فرمائیے۔

پہلی چار آیتوں میں فرشتوں کی قسم کھا کر یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم سب کا معبود برحق ایک ہے۔ اگرچہ قسم کے دوران فرشتوں کی صفات بھی وہ ذکر کی گئی ہیں جن پر تھوڑا سا بھی غور کر لیا جائے تو وہ عقیدہ توحید ہی کی دلیل معلوم ہوتی ہیں، لیکن آگے کی چھ آیات میں توحید کی دلیل مستقلاً بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا رَبُّ الْمَشَارِقِ (وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جتنی مخلوقات ہیں ان کا اور پروردگار ہر مشرقوں کا) تو

جو ذات اتنی عظیم مخلوقات کی خالق و پروردگار ہو، عبادت کی مستحق بھی وہی ہے، اور یہ ساری کائنات اس کے وجود اور وحدانیت کی دلیل ہے۔ یہاں المشارق، مشرق کی جمع ہے، اور چونکہ سورج سال کے ہر دن میں ایک نئی جگہ سے طلوع ہوتا ہے، اس لئے اس کی مشرقیں بہت ساری ہیں، اسی بناء پر یہاں جمع کا صیغہ لایا گیا ہے۔

إِنَّا نَرِيكَ السَّمَاءَ الدُّنْيَا مِنْ مِّنْهُ الْكَوَاكِبِ اس میں السماء الدنيا سے مراد نزدیک ترین آسمان ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس نزدیک والے آسمان کو ستاروں کے ذریعے زینت بخشی ہے، اب یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ ستارے ٹھیک آسمان کے اندر ہوں، بلکہ اگر اس سے جدا ہوں تب بھی زمین سے دیکھا جائے تو وہ آسمان ہی پر معلوم ہوتے ہیں، اور ان کی وجہ سے آسمان جگمگاتا نظر آتا ہے۔ بتلانا صرف اس قدر ہے کہ یہ تاروں بھرا آسمان اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خود بخود وجود میں نہیں آگیا، بلکہ اسے پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے، اور جو ذات اتنی عظیم الشان چیزوں کو وجود میں لاسکتی ہے اسے کسی شریک اور ساجھی کی کیا ضرورت ہو؟ نیز جب یہ بات مشرکین کے نزدیک بھی طے شدہ ہے کہ ان تمام فلکی اجسام کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو یہ بڑے ظلم کی بات ہے کہ خالق و مالک تو وہ ہوا اور عبادت کسی اور کی کی جائے؟

رہا یہ مسئلہ کہ ستارے قرآن کی رو سے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں یا اس سے الگ ہیں؟ نیز قرآن کریم کا علم ہیئت کے ساتھ کیا رہتا ہے؟ اس موضوع پر مفصل بحث سورۃ حجر میں گذر چکی ہے۔

وَحَفِظْنَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِجٍ (الی قولہ تعالیٰ) فَاتَّبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ، ان آیات میں زینت و آرائش کے علاوہ ستاروں کا ایک فائدہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کے ذریعہ شریعہ کے شیاطین کو عالم بالا کی باتیں سننے سے روکا جاتا ہے۔ وہ غیبی خبروں کی سن گن لینے کے لئے آسمان کے قریب جاتے ہیں، لیکن انھیں فرشتوں کی باتیں سننے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ کوئی شیطان اگر کوئی آدمی ہتائی بات سن بھانگتا ہے تو اسے ایک دھکے ہوئے شعلہ کے ذریعے مار لگائی جاتی ہے، تاکہ وہ دنیا میں پہنچ کر اپنے معتقد کاہنوں اور نجومیوں کو کچھ بتانہ سکے، اسی دھکے ہوئے شعلے کو ”شہاب ثاقب“ کہا گیا ہے۔

”شہاب ثاقب“ کی کچھ تفصیل سورۃ حجر میں گذر چکی ہے، یہاں اتنی تنبیہ ضروری ہے کہ قدیم یونانی فلاسفہ اس بات کے قائل تھے کہ ”شہاب ثاقب“ دراصل کوئی زمینی مادہ ہوتا ہے، جو بخارات کے ساتھ اوپر چلا جاتا ہے، اور کمرہ نار کے قریب پہنچ کر جل اٹھتا ہے، لیکن قرآن کریم کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے ”شہاب ثاقب“ کوئی زمینی مادہ نہیں،

بلکہ عالم بالا ہی میں پیدا ہونے والی کوئی چیز ہے۔ قدیم مفسرین اس موقع پر یہ کہتے آئے ہیں کہ یونانی فلاسفہ کا یہ خیال ”کہ شہاب ثاقب کوئی زمینی مادہ ہے محض قیاس اور تخمینہ پر مبنی ہے، اس لئے اس سے قرآن پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ اگر کوئی زمینی مادہ اوپر جا کر مشتعل ہو جاتا ہو تو قرآن کریم سے اس کی بھی کوئی منافات نہیں۔

لیکن آج کی جدید سائنسی تحقیقات نے یہ سوال ہی ختم کر دیا ہے۔ موجودہ سائنسدانوں کا خیال یہ ہے کہ ”شہاب ثاقب“ ان گنت ستاروں ہی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں اور عمر بڑی بڑی اینٹوں کے برابر اور یہ ان گنت ٹکڑے فضا میں رہتے ہیں۔ انہی کا ایک مجموعہ ”اسد“ کہلاتا ہے، جو سورج کے گرد دھیلہ کی شکل میں گردش کرتا رہتا ہے، اور اس کا ایک دورہ ۳۳ سال میں پورا ہوتا ہے۔ ان ٹکڑوں میں روشنی کی تیز رفتاری اور خلائی اجرام کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ٹکڑے ۱۰ اگست اور ۲ نومبر کی راتوں میں زیادہ گرتے ہیں، اور ۲ اپریل، ۲۸ نومبر، ۱۸ اکتوبر اور ۹، ۱۳ دسمبر کی راتوں میں کم ہو جاتے ہیں۔

(از تفسیر الجواہر للطنطاوی، ص ۱۵، ج ۸)

جدید سائنس کی یہ تحقیق قرآنی اسلوب بیان کے زیادہ مطابق ہے، البتہ جو لوگ ”شہاب ثاقب“ کے ذریعہ شیطانوں کے مارے جانے کو بعید از قیاس سمجھتے ہیں ان کے بارے میں طنطاوی مرحوم نے الجواہر میں بڑی اچھی بات لکھی ہے:

”ہمارے آباء و اجداد اور حکماء کو بھی یہ بات گراں محسوس ہوتی تھی کہ قرآن کریم ان کے زمانہ کے علمِ فلکیات کے خلاف کوئی بات کہے، لیکن مفسرین اس بات پر راضی نہیں ہوئے کہ ان کے فلسفیانہ نظریات کو قبول کر کے قرآن کو چھوڑ دیں، اس کے بجائے انہوں نے ان فلسفیانہ نظریات کو چھوڑا اور قرآن کے ساتھ رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد خود بخود ثابت ہو گیا کہ قدیم یونانی فلاسفہ کا خیال بالکل باطل اور غلط تھا، اب بتائیے کہ اگر ہم تسلیم کر لیں کہ یہ ستارے شیطانوں کو جلاتے، مارتے اور تکلیف پہنچاتے ہیں تو اس میں کوئی رکاوٹ ہے؟ ہم قرآن کریم کے اس بیان کو تسلیم کرتے ہوئے مستقبل کے انتظار میں ہیں، (جب سائنس بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لے گی)۔ (جواہر، ص ۱۴ ج ۸)

مقصد اصلی | یہاں آسمانوں، ستاروں، اور شہابِ ثاقب کا تذکرہ کرنے سے ایک مقصد تو توحید کا اثبات ہے کہ جس ذات نے یکہ و تنہا اتنے زبردست آفاقی انتظامات کئے ہوئے ہیں، وہی لائقِ عبادت بھی ہے۔ دوسرے اسی دلیل میں ان لوگوں کے خیال

کی تردید بھی کر دی گئی ہے جو شیطانوں کو دیتا یا معبود قرار دیتے ہیں، اور جادو یا گیا ہے کہ یہ تو ایک مردود و مقہور مخلوق ہیں، ان کو خدائی سے کیا واسطہ؟

اس کے علاوہ اسی مضمون میں ان لوگوں کی بھی بھرپور تردید موجود ہے جو قرآن کریم کا آنحضرت صلی اللہ علیہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی کو کافروں کی کہانت سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ ان آیتوں میں اشارہ کر دیا گیا کہ قرآن کریم تو کافروں کی تردید کرتا ہے، لے لے کر ان کی معطلوں کا سب سے بڑا ذریعہ شیاطین ہیں، اور قرآن یہ کہتا ہے کہ شیاطین کی عالم بالاتک رسائی ممکن نہیں، وہ غیب کی سچی خبریں نہیں لاسکتے۔ جب کہانت کے بارے میں قرآن کریم کا بیان کیا ہوا عقیدہ یہ ہے تو وہ خود کہانت کیسے ہو سکتا ہے؟ اس طرح یہ آیتیں توحید اور رسالت دونوں مضامین کی طرف اشاروں پر مشتمل ہیں، اور آگے اپنی آسمانی مخلوقات کے ذریعہ آخرت کے عقیدے کو ثابت کیا گیا ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ أَهَمْ أَسَدٌ خَلَقًا أَمْ مَنْ خَلَقْنَا ط إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ

اب پوچھ ان سے کیا یہ بنائے مشکل ہیں یا جتنی خلقت کہ ہم نے بنائی؟ ہم نے ہی ان کو بنایا ہے

مِنْ طِينٍ لَا زَيْبَ ۝۱۱ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ۝۱۲ وَإِذَا ذُكِّرُوا

ایک چمکتے گارے سے ۔ بلکہ تو کرتا ہر تعجب اور وہ کرتے ہیں ٹھٹھے ۔ اور جب انکو سمجھائیے

لَا يَذْكُرُونَ ۝۱۳ وَإِذَا سَأُوا آيَةً يَسْتَسْخَرُونَ ۝۱۴ وَقَالُوا

نہیں سوچتے ۔ اور جب دیکھیں کچھ نشانی مہنسی میں ڈال دیتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں

إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝۱۵ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ

کچھ نہیں یہ تو کھلا جادو ہے ۔ کیا جب ہم مر گئے اور ہو گئے مٹی اور

عِظًا مَاءَ إِنَّا لَسَبْعٌ مُّثُتُونَ ۝۱۶ أَوَابَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ۝۱۷ قُلْ

ہڈیاں تو کیا ہم کو پھر اٹھائیں گے، کیا اور ہمارے اگلے باپ دادوں کو بھی؟ تو کہہ کہ

نَعَمْ وَأَنْتُمْ دَاخِرُونَ ۝۱۸

ہاں اور تم ذلیل ہو گے۔

خلاصہ تفسیر

رجب دلائل توحید سے معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ان عظیم الشان مخلوقات میں سے ایسے

عظیم تصرفات پر قادر ہیں اور یہ ساری عظیم مخلوقات اس کے قبضہ قدرت میں ہیں، تو آپ ان (آخرت کا انکار کرنے والوں) سے پوچھئے کہ یہ لوگ بناوٹ میں زیادہ سخت ہیں، یا ہماری پیدا کی ہوئی یہ چیزیں (جن کا ابھی ذکر ہوا) حقیقت یہی ہے کہ یہی چیزیں زیادہ سخت ہیں، کیونکہ ہم نے ان لوگوں کو رتو آدم کی تخلیق کے وقت اسی معمولی، چمکتی مٹی سے پیدا کیا ہے، جس میں نہ کچھ قوت ہو نہ سختی، اور انسان جو اس سے بنا ہے وہ بھی زیادہ قوی اور سخت نہیں ہے اب سوچنے کی بات ہے کہ جب ہم ایسی قوی اور سخت مخلوقات کو عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہیں تو انسان جیسی ضعیف مخلوق کو ایک بار موت دے کر دوبارہ زندہ کرنے پر کیوں قدرت نہ ہوگی؟ مگر ایسی واضح دلیل کے باوجود یہ لوگ آخرت کے امکان کے قائل نہیں ہوئے، بلکہ (اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ) آپ تو (ان کے انکار سے) تعجب کرتے ہیں اور یہ لوگ (انکار سے بڑھ کر آخرت کے عقیدے سے) تمسخر کرتے ہیں اور جب ان کو (دلائل عقلیہ سے) سمجھایا جاتا ہے تو یہ سمجھتے نہیں اور جب یہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں (جو آپ کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ان کو دکھایا جاتا ہے جس سے عقیدہ آخرت ثابت کیا جائے) تو (خود) اس کی ہنسی اڑاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ (کیونکہ اگر یہ معجزہ ہو تو اس سے آپ کی نبوت ثابت ہو جائیگی اور آپ کو نبی ماننے کے بعد آپ کا بیان کردہ عقیدہ آخرت بھی ماننا پڑے گا، حالانکہ ہم آخرت کا عقیدہ نہیں مان سکتے، کیونکہ) بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو گئے، تو کیا ہم (پھر) زندہ کئے جائیں گے، اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی (زندہ ہوں گے) آپ کہہ دیجئے کہ ہاں (ضرور زندہ ہوں گے) اور تم ذلیل بھی ہو گے۔

معارف و مسائل

عقیدہ توحید کو ثابت کرنے کے بعد ان آٹھ آیتوں میں عقیدہ آخرت کا بیان ہے، اور اس سے متعلق مشرکین کے شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔ سب سے پہلی آیت میں انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے امکان پر عقلی دلیل پیش کی گئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہو کہ کائنات کے جن عظیم اجسام کا ذکر پچھلی آیتوں میں کیا گیا ہے، انسان تو ان کے مقابلہ میں بہت کمزور مخلوق ہے جب تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے، چاند، ستارے، سورج اور شہاب ثاقب جیسی مخلوقات اپنی قدرت سے پیدا فرمائی ہیں، تو اس کے لئے انسان جیسی کمزور مخلوق کو موت دے کر دوبارہ زندہ کر دینا کیا مشکل ہے؟ جس طرح تمہیں ابتداء میں چمکتی ہوئی مٹی سے بنا کر تم میں روح پھونک دی تھی، اسی طرح جب تم مر کر دوبارہ خاک ہو جاؤ گے اُس وقت پھر اللہ تعالیٰ

تمہیں زندگی عطا کر دے گا۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ”ہم نے انہیں چکیتی مٹی سے پیدا کیا“ اس سے مطلب یا تو یہ ہے کہ ان کے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد ہر انسان ہو۔ اس لئے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر انسان کی اصل پانی ملی ہوئی مٹی ہوتی ہے، وہ اس طرح کہ انسان نطفہ سے پیدا ہوتا ہے، نطفہ خون سے بنتا ہے، خون غذا سے پیدا ہوتا ہے اور غذا خواہ کسی شکل میں ہو اس کی اصل نباتات ہیں، اور نباتات مٹی اور پانی سے پیدا ہوتے ہیں۔

بہر صورت پہلی آیت عقیدہ آخرت کی عقلی دلیل پر مشتمل ہے، اور اسے خود انہی سے یہ سوال کر کے شروع کیا گیا ہے کہ تم زیادہ سخت مخلوق ہو یا جن مخلوقات کا ذکر ہم نے کیا ہے، وہ زیادہ سخت ہیں؟ جواب ظاہر تھا کہ وہی مخلوقات زیادہ سخت ہیں، اس لئے اس کی تصریح کرنے کے بجائے اس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کر دیا گیا ہے کہ ”ہم نے تو انہیں چکیتی مٹی سے پیدا کیا ہے“

اس کے بعد کی پانچ آیتوں میں اس ردِ عمل کا بیان کیا گیا ہے جو آخرت کے دلائل شرکینِ ظاہر کرتے ہیں۔ مشرکین کے سامنے عقیدہ آخرت کے جو دلائل بیان کئے جاتے تھے وہ دو قسم کے تھے۔ ایک تو عقلی دلائل جیسے پہلی آیت میں بیان کیا گیا، دوسرے نقلی دلائل یعنی ان کو معجزے دکھا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا بیان کیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، نبی کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا، اس کے پاس آسمانی خبریں آتی ہیں، جب آپ یہ خبر دے رہے ہیں کہ قیامت آئے گی، حشر و نشر ہوگا، انسانوں سے حساب کتاب لیا جائے گا تو یہ خبر یقیناً سچی ہے، اسے مان لینا چاہئے۔ جہاں تک عقلی دلائل پر مشرکین کے ردِ عمل کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ارشاد ہے:

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ۚ وَإِذَا ذُكِّرُوا لَا يَذْكُرُونَ ۚ

یہ تعجب ہوتا ہے کہ کیسے واضح دلائل سامنے آنے کے باوجود یہ لوگ نہیں مان رہے، لیکن یہ اُنسا آپ کے دلائل و عقائد کا مذاق اڑاتے ہیں، اور انہیں کتنا ہی سمجھاؤ، سمجھ کر نہیں دیتے۔ رہے نقلی دلائل، سو اس کے بارے میں ان کا ردِ عمل یہ ہے کہ:

وَإِذَا بَرَأُوا آيَاتِنَا يَسْتَسْخِرُونَ ۚ

بالآخر عقیدہ آخرت پر دلالت کرتا ہے، تو یہ اُسے بھی ٹٹھوں میں اڑا کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ اور اس سارے تمسخر و استہزاء کی اُن کے پاس ایک ہی دلیل ہو اور وہ یہ کہ:

۶ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ؕ اِنَّا لَسَبْعٌ ثَوْنٌ اَوْ اَبَاوُنَا اِلَّا وَكُنْ ؕ
یعنی یہ بات ہمارے تصور میں نہیں آتی کہ ہم یا ہمارے آباء و اجداد خاک ہو جانے اور ہڈیاں بن جانے
کے بعد دوبارہ کیسے زندہ کر دیئے جائیں گے؟ اس لئے ہم نہ کوئی عقلی دلیل مانتے ہیں، اور نہ کسی
معجزے وغیرہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ باری تعالیٰ نے اس کے جواب میں صرف ایک جملہ آخر میں ارشاد
فرمایا: قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ ذَاخِرُونَ ؕ یعنی آپ کہہ دیجئے کہ ہاں تم ضرور دوبارہ زندہ ہو گے
اور ذلیل و خوار ہو کر زندہ ہو گے۔

دیکھنے میں تو یہ ایک حاکمانہ جواب ہے، جیسا ہٹ دھرمی کرنے والوں کو دیا جاتا ہے،
لیکن تھوڑا سا غور کیا جائے تو یہ ایک پوری دلیل بھی ہے، جس کی تشریح امام رازیؒ نے تفسیر کبیر
میں کی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اوپر دوبارہ زندہ ہونے کی عقلی دلیل سے ثابت ہو چکا ہے کہ انسانوں
کا مکر پھر زندہ ہونا کوئی ناممکن بات نہیں، اور یہ قاعدہ ہے کہ جو بات عقلاً ممکن ہو اس کا واقعہ
وجود میں آ جانا کسی سچے خبر دینے والے کی خبر سے ثابت ہو سکتا ہے۔ جب یہ بات طے ہو گئی کہ دوبارہ
زندہ ہونا ممکن ہو تو اس کے بعد کسی سچے نبی کا صرف اتنا کہہ دینا کہ ”ہاں تم ضرور دوبارہ زندہ ہو“
اس بات کی قطعی دلیل ہو کہ یہ واقعہ ضرور پیش آ کر رہے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم | وَاِذَا رَاَوْا آيَةً الْخٰزِيْنَ ؕ اَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنَّكُمْ لَعِنٌ اَعْيُنُنَا وَاَنْتُمْ كَافِرٌ
کے معجزات کا ثبوت یہاں مراد معجزہ ہے۔ لہذا یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے علاوہ بھی کچھ معجزات عطا فرمائے تھے،
اور اس سے اُن محدثین کی تردید ہو جاتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو حسی
اسباب کے تابع قرار دے کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ کے دست مبارک پر قرآن کریم کے
سوا کوئی معجزہ ظاہر نہیں کیا گیا۔

چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمایا ہے: وَاِذَا رَاَوْا آيَةً يَسْتَسْخِرُوْنَ
رجب یہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو اس کا ٹھٹھا اڑاتے ہیں، بعض منکرین معجزات کہتے ہیں کہ
یہاں ”آیت“ سے مراد معجزہ نہیں، بلکہ عقلی دلائل ہیں۔ لیکن یہ بات اس لئے غلط ہے کہ اگلی
آیت میں قَوْلًا اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ، یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے، ظاہر
ہے کہ کسی دلیل کو کھلا جادو قرار دینے کا کوئی ٹھک نہیں ہے، یہ بات وہ معجزہ دیکھ کر ہی کہہ
سکتے ہیں۔

بعض منکرین معجزات یہ بھی کہتے ہیں کہ ”آیت“ سے مراد قرآن کریم کی آیات ہیں کہ یہ
لوگ انھیں جادو قرار دیتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کا لفظ ”رَأَوْا“ (دیکھتے ہیں) اس کی صفا

تردید کر رہا ہے۔ آیات قرآنی کو دیکھا نہیں، سنا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں کہیں آیات قرآنی کا ذکر ہو وہاں اس کے ساتھ سننے کے الفاظ آتے ہیں دیکھنے کے نہیں، اور قرآن کریم میں جگہ جگہ آیہ "کا لفظ معجزہ کے معنی میں آیا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون کا مطالبہ نقل کرتے ہوئے ارشاد ہے:

”اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِآيَةٍ فَلَا تَكُنْ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ“
”اگر تم کوئی معجزہ لے کر آتے ہو تو لاؤ، اگر سچے ہو“

اسی کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لالٹھی کو سانپ بنانے کا معجزہ دکھلایا تھا۔

رہیں قرآن کریم کی وہ آیات جن میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزہ دکھانے کے مطالبہ کو نہیں مانا۔ سو درحقیقت وہاں بار بار معجزات دکھائے جا چکے تھے لیکن وہ ہر روز اپنی مرضی کا ایک نیا معجزہ طلب کرتے تھے، اس کے جواب میں معجزہ دکھانے سے انکار کیا گیا۔ اس لئے کہ اللہ کا نبی اللہ کے حکم سے معجزات دکھاتا ہے، اگر کوئی پھر بھی اس کی بات نہ مانے تو ہر روز ایک نیا معجزہ ظاہر کرنا نبی کے وقار کے بھی خلاف ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بھی۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا دستور یہ رہا ہے کہ جب کسی قوم کو اس کا مطلوبہ معجزہ عطا کر دیا گیا اور اس کے بعد بھی وہ ایمان نہیں لاتی، تو عذاب عام کے ذریعہ اس کو ہلاک کیا گیا امت محمدیہ کو چونکہ باقی رکھنا اور عذاب عام سے بچانا پیش نظر تھا اس لئے اسے مطلوبہ معجزہ نہیں دکھایا گیا۔

فَانْسَاهِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُونَ ﴿١٩﴾ وَقَالُوا

سو وہ اٹھانا تو یہی ہے ایک جھڑکی پھر اسی وقت یہ گلیں گے دیکھنے۔ اور کہیں گے

يَوْمَئِذٍ نَّاهَذَا يَوْمَ الدِّينِ ﴿٢٠﴾ هَذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِي

اے خرابی ہماری یہ آگیا دن جزا کا۔ یہ ہو دن فیصلہ کا جس کو

كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿٢١﴾ اَحْسِرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوا وَاَزْوَاجَهُمْ

تم جھٹلاتے تھے۔ جمع کرو گنہگاروں کو اور ان کے جوڑوں کو

وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿۲۲﴾ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَاهْدُ وَهُمْ إِلَى

اور جو کچھ پوجتے تھے ، اللہ کے سوائے پھر چلاؤ ان کو

صِرَاطِ الْجَحِيمِ ﴿۲۳﴾ وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ ﴿۲۴﴾ مَا لَكُمْ

دوزخ کی راہ پر ، اور کھڑا رکھو ان کو ، ان سے پوچھنا ہے ، کیا ہوا تم کو

لَا تَنَاصَرُونَ ﴿۲۵﴾ بَلْ لَهُمُ الْيَوْمَ مَسْئَلُونَ ﴿۲۶﴾

ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے ؛ کوئی نہیں وہ آج اپنی آپ کو پکڑواتے ہیں ۔

خُلاصۂ تفسیر

پس قیامت تو بس ایک للکار ہوگی (یعنی دوسرے امور) سو اس سے سب بچا ایک
روز زندہ ہو کر (دیکھنے بھالنے لگیں گے اور (حسرت سے) کہیں گے ہمارے کم بخشی یہ تو وہی
روز جزا (معلوم ہوتا) ہے (ارشاد ہو گا کہ ہاں) یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے
آگے قیامت ہی کے بعض واقعات کی تفصیل ہے کہ فرشتوں کو حکم ہو گا) جمع کر لو ظالموں کو
(یعنی جو کفر و شرک کے بانی اور مقتدر تھے) اور ان کے ہم مشربوں کو (یعنی جو ان کے ساتھ تاج
تھے) اور ان مجبوروں کو جن کی وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کیا کرتے تھے (یعنی شیاطین اور
بُت) پھر ان سب کو دوزخ کا راستہ بتلاؤ (یعنی ادھر لے جاؤ) اور (پھر یہ حکم ہو گا کہ اچھا)
ان کو (ذرا) ٹھہراؤ ان سے کچھ پوچھا جائے گا (چنانچہ ان سے یہ سوال ہو گا کہ اب تم کو کیا ہوا
کہ (عذاب کا حکم سن کر) ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے (یعنی کافروں کے بڑے بڑے رہنما
انسان ہوں یا شیاطین اپنے تابعین کی مدد نہیں کرتے، جس طرح دنیا میں ان کو بہکایا کرتے
تھے ؟ مگر اس سوال کے بعد بھی وہ مدد نہ کر سکیں گے) بلکہ وہ سب کے سب اس روز سرفراز
(کھڑے) ہوں گے ۔

معارف و مسائل

آخرت کے امکان و ثبوت کے بعد باری تعالیٰ نے ان آیتوں میں حشر و نشر کے
کچھ واقعات بیان فرمائے ہیں، اور دوبارہ زندہ ہونے کے بعد کافروں اور مسلمانوں کو جو
حالات پیش آئیں گے ان کا تذکرہ فرمایا ہے ۔

سب سے پہلی آیت میں مردوں کے زندہ ہونے کا طریقہ کار بیان فرمایا ہے کہ قَائِلَمَا
هِيَ زُجْرَةٌ وَاحِدَةٌ (یعنی قیامت تو بس ایک للکار ہوگی) زُجْرَةٌ کا لفظ زَجْرٌ کا اسم مرہ ہے اور
اس کے عربی زبان میں کئی معنی آتے ہیں۔ ان میں سے ایک معنی ہیں ”مولیشیوں کو چلنے پر آمادہ کرنے
کے لئے ایسی آوازیں نکالنا جنہیں سن کر وہ اٹھ کھڑے ہوں“ یہاں اس سے مراد وہ دوسرا صورت
ہے جو حضرت اسرافیل علیہ السلام مردوں کو زندہ کرنے کے لئے پھونکیں گے، اور اسے ”زُجْرَةٌ“
سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس طرح مولیشیوں کو اٹھا کر چلانے کے لئے کچھ آوازیں نکالی جاتی ہیں
اسی طرح مردوں کو زندہ کرنے کے لئے یہ صورت پھونکا جائے گا۔ (تفسیر قرطبی)

اگرچہ باری تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے کہ صورت پھونکنے بغیر مردوں کو زندہ کر دے، لیکن یہ
صورتِ حشر و نشر کے منظر کو پُر ہیبت بنانے کے لئے پھونکا جائے گا (تفسیر کبیر) — اس
صورت پھونکنے کا اثر کافروں پر یہ ہوگا کہ قَاذَاهُمْ يَنْظُرُونَ (پس اچانک وہ دیکھنے بھالنے
لگیں گے) یعنی جس طرح دنیا میں وہ دیکھنے پر قادر تھے اسی طرح وہاں بھی دیکھ سکیں گے، اور
بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ وہ حیرانی کے عالم میں ایک دوسرے کو
دیکھنے لگیں گے۔ (قرطبی)

الْحُشْرُ وَالَّذِينَ ظَلَمُوا وَاَزْوَاجَهُمْ (یعنی ان ظالموں کو جنہوں نے شرک کے ظلم
عظیم کا ارتکاب کیا اور ان کے ہم مشربوں کو جمع کر دو) یہاں ہم مشربوں کے لئے ازواج
کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی ہیں ”جوڑ“ اور یہ لفظ شوہر اور بیوی کے معنی میں
بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض مفسرین نے اس کے معنی بیان کرتے ہوئے یہ کہا
ہے کہ اس سے مشرکین کی وہ بیویاں مراد ہیں جو خود بھی مشرک تھیں۔ لیکن اکثر مفسرین کے
نزدیک یہاں ”ازواج“ سے مراد ہم مشرب ہی ہے، اور اس کی تائید حضرت عمرؓ کے ایک ارشاد
سے بھی ہوتی ہے۔ امام بیہقیؒ اور عبدالرزاقؒ وغیرہ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عمرؓ کا یہ
قول نقل کیا ہے، کہ یہاں ازواج ہم سے مراد ہیں ان جیسے دوسرے لوگ، چنانچہ سود خور دوسرے
سود خوروں کے ساتھ، زنا کار دوسرے زانیوں کے ساتھ، اور شراب پینے والے دوسرے
شراب پینے والوں کے ساتھ جمع کئے جائیں گے۔ (روح المعانی و مظہری)

اس کے علاوہ وَمَا كَاوُا يَعْبُدُونَ کے الفاظ سے بتا دیا گیا کہ مشرکین کے ساتھ ان کے
وہ باطل معبود یعنی بت اور شیاطین بھی جمع کئے جائیں گے، جنہیں یہ لوگ دنیا میں اللہ کے
ساتھ شریک ٹھہراتے تھے، تاکہ اُس وقت اُن باطل معبودوں کی بے بسی کا اچھی طرح
نظارہ کرایا جائے۔

اس کے بعد فرشتوں کو حکم ہوگا کہ فَاَهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ ۝ یعنی ان لوگوں کو جہنم کا راستہ دکھلاؤ، اور جب فرشتے ان لوگوں کو لے چلیں گے تو پل صراط کے قریب پہنچنے کے بعد حکم ہوگا کہ يَقْوَاهُمْ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ ان کو ٹھہراؤ، ان سے سوال ہوگا۔ چنانچہ اس مقام پر ان کے ان کے عقائد و اعمال کے بارے میں وہ سوالات کئے جائیں گے جن کا ذکر قرآن و حدیث میں بہت مقامات پر آیا ہے۔

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۖ (۳۷) قَالُوا إِنَّا كُنَّا كُنتُمْ

اور منہ کیا بعضوں نے بعضوں کی طرف لگے پوچھنے، بولے تم ہی تھے کہ آتے تھے ہم پر داہنی

تَأْتُونَنَا عَنِ الْيَمِينِ ۖ (۳۸) قَالُوا بَلْ كُنْتُمْ نَوَاسِطَ (۳۹) وَمَا

طرف سے ۔ وہ بولے کوئی نہیں پر تم ہی نہ تھے یقین والے ۔ اور ہمارا

كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ ۖ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِينَ ۖ (۴۰) فَحَقَّ عَلَيْنَا

تم پر کچھ زور نہ تھا، پر تم ہی تھے لوگ حد سے نکل چلنے والے ۔ سو ثابت ہو گئی ہم پر

قَوْلُ رَبِّنَا ۖ إِنَّا لَذٰلِكَ أَقْبُونَ ۖ (۴۱) فَأَخَوَيْنَاكُمْ ۖ إِنَّا كُنَّا غٰوِينَ ۖ (۴۲)

بات ہمارے رب کی بیشک ہم کو مزہ چکھنا ہی، ہم نے تم کو گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ تھے ۔

فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ۖ (۴۳) إِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ

سو وہ سب اس دن تکلیف میں شریک ہیں ۔ ہم ایسا ہی کرتے ہیں گنہگاروں

بِالْمُجْرِمِينَ ۖ (۴۴) إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

کے حق میں ۔ وہ تھے کہ ان سے جب کوئی کہتا کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے،

يَسْتَكْبِرُونَ ۖ (۴۵) وَيَقُولُونَ إِنَّمَا نَتْلُو أَسَاطِيرَ الْأَوَّلِينَ ۖ (۴۶)

تو غرور کرتے، اور کہتے کیا ہم چھوڑ دیں گے اپنے معبودوں کو کہنے سے ایک شاعر دیوانے کے؟

بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ۖ (۴۷) إِنَّا كُنَّا لَنَقُولُ الْعَذَابَ

کوئی نہیں، وہ لیکر آیا ہی سچا دین اور سچا ماننا ہی سب سولوں کو، بیشک تم کو چکھنا ہی عذاب

الْأَلِيمُ ۖ (۴۸) وَمَا يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۖ (۴۹) إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمَخْلُصِينَ ۖ (۵۰)

دردناک ۔ اور وہی بدلہ پاؤ گے جو کچھ تم کرتے تھے، مگر جو بندے اللہ کے ہیں چنے ہوئے ۔

خلاصہ تفسیر

دجائے اس کے کہ مشرکین ایک دوسرے کی مدد کر سکیں ان میں اُس وقت اُلٹا جھگڑا ہوگا اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر جواب سوال (یعنی اختلافات) کرنے لگیں گے (چنانچہ تابعین) اپنے سرداروں سے کہیں گے کہ (ہم کو تو تم نے گمراہ کیا، کیونکہ) ہم پر تمہاری آمد بڑے زور کی ہو کرتی تھی (یعنی تم ہم پر خوب زور ڈال کر ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے) تبوعین یہ کہیں گے کہ نہیں بلکہ تم خود ہی ایمان نہیں لائے تھے، اور (ہم پر ناحق الزام لگاتے ہو، کیونکہ) ہمارا تم پر کوئی زور تو تھا ہی نہیں، بلکہ تم خود ہی سرکشی کیا کرتے تھے سو جب کفر کے مرتکب ہم بھی تھے اور تم بھی، تو معلوم ہوا کہ) ہم سب ہی پر ہمارے رب کی یہ (ازلی) بات محقق ہو چکی تھی کہ ہم سب کو (عذاب کا) مزہ چکھنا ہے، تو اس کا سامان یہ ہو گیا کہ) ہم نے تم کو یہ کیا جس سے تم ہمارے جبر و اکراہ کے بغیر خود اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے اور ادھر) ہم خود بھی (اپنا اختیار سے) گمراہ تھے پس دونوں کی گمراہی کے اسباب جمع ہو گئے، جس میں تمہارا اپنا اختیار بھی اپنی گمراہی کا بڑا سبب ہے، پھر اپنے آپ کو بری کیسے کرنا چاہتے ہو؟ آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب دونوں فریق کافر میں مشترک ہونا ثابت ہے، تو وہ سب کے سب اس روز عذاب میں (بھی) شریک رہیں گے (اور) ہم ایسے مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں (آگے ان کے کفر و جرم کا بیان ہے کہ) وہ لوگ ایسے تھے کہ (توحید کے بھی منکر تھے اور رسالت کے بھی چنانچہ) جب ان سے (بواسطہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کہا جاتا تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود برحق نہیں تو اس کے ماننے سے) سبکدوش کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعر دیوانہ (کے کہنے) کی وجہ سے چھوڑ دیں گے؟ پس اس میں توحید اور رسالت دونوں کا انکار ہو گیا حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ پیغمبر نہ شاعر ہیں نہ مجنون (بلکہ) پیغمبر ہیں کہ) ایک سچا دین لے کر آئے ہیں اور اصول توحید و غیرہ میں) دوسرے پیغمبروں کی تصدیق (اور موافقت) کرتے ہیں (یعنی ایسے اصول بتلاتے ہیں جس میں سب رسول متفق ہیں۔ پس وہ اصول بے شمار دلائل کی روشنی میں حق ہیں، خیال بندی نہیں، اور حق بات کا کہنا جئون نہیں۔ دوسری امتوں نے بھی اپنے انبیاء کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کیا۔ یہاں چونکہ براہ راست کفار عرب مخاطب ہیں، اس لئے صرف اسی اُمت کے کافروں کا ذکر کیا گیا ہے، آگے اس بات کا بیان ہے کہ انھیں مشافہۃً اس مشترک عذاب کی وعید سنائی جائے گی کہ) تم سب (تابع اور متبوع) کو دردناک عذاب چکھنا پڑے گا اور اس حکم میں تم پر کوئی ظلم نہیں ہو (کیونکہ) تم کو اسی کا بدلہ ملے گا جو کچھ تم

رکفر وغیرہ) کیا کرتے تھے، ہاں مگر جو اللہ کے خاص کئے ہوئے بندے ہیں اس سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جنہوں نے حق کا اتباع کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں مقبول اور مخصوص فرمایا ایسے لوگ عذاب سے محفوظ رہیں گے۔

معارف و مسائل

میدانِ حشر میں جمع ہونے کے بعد کافروں کے بڑے بڑے سردار جنہوں نے اپنی چھوٹوں کو بہکایا تھا، اپنے پیروں کے سامنے آئیں گے تو بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کی کوئی مدد کر سکیں، آپس میں بحث و تکرار شروع کر دیں گے۔ ان آیات میں اسی بحث و تکرار کا کچھ نقشہ کھینچ کر فریقین کا انجام بد بیان کیا گیا ہے۔ آیات کا مفہوم خلاصہ تفسیر سے واضح ہے، صرف چند مختصر باتیں قابل ذکر ہیں:-

(۱) اِنَّكُمْ كُنْتُمْ ثَاوِيْنَا عَنِ الْمَيْمَيْنِ میں "یمن" کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، ان میں سے ایک معنی قوت و طاقت بھی ہیں۔ اور اسی معنی کے لحاظ سے تفسیر یہ کی گئی ہے کہ "ہم پر تمہاری آمد بڑے زور کی ہو ا کرتی تھی" یعنی تم ہم پر خوب زور ڈال کر ہمیں گمراہ کیا کرتے تھے اور یہی تفسیر زیادہ صاف اور بے غبار ہے۔ اس کے علاوہ "یمن" کے معنی "قسم" کے بھی آتے ہیں اس لئے بعض حضرات نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ: "تم ہمارے پاس قسمیں لے کر آیا کرتے تھے" یعنی قسم کھا کر ہم پر یہ باور کراتے تھے کہ ہمارا مذہب درست ہے، اور رسولؐ کی تعلیم (معاذ اللہ) باطل ہے۔ الفاظِ قرآنی کے لحاظ سے یہ دونوں تفسیریں بے تکلف ممکن ہیں۔

(۲) قَالَتْهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو ناجائز کام کی دعوت دے اور اسے گناہ پر آمادہ کرنے کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے تو اسے دعوتِ گناہ کا عذاب تو بے شک ہوگا، لیکن جس شخص نے اس کی دعوت کو اپنے اختیار سے قبول کر لیا، وہ بھی اپنے عمل کے گناہ سے بری نہیں ہو سکتا۔ وہ آخرت میں یہ کہہ کر چھٹکارا نہیں پاسکتا کہ مجھے تو فلاں شخص نے گمراہ کیا تھا، ہاں اگر اس نے گناہ کا ارتکاب اپنے اختیار سے نہ کیا ہو بلکہ جبر و اکراہ کی حالت میں اپنی جان بچانے کے لئے کر لیا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی معافی کی امید ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿۴۱﴾ فَاَوَاكِهِ وَهُمْ مُّكْرَمُونَ ﴿۴۲﴾ فِي جَنَّتٍ

وہ لوگ جو ہیں اُن کے واسطے روزی ہو مقرر میوے اور ان کی عزت ہو نعمت کے

التَّعِيمِ ۝۴۳ عَلَى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ۝۴۴ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ

باغوں میں، تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے، لوگ لئے پھرتے ہیں ان کے پاس پیالہ

مِنْ مَّعِينٍ ۝۴۵ بَيضَاءُ كَذَّةٍ لِّلشَّرِبِ ۝۴۶ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا

شراب صاف کا، سفید رنگ مزہ دینے والی پینے والوں کو، نہ اس میں سر پھرتا ہو اور نہ وہ

هَمٌّ عَنْهَا يُنْزَفُونَ ۝۴۷ وَعِنْدَهُمْ قُصِرَاتُ الطَّرَفِ عِينٌ ۝۴۸

اس کو پی کر بہکیں، اور ان کے پاس ہیں عورتیں نیچے نگاہ رکھنے والیاں بڑی آنکھوں والیاں،

كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مُّكْنُونٌ ۝۴۹ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝۵۰

گویا وہ اندھے ہیں چھپے دھرے۔ پھر مٹہ کیا ایک نے دوسرے کی طرف لگے پوچھنے،

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۝۵۱ يَقُولُ أَإِنَّكَ لَمِنَ

بولا ایک بولنے والا ان میں میرا تھا ایک ساتھی، کہا کرتا کیا تو یقین

الْمُصَدِّقِينَ ۝۵۲ إِذَا امْتَنَّا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا إِنَّا

کرتا ہے، کیا جب ہم مر گئے اور ہو گئے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم کو

لَمَسَدٍ يُنَوَّنَ ۝۵۳ قَالَ هَلْ آنَسَمُ مُطِلَعُونَ ۝۵۴ فَاطْلَعَ فَرَاهُ فِي

جزائر ملے گی؟ کہنے لگا بھلا تم جہانک کر دیکھو گے؟ پھر جہانکا تو اس کو دیکھا

سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۝۵۵ قَالَ تَاللَّهِ إِن كِدَّتْ لَتُرْدِينَ ۝۵۶ وَلَوْلَا

بجول بیچ دوزخ کے۔ بولا قسم اللہ کی تو تو مجھ کو ڈالنے لگا تھا گرٹھے میں، اور اگر نہ ہوتا

نِعْمَةُ رَبِّي لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ۝۵۷ أَفَمَا خُنَّ بِمَنِّيَنَ ۝۵۸

میرے رب کا فضل تو میں بھی ہوتا انہی میں جو پکڑے ہوئے آئے کیا اب ہم کو مرنا نہیں،

إِلَّا مَوْتَنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝۵۹ إِنَّ هَٰذَا أَلْهُو

مگر جو پہلی بار مر چکے اور ہم کو تکلیف نہیں پہنچے گی۔ بیشک یہی ہے

الْفَوْنُ الْعَظِيمُ ۝۶۰ لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ ۝۶۱

بڑی مراد ملنی۔ ایسی چیزوں کے واسطے چاہئے محنت کریں محنت کرنے والے۔

خلاصہ تفسیر

ان اللہ کے مقبول بندوں کے واسطے ایسی غذائیں ہیں جن کا حال (دوسری سورتوں میں) معلوم (ہو چکا) ہے یعنی میوے (جن کا ملنا سورۃ یس آیت اَہْمُ فِیْہَا فَاہْمُ میں اور جن کی صفات سورۃ واقعہ آیت وَفَاکَہِ کَثِیْرَۃٌ لَا مَقْطُوْعَہٌ وَلَا مَمْنُوْعَہٌ میں اس کے قبل نازل ہو چکی ہیں، کیونکہ یس اور واقعہ سورۃ صافات سے نزول میں مقدم ہیں۔ کذا فی الاتقان) اور وہ لوگ بڑی عزت سے آرام کے باغوں میں تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہونگے (اور) اُن کے پاس ایسا جام شراب لایا جائے گا (یعنی غلمان لائیں گے) جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جائے گا (اس سے شراب کی کثرت اور لطافت معلوم ہوئی اور دیکھنے میں سفید ہوگی (اور پینے میں) پینے والوں کو لذیذ معلوم ہوگی (اور) نہ اس میں دردِ سر ہوگا (جیسے دنیا کی شراب میں ہوتا ہے جس کو خمار کہتے ہیں) اور نہ اس سے عقل میں فتور آئے گا، اور ان کے پاس نچی نگاہ والی بڑی بڑی آنکھوں والی (حوریں) ہوں گی (جن کی رنگت ایسی صاف ہوگی کہ) گویا بیضے ہیں جو (پروں کے نیچے) چھپے ہوئے ہیں (کہ گرد و غبار اور داغ سے بالکل محفوظ ہوتے ہیں تشبیہ محض صفائی میں ہے) پھر جب سب لوگ ایک جلسہ میں جمع ہوں گے تو ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کریں گے (اس بات چیت کے دوران میں) ان (اہل جنت) میں سے ایک کہنے والا (اہل مجلس سے) کہے گا کہ (دنیا میں) میرا ایک ملاقاتی تھا وہ (مجھ سے بطور تعجب) کہا کرتا تھا کہ کیا تو بعث کے معتقدین میں سے ہے کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم (دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور زندہ کر کے) جزاء سزا دیئے جائیں گے؟ (یعنی وہ آخرت کا منکر تھا، اس لئے ضرور وہ دوزخ میں گیا ہوگا۔ حق تعالیٰ کا) ارشاد ہوگا کہ (اے اہل جنت) کیا تم جھانک کر (اس کو) دیکھنا چاہتے ہو؟ (اگر چاہو تو تم کو اجازت ہے) سو وہ شخص (جس نے قصہ بیان کیا تھا) جھانکے گا تو اس کو وسطِ جہنم میں (پڑا ہوا) دیکھے گا (اس کو وہاں دیکھ کر اس) کہے گا کہ خدا کی قسم تو مجھ کو تباہ ہی کرنے کو تھا (یعنی مجھ کو بھی منکرِ آخرت بنانے کی کوشش کیا کرتا تھا، اور اگر میرے رب کا (مجھ پر) فضل نہ ہوتا کہ مجھ کو اس نے صحیح عقیدے پر قائم رکھا، تو میں بھی (تیری طرح) مآخوذ لوگوں میں ہوتا اور اس کے بعد جنتی اہل مجلس سے کہے گا کہ) کیا ہم بجز پہلی بار مر چکنے کے (کہ دنیا میں مر چکے ہیں) اب نہیں مریں گے اور نہ ہم کو عذاب ہوگا؟ (یہ ساری باتیں اس جو شِ مسرت میں کہی جاتیں گی کہ اللہ تعالیٰ نے سب آفات اور کھفتوں سے بچا لیا اور ہمیشہ کے لئے بے فکر کر دیا۔ آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جنت کی جتنی جسمانی اور روحانی نعمتیں اور پر بیان کی گئیں) یہ بیشک بڑی کامیابی ہے، ایسی ہی کامیابی

(حاصل کرنے کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے (یعنی ایمان لانا اور اطاعت کرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

اہلِ دوزخ کے حالات بیان کرنے کے بعد ان آیات میں اہلِ جنت کے احوال کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ تذکرہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دس آیتوں میں عام اہلِ جنت کو جو عیش و آرام حاصل ہوگا، اس کا بیان ہے اور اس کے بعد کی آیات میں ایک خاص جنتی کا عبرت آموز واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ابتدائی دس آیتوں میں چند باتیں بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) اُولَئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ کا لفظی ترجمہ یہ ہے ”انہی لوگوں کے لئے ایسا رزق ہے جس کا حال معلوم ہے“ مفسرین نے اس کے مختلف مطلب بتائے ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اس سے جنتی غذاؤں کی ان تفصیلی صفات کی طرف اشارہ ہے جو مختلف سورتوں میں بیان کی گئی ہیں۔ چنانچہ خلاصہ تفسیر میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اسی تفسیر کو اختیار فرمایا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ ”رزق معلوم“ سے مراد یہ ہے کہ اس کے اوقات متعین اور معلوم ہیں، یعنی وہ صبح و شام یا بندی کے ساتھ عطا کیا جائے گا، جیسا کہ دوسری آیت میں مُبَكَّرَةٌ وَعَشِيًّا رِزْقٌ وَشَامٌ کے الفاظ صراحتاً آئے ہیں۔ ایک تیسری تفسیر اور ہے، اور وہ یہ کہ ”رزق معلوم“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ یقینی اور دائمی رزق ہوگا، دنیا کی طرح نہیں کہ کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا کہ کل مجھے کیا اور کتنا رزق ملنے والا ہے؟ اور نہ کسی کو یہ علم ہے کہ جتنا رزق مجھے حاصل ہے وہ کب تک میرے پاس رہے گا؟ ہر انسان کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ جو نعمتیں مجھے اس وقت حاصل ہیں وہ شاید کل میرے پاس نہ رہیں، جنت میں یہ خطرہ نہیں ہوگا، بلکہ وہاں کا رزق یقینی بھی ہوگا اور دائمی بھی (تفسیر قرطبی وغیرہ)

(۲) فَوَاكِهُ، اس لفظ کے ذریعہ قرآن نے جنت کے رزق کی خود تفسیر فرمادی ہے کہ وہ رزق میوؤں پر مشتمل ہوگا۔ فَوَاكِهُ کی جمع ہے، اور عربی میں فَاكِهَةٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو بھوک کی ضرورت رفع کرنے کے لئے نہیں، بلکہ لذت حاصل کرنے کے لئے کھائی جائے اور دو میں اس کا ترجمہ ”میوہ“ اس لئے کر دیا جاتا ہے کہ میوہ بھی لذت حاصل کرنے کے کھایا جاتا ہے، ورنہ درحقیقت ”فاکہہ“ کا مفہوم میوے کے مفہوم سے زیادہ عام ہے۔ امام رازیؒ نے اسی ”فواکہ“ کے لفظ سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جنت میں جتنی غذائیں دی جائیں گی وہ سب لذت بخشہ کے لئے دی جائیں گی، بھوک کی حاجت رفع کرنے کے لئے نہیں۔ اس لئے کہ جنت میں انسان کو حاجت کسی چیز کی نہیں ہوگی، وہاں اسے اپنی زندگی برقرار رکھنے یا حفظانِ صحت

کے لئے بھی کسی غذا کی ضرورت نہیں ہوگی، ہاں خواہش ہوگی، اس خواہش کے پورے ہونے سے لذت حاصل ہوگی، اور جنت کی تمام نعمتوں کا مقصد لذت عطا کرنا ہوگا (تفسیر کبیر، ص ۹۸ ج ۲) (۳) وَهُمْ يَكْمُرُونَ، کہہ کر بتا دیا گیا کہ اہل جنت کو یہ رزق پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ ریا جائے گا۔ کیونکہ اعزاز و اکرام نہ ہو تو لذت سے لذیذ غذا بھی بے حلاوت ہو جاتی ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں کا حق صرف کھانا کھلانے سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا اعزاز و اکرام بھی اس کے حقوق میں داخل ہے۔

(۴) عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِیْنَ، یہ اہل جنت کی مجلس کا نقشہ ہے کہ وہ تختوں پر آٹنے سامنے بیٹھے ہوں گے، کسی کی کسی کی طرف پشت نہیں ہوگی، اس کی عملی صورت کیا ہوگی؟ اس کا صحیح علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ مجلس کا دائرہ اتنا وسیع ہوگا کہ کسی کو کسی کی طرف پشت کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، اور اللہ تعالیٰ اہل جنت کو ایسی قوت بینائی، سماعت اور گویائی عطا فرمائے گا کہ وہ دور بیٹھے ہوئے لوگوں سے بڑے آرام کے ساتھ باتیں کر سکیں۔ اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ تخت گھومنے والے ہوں گے، اور جس سے بات کرنی ہو اسی کی طرف گھوم جائیں گے۔ واللہ سبحانہ اعلم

(۵) لَذَّةٍ لِّلْشَّارِبِیْنَ، ”لذۃ“ اصل میں مصدر ہے، جس کے معنی ہیں لذت ہونا۔ اسی لئے بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں مضان محذوف ہے، اصل میں ”ذات لذۃ“ تھا، یعنی ”لذت والی“ لیکن اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ اول تو اگر ”لذۃ“ کو مصدر ہی سمجھا جائے تو مصدر اسم فاعل کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ وہ شراب پینے والوں کے لئے ”محتم لذت“ ہوگی۔ اس کے علاوہ ”لذۃ“ کا صیغہ صفت لذیذ کے علاوہ لذۃ بھی آتا ہے، ہو سکتا ہے کہ یہاں لذۃ اسی لذۃ کا مؤنث ہو (تفسیر قرطبی) اس صورت میں معنی ہوں گے ”پینے والوں کے لئے لذیذ“

(۶) لَا فِيْهَا غَوْلٌ۔ غَوْل کے معنی کسی نے ”درد سر“ بیان کئے ہیں، کسی نے ”پیٹ کا درد“ کسی نے ”بدبوا و رگندگی“ اور کسی نے ”عقل کا بہک جانا“ و حقیقت لفظ غَوْل ان سبھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور حافظ ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہاں غَوْل آفت کے معنی میں ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جنت کی شراب میں ایسی کوئی آفت نہیں ہوگی جیسی دنیا کی شرابوں میں پائی جاتی ہیں، نہ درد سر ہوگا، نہ درد شکم، نہ بدبو کا بھبکا رہ، نہ عقل کا بہک جانا (تفسیر ابن جریر)

(۷) قِصَصَاتِ الطُّرُقِ، یہ جنت کی حوروں کی صفت ہے کہ وہ ”نگاہیں نیچی رکھنے والی ہوں گی“ مطلب یہ ہے کہ جن شوہروں کے ساتھ ان کا ازدواجی رشتہ اللہ تعالیٰ نے قائم کر دیا، وہ

ان کے علاوہ کسی بھی مرد کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھیں گی۔ علامہ ابن جوزیؒ نے نقل کیا ہے کہ یہ عورتیں اپنے شوہروں سے کہیں گی: ”میرے پروردگار کی عزت کی قسم! جنت میں مجھے تم سے بہتر کوئی نظر نہیں آتا جس اللہ نے مجھے تمھاری بیوی اور تمھیں میرا شوہر بنایا تمام تعریفیں اسی کی ہیں!“

”نگاہیں نیچی رکھنے والی“ کا ایک اور مطلب علامہ ابن جوزیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی نگاہیں نیچی رکھیں گی۔ یعنی وہ خود اتنی خوب صورت اور وفا شعار ہوں گی کہ ان کے شوہروں کو کسی اور کی طرف نظر اٹھانے کی خواہش ہی نہ ہوگی (تفسیر زاد المسیر لابن جوزیؒ ص ۵۵۵ و ۵۵۶ ج ۱) (۸) **كَانَ هُنَّ يَبْصُرْنَ مِمَّا كُنُوْنَ**، اس آیت میں جنت کی عورتوں کو ”چھپے ہوئے اندوں“ سے

تشبیہ دی گئی ہے۔ اہل عرب کے یہاں یہ تشبیہ مشہور و معروف تھی، جو انڈاپروں میں چھپا ہوا ہو اس پر بیرونی گرد و غبار کا اثر نہیں پہنچتا۔ اس لئے وہ نہایت صاف ستھرا ہوتا ہے، اس کے علاوہ اس کا رنگ زردی مائل سفید ہوتا ہے جو اہل عرب کے یہاں عورتوں کے لئے دلکش ترین رنگ شمار ہوتا تھا، اس لئے اس سے تشبیہ دی گئی۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہاں اندوں سے تشبیہ نہیں ہے، بلکہ اندوں کی اس جھلی سے ہے جو چھلکے کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ عورتیں اس جھلی کی طرح نرم و نازک اور گداز ہوں گی (روح المعانی)

واللہ سبحانہ اعلم

ابتدائی دس آیتوں میں اہل جنت کے عمومی حالات بیان فرمانے کے بعد ایک ایک جنتی اور اس کا کافر ملاقاتی

اپنے ایک کافر دوست کو یاد کرے گا جو دنیا میں آخرت کا منکر تھا اور پھر اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اسے جہنم کے اندر جھانک کر اس سے باتیں کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ قرآن کریم میں اس شخص کا کچھ نام و پتہ نہیں بتایا گیا۔ اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کون ہوگا؟ تاہم بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس مؤمن شخص کا نام یہوداہ اور اس کے کافر ملاقاتی کا نام مطروس ہے۔ اور یہ وہی دو شخص ہیں جن کا ذکر سورۃ کہف کی آیت **وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا زَوْجَيْنِ الْاٰخَرَيْنِ** میں گزر چکا ہے (تفسیر مظہری)

اور علامہ سیوطیؒ نے متعدد تابعین سے اس شخص کی تعیین کے لئے ایک اور واقعہ نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دو آدمی کاروبار میں شریک تھے، ان کو آٹھ ہزار دینار کی آمدنی ہوئی، اور دونوں نے چار چار ہزار دینار آپس میں بانٹ لئے۔ ایک شریک نے اپنی رقم میں سے ایک ہزار دینار خرچ کر کے ایک زمین خریدی۔ دوسرا سا بھی بہت نیک تھا، اس نے یہ دعا کی کہ ”یا اللہ فلاں شخص نے ایک ہزار دینار میں ایک زمین خریدی ہے، میں آپ سے ایک

ہزار دینار کے عوض جنت میں زمین خریدتا ہوں“ اور ایک ہزار دینار کا صدقہ کر دیا۔ پھر اس کے ساتھی نے ایک ہزار دینار خرچ کر کے ایک گھر بنوایا، تو اس شخص نے کہا ”یا اللہ فلاں شخص نے ایک ہزار دینار میں ایک گھر تعمیر کیا ہے، میں ایک ہزار دینار میں آپ سے جنت کا ایک گھر خریدتا ہوں“ یہ کہہ کر اس نے مزید ایک ہزار دینار صدقہ کر دیئے۔ اس کے بعد اس کے ساتھی نے ایک عورت سے شادی کی اور اس پر ایک ہزار دینار خرچ کر دیئے، تو اس نے کہا ”یا اللہ فلاں نے ایک عورت سے شادی کر کے اس پر ایک ہزار دینار خرچ کر دیئے ہیں، اور میں جنت کی عورتوں میں سے کسی کو پیغام دیتا ہوں اور یہ ایک ہزار دینار نذر کرتا ہوں“ یہ کہہ کر وہ ایک ہزار بھی صدقہ کر دیئے۔ پھر اس کے ساتھی نے ایک ہزار دینار میں کچھ غلام اور سامان خریدا تو اس نے پھر ایک ہزار صدقہ کر کے اللہ تعالیٰ سے اس کے عوض جنت کے غلام اور جنت کا سامان طلب کیا۔

اس کے بعد اتفاق سے اس مؤمن بندے کو کوئی شدید حاجت پیش آئی، اسے خیال ہوا کہ میں اپنے سابق شریک کے پاس جاؤں تو شاید وہ نیکی کا اوارہ کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھی سے اپنی ضرورت کا ذکر کیا، ساتھی نے پوچھا، تمہارا مال کیا ہوا؟ اس کے جواب میں اس نے پورا قصہ سنا دیا۔ اس پر اس نے حیران ہو کر کہا کہ ”کیا واقعی تم اس بات کو سچا سمجھتے ہو کہ ہم جب مر کر خاک ہو جائیں گے تو ہمیں دوسری زندگی ملے گی، اور وہاں ہم کو ہمارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، جاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں دوں گا“ اس کے بعد دونوں کا انتقال ہو گیا۔ مذکورہ آیات میں جنتی سے مراد وہ بندہ ہے جس نے آخرت کی خاطر اپنا سارا مال صدقہ کر دیا تھا، اور اس کا جہنمی ملاقاتی وہی شریک کا روبرو ہے جس نے آخرت کی تصدیق کرنے پر اس کا مذاق اڑایا تھا (تفسیر الدر المنثور بحوالہ ابن جریر وغیرہ، ص ۱۶۵ ج ۵)

بہر کیف: اس سے مراد خواہ کوئی ہو یہاں اس واقعہ کو ذکر کرنے سے قرآن کریم بچنے کی تعلیم کا اصل منشاء لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ وہ اپنے حلقہ احباب کا پوری احتیاط کے ساتھ جائزہ لے کر یہ دیکھیں کہ اس میں کوئی ایسا شخص تو نہیں ہے جو انھیں کشاکش دوزخ کے انجام کی طرف لے جا رہا ہو۔ بُری صحبت سے جو تباہی آسکتی ہے اس کا صحیح اندازہ آخرت ہی میں ہوگا، اور اس وقت اس تباہی سے بچنے کا کوئی رستہ نہ ہوگا، اس لئے دنیا ہی میں دوستیاں اور تعلقات بہت دیکھ بھال کر قائم کرنے چاہئیں۔ بسا اوقات کسی کافر یا نافرمان شخص سے تعلقات قائم کرنے کے بعد انسان غیر محسوس طریقے پر اس کے افکار و نظریات اور طرز زندگی سے متاثر ہوتا چلا جاتا ہے، اور یہ چیز آخرت کے انجام

کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

موت کے خاتمہ پر تعجب | یہاں جس شخص کا یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنے کافر ساتھی کو دیکھنے کے لئے جہنم میں جھانکے گا، اسی کے بارے میں آگے یہ مذکور ہے کہ وہ جنت کی نعمتوں کو حاصل کر کے فرط مسرت سے یہ کہے گا کہ ”کیا اب ہم کبھی نہیں مریں گے؟“ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ جنت کی جاودانی زندگی کا یقین نہیں ہوگا، بلکہ جس شخص کو مسرتوں کا انتہائی درجہ حاصل ہو جائے وہ بسا اوقات ایسی باتیں کرتا ہے جیسے اسے یقین نہیں ہے کہ یہ مسرتیں اسے حاصل ہو گئی ہیں، یہ جملے بھی اسی نوعیت کے ہیں۔

آخر میں قرآن کریم اس واقعہ کے اصل سبق کی طرف متوجہ کر کے فرماتا ہے،
لِيَسْتَلِ هَذَا أَقَلِّعُ عَمَلٍ الْغَائِلُونَ (ایسی ہی کامیابی کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے)۔

أَذْلِكَ خَيْرٌ نَزْلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ۖ إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً

بجلا یہ بہتر ہیسمانی یا درخت سیہند کا ؟ ہم نے اس کو رکھا ہی ایک بلا ظالموں

لِلظَّالِمِينَ ۖ إِنَّمَا شَجَرَةُ زُجْرٍ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ۖ طَلْعُهَا

کے واسطے ۔ وہ ایک درخت ہی کہ نکلتا ہی دوزخ کی جڑ میں ، اس کا خوشہ

كَانَتْ رُءُوسَ الشَّيَاطِينِ ۖ فَأَنَّهُمْ لَا يَكُونُونَ مِنْهَا فَنَالُونَ

جیسے سر شیطان کے ۔ سو وہ کھاتیں گے اس میں سے پھر بھریں گے

مِنْهَا الْبُطُونُ ۖ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ ۖ ثُمَّ إِنَّ

اس سے پیٹ ، پھر اُن کے واسطے اس کے اوپر ملونی ہو جلتے پانی کی ، پھر اُن کو

مَرْجِعَهُمْ لَا إِلَى الْجَحِيمِ ۖ أَتَقُوا آبَاءَهُمْ ضَالِّينَ ۖ

لے جانا ہی آگ کے ڈبیر میں ۔ انھوں نے پایا اپنے باپ دادوں کو بہکے ہوئے ،

فَهُمْ عَلَىٰ أَثَرِهِمْ يهْرَعُونَ ۖ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ

سو وہ انہی کے قدموں پر دوڑتے ہیں ۔ اور بہک چکے ہیں ان سے پہلے بہت لوگ

الْأَوَّلِينَ ۖ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِمْ مُّنْذِرِينَ ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ

اگلے ۔ اور ہم نے بھیجے ہیں ان میں ڈر سناتے والے ۔ اب دیکھ کیسا ہوا

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُتَدَرِّينَ ۝۴۳ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۝۴۴

انجام ڈرائے ہوؤں کا، مگر جو بندے اللہ کے ہیں چنے ہوئے۔

خلاصہ تفسیر

(عذاب اور ثواب دونوں کا موازنہ کر کے اب اہل ایمان کو ترغیب اور کفار کو ترہیب فرماتے ہیں کہ بتلاؤ) بھلا یہ دعوت (جنت کی نعمتوں کی) بہتر ہے (جو اہل ایمان کے لئے ہے) یا زقوم کا درخت (جو کفار کے لئے ہے) ہم نے اس درخت کو آخرت کی سزا بنانے کے علاوہ دنیا میں بھی ان ظالموں کے لئے موجب امتحان بنایا ہے (کہ اس کو سن کر تصدیق کرتے ہیں یا تکذیب و استہزاء کرتے ہیں چنانچہ کفار تکذیب و استہزاء سے پیش آئے، کہنے لگے کہ زقوم تو مسکہ اور خرما کو کہتے ہیں، وہ تو خوب لذیذ چیز ہے۔ اور کہنے لگے کہ زقوم اگر درخت ہے تو دوزخ میں جو آگ ہی آگ ہے درخت کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ وہ ایک درخت ہے جو قعر دوزخ میں سے نکلتا ہے (یعنی مسکہ اور خرما نہیں ہے، اور چونکہ وہ خود آگ ہی میں پیدا ہوتا ہے اس لئے وہاں رہنا بعید نہیں، جیسے سمندر نامی جانور آگ میں پیدا ہوتا ہے، اور آگ ہی میں رہتا ہے، اس سے دونوں باتوں کا جواب ہو گیا۔ آگے زقوم کی ایک کیفیت مذکور ہے کہ) اس کے پھل ایسے (کہ یہ المنظر) ہیں جیسے سانپ کے پھن (پس ایسے درخت سے ظالموں کی دعوت ہو گی) تو وہ لوگ (بھوک کی شدت میں جب اور کچھ نہ ملیگا تو) اس سے کھا دیں گے اور (چونکہ بھوک سے بے چین ہوں گے) اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر جب پیاس سے بے قرار ہو کر پانی مانگیں گے تو اُن کو کھولتا ہوا پانی (غشاق یعنی پیپ میں) ملا کر دیا جائے گا اور (یہ نہیں کہ اس مصیبت کا خاتمہ ہو جائے بلکہ اس کے بعد) پھر اخیر ٹھکانا ان کا دوزخ ہی کی طرف ہو گا (یعنی اس کے بعد بھی وہیں ہمیشہ کے لئے رہنا ہو گا، اور انھیں یہ سزا اس لئے دی گئی کہ) انھوں نے ہدایت الہیہ کا اتباع نہیں کیا تھا بلکہ اپنے بڑوں کو گمراہی کی حالت میں پایا تھا، پھر یہ بھی اپنی کے قدم بقدم تیزی کے ساتھ چلتے تھے (یعنی شوق اور رغبت ان کی بے راہی پر چلتے تھے) اور ان (موجودہ کفار) سے پہلے بھی اگلے لوگوں میں اکثر گمراہ ہو چکے ہیں اور ہم نے ان میں بھی ڈرائیوالے (پیغمبر) بھیجے تھے سود بھیجے لیجئے ان لوگوں کو کیسا (برا) انجام ہو جن کو ڈرایا گیا تھا اور انھوں نے نہ مانا تھا کہ ان پر دنیا ہی میں کیا عذاب نازل ہوا) ہاں مگر جو اللہ کے خاص کئے ہوئے (یعنی ایمان والے) بندے تھے (وہ اس نیری عذاب سے بھی محفوظ رہے)۔

معارف مسائل

دوزخ اور جنت دونوں کے تھوڑے تھوڑے حالات بیان فرمانے کے بعد باری تعالیٰ نے ہر انسان کو موازنہ کرنے کی دعوت دی ہے کہ غور کرو ان میں سے کونسی حالت بہتر ہے؟ چنانچہ فرمایا اذْلِكْ خَلْقًا مِّنْ ذَلَاٰمٍ شَجَرَةً اَلْزَّقُوْمِ؟ جنت کی جن نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا وہ بہتر ہیں یا زقوم کا درخت جو دوزخیوں کو کھلایا جائے گا؟

زقوم کی حقیقت | زقوم نام کا ایک درخت جزیرہ عرب کے علاقہ ہناتمہ میں پایا جاتا ہے، اور علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ یہ دوسرے بنجر صحراؤں میں بھی ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے یہ وہی درخت ہے جسے اردو میں ”تھوڑ“ کہتے ہیں، اسی کے قریب قریب ایک اور درخت ہندوستان میں ”ناگ بھن“ کے نام سے معروف ہے۔ بعض حضرات نے اس کو زقوم قرار دیا ہے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ اب حضرات مفسرین کی رائیں اس میں مختلف ہیں، کہ جہنمیوں کو جو درخت کھلایا جائے گا وہ یہی دنیا کا زقوم ہے، یا کوئی اور درخت ہے؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہی دنیا کا زقوم مراد ہے، اور بعض نے کہا کہ دوزخ کا زقوم بالکل الگ چیز ہے، دنیا کے زقوم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سانپ بچھو وغیرہ دنیا میں بھی ہوتے ہیں اسی طرح دوزخ میں بھی ہوتے ہیں، لیکن دوزخ کے سانپ بچھو یہاں کے سانپ بچھو سے کہیں زیادہ خوفناک ہوں گے، اسی طرح دوزخ کا زقوم بھی اپنی مجلس کے لحاظ سے تو دنیا ہی کے زقوم کی طرح ہوگا، لیکن یہاں کے زقوم سے کہیں زیادہ کریمہ لمنظر اور کھانے میں کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

اِنَّا جَعَلْنَا هَٰذَا فِتْنَةً لِّلْظٰلِمِيْنَ، یعنی ”ہم نے اس زقوم کے درخت کو ان ظالموں کے لئے فتنہ بنایا ہے“ اس میں فتنہ سے بعض مفسرین کے نزدیک عذاب مراد ہے، یعنی اس درخت کو عذاب کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ لیکن اکثر حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہاں ”فتنہ“ کا ترجمہ ”آزمائش“ اور ”امتحان“ کرنا زیادہ موزوں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس درخت کا تذکرہ کر کے ہم یہ امتحان لینا چاہتے ہیں کہ کون اس پر ایمان لاتا ہے؟ اور کون اس کا مذاق اڑاتا ہے؟ چنانچہ کفار عرب اس امتحان میں ناکام رہے، انھوں نے بجائے اس کے کہ اس عذاب سے ڈر کر ایمان لاتے تمسخر و استہزاء کا طریقہ اختیار کیا۔ روایات میں ہے کہ جب قرآن کریم کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں کافروں کو زقوم کھلانے کا تذکرہ ہے، تو ابو جہل نے اپنی ساتھیوں سے کہا: ”تمہارا دوست (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہتا ہے کہ آگ میں ایک درخت ہوگا“

حالانکہ آگ تو درخت کو کھاتی ہے، اور خدا کی قسم! ہم تو یہ جانتے ہیں کہ زقوم کھجور اور مکھن کو کہتے ہیں، تو آؤ اور یہ کھجور مکھن کھاؤ! (درمنثور، ص ۲۷، ج ۲۵) دراصل زقوم بربری زبان میں کھجور اور مکھن کو کہتے تھے، اس لئے اس نے سہزادہ کا یہ طریقہ اختیار کیا۔ باری تعالیٰ نے ایک ہی جملے میں اس کی دونوں باتوں کا جواب دیدیا کہ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْ اَصْلِ الْجَحِيْمِ، یعنی زقوم تو جہنم کی تہ میں اُگنے والا ایک درخت ہے، لہذا نہ تو اس سے مراد کھجور اور مکھن ہے اور نہ یہ اعتراض معقول ہے کہ آگ میں درخت کیسے ہو سکتا ہے؟ جب وہ درخت پیدا ہی آگ میں ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی خصوصیات رکھ دی ہیں کہ وہ آگ سے جلنے کے بجائے اس سے نشوونما پاتا ہے، نمونے کے طور پر ایسے کئی حیوانات موجود ہیں جو آگ ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں آگ انہیں جلانے کے بجائے اور نشوونما عطا کرتی ہے۔

طُعْمَهَا كَاَنَّ رُءُوسَ الشَّيَاطِيْنِ، اس آیت میں زقوم کے پھل کو ”شیاطین کے سروں“ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے تو یہاں ”شیاطین“ کا ترجمہ ”سایپوں“ سے کیا ہے، یعنی زقوم کا پھل ایسی شکل کا ہوتا ہے جیسے سائپ کا پھن، اردو میں بھی اُسے ”ناگ پھن“ اسی لئے کہتے ہیں۔ لیکن اکثر مفسرین نے فرمایا کہ یہاں ”شیاطین“ سے اس کے معروف معنی ہی مراد ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ زقوم کا پھل اپنی بد صورتی میں شیطانوں کے سر کی طرح ہوتا ہے۔ اب یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ شیطان کو تو کسی نے دیکھا نہیں، پھر اس کے ساتھ تشبیہ کیوں دی گئی؟ اس لئے کہ یہ ایک تخیلی تشبیہ ہے، محاورہ میں بد صورت اور بد ہیئت اشیاء کو شیطان اور جن بھوت سے تشبیہ دیدی جاتی ہے، اس کا منشاء محض انتہاء درجے کی بد صورتی بیان کرنا ہوتا ہے، یہاں بھی تشبیہ اسی نوعیت کی ہے۔ (روح المعانی وغیرہ) باقی آیات کا مفہوم خلاصہ تفسیر سے واضح ہے۔

وَلَقَدْ نَادَيْنَا نُوْحًا فَلْيَعْمَلِ الْمَجِيْبُوْنَ ۖ ﴿٥٥﴾ وَنَجِّنْهُ وَاَهْلًا مِّنْ

اور ہم کو پکارا تھا نوح نے سو کیا خوب پہنچنے والے ہیں ہم پکار پر، اور بچا دیا اس کو اور اس کے گھر کو

الْكُرْبِ الْعَظِيْمِ ۖ ﴿٥٦﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِيْنَ ۖ ﴿٥٧﴾ وَتَرَكْنَا

اُس بڑی گہرا ہٹ سے، اور رکھا اس کی اولاد کو وہی باقی رہنے والے۔ اور باقی رکھا

عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۖ ﴿٥٨﴾ سَلَّمَ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعَالَمِيْنَ ۖ ﴿٥٩﴾ اِنَّا كُنَّا لَكَ

اس پر پچھلے لوگوں میں، کہ سلام ہو نوح پر ساری جہان والوں میں۔ ہم یوں

نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝ ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِينَ ۝ ۸۲

بدلتی ہیں نیکی والوں کو، وہ ہی ہمارے ایماندار بندوں میں، پھر ڈبا دیا ہم نے دوسروں کو۔

خُلاصَةُ تَفْسِيرِ

اور ہم کو نوح (علیہ السلام) نے نصرت کے لئے پکارا (یعنی دعا کی) سو رہم نے ان کی فریادرسی کی اور ہم خوب فریاد سننے والے ہیں اور ہم نے ان کو اور ان کے تابعین کو بڑے بھاری غم سے (جو کفار کی تکذیب اور ایذا رسانی سے پیش آیا تھا) نجات دی کہ طوفان سے کفار کو غرق کر دیا اور ان کے تابعین کو بچا لیا اور ہم نے باقی انہی کی اولاد کو رہنے دیا (اور کسی کی نسل نہیں چلی) اور ہم نے ان کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات مدت دراز کے لئے (رہز دی کہ نوح پر سلام ہو عالم والوں میں) (یعنی خدا کر دیا پھر تمام اہل عالم جن وانس و ملائکہ سلام بھیجا کریں) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں بیشک وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں تھے، پھر ہم نے (دوسرے طریق کے) لوگوں کو (یعنی کافروں کو) غرق کر دیا۔

معارف ومسائل

پچھلی آیت میں تذکرہ کیا گیا تھا کہ ہم نے پہلی اُمتوں کے پاس بھی ڈرانے والے پیغمبر بھیجے تھے، لیکن اکثر لوگوں نے ان کی بات نہیں مانی، اس لئے ان کا انجام بہت بُرا ہوا۔ اب یہاں سے اسی اجمال کی کچھ تفصیل بیان کی جا رہی ہے، اور اس ضمن میں کئی انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے ان آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ کیا گیا ہے، حضرت نوح کا واقعہ تفصیل کے ساتھ سورہ ہود میں گزر چکا ہے، یہاں چند باتیں جو خاص طور سے انہی آیات کی تفسیر سے متعلق ہیں درج ذیل کی جاتی ہیں:-

[illegible]

جبکہ آپ کی قوم نے آپ کو جھٹلانے پر اکتفاء کرنے کے بجائے اُلٹا آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔
 وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمْ الْكَآفِرِينَ (اور ہم نے باقی اہنی کی اولاد کو رہنے دیا)۔ اکثر
 حضرات مفسرین کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے
 میں جو طوفان آیا تھا اس میں دنیا کی اکثر آبادی ہلاک ہو گئی تھی، اور اس کے بعد ساری دنیا کی نسل
 حضرت نوح علیہ السلام ہی کے تین بیٹوں سے چلی۔ ایک بیٹے کا نام سام تھا، اور ان کی اولاد سے
 اہل عرب اور اہل فارس وغیرہ کی نسل چلی۔ دوسرے بیٹے حام تھے، اور ان سے افریقی ممالک کی
 آبادیاں دنیا میں پھیلیں، بعض حضرات نے ہندوستان کے باشندوں کو بھی اسی نسل میں شامل کیا
 ہے۔ اور تیسرے بیٹے یافت تھے، ان سے ترک، منگول اور یاجوج و ماجوج کی نسلیں نکلی ہیں۔ جو
 لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار ہو کر طوفان سے بچ گئے تھے ان میں سے حضرت
 نوح کے ان تین بیٹوں کے سوا کسی اور سے کوئی نسل نہیں چلی۔

البتہ بعض علماء جن کی تعداد بہت کم ہے اس بات کے قائل رہے ہیں کہ طوفانِ نوح ؑ
 پوری دنیا میں نہیں، بلکہ صرف ارضِ عرب میں آیا تھا۔ ان کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے
 کہ ارضِ عرب میں صرف حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد باقی رہی، اور اہنی سے اہل عرب کی نسل
 چلی، دنیا کے دوسرے خطوں میں دوسروں کی نسل چلنے کی اس آیت سے نفی نہیں ہوتی (بیان القرآن)
 مفسرین کا ایک تیسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ طوفانِ نوحؑ تو پوری دنیا میں آیا تھا، لیکن دنیا کی
 نسل صرف حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹوں سے نہیں، بلکہ ان تمام لوگوں سے چلی ہے جو کشتی میں
 حضرت نوح کے ساتھ سوار تھے۔ یہ گروہ آیت میں حصر کو حصر اضافی قرار دے کر یہ کہتا ہے کہ یہاں
 اصل مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ ڈوبنے والوں کی نسل نہیں چلی (قرطبی)

قرآن کریم کے سیاق کے لحاظ سے تیسرا قول بہت کم زور ہے اور پہلا قول سب سے بہتر
 ہے، اس لئے کہ اس کی تائید بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے، جو امام ترمذی وغیرہ نے اس آیت
 کی تفسیر میں براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ
 سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: سام اہل عرب کا باپ ہے، حام اہل حبشہ کا باپ ہے،
 اور یافت اہل روم کا۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور امام حاکم نے اسے صحیح قرار دیا
 (روح المعانی، ص ۹۸ ج ۲۳)

وَنَزَّلْنَا عَلَیْهِ فِي الْآخِرِينَ سَلَامًا عَلَى نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ (اور ہم نے اُن کے
 لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات رہنے دی کہ نوح پر سلام ہو عالمِ والوں میں) اس کا
 مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے اُن کی نظر میں حضرت نوحؑ

کو ایسا معزز و مکرم بنا دیا کہ وہ قیامت تک حضرت نوح علیہ السلام کے لئے سلامتی کی دعا کرتے رہیں گے چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ تمام وہ مذاہب جو اپنے آپ کو آسمانی کتابوں سے منسوب کرتے ہیں سب کے سب حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت اور تقدس کے قائل ہیں، مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور نصرانی بھی آپ کو اپنا پیٹھو مانتے ہیں۔

وَأَنَّ مِنْ شَيْعَتِهِ لَابْرَهِيمَ ۝۸۳ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝۸۴

اور اسی کی راہ والوں میں ہے ابراہیم - جب آیا اپنے رب کے پاس بیکر دل بردگنا

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ ۝۸۵ أَتُفَكِّرُونَ ۝۸۶

جب کہا اپنے باپ کو اور اس کی قوم کو تم کیا پوجتے ہو، کیا جھوٹ بنائے ہوئے حاکموں کو اللہ کے

اللَّهُ قَرِيبٌ ۝۸۷ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝۸۸ فَنَظَرَ نَظْرَةً

سوا چاہتے ہو، پھر کیا خیال کیا کرتے ہو پروردگار عالم کو؟ پھر نگاہ کی ایک بار

فِي النَّجُومِ ۝۸۹ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ۝۹۰ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِينَ ۝۹۱

تاروں میں، پھر کہا میں بیمار ہونے والا ہوں - پھر پھر گئے وہ اس سے پیٹھ دے کر

فَرَاغَ إِلَىٰ آلِهِمْ فَقَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ۝۹۲ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُونَ ۝۹۳

پھر جا گھسا ان کے بتوں میں پھر بولا تم کیوں نہیں کھاتے، تم کو کیا ہے کہ نہیں بولتے؟

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ ۝۹۴ فَأَقْبَلُوا إِلَيْهِ يَزْفَرُونَ ۝۹۵

پھر گھسا ان پر مارتا ہوا دائیں ہاتھ سے - پھر لوگ آئے اُس پر دوڑ کر گھبراتے ہوئے۔ بولا

تَعْبُدُونَ مَا تَنْجُونَ ۝۹۶ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ۝۹۷

کیوں پوجتے ہو جو آپ تڑاشتے ہو؟ اور اللہ نے بنایا تم کو اور جو تم بناتے ہو۔

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۝۹۸ فَأَرَادُوا بِهِ

بولے بناؤ اس کے واسطے ایک عمارت پھر ڈالو اس کو آگ کے ڈھیر میں - پھر چاہنے لگے اس پر

كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمْ أَسْفَلَ سَفَلِينَ ۝۹۹

بڑا داؤ کرنا پھر ہم نے ڈالا انہی کو نیچے۔

خلاصہ تفسیر

اور نوح (علیہ السلام) کے طریقہ والوں میں سے یعنی ان لوگوں میں سے جو اصولی عقائد میں نوح علیہ السلام کے ساتھ متفق تھے، ابراہیم بھی تھے ان کا وہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے، جب کہ وہ اپنے رب کی طرف صاف دل سے متوجہ ہوئے (صاف دل کا مطلب یہ کہ ان کا دل بعقیدگی اور دکھلاوے کے جذبہ سے پاک تھا) جبکہ انھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے (جو بت پرست تھی) فرمایا کہ تم کس (واہیات) چیز کی عبادت کیا کرتے ہو؟ کیا جھوٹ موٹ کے معبودوں کو اللہ کے سوا (معبود بنانا) چاہتے ہو تو تمھارا رب العالمین کے ساتھ کیا خیال ہے، (یعنی تم نے جو اس کی عبادت ترک کر رکھی ہے تو کیا اس کے معبود ہونے میں کوئی شبہ ہو؟ یعنی اول تو ایسا نہ ہونا چاہیے اور اگر کوئی شبہ ہے تو اسے رفع کر لو۔ غرض یوں ہی بحث و مباحثہ ہوتا رہتا تھا، ایک بار کا واقعہ ہے کہ ان کا کوئی ہتھیار آیا، قوم نے اُن سے بھی درخواست کی کہ ہمارے میلہ میں چلو) سو ابراہیم (علیہ السلام) نے ستاروں کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا اور کہہ دیا کہ میں بیمار ہونے کو ہوں (اس لئے میلہ میں نہیں جاسکتا) غرض وہ لوگ (ان کا یہ عذر سن کر) اُن کو چھوڑ کر چلے گئے (کہ ناحق بیمار سی میں ان کو اور ان کی وجہ سے اوروں کو تکلیف ہوگی) تو یہ (یعنی ابراہیم علیہ السلام) اُن کے بتوں میں جا گھسے اور (ہتھیار کے طور پر ان سے) کہنے لگے کیا تم (یہ چڑھاؤ جو تمھارے سامنے رکھے ہیں) کھاتے نہیں ہو (اور) تم کو کیا ہوا تم بولتے بھی نہیں؟ پھر اُن پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے (اور کھلاڑی وغیرہ سے ان کو توڑ پھوڑ دیا) سو ان لوگوں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ لوگ اُن کے پاس دوڑتے ہوئے (گھبرائے ہوئے غصہ میں) آئے اور گفتگو شروع ہوئی، ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم ان چیزوں کو پوجتے ہو جن کو خود اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو (تو جو تمھارا محتاج ہو وہ خدا کیا ہوگا؟) حالانکہ تم کو اور تمھاری بنائی ہوئی ان چیزوں کو (سب کو) اللہ ہی نے پیدا کیا ہے (سو عبادت اسی کی کرنا چاہئے) وہ لوگ (جب مناظرہ میں مغلوب ہوئے تو جھلا کر باہم) کہنے لگے کہ ابراہیم کے لئے ایک آتش خانہ تعمیر کرو (اور اس میں آگ دہکا کر) ان کو اس دہکتی آگ میں ڈال دو، غرض ان لوگوں نے ابراہیم کے ساتھ بُرائی کرنی چاہی تھی (کہ یہ ہلاک ہو جائیں گے) سو ہم نے انہی کو نچا دکھایا (جس کا قصہ سورہ انبیاء میں گزر چکا ہے)۔

معارف و مسائل

حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کے بعد قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ کے دو واقعے ذکر کئے ہیں، دونوں واقعے ایسے ہیں جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض اللہ کے واسطے عظیم قربانیاں پیش کیں۔ ان میں سے پہلا واقعہ جو مذکورہ آیات میں بیان کیا گیا ہے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کا واقعہ ہے، اور اس کی تفصیلات سورۃ انبیاء میں گزر چکی ہیں، البتہ یہاں جس انداز میں اس کو بیان کیا گیا ہے اس میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

اِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَا بُرْهِيْمَ، شِيعَتُہ عربی زبان میں اس گروہ یا جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد بنیادی نظریات اور طور طریق میں یکساں ہوں۔ اور یہاں ظاہر یہی ہے کہ شِیعَتِہ کی ضمیر حضرت نوح علیہ السلام کی طرف راجع ہے، لہذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پیش رو نبی حضرت نوح علیہ السلام کے طریقے پر تھے، اور بنیادی اصول دین میں دونوں کا مکمل اتفاق تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کی شریعتیں بھی یکساں یا ملتی جلتی ہوں۔ واضح رہے کہ بعض تاریخی روایات کے مطابق حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے درمیان دو ہزار چھ سو چالیس سال کا وقفہ ہے، اور دونوں کے درمیان حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کے سوا کوئی اور نبی نہیں ہوا۔ (کشاف، ص ۲۸ ج ۱۳)

اِذْ جَاءَ رَبُّہٗ یَقْلِبُ سَیِّئِہٖمُ، اس کے ٹھیک لفظی معنی یہ ہیں: ”جبکہ وہ آئے اپنے پروردگار کے پاس صاف دل لے کر“ اور پروردگار کے پاس آئے سے مراد ہے، اللہ کی طرف رجوع کرنا، اس کی طرف متوجہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا۔ اس کے ساتھ ”صاف دل“ کی قیاسی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ اللہ کی کوئی عبادت اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک کہ عبادت کرنے والے کا دل غلط عقیدوں اور بُرے جذبات سے پاک نہ ہو، اگر غلط عقیدے کے ساتھ کوئی عبادت کی جائے تو خواہ عبادت گزار نے اس میں کتنی محنت اٹھائی ہو وہ قابل قبول نہیں۔ اسی طرح اگر عبادت کرنے والے کا اصل مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے دکھلاوا ہو یا کوئی مادی منفعت ہو تو وہ عبادت قابلِ تعریف نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رجوع الی اللہ ان تمام ملاوٹوں سے پاک تھا۔

فَنَظَرَ نَظْرَۃً فِی السُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّیْ سَمِیْعٌ، ان آیتوں کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم ایک خاص دن میں تہوار منایا کرتی تھی، جب وہ دن آیا تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دعوت دی کہ آپ بھی ہمارے ساتھ جشن میں شرکت کے لیے چلیں

مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس جشن میں ہمارے ساتھ رہیں گے تو شاید ہمارے دین سے متاثر ہو جائیں، اور اپنے دین کی دعوت چھوڑ دیں۔ (درغثورواہن جریر وغیرہ) لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس موقع سے دوسرا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، آپ کا ارادہ یہ تھا کہ جب ساری قوم جشن منانے چلی جائے گی تو میں ان کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کے بتوں کو توڑ ڈالوں گا، تاکہ یہ لوگ واپس آکر اپنے جھوٹے معبودوں کی بے بسی کا عملی نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، ہو سکتا ہے کہ اپنے بتوں کو بے بس دیکھ کر کسی کے دل میں ایمان پیدا ہو اور وہ شرک سے توبہ کر لے۔ اس غرض سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے ساتھ جانے سے انکار فرما دیا، لیکن انکار کا طریقہ یا اختیار فرمایا کہ پہلے نگاہ بھر کر ستاروں کو دیکھا اور پھر کہا کہ ”میں بیمار ہوں“ قوم والوں نے آپ کو معذور سمجھ کر چھوڑ دیا اور جشن منانے چلے گئے۔

اس واقعے سے متعدد تفسیری اور فقہی مباحث متعلق ہیں، یہاں ان کا خلا پیش خدمت ہو سٹاروں پر نگاہ ڈالنے کا مقصد سب سے پہلی بحث تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دینے سے پہلے جو ستاروں پر نظر ڈالی، اس کا مقصد کیا تھا؟ بعض حضرات نے تو یہ فرمایا ہے کہ یہ محض ایک اتفاقی عمل تھا، کسی اہم بات کو سوچتے ہوئے انسان بعض اوقات بے اختیار آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہے، جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی تو آپ اس سوچ میں پڑ گئے کہ اس دعوت کو کس طرح ٹلاؤں؟ اسی سوچ کے عالم میں آپ نے بے اختیار ستاروں کی طرف دیکھا اور اس کے بعد جواب دیا۔ ستاروں پر نظر ڈالنے کی یہ تشریح بظاہر بے غبار معلوم ہوتی ہے، لیکن قرآن کریم کے اسلوب کے پیش نظر اسے درست کہنا مشکل ہے۔ اول تو اس لئے کہ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ واقعات کے صرف اہم اور ضروری جزاء کو بیان فرماتا ہے، اور غیر ضروری تفصیلات کو چھوڑ دیتا ہے، خود بھی آیتوں میں واقعے کے کئی اجزاء محذوف ہیں، یہاں تک کہ اس کا پورا پس منظر بھی بیان نہیں کیا گیا، اس لئے یہ باور کرنا ممکن نہیں کہ قرآن کریم نے واقعے کے پس منظر کو تو تطویل کے خیال سے چھوڑ دیا ہو اور ایک قطعی غیر خستہ کاری عمل جس کا واقعے سے دور دراز کا بھی تعلق نہ تھا اسے پوری ایک آیت میں بیان فرمایا ہو۔ دوسرے اگر ستاروں کو دیکھنے میں کوئی خاص حکمت پیش نظر نہیں تھی، بلکہ یہ ایک غیر خستہ کاری عمل تھا تو عربی زبان کے قواعد کی رو سے فَتَنَ نَظْرًا إِلَى النُّجُومِ کہنا چاہئے تھا، اِنِّی النُّجُومِ نہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ستاروں کو دیکھنے میں کوئی خاص مصلحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیش نظر تھی، اسی لئے قرآن کریم نے اہمیت کے ساتھ اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اب وہ

مصلحت کیا تھی؟ اس کے جواب میں اکثر مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم علم نجوم کی بڑی شیدائی تھی، اور ستاروں کو دیکھ دیکھ کر اپنے کاموں کا تعین کیا کرتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی طرف دیکھ کر جو جواب دیا اس کا مقصد یہ تھا کہ قوم والے یہ سمجھیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام — اپنی بیماری کے بارے میں جو کچھ فرما رہے ہیں وہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے، بلکہ ستاروں کے چلن پر غور کر کے کہہ رہے ہیں، اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بذات خود علم نجوم کے قائل نہ ہوں، لیکن جشن کی شرکت سے اپنی گلو خلا کے لئے آپ نے طریقہ اختیار فرمایا جو ان کی نظر میں زیادہ قابل اعتماد ہو، اور چونکہ آپ نے زبان سے علم نجوم کا کوئی حوالہ نہیں دیا، نہ یہ بتایا کہ ستاروں کو دیکھنے سے میرا مقصد علم نجوم سے مدد لینا ہے، بلکہ صرف نظر بھر کر ستاروں کو دیکھا، اس لئے اس میں جھوٹ کا بھی کوئی پہلو نہیں ہوا۔ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس عمل سے ان کافروں کی ہمت افزائی ہوتی ہوگی جو نہ صرف علم نجوم کے قائل تھے، بلکہ ستاروں کو دنیا کے واقعات میں موثر حقیقی مانتے تھے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ ہمت افزائی تو تب ہوتی جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بعد میں انھیں صراحت کے ساتھ ان کی گمراہیوں پر متنبہ نہ فرماتے، یہاں تو یہ ساری تدبیر کی ہی اس لئے جاری تھی کہ انھیں توحید کی دعوت زیادہ سے زیادہ موثر بنا کر دی جائے، چنانچہ تھوڑے ہی وقفہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کی ایک ایک گمراہی کو کھول کھول کر بیان فرمادیا، اس لئے محض اس مبہم عمل سے کافروں کی ہمت افزائی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں اصل مقصد جشن کی شرکت سے اپنی جان چھڑانا تھا، تاکہ دعوت حق کے لئے زیادہ موثر فضا پیدا کی جاسکے، اس مقصد کے لئے ایہام کا یہ طریقہ عین حکمت پر مبنی ہے، اور اس پر کوئی معقول اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

ستاروں کی طرف دیکھنے کی یہ تشریح اکثر مفسرین سے منقول ہے، اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

علم نجوم کی شرعی حیثیت | اس آیت کے تحت دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ علم نجوم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہاں اختصار کے ساتھ اس سوال کا جواب عرض کیا جاتا ہے۔

یہ تو ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاند سورج اور ستاروں میں کچھ ایسی خاصیتیں رکھی ہیں جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں، ان میں سے بعض خاصیتیں ایسی ہیں جن کا ہر شخص مشاہدہ کر سکتا ہے، مثلاً سورج کے قُرب و بُعد سے گرمی اور سردی کا پیدا ہونا، چاند کے آثار چڑھاؤ سے سمندر میں مد و جزر وغیرہ، اب بعض حضرات کا

کہنا تو یہ ہے کہ ان ستاروں کی خصوصیات صرف اتنی ہی ہیں جتنی عام مشاہدہ سے معلوم ہوتی ہیں، اور بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ان کے علاوہ بھی ستاروں کی گردش کے کچھ ایسے خواص ہوتے ہیں جو انسان کی زندگی کے اکثر معاملات پر اثر ڈالتے ہیں۔ ایک انسان کے لئے کسی ستارے کا کسی خاص برج میں چلے جانا مسرتوں اور کامیابیوں کا سبب بنتا ہے، اور کسی کے لئے غموں اور ناکامیوں کا، پھر بعض لوگ تو ان ستاروں ہی کو کامیابیوں اور ناکامیوں کے معاملہ میں مؤثر حقیقی مانتے ہیں، اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مؤثر حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، مگر اس نے ستاروں کو ایسے خواص عطا کر دیئے ہیں، اس لئے دنیا کے دوسرے اسباب کی طرح وہ بھی انسان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا ایک سبب ہوتے ہیں۔

جہاں تک اُن لوگوں کا تعلق ہے جو ستاروں کو مؤثر حقیقی مانتے ہیں، یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے انقلابات اور واقعات ستاروں ہی کے رہیں منت ہیں، ستارے ہی دنیا کے تمام واقعات کے فیصلے کرتے ہیں، تو بلاشبہ ان کا خیال غلط اور باطل ہے، اور یہ عقیدہ انسان کو شرک کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ اہل عرب بارش کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ایک خاص ستارہ (جسے "نور" کہا جاتا تھا) بارش لے کر آتا ہے، اور وہ بارش کے لئے مؤثر حقیقی کی حیثیت رکھتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عقیدے کی سخت تردید فرمائی ہے، جس کی تصریح احادیث میں موجود ہے۔ رہے وہ لوگ جو دنیوی واقعات میں مؤثر حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ اللہ نے ستاروں کو ایسے خواص عطا فرمائے ہیں جو سبب کے درجہ میں انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، جس طرح بارش برسانے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن اس کا ظاہری سبب بادل ہیں، اسی طرح تمام کامیابیوں اور ناکامیوں کا اصل سبب تو اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی ہے، لیکن یہ ستارے ان کامیابیوں اور ناکامیوں کا سبب بن جاتے ہیں، سو یہ خیال شرک نہیں ہے، اور قرآن و حدیث سے اس خیال کی نہ تصدیق ہوتی ہے نہ تردید۔ لہذا یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کی گردش اور ان کے طلوع و غروب میں کچھ ایسے اثرات رکھے ہوں، لیکن ان اثرات کی جستجو کرنے کے لئے علم نجوم کی تحصیل، اس علم پر اعتماد اور اس کی بناء پر مستقبل کے بارے میں فیصلے کرنا بہر حال ممنوع اور ناجائز ہے، اور احادیث میں اس کی ممانعت آتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

جَبْ تَقْدِرُ كَاذِرَ جَهْرَے تَوْرَكْ جَاوْ، (یعنی
اس میں زیادہ غور و خوض اور بحث مباحثہ
نہ کرو)، اور جب ستاروں کا ذکر چھڑے تو

إِذَا ذُكِرَ الْقَدَرُ فَامْسِكُوا وَإِذَا
ذُكِرَ النُّجُومُ فَامْسِكُوا وَإِذَا
ذُكِرَ أَصْحَابِي فَامْسِكُوا (تخویر)

احیاء العلوم للعراقی بحوالہ طبقاتی
وہوحد یت حسنہ العراقی

رک جاؤ اور جب میرے صحابہؓ کا دینی
اُن کے باہمی اختلافات وغیرہ کا ذکر چھڑا
تو رک جاؤ۔

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

تَعْلَمُوا مِنْ النُّجُومِ مَا تَقْدِرُونَ
بِهِ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ثُمَّ أَمْسَكُوا
داحیاء علوم الدین للضری

ستاروں کے علم سے اتنا علم حاصل کرو
جس کے ذریعہ تم خشکی اور سمندر میں رہو
جان سکو اس کے بعد رک جاؤ۔

اس ممانعت سے ستاروں کے خواص و آثار کا انکار لازم نہیں آتا، لیکن ان خواص و آثار کے پیچھے پڑنے — اور ان کی جستجو میں قیمتی اوقات برباد کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس ممانعت کی متعدد حکمتیں بتائی ہیں۔ علم نجوم کے ممنوع و مذموم ہونے کی پہلی حکمت تو یہ ہے کہ جب اس علم میں انسان کا اہمک بڑھتا ہے تو تجربہ یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ستاروں ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے، اور یہ چیز اسے کشاں کشاں ستاروں کے موثر حقیقی ہونے کے مشرکانہ عقیدے کی طرف لے جاتی ہے۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ اگر ستاروں میں اللہ تعالیٰ نے کچھ خواص و آثار رکھے بھی ہوں تو ان کے یقینی علم کا ہمارے پاس سوائے وحی کے کوئی راستہ نہیں ہے، حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے اس قسم کا کوئی علم عطا فرمایا تھا لیکن اب وہ علم جس کی بنیاد وحی الہی پر تھی، دنیا سے مٹ چکا ہے، اب علم نجوم کے ماہرین کے پاس جو کچھ ہے وہ محض قیاسات، اندازے اور تخمینے ہیں جن سے کوئی یقینی علم حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نجومیوں کی بے شمار پیشینگوئیاں آئے دن غلط ثابت ہوتی رہتی ہیں، کسی نے اس علم کے بارے میں بہترین تبصرہ کیا ہے کہ:

مفید کا غیر معلوم و معلومہ

غیر مفید

”یعنی اس علم کا جتنا حصہ مفید ہو سکتا ہو

وہ کسی کو معلوم نہیں اور جتنا لوگوں کو

معلوم ہو وہ فائدہ مند نہیں۔“

علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں تاریخی واقعات کی ایسی متعدد مثالیں پیش کی ہیں جن میں علم نجوم کے مسلمہ قواعد کے تحت ایک واقعہ جس طرح پیش آنا چاہئے تھا حقیقت میں اس کے بالکل برعکس پیش آیا، چنانچہ جن بڑے بڑے لوگوں نے اس علم کی تحصیل میں اپنی عمریں کھپائی ہیں وہ آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ اس علم کا انجام قیاس و تخمین سے آگے کچھ نہیں۔ ایک مشہور منجسم

کو شیاردہلی نے علم نجوم پر اپنی کتاب المجل فی الاحکام میں لکھا ہے :

”علم نجوم ایک غیر مدلل علم ہے، اور اس میں انسان کے موسموں اور گناہوں کے لئے

بڑی گنجائش ہے“ (روح المعانی، ص ۱۱۶ ج ۲۳)

علامہ آلوسیؒ نے اور بھی متعدد علماء نجوم کے اسی قسم کے اقوال نقل فرمائے ہیں، بہر حال :

یہ بات طے شدہ ہے کہ علم نجوم کوئی یقینی علم نہیں ہے، اور اس میں غلطیوں کے بے حساب احتمالات ہوتے ہیں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اس علم کی تحصیل میں لگتے ہیں وہ اسے بالکل قطعی اور یقینی علم کا درجہ دے بیٹھتے ہیں، اسی کی بناء پر مستقبل کے فیصلے کرتے ہیں، اسی کی وجہ سے دوسروں کے بارے میں اچھی برسی رائیں قائم کر لیتے ہیں، اور سب بڑھ کر یہ کہ اس علم کا جھوٹا پسندار بعض اوقات انسان کو علم غیب کے دعووں تک پہنچا دیتا ہے، اور ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر چیز بے شمار مفسد پیدا کرنے والی ہے۔

علم نجوم کی ممانعت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ عمر و عزیز کو ایک بے فائدہ کام میں صرف کرنے کے مرادف ہے، جب اس سے کوئی نتیجہ یقینی طور پر حاصل نہیں کیا جاسکتا تو ظاہر ہے کہ دنیا کے کاموں میں یہ علم چنداں مددگار نہیں ہو سکتا۔ اب خواہ مخواہ ایک بے فائدہ چیز کے پیچھے پڑنا اسلامی شریعت کی روح اور مزاج کے بالکل خلاف ہے، اس لئے اس کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام | اس آیت سے متعلق تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیماری کا مطلب | نے اپنی قوم کی دعوت کے جواب میں جو اپنی ”سقیۃ“ (میں بیمار ہوں) فرمایا تو کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت واقعی بیمار تھے؟ قرآن کریم میں اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہے، لیکن صحیح بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس وقت ایسے بیمار نہیں تھے کہ قوم کے ساتھ نہ جاسکیں، اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات کیسے ارشاد فرمائی؟

اس کا جواب جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ درحقیقت ان الفاظ کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ”توریت کیا تھا،“ ”توریت“ کا مطلب ہے ”کوئی ایسی بات کہنا جو بظاہر واقعہ کے خلاف ہو، لیکن کہنے والے نے اس سے کوئی ایسے دُور کے معنی مراد لئے ہوں جو واقعہ کے مطابق ہوں“ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو جملہ ارشاد فرمایا اس کا ظاہر ہی مفہوم تو یہی ہے کہ ”میں اس وقت بیمار ہوں“ لیکن آپ کی اصل مراد یہ نہیں تھی۔ اب اصل مراد کیا تھی؟ اس کے بارے میں مفسرین نے مختلف رائیں ظاہر کی ہیں، بعض نے فرمایا کہ اس سے آپ کا مقصد وہ طبعی انقباض تھا جو آپ کو اپنی قوم کی مشرکانہ حرکات دیکھ کر پیدا

ہو رہا تھا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہاں ”سقیم“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو ”مریقہ“ کے مقابلہ میں بہت ہلکا لفظ ہے، اور اس کا مفہوم اردو میں اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ ”میری طبیعت ناساز ہے“ ظاہر ہے کہ اس جملہ میں طبعی انقباض کے مفہوم کی بھی پوری گنجائش پائی جاتی ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ”إِنِّي سَقِيمٌ“ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ میں بیمار ہونے والا ہوں“ اس لئے کہ عربی زبان میں اس اسم فاعل کا صیغہ بکثرت زمانہ مستقبل کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرآن کریم ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا: ”إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ“ اس کے ظاہری الفاظ کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ”تم بھی مُردہ ہو اور وہ بھی مُردہ ہیں“ لیکن ظاہر ہے کہ یہاں مراد یہ معنی ہیں کہ ”تم بھی مرنے والے ہو اور وہ بھی مرنے والے ہیں“ اسی طرح ”إِنِّي سَقِيمٌ“ کے معنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ مراد لئے تھے کہ ”میں بیمار ہونے والا ہوں“ اور یہ اس لئے فرمایا کہ موت سے پہلے پہلے ہر انسان کا بیمار ہونا ^{یقینی} امر ہے، اگر کسی کو ظاہری بیماری نہ ہو تب بھی موت سے ذرا پہلے انسان کے مزاج میں خلل کا واقع ہونا ناگزیر ہے۔

اور اگر کسی کا دل ان تاویلات پر مطمئن نہ ہو تو سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طبیعت اُس وقت واقعہً تھوڑی بہت ناساز تھی، لیکن بیماری ایسی نہ تھی جو جشن میں شرکت سے مانع ہوتی، آپ نے اپنی معمولی ناسازی طبع کا ذکر ایسے ماحول میں کیا جس سے سننے والے یہ سمجھے کہ آپ کو کوئی بڑی بیماری لاحق ہے، جس کی وجہ سے آپ واقعی ہمارے ساتھ نہیں جاسکتے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توجیہ کی یہ تشریح سب سے زیادہ معقول اور اطمینان بخش ہے۔

اس تشریح سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد ”إِنِّي سَقِيمٌ“ کے لئے جو ”کذبہ“ (جھوٹ) کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے مراد ”توریہ“ ہے جس کی ظاہری شکل جھوٹ ہوتی ہے، لیکن متکلم کی مراد کے لحاظ سے وہ جھوٹ نہیں ہوتا، خود اسی حدیث کی بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

<p>مَا مِنْهَا كَذِبٌ إِلَّا مَا حَلَّ بِهَا عَنْ دِينِ اللَّهِ</p>	<p>اُن میں سے کوئی جھوٹ ایسا نہیں ہے جو اللہ کے دین کی ممانعت اور حمایت میں نہ بولا گیا ہو</p>
---	--

ان الفاظ نے خود یہ واضح کر دیا ہے کہ یہاں ”کذب“ اپنے عام معنی سے جدا مفہوم رکھتا ہے، اس حدیث سے متعلق قرآن کریم میں آیت قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ شَيْءٌ

گزر چکی ہے۔

تَوْرٰیہ کا شرعی حکم | انہی آیات سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ ضرورت کے مواقع پر تَوْرٰیہ کرنا جائز ہے تَوْرٰیہ ایک تو قوی ہوتا ہے، یعنی ایسی بات کہنا جس کا ظاہری مفہوم خلاف واقعہ ہو، اور باطنی مراد مطابق واقعہ۔ اور ایک تَوْرٰیہ عملی ہوتا ہے، یعنی ایسا عمل کرنا جس کا مقصد دیکھنے والا کچھ سمجھے اور حقیقت اس کا مقصد کچھ اور ہو، اسے اِیہَام بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کو دیکھنا (اکثر مفسرین کے قول کے مطابق) اِیہَام تھا، اور اپنے آپ کو بیمار کہنا تَوْرٰیہ۔

ضرورت کے مواقع پر تَوْرٰیہ کی یہ دونوں قسمیں خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، جس وقت آپ ہجرت کے لئے تشریف لے جاتے تھے، اور مشرکین آپ کی تلاش میں لگے ہوئے تھے، تو راستے میں ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا، کہ ”یہ کون ہیں؟“ حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب دیا، ”هُوَ هَٰذَا یَحْیٰی بَنِیَّ“ (وہ میرے رہنما ہیں، مجھے رستہ دکھاتے ہیں، سنئے والا یہ سمجھا کہ عام رستہ بتانے والے رہنما مراد ہیں، اس کو چھوڑ کر چل دیا، حالانکہ حضرت ابوبکرؓ کا مقصد یہ تھا کہ آپ دینی اور روحانی رہنما ہیں (روح المعانی) اسی طرح حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کے لئے جس سمت میں جانا ہوتا مدینہ طیبہ سے نکلتے وقت اس سمت میں روانہ ہونے کے بجائے کسی دوسری سمت میں چلنا شروع فرماتے تھے، تاکہ دیکھنے والوں کو صحیح منزل معلوم نہ ہو سکے (صحیح مسلم وغیرہ) یہ عملی تَوْرٰیہ اور اِیہَام تھا۔

مزاح اور خوش طبعی کے مواقع پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تَوْرٰیہ ثابت ہے، شامل ترمذیؒ میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھی عورت سے مزاحاً فرمایا ”کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہیں جاتے گی“ وہ عورت یہ سن کر بہت پریشان ہوئی تو آپؐ نے تشریح فرمائی کہ بوڑھیوں کے جنت میں نہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑھاپے کی حالت میں جنت میں نہ جاتیں گی ہاں جوان ہو کر جاتیں گی۔

اس کے بعد کی آیات کا مفہوم خلاصہ تفسیر سے واضح ہے، اور واقعہ کی تفصیلات سورۃ انبیاء میں گزر چکی ہیں۔

وَقَالَ اِنِّیْ ذٰہِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیِّئٌ مِّنْیْ ۙ رَبِّیْ هَبْ لِّیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۹۹

اور بولا میں جاتا ہوں اپنے رب کی طرف وہ مجھ کو راہ دے گا۔ اے رب بخش مجھ کو کوئی نیک بیٹا۔

فَبَشِّرْهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ۝۱۱۱ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَبْنِيْ اِلَيَّ اَرَى

پھر خوشخبری دی ہم نے اس کو ایک لڑکے کی جو ہوگا تحمل والا۔ پھر جب بچپن اس کے ساتھ بڑھنے کو کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں

فِي السَّامِ اِنِّيْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَى ۝۱۱۲ قَالَ يَآبَتِ افْعَلْ مَا

خواب میں کہ تجھ کو ذبح کرتا ہوں پھر دیکھ تو تو کیا دیکھتا ہے؟ بولا اے باپ کر ڈال جو تجھ کو حکم ہوتا ہے

تَوْمَرُ سَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۱۳ فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّ

تو مجھ کو پائے گا اگر اللہ نے چاہا سہارنے والا۔ پھر جب دونوں نے حکم مانا اور بچھاڑا

لِلْجَبِيْنَ ۝۱۱۴ وَنَادَيْنَاهُ اَنْ يَاِبْرٰهِيْمُ ۝۱۱۵ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّعْءَ يَا اِنَّا

اس کو ماتھے کے بل۔ اور ہم نے اس کو پکارا یوں کہ اے ابراہیم! تو نے سچ کر دکھایا خواب ہم یوں

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۱۶ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِيْنُ ۝۱۱۷

دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو، بیشک یہی ہے صریح جانچنا۔

وَفَدَيْنَاهُ بِذَبْحٍ عَظِيْمٍ ۝۱۱۸ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ

اور اس کا بدلہ دیا ہم نے ایک جانور ذبح کرنے کے واسطے بڑا، اور باقی رکھا ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں،

سَلَامٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝۱۱۹ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۱۱۰ اِنَّكَ

کہ سلام ہے ابراہیم پر۔ ہم یوں دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو، وہ پرہیزگارے

مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۱۱۱ وَبَشِّرْهُ بِاسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنْ اَصْلٰحِيْنَ ۝۱۱۱۲

ایمان دار بندوں میں، اور خوشخبری دی ہم نے اس کو اسحق کی جو نبی ہوگا نیک، بخنوں میں۔

وَبَرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُّحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ

اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحق پر اور دونوں کی اولاد میں نیکی والے ہیں اور بدکار بھی اپنی حق میں

مُبِيْنٌ ۝۱۱۱۳

صریح

خُلَاصَةُ تَفْسِيْر

اور ابراہیم (علیہ السلام) جب ان لوگوں کے ایمان سے مایوس ہو گئے تو کہنے لگے کہ میں تو

(تم سے ہجرت کر کے) اپنے رب کی راہ میں کسی طرف چلا جاتا ہوں، وہ مجھ کو (اچھی جگہ) پہنچا ہی دینگا،
 (چنانچہ ملک شام میں جا پہنچے، اور یہ دعا کی کہ) اے میرے رب مجھ کو ایک نیک فرزند دے، سو
 ہم نے ان کو ایک حلیم المزاج فرزند کی بشارت دی (اور وہ فرزند پیدا ہوا اور ہشیار ہوا) سو
 جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ چلنے پھرنے لگا، تو ابراہیم (علیہ السلام)
 نے (ایک خواب دیکھا کہ میں اس فرزند کو خدا کے حکم سے ذبح کر رہا ہوں، اور یہ ثابت نہیں کہ حلقوم
 کٹا ہوا بھی دیکھایا نہیں، غرض آنکھ کھلی تو اسے اللہ کا حکم سمجھ، کیونکہ انبیاء کا خواب بھی وحی ہوتا ہے
 اور اس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے۔ پھر یہ سوچ کر کہ خدا جانے میرے فرزند کی اس بارے میں کیا رائے
 ہو، اس کو اطلاع کرنا ضروری سمجھا، اس لئے اس سے) فرمایا کہ بر خوردار میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو
 (بامراہی) ذبح کر رہا ہوں، سو تم بھی سوچ لو تمھاری کیا رائے ہے؟ وہ بولے ابا جان (اس میں
 مجھ سے پوچھنے کی کیا بات ہے، جب آپ کو خدا کی طرف سے حکم کیا گیا ہے تو) آپ کو جو حکم ہوا وہی
 آپ (بلاتامل) سمجھئے، انشاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو سہارا کرنے والوں میں سے دیکھیں گے، غرض جب
 دونوں نے (خدا کے حکم کو) تسلیم کر لیا، اور باپ نے بیٹے کو (ذبح کرنے کے لئے) کر دھ پر لٹایا
 اور (چاہتے تھے کہ گلا کاٹ ڈالیں اور اس وقت) ہم نے ان کو آواز دی کہ ابراہیم (خدا با ش ہو)
 تم نے خواب کو خوب سچ کر دکھایا (یعنی خواب میں جو حکم ہوا تھا اپنی طرف سے اس پر پورا عمل کیا
 اب ہم اس حکم کو منسوخ کرتے ہیں بس ان کو چھوڑ دو، غرض ان کو چھوڑ دیا، جان کی جان بچ گئی،
 اور بلند درجات (مزید برآں عطا ہوئے) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (کہ دونوں جہاں کی
 راحت انھیں عطا کرتے ہیں) حقیقت میں یہ تھا بھی بڑا امتحان (جس کو بجز مخلص کامل کے دوسرا
 برداشت نہیں کر سکتا تو ہم نے ایسے امتحان میں پورا اترنے پر صلہ بھی بڑا بھاری دیا، اور اس
 میں جیسا امتحان ابراہیم علیہ السلام کا تھا، اسی طرح اسمعیل علیہ السلام کا بھی تھا، تو وہ صلہ میں
 شریک ہوں گے) اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا، (کہ ابراہیم علیہ السلام سے وہ
 ذبح کرایا گیا، اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات ان کے لئے رہنے دی کہ ابراہیم پر سلام ہو (چنانچہ
 ان کے نام کے ساتھ اب تک "علیہ السلام" کہا جا رہا ہے) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں،
 (کہ انہیں لوگوں کی دعاؤں اور سلامتی کی بشارتوں کا مرکز بنا دیتے ہیں) بیشک وہ ہمارے ایمان دار
 بندوں میں سے تھے اور ہم نے (ایک انعام ان پر یہ کیا کہ) ان کو اسحاق کی بشارت دی کہ نبی اور نیک بختوں
 میں ہوں گے اور ہم نے ابراہیم پر اور اسحق پر برکتیں نازل کیں (ان برکتوں میں سے ایک یہ کہ انکی نسل بہت
 پھیلی اور اس نسل میں کثرت سے انبیاء پیدا ہوئے، اور پھر آگے) ان دونوں کی نسل میں بعض اچھے
 بھی ہیں اور بعض ایسے بھی جو (بدیاں کر کے) صریح اپنا نقصان کر رہے ہیں۔

معارف و مسائل

بیٹے کی قربانی کا واقعہ | ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ کا ایک دوسرا اہم واقعہ بیان کیا گیا ہے، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے لئے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی پیش کی، واقعہ کے بنیادی اجزاء خلاصہ تفسیر سے واضح ہو جاتے ہیں، بعض تاریخی تفصیلات آیتوں کی تفسیر کے ذیل میں آجائیں گی:

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي ۖ وَادِّ ابْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كُنْ لَكَ فِي بَنِيكَ وَمِنْ بَنِيكَ ۖ قَالَ لَا يَأْتِيكَ بِهِ ۖ قَالَ لَا يَأْتِيكَ بِهِ ۖ قَالَ لَا يَأْتِيكَ بِهِ ۖ قَالَ لَا يَأْتِيكَ بِهِ ۖ

چلا جاتا ہوں، یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت ارشاد فرمائی جبکہ آپ اپنے اہل وطن یا نکل مایوس ہو گئے، اور وہاں آپ کے بھانجے حضرت لوط علیہ السلام کے سوا کوئی آپ پر ایمان نہیں لایا۔ ”رب کی طرف چلے جانے“ سے مراد یہ ہے کہ میں دارالکفر کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں کا مجھے اپنے رب کی طرف سے حکم ہوا ہے، اور جہاں میں اپنے پروردگار کی عبادت کر سکوں گا، چنانچہ آپ اپنی زوجہ مطہرہ حضرت سارہؓ اور اپنے بھانجے حضرت لوط علیہ السلام کو لے کر سفر پر روانہ ہوئے، اور عراق کے مختلف حصوں سے ہوتے ہوئے بالآخر شام تشریف لے آئے۔ اس تمام عرصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی، اس لئے آپ نے وہ دعا فرمائی جس کا اگلی آیت میں ذکر ہے، یعنی:

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ (اے میرے پروردگار! مجھے ایک نیک فرزند عطا فرما)

چنانچہ آپ کی یہ دعا قبول ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک فرزند کی پیدائش کی خوشخبری سنائی۔

فَبَشِّرْهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ (ہم نے ان کو ایک حلیم المزاج فرزند کی بشارت دی)

”حلیم المزاج“ فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ یہ نو مولود اپنی زندگی میں ایسے صبر و ضبط اور بردباری کا مظاہرہ کرے گا کہ دنیا اس کی مثال نہیں پیش کر سکتی۔ اس فرزند کی ولادت کا واقعہ یہ ہوا کہ جب حضرت سارہؓ نے یہ دیکھا کہ مجھ سے کوئی اولاد نہیں ہو رہی تو وہ سمجھیں کہ میں بانجھ ہو چکی ہوں اُدھر فرعون مصر نے حضرت سارہؓ کو اپنی بیٹی جن کا نام ہاجرہؓ تھا، خدمت گزاری کے لئے دیدی تھی، حضرت سارہؓ نے یہی ہاجرہؓ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا کر دیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے نکاح کر لیا، اپنی ہاجرہؓ کے بطن سے یہ صاحبزادے پیدا ہوئے اور ان کا نام اسمعیل (علیہ السلام) رکھا گیا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَبْنَئِي إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ (سو جب وہ فرزند ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیمؑ کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیمؑ نے فرمایا: پر خوردار میں خواب

میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تین روز متواتر دکھایا گیا (قرطبی) اور یہ بات طے شدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے، اس لئے اس خواب کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا ہے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر دو۔ یوں یہ حکم براہ راست کسی فرشتے وغیرہ کے ذریعہ بھی نازل کیا جاسکتا تھا، لیکن خواب میں دکھانے کی حکمت بظاہر یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت شعاری اپنے کمال کے ساتھ ظاہر ہو، خواب کے ذریعہ دیتے ہوئے حکم میں انسانی نفس کے لئے تاویلات کی بڑی گنجائش تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تاویلات کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے اللہ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا (تفسیر کبیر)

اس کے علاوہ یہاں باری تعالیٰ کا اصل مقصد نہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کو ذبح کرنا تھا، نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دینا کہ انھیں ذبح کر ہی ڈالو، بلکہ منشاء یہ حکم دینا تھا کہ اپنی طرف سے انھیں ذبح کرنے کے سارے سامان کر کے ان کے ذبح کا اقدام کر گزرد۔ اب یہ حکم اگر زبانی دیا جاتا تو اس میں آزمائش نہ ہوتی، اس لئے انہیں خواب میں دکھلایا کہ وہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں، اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سمجھے کہ ذبح کا حکم ہوا ہے، اور وہ پوری طرح ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے، اس طرح آزمائش بھی پوری ہو گئی، اور خواب بھی سچا ہو گیا، یہ بات زبانی حکم کے ذریعہ آتی تو آزمائش نہ ہوتی، یا حکم کو بعد میں منسوخ کرنا پڑتا۔ یہ امتحان کس قدر سخت تھا؟ اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہاں اللہ تعالیٰ نے قَلَمًا بَنَعَ مَعَ السَّحَى کے الفاظ پڑھائے ہیں، یعنی ارمانوں سے مانگے ہوئے اس بیٹے کو قربان کرنے کا حکم اس وقت دیا گیا تھا جب یہ بیٹا اپنے باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا، اور پرورش کی مشقتیں برداشت کرنے کے بعد اب وقت آیا تھا کہ وہ قوت بازو بن کر باپ کا سہارا ثابت ہو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس وقت حضرت اسمعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال تھی، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ بالغ ہو چکے تھے (تفسیر مظہری)

فَانْظُرْ مَاذَا تَأْمُرُ (سو تم بھی سوچ لو کہ تمھاری کیا رائے ہے؟) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات حضرت اسمعیل علیہ السلام سے اس لئے نہیں پوچھی کہ آپ کو حکم الہی کی تعمیل میں کوئی تردد تھا، بلکہ ایک تو وہ اپنے بیٹے کا امتحان لینا چاہتے تھے کہ وہ اس آزمائش میں کس حد تک پورا اترتا ہے؟ دوسرے انبیاء علیہم السلام کا طرز ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ احکام الہی کی اطاعت کے لئے تو ہر وقت تیار رہتے ہیں، لیکن اطاعت کے لئے ہمیشہ راستہ وہ اختیار کرتے ہیں جو حکمت اور وحی المقدور سے ہولست پر مبنی ہو۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے سے کچھ کہے بغیر

بیٹے کو ذبح کرنے لگتے، تو یہ دونوں کے لئے مشکل کا سبب ہوتا، اب یہ بات آپ نے مشورہ کے انداز میں بیٹے سے اس لئے ذکر کی کہ بیٹے کو پہلے سے اللہ کا یہ حکم معلوم ہو جائے گا تو وہ ذبح ہونے کی اذیت سہنے کے لئے پہلے سے تیار ہو سکے گا، نیز اگر بیٹے کے دل میں کچھ تذبذب ہوا بھی تو اسے سمجھایا جاسکے گا۔ (روح المعانی و بیان القرآن) لیکن وہ بیٹا بھی اللہ کے خلیل کا بیٹا تھا اور اسے خود منصب رسالت پر فائز ہونا تھا، اس نے جواب میں کہا:

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (ابا جان جس بات کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے کر گزریئے)۔ اس سے حضرت اسمعیل علیہ السلام کے بے مثال جذبہ جاں سپاری کی تو شہادت ملتی ہی ہے اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم سنی ہی میں اللہ نے انہیں کیسی ذہانت اور کیسا علم عطا فرمایا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن کے سامنے اللہ کے کسی حکم کا حوالہ نہیں دیا تھا، بلکہ محض ایک خواب کا تذکرہ فرمایا تھا، لیکن حضرت اسمعیل علیہ السلام سمجھ گئے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے، اور یہ خواب بھی درحقیقت حکم الہی کی ہی ایک شکل ہے، چنانچہ انہوں نے جواب میں خواب کے بجائے حکم الہی کا تذکرہ فرمایا۔

وحی غیر متلو کا ثبوت | یہیں سے ان منکرین حدیث کی واضح تردید ہو جاتی ہے جو وحی غیر متلو کے وجود کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ وحی صرف وہ ہے جو آسمانی کتاب میں نازل ہو گئی، اس کے علاوہ وحی کی کوئی دوسری قسم موجود نہیں، سو آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم خواب کے ذریعہ دیا گیا، اور حضرت اسمعیل علیہ السلام نے صریح الفاظ میں اسے اللہ کا حکم قرار دیا، اگر وحی غیر متلو کوئی چیز نہیں ہے تو یہ حکم کونسی آسمانی کتاب میں اُترا تھا؟ حضرت اسمعیل علیہ السلام نے اپنی طرف سے اپنے والد بزرگوار کو یہ یقین بھی دلایا کہ:-

سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ، انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے، اس جملے میں حضرت اسمعیل علیہ السلام کی غایت ادب اور غایت تواضع کو دیکھئے۔ ایک تو اِنْ شَاءَ اللَّهُ کہہ کر معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیا اور اس وعدے میں دعوے کی جو ظاہری صورت پیدا ہو سکتی تھی اسے ختم فرما دیا۔ دوسرے آپ یہ بھی فرما سکتے تھے کہ ”آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے“ لیکن اس کے بجائے آپ نے فرمایا کہ ”آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے“ جس سے اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ یہ صبر و ضبط تنہا میرا کمال نہیں، بلکہ دنیا میں اور بھی بہت سے صبر کرنے والے ہوتے ہیں، انشاء اللہ میں بھی اُن میں شامل ہو جاؤں گا۔ اس طرح آپ نے اس جملے میں فخر و تکبر، خود پسندی اور پندار کے ہر ادنیٰ شائبے کو ختم کر کے اس میں انتہا درجے کی تواضع اور انکسار کا اظہار فرما دیا (روح المعانی) اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو

کسی معاملے میں اپنے اوپر خواہ کتنا ہی اعتماد ہو، لیکن اُسے ایسے بلند بانگ دعوے نہیں کرنے چاہئیں جن سے غرور و تکبر ٹپکتا ہو، اگر کہیں ایسی کوئی بات کہنے کی ضرورت ہو تو الفاظ میں اس کی رعایت ہونی چاہئے کہ ان میں اپنے بجائے اللہ پر بھروسہ کا اظہار ہو، اور جس حد تک ممکن ہو تواضع کے دامن کو نہ چھوڑا جائے۔

فَلَمَّا أَتٰكُمَا رٰسٍ جَبَّ رُءُوسًا مَّجْهُكُمَا ۖ اَسْلَمَ ۚ مَعْنٰی ہُنَّ جُحْكُ جَانَا، مَطِيحٌ ہُو جَانَا، رَام ہُو جَانَا۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ اللہ کے حکم کے آگے جھک گئے، یعنی باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کا اور بیٹے نے ذبح ہو جانے کا ارادہ کر لیا، یہاں کُتْمَا رَجَبٌ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن اس کا جواب مذکور نہیں ہے، یعنی آگے یہ نہیں بتایا گیا کہ جب یہ واقعات پیش آچکے تو کیا ہوا؟ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ باپ بیٹے کا یہ اقدام فداکاری اس قدر عجیب و غریب تھا کہ الفاظ اس کی پوری کیفیت کو بیان کر ہی نہیں سکتے۔

بعض تاریخی اور تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے تین مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہکانیکی کوشش کی، ہر بار حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے سات کنکریاں مار کر بھگا دیا۔ آج تک منی کے تین جمرات پر اسی محبوب عمل کی یاد کنکریاں مار کر منائی جاتی ہے، بالآخر جب دونوں باپ بیٹے یہ انوکھی عبادت انجام دینے کے لئے قربان گاہ پر پہنچے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جان مجھے خوب اچھی طرح باندھ دیجئے تاکہ میں زیادہ تڑپ نہ سکوں، اور اپنے کپڑوں کو بھی مجھ سے بچائیے، ایسا نہ ہو کہ ان پر میرے خون کی چھینٹیں پڑیں، تو میرا ثواب گھٹ جائے، اس کے علاوہ میری والدہ خون دیکھیں گی تو انھیں غم زیادہ ہوگا، اور اپنی چھری بھی تیز کر لیجئے، اور اسے میرے حلق پر ذرا جلدی جلدی پھیرئیے گا، تاکہ آسانی سے میرا دم نکل سکے، کیونکہ موت بڑی سخت چیز ہے، اور جب آپ میری والدہ کے پاس جائیں تو ان سے میرا سلام کہہ دیجئے گا، اور اگر آپ میرا قیص والدہ کے پاس لے جانا چاہیں تو لے جائیں، شاید اس سے انہیں کچھ تسلی ہو۔ اکلوتے بیٹے کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ایک باپ کے دل پر کیا گزر سکتی ہے؟ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام استقامت کے پہاڑ بن کر جواب یہ دیتے ہیں کہ: ”بیٹے! تم اللہ کا حکم پورا کرنے کے لئے میرے کتنے اچھے مددگار ہو“ یہ کہہ کر انھوں نے بیٹے کو بوسہ دیا، پُرسم آنکھوں سے انھیں باندھا۔ (منہری) اور ۱۔

وَلَمَّا دَلَّ الْجَبِيْنِ (انھیں پیشانی کے بل خاک پر لٹا دیا) حضرت ابن عباسؓ سے اس کا مطلب یہ منقول ہے کہ انھیں اس طرح کر دٹ پر لٹا دیا کہ پیشانی کا ایک کنارہ زمین چھونے لگا (منہری) لغت کے اعتبار سے یہ تفسیر راجح ہے۔ اس لئے کہ جَبِيْنٌ عربی زبان میں پیشانی کی

دونوں کردٹوں کو کہتے ہیں، اور پیشانی کا درمیانی حصہ جَبْہَہ کہلاتا ہے۔ اسی لئے حکیم الامت حضرت مھاتومیؒ نے اس کا ترجمہ کردٹ پر لٹانے سے کیا ہی، لیکن بعض دوسرے حضرات مفسرین نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اوندھے منہ زمین پر لٹا دیا۔ بہر صورت تاریخی روایات میں اس طرح لٹانے کی چیز یہ بیان کی گئی ہے کہ شروع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں سیدھا لٹایا تھا، لیکن جب چھری چلانے لگے تو بار بار چلانے کے باوجود کلا کلتا نہیں تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے پتل کا ایک ٹکڑا بچ میں حائل کر دیا تھا، اس موقع پر بیٹے نے خود یہ فرمائش کی کہ ابا جان! مجھے چہرے کے بل کردٹ سے لٹا دیجئے، اس لئے کہ جب آپ کو میرا چہرہ نظر آتا ہے تو شفقتِ پدری جوش مارنے لگتی ہے، اور گھلا پوری طرح کٹ نہیں پاتا، اس کے علاوہ چھری مجھے نظر آتی ہے تو مجھے بھی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اسی طرح لٹا کر چھری چلائی شروع کی (تفسیر مظہری وغیرہ) واللہ اعلم

وَقَدْ يَنْشَأُ ابْنُ آدَمَ بُرْهَانًا مُّهِمًّا قَدْ صَدَّقَتِ الرُّعَايَا (اور ہم نے انھیں آواز دی کہ اے ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا) یعنی اللہ کے حکم کی تعمیل میں جو کام تمھارے کرنے کا تھا اس میں تم نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ (خواب میں بھی غالباً صرف یہی دکھایا گیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام انھیں ذبح کرنے کے لئے چھری چلا رہے ہیں) اب یہ آزمائش پوری ہو چکی اس لئے اب انہیں چھوڑ دو۔

إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں) یعنی جب کوئی اللہ کا بندہ اللہ کے حکم کے آگے تسلیمِ خم کر کے اپنے تمام جذبات کو قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، تو ہم بالآخر اسے دنیوی تکلیف سے بھی بچا لیتے ہیں، اور آخرت کا اجر و ثواب بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھ دیتے ہیں۔

وَقَدْ يَنْشَأُ بَيْنَهُ عَظِيمٌ (اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا) روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ آسمانی آواز سن کر اوپر کی طرف دیکھا تو حضرت جبریل علیہ السلام ایک مینڈھا لے کھڑے تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی مینڈھا تھا جس کی قربانی حضرت آدم علیہ السلام کے صاحبزادے ہابیلؑ نے پیش کی تھی۔ واللہ اعلم بہر حال یہ جتنی مینڈھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوا، اور انھوں نے اللہ کے حکم سے اپنے بیٹے کے بجائے اس کو قربان کیا۔ اس ذبیحہ کو عظیم اس لئے کہا گیا کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا تھا اور اس کی قربانی کے مقبول ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر مظہری وغیرہ)

ذیح حضرت اسمعیلؑ اور آیات کی تفسیر تسلیم کرتے ہوئے کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو
تھے یا حضرت اسحقؑ جس بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ حضرت اسمعیل علیہ السلام تھے،

لیکن درحقیقت اس معاملہ میں مفسرین اور مؤرخین کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔
حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عباسؓ، حضرت ابن عباسؓ، کعب
الاحبارؓ، سعید بن جبیرؓ، قتادہؓ، مسروقؓ، عکرمہؓ، عطاءؓ، مقاتلؓ، زہریؓ اور سدیؓ سے منقول ہے
کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحقؑ علیہ السلام تھے، اس کے برخلاف حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ
حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابوالطفیلؓ، سعید بن المسیبؓ، سعید بن جبیرؓ
حسن بصریؓ، مجاہدؓ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ، شعبیؓ، محمد بن کعب قرظیؓ اور دوسرے بہت سے
تابعین سے منقول ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسمعیل علیہ السلام تھے۔

بعد کے مفسرین میں سے حافظ ابن جریر طبریؒ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، اور حافظ
ابن کثیرؒ وغیرہ نے دوسرے قول کو اختیار کر کے پہلے قول کی سختی کے ساتھ تردید فرمائی ہے یہاں
فریقین کے دلائل پر مکمل تبصرہ ممکن نہیں، تاہم قرآن کریم کے اسلوب بیان اور روایات کی
قوت کے لحاظ سے راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن صاحبزادے
کے ذبح کا حکم دیا گیا وہ حضرت اسمعیل علیہ السلام تھے، اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں :-
(۱) قرآن کریم نے بیٹے کی قربانی کا پورا واقعہ نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ وَبَشِّرْهُ
بِاسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ (اور ہم نے ان کو اسحقؑ کی بشارت دی کہ نبی اور نیک لوگوں
میں سے ہوں گے)، اس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا وہ
حضرت اسحقؑ علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور تھے، اور حضرت اسحقؑ علیہ السلام کی بشارت انکی
قربانی کے واقعہ کے بعد دی گئی۔

(۲) حضرت اسحقؑ علیہ السلام کی اسی بشارت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت اسحقؑ
علیہ السلام نبی ہوں گے، اس کے علاوہ ایک دوسری آیت میں مذکور ہے، کہ حضرت اسحقؑ کی
پیدائش کے ساتھ یہ بشارت بھی دیدی گئی تھی کہ ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام پیدا
ہوں گے، (فَبَشِّرْهُنَّ أَهْلًا بِاسْحَاقَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ يُعْقُوبُ) اس کا صاف مطلب یہ
تھا کہ وہ بڑی عمر تک زندہ رہیں گے، یہاں تک کہ صاحب اولاد ہوں گے، پھر انہی کو بچپن میں
ذبح کرنے کا حکم کیونکر دیا جاسکتا تھا، اور اگر انہی کو بچپن میں نبوت سے قبل ذبح کرنے کا حکم
دیا جاتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ جاتے کہ انہیں تو ابھی نبوت کے منصب پر فائز ہونا ہے
اور ان کی صلب سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش مقدر ہے، اس لئے ذبح کرنے

سے انھیں موت نہیں آسکتی ظاہر ہے کہ اس صورت میں نہ یہ کوئی بڑا امتحان ہوتا، اور نہ حضرت ابراہیمؑ اس کی انجام دہی میں کسی تعریف کے مستحق ہوتے، امتحان تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پوری طرح یہ سمجھے ہوئے ہوں کہ میرا یہ بیٹا ذبح کرنے سے ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد وہ ذبح کرنے کا اقدام کریں۔ حضرت اسمعیل علیہ السلام کے معاملہ میں یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے زندہ رہنے اور نبی بننے کی کوئی بیشک کوئی نہیں فرمائی تھی۔

(۳) قرآن کریم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پہلا بیٹہ تھا، اس لئے کہ انھوں نے اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت ایک بیٹے کی دعا کی تھی، اسی دعا کے جواب میں انھیں یہ بشارت دی گئی کہ ان کے یہاں ایک حلیم لڑکا پیدا ہوگا، اور پھر اسی لڑکے کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ جب وہ باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو اسے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ سارا سلسلہ واقعات بتا رہا ہے کہ وہ لڑکا حضرت ابراہیمؑ کا پہلا بیٹا تھا، ادھر یہ بات متفق علیہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلے صاحبزادے حضرت اسمعیل علیہ السلام ہیں، اور حضرت اسحق علیہ السلام ان کے دوسرے صاحبزادے ہیں، اس کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ ذبح حضرت اسمعیل علیہ السلام ہی تھے۔

(۴) یہ بات بھی تقریباً طے شدہ ہے کہ بیٹے کی قربانی کا یہ واقعہ مکہ مکرمہ کے آس پاس پیش آیا ہے، اسی لئے اہل عرب میں برابر حج کے دوران قربانی کا طریقہ رائج رہا ہے، اس کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے کے فدیہ میں جو مینڈھا جنت سے بھیجا گیا اس کے سینک سالہا سال تک کعبہ شریف کے اندر لٹکے رہے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس کی تائید میں کئی روایتیں نقل کی ہیں، اور حضرت عامر شعبیؒ کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ: ”میں نے اس مینڈھے کے سینک کعبہ میں خود دیکھے ہیں“ (ابن کثیر، ص ۸ ج ۴) اور حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں کہ ”اس مینڈھے کے سینک مسلسل کعبہ میں لٹکے رہے، یہاں تک کہ جب حجاج بن یوسف کے زمانہ میں کعبہ اللہ میں آتش زدگی ہوئی تو یہ سینک بھی جل گئے“ (ایضاً، ص ۱۲ ج ۲) اب ظاہر ہے کہ مکہ مکرمہ میں حضرت اسمعیل علیہ السلام تشریف فرما رہے ہیں، نہ کہ حضرت اسحق علیہ السلام اس لئے صاف ظاہر ہے کہ ذبح کا حکم حضرت اسمعیل علیہ السلام ہی سے متعلق تھا، نہ کہ حضرت اسحق علیہ السلام سے۔

رہیں وہ روایات جن میں مختلف صحابہؓ و تابعینؓ کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے ذبح حضرت اسحق علیہ السلام کو قرار دیا، سو ان کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے

لکھا ہے کہ :-

اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن بظاہر یہ سارے اقوال کعب الاحبار سے ماخوذ ہیں، اس لئے کہ جب وہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسلام لائے تو حضرت عمرؓ کو اپنی پرانی کتابوں کی باتیں سننے لگے، بعض اوقات حضرت عمرؓ ان کی باتیں سن لیتے تھے، اس سے اور لوگوں کو بھی گنجائش ملی، اور انھوں نے بھی ان کی روایات سن کر انھیں نقل کرنا شروع کر دیا، ان روایات میں ہر طرح کی رطب و یابس باتیں جمع تھیں، اور اس امت کو ان باتوں میں سے ایک حرف کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

(تفسیر ابن کثیر، ص ۱۷ ج ۱۲)

حافظ ابن کثیرؒ کی یہ بات بہت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ حضرت اسحق علیہ السلام کو ذبیح قرار دینے کی بنیاد اسرائیلی روایات ہی پر ہے، اسی لئے یہود و نصاریٰ حضرت اسمعیل علیہ السلام کے بجائے حضرت اسحق علیہ السلام کو ذبیح قرار دیتے ہیں، موجودہ بائبل میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

”ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابراہیم کو آزمایا اور اسے کہا اے ابراہیم: اس نے کہا میں حاضر ہوں، تب اس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے اسحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑ میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔“

(پیدائش ۲۲: ۱۷)

اس میں ذبیح کا واقعہ حضرت اسحق علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن اگر انصاف سے اور تحقیق سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں یہودیوں نے اپنے روایتی تعصب سے کام لے کر توہرات کی عبارت میں تحریف کا ارتکاب کیا ہے، اس لئے کہ کتاب پیدائش کی مذکورہ عبارت ہی میں ”جو تیرا اکلوتا ہے“ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو جس بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا، اسی باب میں آگے چل کر پھر لکھا ہے کہ :-

”تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا۔“ (پیدائش ۲۲: ۱۲)

اس جملے میں بھی یہ تصریح موجود ہے کہ وہ بیٹا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اکلوتا تھا، ادھر یہ بات طے شدہ ہے کہ حضرت اسحق علیہ السلام ان کے اکلوتے بیٹے نہ تھے، اگر ”اکلوتے“ کا اطلاق کسی پر ہو سکتا ہے تو وہ صرف حضرت اسمعیل علیہ السلام ہیں، خود کتاب پیدائش ہی کی دوسری کئی عبارتیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کی پیدائش حضرت اسحق علیہ السلام

سے بہت پہلے ہو چکی تھی، ملاحظہ فرمائیے:-

”اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی، اس کی ایک مصری لونڈی تھی، جس کا نام ہاجرہ تھا، اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی... اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا، اس کا نام اسمعیل رکھنا۔ اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسمعیل پیدا ہوا تب ابرام چھپاسی برس کا تھا“
(پیدائش باب ۱۶ آیات ۳ و ۴ و ۱۶)

نیز اگلے باب میں لکھا ہے:

”اور خدا نے ابرام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے۔ اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا... تب ابرام سرنگوں ہوا اور ہنس کر دل میں کہنے لگا کہ کیا تو برس کے بڑھے سے کوئی بچہ ہوگا، اور کیا سارہ کے جو نوے برس کی ہے اولاد ہوگی؟ اور ابرام نے خدا سے کہا کہ کاش! اسمعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے، تب خدا نے فرمایا کہ بیشک تیری بیوی سارہ کے تجھ سے بیٹا ہوگا، تو اس کا نام اسحاق رکھنا“ (پیدائش ۱۷: ۱۵ تا ۲۰)

اس کے بعد حضرت اسحق علیہ السلام کی پیدائش کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے:

”اور جب اس کا بیٹا اسحاق اس سے پیدا ہوا تو ابرام تلوہ برس کا تھا“ (پیدائش ۲۱)

ان عبارتوں سے صاف واضح ہے کہ حضرت اسحق علیہ السلام حضرت اسمعیل علیہ السلام سے چودہ سال چھوٹے تھے، اور اس چودہ سال کے عرصہ میں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اکلوتے بیٹے تھے، اس کے برعکس حضرت اسحق علیہ السلام پر ایسا کوئی وقت نہیں گذرا، جس میں وہ اپنی والدہ کے اکلوتے ہوں، اب اس کے بعد جب کتاب پیدائش کے بابیسویں باب میں بیٹے کی قربانی کا ذکر آتا ہے، تو اس میں ”اکھوتا“ کا لفظ صاف شہادت دے رہا ہے کہ اس سے مراد اسمعیل علیہ السلام ہیں اور کسی یہودی نے اس کے ساتھ ”اسحاق“ کا لفظ محض اس لئے بڑھا دیا کہ تاکہ یہ فضیلت بنو اسمعیل کے بجائے بنو اسحق کو حاصل ہو۔

اس کے علاوہ بائبل کی اسی کتاب پیدائش میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحق علیہ السلام کی پیدائش کی خوش خبری دی گئی ہے وہاں یہ بھی مذکور ہے کہ:-
”یقیناً میں اسے (یعنی حضرت اسحق) کو برکت دوں گا کہ قو میں اس کی نسل سے ہوں گی“ (پیدائش ۱۸: ۱۰)

اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کے بارے میں اس کی پیدائش سے پہلے ہی یہ خبر دی جا چکی ہو کہ وہ صاحب اولاد ہوگا، اور قو میں اس کی نسل سے ہوں گی، اس کو قربان کرنے کا حکم

کیسے دیا جاسکتا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم حضرت اسحق علیہ السلام سے متعلق نہیں تھا، بلکہ حضرت اسمعیل علیہ السلام سے متعلق تھا۔

بائبل کی ان عبارتوں کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ ابن کثیرؒ کا یہ خیال کس قدر صحیح ہے کہ:-

”یہودیوں کی کتب مقدسہ میں تصریح ہے کہ جب اسمعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیالیس سال تھی، اور جب اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی عمر تسو سال تھی، اور انہی کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے اکلوتے بیٹے کے ذبح کا حکم دیا تھا، اور ایک اور نسخہ میں ”اکلوتے“ کے بجائے ”پہلوٹھے“ کا لفظ ہے، پس یہودیوں نے یہاں ”اسحق“ کا لفظ اپنی طرف سے بہتاناً بڑھا دیا، اور اس کو درست قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے، کیونکہ یہ خود ان کی کتابوں کی تصریحات کے خلاف، اور یہ لفظ انھوں نے اس لئے بڑھایا کہ حضرت اسحق علیہ السلام اُن کے جدا محب ہیں، اور حضرت اسمعیل علیہ السلام عربوں کے، پس یہودیوں نے حسد کی وجہ سے یہ لفظ بڑھا دیا، اور اب ”اکلوتے“ کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ وہ بیٹا جس کے سوا اس وقت کوئی اور تھا کہ اسے پاس موجود نہیں ہے، کیونکہ حضرت اسمعیل علیہ السلام اور اُن کی والدہ اس وقت وہاں نہیں تھیں، اس لئے حضرت اسحقؑ کو اس معنی میں اکلوتا کہا جاسکتا ہے، لیکن یہ بالکل غلط تاویل ہے اور باطل تحریف ہے، اس لئے کہ اکلوتا اس بیٹے کو کہتے ہیں جس کے باپ کا اُس کے سوا کوئی بیٹا

نہ ہو“ (تفسیر ابن کثیر، ص ۱۱۲ ج ۲)

حافظ ابن کثیرؒ ہی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ علماء یہود میں سے ایک شخص حضرت عمر بن العزیزؒ کے زمانے میں مسلمان ہو گیا تھا، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس سے پوچھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں میں سے کون سے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا؟ تو اس نے کہا کہ ”خدا کی قسم! امیر المؤمنین! وہ اسمعیل علیہ السلام تھے، یہودی اس بات کو خوب جانتے ہیں، لیکن وہ آپ عرب لوگوں سے حسد کی وجہ سے ایسا کہتے ہیں“ (ص ۱۸ ج ۲)

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ ذبح حضرت اسمعیل علیہ السلام

ہی تھے۔ واللہ سبحانہ اعلم

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ (ان دونوں کی نسل میں بعض اچھے

بھی ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو صریح اپنا نقصان کر رہے ہیں، اس آیت کے ذریعہ یہودیوں کے اس زعم باطل کی تردید کر دی گئی ہے کہ ان حضرات انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں سے ہونا ہی انسان کی فضیلت اور نجات کے لئے کافی ہے۔ اس آیت نے وضاحت کے ساتھ بتا دیا کہ کسی نیک انسان کے نسب سے تعلق نجات کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کا اصل مدار انسان کے اپنے عقائد اور اعمال پر ہے۔

وَلَقَدْ مَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿١١٤﴾ وَنَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ

اور ہم نے احسان کیا موسیٰ اور ہارون پر، اور بچا دیا ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو

الْكُرْبِ الْعَظِيمِ ﴿١١٥﴾ وَنَصَرْنَاهُمْ فَكَانُوا أَهْلَ الْغَلِبِ ﴿١١٦﴾ وَآتَيْنَاهُمَا

اس بڑی گھبراہٹ سے، اور ان کی ہم نے مدد کی تو رہے وہی غالب۔ اور ہم نے دی انکو

الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ ﴿١١٧﴾ وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿١١٨﴾ وَتَرَكْنَا

کتاب واضح، اور بچھائی ان کو سیدھی راہ، اور باقی رکھا

عَلَيْهِمَا فِي الْآخِرِينَ ﴿١١٩﴾ سَلَّمَ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿١٢٠﴾ إِنَّا كَذَبْنَاكَ

ان پر پچھلے لوگوں میں، کہ سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر۔ ہم یوں دیتے ہیں

فَنَجِّرِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٢١﴾ إِنَّهُمْ مِمَّا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٢٢﴾

بدلہ لیکر کرنے والوں کو۔ تحقیق وہ دونوں ہیں ہمارے ایماندار بندوں میں۔

خُلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پر بھی احسان کیا کہ ان کو نبوت اور دیگر کمالات عطا فرمائے، اور ہم نے ان دونوں کو اور ان کی قوم (یعنی بنی اسرائیل) کو بڑے غم سے (یعنی فرعون کی جانب سے پہنچائی جانے والی تکالیف سے) نجات دی اور ہم نے ان سب کی (فرعون کے مقابلے میں) مدد کی، سو (آخر میں) یہی لوگ غالب آ گئے کہ فرعون کو غرق کر دیا گیا، اور یہ صاحب حکومت ہو گئے، اور ہم نے (فرعون کے غرق ہونے کے بعد) ان دونوں (صاحبوں) کو (یعنی موسیٰ علیہ السلام کو اصالۃ اور ہارون علیہ السلام کو تبعاً) واضح کتاب دی (مراد تورات ہے) کہ اس میں احکام واضح طور پر مذکور تھے، اور ہم نے ان کو سیدھے رستہ پر قائم رکھا، (جس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انھیں نبی معصوم بنایا) اور ہم نے ان دونوں کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں

رمدت ہائے دراز کے لئے) یہ بات رہنے دی کہ موسیٰ اور ہارون پر سلام چنانچہ دونوں حضرات کے ناموں کے ساتھ آج تک علیہ السلام کہا جاتا ہے، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں، (کہ ان کو ثناء اور وعار کا مستحق بنا دیتے ہیں) بیشک وہ دونوں ہمارے (کامل) ایمان واربندوں میں سے تھے (اس لئے صلہ بھی کامل عطا ہوا)۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں تیسرا واقعہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا بیان کیا گیا ہے یہ واقعہ متعدد مقامات پر تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے، یہاں اس کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے، اور اسے ذکر کرنے سے اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخلص اور اطاعت شعار بندوں کی کس طرح مدد فرماتے ہیں، اور انھیں کیسے کیسے انعامات سے نوازتے ہیں۔ چنانچہ یہاں حضرت موسیٰ و ہارون پر اپنے انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے، انعامات کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک مثبت انعامات، یعنی فائدے پہنچانا، وَتَقَدَّرَ مَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ میں اسی قسم کے انعامات کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے منفی انعامات، یعنی نقصان سے بچانا، اگلی آیات میں اسی قسم کی تفصیل ہے۔ آیات کا مفہوم خلاصہ تفسیر سے واضح ہو جاتا ہے۔

وَأَنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۖ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَالَتَقُونَ ۙ

اور تحقیق الیاس ہے رسولوں میں۔ جب اس نے کہا اپنی قوم کو کیا تم کو ڈر نہیں،

أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ۙ اللَّهُ رَبُّكُمْ

کیا تم بھارتے ہو بعل کو اور چھوڑتے ہو بہتر بنانے والے کو۔ جو اللہ ہے رب تمہارا

وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ۙ فَكَذَّبُوا بِوُجْهِهِمْ لَمَحْضُرُونَ ۙ

اور رب تمہارے اگلے باپ دادوں کا، پھر اس کو جھٹلایا سودہ آنے والے ہیں پھڑے ہوئے،

إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۙ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۙ

مگر جو بندے ہیں اللہ کے چنے ہوئے۔ اور باقی رکھا ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں کہ

سَلَّمَ عَلَىٰ آلِ يَاسِينَ ۙ إِنَّا كَذَلِكْ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۙ

سلام ہے الیاس پر۔ ہم یوں دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو۔

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ (۱۳۲)

وہ ہر ہمارے ایمان دار بندوں میں۔

خُلاصۂ تفسیر

اور الیاس علیہ السلام ابھی ربی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے تھے ان کا اس وقت کا واقعہ ذکر کیجئے جبکہ انھوں نے اپنی قوم ربی اسرائیل سے دیکھ وہ بہت پرستی میں مبتلا تھی، فرمایا کہ کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ کیا تم بعل کو جو ایک بہت کا نام تھا، پوجتے ہو اور اس کی عبادت کو چھوڑ بیٹھے ہو جو سب سے بڑھ کر بنانے والا ہے کیونکہ اور لوگ تو صرف بعض اشیاء کی تحلیل و ترکیب پر قدرت رکھتے ہیں اور وہ بھی عارضی، اور وہ تمام اشیاء کو عدم سے وجود میں لانے پر قدرت ذاتی رکھتا ہے، پھر کوئی دوسرا جان نہیں ڈال سکتا اور وہ جان ڈالتا ہے اور وہ (معبود برحق ہے) اور تمھارا بھی رب ہے اور تمھارے اگلے باپ دادوں کا بھی رب ہے، سو ان لوگوں نے اس توحید کے دعوے میں، اُن کو جھٹلایا، سو اس جھٹلانے کی شامت میں، وہ لوگ (عذابِ آخرت میں) پکڑے جاویں گے، مگر جو اللہ کے خاص بندے (یعنی ایمان والے) تھے (وہ ثواب و اجر میں ہوں گے) اور ہم نے الیاس کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں (مدد ہمارے دراز کے لئے) یہ بات رہنے دی کہ الیاسین پر دیکھ یہ بھی الیاس علیہ السلام کا نام ہے، سلام ہو، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں کہ ان کو ثناء اور دعا کا مستحق بناتے ہیں، بیشک وہ ہمارے (کامل) ایمان دار بندوں میں سے تھے۔

معارف و مسائل

حضرت الیاس | ان آیات میں چوتھا واقعہ حضرت الیاس علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے۔ آیات کی علیہ السلام | تفسیر سے قبل حضرت الیاس علیہ السلام سے متعلق چند معلومات درج ذیل ہیں:-
قرآن کریم میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر صرف دو مقامات پر آیا ہے، ایک سورۃ انعام میں اور دوسرے سورۃ صافات کی اپنی آیتوں میں۔ سورۃ انعام میں تو صرف انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں آپ کا اسم گرامی شمار کر دیا گیا ہے اور کوئی واقعہ مذکور نہیں، البتہ یہاں نہایت اختصار کے ساتھ آپ کی دعوت و تبلیغ کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے۔

چونکہ قرآن کریم میں حضرت الیاس علیہ السلام کے حالات تفصیل سے مذکور نہیں ہیں،

اور نہ مستند احادیث میں آپ کے حالات آئے ہیں، اس لئے آپ کے بارے میں کتب تفسیر کے اندر مختلف اقوال اور متفرق روایات ملتی ہیں، جن میں سے بیشتر بنی اسرائیل کی روایات سے ماخوذ ہیں۔

مفسرین میں سے ایک مختصر گروہ کا کہنا یہ ہے کہ "الیاس" حضرت ادریس علیہ السلام ہی کا دوسرا نام ہے، اور ان دونوں شخصیتوں میں کوئی تفرق نہیں ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ (ص ۲۸۵، ۲۸۶ ج ۵) لیکن محققین نے ان اقوال کی تردید کی ہے۔ قرآن کریم نے بھی حضرت ادریس اور حضرت الیاس علیہما السلام کا اس طرح جدا جدا تذکرہ فرمایا ہے، کہ دونوں کو ایک قرار دینے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی، اس لئے حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں صحیح اسی کو قرار دیا ہے کہ دونوں الگ الگ رسول ہیں (البدایہ والنہایہ، ص ۳۳۹ ج ۱)

بخت کا زمانہ | قرآن وحدیث سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ حضرت الیاس علیہ السلام کب اور کہاں اور مقام | مبعوث ہوئے تھے؛ لیکن تاریخی اور اسرائیلی روایات اس بات پر تقریباً متفق ہیں کہ آپ حضرت حزقیل علیہ السلام کے بعد اور حضرت یسوع علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے جانشینوں کی بدکاری کی وجہ سے بنی اسرائیل کی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی تھی، ایک حصہ یہوداہ یا یہودیہ کہلاتا تھا، اور اس کا مرکز بیت المقدس تھا، اور دوسرا حصہ اسرائیل کہلاتا تھا اور اس کا پایہ تخت سامرہ (موجودہ نابلس) تھا۔ حضرت الیاس علیہ السلام اردن کے علاقہ جلعاد میں پیدا ہوئے تھے، اُس وقت اسرائیل کے ملک میں جو بادشاہ حکمران تھا اس کا نام بائبل میں اخیا آب اور عربی تواریخ و تفاسیر میں اجب یا اخب مذکور ہے۔ اس کی بیوی ایزبل، بعل نامی ایک بت کی پرستار تھی، اور اسی نے اسرائیل میں بعل کے نام پر ایک بڑی قربان گاہ تعمیر کر کے تمام بنو اسرائیل کو بت پرستی کے ہت پر لگا دیا تھا۔ حضرت الیاس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ اس خطے میں جا کر توحید کی تعلیم دیں، اور اسرائیلیوں کو بت پرستی سے روکیں (ملاحظہ ہو تفسیر ابن جریر ص ۵۳، ج ۲۳ و ابن کثیر ص ۱۹ ج ۴ و تفسیر منہرجی ص ۱۳۴ ج ۸ اور بائبل کی کتاب سلاطین اول ۱: ۱۶ تا ۲۹ ج ۳۳ و ۱: ۱۱)

قوم کے ساتھ کشمکش | دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت الیاس علیہ السلام کو بھی اپنی قوم کے ساتھ شدید کشمکش دوچار ہونا پڑا۔ قرآن کریم چونکہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے، اس لئے اس نے اس کشمکش کا مفصل حال بیان کرنے کے بجائے صرف اتنی بات بیان فرمائی ہے جو عبرت و موعظت حاصل کرنے کے لئے ضروری تھی، یعنی یہ کہ ان کی قوم نے اُن کو جھٹلایا اور چند مخلص بندوں کے سوا کسی نے حضرت الیاس

علیہ السلام کی بات نہ مانی، اس لئے آخرت میں انہیں ہولناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔
 بعض مفسرین نے یہاں اس کشمکش کے مفصل حالات بیان فرمائے ہیں، مروجہ تفاسیر میں
 حضرت الیاس علیہ السلام کا سب سے بسوط تذکرہ تفسیر مظہری میں علامہ بغویؒ کے حوالہ سے کیا گیا ہے، اس
 میں جو واقعات مذکور ہیں وہ تقریباً تمام تر بائبل سے ماخوذ ہیں، دوسری تفسیروں میں بھی ان واقعات
 کے بعض اجزاء حضرت وہاب بن منبہؒ اور کعب الاحبارؒ وغیرہ کے حوالہ سے بیان ہوئے ہیں جو اکثر
 اسرائیلی روایات نقل کرتے ہیں۔

ان تمام روایات سے خلاصہ کے طور پر جو قدر مشترک نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام
 نے اسرائیل کے بادشاہ اخی اب اور اس کی رعایا کو بعل نامی بت کی پرستش سے روک کر توحید کی دعوت
 دی، مگر دو ایک حق پسند افراد کے سوا کسی نے آپ کی بات نہیں مانی، بلکہ آپ کو طرح طرح پریشان
 کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ اخی اب اور اس کی بیوی ایزبل نے آپ کو شہید کرنے کے منصوبے
 بنائے۔ آپ نے ایک دو راقنادہ غار میں پناہ لی، اور عرصہ دراز تک وہیں مقیم رہے، اس کے بعد
 آپ نے دعا فرمائی کہ اسرائیل کے لوگ قحط سالی کا شکار ہو جائیں، تاکہ اس قحط سالی کو دور کرنے
 کے لئے آپ ان کو معجزات دکھائیں تو شاید وہ ایمان لے آئیں، چنانچہ انہیں شدید قحط میں
 مبتلا کر دیا گیا۔

اس کے بعد حضرت الیاس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اخی اب سے ملے، اور اس سے
 کہا کہ یہ عذاب اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے ہے، اور اگر تم اب بھی باز آ جاؤ تو یہ عذاب دور ہو سکتا
 ہے۔ میری سچائی کے امتحان کا بھی یہ بہترین موقع ہے، تم کہتے ہو کہ اسرائیل میں تمہارے معبود بعل
 کے ساڑھے چار سونے ہیں، تم ایک دن ان سب کو میرے سامنے جمع کر لو، وہ بعل کے نام پر قربانی
 پیش کریں، اور میں اللہ کے نام پر قربانی کر دوں گا، جس کی قربانی کو آسمانی آگ آ کر بھسم کر دے گی،
 اس کا دین سچا ہوگا، سب سے اس تجویز کو خوشی سے مان لیا۔

چنانچہ کوہ کرمل کے مقام پر یہ اجتماع ہوا، بعل کے جھوٹے نبیوں نے اپنی قربانی پیش کی،
 اور صبح سے دوپہر تک بعل سے التجائیں کرتے رہے، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اس کے بعد حضرت
 الیاس علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی، اس پر آسمان سے آگ نازل ہوئی، اور اس نے حضرت
 الیاس علیہ السلام کی قربانی کو بھسم کر دیا، یہ دیکھ کر بہت سے لوگ سجدے میں گر گئے، اور ان پر
 حق واضح ہو گیا، لیکن بعل کے جھوٹے نبی اب بھی نہ مانے، اس لئے حضرت الیاس علیہ السلام نے
 ان کو وادی قیشون میں قتل کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد موسیٰؑ اور ہارونؑ بارش بھی ہوئی، اور پورا خطہ پانی سے ہنال ہو گیا، لیکن

اخی آب کی بیوی ایزبل کی اب بھی آنکھ نہ کھلی، وہ حضرت الیاس علیہ السلام پر ایمان لانے کے بجائے اٹلی ان کی دشمن ہو گئی، اور اس نے آپ کو قتل کرانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ حضرت الیاس علیہ السلام یہ سنکر پھر سامریہ سے روپوش ہو گئے، اور کچھ عرصہ کے بعد بنی اسرائیل کے دوسرے ملک یہود میں تبلیغ شروع کر دی، کیونکہ رفتہ رفتہ بعل پرستی کی دبا دہاں بھی پھیل چکی تھی۔ وہاں کے بادشاہ بہرام نے بھی آپ کی بات نہ سنی، یہاں تک کہ وہ حضرت الیاس علیہ السلام کی پیشینگوئی کے متعلق تباہ و برباد ہوا چند سال بعد آپ دوبارہ اسرائیل تشریف لائے اور یہاں پھر اخی آب اور اس کے بیٹے اخزیاہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی، مگر وہ بدستور اپنی بد اعمالیوں میں مبتلا رہے، یہاں تک کہ انھیں بیرونی حملوں اور مہلک بیماریوں کا شکار بنا دیا گیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو واپس بلا لیا۔

کیا حضرت الیاس علیہ السلام | مؤرخین اور مفسرین کے درمیان یہاں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہے کہ
حیات ہیں؟ حضرت الیاس علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا چکے؟ تفسیر مظہری

میں علامہ بغویؒ کے حوالہ سے جو طویل روایت بیان کی گئی ہے اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کو ایک آتشیں گھوڑے پر سوار کر کے آسمان کی طرف اٹھالیا گیا تھا، اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح زندہ ہیں (مظہری ص ۱۴۱ ج ۸) علامہ سیوطیؒ نے بھی ابن عساکرؒ اور حاکمؒ وغیرہ کے حوالہ سے کئی روایات ایسی نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ کعب الاحبارؒ سے منقول ہے کہ چار انبیاء علیہم السلام اب تک زندہ ہیں، دوزین میں، حضرت خضرؒ اور حضرت ایوبؒ اور دو آسمان میں، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت ادریس علیہم السلام، (درنثور، ص ۱۲۸، ۱۲۹ ج ۲) یہاں تک کہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت خضر اور حضرت الیاس علیہما السلام ہر سال رمضان کے مہینہ میں بیت المقدس میں جمع ہوتے ہیں، اور روزے رکھتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی، ص ۱۶ ج ۱۵)

لیکن حافظ ابن کثیرؒ جیسے محقق علماء نے ان روایات کو صحیح قرار نہیں دیا، وہ ان جیسی روایتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:-

”یہ ان اسرائیلی روایتوں میں سے ہے جن کی نہ تصدیق کی جاتی ہے نہ تکذیب، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کی صحت بعید ہے“

وہومن الاسلئیات التي لا تصدق ولا تكذب بل الظاهر أن صحتها بعيدة، (البدایہ والنہایہ، ص ۳۳۸ ج ۱)

نیز فرماتے ہیں:-

”ابن عساکر نے کئی روایتیں ان لوگوں کی نقل کی ہیں جو حضرت الیاس علیہ السلام سے ملے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی قابل اطمینان نہیں، یا تو اس لئے کہ ان کی

سند ضعیف ہی، یا اس لئے کہ جن اشخاص کی طرف یہ واقعات منسوب کئے گئے ہیں وہ

بمحول ہیں۔ (البدایۃ والنہایۃ، ص ۳۳۹ ج ۱)

ظاہر یہی ہے کہ حضرت ایاس علیہ السلام کے رفیع آسمانی کا نظریہ اسرائیلی روایات ہی سے ماخوذ ہے، بائبل میں لکھا ہے کہ:-

”اور وہ آگے چلتے اور باتیں کرتے جاتے تھے کہ دیکھو ایک آتشیں رتھ اور آتشیں گھوڑوں

ان دونوں کو جدا کر دیا اور ایلیاہ بگولے میں آسمان پر چلا گیا۔“ (۲۔ سلاطین ۱۱: ۲)

اسی وجہ سے یہودیوں میں یہ عقیدہ پیدا ہوا تھا کہ حضرت ایاس علیہ السلام دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے، چنانچہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو انھوں نے ان پر ایاس علیہ السلام ہونے کا شبہ ظاہر کیا۔ انجیل یوحنا میں ہے:

”انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اُس نے کہا میں نہیں ہوں۔“

(یوحنا ۱: ۲۱)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کعب الاحبار اور وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے جو اہل کتاب کے علوم کے ماہر تھے، یہی روایتیں مسلمانوں کے سامنے بیان کی ہوں گی جن سے حضرت ایاس علیہ السلام کی زندگی کا نظریہ بعض مسلمانوں میں بھی پھیل گیا، ورنہ قرآن یا حدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے، جس سے حضرت ایاس علیہ السلام کی زندگی یا آپ کا آسمان پر اٹھایا جانا ثابت ہوتا ہو، صرف ایک روایت مستدرک حاکم میں ملتی ہے، جس میں مذکور ہے کہ تبوک کے راستے میں آنحضرت صلی علیہ وسلم کی ملاقات حضرت ایاس علیہ السلام سے ہوئی۔ لیکن یہ روایت بتصریح محدثین موضوع ہے، حافظ ذہبی فرماتے ہیں:-

بل هو موضوع قبح الله من

وضعه وما كنت احب ولا

أجوز أن المجمل يبلغ بالحكم

إلى أن يصح هذا

(در منثور، ص ۲۸۶ ج ۵)

بلکہ یہ حدیث موضوع ہے، خدا پر کرے

اس شخص کا جس نے یہ حدیث وضع کی،

اس سے پہلے میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ

امام حاکم کی بخبری اس حد تک پہنچ سکتی ہو

کہ وہ اس حدیث کو صحیح قرار دیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت ایاس علیہ السلام کا زندہ ہونا کسی معتبر اسلامی روایت سے ثابت نہیں ہے۔ لہذا اس معاملے میں سلامتی کی راہ یہ ہے کہ اس میں سکوت اختیار کیا جائے اور

۱۔ واضح رہے کہ بائبل میں حضرت ایاس علیہ السلام کا نام ایلیاہ مذکور ہے۔

اسرائیلی روایات کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کیا جائے کہ ”نہ اُن کی تصدیق کرو نہ تکذیب“ کیونکہ قرآن کریم کی تفسیر اور عبرت و موعظت کا مقصد اس کے بغیر بھی پوری طرح حاصل ہو جاتا ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم، اب آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے:-

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا، دیکھو تم بعل کو پوجتے ہو! بعل کے لغوی معنی شوہر اور مالک وغیرہ ہیں لیکن یہ اُس بت کا نام تھا جسے حضرت الیاس علیہ السلام کی قوم نے اپنا معبود بنایا ہوا تھا۔ بعل کی پرستش کی تاریخ بہت قدیم ہے، شام کے علاقہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس کی پرستش ہوتی تھی، اور یہ اُن کا سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔ شام کا مشہور شہر جبلبک بھی اسی کے نام سے موسوم ہوا، اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اہل حجاز کا مشہور بت ہبل بھی یہی بعل ہے۔

(تفصیل قرآن، ص ۲۸ ج ۲)

وَدَدُّ رُؤُوسِ اَحْسَنِ الْخَالِقِيْنَ (اور اس کو چھوڑ بیٹھے ہو جو سب سے بڑھ کر بنانے والا) اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور ”احسن الخالقین“ (سب سے اچھا خالق) کا مطلب یہ نہیں ہو کہ معاذ اللہ کوئی دوسرا بھی خالق ہو سکتا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جن جھوٹے معبودوں کو تم نے خالق قرار دیا ہوا ہے وہ ان سب سے اونچی شان والا ہے۔ (قرطبی) اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں ”مخالف“ ”مخالق“ ”دبانے والا“ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی وہ تمام صنائعوں سے بڑھ کر ہو، اس لئے کہ دوسرے صنائع صرف اتنا ہی تو کرتے ہیں کہ مختلف اجزاء کو جوڑ کر کوئی چیز تیار کر لیتے ہیں کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا ان کے بس سے باہر ہے، اور اللہ تعالیٰ معدوم اشیاء کو وجود بخشنے پر قدرت ذاتی رکھتا ہے (بیان قرآن)

غیر اللہ کی طرف تخلیق کی یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ”خلق“ کے معنی پیدا کرنے کے ہیں، جس کا مطلب صفت منسوب کرنا جائز نہیں ہو کسی شے کو عدم محض سے قدرت ذاتی کے بل پر وجود میں لانا۔ اس لئے یہ صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، کسی اور کی طرف اس کی نسبت جائز نہیں، لہذا ہمارے زمانے میں جو رواج چل پڑا ہے کہ اہل قلم کے مضامین، شاعروں کے شعرا اور مصوروں کی تصویروں کو اُن کی ”تخلیقات“ کہہ دیا جاتا ہے وہ بالکل جائز نہیں، اور نہ اہل قلم کو ان مضامین کا خالق کہنا درست ہے۔ خالق اللہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے اُن کے رشتہات قلم کو ”کادش“ یا ”مضمون“ وغیرہ کہنا چاہئے ”تخلیق“ نہیں۔

فَكَفَىٰ بُؤْسًا لَّهُمْ لَمُحَضَّرُوْنَ (سو اُن لوگوں نے اُن کو جھٹلایا سو وہ پکڑے جائیں گے)

مطلب یہ ہے کہ انھیں اللہ کے سچے رسول کو جھٹلانے کا مزہ چھنا پڑے گا۔ اس سے آخرت کا عذاب بھی مراد ہو سکتا ہے اور دنیا کا انجام بد بھی۔ پیچھے گزر چکا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کی

تکذیب کے نتیجے میں یہود اور اسرائیل دونوں ملکوں کے حکمرانوں کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا، اس تباہی کی تفصیل تفسیر منطہری میں اور بائبل کی کتاب سلاطین اول باب ۲۲ سلاطین دوم باب اول اور تواریخ دوم باب ۲۱ میں موجود ہے۔

إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ، یہاں ”مخلصین“ (لام پر زبر ہے) کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں ”خالص کئے ہوئے لوگ“ یعنی وہ لوگ جنہیں اللہ نے اپنی اطاعت اور اجر و ثواب کے لئے خالص کر لیا ہو، لہذا اس کا ترجمہ ”مخلص“ کے بجائے ”برگزیدہ“ زیادہ مناسب ہے۔
سَلَامٌ عَلَىٰ آلِ يَاسِينَ، ”ایاسین“ بھی ایاس علیہ السلام ہی کا ایک نام ہے، اہل عزہ اکثر عجمی ناموں کے ساتھ یاہ اور فون بڑھا دیتے ہیں، جیسے ”سینا ہے“ ”سینین“ اسی طرح یہاں بھی دو حرف بڑھا دیئے گئے ہیں۔

وَأَن لُّوطًا لِّمَنِ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٣٣﴾ إِذْ نَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَتَجَعِّلِينَ ﴿١٣٤﴾

اور تحقیق لوط ہے رسولوں میں سے۔ جب بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے سارے گھروالوں کو،

إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ﴿١٣٥﴾ ثُمَّ دَمَرْنَا الْأَخْرِيزِينَ ﴿١٣٦﴾ وَاتَّكَمَ

مگر ایک بڑھیا کہ رہ گئی رہ جانے والوں میں۔ پھر جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہم نے دوسروں کو، اور تم گزرتے ہو

لَتَسْمُرُونَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِينَ ﴿١٣٧﴾ وَبِالْأَيْلِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٣٨﴾

اُن پر صبح کے وقت، اور رات کو بھی۔ پھر کیا نہیں سمجھتے؟

خلاصہ تفسیر

اور بیشک لوط (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے تھے (ان کا اس وقت کا قصہ قابلِ ذکر ہے) جب کہ ہم نے ان کو اور ان کے متعلقین کو سب کو نجات دی بجز اس بڑھیا (یعنی ان کی بیوی) کے کہ وہ (عذاب کے اندر) رہ جانے والوں میں رہ گئی، پھر ہم نے اور سب کو (جو لوط اور ان کے اہل کے سوا تھے) ہلاک کر دیا (جن کا قصہ کئی جگہ آچکا ہے) اور (اسے اہل مکہ) تم تو اُن کے (دیار و مساکن پر سفر شام میں بھی) صبح ہوتے اور (کبھی) رات میں گزرا کرتے ہو (اور آثارِ بربادی دیکھتے ہو) تو کیا (اس کو دیکھ کر) پھر بھی نہیں سمجھتے ہو (کہ کفر کا کیا انجام ہوا، اور جو آئندہ کفر کرے گا اس کے لئے بھی یہی اندیشہ ہے)۔

معارف و مسائل

ان آیات میں پانچواں واقعہ حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ یہ واقعہ پیچھے کئی مقامات پر گزر چکا ہے، اس لئے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔ یہاں اہل مکہ کو خاص طور پر یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ تم شام کے تجارتی سفر میں سدوم کے اس علاقہ سے دن رات گزرتے ہو، جہاں یہ عبرتناک واقعہ پیش آیا، لیکن اس سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ صبح اور رات کا ذکر خاص طور سے اس لئے فرمایا گیا کہ اہل عرب عموماً انہی اوقات میں یہاں سے گزرا کرتے تھے، اور قاضی ابوالسود فرماتے ہیں کہ غالباً سدوم کا یہ علاقہ راستے کی ایسی منزل پر واقع تھا کہ یہاں سے کوچ کرنے والے صبح کے وقت روانہ ہوتے تھے اور آنے والے شام کے وقت آتے تھے (تفسیر ابی السود)

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٣٩﴾ إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلِّ الْمَشْحُونِ ﴿١٤٠﴾

اور یحییٰ یونس ہے رسولوں میں سے۔ جب بھاگ کر پہنچا اس بھری کشتی پر

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ ﴿١٤١﴾ فَالْقَمَمَةُ الْحَوْثُ وَهُوَ

پھر قرعہ ڈلویا تو نکلا خطاوار۔ پھر لقمہ کیا اس کو مچھلی نے اور وہ

مِلِيمٌ ﴿١٤٢﴾ فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ ﴿١٤٣﴾ لَلِیْثِ فِي بَطْنِهِ

الزما کھایا ہوا تھا۔ پھر اگر نہ ہوتی یہ بات کہ وہ یاد کرتا تھا پاک ذات کو، تو رہتا اسی کے پیٹ میں جس

إِلَى يَوْمٍ يَبْعَثُونَ ﴿١٤٤﴾ فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ ﴿١٤٥﴾ وَأَنْبَتْنَا

دن تک کہ مڑے زندہ ہوں۔ پھر ڈال دیا ہم نے اس کو چٹیل میدان میں اور وہ بیمار تھا۔ اور اُگایا ہم نے

عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَقْطِطِينَ ﴿١٤٦﴾ وَارْسَلْنَاهُ إِلَى مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ

اس پر ایک درخت بیل والا، اور بھیجا اس کو لاکھ آدمیوں پر یا

يَزِيدُونَ ﴿١٤٧﴾ فَأَمْنُوا فَفَتَحْنَاهُمْ إِلَى حِينٍ ﴿١٤٨﴾

اس سے زیادہ۔ پھر وہ یقین لائے پھر ہم نے فائدہ اٹھانے دیا انکو ایک وقت تک

خلاصہ تفسیر

اور بیشک یونس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے تھے (ان کا اُس وقت کا قصہ

یاد کیجئے) جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے ایمان نہ لانے پر بحکم الہی عذاب کی پیشنگوئی کی، اور خود وہاں سے چلے گئے اور جب متعین وقت پر عذاب کے آثار نمودار ہونے لگے تو قوم کو ایمان لانے کی غرض سے یونس علیہ السلام کی تلاش ہوئی، جب وہ نہ ملے تو سب نے متفق ہو کر حق تعالیٰ کے سامنے گریہ زاری کی اور اجمالی طور پر ایمان لے آئے، اور وہ عذاب ٹل گیا، یونس علیہ السلام کو کسی ذریعہ سے یہ خبر معلوم ہوئی تو شرمندگی کی وجہ سے اپنے اجتہاد سے اللہ تعالیٰ کی صریح اجازت کے بغیر کہیں دور چلے جانے کا ارادہ کر کے اپنی جگہ سے بھاگ کر (چلے) راہ میں دریا تھا، اس میں مسافروں سے بھری ہوئی کشتی تھی، اس بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے کشتی چلی تو طوفان آیا، کشتی والے کہنے لگے کہ ہم میں کوئی نیا قصور وار ہے، اس کو کشتی سے علیحدہ کرنا چاہئے، اس شخص کو متعین کرنے کے لئے سب کا اتفاق اس پر ہوا کہ قرعہ ڈالا جائے، سو یونس (علیہ السلام) بھی شریک قرعہ ہوئے تو (قرعہ میں) یہی ملزم ٹھہرے (یعنی انہی کا نام نکلا، پس انھوں نے اپنے کو دریا میں ڈال دیا۔ شاید کنارہ قریب ہوگا، شناسداری کر کے کنارہ پر جا پہنچنے کا ارادہ ہوگا، پس مشبہ خود کشتی کا لازم نہیں آتا) پھر (جب دریا میں گرے تو ہمارے حکم سے) ان کو مچھلی نے (ثابت) نگل لیا اور یہ (اس وقت) اپنے کو (اس اجتہادی غلطی پر) ملامت کر رہے تھے (یہ تو دل سے توبہ ہوئی اور زبان سے بھی توحید و تسبیح کے ساتھ استغفار کر رہے تھے، جیسا دوسری آیت میں ہے لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ شَهِدْنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ) سو اگر وہ (اس وقت) تسبیح (و استغفار) کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی کے پیٹ میں رہتے (مطلب یہ کہ پیٹ سے نکلنا میسر نہ ہوتا، بلکہ اس کی غذا بنادیتے جاتے) سو چونکہ انھوں نے تسبیح اور توبہ کی اس لئے) ہم نے (ان کو اس سے محفوظ رکھا اور مچھلی کے پیٹ نکال کر) ان کو ایک میدان میں ڈال دیا (یعنی مچھلی کو حکم دیا کہ کنائے پر اُگل دے) اور وہ اس وقت مضحل تھے (کیونکہ مچھلی کے پیٹ میں کافی ہوا اور غذا نہ پہنچتی تھی) اور ہم نے (دھوپ سے بچانے کے لئے) اُن پر ایک بیلدار درخت بھی اُگادیا تھا اور کوئی پہاڑی بکری انھیں دودھ پلا جاتی تھی) اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی طرف (شہرینوایں موصل کے قریب) پیغمبر بنا کر بھیجا تھا، پھر وہ لوگ ایمان لے آئے تھے (آثار عذاب دیکھ کر اجمالا اور مچھلی کے واقعہ کے بعد حضرت یونس علیہ السلام وہاں دوبارہ تشریف لے گئے اس وقت تفصیلاً) تو ایمان کی برکت سے) ہم نے اُن کو ایک زمانہ تک (یعنی مدت عمر تک خیر و خوبی سے) عیش دیا۔

معارف مسائل

اس سورۃ میں آخری واقعہ حضرت یونس علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ اور

اس کی متعلقہ تفصیلات سورۃ یونس کے آخر میں گذر چکی ہیں (دیکھئے معارف القرآن ص ۵۷۵، ج ۱) اور ان کا خلاصہ اوپر خلاصہ تفسیر میں بھی آگیا ہے، اس لئے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، البتہ خاص ان آیتوں کے بارے میں چند ضروری باتیں درج ذیل ہیں:-

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ، بعض مفسرین اور مؤرخین نے اس پر بحث کی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے واقعہ سے پہلے ہی رسول بنا دیے گئے تھے یا بعد میں بنا گئے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ مچھلی کے واقعہ کے بعد انھیں رسول بنایا گیا، لیکن مترآن کریم کے ظاہری اسلوب اور بیشتر روایات سے یہی راجح ہے کہ آپ کو پہلے ہی منصب رسالت پر فائز کر دیا گیا تھا، مچھلی کا واقعہ بعد میں پیش آیا۔

إِذْ أَبَوَّعَ إِلَى الْفُلِّ الْفُتُوحُونَ (جب کہ وہ بھاگے بھری ہوئی کشتی کی طرف) لفظ أَبَوَّعَ سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں کسی غلام کا اپنے آقا کے پاس سے بھاگ جانا۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کے لئے اس وجہ سے استعمال فرمایا کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف سے وحی کا انتظار کرتے بغیر روانہ ہو گئے تھے۔ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہوتے ہیں اور انکی معمولی سی لغزش بھی بڑی گرفت کا سبب بن جاتی ہے، اس لئے یہ سخت لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

فَسَاهَمَ رِبْسٍ وَهْ شَرِيكَ قَرَعِ انْدَازِیْ (ہوئے) یہ قرعہ اندازی اُس وقت کی گئی جبکہ کشتی بچ دریا کے پہنچ کر طوفان میں گھر گئی، اور وزن کی زیادتی سے اس کے ڈوبنے کا اندیشہ ہو گیا، اور طے یہ پایا کہ ایک شخص کو دریا میں پھینک دیا جائے، قرعہ یہ متعین کرنے کے لئے ڈالا گیا کہ وہ شخص کون ہے؟

قرعہ اندازی کا حکم یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ نہ کسی کا حق ثابت کیا جاسکتا ہے نہ کسی کو مجرم قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً قرعہ کے ذریعہ کسی کو چور ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اگر دو آدمیوں میں یہ اختلاف ہو کہ فلاں جائیداد کس کی ملکیت ہے تو قرعہ کے ذریعہ اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، ہاں قرعہ اندازی اس موقع پر جائز بلکہ بہتر ہے جہاں ایک شخص کو شرعاً مکمل اختیار حاصل ہو کہ وہ چند جائز راستوں میں سے کسی بھی راستے کو اختیار کر لے۔ اب وہ اپنی مرضی سے کوئی راستہ متعین کرنے کے بجائے قرعہ ڈال کر فیصلہ کرے، مثلاً جس شخص کی ایک سے زائد بیویاں ہوں، اُسے سفر میں جاتے وقت یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس بیوی کو چاہے ساتھ لے جائے، اب وہ اپنی مرضی سے ایسا کرنے کے بجائے قرعہ اندازی کر لے تو بہتر ہے، تاکہ کسی کی دل نیکئی نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا۔

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں بھی قرعہ اندازی سے کسی کو مجرم ثابت کرنا مقصود نہیں تھا، بلکہ پوری کشتی کو بچانے کے لئے کسی کو بھی دریا میں ڈالا جاسکتا تھا، قرعہ کے

کے ذریعہ اس کی تعین کی گئی۔

فَكَانَ مِنَ الْمُسْحِقِينَ (پس وہ مغلوب ہو گئے) اِدْحَاقُ کے لغوی معنی ہیں کسی کو ناکام بنادینا، مطلب یہ ہے کہ قرعہ اندازی میں اپنی کا نام نکل آیا، اور اسخوں نے اپنے آپ کو دریابیا ڈال دیا۔ اس پر خودکشی کا شبہ نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ ہو سکتا ہے کنارہ قریب ہو اور وہ تیرا کی ذریعے وہاں تک پہنچنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

فَلَوْلَا اَنْتَ كَانِ مِنَ الْمُسْتَجِیْنِ اَلَمْ، اس آیت سے یہ سمجھنا غلط ہے کہ اگر حضرت یونس علیہ السلام تسبیح نہ کرتے تو وہ مچھلی قیامت تک زندہ رہتی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس مچھلی کے پیٹ ہی کو حضرت یونس علیہ السلام کی قبر بنا دیا جاتا۔

تسبیح و استغفار سے | اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مصائب اور آفتوں کو دور کرنے میں تسبیح اور مصائب دور ہوتے ہیں | استغفار خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ سورۃ انبیاء میں گزر چکا ہے کہ جب حضرت

یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں تھے تو یہ کلمہ خاص طور سے پڑھتے تھے لَا اِلَهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ، اللہ تعالیٰ نے اسی کلمہ کی برکت سے انھیں اس آزمائش سے نجات عطا فرمائی، اور وہ مچھلی کے پیٹ سے صحیح سالم نکل آئے۔ اسی لئے بزرگوں سے یہ منقول چلا آ رہا ہے کہ وہ انفرادی یا اجتماعی مصیبت کے وقت یہ کلمہ سوا لاکھ مرتبہ پڑھتے ہیں، اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ مصیبت کو دور فرما دیتا ہے۔

ابوداؤد میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت یونس علیہ السلام نے جو دعاء مچھلی کے پیٹ میں کی تھی یعنی لَا اِلَهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ، اسے جو مسلمان بھی کسی مقصد کے لئے پڑھے گا اس کی دعاء قبول ہوگی (تفسیر قرطبی)۔

فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِیْمٌ، (پس ہم نے اُن کو میدان میں ڈال دیا اور وہ اس وقت مضمحل تھے) العراء کے معنی ہیں کھلا میدان جس میں کوئی درخت نہ ہو۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ انتہائی کمزور ہو گئے تھے، اور جسم پر بال بھی باقی نہ رہے تھے۔

وَالْبَتِّ نَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقُطِیْنِ، (اور ہم نے ان پر ایک بیل دار درخت بھی اٹھا دیا تھا) یَّقُطِیْنُ ہر اُس درخت کو کہتے ہیں جس کا تنہ نہ ہو۔ روایات میں ہے کہ یہ کدو کی بیل تھی۔ اس درخت کو اگانے کا منشا یہ تھا کہ حضرت یونس علیہ السلام کو سایہ حاصل ہو۔ یہاں شَجَرَةٍ کا لفظ بتا رہا ہے کہ یا تو اسی کدو کی بیل کو اللہ نے معجزہ کے طور پر تنہ دار بنا دیا تھا،

یا کوئی اور درخت تھا جس پر وہ بیل چڑھا دی تھی تاکہ اس سے گھنا سایہ مل سکے، ورنہ بیل سے سایہ ملنا مشکل تھا۔

وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ (اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا تھا) یہاں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو علیم وخبیر ہیں، ان کو اس شک کے اظہار کی کیا ضرورت ہے کہ ایک لاکھ یا اس سے زیادہ آدمی تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملہ عام لوگوں کی مناسبت سے کہا گیا ہے، یعنی ایک عام آدمی انھیں دیکھتا تو یہ کہتا کہ اُن کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے کچھ اوپر ہے (منظری) اور حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ یہاں شک کا اظہار مقصود ہی نہیں ہے، انھیں ایک لاکھ بھی کہا جاسکتا ہے، اور اس سے زیادہ بھی، اور وہ اس طرح کہ اگر کسر کا لحاظ نہ کیا جائے تو ان کی تعداد ایک لاکھ تھی، اور اگر کسر کو بھی شمار کیا جائے تو ایک لاکھ سے زیادہ (بیان ہستران)

یہ جملہ چونکہ مچھلی کے واقعہ کے بعد آیا ہے اس لئے اس سے بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی بعثت اس واقعہ کے بعد ہوئی تھی۔ اور علامہ بغویؒ نے یہاں تک فرمادیا کہ اس آیت میں نینوا کی طرف بعثت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ مچھلی کے واقعہ کے بعد انھیں ایک دوسری امت کی طرف بھیجا گیا، جس کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی، لیکن قرآن کریم اور روایات سے ان کے اس قول کی تائید نہیں ہوتی۔ یہاں حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کے شروع ہی میں آپ کی رسالت کا تذکرہ صاف بتا رہا ہے کہ مچھلی کا واقعہ رسول بننے کے بعد پیش آیا ہے، اس کے بعد یہاں اس جملے کو دوبارہ اس لئے لایا گیا کہ حضرت یونس علیہ السلام کی تندرستی کے بعد انھیں دوبارہ وہیں بھیجا گیا تھا، یہاں یہ واضح کر دیا کہ وہ لوگ معدودے چند افراد نہیں تھے بلکہ ان کی تعداد لاکھ سے بھی اوپر تھی۔

فَاٰمَنُوْا فَمَنْعْنٰهُمْ اِلٰی حَبِيْنٍ، (پس وہ ایمان لے آئے، سو ہم نے ان کو ایک زمانہ تک عیش دیا) "ایک زمانہ تک" کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ دوبارہ کفر و شرک میں مبتلا نہیں ہوئے ان پر کوئی عذاب نہیں آیا۔

مرزا قادیانی کی | یہ بات سورۃ یونس کی تفسیر میں بھی واضح کی جا چکی ہے، اور اس آیت سے بھی واضح تلبیس کا جواب | ہوتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر سے جو عذاب ٹپلایا گیا وہ اس لئے کہ آپ کی قوم بردقت ایمان لے آئی تھی۔ اس سے پنجاب کے جھوٹے نبی مرزا غلام احمد قادیانی کی اس تلبیس کا خاتمہ ہو جاتا ہے کہ جب اس نے اپنے مخالفوں کو یہ چیلنج کیا کہ اگر وہ اسی طرح نفی کرتے رہے تو خدا کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ فلاں وقت تک عذاب اتنی آجائے گا، لیکن مخالفین کی

جدوجہد اور تیز ہو گئی پھر بھی عذاب نہ آیا، تب ناکامی کی ذلت سے بچنے کے لئے قادیانی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ چونکہ مخالفین دل میں ڈر گئے ہیں اس لئے اُن پر سے عذاب ٹل گیا، جس طرح یونس علیہ السلام کی قوم پر سے ٹل گیا تھا، لیکن قرآن کریم کی یہ آیت اس تاویل باطل کو مردود قرار دیتی ہے۔ اس لئے کہ قوم یونس علیہ السلام تو ایمان کی وجہ سے عذاب سے بچی تھی، اس کے برعکس مرزا قادیانی کے مخالفین نہ صرف یہ کہ ایمان نہیں لائے بلکہ ان کی مخالفانہ جدوجہد اور تیز رہی۔

فَاسْتَغْفِرُهُمُ الرَّبُّ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ ﴿۱۶۹﴾ أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ

اب اُن سے پوچھ کیا تیرے رب کے یہاں بیٹیاں ہیں اور ان کے یہاں بیٹے، یا ہم نے بنایا فرشتوں کو

إِنَّا نَاوَاهُمْ شَهِدُونَ ﴿۱۷۰﴾ أَلَا إِنَّهُمْ مِّنْ أَفْكِهَمُ لَيَقُولُونَ ﴿۱۷۱﴾

عورت اور وہ دیکھتے تھے ؟ سنتا ہے، وہ اپنا جھوٹ کہتے ہیں کہ

وَلَدَ اللَّهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۱۷۲﴾ أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ ﴿۱۷۳﴾

اللہ کے اولاد ہوئی، اور وہ بیشک جھوٹے ہیں۔ کیا اُن نے پسند کیں بیٹیاں بیٹوں سے

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿۱۷۴﴾ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۷۵﴾ أَمْ لَكُمْ

کیا ہو گیا ہو تم کو کیسا انصاف کرتے ہو ؟ کیا تم دھیان نہیں کرتے ہو، یا تمھارے پاس کوئی

سُلْطٰنٌ مُّبِينٌ ﴿۱۷۶﴾ فَأْتُوا بِكِتَابِكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۷۷﴾ وَ

سند ہے کھلی ؟ تو لاؤ اپنی کتاب اگر ہو تم سچے اور

جَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ نِجَابًا وَقَدْ عَلِمَتْ الْجَنَّةُ إِنَّهُمْ

ٹھہرایا ہوا انھوں نے خدا میں اور جہنم میں ناتا، اور جہنم کو تو معلوم ہے کہ تحقیق

لَمْ يَخْضَرُوا ﴿۱۷۸﴾ سُبْحٰنَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ ﴿۱۷۹﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ

وہ پھڑے ہوئے آئیں گے۔ اللہ پاک ہر ان باتوں سے جو یہ بتاتے ہیں، مگر جو بندے ہیں اللہ

الْمُخْلِصِينَ ﴿۱۸۰﴾ فَإِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ ﴿۱۸۱﴾ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ

کے بچنے ہوئے۔ سو تم اور جن کو تم پوجتے ہو، کسی کو اس کے ہاتھ سے بہکا کر

بِفِتْنَيْنِ ﴿۱۸۲﴾ إِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيمِ ﴿۱۸۳﴾ وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ

نہیں لے سکتے، مگر اسی کو جو پہنچے والا ہے دوزخ میں۔ اور ہم میں جو ہے اس کا

مَقَامٌ مَّعْلُومٌ ﴿۱۶۳﴾ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُونَ ﴿۱۶۴﴾ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ ﴿۱۶۵﴾

ایک ٹھکانا ہی مقرر، اور ہم ہی ہیں صاف ہونے والے، اور ہم ہی ہیں پاکی بیان کرنے والے۔

خلاصہ تفسیر

(توحید کے دلائل تو اوپر بیان ہو چکے) سو اب اس کے بعد ان لوگوں سے (جو ملائکہ اور جنات کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں، اس طرح کہ ملائکہ کو تعوذ باللہ خدا کی بیٹیاں اور جنات کے سرداروں کی بیٹیوں کو ان فرشتوں کی مائیں قرار دیتے ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے نفسی رشتہ ہے، اور جنات سے زوجیت کا تعلق ہے، سو ان سب) پوچھئے کہ کیا خدا کے لئے تو بیٹیاں (ہوں) اور تمھارے لئے بیٹے (ہوں) یعنی جب اپنے لئے بیٹے پسند کرتے ہو تو عقیدہ مذکور میں خدا کے لئے بیٹیاں کیلئے تجویز کرتے ہو۔ پس اس عقیدے میں ایک خرابی تو یہ ہے اور ماں (دوسری بات سنو کہ) کیا ہم نے فرشتوں کو عورت بنایا ہے اور وہ (ان کے بننے کے وقت) دیکھ رہے تھے (یعنی ایک دوسری بُرائی یہ ہے کہ فرشتوں پر بلا دلیل مؤنث ہونے کی ہمت رکھتے ہیں) خوب سن لو کہ وہ لوگ (دلیل کچھ نہیں رکھتے، بلکہ محض سخن تراشی سے کہتے ہیں کہ) (لعوذ باللہ) اللہ صاحب اولاد ہے اور وہ یقیناً (بالکل) جھوٹے ہیں (پس اس عقیدے میں تیسری بُرائی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت لازم آتی ہے، ان میں سے پہلی بُرائی کا قبح عورت سے اور تیسری کا نقل سے اور تیسری کا عقل سے ثابت ہے۔ اور چونکہ جاہلوں کے لئے عرفی بُرائی کا اثبات زیادہ مؤثر ہوتا ہے، اس لئے پہلی بُرائی کو دوسرے عنوان سے مکرر فرماتے ہیں کہ ہاں، کیا اللہ تعالیٰ نے بیٹوں کے مقابل میں بیٹیاں زیادہ پسند کیں؟ تم کو کیا ہو گیا تم کیسا (بیہودہ) حکم لگاتے ہو؟ (جن کو عرفاً خود بھی بُرا سمجھتے ہو) پھر (علاوہ عرف کے) کیا تم (عقل اور) سوچ سے کام نہیں لیتے ہو (کہ یہ عقیدہ عقل کے بھی خلاف ہے) ہاں اگر دلیل عقلی نہیں تو کیا تمھارے پاس (اس پر) کوئی واضح دلیل موجود ہے (اس سے مراد نقلی دلیل ہے) سو تم اگر (اس میں) سچے ہو تو اپنی وہ کتاب پیش کرو اور (عقیدہ مذکورہ میں ملائکہ کو اولاد قرار دینے کے علاوہ) ان لوگوں نے اللہ میں اور جنات میں (رشتہ داری قرار دی ہے جس کا بطلان اور بھی زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ بیوی جس کام کے لئے ہوتی ہے اس سے حق تعالیٰ پاک ہے، اور جب زوجیت محال ہے تو سسرالی رشتے جو اُسی سے نکلتے ہیں وہ بھی محال ہوں گے) اور (جس کو یہ لوگ خدا کا شریک ٹھہرا رہے ہیں ان کی تو یہ کیفیت ہے کہ ان میں جو جنات

رہیں خود ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ان میں جو کافر ہیں وہ (عذاب میں) گرفتار ہوں گے (اور عذاب میں کیوں گرفتار نہ ہوں کہ حق تعالیٰ کی نسبت بُری بُری باتیں بیان کرتے ہیں، حالانکہ اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو جو یہ بیان کرتے ہیں پس ان کا فرمانہ بیانات سے وہ گرفتار عذاب ہوں گے) مگر جو اللہ کے خاص (یعنی ایمان والے) بندے ہیں (وہ اس عذاب سے بچیں گے) سو تم اور تمہارے سارے معبود سب مل کر بھی خدا سے کسی کو پھیر نہیں سکتے (جیسی تم کوشش کیا کرتے ہو، مگر اسی کو جو کہ (علم الہی میں) جہنم رسید ہونے والا ہے اور آگے ملائکہ کا ذکر فرماتے ہیں کہ ان میں جو ملائکہ ہیں ان کا یہ مقولہ ہے کہ ہم تو بندہ محض ہیں، چنانچہ جو خدمت ہمارے سپرد ہے اس میں ہم سے ہر ایک کا ایک معین درجہ ہے کہ اسی کی بجا آوری میں لگے رہتے ہیں اپنی رائے سے کچھ نہیں کر سکتے اور ہم خدا کے حضور میں محکم سننے کے وقت یا عبادت کے وقت ادب سے صفت بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور ہم (خدا کی) پاکی بیان کرنے میں بھی لگے رہتے ہیں (غرض ہر طرح محکوم اور بندے ہیں۔ سو جب فرشتے خود اپنی بندگی کا اعتراف کر رہے ہیں تو پھر ان پر معبود ہونے کا شبہ کرنا بڑی بیوقوفی ہے، پس جنات اور ملائکہ کے حق میں خدائی کا اعتقاد باحسن جو باطل ہو گیا)

معارف و مسائل

انبیاء علیہم السلام کے واقعات نصیحت و عبرت کے لئے بیان کئے گئے تھے، اب پھر توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کا اصل مضمون بیان کیا جا رہا ہے، اور یہاں شرک کی ایک خاص قسم کا بیان ہے۔ کفار عرب کا یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اور جنات کی سردارزادیاں فرشتوں کی مائیں ہیں۔ بقول علامہ واحدیؒ یہ عقیدہ قریش کے علاوہ جہینہ، بنو سلمہ، بنو خزاعہ اور بنو ملیح کے یہاں بھی رائج تھا (تفسیر کبیر، ص ۱۱۲ ج ۷)

فَاسْتَفْتَيْهِمْ (اے اللہ تعالیٰ) اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ، ان آیتوں میں کفار عرب کے اسی عقیدے کی تردید کے لئے دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اول تو تمہارا یہ عقیدہ خود تمہارے معرفت اور رسم و رواج کے لحاظ سے بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ تم بیٹیوں کو باپ تک سمجھتے ہو، اب جو چیز تمہارے اپنے لئے ننگ و عار ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ پھر تم نے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا ہے، اس کی تمہارے پاس دلیل کیا ہے؟ کسی دعوے کو ثابت کرنے کے لئے تین قسم کے دلائل ہو سکتے ہیں۔ ایک مشاہدہ، دوسرے نقلی دلیل، یعنی کسی ایسی ذات کا قول جس کی سچائی مسلم ہو، اور تیسرے عقلی دلیل۔ جہاں تک مشاہدہ کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو فرشتوں کی تخلیق کرتے ہوئے دیکھا،

نہیں جس سے فرشتوں کا موت نہ ہو نامعلوم ہو سکتا، لہذا مشاہدہ کی کوئی دلیل تو تمھارے پاس ہی نہیں
 رَامُ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ اب کا یہی مطلب ہے، اب یہی نقلی دلیل سو وہ بھی تمھارے
 پاس نہیں، اس لئے کہ قول ان لوگوں کا معتبر ہوتا ہے جن کی سچائی مسلم ہو، اس کے برخلاف جو لوگ
 اس عقیدے کے قائل ہیں وہ جھوٹے لوگ ہیں، ان کی بات کوئی حجت نہیں ہو سکتی رَاٰلَا فِہُمْ
 مِّنْ اٰفَکِہِمۡ لَیۡقُوۡنَ اب کا یہی مطلب ہے، اب یہی عقلی دلیل، سو وہ بھی تمھاری تائید نہیں کرتی،
 اس لئے کہ خود تمھارے خیال کے مطابق بیٹیاں بیٹوں کے مقابلے میں کم رتبہ رکھتی ہیں، اب جو ذات
 تمام کائنات سے افضل ہے وہ اپنے لئے کم رتبہ والی چیز کو کیسے پسند کر سکتی ہے؟ (اَصْطَفٰی
 الْبَنَاتِ عَلَی الْبَنٰیۡنِ کا یہی مطلب ہے، اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ تمھارے
 پاس کوئی آسمانی کتاب آئی ہو اور اس میں بذریعہ وحی تمھیں اس عقیدے کی تعلیم دی گئی ہو،
 سو اگر ایسا ہے تو دکھاؤ وہ وحی اور وہ کتاب کہاں ہے؟ (اَمْ لَکُمْ سُلٰطٰنٌ مُّبٰیۡنٌ، فَاَنْتَوۡا
 بِکِتٰبِکُمۡ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیۡنَ کا یہی مفہوم ہے)۔

ہٹ دھرمی کرنے والوں کے لئے | ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے ہوں
 الزامی جواب زیادہ مناسب ہے | ان کو الزامی جواب دینا زیادہ مناسب ہے۔ الزامی جواب کا
 مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے دعوے کو خود انہی کے کسی دوسرے نظریہ کے ذریعہ باطل کیا جائے
 اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسرا نظریہ ہمیں بھی تسلیم ہے، بلکہ بسا اوقات وہ دوسرا نظریہ
 بھی غلط ہوتا ہے، لیکن مخالف کو سمجھانے کے لئے اس سے کام لے لیا جاتا ہے۔ یہاں باری تعالیٰ
 نے ان کے عقیدہ کی تردید کے لئے خود انہی کے اس نظریہ کو استعمال فرمایا ہے کہ بیٹیوں کا وجود
 باعثِ ننگ و عار ہے، ظاہر ہے کہ اس کا مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بیٹیوں کا وجود باعثِ ننگ ہو، نہ
 یہ مطلب ہے کہ اگر وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کے بجاتے خدا کے بیٹے کہتے تو یہ درست ہوتا
 بلکہ یہ ایک الزامی جواب ہے۔ جس کا مقصد خود انہی کے مزعومات سے ان کے عقیدے کی تردید
 کرنا ہے، ورنہ اس قسم کے عقائد کا حقیقی جواب وہی ہے جو قرآن کریم ہی میں کئی جگہ مذکور ہے
 کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، اور اُسے کسی اولاد کی نہ ضرورت ہے، اور نہ اس کی رفعتِ شان کے
 یہ مناسب ہے کہ اس کی اولاد ہو۔

وَجَعَلُوا بَیۡنَہٗ وَبَیۡنَ الْجَنَّةِ نَسَبًا، اور انھوں نے اللہ تعالیٰ اور جنات

کے درمیان نسی تعلق قرار دیا ہے، اس جملے کی ایک تفسیر تو یہ ہو کہ یہ مشرکین عرب کے اس فاسد
 عقیدے کا بیان ہے کہ جنات کی سردارِ زادیاں فرشتوں کی مائیں ہیں۔ گویا معاذ اللہ جنات کی
 سردارِ زادیوں سے اللہ تعالیٰ کا زوجیت کا تعلق ہے، اور اسی تعلق کے نتیجے میں فرشتے

وجود میں آئے ہیں۔ چنانچہ ایک تفسیری روایت میں ہے کہ جب مشرکین عرب نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا تو حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ ان کی ماں کون ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ جنات کی سرراز اور پناہ (تفسیر ابن کثیر، ص ۲۳ ج ۱۲)۔ لیکن اس تفسیر پر یہ اشکال رہتا ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ اور جنات کے درمیان نسبی تعلق کا ذکر ہے اور زوجیت کا تعلق نسبی نہیں ہوتا۔

اس لئے ایک دوسری تفسیر یہاں زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، اور وہ یہ کہ بعض اہل عرب کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ معاذ اللہ ابلیس اللہ تعالیٰ کا بھائی ہے، اللہ تعالیٰ خالق خیر ہے اور وہ خالق شر، یہاں اسی باطل عقیدے کی تردید کی گئی ہے (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر و قرطبی و تفسیر کبیر)

وَلَقَدْ عَلِمْتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ (اور جنات کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ گرفتار ہوں گے) "وہ" سے مراد ایسے مشرکین بھی ہو سکتے ہیں جو جنات اور شیاطین کو خدا کا ہمسر قرار دیتے تھے اور خود جنات بھی۔ دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ جن شیاطین اور جنات کو تم نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرا رکھا ہے وہ خود اچھی طرح جانتے ہیں کہ آخرت میں ان کا برا حشر ہونے والا ہے، مثلاً ابلیس کہ وہ اپنے انجام بد سے خوب واقف ہے، اب جو خود یہ یقین رکھتا ہو کہ مجھے مبتلائے عذاب ہونا ہے اُسے خدا کا ہمسر قرار دینا کتنی بڑی حماقت ہے۔

وَإِنْ كَانُوا لَيَقُولُنَّ ۖ لَوْ أَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْأَوَّلِينَ ۖ لَكُنَّا

اور یہ تو کہا کرتے تھے۔ اگر ہمارے پاس کچھ احوال ہوتا پہلے لوگوں کا تو ہم

عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۖ فَكَفَرُوا بِهِ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۚ (۱۶۹)

ہوتے بندے اللہ کے چنے ہوئے۔ سو اس سے منکر ہو گئے اب آگے جان لیں گے اور

لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْوَسِيلِينَ ۖ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمُتَوَدَّدُونَ ۖ (۱۷۰)

پہلے ہو چکا ہمارا حکم اپنے بندوں کے حق میں جو کہ رسول ہیں۔ بیشک انہی کو مدد دی جاتی ہے۔

وَإِنْ جُنَدَنَا لَهُمُ الْغُلَبُونَ ۖ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ۖ وَأَبْصَرَهُمْ

اور ہمارا لشکر جو ہی بیشک ہی غالب ہو۔ سو تو ان سے پھر ایک وقت تک، اور ان کو دیکھتا رہ

فَسَوْفَ يَبْصُرُونَ ۖ اَفَبِعَدَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ۖ فَاِذَا نَزَلَ

کہ وہ آگے دیکھ لیں گے۔ کیا ہماری آفت کو جلد مانگتے ہیں، پھر جب اترے گی

يَسَاحِرِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ ۝ ۱۴۸ ۝ وَتَوَلَّى عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ۝ ۱۴۹ ۝

ان کے میدان میں تو بُری صبح ہوگی ڈرائے ہوؤں کی، اور پھر آ ان سے ایک وقت تک

وَأَبْصَرَ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ۝ ۱۴۹ ۝

اور دیکھتا رہ اب آگے دیکھ لیں گے۔

خلاصہ تفسیر

اور یہ لوگ یعنی کفار عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے پاس کوئی نصیحت (کی کتاب) پہلے لوگوں (کی کتابوں) کے طور پر آتی (یعنی جیسے یہود و نصاریٰ کے پاس رسول اور کتابیں آئیں، اگر ہمارے لئے ایسا ہوتا) تو ہم اللہ کے خاص بندے ہوتے (یعنی اس کتاب کی تصدیق اور اس پر عمل کرتے، ان کی طرح تکذیب اور مخالفت نہ کرتے) پھر جب وہ نصیحت کی کتاب رسول کے ذریعہ سے اُن کو پہنچی تو یہ لوگ اس کا انکار کرنے لگے (اور اپنا وہ عہد توڑ دیا) سو (خیر) اب ان کو اس کا انجام معلوم ہوا جاتا ہے (چنانچہ مرتے ہی کفر کا انجام سامنے آگیا، اور بعض سزائیں موت سے پہلے بھی مل گئیں) اور آگے حضور کو تسلی ہے کہ گو اس وقت ان مخالفین کو کسی قدر شوکت حاصل ہے لیکن یہ چند روزہ ہے (کیونکہ) ہمارے خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لئے ہمارا یہ قول پہلے ہی سے (یعنی لوح محفوظ ہی میں) مقرر ہو چکا ہے کہ بیشک وہی غالب کئے جاویں گے اور (ہمارا تو عام قاعدہ ہے کہ) ہمارا لشکر غالب رہتا ہے (جو رسولوں کے متبعین کو بھی شامل ہے، سو جب یہ بات ہے کہ آپ غالب آنے والے ہیں ہی) تو آپ (تسلی رکھئے اور) تھوڑے زمانہ تک (صبر کیجئے اور) ان (کی مخالفت اور ایذا رسانی) کا خیال نہ کیجئے اور (ذرا) اُن کو دیکھتے رہئے (یعنی ان کی حالت کا قدرے انتظار کیجئے) سو عنقریب یہ بھی دیکھ لیں گے (اس کا بھی وہی مطلب ہے جو فسوفَ یَعْلَمُونَ کا تھا کہ اُن کو مرنے کے بعد بھی اور مرنے سے پہلے بھی اللہ کی طرف سے سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس دھمکی پر وہ کہہ سکتے تھے اور اکثر وہ کہا بھی کرتے تھے کہ ایسا کب ہوگا؟ تو اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ایسا ہمارے عذاب کا تقاضا کر رہے ہیں، سو وہ (عذاب) جب اُن کے رُودِ رُودِ آنازل ہوگا، سو وہ دن ان لوگوں کا جن کو (پہلے سے) ڈرایا جا چکا تھا بہت ہی بُرا ہوگا کہ وہ عذاب ٹل نہ سکے گا، اور جب یہ بات ہے کہ ان لوگوں پر عذاب واقع ہونے والا ہے تو آپ (تسلی رکھئے اور) تھوڑے زمانہ تک (صبر کیجئے اور) ان (کی مخالفت اور ایذا رسانی) کا خیال نہ کیجئے اور (ذرا ان کی حالت کو)

دیکھتے رہتے (یعنی منتظر رہتے) سو عنقریب یہ بھی دیکھ لیں گے (یعنی آپ کو تو ہمارے کہنے سے یقین ہے ہی، آنکھوں سے دیکھ کر انھیں بھی یقین آجائے گا)۔

معارف و مسائل

اسلام کے بنیادی عقائد کو دلائل و شواہد سے ثابت کرنے کے بعد ان آیتوں میں کفار کی ہٹ دھرمی کا ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل تمنا کیا کرتے تھے کہ اللہ کا کوئی پیغمبر آئے تو یہ اس کی پیروی کریں، لیکن جب آپ تشریف لے آئے تو انھوں نے ضد اور عناد کا وطیرہ اختیار کیا ہوا ہے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ان لوگوں کی ایذا رسانیوں سے رنجیدہ نہ ہوں، عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ آپ غالب اور فتح یاب ہوں گے اور یہ مغلوب اور نشانہ عذاب۔ آخرت میں تو اس کا مکمل مظاہرہ ہو گا ہی، دنیا میں بھی اللہ نے دکھا دیا کہ غزوہ بدر سے لے کر فتح مکہ تک ہر جہاد میں اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ظفر مند کیا، اور آپ کے مخالفین ذلیل و خوار ہوئے۔

اللہ والوں کے غلبہ کا مطلب ان آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے یہ بات پہلے سے طے کر رکھی ہے کہ ہمارے خاص بتدرے یعنی پیغمبر ہی غالب ہوتے ہیں۔ اس پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کو دنیا میں غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معلوم پیغمبروں میں اکثریت تو ایسے ہی حضرات کی ہی جن کی قومیں انھیں جھٹلا کر عذاب میں مبتلا ہوئیں، اور ان حضرات کو عذاب سے محفوظ رکھا صرف چند انبیاء علیہم السلام ایسے ہیں جنہیں دنیا میں آخر وقت تک بظاہر مادی طور پر غلبہ نہ مل سکا، لیکن دلیل و حجت کے میدان میں ہمیشہ وہی سر بلند ہے، اور نظریاتی فتح ہمیشہ انہی کو حاصل ہوتی، ہاں اس سر بلندی کے مادی آثار کسی خاص حکمت مثلاً آزمائش وغیرہ کی وجہ سے آخرت تک مؤخر کر دیئے گئے۔ لہذا بقول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ذلیل رہزن کسی بڑے حاکم افسر کے ساتھ سفر کی حالت میں ٹوٹ مار کرنے لگے، مگر وہ حاکم اپنی خداداد عالی دماغی کی وجہ سے ہرگز اس ذلیل رہزن کی خوشامد نہیں کرے گا، حتیٰ کہ جب وہ حاکم اپنے دار الحکومت میں پہنچے گا اس رہزن کو گرفتار کر کے سزا دے گا۔ لہذا اس عارضی غلبہ کی وجہ سے نہ اس رہزن کو حاکم کہہ سکتے ہیں اور نہ اس افسر کو محکوم، بلکہ اصلی حالت کے اعتبار سے وہ رہزن اس غلبہ میں بھی محکوم ہے، اور وہ افسر اس مغلوبیت میں بھی

حاکم ہے۔ اسی بات کو حضرت ابن عباسؓ نے ایک مختصر اور سلیس عنوان سے تعبیر فرمایا ہے: اِنَّ لَمْ يُنْصَرْ وَ اِنِّی الدُّنْیَا یُنْصَرُ وَ اِنِّی الْآخِرَةُ (بیان القرآن تفسیر سورۃ مائدہ)

لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ غلبہ خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں، کسی قوم کو محض خصوصیات نسلی یا دین کے ساتھ محض نام کے تعلق سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے آپ کو "اللہ کے شکر" کا ایک فرد بنالے۔ جس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ ہر شعبہ زندگی میں اللہ کی اطاعت کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے ہو۔ یہاں "جُتِدْنَا" (ہمارا شکر) کا لفظ بتا رہا ہے کہ جو شخص اسلام قبول کرے اُسے اپنی ساری زندگی نفس اور شیطان کی طاقتوں سے جنگ کرنے میں خرچ کرنے کا معاہدہ کرنا ہوگا اور اس کا غلبہ خواہ مادی ہو یا اخلاقی، دنیا میں ہو یا آخرت میں، اسی شرط پر موقوف ہے۔

فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِیْنَ، پس جب وہ عذاب اُن کے صحن میں آنازل ہوگا تو جن لوگوں کو پہلے ڈرایا جا چکا تھا اُن کی وہ صبح بہت بُری ہوگی، سَاحَۃ کے لفظی معنی صحن کے ہیں اور نَزَلَ بِسَاحَتِهِ (اس کے صحن میں اُترا) عربی محاورہ ہے، جس کا مفہوم کسی آفت کا سننے آجانا اور صبح کے وقت کی تخصیص یہ ہے کہ اہل عرب میں دشمن کا حملہ عموماً اُسی وقت ہوا کرتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی یہی تھا کہ اگر کسی دشمن کے خطے میں رات کے وقت پہنچے تو حملے کے لئے صبح تک انتظار فرماتے تھے (منظری) روایات میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلعہ خیبر پر صبح کے وقت حملہ کیا تو ارشاد فرمایا "اللہ اکبر، خربت خیبر، اِنَّا اِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِیْنَ" اللہ اکبر! خیبر ویران ہو گیا، بلاشبہ جب ہم کسی قوم کے صحن میں اترتے ہیں تو جن لوگوں کو پہلے ڈرایا جا چکا تھا اُن کی وہ صبح بہت بُری ہوتی ہے۔

سُبْحَنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿۱۸۲﴾ وَسَلَامٌ عَلَى

پاک ذاتِ ہر تیرے رب کی وہ پروردگار عزت والا پاک ہو ان باتوں کو جو وہ بیان کرتے ہیں، اور سلام ہے

الرُّسُلِیْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ﴿۱۸۲﴾

رسولوں پر، اور سب خوبی ہے اللہ تعالیٰ کو جو رب ہے سائے جہان کا۔

خُلاصۃ تفسیر

آپ کا رب جو بڑی عظمت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ (کافر) بیان کرتے ہیں

رہیں خدا کو ان باتوں سے پاک ہی قرار دو) اور پیغمبروں کو واجب الاتباع سمجھو، کیونکہ ہم انکی شان میں یہ کہتے ہیں کہ (سلام ہو پیغمبروں پر اور (خدا کو شرک وغیرہ سے پاک سمجھنے کے ساتھ ساتھ تمام کمالات کا جامع بھی سمجھو، کیونکہ) تمام تر خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام عالم کا پروردگار (اور مالک) ہے ۛ

معارف و مسائل

ان آیتوں پر سورۃ صافات کو ختم کیا گیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس حسین خاتمے کی تشریح کے لئے دفتر چاہئیں۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان تین مختصر آیتوں میں سورت کے جملہ مضامین کو سمیٹ دیا ہے۔ سورت کی ابتداء توحید کے بیان سے ہوئی تھی، جس کا حاصل یہ تھا کہ مشرکین جو جو باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں، باری تعالیٰ ان سب سے پاک ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں اسی طویل مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد سورت میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کئے گئے تھے، چنانچہ دوسری آیت میں ان کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد کھول کھول کر سفار کے عقائد اور شبہات و اعتراضات کی عقلی و نقلی تردید کر کے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ غلبہ بالآخر اہل حق کو حاصل ہوگا، ان باتوں کو جو شخص بھی عقل و بصیرت کی نگاہ سے پڑھے گا وہ بالآخر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء پر مجبور ہوگا، چنانچہ اسی حمد و ثناء پر سورت کو ختم کیا گیا ہے۔

نیز ان آیتوں میں اسلام کے بنیادی عقائد توحید اور رسالت کا صراحتاً اور آخرت کا ضمناً ذکر بھی کیا ہے۔ چونکہ اثبات سورت کا اصل مقصد تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی دیدی گئی کہ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے ہر مضمون ہر خطبے اور ہر مجلس کا اختتام باری تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے اور اس کی حمد و ثناء پر کرے۔ چنانچہ علامہ قرطبی نے یہاں اپنی سند سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بار سنا کہ آپ نماز ختم ہونیکے بعد یہ آیات تلاوت فرماتے تھے: **سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ**۔ نیز متعدد تفاسیر میں امام بغوی کے حوالہ سے حضرت علیؑ کا یہ قول منقول ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ قیامت کے دن اسے بھرپور پیمانے سے اجر ملے اسے چاہئے کہ وہ اپنی ہر مجلس کے آخر میں یہ پڑھا کرے: **سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ**۔ یہی قول ابن ابی عامر نے حضرت شعبیؒ کی روایت مرفوعاً بھی نقل کیا ہے (تفسیر ابن کثیر)

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ
بحمد اللہ تعالیٰ آج بتاریخ، از محرم الحرام ۱۳۹۳ھ شب یکشنبہ بوقت عشاء سورۃ صافات

کی تفسیر مکمل ہوئی

سُورَةُ ص

سُورَةُ ص مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانُونَ آيَةً وَخَمْسُ مِائَةٍ كُوْعًا
سُورَةُ ص مَكِّيَّةٌ نَزَلَتْ بِمَكَّةَ وَأُثْقَفَ اسْمُهَا فِي آيَاتِهَا وَأَوَّلُهَا بِحُرُوفٍ كَوْنِيَّةٍ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
مُتْرُوعُ اللَّهِ كَيْفَ نَامَ سَبْعُ حُرُوفٍ مَهْرَبَانِ نَهَائِيَّةٍ رَحْمَةً

ص وَالْقُرْآنِ إِنِّي الَّذِي كَفَرْتُ وَإِنِّي عَنِيَّةٌ وَ

تسم ہے اس قرآن سمجھانے والے کی ۔ بلکہ جو لوگ منکر ہیں ۔ عند در میں ہیں اور

شِقَاقٍ ۲ كَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَ ذُؤَالَتِ حِينٍ

مقابلہ میں بہت غارت کر دیں ہم نے ان سے پہلے جماعتیں پھر لگے پکارنے اور وقت نہ رہا تھا

مَنَاصِصٍ ۳ وَجَبُّوْا أَن جَاءَهُمْ مِّنْ ذُرِّيَّتِهِمُ الْمُنْتَصِفِ وَقَالَ الْكُفْرُونَ

خلاصی کا اور تعجب کرنے لگے اس بات پر کہ آیا ان کے پاس ایک ڈر سنا لے ڈالا انہی میں سے

هَذَا سِحْرٌ كَذِبٌ ۴ أَجْعَلُ الْآلِهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا إِنَّ

اور کہنے لگے منکر یہ جادو گر ہے جھوٹا کیا اس نے کردی اتنوں کی بندگی کے بدلے ایک ہی کی بندگی

هَذَا الشَّيْءُ عَجَابٌ ۵ وَالنَّظْلُ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا

یہ بھی ہے بڑے تعجب کی بات اور چل کھڑے ہوئے کئی بیچ ان میں سے کہ چلو اور

وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ ۶ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ ۷ مَا سَمِعْنَا

جے رہو اپنے معبودوں پر یہ شک اس بات میں کوئی غرض ہے یہ نہیں سنا

بِهَذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ ۸ إِنَّ هَذَا إِلَّا خِثْلَانٌ ۹ وَأَنزَلَ

ہم نے اس تکھیلے دین میں اور کچھ نہیں یہ بنائی ہوئی بات ہے کیا اس پر

عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِّنْ بَيْنِنَا ۱۰ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِي ۱۱

اتری نصیحت ہم سب میں سے ۔ کوئی نہیں ان کو دھوکا ہے میری نصیحت میں

یہ تھی کہ وہ اپنی جہالت سے بشریت کو نبوت کے منافی سمجھتے تھے اور اس انکار رسالت میں یہاں تک پہنچ گئے، کہ آپ کے معجزات اور دعویٰ نبوت کے بارے میں کہنے لگے کہ (نعوذ باللہ) یہ شخص (خواری عادت کے معاملہ میں) ساحر اور (دعویٰ نبوت کے معاملہ میں) کذاب ہے (اور) کیا (یہ شخص سچا ہو سکتا ہے جبکہ) اس نے اپنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا (اور سب کے معبود ہونے کی نفی کر دی) واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔ (جس کی وجہ عنقریب آتی ہے) اور (توحید کا مضمون سن کر) ان کفار میں کے رئیس (مجلس سے اٹھ کر لوگوں سے) یہ کہتے ہوئے چلے کہ (یہاں سے) چلو اور اپنے معبودوں (کی عبادت) پر قائم رہو (کیونکہ اول تو) یہ (توحید کی دعوت) کوئی مطلب کی بات (معلوم ہوتی) ہے (یعنی اس بہانہ سے آپ معاذ اللہ ریاست کے خواہاں ہیں۔ دوسرے توحید کا دعویٰ بھی باطل اور عجیب ہے کیونکہ) ہم نے تو یہ بات (اپنے) پچھلے مذہب میں نہیں سنی، ہونہ ہو یہ (اس شخص کی) من گھڑت ہے (پچھلے مذہب کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بہت سے طریقہ کے لوگ ہوئے ہیں، سب سے پیچھے ہم آئے ہیں اور حق پر ہیں، سو ہم نے اس طریقہ کے بزرگوں سے کبھی یہ بات نہیں سنی۔ اور یہ شخص جو نبوت کا مدعی ہے اور توحید کو تعلیم الہی بتاتا ہے، سو اول تو نبوت بشریت کے منافی ہے۔ دوسرے اگر اس سے قطع نظر کی جائے تو کیا ہم سب میں اسی شخص (کو کوئی) فرقت و تفصیل تھی کہ اسی کو نبوت ملی اور اسی پر کلام الہی نازل کیا گیا (بلکہ کسی رئیس پر ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ ان پر کیوں نازل ہوا؟ کسی رئیس پر کیوں نہ ہوا؟ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کا اتباع کرتے) بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ لوگ (خود) میری وحی کی طرف سے شک (یعنی انکار) میں ہیں۔ (یعنی مسئلہ نبوت ہی کے منکر ہیں، خصوصاً بشر کو نبی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اور یہ انکار بھی کچھ اس لئے نہیں کہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ) انھوں نے ابھی تک میرے عذاب کا فرہ نہیں چکھا (اور نہ سب عقل ٹھکانے آجاتی۔ آگے دوسرے طرز پر جواب ہے کہ) کیا ان لوگوں کے پاس آپ کے پروردگار زبردست فیاض کی رحمت کے خزانے ہیں (جس میں نبوت بھی داخل ہے، کہ جس کو چاہیں دیں، جس کو چاہیں نہ دیں۔ یعنی اگر رحمت کے سارے خزانے ان کے قبضہ میں ہوتے تب تو ان کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ ہم نے بشر کو نبوت نہیں دی، پھر وہ نبی کیسے ہو گیا؟) یا (اگر سارے خزانے قبضہ میں نہیں ہیں تو) کیا ان کو آسمان اور زمین اور جو چیزیں ان کے درمیان ہیں ان (سب) کا اختیار حاصل ہے (کہ اگر اتنا ہی اختیار ہوتا تب بھی یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ یہ آسمان و زمین کے مصالح سے باخبر ہیں، اس لئے جسے چاہیں اسے نبوت ملنی چاہئے۔ اور آگے تعجیر کے طور پر ارشاد ہے کہ اگر ان کو اس پر اختیار ہے) تو ان کو چاہئے کہ سر ہیاں لگا کر (آسمان پر) چڑھ جاویں (اور ظاہر ہے کہ یہ اس پر قادر نہیں۔ پس جب انھیں اتنی بھی قدرت نہیں تو آسمان و زمین کی معلومات اور ان پر کیا اختیار ہوگا؟ پھر ان کو ایسی بے سرو پایا باتیں

کہنے کا کیا حق ہے؟ مگر اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان کی مخالفت سے فکر نہ کریں۔ کیونکہ اس مقام پر (یعنی مکہ میں) ان لوگوں کی یونہی ایک بھیڑ ہے، منجملہ (مخالفتین انبیاء کے) گروہوں کے جو (عنقریب) شکست دیے جاویں گے (چنانچہ عرزہ بدر میں یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور) ان سے پہلے بھی قوم نوحؑ نے اور عاد نے اور فرعون نے جس (کی سلطنت) کے کھوٹے گروہ تھے اور ثمود نے اور قوم لوط نے اور اصحاب ایکہ نے (جن کے قصے کہی جگہ آچکے ہیں، ان سب نے) تکذیب کی تھی (اور) وہ گروہ (جس کا اور پر صین الاحزاب میں ذکر آیا ہے) یہی لوگ ہیں، ان سب نے صرف رسولوں کو جھٹلایا تھا (جیسے یہ کفار قریش آپ کو جھٹلا رہے ہیں) سو میرا عذاب (اُن پر) واقع ہو گیا (پس جب جرم مشترک ہے تو عذاب کے اشتراک سے یہ کیوں مطمئن ہیں؟) اور یہ لوگ (جو تکذیب پر مہر ہیں تو) بس ایک زور کی چیخ (یعنی نفخہ ثانیہ) کے منتظر ہیں جس میں دم لینے کی گنجائش نہ ہوگی (اس سے مراد قیامت ہے) اور یہ لوگ (قیامت کی وعید سن کر تکذیب رسولؐ اور استہزاء کے طور پر) کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب (آخرت میں جو کافروں کو عذاب ہوگا، اس میں سے) ہمارا حصہ ہم کو روز حساب سے پہلے ہی دیدے (مطلب یہ کہ قیامت نہیں ہے، اور اگر ہے تو ہم کو ابھی عذاب مطلوب ہے، جب عذاب نہیں ہوتا تو معلوم ہوا قیامت نہ آوے گی۔ نفوذ باللہ!)

معارف و مسائل

شان نزول | اس سورت کی ابتدائی آیات کا پس منظر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب مسلمان نہ ہونے کے باوجود آپ کی پوری نگہداشت کر رہے تھے، جب وہ ایک بیماری میں مبتلا ہوئے تو قریش کے بڑے بڑے سرداروں نے ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ جس میں ابوجہل، عاص ابن وائل، اسود بن مطلب، اسود بن عبید لغوث اور دوسرے رؤساء شریک ہوئے۔ مشورہ یہ ہوا کہ ابوطالب بیمار ہیں، اگر وہ اس دنیا سے گزر گئے اور اس کے بعد ہم نے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے نئے دین سے باز رکھنے کے لئے کوئی سخت اقدام کیا تو عرب کے لوگ ہمیں یہ طعن دیں گے کہ جب تک ابوطالب زندہ تھے، اس وقت تک تو یہ لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کچھ نہ بگاڑ سکے، اور جب ان کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے آپ کو حدت بنالیا۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ ہم ابوطالب کی زندگی ہی میں ان سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ کا تصفیہ کر لیں تاکہ وہ ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دیں۔

چنانچہ یہ لوگ ابوطالب کے پاس پہنچے، اور جب ان سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے آپ انصاف سے کام لے کر اُن سے کہیے کہ وہ جس خدا کی چاہیں عبادت کریں، لیکن ہمارے معبودوں کو کچھ نہ کہیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اُن کے بتوں کو اس کے سوا کچھ نہ کہتے تھے کہ بے حس

اور بے جان ہیں۔ نہ تمہارے خالق ہیں نہ رازق ہیں۔ نہ تمہارا کوئی نفع نقصان ان کے قبضہ میں ہے۔ ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجلس میں بلوایا، اور آپ سے کہا کہ بھتیجے! یہ لوگ تمہاری شریعت کو گمراہی میں لے رہے ہیں کہ تم ان کے معبودوں کو گمراہ کہتے ہو۔ انھیں اپنے مذہب پر چھوڑ دو، اور تم اپنے خدا کی عبادت کرتے رہو، اس پر قریش کے لوگ بھی بولتے رہے۔

بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ”چچا جان! کیا میں انھیں اس چیز کی دعوت نہ دوں جس میں ان کی بہتری ہے؟“ ابو طالب نے کہا: ”وہ کیا چیز ہے؟“ آپ نے فرمایا ”میں ان سے ایک ایسا کلمہ کہلاانا چاہتا ہوں جس کے ذریعہ سارا عرب ان کے آگے سترگوں ہو جائے اور یہ پورے عجم کے مالک ہو جائیں“ اس پر ابو جہل نے کہا: ”بتاؤ وہ کلمہ کیا ہے؟ تمہارے باپ کی قسم! ہم ایک کلمہ نہیں دیں گے کہنے کو تیار ہیں“ اس پر آپ نے فرمایا ”بس لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کہہ دو، یہ سن کر تمام لوگ کھڑے کھڑے گھڑے ہوئے اور کہنے لگے ”کیا ہم سارے معبودوں کو چھوڑ کر صرف ایک کو اختیار کر لیں؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے“ اس موقع پر سورۃ ص کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۴ و ۲۸ ج ۴)۔

وَالضَّلَاقِ الْمَلَأَ مِنْهُمْ رِجْ - (اور ان کفار میں کے رتیں یہ کہتے ہوئے چل دیئے کہ رِجْ، اس سے مذکورہ واقعہ ہی کی طرف اشارہ ہے کہ توحید کی دعوت سن کر وہ مجلس سے چل کھڑے ہوئے۔

ذُرِّيَعَوْنَ ذُو الْأَوْتَارِ اس کے لفظی معنی ہیں ”میخوں والا فرعون“ اور اس کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے اس کی سلطنت کے استحکام کی طرف اشارہ ہے، اسی لئے حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ”جس کے کھونٹے گڑ گئے تھے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ وہ لوگوں کو اس طرح سزا دیا کرتا تھا کہ اسے چیت لٹا کر اس کے چاروں ہاتھ پاؤں میں میخیں گاڑ دیتا اور اس پر سانپ، بکھو چھوڑ دیتا تھا۔ اور بعض نے کہا کہ وہ رستی اور میخوں سے کوئی خاص کھیل کھیلا کرتا تھا۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ ”میخوں“ سے مراد عمارتیں ہیں، اور اس نے بڑی مضبوط عمارتیں بنائی تھیں۔ (تفسیر قرطبی) واللہ سبحانہ اعلم

أُولَئِكَ الْأَحْزَابُ اس کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ یہ جملہ مٹھنؤ و مڑھنؤ الْأَحْزَابِ کا بیان ہے۔ یعنی جن گروہوں کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے اسی کے مطابق تفسیر کی ہے۔ لیکن دوسرے مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ ”گروہ وہ تھے، یعنی اصل طاقت و قوت کی مالک قوم نوحؑ اور عاد و ثمود وغیرہ کی قومیں تھیں۔ مشرکین مکہ کی اُن کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں، جب وہ لوگ عذاب الہی سے نہ بچ سکے تو ان کی ہستی کیا ہے؟ (قرطبی)

فَالْهَامِ مِنْ فَوَاقٍ۔ فَوَاقِ کے عربی میں کئی معنی آتے ہیں۔ ایک تو ”ذوق“ اس درمیانی وقفہ کو کہتے

ہیں جس میں ایک مرتبہ دودھ دوسنے کے بعد دوبارہ اس کے تھنوں میں دودھ آجائے۔ نیز اس کے معنی "راحت آرام" کے بھی ہیں۔ بہر صورت! مطلب یہ ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام کا پھونکا ہوا صُور اس قدر مسلسل ہوگا کہ اس میں کوئی وقفہ نہ ہوگا۔ (قرطبی)

عَجَلْنَا لَكَ قِطَّنًا۔ "قِطَّنًا" اصل میں اُس دستاویز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی کو انعام دینے کا وعدہ کیا گیا ہو۔ پھر یہ لفظ مطلق "حصہ" کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں، کہ "آخرت کی جزا و سزا سے جو کچھ ہیں حصہ ملنا ہے وہ یہاں دلواد کیجئے۔"

إصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَادْخُرْ عَبْدًا نَادًا ذَا الْأَيْدِ إِنَّكَ

تو تحمل کرتا رہ اس پر جو وہ کہتے ہیں اور یاد کر ہمارے بندے داؤد قوت والے کو۔ وہ تھا رجوع

أَوَّابٌ ۱۷ إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعُشِيِّ ۱۸

رہنے والا ہم نے تابع کئے پہاڑ اس کے ساتھ پاکی بولتے تھے شام کو اور

الْوُشَاقِ ۱۸ وَالطَّيْرُ مَحْشُورَةٌ كُلُّ لَّهُ أَوَّابٌ ۱۹ وَشَدَدْنَا

صبح کو اور اڑتے جانور جمع ہو کر سب تھے اس کے آگے رجوع رہتے اور قوت دی

مُلْكَهُ ۲۰ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصَّلَ الْخِطَابِ ۲۱

ہم نے اس کی سلطنت کو اور دی اس کو تدبیر اور فیصلہ کرنا بات کا

خلاصہ تفسیر

آپ ان لوگوں کے اقوال پر صبر کیجئے اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کیجئے جو (عبادت میں جس میں صبر بھی داخل ہے) بڑی قوت (اور بہت) والے تھے (اور) وہ (خدا کی طرف) بہت رجوع ہونے والے تھے (اور ہم نے ان کو یہ نعمتیں عطا فرمائی تھیں :- ایک یہ کہ ہم نے پہاڑوں کو حکم کر رکھا تھا کہ ان کے ساتھ (شریک ہو کر) شام اور صبح (کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیح کے یہی اوقات تھے) تسبیح کیا کریں اور (اسی طرح) پرندوں کو بھی (یہی حکم دے رکھا تھا) جو کہ (تسبیح کے وقت ان کے پاس) جمع ہو جاتے تھے (اور یہ پہاڑ اور پرندے وغیرہ) سب ان کی (تسبیح کی) وجہ سے مشغول ذکر رہتے اور (دوسری نعمت یہ کہ) ہم نے انکی سلطنت کو نہایت قوت دی تھی اور (تیسری نعمت یہ کہ) ہم نے ان کو حکمت (یعنی نبوت) اور فیصلہ کر دینے والی تقریر (جو نہایت واضح اور جامع ہو) عطا فرمائی تھی۔

معارف و مسائل

کفار کی تکذیب و استہزاء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو صدمہ ہوتا تھا، اُسے دور کر کے تسلی دینے کے لئے عموماً اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے انبیاء علیہم السلام کے واقعات سنائے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی آپ کو صبر کی تلقین فرما کر بعض انبیاء علیہم السلام کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں جن میں سے پہلا واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کا ہے۔

وَإِذْ كُنَّا عَبْدًا لَّدَاوُدَ ذَا الْأَيْدِ - (اور یاد کیجئے ہمارے بندے داؤد کو جو قوت والے تھے) تقریباً

تمام مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ عبادت میں بڑی قوت و سمیت کا ثبوت دیتے تھے اسی لئے اس کے بعد یہ جملہ ہوا: - إِنَّهُ أَقْدَرُ (بلاشبہ وہ اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے) چنانچہ صحیحین کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: - ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ نماز داؤد علیہ السلام کی ہے، اور سب سے زیادہ پسندیدہ روزہ داؤد علیہ السلام کے ہیں وہ آدھی رات سوتے، ایک تہائی رات عبادت کرتے اور پھر رات کے چھٹے حصہ میں سو جاتے تھے اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار فرماتے تھے، اور جب دشمن سے ان کا مقابلہ ہو جاتا تو فرار اختیار نہ فرماتے تھے۔ اور بلاشبہ وہ اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے“ (تفسیر ابن کثیر)

عبادت کے اس طریقہ کو سب سے زیادہ پسندیدہ اس لئے قرار دیا گیا کہ ایک تو اس میں مشقت زیادہ ہے ساری عمر روزہ رکھنے سے آدمی روزے کا عادی ہو جاتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد اس میں زیادہ مشقت نہیں رہتی، لیکن ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھنے میں تکلیف مسلسل رہتی ہے، دوسرے اس طریقہ سے انسان عبادت کے ساتھ ساتھ اپنے نفس، اہل و عیال اور متعلقین کے حقوق بھی پوری طرح ادا کر سکتا ہے۔

إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ، الخ - اس آیت میں پہاڑوں اور پرندوں کے حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ شریک تسلیم ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کی تشریح سورۃ انبیاء اور سورۃ سباء میں گئے رکھی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کو باری تعالیٰ نے یہاں اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام پر ایک خاص انعام تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے نعمت کیسے ہوئی؟ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح سے کیا خاص فائدہ پہنچا؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک معجزہ ظاہر ہوا، اور ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا انعام ہے۔ اس کے علاوہ حضرت تھانویؒ نے ایک لطیف توجہ یہ فرمائی ہے کہ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح سے ذکر و شغل کا ایک خاص کیفیت پیدا ہو گیا تھا جس سے عبادت میں نشاط اور تازگی

وَهَلْ أَتَاكَ نَبَوَّا الْخَصَمِ إِذْ تَسَوَّرُوا بِالْمِحْرَابِ ۖ (۲۱) إِذْ دَخَلُوا

اور پہنچی ہے تجھ کو خبر دو گئے والوں کی جب دیوار کو دکر آئے عبادت خانے میں جب گھس آئے

عَلَى دَاوُدَ فَقَرِعَ مِنْهُمْ قَالُوا لَا تَخَفْ خَصْمَانِ بَغَى

داؤد کے پاس تو ان سے گھبرایا - وہ بولے مت گھبرا ہم دو جھگڑاتے ہیں -

بَعْضُنَا عَلَى بَعْضٍ فَأَحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تَشْطِطْ وَاهْدِنَا

زیادتی کی ہے ایک نے دوسرے پر سو فیصلہ کر دے ہم میں انصاف کا اور دور نہ ڈال بات کو اور

إِلَى سَوَاءٍ الصِّرَاطِ ۖ (۲۲) إِنَّ هَذَا أَرْخَىٰ تَفَالَهُ تَسْعُ وَتَسْعُونَ

بتلا دے ہم کو سیدھی راہ - یہ جو ہے بھائی میرا اس کے یہاں ہیں مٹاؤے

نَجَّةً وَلِي نَجَّةً وَاحِدَةً فَقَالَ أَكْفُلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي

دُنْيَاں اور میرے یہاں ایک کو نبی پھر کہتا ہے حوالے کرے میرے وہ بھی اور زبردستی کرتا ہے

الْخِطَابِ ۖ (۲۳) قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُوءِ آلٍ نَعَجْتِكِ إِلَى

مجھ سے بات میں بولا وہ بے انصافی کرتا ہے تجھ پر کہ مانگتا ہے تیری دُنیاں ملائے کو اپنی

نِعَاجِهِ ۖ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَى

دُنئیوں میں اور اکثر شریک زیادتی کرتے ہیں ایک دوسرے پر

بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ

مگر جو یقین لائے ہیں اور کام کئے نیک اور حق پرست

مَّا هُمْ وَطَنٌ دَاوُدَ أَنْ مَّا فَتَنَهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ

لوگ ہیں ایسے - اور خیال میں آیا داؤد کے کہ ہم نے اس کو جانچا پھر گناہ بخشوائے لگا اپنے رب سے

رَاكِعًا وَأَنَابَ ۖ (۲۴) فَغَفَرْنَا لَهُ ذَلِكَ ۖ وَإِنَّ لَكَ عِندَنَا

اور گر پڑا جھک کر اور رجوع ہوا پھر ہم نے معاف کر دیا اس کو وہ کام اور اس کے لئے ہمارے پاس

لَزُلْفَىٰ وَحُسْنِ مَّآبٍ ۖ (۲۵)

مرتبہ ہے اور اچھا ٹھکانا -

خلاصہ تفسیر

اور بھلا آپ کو ان اہل مقدمہ کی خبر بھی پہنچی ہے (جو داؤد علیہ السلام کے پاس مقدمہ لائے تھے جبکہ وہ لوگ داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ کی دیوار بھانڈ کر داؤد علیہ السلام کے پاس آئے) کیونکہ دروائے سے پہرہ داروں نے اس لئے نہیں آنے دیا کہ وہ وقت آپ کی عبادت کا تھا، مقدمات کے فیصلے کا نہیں،

ہمت پیدا ہوتی ہے۔ اجتماعی ذکر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ذکر کی برکتوں کا ایک دوسرے پر انعکاس ہوتا رہتا ہے۔ صوفیائے کرام کے یہاں ذکر و شغل کا ایک خاص طریقہ معروف ہے جس میں ذکر کرتے ہوئے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ پوری کائنات ذکر کر رہی ہے، اصلاح باطن اور شوق عبادت میں اس طریقہ کی عجیب تاثیر ہے۔ اس آیت سے اس طریقہ ذکر کی بنیاد بھی مستنبط ہوتی ہے (مسائل السلوک)

صلوۃ الفحی | بِالْعِشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ۔ عِشِیُّ کے معنی ہیں ظہر کے بعد سے اگلے دن صبح تک کا وقت اور اِشْرَاق کے معنی صبح کا وہ وقت جس میں دھوپ زمین پر پھیل گئی ہو۔ اس آیت سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے صلوۃ الفحی کے مشروع ہونے پر استدلال فرمایا ہے۔ صلوۃ الفحی کو صلوۃ الاذہین اور بعض حضرات صلوۃ الاشراف بھی کہتے ہیں۔ اگرچہ بعد میں صلوۃ الاذہین کا نام مغرب کے بعد کی چھ نفلوں کے لئے اور صلوۃ الاشراف طلوع آفتاب کے متصل والی دو یا چار نفلوں کے لئے زیادہ مشہور ہو گیا۔

صلوۃ الفحی میں دو سے لیکر بارہ تک جتنی رکعتیں چاہیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ حدیث میں اس کے بہت سے فوائد وارد ہوئے ہیں۔ جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”جو شخص صلوۃ الفحی کی دو رکعتوں کی پابندی کر لے اُس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، خواہ وہ سمندری جھاگ جتنے ہوں“ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”جو شخص صلوۃ الفحی کی بارہ رکعتیں پڑھے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں سونے کا محل بنادے گا“ (قرطبی)

علمائے فرمایا ہے کہ یوں تو دو سے لیکر بارہ تک جتنی رکعتیں پڑھی جاسکیں وہ ٹھیک ہیں، لیکن تعداد کے لئے کوئی خاص معمول بنالیا جائے تو بہتر ہے، اور یہ معمول کم از کم چار رکعت ہو تو زیادہ اچھا ہے کیونکہ آپ کا عام معمول چار رکعتیں ہی پڑھنے کا تھا۔

وَأَتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصَّلَ الْخِطَابِ (اور ہم نے ان کو حکمت اور فیصلہ کر دینے والی تقریر عطا فرمائی) حکمت سے مراد تو دانائی ہے، یعنی ہم نے انھیں عقل و فہم کی دولت بخشی تھی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ نبوت مراد ہے۔ اور ”فَصَّلَ الْخِطَابِ“ کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد زور بیان اور قوت خطابت ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے خطیب ہونے اور خطبوں میں حمد و صلوۃ کے بعد لفظ ”أَمَّا بَعْدُ“ سب سے پہلے انھوں نے ہی کہنا شروع کیا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے بہترین قوت فیصلہ مراد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو جھگڑے چکانے اور تنازعات کا فیصلہ کرنے کی قوت عطا فرمائی تھی۔ درحقیقت ان الفاظ میں بیک وقت دونوں معنی کی پوری گنجائش ہے اور یہ دونوں باتیں ہی مراد ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جو اس کا ترجمہ فرمایا ہے اس میں بھی دونوں معنی سما سکتے ہیں۔

تو وہ (ان کے اس بے قاعدہ آنے سے) گھبرا گئے (کہ کہیں یہ لوگ دشمن نہ ہوں جو قتل کے ارادے سے اس طرح تنہائی میں آگھسے ہوں) وہ لوگ (اُن سے) کہنے لگے کہ آپ ڈریں نہیں، ہم دواہل معاملہ ہیں کہ ایک نے دوسرے پر (کچھ) زیادتی کی ہے (اس کے فیصلے کے لئے ہم آئے ہیں، چونکہ پہرہ داروں نے دروازہ سے نہیں آنے دیا۔ اس لئے اس طرح آنے کے مرتکب ہوئے) سو آپ ہم میں انصاف سے فیصلہ کر دیجئے، اور بے انصافی نہ کیجئے اور ہم کو (معاملہ) سیدھی راہ بتلا دیجئے (اور پھر ایک شخص بولا کہ صورت مقدمہ یہ ہے کہ) یہ شخص میرا بھائی ہے (یعنی دینی بھائی جیسا کہ درمنثور میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نقل ہے اور) اس کے پاس تیناؤں دُنبیاں ہیں اور میرے پاس (کل)، ایک دُنبی ہے۔ سو یہ کہتا ہے کہ وہ بھی مجھ کو دے ڈال اور بات چیت میں مجھ کو دباتا ہے (اور میری بات کو منہ زوری سے چلنے نہیں دیتا) داؤد (علیہ السلام) نے کہا کہ یہ جو تیری دُنبی اپنی دُنبیوں میں ملانے کی درخواست کرتا ہے تو واقعی تجھ پر ظلم کرتا ہے اور اکثر شرکار (کی عادت ہے کہ) ایک دوسرے پر (یوں ہی) زیادتی کیا کرتے ہیں، مگر ہاں جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں، اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں (یہ بات آپ نے مظلوم کی تسلی کے لئے ارشاد فرمائی) اور داؤد (علیہ السلام) کو خیال آیا کہ (اس مقدمہ کو اس طرح پیش کر کے) ہم نے ان کا امتحان کیا ہے، سو انھوں نے اپنے رب کے سامنے توبہ کی اور سجدہ میں گر پڑے اور (خاص طور پر خدا کی طرف) رجوع ہوئے، سو ہم نے ان کو وہ (امر) معاف کر دیا، اور ہمارے یہاں اُن کے لئے (خاص) قرب اور (اعلیٰ درجہ کی) نیک انجامی (یعنی جنت کا درجہ علیا) ہے۔

معارف و مسائل

ان آیات میں باری تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ ذکر فرمایا ہے۔ قرآن کریم میں یہ واقعہ جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی عبادت گاہ میں دو فریقوں کو جھگڑتے ہوئے بھیج کر اُن کا کوئی امتحان کیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس امتحان پر متنبہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا اور سجدے میں گر پڑے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرمادی۔ قرآن کریم کا اصل مقصد چونکہ یہاں یہ بیان کرنا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور کبھی ذرا سی لغزش بھی ہو جائے تو فوراً استغفار کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں یہ تفصیل بیان نہیں کی گئی کہ وہ امتحان کیا تھا؟ حضرت داؤد علیہ السلام سے وہ کونسی لغزش ہوئی تھی جس سے انھوں نے استغفار کیا؟ اور جسے اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادیا۔ اسی لئے بعض محقق اور محتاط مفسرین نے ان آیات کی تشریح میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص حکمت و مصالحت سے اپنے جلیل القدر پیغمبر کی اس لغزش اور امتحان کی تفصیل کو کھول کر بیان

نہیں فرمایا، اس لئے ہمیں بھی اس کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے۔ اور جتنی بات قرآن کریم میں مذکور ہے، صرف اسی بات پر ایمان رکھنا چاہیے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ جیسے محقق مفسر نے اپنی تفسیر میں اسی پر عمل کرتے ہوئے واقعہ کی تفصیلات سے خاموشی اختیار کی ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ یہ سب سے زیادہ محتاط اور سلامتی کا راستہ ہے۔ اسی لئے علماء سلف سے منقول ہے کہ ابھموا ما ابھموا اللہ، یعنی جس چیز کو اللہ نے مبہم چھوڑا ہے تم بھی اس کو مبہم رہنے دو۔ اسی میں حکمت و مصلحت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد ایسے معاملات کا ابہام ہے جن سے ہمارے عمل اور حلال و حرام کا تعلق نہ ہو اور جن معاملات سے مسلمانوں کے عمل کا تعلق ہو اس ابہام کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے رفع کر دیا ہے۔

البتہ دوسرے مفسرین نے روایات و آثار کی روشنی میں اس امتحان اور آزمائش کو مستعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک عامیانہ روایت تو یہ مشہور ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر ایک مرتبہ اپنے ایک فوجی انسر ادریا کی بیوی پر پڑ گئی تھی۔ جس سے ان کے دل میں اس کے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش پیدا ہوئی، اور انھوں نے ادریا کو قتل کرانے کی غرض سے اُسے خطرناک ترین مشن سونپ دیا جس میں وہ شہید ہو گیا، اور بعد میں آپ نے اس کی بیوی سے شادی کر لی۔ اس عمل پر تنبیہ کرنے کے لئے یہ دو فرشتے انسانی شکل میں بھیجے گئے۔

لیکن یہ روایت بلاشبہ اُن خرافات میں سے ہے جو یہودیوں کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی پھیل گئی تھیں۔ یہ روایت دراصل بائبل کی کتاب سموئیل دوم باب ۱۱ سے ماخوذ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بائبل میں کھلم کھلا حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے معاذ اللہ ادریا کی بیوی سے نکاح سے قبل ہی زنا کار تکاب کیا تھا۔ اور ان تفسیری روایتوں میں زنا کے جُزر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اس اسرائیلی روایت کو دیکھا اور اس میں سے زنا کے قصے کو نکال کر اُسے قرآن کریم کی مذکورہ آیتوں پر چسپاں کر دیا۔ حالانکہ یہ کتاب سموئیل ہی سرے سے بے اصل ہے اور یہ روایت قطعی کذب و افتراء کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے تمام محقق مفسرین نے اس کی سخت تردید کی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے علاوہ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ، قاضی ابوالسعود رحمہ اللہ، قاضی بیہناوی رحمہ اللہ، قاضی عیاض رحمہ اللہ، امام رازی رحمہ اللہ، علامہ ابو حیان اندلسی رحمہ اللہ، خازن رحمہ اللہ، زنجیزی رحمہ اللہ، ابن حزم رحمہ اللہ، علامہ خفاجی رحمہ اللہ، احمد بن نصر رحمہ اللہ، ابوتام رحمہ اللہ، اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اسے کذب و افتراء قرار دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:-

”بعض مفسرین نے یہاں ایک قصہ ذکر کیا ہے جس کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بارے میں کوئی ایسی بات ثابت نہیں جس کا اتباع واجب ہو صرف ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یہاں ایک حدیث روایت کی ہے۔ مگر اس کی سند صحیح نہیں ہے۔
غرض بہت سے دلائل کی روشنی میں جن کی کچھ تفصیل امام رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کبیر اور ابن جوزی رحمہ اللہ کی زاد المسیر وغیرہ میں موجود ہے، یہ روایت تو اس آیت کی تفسیر میں قطعاً خارج از بحث ہو جاتی ہے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس آزمائش اور لغزش کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ مقدمہ کے یہ دو فریق دیوار بھانڈ کر داخل ہوئے، اور طرز مخاطبت بھی انتہائی گستاخانہ اختیار کیا کہ شروع ہی میں حضرت داؤد علیہ السلام کو انصاف کرنے اور ظلم نہ کرنے کی نصیحتیں شروع کر دیں، اس انداز کی گستاخی کی بنا پر کوئی عام آدمی ہوتا تو انھیں جواب دینے کے بجائے اُلٹی سزا دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ امتحان فرمایا کہ وہ بھی عقدہ میں آکر انھیں سزا دیتے ہیں یا پیغمبرانہ عفو و تحمل سے کام لے کر ان کی بات سنتے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام اس امتحان میں پورے اثرے، لیکن اتنی سی فرو گذاشت ہو گئی کہ فیصلہ سناتے وقت ظالم کو خطاب کرنے کے بجائے مظلوم کو مخاطب فرمایا جس سے ایک گونہ جانبداری مترشح ہوتی تھی مگر اس پر فوراً تنبیہ ہوا اور سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف فرمادیا۔ (بیان القرآن)
بعض مفسرین نے لغزش کی یہ تشریح کی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعا علیہ کو خاموش دیکھا تو اس کا بیان سُننے بغیر صرف مدعی کی بات سُن کر اپنی نصیحت میں ایسی باتیں فرمائیں جن سے فی الجملہ مدعی کی تائید ہوتی تھی، حالانکہ پہلے مدعا علیہ سے پوچھنا چاہیے تھا کہ اس کا موقف کیا ہے؟ حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ ارشاد اگرچہ صرف ناصحانہ انداز میں تھا اور ابھی تک مقدمہ کے فیصلے کی نوبت نہیں آئی تھی، تاہم ان جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایان شان نہیں تھا۔ اسی بات پر آپ بعد میں متنبیہ ہو کر سجدہ ریز ہو گئے۔

(روح المعانی)

بعض حضرات نے فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا نظم اوقات ایسا بنایا ہوا تھا کہ جو عرصے گھنٹے میں ہر وقت گھر کا کوئی نہ کوئی فرد عبادت، ذکر اور تسبیح میں مشغول رہتا تھا، ایک روز انھوں نے باری تعالیٰ سے عرض کیا کہ پروردگار! دن اور رات کی کوئی گھڑی ایسی نہیں گزرتی جس میں داؤد کے گھر والوں میں سے کوئی نہ کوئی آپ کی عبادت، نماز اور تسبیح و ذکر میں مشغول نہ ہو، باری تعالیٰ نے فرمایا کہ داؤد! یہ سب کچھ میری توفیق سے ہے، اگر میری مدد شامل حال نہ ہو تو یہ بات تمہارے بس کی نہیں ہے، اور ایک دن میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں گا۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ وقت حضرت داؤد علیہ السلام کے مشغول عبادت ہونے کا تھا۔ اس ناگہانی تفسیہ سے ان کے اوقات کا نظم مختل ہو گیا حضرت داؤد علیہ السلام جب گھڑی اچکانے میں مشغول ہو گئے، آل داؤد علیہ السلام کا کوئی اور فرد بھی اس وقت

عبادت اور ذکر الہی میں مصروف نہ تھا۔ اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو تنبیہ ہوا کہ وہ فخر یہ کلمہ جو زبان سے نکل گیا تھا، یہ مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ اس لئے آپ نے استغفار فرمایا اور سجدہ ریز ہو گئے۔ اس توجیہ کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک ارشاد سے بھی ہوتی ہے جو مستدرک حاکم میں صحیح سند کے ساتھ منقول ہے۔ (احکام القرآن)

ان تمام تشریحات میں یہ بات مشترکہ طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ مقدمہ فرضی نہیں بلکہ حقیقی تھا، اول صورت مقدمہ کا حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش یا لغزش سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے برخلاف بہت سے مفسرین نے اس کی ایسی تشریح فرمائی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مقدمہ کے یہ فریقین انسان نہیں، بلکہ فرشتے تھے، اور انھیں اللہ تعالیٰ نے اس لئے بھیجا تھا کہ وہ ایسی فرضی صورت مقدمہ پیش کریں جس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی لغزش پر تنبیہ ہو جائے۔

چنانچہ ان حضرات کا یہ کہنا ہے کہ داؤد یا کو قتل کرانے اور اس کی بیوی سے نکاح کر لینے کا وہ قصہ تو غلط ہے، لیکن حقیقت حال یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں کسی شخص سے یہ فرمائش نہ کی گئی تھی کہ اس سے نکاح کر لیں، بلکہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس کا نکاح مجھ سے کر دو۔ اس زمانے میں اس فرمائش کا عام رواج بھی تھا۔ اور یہ بات خلاف مروت بھی نہ سمجھی جاتی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسی بنا پر اور یا سے یہی فرمائش کی تھی، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ دو فرشتے بھیج کر آپ کو تنبیہ فرمائی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ بات صرف اتنی تھی کہ داؤد یا نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا ہوا تھا، حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی اسی عورت کو اپنا پیغام دیدیا، اس سے اور یا کو بہت رنج ہوا اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ کے لئے یہ دو فرشتے بھیجے اور ایک لطیف پیرایہ میں اس لغزش پر تنبیہ فرمائی۔ قاضی ابویعلیٰ رحمہ اللہ نے اس توجیہ پر قرآن کریم کے الفاظ وَعَزَّیْ فِی الْخِطَابِ سے استدلال فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ معاملہ محض خطبہ (منگنی) کے سلسلہ میں پیش آیا تھا۔ اور ابھی حضرت داؤد علیہ السلام نے اس سے نکاح نہیں فرمایا تھا۔

(زاد المسیر لابن الجوزی ص ۱۱۶ - ج ۴)

اکثر مفسرین نے ان آخری دو تشریحات کو ترجیح دی ہے اور ان کی تائید بعض آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو روح المعانی، تفسیر ابی السعود، تفسیر کبیر وغیرہ) لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس آزمائش اور لغزش کی تفصیل نہ قرآن کریم سے ثابت ہے، نہ کسی صحیح حدیث سے۔ اس لئے اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ اور یا کو قتل کر دینے کا جو قصہ مشہور ہے، وہ غلط ہے، لیکن اصل واقعہ کے بارے میں مذکورہ بالا تمام احتمالات موجود ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو قطعی اور یقینی نہیں کہا جاسکتا۔ لہذا سلامتی کی راہ وہی ہے جو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اختیار کی کہ جس بات کو اللہ تعالیٰ نے مبہم چھوڑا ہے،

ہم اپنے قیاسات اور اندازوں کے ذریعہ اس کی تفصیل کی کوشش نہ کریں۔ جبکہ اس سے ہمارے کسی عمل کا تعلق نہیں۔ اس ابہام میں بھی یقیناً کوئی حکمت ہے۔ لہذا صرف اتنے واقعہ پر ایمان رکھا جائے جو قرآن کریم میں مذکور ہے، باقی تفصیلات کو اللہ کے حوالے کیا جائے۔ البتہ اس واقعہ سے متعدد عملی فوائد حاصل ہوتے ہیں زیادہ توجہ ان کی طرف دینی چاہیے۔ اسلئے اب آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے جس میں انشاء اللہ ان فوائد کا ذکر آجائے گا۔

اِذْ تَسُوْرُ وَالْمِحْرَابِ (جب وہ محراب کی دیوار پھانڈ کر داخل ہوئے) مِحْرَابٌ دراصل بالاخانے یا کسی مکان کے سامنے کے حصّہ کو کہتے ہیں۔ پھر خاص طور سے مسجد یا عبادت خانے کے سامنے کے حصّہ کو کہا جانے لگا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ عبادت گاہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ مسجد کے دائرہ نما محرابیں جیسی آجکل معروف ہیں، یہ عہد نبوی میں موجود نہیں تھیں (روح المعانی)۔ فَفَزِعَ مِنْهُمْ دَاوُدُ (پس حضرت داؤد ان سے گھبرا گئے) گھبرانے کی وجہ صاف ظاہر تھی کہ داؤد کا بے وقت پہرہ توڑ کر اس طرح گھس آنا عموماً کسی بُری نیت ہی سے ہوتا ہے۔

طبعی خوفِ نبوت یا ولایت اس سے معلوم ہوا کہ کسی خوفناک چیز سے طبعی طور پر گھبرا جانا نبوت اور ولایت کے منافی نہیں ہے۔ ہاں اس خوف کو دل و دماغ پر طاری کر کے اپنے ذہن کو چھوڑ دینا ضرور بُرا ہے۔ اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم میں انبیاء کی شان یہ بیان کی گئی ہے لَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ۔ (وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے) پھر یہاں حضرت داؤد علیہ السلام کو خوف کیوں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ڈرنے کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک ڈر تو موزی اشیاء کے تکلیف پہنچانے سے ہوتا ہے، اُسے عربی میں خَوْفٌ کہتے ہیں۔ دوسرا ڈر کسی بڑے کی عظمتِ جلالتِ شان اور رعب کی وجہ سے ہوتا ہے، اُسے خَشْيَةٌ کہا جاتا ہے۔ (مفردات، راغب) خشیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہونی چاہیے، اور انبیاء علیہم السلام کی شان یہی ہوتی ہے کہ اللہ کے سوا ان پر کسی کی خشیت طاری نہیں ہوتی۔ ہاں خوفِ طبعی موزی اشیاء سے ہو سکتا ہے۔

قَالُوا لَا تَخَفْ (انہوں نے کہا ڈرے نہیں) آنے والوں نے یہ کہہ کر اپنی بات بیان کرنی شروع کر دی، اور حضرت داؤد علیہ السلام خاموشی سے ان کی بات سُنتے رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اچانک کسی بے قاعدگی کا مرتکب ہو تو اُسے فوراً ملاست اور زبردستی شروع نہیں کر دینی چاہیے، بلکہ پہلے اس کی بات مٹنی چاہیے۔ تاکہ اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے پاس اس بے قاعدگی کا جواز تھا یا نہیں۔ کوئی اور ہوتا تو آنے والوں پر فوراً برس پڑتا، لیکن حضرت داؤد علیہ السلام نے انکشافِ حقیقت کا انتظار فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ معذور ہوں۔

وَلَا تُشْطِطْ (اور بے انصافی نہ کیجئے)، آئے والے کا یہ اندازِ خطاب بظاہر بڑا گستاخانہ تھا، اول تو دیوار بچاند کر بے وقت آنا، پھر اگر حضرت داؤد علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو انصاف کرنے اور ظلم سے بچنے کا درس دینا، یہ سب اٹھڑپن کی باتیں تھیں، لیکن حضرت داؤد علیہ السلام نے ان سب باتوں پر صبر فرمایا اور انھیں کچھ برا بھلا نہیں کہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو اللہ نے کوئی بڑا مرتبہ دیا ہو اور
لوگوں کی ضروریات اس سے متعلق ہوں اُسے چاہیے کہ وہ اہل حاجت
کی بے قاعدگیوں اور گفتگو کی غلطیوں پر حتی الوسع صبر کرے کہ یہی اس کے
مرتبہ کا تقاضا ہے۔ خاص طور سے حاکم، قاضی اور مفتی کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ (روح المعانی)

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ لِسَوَّالٍ نَعْبَتِكَ اِلَىٰ لِفَاعِهِ - (داؤد علیہ السلام نے کہا کہ اُس نے جو تیری دُستی اپنی دُستیوں میں ملانے کی درخواست کی ہے تو واقعی تجھ پر ظلم کیا ہے) یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ فقرہ صرت مدعی کی بات سُن کر ارشاد فرمادیا، مدعا علیہ کا بیان نہیں سُننا۔ اس پر بعض حضرات نے تو یہ کہا ہے کہ وہ لغزش جس پر آپ نے استغفار فرمایا، یہی لغزش تھی۔ لیکن دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ درحقیقت یہاں مقدمہ کی پوری تفصیلات بیان نہیں ہو رہی ہیں، صرف ضروری باتیں بیان کی گئی ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام یقیناً مدعا علیہ سے اس کا موقف سُننا ہو گا۔ لیکن اُسے یہاں اس لئے بیان نہیں کیا گیا کہ فیصلوں کا معروف طریقہ یہی ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہاں مدعا علیہ سے پوچھنے کا جُز و محذوف ہے۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ اگرچہ آنے والوں نے حضرت داؤد علیہ السلام سے عدالتی فیصلہ طلب کیا تھا، لیکن نہ وہ وقت عدالت کا تھا، نہ مجلس تصانک مفتی، نہ وہاں حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس اپنے فیصلہ کو نافذ کرنے کے وسائل جمع تھے۔ اس لئے حضرت داؤد علیہ السلام نے قاضی کی حیثیت میں نہیں بلکہ مفتی کی حیثیت میں فتویٰ دیا۔ اور مفتی کا کام واقعہ کی تحقیق کرنا نہیں ہوتا، بلکہ جیسا سوال ہو، اسی کے مطابق جواب دینا ہوتا ہے۔

کسی قسم کے دباؤ کے ساتھ چندہ یا ہدیہ بھی طلب کرنا غضب ہے

اس سے معلوم یہ ہوا کہ اگر کوئی آدمی کسی سے اس طرح کوئی چیز مانگے کہ مخاطب راضی ہو یا ناراض

لیکن اس کے پاس دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو اس طرح ہدیہ طلب کرنا بھی غصب میں داخل ہے لہذا اگر مانگنے والا کوئی صاحب اقتدار یا ذی وجاہت شخص ہو اور مخاطب اس کی شخصیت کے دباؤ کی وجہ سے انکار نہ کر سکتا ہو، تو وہاں صورت چاہے ہدیہ طلب کرنے کی ہو، لیکن حقیقت میں وہ غصب ہی ہوتا ہے اور مانگنے والے کے لئے اس طرح حاصل کی ہوئی چیز کا استعمال جائز نہیں ہوتا۔ مسئلہ خاص طور پر ان لوگوں کے لئے بہت توجہ کرنے کا ہے، جو مدارس و مکاتب، مسجد یا انجمنوں اور جماعتوں کے لئے چندے وصول کرتے ہیں۔ صرف وہ چندہ حلال طیب ہے جو دیئے والے نے اپنے مکمل اختیار اور خوش دلی کے ساتھ دیا ہو۔ اور اگر چندہ کرنے والوں نے اپنی شخصیت کا دباؤ ڈال کر یا بیک وقت آٹھ دس آدمیوں نے کسی ایک شخص کو زچ کر کے چندہ وصول کر لیا تو یہ صریح ناجائز فعل ہے۔

حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ:-
 لَا يَحِلُّ مَالٌ أَمْدِيٍّ سَلَمٌ إِلَّا بِطَيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ
 کسی مسلمان کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں

وَرَأَى كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِيَنَّ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ -
 (اور بہت سے مشرکار ایک دوسرے پر زیادتی کیا کرتے ہیں، اس سے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔)
 اس بات پر تنبیہ کر دی ہے کہ جب دو انسانوں میں شرکت کا کوئی معاملہ ہو تو اس میں اکثر ایک دوسرے کی حق تلفیاں ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات ایک آدمی ایک کام کو معمولی سمجھ کر گزر رہا ہے، لیکن درحقیقت وہ گناہ کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

وَظَنَّ دَاوُدُ أَنَّهُ وَافَقَتْهُ - (اور داؤد علیہ السلام کو خیال آیا کہ ہم نے ان کا امتحان کیا ہے) اگر مقدمہ کی صورت کو حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش کی تیش قرار دیا جائے تب تو یہ خیال آنا ظاہری ہے۔ اور اگر صورت مقدمہ کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو، تب بھی فریقین کی مجموعی حالت یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی تھی کہ یہ امتحان بھیجے گئے ہیں۔ ایک طرف تو ان فریقوں نے مقدمہ کے فیصلے کے لئے اتنی جلد بازی اور جرات سے کام لیا کہ دیوار پھانڈ کر چلے آئے۔ دوسری طرف جب مقدمہ پیش ہوا، تو مدعا علیہ خاموش بیٹھا رہا، اور قوی یا عملی طور سے مدعی کی بات کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا۔

اگر مدعی کے بیان کردہ واقعہ کو مدعا علیہ تسلیم کرتا تھا تو جھگڑے کا فیصلہ کرانے کے لئے حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آنے کی ضرورت ہی نہ تھی، ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اس صورت میں مدعی کے حق میں ہی فیصلہ کریں گے۔ فریقین کا یہ پراسرار طریقہ عمل بتا رہا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے بھانپ لیا کہ یہ اللہ کے بھیجے ہوئے

آئے ہیں اور میرا امتحان مقصود ہے۔ اور بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ فیصلہ سننے کے بعد وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر چلے گئے۔ واللہ اعلم

فَاسْتَغْفِرْ رَبَّكَ وَخُذْ رَاكِعًا وَأَنَابَ۔ (اپس انہوں نے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کی، اور سجدے میں گر پڑے اور رجوع ہوئے) یہاں دراصل رکوع کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے لغوی معنی جھکنے کے ہیں۔ اور اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد سجدہ ہے۔ احناف کے نزدیک اس آیت کی تلاوت سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔

اور امام ابو حنیفہ رحمہ نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اگر نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کی گئی ہے تو رکوع میں سجدہ کی نیت کر لینے سے سجدہ ادا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہاں باری تعالیٰ نے سجدہ کے لئے رکوع کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ رکوع بھی سجدہ کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں چند ضروری مسائل یاد رکھنے چاہئیں۔

مسئلہ نماز کے فرض رکوع کے ذریعہ سجدہ صرف اس صورت میں ادا ہو سکتا ہے جبکہ سجدے کی آیت نماز میں پڑھی گئی ہو، نماز سے باہر تلاوت کرنے میں رکوع سے سجدہ ادا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ رکوع صرف نماز میں عبادت ہے، نماز سے باہر مشروع نہیں (بدائع)۔ **مسئلہ رکوع میں سجدہ صرف اس وقت ادا ہوگا جبکہ آیت سجدہ تلاوت کرنے کے فوراً بعد یا زیادہ سے دو تین آیتیں مزید تلاوت کر کے رکوع کر لیا ہو۔** اور اگر آیت سجدہ کے بعد کھڑے کھڑے طویل قرات کی ہو تو سجدہ رکوع میں ادا نہیں ہوگا۔ **مسئلہ اگر سجدہ تلاوت رکوع میں ادا کرنے کا خیال ہو تو رکوع میں جاتے وقت سجدہ تلاوت کی نیت کر لینے چاہیے، ورنہ اس رکوع سے سجدہ ادا نہیں ہوگا۔** ہاں جب سجدہ میں جانے لگا تو بلا نیت بھی سجدہ ادا ہو جائے گا۔ **مسئلہ افضل بہر حال یہی ہے کہ سجدہ تلاوت کو نماز کے فرض رکوع میں ادا کرنے کے بجائے مستقل سجدہ کیا جائے۔** اور سجدہ سے اٹھ کر ایک دو آیتیں تلاوت کر کے پھر رکوع میں جائیں۔ (بدائع)

وَإِنَّ لَهُ عِجْلًا فَأَنفَخُوا فِيهِنَّ وَمَا يُبِـلُ الْأَبْصَارُ - (اور بلاشبہ ان کے لئے ہمارے یہاں خاص تقرب اور نیک انجامی ہے) اس آیت پر واقعہ کو ختم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش جو کچھ بھی رہی ہو، ان کے استغفار اور انابت کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے تعلق میں اور اضافہ ہو گیا۔

اس واقعہ سے متعلق ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش غلطی پر تنبیہ میں حکمت کی رعایت خواہ کچھ رہی ہو، اللہ تعالیٰ براہ راست وحی کے ذریعہ بھی آپ کو

اس پر متنبہ فرما سکتے تھے۔ لیکن اس کے بجائے ایک مقدمہ بھیج کر تنبیہ کے لئے یہ خاص طریقہ کیوں اختیار کیا گیا؟
درحقیقت اس طریقہ پر غور کرنے سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والوں کو یہ ہدایت
کی گئی ہے کہ کسی شخص کو اس کی غلطی پر تنبیہ کے لئے حکمت سے کام لینے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ایسا
طریقہ اختیار کرنا زیادہ اچھا ہے جس سے متعلقہ شخص خود بخود اپنی غلطی کو محسوس کر لے اور اسے زبانی تنبیہ
کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اور اس کے لئے ایسی تمثیلات سے کام لینا زیادہ مؤثر ہوتا ہے جس سے کسی
کی دل آزاری بھی نہ ہو اور ضروری بات بھی واضح ہو جائے۔

يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ

اے داؤد ہم نے کیا تجھ کو نائب ملک میں سو تو حکومت کر لوگوں میں

بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ اِنَّ

انصاف سے اور نہ چل جی کی خواہش پر پھر وہ تجھ کو بھلاوے اللہ کی راہ سے مقرر

الَّذِينَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا

جو لوگ بھلتے ہیں اللہ کی راہ سے ان کو سخت عذاب ہے اس بات پر

تَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾

کہ بھلا دیا انہوں نے دن حساب کا -

خلاصہ تفسیر

اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے، سو (جس طرح اب تک کرتے رہے ہو، اسی طرح آئندہ بھی)
لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور (جس طرح اب تک کبھی نفسانی خواہش کی پیروی نہیں کی)
اسی طرح آئندہ بھی، نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا کہ (اگر ایسا کر دگے تو) وہ خدا کے رستہ سے تم کو
بھٹکا دے گی (اور) جو لوگ خدا کے رستہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہوگا اس وجہ سے کہ وہ
روزِ حساب کو بھٹو لے رہے۔

معارف و مسائل

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ حکومت و سلطنت بھی عطا فرمائی تھی،
چنانچہ اس آیت میں حکومت و سیاست کے لئے آپ کو ایک بنیادی ہدایت نامہ عطا کر دیا گیا ہے۔ اس
ہدایت نامہ میں تین بنیادی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں:-

(۱) ہم نے آپ کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

(۲) اس حیثیت سے آپ بنیادی کام حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔

(۳) اور اس کام کے لئے خواہشات نفسانی کی پیروی سے بچنا ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

جہاں تک زمین میں خلیفہ بنانے کا تعلق ہے، اس کا مفہوم سورہ بقرہ میں گزر چکا ہے (دیکھئے

معارف القرآن جلد اول ص ۱۲۱) اور اسی سے اسلامی سیاست کا یہ اصل الاصول واضح ہوتا ہے کہ

”اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے“ زمین کے حکمران اسی کے احکام کے مطابق چلنے کے مجاز میں

اس سے باہر نہیں جاسکتے۔ لہذا مسلمانوں کا حاکم، شہر سی یا اسمبلی اسلامی قانون کی تشریح یا

تدوین تو کر سکتی ہے، لیکن درحقیقت وہ واضح قانون نہیں بلکہ اللہ کے قانون کو پیش کرنا ہی ہے۔

دوسری بات یہاں واضح کر دی گئی ہے کہ اسلامی ریاست کا بنیادی کام

اقامت حق ہے۔ حکومت پر لازم ہے کہ وہ اپنے انتظامی معاملات اور تنازعات

بنیادی کام اقامت حق ہے اسلامی ریاست کا

کے تقاضے میں حق و انصاف قائم کرے۔

اسلام چونکہ ایک ابدی دین ہے، اس لئے اس نے سیاست و حکمرانی کے لئے ایسے انتظامی

جزئیات کی تعیین نہیں فرمائی، جو حالات اور زمانے کے بدلنے سے قابل تبدیل ہو جائیں۔ بلکہ کچھ ایسی

بنیادی ہدایات عطا فرمادی ہیں جن کی روشنی میں ہر زمانے کے مطابق انتظامی جزئیات خود طے کی جاسکتی

ہیں۔ اسی لئے یہاں یہ بات تو قیادی گئی ہے کہ حکومت کا اصل کام اقامت حق ہے، لیکن اس کی انتظامی

تفصیلات ہر دور کے اہل رائے مسلمانوں پر چھوڑی گئی ہیں۔

عدلیہ اور انتظامیہ کا رشتہ

چنانچہ یہ بات کہ عدلیہ انتظامیہ سے بالکل الگ رہے یا اس کے ساتھ وابستہ؟

اس مسئلہ میں کوئی ایسا مستعین حکم نہیں دیا گیا جو ہر دور میں ناقابل تبدیل

ہو۔ اگر کسی زمانہ میں حکمرانوں کی امانت و دیانت پر پورا اعتماد کیا جاسکتا ہو تو عدلیہ اور انتظامیہ کی

دوئی کو مٹایا جاسکتا ہے۔ اور اگر کسی دور میں حکمرانوں کی امانت و دیانت پر پورا بھروسہ نہ ہو تو عدلیہ

کو انتظامیہ سے بالکل آزاد بھی رکھا جاسکتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ ان سے زیادہ امانت و دیانت کا

کون دعویٰ کر سکتا تھا؟ اس لئے انھیں بیک وقت انتظامیہ اور عدلیہ دونوں کا سربراہ بننا کر

تنازعات کے فیصلے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ خلفاء راشدین میں

بھی یہی طرز رہا کہ امیر المؤمنین خود ہی قاضی بھی ہوتا تھا۔ بعد کی اسلامی حکومتوں میں اس طریقے

کو بدلا گیا اور امیر المؤمنین کو انتظامیہ کا اور قاضی القضاۃ کو عدلیہ کا سربراہ بنایا گیا۔

تیسری ہدایت جس پر اس آیت میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ خواہشات

انسانی کی پیروی مت کرنا اور روز حساب کو ہر وقت پیش نظر رکھنا۔ اس ہدایت پر سب سے زیادہ زور اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ چیز اقامت حق کی بنیاد ہے۔ جس حاکم یا قاضی کے دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر ہے وہی صحیح معنی میں حق و انصاف قائم کر سکتا ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو آپ اچھے سے اچھا قانون بنا لیجئے۔ نفس انسانی کی دسیسہ کاریاں ہر جگہ اپنا راستہ خود بنا لیتی ہیں اور ان کی موجودگی میں کوئی بہتر سے بہتر نظام قانون بھی حق انصاف قائم نہیں کر سکتا۔ دنیا کی تاریخ اور موجودہ زمانے کے حالات اس پر گواہ ہیں۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی شخص کو حاکم، قاضی یا کسی محکمے کا ذمہ داری کے عہدوں میں سب سے پہلے دیکھنے کی چیز انسان کا کردار ہے خدا کا خوف اور آخرت کی فکر ہے یا نہیں اور اس کے اخلاق و کردار کی کیا حالت ہے؟ اگر یہ محسوس ہو کہ اس کے دل پر خوف خدا کے بجائے خواہشات نفسانی کی حکمرانی ہے تو خواہ وہ کسی اعلیٰ ڈگریاں رکھتا ہو اپنے فن میں کتنا ماہر اور پختہ کار ہو، اسلام کی نظر میں وہ کسی اونچے منصب کا مستحق نہیں ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا ذِكْرًا لِّذِينَ

اور ہم نے نہیں بنایا آسمان اور زمین کو اور ان کے بیچ میں ہے نیکیاں یہ خیال ہے ان کا

الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِّنَ النَّارِ ۗ أَمْ تَجْعَلُ

جو منکر ہیں سو خرابی ہے منکروں کے لئے آگ سے کیا ہم

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ أَمْ

کردیں گے ایمان والوں کو جو کرتے ہیں نیکیاں برابر ان کے جو خرابی ڈالیں ملک میں،

أَمْ تَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ ۚ ۝۳۸ كَذٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ

کیا ہم کر دیں گے ڈرنے والوں کو برابر ڈھیٹھ لوگوں کے؟ ایک کتاب ہے جو اتاری ہم نے

مُبٰرَكٌ لِّیَدِیْكَ ۚ اٰیٰتِہٖ وَلَیْسَ دُوٰلَا ۚ اَلَا لِبَابِ ۝۳۹

تیری طرف برکت کی تادھیان کریں لوگ اس کی باتیں اور تا سمجھیں عقل والے۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو چیزیں ان کے درمیان موجود ہیں ان کو خالی از حکمت پیدا نہیں کیا۔ بلکہ بہت سی حکمتیں ہیں جن میں سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ ان سے توحید اور آخرت ثابت ہوتی

ہے) یہ (یعنی ان کا خالی از حکمت ہونا) ان لوگوں کا خیال ہے جو کافر ہیں (کیونکہ جب توحید اور آخرت کی جزا و سزا کا انکار کیا تو کائنات کی تخلیق کی سب سے بڑی حکمت کا انکار کر دیا) سو کافروں کے لئے (آخرت میں) بڑی خرابی ہے یعنی دو زرخ (کیونکہ وہ توحید کا انکار کرتے تھے) ہاں (ایک غلطی ان کی یہ ہے کہ قیامت کے منکر ہیں) حالانکہ قیامت میں یہ حکمت ہے کہ نیکوں کو جزا اور مفسدوں کو سزا ملے، اب ان کے انکار قیامت سے لازم آتا ہے کہ اس حکمت کا تحقق نہ ہو بلکہ سب برابر ہیں) تو کیا ہم ان لوگوں کو جو کہ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے ان کی برابر کر دیں گے جو (کفر وغیرہ کر کے) دنیا میں فساد کرتے پھرتے ہیں یا (بالفاظ دیگر کیا) ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں کی برابر کر دیں گے۔ (یعنی ایسا نہیں ہو سکتا، لہذا قیامت ضرور آئے گی تاکہ نیکوں کو جزا اور بدکاروں کو سزا ملے، اسی طرح توحید اور آخرت کے ساتھ رسالت پر ایمان رکھنا بھی ضروری ہے، کیونکہ) یہ (قرآن) ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں (یعنی ان کے اعجاز میں بھی اور کثیر النفع مضامین میں بھی) اور تاکہ (غور سے اس کی حقیقت معلوم کر کے اس سے) اہل فہم نصیحت حاصل کریں (یعنی اس پر عمل کریں)۔

معارف و مسائل

آیات کی لطیف ترتیب | یہ آیتیں جن میں اسلام کے بنیادی عقائد، خاص طور سے آخرت کا اثبات کیا گیا ہے، حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعات کے درمیان انتہائی لطیف ترتیب کے ساتھ آئی ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ہٹ دھرمی کی وجہ سے نہ سمجھ رہا ہو تو اس سے حکیمانہ طریقہ یہ ہے کہ زیر بحث موضوع چھوڑ کر کوئی غیر متعلق بات شروع کر دی جائے۔ اور جب اس کا ذہن پہلی بات سے ہٹ جائے تو باتوں ہی باتوں میں اسے پہلی بات ماننے پر مجبور کر دیا جائے۔ یہاں آخرت کے اثبات کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ سے پہلے کفار کی ہٹ دھرمیوں کا ذکر چل رہا تھا، جو اس آیت پر ختم ہوا کہ وَقَالُوا إِنَّمَا بَنَّا عَجِلُّ لَنَا وَقَطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ۔ جس کا یہ حامل تھا کہ وہ لوگ آخرت کا انکار کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کے فوراً بعد یہ ارشاد ہوا کہ اَصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ عَبْدًا دَاوُدَ اِنَّ كِي بَاتِيں پْر صبر كچھجے اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کیجئے) اس طرح ایک نئی بات شروع کر دی گئی، لیکن حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ کو اس بات پر ختم کیا گیا کہ ”اے داؤد، ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہذا تم لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا“

اب یہاں سے ایک غیر محسوس طریقہ پر آخرت کا اثبات کر دیا گیا کہ جو ذات زمین میں اپنے خلیفہ کو عدل و انصاف قائم کرنے کا حکم دے رہی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بدکاروں کو سزا ملے اور نیکوں کو راحت، کیا وہ

خود اس کائنات میں عدل و انصاف قائم نہیں کرے گی؟ یقیناً اُس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اچھے اور بُرے تمام لوگوں کو ایک لاکھٹی سے ہانکنے کے بجائے بدکاروں کو سزا دے، اور نیکو کاروں کو انعام عطا فرمائے، یہی اس کائنات کی تخلیق کا مقصد ہے اور اس کے رویکار آنے کے لئے قیامت و آخرت کا وجود اس کی حکمت کے عین مطابق ہے۔ جو لوگ آخرت کا انکار کرتے ہیں وہ گویا زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ یہ کائنات بے مقصد اور خالی از حکمت پیدا کر دی گئی ہے۔ اور اس میں اچھے بُرے تمام لوگ زندگی گزار کر مر جائیں گے اور پھر ان سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر ایمان رکھنے والا اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔

اَمْ يَجْعَلُ الَّذِينَ اٰمَنُوا (المنزلۃ تعالیٰ) کافُجَّارًا (تو کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیکو کاروں کو زمین میں فساد پھیلانے والوں کے برابر کر دیں گے یا بدترین کاروں کو بدکاروں کے برابر کر دیں گے؟) یعنی ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، بلکہ دونوں کا انجام بالکل مختلف ہوگا۔ اسی سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ مومن اور کافر کا یہ فرق آخرت کے احکام کے اعتبار سے ہے۔ دنیا میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کافر کو مومن سے بڑھ کر مادی راحتیں مل جائیں۔ نیز اس سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکالا جاسکتا کہ کافر کے دنیوی حقوق مومن کی برابر نہیں ہو سکتے۔ بلکہ کافر کو مسلمان کے برابر انسانی حقوق دیئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی مملکت میں جو غیر مسلم اقلیتیں عہد و پیمان کے ساتھ بسستی ہوں، انھیں تمام انسانی حقوق مسلمانوں کے برابر ہی دیئے جائیں گے۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ ۖ نِعْمَ الْعَبْدُ ۚ إِنَّهُ اَوَابٌ ﴿۳۱﴾ اِذْ

اور دیا ہم نے داؤد کو سلیمان بہت خوب بندہ وہ ہے رجوع ہونے والا جب

عَرَضَ عَلَيْهِ بِالْعَشيِّ الشَّفِيفَةُ الْجَيَادُ ﴿۳۲﴾ فَقَالَ اِنِّیْ

دکھانے کو لائے اس کے سامنے شام کو گھوڑے بہت خاصے تو بولا میں نے

اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّیْ ۚ حَتّٰی تَوَارَتْ

دوست رکھا مال کی محبت کو اپنے رب کی یاد سے یہاں تک کہ سوورج چھپ گیا

بِالْحِجَابِ ۚ رَاَدُّوْهَا عَلَیَّ ۖ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ

اوٹ میں پھیرا وہاں کو میرے پاس پھر لگا جھاڑنے ان کی پنڈلیاں

وَالْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾

اور گردنیں -

خلاصہ تفسیر

ادرم نے داؤد (علیہ السلام) کو سلیمان (علیہ السلام) فرزند عطا کیا بہت اچھے بندے تھے کہ اخلا کی طرف بہت رجوع ہونے والے تھے (چنانچہ ان کا وہ قصہ یاد رکھنے کے لائق ہے) جبکہ شام کے وقت ان کے روپر واصل (اور) عمدہ گھوڑے (جو بغرض جہاد وغیرہ رکھے جاتے تھے) پیش کئے گئے (اور ان کے ملاحظہ کرنے میں اس قدر دیر ہو گئی کہ دن چھپ گیا اور کوئی معمول از قسم نماز فوت ہو گیا اور بوجہ معیت و جلالت کے کسی خادم کی جرأت نہ ہوئی کہ مطلع و متنبہ کرے، پھر جب خود ہی تنبیہ ہوا، تو کہنے لگے کہ (افسوس) میں اس مال کی محبت کی خاطر (لگ کر) اپنے رب کی یاد سے (یعنی نماز سے) غافل ہو گیا، یہاں تک کہ آفتاب پردہ (مغرب) میں چھپ گیا (پھر خادموں کو حکم دیا کہ) ان گھوڑوں کو ذرا پھر دو میرے سامنے لاؤ (چنانچہ لائے گئے) سو انھوں نے ان (گھوڑوں) کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (تلواریں) ہاتھ صاف کرنا شروع کیا (یعنی ان کو ذبح کر ڈالا)۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کی مشہور تفسیر وہی ہے جو اوپر خلاصہ تفسیر میں ذکر کی گئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کے معائنہ میں ایسے مشغول ہوئے کہ عصر کا وقت جو نماز پڑھنے کا معمول تھا وہ چھوٹ گیا، بعد میں متنبہ ہو کر آپ نے ان تمام گھوڑوں کو ذبح کر ڈالا کہ ان کی وجہ سے یاد الہی میں خلل واقع ہوا تھا۔ یہ نماز نفلی بھی ہو سکتی ہے۔ اور اس صورت میں کوئی اشکال نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام اتنی غفلت کی بھی تلافی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرض نماز ہو، اور معائنہ میں لگ کر بھول طاری ہو گئی ہو، بھول جانے کی صورت میں فرض نماز کے قضا ہونے سے گناہ تو نہیں ہوتا۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بلند منصب کے پیش نظر اس کا بھی تذکرہ فرمایا۔

ان آیات کی یہ تفسیر متعدد ائمہ تفسیر سے مستقول ہے، اور حافظ ابن کثیر جیسے محقق عالم نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے، اور اس کی تائید ایک مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے جو علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے معجم طبرانی میں اسماعیلی رحمہ اللہ ابن مردودہ کے حوالے سے نقل کی ہے:-

(عن ابی بن کعب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قولہ فطفت مسحاً بالسرور والاعناق قال قطع سوقھا وأھنا قھا بالسیف)۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ (اور منثور ج ۳۰۹ ص ۵) اور علامہ شمسی مجمع الزوائد

میں یہ حدیث نقل کر کے لکھتے ہیں :-

”اسے طبرانی رح نے اوسط میں روایت کیا ہے، اس میں ایک راوی سعید بن بشر ہیں جنہیں شعبہ وغیرہ نے ثقہ کہا ہے، اور ابن معین رح وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے، اور اس کے باقی رجال ثقہ ہیں۔“
(مجمع الزوائد ص ۹۹ ج ۴ - کتاب التفسیر)

اس حدیث مرفوعہ کی وجہ سے یہ تفسیر کافی مضبوط ہو جاتی ہے لیکن اس پر عموماً یہ مشبہ ہوتا ہے کہ گھوڑے اللہ کا عطا کیا ہوا ایک انعام تھا، اور اپنے مال کو اس طرح ضائع کر دینا ایک نبی کے شایانِ شان معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن مفسرین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ گھوڑے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ذاتی ملکیت میں تھے۔ اور ان کی شریعت میں گائے، بکری، اور نٹ کی طرح گھوڑوں کی قربانی بھی جائز تھی، لہذا انھوں نے گھوڑوں کو ضائع نہیں کیا، بلکہ انھیں اللہ تعالیٰ کے نام پر قربان کر دیا۔ جس طرح گائے، بکری کی قربانی سے ان کو ضائع کرنا لازم نہیں آتا، بلکہ یہ عبادت ہی کا ایک شعبہ ہے، اسی طرح یہاں بھی عبادت ہی کے طور پر ان کی قربانی پیش کی گئی۔ (روح المعانی)

اکثر حضرات مفسرین نے آیت کی یہی تفسیر کی ہے، لیکن ان آیات کی ایک تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے جس میں واقعہ بالکل مختلف طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے وہ گھوڑے معائنہ کے لئے پیش کئے گئے جو جہاد کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام انھیں دیکھ کر مسرور ہوئے۔ اور ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا کہ مجھے ان گھوڑوں سے جو محبت اور تعلق خاطر ہے وہ دنیا کی محبت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنے پروردگار ہی کی یاد کی وجہ سے ہے، کیونکہ یہ جہاد کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ اور جہاد ایک اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ اتنے میں گھوڑوں کی وہ جماعت آپ کی نگاہوں سے روپوش ہو گئی۔ آپ نے حکم دیا کہ انھیں دوبارہ سامنے لایا جائے۔ چنانچہ جب وہ دوبارہ سامنے آئے تو آپ ان کی گردنوں اور پٹیلیوں پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگے۔

اس تفسیر کے مطابق عن ذکر ساری میں عن سببیہ ہے۔ اور تواتر کی ضمیر گھوڑوں ہی کی طرف راجع ہے، اور مسح سے مراد کاٹنا نہیں، بلکہ محبت سے ہاتھ پھیرنا ہے۔

قدیم مفسرین میں سے حافظ ابن جریر طبری رح اور امام رازی رح وغیرہ نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے، کیوں کہ اس پر مال ضائع کرنے کا مشبہ نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کے الفاظ کے لحاظ سے دونوں تفسیروں کی گنجائش ہے، لیکن پہلی تفسیر کے حق میں چونکہ ایک مرفوع حدیث آگئی ہے جو مسند کے اعتبار سے حسن ہے، اس لئے اس کی قوت بڑھ جاتی ہے۔

سُورج کی واپسی کا قصہ | بعض حضرات نے پہلی تفسیر کو اختیار کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ نماز عصر کے قضا ہو جانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یا فرشتوں سے یہ درخواست کی کہ سُورج کو دوبارہ لوٹا دیا جائے، چنانچہ سُورج لوٹا دیا گیا، اور آپ نے اپنا معمول پورا کر لیا۔ اس کے بعد دوبارہ سُورج غروب ہوا، یہ حضرت رُذَوِّہا کی ضمیر کو سُورج کی طرف راجع مانتے ہیں۔

لیکن محقق مفسرین مثلاً علامہ آلوسی رحمہ وغیرہ نے اس قصے کی تردید کی ہے۔ اور کہا ہے کہ، رُذَوِّہا کی ضمیر گھوڑوں کی طرف راجع ہے نہ کہ سُورج کی طرف۔ اس لئے نہیں کہ معاذ اللہ سُورج کو دوبارہ لوٹا دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں نہیں، بلکہ اس لئے کہ یہ قصہ قرآن و حدیث کی کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ (رُوح المعانی)

بہر کیف! اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت خدا کی یاد میں غفلت ہو تو اپنے اوپر سزا اللہ کی یاد سے غفلت ہو جائے تو نفس کو سزا دینے کے لئے اُسے مقرر کرنا دینی غیرت کا تقاضا ہے۔ کسی فعلِ مباح سے محروم کر دینا جائز ہے۔ اور حضرات صوفیائے

کرام کی اصطلاح میں اُسے ”غیرت“ کہا جاتا ہے۔ (بیان القرآن)

کسی نیکی کی عادت ڈالنے کے لئے اپنے نفس پر ایسی سزائیں مقرر کرنا اصلاحِ نفس کا ایک نسخہ ہے اور اس واقعہ سے اس کا حوالہ بلکہ استحباب معلوم ہوتا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوجہم رضی نے ایک شامی چادر ہدیہ پیش کی جس پر کچھ نقش و نگار بنے ہوئے تھے آپ نے اس چادر میں نماز پڑھی اور واپس آکر حضرت عائشہ رضی سے فرمایا کہ یہ چادر ابوجہم رضی کو واپس کر دو، کیونکہ نماز میں میری نگاہ اس کے نقش و نگار پر پڑ گئی، تو قریب تھا کہ یہ نقش و نگار مجھے فتنہ میں ڈال دیں۔ (احکام القرآن بحوالہ موطاء مالک رحمہ)

اسی طرح حضرت ابو طلحہ رضی ایک مرتبہ اپنے باغ میں نماز پڑھتے ہوئے ایک پرندے کو دیکھنے میں مشغول ہو گئے جس سے نماز کی طرف دھیان نہ رہا، تو بعد میں آپ نے پورا باغ صدقہ کر دیا۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس مقصد کے لئے سزا ایسی ہی ہونی چاہیے جو بذاتِ خود جائز ہو، کسی مال کو بلا وجہ ضائع کر دینا جائز نہیں۔ لہذا ایسا کوئی کام درست نہیں جس سے اخلاقیاتِ مال لازم آتی ہو صوفیاء میں سے حضرت مشہدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ اسی سزا کے طور پر اپنے کپڑے جلادینے تھے، لیکن محقق صوفیاء مثلاً شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کے اس عمل کو صحیح قرار نہیں دیا۔

(رُوح المعانی)

امیر کو بذاتِ خود ریاست کے کاموں کی نگرانی کرنی چاہیے۔ | اس واقعہ سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ

مملکت کے ذمہ دار یا اپنے درجہ کے انسر کو چاہیے کہ وہ اپنے ماتحت شعبوں پر بذاتِ خود نگرانی رکھے، اور انھیں اپنے ماتحتوں پر چھوڑ کر فارغ نہ ہو بیٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ماتحتوں کی کثرت کے باوجود بنفس نفیس گھوڑوں کا معائنہ فرمایا۔ خلفائے راشدین اور خاص طور سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

ایک عبادت کے وقت دوسری عبادت میں مشغول ہونا غلطی ہے۔

چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جہاد کے گھوڑوں کا معائنہ ایک عظیم عبادت تھی۔ لیکن چونکہ وہ وقت اس عبادت کے بجائے نماز کا تھا، اس لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو بھی غلطی میں شمار کر کے اس کا تدارک فرمایا۔ اسی لئے ہمارے فقہار نے لکھا ہے کہ جمعہ کی اذان کے بعد جس طرح خرید و فروخت میں مشغولیت جائز نہیں، اسی طرح نماز جمعہ کی تیاری کے علاوہ کسی اور کام میں مشغول ہونا بھی درست نہیں خواہ وہ تلاوتِ قرآن یا نفل پڑھنے کی عبادت ہی کیوں نہ ہو۔

وَلَقَدْ قَتَلْنَا سُلَيْمَانَ وَ أَلْقَيْنَا عَلَى كُرْسِيِّهِ جَسَداً ثُمَّ أَنَابَ ﴿۳۴﴾

اور ہم نے جا بجا سلیمان کو اور ڈال دیا اُس کے تخت پر ایک دھڑ پھر وہ رجوع ہوا۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کو (ایک اور طرح سے بھی) امتحان ڈالا اور ہم نے اُن کے تخت پر ایک دھڑ لا ڈالا۔ پھر انھوں نے (خدا کی طرف) رجوع کیا۔

معارف و مسائل

اس آیت میں باری تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک اور آزمائش کا تذکرہ فرمایا ہے اور اس سلسلے میں صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے کہ اس آزمائش کے دوران کوئی دھڑ حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی پر ڈال دیا گیا تھا۔ اب وہ دھڑ کیا تھا؟ اس کے کرسی پر ڈالنے کا کیا مطلب ہے؟ اور اس سے آزمائش کیونکر ہوئی؟ یہ تفصیلات نہ قرآن کریم میں موجود ہیں اور نہ کسی صحیح حدیث سے ثابت ہیں۔ اس لئے بعض محقق مفسرین مثلاً حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ حجاز یہاں بھی اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے جس بات کو کجھل چھوڑا ہے اُس کی تفصیلات میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، بس اتنی بات پر ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی کوئی آزمائش کی تھی، جس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام

نے اللہ کی طرف پہلے سے زیادہ رجوع فرمایا، اور قرآن کریم کا اصل مقصد اتنے بیان سے پورا ہو جاتا ہے۔ اور بعض مفسرین نے اس آزمائش کی تفصیلات کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں متعدد احتمالات بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے بعض احتمالات تو خالص اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں، مثلاً یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا راز ان کی انگوٹھی میں تھا، ایک دن ایک شیطان نے اس انگوٹھی کو قبضہ میں کر لیا، اور اس کی وجہ سے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر آپ ہی کی شکل میں حکمراں بن بیٹھا۔ چالیس دن کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کو وہ انگوٹھی ایک پھلی کے پیٹ میں سے ملی، اس کے بعد آپ نے دوبارہ حکومت پر قبضہ کیا۔ یہ روایت متعدد مزید قصوں کے ساتھ کئی تفسیر کی کتابوں میں آئی ہے، لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس قسم کی تمام روایات کو اسرائیلیات میں شمار کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

”اہل کتاب میں ایک جماعت ایسی ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی نہیں مانتی۔ بس ظاہر یہ ہے کہ یہ جھوٹے قسے انہی لوگوں نے گھڑے ہیں“ (تفسیر ابن کثیر ص ۳۵ ج ۲)

لہذا اس قسم کی روایات کو اس قرآنی آیت کی تفسیر کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک اور واقعہ صحیح بخاری رحمہ اللہ میں مذکور ہے، بعض مفسرین نے اس واقعہ کے بعض حصوں کو قرآن کریم کی اس آیت سے ملتا جلتا دیکھ کر اسے اس آیت کی تفسیر قرار دیا ہے اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ آج رات میں ازواج کے ساتھ وظیفہ رز و جمیت ادا کروں گا۔ اور ان میں سے ہر بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو اللہ کے راستے میں جہاد کرے گا۔ لیکن یہ خیال ظاہر فرماتے وقت آپ ”انشاء اللہ“ کہنا بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیل القدر پیغمبر کی یہ فروگزاشت پسند نہ آئی اور اس نے آپ کے دعوے کو اس طرح غلط ثابت کر دیا کہ تمام ازواج مطہرات میں سے صرف ایک بیوی کے یہاں ایک مردہ بچہ پیدا ہوا۔ جس کا ایک پہلو نڈارہ تھا۔

بعض مفسرین نے اس واقعہ کو آیت پر منطبق کر کے یہ فرمایا کہ تخت پر دھڑکے لا ڈالنے سے مراد یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے کسی خادم نے یہ بچہ آپ کے تخت پر لا کر رکھ دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس پر تنبیہ ہو کہ یہ انجام میرے ”انشاء اللہ“ نہ کہنے کا ہے۔ چنانچہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع فرمایا اور اپنی اس فروگزاشت پر استغفار کیا۔

اس تفسیر کو متعدد محقق مفسرین مثلاً قاضی ابوالسعود اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں بھی اسی کے مطابق تفسیر کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کو بھی آیت کی قطعی تفسیر نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ یہ واقعہ جتنی روایتوں میں آیا ہے ان میں

کہیں اس بات کی کوئی علامت نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو زیر بحث آیت کی تفسیر میں ذکر فرمایا ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی یہ حدیث کتاب الجہاد، کتاب الانبیاء اور کتاب الایمان والذکر وغیرہ میں تو مستقلاً و طریقوں سے نقل کی ہے۔ لیکن کتاب التفسیر میں سورہ ص کی تفسیر کے تحت اسے کہیں ذکر نہیں کیا، بلکہ آیت وَهَبْ لِي مَلَكًا اُنْجِیْ کے تحت ایک دوسری روایت نقل کی ہے اور اس حدیث کا کوئی حوالہ تک نہیں دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک بھی یہ واقعہ آیت زیر بحث کی تفسیر نہیں، بلکہ جس طرح انبیاء علیہم السلام کے دوسرے متعدد واقعات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں اُسی طرح یہ بھی ایک جداگانہ واقعہ ہے جس کا کسی آیت کی تفسیر ہونا کوئی ضروری نہیں۔

ایک تیسری تفسیر امام رازی رحمہ اللہ نے بیان کی ہے، اور وہ یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک مرتبہ سخت بیمار ہو گئے، اور اس کی وجہ سے نقاہت اس درجہ بڑھ گئی کہ جب تخت پر لا کر بٹھائے گئے تو ایک بے روح جسم معلوم ہوتا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت عطا فرمائی۔ اس وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے شکر بھی ادا کیا اور مغفرت بھی طلب فرمائی، اور آئندہ کے لئے بے نظیر حکومت کی دعا بھی کی۔

لیکن یہ تفسیر بھی محض قیاسی ہے، قرآن کریم کے الفاظ سے بھی زیادہ مناسبت نہیں رکھتی اور کسی روایت سے بھی اس کا ثبوت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی یقینی تفصیلات معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، اور نہ ہم اس کے مکلف ہیں۔ لہذا اتنی بات پر ایمان رکھنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی کوئی آزمائش کی تھی جس کے بعد ان میں انابت الی اللہ کا جذبہ پہلے سے زیادہ پیدا ہوا اور اس واقعہ کو ذکر کرنے سے قرآن کریم کا اصل مقصد تمام انسانوں کو اس بات کو دعوت دینا ہے کہ وہ کسی مصیبت یا آزمائش میں مبتلا ہوں تو انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح پہلے سے زیادہ رجوع الی اللہ کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ رہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کی تفصیلات سوان کو اللہ کے حوالے کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ

بولا اے رب میرے معاف کر مجھ کو اور بخش مجھ کو وہ بادشاہی کہ مناسب نہ ہو کسی کو میرے

بَعْدِي ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ

تیرے بعد بے شک تو ہے سب کچھ بخشنے والا پھر ہم نے تابع کر دیا اس کے ہوا کو

تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ۝۳۶ وَالشَّيَاطِينُ كُلٌّ بِنَاءٍ

چلتی تھی اس کے حکم سے نرم نرم جہاں پہنچنا چاہتا اور تابع کئے شیطان سارے عمارت کرنے والے

وَعَوَّاصٍ ۝۳۷ وَآخَرِينَ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۝۳۸ هَذَا

اور عوٹے لگانے والے اور بہت سے اور جو باہم جکڑے ہوئے ہیں بیڑیوں میں - یہ ہے

عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۳۹ وَإِنَّ لَهُ

بخشش ہماری اب تو احسان کر یا رکھ چھوڑ کچھ حساب نہ ہوگا - اور اس کو

عِنْدَنَا لَفِي وَحْشٍ مَّائٍ ۝۴۰

ہمارے یہاں مرتبہ ہے اور اچھا ٹھکانا

خلاصہ تفسیر

(حضرت سلیمان ؑ نے اللہ سے دعا مانگی کہ اے میرے رب میرا (پچھلا) تصور معاف کر اور (آئندہ کے لئے) مجھ کو ایسی سلطنت دے کہ میرے سوا (میرے زمانہ میں) کسی کو میسر نہ ہو (خواہ کوئی غیبی وہی سامان عطا کر دیجئے خواہ سلاطین زمانہ کو ویسے ہی دبا کر بھیجے تاکہ مقابلہ ہی نہ کر سکیں اور) آپ بڑے دینے والے ہیں (آپ کو اس دعا کا قبول کر لینا کچھ دشوار نہیں) سو (ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کی خطا بھی معاف کر دی اور نیز) ہم نے ہوا کو ان کے تابع کر دیا کہ وہ ان کے حکم سے جہاں وہ (جانا) چاہتے نرمی سے چلتی (کہ اس سے گھوڑوں کی ضرورت نہ رہی) اور جنات کو بھی ان کے تابع کر دیا یعنی تعمیر بنانے والوں کو بھی اور رومی وغیرہ کے لئے غوطہ خوروں کو بھی اور دوسرے جنات کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے (غالباً جو مفوضہ خدمات سے گریز یا اس میں کوتاہی کرتا ہو) اس کو قید کی سزا ہوتی ہوگی، اور ہم نے یہ سامان دیکر ارشاد فرمایا کہ) یہ ہمارا عطیہ ہے، سو خواہ (کسی کو) دو یا نہ دو تم سے کچھ دارہ و گیر نہیں (یعنی جتنا سامان ہم نے تم کو دیا ہے، اس میں تم کو دوسرے بادشاہوں کی طرح محض خازن اور منتظم ہی نہیں بنایا، بلکہ تم کو مالک بھی بنا دیا ہے، اور علاوہ اس سامان کے جو دنیا میں ان کو عطا ہوا تھا، ان کے لئے ہمارے یہاں (خاص) قرب اور (اعلیٰ درجہ کی نیک انجامی ہے) جس کا ثمرہ پورے طور پر آخرت میں ظاہر ہوگا)۔

معارف و مسائل

هَبْ لِي مَلِكًا ۚ وَيُنَبِّئُنِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي - (مجھ کو ایسی سلطنت دے کہ میرے بعد کسی کو

میسر نہ ہو) اس دعا کا مطلب بعض مفسرین نے تو یہ بتایا ہے کہ میرے زمانے میں میری جیسی عظیم الشان سلطنت کسی اور کو میسر نہ ہو۔ گویا ان کے نزدیک ”میرے بعد“ کا مطلب ”میرے سوا“ ہے۔ حضرت تھانویؒ نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ لیکن بیشتر مفسرین کے نزدیک دعا کا مفہوم یہ ہے کہ میرے بعد بھی کسی کو ایسی عظیم الشان حکومت حاصل نہ ہو، چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جیسی حکومت عطا فرمائی، ویسی بعد میں بھی کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ کیونکہ ہواؤں کا مسخر ہونا اور جنات کا ایسا تابع ہونا بعد میں کسی کو میسر نہ آسکا۔ بعض لوگ عملیات وغیرہ کے ذریعہ بعض جنات کو جو مسخر کر لیتے ہیں وہ اس کے منافی نہیں۔ کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تسخیر جنات سے اس کو کوئی نسبت نہیں، عملیات کے ماہرین و ادایک یا چند جنات کو تابع بنا لیتے ہیں۔ لیکن جس طرح کی ہمہ گیر حکومت حضرت سلیمان علیہ السلام کو حاصل تھی ویسی کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کی کوئی دعا اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ دعا بھی باری تعالیٰ

کی اجازت ہی سے مانگی تھی۔ اور چونکہ اس کا منشاء محض طلب اقتدار نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنے اور کلمہ حق کو سر بلند کرنے کا جذبہ کار فرما تھا، اور باری تعالیٰ کو معلوم تھا کہ حکومت ملنے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام انہی مقاصد عالیہ کے لئے کام کریں گے۔ اور حُب جاہ کے جذبات ان کے دل میں جگہ نہیں پائیں گے۔ اس لئے انھیں اس دعا کی اجازت بھی دیدی گئی اور اسے قبول بھی کر لیا گیا۔ لیکن عام لوگوں کے لئے از خود اقتدار کے طلب کرنے کو حدیث میں اس لئے منع کیا گیا ہے کہ اس میں حُب جاہ و مال کے جذبات شامل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جہاں انسان کو اس قسم کے جذبات نفسانی سے خالی ہونے کا یقین ہو اور وہ واقعہٴ اعلا رکامتہ الحق کے ہوا کسی اور مقصد سے اقتدار حاصل نہ کرنا چاہتا ہو، تو اس کے لئے حکومت کی دعا مانگنا جائز ہے۔ (روح المعانی وغیرہ)

مُفَوَّضَاتٍ فِي الْأَفْئَادِ۔ (زنجیروں میں جکڑے ہوئے) جنات کی تسخیر اور جو خدمات وہ انجام دیتے تھے، ان کی تفصیل سورہ سبا میں گزر چکی ہے، یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ مکرش جنات کو حضرت سلیمانؑ نے زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، اب ان زنجیروں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ بھی نظر آنے والی لوہے کی زنجیریں ہوں، ہو سکتا ہے کہ جنات کو جکڑنے کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کیا گیا ہو۔ جسے آسانی سے سمجھانے کے لئے یہاں زنجیروں سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

وَإِذْ كُنَّا عَبْدًا لَّيْلًا إِذْ نَادَىٰ رَبَّنَا أَنِي مَسْنِي

اور یاد کر ہمارے بندے ایوب کو جب اس نے پکارا اپنے رب کو کہ مجھ کو لگا دی

الشَّيْطَانُ يَنْصُبُ وَعَذَابِ ۴۱ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هَذَا مُغْتَسَلٌ

شیطان نے ایذا اور تکلیف - لات مارا اپنے پاؤں سے یہ چشمہ نکلا نہانے کو

تَبَارِدٌ وَشَرَابٌ ۴۲ وَهَبْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ

ٹھنڈا اور پیسے کو اور بخشے ہم نے اس کو اس کے گھروالے اور انکے برابر ان کے ساتھ

سَحْمَةً مِّمَّا وَذِكْرَى لَأُولَى الْأَلْبَابِ ۴۳ وَخُذْ بِيَدِكَ

اپنی طرف کی مہربانی سے اور یاد رکھنے کو عقل والوں کے اور پکڑ اپنے ہاتھ میں

ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِهِ وَلَا تَحْنُطْ ۣ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَبْرًا ط

سینکوں کا ٹھٹھا بھرا اس سے مارے اور اپنی قسم میں جھوٹا نہ ہو ہم نے اس کو پایا جھیلے والا

نِعْمَ الْعَبْدُ ۣ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۴۴

بہت خوب بندہ تحقیق وہ ہے رجوع ہونے والا -

خلاصہ تفسیر

اور آپ ہمارے بندہ ایوب (علیہ السلام) کو یاد کیجئے جبکہ انھوں نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھ کو رنج اور آزار پہنچایا ہے۔ اور یہ رنج و آزار بعض مفسرین کے قول کے مطابق وہ ہے جو امام احمد رحمہ اللہ نے کتاب الزہد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کے زمانے میں ایک بار شیطان ایک طبیب کی شکل میں حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی کو ملا تھا۔ اسے انھوں نے طبیب سمجھ کر علاج کی درخواست کی اس نے کہا اس شرط سے کہ اگر ان کو شفا ہو جاوے تو یوں کہہ دینا کہ تو نے ان کو شفا دی، میں اور کچھ نذرانے نہیں چاہتا۔ انھوں نے ایوب علیہ السلام سے ذکر کیا، انھوں نے فرمایا کہ بھلی مانس وہ تو شیطان تھا۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو شفا دیدے تو میں تجھ کو سو تمچیاں ماروں گا۔ پس آپ کو سخت رنج پہنچا اس سے کہ میری بیماری کی بدولت شیطان کا یہاں تک حوصلہ بڑھا کہ خاصہ میری بیوی سے ایسے کلمات کہلوانا چاہتا ہے جو ظاہراً موجب شرک ہیں۔ گو تاویل سے شرک نہ ہوگا اگرچہ حضرت ایوب علیہ السلام ازالہ مرض کے لئے پہلے بھی دعا کر چکے تھے۔ مگر اس واقعہ سے اور زیادہ ابہتال اور تضرع سے دعا کی، پس ہم نے ان کی دعا قبول کر لی اور حکم دیا کہ اپنا پاؤں (زمین پر) مارو۔ (چنانچہ انھوں نے زمین پر پاؤں مارا تو وہاں سے ایک چشمہ پیدا ہو گیا۔ (رواہ احمد))

پس ہم نے ان سے کہا کہ یہ (متھارے لئے) نہانے کا ٹھنڈا پانی ہے اور پیئے گا۔ (یعنی اس میں غسل کرو اور بیوی بھی۔ چنانچہ نہانے اور بالکل اچھے ہو گئے) اور ہم نے ان کو ان کا کئی عطا فرمایا

اور ان کے ساتھ (گنتی میں) ان کے برابر اور بھی (دیئے) اپنی رحمتِ خاتمہ کے سبب سے اور اہل عقل کے لئے یادگار رہنے کے سبب سے (یعنی اہل عقل یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ صابروں کو کیسی جزا دیتے ہیں اور اب ایوب علیہ السلام نے اپنی قسم پوری کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر چونکہ ان کی بیوی نے ایوب علیہ السلام کی خدمت بہت کی تھی۔ اور ان سے کوئی گناہ بھی صادر نہ ہوا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کے لئے ایک تخفیف فرمائی) اور (ارشاد فرمایا کہ اے ایوب) تم اپنے ہاتھ میں ایک مسحوق سینکوں کا لو (جس میں تلو سینکیں ہوں) اور (اپنی بیوی کو) اس سے مار لو اور (اپنی) قسم توڑو (چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آگے ایوب علیہ السلام کی تعریف کی ہے کہ) بے شک ہم نے ان کو بڑا صابر پایا، اچھے بندے تھے کہ (خدا کی طرف) بہت رجوع ہوتے تھے۔

معارف و مسائل

حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کرنے کے لئے لایا گیا ہے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ سورہ انبیاء میں گزر چکا ہے، یہاں چند باتیں قابل ذکر ہیں۔

مَسْنَخِ الشَّيْطَانِ بِمُصِيبٍ وَعَذَابٍ۔ (شیطان نے مجھ کو رنج اور آزار پہنچایا ہے) بعض حضرات نے شیطان کے رنج و آزار پہنچانے کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام جس بیماری میں مبتلا ہوئے وہ شیطان کے تسلط کی وجہ سے آئی تھی۔ اور ہوا یہ تھا کہ ایک مرتبہ فرشتوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بہت تعریف کی جس پر شیطان کو سخت حسد ہوا اور اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے ان کے جسم اور مال و اولاد پر ایسا تسلط عطا کر دیا جائے جس سے میں ان کے ساتھ جو چاہوں سو کروں، اللہ تعالیٰ کو بھی حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش مقصود تھی، اس لئے شیطان کو یہ جوت دیدیا گیا اور اس نے آپ کو اس بیماری میں مبتلا کر دیا۔

لیکن محقق مفسرین نے اس قصے کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق انبیاء علیہ السلام پر شیطان کو تسلط حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس نے آپ کو بیمار ڈال دیا ہو۔

بعض حضرات نے شیطان کے رنج و آزار پہنچانے کی یہ تشریح کی ہے کہ بیماری کی حالت میں شیطان حضرت ایوب علیہ السلام کے دل میں طرح طرح کے دوسوے ڈالاکرتا تھا، اس سے آپ کو اور زیادہ تکلیف ہوتی تھی، یہاں آپ نے اسی کا ذکر فرمایا ہے۔ لیکن اس آیت کی سب سے بہتر تشریح وہ ہے جو حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں اختیار کی ہے اور جو خلاصہ تفسیر میں اوپر لکھی گئی ہے۔

حضرت ایوبؑ کے مرض کی نوعیت

قرآن کریم میں اتنا تو بتایا گیا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو ایک شدید قسم کا مرض لاحق ہو گیا تھا، لیکن اس مرض کی نوعیت نہیں بتائی گئی۔ احادیث میں

بھی اس کی کوئی تفصیل آنحضرت ﷺ سے منقول نہیں ہے۔ البتہ بعض آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے جسم کے ہر حصے پر پھوڑے نکل آئے تھے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے گھن کی وجہ سے آپ کو ایک کورٹی پر ڈال دیا تھا۔ لیکن بعض محقق مفسرین رح نے ان آثار کو درست تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بیماریاں تو آسکتی ہیں، لیکن انھیں ایسی بیماریوں میں مبتلا نہیں کیا جاتا، جن سے لوگ گھن کرنے لگیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری بھی ایسی نہیں ہو سکتی، بلکہ یہ کوئی عام قسم کی بیماری تھی، لہذا وہ آثار جن میں حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف پھوڑے پھنسیوں کی نسبت کی گئی ہے یا جن میں کہا گیا ہے کہ آپ کو کورٹی پر ڈال دیا گیا تھا، روایت و درایت قابل اعتماد نہیں ہیں۔

(ملخص از روح المعانی و احکام القرآن)

خَذَّ بَيْدًا فَخَضَعَهَا۔ (تم اپنے ہاتھ میں ایک مٹھا سینکوں کا لو، اس واقعہ کا پس منظر اور خلاصہ تفسیر میں آچکا ہے۔ یہاں اس واقعہ سے متعلق چند مسائل درج کئے جاتے ہیں:-

پہلا مسئلہ تو ہے کہ اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کو تنہا چھیاں مارنے کی قسم کھالے اور بعد میں تنہا چھیاں الگ الگ مارنے کے بجائے تمام چھپیوں کا ایک گٹھا بنا کر ایک ہی مرتبہ مار دے تو اس سے قسم پوری ہو جاتی ہے۔ اسی لئے حضرت ایوب علیہ السلام کو ایسا کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہی امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔ لیکن جیسا کہ علامہ ابن ہمام رح نے لکھا ہے کہ اس کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس شخص کے بدن پر ہر قسمی طہ لایا عرضاً ضرور لگ جائے۔ دوسرے یہ کہ اس سے کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور ہو۔ اگر اتنے ہلکے سے چھیاں بدن کو لگائی گئیں کہ بالکل تکلیف نہ ہوئی تو قسم پوری نہیں ہوگی۔ حضرت تھانوی رح نے بیان القرآن میں جو لکھا ہے کہ قسم پوری نہیں ہوگی، تو غالباً اس کی مراد یہی ہے کہ تکلیف بالکل نہ ہو یا کوئی قسمی بدن کو لگ جائے رہ جائے، ورنہ فقہائے حنفیہ رح نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر مذکورہ دو شرطوں کے ساتھ مارا جائے تو قسم پوری ہو جاتی ہے۔

(ملاحظہ ہو فتح القدیر۔ ص ۱۳۴، ج ۲)

حیلوں کی شرعی حیثیت

اس آیت سے دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کسی نامناسب یا مکروہ بات سے بچنے کیلئے کوئی شرعی حیلہ اختیار کیا جائے تو وہ جائز ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت ایوب

علیہ السلام کے واقعہ میں قسم کا اصلی تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی زوجہ و مطہرہ کو پوری سوچیاں ماریں، لیکن چونکہ ان کی زوجہ و مطہرہ بگینا تھیں اور انھوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بمثال خدمت کی تھی، اسلئے

اللہ تعالیٰ نے خود حضرت ایوب علیہ السلام کو ایک حیلہ کی تلقین فرمائی اور یہ تصریح کر دی کہ اس طرح ان کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ اس لئے یہ واقعہ حیلہ کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے حیلے اسی وقت جائز ہوتے ہیں جبکہ انھیں شرعی مقاصد کے ابطال کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اور اگر حیلہ کا مقصد یہ ہو کہ کسی حقدار کا حق باطل کیا جائے، یا کسی صریح فعل حرام اس کی رُوح برقرار رکھتے ہوئے اپنے لئے حلال کر لیا جائے تو ایسا حیلہ بالکل ناجائز ہے۔ مثلاً زکوٰۃ سے بچنے کے لئے بعض لوگ یہ حیلہ کرتے ہیں کہ سال کے ختم ہونے سے ذرا پہلے اپنا مال بیوی کی ملکیت میں دیدیا، پھر کچھ عرصہ کے بعد بیوی نے شوہر کی ملکیت میں دیدیا اور جب اگلا سال ختم ہونے کے قریب ہوا تو پھر شوہر نے بیوی کو یہہہ کہہ دیا۔ اس طرح کسی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، ایسا کرنا چونکہ مقاصد شرعیہ کو باطل کرنے کی ایک کوشش ہے، اس لئے حرام ہے اور شاید اس کا وبال ترک زکوٰۃ کے وبال سے زیادہ بڑا ہو۔ (رُوح المعانی از میسوط سرخسی)۔

نامناسب کام پر قسم کھانا | تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی نامناسب، غلط یا ناجائز فعل پر قسم کھالے تو قسم منقذ ہو جاتی ہے، اور اس کے توڑنے پر بھی کفارہ آتا ہے ظاہر ہے کہ اگر اس صورت میں کفارہ نہ آتا تو حضرت ایوب علیہ السلام کو یہ حیلہ تلقین نہ فرمایا جاتا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کسی نامناسب کام پر قسم کھالی جائے تو شرعی حکم یہ ہے کہ اُسے توڑ کر کفارہ ادا کر دیا جائے۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:-

”جو شخص ایک قسم کھالے، پھر بعد میں اس کی رائے یہ ہو کہ اس قسم کے خلاف عمل کرنا زیادہ بہتر ہے تو اُسے چاہیے کہ وہ وہی کام کرے جو بہتر ہو، اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے۔“

وَ اذْكُرْ عَبْدًا نَّا اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولٰٓئِ

اور یاد کر ہمارے بندوں کو ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب ہاتھوں

الْاَيْدِي وَالْاَبْصَارِ ۝۴۵ اِنَّا اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ

والے اور آنکھوں والے ہم نے امتیاز دیا ان کو ایک چمن ہوئی بات کا وہ

ذِكْرٰى الدَّارِ ۝۴۶ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِّنَ الْمُصْطَفٰٓئِ

یاد اس گھر کی اور وہ سب ہمارے نزدیک میں چنے ہوئے نیک

الْاٰخِيَارِ ۝۴۷ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۝

لوگوں میں اور یاد کر اسمعیل کو اور الیسع اور ذوالکفل کو

وَكُلٌّ مِّنَ الْاٰخِيَارِ ۝۴۸ هٰذَا ذِكْرٌ وَّ اِنَّ لِّلْمُتَّقِيْنَ لِحُسْنِ

اور ہر ایک تھا خوبی والا یہ ایک مذکور ہو چکا اور تحقیق ڈروالوں کے لئے ہے ایتھا

مَاۤبٍ ۙ جَدَّتْ عَدْنٍ مُّفْتَحَةً لَهُمُ الْأَبْوَابُ ۝۵۱ مُتَّكِئِينَ

ٹھکانا باغ میں سدائے کھول رکھے ہیں ان کے واسطے دروازے تکیہ لگائے ہوئے

فِيهَا يَدْعُونَ فِيهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ وَشَرَابٍ ۝۵۲

بیتھے ان میں منگوائیں گے ان میں میوے بہت اور شراب اور

عِنْدَهُمْ قِصَصَاتُ الظُّلُمَاتِ أَثَرَابٍ ۝۵۳ هَذَا مَا

ان کے پاس عورتیں ہیں نیچی نگاہ والیاں ایک عمر کی یہ وہ ہے جو تم

تَوَعَّدُونَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝۵۴ إِنَّ هَذَا لَاسِرُّنَا

سے وعدہ کیا گیا حساب کے دن پر یہ ہے روزی ہماری دہی

مَالِهِ مِنْ تَفَادٍ ۝۵۵ هَذَا طَرٌّ وَإِنَّ لِلطُّغْيَانِ لَشَرًّا مَاۤبٍ ۝۵۶

ہوئی اس کو نہیں بڑھنا یہ مہل چمے اور تحقیق شریروں کے واسطے ہے برا ٹھکانا

جَهَنَّمَ يَصْأَوْنَهَا فَيَنسِفُ الْوَهَادُ ۝۵۷ هَذَا أَقْلِيدٌ وَقَوْلُهُ

دوزخ ہے جس میں ان کو ڈالیں گے سو کیا بڑی آرام کرنے کی جگہ ہے یہ ہے اب اس کو چمکیں

حَمِيمٌ وَغَسَّاقٌ ۝۵۸ وَآخِرُ مِنْ شَكْلَةٍ أَزْوَاجٌ ۝۵۹ هَذَا فَوْجٌ

گرم پانی اور پیپ اور کچھ اور اسی شکل کی طرح طرح کی چیزیں یہ ایک فوج ہے

مَقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ إِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ۝۶۰ قَالُوا

دھنستی آ رہی ہے تمہارے ساتھ جگہ نہ ملیو ان کو یہ ہیں کھسے والے آگ میں وہ بولے

بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ أَنْتُمْ قَدْ مَتَمَّوْا كُنَّا فَيَنسِفُ

بلکہ تم ہی ہو جگہ نہ ملیو تم کو تم ہی پیش لائے ہمارے یہ بلا سو کیا بڑی ٹھہرنے کی

الْقَرَارِ ۝۶۱ قَالُوا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هَذَا فَزِدْهُ عَذَابًا

جگہ ہے وہ بولے اے رب ہمارے جو کوئی لایا ہمارے پیش یہ اسو بڑھادے اس کو

بِضَعْفٍ فِي النَّارِ ۝۶۲ وَقَالُوا مَا لَنَا لَا نَرَىٰ رِجَالًا كُنَّا

دونا عذاب آگ میں اور کہیں گے کیا ہوا کہ ہم نہیں دیکھتے ان مردوں کو کہ ہم

نَعُدُّهُمْ مِنَ الْأَشْرَارِ ۝۶۳ أَخَذْنَاهُمْ سَخِرِيًّا أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمْ

ان کو شمار کرتے تھے بڑے لوگوں میں کیا ہم نے ان کو ٹھٹھے میں پکڑا تھا یا چوک گئیں ان سے

الْأَبْصَارُ ۝۶۴ إِنَّ ذَلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ ۝۶۵

ہماری آنکھیں - یہ بات ٹھیک ہوتی ہے جھگڑا کرنا آپس میں دوزخیوں کا -

الثالثة

الاول

خلاصہ تفسیر

اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) کو یاد کیجئے جو باحقوں (سے کام کرنے والے) اور آنکھوں (سے دیکھنے) والے تھے (یعنی ان میں قوتِ عملیہ بھی تھی اور قوتِ علمیہ بھی اور) ہم نے ان کو ایک خاص بات کے ساتھ مخصوص کیا تھا کہ وہ یادِ آخرت کی ہے (چنانچہ ظاہر ہے کہ انبیاء میں یہ صفت سب سے زیادہ تام اور کامل ہوتی ہے، اور شاید یہ جملہ اس لئے بڑھا دیا ہے کہ اہل غفلت کے کان ہوں کہ جب انبیاء اس فکر سے خالی نہ تھے تو ہم کس شمار میں ہیں) اور وہ (حضرات) ہمارے یہاں منتخب اور سب سے اچھے لوگوں میں سے ہیں (یعنی منتخب لوگوں میں بھی سب سے بڑھ کر، چنانچہ ظاہر ہے کہ انبیاء دوسرے اولیاء اور صلحا سے افضل ہوتے ہیں)۔ اور اسمعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو بھی یاد کیجئے اور یہ سب بھی سب سے اچھے لوگوں میں سے ہیں (آگے تو حید اور آخرت اور رسالت کا کسی قدر مفصل بیان ہے) ایک نصیحت کا مضمون تو یہ ہو چکا (اس سے مراد انبیاء علیہم السلام کے واقعات ہیں کہ ان واقعات میں کافروں کے لئے عقیدہ رسالت کی تبلیغ ہے، اور مومنوں کیلئے اخلاقِ جمیلہ اور اعمالِ ناملہ کی تعلیم ہے) اور (دوسرے مضمون آخرت کی جزا و سزا کے متعلق اب شروع ہوتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ) پرہیزگاروں کے لئے آخرت میں، اچھا ٹھکانا ہے، یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات جن کے دروازے ان کے واسطے کھلے ہوئے ہوں گے (ظاہر مراد یہ ہے کہ پہلے سے کھلے ہوں گے) وہ ان باغوں میں تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے (اور) وہ وہاں (جنت کے خادموں سے) بہت سے میوے اور پیئیں کی چیزیں منگوائیں گے اور ان کے پاس نیچی نگاہ والیاں ہم عمر ہوں گی (مراد حوریٰ ہیں اے مسلمانو!) یہ (جس کا اوپر ذکر ہوا) وہ (نعمت) ہے جس کا تم سے روزِ حساب آنے پر وعدہ کیا جاتا ہے، بے شک یہ ہماری عطا ہے، اس کا کہیں ختم ہی نہیں (یعنی دائمی اور ابدی نعمت ہے) یہ بات تو ہو چکی (جو نیک بخت پرہیزگاروں کے متعلق تھی) اور (آگے کافروں کے متعلق مضمون ہے) وہ (یہ کہ) سرکشوں کے لئے (یعنی جو کفر میں دوسروں کے رہنما تھے ان کے لئے) برا ٹھکانا ہے، یعنی دوزخ، اس میں وہ داخل ہوں گے، سو بہت ہی بُری جگہ ہے، یہ کھولتا ہوا پانی اور پیپ (موجود) ہے سو یہ لوگ اس کو چکیں اور اس کے علاوہ، اور بھی اس قسم کی (ناگوار اور موجبِ آزار) طرح طرح کی چیزیں (موجود) ہیں (اس کو بھی چکیں) اور جو تابع تھے ان کے لئے بھی یہی چیزیں ہیں، گو تقدیم و تاخر اور شدت اور شدت کا تفاوت ہو، باقی نفسِ عذاب میں سب شریک ہیں۔ چنانچہ جب کافروں کے رہنما اول داخل جہنم ہو چکیں گے، پھر ان کے پیرو آئیں گے تو رہنما آپس میں کہیں گے کہ لو، یہ ایک جماعت اور آئی جو تمہارے ساتھ (عذاب میں شریک ہونے کے لئے جہنم میں) گھس رہے ہیں ان پر خدا کی مار یہ بھی دوزخ ہی میں آ رہے ہیں (یعنی کوئی ایسا تابو عذاب کا مستحق نہ ہوتا تو اس کے آنے کی خوشی بھی ہوتی اور اس کی

اَوْ بَعَاثَ بَعِي كَمَتَ يَدُ خُودِهِ جہنمی ہیں۔ ان سے کیا امید اور ان کے آنے کی کیا خوشی اور کیا آؤ بھگت؟ (وہ) پیرو اپنے رہنماؤں سے کہیں گے، بلکہ تمہارے ہی اوپر خدا کی مار (کیونکہ) تم ہی تو یہ (مصلبت) ہمارے آگے لائے کیونکہ تم ہی نے ہم کو بہکا یا تھا) سو (جہنم) بہت ہی برا ٹھکانا ہے (جو تمہاری بدولت ہمارے آگے آیا۔ اس کے بعد جیب ان میں ہر شخص دوسرے پر الزام کھنے لگے گا تو اس وقت یہ متبعین ان سے خطاب چھوڑ کر حق تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار جو شخص اس (مصلبت) کو ہمارے آگے لایا ہو اس کو دوزخ میں دونا عذاب دیجیو، اور وہ لوگ (یعنی متبعین) یا سب دوزخ ہی آپس میں) کہیں گے کہ کیا بات ہے ہم ان لوگوں کو (دوزخ میں) نہیں دیکھتے جنکو ہم بڑے لوگوں میں شمار کیا کرتے تھے (یعنی مسلمانوں کو بدراہ اور حقیر سمجھا کرتے تھے، وہ کیوں نظر نہیں آتے) کیا ہم نے (ناحق) ان کی منسی کر رکھی تھی (اور وہ اس قابل نہ تھے اور جہنم میں نہیں آتے) یا (یہ کہ جہنم میں موجود ہیں مگر) ان (کے دیکھنے) سے لگا ہیں چکرار ہی ہیں (کہ ان پر نظر نہیں جمی۔ مطلب یہ کہ عذاب کے ساتھ ایک اور حسرت ہوگی کہ جن لوگوں کو ہم برا سمجھتے تھے وہ عذاب سے بچ گئے، اور) یہ بات یعنی دوزخیوں کا آپس میں لڑنا جھگڑنا بالکل سچی بات ہے (کہ ضرور ہو کر رہے گی)۔

معارف و مسائل

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ کَانَ بَصَیْرًا۔ اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ وہ ہاتھوں اور نگاہوں والے تھے مطلب یہ ہے کہ اپنی فکری اور عملی توانائیاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں صرف کرتے تھے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ اعضاء انسانی کا اصل مصرف یہ ہے کہ وہ اطاعت الہی میں خرچ ہوں، اور جو اعضاء اس میں خرچ نہ ہوں ان کا ہونا نہ ہوتا برابر ہے۔

فکر آخرت انبیاء کا ذکر فی الذار۔ اس کے لفظی معنی ہیں ”گھر کی یاد“ اور ”گھر“ سے مراد آخرت ہے۔ آخرت کے بجائے امتیازی وصف ہے یہ لفظ استعمال کر کے تنبیہ کر دی گئی ہے کہ انسان کو اپنا اصلی گھر آخرت ہی کو سمجھنا چاہیے اور اسی کی فکر کو اپنے افکار و اعمال کی بنیاد بنانا چاہیے یہ ہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فکر آخرت انسان کی فکری اور عملی قوت کو اور زیادہ جلا بخشتی ہے۔ بعض محدثین کا خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ فکر آخرت انسان کی قوتوں کو کند کر دیتی ہے۔

وَالْيَسَعَ اور الیسع علیہ السلام کو یاد کرو) حضرت الیسع علیہ السلام بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام میں سے ہیں اور قرآن کریم میں ان کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے۔ ایک سورہ انعام میں اور دوسرے یہاں۔ دونوں میں سے کسی جگہ آپ کے تفصیلی حالات

مذکور نہیں، بلکہ انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں صرف آپ کا اسم گرامی شمار کیا گیا ہے۔
تاریخ کی کتابوں میں منقول ہے کہ آپ حضرت الیاس علیہ السلام کے چچا زاد بھائی ہیں اور حضرت الیاس علیہ السلام کے نائب اور خلیفہ تھے، انہی کی رفاقت میں رہتے تھے، ان کے بعد آپ کو نبوت عطا کی گئی۔
بائبل کی کتاب سلاطین اول باب ۱۹ اور سلاطین دوم باب ۲ وغیرہ میں آپ کے تفصیلی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ وہاں آپ کا اسم گرامی ایشع بن سافط مذکور ہے۔

وَعِنْدَهُمْ قِصَصَاتُ الظُّرُفِ أَتْرَابٌ۔ (اور ان کے پاس بھی نگاہ والی ہم عمر عورتیں ہوں گی) ان سے مراد جنت کی حوریں ہیں، اور ”ہم سن“ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سب آپس میں ہم عمر ہوں گی، اور یہ بھی کہ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ عمر میں مساوی ہونگی پہلی صورت میں ان کے ہم عمر ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ ان کے درمیان آپس میں محبت، انس اور دوستی کا تعلق ہو گا سو کنوں کا سا، بغض اور نفرت نہیں ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ چیز شوہروں کے لئے انتہائی راحت کا موجب ہے۔

زوجین کے درمیان عمر کے تناسب کی رعایت بہتر ہے | اور دوسری صورت میں جبکہ ”ہم عمر“ کا مطلب یہ لیا جائے کہ وہ اپنے شوہروں کی ہم عمر ہوں گی، اس کا فائدہ یہ ہے کہ ہم عمری کی وجہ سے طبیعتوں میں زیادہ مناسبت اور توافق ہوگا۔ اور ایک دوسرے کی راحت و دلچسپی کا خیال زیادہ رکھا جاسکے گا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زوجین کے درمیان عمر میں تناسب کی رعایت رکھنی چاہیے، کیونکہ اس سے باہمی انس پیدا ہوتا ہے۔ اور مشدہ نکاح زیادہ خوشگوار اور پائیدار ہو جاتا ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا مُنذِرٌ ۖ وَمَا مِن إِلَهِ إِلَّا اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۴۵

تو کہہ میں تو یہی ہوں ڈر سنا دینے والا اور حاکم کوئی نہیں مگر اللہ اکیلا دہاؤ والا

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ۝۴۶

رب آسمانوں کا اور زمین کا اور جو ان کے بیچ میں ہے زبردست گناہ بخشنے والا

قُلْ هُوَ نَبِیُّۤا عَظِیْمٌ ۝۴۷ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ ۝۴۸ مَا كَانَ

تو کہہ یہ ایک بڑی خبر ہے کہ تم اس کو دھیان میں نہیں لاتے مجھ کو کچھ

لِی مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلٰٓئِکَ الْاَعْلٰی اِذْ یَخْتَصِمُونَ ۝۴۹ اِنَّ

خبر نہ تھی اور ہر کی مجلس کی جب وہ آپس میں تکرار کرتے ہیں مجھ کو تو

یُوْحٰی اِلَیَّ ۚ اِلَّا اَنْتُمْ اَنْتُمْ اَنْتُمْ یُرْمٰیْنَ ۝۵۰ اِذْ قَالَ رَبِّکَ

یہی حکم آتا ہے کہ اور کچھ نہیں میں تو ڈر سنا دینے والا ہوں کھول کر جب کہا تیرے رب نے

لِّلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝۴۱ فَاِذَا سُوِّیْتَهُ وَ

فرشتوں کو میں بناتا ہوں ایک انسان مٹی کا پھر جب ٹھیک بنا چکوں اور

نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا اِلَیْہٖ سٰجِدٰتٍ ۝۴۲ فَسَجَدَ

پھونکیوں اس میں ایک اپنی جان تو تم گر پڑو اس کے آگے سجدے میں پھر سجدہ کیا

اَلْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اٰجَمِعُوْنَ ۝۴۳ اِلَّا اِبْلِیْسَ ط اِسْتَكْبَرَ

فرشتوں نے سب نے اکٹھے ہو کر مگر ابلیس نے غرور کیا

وَكَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ۝۴۴ قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ

اور تھا وہ منکروں میں فرمایا اے ابلیس کس چیز نے روک دیا تجھ کو

تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیْ ط اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ

کے سجدہ کرے اس کو جس کو میں نے بنایا اپنے دونوں ہاتھ سے یہ تو نے غرور کیا یا تو بڑا عدا

اَلْعٰلِیْنَ ۝۴۵ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہٖ ط خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَ

درجہ میں بولا میں بہتر ہوں اس سے مجھ کو بنایا تو نے آگ سے اور

خَلَقْتَهُ مِنْ طِیْنٍ ۝۴۶ قَالَ فَاخْرِجْ مِنْهَا فَاثَّكَ

اس تو بنایا مٹی سے فرمایا تو تو نکل یہاں سے کہ تو

رَجِیْمٌ ۝۴۷ وَاِنَّ عَلَیْكَ لَعْنَتِیْ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۴۸ قَالَ

مردود ہوا اور تجھ پر میری پشکار ہے اس جزا کے دن تک بولا

رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝۴۹ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ

اے رب مجھ کو ڈھیل دے جس دن تک مرنے جی اٹھیں فرمایا تو مجھ کو

اَلْمُنْظَرِیْنَ ۝۵۰ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝۵۱ قَالَ فَبِعِزَّتِیْ

ڈھیل ہے اسی وقت کے دن تک جو معلوم ہے بولا تو قسم ہے میری

لَا اُغْوِیْہُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۵۲ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْہُمْ اَلْمُخْلِصِیْنَ ۝۵۳

عزت کی میں گمراہ نہ کروں گا ان سب کو مگر جو بندے ہیں ان میں میرے چنے ہوئے

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقُّ اَقُوْلُ ۝۵۴ لَا مَلَكٌ جَہَنَّمَ مِنْکَ وَ

فرمایا تو ٹھیک بات یہ ہے اور میں ٹھیک ہی کہتا ہوں مجھ کو بھڑنا ہے دوزخ تجھ سے اور

مِّنْ تَبِعَکَ مِنْہُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۵۵ قُلْ مَا اَسْأَلُکُمْ عَلَیْہِ

جو ان میں میری راہ چلے ان سب تو کہہ میں مانگتا نہیں تم سے

مِنْ اَجْرٍ وَمَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِیْنَ ۝۵۶ اِنَّ ہُوَ اِلَّا

اس پر مجھ کو بدلہ اور میں نہیں اپنے آپ کو بنانے والا یہ تو ایک ہمارا شے ہے

ذِكْرُ لِلْعَالَمِينَ ۝ وَكَتَعْلَمَنَّ نَبَأَ لَعْدَ حِينَ ۝

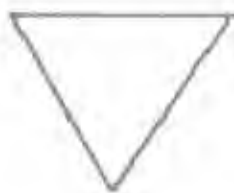
سارے جہان والوں کو اور معلوم کرو گے اس کا احوال تھوڑی دیر کے نیچے

مُخَلَّصَةٌ تَفْسِير

آپ کہہ دیجئے کہ (تم جو رسالت اور توحید کے مسئلہ میں تکذیب و انکار کرتے ہو تو تمہارا ہی نقصان ہے میرا کچھ ضرر نہیں، کیونکہ) میں تو (تم کو صرف عذابِ خداوندی سے، ڈرانے والا (پیغمبر) ہوں، اور (جیسے میرا رسول اور مندر ہونا واقعی ہے اسی طرح توحید بھی برحق ہے، یعنی) بجز اللہ واحد غالب کے کوئی لائق عبادت کے نہیں ہے، وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان کے درمیان میں ہیں (اور وہ) زبردست (اور گناہوں کا) بڑا بخشنے والا ہے۔ (اور چونکہ توحید کو تو کسی درجہ میں وہ لوگ مانتے بھی تھے اور رسالت کے بالکل ہی منکر تھے، اس لئے رسالت کی مزید تحقیق کے لئے ارشاد ہے کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ یہ (یعنی اللہ تعالیٰ کا مجھ کو توحید اور احکام شریعت کی تعلیم کے لئے رسول بنانا) ایک عظیم الشان مضمون ہے جس (کا تم کو بڑا اہتمام چاہیے تھا، مگر افسوس کہ اُس) سے تم (بالکل ہی) بے پروا ہو رہے ہو اور اس کے عظیم الشان مضمون ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اعتقاد رکھے بغیر حقیقی سعادت کا حصول ناممکن ہے۔ آگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت کرنے کی ایک دلیل ہے۔ وہ یہ کہ مجھ کو عالم بالا (کی بحث و گفتگو) کی (کسی ذریعہ سے) کچھ بھی خبر نہ تھی جبکہ وہ (تخلیقِ آدم کے بارے میں جسکی تفصیل آگے آتی ہے، اللہ تعالیٰ سے) گفتگو کر رہے تھے (اب میں جو اس گفتگو کا واقعہ بتا رہا ہوں تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ مجھے یہ واقعہ کہاں سے معلوم ہوا؟ میں نے بچپن خود تو اسے دیکھا نہیں، اہل کتاب سے بھی میرا ایسا میل جول نہیں کہ اُن سے معلوم کر لیتا، یقیناً مجھے یہ علم وحی کے ذریعہ ہی حاصل ہوا ہے، لہذا ثابت ہو گیا کہ) میرے پاس (جو) وحی (آتی ہے جس سے عالم بالا کے احوال بھی معلوم ہوتے ہیں، تو) محض اس سبب سے آتی ہے کہ میں (مخائب اللہ) صاف صاف ڈرانے والا (کر کے بھیجا گیا) ہوں (یعنی چونکہ مجھے پیغمبری ملی ہے اس لئے وحی نازل ہوتی ہے۔ پس واجب ہے کہ تم میری رسالت کی تصدیق کرو۔ اور عالم بالا کی اللہ تعالیٰ گفتگو جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے اُس وقت ہوئی تھی) جبکہ آپ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں گارے سے ایک انسان کو (یعنی اُس کے پتلے کو بنانے والا ہوں، سو میں جب اس کو (یعنی اس کے جسمانی اعضاء کو) پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) جان ڈالوں تو تم سب اس کے رو برو سجدہ میں گر پڑنا، سو (جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بنالیا تو) سارے کے سارے فرشتوں نے (آدم علیہ السلام کو) سجدہ کیا، مگر ابلیس نے کہ وہ غرور میں آگیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابلیس

جس چیز کو میں نے اپنے ہاتھوں بنایا (یعنی جس چیز کو وجود میں لانے کے لئے خواص عنایت ربانی متوجہ ہوئی) پھر اس کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس کو سجدہ کرنے سے مجھ کو کون چیز مانع ہوئی، کیا تو غرور میں آگیا؟ (اور دافع میں بڑا نہیں ہے) یا یہ کہ تو (واقع میں ایسے) بڑے درجہ والوں میں سے ہے جس کو سجدہ کا حکم نہ بھی زیر نہیں) کہنے لگا کہ (دوسری بات صحیح ہے، یعنی میں آدم سے بہتر ہوں) (کیونکہ) آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے۔ اور اس (آدم) کو خاک سے پیدا کیا ہے (پس مجھ کو حکم دینا کہ اس کے سامنے سجدہ کروں حکمت کے خلاف ہے) ارشاد ہوا تو (اچھا پھر) آسمان سے نکل کیونکہ بیشک تو (اس حرکت سے) مردود ہو گیا اور بیشک مجھ پر میری لعنت رہے گی قیامت کے دن تک (اور اس کے بعد مورد رحمت ہونے کا احتمال نہیں ہے) کہنے لگا کہ اگر مجھ کو آدم کی وجہ سے مردود کیا ہے تو پھر مجھ کو (مرنے سے) مہلت دیجئے قیامت کے دن تک (تاکہ ان سے اور ان کی اولاد سے خوب بدلہ لوں) ارشاد ہوا (جب تو مہلت مانگتا ہے) تو (جا) تجھ کو معین وقت کی تاریخ تک مہلت دی گئی، کہنے لگا (جب مجھ کو مہلت مل گئی) تو (مجھ کو بھی) تیری (ہی) عزت کی قسم ہے) کہ میں ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کئے گئے ہیں (یعنی آپ نے ان کو میرے اثر سے محفوظ رکھا ہے) ارشاد ہوا کہ میں سچ کہتا ہوں اور میں تو (ہمیشہ) سچ ہی کہا کرتا ہوں کہ میں مجھ سے اور جو ان میں سے تیرا ساتھ دے ان سب سے دوزخ بھر دوں گا۔

(سورت کی ابتدائی آیات سے واضح ہے کہ اس سورت کا بنیادی مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات ہے۔ اس موضوع پر دلائل تو دیئے جا چکے، اب ناصحانہ طریقہ پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے) آپ (بطور اتمام حجت کے) کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس (قرآن کی تبلیغ) پر نہ کچھ معاوضہ چاہتا ہوں اور نہ میں بناوٹ کر لے والوں میں ہوں (کہ بناوٹ کی راہ سے نبوت کا دعویٰ کیا ہو) اور غیر قرآن کو قرآن کہہ دیا ہو۔ یعنی اگر جھوٹ بولتا تو اس کا منشاء یا تو کوئی مادی نفع ہوتا جیسے معاوضہ، یا کوئی طبعی عادت ہوتی جیسے تکلف، سو یہ دونوں باتیں نہیں، بلکہ فی الواقع یہ قرآن تو (اللہ کا کلام اور) دنیا جہان والوں کے لئے بس ایک نصیحت ہے (جس کی تبلیغ کے لئے مجھ کو نبوت ملی ہے اور جس میں سراسر تمہارا ہی نفع ہے) اور (اگر حق کے واضح ہونے کے باوجود بھی تم نہیں مانتے تو) تھوڑے دنوں بیچے تم کو اس کا حال معلوم ہو جاوے گا (یعنی مرنے کے ساتھ ہی حقیقت کھل جائے گی کہ یہ حق تھا اور اس کا انکار باطل تھا، مگر اس وقت معلوم ہونے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا)



معارف و مسائل

خلاصہ مضامین سورت

قُلْ إِنَّمَا أَنَا صُنْدٌ ۖ سورت کے شروع میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس سورت کا اصل مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات اور کفار کی تردید ہے، اسی ضمن میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات و وجہ سے ذکر کئے گئے تھے۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہو اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کی طرح آپ بھی کفار کی بے ہودہ باتوں پر صبر فرمائیں۔ دوسرے یہ کہ ان واقعات سے خود وہ لوگ غیرت حاصل کریں جو ایک نبی برحق کی رسالت کا انکار کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور طریقے سے کفار کو دعوت اسلام دی گئی اور وہ اس طرح کہ مؤمنوں کی نیک انجامی اور کافروں کے عذاب شدہ پلٹنے کا بیان کیا۔ اور اس بات پر تنبیہ کی گئی کہ جن لوگوں کی اتباع میں تم آج افضل الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر رہے ہو آخرت کے دن وہی لوگ تمہاری مدد سے دستبردار ہو جائیں گے، وہ تمہیں برا بھلا کہیں گے اور تم ان پر لعنت بھیجو گے۔

ان تمام مضامین کے بعد آخر میں پھر اصل مدعا یعنی اثبات رسالت کا بیان کیا گیا ہے، اور دلائل پیش کرنے کے ساتھ نا صحابہ انداز میں دعوت بھی دی گئی ہے۔

مَا كَانَتْ لِي مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلِكِ إِلَّا عَلَىٰ إِذْ يَخْتَصِمُونَ۔ (مجھ کو عالم بالا کی کچھ بھی خبر نہ تھی جبکہ وہ گفتگو کر رہے تھے) یعنی یہ میری رسالت کی واضح دلیل ہے کہ میں تم سے عالم بالا کی ایسی باتیں بیان کرتا ہوں جو وحی کے سوا کسی بھی ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ ان باتوں سے مراد ایک تو وہ گفتگو ہے جو تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان ہوئی تھی، اور جس کا تذکرہ سورہ بقرہ میں آچکا ہے۔ فرشتوں نے کہا تھا کہ تَجْعَلُ فِيهَا مَصْرًا يَفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاطَ۔ (کیا آپ زمین میں ایسے انسان کو پیدا کر رہے ہیں جو وہاں فساد پھیلانے اور خونریزی کرنے؟) اس گفتگو کو یہاں ”اختصام“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی ہیں ”جھگڑا“، یا ”بحث و مباحثہ“، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ فرشتوں کا یہ سوال کوئی اعتراض یا بحث و مباحثہ کے نقطہ نظر سے نہ تھا بلکہ وہ محض تخلیق آدم کی حکمت معلوم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سوال و جواب کا ظاہری رُو کار چونکہ بحث کا سا ہو گیا تھا اس لئے اسے ”اختصام“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے جب کوئی چھوٹا کسی بڑے سے کوئی سوال کرتا ہے تو بعض اوقات بڑا آدمی اس کا ذکر کرتے ہوئے ازراہ تفسن اس کے سوال و جواب کو ”جھگڑنے سے تعبیر کر دیتا ہے۔“

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلِكِ عِصَّةً۔ (جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا الخ) یہاں تخلیق آدم کا جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے اس سے اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی مذکورہ بالا گفتگو کی طرف اشارہ کے ساتھ ساتھ اس

بات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح ابلیس نے محض حسد اور تکبر کی وجہ سے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا، اسی طرح مشرکین عرب بھی حسد اور تکبر کی وجہ سے آپؐ کی بات نہیں مان رہے، اور جو انجام ابلیس کا ہوا وہی ان کا بھی ہونا ہے۔ (تفسیر کبیر)

لَمَّا خَلَقْتَ بَدَنِي - یہاں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے انھیں پیدا کیا۔ جمہور اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ ”ہاتھوں“ سے مراد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ایسے ہی ہاتھ ہیں جیسے انسانوں کے ہوتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اعضاء و جوارح کی احتیاج سے منزہ ہے۔ لہذا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے، اور عربی زبان میں لفظ ”بید“ بکثرت قدرت کے معنی میں مستعمل ہے، مثلاً ارشاد ہے: بِيَدِهِ عَقْدُ الْكَوْكَبِ - لہذا آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں نے آدم کو اپنی قدرت سے پیدا کیا۔ اور یوں تو کائنات کی ساری چیزیں قدرت خداوندی ہی سے پیدا ہوئی ہیں، لیکن جب باری تعالیٰ کسی چیز کا خصوصی شرف ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو اسے خاص طور سے اپنی طرف منسوب فرمادیتے ہیں۔ جیسے کعبہ کو بیت اللہ۔ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ناقۃ اللہ، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ یا روح اللہ کہا گیا ہے۔ یہاں بھی یہ نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے کی گئی ہے (قرطبی)

وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ - (اور میں بناوٹ کرنے والوں میں سے نہیں ہوں) تکلف اور تصنع کی مذمت

مطلب یہ ہے کہ میں تکلف اور تصنع کر کے اپنی نبوت و رسالت اور علم و حکمت کا اظہار نہیں کر رہا، بلکہ اللہ کے احکام کو ٹھیک ٹھیک پہنچا رہا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تکلف اور تصنع شرعاً مذموم ہے۔ چنانچہ اس کی مذمت میں بعض احادیث وارد ہوئی ہیں صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد منقول ہے کہ ”اے لوگو تم میں سے جس شخص کو کسی بات کا علم ہو وہ تو لوگوں سے کہدے، لیکن جس کا علم نہ ہو تو وہ ”اللہ اعلم“ کہنے پر اکتفا کر لے، (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا ہے۔ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ“ (روح المعانی)

سُورَةُ الزُّمَرِ

سُورَةُ الزُّمَرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسُ وَسَبْعُونَ آيَةً وَثَنَانِ مُرَكَّعَاتٍ

سورہ زمر مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پچھتر آیتیں ہیں اور آٹھ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ① إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ

اتارنا ہے کتاب کا اللہ سے جو زبردست ہے حکمتوں والا ① ہم نے اتاری ہے

إِلَيْكَ الْكِتَابُ بِالْحَقِّ فَأَعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ②

تیری طرف کتاب ٹھیک ٹھیک سو بندگی کر اللہ کی خالص کہہ اس کے واسطے بندگی

أَلِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ

سنتا ہے اللہ ہی کے لئے ہے بندگی خالص اور جنہوں نے پکڑ رکھے ہیں اُس سے ورے

أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى ③

حمایتی کہ ہم تو پوجتے ہیں اُن کو اس واسطے کہ ہم کو پہنچادیں اللہ کی طرف قریب کے درجہ میں

اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ④ إِنَّ اللَّهَ

بیشک اللہ فیصلہ کر دے گا اُن میں جس چیز میں وہ جھگڑ رہے ہیں البتہ اللہ

لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَذِبٌ كَفَّارٌ ⑤ كَوَّارَ اللَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ

راہ نہیں دیتا اُس کو جو بوجھوٹا حق نہ ماننے والا اگر اللہ چاہتا کہ اولاد

وَلَدًا إِلَّا صُطْفًى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ لَا سُبْحَنَهُ ⑥ هُوَ

کر لے تو چن لیتا اپنی مخلوق میں سے جو کچھ چاہتا وہ پاک ہے وہی ہے

اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ⑦ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ⑧

اللہ اکلا دیار والا بنائے آسمان اور زمین ٹھیک

يُكْوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكْوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ

پہناتا ہے رات کو دن پر اور پہناتا ہے دن کو رات پر اور کام میں

الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ إِلَّا هُوَ

لگا دیا سورج اور چاند کو ہر ایک چلتا ہے ایک ٹھہری ہوئی مدت پر سنا ہے ہی ہے

الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ۝ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ

بہر دست گناہ بخشہ والا بنایا تم کو ایک ہی سے پھر بنایا اسی سے

مِنْهَا زَوْجَهَا وَانْزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمِينَةَ آزَاجٍ ۖ

اس کا جوڑا اور انارے تمہارے واسطے جو پاؤں سے آٹھ نر مادہ

يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ

بناتا ہے تم کو ماں کے پیٹ میں ایک طرح پر دوسری طرح کے نیچے

فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا إِلَهَ

تین اندھیروں کے نیچے وہ اللہ ہے رب تمہارا اسی کا راج ہے کسی کی بندگی

إِلَّا هُوَ قَاتِي تَصَرُّفُونَ ۝ ۶

ہیں اُس کے سوائے پھر کہاں سے پھرے جاتے ہو ۔

خلاصہ تفسیر

یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے (کہ غالب ہونا اس کا مقتضی تھا کہ جو اس کی تکذیب کرے اس کو سزا دیدی جاوے) مگر چونکہ حکیم بھی ہے اور مہلت میں مصلحت تھی، اس لئے سزا میں مہلت دے رکھی ہے) ہم نے ٹھیک طور پر اس کتاب کو آپ کی طرف نازل کیا ہے سو آپ (قرآن کی تعلیم کے موافق) خالص اعتقادِ کبر کے اللہ کی عبادت کرتے رہیے۔ (جیسا اب تک کرتے رہے ہیں اور جب آپ پر بھی یہ واجب ہے تو آدمیوں پر تو کیوں واجب نہیں ہوگا، اسے لوگوں یاد رکھو عبادت جو کہ (شرک و ریائے) خالص ہو اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے اور جن لوگوں نے (عبادتِ خالصہ چھوڑ کر) خدا کے سوا اور شرکاء تجویز کر رکھے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرر بنا دیں (یعنی ہمارے حوائج یا عبادت کو خدا کے حضور پیش کر دیں جیسا دنیا میں دوزرا و دربارِ سلاطین میں اس کام کے ہوتے ہیں) تو ان کے (اور ان کے مقابل اہل ایمان کے) باہمی اختلافات کا (قیامت کے روز) اللہ تعالیٰ (عملی) فیصلہ کر دے گا کہ اہل توحید کو جنت میں اور اہل شرک کو دوزخ میں داخل کر دے گا

یعنی ان لوگوں کے ماننے پر آپ غم نہ کریں ان کا فیصلہ وہاں ہوگا اور اس کا بھی تعجب نہ کریں کہ باوجود قیام دلائل کے یہ حق پر نہیں آتے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو راہ پر نہیں لاتا جو (قولاً، جہواً اور اعتقاداً) کافر ہو (یعنی منہ سے اقوال کفریہ اور دل سے عقائد کفریہ پر مضمحل ہو اور اس سے باز نہ آنے کا اور طلب حق کا قصد ہی نہ کرتا ہو تو اس کے اس عناد سے اللہ تعالیٰ بھی اس کو توفیق ہدایت کی نہیں دیتا اور چونکہ مشرکین میں بعضے خدا کی طرف اولاد کی نسبت کرتے تھے جیسے ملائکہ کو بنات اللہ کہتے تھے، آگے ان کا رد ہے کہ) اگر (بالفرض) اللہ تعالیٰ (کسی کو اولاد بناتا تو یقیناً اس کے کہ بدون ارادہ خداوندی کوئی فعل واقع نہیں ہوتا، اولاد بنانے کا ارادہ کرتا اور اگر کسی کو اولاد بنانے کا ارادہ کرتا تو (خونکہ) ماسوائے اللہ سب مخلوق ہیں اس لئے) ضرور اپنی مخلوق (یہی ہیں سے جس کو چاہتا (اس امر کے لئے) منتخب فرماتا اور لازم باطل ہے کیونکہ) وہ (عیوب سے پاک ہے) اور غیر جنس ہونا عیب ہے اس لئے کسی مخلوق کو اولاد بنانے کے لئے منتخب کرنا محال ہوا اور محال کا ارادہ کرنا بھی محال ہے اس طرح ثابت ہو گیا کہ وہ ایسا اللہ ہے جو واحد ہے (کہ اس کا کوئی شریک بالفعل نہیں اور) زبردست ہے (اس کا کوئی شریک بالقوہ بھی نہیں کیونکہ صلاحیت جب ہوئی کوئی ویسا ہی زبردست ہوتا اور وہ ہے نہیں۔ آگے دلائل توحید ارشاد فرماتے ہیں کہ) اس نے زمین اور آسمان کو حکمت سے پیدا کیا، وہ رات (کی ظلمت) کو دن (کی روشنی) کے محل (یعنی ہوا) پر بٹاتا ہے (جس سے دن غائب اور رات آمو جو رہوتی ہے) اور دن (کی روشنی) کو رات (کی ظلمت) کے محل (یعنی ہوا) پر بٹاتا ہے (جس سے رات غائب اور دن آمو جو ہو جاتا ہے) اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے (ان میں) ہر ایک وقت مقررہ تک چلتا رہے گا یاد رکھو کہ ان دلائل کے بعد انکار توحید اندیشہ غلط ہے اور اللہ تعالیٰ اس پروردگار بھی ہے کیونکہ وہ زبردست ہے (لیکن اگر بعد انکار کے بھی کوئی تسلیم کر لے تو انکار گزشتہ پر عذاب دیگا، کیونکہ وہ پڑا بخشنے والا بھی) ہے۔ اس سے توحید کی ترغیب اور شرک سے ترہیب ہو گئی اور اب استدلال تھا دلائل آفاقیہ سے آگے استدلال ہے دلائل انفسیہ سے جس میں ضمنی طور پر کچھ آفاقی حالات بھی آگے ہیں، یعنی اس نے تم لوگوں کو تین واحد (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا (کہ اول وہ تین واحد پیدا ہوا) پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا (مراد اس سے حوا ہیں آگے پھر ان سے تمام آدمی پھیلا دئے) اور (بعد حادث کے) تمہارے (نفع بقا رکھنے) اٹھ نژاد مادہ چار پایوں کے پیدا کئے (جن کا ذکر پارہ ہشتم کے ربع پر رکوع وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ میں آیا ہے اور ان کی تفصیص اس لئے کہ یہ زیادہ کام میں آتے ہیں۔ یہی ہے وہ جزو جوافاقیات میں سے تبعاً مذکور ہو گیا اور تبعاً اس لئے کہا گیا کہ مقصود بیان کرنا ہے بقا نفس کا اور یہ اسباب بقا میں سے ہے آگے کیفیت خلقت نسل انسانی کی بیان فرماتے ہیں کہ) وہ تم کو ماؤں کے پیٹ میں ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت پر (اور دوسری کیفیت کے بعد تیسری کیفیت پر) علیٰ ہذا مختلف کیفیات پر (بناتا ہے) (کہ اول نطفہ ہوتا ہے پھر علقہ پھر مضغہ الی آخرہ اور یہ بنانا) تین تاریکیوں میں (ہوتا ہے)

ایک تاریخی شکم کی، دوسری رحم کی، تیسری اس جھکی کی جس میں بجیہ لپٹا ہوتا ہے۔ ان مختلف کیفیات، متعدد دائرہ ہستیوں میں تخلیق کمال قدرت کی دلیل ہے اور ظلماتِ شمشیر میں پیدا کرنا کمالِ علم کی دلیل ہے (یہ ہے اللہ تعالیٰ رب جس کی صفات ابھی تم نے سنیں) اسی کی سلطنت ہے، اُس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں سو (ان لائل کے بعد) تم کہاں (حق سے) پھرے چلے جا رہے ہو (بلکہ واجب ہے کہ توحید کو قبول کرو اور شرک کو چھوڑ دو)۔

معارف و مسائل

فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۚ اَللّٰهُ الَّذِيْ لَمْ يَخْلُصْ لَهُ دِيْنٌ مِّنْ دِيْنِهِ ۚ اِنَّ اللَّهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ
عبادت کے ہیں یا طاعت کے، جو تمام احکام دینیہ کی پابندی کو عام اور شامل ہے۔ اس کے پہلے جملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت و طاعت کو خالص اسی کے لئے کریں جس میں کسی غیر اللہ کے شریک یا ربا یا رنود کا شائبہ نہ ہو۔ دوسرا جملہ اُسی کی تاکید کے لئے ہے کہ اخلاص دین صرف اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے۔ اُس کے سوا اور کوئی مستحق نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں بعض اوقات کوئی صدقہ و خیرات کرتا ہوں یا کسی پر احسان کرتا ہوں جس میں میری نیت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی بھی ہوتی ہے اور یہ بھی کہ لوگ میری تعریف و ثناء کریں گے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں فرمائے، جس میں کسی غیر کو شریک کیا گیا ہو۔ پھر آپ نے آیت مذکورہ بطور استدلال کے تلاوت فرمائی۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ لَمْ يَخْلُصْ لَهُ دِيْنٌ مِّنْ دِيْنِهِ ۚ (قرطبی)

مستند آیات قرآنی اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اعمال کا حساب اعمال کی مقبولیت عند اللہ گنتی سے نہیں بلکہ وزن سے ہوتا ہے۔ وَلَنُضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ اُنْفِخَ الصُّورُ اور آیات مذکورہ نے بتلادیا کہ اللہ کے نزدیک اعمال کی

قدراور وزن بقدر اخلاص ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کمال اخلاص بدون کمال ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اخلاص کامل یہ ہے کہ اللہ کے سوا نہ کسی کو نفع و ضرر کا مالک سمجھے نہ اپنے کاموں میں کسی غیر اللہ کو متصرف خیال کرے، نہ کسی طاعت و عبادت میں غیر اللہ کا اپنے تصور سے دھیان آنے دے۔ غیر اختیاری مساوس کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتا ہے۔

صحابہ کرامؓ جو مسلمانوں کی صفِ اول ہیں ان کے اعمال و ریاضات کی تعداد کچھ زیادہ نظر نہ آئے گی۔ مگر اس کے باوجود ان کا ایک ادنیٰ عمل باقی اُمت کے بڑے بڑے اعمال سے نائق ہونے کی وجہ ان کا

کمال ایمان اور کمال اخلاص ہی تو ہے۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مِمَّا نَعْبُدُ لَهُمْ أَلَا لِيُقَسِّرَ بُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ ط
یہ مشرکین عرب کا حال ہے اور اس زمانے کے عام مشرکین بھی تقریباً یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ خالق و مالک اور تمام کاموں میں متصرف تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ شیطان نے ان کو بہکایا تو اپنے خیال کے مطابق فرشتوں کی شکلوں پر مبنی تراشے اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ بت ہمارے بنائے ہوئے ہیں انھیں کوئی عقل و شعور اور قدرت و قوت نہیں۔ انھیں عقیدہ یہ تھا کہ ان بتوں کی تعظیم و تکریم سے وہ فرشتے ہم سے خوش ہوں گے جنکی شکلوں پر مبنی بنائے گئے ہیں اور فرشتے اللہ کے نزدیک مقرب ہیں۔ انھوں نے بارگاہ خداوندی کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کیا کہ جیسے شاہی مقرب کسی سے خوش ہوں تو وہ بادشاہ کے پاس ان کی سفارش کر کے ان کو بھی بادشاہ کا مقرب بنا دیتے ہیں۔ یہ سمجھتے تھے کہ فرشتے بھی بادشاہی ربا ریوں کی طرح جس کی چاہیں سفارش کر سکتے ہیں مگر ان کے سارے خیالات شیطانی تلبیس اور باطل ہی باطل تھے۔ ازل تو یہ بت فرشتوں کی شکل پر واقع میں ہیں نہیں اور ہوں بھی تو اللہ کے مقرب فرشتے اپنی پرستش سے کب خوش ہونے والے ہیں یا ان کو تو ہر اس چیز سے طبعی نفرت ہے جو اللہ کے نزدیک ناپسند ہو۔ اس کے علاوہ بارگاہ خداوندی میں وہ از خود کسی کی سفارش نہیں کر سکتے جب تک ان کو کسی خاص شخص کے بارے میں سفارش کی اجازت نہ مل جائے۔

وَكَمْ مِنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّذِنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُرِضٰى ۔ کا یہی مطلب ہے۔

اُس زمانے کے مشرکین بھی آج کے کفار سے بہتر تھے۔ آج کے کفار پرست کفار تو خود اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی شان میں براہ راست گستاخیاں کرتے ہیں۔ یورپ سے در آمد کیا گیا کفر خواہ اُس کے رنگ مختلف ہوں، کوئی سرمایہ پرست ہو، کوئی کیونزیم کا قائل۔ یہ بات سب میں قدر مشترک ہے کہ معاذ اللہ خدا کوئی چیز نہیں، ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ہم سے ہمارے اعمال کی باز پرس کرنے والا کوئی نہیں۔ اسی بدترین کفر اور ناشکری کا نتیجہ ہے کہ پوری دنیا سے امن و اطمینان، سکون و راحت مفقود ہو چکا ہے، راحت کے نئے نئے سامان بہت مگر راحت مفقود علاج معالجہ کے جدید آلات اور تحقیقات کی بہتات مگر امراض کی اتنی کثرت جو پہلے کسی زمانے میں نہیں مٹنی گئی۔ پہرے چوکیا پولیس، خفیہ پولیس، قدم قدم پر، مگر جرائم کی رفتار ہر روز بڑھ رہی ہے۔ یہ نئے آلات اور راحت و آرام کے نئے نئے طریقے جب غور کریں تو یہی خالق خدا کے لئے وبال جان بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کفر کی سزا تو آخرت میں سب ہی کفار کے لئے دائمی جہنم ہے۔ مگر اس اندھی ناشکری کی سزا کچھ دنیا میں بھگتنی پڑتی ہے۔ کہ جس کی دی ہوئی نعمتوں میں تصرفات کر کے آسمان پر چڑھنے کے حوصلے پیدا ہوئے، اسی کا انکار ہے۔

در میان خانہ گم کردیم صاحب خانہ را

لَوْ أَرَادَ اللَّهُ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا - یہ ان لوگوں پر رد ہے جو فرشتوں کو اللہ کی اولاد کہتے تھے ان کے اس خیال یاطل اور محال کو بطور فرض محال کے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے معاذ اللہ کوئی اولاد ہوتی تو وہ بغیر اس کے ارادہ اور مشیت کے ہونا محال ہے کہ زیر دست اولاد اس پر مسلط نہیں ہو سکتی پھر اگر بالفرض اس کا ارادہ ہوتا تو اس کی ذات سوا سب اس کی مخلوقات ہی ہیں انہیں میں سے کسی کو اولاد بناتے۔ اور اولاد کا اپنے والد کی ہم جنس ہونا لازم ہے، اور مخلوق خالق کی ہم جنس ہو نہیں سکتی۔ اس لئے مخلوق کو اولاد بنانے کا ارادہ کرنا محال ہو گیا۔

يَكُونُ الدَّلِيلُ عَلَى النَّهْيِ - تکویر کے معنی ایک چیز کو دوسری پر ڈال کر اس کو چھپا دینے کے ہیں۔ قرآن کریم نے دن رات کے انقلاب کو یہاں عام نظروں کے اعتبار سے بلفظ تکویر تعبیر کیا ہے کہ رات آتی ہے تو گویا دن کی روشنی پر ایک پردہ ڈال دیا گیا، اور دن آتا ہے تو رات کی اندھیری پردہ میں چلی جاتی ہے۔

چاند۔ سورج دونوں متحرک ہیں

ہیں۔ فلکیات اور طبقات الارض کی مادی تحقیقات قرآن پاک یا کسی آسمانی کتاب کا موضوع بحث نہیں ہوتا۔ مگر اس معاملہ میں جتنی بات کہیں ضمناً آجاتی ہے اس پر یقین رکھنا فرض ہے۔ فلاسفہ کی قدیم و جدید تحقیقات تو موم کی ناک میں روز بدلتی رہتی ہیں۔ قرآنی حقائق غیر متبدل ہیں۔ آیت مذکورہ نے جتنی بات بتلائی کہ چاند اور سورج دونوں حرکت کر رہے ہیں اس پر یقین رکھنا فرض ہے۔ اب رہا یہ معاملہ کہ ہمارے سامنے آفتاب کا طلوع و غروب زمین کی حرکت سے ہے یا خود ان سیاروں کی حرکت سے، قرآن پاک نہ اس کا اثبات کرتا ہے نہ نفی۔ تجربہ سے جو کچھ معلوم ہوا اس کے ماننے میں حرج نہیں۔

وَأَنْزَلْنَا لَكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً شَدِيدًا فَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْغَمِّ الْمَوْتُ - جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی گویا آسمان سے نازل ہوئے، قرآن کریم نے انسانی لباس کے لئے بھی یہی لفظ استعمال فرمایا ہے۔

وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا - اور بعض معدنی چیزوں مثلاً لوہے کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ وَأَنْزَلْنَا السَّمَاءَ سَائِغًا - ان سب کا حاصل ان چیزوں کا اپنی قدرت سے پیدا کرنا اور انسان کو عطا کرنا ہے۔ (قرطبی)

خَلَقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقِ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثَ - اس میں قدرت خداوندی کے ان رموز و اسرار کی کچھ نشاندہی کی گئی ہے جو انسان کی تخلیق میں کل فرما ہیں۔ اول تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو یہ بھی تھا کہ بچہ کو شکم میں بیک وقت مکمل پیدا کر دیتے۔ مگر بہ اتفاقاً حکمت و مصلحت ایسا نہیں بلکہ خَلَقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقِ تدریج اختیار کی کہ عورت جس کے پیٹ میں عالم اصغر بن رہا ہے وہ آہستہ آہستہ اس کا بوجھ

برداشت کرنے کی عادی ہوتی چلی جائے۔ دوسرے اس بے نظیر حسین ترین مخلوق کو جس میں سینکڑوں نازک مشینیں اور بال کی برابر رگیں خون اور روح پہنچانے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ یہ عام صنعت کاروں کی طرح کسی کھلی جگہ روشنیوں کی مدد سے نہیں بلکہ تین اندھروں میں ایسی جگہ پیدا کی گئی ہے جہاں کسی کی نظر تو کیا فکر کی بھی رسائی نہیں۔ فَبَارِكِ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔

إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ

اگر تم منکر ہو گے تو اللہ برواہ نہیں رکھتا تمہاری اور پسند نہیں کرتا اپنے بندوں کا منکر ہونا

وَإِنْ تَشْكُرُوا وَآيْرُضَهُ لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ

اور اگر اس کا حق مانو گے تو اس کو تمہارے لئے پسند کریگا اور نہ اٹھائے گا کوئی اٹھائے والا بوجھ دوسرے کا

ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ إِنَّهُ

پھر اپنے رب کی طرف تم کو پھر جانا ہے تو وہ بتلائے گا تم کو جو تم کرتے تھے مقرر

عَلَيْهِمْ يَذَاتِ الصُّدُورِ ۝ وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا

اس کو خبر ہے دلوں کی بات کی اور جب آئے انسان کو سختی پکارے

رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا آخُوهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسَىٰ مَا كَانَ

اپنے رب کو رجوع ہو کر اس کی طرف پھر جب بخشنے اس کو نعمت اپنی طرف سے بھول جائے اُس کو کہ جس

يَدْعُوْا إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلَّهِ أَنْدَادًا لِّبُضْلٍ عَنْ

کے لئے پکار رہا تھا پہلے سے اور پھر اسے اللہ کی برابر ادروں کو تاکہ بھکائے اسکی

سَبِيلِهِ ۚ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ

راہ سے تو کہہ بڑے لے ساتھ اپنے کفر کے تھوڑے دنوں تو ہے دوزخ والوں

النَّارِ ۝ أَمَنْ هُوَ قَانِتٌ أَنْ آءِ اللَّيْلِ سَاجِدًا أَوْ قَائِمًا

میں بھلا ایک جو بندگی میں لگا ہوا ہے رات کی گھڑیوں میں سجدے کرتا ہوا اور کھڑا ہوا

يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةً مِّنْ رَبِّهِ ۚ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي

خطرہ رکھتا ہے آخرت کا اور امید رکھتا ہے اپنے رب کی مہربانی کی تو کہہ کوئی برابر ہوتے ہیں

الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ

سمجھ والے اور بے سمجھ سمجھتے وہی ہیں

أُولَٰئِكَ الْأَكْبَابُ ۚ ۝ قُلْ يُعْبَادُ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ

جن کو عقل ہے تو کہہ اے بندو میرے جو یقین لائے ہو درد اپنے رب سے

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۖ وَأَرْضُ اللَّهِ

جنہوں نے نیکی کی اس دُنیا میں اُن کے لئے ہے بھلائی اور زمین اللہ کی

وَإِسْعَىٰ ط ۖ إِنَّمَا يُؤْنِي الصَّبِرُونَ ۖ أَجْرُهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۚ

کسادہ ہے صبر کرنے والوں ہی کو ملتا ہے ان کا ثواب بے شمار

خلاصہ تفسیر

اے لوگو تم نے کفر و شرک کا بطلان سُن لیا، اس کے بعد اگر تم کفر کر دو گے (جس میں شرک بھی داخل ہے) تو خدا تعالیٰ (کو کوئی ضرر نہیں کیونکہ وہ تمہارا اور تمہاری عبادت کا) حاجتمند نہیں (کہ تمہارے عبادت و توحید اختیار نہ کرنے سے کچھ اُس کو ضرر پہنچے) اور (یہ بات ضرور ہے کہ) وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا (کیونکہ کفر سے بندوں کو ضرر پہنچتا ہے) اور اگر تم شرک کر دو گے (جس کی فردا عظم ایمان ہے) تو اُس کو کوئی نفع نہیں مگر چونکہ تمہارا نفع ہے اس لئے وہ، اس کو تمہارے لئے پسند کرتا ہے اور (چونکہ ہمارے یہاں قاعدہ مقرر ہے کہ) کوئی کسی کا بوجھ (گناہ کا) نہیں اٹھاتا (اس لئے کفر کر کے یوں بھی نہ سمجھنا کہ ہمارا کفر دوسرے کے نامہ اعمال میں کسی وجہ سے درج ہو جاوے گا اور ہم بری ہو جاویں گے خواہ اس وجہ سے کہ ہم دوسروں کے متبع ہیں معاصرین کے یا آبا و اجدادین کے خواہ اس وجہ سے کہ دوسرے وعدہ اس بوجھ کے اٹھالیتے کا کرتے ہیں جیسا بعض کفار کہہ کرتے تھے۔ وَكُنْ حَمِلٌ مُّخْطَلِیْكُمْ۔ غرض یہ نہ ہوگا بلکہ تمہارا کفر تمہارے جرائم میں لکھا جاوے گا) پھر اپنے پروردگار کے پاس تم کو لوٹ کر جانا ہوگا۔ سو وہ تمہارے سب اعمال تم کو جلا دے گا (اور سزا دے گا پس یہ گمان بھی غلط ہے کہ ان کے اعمال کی پیشی کا وقت نہ آوے گا۔ اور) وہ دلوں تک کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ پس یہ گمان بھی مت کرنا کہ ہمارے کفر کی شاید اس کو اطلاع نہ ہو جیسا کہ حدیثوں میں ہے کہ بعض لوگوں میں گفتگو ہوتی کہ معلوم اللہ تعالیٰ ہماری باتیں سنتا ہے یا نہیں کسی نے کچھ جواب دیا کسی نے کچھ جواب دیا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَعْتِرُونَ اَنْ يَّشْهَدَ الْخَلْقُ اور (مشرک) آدمی (کی حالت یہ ہے کہ اُس) کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب (حقیقی) کو اسی کی طرف رجوع ہو کر پکارنے لگتا ہے۔ (اور سب معبودوں کو بھول جاتا ہے) پھر جب اللہ تعالیٰ اس کو اپنے پاس سے نعمت (امن و آسائش کی) عطا فرمادیتا ہے تو جس (تکلیف کے دفع کرنے) کے لئے پہلے سے (خدا کو) پکار رہا تھا اُس کو بھول جاتا ہے (اور غافل ہو جاتا ہے) اور خدا کے شریک بنانے لگتا ہے جس کا اثر (علاوہ گمراہ ہونے کے) یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ سے دوسروں کو (بھی) گمراہ کرتا ہے (اور اگر اس مصیبت کو پیش نظر رکھیں تو توحید میں اخلاص کو قائم رکھنا یہ مشرک کی مذمت ہو گئی، آگے عذاب سے ڈرنا ہے کہ) آپ (ایسے

شخص سے) کہہ دیجئے کہ اپنے کفر کی بہار تھوڑے دنوں اور لوٹ لے (پھر آخر کار) تو دو زخموں میں سے ہو نوالا ہے (آگے اہل توحید کی مدح و بشارت ہے یعنی) بھلا جو شخص (برعکس حال مشرک مذکور کے) اوقات شب میں (جو عموماً غفلت کا وقت ہوتا ہے) سجدہ و قیام (یعنی نماز) کی حالت میں عبادت کر رہا ہو (یہ تو اس کا ظاہر ہے اور باطن یہ ہو کہ) آخرت سے ڈر رہا ہو اور اپنے پروردگار کی رحمت کی امید (بھی) کر رہا ہو۔ (کیا ایسا شخص اور مشرک مذکور برابر ہو سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں بلکہ یہ قانت جو عبادت پر مداومت کرنے والا اور اللہ سے ڈرنے والا بھی ہے اور اس سے امید و غور و کرم رکھنے والا بھی یہ محمود ہے اور مشرک جو مطلب نکال لینے کے بعد اخلاص کو چھوڑ دیتا ہے مذموم ہے اور چونکہ ان عبادات کے ترک کو کفار مذموم نہ سمجھتے تھے اس لئے اس تفاوت کی بنا پر محدودیت و مذمومیت کے حکم میں ان کو مشبہ ہو سکتا تھا، اس لئے آگے اس سے زیادہ واضح اور مسلم عنواؤں سے اس حکم کا اثبات فرماتے ہیں یعنی اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے بائیں عنوان) کہیے کہ علم والے اور جہل والے کہیں برابر ہوتے ہیں (چونکہ جہل کہہ شخص برا سمجھتا ہے اس کے جواب میں ان کی طرف سے بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ اہل جہل مذموم ہیں آگے یہ ثابت کرنا رہ جاوے گا، کہ صاحب عمل صاحب علم ہے اور عمل سے اعراض کرنے والا صاحب جہل ہے سو یہ امر ذرا تامل سے ثابت ہے اور ہر چند کہ اس بیان سے کفر و اہل کفر کا مذموم اور ایمان و اہل ایمان کا محمود ہونا ثابت ہو گیا لیکن پھر بھی وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل (سلیم) ہیں اور (جب اہل اطاعت کا خداوند محمود ہونا معلوم ہو گیا تو اطاعت کی ترغیب دینے کے لئے) آپ (مؤمنین کو میری طرف سے) کہہ دیجئے کہ اے میرے ایمان والے بند و تم اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو (یعنی مداوم علی الطاعات و محت زعن المعاصی رہو کہ یہ سب فرع ہیں تقویٰ کے آگے اس کا ثمرہ ہے کہ) جو لوگ اس دنیا میں نیکی کرتے ہیں ان کے لئے نیک جملہ ہے (آخرت میں تو ضرور اور دنیا میں بھی باطنی راحت تو ضرور اور کبھی ظاہر بھی) اور (اگر وطن میں کوئی نیکی کرنے سے مانع ہو تو ہجرت کر کے دوسری جگہ چلے جاؤ کیونکہ اللہ کی زمین فراخ ہے) اور اگر ترک وطن میں کچھ تکلیف پہنچے تو استقلال رکھو کیونکہ دین میں مستقل رہنے والوں کو ان کا جملہ بے شمار ہی ملے گا (پس اس سے ترغیب اطاعت کی ہو گئی)۔

معارف و مسائل

اِنَّ تَكْفُرًا وَاَفَاكًا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَنْكُمْ۔ یعنی نہ تمہارے ایمان سے اللہ تعالیٰ کا اپنا کوئی نائدہ نہ تمہارے کفر سے کوئی نقصان۔ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اے میرے بند

اگر تمہارے اولین اور آخرین اور تمہارے انسان اور جن سب کے سب انتہائی فسق و فجور میں مبتلا ہو جائیں تو میرے ملک و سلطنت میں ذرا بھی کمی نہیں آتی۔ (ابن کثیر)

وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ - یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے کفر سے راضی نہیں۔ رضا سے مراد محبت ہے یا کسی کام کا ارادہ کرنا بغیر اعتراض کے۔ اس کا مقابل لفظ سخط آتا ہے جس کے معنی کسی چیز کو مبغوض رکھنا یا کسی چیز کو قابل اعتراض قرار دینا اگرچہ اس کے ساتھ ارادہ بھی متعلق ہو۔

مسئلہ: - اہلسنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اچھا یا بُرا کام ایمان یا کفر اللہ تعالیٰ کی مشیت یا ارادہ کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ اس لئے ہر چیز کے وجود میں آنے کے لئے اللہ تعالیٰ شائد کا ارادہ شرط ہے۔ البتہ رضا اور پسندیدگی حق تعالیٰ کی صفت ایمان اور اچھے کاموں سے متعلق ہوتی ہے، کفر و شرک اور معاصی اس کو پسند نہیں۔ شیخ الاسلام نوویؒ نے اپنی کتاب الاصول والاصواب میں لکھا ہے:-

مذہب اہل الحق الايمان بالقدر
واشباته وان جميع الكائنات خيراها
وشراها بقضاء الله وقد سواه وهو مويد
لها كلها ويكسره المعاصي مع انه تعالى
مويد لها لحكمته يعلمها جل وعلا
(روح المعاني)

مذہب اہل حق کا تقدیر پر ایمان لانا ہے اور یہ کہ تمام کائنات اچھی ہوں یا بُری سب اللہ تعالیٰ کے حکم و تقدیر سے وجود میں آتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی تخلیق کا ارادہ بھی کرتا ہے مگر وہ معاصی کو مکروہ و ناپسند سمجھتا ہے۔ اگرچہ ان کی تخلیق کا ارادہ کسی حکمت و مصلحت سے ہوتا ہے جس کو وہ خود ہی جانتا ہے۔

آمَنَ هُوَ قَانِتٌ اَنَاءَ الْخَلِّ - لفظ آمَنَ دو لفظوں سے مرکب ہے۔ آم حرف استفہام اور مَنَ اسم موصول اس جملے سے پہلے کفار کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں اپنے کفر اور فسق و فجور کے مزے اڑالو، آخر کار تم جہنم کے امیندھن ہو گے۔ اس کے بعد اس جملے میں مؤمن مطیع کا بیان ہے جس کو آمَنَ کے لفظ سوال سے شروع کیا گیا ہے۔ علماء تفسیر نے فرمایا کہ اس سے پہلے ایک جملہ محذوف ہے کہ کافر سے کہا جائے گا کہ تو اچھا ہے یا وہ مؤمن مطیع جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ لفظ قانت کے کسی ترجمے کے لئے نہیں۔ سب کو جامع قول حضرت ابن مسعودؓ کا ہے۔ اس کے معنی میں اطاعت گزار اور یہ لفظ جب خاص نماز کے لئے بولا جائے۔ جیسے قَوْمُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ۔ تو وہاں مرد وہ شخص ہو تا ہے جو نماز میں اپنی نگاہ کو پست رکھے، ادھر ادھر نہ دیکھے، نہ اپنے بدن یا کپڑوں سے کھیل کرے، نہ دنیا کی کسی چیز کو اپنے اختیار سے نماز میں یاد کرے۔ بھول اور غیر اختیار سے سو رہے اس کے منافی نہیں۔ (قرطبی)

اَنَاءَ الْيَلِ کے معنی ساعات اللیل کے ہیں۔ جس سے مراد رات کا شروع حصہ اور درمیان اور آخر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ محشر کے موقف حساب میں اللہ تعالیٰ اس پر آسانی فرمادیں، اس کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کو رات کی اندھیری میں سجدہ اور قیام کی حالت میں پائے۔ اس طرح کہ اس کو آخرت کی فکر بھی ہو اور رحمت کی امید بھی۔ بعض حضرات نے مغرب عشر کے درمیان کے وقت کو بھی انار اللیل کہا ہے (قرطبی)۔

وَاَمَّا حُزْنُ اللَّهِ وَاسْعَادُهُ۔ اس سے پہلے جملے میں اعمال صالحہ کا حکم ہے۔ اس میں کوئی یہ غور کر سکتا تھا کہ میں جس شہر یا ملک میں رہتا ہوں یا جس ماحول میں پھنسا ہوا ہوں، اس کا ماحول مجھے اعمال صالحہ سے روکتا ہے۔ اس کا جواب اس جملے میں دیدیا گیا کہ اگر کسی خاص ملک و شہر یا خاص ماحول میں رہتے ہوئے احکام شرعیہ کی پابندی مشکل نظر آئے تو اس کو چھوڑ دو اللہ کی زمین بہت وسیع ہے کسی ایسی جگہ اور ایسے ماحول میں جا کر رہو جو اطاعت احکام الہیہ کے لئے سازگار ہو۔ اس میں ترغیب ہے ایسی جگہ سے ہجرت کی جس میں رہتے ہوئے انسان احکام دین کی پابندی نہ کر سکے۔ ہجرت کے مفصل احکام سورہ نسا میں آچکے ہیں۔

لَا تَمْلِكُوْا فِی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ بغیر حساب سے مراد یہ ہے کہ صبر کرنے والوں کا ثواب کسی مقرر انداز سے اور پیمانے سے نہیں، بلکہ بے اندازہ و بے حساب دیا جائے گا۔ جیسا کہ روایت حدیث میں آگے آتا ہے اور بعض حضرات نے بغیر حساب کے معنی درخواست و مطالبہ کے لئے ہیں یعنی جیسے دنیا میں کسی کا کوئی حق کسی کے ذمہ ہو تو اسے اپنے حق کا خود مطالبہ کرنا پڑتا ہے لیکن اللہ کے یہاں صابروں کو درخواست اور مطالبہ کے بغیر ہی ان کا ثواب عطا کیا جائے گا۔

حضرت قتادہ ؓ نے فرمایا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز میزانِ عدل قائم کی جائیگی۔ اہل صدقہ آئیں گے تو ان کے صدقات کو تول کر اس کے حساب سے پورا پورا اجر دیدیا جائے گا۔ اسی طرح نماز اور حج وغیرہ عبادات والوں کی عبادات کو تول کر حساب سے ان کا اجر پورا دیدیا جائے گا۔ پھر جب بلا اور مصیبت میں صبر کرنے والے آئیں گے تو ان کے لئے کوئی گنجل اور وزن نہیں ہوگا۔ بلکہ بغیر حساب و اندازہ کے ان کی طرف اجر و ثواب بہا دیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لَا تَمْلِكُوْا فِی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جن کی دنیاوی زندگی عاقبت میں گزری تمنا کرنے لگیں گے کہ کاش دنیا میں ان کے بدن قینچیوں کے ذریعہ کاٹے گئے ہوتے تو ہمیں بھی صبر کا ایسا ہی صلہ ملتا۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے اس آیت میں صابرین سے مراد وہ لوگ لئے ہیں جو دنیا کی مصائب اور رنج و غم پر صبر کرنے والے ہیں اور بعض حضرات نے فرمایا کہ صابرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو معاصی سے

اپنے نفس کو روکیں۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ لفظ صابر جب بغیر کسی دوسرے لفظ کے بولا جاتا ہے اس سے مراد یہی ہوتا ہے جو اپنے نفس کو گناہوں سے باز رکھنے کی مشقت پر صبر کرے اور مصیبت پر صبر کرنے والے کے لئے لفظ صابر بولا جاتا ہے تو صابر علی کذا کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ یعنی فلاں مصیبت پر صبر کرنے والا۔ واللہ اعلم

قُلْ إِنِّي أُهْرِتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۖ ۱۱

تو کہہ مجھ کو حکم ہے کہ بندگی کروں اللہ کی خالص کر کے اس کے لئے بندگی اور

أُهْرِتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ ۖ ۱۲ قُلْ إِنِّي أَخَافُ

حکم ہے کہ میں مجھوں سب سے پہلے حکم بردار تو کہہ میں ڈرتا ہوں

إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابٌ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۖ ۱۳ قُلِ اللَّهُ أَعْبُدْ

اگر حکم نہ مانوں اپنے رب کا ایک بڑے دن کے عذاب سے تو کہہ میں تو اللہ کو پوجتا

مُخْلِصًا لَهُ دِينِي ۖ ۱۴ فَأَعْبُدْ وَامَّا شِئْتُمْ مِّنْ دُونِهِ ط قُلْ

ہوں خالص کر کے اپنی بندگی اس کے واسطے اب تم پوجو جس کو چاہو اس کے سوائے تو کہہ

إِنَّ الْخُسْرَاءَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ

بڑے ہارنے والے وہ جو ہار بیٹھے اپنی جان کو اور اپنے گھروالوں کو

يَوْمَ الْقِيَامَةِ ط إِلَّا ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ۖ ۱۵ لَهُمْ

قیامت کے دن سنا ہے یہی ہے صریح ٹوٹا ان کے

مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلٌ ط ذَٰلِكَ

واسطے اوپر سے بادل ہیں آگ کے اور ان کے نیچے سے بادل اس چیز

يُخَوِّفُ اللَّهُ بِهِ عِبَادَ ط يَعْبَادُ فَاتَّقُوا ۖ ۱۶ وَالَّذِينَ

سے ڈراتا ہے اللہ اپنے بندوں کو لے بندو میرے تو مجھ سے ڈرو اور جو لوگ بچے

اجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ أَنْ يَّعْبُدُوا ذَٰلِكُمْ وَأَنَّا بُرَّاءُ إِلَى اللَّهِ لَهُمْ

شیطانوں سے کہ ان کو پوجیں اور جو عہد ہوئے اللہ کی طرف ان کے لئے

الْبُشْرَىٰ فَبَشِّرْ عِبَادَ ۖ ۱۷ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ

ہے خوشخبری سو تو خوشی سنادے میرے بندوں کو جو سنتے ہیں بات پھر چلتے ہیں

أَحْسَنَهُ ط أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَأُولَٰئِكَ هُمُ

اس پر جو اس میں نیک ہے وہی ہیں جن کو راستہ دیا اللہ نے اور وہی ہیں

أُولَٰئِكَ لَبِٰبٌ ۝۱۸ أَفَسَنْ حَقِّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۖ أَفَأَنْتَ

عقل والے بھلا جس پر ٹھیک ہو چکا عذاب کا حکم بھلا تو

تَنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۝۱۹ لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ

خلاص کر سکے گا اس کو جو آگ میں پڑ چکا لیکن جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے ان کے واسطے ہیں جھروکے

مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ

ان کے اوپر اور جھروکے بنے ہوئے ان کے نیچے بہتی ہیں نہریاں

وَعَدَ اللَّهُ ۖ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ الْوَعْدَ ۝۲۰

وعدہ ہو چکا اللہ کا اللہ نہیں خلاف کرتا اپنا وعدہ -

خلاصہ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو (منجانب اللہ) حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ عبادت کو اُسی کے لئے خالص رکھوں (یعنی اس میں شائبہ شرک کا نہ ہو) اور مجھ کو (یہ بھی) حکم ہوا ہے کہ (اس امت کے لوگوں میں) سب مسلمانوں میں اول (اسلام کو حق ماننے والا) میں ہوں (اور ظاہر ہے کہ قبول احکام میں نبی کا اول ہونا ضروری ہے اور) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ اگر (بفرض محال) میں اپنے رب کا کہنا نہ مانوں تو میں ایک بڑے دن (یعنی قیامت) کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں اور آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ مجھے جس بات کا حکم ہوا ہے میں تو اسی پر کاربند ہوں چنانچہ میں تو اللہ ہی کی عبادت اس طرح کرتا ہوں کہ عبادت کو اُسی کے لئے خالص رکھتا ہوں (جس میں شرک کا ذرا سا شائبہ نہیں) تو (اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم بھی ایسی ہی خالص عبادت کرو لیکن اگر تم نہیں مانتے تو تم جانو اور) خدا کو چھوڑ کر تمہارا اول جس چیز کی عبادت (کو چاہے اس کی عبادت کرو) (قیامت کے روز اس کا مزہ چکھو گے اور) آپ اُن سے (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ پورے زیاں کار وہی لوگ ہیں جو اپنی جانوں سے اور اپنے متعلقین سے قیامت کے روز خسارے میں پڑے (یعنی نہ اپنی جان سے اس کو کوئی فائدہ پہنچا اور نہ اپنے متعلقین سے کیونکہ وہ متعلقین بھی اگر انھیں کسی طرح گمراہ تھے تو وہ بھی گرفتار عذاب ہوں گے دوسروں کی فائدہ پہنچائیں گے اور اگر وہ مومن مخلص ہو کر جنت میں ہوں گے تو بھی وہ کافروں کی کوئی سفارش کر کے نفع نہیں پہنچا سکتے) یاد رکھو کہ کھلا ہوا خسارہ یہ ہے کہ اُن کے لئے اُن کے اوپر سے بھی آگ کے شعلے ہوں گے اور اُن کے نیچے سے بھی آگ کے محیط شعلے ہوں گے یہ وہی (عذاب) ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے (اور اس سے بچنے کی تدبیریں بتلاتا ہے جو دین حق پر عمل کرنا ہے سو) اے میرے بند و مجھ سے (یعنی میرے عذاب سے) ڈرو (یہ حال تو کفار مشرکین کا ہوا) اور

جو لوگ شیطان کی عبادت سے بچتے ہیں (شیطان کی عبادت سے مراد اسکی اطاعت ہے) اور (ہمہ تن) اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، وہ مستحق خوشخبری گنہگار کے ہیں سو آپ میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو (اس صفت کے ساتھ بھی موصوف ہیں کہ) اس کلام (الہی) کو کان لگا کر سنتے ہیں۔ پھر اس کی اچھی باتوں پر (اور اللہ کے احکام سب اچھے ہیں۔ جیسا کہ آگے آیت احسن الخیرات میں آتا ہے) چلتے ہیں یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی ہے اور یہی ہیں جو اہل عقل ہیں (سو ان لوگوں کو بشارت دیدیجئے۔ جس چیز کی بشارت دینا ہے اس کا بیان تو آگے آئے گا) آیت لکن الذین اتقوا میں درمیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کافروں کا سو من بنادینا آپ کے اختیار سے خارج ہے اس لئے اس پر کوئی غم نہ کریں کہ (بھلا جس شخص پر عذاب کی (ازلی تفتیر) بات محقق ہو چکی تو کیا آپ ایسے شخص کو جو کہ (علم الہی میں) دوزخ میں ہے (موجبات جہنم سے) پھڑا سکتے ہیں (یعنی جو دوزخ میں جانے والے ہیں وہ کوشش سے بھی گمراہی سے باز نہیں آویں گے، اس لئے ان پر افسوس اور غم بے کار ہے) لیکن جو لوگ (ایسے ہیں کہ ان کے حق میں کلمۃ العذاب محقق نہیں ہوا، اور اس وجہ سے وہ آپ سے احکام من کر) اپنے رب سے دُرتے رہے۔ ان کے لئے (جنت کے) بالا خانے ہیں جن کے اوپر اور بالا خانے ہیں جو بنے بنائے تیار ہیں (اور) ان کے نیچے نہریں چل رہی ہیں۔ یہ اللہ نے وعدہ کیا ہے (اور) اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ (یہ مضمون اس بشارت کا ہے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے فَبَشِّرْ عِبَادَ۔)

معارف و مسائل

فَبَشِّرْ عِبَادَ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْوَالِدُونَ الْبَارُونَ۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرات مفسرین کے اقوال متعدد ہیں۔ ایک قول وہ ہے جس کو ابن کثیر نے لیا اور خلاصہ تفسیر مذکور میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قول سے مراد اللہ کا کلام قرآن یا قرآن مع تعلیمات رسول ہے اور وہ سب احسن ہی احسن ہے۔ اس لئے مقتضی مقام کا بظاہر یہ تھا کہ لَبِثَ تَمَعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ کہاجاتا مگر اس کی جگہ لفظ احسن کا اضافہ کر کے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ان لوگوں نے قرآن و تعلیمات رسول کا اتباع بے ابھیرنی کے ساتھ نہیں کیا جیسا بے وقوف لوگوں کا طریقہ ہے کہ جس کی بات سنی بغیر کسی تحقیق و بصیرت کے اس کا اتباع کرنے لگے بلکہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کے کلام کو حق اور

احسن دیکھنے کے بعد اس کا اتباع کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں آخر آیت میں ان کو اُولَ الْاَلْبَاب یعنی عقل والے ہونے کا خطاب دیا گیا ہے۔ اس کی نظیر قرآن ہی میں وہ ارشاد ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کے متعلق ہوا ہے۔ فَخَذُّهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا۔ یہاں بھی احسن سے مراد پوری تورات اور اس کے احکام ہیں۔ اسی طرح مذکورہ آیات میں استماع قول سے مراد استماع قرآن اور اتباع احسن سے مراد اتباع پورے قرآن کا ہے جس کو اگلی آیت میں احسن الحدیث فرمایا گیا ہے۔ اسی تفسیر میں کہ قول سے مراد خاص قرآن لیا جائے بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں بھی بہت احکام ہیں احسن اور احسن کے درجات رکھے ہیں۔ مثلاً انتقام اور عفو دونوں جائز ہیں۔ مگر عفو احسن الفضل ہے، وَأَنَّ تَصْدِيرَ الْخَيْرِ لَكُمْ۔ بہت سی چیزیں جس میں قرآن نے انسان کو اختیار دیا ہے کہ دونوں میں جس کو چاہے اختیار کرے کوئی گناہ نہیں۔ مگر ان میں سے کسی ایک کو احسن و افضل بھی فرمادیا، جیسے وَأَنَّ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ میں ہے۔ بہت سی چیزوں میں رخصت دی گئی ہے مگر عزیمت پر عمل کو احسن و افضل فرمایا ہے تو مراد آیت کی یہ ہو گئی کہ یہ لوگ احکام قرآن رخصت کے بھی سنتے ہیں۔ عزیمت کے بھی مگر اتباع بجا رکھتے کے عزیمت کا کرتے ہیں۔ اور جن دو چیزوں میں ایک احسن ہو دوسری احسن، یہ ان میں سے احسن ہی کو عمل کے لئے اختیار کرتے ہیں۔

اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس جگہ قول سے مراد عام لوگوں کے اقوال ہیں جن میں توحید و شرک، کفر و اسلام، حق و باطل پھر حق میں حسن اور احسن اور رائج و مزجوج سب اخل ہیں۔ مطلب آیت کا اس تفسیر یہ ہے کہ یہ لوگ باتیں تو سب کی سنتے ہیں۔ کفار کی بھی مومنین کی بھی۔ حق بھی باطل بھی، اچھی بھی اور بُری بھی لیکن اتباع صرف اسی بات کا کرتے ہیں جو احسن ہے۔ توحید و شرک میں سے توحید کا حق و باطل میں سے حق کا اور حق کے مختلف درجات ہوں تو ان میں جو احسن اور رائج ہو اس کا اتباع کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کو دو صفتوں کے ساتھ موصوف کیا گیا۔ پہلی هٰذَا هُمْ اللَّهُ یعنی یہ لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں۔ اس لئے مختلف قسم کی باتیں سن کر ٹھکتے نہیں۔ دوسرے اُولَ الْاَلْبَاب یعنی یہ لوگ عقل والے ہیں، عقل کا کام ہی یہ ہے کہ اچھے بُرے اور حق و باطل میں تمیز کرے۔ اور احسن و احسن کو پہچان کر احسن کو اختیار کرے۔

اسی لئے کہا گیا ہے کہ یہ آیت زید بن عمرو بن نفیل ابوذر غفاری اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی زید بن عمرو بن نفیل تمام جاہلیت میں بھی شرک و بت پرستی سے نفرت کرتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ اور سلمان فارسیؓ مختلف اہل مذاہب مشرکین پھر یہود و نصاریٰ کی باتیں سننے اور ان کے طور و طریق دیکھنے کے بعد ایمان لائے اور قرآنی تعلیمات کو سب سے احسن پا کر ان کو ترجیح دی۔

(قرطبی)

الْمَزْرَأَاتِ أَلَّا اللَّهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی پھر چلایا وہ پانی چشموں میں

فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ

زمین کے پھر نکالتا ہے اُس سے کھیتی کئی کئی رنگ بدلتے اُس پر پھر آئے

مُصْفًى ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا

تیار ہی ہو تو تو دیکھے اس کا رنگ زرد پھر کر ڈالتا ہے اس کو چورا چورا بے شک اس میں نصیحت ہے

لِلأُولَى الْأَلْيَابِ ۝۲۱۱ أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ

عقل مندوں کے واسطے بھلا جس کا سینہ کھول دیا اللہ نے دین اسلام کے واسطے

فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِّن رَّبِّهِ ۖ فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن

سودہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے سو خرابی ہے ان کو جن کے دل سخت ہیں اللہ کی

ذِكْرِ اللَّهِ ۖ أُولَٰئِكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ۝۲۱۲ اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ

یاد سے وہ بڑے پھرتے ہیں بھٹکتے صریح اللہ نے اتاری بہت بات

الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ

کتاب آپس میں ملتی دوہرائی ہوئی (بال کھڑے ہوتے ہیں اُس سے کھال پر

يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ

ان لوگوں کے جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے پھر نرم ہوتی ہیں اُن کی کھالیں اور اُن کے دل اللہ کی

ذِكْرِ اللَّهِ ۖ ذٰلِكَ هُدًى لِّلَّذِينَ يَشَاءُونَ

یاد پر یہ ہے راہ دینا اللہ کا اس طرح راہ دیتا ہے جس کو چاہے

وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝۲۱۳

اور جس کو راہ بھلائے اللہ اس کو کوئی نہیں سمجھائے والا -

خلاصہ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تو نے اس (بات) پر نظر نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو زمین کے سوتلوں میں (یعنی ان قطعات میں جہاں سے پانی اُبل کر کنوؤں اور چشموں کے ذریعہ نکلتا ہے) داخل کر دیتا ہے پھر جب وہ اُبلتا ہے تو اُس کے ذریعہ سے کھیتیاں پیدا کرتا ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں، پھر وہ کھیتی بالکل خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو زرد دیکھتا ہے پھر (اللہ تعالیٰ) اس کو چورا چورا کر دیتا

ہے اس (منونہ) میں اہل عقل کے لئے بڑی عبرت ہے (کہ یہی حالت بعینہ انسان کی دنیوی حیات کی ہے) آخر فنا آخر فنا تو اس میں منہک ہو کر ابدی راحت سے محروم رہنا اور ابدی مصیبت کو سر پر لے لینا نہایت حماقت ہے، گو ہمارا بیان نہایت بلیغ ہے مگر پھر بھی سب سننے والے باہم متفاوت ہیں، سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام (کے قبول کرنے) کے لئے کھول دیا (یعنی اسلام کی حقیقت کا اُس کو یقین آ گیا) اور وہ اپنے پروردگار کے (عطا کئے ہوئے) نور (یعنی ہدایت کے مقتنا) پر (چل رہا) ہے (یعنی یقین لاکر) اُس کے موافق عمل کرنے لگا کیا وہ شخص اور اہل قسارت برابر ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے، سو جن لوگوں کے دل خدا کے ذکر سے (اس میں احکام و مواہید سب آگئے) متاثر نہیں ہوتے (یعنی ایمان نہیں لاتے)، اُن کے لئے (قیامت میں) بڑی خرابی ہے (اور دنیا میں) یہ لوگ کھلی گمراہی میں (گرفتار) ہیں (آگے اس نور اور ذکر کا بیان ہے یعنی) اللہ تعالیٰ نے بڑا عمدہ کلام (یعنی قرآن) نازل فرمایا ہے جو ایسی کتاب ہے کہ (باعتبار اعجاز نظم و صحت معانی کے) باہم ملتی جلتی ہے (اور جس میں سمجھانے کے لئے بعض بعض بہت ضروری بات) بار بار دہرائی گئی (وہ کہ اقولہ تعالیٰ لَقَدْ هَمَمْنَا الْخَمِيسِ میں باوجود فائدہ تاکید و تکرار مدعا کے قلب مخاطب میں ہر جگہ خاص خاص لطافت کا بھی لحاظ ہوتا ہے جس سے غالی ٹکرا رہیں رہتا اور مثالی ہونا یعنی بار بار دہرایا جانا دلیل ہے ہدایت پر مشتمل ہونے کی) جس سے اُن لوگوں کے جو کہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں بدن کانپ اٹھتے ہیں (یہ کنایہ ہے خوف سے گو قلب ہی میں رہے بدن پر اثر نہ آوے اور گو وہ خوف عقلی و ایمانی ہو، طبعی و حالی نہ ہو) پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر (یعنی کتاب اللہ پر عمل کرنے) کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں (یعنی ڈر کر اعمال جوارج و اعمال قلب کو انقیاد اور توجہ سے بجالاتے ہیں اور) یہ (قرآن) اللہ کی ہدایت ہے جسکو وہ چاہتا ہے اُس کے لئے ذریعہ ہدایت کرتا ہے (جیسا خائفین کا حال ابھی سنایا گیا) اور خدا جس کو گمراہ کرتا ہے اس کا کوئی ہادی نہیں (جیسا قاسین یعنی سخت دل کافروں کا حال ابھی سنایا گیا)

معارف و مسائل

فَسَلِّكُمَا يَنَابِيعَ فِي الْاَوْرَاقِ - یَنَابِيعُ غُيُورِ کی جمع ہے جس کے معنی زمین سے پھوٹنے والے چشمے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان سے پانی نازل کر دینا ہی ایک عظیم الشان نعمت ہے مگر اس نعمت کو اگر زمین کے اندر محفوظ کر دینے کا انتظام نہ کیا جاتا تو انسان اُس سے صرف بارش کے وقت یا اس کے متصل چند دن تک فائدہ اٹھا سکتا۔ حالانکہ پانی اس کی زندگی کا مدار اور ایسی ضرورت ہے جس سے وہ ایک دن بھی مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے صرف اس نعمت کے نازل کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا

بلکہ اُس کے محفوظ کرنے کے عجیب عجیب سامان فرمادینے۔ کچھ تو زمین کے گڑھوں، حوضوں اور تالابوں میں محفوظ ہو جاتا ہے اور بہت بڑا ذخیرہ برت بنا کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر لا دیا جاتا ہے۔ جس سے اس کے مٹنے اور خراب ہونے کا امکان نہیں رہتا۔ پھر وہ بہت آہستہ آہستہ پگھل کر پہاڑی رگوں کے ساتھ زمین میں اتر جاتا ہے اور جا بجا اُبلنے والے چشموں کی صورت میں خود بخود ذخیرہ کسی نئی شکل کے پھوٹ نکلتا ہے اور ندیوں کی شکل میں زمین میں بہنے لگتا ہے اور پانی پانی پوری زمین کی گہرائی میں چلتا رہتا ہے جس کو کنواں کھود کر ہر جگہ نکالا جاسکتا ہے۔

قرآن کریم میں اس نظام آبپاشی کی پوری تفصیل سورہ مؤمنون میں آیت نَحْنُ سَکِّتُهُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّا عَلَىٰ ذَهَابٍ بِكُلِّ قَوْمٍ مُّوَدَّنَ کے تحت بیان کیا گیا ہے۔
مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ۔ کھیتی کے اگنے کے وقت اور پکنے کے وقت اُس پر مختلف رنگ آتے جاتے رہتے ہیں اور چونکہ ان رنگوں میں انقلاب اور تبدل ہے۔ اس لئے مُخْتَلِفًا کو ترکیب نحوی میں حال بنا کر منصوب کیا گیا ہے جو تجدید و دلالت کرتا ہے۔

إِنَّا فِي ذَٰلِكَ لَآلِیٰ كُوْنٍ اَوَّلِی الْاَلْبَابِ۔ یعنی پانی اُتارنے اور اس کو محفوظ کر کے انسان کے کام میں لگانے پھر اس سے قسم قسم کی نباتات اور درخت اُگانے اور ان درختوں پر مختلف رنگ آنے کے بعد آخر میں زرد خشک ہو کر غلہ الگ اور بھوسہ الگ ہو جانے میں بڑی نصیحت ہے عقل والوں کے لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان قدرت و حکمت کے دلائل ہیں جن کو دیکھ کر انسان اپنی تخلیق کے معاملہ کی حقیقت بھی پہچان سکتا ہے جو ذریعہ ہو سکتی ہے اپنے خالق و مالک کے پہچاننے کا۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرًا لِّاِسْمٰہِم فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ قَدِیْنٍ تَرٰہِم۔ شرح کے لفظی معنی کھولنے، پھیلانے اور وسیع کرنے کے ہیں۔ شرح صدر کے معنی وسعت قلب کے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قلب میں اسکی استعداد موجود ہو کہ وہ بلوینی آیات الہیہ آسمان و زمین اور خود اپنی پیدائش وغیرہ میں غور کر کے عبرت اور فوائد حاصل کرے اسی طرح جو آیات الہیہ بصورت کتاب و احکام نازل کی جاتی ہیں اُن میں غور کر کے استفادہ کر سکے۔ اس کا بالمقابل دل تنگی اور قسارت قلب ہے۔ قرآن کریم کی ایک آیت مَجْعَلِ صَدْرًا ضِیْقًا حَوْجًا اور اس جگہ اگلی آیت مِیْلًا لِّقَاسِیْہِ فَلَکُوْبُہُمْ اسی شرح صدر کے بالمقابل آیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آیت اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرًا لِّاِسْمٰہِم فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ قَدِیْنٍ تَرٰہِم تلاوت فرمائی تو ہم نے آپ سے شرح صدر کا مطلب پوچھا آپ نے فرمایا کہ حبِ نور ایمان انسان کے قلب میں داخل ہوتا ہے تو اس کا قلب وسیع ہو جاتا ہے (جس سے احکام الہیہ کا سمجھنا اور عمل کرنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے)۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اس (شرح صدر) کی

علامت کیا ہے تو آپ نے فرمایا:-

الانابة الى دار الخلود والتجافي
عن دار الغرور والتأهب للموت قبل
نزوله -

رواہ الحاکم فی المستدرک البیہقی فی شعب الایمان -

(روح المعانی)

ہمیشہ رہنے والے گھر کی طرف راغب اور مائل
ہونا اور دھوکے کے گھر یعنی دنیا (کی لذائذ اور زینت)
سے دور رہنا اور موت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری
کرتا -

آیت مذکورہ کو حرف استفہام آفصح سے شروع کیا گیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ کیا ایسا شخص جس کا
دل اسلام کے لئے کھول دیا گیا ہو اور وہ اپنے رب کی طرف سے آئے ہوئے لُڑ پر ہے یعنی اس کی روشنی میں
سب کام کرتا ہے - اور وہ آدمی جو دل تنگ اور سخت دل ہو کہیں برابر ہو سکتے ہیں - اس کے بالمقابل
سخت دل کا ذکر اگلی آیت میں عذاب و دل کے ساتھ کیا گیا ہے -

قَوْلِيلٍ لِلْقَيْسِيَّةِ قُلُوْبُهُمْ - قاسية قسوت سے مشتق ہے جس کے معنی سخت دل ہونا جس کو کسی
پر رحم نہ آئے اور جو اللہ کے ذکر اور اس کے احکام سے کوئی اثر قبول نہ کرے -

اللّٰهُ نَزَلَ اَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِي - اس سے پہلی آیت میں اللہ کے مقبول بندوں کا یہ
حال ذکر کیا گیا تھا کہ لَيَسْتَتِمُّوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهُ اس آیت میں بتلادیا کہ پورا قرآن ہی
احسن الحديث ہے - حدیث کے لفظی معنی اس کلام یا نصیحت کے ہیں جو بیان کیا جاتا ہے - قرآن کو احسن الحديث
فرمانے کا مائل یہ ہے کہ انسان جو کچھ کہتا بولتا ہے اس میں احسن الکلام قرآن ہے - آگے قرآن کی چند
صفات ذکر فرمائی ہیں - ایک کِتَابًا مُّتَشَابِهًا متشابہ سے مراد اس جگہ متماثل ہے - یعنی مضامین قرآنیہ
ایک دوسرے سے مربوط اور مماثل ہیں کہ ایک آیت کی تشریح و تصدیق دوسری آیت سے ہو جاتی ہے - اس
کلام میں تضاد و تعارض کا نام نہیں ہے - دوسری صفت مشائی ہے جو مشنی کی جمع ہے جس کے معنی مکرر کے
ہیں مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم میں ایک مضمون کو ذہن نشین کرنے کے لئے بار بار دہرایا جاتا ہے تیسری صفت
یہ بیان فرمائی کہ تَفْشِيْعًا مِنْهُ جُلُوْدُ الْكَافِرِيْنَ يَخْشَوْنَ سَاطِعَهُمْ - یعنی اللہ کی عظمت سے متاثر ہو کر
ڈرنے والوں کا قرآن پڑھ کر خشیت و ہدیت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کے بدن پر بال کھڑے ہو جاتے ہیں -
چوتھی صفت یہ ہے کہ تَحْرِيْلِيْنَ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ - یعنی تلامذت قرآن کا اثر کبھی
عذاب کی وعید سن کر یہ ہوتا ہے کہ بدن کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں اور کبھی رحمت و مغفرت کی آیات
سن کر یہ حال ہوتا ہے کہ بدن اور قلب سب اللہ کی یاد میں نرم ہو جاتے ہیں - حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ
فرماتی ہیں کہ صحابہ کرام کا عام حال یہی تھا کہ جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا تو ان کی آنکھوں میں آنسو
آ جاتے اور بدن پر بال کھڑے ہو جاتے - (قرطبی) -

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بندے کے بدن پر اللہ کے خوف سے ہال کھڑے ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اس کے بدن کو آگ پر حرام کر دیتے ہیں (قرطبی)

أَقَمَنْ يَتَّقِي بِوَجْهِهِ سُوءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ

بھلا ایک وہ جو روکتا ہے اپنے منہ پر بُرا عذاب دن قیامت کے

وَقِيلَ لِلظَّالِمِينَ ذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿۲۳﴾ كَذَبَ

اور کہے گا بے انصافوں کو چکھو جو تم کھاتے تھے جھٹلا چکے

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ

ہیں اُن سے اگلے پھر پہنچا ان پر عذاب ایسی جگہ سے کہ اُن کو

لَا يَشْعُرُونَ ﴿۲۴﴾ فَأَذَاقَهُمُ اللَّهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيَاةِ

خیال بھی نہ تھا پھر چکھائی اُن کو اللہ نے رسوائی دُنیا کی

الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۲۵﴾

زندگی میں اور عذاب آخرت کا تو بہت ہی بڑا ہے اگر اُن کو سمجھ نہ ہوتی

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ

اور ہم نے بیان کی لوگوں کے واسطے اس قرآن میں سب چیز کی مثل

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۶﴾ قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي

تاکہ وہ دھیان کریں قرآن ہے عربی زبان کا جس میں

عَوَجٍ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۲۷﴾

کجی نہیں تاکہ وہ بچ کر چلیں

خلاصہ تفسیر

بھلا جو شخص اپنے منہ کو قیامت کے روز سخت عذاب کی سپر بنا دے گا اور ایسے ظالموں کو محکم ہو گا کہ جو کچھ تم کیا کرتے تھے (اب) اس کا مزہ چکھو تو کیا یہ (گرفتار عذاب) اور جو ایسا نہ ہو برابر ہو سکتے ہیں (اور کفار ان عذابوں کو مسن کر انکار نہ کریں کیونکہ) جو لوگ اُن سے پہلے ہو چکے ہیں انہوں نے بھی (حق کو) جھٹلایا تھا سو اُن پر عذاب ایسے طور پر آیا کہ اُن کو خیال بھی نہ تھا سو اللہ تعالیٰ نے

ان کو اسی دنیوی زندگی میں بھی رسوائی کا مزہ چکھایا۔ (کہ زمین میں دھنس جانے اور چہرہ بگڑ جانے اور آسمان سے پتھر برسنے وغیرہ کے عذاب سے دنیا میں بدنام ہوئے) اور آخرت کا عذاب اور بھی بڑا ہے کاش یہ لوگ سمجھ جاتے (اور پر کی ایک آیت اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَكَ میں یہ بیان ہوا تھا کہ قرآن سن کر بعض لوگ متاثر ہوتے ہیں بعض نہیں ہوتے۔ آگے آیت میں یہ بیان ہے کہ بعض لوگوں کا اس سے متاثر نہ ہونا انکی اپنی قابلیت و صلاحیت کی کمی کی وجہ سے ہے، ورنہ قرآن فی نفسہ سب کے لئے اثر برابر رکھتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تفاوت قابلیت کے اعتبار سے ہے۔ فاعل میں کوئی نقص اور کمی نہیں) اور ہم نے لوگوں (کی ہدایت) کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کے (ضروری) عمدہ مضامین بیان کئے ہیں تاکہ یہ لوگ نصیحت پکڑیں جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ عربی قرآن ہے جس میں ذرا بھی کجی نہیں (اور یہ مضامین اس لئے لائے گئے) تاکہ یہ لوگ (ان سچے اور صاف مضامین کو سن کر) ڈریں (معلوم ہوا کہ قرآن پاک کے کتاب الہدایہ ہونے میں جن صفات کی ضرورت تھی وہ سب اس میں جمع ہیں کہ اس کے مضامین بھی سب سچے اور صاف واضح ہیں اور زبان بھی عربی ہے جس کو موجودہ مخاطب بلا واسطہ سمجھ سکتے ہیں، پھر ان کے ذریعہ سے دوسروں کا سمجھ لینا بھی آسان ہو سکتا ہے۔ غرض اس کتاب ہدایت میں تو کوئی کمی نہیں کسی میں قبول کرنے کی استعداد اور صلاحیت ہی نہ ہو تو کیا کیا جائے۔)

معارف و مسائل

اَفَمَنْ يَتَّقِ بِوَجْهِهِ۔ اس میں جہنم کے سخت ہولناک ہونے کا بیان ہے کہ انسان کی عادت دنیا میں یہ ہے کہ کوئی تکلیف کی چیز سامنے آجائے تو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کو چہرہ بچانے کے لئے ڈھال بنا کر دفع کرتا ہے۔ مگر خدا کی پناہ اہل جہنم کو یہ ہاتھ پاؤں سے مدافعت بھی نصیب نہیں ہوگی، ان پر جو عذاب آئے گا وہ براہ راست ان کے چہروں پر پڑے گا۔ وہ مدافعت بھی کرنا چاہے تو چہرہ ہی کو ڈھال بنا سکے گا کیونکہ جہنم میں اس کو ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈالا جائے گا۔ فعوذ باللہ منہ۔

آئمۃ تفسیر میں سے حضرت عطاء ابن زید نے فرمایا کہ جہنمی کو جہنم میں ہاتھ پاؤں باندھ کر گھسیٹ کر ڈالا جائے گا۔ (قرطبی)

صَرَابُ اللّٰهِ مَثَلًا شَرًّا جَلَّالٌ فِيهِ شَرٌّ كَأَنَّ مُتَشَكِّسُونَ

اللہ کے بتلائے ایک مثل ایک مرد ہے کہ اُس میں شریک ہیں کئی ضدی

وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ۖ هَلْ يَسْتَوِينَ مَثَلًا

اندر ایک مرد ہے یہ اور ایک شخص کا کیا برابر ہو سکتی ہیں دونوں مثل

الْحَمْدُ لِلَّهِ ۖ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۹﴾ إِنَّكَ مَيِّتٌ

سب خوبی اللہ کے لئے ہے بہرہ بہت لوگ سمجھ نہیں رکھتے بے شک تو بھی مرتا ہے

وَأَنَّهُمْ مَّيِّتُونَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ

الردہ بھی مرتے ہیں پھر مقرر تم قیامت کے دن اپنے رب کے آگے

تَخْتَصِمُونَ ﴿۳۱﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللَّهِ

جھگڑو گے پھر اس سے زیادہ ظالم کون جس نے جھوٹ بولا اللہ پر

وَكَذَبَ بِالْصِّدْقِ إِذْ جَاءَهُ ۖ أَطَّالَ الْيُسُ فِي جَهَنَّمَ

اور جھٹلایا سچی بات کو جب پہنچی اس کے پاس کیا نہیں دوزخ میں

مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِي جَاءَ بِالْصِّدْقِ وَصَدَّقَ

ٹھکانا شکروں کا اور جو لے کر آیا سچی بات اور سچ مانا

بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ

جس نے اس کو دہی لوگ ہیں ڈروالے ان کے لئے ہے جو وہ چاہیں اپنے

رَبِّهِمْ ۚ ذَٰلِكَ جَزَاُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۳۴﴾ لِيُكَفِّرَ اللَّهُ عَنْهُمْ

رب کے پاس یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا تاکہ اتار دے اللہ ان پر سے

أَسْوَأَ الَّذِي عَمِلُوا وَيَجْزِيَهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۵﴾

برے کام جو انھوں نے کئے تھے اور بدلے میں دے ان کو ثواب بہتر کاموں کا جو وہ کرتے تھے

خُلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے (مومن اور مشرک کے بارے میں) ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص (غلام) جس کی سبھی چیزیں جن میں باہم ضد اضدی (بھی) ہے اور ایک اور شخص ہے کہ پورا ایک ہی شخص کا (غلام) ہے (تو) کیا ان دونوں کی مثالیں (ہو سکتی) ہے (اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں برابر نہیں، پہلا شخص تکلیف میں ہے کہ ہمیشہ متحیر رہتا ہے کہ کس کا کہنا مانوں کس کا نہ مانوں۔ دوسرا آرام میں ہے کہ ایک ہی شخص سے تعلق ہے۔ پس پہلی مثال مشرک کی ہے کہ ہمیشہ ڈنڈا ڈول رہتا ہے۔ کبھی غیر اللہ کی طرف دڑتا ہے، کبھی خدا کی طرف پھر غیر اللہ میں بھی ایک پراطینان نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کی طرف رجوع کرتا ہے کبھی کسی کی طرف۔

اس سوال کا جواب کفار بھی اس کے سوا نہیں دے سکے کہ غلام مشترک بڑی مصیبت میں رہتا ہے اس لئے ان پر حجت تمام ہو گئی۔ اس تمام حجت پر فرمایا الحمد للہ حق ثابت ہو گیا۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ قبول نہیں کرتے۔ بلکہ (قبول تو کیا) ان میں اکثر لوگ سمجھتے بھی نہیں (کیونکہ سمجھنے کا ارادہ ہی نہیں کرتے۔ آگے فیصلہ قیامت کا ذکر ہے جو آخری فیصلہ ہو گا۔ جس سے کوئی بھاگ نہیں سکے گا اور فیصلہ قیامت سے پہلے موت کی خبر دیتے ہیں۔ کیونکہ موت ہی مقدمہ اور طریقہ ہے آخرت تک پہنچنے کا اس لئے فرمایا اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم یہ لوگ اگر دنیا میں کسی عقلی اور نفلی فیصلہ کو نہیں مانتے تو آپ غم نہ کیجئے، کیونکہ دنیا سے آپ کو بھی مر جانا ہے اور ان کو بھی مر جانا ہے، پھر قیامت کے روز تم (دونوں فرق اپنے اپنے) مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کرو گے۔ (اُس وقت عملی فیصلہ ہو جاوے گا جس کے ظہور کا بیان آگے آتا ہے فَمَنْ أَظْلَمُ) سو اس مخالفت اور عدالت میں مقدمات پیش ہونے کے وقت فیصلہ یہ ہو گا کہ باطل پرستوں کو عذاب جہنم ہو گا اور حق پرستوں کو اجر عظیم ملے گا اور ظاہر ہے کہ اس شخص سے زیادہ بے انصاف (اور ناحق پرست) کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے (یعنی خدا تعالیٰ کے متعلق یہ کہے کہ اس کے ساتھ دوسرے بھی شریک ہیں) اور سچی بات کو (یعنی قرآن) کو جبکہ وہ اس کے پاس (رسول کے ذریعہ) پہنچی جھٹلا دے (تو ایسے شخص کا بڑا ظالم ہونا بھی ظاہر ہے اور ظالم کا مستحق ہونا بڑے عذاب کا بھی ظاہر ہے اور بڑا عذاب جہنم کا ہے تو) کیا (قیامت کے دن) جہنم میں ایسے کافروں کا ٹھکانہ نہ ہو گا (یہ فیصلہ تو باطل پرستوں کا ہوا) اور (برخلاف ان کے) جو لوگ سچی بات لے کر خدا کی طرف سے یا رسول کی طرف سے لوگوں کے پاس آئے اور (خود بھی) اس کو سچ جانا (یعنی یہ لوگ صادق بھی ہیں اور مصدق بھی جیسا کہ پہلے لوگ کاذب بھی تھے اور مکذب بھی) تو یہ لوگ پرہیزگار ہیں (ان کا فیصلہ یہ ہو گا کہ) وہ جو کچھ چاہیں گے اُن کے لئے پروردگار کے پاس سب کچھ ہے یہ صلہ ہے نیکو کاروں کا (اور یہ صلہ اُن کے لئے اس واسطے تجویز کیا) تاکہ اللہ تعالیٰ ان سے برے عملوں کو دور کرے اور نیک کاموں کے عوض ان کو اُن کا ثواب دے۔

معارف و مسائل

إِنَّكَ صَدِيقٌ لِّمَنْ يَّؤْتِيكَ الْيَدُ الْيُسْرَىٰ - لفظ صَدِيق بتشدید الیاء اُس کو کہتے ہیں جو زمانہ مستقبل میں مرنے والا ہو اور صَدِيق بتسکون الیاء اُس کو کہتے ہیں جو مر چکا ہو۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپ بھی مرنے والے ہیں اور آپ کے

دشمن اور احباب بھی سب مرنے والے ہیں۔ مقصد اس کے بیان کرنے سے سب کو فکر آخرت کی طرف متوجہ کرنا اور عمل آخرت میں لگنے کی ترغیب دینا ہے اور ضمناً یہ بھی بتلادینا ہے کہ افضل الخلائق اور سید المرسلین ہونے کے باوجود موت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مستثنیٰ نہیں۔ تاکہ آپ کی وفات کے بعد لوگوں میں اس پر اختلاف پیدا نہ ہو۔ (از قرطبی)

ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ - حضرت محشر کی عدالت میں مظلوم کا حق ظالم سے وصول کرنے کی صورت

ابن عباس رضی فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ انکم میں مومن و کافر اور مسلمان ظالم و مظلوم سب داخل ہیں یہ سب اپنے اپنے مقدمات اپنے رب کی عدالت میں پیش کریں گے اور اللہ تعالیٰ ظالم سے مظلوم کا حق دلوائیں گے وہ کافر ہو یا مومن۔ اور صورت اس ادائیگی حقوق کی وہ ہوگی جو صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی کی روایت سے آئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کسی کا حق ہے اس کو چاہیے کہ دنیا ہی میں اس کو ادا یا معاف کر کے حلال ہو جائے۔ کیونکہ آخرت میں درہم و دینار تو ہوں گے نہیں۔ اگر ظالم کے پاس کچھ اعمال صالحہ ہیں تو بقدر ظلم یہ اعمال اس سے لیکر مظلوم کو دیدیئے جائیں گے۔ اور اگر اس کے پاس حسنات نہیں ہیں تو مظلوم کی سیئات اور گناہوں کو اس سے لیکر ظالم پر ڈال دیا جائے گا۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے ایک روز صحابہ کرام سے سوال کیا کہ آپ جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم تو مفلس اس کو سمجھتے ہیں جس کے پاس نہ کوئی نقد رقم ہو نہ ضروریات کا سامان۔ آپ نے فرمایا کہ اصلی اور حقیقی مفلس میری امت میں وہ شخص ہے جو قیامت میں بہت سے نیک اعمال، نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ لیکر آئے گا مگر اس کا حال یہ ہوگا کہ اس نے دنیا میں کسی کو گالی دی، کسی پر تہمت باندھی، کسی کا مال ناجائز طور پر کھا گیا کسی کو قتل کر دیا کسی کو مار پیٹ سے متنا یا تو یہ سب مظلوم اللہ کے سامنے اپنے مظالم کا مطالبہ کریں گے اور اس کی حسنات ان میں تقسیم کر دی جائیں گی پھر جب یہ حسنات ختم ہو جائیں گی اور مظلوموں کے حقوق ابھی باقی ہوں گے تو مظلوموں کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے۔ اور اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (تو یہ شخص سب کچھ سامان ہونے کے باوجود قیامت میں مفلس رہ گیا، یہی اصلی مفلس ہے)

اور طبرانی نے ایک معتبر سند کے ساتھ حضرت ابو ایوب انصاری رضی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو مقدمہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوگا وہ مرد اور اس کی بیوی کا ہوگا اور بخدا کہ وہاں زبان نہیں بولے گی۔ بلکہ عورت کے ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ اپنے شوہر پر کیا کیا عیب لگایا کرتی تھی اور اسی طرح مرد کے ہاتھ پاؤں اس پر گواہی دیں گے کہ وہ کس طرح اپنی بیوی کو تکلیف دینا پہنچاتا تھا۔ اس کے بعد ہر آدمی کے سامنے اس کے نوکر چاکر لائے

جائیں گے ان کی شکایات کا فیصلہ کیا جائے گا۔ پھر عوام بازار کے لوگ جن سے اس کے معاملات رہے تھے وہ پیش ہوں گے اگر اس نے ان میں سے کسی پر ظلم کیا ہے تو اس کا حق دلوا یا جائے گا۔

سارے اعمال مظالم اور حقوق کے بدلے میں دیدیئے جاویں گے مگر ایمان نہیں دیا جائے گا۔

تفسیر منطہری میں مذکورہ سب روایات حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مظلوموں کے حقوق میں ظالم کے اعمال دیدیئے کا جو ذکر آیا ہے، اس سے مراد ایمان کے

دوسرے اعمال ہیں، کیونکہ جتنے مظالم ہیں وہ سب عملی گناہ ہیں، کفر نہیں ہیں اور عملی گناہوں کی سزا محدود ہوگی بخلاف ایمان کے کہ وہ ایک غیر محدود عمل ہے۔ اس کی جزا بھی غیر محدود یعنی ہمیشہ جنت میں رہنا ہے اگرچہ وہ گناہوں کی سزا بھگتے اور کچھ عرصہ جہنم میں رہنے کے بعد اس کا حاصل یہ ہے کہ جب ظالم کے اعمال صالحہ علاوہ ایمان کے سب مظلوموں کو دے کر ختم ہو جائیں گے۔ صرف ایمان رہ جائے گا تو ایمان اس سے سلب نہیں کیا جائے گا بلکہ مظلوموں کے گناہ اس پر ڈال کر حقوق کی ادائیگی کی جائے گی جس کے نتیجے میں یہ گناہوں کا عذاب بھگتنے کے بعد پھر بالآخر جنت میں داخل ہوگا اور پھر یہ حال اس کا دائمی ہوگا۔ صاحب تفسیر منطہری نے فرمایا کہ امام بیہقی نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔

كَذَّبَ بِالْقِدْثِ اَوْ اَلَّذِي جَاءَ بِالْقِدْثِ مِیْنِ صِدْقٍ سَے مراد وہ تعلیمات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔ خواہ قرآن ہو یا قرآن کے علاوہ دوسری تعلیمات احادیث اور صدقہ میں سب مؤمنین داخل ہیں جو اس کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدًا وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِنْ دُونِهِ

کیا اللہ بس نہیں اپنے بندہ کو اور تجھ کو ڈراتے ہیں ان سے جو اس کے سوا ہیں

وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۖ وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ

اور جس کو راہ بھلائے اللہ تو کوئی نہیں اس کو راہ دینے والا اور جس کو راہ گمھائے اللہ

فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ ۖ أَلَيْسَ اللَّهُ بِعَزِيزٍ ذِي انْتِقَامٍ

تو کوئی نہیں اس کو بھلائے والا کیا نہیں ہے اللہ زبردست بدلہ لینے والا

وَلَكِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ

اور جو تو ان سے پوچھے کس نے بنائے آسمان اور زمین تو کہیں

اللَّهُ ۖ قُلْ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ

اللہ نے تو کہہ بھلا دیکھو تو جن کو پوجتے ہو اللہ کے سوا کون

أَرَادَنِي اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّيْكَ أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ

چاہے اللہ مجھ پر کچھ تکلیف تو وہ ایسے ہیں کہ کہوں دیں تکلیف اس کی ڈالی ہوئی یا وہ چاہے مجھ پر

هَلْ هُنَّ مُّسْكِتٌ رَّحْمَتِهِ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ عَلَيْهِ

مہربانی تو وہ ایسے ہیں کہ روک دیں اس کی مہربانی کو تو کہہ مجھ کو بس ہے اللہ اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں

يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿٣٨﴾ قُلْ يَقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ

بھروسہ رکھنے والے تو کہہ اے قوم کام کئے جاؤ اپنی جگہ پر

إِنِّي عَامِلٌ ۚ فَمَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ

میں بھی کام کرتا ہوں اب آگے جان لو گے کس پر آتی ہے آفت کہ اس کو

يُخْرِئُهُ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٤٠﴾ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ

رُسوا کرے اور اُترتا ہے اس پر عذاب سدا رہنے والا ہم نے اتاری ہے

عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ

مجھ پر کتاب لوگوں کے واسطے سچے دین کے ساتھ پھر جو کوئی راہ پر آیا سوا اپنے بھلے کو اور جو

ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ﴿٤١﴾

کوئی بہکا سو یہی بات ہے کہ بہکا اپنے بڑے کو اور تو ان کا ذمہ دار نہیں -

خلاصہ تفسیر

کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندہ (خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت) کے لئے کافی نہیں (یعنی وہ تو سب ہی کی حفاظت کے لئے کافی ہے تو اپنے محبوب خاص بندے کے لئے کیوں کافی نہ ہوگا) اور یہ لوگ (ایسے احمق ہیں کہ حفاظت خداوندی سے تجاہل کر کے) آپ کو ان (جھوٹے معبودوں) سے ڈرتے ہیں جو خدا کے سوا (تجوذ کر رکھے) ہیں (حالانکہ وہ خود بے جان عاجز ہیں اور قادر بھی ہوتے تو خدا کی حفاظت کے مقابلہ میں عاجز ہی ہوتے) اور (اصل بات یہ ہے کہ) جس کو خدا گمراہ کرے اس کا کوئی ہدایت کرنے والا نہیں اور جس کو وہ ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں (اگے خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ذکر کر کے انکی حماقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ) کیا خدا تعالیٰ (ان کے نزدیک) زبردست (اور) انتقام لینے (پر قدرت رکھنے) والا نہیں ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت ناصریت بھی کامل اور بندہ کی صلاحیت منصوریت بھی کامل اور جھوٹے معبودوں کا قدرت و نصرت سے عاجز ہونا بھی ظاہر پھر آپ کو ان باتوں سے ڈرنا حماقت نہیں تو کیا ہے) اور (عجیب بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی

قدرت کاملہ اور نصرت کے مقدمات کو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں چنانچہ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہی کہیں گے کہ اللہ نے (اس لئے) آپ (ان سے) کہتے کہ بھلا (جب تم اللہ کو تخلیق میں منفرد مانتے ہو تو) یہ بتلاؤ کہ خدا کے سوا جن معبودوں کو پوجتے ہو، اگر اللہ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہے، کیا یہ معبود اس کی دی ہوئی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں یا اللہ مجھ پر اپنی عنایت کرنا چاہے تو کیا یہ معبود اس کی عنایت کو روک سکتے ہیں (آگے ارشاد ہے کہ جب اس تقریر سے اللہ تعالیٰ کا کمال قدرت ثابت ہو جاوے تو) آپ کہہ دیجئے کہ (اس سے ثابت ہو گیا کہ) میرے لئے خدا کافی ہے توکل کرنے والے اسی پر توکل کرتے ہیں (اسی لئے میں بھی اسی پر توکل اور بھروسہ رکھتا ہوں اور تمھارے خلاف عناد کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ اور چونکہ یہ لوگ ان سب باتوں کو سن کر بھی اپنے خیال باطل پر جمے ہوئے تھے اسلئے آپ کو آخری جواب کی تعلیم ہے کہ) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ (اگر اس پر بھی تم نہیں مانتے تو تم جانو) تم اپنی حالت پر عمل کئے جاؤ میں بھی (اپنے طرز پر) عمل کر رہا ہوں (یعنی جب تم اپنے طریقہ یاطل کو نہیں چھوڑتے تو میں طریقہ حق کو کیسے چھوڑوں) سو اب جلد ہی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر (دنیا میں) ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا، اور (مرنے کے بعد) اس پر دائمی عذاب نازل ہوگا (چنانچہ دنیا میں غزوہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ سے ان کو سزا ملی اس کے بعد آخرت کا دائمی عذاب ہے۔ یہاں تک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کے خون سے تسلی دی گئی۔ آگے آپ کو جو کفار اور عام خلق خدا کے ساتھ شفقت کی بنا پر ان کے کفر و انکار سے غم ہوتا تھا اس پر تسلی دی گئی کہ) ہم نے یہ کتاب آپ پر لوگوں کے (نفع کے) لئے اتاری۔ جو حق کو لئے ہوئے ہے سو (آپ کا کام اس کا پہنچانا ہے پھر) جو شخص راہ راست پر آئے گا تو اپنے نفع کے واسطے اور جو شخص بے راہ رہے گا تو اس کا بے راہ ہونا اسی پر پڑے گا، اور آپ ان پر مستط (اس طرح) نہیں کئے گئے (کہ ان کی بے راہی کی آپ سے باز پرس ہو تو آپ ان کی گمراہی سے کیوں مغموم ہوتے ہیں)۔

معارف و مسائل

الَّذِينَ اللَّهُ يَكُفِّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ يُكَفِّرُونَ - اس آیت کا شان نزول ایک واقعہ ہے کہ کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس سے ڈرایا تھا کہ اگر آپ نے ہمارے بتوں کی بے ادبی کی تو ان بتوں کا اثر بہت سخت ہے اس سے آپ بچ نہ سکیں گے۔ ان کے جواب میں کہا گیا کہ کیا اللہ اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں؟ اس لئے بعض مفسرین نے یہاں بندے سے مخصوص بندہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لیا ہے۔ خلاصہ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ اور دوسرے مفسرین نے بندہ سے مراد عام لی ہے اور

آیت کی دوسری قرأت جو عبادۃ الہی ہے وہ اس کی مؤید ہے۔ اور مضمون بہر حال عام ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر بندے کے لئے کافی ہے۔

عبرت و نصیحت **وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِنْ دُونِهِ**۔ یعنی کفار آپ کو ڈراتے ہیں اپنے جھوٹے معبودوں کے غضب سے۔ اس آیت کو پڑھنے والے عموماً یہ خیال کر کے گذر جاتے ہیں کہ یہ ایک خاص واقعہ کا ذکر ہے، جس کا تعلق کفار کی دھمکیوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے ہے، اس طرف دھیان نہیں دیتے کہ اس میں ہمارے لئے کیا ہدایت ہے۔ حالانکہ بات بالکل کھلی ہوئی ہے کہ جو شخص بھی کسی مسلمان کو اس لئے ڈرائے کہ تم نے فلاں حرام کام یا گناہ نہ کیا تو تمہارے حکام اور افسروں کے محتاج سمجھے جاتے ہو تم سے خفا ہو جائیں گے اور تکلیف پہنچائیں گے۔ یہ بھی اسی میں داخل ہے اگرچہ ڈرانے والا مسلمان ہی ہو اور جس سے ڈرایا جائے وہ بھی مسلمان ہی ہو۔ اور یہ ایسا عام ابتلا ہے کہ دنیا کی اکثر ملازمتوں میں لوگوں کو پیش آتا ہے کہ احکام الہیہ کی خلاف ورزی پر آمادہ ہو جائیں یا پھر اپنے افسروں کے عتاب و عقاب کے مورد بنیں۔ اس آیت نے ان سب کو یہ ہدایت دی کہ کیا اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کے لئے کافی نہیں، تم نے خالص اللہ کے لئے گناہوں کے ارتکاب سے بچنے کا عزم کر لیا اور احکام خداوندی کے خلاف کسی حاکم و افسر کی پروا نہ کی تو خدا تعالیٰ کی امداد تمہارے ساتھ ہوگی۔ زائد سے زائد یہ ملازمت چھوڑ بھی جائے گی تو اللہ تعالیٰ تمہارے رزق کا دوسرا انتظام کر دیں گے۔ اور مومن کا کام تو یہ ہے کہ ایسی ملازمت کو چھوڑنے کی خود ہی کوشش کرتا رہے کہ کوئی دوسری مناسب جگہ مل جائے تو اس کو فوراً چھوڑ دے۔

اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي

اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو ان کے مرنے کا اور جو نہیں مریں ان کو کھینچ لیتا ہے

مَنَازِلَ هَاجَ فِيمُسِيكِ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ

ان کی میند میں پھر رکھ چھوڑتا ہے جن پر مرنا ٹھہرا دیا ہے اور بھیج دیتا ہے

الْآخِرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ

اُوروں کو ایک دیر مقرر تک اس بات میں پختہ ہیں ان لوگوں کو

يَتَفَكَّرُونَ ۝۴۲ **أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ط ۚ قُلْ**

جو دھیان کریں کیا انہوں نے پکڑے ہیں اللہ کے سوائے کوئی سفارش والے تو کہہ

أَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ۝۴۳ **قُلْ لِلَّهِ**

اگرچہ ان کو اختیار نہ ہو کسی چیز کا اور نہ سمجھ تو کہہ اللہ کے

الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ثُمَّ

اختیار میں ہے ساری سفارش اسی کا راجح ہے آسمان اور زمین میں پھر

إِلَيْهِ تَرْجِعُونَ ﴿۳۹﴾ وَإِذَا ذَكَرَ اللَّهُ وَحْدًا شَهِدَتْ قُلُوبُ

اس کی طرف پھیرے جاؤ گے اور جب نام لیجے مخلص اللہ کا رک جاتے ہیں دل

الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذَكَرَ الَّذِينَ مِنْ

ان کے جو یقین نہیں رکھتے کچھ کھڑا اور جب نام لیجے اس کے سوا

دُونِهِ إِذَا هُمْ كَيْتَبُنَّشْرُونَ ﴿۴۰﴾

اوروں کا تبدلہ لگیں خوشیاں کرنے

خلاصہ تفسیر

اللہ ہی قبض (یعنی معطل) کرتا ہے اُن جانوں کو (جن کا وقت موت آگیا ہے) ان کی موت کے وقت (مکمل طور پر کہ زندگی بالکل ختم ہو جائے) اور اُن جانوں کو بھی جن کو موت نہیں آئی اُن کے سولے کے وقت یہ تعطل بالکلیہ نہیں ہوتا ایک حیثیت حیات کی باقی رہ جاتی ہے مگر ادراک نہیں ہوتا اور موت کی صورت میں نہ ادراک رہتا ہے نہ حیات) پھر (اس معطل کرنے کے بعد) اُن جانوں کو تو (بدن کی طرف عود کرنے سے) روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم فرما چکا ہے اور باقی جانوں کو (جو نیند کی وجہ سے معطل ہو گئی تھیں اور ابھی ان کی موت کا وقت نہیں آیا) ایک ميعاد معین (یعنی مدت) تک کے لئے آزاد کر دیتا ہے (کہ پھر واپس جا کر بدن میں بدستور سابق تصرفات کر لیں) اس (مجموعہ تصرفات الہیہ) میں اُن لوگوں کے لئے جو سوچنے کے عادی ہیں (خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور بلا شرکت غیرے تمام عالم کے انتظامات کھنے پر) دلائل ہیں (جن سے اللہ کی توحید پر استدلال کرتے ہیں) ہاں کیا (توحید کے دلائل واضح قائم ہوتے ہوئے) ان لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو (معبود) قرار دے رکھا ہے جو (ان کی) سفارش کریں گے (جیسا کہ مشرکین اپنے بتوں کے متعلق کہا کرتے تھے هُوَ كَا۟فٍ شَفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ) آپ کہہ دیجئے کہ اگرچہ یہ (تمہارے گھڑے ہوئے شفعاۃ) کچھ بھی قدرت نہ رکھتے ہوں اور کچھ بھی علم نہ رکھتے ہوں (کیا پھر بھی تم یہی سمجھتے چلے جاؤ گے کہ یہ تمہاری سفارش کریں گے۔ کیا اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ شفاعت کے لئے علم اور اس کے مناسب قدرت و ضروری ہے جو ان میں مفقود ہے۔ یہاں بعض مشرک یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ پتھر کے تراشے ہوئے بت ہمارا مقصود نہیں بلکہ یہ مجسمے اور شکلیں فرشتوں کی یا جنات کی ہیں وہ تو ذی روح بھی ہیں قدرت اور علم بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کے جواب کی یہ تعلیم دی گئی کہ) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ سفارش تو

تو متر خدا ہی کے اختیار میں ہے (بدون اس کی اجازت کے کسی فرشتے یا بشر کی مجال نہیں کہ کسی کفر یا شر کر سکے اور اللہ تعالیٰ کی اجازت شفاعت کے لئے در شرطیں ہیں ایک شفاعت کرنے والے کا عند اللہ مقبول ہونا، دوسرے جس کی شفاعت کی جائے اس کا قابل مغفرت ہونا۔ اب سمجھ لو کہ مشرکین نے بتوں کو جنکی شکلیں سمجھ کر اختیار کیا ہے اگر وہ جنات و شیاطین ہیں تو دونوں شرطیں مفقود ہیں، نہ شفاعت کرنے والے مقبول عند اللہ ہیں نہ یہ مشرک قابل مغفرت ہیں اور اگر ان شکلوں کو ملائکہ یا انبیاء کی شکلیں قرار دے رکھا ہے تو شفاعت کرنے والوں کے مقبول ہونے کی شرط تو موجود ہوئی، مگر دوسری شرط مفقود ہے کہ ان مشرکین میں صلاحیت مغفرت کی نہیں ہے۔ آگے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ تمام آسمان و زمین کی سلطنت اسی کی ہے۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔ (اسی لئے سب کو چھوڑ کر اسی سے ڈرو اسی کی عبادت کرو) اور (توحید کے دلائل و ائمہ قائم ہونے کے باوجود کفار و مشرکین کا حال یہ ہے کہ) جب فقط اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے (کہ وہ بلا شرکت غیرے تمام عالم کے سیاہ سفید کا مالک مختار و مقرر ہے) تو ان لوگوں کے دل منقبض ہوتے ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر آتا ہے (خواہ صرف انھیں کا ذکر ہو یا اللہ کے ذکر کے ساتھ ان کا بھی ذکر ہو) تو اسی وقت وہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔

معارف و مسائل

اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي جَنَّةٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ - تَوَفَّى کے لفظی معنی لے لینے اور قبض کر لینے کے ہیں۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ جانداروں کی ارواح ہر حال ہر وقت اللہ تعالیٰ کے زیر تصرف ہیں، وہ جب چاہے ان کو قبض کر سکتا ہے اور واپس لے سکتا ہے اور اس تصرف خداوندی کا ایک مظاہرہ تو ہر جاندار روزانہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے کہ نیند کے وقت اس کی روح ایک حیثیت سے قبض ہو جاتی ہے، پھر بیداری کے بعد واپس مل جاتی ہے اور آخر کار ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ بالکل قبض ہو جائے گی پھر واپس نہ ملے گی۔

تفسیر منظری میں ہے کہ قبض روح کے معنی اس کا تعلق بدن انسانی سے قطع کر دینے کے ہیں، کبھی یہ ظاہر و باطن بالکل منقطع کر دیا جاتا ہے۔ اسی کا نام موت ہے اور کبھی صرف ظاہر منقطع کیا جاتا ہے باطن باقی رہتا ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ صرف حس اور حرکت ارادیہ جو ظاہری علامت زندگی ہے وہ منقطع کر دی

جاتی ہے اور باطناً تعلق روح کا جسم کے ساتھ باقی رہتا ہے جس سے وہ سانس لیتا ہے اور زندہ رہتا ہے اور صورت اس کی یہ ہوتی ہے کہ روح انسانی کو عالم مثال کے مطالعہ کی طرف متوجہ کر کے اس عالم سے غافل اور معطل کر دیا جاتا ہے تاکہ انسان مکمل آرام پاسکے۔ اور کبھی یہ باطنی تعلق بھی منقطع کر دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے جسم کی حیات بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

آیت مذکور میں لفظ تَوْتٰی بمعنی قبض بطور عموم مجاز کے دونوں معنی پر حاوی ہے۔ موت اور نیند دونوں میں قبض روح کا یہ فرق جو ادب پر بیان کیا گیا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ سونے کے وقت انسان کی روح اس کے بدن سے نکل جاتی ہے مگر ایک شعاع روح کی بدن میں رہتی ہے جس سے وہ زندہ رہتا ہے اور اسی رابطہ شعاعی سے وہ خواب دیکھتا ہے۔ پھر یہ خواب اگر روح کے عالم مثال کی طرف متوجہ رہنے کی حالت میں دیکھا گیا تو وہ سچا خواب ہوتا ہے اور اگر اس طرف سے بدن کی طرف واپسی کی حالت میں دیکھا تو اس میں شیطانی تصرفات ہو جاتے ہیں وہ رؤیاء صادقہ نہیں رہتا۔ اور فرمایا کہ نیند کی حالت میں جو روح انسانی اس کے بدن سے نکلتی ہے تو بیداری کے وقت آنکھ جھپکنے سے بھی کم مقدار وقت میں بدن میں واپس آ جاتی ہے۔

قُلِ اللَّهُمَّ قَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَلِمَ الْغَيْبِ وَ

تو کہہ اے اللہ پیدا کرنے والے آسمانوں کے اور زمین کے جاننے والے چھپے اور

الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

کھلے کے تو ہی فیصلہ کرے اپنے بندوں میں جس چیز میں وہ جھگڑ رہے تھے

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَمِثْلَهُ

اور اگر گنہگاروں کے پاس ہو جتنا کچھ کہ زمین میں ہے سارا اور اتنا ہی اور

مَعَهُ لَا فَنَدَ وَاِیَّاهُ مِنْ سُوْءِ الْعَذَابِ اَبْ یُّوْمَ الْقِيٰمَةِ ط

اس کے ساتھ تو سب دے ڈالیں اپنے چھڑولنے میں بڑی طرح کے عذاب سے دن قیامت کے

وَبَدَّلَ اَلْهُمُّ مِنَ اللّٰهِ مَا لَمْ یَكُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۰﴾ وَبَدَّلَ اَلْهُمُّ

اور نظر لائے ان کو اللہ کی طرف سے جو خیال بھی نہ رکھتے تھے اور نظر آئیں انکو

سَیِّئَاتٍ مَا كَسَبُوْا وَاَحَاقَ بِهُمْ مَّا كَانُوْا یَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۴۱﴾

بڑے کام اپنے جو کھاتے تھے اور اٹھ پڑے ان پر وہ چیز جس پر ٹھٹھا کرتے تھے۔

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِّنَّا لَا

سوجب آگئی ہے آدمی کو کچھ تکلیف ہم کو پکارنے لگتا ہے پھر جب ہم بخشیں اس کو اپنی طرف سے کوئی

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيْتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَكِنَّا أَكْثَرُ هُمْ

نہت کہتا ہے یہ تو مجھ کو ملی کہ پہلے سے معلوم تھی کوئی نہیں۔ جانچ ہے پر وہ بہت سے لوگ

لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۹﴾ قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَا أَغْنَىٰ

نہیں سمجھتے کہہ چکے ہیں یہ بات اُن سے اگلے پھر کچھ کام نہ آیا

عَنهُمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۴۰﴾ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتٌ مَّا كَسَبُوا

اُن کو جو کما لے تھے پھر پڑ گئیں ان پر برائیاں جو کما فی حق

وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ هَؤُلَاءِ سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتٌ مَّا

اور جو گنہگار ہیں اُن میں سے ان پر بھی اب پڑتی ہیں برائیاں جو

كَسَبُوا ۖ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۴۱﴾ أَوَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ

کما فی ہیں اور وہ نہیں تو فکالے والے اور کیا نہیں جان چکے کہ اللہ

يُسِّطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَايَةً

پھیلاتا ہے روزی جس کے واسطے چاہے اور ماپ کر دیتا ہے البتہ اس میں پتہ ہیں اُن

لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۴۲﴾

لوگوں کے واسطے جو مانتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

آپ (ان کی شدتِ غنا سے محزون نہ ہو جائے اور اللہ سے دعا میں یہ کہئے کہ اے اللہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے باطن اور ظاہر کے جاننے والے آپ ہی (قیامت کے روز) اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں فیصلہ فرمادیں گے جن میں باہم وہ اختلاف کرتے تھے۔ (یعنی آپ ان معاندین کی فکر میں نہ پڑیں، بلکہ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کیجئے وہ خود عملی فیصلہ کر دیں گے) اور (اس فیصلہ کے وقت یہ حالت ہوگی کہ) اگر ظلم (یعنی شرک و کفر) کرنے والوں کے پاس دنیا بھر کی تمام چیزیں ہوں اور ان چیزوں کے ساتھ اتنی چیزیں اور بھی ہوں تو وہ لوگ قیامت کے دن سخت عذاب سے چھوٹ جانے کے لئے (بے تامل) ان کو دینے لگیں (گو مقبول نہ ہو کہما فی المائدۃ مَا تَقْبَلُ مِنْهُمْ) اور خدا کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آوے گا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا (کیونکہ اول تو آخرت کے منکر

تھے پھر اس میں بھی اس کے مدعی تھے کہ وہاں بھی ان کو عزت و دولت ملے گی) اور (اس وقت) ان کو تمام اپنے برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے اور جس (عذاب) کے ساتھ وہ استہزاء کیا کرتے تھے وہ ان کو آگہرے گا دیوں تو مشرک غیر اللہ کے ذکر سے مسرور اور صرف اللہ کے ذکر سے نفور رہتا ہے) پھر جس وقت (اس مشرک) آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو (جن کے ذکر سے مسرور ہوا کرتا تھا ان سب کو چھوڑ کر صرف ہم کو بھارتا ہے) جس سے پہلے نفور تھا) پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا فرمادیتے ہیں تو (اس توحید پر جس کا حق ہونا خود اس کے اقرار سے ثابت ہو چکا تھا قائم نہیں رہتا چنانچہ اس نعمت کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کرتا بلکہ یوں) کہتا ہے کہ یہ تو مجھ کو (میری) تدبیر سے ملی ہے (اور چونکہ نسبت حق تعالیٰ کی طرف نہیں کرتا بلکہ اپنی تدبیر کا نتیجہ سمجھتا ہے اسلئے تدبیر پر قائم نہیں ہوتا بلکہ اپنے قییم طریقہ شرک کی طرف عود کر کے غیر اللہ کی عبادت میں لگا جاتا ہے۔ آگے حق تعالیٰ اس کے قول **لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا** کو رد فرماتے ہیں کہ نعمت اسکی تدبیر کا نتیجہ نہیں ہے) بلکہ وہ (نعمت خدا کی دسی ہوئی اور اسکی طرف سے انسان کی) ایک آزمائش ہے (کہ دیکھیں اس کے ملنے پر ہم کو بھول جاتا ہے اور کفر کرتا ہے یا یاد رکھتا ہے اور شکر کرتا ہے اور اسی آزمائش کے لئے بعض نعمتوں میں اسباب و کسب کا واسطہ بھی رکھ دیا ہے۔ اس سے اور زیادہ آزمائش ہو گئی کہ دیکھیں اس ظاہری سبب پر نظر کرتا ہے یا علت حقیقیہ پر) لیکن اکثر لوگ (اس بات کو) سمجھتے نہیں (اس لئے اس کو اپنی تدبیر کا نتیجہ بتلاتے ہیں اور مبتلائے شرک رہتے ہیں آگے تفریع ہے کہ) یہ بات (بعض) ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (جیسے تارون نے کہا تھا **إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي** یا جو لوگ منکر صانع کے ہو گزرے ہیں جیسے نمرود و فرعون۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی کسی نعمت کی نسبت خدا کی طرف نہ کرتے تھے بلکہ غیر مکتسب اور غیر اختیاری میں بخت و اتفاق کی طرف اور مکتسب و اختیاری میں ہنر اور تدبیر کی طرف نسبت کرتے تھے) سو ان کی کارروائی ان کے کچھ کام نہ آئی (اور مانع عن العذاب ہوئی) پھر (مانع نہ ہو سکنے کے بعد واقع للعذاب بھی نہ ہوئی بلکہ) ان کی تمام بد اعمالیاں ان پر آپڑیں (اور سزا یاب ہوئے) اور (زمانہ محال کے لوگ یہ خیال نہ کریں کہ جو کچھ ہونا تھا انکوں کے ساتھ ہو چکا بلکہ) ان میں بھی جو ظالم ہیں ان پر بھی ان کی بد اعمالیاں ابھی پڑنے والی ہیں اور یہ (خدا تعالیٰ کو) ہرا نہیں سکتے (چنانچہ بدر میں خوب سزا ہوئی) آگے اس کی دلیل بیان فرمائی کہ بعضے احمق جو نعمت و رزق کو اپنی تدبیر کی طرف منسوب کرتے ہیں تو کیا ان لوگوں کو (احوال میں غور کرنے سے) یہ معلوم نہیں ہو کہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور وہی (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگی بھی کر دیتا ہے (اس بسط و قسٹ میں) (غور کرنے سے) ایمان والوں کے واسطے (کہ اہل فہم ہوتے ہیں اس بات پر) نشانیاں (یعنی دلائل قائم) ہیں (کہ باسط و قابض وہی ہے تدبیر و تدبیر اس میں علت حقیقیہ نہیں۔ پس ان دلائل کو جو شخص سمجھ لے گا وہ اپنی تدبیر کی طرف نسبت نہ کرے گا، بلکہ خدا کے منعم ہونے سے ذہول نہ کرے گا جو سبب ہو گیا تھا ابتلا بالشرک کا بلکہ وہ موحد رہے گا اور مصیبت

وراحت میں اس کا حال و حال متناقض و متعارض نہ ہوگا۔

معارف و مسائل

قُلِ اللَّهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنِّیْٓ اَسْأَلُكَ - صحیح مسلم میں حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز (یعنی تہجد) کو کس چیز سے شروع فرماتے تھے تو انھوں نے فرمایا کہ آپ جب تہجد کی نماز کو اٹھتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے:-

اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرِیْلَ وَمِیْکَائِیْلَ وَاسْرَافِیْلَ، فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَلِیْمَ الْغُیْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِیْہَا کَاَنُوْا فِیْہِ یَخْتَلِعُوْنَ، اِهْدِنِیْ لِمَا خَلِیْتَ فِیْہِ مِنْ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّکَ کَعْدِیْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰی حِصْرٍ طِیِّبٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے قرآن کریم کی ایک ایسی آیت معلوم ہے کہ اسکو قبولیت دعا پڑھ کر آدمی جو دعا کرتا ہے قبول ہوتی ہے۔ پھر یہی آیت بتلائی:-

اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنِّیْٓ اَسْأَلُكَ۔ (قرطبی)

وَقَدْ اَلْهَمَّ مِنَ اللّٰهِ مَا لَمْ یَكُوْنُوْا یَحْتَیِبُوْنَ - حضرت صفیان ثوری رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو پڑھ کر فرمایا کہ ہلاکت باریکاروں کے لئے، ہلاکت ہے ریاکاروں کے لئے۔ یہ آیت انھیں سے متعلق ہے جو دنیا میں نیک کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتے تھے۔ اور لوگ بھی ان کو نیک سمجھتے تھے وہ خود بھی اس دھوکہ میں تھے کہ یہ اعمال ان کے لئے نجاتِ آخرت کا ذریعہ بنیں گے۔ مگر چونکہ ان میں اخلاص نہیں تھا اسلئے اللہ کے نزدیک ایسے نیک اعمال کا کوئی اجر و ثواب نہیں، اس لئے وہاں اچانک اُن کے گمان کے خلاف عذاب و عتاب ہونے لگے گا۔ (قرطبی)

حضرت ربیع ابن خلیثم سے کسی نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے ایک آہ بھری اور اس آیت کی تلاوت فرمائی:-

قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَلِیْمَ الْغُیْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ

مشاجرات صحابہ کے متعلق
ایک اہم ہدایت

بَيْنَ عِبَادِكَ الْاٰیۃ۔ اور فرمایا کہ صحابہ کرام کے باہمی اختلافات کے متعلق جب تمھارے دل میں کوئی شک پیدا ہو تو یہ آیت پڑھ لیا کرو۔ روح المعانی میں اس کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ عظیم الشان تعلیم ادب پر عبور ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔

قُلْ يٰٓعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا

کہوئے اے بندو میرے جنہوں نے خود زیادتی کی ہے اپنی حیاں پر اس رست توڑو

مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ط

اللہ کی مہربانی سے بے شک اللہ بخشتا ہے سب گناہ

اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۳﴾ وَاَنْیَبُوْا اِلٰی رَبِّكُمْ وَاَسْلَمُوْا

وہ جو ہے وہی ہے گناہ معاف کرنے والا مہربان اور رجوع ہو جاؤ اپنے رب کی طرف اور اس کی

لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاتِیَکُمُ الْعَذَابُ اَبْ ثُمَّ لَا تَنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾

حکم برداری کرو پہلے اس سے کہ آئے تم پر عذاب پھر کوئی تمہاری مدد کو نہ آئے گا

وَاتَّبِعُوْا اَحْسَنَ مَا اَنْزَلَ اِلَیْکُمْ مِنْ رَبِّکُمْ مِنْ قَبْلِ

اور چلو بہتر بات پر جو اتاری تمہاری طرف تمہارے رب سے پہلے اس سے کہ

اَنْ یَّاتِیَکُمُ الْعَذَابُ اَبْ غَنَّةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

پہنچے تم پر عذاب ایمانک اور تم کو خبر نہ ہو

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسُ یٰحَسْرَتِیْ عَلٰی مَا فَرَّطْتُ فِیْ جَنْبِ اللّٰهِ

کہیں کہنے لگے کوئی جی اے انوس اس بات پر کہ میں کوتاہی کرتا رہا اللہ کی طرف سے

وَ اِنْ کُنْتُ لِمِنْ الشَّخِیْرِیْنَ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ

اور میں تو ہشتا ہی رہا یا کہنے لگے کہ اگر اللہ

هٰذَا بَنِیْ لَکُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۵۷﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِیْنَ تَرٰی

مجھ کو راہ دکھاتا تو میں ہوتا ڈرنے والوں میں یا کہنے لگے جب دیکھے

الْعَذَابُ اَبْ لَوْ اَنَّ لِّیْ کَرَّةً فَاکُوْنُ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۸﴾

عذاب کو کسی طرح مجھ کو پھر جانا ملے تو میں ہو جاؤں نیکی والوں میں

بَلٰی قَدْ جَاۤءَتْکَ اٰیٰتِیْ فَکَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَکْبَرْتَ وَ

کیوں نہیں پہنچ چکے تھے میرے حکم پھر تو نے ان کو جھٹلایا اور غرور کیا اور

کُنْتُ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۵۹﴾ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ تَرٰی الَّذِیْنَ

تو تھا منکروں میں اور قیامت کے دن تو دیکھے ان کو جو

کَذَبُوْا عَلٰی اللّٰهِ وَجُوْهُهُمْ مَّسْوُوْدَةٌ اَلْیَسْ فِیْ جَهَنَّمَ

جھوٹ بولتے ہیں اللہ پر کہ ان کے منہ یوں سیاہ کیا نہیں ہے دوزخ میں ٹھکانا

مَنْثُوۤی لِّلْمُنْکِبِیْنَ ﴿۶۰﴾ وَیُنْجِی اللّٰهُ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ

عسروں والوں کا اور بچائے گا اللہ ان کو جو ڈرتے رہے ان کے بچاؤ کی جگہ

لَا يَمَسُّهُمُ السُّوءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۱﴾

نہ لگے ان کو بُرائی اور نہ وہ غمگین ہوں -

خلاصہ تفسیر

آپ (ان سوال کرنے والوں کے جواب میں میری طرف سے) کہہ دیجئے کہ اے میرے بند و جہنوں نے (کفر و شرک کر کے) اپنے اوپر نہ یاد تیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے نا امید مت ہو (اور یہ خیال نہ کرو کہ ایمان لانے کے بعد گزشتہ کفر و شرک پر مواخذہ ہو گا سو یہ بات نہیں بلکہ) بالیقین اللہ تعالیٰ (اسلام کی برکت سے) تمام (گزشتہ) گناہوں کو (گو کفر و شرک ہی کیوں نہ ہو) معاف فرما دیگا واقعی وہ بڑا بخشنے والا، بڑی رحمت کرنے والا ہے اور (چونکہ اس معافی کی شرط اور طریقہ کفر سے توبہ کرنا اور اسلام لانا ہے، اس لئے) تم (کفر سے توبہ کرنے کے لئے) اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور (اسلام قبول کرنے میں) اُس کی فرمانبرداری کرو قبل اس کے کہ (اسلام نہ لانے کی صورت میں) تم پر عذاب (الہی) واقع ہونے لگے (اور) پھر (اُس وقت کسی کی طرف سے) تمہاری کوئی مدد نہ کی جاوے - (یعنی جیسا اسلام لانے کی صورت میں سب کفر و شرک معاف ہو جاوے گا، اسی طرح اسلام نہ لانے کی صورت میں اس کفر و شرک پر عذاب ہو گا جس کا کوئی دفعیہ نہیں) اور (جب یہ بات ہے کہ اسلام نہ لانے کا یہ انجام ہے تو) تم (کو چاہیے کہ) اپنے رب کے پاس آئے ہوئے اچھے اچھے حکموں پر چلو۔ اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آپڑے اور تم کو (اس کا) خیال بھی نہ ہو (مراد اس سے عذاب آخرت ہے بقرینہ مابعدہ اور اچانک یا تو اس لئے رکھا کہ نفخہ اولیٰ میں سب ارواح مدہ ہوش ہو جاویں گی پھر نفخہ ثانیہ کے بعد ادراک عذاب اچانک ہونے لگے گا اور یا اس لئے کہ جیسا عذاب واقع ہو گا قبل وقوع اسکی حقیقت کا ادراک نہ تھا اور ویسا گمان نہ تھا، گمان کے خلاف واقعہ سامنے آنے کو اچانک سے تعبیر کیا گیا، اور یہ انابت و اسلام و اتباع کا حکم اس لئے دیا جاتا ہے کہ) کبھی (کل قیامت کے روز) کوئی شخص کہنے لگے کہ افسوس میری اس کوتاہی پر جو میں نے خدا کی جناب میں کی (یعنی اس کی اطاعت میں جو مجھ سے تفسیر ہوئی) اور میں تو احکام خداوندی پر ہنستاری رہا یا کوئی یوں کہنے لگے کہ اگر اللہ تعالیٰ (دنیا میں) مجھ کو ہدایت کرتا تو میں بھی پرہیزگاروں میں سے ہوتا (مگر ہدایت ہی محروم رہا اس لئے یہ تمام تر تفسیر و کوتاہی ہوئی جس میں معذور ہوں) یا کوئی عذاب کو دیکھ کر یوں کہنے لگے کہ کاش میرا (دنیا میں) پھر جانا ہو دے پھر میں نیک بندوں میں ہو جاؤں - (دوسرے قول میں جو یہ کہا گیا تھا کہ اگر مجھے ہدایت کی جاتی تو میں بھی متقی ہو جاتا۔ آگے اس کے جواب میں فرمایا ہے) ہاں بے شک تیرے پاس میری آیتیں پہنچی تھیں، سو تو نے ان کو جھٹلایا اور (جھٹلانا کسی شبہ سے نہ تھا بلکہ) تو نے تکبر کیا اور (یہ بھی نہ ہوا کہ دوسرے وقت

دماغ درست ہو جاتا بلکہ کافروں میں ہمیشہ شامل رہا (اور اس لئے تیرا یہ کہنا غلط ہے کہ مجھے ہدایت نہیں پہنچی) اور آگے مصر علی الکفر و تائب عن الکفر کی سزا و جزا کا مختصراً ذکر فرماتے ہیں کہ اے پیغمبر! آپ قیامت کے روز ان لوگوں کے چہرے سیاہ دیکھیں گے۔ جنہوں نے خدا پر جھوٹ بولا تھا۔ (اس میں دو امر آگئے جو بات خدا نے نہیں کہی مثل شرک وغیرہ اس کو یہ کہنا کہ خدا نے کہی ہے اور جو بات خدا نے کہی جیسے قرآن اس کو یہ کہنا کہ خدا نے نہیں کہی ہے) کیا ان متکبرین کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہے۔ (جو کہ عناداً و استکباراً تکذیب کریں) اور جو لوگ (شرک و کفر سے) بچتے تھے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کامیابی کے ساتھ (جہنم سے) نجات دے گا ان کو (ذرا) تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ عملیں ہونگے (کیونکہ جنت میں غم نہیں ہے)۔

معارف و مسائل

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِينَ يَتَّقُونَ آتِهِمْ قُلُوبًا مَّا أَرَادَ اللَّهُ بِهِنَّ أَنْ يَكُونُوا قُلُوبًا فَاسِدَةً۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے قتل ناحق کئے اور بہت کئے اور زنا کا ارتکاب کیا اور بہت کیا انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ جس دین کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں وہ ہے تو بہت اچھا لیکن نکر یہ کہ جب ہم اتنے بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کر چکے اب اگر مسلمان بھی ہو گئے تو کیا ہماری توبہ قبول ہو سکے گی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مذکورہ نازل فرمائی۔ (ذکرہ البخاری بمعناہ - قرطبی) اس لئے خلاصہ آیت کے مضمون کا یہ ہوا کہ مرنے سے پہلے پہلے ہر بڑے سے بڑے گناہ یہاں تک کہ کفر و شرک سے بھی جو توبہ کر لے قبول ہو جاتی ہے۔ اور سچی توبہ سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کسی کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت گناہگاروں کے لئے قرآن کی سب آیتوں سے زیادہ امید افزا ہے۔ مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سب سے زیادہ رجاء و امید کی یہ آیت ہے: اِنَّ سَائِلَكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلْمِهِمْ۔

وَاتَّبِعُوا اَحْسَنَ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ۔ اَحْسَنَ مَا اُنْزِلَ سے مراد قرآن ہے اور پورا قرآن احسن ہی ہے اور قرآن کو احسن مَا اُنْزِلَ اس اعتبار سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ جتنی کتابیں تورات انجیل، زبور، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں۔ ان سب میں احسن و اکمل قرآن ہے۔ (قرطبی) اِنَّ تَقُوْلَ لِنَفْسٍ لِّيْ حَسْرَتٌ مِّنْ اَمْرِ اَنْزَلْتُ اَسْمٰی۔ کی تین آیتوں میں اُسی مضمون کی تشریح و تاکید ہے، جو اس سے پہلے کی تین آیتوں میں بیان فرمایا ہے کہ کسی بڑے سے بڑے مجرم کافر

فاجر کو بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے اگر وہ توبہ کر لے گا تو اللہ اس کے سب پہلے گناہ معاف فرمادے گا۔ اَنْ تَقُولَ نَفْسُكَ سے تین آیتوں میں یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ یہاں تک کفر و شرک کو بھی توبہ سے معاف فرما دیتا ہے۔ مگر یہ یاد رکھو کہ توبہ کا وقت مرنے سے پہلے پہلے ہے، مرنے کے بعد قیامت کے روز کوئی توبہ کرے یا اپنے کئے پر حسرت کرے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

جیسا کہ بعض کفار فجار قیامت کے روز مختلف تمنائیں کریں گے۔ کوئی تو اظہار حسرت کرے گا کہ افسوس میں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کوتاہی کیوں کی تھی۔ کوئی تو اس بھی اپنا الزام تقدیر پر ڈال کر بچنا چاہے گا وہ کہے گا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت کر دیتا تو میں بھی متقیوں میں داخل ہوتا، مگر خدا نے ہی ہدایت نہ کی تو میں کیا کروں۔ کوئی یہ تمنا کرے گا کہ کاش مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تو میں سچا پکا مسلمان بنوں، اور اللہ کے احکام کی پوری اطاعت کروں۔ مگر اس وقت کی یہ حسرتیں اور تمنائیں کسی کے کام نہ آئیں گی۔

یہ تین قسم کی تمنائیں ہو سکتا ہے کہ مختلف لوگوں کی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تینوں تمنائیں یکے بعد دیگرے ایک ہی جماعت کے کفار کی طرف سے ہوں، کیونکہ آخری قول جس میں دوبارہ دنیا میں آنے کی تمنا ہے اُس کے ساتھ آیت میں مذکور ہے کہ وہ عذاب کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہوگا۔ اس سے لفظ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دونوں قول مشاہدہ عذاب سے پہلے کے ہیں کہ قیامت کے روز اول ہی اپنے عمل کی تقصیرات کو یاد کر کے کہیں گے، یَحْسَرُونَ عَلَى مَا فَرَّطُوا فِي جَهَنَّمَ اللہ پھر عذر اور بہانے کے طور پر کہیں گے کہ ہم تو معذور تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہدایت کر دیتا تو ہم بھی مطیع و فرمانبردار اور متقی بن جاتے۔ مگر جب اُس نے ہدایت ہی نہ کی تو ہمارا کیا قصور ہے، پھر جب عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو یہ تمنا ہوگی کہ کاش دنیا میں دوبارہ بھیج دیے جاویں۔ حق تعالیٰ نے ان تینوں آیتوں میں بتلادیا کہ اللہ کی مغفرت اور رحمت بہت وسیع ہے، مگر وہ جمیع حال ہو سکتی ہے کہ مرنے سے پہلے توبہ کر لو۔ اس لئے ہم ابھی بتلائے دیتے ہیں ایسا نہ ہو کہ تم مرنے کے بعد پھپھو اور آخرت میں اس طرح کی فضول حسرت و تمنائیں مبتلا ہو۔

بَلَىٰ كَذٰلِكَ أَتٰیكَ اٰیٰتِیْ فَكُنْ بِهَا بِهْتًا۔ اس آیت میں کفار کی اس بات کا جواب ہے کہ اگر اللہ ہدایت کر دیتا تو ہم متقی ہو جاتے۔ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ اللہ نے پوری ہدایت کر دی تھی اپنی کتاب میں اور آیتیں بھی تھیں۔ اس لئے ان کا یہ کہنا غلط اور لغو ہے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت نہیں کی۔ ہاں ہدایت کرنے کے بعد نیکی اور اطاعت پر اللہ نے کسی کو مجبور نہیں کیا۔ بلکہ بندہ کو یہ اختیار دیدیا کہ وہ جس راستے حق یا باطل کو اختیار کرنا چاہے کبھی ہی بندہ کا امتحان تھا، اس پر اس کی کامیابی یا ناکامی موقوف تھی جس نے اپنے اختیار سے مگر اپنی کار راستہ اختیار کر لیا وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔

اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴿٦٢﴾ لَهُ مَقَالِيدُ

اللہ بتائے والا ہے ہر چیز کا ۵۹ ہر چیز کا ذمہ لیتا ہے اس کے پاس ہیں

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ

کنجیاں آسمانوں کی اور زمین کی اور جو منکر ہوئے ہیں اللہ کی باتوں سے وہ لوگ جو ہیں

هَمْ الْخَسِرُونَ ﴿٦٣﴾ قُلْ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَأْمُرُونِي أَعْبُدُ أَيُّهَا

وہی ہیں ٹوٹے میں پرے تو کہہ اب اللہ کے سوا کس کو بتلائے ہو کہ یوحنا اے

الْجَاهِلُونَ ﴿٦٢﴾ وَلَقَدْ أَوْحَىٰ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكَ

مادانہ اور حکم مروجہ کا ہے تجھ کو اور تجھ سے انگلوں کو

لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبِطَنَّ عَنْكَ مَلَكُوكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٤٥﴾

کہ اگر تو نے شہ کا مال لیا تو اکارت حاصل کئے تیسرے عمل اور تو ہو گا دوسرے میں یہ رٹا

بَلِ اللّٰهُ فَاَعْبُدْ وَكُنْ مِنَ الشّٰكِكِيْنَ ﴿٤٤﴾ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ

ہیں بلکہ اللہ ہی کو یلوج اور رہ حق ماننے والوں میں اور نہیں سمجھتا اللہ کو

حَقِّ قَدِيرًا قَسْوًا الْأَرْضُ جَبِينًا قَبِضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

عقنا کچھ ۵۹ سے الہ زمیں سار ۱۵ ایک سچھے اسکے (۱۰) قدامت کے

وَالسَّمَوَاتِ مَطْوِيَّاتٍ بِيَمِينِهِ ۖ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى

اور آسمان پر طوطے ہوں اُسکے دامِ عزت پر ہوں وہاں کہ ہے اور بہت اور ہے

عَلَّمَا يُشْرِكُونَ ﴿٤٤﴾

اُس سے کہ شریک بتلاتے ہیں ۔

خُلاصۂ تفسیر

اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے، اُسی کے اختیار میں کجیاں ہیں

آسمان و زمین کی۔ یعنی ان سب چیزوں کا موجد و خالق بھی وہی ہے اور ان کو باقی رکھنے والا، حفاظت

کرنے والا بھی وہی ہے، جو مفہوم ہے لفظ و کبیل کا۔ اور ان سب مخلوقات میں تصرفات و انقلابات بھی

اسی کا کام ہے یہ مفہوم ہے لہٰذا مَقَالِیْدُ السَّمَوٰتِ وَالْاَرْضِ کا یہی کہ جس کے ہاتھ میں خزانوں کی کھنیاں

ہوتی ہیں، وہ ہی عادتاً ان میں تصرفات کا مالک ہوتا ہے۔ اور حجب ساری کائنات کا خالق بھی بلا

شرکت غیرے وہی ہے، محافظ بھی وہی ہے، مالک تصرفات کا بھی وہی ہے تو عبادت بھی صرف اسی کی

ہونا چاہیے اور سزا و جزا کا مالک بھی وہی ہونا چاہیے جو خلاصہ ہے توحید کا۔ اور چونکہ ان سب مقدمات کو یہ مشرکین بھی تسلیم کرتے تھے تو ان پر لازم تھا کہ عقیدہ توحید کو بھی تسلیم کریں، اس لئے فرمایا (جو لوگ (اس پر بھی) اللہ کی آیتوں کو (جو توحید اور جزا و سزا کے مضمون پر مشتمل ہیں) نہیں مانتے وہ بڑے خسارے میں رہیں گے) اور یہ لوگ خود تو کفر و شرک میں ملوث تھے ہی اب ان کا حوصلہ یہاں تک بڑھا کہ آپ کو بھی اپنے طریقہ پر لانے کے لئے فرمائش کرتے ہیں سو! آپ کہہ دیجئے کہ اے جاہلو! (مذکورہ دلائل سے توحید کا مکمل ثبوت اور کفر و شرک کا ابطال ہو جانے کے بعد) پھر بھی تم مجھ کو غیر اللہ کی عبادت کرنے کے لئے کہتے ہو (اور آپ سے کفر و شرک کا صادر ہونا کیسے ممکن ہے جبکہ) آپ کی طرف بھی اور جو پیغمبر آپ سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کی طرف بھی یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ (ہر امتی کو پہنچا دیں) کہ اگر تو شرک کہہ چکا تو تیرا کیا کرایا کام سب غارت ہو جاوے گا۔ اور تو خسارہ میں پڑے گا۔ (اس لئے تو کبھی شرک کے پاس نہ جانا، بلکہ اللہ ہی کی عبادت کرتا اور (امنی کا) شکر گزار رہنا) اور جب انبیاء علیہم السلام کو جن میں آپ بھی داخل ہیں توحید کا حق ہونا اور کفر و شرک کا باطل ہونا بذریعہ وحی ثابت ہو چکا اور وہ اس پر مامور کئے گئے کہ دوسروں کو بھی اس عقیدے کی ہدایت کریں تو ان مشرکین کا آپ سے کفر و شرک کی توقع رکھنا بجز حماقت کے اور کیا ہو سکتا ہے) اور (انسوس ہے کہ) ان لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی عظمت و قدر نہ پہچانی جیسا کہ پہچانا چاہیے تھا، حالانکہ ساری زمین اُسی کی مٹھی میں ہو گئی قیامت کے دن اور تمام آسمان لیے ہوئے ہوں گے اُس کے داہنے ہاتھ میں، وہ پاک اور برتر ہے ان کے شرک سے۔

معارف و مسائل

لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ - مَقَالِيدُ جمع مقلد یا مقلید کی ہے جو قفل کی کنجی کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا دراصل یہ لفظ فارسی زبان سے معرب کیا گیا ہے۔ فارسی میں کنجی کو کلید کہتے ہیں۔ معرب کر کے اس کو اقلید بنایا گیا پھر اس کی جمع مقالید لائی گئی (روح) کنجیوں کا کسی کے ہاتھ ہونا اس کے مالک و متصرف ہونے کی علامت ہے، اس لئے مراد آیت کی یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو خزانے نعمتوں کے مستور ہیں، ان سب کی کنجیاں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں وہی ان کا محافظ اور وہی متصرف ہے کہ جب چاہے جس کو چاہے اور جس کو چاہے نہ دے۔

اور بعض روایات حدیث میں کلمہ سوم یعنی سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ کو مقالید السموات والارضی فرمایا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص صبح و شام یہ کلمہ پڑھتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کے خزانوں کی نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ ان روایات کو ابن جوزی نے موضوع کہہ دیا ہے، مگر دوسرے محدثین نے احادیث ضعیفہ قرار دیا ہے جن کا فضائل اعمال میں اختیار کیا جاسکتا ہے۔ (روح المعانی)

وَالْآرْضُ مِنْ جَمِيعَةٍ قَبَضَتْهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمَوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِلَيْمَيْنِ۔ قیامت کے روز زمین کا اللہ تعالیٰ کی مٹھی میں ہونا اور آسمانوں کا لپیٹ کر اس کے داہنے ہاتھ میں ہونا اسلاف متقدمین کے نزدیک اپنے حقیقی معنوں میں ہیں۔ مگر مضمون آیت متشابہات میں سے ہے جس کی حقیقت بحسب خدا نے تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں۔ عام لوگوں کو اس کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش بھی ممنوع ہے بس اس پر ایمان لانا ہے کہ جو کچھ اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہ حق اور صحیح ہے۔ اور چونکہ اس آیت کے ظاہری الفاظ سے اللہ تعالیٰ کے لئے مٹھی اور داہنے ہاتھ کا ہونا معلوم ہوتا ہے جو اعضاء جوارح جسمانی ہیں اور اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانیات سے پاک ہے، اس کی طرف آیت کے خاتمہ میں اشارہ کر دیا کہ ان الفاظ کو اپنے اعضاء پر قیاس مت کرنا، اللہ تعالیٰ ان سے پاک ہے سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ۔

اور علماء متاخرین نے اس آیت کو ایک تمثیل و مجاز قرار دے کر یہ معنی بیان کئے کہ کسی چیز کا مٹھی میں ہونا اور داہنے ہاتھ میں گناہ ہوتا ہے اس پر پوری طرح قبضہ و قدرت سے یہی مکمل قبضہ و قدرت مراد ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ

اور پھونکا جائے صور میں پھر ہوش ہو جائے جو کوئی ہے آسمانوں میں اور زمین میں

اَلَا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اٰخَرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ

مگر جس کو اللہ چاہے پھر بھونکی جائے دوسری بار تو فوراً وہ کھڑے ہو جائیں

يَنْظُرُوْنَ ۝۶۸ ۝۶۸ وَاشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ

ہر طرف دیکھتے اور چمکے زمین اپنے رب کے نور سے اور لادھریں

الْكِتٰبُ وَجِئَتْ بِالنَّبِیِّنَ وَالشَّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ

دفتر اور حاضر آئیں پیغمبر اور گواہ اور فیصلہ ہو ان میں

بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۶۹ ۝۶۹ وَوُفِّتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ

انصاف سے اور ان پر ظلم نہ ہوگا اور پورا ملے ہر جی کو جو اس نے کیا

وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا فَعَلُوْنَ ۝۷۰ ۝۷۰ وَسِيقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اِلٰی

اور اس کو خوب خبر ہے جو کچھ کرتے ہیں۔ اور ہانکے جائیں جو منکر تھے دوزخ کی

جَهَنَّمَ زُرَّاءٌ حَتَّىٰ إِذَا أَجَاءُوهَا فَتَحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ

طرف گروہ گروہ یہاں تک کہ جب پہنچ جائیں اس پر کھولے جائیں اُسکے دروازے اور کہنے لگیں اُنکو

خُزِّنَتْ هَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ

اس کے داروغہ کیا نہ پہنچتے تھے تمہارے پاس رسول تم میں کے پڑھتے تھے تم پر باتیں تمہارے رب کی

وَيُنذِرُوكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا قَالُوا بَلَىٰ وَلَكِنْ حَقَّتْ

ادھر ڈراتے تم کو اس تمہارے دن کی ملاقات سے بولیں کیوں نہیں پتر ثابت ہوا

كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝۴۱ قِيلَ ادْخُلُوا أَبْوَابَ

حکم عذاب کا منکروں پر حکم ہووے کہ داخل ہو جاؤ دروازوں میں

جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ ۝۴۲

دوزخ کے سدا رہنے کو اُس میں سو کیا بُری جگہ رہنے کی غرور والوں کو

وَسَيُتَقَالُ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُرَّاءٌ حَتَّىٰ

اور ہانکے جائیں وہ لوگ جو ڈرتے رہے تھے اپنے رب سے جنت کو گروہ گروہ یہاں تک کہ جب

إِذَا أَجَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خُزِّنَتْ هَا

پہنچ جائیں اس پر اور کھولے جائیں اُسکے دروازے اور کہنے لگیں ان کو داروغہ اُس کے

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ۝۴۳ وَقَالُوا

سلام پہنچے تم پر تم لوگ پاکیزہ ہو سو داخل ہو جاؤ اس میں سدا رہنے کو اور وہ بولیں

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقْنَا وَعَدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ

شکر ہے اللہ کا جس نے سچا کیا ہم سے اپنا وعدہ اور وارث کیا ہم کو اس زمین کا

نَتَّبِعُوا أَمِنْ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۚ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ۝۴۴

گھر لے لیوں بہشت میں سے جہاں چاہیں سو کیا خوب بدلہ ہے محنت کرنے والوں کا

وَنَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِئِينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ

اور تو دیکھے فرشتوں کو گھبر رہے ہیں عرش کے گرد پاکی بولتے ہیں اپنے

بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ

رب کی خوبیاں اور فیصلہ ہوتا ہے ان میں انصاف کا اور یہی بات کہتے ہیں کہ سب خوبی ہے

لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝۴۵

اللہ کو جو رب ہے سارے جہان کا

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ

خلاصہ تفسیر

اور (قیامت کے روز جس کا اوپر ذکر آیا ہے) صور میں پھونک ماری جاوے گی جس سے تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش اُٹھادیں گے (پھر زندہ تو مہ جادیں گے اور مردوں کی رُوہیں بیہوش ہو جاویں گی) مگر جس کو خدا چاہے (وہ اس بے ہوشی اور موت سے محفوظ رہے گا) پھر اُس (صور) میں دوبارہ پھونک ماری جاوے گی تو دفعۃً سب کے سب (ہوش میں آکر اراج کا تعلق ابدان سے ہو کر قبروں سے نکل) کھڑے ہو جائیں گے۔ (اور چاروں طرف دیکھنے لگیں گے) (جیسا کہ حادثہ غریبہ کے وقوع کے وقت عادت طبعی ہے) اور (پھر حق تعالیٰ حساب کے لئے زمین پر اپنی شان کے مناسب نزول و تجلی فرما دیں گے اور) زمین اپنے رب کے نور (بے کیف) سے روشن ہو جاوے گی اور (سب کا) نامہ اعمال ہر ایک کے سامنے رکھ دیا جاوے گا اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جاویں گے (گواہ کا مفہوم عام ہے جس میں پیغمبر بھی داخل ہیں اور فرشتے بھی اور اُمت محمدی بھی اور اعضاء و جوارح بھی، جس کی تفصیل آگے معارف کے ضمن میں آتی ہے) اور سب (مسکلفین) میں (حسب اعمال) ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا جاوے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا (کہ کوئی نیک عمل جو بشرائط واقع ہوا ہو چھپا لیا جائے یا کوئی بد عمل بڑھا دیا جاوے) اور ہر شخص کو اُس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جاوے گا (اعمال نیک میں بدلہ کے پورا ہونے سے مقصود کمی کی نفی ہے اور اعمال بد میں پورا ہونے سے مقصود زیادتی کی نفی ہے) اور وہ سب کے کاموں کو خوب جانتا ہے (پس اُس کو ہر ایک کے موافق جزا دیدینا کچھ مشکل نہیں) اور (بیان اُس بدلہ کا جو نتیجہ فیصلہ کا ہے یہ ہے کہ) جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گمراہ ہو کر رہیں گے (دھکے دے کر ذلت و خواری کے ساتھ) ہانکے جاویں گے (گمراہ گمراہ اس لئے کہ اقسام و مراتب کفر کے جدا جدا ہیں۔ پس ایک ایک طرح کے کفار کا ایک ایک گمراہ ہوگا) یہاں تک کہ جب دوزخ کے پاس پہنچیں گے تو (اُس وقت) اُس کے دروازے کھول دیئے جاویں گے اور اُن سے دوزخ کے محافظ (فرشتے بطور ملامت کے) کہیں گے کیا تمہارے پاس تم ہی لوگوں سے (جن سے استفادہ تمہارے لئے مشکل نہ تھا) پیغمبر نہ آئے تھے جو تم کو تمہارے رب کی آیتیں پڑھ کر سنا کر تے تھے اور تم کو تمہارے اس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے وہ کافر کہیں گے کہ ہاں (رسول بھی آئے تھے اور انھوں نے ڈرایا بھی) لیکن عذاب کا وعدہ کافروں پر جن میں ہم بھی داخل ہیں) پورا ہو کر رہا (یہ اعتذار نہیں بلکہ اعتراف ہے کہ باوجود ابلاغ کے ہم نے کفر کیا اور کافروں کے لئے جو عذاب موعود تھا وہ ہمارے سامنے آیا واقعی ہم مجرم ہیں، پھر اُن سے کہا جاوے گا (یعنی وہ فرشتے کہیں گے) کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو (اور) ہمیشہ اس میں رہ کر و غرض (خدا کے احکام سے)

مکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانہ ہے (پھر اس کے بعد وہ جہنم میں داخل کئے جاویں گے اور دروازے بند کر دئے جاویں گے۔ کما قال تعالیٰ إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤَصَّوَةٌ لَّيُؤْخَذُوكَافَرُكَامَالِإِنِّہِا، اور جو لوگ گنہگار سے ڈرتے تھے۔ جس کا ابتدائی مرتبہ ایمان ہے پھر آگے اس کے مختلف درجات ہیں) وہ گروہ گروہ ہو کر (کہ جس مرتبہ کا تقدس ہوگا اس مرتبہ کے متقی ایک جگہ کر دئے جاویں گے اور) جنت کی طرف (شوق دلا کر جلدی) روانہ کئے جاویں گے یہاں تک کہ جب اُس (جنت) کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے (پہلے سے) کھلے ہوئے ہوں گے (تاکہ ذرا بھی دیر نہ لگے اور نیز اہل اکرام کے لئے ایسا ہی ہوتا ہے جیسا مہمان کے لئے عادت ہے کہ پہلے سے دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ کما قال تعالیٰ مُّفْتَحَتْ لَّهُمُ الْبَابُ) اور وہاں کے محافظ (فرشتے) ان سے (بطور اکرام و تہنات کے) کہیں گے کہ السلام علیکم تم مرزہ میں رہو سو اس (جنت) میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ (اس وقت اس میں داخل ہو جاویں گے) اور داخل ہو کر) کہیں گے کہ اللہ کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سر زمین کا مالک بنا دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں (یعنی ہر شخص کو خوب فراغت کی جگہ ملی ہے خوب کھل کھیل کر چلیں پھریں) بیٹھیں اٹھیں قیام کے طور پر تو اپنی ہی جگہ میں اور سیر کے طور پر دوسرے جنتی کے درجہ میں بھی (عرش (نیک) عمل کرنے والوں کا اچھا بدلہ ہے) یہ جملہ خود اہل جنت کا ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو دونوں امکان ہیں) اور آگے اجلاسِ اخیر فیصلہ تاکہ اسی مضمون کو مختصر اور پر شوکت الفاظ میں بطور تلخیص کے فرماتے ہیں کہ) آپ فرشتوں کو دیکھیں گے کہ (نزول اجلاسِ الحساب کے وقت عرش کے گرد اگر حلقہ باندھے ہوں گے) اور) اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہوں گے اور تمام بندوں میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جاوے گا اور (اس فیصلہ کے ٹھیک ہونے پر ہر طرف سے جوش کے ساتھ یہی خروش ہوگا اور) کہا جاوے گا کہ ساری خوبیاں خدا کو زیبا ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے (جس نے ایسا عمدہ فیصلہ کیا پھر اس نعرہ تحسین پر دوبارہ فرماست ہو جاوے گا)۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

فَصَبِّحْ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ الْأَمَّنْ شَاءَ اللَّهُ۔ صَبِّحْ کے لفظی معنی ہمیشہ

ہونے کے ہیں اور مراد یہ ہے کہ اول بیہوش ہو جائیں گے پھر سب مر جائیں گے اور جو پہلے مر چکے ہیں انکی روحیں بیہوش ہو جائیں گی۔ (کمافی بیان القرآن من سورة النمل وعند ابن کثیر مثله)

الَا مَن شَاءَ اللَّهُ۔ میں درمنثور کی روایات کے مطابق چار فرشتے جبریل، میکائیل، اسرافیل

اور ملک الموت ہیں اور بعض روایات میں حملہ العرش بھی اس میں داخل ہیں۔ ان کے استثناء کا مطلب یہ ہے کہ نفعِ صورت کے اثر سے ان کو موت نہیں آئے گی مگر اس کے بعد ان کو بھی موت آجائے گی اور سوائے ایک ذات حق سبحانہ تعالیٰ کے کوئی اس وقت زندہ نہیں رہے گا۔ ابن کثیر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ ان سب میں بھی سب سے آخر میں ملک الموت کو موت آوریگی۔ سورۃ نمل میں بھی ایک آیت اسی کی مثل گزاری ہے اُس میں صَدَقَ کے بجائے فَرَعَ کا لفظ آیا ہے وہاں بھی اس کی کچھ تفصیل گزاری ہے۔

وَجَاءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ - مراد یہ ہے کہ میدانِ حشر میں حساب و کتاب کے وقت سب انبیاء و بھی موجود ہوں گے اور دوسرے سب گواہ بھی حاضر ہوں گے۔ ان گواہوں میں خود انبیاء علیہم السلام بھی ہوں گے، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے جِئْتُمُونِي كَمَا تَبْشُرُونَ - اور فرشتے بھی گواہوں میں ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ۔ کہ اس میں سَائِقٌ اور شہید سے مراد فرشتے ہوتا (تفسیر درمنثور) سورۃ ق میں مذکور ہے اور ان گواہوں میں اُمت محمدیہ بھی ہوگی جیسا کہ قرآن کریم میں ہے لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ اور ان گواہوں میں خود انسان کے اعضاء و جوارح بھی ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے تَكَلَّمْنَا بِأَنفُسِنَا وَشَهِدْنَا بِأَنفُسِنَا -

نَتَبَوَّأُمِنْ الْجَنَّةِ تَحِيَّتٌ نَّشَاءُ - مطلب یہ ہے کہ اہل جنت کے لئے اپنے اپنے مکاناتِ محلات اور بانمات تو ہونگے ہی، ان کو یہ اختیار بھی دیا جائے گا کہ دوسرے اہل جنت کے پاس ملاقات و تفریح کے لئے جایا کریں بطرانی۔ ابو نعیم اور ضیاء نے سند حسن کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک صبا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ مجھے آپ اتنی محبت ہے کہ اپنے گھر بھی جاتا ہوں تو آپ ہی یاد کرتا رہتا ہوں اور جب تک پھر حاضر خدمت نہ ہو جاؤں مجھے صبر نہیں آتا۔ مگر جب میں اپنی موت کو یاد کرتا ہوں اور آپ کو فات کو یاد کرتا ہوں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ تو حقیقت میں انبیاء کے مقاماتِ عالیہ میں ہوں گے اور میں اگر جنت میں پہنچ بھی گیا تو کسی نیچے کے درجے میں ہوں گا مجھے نکر یہ ہے کہ میں آپ کو کیسے دیکھوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات سن کر کچھ جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ جبریل امین یہ آیت لیکر نازل ہوئے۔

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا - اس آیت میں بتلادیا کہ اللہ و رسول کی اطاعت کرنے والے مسلمان انبیاء و صدیقین وغیرہ کے ساتھ ہی ہوں گے۔ اور آیت مذکورہ میں اسکی تشریح ہوگئی کہ ان کو مقاماتِ عالیہ میں بھی جانے کی اجازت ہوگی۔ الحق تعالیٰ بہم بمنہ وکرمہ۔

سُورَةُ الْمُؤْمِنِ

سُورَةُ الْمُؤْمِنِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسٌ وَثَمَانُونَ آيَةً وَتَسْعُ رُكُوعَاتٍ

سورۃ مؤمن مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پچاسی آیتیں ہیں اور نو رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

أَحْمَدُ ① تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ② غَافِرٌ

اتارنا کتاب کا اللہ سے ہے جو نہ بردست ہے خبردار گناہ

الذَّانِبِ وَقَابِلُ التَّوْبِ شَدِيدُ الْعِقَابِ ③ ذِي الطَّلُوفِ ④

بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا سخت عذاب دینے والا مقتدر والا

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ⑤ إِلَيْهِ الْمَصِيرُ ⑥ مَا يُجَادِلُ فِي آيَاتِ اللَّهِ

کسی کی بتائی نہیں سوائے اس کے اسی کی طرف بھرجانا ہے وہی جھگڑاتے ہیں اللہ کی باتوں میں

إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا أَفَلَا يَغْدِرُونَ ⑦ تَقْلِبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ⑧

جو منکر ہیں سر جھک کر دھوکا دے یہ بات کہ وہ چلتے پھرتے ہیں شہروں میں

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَالْأَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ ⑨

جھٹلا چکے ہیں ان سے پہلے قوم نوح کی اور کتے-فرتے ان سے پیچھے

وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوا وَجَدَ اللَّهُ

اور ارادہ کیا ہر امت نے اپنے رسول پر کہ اس کو پکڑ لیں اور لالچ لے

بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتَهُمْ فَكَيْفَ

جھوٹے جھگڑتے کہ اس سے دھکا دیں سچے دین کو پھر میں نے ان کو پکڑ لیا (کہو) پھر کیسا ہوا

كَانَ عِقَابٍ ۝ وَكَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ

میرا سزا دینا اور اسی طرح ٹھیک ہوئی بات تیرے رب کی مستکروں پر

كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ

کہ یہ ہیں دوزخ والے جو لوگ اٹھا رہے ہیں عرش کو

وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ

اور جو اس کے گرد ہیں پاکی بولتے ہیں اپنے رب کی خوبیاں اور اس پر یقین رکھتے ہیں

وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ

اور گناہ بخشواتے ہیں ایمان والوں کے اے پروردگار ہمارے ہر چیز سمائی ہوئی ہے

رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا

تیری بخشش اور حسیب میں سوسعت کر ان کو جو توبہ کریں اور چلیں تیری

سَبِيلِكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۖ رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ

راہ پر اور بچا ان کو آگ کے عذاب سے اے رب ہمارے اور داخل کر ان کو

جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدْتَ لَهُمْ وَمَنْ صَلَّاهُمْ مِنْ آبَائِهِمْ

سمائیے کے باغوں میں جن کا وعدہ کیا تو نے ان سے اور جو کوئی نیک ہو ان کے باپوں میں

وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

اور عورتوں میں اور اولاد میں بے شک تو ہی ہے زبردست حکمت والا

وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ ۖ وَمَنْ تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ

اور بچا ان کو برائیوں سے اور جس کو تو بچائے برائیوں سے اُس دن اُس پر

رَّاحِمَتُهُ ۖ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

مہربانی کی توتی اور جو ہے یہی ہے بڑی مراد پائی

خلاصہ تفسیر

احقر (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ کتاب اتاری گئی ہے اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ گناہ بخشے والا ہے اور توبہ کا قبول کرنے والا ہے، سخت سزا دینے والا ہے، قدرت والا ہے اُس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اسی کے پاس (سب کو) جانا ہے (پس قرآن مجید اور توحید کی حقیقت کا مقتضایہ ہے کہ اس میں انکار و جدال نہ کیا جاوے مگر پھر بھی) اللہ تعالیٰ کی ان آیتوں میں (یعنی قرآن میں جو توحید پر

بھی مشتمل ہے) وہی لوگ (ناحق کے) جھگڑے نکالتے ہیں جو (اس کے) منکر ہیں (اور اس انکار کا مقتضایہ ہے کہ ان کو سزا دی جائے، لیکن عاجلاً سزا نہ ہونا استدراج یعنی چند روزہ مہلت دینا ہے) سو ان لوگوں کا شہروں میں (امن و امان سے دنیوی کاروبار کے لئے) چلنا پھرنا آپ کو اشتباہ میں نہ ڈالے (کہ اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ اسی طرح سزا و عذاب سے بچے رہیں گے اور آرام سے رہیں گے اور آپ کے اس خطاب سے دوسروں کو سنا نامقصود ہے، غرض ان پر دار و گیر ضرور ہوگی خواہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی یا صرف آخرت میں چنانچہ) ان سے پہلے نوح (علیہ السلام) کی قوم نے اور دوسرے گروہوں نے بھی جو ان کے بعد ہوئے (جیسے عاد و ثمود وغیرہم دین حق کو) جھٹلایا تھا اور ہر اہمیت (میں سے جو لوگ ایمان نہ لائے تھے انھوں) نے اپنے پیغمبر کے گرفتار کرنے کا ارادہ کیا (کہ پکڑ کر قتل کر دیں) اور ناحق کے جھگڑے نکالے تاکہ اس ناحق سے حق کو باطل کر دیں سو میں نے (آخر) ان پر دار و گیر کی سو (دیکھو) میری طرف سے (ان کو) کیسی سزا ہوئی اور (جس طرح ان کو دنیا میں سزا ہوئی) اسی طرح تمام کافروں پر آپ کے پروردگار کا یہ قول ثابت ہو چکا ہے کہ وہ لوگ (آخرت میں) دوزخی ہوں گے (یعنی یہاں بھی سزا ہوئی اور وہاں بھی ہوگی) اسی طرح کفر کے سبب ان کفار حاضرین کو بھی دار و گیر اور سزا ہونے والی ہے خواہ دوزخ عالم میں یا آخرت میں۔ یہ تو حال ہے منکرین کا، کہ مستحق اہانت و عقوبت ہیں اور جو لوگ موحدا و مؤمن ہیں وہ ایسے مکرم ہیں کہ ملائکہ مقربین ان کے لئے دعا و استغفار کرنے میں مشغول رہتے ہیں جو کہ حسب قاعدہ یَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ اس کی علامت ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے اس پر مامور ہیں کہ مؤمنین کے لئے استغفار کیا کریں۔ اس سے مؤمنین کا محبوب عند اللہ ہونا ثابت ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ) جو فرشتے کہ عرش (الہی) کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو فرشتے اس کے گرد گروہیں وہ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہتے ہیں۔ اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لئے (اس طرح دعاؤں) استغفار کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ کی رحمت — (عامہ) اور علم ہر چیز کو شامل ہے (پس اہل ایمان پر بدرجہ اولیٰ رحمت ہوگی اور ان کے ایمان کا آپ کو علم بھی ہے) سو ان لوگوں کو بخشد کیجئے جنھوں نے (شرک و کفر سے) توبہ کر لی ہے اور آپ کے رستہ پر چلتے ہیں اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچا لیجئے۔ اے ہمارے پروردگار اور (دوزخ سے بچا کر) ان کو ہمیشہ رہنے کی بہشتوں میں جس کا آپ نے ان سے وعدہ کیا ہے داخل کر دیجئے اور ان کے ماں باپ اور بیویاں اور اولاد میں جو (جنت کے) لائق (یعنی مؤمن) ہوں (گو ان مؤمنین کے درجے کے نہ ہوں) ان کو بھی داخل کر دیجئے، بلا شک آپ زبردست حکمت والے ہیں (کہ مغفرت پر قادر ہیں اور ہر ایک کے مناسب اس کو درجہ عطا فرماتے ہیں) اور (غلیبا ان کو دوزخ سے جو کہ عذاب اعظم ہے بچانے کے لئے آپ سے دعا ہے اسی طرح یہ بھی دعا ہے کہ) ان کو (قیامت کے دن ہر طرح کی) تکالیف سے بچائیے (گو وہ جہنم

سے خفیت ہوں جیسے میدان قیامت کی پریشانیاں اور آپ جس کو اس دن تکلیف سے بچالیں تو اس پر آپ کے (بہت مہربانی فرمائی۔ اور یہ (جو مذکور ہوا مغفرت و حفاظت عذاب اکبر و اصغر سے اور دخول جنت) بڑی کامیابی ہے (پس اپنے مؤمن بندوں کو اس سے محروم نہ رکھیے)۔

معارف و مسائل

یہاں سے سورۃ احقاف تک سات سورتیں — حکم سے شروع ہوتی ہیں ان کی سورۃ مؤمن کی خصوصیات اور فضائل وغیرہ

آل حکم یا حوامیم کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آل حکم دیباج القرآن ہے (دیباج ریشمی کپڑے کہتے ہیں۔ مراد اس سے زینت ہے)۔ اور مسعر بن کدام فرماتے ہیں کہ ان کو عزرائل کہا جاتا ہے یعنی دہنیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہر چیز کا ایک مغز اور خلاصہ ہوتا ہے۔ قرآن کا خلاصہ آل حکم ہیں یا فرمایا کہ حوامیم ہیں۔ یہ سب روایتیں امام عالم ابو عبیدہ تقم بن سلام رحمہ اللہ نے اپنی کتاب فضائل القرآن میں لکھی ہیں۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اپنے اہل و عیال کی رہائش کے لئے جگہ کی تلاش میں نکلا۔ تو کسی ہرے بھرے میدان کو دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔ اچانک آگے بڑھا تو روضات و مزارع یعنی ایسے باغات جن کی زمین میں گائے کا مادہ سب سے زیادہ ہے ان کو دیکھ کر کہنے لگا میں تو بارش کی پہلی ہی ہرمانی کو دیکھ کر تعجب کر رہا تھا۔ یہ تو اُس سے بھی عجیب تر ہے تو اُس سے یہ کہا جائے گا کہ پہلی ہرمانی اور سرسبزی کی مثال عام قرآن کی مثال ہے اور روضات و مزارع کی مثال قرآن میں سے آل حکم کی مثال ہے۔ اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب میں تلاوت قرآن کرتے ہوئے آل حکم پڑھتا ہوں تو گویا ان میں میری بڑی تفریح ہوتی ہے۔

اور مسند بزار میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے شروع دن میں آیۃ الکرسی اور سورۃ مؤمن (کی پہلی تین آیتیں حکم سے) اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَائِرِ الْمُرْسَلِینَ پڑھ لیں۔ وہ اس دن ہر برائی اور تکلیف سے محفوظ رہے گا۔ اس کو ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ جس کی سند میں ایک راوی متکلم فیہ ہے۔

(ابن کثیر ص ۶۹ ج ۴)

ابوداؤد ترمذی میں باسناد صحیح حضرت مہلب بن ابی صفرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، دشمن سے حفاظت انھوں نے فرمایا کہ مجھ سے ایسے شخص نے روایت کی کہ جس نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ (کسی جہاد کے موقع پر رات میں حفاظت کے لئے) فرما رہے تھے کہ اگر رات میں تم پر چھاپہ مارا جائے تو تم حِلْمَ لَا تُنْصَوُّوْنَ پڑھ لینا جس کا حائل لفظ حِلْم کے ساتھ یہ دُعا کرنا ہے کہ ہمارا دشمن کامیاب نہ ہو۔ اور بعض روایات میں حِلْمَ لَا تُنْصَوُّوْا بغیر نون کے آیا ہے جس کا حائل یہ ہے کہ جب تم حِلْم کہو گے تو دشمن کامیاب نہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حِلْم دشمن سے حفاظت کا قلعہ ہے۔ (ابن کثیر)

حضرت ثابت بنانی رحمہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کوفہ کے ایک عجیب واقعہ کے علاقہ میں تھا۔ میں ایک باغ کے اندر چلا گیا کہ دو رکعت پڑھ لوں۔ میں نے نماز سے پہلے لَحْمَ السَّمُوءِ کی آیتیں اَللّٰہِ الْمَہِیْمُوْیْ تک پڑھیں، اچانک دیکھا کہ ایک شخص میرے پیچھے ایک سفید خچر پر سوار کھڑا ہے جس کے بدن پر مینی کپڑے ہیں۔ اس شخص نے مجھ سے کہا کہ جب تم عَنَّا فِی الدُّنْیَا کہو تو اس کے ساتھ یہ دُعا کرو، یَا غَافِرُ الدُّنْیَا عِظْمَیْ یعنی اے گناہوں کے معاف کرنے والے مجھے معاف کر دے اور جب تم پڑھو قَابِلُ التَّوْبِ تو یہ دُعا کرو یَا قَابِلُ التَّوْبِ اَقْبِلْ تَوْبَتِیْ یعنی اے توبہ کے قبول کرنے والے میری توبہ قبول فرما پھر جب پڑھو شَدِیدُ الْعِقَابِ تو یہ دُعا کرو یَا شَدِیدُ الْعِقَابِ لَآ اَقْتَنِیْ یعنی اے سخت عقاب والے مجھے عذاب نہ دیجئے۔ اور جب ذِی الطَّلُوْیْ پڑھو تو یہ دُعا کرو یَا ذِی الطَّلُوْیْ مَحْلِیْ عَلَیَّ بِخَیْرِ یعنی اے انعام و احسان کرنے والے مجھ پر انعام فرما۔

ثابت بنانی رحمہ کہتے ہیں یہ نصیحت اس سے سننے کے بعد جو اُدھر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں اسکی تلاش میں باغ کے دروازے پر آیا۔ لوگوں سے پوچھا کہ ایک ایسا شخص مینی لباس میں یہاں سے گزرا ہے، سب نے کہا کہ ہم نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا۔ ثابت بنانی رحمہ کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ الیاس علیہ السلام تھے، دوسری روایت میں اس کا ذکر نہیں۔ (ابن کثیر)

ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کی سند سے نقل کیا ہے کہ ایک ان آیات کی تاثیر اصلاحِ خلق میں اور اہل شام میں سے بڑا بارعب قوی آدمی تھا اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ایک عظیم ہدایت مصلحین کے لئے کے پاس آیا کرتا تھا کچھ عرصہ تک وہ نہ آیا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے اس کا حال پوچھا۔ لوگوں نے کہا کہ امیر المؤمنین اس کا حال نہ پوچھئے وہ تو شراب میں پست رہنے لگا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے منشی کو بلایا اور کہا کہ یہ خط لکھو۔

منجانب عمر بن خطاب بنام فلاں بن فلاں - سلام علیک، اس کے بعد میں تمہارے لئے اُمس اللہ کی حمد پیش کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ گناہوں کو معاف کرنے والا، توبہ کو قبول

من عمر بن الخطاب الى فلان
بن فلان - سلام عليك، فاني احمد اليك
الله الذي لا اله الا هو غافر الذنب و
قابل التوب شديد العقاب ذي الطول

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ إِلَهُ الْمَصِيرُونَ

کہنے والا، سخت عذاب والا، بڑی قدرت والا ہے،
اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اُسی کی طرف لوٹ کر
جانا ہے۔

پھر حاضرین مجلس سے کہا کہ سب مل کر اس کے لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو پھیر دے،
اور اس کی توبہ قبول فرمائے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جس قاصد کے ہاتھ یہ خط بھیجا تھا اس کو ہدایت کر دی تھی
کہ یہ خط اس کو اس وقت تک نہ دے جب تک کہ وہ نشہ سے ہوش میں نہ آئے اور کسی دوسرے کے حوالے
نہ کرے۔ جب اس کے پاس حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ خط پہنچا اور اس نے پڑھا تو بار بار ان کلمات کو پڑھتا
اور غور کرتا رہا کہ اس میں مجھے ستر اسے ڈرایا بھی گیا ہے اور معاف کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ پھر رونے لگا
اور شراب خوری سے باز آگیا، تو ایسی توبہ کی کہ پھر اس کے پاس نہ گیا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جب اس اثر کی خبر ملی تو لوگوں سے فرمایا کہ ایسے معاملات میں تم سب کو ایسا
ہی کرنا چاہئے کہ جب کوئی بھائی کسی لغزش میں مبتلا ہو جائے تو اس کو درستی پر لانے کی فکر کرو اور اس کو
اللہ کی رحمت کا بھروسہ دلاؤ اور اللہ سے اس کے لئے دعا کرو کہ وہ توبہ کر لے۔ اور تم اس کے مقابلہ پر شیطان
کے مددگار نہ بنو۔ یعنی اس کو برا بھلا کہہ کر یا غصہ دلا کر اور دین سے دور کر دو گے تو یہ شیطان کی مدد ہوگی۔
(ابن کثیر رحمہ اللہ)

جو لوگ اصلاح خلق اور تبلیغ و دعوت کی خدمت انجام دینے والے ہیں ان کے لئے اس حکایت میں
تنبیہ ایک عظیم الشان ہدایت ہے کہ جس شخص کی اصلاح مقصود ہو اس کے لئے خود بھی دعا کرو پھر نرم تدابیر
سے اس کو درستی کی طرف لاؤ۔ اشتعال انگیزی نہ کرو کہ اس سے اس کو نفع نہیں پہنچے گا بلکہ شیطان کی امداد ہوگی
اور وہ اس کو اور زیادہ گمراہی میں مبتلا کر دے گا۔ (آگے آیت کی تفسیر دیکھئے)۔

حاصل۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے مگر ائمہ متقدمین کے نزدیک
یہ حمد و ثناء سب متشابہات میں سے ہیں جن کے معنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے یا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہے۔

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ - غَافِرِ الذَّنْبِ کے لفظی معنی ہیں گناہ پر پردہ ڈالنے والا، اور
قَابِلِ التَّوْبِ کے معنی توبہ قبول کرنے والا، یہ دو لفظ الگ الگ لئے گئے اگرچہ مفہوم دونوں کا تقریباً ایک
معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ غَافِرِ الذَّنْبِ میں اشارہ اس طرف کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس پر بھی
قدرت ہے کہ کسی بندے کا گناہ بغیر توبہ کے بھی معاف کر دے اور توبہ کرنے والوں کو معافی دینا دوسرا
وصف ہے۔ (مظہری)

ذِي الطَّلَوِ - طَلَوٌ کے لفظی معنی وسعت و غنا کے ہیں اور قدرت کے معنی میں بھی آتا ہے، فضل

واحسان کے معنی میں بھی۔ (منظہری)

مَا يَجَادِلُ فِي آيَاتِ اللَّهِ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ - اس آیت نے جدال فی القرآن کو کفر قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَجَادِلُوا فِي آيَاتِ اللَّهِ كَقَوْلِهِمْ كَفَرُوا بِبَعْضِ آيَاتِ اللَّهِ كَقَوْلِهِمْ كَفَرُوا بِبَعْضِ آيَاتِ اللَّهِ (رواہ البغوی و البیہقی فی الشعب عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ و رواہ ابو داؤد و الحاکم و صحیحہ و مظہری) اور حدیث میں ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شخصوں کی آواز سنی جو کسی آیت قرآن کے متعلق جھگڑ رہے تھے، آپ غضبناک ہو کر یا ہر تشریف لائے کہ آپ کے چہرہ میارک سے عفتہ کے آثار محسوس ہو رہے تھے اور فرمایا کہ تم سے پہلی اُنہیں اسی سے ہلاک ہوئیں کہ وہ اللہ کی کتاب میں جدال کرنے لگی تھیں (رواہ مسلم عن عبداللہ بن عمرو بن شعیب - مظہری)

یہ جدال جس کو قرآن و حدیث نے کفر قرار دیا اس سے مراد قرآنی آیات پر طعن کرنا اور فضول فہم کے شبہات نکال کر اس میں جھگڑا ڈالنا ہے یا کسی آیت قرآن کے ایسے معنی بیان کرنا جو دوسری آیات قرآن اور نصوص سنت کے خلاف ہوں جو تحریف قرآن کے درجہ میں ہے نہ کہ کسی مبہم یا مجمل کلام کی تحقیق یا مشکل کلام کا حل تلاش کرنا یا کسی آیت سے احکام و مسائل کے استنباط میں باہم بحث و تحقیق کرنا اس میں داخل نہیں بلکہ وہ تو بڑا ثواب ہے۔ (قاضی بیضاوی - قرطبی، مظہری)

وَلَا يَعْزُبُ عَنْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ - کفار قریش سرحدی میں مین کا اور گرمی میں ملک شام کا تجارتی سفر کرتے تھے اور حرم بیت اللہ کی خدمت کی وجہ سے ان کا سارے عرب میں احترام تھا۔ اس لئے اپنے سفروں میں محفوظ رہتے اور تجارتی منافع حاصل کرتے تھے۔ اسی سے ان کی مالداری اور ریاست قائم تھی اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے باوجود ان کی یہ صورت قائم رہنا ان کے لئے فخر و غرور کا سبب تھا کہ اگر ہم اللہ کے نزدیک مجرم ہوتے تو یہ نعمتیں سلب ہو جاتیں۔ اس سے کچھ مسلمانوں کو بھی شبہات پیدا ہونے کا امکان تھا، اس لئے اس آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و مصلحت سے ان کو یہ چند روزہ مہلت دے رکھی ہے، اس سے آپ یا مسلمان کسی دھوکہ میں نہ پڑیں۔ چند روزہ مہلت کے بعد ان پر عذاب آئے والا ہے اور یہ ریاست فنا ہو جائیگی جس کی ابتدا غزوہ بدر سے ہوئی اور فتح مکہ تک چھ سال کے اندر اس کا پوری طرح ظہور کیا۔

الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ - حاملان عرش فرشتے اب چار ہیں اور قیامت کے روز آٹھ ہو جائیں گے اور عرش کے گرد کھڑے فرشتے ہیں ان کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے۔ بعض روایات میں ان کی صفوں کی تعداد بتلائی ہے جو لاکھوں تک پہنچتی ہے، ان کو کہہ دینی کہا جاتا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے ہیں۔ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ یہ سب مقرب فرشتے مومنین کے لئے حضور مآجود ہوں سے نائب اور شریعت کے متبع ہو جائیں ان کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ یا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کام پر مامور فرمایا ہے یا ان کی فطرت و طبیعت ہی ایسی ہے کہ وہ اللہ کے نیک بندوں کیلئے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ اسی لئے حضرت مطرف بن عبداللہ بن شعیب نے فرمایا کہ اللہ کے بندوں میں میں نے خیر خواہ سے زیادہ اللہ کے فرشتے

ہیں۔ انکی دعائوں میں کے لئے ایک یہ ہوتی ہے کہ ان کی مغفرت فرما اور عذابِ جہنم سے بچا۔ اور ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں داخل فرما۔ اس کے ساتھ یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ وَمَنْ صَلَّاهُمْ اَبَائِهِمْ وَاَنْثَرَا جِهَنَّمَ وَذُرِّيَّاتِهِمْ۔ یعنی ان کے باپ دادوں اور ان کی بیویوں اور ان کی اولادوں میں سے جن میں صلاحیت مغفرت کی ہو یعنی جن کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہے ان کو بھی انہیں لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل فرما۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان تو شرطِ نجات ہے ایمان کے بعد دوسرے اعمالِ صالحہ ہیں۔ مسلمان کے متعلقین باپ دادے یا بیوی اور اولاد اگر اس کے درجہ سے نیچے بھی تو اللہ تعالیٰ ان کے اکرام میں کم درجہ کے متعلقین کو بھی جنت میں انہیں کے ساتھ کر دیں گے تاکہ ان کی غمخیزی و مسرت مکمل ہو جائے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ اَلْحَقُّنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ۔

حضرت سعید بن جبیرؓ نے فرمایا کہ مومن جب جنت میں جائے گا تو اپنے باپ، بیٹے، بھائی وغیرہ کو بوجھ لگا کر وہ کہاں ہیں اس کو بتلایا جائے گا کہ انھوں نے تمھارے جیسا عمل نہیں کیا (اس لئے وہ یہاں نہیں پہنچ سکے)۔ یہ کہنے لگا کہ میں نے جو عمل کیا تھا (وہ صرف اپنے لئے نہیں) بلکہ اپنے اور ان کے لئے کیا تھا تو حکم ہو گا ان کو بھی جنت میں داخل کر دو۔ (ابن کثیر)۔

تفسیر مظہری میں اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ موقوف بحکم مرفوع ہے اور اس بارے میں صریح ہے کہ صلاحیت جو اس آیت میں شرط قرار دی گئی ہے اس سے مراد نفس ایمان ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَيْسَادُونَ لِمَقَاتِ اللَّهِ أَكْبَرُ مِنْ

جو لوگ منکر ہیں ان کو پکار کر کہیں گے اللہ بڑا مہربان تھا زیادہ اس سے جو

مَقَاتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ إِذْ تُدْعَوْنَ إِلَى الْإِيمَانِ فَتَكْفُرُونَ ﴿١٠﴾

تم بیزار ہو اپنے جی سے جس وقت تم کو بلاتے تھے یقین لائیے کہ پھر تم سے کہہ دیتے تھے

قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا أَثْنَتَيْنِ وَأَخْيَرْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا

بولیں گے اے رب ہمارے تو موت دے چکا ہم کو دوبار اور زندگی دے چکا دوبار اب ہم قائل ہوئے

يَذُنُّونَا فَهَلْ إِلَى خُرُوجٍ مِّنْ سَبِيلٍ ۝۱۱ ذَلِكُمْ بِأَنَّهُ

ایسے گناہوں کے پھراب بھی ہے نکلنے کو کوئی راہ یہ کہ یہ اس واسطے ہے کہ

اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ لِحُكْمٍ مِّنْهُ فَعَلَى الْاُنثَىٰ كُفْرُكُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تَوْعْمٰنَا

جب پکارا کسی نے اللہ کو اکیلا، تو تم منکر ہوتے اور جب پکارتے اس کے ساتھ شریک کو تو

قَالَ حُكْمُ اللَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (١٢)

تم یقین لانے لگے اب حکم وہی جو کہی اللہ سب سے اوپر بڑا

خلاصہ تفسیر

جو لوگ کافر ہوئے (وہ جب دوزخ میں جا کر اپنے مشرک و کفر اختیار کرنے پر حسرت و افسوس کہیں گے اور خود ان کو اپنے سے سخت نفرت ہوگی یہاں تک غصہ کے مارے اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھا دیں گے۔ جیسا کہ درمنثور میں حضرت حسن سے روایت ہے۔ اس وقت) ان کو پکارا جاوے گا کہ جیسی تم کو (اس وقت) اپنے سے نفرت ہے، اس سے بڑھ کر خدا کو تم سے نفرت تھی جبکہ تم (دنیا میں) ایمان کی طرف بلائے جاتے تھے پھر (بلائے کے بعد) تم نہیں مانتا کرتے تھے (مقصود اس سے ان کی حسرت و ندامت میں اور زیادتی کرنا ہے) وہ لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم جو دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کیا کرتے تھے اب ہم کو اپنی غلطی معلوم ہو گئی۔ چنانچہ دیکھ لیا کہ آپ نے ہم کو دو مرتبہ مردہ رکھا (ایک مرتبہ پیدا نش سے پہلے کہ ہم بے جان مادہ کی صورت میں تھے اور دوسری مرتبہ اس عالم میں آنے اور زندہ ہونے کے بعد متعارف موت سے مردہ ہوئے) اور دو مرتبہ زندگی دی (ایک دنیا کی زندگی اور دوسری آخرت کی زندگی۔ یہ چار حالتیں ہیں جن میں سے انکار تو صرف ایک یعنی آخرت کی زندگی کا تھا مگر باقی تین حالتوں کا ذکر اس لئے کر دیا کہ وہ یقینی تھیں اور اس اقرار کا مقصد یہ تھا کہ اب چوتھی قسم بھی پہلی تین کی طرح یقینی ہو گئی) سو ہم اپنی خطاؤں کا (جن میں اصل مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا انکار تھا، باقی سب اسی کی فروع تھیں) اقرار کرتے ہیں تو کیا (یہاں سے) نکلنے کی کوئی صورت ہے (کہ دنیا میں پھر جا کر ان خطاؤں کا تدارک کر لیں۔ جواب میں ارشاد ہوگا کہ تمہارے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی بلکہ ہمیشہ یہیں رہنا ہوگا۔ اور) وجہ اس کی یہ ہے کہ جب صرف اللہ کا نام لیا جاتا تھا (یعنی توحید کا ذکر ہوتا تھا) تو تم انکار کیا کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے اس لئے فیصلہ اللہ کا (کیا ہوا) ہے جو عالیشان (اور) بڑے مرتبہ والا ہے (یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ کے علو و کبریا کے اعتبار سے یہ جرم عظیم تھا اس لئے فیصلہ میں سزا بھی عظیم ہوئی یعنی دائمی جہنم)۔

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ رِزْقًا

وہی ہے تم کو دکھاتا اپنی نشانیاں اور اتارتا ہے تمہارے واسطے آسمان سے روزی

وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَنْ يُنِيبُ ۝۱۳ فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ

اور سوج رہی کرے جو رجوع رہتا ہو سو پکارو اللہ کو خالص کر کے اسکے واسطے

الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝۱۴ رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو

بندگی اور بڑے درجوں والا بلند ہے وہی ہے اونچے درجوں والا مالک

الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ

عرش کا اتارتا ہے بھید کی بات اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے

لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۝۱۵ يَوْمَ هُمْ بِلُزُومٍ لَا يَخْفَى

تاکہ وہ ڈرائے ملاقات کے دن سے جس دن وہ لوگ بھل کھڑے ہونگے چھپی نہ رہے گی

عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ط لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ

الْقَدِيرِ ان کی کوئی چیز کس کا راج ہے اُس دن اللہ کا ہے جو اکیلا ہے

الْقَهَّارِ ۝۱۶ الْيَوْمَ تُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ط لَا ظَلَمَ

دباؤ والا آج بدل ملے گا ہر جی کو جیسا اس نے کیا یا بالکل ظلم

الْيَوْمَ ط إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝۱۷ وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ

نہیں آج بیشک اللہ جلد لینے والا ہے حساب اور خبر سنارے ان کو کہ اُس نزدیکی

الْآزِفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَظِيمِينَ ط مَا لِلظَّالِمِينَ

آنے والے دن کی جس وقت دل پہنچیں گے گلوں کو تو وہ دُبا رہے ہوں گے کوئی نہیں گناہگاروں کا

مِنْ حَاسِبٍ وَلَا شَفِيعٌ يُطَاعُ ۝۱۸ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ

دوست اور نہ سفارشی کہ جسکی بات مانی جائے وہ جانتا ہے چوری کی نگاہ

وَمَا تَخْنِي الصُّدُورُ ۝۱۹ وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ ط وَالَّذِينَ

اور جو کچھ چھپا ہوا ہے سینوں میں اور اللہ فیصلہ کرتا ہے انصاف سے اور جن کو

يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَقْضُونَ بِشَيْءٍ ط إِنَّ اللَّهَ هُوَ

پکارتے ہیں اُس کے سوائے نہیں فیصلہ کرتے کچھ بھی بے شک اللہ جو ہے

السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝۲۰ أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا

وہی ہے سنے والا دیکھنے والا کیا وہ پھرے نہیں ملک میں کہ دیکھتے

کَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِنْ قَبْلِهِمْ ط كَانُوا

انجام کیسا ہوا ان کا جو تھے ان سے پہلے وہ تھے

هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ط وَأَثَارًا فِي الْأَرْضِ ط فَآخَذَهُمُ اللَّهُ

ان سے سخت زور میں اور نشانیوں میں جو چھوڑ گئے زمین میں پھر ان کو پکڑا اللہ نے

بِذُنُوبِهِمْ ط وَمَا كَانَ لَهُمُ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ ۝۱۱ ذٰلِكَ

اُن کے گناہوں پر اور نہ ہوا ان کو اللہ سے کوئی بچانے والا یہ اس لئے کہ

بِأَنَّهُمْ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا

ان کے پاس آتے تھے ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر پھر منکر ہو گئے

فَآخَذَهُمُ اللَّهُ ط إِنَّهُ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝۱۲

تو ان کو پکڑا اللہ نے بیشک وہ زور آور ہے سخت عذاب دینے والا

خُلاصۂ تفسیر

وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں (قدرت کی) دکھاتا ہے (تاکہ تم ان سے توحید پر استدلال کرو) اور (وہی ہے جو) آسمان سے تمہارے لئے رزق بھیجتا ہے (یعنی بارش بھیجتا ہے جس سے رزق پیدا ہوتا ہے) یہ بھی (نجلہ مذکورہ نشانیوں کے ہے) اور (ان نشانیوں سے) صرف وہی شخص نصیحت قبول کرتا ہے، جو (خدا کی) طرف رجوع (کرنے کا ارادہ) کرتا ہے (کیونکہ ارادہ رجوع سے خود تامل نصیب ہوتا ہے) اس سے حق تک رسائی ہو جاتی ہے) تو (جب توحید پر دلائل قائم ہیں تو) تم لوگ خدا کو خالص اعتقاد کر کے (یعنی توحید کے ساتھ) پکارو (اور مسلمان ہو جاؤ) گو کافروں کو ناگوار ہو (اس کی پروا نہ کرو کیونکہ) وہ رفیع الدرجات ہے، وہ عرش کا مالک ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے وحی یعنی اپنا حکم بھیجتا ہے تاکہ وہ (صاحب وحی لوگوں کو) اجتماع کے دن (یعنی قیامت کے دن) سے ڈرائے جس دن سب لوگ (خدا کے) سامنے موجود ہوں گے (کہ) اُن کی بات خدا سے مخفی نہ رہے گی آج کے روز کس کی حکومت ہوگی، بس اللہ ہی کی ہوگی جو مکیا (اور) غالب ہے آج ہر شخص کو اُس کے کئے (ہوئے کاموں) کا بدلہ دیا جاوے گا، آج (کسی پر) کچھ ظلم نہ ہوگا اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے اور (اس لئے) آپ ایک قریب آنے والی مصیبت کے دن (یعنی روز قیامت) سے ڈرائے جس وقت کیلجے منہ کو آجاویں گے (غم سے) گھٹ گھٹ جاوینگے (اس روز) ظالموں (یعنی کافروں) کا نہ کوئی بولی دوست اور نہ کوئی سفارشچی ہوگا جس کا کہا مانا جائے (اور) وہ (ایسا ہے کہ) آنکھوں کی چوری کو جانتا ہے اور اُن (باتوں) کو بھی جو

سینوں میں پوشیدہ ہیں (جن کو دوسرا نہیں جانتا۔ مطلب یہ کہ وہ بندوں کے تمام کھلے اور چھپے اعمال سے یا خبر ہے جن پر سزا اور جزا موقوف ہے) اور اللہ تعالیٰ ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارا کرتے ہیں وہ کسی طرح کا بھی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ (کیونکہ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے۔) اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام صفات کمال سے موصوف اور جھوٹے معبود سب سے عاری ہیں اس لئے فیصلہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی کے بس میں نہیں۔ اور یہ لوگ جو ان واضح دلائل کے بعد بھی انکار کرتے ہیں تو کیا ان لوگوں کو ملک میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (اس کفر کی وجہ سے) ان کا کیسا انجام ہوا۔ وہ لوگ قوت اور ان نشانوں میں جو زمین پر چھوڑ گئے ہیں (مثل عمارات و باغات وغیرہ کے) ان (موجودین) سے بہت زیادہ تھے سو ان کے گناہوں کی وجہ سے خدا نے ان پر دار و گیر فرمائی (یعنی عذاب نازل کیا) اور ان کا کوئی خدا سے بچانے والا نہ ہوا (آگے ان کے گناہوں کی تفصیل ہے کہ) یہ مواخذہ اس سبب سے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول و واضح دلیلیں (یعنی معجزات جو دلائل نبوت ہوتے ہیں) لیکر آتے رہے پھر انھوں نے نہ مانا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر مواخذہ فرمایا بے شک وہ بڑی قوت والا سخت سزا دیئے والا ہے (جب ان موجودہ کافروں میں بھی وہی موجبات عذاب جمع ہیں تو یہ مواخذہ سے کیسے بچ سکتے ہیں۔)

معارف و مسائل

سَرَفِیْعُ الدَّرَجَاتِ - درجات سے مراد بعض حضرات نے صفات قرار دیا ہے جس سے رفیع الدرجات کے معنی ہوئے، رفیع الصفات یعنی اس کی صفات کمال سب سے زیادہ رفیع الشان ہیں۔ ابن کثیر نے اسکو اپنے ظاہر پر رکھ کر یہ معنی بیان کئے کہ اس سے مراد رفعت عرش عظیم کا بیان ہے کہ وہ تمام زمینوں اور آسمانوں پر حاوی اور سب کے اوپر بمنزلہ چھت کے بلند ہے۔ جیسا کہ سورہ معارج کی آیت میں ہے مِنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِ تَخْرُجُ الْمَلَائِکَۃُ وَالرُّوْحُ اَیُّہُ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مَقْدَرًا لِّخَمْسِ سِجِّیْنَ اَلْفِ سَنَۃٍ ۝ ابن کثیر کی تحقیق اس آیت کے متعلق یہ بھی ہے کہ یہ پچاس ہزار سال کی مقدار اس مسافت کا بیان ہے جو ساتویں زمین سے عرش تک ہے اور اسی کو سلف و خلف کی بڑی جماعت کے نزدیک راجع قرار دیا ہے۔ اور بیان کیا ہے کہ بہت سے علماء کے نزدیک عرش رحمن ایک قوت مرفع سے بنا ہے جس کا قطر اتنا بڑا ہے کہ وہ پچاس ہزار سال کی مسافت ہے۔ اسی طرح اس کا ارتفاع ساتویں زمین سے پچاس ہزار سال کی مسافت تک ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ سَرَفِیْعُ الدَّرَجَاتِ بمعنی سَرَفِیْعُ الدَّرَجَاتِ ہے یعنی اللہ تعالیٰ مومنین متقیین کے درجات کو بلند فرمانے والا ہے جیسا کہ قرآن کی آیات اس پر شاہد ہیں تَسَارَفَ دَرَجَاتٍ مِّنْ نَّشَآءٍ ۚ اَوْ هُمْ وَرَثَاتُہٗ عِندَ اللّٰهِ ۝

يَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ - بَارِزُونَ سے مراد یہ ہے کہ میدانِ حشر کی زمین چونکہ ایک سطحِ مستوی بنا دی جائے گی جس میں کوئی پہاڑ یا غار یا عمارت اور درخت نہ ہوگا، جسکی آڑ ہو سکے اس لئے سب کھلے میدان میں سامنے ہوں گے۔

لَمِنَ الْمُلْكِ الْيَوْمَ - یہ کلمہ آیات مذکورہ میں یَوْمَ التَّلَاقِ اور يَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ کے بعد آیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یَوْمَ التَّلَاقِ ملاقات و اجتماع کا دن نفخہ ثانیہ کے بعد ہوگا اسی طرح یَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ کا واقعہ بھی اس وقت ہوگا جب نفخہ ثانیہ کے بعد نئی زمین ایک سطحِ مستوی کی صورت پر بنا دی جائے گی، جس پر کوئی آڑ پہاڑ نہ ہوگا۔ اس کے بعد یہ کلمہ لَمِنَ الْمُلْكِ لائے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد نفخہ ثانیہ سے تمام خلائق کے دوبارہ پیدا ہونے کے بعد ہوگا۔ اس کی تائید قرطبی نے بحوالہ خمس ایک حدیث پیش کی ہے جو ابوالوائل نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے، وہ یہ کہ تمام آدمی ایک صاف زمین پر جمع کئے جائیں گے جس پر کسی نے کوئی گناہ نہیں کیا ہوگا۔ اس وقت ایک منادی کہے گا کہ تم لوگو جو یہ ندا کرے گا لَمِنَ الْمُلْكِ الْيَوْمَ یعنی آج کے دن ملائکہ اس کا ہے۔ اس پر تمام مخلوقات مؤمنین و کافریں یہ جواب دیں گے کہ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ مؤمن تو اپنے اعتقاد کے مطابق خوشی و تلذذ کی صورت میں کہیں گے اور کافر مجبور و عاجز ہونے کی بنا پر رنج و غم کے ساتھ اس کا اقرار کریں گے۔

لیکن دوسری بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارشاد حق تعالیٰ خود ہی اس وقت فرمائیں گے جبکہ انجیل اولیٰ کے بعد ساری مخلوقات فنا ہو جائیں گی اور پھر مخصوص مقرب فرشتوں - جبریلؑ - میکائیلؑ - اسرافیلؑ اور ملک الموتؑ کو بھی موت آجائیگی۔ اور سوائے ذات حق سبحانہ و تعالیٰ کے کوئی نہ ہوگا اس وقت حق تعالیٰ فرمائے گا لَمِنَ الْمُلْكِ الْيَوْمَ۔ اور چونکہ اس وقت جواب دینے والا کوئی نہ ہوگا تو خود ہی جواب دیں گے لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس میں سوال کرنے والا اور جواب دینے والا صرف ایک اللہ ہی ہے۔ محمد بن کعب قرظیؒ کا بھی یہی قول ہے اور اس کی تائید حضرت ابوہریرہؓ اور ابن عمرؓ کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ساری زمینوں کو بائیں ہاتھ میں اور آسمانوں کو دایرے ہاتھ میں لپیٹ کر فرمائیں گے۔ اِنَّا الْمَلِكُ اَيُّنَ الْجَبَابِرَتِ اَيُّنَ الْمُتَكَبِّرِينَ - یعنی میں ہی ملک اور مالک ہوں آج جبارین اور متکبرین کہاں ہیں۔ تفسیر درمنثور میں اس طرح کی دونوں روایتیں نقل کر کے کہا گیا ہے کہ یہ کلمہ دو مرتبہ دہرایا جائے ایک نفخہ اولیٰ اور فناء عالم کے وقت دوسرا نفخہ ثانیہ اور تمام خلائق کے دوبارہ زندہ ہونے کے وقت۔ بیان القرآن میں فرمایا کہ قرآن کریم کی تفسیر اس پر موقوف نہیں کہ دوسری مرتبہ قرار دیا جائے بلکہ ہو سکتا ہے کہ آیات مذکورہ میں اس واقعہ کا ذکر ہو جو نفخہ اولیٰ کے بعد ہوا تھا۔ اس کو اس وقت حاضر فرما کر کہے یہ کلمہ فرمایا گیا ہو۔ واللہ اعلم

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ - (یعنی الایمن الخائنة) خیانتِ نظر سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص لوگوں سے چرا کر ایسی چیز پر نظر ڈالے جو اس کے لئے حرام اور ناجائز ہو، جیسے کسی غیر محرم پر شہوت سے نظر کرے، اور جب کسی کو دیکھے تو نظر ہٹالے یا اس طرح نظر ڈالے کہ جس کو دیکھنے والے محسوس نہ کریں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ سب چیزیں ظاہر ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ۖ (۲۳) اِلٰى

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیاں دیکر اور کھلی سند

فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُونَ فَقَالُوا سِحْرٌ كَذَّابٌ ۖ (۲۴)

فرعون اور ہامان اور قارون کے پاس پھر کہنے لگے یہ جادو گر ہے جھوٹا

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَاءَ

پھر جب پہنچا ان کے پاس لے کر سچی بات ہمارے پاس سے بولے مار ڈالو بیٹے ان کے

الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ ط وَمَا كَيْدُ

جو یقین لائے ہیں اس کے ساتھ اور جیتی رکھو ان کی عورتیں اور جو داؤد ہے

الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِي ضَلٰلٍ ۖ (۲۵) وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِيْ

منکروں کا سو غلطی میں اور بولا فرعون مجھ کو چھوڑو

اَقْتُلْ مُوسٰى وَلْيَدْعُ رَبِّهٖ ۚ اِنِّىْۤ اَخَافُ اَنْ يُبَدِّلَ دِيْنَكُمْ

کہ مار ڈالوں موسیٰ کو اور پڑھائے اپنے رب کو میں ڈرتا ہوں کہ بگاڑ دے تمہارا دین

اَوْ اَنْ يُظْهِرَ فِى الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۖ (۲۶) وَقَالَ مُوسٰى اِنِّىْ

یا بھیلانے ملک میں خرابی اور کہا موسیٰ نے میں

عَدْتُ بِرَبِّىْ وَرَبِّكُمْ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ

پناہ لے چکا ہوں اپنے اور تمہارے رب کی ہر غرور والے سے جو یقین نہ کرے حساب

الْحِسَابِ ۖ (۲۷) وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ

کے دن کا اور بولا ایک مرد ایمان دار فرعون کے لوگوں میں جو چھپاتا تھا

اِيْمَانَهُ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَقُوْلَ رَبِّىَ اللّٰهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ

اپنا ایمان کیا مائے ڈالتے ہو ایک مرد کو اس بات پر کہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے اور لایا تمہارے پاس کھلی

يَا بَلِيَّتٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَإِن يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ وَإِن

نشانیاں تمہارے رب کی اور اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس پر پڑے گا اس کا جھوٹ اور اگر

يَكُ صَادِقًا يُصِيبُكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ اللَّهَ

وہ سچا ہوگا تو تم پر پڑے گا کوئی نہ کوئی وعدہ جو تم سے کرتا ہے بے شک اللہ راہ

لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝۲۸ يَقَوْمٍ لَّكُمْ الْمُلْكُ

نہیں دیتا اس کو جو بے لحاظ جھوٹا اے میری قوم آج تمہارا

الْيَوْمَ ظَهَرْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنْ بَأْسِ

راج ہے جو ظہور ہے ہو ملک میں پھر کون مدد کرے گا ہماری اللہ کی

اللَّهِ إِنَّ جَاءَنَا قَالِ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَسْرَى

آفت سے اگر آگئی ہم پر بولا فرعون میں تو وہی بات سمجھاتا ہوں تم کو

وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ ۝۲۹ وَقَالَ الَّذِي آمَنَ

جو سوچھی سمجھ کو اور وہی راہ بتلاتا ہوں جس میں بھلائی ہے اور کہا اسی ایماندار نے

لَيَقَوْمٍ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ ۝۳۰

اے قوم میری میں درتا ہوں کہ آئے تم پر دن اگلے لشروں کا سا

مِثْلَ دَايٍ قَوْمِ تَوْحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ

جیسے حال ہوا قوم توح کا اور عاد اور ثمود کا اور جو لوگ ان کے پیچھے ہوئے

وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝۳۱ وَلَيَقَوْمٍ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ

اور اللہ بے انصافی نہیں چاہتا بندوں پر اور اے قوم میری میں درتا ہوں کہ تم پر آئے

يَوْمَ التَّنَادِ ۝۳۲ يَوْمَ تَوَلَّوْنَ مُدُبِرِينَ ۝۳۳ مَا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ

دن ہانک پکار کا جس دن بھاگو گے پیٹھ پھیر کر کوئی نہیں تم کو اللہ سے

مِنْ عَاصِمٍ ۝۳۴ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝۳۵

سجائے والا اور جس کو غلطی میں ڈالے اللہ تو کوئی نہیں اس کو سمجھائے والا

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي

اور تمہارے پاس آچکا ہے یوسف اس سے پہلے کھلی باتیں لے کر پھر تم رہے دھوکے ہی

شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُمْ بِهِ ۝۳۶ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلُوبُكُمْ لَنْ يَبْعَثَ

میں ان چیزوں سے جو وہ تمہارے پاس لیکر آیا یہاں تک کہ جب مر گیا لگے کہنے ہرگز نہ بھجے گا

اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ

اللہ اس کے بعد کوئی رسول اسی طرح بھٹکاتا ہے اللہ اس کو جو بہت بے باک

مُتْرَابٌ ۳۴) الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ

شک کر لے ڈالا وہ جو کہ جھگڑاتے ہیں اللہ کی باتوں میں بغیر کسی سند کے

أَتَهُمْ طُغْيَانٌ كَبِيرٌ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا ط كَذَلِكَ

جو پہنچی ہوا ان کو بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں اور ایمانداروں کے یہاں اسی طرح

يُطَبِّعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبٍ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٌ ۳۵) وَقَالَ فِرْعَوْنُ

تہر کر دیتا ہے اللہ ہر دل پر افسردہ والے سرکش کے اور بولا فرعون

يَهَامِلُنِ ابْنِ لِي صِرَ حَالًا عَلَىٰ أَبْلَغِ الْأَسْيَابِ ۳۶) أَسْيَابٌ

کڑے ہامان بنامیرے واسطے ایک اونچا محل شاید میں جا پہنچوں رستوں میں رستوں میں

السَّمَوَاتِ فَأَطَّلِعَ إِلَىٰ إِلَهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا وَ

آسمانوں کے پھر جھانک کر دیکھوں موسیٰ کے معبود کو اور میری اُنکھ میں تو وہ جھوٹا ہے اور

كَذَلِكَ نُرِيَنَّ لِفِرْعَوْنَ سُوءَ عَذَابِهِ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيلِ ط

اسی طرح بھلے دکھلا دیئے فرعون کو اس کے بُرے کام اور روک دیا گیا سیدھی راہ سے

وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا فِي تَبَابٍ ۳۷) وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَوْمَ

اور جو دانا تھا فرعون کا سوتاہ ہونے کے واسطے اور کہا اسی ایماندار نے اے قوم

اتَّبِعُونِ أَهْدِيكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ ۳۸) يَوْمَ إِنَّمَا هُذِنَ

راہ چلو میری پہنچا دوں تم کو نیکی کی راہ میری قوم یہ جو زندگی ہے

الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ زَوَّارِنَا الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۳۹)

دنیا کی سو کچھ بھرت لینا ہے اور وہ گھر جو بچھلا ہے وہی ہے ہم کو رہنے کا گھر

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ

جس نے کیا ہے برائی تو وہی بدلہ پائے گا اسکی برابر اور جس نے کیا ہے

صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ

بھلائی مرد ہو یا عورت اور وہ یقین رکھتا ہو مردہ لوگ ہائیں گے

الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۴۰) وَلَيَقْوِمَنَّ إِلَىٰ

بہشت میں روزی پائیں گے وہاں بے شمار اور اے قوم مجھ کو

ادْعُوكُمْ إِلَى النَّجْوَىٰ وَتَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ ۖ تَدْعُونَنِي

کیا ہوا ہے بلاتاہوں تم کو نجات کی طرف اور تم بلا تے ہو مجھ کو آگ کی طرف تم بلا تے ہو مجھ کو

لَا كُفْرًا بِاللَّهِ وَأُشْرًا بِبِهِ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَأَنَا أَدْعُوكُمْ

کہ منکر ہوں خدا سے اور شریک مقرر اؤں اس کا اس کو جس کی مجھ کو خبر نہیں اور میں بلاتا ہوں تم کو

إِلَى الْعَزِيزِ الْغَفَّارِ ۖ لَا جَرَمَ أَنَا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ لَيْسَ لَهُ

اس زبردست گناہ بخشے والے کی طرف آپ ہی ظاہر ہے کہ جس کی طرف تم مجھ کو بلا تے ہو اس کا بلاوا

دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَنْ مَّرَدَّنَا إِلَى اللَّهِ

کہیں نہیں دنیا میں اور نہ آخرت میں اور یہ کہ ہم کو پھر جانا ہے اللہ کے پاس

وَأَنْ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ فَسْتَدْكُرُونَ

اور یہ کہ زیادتی والے وہی ہیں دوزخ کے لوگ سو آگے یاد کرو گے

مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ

جو میں کہتا ہوں تم کو اور میں سونپتا ہوں اپنا کام اللہ کو بے شک اللہ کی

يَصِيرُ بِالْعِبَادِ ۖ فَوَقَاهُ اللَّهُ سَيِّئَاتِ مَا مَكَرُوا وَخَاقَ

نگاہ میں میں سب بندے پھر بچا لیا موسیٰ کو اللہ نے بڑے داؤ سے جو وہ کرتے تھے اور الٹ پڑا

يَا لِفِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ۖ النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا

فرعون والوں پر برسی طرح کا عذاب وہ آگ ہے کہ دکھلا دیتے ہیں ان کو

عَذَابًا وَخَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ ۖ أَدْخِلُوا آلَ

صبح اور شام اور جس دن قائم ہوگی قیامت حکم ہوگا داخل کرو

فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ۖ

فرعون والوں کو سخت سے سخت عذاب میں

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے احکام اور کھلی دلیل (یعنی معجزہ) دیکر فرعون اور ہامان اور قارون کے پاس بھیجا تو ان لوگوں (میں سے بعض نے یا کل) نے کہا کہ (نعوذ باللہ) یہ جادوگر (اور) جھوٹا ہے اجادوگر معجزہ میں کہا اور کذاب دعویٰ نبوت و احکام میں کہا۔ یہ قول فرعون، ہامان اور قارون

تین کی طرف منسوب کیا گیا ہے مگر قارون چونکہ بنی اسرائیل میں سے تھا اور بظاہر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا اس کا ان کو ساحر کہنا بظاہر مستبعد ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ اس وقت بھی منافق ہو موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر میں ایمان کا دعویٰ کرتا ہو حقیقتہً نہ ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قول صرف فرعون و ہامان کا ہو۔ تغلیباً تینوں کی طرف نسبت کر دی گئی ہو، پھر اس کے بعد جب وہ (عام) لوگوں کے پاس دین حق جو ہماری طرف سے تھا لیکر آئے (جس پر بعض لوگ مسلمان بھی ہو گئے) تو ان (مذکورہ) لوگوں نے (بطور مشورہ کے) کہا کہ جو لوگ ان کے ساتھ (ہو کر) ایمان لے آئے ہیں ان کے بیٹوں کو قتل کر ڈالو (تاکہ ان کی جمعیت اور قوت نہ بڑھ جائے جس سے اندیشہ زوال سلطنت کا ہے) اور (چونکہ عورتوں سے ایسا اندیشہ نہیں و نیز ہمارے گھروں میں خدمتگاری کے لئے ان کی ضرورت ہے اس لئے) ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دو (غرض انھوں نے موسیٰ) کے غلیہ کا خطرہ محسوس کر کے انسداد کی یہ تدبیر کی) اور ان کافروں کی تدبیر محض بے اثر رہی (چنانچہ آخر میں موسیٰ علیہ السلام غالب آئے۔ بنی اسرائیل کے نوزائیدہ لڑکوں کے قتل کا حکم ایک تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے دیا گیا تھا جس کے نتیجہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈالنے کی نوبت آئی اور قدرت نے اس بچہ کو خود فرعون کے گھر میں پلویا یا۔ یہ دوسرا فیصلہ ان کے لڑکوں کو قتل کرنے کا موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور نبوت کے بعد اس وقت کا ہے جبکہ ان کے معجزات دیکھ کر آل فرعون نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ ان کا جوتھا بڑھ گیا تو ہماری سلطنت کی خیر نہیں۔ پھر یہ کسی روایت میں نظر سے نہیں گزرا کہ اس وقت یہ قتل غلمان کا قانون نافذ ہوا یا نہیں۔ پھر اس کے بعد خود موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے بارے میں گفتگو ہوئی) اور فرعون نے (اہل دربار سے) کہا کہ مجھ کو چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کر ڈالوں اور اس کو چاہیے کہ اپنے رب کے (مدد کے لئے) پکارے۔ مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ (کہیں) تمہارا دین (نہ) بدل ڈالے یا ملک میں کوئی فساد (نہ) پھیلادے (کہ ایک ضرر دین کا ہے اور دوسرا ضرر دنیا کا۔ اور فرعون کا یہ کہنا کہ مجھ کو چھوڑ دو، یا تو اس وجہ سے ہے کہ اہل دربار نے شاید اس لئے قتل کی رائے نہ دی ہوگی کہ اس کو مصلحت ملے گی کے خلاف سمجھا ہو گا کہ عام چرچا ہو گا کہ ایک بے سرو سامان شخص سے ڈر گئے اور یا یہ کہنا بطور تمویہ کے ہے کہ عام سننے والے یہ سمجھیں کہ اب تک ان کے قتل میں تاخیر مشیروں کے روکنے کے سبب سے ہوئی، گو واقع میں قتل پر خود اس کو جرأت نہ تھی۔ کیونکہ دل میں تو معجزات سے یقین ہو ہی گیا تھا۔ اس لئے اس کو خطرہ تھا کہ ان کو قتل کیا تو کسی آسمانی عذاب و بلا میں مبتلا ہو جاؤں گا مگر اپنے خوف کو درباریوں کے سر ڈالنے کے لئے ایسا کہا۔ اور اسی طرح وَلَیْدٌ مُّزَبَّیًّہً کہنا بھی لوگوں پر اپنی بہادری جملانے کے لئے ہو گا، اگرچہ دل اندر سے تھرا رہا ہو) اور موسیٰ علیہ السلام نے جو یہ بات مٹنی خواہ بالمشافہ سنی ہو یا بالواسطہ تو انھوں نے کہا میں اپنے اور تمہارے (یعنی سب کے) پروردگار کی پناہ لیتا ہوں ہر خرم دماغ شخص

(کے مشر) سے جو روز حساب پر یقین نہیں رکھتا (اور اس لئے حق کا مقابلہ کرتا ہے) اور (اُمس مجلس مشورہ میں) ایک مؤمن شخص نے جو کہ فرعون کے خاندان میں سے تھے (اور اب تک) اپنا ایمان پوشیدہ رکھتے تھے (یہ مشورہ مٹن کہ لوگوں سے) کہا کیا تم ایک شخص کو (محض) اس بات پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے، حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے اس دعوے پر (دلیلیں بھی) لیکر آیا ہے (یعنی معجزات بھی دکھلاتا ہے جو دلیل ہے صدق دعوی نبوت کی اور دلیل موجود ہوتے ہوئے صاحب دلیل کی مخالفت کرنا اور مخالفت بھی اس درجہ کی کہ قتل کا قصد کیا جاوے نہایت نازیبا ہے) اور اگر (بالفرض) وہ جھوٹا ہی ہو تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا (اور آپ ہی اللہ کی طرف سے رسوا ہو جائے گا۔ قتل کرنے کی کیا ضرورت) اور اگر وہ سچا ہو تو وہ جو کچھ پیشین گوئی کر رہا ہے (کہ ایمان نہ لانے کی صورت میں ایسا ایسا عذاب ہوگا) اس میں کچھ تو تم پر (ضروری) پڑے گا (تو اس صورت میں قتل کرنے سے اور زیادہ بلا اپنے سر پر لینا ہے۔ غرض اس کے کذب کی صورت میں قتل فضول اور صدق کی صورت میں مضر ہے پھر ایسا فعل کیوں کیا جاوے اور قاعدہ کلیہ ہے کہ) بے شک اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو مقصود تک نہیں پہنچاتا جو اپنی حد سے گذر جائے والا (اور) بہت جھوٹ بولنے والا ہو (یعنی برائے چند سے اس کی بات چل جاوے تو ممکن ہے مگر انجام کا اس کی ناکامی یقینی ہے۔ پس اس قاعدہ کلیہ کے اعتبار سے اگر موسیٰ علیہ السلام بالفرض کاذب ہوں تو وجہ اس کے کہ جھوٹا دعویٰ نبوت کا بہت بڑا گناہ ہے اور سخت جرأت ہے، ایسے کاذب مفری کو بھی اگر مقہور و ہلاک نہ کیا جاوے تو مخلوق کو خود شبہ اور التباس میں مبتلا کرنا لازم آتا ہے۔ اور یہ عقلاً حق تعالیٰ اسے نہیں ہو سکتا اس لئے ضروری ہے کہ یہ مغلوب و رسوا ہوں گے، پھر حاجت قتل کیا ہے؟ اور اگر صادق ہیں تو تم لوگ بالیقین کاذب ہو اور کذب میں مسرف بھی ہو کہ فرعون کی خدائی کے دعویدار ہو اور مسرف کذاب کو کامیابی ہوئی نہیں۔ پس تم لوگ قتل میں کامیاب نہ ہو گے یا تو قدرت نہ ہوگی یا اس کا اخیر نتیجہ میرا ہوگا۔ بہر حال دونوں مشقوں کا مقصد ہی ہو کہ ان کو قتل نہ کیا جاوے اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ کبھی کسی مفسد کو قتل نہ کیا جاوے۔ جواب یہ ہے کہ یہ تقریر اس صورت میں جہاں کاذب ہونے یا صادق ہونے میں شبہ اور معجزات سے اقل درجہ احتمال صدق ضرور تھا اور جہاں دلائل قطعیہ سے کذب متیقن ہو وہاں ایسا نہیں ہوگا۔ اور گو اس مؤمن کو موسیٰ علیہ السلام کے صدق کا پورا یقین تھا مگر اس طرز سے گفتگو کرنا لوگوں کی طبیعت کی رعایت سے تھا کہ وہ کچھ غور کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ آگے بھی اسی قتل سے روکنے کے متعلق مضمون ہے کہ) اے میرے بھائیو! آج تو تمہاری سلطنت ہے کہ اس سرزمین میں تم حاکم ہو سو خدا کے عذاب میں ہماری کون مدد کرے گا اگر (ان کے قتل کرنے سے) وہ ہم پر آ پڑا (جیسا کہ ان کے سچے ہونے کی صورت میں

اس کا احتمال ہے) فرعون نے آیہ تقریر میں (کہا کہ میں تو تم کو وہی رائے دوں گا جو خود سمجھ رہا ہوں) کہ ان کا قتل ہی مناسب ہے) اور میں تم کو عین طریق مصلحت بتلاتا ہوں اور اس مؤمن نے (جب دیکھا کہ نصیحت میں نرمی اور رعایت خیال مخاطب سے کام نہیں چلتا تو آب تہدید و تحذیف سے کام لیا اور) کہا صاحبو مجھے تمہاری نسبت دوسری امتوں کے سے روز بد کا اندیشہ ہے، جیسا کہ قوم نوح اور عاد اور ثمود اور بعد والوں (یعنی قوم لوط وغیرہ) کا حال ہوا تھا اور خدا تعالیٰ تو بندوں پر کسی طرح کا ظلم کرنا نہیں چاہتا (لیکن جب تم حکمتیں ہی ایسی کرو گے تو ضرور ہی اپنی سزا کو پہنچو گے) اور (یہ ڈرانا تھا عذاب دنیا سے آگے تہدید ہے عذاب آخرت سے کہ) صاحبو مجھ کو تمہاری نسبت اس دن کا اندیشہ ہے جس میں کثرت سے ندا میں ہوں گی (یعنی وہ دن مشتمل ہے، واقعات عظیمہ پر کیونکہ نداؤں کی کثرت یعنی ایک دوسرے کو آواز دنیا واقعات کے عظیم ہونے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ سب سے اول آواز صور بھونکنے کی ہوگی جس سے مردے زندہ ہوں گے۔ قال تعالیٰ یَوْمَ نُنَادِ الْمُتَّادِمِينَ مَكَانٍ قَرِيبٍ یَوْمَ یَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ۔ ایک ندا حساب کے لئے ہوگی۔ قال تعالیٰ یَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ اُنَاسٍ بِمَا مَهِمُ ایک تنادی یعنی ایک دوسرے کو ندا کرنا باہم اہل جنت و اہل نار میں ہوگا۔ قال تعالیٰ فی الْاَعْرَافِ وَنَادٰی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ الْخ۔ وَنَادٰی اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ الْخ۔ وَنَادٰی اَصْحٰبُ النَّارِ الْخ۔ ایک ندا راخیر میں موت کو بشکل دُنیہ ذبح کرنے کے وقت ہوگی جیسا حدیث میں ہے۔ یا اہل الجنة خلود لا موت یا اہل النار خلود لا موت۔ اور آگے اس دن کی ایک حالت بیان کی گئی ہے کہ جس دن (موقف حساب سے) پشت پھیر کر (دوزخ کی طرف) لوٹو گے (کذا نسرا البغوی اور اس وقت) تم کو خدا کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا (اور اس مضمون کا تقاضا ہدایت قبول کرنے کا ہے لیکن) جس کو خدا ہی گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت کرنے والا نہیں اور (آگے تو بیخ و تنبیہ ہے اس پر کہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ایک رفیعہ کی بھی تکذیب کر چکے ہیں یعنی) اس سے قبل تم لوگوں کے پاس یوسف (علیہ السلام) دلائل (توحید و نبوت کے) لیکر آچکے ہیں (یعنی اسی قوم قبط میں جن میں سے تم بھی ہو اور آباؤ سابقین سے تم تک بھی ان کی خبر متواتر پہنچتی ہے) سو تم ان امور میں بھی برابر شک (و انکار) ہی میں رہے جو وہ تمہارے پاس لیکر آئے تھے، حتیٰ کہ جب ان کی وفات ہو گئی تو تم کہنے لگے کہ بس اب اللہ کسی رسول کو نہ بھیجے گا (یہ قول بطور شرارت کے تھا، مطلب یہ کہ اول تو یوسف بھی رسول نہ تھے اور اگر بالفرض تھے بھی تو جب ایک کو نہ مانا تو اللہ میاں کہیں گے کہ دوسرے کو بھیجے سے کیا فائدہ، تو ہمیشہ کے لئے یہ جھگڑا پاک ہو گیا مقصود اصلی اس سے نفی مسند رسالت کی ہے جیسا کہ اگلے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس مسئلہ میں تم غلط کار ہو، اسی طرح اللہ تعالیٰ آپ سے باہر ہو جانے والے (اور) شبہات میں گرفتار رہنے

والوں کو غلطی میں ڈالے رکھتا ہے، جو بلا کسی سند کے جو ان کے پاس موجود ہو خدا کی آیتوں میں جھگڑنے کلا کرتے ہیں۔ اس (کج بحثی) سے خدا تعالیٰ کو بڑی نفرت ہے اور مؤمنین کو بھی اور (جس طرح تمہارے دلوں پر مہر لگا رکھی ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر مشرور جابر کے پورے قلب پر مہر کر دیتا ہے۔ (کہ اس میں اصلاً گنجائش حق نہیں کی نہیں رہتی۔ یہ تقریر بھی ان مؤمن بزرگ کی جو فرعون کے خاندان میں سے ہیں اور اب تک ایمان کا اظہار نہیں کیا تھا اور اس تقریر سے اُن بزرگ کہتے ایمان جاتا رہا، خواہ اول تقریر سے خواہ بعد کی تقریر سے یعنی يَقُولُ اِنِّيْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ قِتْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ اور ظاہر حسن اول ہے لَقَوْلِهِ تَعَالٰى وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ الْخ) اور فرعون نے یہ تقریر جواباً سنی تو اس مؤمن کو کچھ جواب دے نہ سکا۔ اپنی جہالت قدیمہ پر بزمِ خود محبت قائم کرنے کے لئے ہامان سے، کہا اے ہامان میرے لئے ایک بلند عمارت بنواد (میں اس پر چڑھ کر دیکھوں گا) شاید میں آسمان پر جانے کی راہوں تک پہنچ جاؤں پھر وہاں جا کر) موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو موسیٰ کو (اس کے دعویٰ میں) جھوٹا سمجھتا ہوں (آگے فرعون کی مزید بدکرداری کا ذکر ہے) اور اسی طرح فرعون کی (اور) بدکرداریاں (بھی) اس کو مستحسن معلوم ہوئی تھیں اور (سیدھے) رستہ سے رگ گیا اور (موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں بڑی بڑی تدبیریں کیں مگر) فرعون کی ہر تدبیر غارت رہی گئی (کسی میں کامیاب نہ ہوا) اور اس مؤمن نے (جب دیکھا کہ فرعون سے کوئی معقول جواب نہیں بن پڑا تو پھر مکرر) کہا کہ اے بھائیو تم میری راہ پر چلو میں تم کو ٹھیک ٹھیک راستہ بتلاتا ہوں (یعنی فرعون نے جو کہا تھا کہ میں تمہیں سبیل الرشاد کی طرف ہدایت کرتا ہوں اس کا بتایا ہوا راستہ ہرگز سبیل الرشاد یعنی ہدایت کا راستہ نہیں، بلکہ سبیل الرشاد میرا بتلایا ہوا راستہ ہے) اے بھائیو یہ دنیوی زندگی محض چند روزہ ہے اور (اصل) تمہارے کامقام تو آخرت ہے (جہاں بدلہ دینے کا یہ قانون ہے کہ) جو شخص گناہ کرتا ہے تو اس کو برابر مسرا بر ہی بدلہ ملتا ہے اور جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مؤمن ہو ایسے لوگ جنت میں جاویں گے (اور) وہاں ان کو بے حساب رزق ملے گا اور (اس تقریر کے وقت اس مؤمن آل فرعون کو یہ محسوس ہوا کہ یہ لوگ میری باتوں پر تعجب کر رہے ہیں اور بجائے میری بات ماننے کے مجھ کو ہی اپنے طریق کفر کی طرف بلانا چاہتے ہیں، اس لئے یہ بھی کہا کہ) اے میرے بھائیو یہ کیا بات ہے کہ میں تو تم کو (طریق نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھ کو (طریق) دوزخ کی طرف بلاتے ہو (یعنی) تم مجھ کو اس بات کی طرف بلاتے ہو کہ (معاذ اللہ) میں خدا کے ساتھ کفر کروں اور ایسی چیز کو اس کا سا جھٹی بناؤں جس کے (سا جھٹی) ہونے کی) میرے پاس کوئی دلیل بھی نہیں اور میں تم کو خدا کے زیر دست خطا بخش کی طرف بلاتا ہوں (یعنی بات ہے کہ تم جس چیز کی عبادت) کی طرف مجھ کو بلاتے ہو وہ نہ تو دنیا ہی میں (کسی نبوی

حاجت کے لئے) پکارے جانے کے لائق ہے اور نہ (دفع عذاب کے لئے) آخرت ہی میں اور (یقینی بات ہے کہ) ہم سب کو خدا کے پاس جانا ہے اور (یقینی بات ہے کہ) جو لوگ دائرہ (عبودیت) سے نکل رہے ہیں (جیسے غیر اللہ کی پرستش کرنے والے) وہ سب دو زخمی ہوں گے سو اب تو میرا کہنا تمہارے جی کو نہیں لگتا مگر) آگے چل کر تم میری بات کو یاد کرو گے اور (چونکہ اس مؤمن کو یہ احتمال پہلے سے ہے کہ یہ لوگ اس نصیحت پر میرے خلاف ہو جائیں اور تکلیف پہنچائیں اور ممکن ہے کہ اس وقت کچھ آثار و علامت دھکی کے بھی ان کی طرف سے سامنے آئے ہوں اس لئے یہ بھی کہا کہ) میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں ، خدا تعالیٰ سب بندوں کا (خود) نگراں ہے (میں تم سے بالکل نہیں ڈرتا) پھر خدا تعالیٰ نے اس (مؤمن) کو ان کی مضر تدبیروں سے محفوظ رکھا (چنانچہ وہ ان کی ایذاؤں سے محفوظ رہا اور حضرت قتادہؓ کے قول کے مطابق اس کو بھی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ غرق سے نجات ہوئی (کذا فی الدر المنثور) اور فرعون والوں پر (مع فرعون کے) تکلیف دینے والا عذاب نازل ہوا (جس کا بیان یہ ہے کہ وہ لوگ (بزرخ میں) تسبیح شام آگ کے سامنے لائے جاتے ہیں) اور ان کو بتلایا جاتا ہے کہ تم قیامت کے روز اس میں داخل ہو گے) اور جس روز قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا) کہ فرعون والوں کو (مع فرعون کے) نہایت سخت عذاب میں داخل کرو۔

معارف و مسائل

اوپر جا بجا منکرین توحید و رسالت کی وعید و تہدید کے ضمن میں کفار کا خلاف و عناد مذکور ہوا ہے جس سے طبعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حزن و ملال ہوتا تھا۔ آپ کی تسلی کے لئے مذکور الصدر تقریباً دو رکوع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس قصہ میں ایک طویل مکالمہ فرعون اور قوم فرعون کے ساتھ اس بزرگ شخص کا ہے جو خود آل فرعون میں ہونے کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر ایمان لے آیا تھا۔ مگر بے صحت اپنے ایمان کو اس وقت تک چھپا رکھا تھا۔ اس مکالمہ کے وقت اس کے ایمان کا بھی حتمی اعلان ہو گیا۔

۱۔ تفسیر میں سے مقاتلؓ اور سدیؓ اور حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ یہ فرعون کا چچا زاد بھائی تھا، اور یہ وہی شخص تھا جس نے اس وقت جبکہ قبیلے کے قتل کے واقعہ میں اس کے قصاص کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا مشورہ دیا، بارہ فرعون میں ہو رہا تھا تو یہی شہر کے کنارے سے دوڑ کر آیا اور موسیٰ علیہ السلام کو خبر دیکر مشورہ دیا کہ مہرے باہر چلے جائیں، جس کا واقعہ سورہ قصص میں حق تعالیٰ نے بیان

فرمایا ہے وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ يَسْتَعِي .

اس مؤمن آل فرعون کا نام بعض نے حبیب بتلایا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ حبیب اس شخص کا نام ہے جس کا قصہ سورۃ یونس میں آیا ہے اس کا نام شمعان ہے پہیلی نے اس نام کو اصح قرار دیا ہے اور دوسرے حضرات نے اس کا نام حزقیل بتلایا ہے۔ تعلیمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی قول نقل کیا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدّ لعلتین چند ہیں ایک حبیب نجار جس کا قصہ سورۃ یونس میں ہے۔ دوسرا مؤمن آل فرعون تیسرے ابو بکر اور وہ ان سب میں افضل ہیں۔ (قرطبی)

يَكُنْ لَهُمُ الْيَمَانَةُ . اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر لوگوں کے سامنے اپنے ایمان کا اظہار نہ کرے دل سے اعتقاد پختہ رکھے تو وہ مؤمن ہے مگر نصوص صریحہ سے یہ ثابت ہے کہ ایمان کے مقبول ہونے کے لئے صرف دل کا یقین کافی نہیں بلکہ زبان سے اقرار کرنا شرط ہے جب تک زبان سے اقرار نہ کرے گا مؤمن نہ ہوگا۔ البتہ زبان کا اقرار لوگوں کے سامنے اعلان کے ساتھ نہ ضروری نہیں۔ اس کی ضرورت صرف اسوجہ سے ہے کہ جب تک لوگوں کو اس کے ایمان کا علم نہیں ہوگا وہ اس کے ساتھ معاملہ مسلمانوں جیسا نہ کر سکیں گے۔ (قرطبی)

مُؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ . اس کالمہ میں آل فرعون اور فرعون کو مختلف عنوانات سے حق اور ایمان کی طرف بلایا اور وہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے درپے تھے ان کو اس سے باز رکھا۔ يَقَوْمِي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ . تَنَادٍ بکسر وال مخفف ہے تَنَادَحٌ کا جس کے معنی ہیں باہم ایک دوسرے کو نداء اور آواز دینے کے۔ قیامت کے روز کو یَوْمَ التَّنَادِ اس لئے کہا گیا کہ اس روز ہمیشہ تَنَادَاتیں اور آوازیں ہونگی۔ جن کا کچھ ذکر خلاصہ تفسیر میں آچکا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ کا ایک منادی ندا دے گا کہ اللہ کے مخالف لوگ کھڑے ہو جائیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو تقیہ کا انکار کرتے تھے۔ اور پھر اصحاب جنت دوزخ والوں کو اور دوزخ والے اصحاب جنت کو اور اصحاب اعراف دونوں کو ندا دیگی اپنی اپنی باتیں کریں گے۔ اور اس وقت ہر خوش نصیب اور بد نصیب کا نام مع ولایت لیکر ان کے نتیجہ کا اعلان کیا جائے گا کہ فلاں ابن فلاں سعید و کامیاب ہو گیا اس کے بعد شقاوت کا کوئی احتمال نہیں رہا اور فلاں بن فلاں شقی و بد بخت ہو گیا، اب اس کی نیک بختی کا کوئی احتمال نہیں رہا (رواہ ابن ابی حاتم فی السنۃ۔ منظرہری) مسند بزار و بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سعادت و شقاوت کا اعلان دوزخ اعمال کے بعد ہوگا۔

اور حضرت ابو حازم اعرج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ اپنے نفس کو مخاطب کر کے فرمایا

کہتے تھے کہ اے اعرج قیامت کے روز زندہ کیا جائے گی کہ فلاں قسم کے گناہ کرنے والے کھڑے ہو جاویں تو ان کے ساتھ کھڑا ہوگا کہ پھر نہ ادرسی جاوے گی کہ فلاں قسم کے گناہ کرنے والے کھڑے ہوں تو ان کے ساتھ کھڑا بھی ہوگا، پھر نہ ادرسی جاوے گی کہ فلاں قسم کے گناہ کرنے والے کھڑے ہوں تو ان کے ساتھ بھی کھڑا ہوگا۔ اور میں سمجھتا ہوں ہر گناہ کے اعلان کے وقت تجھے ان کے ساتھ کھڑا ہونا پڑے گا کیونکہ تو نے ہر قسم کے گناہ جمع کر رکھے ہیں)۔ (آخر ص: ابو نعیم - منظری)

یَوْمَ تَوَلَّوْنَ مَدْیُنَیْکُمْ - یعنی جب تم پشت پھیر کر لوٹو گے۔ خلاصہ تفسیر میں بحوالہ امام بغوی اس کے معنی یہ بیان ہوئے ہیں کہ یہ اُس حالت کا بیان ہے جب مجرمین موقف حساب سے جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ پہلے یہ ندائیں اور اعلانات جن کا ذکر یَوْمَ التَّنَادِ کی تفسیر میں آ رہا ہے، وہ سب ہو چکیں گے۔ اس کے بعد یہ لوگ موقف حساب سے مرکز جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے۔

اور بعض حضرات مفسرین کے نزدیک یہ حال دنیا میں نفخہ اولیٰ کے وقت کا بیان کیا گیا ہے، کہ جب پہلا صور بھونکا جائے گا اور زمین پھٹے گی تو یہ لوگ ادھر ادھر بھاگیں گے مگر ہر طرف فرشتوں کا پہرہ ہوگا، کہیں نکلنے کا راستہ نہ ہوگا۔ ان حضرات کے نزدیک یَوْمَ التَّنَادِ سے مراد بھی نفخہ اولیٰ کا وقت ہے کہ اس میں ہر طرف سے چیخ پکار ہوگی۔ آیت کی دوسری قراءت سے اس کی تائید ہوتی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ یَوْمَ التَّنَادِ کو بدال مشدّد پڑھتے تھے، جو نہ مصدر سے مشتق ہے جس کے معنی بھاگنے کے ہیں تو یَوْمَ التَّنَادِ کے معنی بھی اس تفسیر کی رو سے بھاگنے کا دن ہوگا اور تَوَلَّوْنَ مَدْیُنَیْکُمْ اُسی کی تشریح ہوتی۔

تفسیر منظری میں ایک طویل حدیث بحوالہ ابن جریر اور مسند ابویعلیٰ اور مسند عبد بن حمید وغیرہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے جس میں قیامت کے روز صور کے تین نفخوں کا ذکر ہے۔ پہلا نفخہ فزع دوسرا نفخہ صعق تیسرا نفخہ نشر، نفخہ فزع سے ساری مخلوق میں گھبراہٹ اور اضطراب پیدا ہوگا۔ یہی نفخہ اولیٰ ہو کر نفخہ صعق بن جائے گا، جس سے سب بے ہوش ہو جائیں گے پھر مہابین کے عام طور پر ان دونوں نفخوں کے مجموعہ کو نفخہ اولیٰ کہا گیا ہے جس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ ایک ہی نفخہ کے دو کیفیتیں ہوں گی، پہلی فزع دوسری صعق۔ اس حدیث میں بھی نفخہ فزع کے وقت لوگوں کے ادھر ادھر بھاگنے کا ذکر کر کے یہ فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِیْ یَقُولُ اللّٰهُ یَوْمَ التَّنَادِ۔ جس سے معلوم ہوا کہ آیت میں یَوْمَ التَّنَادِ سے مراد پہلے نفخہ کے وقت لوگوں کا مضطربانہ ادھر ادھر دوڑنا ہے۔

(واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم)

كَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ مُنْکِرٍ جَبَّارٍ - یعنی جس طرح فرعون و ہامان کے قلوب

موسیٰ علیہ السلام اور مؤمن آل فرعون کی نصیحتوں سے کوئی اثر نہیں لیا اسی طرح اللہ تعالیٰ مہر کر دیتے ہیں ہر ایسے شخص کے قلب پر جو متکبر اور جبار ہو (متکبر: تکبر کر نیوالا اور جبار: کے معنی ظالم قاتل) جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس میں نور ایمان داخل نہیں ہوتا اور اس کو اچھے بُرے کی تمیز نہیں رہتی۔ ایک قرارت میں متکبر اور جبار کو قلب کی صفت قرار دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تمام اخلاق و اعمال کا منبع اور سرچشمہ قلب ہی ہے، ہر اچھا بُرا عمل قلب ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے حدیث میں فرمایا ہے کہ انسان کے بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا (یعنی دل) ایسا ہے جس کے درست ہونے سے سارا بدن درست ہو جاتا ہے اور اس کے خراب ہونے سے سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ (قرطبی)۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا هَامُوتُ ابْنِ لِي صَرْحًا۔ صرح کے معنی بلند تعمیر کے ہیں۔ ظاہر اس کا یہ ہے کہ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ ایسی بلند تعمیر بناؤ جو آسمان کے قریب تک چلی جائے جس پر جا کر میں خدا کو جھانک کر دیکھ لوں۔ یہ احمقانہ خیال جو کوئی ادنیٰ سمجھ کا آدمی بھی نہیں کر سکتا سلطنت مصر کے مالک فرعون کا یا تو واقعی ہے جو اس کی انتہائی بے وقوفی اور حماقت کی دلیل ہے اور وزیر نے اگر اس کی تعمیل کی تو وزیر سے چین شہر یارے چین کا مصداق ہے۔ مگر کسی بھی دینی ملک سے ایسے احمقانہ تصور کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے بعض حضرات مفسرین نے کہا کہ یہ تو وہ بھی جانتا تھا کہ کتنی ہی بلند تعمیر بنالے وہ آسمان تک نہیں پہنچ سکتا۔ مگر اپنے لوگوں کو بوقوف بنانے اور دکھانے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔ پھر کسی صحیح اور قوی روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ایسا کوئی محل عالیشان بلند تعمیر ہوا یا نہیں۔ قرطبی نے نقل کیا ہے کہ یہ بلند تعمیر کرائی گئی تھی جو بلندی پر پہنچنے ہی منہدم ہو گئی۔

دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحب رح کے شاگرد خاص میرے والد ماجد مولانا محمد حسین صاحب نے اپنے استاد موصوف سے نقل کر کے فرمایا کہ اس قصر بلند کے منہدم ہونے کے لئے ضروری نہیں کہ کوئی آسمانی عذاب آیا ہو بلکہ ہر تعمیر کی بلندی اس کی بنیادوں کے تحمل پر موقوف ہوتی ہے اس نے کتنی بھی گہری بنیاد رکھی ہو مگر ایک حد تک ہی گہری ہوگی جب اس کے اوپر تعمیر چڑھتا ہی چلا گیا تو لازم تھا کہ جب اس کی بنیادوں کے تحمل سے زیادہ ہو جائے تو منہدم ہو جائے اس سے فرعون و ہامان کی دوسری بے وقوفی ثابت ہوئی۔ واللہ اعلم

فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأَفَوتُ إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ۔

یہ مؤمن آل فرعون کا آخری کلام ہے جو اپنی قوم کو حق کی طرف بلانے کے سلسلے میں کیا گیا جس میں اظہار ہے کہ آج تو تم میری بات نہیں مانتے مگر جب عذاب نہیں آپکڑے گا تو اس وقت تم کو میری بات یاد آئے گی۔ مگر اس وقت کا یاد آنا بے کار ہوگا۔ اور اب جبکہ اس طویل مکالمہ اور نصیحت و

دعوت کے ذریعہ اسل مؤمن آل فرعون کا ایمان ان لوگوں پر ظاہر ہو گیا تو فکر ہوئی کہ اب یہ لوگ ان کے درپے ہوں گے اس لئے فرمایا کہ میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کا نگران و محافظ ہے۔ امام تفسیر مقاتل نے فرمایا کہ ان کے گمان کے مطابق قوم فرعون ان کے درپے ہوئی تو یہ پہاڑ کی طرف بھاگ نکلے۔ اور ان کی گرفت میں نہ آ سکے جس کا ذکر اگلی آیت میں اس طرح آیا ہے۔

فَوَقَّعَهُ اللَّهُ سَيِّئَاتٍ مَّامَنَ كُفْرًا وَّأَوْحَاقَ بَالٍ فِرْعَوْنُكَ سُوءَ الْعَذَابِ - یعنی اس کو اللہ تعالیٰ نے قوم فرعون کی بُری تدبیروں کے شر سے بچا لیا مگر خود قوم فرعون سخت عذاب پہنچا دی گئی۔ مولائے کریم نے مؤمن آل فرعون کو دنیا میں اقل تو آل فرعون کی ان کے خلاف تدبیروں سے بچایا جس کی تفصیل قرآن میں مذکور نہیں۔ مگر الفاظ قرآن سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو قتل کرنے اور تکلیف پہنچانے کے لئے قوم فرعون نے بہت سی تدبیریں کی تھیں اور جب پھر قوم فرعون غرق ہوئی تو اس بندہ مؤمن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نجات دی گئی، اور آخرت کی نجات تو ظاہر ہی ہے۔

النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ - حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ آل فرعون کی رُوہیں سیاہ پیرندوں کی شکل میں ہر روز صبح اور شام دو مرتبہ جہنم کے سامنے لائی جاتی ہیں اور جہنم کو دکھلا کر ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا ٹھکانا یہ ہے۔

(آخر جہ عبدالرزاق و ابن ابی حاتم - منظر ہی)

اور صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی مر جاتا ہے تو عالم برزخ میں صبح و شام اس کو وہ مقام دکھلایا جاتا ہے جہاں قیامت کے حساب کے بعد اس کو پہنچنا ہے اور یہ مقام دکھلا کر روزانہ اس سے کہا جاتا ہے کہ تجھے آخر کار یہاں پہنچنا ہے۔ اگر یہ شخص اہل جنت میں سے ہے تو اس کا مقام جنت اس کو دکھلایا جائے گا اور اہل جہنم میں سے ہے تو اس کا مقام جہنم اس کو دکھلایا جائے گا۔

عذاب قبر | یہ آیت دلیل ہے عذاب قبر کی اور حدیث کی روایات متواترہ اور اجماع امت اس پر شاہد ہیں، جن کو احقر نے ایک مستقل رسالہ بنام السبل بعذاب القبور میں جمع کر دیا ہے مع آیات متعلقہ کے یہ رسالہ احکام القرآن حزب سادس کا جزر ہو کر بزبان عربی شائع ہو گیا۔

وَإِذْ يَتَحَايُّونَ فِي النَّارِ فَيَقُولُ الضُّعَفَاءُ

اور جب آپس میں جھگڑیں گے آگ کے اندر پھر کہیں گے کمزور

لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ

غزور کرتے والوں کو ہم تھے تمہارے تابع پھر کچھ تم

أَنْتُمْ مُّغْنُونَ عَنَّا نَصِيبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾

ہم پر سے اٹھاؤ گے حصہ آگ کا

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُلٌّ فِيهَا ﴿۴۸﴾

کہیں گے جو غزور کرتے تھے ہم سب ہی بڑے ہوئے ہیں یہی

إِنَّ اللَّهَ فَتَدْحَكُم بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۹﴾

بیشک اللہ فیصلہ کر چکا بندوں میں

وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ

اور کہیں گے جو لوگ بڑے ہیں آگ میں دوزخ کے داروغوں کو

ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا

مانگو اپنے رب سے کہ ہم پر ہلکا کر دے ایک دن

مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۵۰﴾ قَالُوا أَوَلَمْ تَكُ تَأْتِيكُمُ

تھوڑا عذاب وہ بولے کیا نہ آتے تھے تمہارے پاس

رُسُلُكُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا بَلَىٰ ط قَالُوا أَفَادْعُوا

تمہارے رسول کھلی نشانیاں لے کر کہیں گے کیوں نہیں بولے پھر پکارو

وَمَا دُعَاؤُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ﴿۵۱﴾

اور کچھ نہیں کافروں کا پکارنا مگر بھٹکنا

خلاصہ تفسیر

اور (وہ وقت بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے) جبکہ کفار دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو اونی درجہ کے لوگ (یعنی تابعین) بڑے درجہ کے لوگوں سے (یعنی متبعین عیسیٰ جن کا وہ دنیا میں اتباع کیا کرتے تھے) کہیں گے کہ ہم (دنیا میں) تمہارے تابع تھے کیا تم ہم سے آگ کا کوئی جزا رٹا سکتے ہو (یعنی جب دنیا میں تم نے ہمیں اپنا تابع اور پیرو بنا رکھا تھا تو آج تمہیں ہماری مدد کرنا چاہیے) وہ بڑے لوگ کہیں گے کہ ہم سب ہی دوزخ میں ہیں (یعنی ہم اپنا ہی عذاب کم نہیں کر سکتے تو تمہارا کیا کریں گے) اللہ تعالیٰ (اپنے) بندوں کے درمیان (قطعی) فیصلہ کر چکا (اب اس کے خلاف کرنے کی کس کو مجال ہے) اور (اس کے بعد) جلتے لوگ دوزخ میں ہوں گے (یعنی بڑے اور چھوٹے تابع اور متبع سب مل کر) جہنم کے موکل فرشتوں سے (درخواست کے طور پر) کہیں گے کہ تم ہی اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ کسی دن تو ہم سے عذاب ہلکا کر دے (یعنی عذاب کے بالکل ہٹ جانے یا ہمیشہ کے لئے کم ہو جانے کی امید تو نہیں، کم از کم ایک روز کی تو کچھ چھٹی مل جایا کرے) فرشتے کہیں گے کہ (یہ بتلاؤ) کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر معجزات لے کر نہیں آتے رہے (اور دوزخ سے بچنے کا طریقہ نہیں بتلاتے رہے) دوزخی کہیں گے ہاں آتے تو رہے تھے (مگر ہم نے ان کا کہنا نہ مانا بلی قَائِلًا نَأْتِيكَ فَتَكُفِّرُنَا) فرشتے کہیں گے کہ تو پھر (ہم تمہارے لئے دعا نہیں کر سکتے کیونکہ کافروں کے لئے دعا کرنے کی ہم کو اجازت نہیں ہے) تم ہی (اگر حجتی چاہے تو خود دعا کر لو) اور (تمہاری دعا کا بھی کچھ نتیجہ نہ ہوگا کیونکہ) کافروں کی دعا (آخرت میں) محض بے اثر ہے (کیونکہ آخرت میں کوئی دعا بغیر ایمان کے قبول نہیں ہو سکتی اور ایمان کا موقع دنیا ہی تھا وہ تم کھو چکے اور یہ جو کہا کہ آخرت میں اس سے فائدہ یہ ہے کہ دنیا میں تو کافروں کی دعا بھی قبول ہو سکتی ہے، جیسا کہ سب سے بڑے کافر ابلیس کی سب سے بڑی دعا قیامت تک زندہ رہنے کی قبول کر لی گئی)۔

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ

ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں اور

يَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ۝۵۱ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعَذَرَتُهُمْ

جب کھڑے ہوں گے گواہ جس دن کام نہ آئیں منکروں کو ان کے بہانے

وَلَهُمُ الْعَذَابُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۝۵۲ وَلَقَدْ آتَيْنَا

اور ان کو پھٹکارا ہے اور ان کے واسطے بُرا گھر اور ہم نے دی

مُوسَى الْهُدَى وَأَوْثَرَ ثَنَابَنِي إِسْرَءِيلَ الْكِتَابِ ۝۵۳

موسیٰ کو راہ کی سوجھ اور وارث کیا بنی اسرائیل کو کتاب کا

هُدًى وَذِكْرَى لِأُولَى الْأَلْبَابِ ۝۵۴ فَاصْبِرْ إِنَّ

سمجھانے والی اور سمجھانے والی عقلمندوں کو سوتو ٹھہرا رہے شک

وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِمَنْ تَبِعَكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ

وعدہ اللہ کا ٹھیک ہے اور بخشو اپنا گناہ اور پاکی بول اپنے

رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ۝۵۵ إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ

رب کی خوبیاں شام کو اور صبح کو جو لوگ جھگڑتے ہیں

فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَنَّهُمْ إِنْ فِي صُدُورِهِمْ

اللہ کی باتوں میں بغیر کسی سند کے جھگڑتی ہیں ان کو اور کوئی بات نہیں

إِلَّا كِبَرُ مَا هُمْ بِبِالْغَيْهِ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ

ان کے دلوں میں غور ہے کبھی نہ پہنچیں گے اس تک سوتو پناہ مانگ اللہ کی بے شک وہ

السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝۵۶ لَخَلَقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ

سنتا دیکھتا ہے البتہ پیدا کرنا آسمانوں کا اور زمین کا بڑا ہے

مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝۵۷

لوگوں کے بنانے سے لیکن بہت لوگ نہیں سمجھتے

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۝۵۸ وَالَّذِينَ آمَنُوا

اور برابر نہیں اندھا اور آنکھوں والا اور نہ

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۝۵۹ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝۶۰

جو بھلے کام نہ کرتے ہیں اللہ نہ بدکار تم بہت کم سوچ کرتے ہو

إِنَّ السَّاعَةَ لَأْتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ

تحقیق قیامت آتی ہے اس میں دھوکا نہیں لیکن بہت سے لوگ

لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۵۹﴾ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ

نہیں مانتے اور کہتا ہے تمہارا رب مجھ کو پکارو کہ میں تمہاری پکار کو بے شک

الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿۶۰﴾

جو لوگ تکبر کرتے ہیں میری بندگی سے اب داخل ہوں گے دوزخ میں ذلیل ہو کر

خلاصہ تفسیر

ہم اپنے پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیوی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں (جیسا اوپر
موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے معلوم ہوا) اور اس روز بھی جس میں گواہی دینے والے (فرشتے جو کہ نامہ
اعمال لکھتے تھے اور قیامت کے روز اس بات کی گواہی دیں گے کہ رسولوں نے عمل تبلیغ کیا اور کفار نے
عمل تکذیب بغرض وہ فرشتے گواہی کے لئے کھڑے ہوں گے (مراد اس سے قیامت کا دن ہے، وہاں کی
مدد کا حال ابھی کفار کے معذرت بالتار ہونے سے معلوم ہو چکا ہے، آگے اس دن کا بیان ہے یعنی)
جس دن کہ ظالموں (یعنی کافروں) کو ان کی معذرت کچھ نفع نہ دیگی (یعنی اول تو کوئی معتبر معذرت
نہ ہوگی اور اگر کچھ حرکت مذبوحی کی طرح ہوئی تو وہ نافع نہ ہوگی) اور ان کے لئے لعنت ہوگی اور ان
کے لئے اس عالم میں خرابی ہوگی (پس اس طرح آپ اور آپ کے اتباع بھی منصوبہ ہوں گے اور مخالفین
ذلیل و مستہزور ہوں گے تو آپ تسلی رکھئے) اور (آپ کے قبل) ہم موسیٰ (علیہ السلام) کو ہدایت نامہ
(یعنی توریت) دے چکے ہیں اور (پھر) ہم نے وہ کتاب بنی اسرائیل کو پہنچائی تھی کہ وہ ہدایت اور نصیحت
(کی کتاب) تھی اہل عقل (سلیم) کے لئے (بخلاف بے عقلوں کے کہ وہ اس سے منتفع نہ ہوئے) اسی طرح
مثل موسیٰ علیہ السلام کے آپ بھی صاحب رسالت و صاحب وحی ہیں اور اسی طرح مثل بنی اسرائیل
کے آپ کے متبعین آپ کی کتاب کی خدمت کریں گے اور جیسے ان میں اہل عقل تصدیق کرنے والے
اور متبع تھے اور بے عقل لوگ منکر و مخالفت اسی طرح آپ کی امت میں بھی دونوں طرح کے لوگ ہیں)
سو (اس سے بھی) آپ (تسلی حاصل کیجئے اور کفار کی ایذاؤں پر) صبر کیجئے بے شک اللہ کا وعدہ (جس
کا اوپر لنقصہم الخ میں ذکر ہوا ہے بالکل) سچا ہے اور (اگر کبھی کمال صبر میں کچھ کمی ہو گئی ہو جو حسب
تواعد شرعیہ واقع میں تو گناہ نہیں، مگر آپ کے رتبہ عالی کے اعتبار سے وجوب تدارک میں مثل
گناہ ہی کے ہے، اس کا تدارک کیجئے وہ تدارک یہ ہے کہ) اپنے (اُس) گناہ کی (جس کو مجازاً آپ کی

شان عالی کے اعتبار سے گناہ کہہ دیا گیا ہے) معافی مانگیے اور (ایسے شغل میں لگے رہیے کہ غمگین و خرس
 نہ لے والی چیزوں کی طرف التفات ہی نہ ہو وہ شغل یہ ہے کہ) شام اور صبح (یعنی علی الدوام) اپنے
 رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہیے (یہ مضمون تو آپ کی تسلی کے متعلق ہو گیا، آگے منکرین و مجادلین پر
 تو بیخ اور رد ہے یعنی) جو لوگ بلا کسی مسئلہ کے کہ ان کے پاس موجود ہو، خدا کی آیتوں میں جھگڑے
 نکالا کرتے ہیں (ان کو کوئی وجہ اشتیاء کی نہیں ہے کہ وہ جدال کا سبب ہو بلکہ) ان کے دلوں میں
 نری بڑائی (یہی بڑائی) ہے کہ وہ اس تک کبھی پہنچنے والے نہیں (اور وہ بڑائی سبب جدال کا ہے
 کیونکہ وہ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں) اتباع سے غار آتا ہے وہ خود اوروں ہی کو اپنا تابع بنانے کی ہوس
 رکھتے ہیں۔ لیکن ان کو یہ بڑائی نصیب نہ ہوگی بلکہ جلد ہی ذلیل و خوار ہوں گے۔ چنانچہ بدر وغیرہ
 میں مسلمانوں سے مغلوب ہوئے) سو (جب یہ خود بڑائی چاہتے ہیں تو آپ سے حسد و عداوت
 سب کچھ کریں گے لیکن) آپ (اندیشہ نہ کیجئے بلکہ ان کے شر سے) اللہ کی پناہ مانگیے رہیے، بے شک
 وہ ہی ہے سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا (تو وہ اپنی صفات کمال سے اپنی پناہ میں آئے
 ہوئے لوگوں کو محفوظ رکھے گا یہ جدال تو آپ کو رسول ماننے میں تھا۔ آگے ان کا جدال قیامت کے
 متعلق مع رد مذکور ہے یعنی وہ لوگ جو آدمیوں کے دوبارہ پیدا ہونے کے منکر ہیں بڑے کم عقل ہیں،
 اس واسطے کہ) بالیقین آسمانوں اور زمین کا (ابتداء) پیدا کرنا آدمیوں کے دوبارہ پیدا کرنے کی
 نسبت بڑا کام ہے (جب بڑے کام پر قدرت ثابت ہوگئی تو چھوٹے پر بدرجہ اولیٰ ثابت ہے اور یہ
 دلیل ثبوت کے لئے کافی شافی ہے) لیکن اکثر آدمی (اتنی بات) نہیں سمجھتے (کیونکہ وہ غور ہی نہیں کرتے
 اور بعض ایسے بھی ہیں جو غور بھی کرتے ہیں اور سمجھتے بھی ہیں اور مانتے بھی ہیں، اس طرح قرآن کو
 سننے والوں کی دو قسم ہو گئیں، ایک اس کو سمجھنے اور ماننے والے یہ صاحب بصیرت اور صاحب ایمان
 ہیں۔ دوسرے نہ سمجھنے اور نہ ماننے والے یہ مثل نابینا اور بدعمل کے ہیں) اور (ان دونوں قسموں
 کے آدمی یعنی ایک) بینا (دوسرا) نابینا اور (ایک) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے
 کام کئے اور (دوسرے) بدکار باہم برابر نہیں ہوتے (اس میں آپ کی تسلی بھی ہے کہ ہر قسم کے
 لوگ ہوا کرتے ہیں، سب کیسے سمجھنے لگیں اور منکرین پر عذاب قیامت کی وعید بھی ہے کہ ہم
 سب کو برابر نہ رکھیں گے۔ آگے منکرین کو یعنی ان لوگوں کو جو مثل نابینا کے اور بدعمل ہیں بطور التفات
 کے زجر ہے فرماتے ہیں کہ) تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو (ورنہ اعلیٰ اور بدعمل نہ ہوتے۔ اور قیامت کے
 متعلق جدال کا جواب دیکر آگے اس کے واقع ہونے کی خبر دیتے ہیں کہ) قیامت تو ضرور ہی آکر رہیگی
 اس (کے آنے) میں کسی طرح کا شک ہے ہی نہیں مگر اکثر لوگ (بوجہ عدم تدبیر فی الدلائل کے
 اس کو) نہیں مانتے اور (ایک جدال ان کا توحید میں تھا کہ خدا کے ساتھ شریک کرتے تھے

آگے اس کے متعلق کلام ہے یعنی، تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ (غیروں کو جو ان کے لئے رحمت پکارو بلکہ) مجھ کو پکارو میں (باستثنا نامناسب معروض کے) تمہاری (ہر) درخواست قبول کر لوں گا (دعا کے متعلق آیت قرآنی فَنُكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ إِلَيْهِ إِنَّ شَاءَ كَآبِیْہِیْ مطلب ہے کہ نامناسب درخواست و دعا کو رد کر دیا جاوے گا) جو لوگ (صرف) میری عبادت سے (جسمیں) مجھ سے دعا مانگنا بھی داخل ہے) سربانی کرتے ہیں (اور غیروں کو پکارنے اور ان کی عبادت کرتے ہیں، حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ توحید سے اعراض کر کے شرک کرتے ہیں) وہ عنقریب (موتے ہی) ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

معارف و مسائل

إِنَّا لَنَنْصُرُ دُشْنَآءَ الَّذِينَ آمَنُوا خِلَافَ الدُّنْيَا — اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے رسولوں اور مؤمنین کی مدد کیا کرتے ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور ظاہر ہے کہ یہ مدد بمقابلہ مخالفین اور اعداء کے مقصود ہے۔ اکثر انبیاء علیہم السلام کے متعلق تو اس کا وقوع ظاہر ہے مگر بعض انبیاء علیہم السلام جیسے یحییٰ و زکریا و عیسیٰ علیہم السلام جن کو دشمنوں نے شہید کر دیا یا بعض کو وطن چھوڑ کر دوسری جگہ ہجرت کرنا پڑی۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ان کے متعلق مشبہ ہو سکتا ہے۔

ابن کثیر نے بحوالہ ابن جریر اس کا جواب دیا ہے کہ آیت میں نصرت سے مراد انتصار اور دشمنوں سے انتقام لینا ہے۔ خواہ ان کی موجودگی میں ان کے ہاتھوں سے یا ان کی وفات کے بعد۔ یہ معنی تمام انبیاء و مؤمنین پر بلا کسی استثناء کے صادق ہیں۔ جن لوگوں نے اپنے انبیاء کو قتل کیا پھر وہ کیسے کیسے عذابوں میں گرفتار کر کے رسوا کئے گئے، اس سے تاریخ بھر بڑھ ہے۔ حضرت یحییٰ، زکریا اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے قاتلوں پر ان کے دشمنوں کو مسلط کر دیا جنہوں نے ان کو ذلیل و خوار کر کے قتل کیا۔ عمرو و کور اللہ نے کیسے عذاب میں پکڑا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں پر اللہ تعالیٰ نے روم کو مسلط کر دیا۔ جنہوں نے ان کو ذلیل و خوار کیا اور پھر قیامت سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ ان کو دشمنوں پر غالب فرمائیں گے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں ہی کے ہاتھوں زیر کیا ان کے مکشش سرور مارے گئے۔ کچھ قید کر کے لائے گئے، باقی ماندہ فتح مکہ میں گرفتار کر کے لائے گئے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر دیا۔ آپ کا کلمہ دنیا میں بلند ہوا اور وہی سب ادیان پر

غالب آیا، پورے جزیرہ العرب پر آپ کے زمانے ہی میں اسلام کی حکومت قائم ہو گئی۔

يَوْمَ يَقُومُ آلُ شِهَادٍ - یعنی جس دن کھڑے ہوں گے گواہ، مراد یوم قیامت ہے، وہاں تو انبیاء و مؤمنین کے لئے نصرت الہیہ خصوصی ظہور ہوگا۔

إِنِّي صَدُّ وَمِهْجَرٍ الْكَافِرِ مَاهُمْ بِبِالْغَيْهِ - یعنی یہ لوگ جو اللہ کی آیات میں بغیر کسی حجت و دلیل کے جدال کرتے ہیں، اور مقصد دراصل اس دین سے انکار کرنا ہے جس کا سبب اسکے سوا کچھ نہیں کہ ان کے دلوں میں تکبر ہے۔ یہ اپنی برائی پر پختہ ہیں اور اپنی بے وقوفی سے یوں سمجھتے ہوئے ہیں کہ یہ بڑائی ہمیں اپنے مذہب پر قائم رہنے سے حاصل ہے، اس کو چھوڑ کر مسلمان ہو جائیں گے تو ہماری یہ ریاست و اقتدار نہ رہے گا۔ قرآن کریم نے فرما دیا کہ مَا هُمْ بِبِالْغَيْهِ یعنی یہ اپنی مرمومہ بڑائی عظمت اور ریاست کو اسلام لائے بغیر نہ پاسکیں گے۔ البتہ اسلام لے آئے تو عزت و عظمت ان کے ساتھ ہوتی۔ (قرطبی)

وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ -

دُعا کے لفظی معنی پکارنے کے ہیں اور اکثر استعمال کسی حاجت و ضرورت کے لئے پکارنے میں ہوتا ہے۔ کبھی مطلق ذکر اللہ کو بھی دعا رکھا جاتا ہے۔ یہ آیت اُمت محمدیہ کا خاص اعزاز ہے کہ ان کو دعا مانگنے کا حکم دیا گیا۔ اور اسکی قبولیت کا وعدہ کیا گیا۔ اور جو دُعا مانگے اس کے لئے عذاب کی وعید آئی ہے۔

حضرت قتادہؓ نے کعب احبارؓ سے نقل کیا ہے کہ پہلے زمانے میں یہ خصوصیت انبیاء علیہم السلام کی تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوتا تھا کہ آپ دُعا کریں میں قبول کروں گا۔ اُمت محمدیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ حکم تمام اُمت کے لئے عام کر دیا گیا۔ (ابن کثیر)

حضرت نعمان بن بشیرؓ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث بیان فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ - یعنی دعا عبادت ہی ہے اور پھر آپ نے استدلال میں یہ آیت تلاوت فرمائی۔ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي -

(رواہ الامام احمد و الترمذی و النسائی و ابوداؤد وغیرہ۔ ابن کثیر)

تفسیر منطہری میں ہے کہ جملہ إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ میں بقاعدہ عربیت (نصر المسند علی المسند الیہ) یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ دعا عبادت ہی کا نام ہے یعنی ہر دعا عبادت ہی ہے اور (نصر المسند الیہ علی المسند کے طور پر) یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ ہر عبادت ہی دعا ہے۔ یہاں دونوں احتمال ہیں۔ اور مراد یہاں یہ ہے کہ دعا اور عبادت اگرچہ لفظی مفہوم کے اعتبار سے دونوں جدا جدا ہیں مگر مصداق

کے اعتبار سے دونوں متحد ہیں کہ ہر دُعا عبادت ہے اور ہر عبادت دُعا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عبادت نام ہے کسی کے سامنے انتہائی تذلل اختیار کرنے کا اور ظاہر ہے کہ اپنے آپ کو کسی کا محتاج سمجھ کر اس کے سامنے سوال کے لئے راجعہ پھیلانا بڑا تذلل ہے جو مفہوم عبادت کا ہے۔ اسی طرح ہر عبادت کا حاصل بھی اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور رحمت اور دنیا اور آخرت کی عافیت مانگنا ہے۔ اسی لئے ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص میری حمد و ثنا میں اتنا مشغول ہو کہ اپنی حاجت مانگنے کی بھی اسے فرصت نہ ملے میں اُس کو مانگنے والوں سے زیادہ دوں گا۔ (یعنی اُس کی حاجت پوری کر دوں گا)۔ (رواہ ابن جریر فی النہایہ) اور ترمذی و مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: مَنْ شَغَلَ الْقُرْآنَ عَنْ ذِكْرِي وَتَسْبِيحِي اعطيتَه افضل ما اعطى السائلين۔ یعنی جو شخص تلاوت قرآن میں اتنا مشغول ہو کہ مجھ سے اپنی حاجات مانگنے کی بھی اسے فرصت نہ ملے تو میں اس کو آندوں گا کہ مانگنے والوں کو بھی اتنا نہیں ملتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت بھی وہی فائدہ دیتی ہے جو دُعا کا فائدہ ہے۔

اور عرفات کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عرفات میں میری دُعا اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی دُعا (یہ کلمہ ہے) اَلَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (رواہ ابن ابی شیبہ منظرہ) اس میں عبادت اور ذکر اللہ کو دُعا فرمایا ہے، اور اس آیت میں عبادت بمعنی دُعا کے ترک کرنے والوں کو جہنم کی وعید پائی گئی ہے وہ بصورت استکبار ہے یعنی جو شخص بطور استکبار کے اپنے آپ کو دُعا سے مستغنی سمجھ کر دُعا چھوڑے یہ علامت کفر کی ہے اس لئے وعید جہنم کا استحقاق ہوا۔ ورنہ فی نفسہ عام دُعا میں فرض واجب نہیں، اُن کے ترک سے کوئی گناہ نہیں۔ البتہ باجماع علماء مستحب اور افضل ہے۔ (منظرہ) اور حسب تصریح احادیث موجب برکات ہے۔

حَدِیْث: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دُعا سے فضائل دُعا زیادہ کوئی چیز مکرم نہیں۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ حاکم عن ابی ہریرۃ)۔

حَدِیْث: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے الدُّعَاءُ هِيَ الْعِبَادَةُ یعنی دُعا

عبادت کا معنی ہے۔ (ترمذی عن النسائی)

حَدِیْث: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگا کرو،

کیونکہ اللہ تعالیٰ سوال اور حاجت طلبی کو پسند فرماتا ہے اور سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ سختی کے وقت آدمی فراخی کا انتظار کرے۔ (ترمذی عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ)

حَدِیْث: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ سے اپنی حاجت کا سوال

نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کا اس پر غضب ہوتا ہے۔ (ترمذی۔ ابن حبان۔ حاکم)۔

ان سب روایات کو تفسیر مظہری میں نقل کر کے فرمایا کہ دعا نہ مانگنے والے پر غضب الہی کی وعید اس صورت میں ہے کہ نہ مانگنا تکبر اور اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے کی بنا پر ہو جیسا کہ آیت مذکورہ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔

حدیث:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دعا سے عاجز نہ ہو کیونکہ دعا کے ساتھ کوئی ہلاک نہیں ہوتا۔ (ابن حبان۔ حاکم عن انس رض)۔

حدیث:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون اور آسمان و زمین کا نور ہے۔ (حاکم فی المستدرک عن ابی ہریرہ رض)۔

حدیث:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کیلئے دعا کے دروازے کھول دیئے گئے اُس کے واسطے رحمت کے دروازے کھل گئے اور اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا اس سے زیادہ محبوب نہیں مانگی گئی کہ انسان اُس سے عافیت کا سوال کرے۔ (ترمذی۔ حاکم عن ابن عمر رض)۔ لفظ عافیت بڑا جامع لفظ ہے جس میں بلا سے حفاظت اور ضرورت و حاجت کا پورا ہونا داخل ہے۔

مسئلہ:۔ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا مانگنا حرام ہے وہ دعا اللہ کے نزدیک قبول بھی نہیں ہوتی۔ (کمانی الحدیث عن ابی سعید الخدری رض)۔

آیت مذکورہ میں اس کا وعدہ ہے کہ جو بندہ اللہ سے دعا مانگتا ہے وہ قبول ہوتی ہے قبولیت دعا کا وعدہ مگر بعض اوقات انسان یہ بھی دیکھتا ہے کہ دعا مانگی وہ قبول نہیں ہوتی۔ اس کا جواب ایک حدیث میں ہے جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان جو بھی دعا اللہ سے کرتا ہے اللہ اس کو عطا فرماتا ہے۔ بشرطیکہ اُس میں کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو اور قبول فرمانے کی تین صورتوں میں سے کوئی صورت ہوتی ہے ایک یہ کہ جو مانگا دوسری مل گیا، دوسرے یہ کہ اس کی مطلوب چیز کے بدلے اس کو آخرت کا کوئی اجر و ثواب دیدیا گیا۔ تیسرے یہ کہ مانگی ہوئی چیز تو نہ ملی مگر کوئی آفت و مصیبت اس پر آنے والی تھی وہ مل گئی۔ (مسند احمد۔ مظہری)۔

آیت مذکورہ میں تو بظاہر کوئی شرط نہیں۔ یہاں تک مسلمان ہونا بھی قبولیت دعا کی شرائط دعا کی شرط نہیں ہے۔ کافر کی دعا بھی اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ یہاں تک

کہ ابلیس کی دعا تا قیامت زندہ رہنے کی قبول ہو گئی۔ نہ دعا کے لئے کوئی وقت شرط نہ طہارت اور نہ با وضو ہونا شرط ہے۔ مگر احادیث معتبرہ میں بعض چیزوں کو موانع قبولیت فرمایا ہے۔ ان چیزوں سے اجتناب لازم ہے جیسا کہ حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض آدمی بہت سفر کرتے اور آسمان کی طرف دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور یا رب

یا رب کہہ کر اپنی حاجت مانگتے ہیں مگر ان کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام، ان کو حرام ہی غذا دی گئی تو ان کی دعا کہاں قبول ہوگی۔ (رواہ مسلم)۔

اسی طرح غفلت و بے پروائی کے ساتھ بغیر دھیان دئے دعا کے کلمات پڑھیں تو حدیث میں اس کے متعلق بھی آیا ہے کہ ایسی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ (ترمذی عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ)

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا

اللہ ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے رات کو کہ اس میں چلین پکڑو اور دن بنایا دیکھنے کو

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَالنَّاسِ

اللہ تو فضل والا ہے لوگوں پر اور لیکن بہت لوگ

لَا يَشْكُرُونَ ﴿٦١﴾ ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ عَمَّ

حق نہیں مانتے وہ اللہ ہے رب تمہارا ہر چیز بنانے والا

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَآئِنِ تَوَفَّكُونَ ﴿٦٢﴾ كَذٰلِكَ يُؤَفِّكُمُ الَّذِينَ

کسی کی بندگی نہیں اُسکے سوائے پھر کہاں سے پھرے جاتے ہو اسی طرح پھرے جاتے ہیں جو لوگ

كَانُوا بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٦٣﴾ اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ

کہ اللہ کی باتوں سے منکر ہوئے نہ جانتے ہیں اللہ ہے جس نے بنایا تمہارے

لَكُمْ الْأَرْضَ قَرَارًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ

لئے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان کو عمارت اور صورت بنائی تمہاری تو اچھی

صَوَّرَكُمْ وَرَازَكُمْ مِنَ الظَّالِمَاتِ ط ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ

بنائیں صورتیں تمہاری اور روزی دی تم کو ستھری چیزوں سے وہ اللہ ہے رب تمہارا

فَتَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٤﴾ هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ

سو بڑی برکت ہے اللہ کی جو رب سارے جہان کا وہ ہے زندہ رہنے والا کسی کی بندگی نہیں اُس کے

فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ط الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ

سوائے سو اس کو پکارو خالص کر کے اس کی بندگی سب خوبی اللہ کو جو رب ہے

الْعَالَمِينَ ﴿٦٥﴾ قُلْ إِنِّي نَهَيْتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ

سارے جہان کا تو کہہ کہ مجھ کو منع کر دیا کہ پوجوں ان کو جن کو تم پکارتے ہو

مِنْ دُونِ اللَّهِ لَمَّا جَاءَنِي الْبَيِّنَاتُ مِنْ رَبِّي وَأُمِرْتُ

سوائے اللہ کے جب پہنچ چکیں میرے پاس کھلی نشانیاں میرے رب سے اور مجھ کو حکم ہوا

أَنْ أَسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۶۷﴾ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ

کہ تابع رہوں جہان کے پروردگار کا وہی ہے جس نے بنایا تم کو

تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ تَفْطَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ

خاک سے پھر پانی کی بوند سے پھر خون جے ہوئے سے پھر تم کو نکالتا ہے

طِفْلًا ثُمَّ لَتَبْلُغُوا أَشَدَّكُمْ ثُمَّ لَتَكُونُوا شُيُوخًا

بچہ پھر جب تک کہ پہنچو اپنے پورے زور کو پھر جب تک کہ ہو جاؤ بوڑھے

وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفَّى مِنْ قَبْلُ وَلَتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى وَ

اور کوئی تم میں ایسا ہے کہ مر جاتا ہے پہلے اس سے اور جب تک کہ پہنچو نکلے وعدے کو اور

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۶۸﴾ هُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ فَإِذَا

تاکہ تم سوچو وہی ہے جو چلاتا ہے اور مارتا ہے پھر جب

قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿۶۹﴾

حکم کرے کسی کام کا تو یہی کہے اُس کو کہ ہو جا وہ ہو جاتا ہے

خلاصہ تفسیر

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے (نفع کے) لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور اسی نے دن کو (دیکھنے کے لئے) روشن بنایا تاکہ بے تکلف معاش حاصل کرو بے شک اللہ تعالیٰ کا لوگوں پر بڑا ہی فضل ہے کہ ان کی مصالحتوں کی کیسی کیسی رعایت فرمائی، لیکن اکثر آدمی (ان نعمتوں کا) شکر نہیں کرتے (بلکہ اللہ شکر کرتے ہیں) یہ اللہ ہے تمہارا رب (جس کا ذکر ہوا نہ وہ جن کو تم نے تراش رکھا ہے) وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اس کے سوا کہ فی لائق عبادت نہیں سو (بعد اثبات توحید کے) تم لوگ کہنا (شرک کر کے) الٹے چلے جا رہے ہو (اور مخاطبین کی کیا تخصیص ہے جس طرح تعصب و عناد سے یہ الٹے چلے جا رہے ہیں) اُسی طرح وہ (پہلے) لوگ بھی الٹے چلا کرتے تھے جو اللہ کی (تکوینی و تنزیلی) نشانیوں کا انکار کیا کرتے تھے اللہ ہی ہے جس نے زمین کو مخلوق کا، قرار گاہ بنایا اور آسمان کو (اوپر سے مثل) چھت (کے) بنایا اور تمہارا نقشہ بنایا، سو عمدہ نقشہ بنایا (چنانچہ انسان کے اعضاء کی برابری کسی حیوان کے اعضاء میں تناسب

نہیں اور یہ مشاہد و مسلم ہے) اور تم کو عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کو دیں (پس) یہ اللہ ہے تمہارا رب سو بڑا
 عالی شان ہے اللہ جو سارے جہان کا پروردگار ہے وہی (ازلی ابدی) زندہ (رہنے والا) ہے اس کے
 سوا کوئی لائق عبادت نہیں سو تم (سب) خالص اعتقاد کر کے اس کو پکارا کرو (اور مشرک نہ کیا کرو)
 تمام خوبیاں اسی اللہ کے لئے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہانوں کا آپ (ان مشرکوں کو سنانے کے
 لئے) کہہ دیجئے کہ مجھ کو اس سے ممانعت کر دی گئی ہے کہ میں اُن (مشرکوں) کی عبادت کروں جن کو
 خدا کے علاوہ تم پکار لے ہو جبکہ میرے پاس میرے رب کی نشانیاں آچکیں (مراد دلائل عقلیہ و نقلیہ ہیں
 مطلب یہ کہ شرک سے مجھے ممانعت ہوئی ہے) اور مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ میں (صرف) رب العالمین کے
 سامنے (عبادت میں) گم نہ دن جھکا لوں (مطلب یہ کہ مجھ کو توحید کا حکم ہوا ہے) وہی ہے جس نے تم کو (یعنی
 تمہارے باپ کو) مٹی سے پیدا کیا پھر (آگے اُن کی نسل کو) نطفہ سے پھر خون کے لو تھڑے سے (جیسا کہ
 سورۃ حج میں بیان ہوا ہے) پھر تم کو بچہ کر کے (ماں کے پیٹ سے) نکالتا ہے پھر (تم کو زندہ رکھتا ہے)
 تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو پھر (تم کو اور زندہ رکھتا ہے) تاکہ تم بوڑھے ہو جاؤ اور کوئی رتم میں سے
 (ان عمروں سے یعنی جوانی اور بوڑھاپے سے) پہلے ہی مر جاتا ہے (یہ تو سب کا الگ الگ حال ہوا کہ کوئی
 جوان ہوا کوئی نہ ہوا کوئی بوڑھا ہوا کوئی نہ ہوا) اور (یہ امر آئندہ سب میں مشترک ہے کہ تم میں سے
 ہر ایک کو ایک خاص عمر دیتا ہے) تاکہ تم سب (اپنے اپنے) وقت مقرر (مقرر) تک پہنچ جاؤ (پس یہ
 امر کلی ہے اور جزئیات مختلف سب اسی کلی کے جزئی ہیں) اور (یہ سب کچھ اس لئے کیا) تاکہ تم لوگ
 (ان امور میں غور کر کے خدا تعالیٰ کی توحید کو) سمجھو وہی ہے جو چلاتا ہے اور مارتا ہے پھر جب وہ
 کسی کام کو (دفعۃً) پورا کرنا چاہتا ہے سو بس اس کی نسبت (اتنا) فرما دیتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جا
 ہے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ کے انعامات اور قدرت کاملہ کے چند مظاہر پیش کر کے توحید کی
 دعوت دی گئی ہے۔

جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا - غور کیجئے کہ کتنی بڑی نعمت
 ہے کہ قدرت نے تمام طبقات انسان بلکہ جانوروں تک کے لئے فطری طور پر نیند کا ایک وقت معین
 کر دیا۔ اور اس وقت کو اندھیرا کر کے نیند کیلئے مناسب بنا دیا۔ اور سب کی طبیعت و فطرت میں
 رکھ دیا کہ اسی وقت یعنی رات کو نیند آتی ہے ورنہ جس طرح انسان اپنے کاروبار کے لئے اپنی طبیعت
 و سہولت کے لحاظ سے اوقات مقرر کرتا ہے۔ اگر نیند بھی اسی طرح اس کے اختیار میں ہوتی۔ اور ہر انسان

اپنی نیند کا پروگرام مختلف اوقات میں بنایا کرتا تو نہ سونے والوں کو نیند کی لذت و راحت ملتی نہ جاگنے والوں کے کام کا نظم درست ہوتا۔ کیونکہ انسانوں کی حاجتیں باہم ایک دوسرے سے متعلق ہوتی ہیں، اگر اوقات نیند کے مختلف ہوتے تو جاگنے والوں کے وہ کام مختل ہو جاتے جو سونے والوں سے متعلق ہیں اور سونے والوں کے وہ کام خراب ہو جاتے جن کا تعلق جاگنے والوں سے ہے اور صرف انسانوں کی نیند کا وقت متعین ہوتا۔ بہائم اور حیوانات کی نیند کے اوقات دوسرے ہوتے تو بھی انسانی کاموں کا نظام مختل ہو جاتا۔

وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ۔ انسان کی صورت کو اللہ تعالیٰ نے سب جانوروں سے ممتاز اعلیٰ اور بہتر حیثیت میں بنایا ہے۔ اس کو سوچنے سمجھنے کی عقل عطا فرمائی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ایسے بنائے کہ ان سے طرح طرح کی اشیاء و مصنوعات بنا کر اپنی راحت کے سامان پیدا کر لیتا ہے۔ اس کا کھانا پینا بھی عام جانوروں سے ممتاز ہے وہ اپنے منہ سے چرتے اور پیٹے ہیں یہ ہاتھوں سے کام لیتا ہے۔ عام جانوروں کی غذا مفردات سے ہے، کوئی گوشت کھاتا ہے کوئی گھاس اور پیٹے اور وہ بھی بالکل مفرد بخلاف انسان کے کہ یہ اپنے کھانے کو مختلف قسم کی چیزوں پھلوں ترکاریوں گوشت اور مصالحہ سے لذیذ و مرغوب بنا کر کھاتا ہے۔ ایک ایک پھل سے طرح طرح کے کھانے اور اجزاء مرتبے، چٹنی تیار کرتا ہے۔ فقبارک اللہ احسن الخالقین۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ أَنْ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو جھگڑتے ہیں اللہ کی باتوں میں کہاں سے

يُصْرَفُونَ ﴿٦٩﴾ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا

پھیرے جاتے ہیں وہ لوگ جو جنہوں نے جھٹلایا اس کتاب کو اور اس کو جو بھیجا ہم نے

بِهِمْ سُلَيْكًا فَتُفْسَوْنَ يَكْمُونَ ﴿٧٠﴾ إِذْ الْأَعْلَىٰ فِي

اپنے رسولوں کے ساتھ سو آخر جان لیں گے حسب طوق پہنچیں ان کی

أَعْنَاقِهِمُ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ ﴿٧١﴾ فِي الْحَمِيمِ

گردلوں میں اور زنجیریں بھی کھینچے جائیں جلتے پانی میں

ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ ﴿٧٢﴾ ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ آيَاتِ مَا

پھر آگ میں ان کو جھونک دیں پھر ان کو کہیں کہاں گئے

كُنْتُمْ تَشْرِكُونَ ﴿٧٣﴾ مِنْ دُونِ اللَّهِ قَالُوا ضَلُّوا

جن کو تم شرک بتلایا کرتے تھے اللہ کے سوائے بولیں وہ ہم سے چوک گئے

عَمَّا بَلَغَ لَكُمْ تَكُنْ تَدْعُو أَمِنْ قَبْلُ شَيْئًا كَذَلِكَ

کوئی نہیں ہم تو پکارتے نہ تھے پہلے کسی چیز کو اس طرح

يُضِلُّ اللَّهُ الْكَافِرِينَ ﴿٤٧﴾ ذَلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُونَ

بھلاتا ہے اللہ منکروں کو یہ بدلہ اُس کا جو تم اتراتے پھرتے تھے

فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُونَ ﴿٤٨﴾

زمین میں ناحق اور اس کا جو تم اکر دیتے تھے

أَدْخُلُوا أَبْوََابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَبِعُزْسِ

داخل ہو جاؤ دروازوں میں دوزخ کے سدا رہنے کو اُس میں سو کیا بُرا

مَتَّوِي الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٤٩﴾ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ

ٹھکانا ہے غرور والوں کا سو تو ٹھہرا رہ بیشک وعدہ اللہ کا ٹھیک ہے

فَأَمَّا ثَرْيُكَ بِعُضِّ الَّذِي نَعِدُ هُمْ أَوْ نَتَوْقِيكَ

پھر اگر ہم دکھلا دیں تجھ کو کوئی وعدہ جو ہم ان سے کرتے ہیں یا قہقہہ کر لیں تجھ کو

فَالْيَنَّا يُرْجِعُونَ ﴿٥٠﴾ وَلَقَدْ آسَرْنَا رَسُولَ سُلَاسٍ مِنْ قَبْلِكَ

ہر حالت میں ہماری ہی طرف پھرتے ہیں اور ہم نے بھیجے ہیں بہت رسول تجھ سے پہلے

مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ

بعضے ان میں وہ ہیں کہ ہم نے سنایا تجھ کو ان کا احوال اور بعضے ہیں کہ

نَقْصُصْ عَلَيْكَ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ

نہیں سنایا اور کسی رسول کا مقدمہ نہ تھا کہ لے آتا کوئی نشانی

إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ فَخِصْ بِالْحَقِّ

مگر اللہ کے حکم سے پھر جب آیا حکم اللہ کا فیصلہ ہو گیا انصاف سے

وَنَحْسِرَ هُنَالِكَ الْهَاطِلُونَ ﴿٥١﴾

اور لوٹے ٹپیں پارٹے اس جگہ جھوٹے

خُلَاصَةُ تَفْسِيرِ

کیا آپ نے ان لوگوں (کی حالت) کو نہیں دیکھا جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں جھگڑے نکال دیتے ہیں (حق سے) کہاں پھرے چلے جا رہے ہیں جن لوگوں نے اس کتاب (یعنی قرآن) کو جھٹلایا اور اس

چیز کو بھی (جھٹلایا) جو ہم نے اپنے پیغمبروں کو دیکر بھیجا تھا (اس میں کتب و احکام و معجزات سب داخل ہو گئے) کیونکہ مشرکین عرب اور کسی پیغمبر کو بھی نہیں مانتے تھے (سوان کو ابھی یعنی قیامت میں کہ قریب ہے) معلوم ہوا جاتا ہے جبکہ طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور (اُن طوقوں میں) زنجیریں (پروٹی ہوئی ہوں گی) جن کا دوسرا سرا فرشتوں کے ہاتھ میں ہوگا اور ان زنجیروں سے) ان کو گھسیٹتے ہوئے کھولتے پانی میں پہنچائیں گے۔ پھر یہ آگ میں جھونک دئے جائیں گے پھر اُن سے پوچھا جاوے گا کہ وہ (معبود) غیر اللہ کہاں گئے جن کو تم شریک (خدائی) ٹھہراتے تھے (یعنی تمہاری مدد کیوں نہیں کرتے) وہ کہیں گے کہ وہ تو سب ہم سے غائب ہو گئے بلکہ (سچ بات تو یہ ہے کہ) ہم اس کے قبل (دنیا میں جو بتوں کو پوجتے تھے تو اب معلوم ہوا کہ) کسی کو بھی نہیں پوجتے تھے (یعنی معلوم ہوا کہ وہ لاشی محض تھے ایسی بات غلطی ظاہر ہونے کے وقت کہی جاتی ہے جیسے کوئی شخص تجارت میں خسارہ اٹھائے اور اس سے پوچھا جاوے کہ تم فلاں مال کی تجارت کیا کرتے ہو اور وہ کہے کہ میں تو کسی کی بھی تجارت نہیں کرتا یعنی جب اس کا منہ حاصل نہ ہو تو یوں سمجھنا چاہیے کہ گویا وہ عمل ہی نہ ہوا آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کو غلطی میں پھنسا رکھتا ہے (کہ جس چیز کے لاشی و غیر نافع ہونے کا وہاں وہ خود اقرار کریں گے) آج یہاں اُن کی عبادت میں مشغول ہیں ارشاد ہوگا کہ) یہ (سزا) اس کے بدلہ میں ہے کہ تم دنیا میں ناحق خوشیاں مناتے تھے اور اس کے بدلہ میں ہے کہ تم اتراتے تھے (اور اس کے قیل اُن کو حکم ہوگا) کہ جہنم کے دروازوں میں گھسو (اور) ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہو سو متکبرین (عن آیات اللہ) کا وہ بُرا ٹھکانا ہے۔ (اور جب اُن سے اس طرح انتقام لیا جاوے گا) تو آپ (چندے) صبر کیجئے بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے پھر جس (عذاب) کا (مطلقاً) ہم اُن سے وعدہ کر رہے ہیں (کہ کفر موجب عذاب ہے) اُس میں سے کچھ قصور (اس عذاب) اگر ہم آپ کو دکھلا دیں (یعنی آپ کی حیات میں اُن پر اُس کا نزول ہو جائے) یا (اس کے نزول کے قبل ہی) ہم آپ کو وفات دیدیں (پھر خواہ بعد میں نزول ہو یا نہ ہو) سو (وہ لوں) احتمال میں کوئی شق ضروری نہیں لیکن ہر حال اور ہر احتمال پر) ہمارے ہی پاس اُن کو آنا ہوگا (اور اس وقت بالیقین ان پر عذاب واقع ہوگا) اور (اس بات کو یاد کر کے بھی تسلی حاصل کیجئے کہ) ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے جن میں بعض تو وہ ہیں کہ اُن کا قصہ ہم نے آپ سے (اجمالاً یا تفصیلاً) بیان کیا ہے اور بعض وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا اور (اتنا امر سب میں مشترک ہے کہ) کسی رسول سے یہ نہ ہو سکا کہ کوئی معجزہ بدوّن اذن الہی کے ظاہر ہو سکے (اور اُمت کی ہر فرمائش پوری کر سکے) سو بعض اس لئے بھی اُن کی تکذیب کرتے رہے، اسی طرح یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو آپ تسلی رکھئے اور صبر کیجئے پھر جس وقت اللہ کا حکم (نزول عذاب کے لئے) آدیکھا

(خواہ دنیا میں یا آخرت میں بقولہ تعالیٰ قَامَا تَرْيَدُكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُكُمْ لَوْ تَصِيكَ تَصِيكَ (عملی) فیصلہ ہو جاوے گا اور اس وقت اہل باطل خسارہ میں رہ جاویں گے۔

معارف مسائل

يُسْحَبُونَ فِي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ - حمیم کھولتا ہوا گرم پانی ہے۔ اس آیت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اہل جہنم کو پہلے حمیم میں ڈالا جائے گا، اس کے بعد حمیم یعنی جہنم میں اور لفظ حمیم اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ حمیم جہنم سے باہر کسی جگہ ہے۔ سورۃ صافات کی آیت ثُمَّ اِنَّهُمْ رُجِعُوْهُمْ اِلَى الْجَحِيْمِ سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ حمیم جہنم سے باہر کسی جگہ ہے اہل جہنم کو اس کا پانی پلانے کے لئے لایا جائے گا پھر جہنم میں لوٹا دیا جائے گا۔ اور بعض آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ حمیم بھی حمیم ہی میں ہے جیسے هٰلِكًا جَهَنَّمَ اَلَّتِي يُكَدِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ اٰنٍ اس میں تصریح ہے کہ حمیم بھی جہنم کے اندر ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد و تعارض نہیں۔ جہنم ہی کے بہت سے طبقات ہوں گے جن میں قسم قسم کے عذاب ہوں گے۔ انہیں میں ایک طبقہ حمیم کا بھی ہو سکتا ہے جس کو بوجہ ممتاز اور الگ ہونے کے جہنم سے خارج بھی کہا جاسکتا ہے اور چونکہ یہ بھی ایک طبقہ جہنم ہی کا ہے اس لئے اس کو جہنم بھی کہا جاسکتا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اہل جہنم نہنجیروں میں جکڑے ہوئے کبھی کبھی حمیم میں ڈال دئے جاویں گے کبھی حمیم میں۔

قَالُوا اضْلَوْا هٰذَا - یعنی جہنم میں پیچکر مشرکین کہیں گے وہ بت اور شیاطین جن کی ہم عبادت کیا کرتے تھے آج غائب ہو گئے۔ مراد یہ ہے کہ ہمیں نظر نہیں آ رہے اگرچہ وہ بھی جہنم کے کسی گوشہ میں پڑے ہوں جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات سے ان کا جہنم میں ہونا ثابت ہے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ خَصَبٌ جَعَلْتُمْ۔

بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُونَ فِي الْاَمْثَلِ بِغِيَا لِحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُونَ - تفرحون - فرح سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں خوش ہونا اور مسرور ہونا۔ اور تفرحون، فرح سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اترانا اور مال و دولت پر فخر و غرور میں مبتلا ہو کر دوسروں کے حقوق میں تعدی کرنا۔ فرح تو مطلقاً مذموم اور حرام ہے اور فرح یعنی خوشی میں یہ تفصیل ہے کہ مال و دولت کے نشہ میں خدا کو بھول کر معاصی سے لذت حاصل کرنا اور ان پر خوش ہونا یہ تو حرام و ناجائز ہے اور اس آیت میں یہی فرح مراد ہے جیسے قارون کے قصہ میں بھی فرح اسی معنی میں آیا ہے لَا تَفْرَحْ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ۔ یعنی بہت خوش نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ خوش ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور دوسرا درجہ فرح کا یہ ہے کہ دنیا کی نعمتوں اور راحتوں کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھ کر ان پر خوشی و مسرت کا اظہار کرے، یہ جائزہ بلکہ مستحب اور مامور بہ ہے۔ ایسی فرح کے متعلق قرآن کریم نے فرمایا۔ فِیْ ذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا۔ یعنی اس پر خوش ہونا چاہیے۔ آیت مذکورہ میں فرح کے ساتھ کوئی قید نہیں مطلقاً سبب عذاب ہے اور فرح کے ساتھ بغیر الحق کی قید لگا کر قبلہ دیا کہ ناحق اور ناجائز لذتوں پر خوش ہونا حرام اور حق و جائز نعمتوں پر بطور شکر کے خوش ہونا عبادت اور ثواب ہے۔

فَأَصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَإِمَّا نُرَبِّيكَ ۖ الْآیۃ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشی کے ساتھ اس کے منتظر تھے کہ کافروں کو عذاب ملے۔ اس لئے آپ کی تسلی کے لئے اس آیت میں یہ فرمایا کہ آپ فرا صبر کریں، اللہ نے جو وعدہ ان کے لئے عذاب کا کیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ خواہ آپ کی حیات ہی میں یا آپ کی وفات کے بعد۔ کافروں کے عذاب کا انتظار بظاہر شانِ رحمتہ للعالمین کے منافی ہے۔ لیکن جبکہ مجرمین کو سزا دینے سے مقصد غیر مجرم مؤمنین کو تہنیر ظلم کیا گیا تھا تسلی دینا ہو تو مجرموں کو سزا، شفقت و رحمت کے منافی نہیں۔ کسی مجرم کو سزا دینا کسی کے نزدیک بھی رحمت کے خلاف نہیں سمجھا جاتا۔

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَنْعَامَ لِتَرْكَبُوا مِنْهَا

اللہ ہے جس نے بنادیئے تمہارے واسطے چوپائے تاکہ سواری کرو بعضوں پر

وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۝۷۹ وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوا

اور بعضوں کو کھاتے ہو اور ان میں تم کو بہت فائدے ہیں اور تاکہ پہنچو

عَلَيْهَا حَاجَةً فِي صُدُورِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ

ان پر چڑھ کر کسی کام تک جو تمہارے جی میں ہو اور ان پر اور کشتیوں پر

تَحْمَلُونَ ۝۸۰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ ۖ فَآيَ آيَاتِ اللَّهِ

لہے پھرتے ہو اور دکھلاتا ہے تم کو اپنی نشانیاں پھر کون کون سی نشانیوں کو اپنے

تَنْكِرُونَ ۝۸۱ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا

رب کی نہ مانو گے کیا پھرے نہیں وہ ملک میں کہ دیکھ لیتے

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ كَانُوا أَكْثَرَ

کیا انجام ہوا ان سے پہلوں کا وہ تھے ان سے

مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَمَا أَغْنَىٰ

زیادہ اور زور میں سخت اور نشانوں میں جو چھوڑ گئے ہیں زمین پر پھر کام نہ آیا

عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨٢﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ

ان کے جو وہ کھاتے تھے پھر جب پہنچے ان کے پاس رسول ان کے

بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ

کھلی نشانیاں لے کر اترائے تھے اس پر جو ان کے پاس تھی خبر اور الٹ پڑی

بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٨٣﴾ فَلَمَّا رَأَوْا

ان پر وہ چیز جس پر تمہٹھا کرتے تھے پھر جب انھوں نے دیکھ لیا

بِآسَانَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحْدَهُ ۖ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ

ہماری آفت کو بولے ہم یقین لائے اللہ اکیلے پر اور ہم نے چھوڑ دیں وہ چیزیں جن کو

مُشْرِكِينَ ﴿٨٤﴾ فَلَمْ يَلِكُ يَنْفَعُهُمْ إِيْمَانُهُمْ لَمَّا

شرک بتلائے تھے پھر نہ ہوا کہ کام آئے ان کو یقین لانا ان کا جس وقت

رَأَوْا بِآسَانَا ۖ سُدَّتِ اللَّهُ إِلَيْهِ قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِكُمْ

دیکھ چکے ہمارا عذاب رسم پڑی ہوئی اللہ کی جو چلی آئی ہے اس کے بندوں میں

وَحَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ﴿٨٥﴾

اور خراب ہوئے اس جگہ منکر

خلاصہ تفسیر

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے موشی بنائے تاکہ ان میں بعض سے سواری لے اور ان میں بعض (ایسے
میں کہ ان کو) کھاتے بھی ہو اور تمہارے لئے ان میں اور بھی بہت سے فائدے ہیں (کہ ان کے بال اور
اُون کام آتی ہے) اور (اس لئے بنائے) تاکہ تم ان پر (سوار ہو کر) اپنے مطلب تک پہنچو جو تمہارے دلوں
میں ہے (جیسے کسی سے ملنے کے لئے جانا تجارت کے لئے جانا وغیرہ وغیرہ) اور (سوار ہونے میں کچھ ان ہی
کی تخصیص نہیں بلکہ) ان پر (بھی) اور کشتی پر (بھی) لدے لدے پھرتے ہو اور (ان کے علاوہ) تم کو اپنی
(قدرت کی) اور نشانیاں دکھلاتا رہتا ہے (چنانچہ ہر مصنوع اس کی صنعت پر ایک نشان ہے) سو تم

اللہ کی کون کون سی نشانیوں کا انکار کرو گے (اور یہ لوگ جو بعد قیام دلائل بھی توحید کے منکر ہیں تو کیا ان کو شرک کے وبال کی خبر نہیں اور) کیا ان لوگوں نے ملک میں چل بھر کر نہیں دیکھا کہ جو (مشرک) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (اس شرک کی بدولت) ان کا کیسا انجام ہوا (حالانکہ) وہ لوگ ان سطوح میں بھی (زیادہ تھے اور قوت اور نشاۃ میں بھی) جو کہ زمین پر چھوڑ گئے ہیں (مثل عمارات وغیرہ) بڑھے ہوئے تھے سوان کی (یہ تمام تر) کمائی ان کے کچھ کام نہ آئی (اور عذاب الہی سے نہ بچ سکے) غرض جب ان کے پیغمبر ان کے پاس کھلی دلیلیں لے کر آئے تو وہ لوگ اپنے (علم) (معاش) پر بڑے نازاں ہوئے جو ان کو حاصل تھا (یعنی معاش کو مقصود سمجھ کر اور اس میں جو ان کو لیاقت حاصل تھی اس پر خوش ہوئے اور معاد کا انکار کر کے اس کی طلب کو دیوانگی اور اس کے انکار پر وعید عذاب سے تشکر کیا) اور (اس کے وبال میں) ان پر وہ عذاب آپڑا جس کے ساتھ مستحضر کرتے تھے، پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہنے لگے (اب) ہم خدائے واحد پر ایمان لائے اور ان سب چیزوں سے ہم منکر ہوئے جن کو ہم اُس کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے سوان کا یہ ایمان لانا نافع نہ ہوا جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ (کیونکہ وہ ایمان اضطراری ہے اور بندہ مکلف ہے ایمان اختیاری کا) اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی معمول مقرر کیا ہے جو اس کے بندوں میں پہلے سے ہونا چلا آیا ہے اور اس وقت (یعنی جبکہ ایمان نافع نہ ہوا) کافر خسارہ میں رہ گئے (پس ان مشرکین کو بھی یہ سمجھ کر ڈرنا چاہیے، ان کے لئے بھی یہی ہوگا پھر کچھ تلافی نہ ہو سکے گی)۔

معارف و مسائل

فَرِحُوا بِمَا حَسَدَ هُمْ مِنَ الْعِلْمِ۔ یعنی ان عاقبت نا اندیش منکرین کے پاس جب اللہ تعالیٰ کے رسول دلائل واضح توحید و ایمان لے کر آئے تو یہ لوگ اپنے علم کو انبیاء کے لئے ہوئے علم سے بہتر اور حق سمجھ کر انبیاء کے کلام کا رد کرنے لگے۔ یہ علم جس پر کفار خوش اور مغن تھے اور اس کے مقابلہ میں انبیاء کے علوم کو رد کرتے تھے۔ یا تو ان کا جہل مرکب تھا کہ حق اور باطل کو حق و صحیح سمجھ بیٹھے تھے۔ جیسے یونانی فلاسفہ کے بیشتر علوم و تحقیقات جو الہیات سے متعلق ہیں اسی نمونہ کی ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں۔ ان کو جہل مرکب تو کہہ سکتے ہیں۔ ان کا نام علم رکھنا علم کی توہین ہے۔ یا پھر ان کے اس علم سے مراد دنیا کی تجارت، صنعت وغیرہ کا علم ہے جس میں یہ لوگ فی الواقع ماہر تھے اور قرآن کریم نے ان کے اس علم کا ذکر سورہ روم کی آیت میں اس طرح

فرمایا ہے یَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَفْلُونَ۔ یعنی لوگ دنیا کی ظاہری زندگی اور اس کے منافع حاصل کرنے کو تو کچھ جانتے سمجھتے ہیں، مگر آخرت جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور جہاں کی راحت و کلفت دائمی ہے اُس سے بالکل جاہل و غافل ہیں۔ اس آیت میں بھی اگر یہی علم ظاہر دنیا کا مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ یہ لوگ چونکہ قیامت اور آخرت کے منکران و ہاں کی راحت و کلفت سے جاہل و غافل ہیں۔ اسی لئے اپنے اسی ظاہری ہنسر پر خوش اور مگن ہو کر انبیاء کے علوم کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ (منظہری)

فَلَمَّا نَبَتْ يَنْفَعُهُمْ إِيْمَانُهُمْ۔ یعنی عذاب سامنے آنے کے بعد یہ لوگ ایمان کا اقرار کرتے ہیں مگر اس وقت کا ایمان اللہ کے نزدیک مقبول و معتبر نہیں۔ حدیث میں ہے کہ یَقْبِلُ اللَّهُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يَغْشَ غُرًّا (ابن کثیر)۔ یعنی اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ اس وقت سے پہلے پہلے قبول کرتے ہیں جس وقت نزعِ رُوح اور غرغرة موت سامنے آجائے، اسی طرح پر عذاب آسمانی کے سامنے آ جانے کے بعد کسی کی توبہ اور ایمان قبول نہیں ہوتا۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ وَالتَّوْبَةَ قَبْلَ الْمَوْتِ وَالْيَسْرَةَ الْمَعَافَاةَ عِنْدَ الْمَوْتِ وَالْمَغْفِرَةَ وَالرَّحْمَةَ بَعْدَ الْمَوْتِ بِبِرْكَةِ اِلٰهِ حَمْدًا وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی النَّبِیِّ الْکَرِیْمِؐ۔

تمت سورۃ المؤمن بحمد اللہ تعالیٰ و عونہ

لثالث عشر من ربيع الآخر سنة ۱۳۹۲ھ یوم السبت

فله الحمد اوله و آخره و ظاهره و باطنه

سُورَةُ حَمِّ السَّجْدَةِ

سُورَةُ حَمِّ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ أَرْبَعٌ وَخَمْسُونَ آيَةً وَتَسْتُرُكُونَ

سورۃ حم سجدہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پچون آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شرع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

حَمَّ ۱ تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۲ كِتَابٌ

انارہوا ہے بڑے مہربان رحم والے کی طرف سے ایک کتاب ہے کہ

فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۳ بَشِيرًا

جدی جدی کی ہیں اسکی آیتیں قرآن عربی زبان کا ایک سمجھ والے لوگوں کو سنائے والا

وَنَذِيرًا ۴ فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۵ وَ

نوحیجزی اور ڈر پر دھیان میں نہ لائے وہ بہت لوگ سو وہ نہیں سنتے اور

قَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي

کہتے ہیں ہمارے دل غلاف میں ہیں اس بات سے جسکی طرف تو ہم کو بلاتا ہے اور ہمارے

أَذَانِنَا وَقُرْآنٌ مِّنْ بَيْنِنَا وَبَيْنَكَ حِجَابٌ ۶ فاعْمَلْ

کالوں میں بوجھ ہے اور ہمارے اور تیرے بیچ میں پردہ ہے سو تم اپنا کام کر

إِنَّا عَمِلُونَ ۷ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَىٰ

ہم اپنا کام کرتے ہیں تو کہہ میں بھی آدمی ہوں جیسے تم حکم آتا ہے مجھ کو

أَنَّمَا أَلْهَمَكُمْ إِلَهُ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوا ۸

کہ تم پر ہدایت کی ایک حاکم کی ہے سو سیدھے رہو اس کی طرف اور اس سے گناہ بخشاؤ

وَوَيْلٌ لِلْمُشْرِكِينَ ۝۶۱ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ

اور خرابی ہے مشرکین کرنے والوں کو جو نہیں دیتے زکوٰۃ

وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ۝۶۲ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا

اور وہ آخرت سے مستکرم ہیں البتہ جو لوگ یقین لائے

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝۶۳

اور ان کے بھلے کام ان کو ثواب ملتا ہے جو مومنوں سے ہو -

خلاصہ تفسیر

حکم (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) یہ کلام رحمن و رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے یہ (کلام) ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی (زبان میں) ہے تاکہ جو بلا واسطہ اس کے مخاطب ہیں یعنی عرب لوگ وہ آسانی سے سمجھ لیں اور ایسے لوگوں کے لئے (نافع) ہے جو دانشمند ہیں (یعنی اگرچہ مکلف اور مخاطب احکام کے سمجھ میں مگر ان سے نفع دہی لوگ اٹھاتے ہیں جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں قرآن ایسے لوگوں کو) بشارت دینے والا ہے اور (نہ ماننے والوں کے لئے) ڈرانے والا ہے سو (اس کا تقاضہ یہ تھا کہ سمجھی اس پر ایمان لاتے مگر) اکثر لوگوں نے (اس سے) روگردانی کی پھر وہ سنتے ہی نہیں اور (جب آپ ان کو سناتے ہیں تو) وہ لوگ کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف آپ ہم کو بلاتے ہیں ہمارے دل اس سے پرہیز میں ہیں (یعنی آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی) اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ (لگ رہی ہے) اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک حجاب ہے سو آپ اپنا کام کئے جائیے۔ ہم اپنا کام کر رہے ہیں (یعنی ہم سے قبول کی امید نہ رکھئے ہم اپنے طریقہ و کار کو نہ چھوڑیں گے) آپ فرما دیجیے کہ (تمہیں ایمان پر مجبور کر دینا تو میرے بس کی بات نہیں، کیونکہ میں بھی تم ہی جیسا بشر ہوں) خدا نہیں جو دلوں میں تصرف کر سکوں البتہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ امتیاز دیا ہے کہ) مجھ پر یہ وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے (اور یہ وحی ایسی ہے کہ ہر شخص غور کرے تو اس کا حق و معقول ہونا اس کی سمجھ میں آسکتا ہے اور جبکہ میری نبوت اور وحی معجزات کے ذریعہ ثابت ہو چکی تو میری بات بہر حال ماننا سب پر فرض ہے، تمہارے قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں ضرور قبول کرو) اس (معبود برحق) کی طرف سیدھ یا مذھ لو (یعنی اس کے سوا کسی کی عبادت کی طرف توجہ نہ کرو) اور اس سے معافی مانگو (یعنی پچھلے اعمال شرکیہ سے توبہ کرو، اور اپنی خطا کی معافی مانگو) اور ایسے مشرکوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو (دلائل نبوت کو دیکھنے

اور دلائل توحید کو سننے کے باوجود اپنے باطل طریقہ کو نہیں چھوڑتے اور زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے منکر ہی رہتے ہیں (ان کے برخلاف) جو لوگ ایمان لے آئے اور انھوں نے تیک کام کئے اُن کے لئے (آخرت میں) ایسا اجر ہے جو (کبھی) موقوف ہونے والا نہیں۔

معارف مسائل

یہ سات سورتیں جو حسم سے شروع ہوئی ہیں جن کو الی حسم یا حوامیم کہا جاتا ہے۔ باہم اتیا کے لئے ان کے ساتھ نام میں کچھ اور الفاظ بھی شامل کئے جاتے ہیں۔ مثلاً سورۃ مؤمن کے حسم کو حسم المؤمن اور اس سورت کے حسم کو حسم السجدہ یا حسم فصلت بھی کہا جاتا ہے۔ اس سورت کے یہ دونوں نام معروف ہیں حسم فصلت اور حسم السجدہ۔

اس سورۃ کے پہلے مخاطب قریش عرب ہیں جن کے سامنے یہ قرآن نازل ہوا اور ان کی زبان میں نازل ہوا۔ انھوں نے قرآن کے اعجاز کا مشاہدہ کیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشمار معجزات دیکھے اس کے باوجود قرآن سے اعراض کیا۔ اور سمجھنا کیا سنا بھی گوارا نہ کیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشفقانہ نصیحتوں کے جواب میں بالآخر یہ کہہ بیٹھے کہ آپ کی باتیں نہ ہماری سمجھ میں آتی ہیں نہ ہمارے دل ان کو قبول کرتے ہیں نہ ہمارے کان ان کو سننے کے لئے آمادہ ہیں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان تو دھڑیرے پردے حائل ہیں۔ بس اب آپ اپنا کام کریں، ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔

یہی مفہوم ہے اس سورت کی ابتدائی پانچ آیاتوں کا۔ ان آیاتوں میں حق تعالیٰ نے قریش کی خصوصیت سے اس کا اظہار فرمایا کہ قرآن کو عربی زبان میں تمھاری خاطر نازل کیا گیا کہ تمھیں اس کے مضامین سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ اس کے ساتھ قرآن کریم کی تین صفتیں بتلائی گئیں۔ اول یہ کہ فصلت ایثہ فصلت تفصیل سے ماخوذ ہے جس کے اصل معنی مضامین کو فصل فصل کر کے ممتاز کر دینا ہے مراد اس سے کھول کر وضاحت سے بیان کرنا ہے، خواہ وہ مختلف فصلوں میں ہو یا ایک ہی جگہ۔ قرآن کریم کی آیات میں احکام۔ قصص۔ عقائد۔ اہل باطل کا رد وغیرہ۔ مختلف مضامین کو الگ الگ بھی بیان کیا گیا ہے اور ہر مضمون کو مثالوں سے واضح کر کے سمجھایا گیا ہے۔ دوسری اور تیسری صفت قرآن کریم کی یہ بتلائی کہ وہ بشیر اور نذیر ہے یعنی اپنے ماننے والوں کو دائمی راحتوں کی خوشخبری اور نہ ماننے والوں کو آبدی عذاب سے ڈراتا ہے۔

اور ان سب صفات کو بیان کر کے آخر میں فرمایا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ یعنی آیات قرآن کا

عربی زبان میں ہونا واضح اور صاف ہونا اور بشارت و نذارت پر مشتمل ہونا، یہ سب ایسے ہی لوگوں کو نفع دے سکتے ہیں جو سوچے اور سمجھنے کا ارادہ بھی کریں۔ **يَعْلَمُونَ** کے لفظ سے اس جگہ بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مراد ہے اسی لئے علامہ تفسیر میں اس کا ترجمہ دانشمند سے کیا گیا ہے۔ مگر عرب اور قریش نے ان سب باتوں کے باوجود اس سے اعراض کیا، سمجھنا کیا سنا بھی گوارا نہ کیا جس کا ذکر انہی آیات میں قاعرض **اَكْثَرُهُمْ** سے فرمایا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کفار مکہ کی طرف سے ایک پیش کش

کفار قریش جو اس سورت کے بلا واسطہ مخاطب ہیں۔ انہوں نے نزول قرآن کے بعد ابتداء اسلام میں زور قوت کے ساتھ اسلام کی تحریک کو دبانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور آپ پر ایمان لانے والوں کو طرح طرح کی ایذا میں پہنچا کر خود قزہ کرنے کی بہت سی کوششیں کیں۔ لیکن اسلام ان کے علی الرغم بڑھتا اور قوت پکڑتا چلا گیا۔ پہلے حضرت حمزہ جو قریش کے مسلم سردار تھے وہ مسلمان ہو گئے پھر حضرت عمر بن خطابؓ جیسے قوی اور جبری داخل اسلام ہو گئے تو اب قریش مکہ نے تحویف کا راستہ چھوڑ کر ترغیب اور لالچ کے ذریعہ تبلیغ اسلام کا راستہ روکنے کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیں۔ اسی سلسلہ کا ایک واقعہ ہے جسکو حافظ ابن کثیرؒ نے مسند بزار ابو یعلیٰ اور بغوی کی روایتوں سے نقل کیا ہے۔ ان سب روایتوں میں **اَقْبُوْا اَقْرَبَ** ہے۔ ابن کثیرؒ نے ان میں بغوی کی روایت کو سب سے زیادہ اشد و اقرب قرار دیا۔ اور ان سب کے بعد محمد بن اسحق کی کتاب السیرۃ سے اس واقعہ کو نقل کر کے ان سب روایات پر اس کو ترجیح دی۔ اس لئے یہ قصہ اس جگہ ابن اسحق ہی کی روایت کے مطابق نقل کیا جاتا ہے۔

محمد بن اسحق نے بیان کیا کہ محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا بڑا سردار مانا جاتا تھا، ایک دن قریش کی ایک جماعت کے ساتھ مسجد حرام میں بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے گوشہ میں اکیلے بیٹھے تھے۔ عتبہ نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر آپ لوگوں کی رائے ہو تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے گفتگو کروں اور ان کے سامنے کچھ ترغیب کی چیزیں پیش کروں کہ اگر وہ ان میں سے کسی کو قبول کر لیں تو ہم وہ چیزیں انہیں دیدیں تاکہ وہ ہمارے دین و مذہب کے خلاف تبلیغ کرنا چھوڑ دیں۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جبکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہو چکے تھے اور مسلمانوں کی قوت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ عتبہ کی پوری قوم نے بیک زبان کہا کہ اے ابوالولید (یہ اس کی کنیت ہے) ضرور ایسا کریں اور ان سے گفتگو کر لیں۔ عتبہ اپنی جگہ سے اٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ گفتگو شروع کی کہ اے ہمارے بھتیجے آپ کو معلوم ہے کہ ہماری قوم قریش میں آپ کو ایک مقام بلند نسب

اور شرافت کا حامل آپ کا خاندان وسیع اور ہم سب کے نزدیک مکرم و محترم ہے۔ مگر آپ نے قوم کو ایک بڑی مشکل میں پھنسا دیا ہے۔ آپ ایک ایسی دعوت لے کر آئے، جس نے ہماری جماعت میں تفرقہ ڈال دیا، ان کو بے وقوف بنایا، ان کے معبودوں پر اور ان کے دین پر عیب لگایا اور ان کے جو آباء و اجداد گنہگار تھے ان کو کافر قرار دیا۔ اس لئے آپ میری بات سنیں، میں چند چیزیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، تاکہ آپ ان میں سے کسی کو پسند کر لیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا۔ ابوالولید کہیے جو کچھ آپ کو کہنا ہے، میں سنوں گا۔

عتبہ ابوالولید نے کہا کہ اے عیسیٰ، آپ نے جو تحریک چلائی ہے اگر اس سے آپ کا مقصد مال جمع کرنا ہے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے لئے اتنا مال جمع کر دیں گے کہ آپ ساری قوم سے زیادہ مالدار ہو جائیں۔ اور اگر مقصد اقتدار و حکومت ہے تو ہم آپ کو سب قریش کا سردار تسلیم کر لیں گے اور آپ کے حکم کے بغیر کوئی کام نہ کریں گے۔ اور اگر آپ بادشاہت چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں اور اگر یہ صورت ہے کہ آپ کے پاس آنے والا کوئی جن یا شیطان ہے جو آپ کو ان کاموں پر مجبور کرتا ہے اور آپ اس کو دفع کرنے سے عاجز ہیں تو ہم آپ کے لئے ایسے معالج بلوائیں گے جو آپ کو اس تکلیف سے نجات دلا دیں اس کے لئے ہم اپنے اموال خرچ کریں گے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بعض اوقات کوئی جن انسان پر غالب آجاتا ہے جس کا علاج کیا جاتا ہے عتبہ یہ طویل تقریر کرتا رہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے رہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ ابوالولید آپ اپنی بات پوری کر چکے؟ اس نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا کہ اب میری بات سنئے۔ عتبہ نے کہا کہ بے شک میں سنوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے کوئی جواب دینے کے بجائے اس سورۃ فصحت کی تلاوت شروع فرمادی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ اَحْمَدُ تَنْزِیْلُ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ کَلْبٌ مُّصَدِّقٌ اٰیٰتِکَ
قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا تَقُوْمُ عَلَیْکَ مَوْتٌ۔ ہزارا در یغی کی روایت میں ہے کہ جب آپ اس سورت کی آیات پڑھتے پڑھتے اس آیت پر پہنچ گئے، فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ تو عتبہ نے آپ کے منہ مبارک پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اپنے نسب اور رشتہ کی قسم دی کہ ان پر رحم کیجئے۔ آگے کچھ نہ فرمائیے۔ اور ابن اسحق کی روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات پڑھنا شروع کیں تو عتبہ خاموشی کے ساتھ سننے لگا اور کچھ لوگوں کی پیٹھ پیچھے ٹیک لگالی تاکہ غور سے سن سکیں، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کی آیت سجدہ پر پہنچ گئے۔ اور آپ نے سجدہ کیا۔ پھر عتبہ کو خطاب کر کے فرمایا۔

اے ابوالولید۔ آپ نے سن لیا، جو کچھ سنا آپ کو اختیار ہے جو چاہو کر و۔ عتبہ اپنی مجلس سے اٹھ کر اپنی مجلس کی طرف چلا تو یہ لوگ دُور سے عتبہ کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے کہ خدا کی قسم ابوالولید کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ اب اس کا وہ چہرہ نہیں جس میں یہاں سے گئے تھے۔ جب عتبہ اپنی مجلس میں پہنچا تو لوگوں نے پوچھا کہ ابوالولید کیا خبر لائے۔ عتبہ ابوالولید نے کہا کہ میری خبر یہ ہے کہ

إِنِّي سَمِعْتُ قَوْلَ اللَّهِ مَا سَمِعْتُ
مِثْلَهُ قَطُّ وَاللَّهِ مَا هُوَ بِالسَّحَرِ وَلَا بِالْشَّعْرِ
وَلَا بِالْكِهَانَةِ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ أَطِيعُونِي
وَأَجْعَلُوا هَالِي خَلُوءًا بَيْنَ الرَّجُلِ وَ
بَيْنَ مَا هُوَ فِيهِ فَاعْتَزِلُوهُ فَوَاللَّهِ
لَيَكُونَنَّ لِقَوْلِهِ الَّذِي سَمِعْتُ نَبَأَ
فَإِنْ تَصِيبَهُ الْعَرَبُ فَقَدْ كَفَيْتُمُوهُ
بَغَيْرِكُمْ وَإِنْ يَظْهَرِ عَلَى الْعَرَبِ
فَمَلِكُهُ مَلِكُكُمْ وَعِزُّهُ عِزُّكُمْ
وَكُنْتُمْ أَسْعَدَ النَّاسِ بِهِ۔

(بن کثیر ج ۹ ص ۴۷)

میں نے ایسا کلام سنا کہ خدا کی قسم اس سے پہلے کبھی ایسا کلام نہیں سنا تھا، خدا کی قسم نہ تو یہ جادو کا کلام ہے نہ شعر یا کاہنوں کا کلام ہے (جو وہ شیاطین سے حاصل کرتے ہیں)۔ اے میری قوم قریش تم میری بات مانو، اور اس معاملہ کو میرے حوالے کر دو میری رائے یہ ہے کہ تم لوگ ان کے مقابلہ اور ان سے باز آ جاؤ اور ان کو ان کے کام پر چھوڑ دو کیونکہ ان کے اس کلام کی ضرورت ایک خاص شان ہونیوالی ہے۔ تم ابھی انتظار کرو، باقی عرب کے لوگوں کا معاملہ دیکھو۔ اگر قریش کے علاوہ یا فنی عرب لوگوں نے ان کو شکست دیدی تو تمہارا مطلب بغیر تمہاری کسی شمش کے حاصل ہو گیا اور اگر وہ عرب پر غالب آ گئے تو ان کی حکومت تمہاری حکومت ہوگی، ان کی عزت سے تمہاری عزت ہوگی اور اس وقت تم ان کی کامیابی کے شریک ہو گے۔

اس کے ساتھ قریشیوں نے جب اس کا یہ کلام سنا تو کہنے لگے کہ اے ابوالولید تم پر تو محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی زبان سے جادو کر دیا ہے۔ عتبہ نے کہا میری رائے تو یہی ہے، جو کچھ کہہ چکا آگے تمہیں اختیار ہے جو چاہو کر و۔

وَقَالُوا أَتُكُونُ أَكْثَرَهُ۔ اس جگہ کفار قریش کے تین قول نقل کئے گئے، اول یہ کہ آپ کے کلام سے ہمارے دلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ آپ کے کلام سے ہمارے کان بہرے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ہمارے اور آپ کے درمیان پردے حائل ہیں۔ قرآن

میں اس قول کو بطور مذمت کے نقل کیا ہے جس سے ان کا کہنا غلط معلوم ہوتا ہے۔ مگر دوسری جگہ خود قرآن نے ان کا ایسا ہی حال بیان فرمایا ہے۔ سورہ الفعام کی آیت میں ہے۔ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمُ الْكِنَّةَ أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا۔ و مثله فی سورہ بنی اسرائیل والکہف۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کا اس کہنے سے مطلب یہ تھا کہ ہم تو مجبور و معذور ہیں کہ ہمارے دلوں پر پردہ اور کانوں میں بوجھ اور درمیانی حجابات ہیں، تو ہم کیسے آپ کی بات سنیں اور انہیں گویا اپنے آپ کو مجبور ثابت کرنا تھا۔ اور قرآن نے جو ان کا ایسا ہی حال بیان فرمایا، اُس میں ان کو مجبور نہیں قرار دیا بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ ان میں آیات الہیہ کو سننے اور سمجھنے کی پوری صلاحیت تھی، مگر جب انھوں نے کسی طرح ادھر کان بھی نہ لگائے اور سمجھنے کا ارادہ بھی نہ کیا تو سزا کے طور پر اُن پر غفلت و جہالت مسلط کر دی گئی مگر وہ بھی اس درجہ میں نہیں کہ یہ لوگ مسلوب الاختیار ہو جائیں، بلکہ اب بھی ارادہ کر لیں تو پھر سننے اور سمجھنے کی صلاحیت عود کر آئیگی۔ (بیان القرآن)۔

منکرین کے انکار و استہزاء کا پیغمبرؐ پرانہ جواب

قسیم کا استہزاء و تمسخر تھا۔ مگر اس ظالمانہ جبراً و استہزاء کا جو جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلفتین کیا گیا وہ یہ تھا کہ ان کے مقابلہ میں کوئی تشدد کی بات نہ کریں، بلکہ اپنی تواضع کا اظہار کریں کہ میں خدا نہیں جو ہر کام کا مالک و مختار ہوں بلکہ تم ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ فرق صرف اس کا ہے کہ مجھے میرے رب نے وحی بھیج کر ہدایت کی اس کی تائید کے لئے معجزات دیئے۔ جس کا اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ تم سب مجھ پر ایمان لاتے۔ اور اب بھی میں تمہیں یہی وصیت کرتا ہوں کہ اپنا رخ عبادت و طاعت میں صرف ایک اللہ کی طرف کر لو اور پچھلے گناہوں سے توبہ کر لو۔

آخر خطاب میں قرآنی بشارت و نذارت کے دونوں پہلو ان کے سامنے کر دئے کہ مشرکین کیلئے بڑی خرابی ہے اور مؤمنین کے لئے دائمی ثواب۔ اس میں مشرکین کی خرابی بیان کر لے کے ضمن میں اس کی وجہ یہ ذکر کی گئی ہے کہ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ یعنی یہ لوگ زکوٰۃ نہیں دیا کرتے تھے۔ اس میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ یہ آیات مکئی ہیں اور زکوٰۃ کی فرضیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے تو فرض ہونے سے پہلے ہی ان پر عدم ادائیگی زکوٰۃ کا الزام کیسے درست ہوا؟

اس کا جواب تو ابن کثیرؒ نے یہ دیا ہے کہ اصل زکوٰۃ تو ابتداء اسلام ہی میں نماز کے ساتھ ہی فرض ہو گئی تھی جس کا ذکر سورہ مزمل کی آیات میں آیا ہے۔ مگر اس کے مضامین کی تفصیلات اور وصولیاتی کا انتظام مدینہ طیبہ میں ہوا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مکہ میں زکوٰۃ فرض نہیں تھی

کیا کفار فروع اعمال کے
مکلف اور مخاطب ہیں یا نہیں

دوسرا اشکال یہ ہے کہ کفار بہت سے فقہاء کے نزدیک مخاطب بالفروع نہیں ہوتے، یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے احکام ان پر عائد نہیں ہوتے۔ ان پر عائد حکم تو یہ ہے کہ وہ پہلے ایمان قبول کریں، ایمان کے بعد غیر فروع عائد ہوتے ہیں تو جب ان پر زکوٰۃ کا فرض عائد ہی نہیں۔ تو اس کے ترک پر عتاب کیسا؟

جواب یہ ہے کہ بہت سے ائمہ و فقہاء کے نزدیک تو کفار بھی مخاطب بالفروع ہیں، ان کے اعتبار سے تو یہ اشکال ہی نہیں ہوتا۔ اور جو لوگ کفار کو مخاطب بالفروع نہیں مانتے وہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں ترک زکوٰۃ پر اصل مذمت نہیں بلکہ ان کا ترک زکوٰۃ چونکہ کفر کی بنا پر تھا اور ترک زکوٰۃ اس کی علامت تھی اس لئے ان کو عتاب کرنے کا حاصل یہ ہوا کہ تم مؤمن ہوتے تو زکوٰۃ کی پابندی کرتے۔ تمہارا تصور ایمان نہ لانا ہے۔ (بیان القرآن)۔ اور کفار کے مخاطب بالفروع ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق احقر کی کتاب احکام القرآن، حزب خامس میں ہے جو بزبان عربی شائع ہوئی ہے۔

تیسرا سوال یہاں یہ ہوتا ہے کہ احکام اسلام میں سب سے مقدم تو نماز ہے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ زکوٰۃ کو خصوصیت سے ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب قرطبی وغیرہ نے یہ دیا ہے کہ قریش عرب مالدار لوگ تھے۔ اور صدقہ و خیرات غریبوں کی امداد ان کا خاص وصف تھا۔ مگر جو لوگ مسلمان ہو جاتے۔ یہ لوگ ان کو اس طرح کی خاندانی اور معاشرتی امداد سے بھی محروم کر دیتے تھے۔ اس کی مذمت کرنا مقصود ہے اس لئے زکوٰۃ کو خصوصیت سے ذکر کیا گیا۔ واللہ اعلم

لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ۔ لفظ مَمْنُون کے معنی مقطوع کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ایمان و عمل صالح کے پابند لوگوں کو آخرت میں جو اجر دیا جائے گا وہ دائمی غیر منقطع ہوگا۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ مؤمن جن اعمال صالحہ کا عادی ہوتا ہے، اگر کسی بیماری یا سفر یا دوسرے عذر سے کسی وقت یہ عمل بھی ترک ہو جائے تو بھی اس عمل کا اجر قطع نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ میرا بندہ جو عمل اپنی تندرستی اور فرصت کے اوقات میں پابندی سے کیا کرتا تھا، اس کے عذر کی حالت میں بھی وہ اعمال بغیر کئے ہوئے اس کے نامہ اعمال میں لکھے جاتے رہیں۔ اس مضمون کی حدیثیں صحیح بخاری میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے اور مشرح السنۃ ابنہی میں حضرت ابن عمرؓ اور انسؓ سے اور رزینؓ نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت کی ہیں۔ (منظہری)

قُلْ آيَاتُكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي

تو کہہ کیا تم منکر ہو اس سے جس نے بنائی زمین دو

يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ آندَادًا ذَلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۹

دن میں اور برابر کرتے ہو اس کے ساتھ اوروں کو وہ ہے رب جہان کا

وَجَعَلَ فِيهَا سَرَاسً مِّنْ فَوْقِهَا وَبَرَكٌ فِيهَا وَقَدْ رَأَىٰ

اور رکھے اس میں بھاری پہاڑ اور برکت رکھی اس کے اندر اور ٹھہرائیں

فِيهَا أَقْوَامًا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءٌ لِّلسَّاعِلِينَ ۱۰

اس میں خوراکیں اس کی چار دن میں پورا ہوا یا چھیننے والوں کو

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا

پھر چڑھا آسمان کو اور وہ دھواں ہو رہا تھا پھر کہا اس کو

وَالْأَرْضَ رِضًا ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا ۖ قَالَتَا أَتَيْنَا

اور زمین کو آؤ تم دونوں خوشی سے یا زور سے وہ بولے ہم آئے

طَائِعِينَ ۱۱ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ

خوشی سے پھر کر دیئے وہ سات آسمان دو دن میں

وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا ۖ وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا

اور اتارا ہر آسمان میں حکم اس کا اور رونق دی ہم نے سب سے ورلے

بِمَصَابِيحٍ ۖ وَحِفْظًا ۖ ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۱۲

آسمان کو چراغوں سے اور محفوظ کر دیا یہ سادھا ہوا ہے زبردست خبردار کا

خلاصہ تفسیر

آپ (ان لوگوں سے) فرمائیے کہ کیا تم لوگ ایسے خدا کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو (بارہ) جوڑ اس کی بڑی وسعت کے (دو روزہ) (کی مقدار وقت) میں پیدا کر دیا اور تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو یہی (خدا جس کی قدرت معلوم ہوئی) سارے جہان کا رب ہے اور اس نے زمین میں اس کے ادھر پہاڑ بنادیئے اور اس (زمین) میں فائدہ کی چیزیں رکھ دیں (جیسے نباتات و حیوانات وغیرہ) اور اس (زمین) میں اس کے رہنے والوں کی غذائیں بخوریت کر دیں (جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ ہر حصہ زمین کے رہنے والوں کے مناسب

الک غذا میں ہیں یعنی زمین میں ہر قسم کے غلے میوے پیدا کر دیئے کہیں کچھ کہیں کچھ جن کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہ سب چار دن میں (ہوا۔ دو دن میں زمین دو دن میں پہاڑ وغیرہ جو شمار میں) پورے ہیں پورے چھنے والوں کے لئے (یعنی ان لوگوں کے لئے جو تخلیق کائنات کی کیفیت اور کمیت کے متعلق آپ سے سوالات کرتے ہیں جیسا کہ یہود نے آپ سے خلق السموات والارض کے متعلق سوال کیا تھا کما فی اللہ المنثور) پھر (یہ سب کچھ پیدا کر کے) آسمان (کے بنانے) کی طرف توجہ فرمائی اور وہ اس وقت ہوا تھا (یعنی آسمان کا مادہ جو زمین کے مادے کے بعد زمین کی موجودہ صورت سے پہلے بن چکا تھا وہ دھوئیں کی شکل میں تھا) سو اس سے اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں (کو ہماری اطاعت کی طرف آنا تو ضرور پڑے گا اب تم کو اختیار ہے کہ) خوشی سے آویزاں بردستی سے (مطلب یہ ہے کہ ہمارے تقدیری احکام جو تم دونوں میں جاری ہوا کریں گے ان کا جاری ہونا تو تمہارے اختیار سے خارج ہے وہ تو ہو کر رہیں گے۔ لیکن جو ادراک و شعور تم کو عطا ہوا ہے اس کے اعتبار سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم ہمارے احکام تقدیری کو اپنی خوشی سے قبول کرو یا ان سے دل میں ناراض ہو، اور وہ زبردستی تمہارے اندر نافذ کئے جاویں۔ جیسے انسان کے لئے امراض اور موت کا معاملہ ہے کہ ان کا ہونا تو امر تقدیری ہے جس کو انسان ٹال نہیں سکتا۔ مگر کوئی دانشمند اس کو راضی خوشی قبول کرتا ہے اور صبر و شکر کے فوائد حاصل کرتا ہے، کوئی ناراض و ناخوش رہتا ہے، گھٹ گھٹ کر مارتا ہے۔ تو اب تم دیکھو کہ ہمارے ان احکام پر راضی رہا کرو گے یا کراہت رکھو گے۔ اور مراد ان تقدیری احکام سے جو آسمان و زمین میں جاری ہونے والے تھے یہ ہیں کہ آسمان ابھی صرف مادہ دھوئیں کی شکل میں تھا، اس کا سات آسمانوں کی صورت میں بنا حکم تقدیری تھا اور زمین اگرچہ بن چکی تھی مگر اس میں بھی ہزاروں انقلابات و تغیرات قیامت تک چلنے والے تھے۔) دونوں نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے (ان احکام کے لئے) حاضر ہیں سو دونوں میں اس کے سات آسمان بنادیئے اور چونکہ ساتوں آسمانوں کو فرشتوں سے آباد و معمور کر دیا گیا تھا اس لئے ہر آسمان میں اس کے مناسب اپنا حکم (فرشتوں کو) بھیج دیا (یعنی جن فرشتوں سے جو کام لینا تھا وہ ان کو بتلا دیا) اور ہم نے اس قریب والے آسمان کو ستاروں زمینیت دی اور (شیاطین کو آسمانی خبریں چوری کرنے سے روکنے کے لئے) اس کی حفاظت کی یہ تجویز ہے (خدا نے) زبردست عالم الکل کی طرف سے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی آیت کے تحت میں چند سوالات و جوابات مذکور ہیں ان میں اس آیت کی جو تشریح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمائی وہ اقرب بآیہی ہے، جو حضرت رحمہ نے تطبیق آیات کے لئے بیان فرمائی ہے۔ اس کے الفاظ جو ابن کثیرؒ نے اسی آیت کے تحت میں نقل کئے ہیں یہ ہیں:-

وخلق الارض في يومين ثم خلق السماء ثم استوى الى السماء فسوَّهن في يومين آخرين ثم دحى الارض ودحىها ان اخروج منها الماء والماء عى وخلق الجبال والرمال والجهاد والاكمام وما بينهما في يومين آخرين فذلك قوله تعالى دحاها۔ اور حافظ ابن کثیرؒ نے بحوالہ ابن جریر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت حٰجَم السجدة کی تفسیر میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ:- یہ وہ مدینہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے متعلق سوال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو اتر اور پیر کے دن پیدا فرمایا، اور پہاڑ اور اس میں جو کچھ معدنیات وغیرہ ہیں ان کو منگل کے روز اور درخت اور پانی کے چشمے اور شہر اور عمارتیں اور دریاں میدان بڑھ کے روز، یہ کل چار روز ہو گئے، جیسا کہ اس آیت میں ہے (عَرَأَيْتُمْ كَتَفُوسًا وَتَبَالَدًا خَلَقَ الْاَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهَا اَنْدَادًا ذٰلِكَ سَبْعُ الْعَالَمِيْنَ وَجَعَلَ فِيْهَا سَاوِاسِي مِّنْ فَوْقِهَا وَبَاسًا فِىْهَا وَقَدْ سَاوِىْهَا اَقْوَامًا فِىْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ طَسَوَاءٌ لِّلْاَسَاوِيْلِيْنَ) یعنی ان لوگوں کے لئے جو اس تخلیق کا سوال کریں پھر فرمایا اور جمعرات کے روز آسمان بنائے اور جمعہ کے روز ستارے اور شمس و قمر اور فرشتے یہ سب کام جمعہ کے دن میں تین ساعت باقی تھیں جب پورے ہوئے۔ ان میں سے دوسری ساعت میں آفات و مصائب جو ہر چیز پر آنے والی ہیں وہ پیدا فرمائی ہیں اور تیسری ساعت میں آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ان کو جنت میں ٹھہرایا اور ابلیس کو سجدہ کا حکم دیا اور سجدہ سے انکار کرنے پر جنت سے نکال دیا گیا۔ یہ سب تیسری ساعت کے ختم تک ہوا۔ (الحديث بطوله۔ ابن کثیر)

ابن کثیرؒ نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا، هَذَا الْحَدِيثُ فِيهِ غَرَابَةٌ۔

اور صحیح مسلم میں ایک حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آئی ہے جس میں تخلیق عالم کی ابتداء یوم السبت یعنی ہفتہ کے روز سے بتلائی گئی ہے۔ اس کے حساب سے آسمان و زمین کی تخلیق کا سات روز ہیں ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مگر عام نصوص قرآن میں یہ تخلیق چھ روز میں ہونا صراحتہً مذکور ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ۔ یعنی ہم نے پیدا

کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے اندر ہے اس کو چھ دن میں اور ہمیں کوئی مکان پیش نہیں آیا۔ اس لئے نیز اس کی سند کے اعتبار سے بھی اکابر محدثین نے اس روایت کو معلول قرار دیا ہے۔ ابن کثیر نے اس کو بحوالہ مسلم و نسائی نقل کر کے فرمایا دھو من غرائب الصحیح المسلم کما فی زاد المسیر لابن الجوزی۔ یعنی یہ حدیث صحیح مسلم کے عجائب میں سے ہے۔ اور پھر فرمایا کہ امام بخاری رحمہ نے اپنی کتاب تاریخ کبیر میں اس روایت کو معلول قرار دیا ہے، اور بعض لوگوں نے اس روایت کو حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کعب احبار نقل کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں اور فرمایا کہ یہی (صحیح ہے)۔ (ابن کثیر ص ۹۴ ج ۴)۔ اسی طرح ابن ہدیٰ اور بیہقی وغیرہ حفاظ حدیث نے بھی اس کو کعب احبار کا قول قرار دیا ہے۔ (ہامشہ زاد المسیر ابن الجوزی ص ۲ ج ۴)۔

پہلی روایت جو ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی عنہ سے نقل کی ہے، ابن کثیر کے فیصلے کے مطابق اس میں بھی غرابت ہے۔ ایک وجہ غرابت کی یہ بھی ہے کہ اس روایت میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق آسمانوں کی تخلیق کے ساتھ آخری دن جمعہ کی آخری ساعت میں، اور اسی ساعت میں حکم سجدہ اور ابلیس کا جنت سے اخراج مذکور ہے۔

حالانکہ متعدد آیات قرآنی میں جو قصہ تخلیق آدم علیہ السلام کا اور حکم سجدہ اور اخراج ابلیس کا مذکور ہے اس کے سیاق سے بدیہی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق آدم علیہ السلام کا واقعہ تخلیق ارض و سما سے بہت زمانہ بعد ہوا ہے جبکہ زمین میں اس کی تمام ضروریات مکمل ہو چکی ہیں اور جنت و شیاطین وہاں بسنے لگے اس کے بعد فرمایا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔

(کذا قال فی المنظہری)

خلاصہ یہ ہے کہ تخلیق ارض و سما کے اوقات اور دن اور ان میں ترتیب جن روایات حدیث میں آئی ہے ان میں کوئی روایت ایسی نہیں جس کو قرآن کی طرح قطعی یقینی کہا جاسکے، بلکہ یہ احتمال غالب ہے کہ یہ اسرائیلی روایات ہوں مرفوع احادیث نہ ہو جیسا کہ ابن کثیر نے مسلم و نسائی کی حدیث کے متعلق اس کی تصریح فرمائی ہے۔ اس لئے آیات قرآنی ہی کو اصل قرآن ذکر مقصود متعین کرنا چاہیے۔ اور آیات قرآنی کو جمع کرنے سے ایک بات تو یہ قطعی معلوم ہوتی کہ آسمان و زمین اور ان کے اندر کی تمام چیزیں صرف چھ دن میں پیدا ہوئی ہیں۔ دوسری بات سورہ حٰلَمُ السَّجْدَةِ کی آیت سے یہ معلوم ہوتی کہ زمین اور اس کے پہاڑ درخت وغیرہ کی تخلیق میں پورے چار دن لگے تیسری بات یہ معلوم ہوتی کہ آسمانوں کی تخلیق میں دو دن صرف ہوئے۔ جس میں پورے دو دن ہونے کی تصریح نہیں بلکہ کچھ اشارہ اس طرف ملتا ہے کہ یہ دو دن پورے خرچ نہیں ہوئے آخری دن جمعہ کا کچھ حصہ بچ گیا۔ ان آیات کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھ دن میں سے پہلے چار دن زمین پر باقی

دو دن آسمانوں کی تخلیق میں صرف ہوئے اور زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی۔ مگر سورۃ نازعات کی آیت میں زمین کے پھیلانے اور مکمل کرنے کو صراحتہً تخلیق آسمان کے بعد فرمایا ہے۔ اس لئے وہ صورت کچھ بعید نہیں جو اور پر بحوالہ بیان القرآن بیان ہوئی ہے کہ زمین کی تخلیق دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے دو دن میں زمین اور اس کے اوپر پہاڑوں وغیرہ کا مادہ تیار کر دیا گیا۔ اس کے بعد دو دن میں سات آسمان بنائے، اس کے بعد دو دن میں زمین کا پھیلاؤ اور اس کے اندر جو کچھ پہاڑ، درخت، نہریں، چشمے وغیرہ بنائے تھے انکی تکمیل ہوئی۔ اس طرح تخلیق زمین کے چار دن متحمل نہیں رہے۔ اور آیت ختم سجدہ میں جو ترتیب بیان یہ رکھی گئی کہ پہلے زمین کو دو دن میں پیدا کرنے کا ذکر فرمایا۔ خَلَقَ الْاَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ۔ اس کے بعد مشرکین کو تنبیہ کی گئی۔ پھر الگ کر کے فرمایا وَجَعَلَ فِيهَا رِجَالًا مِّنْ نَّحْسٍ وَبَنَاتٍ فَتَکُونُ مِثْلُکُمْ۔ اس میں اس پر تو بھی مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ اربعۃ ایام ان پہلے دو دنوں کو شامل کر کے ہیں۔ اس سے الگ چار دن نہیں۔ ورنہ مجموعہ آٹھ دن ہو جائے گا جو تصریح قرآنی کے خلاف ہے۔

اب یہاں غور کرنے سے بظاہر مقتضی مقام کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ خَلَقَ الْاَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ فرمانے کے بعد پہاڑوں وغیرہ کی تخلیق کو بھی فِي يَوْمَيْنِ کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تو اس کا مجموعہ چار دن ہونا خود بخود معلوم ہو جاتا مگر قرآن کریم نے عنوان تعبیر اس کے بجائے یہ رکھا کہ زمین کی تخلیقات میں سے یا قیامانہ کو ذکر کر کے فرمایا کہ یہ کل چار دن ہوئے۔ اس سے بظاہر اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ یہ چار دن متواتر اور مسلسل نہیں تھے بلکہ دو حصوں میں منقسم تھے۔ دو دن تخلیق سموات سے پہلے دو دن اُس کے بعد اور آیت مذکورہ میں وَجَعَلَ فِيهَا رِجَالًا مِّنْ نَّحْسٍ وَبَنَاتٍ فَتَکُونُ مِثْلُکُمْ کا ذکر ہے یہ آسمانوں کی تخلیق کے بعد کا بیان ہے۔ وَاللّٰهُ سَبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ۔

وَجَعَلَ فِيهَا رِجَالًا مِّنْ نَّحْسٍ وَبَنَاتٍ فَتَکُونُ مِثْلُکُمْ۔ زمین میں پہاڑ اس کے توازن کو درست رکھنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں جیسا کہ متعدد آیات قرآن میں اس کی تصریح آئی ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ ان پہاڑوں کو زمین کی سطح کے اوپر بلند و بالا کر کے رکھا جائے زمین کے اندر بھی رکھے جاسکتے تھے۔ مگر اوپر رکھنے اور ان کی بلندی کو عام انسانوں جانوروں کی رسائی سے دور رکھنے میں زمین کے بسنے والوں کے لئے ہزاروں بلکہ بے شمار فوائد تھے۔ اس لئے اس آیت میں مِثْلُکُمْ فَتَکُونُ کے لفظ سے اس خاص نعمت کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔

وَقَدْ سَرَفْنَا آيَاتِنَا فِي آيَاتٍ سَوَاءٍ لِّلنَّاسِ يَلِیْنِ۔ اقوات قوت

کی جمع ہے جس کے معنی ہیں رزق اور روزی جس میں عام ضروریات انسانی داخل ہیں۔ کما قال

ابو عبید (زاد المسیر لابن جوزی)۔

اور حضرت حسنؑ اور حسنینؑ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے ہر حصہ میں اس کے بسنے رہنے والوں کی مصالح کے مناسب رزق اور روزی مقدر فرمادی۔ مقدر فرمائے کا مطلب یہ ہے کہ حکم جاری کر دیا کہ اس حصہ زمین میں فلاں فلاں چیزیں اتنی اتنی مقدار سے پیدا ہو جائیں۔ اسی تقدیر الہی سے ہر حصہ زمین کی کچھ خصوصیات ہو گئیں، ہر جگہ مختلف قسم کی معدنیات اور مختلف اقسام کی نباتات اور درخت اور جانور اس خطہ کی ضروریات ان کے مزاج و مرغوبات کے مطابق پیدا فرمادیئے۔

اسی سے ہر خطہ کی مصنوعات و مبلوسات مختلف ہوتی ہیں۔ یمن میں عصب۔ ساہور میں ساہوری رتنے میں طیالسہ۔ کسی خطہ میں گندم، کسی میں چانول اور دوسرے غلات، کسی جگہ میں روئی، کسی میں جوٹ، کسی میں سیب انگور اور کسی میں آم۔ اس اختلاف اشیاء میں ہر خطہ کے مزاجوں کی مناسبت بھی ہے اور عکسہ اور قحاک کے قول کے مطابق یہ قائدہ بھی ہے کہ دنیا کے سب خطوں اور ملکوں میں باہمی تجارت اور تعاون کی راہیں کھلیں۔ کوئی خطہ دوسرے خطہ سے مستغنی نہ ہو۔ باہمی احتیاج ہی پر باہمی تعاون کی مضبوط تعمیر ہو سکتی ہے۔ حکمران نے فرمایا کہ بعض خطوں میں نمک کو سونے کی برابر قول کر فروخت کیا جاتا ہے۔

گویا زمین کو حق تعالیٰ نے اس پر بسنے والے انسانوں اور جانوروں کی تمام ضروریات غذا، مسکن اور لباس وغیرہ کا ایک ایسا عظیم الشان گدام بنا دیا ہے، جس میں قیامت تک آنے اور بسنے والے اربوں اور کھربوں انسانوں اور لاتعداد جانوروں کی سب ضروریات رکھ دی ہیں۔ وہ زمین کے پیٹ میں بڑھتی اور حسب ضرورت قیامت تک نکلتی رہیں گی۔ انسان کا کام صرف یہ رہ گیا کہ اپنی ضروریات کو زمین سے نکال کر اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کرے۔ آگے آیت میں فرمایا سَوَاءٌ لِّلنَّاسِ أَیْلٰیٰنَ۔ اس جملہ کا تعلق اکثر حضرات مفسرین نے اربعہ ایام کے ساتھ قرار دیا ہے۔ معنی یہ ہیں یہ سب تخلیقات عظیم ٹھیک چار دن میں ہوئی ہیں۔ اور چونکہ عرف میں جس کو چار کہہ دیا جاتا ہے۔ وہ کبھی چار سے کچھ کم کبھی کچھ زیادہ بھی ہوتا ہے، مگر کسر کو حذف کر کے اُس کو چار ہی کہہ دیتے ہیں۔ آیت میں اس جگہ لفظ سَوَاءٌ بڑھا کر اس احتمال کو قطع کر کے یہ بتلادیا کہ یہ کام پورے چار دن میں ٹھیک ہوا ہے۔ اور لِّلنَّاسِ أَیْلٰیٰنَ فرمائے کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ آسمان زمین کی تخلیق کے متعلق آپ سے سوالات کر رہے ہیں جیسا کہ یہود کا سوال کرنا تفسیر ابن جریر اور درمنثور میں منقول ہے ان سوالات کرنے والوں کو یہ بتلادیا گیا ہے کہ یہ سب تخلیق ٹھیک چار دن میں ہوئی ہے۔ (ابن کثیر، قرطبی، روح)۔

اور بعض مفسرین ابن زید وغیرہ نے لِّلنَّاسِ أَیْلٰیٰنَ کا تعلق جملہ قَدْ سَرَفِیْھَا اَقْوَامُھَا کے ساتھ قرار دیا ہے۔ اور سائلین کے معنی طالبین و محتاجین کے لئے ہیں۔ اس صورت میں معنی یہ ہونگے

کہ زمین میں اللہ تعالیٰ نے جو مختلف اجناس و اقسام کی اقوات و ضروریات پیدا فرمائی ہیں، یہ ان لوگوں کے فائدے کے لیے ہیں جو ان کے طالب اور حاجت مند ہیں اور چونکہ طالب محتاج عادتاً سوال کیا کرتا ہے اس لیے اس کو سائلین کے لفظ سے تعبیر کر دیا۔ (بحر محیط)

اور ابن کثیرؒ نے اس تفسیر کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا اَشْكُم مِّنْ كُلِّ مَآسَا لَتَمُوَدَّكَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے وہ سب چیزیں عطا فرمائیں جو تم نے مانگیں کیونکہ یہاں بھی مانگنے سے مراد ان کا حاجت مند ہونا ہے۔ سوال کرنا شرط نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ نے یہ چیزیں نہ مانگنے والوں کو بھی عطا فرمائی ہیں۔

فَقَالَ كَهَا وَ لَدُنَّهَا مِنَ الْمَخِطَاتِ طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتْ اأَتَيْنَا طَائِعِينَ۔ یہ آسمان و زمین کو خطاب کر کے حکم دینا اور ان کا اطاعت و فرمانبرداری سے جواب دینا بعض مفسرین کے نزدیک مجاز ہے کہ زمین و آسمان اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان ہر کام کے لئے تیار پائے گئے۔ مگر ابن عطیہ اور دومرے محققین ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس میں کوئی مجاز نہیں، سب اپنی حقیقت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین میں شعور و ادراک خطا کی سمجھنے کا بھی پیدا فرمایا دیا تھا اور ان کو گویائی کی طاقت بھی جواب دینے کے لئے عطا فرمادی تھی۔ تفسیر بحر محیط میں اس کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہی تفسیر احسن اور بہتر ہے۔ ابن کثیرؒ نے اس کو نقل کر کے بعض کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ زمین کی طرف سے یہ جواب اُس حصہ زمین نے دیا تھا جس پر بیت اللہ کی تعمیر ہوئی اور آسمان کے اُس حصہ نے جو بیت اللہ کے بالمقابل ہے، (جس کو بیت المعمور کہا جاتا ہے)۔

فَإِنْ أَحْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ

پھر اگر وہ ٹلائیں تو تو کہہ میں نے خبر سنا دی تم کو ایک سخت عذاب کی جیسے عذاب آیا

عَادٍ وَ ثَمُودَ ۝ اِذْ جَاءَهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ

عاد اور ثمود پر جب آئے ان کے پاس رسول آئے سے

أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ط

اور پیچھے سے کہ نہ بوجو کسی کو سوائے اللہ کے

قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ

کہنے لگے اگر ہمارا رب چاہتا تو بھیجتا فرشتے سو ہم تمہارا لایا ہوا

بِهِ كُفِرُوكَ ۝ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ

بہیں مانتے سو وہ جو عاد تھے وہ غرور کرنے لگے ملک میں ناحق

الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ

اور کہنے لگے کون ہے ہم سے زیادہ زور میں کیا دیکھتے نہیں کہ اللہ

الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَكَانُوا بِآيَاتِنَا

جس نے ان کو بنایا وہ زیادہ ہے ان سے زور میں اور تھے ہماری نشانیوں سے

يَجْحَدُونَ ۝ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْسَرًا فِي

منکر بھیجی ہم نے ان پر ہوا بڑے زور کی کئی دن

أَيَّامٍ نَّحْسَاتٍ لِّنَدِّ يُقَهُمْ عَذَابُ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ

جو مصیبت کے تھے تاکہ چکھائیں ان کو رسوائی کا عذاب دنیا کی زندگی

الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ وَهُمْ لَا يُنصَرُونَ ۝

میں اور آخرت کے عذاب میں تو پوری رسوائی ہے اور ان کو کہیں مدد نہیں

وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَىٰ يَنَّهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَصَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ

اور وہ جو ثمود تھے سو ہم نے ان کو راہ بتلائی پھر ان کو خوش لگا اندھا رہنا راہ سو جھٹنے سے

فَاتَّخَذَتْهُمْ صَعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ بِمَا كَانُوا

پھر پکڑا ان کو کرک لے ذلت کے عذاب کی بدلہ اس کا جو

يَكْسِبُونَ ۝ ۱۴ وَنَجَّيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝

کھاتے تھے اور بچا دیا ہم نے ان لوگوں کو جو یقین لاتے تھے اور کچھ کر چلتے تھے

وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَرُونَ ۝

اور جس دن جمع ہونگے دشمن اللہ کے دوزخ پر پھر ان کی جماعتیں بنائی جائیں گی

حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ

یہاں تک کہ جب پہنچیں اس پر بتائیں گے ان کو ان کے کان اور ان کی آنکھیں

وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ ۱۵ وَقَالُوا لِمَ لَمْ

اور ان کے چمڑے جو کچھ وہ کرتے تھے اور وہ کہیں گے اپنے چمڑوں کو ہم نے

شَهِدُوا عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقْنَا اللَّهَ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ

کیوں بتلایا ہم کو وہ بولیں گے ہم کو بولایا اللہ نے جس نے بولایا ہر چیز کو

وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۱﴾ وَمَا كُنْتُمْ

اور اسی نے بنایا تم کو پہلی بار اور اسی کی طرف پھیرے جاتے ہو اور تم بہرہ

تَسْتَتِرُونَ أَنْ لَّيْشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا

نہ کرتے تھے اس بات سے کہ تم کو بتلائیں گے تمھارے کان اور نہ

أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ

تمھاری آنکھیں اور نہ تمھارے چہرے پر تم کو یہ خیال تھا کہ اللہ

لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۲۲﴾ وَذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ

نہیں جانتا بہت چیزیں جو تم کرتے ہو اور یہ وہی تمھارا خیال

الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرَأَيْتُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِنَ

جسے جو تم رکھتے تھے اپنے رب کے حق میں اسی نے تم کو غارت کیا پھر آج

الْخٰسِرِينَ ﴿۲۳﴾ فَإِنْ يَصْبِرُوا فَالنَّارُ مَثْوًى لَهُمْ

رہ گئے ٹوٹے ہیں پھر اگر وہ صبر کریں تو آگ ان کا گھر ہے

وَإِنْ يَسْتَغِيثُوا فَمَا لَهُمْ مِنَ الْمُعْتَبِينَ ﴿۲۴﴾ وَقَلِيلًا

اور اگر وہ مناجاتیں تو ان کو کوئی نہیں سناتا اور کادینے

لَهُمْ قُرْبَاءَ فَرْتَنُوا لَهُمْ مَابَيْنَ آيْدٍ يُهِمُّ وَمَا

ہم نے ان کے پیچھے ساتھ رہنے والے پھر انھوں نے خوبصورت بنا دیا ان کی آنکھوں میں اس کو جو ان کے آگے

خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمِّ قَدْ خَلَتْ

ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور ٹھیک پرچکی ان پر عذاب کی بات ان فرشتوں کے ساتھ جو گزر چکے

مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خٰسِرِينَ ﴿۲۵﴾

ان سے پہلے جنوں کے اور آدمیوں کے بیشک وہ بے فائدہ ٹوٹے والے

خُلاصۃ تفسیر

پھر (دلائل توحید منکر بھی) اگر یہ لوگ (توحید سے) اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو اسی آفت سے ڈراتا ہوں جیسی عادیث و ثواب پر (شُرک و کفر کی وجہ سے) آفت آئی تھی (مراد عذاب سے ہلاک کرنا ہے)

جیسا کہ قریش مکہ کے سردار عزوہ بدر میں ہلاک اور قید کئے گئے، اور یہ قصہ عاد و ثمود کا اس وقت ہوا تھا۔ جبکہ ان کے پاس ان کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی پیغمبر آئے (یعنی جو پیغمبر ان کی طرف بھیجے گئے اور ان کے سمجھانے میں جان توڑ کوشش کی گئی۔ جیسے کوئی شخص اپنے کسی عزیز کو کسی مصیبت و ہلاکت کی طرف جاتے دیکھے تو وہ کبھی آگے سے آکر اسے روکتا ہے کبھی پیچھے سے پکڑتا ہے۔ اور اس کی مثال قرآن میں ابلیس کا یہ قول ہے کہ اس نے کہا اَلَا تَتَذَكَّرُ مَن يَكْفُرْ اَنَّا بِيَهُمْ ذَمٌّ مِّنْ خَلْفِهِمْ۔ یعنی میں بنی آدم کو گمراہ کرنے ان کے آگے سے بھی آؤں گا ان کے پیچھے سے بھی اور ان پیغمبروں نے یہی کہا کہ) بجز اللہ کے اور کسی کی عبادت نہ کرو انھوں نے جواب دیا کہ (تم جو اللہ کی طرف سے آئے کا اور توحید کی طرف بلائے کا دعویٰ کر لے ہو یہی غلط ہے کیونکہ) اگر ہمارے پروردگار کو (یہ) منظور ہوتا (کہ کسی پیغمبر بنا کر بھیجے) تو فرشتوں کو بھیجتا اس لئے ہم اس (توحید) سے بھی منکر ہیں جس کو دیکر (مٹھارے دعویٰ کے مطابق) تم (پیغمبر کے طور پر) بھیجے گئے ہو پھر (اس مشترک قول کے بعد ہر قوم کے خاص کی تفصیل یہ ہے کہ) وہ جو عاد کے لوگ تھے وہ دنیا میں ناحق تکبر کرنے لگے اور (جب عذاب کی وعید سنی تو) کہنے لگے وہ کون ہے جو قوت میں ہم سے زیادہ ہے (کہ وہ ہمیں ایسے عذاب میں مبتلا کر سکے اور ہم اس کے دفع کرنے پر قادر نہ ہوں) آگے جواب ہے کہ کیا ان لوگوں کو یہ نظر نہ آیا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ قوت میں ان سے بہت زیادہ ہے (مگر باوجود اس کے بھی وہ ایمان نہ لائے) اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے تو ہم نے ان پر ایک سخت ہوا ایسے دوزخ میں بھیجی جو (بوجہ نزول عذاب الہی کے ان کے حق میں) منجوس تھے تاکہ ہم ان کو اس دنیوی زندگی میں رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھا دیں اور آخرت کا عذاب اور بھی زیادہ رسوائی کا سبب ہے اور (اس عذاب کے وقت کسی طرف سے بھی) ان کو مدد نہ پہنچے گی۔ اور وہ جو ثمود تھے تو (ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ) ہم نے ان کو (پیغمبر کے ذریعہ) رسوا کر دیا، انھوں نے گمراہی کو ہدایت کے مقابلہ میں پسند کیا تو ان کو سرِ پا ذلت کے عذاب کی آفت نے پکڑ لیا ان کی بدکرداریوں کی وجہ سے اور ہم نے (اس عذاب سے) ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے اور ہم سے ڈرتے تھے۔ (یہاں عذاب دنیوی کا ذکر تھا آگے عذاب آخرت کا ذکر ہے) اور (ان کو وہ دن بھی یاد دلایئے) جس دن اللہ کے دشمن (یعنی کفار) دوزخ کی طرف جمع کر دیئے گئے (لئے موقف حساب میں) لائے جاویں گے پھر (راستہ میں ان کی کثرت کے سبب منتشر ہونے سے بچانے اور مجتمع رہنے کے لئے) وہ روکے جاویں گے (تاکہ پیچھے رہنے والے ساتھ ہو جاویں جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں تمام جنود اور لشکروں کو جمع کرنے کے لئے فَهَمُّوْهُمْ عُوْنٌ فرمایا یعنی ان کو روکا جاوے گا) یہاں تک کہ جب وہ (سب جمع ہو کر) اُس (دوزخ) کے قریب آجاویں گے (مراد موقف حساب ہے جہاں سے دوزخ قریب ہی نظر آوے گا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ دوزخ کو موقف حساب میں حاضر کرینگے

اور یہ کافر اپنے چاروں طرف اگ ہی اگ دیکھے گا غرض یہ کہ جب موقف حساب میں آجائیں گے اور حساب شروع ہوگا) تو ان کے کان اور آنکھیں اور اُن کی کھالیں اُن کے خلاف اُن کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ اور (اُس وقت) وہ لوگ (تعجب کے ساتھ) اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی (ہم تو دنیا میں سب کچھ تمہاری ہی راحت کے لئے کرتے تھے جیسا کہ حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ فنعنک کنت انا ضل ما داک مسلم۔ یعنی میں تمہارے ہی لئے سب کو مشغول کیا کرتا تھا) وہ (اعضاء) جواب دیں گے کہ ہم کو اس نادیر مطلق ہلے گویائی دی جس نے ہر (گویا) چیز کو گویائی دی (جس سے ہم نے اپنے اندر خود اس قدر استکبار کا مشاہدہ کر لیا) اور اسی نے تم کو اول بار پیدا کیا تھا اور اسی کے پاس پھر (دوبارہ زندہ کر کے) لانے گئے ہو (تو ہم ایسے عظمت والے و قدرت والے کے پوچھنے پر حق بات کو کیسے چھپا سکتے تھے اس لئے گواہی دیدی) اور (آگے حق تعالیٰ ان منکروں کو خطاب فرمادیں گے کہ) تم (دنیا میں) اس بات سے تو اپنے کو (کسی طرح) چھپا (اور بچا) ہی نہ سکتے تھے کہ تمہارے کان اور آنکھیں اور کھالیں تمہارے خلاف میں گواہی دیں (کیونکہ حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ اور علم محیط واقع میں ثابت ہے جس کا مقتضایہ تھا کہ برے اعمال سے بچتے) لیکن تم (اس لئے نہ بچے کہ) اس گمان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے بہت سے اعمال کی خبر بھی نہیں اور تمہارے اسی گمان نے جو کہ تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تم کو برباد کیا (کیونکہ اس گمان سے اعمال کفریہ کے مرکب ہوئے اور وہ موجب بربادی ہوئے) پھر تم (ایدی) خسارہ میں پڑ گئے سو (اس حالت میں) اگر یہ لوگ (اس بربادی و خسارہ پر) صبر کریں (اور تن بقدریرہ کر عذر معذرت کچھ نہ کریں) تب بھی دوزخ ہی ان کا ٹھکانہ ہے (یہ نہیں کہ ان کا صبر موجب رحم ہو جاوے جیسا کہ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا تھا) اور اگر وہ عذر کرتا چاہیں گے تو بھی مقبول نہ ہوگا اور ہم نے (دنیا میں) ان (کفار) کے لئے کچھ ساتھ رہنے والے (شیاطین) مقرر کر رکھے تھے سو انہوں نے ان کے اگلے پچھلے اعمال ان کی نظر میں سخن کر رکھے تھے (اس لئے) ان پر مہر تھے) اور (کفر پر اصرار کرنے کی وجہ سے) اُن کے حق میں بھی ان لوگوں کے ساتھ اللہ کا قول (یعنی وعدہ عذاب) پورا ہو کر رہا جو ان سے پہلے جن اور انسان (کفار) ہو کر رہے ہیں، یہ شک وہ بھی خسارے میں رہے۔

معارف و مسائل

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ مَائِجًا صَبْرًا۔ یہ اس عذابِ صاعقہ کی تشریح ہے جو اس سے پہلے آیت میں صاعقہ عادیہ و نمود کے عنوان سے بیان ہوا ہے۔ صاعقہ کے اصل معنی مدہوش و بیہوش کرنے

والی چیز کے ہیں اسی لئے گرنے والی بجلی کو بھی صاعقہ کہا جاتا ہے۔ اور تاگہانی آفت و مصیبت کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قوم عاد پر جو ہوا کا طوفان مسلط کیا گیا وہ بھی اسی صاعقہ کا ایک فرد ہے اسی کو ریح صرصر کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔ جو تیز و تند ہوا کو کہا جاتا ہے، جس میں تیز رفتاری کے ساتھ سخت آواز بھی ہو۔ (قرطبی)

ضحاک نے فرمایا کہ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے تین سال تک بارش بالکل بند کر دی اور تیز و تند خشک ہوائیں چلتی رہیں اور آٹھ روز سات راتیں مسلسل ہوا کا شدید طوفان رہا۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ واقعہ آخر شوال میں ایک بدھ کے روز سے شروع ہو کر دوسرے بدھ تک رہا۔ اور جس کسی قوم پر عذاب آیا ہے وہ بدھ ہی کے دن آیا ہے۔ (قرطبی و منطہری)

حضرت جابر بن عبد اللہ رحمہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی بھلائی چاہتے ہیں تو ان پر بارش برساتے ہیں اور زیادہ تیز ہواؤں کو ان سے روک لیتے ہیں۔ اور جب کسی قوم کو مصیبت میں مبتلا کرنا ہوتا ہے تو بارش ان سے روک لی جاتی ہے اور ہوائیں زیادہ اور تیز چلنے لگتی ہیں۔ فتح ایام تحسبات۔ اصول اسلام اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ کوئی دن یا رات اپنی ذات میں منحوس نہیں ہے۔ قوم عاد پر طوفان باد کے ایام کو نحسات فرماتے کا حامل یہ ہے کہ یہ دن اس قوم کے حق میں ان کی بد اعمالیوں کے سبب منحوس ہو گئے تھے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ دن سب کے لئے منحوس ہوں۔ (منطہری و بیان القرآن) اور اس مسئلہ کی پوری تحقیق کہ کوئی چیز اپنی ذات میں منحوس ہو سکتی ہے یا نہیں، احقر کی کتاب احکام القرآن حزب خمس میں دیکھ لیں جو عربی میں طبع ہو چکی ہے۔

فَهُمْ يُؤَنَّا عَوْنًا - یہ دُزخ سے شقت ہے جس کے معنی روکنے اور منع کرنے کے آتے ہیں اسی کے مطابق خلاصہ تفسیر مذکور میں اس کا ترجمہ روکنے سے کیا گیا ہے۔ اور اکثر حضرات مفسرین نے یہی معنی لئے ہیں کہ اہل جہنم جو بڑی تعداد میں ہوں گے ان کو میدان حشر اور موقف حساب کی طرف جانے کے وقت انتشار سے بچانے کے لئے اگلے حصہ کو کچھ روک دیا جائے گا، تاکہ پچھلے لوگ بھی آملیں۔ اور بعض حضرات مفسرین نے یُونَّا عَوْنًا کا ترجمہ یُسَاقُوتُ و یُعَذِّبُ عَوْنًا سے کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو موقف حساب کی طرف ہانک کر دھکے دیکر لایا جائے گا۔ (قرطبی)

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَوُونَ اَنْ يَكْسُفَ عَنْكُمْ سَحَابُكُمْ الْاٰیۃ - معنی آیت کے یہ ہیں کہ انسان اگر چھپ کر کوئی جرم و گناہ کرنا چاہے تو دوسرے لوگوں سے تو چھپا سکتا ہے و خود اپنے ہی اعضاء و جوارح سے کیسے چھپائے۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں اور بدن کی کھال اور بال سب ہمارے نہیں بلکہ سرکاری گواہ ہیں اور جب ان سے ہمارے اعمال کو چھپا جاوے گا

تو سچی گواہی دیں گے تو پھر چھپا کر کوئی جرم و گناہ کرنے کا کوئی راستہ ہی نہیں رہتا، اس رسوائی سے بچنے کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ گناہ کو ہی چھوڑا جائے۔ مگر تم لوگ یعنی منکرین توحید و رسالت کا ذہن ادھر تو کیا جاتا کہ ہمارے اعضاء و جوارح بھی بولنے لگیں گے اور ہمارے خلائق اللہ کے سامنے گواہی دیں گے، مگر اتنی بات تو ہر ذی عقل کی سمجھ میں آ سکتی تھی کہ جس ذات نے ہمیں ایک حقیر چیز سے پیدا کر کے سمیع و بصیر انسان بنایا پالا اور جو ان کیا کیا اس کا علم ہمارے اعمال و احوال پر محیط نہیں ہو گا، مگر تم نے اس بدیہی چیز کے خلاف یہ گمان کر رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے بہت سے اعمال کی کچھ خبر نہیں۔ اس لئے تمہیں شرک و کفر کرنے پر جرأت ہوئی۔ وَذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَنْ تَكْفُرَ لِيْنِي تَهَارَے اسی گمان بد نے تمہیں برباد کیا۔

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ کو ہنسی آگئی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ میں کس بات پر ہنس رہا ہوں۔ ہم نے عرض کیا

انسان کے اعضاء و جوارح کی محشر میں گواہی

کہ اللہ اور اس کا رسول ہی جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے ہنسی اس کلام پر آئی جو میدان حشر اور موقف حساب میں بندہ اپنے رب سے کرے گا۔ یہ عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار کیا آپ نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ بیشک دی ہے۔ اس پر بندہ کہے گا کہ اگر یہ بات ہے تو میں اپنے حساب و کتاب کے معاملہ میں اور کسی کی گواہی پر مطمئن نہیں ہوں گا، بجز اس کے کہ میرے وجود ہی میں سے کوئی گواہ کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کَفَنِيْ بِدَفْنِيْكَ اَلْيَوْمَ عَلَيَّكَ حِسْبَتَا یعنی اچھا ہے لو تم خود ہی اپنا حساب کر لو۔ اس کے بعد اس کے منہ پر مہر کر دی جاوے گی اور اسکے اعضاء و جوارح سے کہا جائے گا کہ تم اس کے اعمال بتلاؤ، ہر عضو بول اٹھے گا اور سچی گواہی پیش کر دے گا۔ اس کے بعد اس کی زبان کھول دی جاوے گی تو یہ خود اپنے اعضاء پر ناراض ہو کر کہے گا بُعْدًا لِّكَتْ وَشُحْقًا فَعَنْكَتْ اُنَا حِلْ۔ یعنی تم غارت و برباد ہو میں نے تو دنیا میں جو کچھ کیا تمہارے ہی آرام پہنچانے کے لئے کیا تھا (اب یہی میرے خلاف گواہی دینے لگے)۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی عنہ کی روایت میں ہے کہ اس شخص کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کی ران کو کہا جائے گا کہ تو بول اور اس کے اعمال بیان کر تو انسان کی ران اور گوشت اور ہڈی سب اس کے اعمال کی گواہی دیدیں گے۔ (رواہ مسلم۔ مظہری)

اور حضرت معقل بن یسار رضی عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انیوالا دن انسان کو یہ ندا دیتا ہے کہ میں نیا دن ہوں اور جو کچھ تو میرے اندر عمل کرے گا قیامت میں میں اس پر گواہی دوں گا۔ اس لئے تجھے چاہیے کہ میرے ختم ہونے سے پہلے پہلے کوئی نیکی کرے کہ میں اس کی

گو اسی دن اور اگر میں جلا گیا تو پھر تو مجھے کبھی نہ پائے گا۔ اسی طرح ہر رات انسان کو یہ یاد دیتی ہے۔
(ذکرہ الونیم - کذانی القرطبی)

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا

اور کہنے لگے منکر مت کان دھرو۔ اس قرآن کے سننے کو اور یک یک کرو

فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ﴿۲۶﴾ فَلَنذِيقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

اسکے پڑھنے میں شاید تم غالب ہو سو ہم کو ضرور چکھانا ہے منکروں کو

عَذَابًا شَدِيدًا اُولَٰئِكَ نَجْزِي خِصْمًا اَسْوَا الَّذِي كَانُوا

سخت عذاب اور ان کو بدلہ دینا ہے برے سے برے کاموں کا جو وہ

يَعْمَلُونَ ﴿۲۷﴾ ذَٰلِكَ جَزَاءُ اَعْدَاءِ اللّٰهِ النَّارُ لَهُمْ

کرتے تھے یہ سزا ہے اللہ کے دشمنوں کی آگ ان کا اسی میں

فِي جَمَادٍ اَوْ اِلَّا تَخْلُدِ ۖ جَزَاءُ بِيْمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿۲۸﴾

گھر ہے سدا کو بدلہ اس کا جو ہمارے باتوں سے انکار کرتے تھے

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا اَرِنَا الَّذِيْنَ اَخْلَلْنَا مِنْ

اور کہیں گے وہ لوگ جو منکر ہیں اے رب ہمارے ہم کو دکھلا دے وہ دونوں جنھوں نے ہم کو بہکا یا

الْجَنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلُهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُونَا

جو جن ہے اور جو آدمی کہ تو ایسے ہم ان کو اپنے پاؤں کے نیچے کہ وہ رہیں

مِنَ الْاَدْفَلَيْنِ ﴿۲۹﴾

سب سے نیچے

خلاصہ تفسیر

اور یہ کافر (باہم) یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو سنو ہی مت اور اگر پیغمبر سنانے بھی لگیں تو اس کے
پیچ میں غل مچا دیا کرو شاید (اس تدبیر سے) تم ہی غالب رہو (اور پیغمبر بارگہ خاموش ہو جائیں) تو ان کے
اس ناپاک ارادے اور عزم کے بدلہ میں ہم ان کافروں کو سخت عذاب کا مزہ چکھا دیں گے اور ان کو انکے
برے برے کاموں کی سزا دیں گے یہی سزا ہے اللہ کے دشمنوں کی یعنی دوزخ ان کے لئے وہاں ہمیشہ

رہنے کا مقام ہوگا۔ اس بات کے بدلہ میں کہ وہ ہماری آیاتوں کا انکار کیا کرتے تھے (اور جب عذاب میں مبتلا ہوں گے تو) وہ کفار کہیں گے اے ہمارے پروردگار ہم کو وہ دونوں شیطان اور انسان دکھا دیجئے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا ہم ان کو اپنے پیروں تلے روند ڈالیں تاکہ وہ خوب ذلیل ہوں۔ (یعنی ان کو اس وقت ان لوگوں پر غصہ آوے گا جنہوں نے ان کو دنیا میں بہکایا تھا۔ آدمی بھی اور شیطان بھی خواہ ایک ایک ہوں یا متعدد ہوں۔ اور یوں تو یہ گمراہ کرنے والے بھی سب جہنم میں ہی ہوں گے۔ مگر اس گفتگو کے وقت وہ ان کے سامنے نہیں ہوں گے اس لئے سامنے کی درخواست کی۔ کسی آیت میں یا روایت میں یہ مذکور نہیں دیکھا کہ ان کی یہ درخواست منظور ہوگی یا نہیں۔ واللہ اعلم)

معارف و مسائل

لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ۔ کفار جب قرآن کے مقابلہ سے عاجز ہو گئے، اور اس کے خلاف ان کی ساری تدبیریں ناکام ہو گئیں تو اس وقت انہوں نے یہ حرکت شروع کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ابو جہل نے لوگوں کو اس پر آمادہ کیا کہ جب فَحْتَمَدُ (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن پڑھا کریں تو تم ان کے سامنے جا کر چیخ و پکار اور شور و غل کرنے لگا کرو تاکہ لوگوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بعض نے کہا کہ سیٹھاں اور تالیاں بجا کر اور بیچ میں طرح طرح کی آوازیں نکال کر قرآن سننے سے لوگوں کو روکنے کی تیاری کرو۔ (قرطبی)

تلاوت قرآن کے وقت خاموش ہو کر سننا واجب ہے نہ رہنا کفار کی عادت ہے، کی نیت سے شور و غل کرنا تو کفر کی علامت ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خاموش ہو کر سننا واجب اور ایمان کی علامت ہے۔ آجکل ریڈیو پر تلاوت قرآن نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ ہر موٹل اور مجمع کے مواقع میں ریڈیو کھولا جاتا ہے جس میں قرآن کی تلاوت ہو رہی ہو اور موٹل والے خود اپنے دھندوں میں لگے رہتے ہیں کھانے پینے والے اپنے شغل میں۔ اس کی صورت وہ بنجانی ہے جو کفار کی علامت تھی وَاللّٰهُ تَعَالٰی مسلمانوں کو ہدایت فرمادیں کہ یا تو ایسے مواقع میں تلاوت قرآن کیلئے نہ کھولیں اگر کھولنا ہے اور برکت حاصل کرنا ہے تو چند منٹ سب کام بند کر کے خود بھی اس طرف متوجہ ہو کر سنیں دوسروں کو بھی اس کا موقع دیں۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ

تحقیق جنہوں نے کہا رب ہمارا اللہ ہے پھر اسی پر قائم رہے ان پر اتنے ہیں

الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ

فرشتے کہ تم مت ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور خوشخبری سنو اس بہشت کی

الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٣٠﴾ نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمْ فِي الْحَيَاةِ

جس کا تم سے وعدہ تھا ہم ہیں تمہارے رفیق دنیا

الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُي

اور آخرت میں اور تمہارے لئے وہاں ہے جو چاہے

أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ ﴿٣١﴾ نَزَّلًا مِّنْ غَفُورٍ

جی تمہارا اور تمہارے لئے وہاں ہے جو کچھ مانگو نازل ہے اس بخشنے والے

رَاحِمٍ ﴿٣٢﴾ وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ

مہربان کی طرف سے اور اس سے بہتر کس کی بات جس نے بلایا اللہ کی طرف

وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٣٣﴾ وَلَا

اور کیا نیک کام اور کہا میں حکم بردار ہوں اور برابر

تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ط إِذْ فَعُ بِالَّتِي هِيَ

نہیں نیکی اور نہ بدی جواب میں وہ کہہ جو اس سے

أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ

بہتر ہو پھر تو دیکھ لے کہ تجھ میں اور جس میں دشمنی تھی گویا دوست وار ہے

حَمِيمٌ ﴿٣٤﴾ وَمَا يُلْقُهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وََمَا يُلْقُهَا

قرابت والا اور یہ بات ملتی ہے انہی کو جو سہار رکھتے ہیں اور یہ بات ملتی ہے

إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٣٥﴾ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ

اسی کو جس کی بڑی قسمت ہے اور جو کبھی چوک لگے تجھ کو شیطان کے چوک

نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٦﴾

لگانے سے تو پناہ پکڑ اللہ کی بے شک مدد ہی ہے سننے والا جاننے والا -

خلاصہ تفسیر

جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کر لیا کہ ہمارا رب (حقیقی صورت) اللہ ہے (مطلب یہ ہے کہ شرک

چھوڑ کر توحید اختیار کر لی، پھر (اس پر) مستقیم رہے (یعنی اُس کو چھوڑا نہیں)، اُن پر (اللہ کی طرف سے رحمت و بشارت کے) فرشتے اتریں گے (اول موت کے وقت پھر قبر میں پھر قیامت میں۔ جیسا کہ درمنثور میں حضرت زید بن اسلم کی روایت سے ثابت ہے اور کہیں گے) کہ تم نہ (احوال آخرت سے) اندیشہ کرو اور نہ (دنیا کے چھوڑنے پر) رنج کرو (کیونکہ آگے تمہارے لئے اس کا نعم البدل اور امن و عافیت ہے) اور تم جنت (کے ملنے) پر خوش رہو جس کا تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا، ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رہیں گے (دنیا میں فرشتوں کا رفیق ہونا یہ ہے کہ وہ انسان کے دلیں نیکیوں کا اہام کرتے رہتے ہیں، اور کوئی تکلیف و مصیبت پیش آجائے تو اس پر صبر و سکون فرشتوں ہی کی رفاقت کا اثر ہوتا ہے۔ اور آخرت میں رفیق ہونا تو آمنے سامنے کھل کر ہوگا، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: **وَتَتَكَفَّهُمْ الْمَلَائِكَةُ** اور دوسری آیت میں **يَكْفُلُونَ عَنْكُم مِّنْ ذُنُوبِكُمْ** وغیرہ) اور تمہارے (اس جنت) میں جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے اور نیز تمہارے لئے اُس میں جو مانگو گے موجود ہے (یعنی جو کچھ زبان مانگو گے وہ تو ملے ہی گا۔ بلکہ مانگنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی جس چیز کو تمہارا دل چاہے گا موجود ہو جائے گی) یہ بطور مہمانی کے ہوگا عقودِ رحیم کی طرف سے (یعنی یہ نعمتیں اکرام و اعزاز کے ساتھ اس طرح ملیں گی جس طرح مہمانوں کو ملتی ہیں۔ اُن کے حسن حال کے بعد حسن مقال و اعمال کو بتایا گیا ہے) اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو لوگوں کو، خدا کی طرف بلائے اور (خود بھی) نیک عمل کرے اور (انہما اطاعت کے لئے) کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں (یعنی بندگی کو اپنا فخر سمجھے، متکبرین کی طرح اس سے غار نہ کرے) اور (چونکہ دعوت الی اللہ اور اصلاح خلق کا ارادہ کرنے والوں کو اکثر جاہلوں کی طرف سے ایذاؤں اور تکلیفوں کا سامنا ہوتا ہے اس لئے آگے ان کو ظلم کے مقابلہ میں انصاف اور ہرانی کے بدلہ میں بھلائی کرنے کی تلقین کی جاتی ہے نیز تجربہ سے ثابت ہے کہ دعوت کے مؤثر اور کامیاب ہونے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ مخالفین کی ایذاؤں پر صبر کر کے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا جس میں سب مسلمان ضمناً شامل ہیں کہ) نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی (بلکہ ہر ایک کا اثر جدا ہے اور حجب یہ بات ثابت ہوگئی تو اب) آپ (مع اپنے متبعین کے) نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیا کیجئے پھر کیا کیا (آپ دیکھیں گے کہ) آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے، (یعنی بدی کا بدلہ بدی سے دینے میں تو عداوت بڑھتی ہے اور نیکی کرنے سے بشرط سلامت طبع دشمن کی عداوت گھٹتی ہے۔ یہاں تک کہ اکثر تو بالکل ہی عداوت جاتی رہتی ہے اور اس معاملہ میں مثل دوست کے ہو جاتا ہے گو دل سے دوست نہ ہو) اور یہ بات ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو (اخلاق کے اعتبار سے) بڑے مستقل و مزاج) ہیں اور یہ بات اُسی کو نصیب ہوتی ہے جو (ثواب کے اعتبار سے)

بڑا صاحب نصیب ہے اور اگر (ایسے وقت میں) آپ کو شیطان کی طرف سے (عقدہ کا) کچھ وسوسہ آنے لگے تو (غوراً) اللہ سے پناہ مانگ لیا کیجئے، بلا مشیہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ بشرط سلامت طبع کی قید سے یہ خدشہ دور ہو گیا کہ بعض اوقات شری آدمی پر نرمی کرنے کا الٹا اثر ہوتا ہے، کیونکہ یہ صرف ایسے لوگوں سے محتمل ہے جو اپنی سلامت طبع کھو بیٹھتے ہیں اور وہ شاذ و نادر ہوتے ہیں۔

معارف و مسائل

م شروع سورت سے یہاں تک منکرین قرآن اور منکرین رسالت و توحید سے خطاب ہے۔ ان کو حق تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ کی نشانیاں پیش نظر کر کے توحید کی دعوت پھر انکار کرنے والوں کا انجام اور عذاب آخرت و دوزخ کا مفصل بیان چلا آیا ہے۔ یہاں سے مؤمنین و کاملین کے حالات اور دنیا و آخرت میں ان کے اعزاز و اکرام کا بیان اور ان کے لئے خاص ہدایات کا ذکر ہے۔ مؤمنین و کاملین وہی ہوتے ہیں جو خود بھی اپنے اعمال و اخلاق میں مستقیم اور بے کم و کاست بالکل شریعت کے مطابق ہوں، اور دوسروں کو بھی اللہ کی طرف دعوت دیں اور ان کی اصلاح کی فکر کریں۔ اسی سلسلہ میں داعیان اسلام کے لئے صبر اور برائی کے بدلہ میں بھلائی کرنے کی ہدایت ہے۔

اس تقامت کے معنی پہلے جہز کہ لفظ استقامت سے تعبیر فرما کر ارشاد ہوا اِنَّ الدِّیْنَ قَالُوْا رَبَّنَا اللّٰهُ شَقَّاسْتَقَامُوْا۔ یعنی جن لوگوں نے سچے دل سے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب یقین کر لیا اور اس کا اقرار بھی کر لیا۔ یہ تو اصل ایمان ہوا، آگے اس پر مستقیم بھی رہے یہ عمل صالح ہوا۔ اس طرح ایمان اور عمل صالح کے جامع ہو گئے۔ لفظ استقامت کا جو مفہوم غلافہ تفسیر میں بیان ہوا ہے کہ ایمان و توحید پر قائم رہے اس کو چھوڑا نہیں۔ یہ تفسیر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور تقریباً یہی مضمون حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، انھوں نے استقامت کی تفسیر اخلاص عمل سے فرمائی ہے اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

الاستقامۃ ان تستقیم علی الامر والنہی ولا تتوغل ما وعناک الثعالب۔ (منظہری)

استقامت یہ ہے کہ تم اللہ کے تمام احکام اور امر اور نواہی پر سیدھے چبے رہو، اس سے ادھر ادھر راہ فرار لوٹریوں کی طرح نہ نکالو۔

اس لئے علماء نے فرمایا کہ استقامت تو ایک لفظ مختصر ہے مگر تمام شرائع اسلامیہ کو جامع ہے جس میں تمام احکام الہیہ پر عمل اور تمام محرمات و مکروہات سے اجتناب دائمی طور پر شامل ہے۔ تفسیر کشاف میں ہے کہ انسان کا ربیب اللہ کہنا، جو بھی صحیح ہو سکتا ہے جبکہ وہ دل سے یقین کرے کہ میں

ہر حال اور ہر قدم میں اللہ تعالیٰ کی زیر تربیت ہوں مجھے ایک سالس بھی اس کی رحمت کے بغیر نہیں آسکتا اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان طریق عبادت پر ایسا مضبوط و مستقیم رہے کہ اس کا قلب اور قالب دونوں اس کی عبودیت سے سرمد انحراف نہ کریں۔

اسی لئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفیؓ نے یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اسلام کی ایک جامع بات بتلا دیجئے جس کے بعد مجھے کسی اور سے کچھ نہ پوچھنا پڑے تو آپؐ نے فرمایا، قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ شَحًّا سَتَقِيْمُ (رواہ مسلم) یعنی تم اللہ پر ایمان لانے کا اقرار کرو، پھر اس پر مستقیم رہو۔ مستقیم رہنے کی ظاہر مراد یہی ہے کہ ایمان پر بھی مضبوطی سے جیسے رہو اور اس کے اقتضائے مطابق اعمال صالحہ پر بھی۔

اسی لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے استقامت کی تعریف اداۓ فراتھ سے نہر مائی اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: استقامت یہ ہے کہ تمام اعمال میں اللہ کی اطاعت کرو اور اس کی معصیت سے اجتناب کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ استقامت کی جامع تعریف وہی ہے جو اوپر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے نقل کی گئی ہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی تعریف بھی اسی کی طرف راجع ہے جس میں اعمال صالحہ کے ساتھ اخلاص عمل کی تاکید ہے۔ (تفسیر مظہری) حصص ۲۱ نے بھی مذکورہ تفسیر کو ابوالعالیہ سے نقل کر کے اختیار کیا ہے اور ابن جریرؒ نے بھی۔

تَنْزَلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ - فرشتوں کا نزول اور وہ خطاب جو اس آیت میں آیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ موت کے وقت ہوگا اور قنادہؒ نے فرمایا کہ محشر میں قبروں سے نکلنے کے وقت ہوگا اور وکیع بن جراحؒ نے فرمایا کہ تین وقتوں میں ہوگا۔ اول موت کے وقت پھر قبروں کے اندر پھر محشر میں قبروں سے اٹھنے کے وقت۔ اور ابو حیانؒ نے بحر محیط میں فرمایا کہ میں تو کہتا ہوں کہ مومنین پر فرشتوں کا نزول ہر روز ہوتا ہے جس کے آثار و برکات ان کے اعمال میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ مشاہدہ اور ان کے کلام کا سننا یہ انھیں مواقع میں ہوگا۔

اور ابو نعیمؒ نے حضرت ثابت بنانیؒ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے سورہ حٰلِم المبیقہ کی تلاوت فرمائی یہاں تک کہ آیت تَنْزَلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ پورے پہنچے تو فرمایا کہ ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ مومن جس وقت اپنی قبر سے اٹھے گا تو دو فرشتے جو دنیا میں اسی کے ساتھ رہا کرتے تھے وہ ملیں گے اور اس کو کہیں گے کہ تم خوف و غم نہ کرو بلکہ جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ان کا کلام مومن کو مومن کو اطمینان ہو جائے گا۔ (مظہری)

لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتٰخِبُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْفُسُكُمْ وَاَنْفُسُكُمْ وَاَنْفُسُكُمْ تَنْزَلُ اَمِنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ - فرشتے مومنین و مخلصین کو بلا میں گے کہ تمہیں جنت میں وہ چیز ملے گی جس کو تمہارا دل چاہے اور وہ چیز

جو تم مانگو۔ اس کا حاصل تو یہ ہے کہ تمہاری ہر خواہش پوری کی جائے گی، خواہ تم مانگو یا نہ مانگو۔ آگے نہ لانا
بمعنی ہمانی فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ بہت سی وہ نعمتیں بھی ملیں گی جس کی تمنا بھی تمہارے دل میں
پیدا نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ہمان کے سامنے بہت سی وہ چیزیں بھی آتی ہیں جن کا پہلے سے کوئی تصور نہیں
ہوتا خصوصاً جبکہ کسی بڑے کا ہمان ہو۔ (منظہری)

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں کسی پرندے کو اڑتا ہوا
دیکھ کر تمہارے دل میں اس کا گوشت کھانے کی خواہش پیدا ہوگی تو وہ اسی وقت بھنا بھنایا تمہارے
سامنے آگرے گا۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ آگ سے مس ہو گا نہ دھوئیں سے، خود بخود دیکر سامنے
آجاوے گا۔ (رواہ البزار والبیہقی عن ابن مسعود۔ منظہری)

اور **حدیث** میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کو جنت میں اگر
اپنے گھر میں بچہ پیدا ہونے کی خواہش ہوگی تو اس کا حمل اور وضع حمل پھر اُس کا درد چھڑانا پھر حوان
ہونا سب ایک ساعت میں ہو جائے گا۔ (ترمذی و بیہقی وغیرہ۔ منظہری)

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ - یہ مومنین کا ملین کا دوسرا حصہ احوال ہے کہ
وہ صرف خود ہی اپنے ایمان و عمل پر قناعت نہیں کرتے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس کی دعوت
دیتے ہیں۔ اور فرمایا کہ اُس سے اچھا کس کا قول ہو سکتا ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے معلوم ہوا کہ
انسان کے کلام میں سب سے افضل و احسن وہ کلام ہے جس میں دوسروں کو دعوت حق دی گئی ہو،
اس میں دعوت الی اللہ کی سب صورتیں داخل ہیں۔ زبان سے تحریر سے یا کسی اور عنوان سے، اذان دینے
والا بھی اس میں داخل ہے، کیونکہ وہ دوسروں کو نماز کی طرف بلاتا ہے۔ اسی لئے حضرت صدیقہ عائشہ
نے فرمایا کہ یہ آیت مؤذنین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور اس دَعَا إِلَى اللَّهِ کے بعد عَمِلَ صَالِحًا
آیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اذان و اقامت کے درمیان دو رکعت نماز پڑھ لے۔

ایک **حدیث** میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اذان و اقامت کے درمیان
جو دعویٰ جاتی ہے وہ رد نہیں ہوتی۔ (رواہ ابو داؤد و الترمذی عن انس رض۔ منظہری)
اذان اور جواب اذان کے فضائل و برکات احادیث صحیحہ میں بہت بڑے ہیں۔ بشرطیکہ اخلاص
کے ساتھ اللہ کے لئے اذان دے، اجرت و معاوضہ پیش نظر نہ ہو۔ یہ احادیث اس جگہ تفسیر منظہری
میں جمع کر دی ہیں۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ - یہاں سے دعوت الی اللہ کی خدمت انجام دینے والوں کو
خاص ہدایات دی گئی ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ بُرائی کا بدلہ برائی سے نہ دیں بلکہ صبر اور احسان سے
کام لیں اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ یعنی داعیانِ حق کی خصلت یہ ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کی بُرائی کو

طریق احسن سے دفع کریں۔ وہ یہ کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ لینا اور معاف کر دینا تو عمل حسن ہے اور احسن یہ ہے کہ جس نے تمہارے ساتھ برا سلوک کیا تم اس کو معاف بھی کر دو اور اس کے ساتھ احسان کا برتاؤ کر دو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس آیت میں حکم یہ ہے کہ جو شخص تم پر غصہ کا اظہار کرے، تم اس کے مقابلہ میں صبر سے کام لو۔ جو تمہارے ساتھ جہالت سے پیش آوے تم اس کے ساتھ حلم و بردباری کا معاملہ کر دو اور جس نے تمہیں ستایا اس کو معاف کر دو۔ (منظہری)

بعض روایات میں ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کسی شخص نے گالی دی یا برا کہا تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر تم اپنے کلام میں سچے ہو کہ میں مجرم و خطاوار اور برا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمادے، اور اگر تم نے جھوٹ بولا ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمادے۔ (قرطبی)

وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ط

اور اس کی قدرت کے نمونے ہیں رات اور دن اور سورج اور چاند

لَا تَسْجُدُ لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ

سجدہ نہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو اور سجدہ کرو اللہ کو

الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝۳۷ فَإِنِ

جس نے ان کو بنایا اگر تم اسی کو پوجتے ہو پھر اگر

اسْتَكْبَرُوا قَالِ الَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونَ لَهُ

عز و رکریں تو جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں پاکی بولتے رہتے ہیں اس کی

بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ ۝۳۸ وَمِنْ آيَاتِهِ

رات اور دن اور وہ نہیں تھکتے اور ایک اس کی

أَنَّكَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ

نشانی یہ کہ تو دیکھتا ہے زمین کو دبی پڑی پھر جب اتارا ہم نے اس پر پانی

اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۝۳۹ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتِ ط

تازہ ہوئی اور ابھری بے شک جس نے اس کو زندہ کیا وہ زندہ کرے گا مردوں کو

إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۴۰

وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور منجملہ اس کی (قدرت و توحید) کی نشانیوں کے رات اور دن ہے اور سورج ہے اور چاند ہے، (پس) تم لوگ نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو (جیسا کہ صائبین ستاروں کی عبادت کیا کرتے تھے کما فی الکشاف) اور (صرف) اس خدا کو سجدہ کرو جس نے ان (سب) نشانیوں کو پیدا کیا۔ اگر تم کو خدا کی عبادت کرنا ہے (یعنی اگر خدا کی عبادت کرنا ہے تو وہ صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو، مشرکین کی طرح اللہ کی عبادت کے ساتھ دوسروں کو عبادت میں شریک کر دیا تو پھر وہ اللہ کی عبادت نہیں رہتی) پھر اگر یہ لوگ (توحید کی عبادت اختیار کرنے اور اپنی آبائی رسوم شرک کو چھوڑنے سے عار) اور تکبر کریں تو (اُن کی حماقت ہے، کیونکہ) جو فرشتے آپ کے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور وہ (اس سے ذرا) نہیں اکتاتے (جب اللہ کے مقرب فرشتے جو ان لوگوں سے لاکھوں درجہ مکرم و معظم ہیں ان کو عار نہیں تو ان احمقوں کو عار کرنے کا کیا موقع ہے) اور منجملہ اس کی (قدرت و توحید) کی نشانیوں کے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے دبی کو بلی (پڑی) ہے۔ پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ بھرتی اور پھولتی ہے (اس سے توحید بھی استدلال ہوتا ہے اور بعثت یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر بھی کیونکہ) جس نے زمین کو (اس کے مناسب) زندہ کر دیا وہی مردوں کو (اُن کے مناسب) زندہ کر دے گا، بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

معارف و مسائل

لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں

اس آیت سے ثابت ہوا کہ سجدہ صرف خالق کائنات کا حق ہے۔ اس کے سوا کسی ستارے یا انسان و غیرہ کو سجدہ کرنا حرام ہے، خواہ وہ عبادت

کی نیت سے ہو یا محض تعظیم و تکریم کی نیت سے دونوں صورتیں باجماع اُمت حرام ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو عبادت کی نیت سے کسی کو سجدہ کرے گا وہ کافر ہو جائیگا اور جس نے محض تعظیم و تکریم کے لئے سجدہ کیا اس کو کافر نہ کہیں گے مگر ارتکاب حرام کا مجرم اور فاسق کہا جائے گا۔

سجدہ عبادت تو اللہ کے سوا کسی کو کسی اُمت و شریعت میں حلال نہیں رہا۔ کیونکہ وہ شرک

میں داخل ہے اور شرک تمام شرائع انبیاء میں حرام رہا ہے۔ البتہ کسی کو تعظیماً سجدہ کرنا، یہ پھلی شریعتوں میں جائز تھا۔ دنیا میں آنے سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے لئے سب فرشتوں کو سجدہ کا حکم ہوا۔ یوسف علیہ السلام کو ان کے والد اور بھائیوں نے سجدہ کیا جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے مگر اتفاقاً فقہار اہل سنت یہ حکم ان شریعتوں میں تھا۔ اسلام میں منسوخ قرار دیا گیا اور غیر اللہ کو سجدہ مطلقاً حرام قرار دیا گیا۔ اس مسئلہ کی پوری تفصیل احقر کے رسالہ ”المقالة المرضیہ فی حکم سجدۃ النخیۃ“ میں مذکور ہے جو ترجمان عربی ہے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

وَهُمْ لَا يَسْتَمِعُونَ۔ اس پر تو امت کا اجماع ہے کہ اس سورت میں سجدہ تلاوت واجب ہے مقام سجدہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ قاضی ابوبکر ابن العربی نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما پہلی آیت کے ختم پر سجدہ کرتے تھے یعنی اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اَيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۔ پر اور اسی کو امام مالک رحمہ اللہ نے اختیار فرمایا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما دوسری آیت کے آخر یعنی لَا يَسْتَمِعُونَ پر سجدہ کرتے تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی یہی فرمایا کہ دوسری آیت کے ختم پر سجدہ کریں۔ مسروق، ابو عبد الرحمن سلمی، ابراہیم نخعی، ابن سیرین، قتادہ وغیرہ اجماعاً فقہاء لَا يَسْتَمِعُونَ۔ ہی پر سجدہ کرتے تھے۔ امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ یہی مذہب تمام ائمہ حنفیہ کا ہے اور فرمایا کہ اختلاف کی بنا پر احتیاط بھی اسی میں ہے کہ دوسری آیت کے ختم پر سجدہ کیا جائے کیونکہ اگر سجدہ پہلی آیت سے واجب ہو چکا ہے تو وہ اب ادا ہو جائے گا اور اگر اسی آیت سے واجب ہوا ہے تو اس کا ادا ہونا خود ظاہر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ اٰيٰتِنَا لَا يَخَفُوْنَ عَلٰنَا

جو لوگ طرہ سے چلتے ہیں ہماری باتوں میں وہ ہم سے پیچھے ہوئے نہیں

اَفَمَنْ يُلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَنْ يَّاتِيْ اٰمِنًا يَوْمَ

بھلا ایک بڑھتا ہے آگ میں وہ بہتر یا ایک جو آئے گا امن سے دن

الْقِيٰمَةِ ط اَعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ لِاِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴۱

قیامت کے کئے جاؤ جو چاہو بیشک جو تم کرتے ہو وہ دیکھتا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالَّذِيْ كُرِّلَ مَا جَاءَهُمْ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ

جو لوگ منکر ہوئے نصیحت سے جب آئی ان کے پاس اور وہ کتاب ہے

عَزِيْزٌ ۝۴۲ لَا يٰۤاٰتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ

نادر اس پر جھوٹ کا دخل نہیں آئے سے الود نہ پیچھے

خَلْفَهُ ط تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿۴۲﴾ مَا يُقَالُ لَكَ

سے اتاری ہوئی ہے حکمتوں والے سب تعریفوں والے کی تجھے وہی کہتے ہیں

الْأَمَّا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ط إِنَّ رَبَّكَ لَذُو

جو کہہ چکے ہیں سب رسولوں سے تجھ سے پہلے تیرے رب کے یہاں معافی

مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَجَبًا

بھی ہے اور سزا بھی ہے دردناک اور اگر ہم اس کو کہتے قرآن ادیبی

لَقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ط عَرَبِيٌّ وَعَرَبِيٌّ ط قُلْ

زبان کا تو کہتے اس کی باتیں سبوں کھولی گئیں کیا ادیبی زبان کی کتاب اور عربی لوگ تو کہہ

هُوَ الَّذِيْنَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءً ط وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُونَ

ایمان والوں کے لئے سوجھ ہے اور روگ کا دور کرنے والا اور جو یقین نہیں لاتے اُن کے

فِيْ اِذَا نِهِمْ وَقُرْ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ط اُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ

کانوں میں . لو جھ ہے اور یہ قرآن اُن کے حق میں اندھایا ہے ان کو پکارتے ہیں دور

مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۴۴﴾ وَلَقَدْ اَتَيْنَا مُوسٰى الْكِتٰبَ فَاخْتَلَفَ

کی جگہ سے اور ہم نے دی تھی موسیٰ کو کتاب پھر اس میں

فِيْهِ ط وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقَضٰى بَيْنَهُمْ ط

اختلاف پڑا اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو پہلے چلی تھی تیرے رب کی طرف سے تو اُن میں فیصلہ ہو جاتا

وَإِنَّهُمْ لَكٰفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ﴿۴۵﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا

اور وہ ایسے دھوکے میں ہیں اس قرآن سے جو چین نہیں لینے دیتا جس نے کی بھلائی سوا اپنے

فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ط وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿۴۶﴾

واسطے اور جس نے کی برائی سو وہ بھی اسی پر اور تیرا رب ایسا نہیں جو ظلم کرے بندوں پر

خلاصہ تفسیر

بلاشبہ جو لوگ ہماری آیتوں میں کج روی کرتے ہیں (یعنی یہ کہ ہماری آیتوں کا تقاضا ان پر ایمان لانے پھر ان پر استقامت رکھنے کا ہے) اس کو چھوڑ کر اُن کی تکذیب کرتے ہیں (کمانی الدرامنذور عن تداوہ) وہ لوگ ہم پر مخفی نہیں (ان کو ہم جہنم کا عذاب دیں گے) سو بھلا جو شخص جہنم میں ڈالا جائے (جیسے کافر) وہ اچھا ہے یا وہ شخص جو قیامت کے روز اس و امان کے ساتھ (جنت میں) آئے (آگے

ان کو ڈرانے کے لئے ارشاد ہے کہ، جو جی چاہے (خوب) کر لو وہ تمہارا سب کچھ کیا ہو اور دیکھ رہا ہے (ایک دفعہ ہی سزا دے گا) جو لوگ اس قرآن کا جبکہ وہ ان کے پاس پہنچتا ہے انکار کرتے ہیں۔ (ان میں خود تدبیر کی کمی ہے) اور (اس قرآن میں کوئی کمی نہیں کیونکہ) یہ (قرآن) بڑی وقعت کتاب ہے جس میں غیر واقعی بات نہ اُس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے (یعنی اس میں کسی پہلو اور کسی جہت سے اس کا احتمال نہیں کہ یہ قرآن منزل من اللہ نہ ہو) اور پھر خلاف واقعہ اس کو منزل من اللہ کہہ دیا جائے جیسا کفار آپ پر یہی مشہ کرتے تھے۔ حق تعالیٰ ایک قاعدہ کلیہ سے اس مشبہ خاص کا ازالہ کر دیا اس طرح کہ اس کا اعجاز سب کے نزدیک مسلم ہے اس لئے یہ ثابت ہو گیا کہ (یہ خدائے حکیم محمود (الذات والصفات) کی طرف سے نازل کیا گیا ہے) اور باوجود اس کے جو یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں۔ تو یہ معلوم کر کے تسلی کر لیجئے کہ آپ کو وہی باتیں (تکذیب و ایذار کی) کہی جاتی ہیں۔ جو آپ سے پہلے رسولوں کو کہی گئی ہیں (انہوں نے صبر کیا تھا آپ بھی صبر کیجئے اور اس سے بھی تسلی حاصل کیجئے کہ) آپ کا رب بڑی مغفرت والا اور درناک سزا دینے والا ہے (پس اگر یہ مخالفین خلاف سے باز آکر مستحق مغفرت نہ ہو گئے تو ان کو سزا بھی دوں گا، پھر آپ کا ہے کہ لئے پریشان ہوں) اور یہ لوگ ایک مشبہ یہ کرتے ہیں کہ قرآن کا کچھ حصہ عجمی بھی ہونا چاہئے تھا، جیسا کہ تفسیر درمنثور میں قریش کا ایسا قول حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے جس سے اس کا اعجاز خوب ظاہر ہوتا، کہ نبی کریم جو عجمی زبان نہیں جانتے وہ عجمی میں حکم کریں سو بات یہ ہے کہ، اگر ہم اس کو (کلاً یا بعضاً) عجمی (زبان کا) قرآن بناتے (تو یہ ہرگز نہ ہوتا کہ اُس کو مان لیتے بلکہ اس میں ایک اور حجت نکال لیتے کیونکہ جب ماننے اور سمجھنے کا ارادہ نہیں ہوتا تو ہر تقدیر پر کچھ نہ کچھ شاخ نکال لی جاتی ہے چنانچہ اگر ایسا ہوتا) تو یوں کہتے کہ اس کی آیتیں (اس طرح) صاف صاف کیوں نہیں بیان کی گئیں (کہ ہم سمجھ لیتے یعنی عربی میں کیوں نہیں آیا اگر بعض عجمی ہوتا تو کہتے یہ بعض بھی عربی کیوں نہیں ہے اور یوں کہتے کہ) یہ کیا بات ہے کہ عجمی کتاب اور عربی عربی (خلاصہ یہ کہ اب جو قرآن عربی ہے تو کہتے ہیں عجمی کیوں نہیں اور اگر عجمی ہوتا تو کہتے عربی کیوں نہیں کسی حال پر ان کو قرار نہیں پھر عجمی ہونے سے کیا فائدہ ہوتا۔ آگے اس مضمون سے جواب دینے کا حکم ہے کہ اے پیغمبر) آپ کہہ دیجئے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لئے تو (نیک کاموں کے بتلانے میں) رہنما ہے اور (برے کاموں سے جو روگ دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں جب اس قرآن کی رہنمائی پر عمل کیا جائے تو یہ اُن روگوں سے) شفا ہے (پس چونکہ ایمان والوں میں تدبیر و طلب حق کی کمی نہ تھی) ان کے حق میں قرآن اپنی حقانیت کے سبب نافع ہوا) اور جو (باوجود ظہور حق کے عناداً) ایمان نہیں لاتے اُن کے کانوں میں ڈاٹ ہے (جس سے حق کو انصاف اور تدبیر سے نہیں

سنتے اور وہ کیسی ہے) اور (اسی کی وجہ سے) وہ قرآن ان کے حق میں تابینائی ہے (قلبت تدبیر و قدرت انصاف سے تعصب میں قوت رہتی ہے اور تعصب ہدایت قبول کرنے سے ملنے بلکہ زیادہ گمراہی کا سبب ہو جاتا ہے۔ تابینائی کا سبب ہونے کی یہ وجہ ہے جیسے آفتاب عالم کو روشنی دیتا ہے چمکا دڑ کو اندھا کر دیتا ہے اور) یہ لوگ (حق بات سننے کے باوجود نفع سے محروم رہنے میں ایسے ہیں کہ گویا کسی دور جگہ سے پکارے جا رہے ہیں کہ آواز سنتے ہوں مگر سمجھتے نہ ہوں) اور (آپ کی تسلی کے لئے جیسا اند پر مجھلا رسولوں کا ذکر ہوا ہے اب خاص موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوتا ہے کہ) ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب دی تھی سو اس میں بھی اختلاف ہوا (کسی نے مانا کسی نے نہ مانا، یہ کوئی نئی بات آپ کے لئے نہیں ہوئی، پس آپ مغموم نہ ہوں) اور (یہ منکرین ایسے مستحق عذاب ہیں کہ اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے بھڑک چکی ہے (کہ پورا عذاب ان کو آخرت میں دوں گا) تو ان کا (قطعی) فیصلہ (دنیا ہی میں) ہو چکا ہوتا اور یہ لوگ (باوجود قیام برائین کے) ابھی تک اس (فیصلہ یعنی عذاب موعود) کی طرف سے ایسے شک میں (پڑے) ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے (کہ ان کو عذاب کا یقین ہی نہیں آتا حالانکہ فیصلہ ضرور واقع ہو گا اور اس فیصلہ کا حامل یہ ہے کہ) جو شخص نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے نفع کے لئے (یعنی وہاں اس کا نفع اور ثواب پاوے گا) اور جو شخص برا عمل کرتا ہے اس کا وبال (یعنی ضرر و عذاب) اسی پر پڑے گا اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں (کہ کوئی نیکی جو شرائط کے مطابق عمل میں لانی گئی ہو اس کو شمار نہ کرے یا کسی بدی کو زائد شمار کرے)۔

معارف و مسائل

کفر کی ایک خاص قسم الحاد ہے | اِنَّ الَّذِیْنَ یُحٰدُّوْنَ فِیْ اٰیٰتِنَا۔ اس سے پہلی آیات میں اُن منکرین توحید و رسالت کو ذکر و تنبیہ اور ان کے عذاب کا ذکر تھا جو رسالت و توحید کا کھل کر صاف انکار کرتے تھے۔ یہاں سے انکار کی ایک خاص قسم کا ذکر کیا جاتا ہے جس کا نام الحاد ہے۔ الحاد اور الحاد کے لغوی معنی ایک طرف مائل ہونے کے ہیں۔ قبر کی لحد کہ بھی اسی لئے لحد کہتے ہیں کہ وہ ایک طرف مائل ہوتی ہے۔ قرآن و حدیث کی اصطلاح میں آیات قرآنی سے عدول و انحراف کو الحاد کہتے ہیں۔ لغوی معنی کے اعتبار سے تو یہ عام ہے۔ احتیاطاً کھلے طور پر انکار و انحراف کرے یا تاویلات فاسدہ کے بہانہ سے انحراف کرے۔ لیکن عام طور سے الحاد ایسے انحراف کو کہتے ہیں کہ ظاہر میں تو قرآن اور اس کی آیات پر ایمان و تصدیق کا دعویٰ ہے

کرے مگر ان کے معانی اپنی طرف سے ایسے گھڑے جو قرآن و سنت کی نصوص اور جمہور امت کے خلاف ہوں اور جس سے قرآن کا مقصد ہی الٹ جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں الحاد کے معنی یہی منقول ہیں فرمایا الحاد هو وضع الكلام على غير موضعه۔ اور آیت مذکورہ میں ارشاد لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْكَ بَلَدٌ مِّنْهُ اس کا قرینہ ہے کہ الحاد کوئی ایسا کفر ہے جس کو یہ لوگ چھپانا چاہتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ہم سے اپنا کفر نہیں چھپا سکتے۔

اور آیت مذکورہ نے صراحت یہ قیلا دیا کہ آیات قرآنی سے انکار و انحراف صاف اور کھلے لفظوں میں ہو یا معانی میں تاویلات باطلہ کر کے قرآن کے احکام کو بدلنے کی فکر کرے یہ سب کفر و ضلال ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ الحاد ایک قسم کا کفر نفاق ہے کہ ظاہر میں قرآن اور آیات قرآن کو ماننے کا دعویٰ اور اقرار کرے لیکن آیات قرآنی کے معانی ایسے گھڑے جو دوسری نصوص قرآن و سنت اور اصول اسلام کے منافی ہوں۔ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں فرمایا:-

كذالك الزنادقة الذين يلحدون | ایسے ہی وہ زندیق لوگ ہیں جو الحاد کرتے ہیں اور
وقد كانوا يظهرون الاسلام | بظاہر اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ملحد اور زندیق دونوں ہم معنی ہیں جو ایسے کافر کو کہا جاتا ہے جو ظاہر میں اسلام کا دعویٰ کرے اور حقیقت میں اس کے احکام کی تعمیل سے انحراف کا یہ بہانہ بنائے کہ قرآن کے معانی ہی ایسے گھڑے جو خلاف نصوص و خلاف اجماع امت ہوں۔

ایک مغالطہ کا ازالہ | کتب عقائد میں ایک ضابطہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ متاویل کو کافر نہیں کہنا چاہیے یعنی جو شخص عقائد باطلہ اور کلمات کفریہ کو کسی تاویل سے اختیار کرے وہ کافر نہیں۔ لیکن اس ضابطہ کا مفہوم اگر عام لیا جائے کہ کیسے ہی قطعی اور یقینی حکم میں تاویل کرے اور کیسی ہی فاسد تاویل کرے وہ بہر حال کافر نہیں تو اس کا نتیجہ یہ لازم آتا ہے کہ دنیا میں مشرکین، بت پرست، یہود و نصاریٰ میں سے کسی کو بھی کافر نہ کہا جائے۔ کیونکہ بت پرست مشرکین کی تاویل تو قرآن میں مذکور ہے مَا تَعْبُدُونَ إِلَّا كُفْرًا بَلَدُوا إِلَى اللَّهِ زُفْرًا۔ یعنی ہم بتوں کی فی نفس عبادت نہیں کرتے بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ سفارش ہمیں کر کے اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیں، تو حقیقت عبادت اللہ ہی کی ہے۔ مگر قرآن نے ان کی اس تاویل کے باوجود انہیں کافر کہا، یہود و نصاریٰ کی تاویلیں تو بہت ہی مشہور و معروف ہیں۔ جن کے باوجود قرآن و سنت کی نصوص میں ان کو کافر کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ متاویل کو کافر نہ کہنے کا مفہوم عام نہیں۔

اسی لئے علماء و فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ یہ تاویل جو تکفیر سے مانع ہوتی ہے اسکی شرط یہ ہے کہ وہ ضروریات دین میں ان کے مفہوم قطعی کے خلاف نہ ہو۔ ضروریات دین سے مراد وہ احکام

و مسائل ہیں جو اسلام اور مسلمانوں میں اتنے متواتر اور مشہور ہوں کہ مسلمانوں کے ان پڑھ جاہلوں تک کو بھی ان سے واقفیت ہو جیسے پانچ نمازوں کا فرض ہونا۔ صبح کی دو ظہر کی چار رکعت کا فرض ہونا۔ رمضان کے روزے فرض ہونا۔ سود، شراب، خنزیر کا حرام ہونا وغیرہ۔ اگر کوئی شخص ان مسائل سے متعلق آیات قرآن میں ایسی تاویل کرے جس سے مسلمانوں کا متواتر اور مشہور مفہوم الٹ جائے وہ بلاشبہ باجماع اُمت کافر ہے، کیونکہ وہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے انکار ہے اور ایمان کی تعریف جمہور اُمت کے نزدیک یہی ہے کہ

تَصَدِيقُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيهَا عِلْمٌ فَجِئْتُ بِهِ ضُرُورَةً -

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنا ان تمام امور میں جن کا بیان کرنا اور حکم کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرورۃً ثابت ہو یعنی ایسا یقینی ثابت ہو کہ علماء کے سوا عوام بھی اس کو جانتے ہوں

اس لئے کفر کی تعریف اس کے بالمقابل یہ ہوگی کہ جن چیزوں کا لانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضروری اور قطعی طور پر ثابت ہو ان میں سے کسی کا انکار کفر ہے۔
تو جو شخص ایسی ضروریات دین میں تاویل کرے اُس حکم کو بدلے وہ آپ کی لائی ہوئی تعلیم کا انکار کرتا ہے۔

اس زمانہ میں کفر والحاد کی گرم بازاری | اس زمانے میں ایک طرف تو دین اور احکام دین سے جہالت اور غفلت انتہا کو پہنچ گئی کہ نئے لکھے پڑھے لوگ بہت سی ضروریات دین سے بھی ناواقف رہتے ہیں۔ دوسری طرف جدید بے خدا تعلیم جس کی بنیاد ہی مادہ پرستی پر ہے، کچھ اس کے اثر سے اس پر مزید یورپ کے مستشرقین کے پھیلانے ہوئے اسلام کے خلاف شبہات و اوہام سے متاثر ہو کر بہت سے ایسے لوگوں نے اسلام اور اصول اسلام پر بحث و گفتگو شروع کر دی ہے جن کو اسلام کے اصول و فروع قرآن و حدیث کے علوم سے کوئی واسطہ نہیں۔ انھوں نے اسلام کے متعلق اگر کچھ معلومات بھی حاصل کی ہیں تو اہل یورپ دشمنان اسلام سے حاصل کی ہیں۔ ایسے لوگوں نے قرآن و حدیث کی نصوص قطعیہ ضروریہ میں طرح طرح کی باطل تاویلیں کر کے شریعت اسلام کے متفق علیہ اور نصیص قطعیہ سے ثابت شدہ احکام کی تحریف کو اسلام کی خدمت سمجھ لیا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ کھلا کفر ہے تو وہ مشہور ضابطہ کا سہارا لیتے ہیں کہ ہم اس حکم کے منکر تو نہیں بلکہ ایک تاویل کر رہے ہیں اس لئے ہم پر یہ کفر عائد نہیں ہوتا۔

اسی لئے وقت کی اہم ضرورت سمجھ کر ہمارے استاد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی جس کا نام ہے

اکفنا الملحدین والملتأولین فی شیء من ضروریات الدین۔ اس میں ہر طبقہ ہر مسلک کے علماء و فقہاء کی تصریحات سے ثابت کیا ہے کہ ضروریات دین میں کسی کی تاویل مسموع نہیں۔ اور یہ تاویل ان کی تکفیر سے مانع نہیں۔ یہ کتاب بزبان عربی شائع ہوئی ہے، احقر نے اس کا خلاصہ اردو زبان میں بنام "ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں" شائع کر دیا ہے۔ اور احکام القرآن خزینہ میں اس کا خلاصہ بزبان عربی بیان کر دیا ہے، اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ حضرت شاہ عید العزیز محدث دہلوی رحمہ کی ایک تحسیر سے نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ نے فرمایا کہ آیات قرآنی میں تاویل باطل جس کو قرآن کی آیت مذکورہ میں الحاد فرمایا ہے اس کی دو قسمیں ہیں اول وہ تاویل باطل جو نصوص قطعیہ متواترہ یا اجماع قطعی کے خلاف ہو وہ تو بلاشبہ کفر ہے۔ دوسری یہ کہ وہ ایسی نصوص کے خلاف ہو جو اگرچہ قطعی ہیں مگر قریب بہ یقین ہیں یا اجماع عربی کے خلاف ہو، ایسی تاویل گمراہی اور فسق ہے، کفر نہیں۔ ان دو قسم کی تاویلوں کے علاوہ باقی تاویلات جو قرآن و حدیث کے الفاظ میں مختلف احتمالات ہونے کی بنا پر ہوں وہ تاویل عام فقہاء امت کا میدان اجتہاد ہے جو تصریح حدیث ہر حال میں باعث اجر و ثواب ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالَّذِي كُتِبَ لَهُمْ وَلَا يُحِلُّونَ عَلَيْهِمْ حَرْفٌ وَ إِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ۔ جمہور مفسرین نے فرمایا کہ ذکر سے مراد یہاں قرآن ہے، اور جملہ لَاتِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالَّذِي كُتِبَ لَهُمْ سابق بملہ لَاتِ الَّذِينَ يُلْحِذُونَ سے بدل ہے اور بقاعدہ عربیت اور مبدل منہ کا ایک حکم ہوتا ہے اس لئے اس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ لوگ ہم سے چھپ نہیں سکتے اور اس لئے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ آگے قرآن کے محفوزہ منجانب اللہ ہونے کو بیان فرمایا ہے کہ إِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ۔ یعنی یہ کتاب اللہ کے نزدیک عزیز و کریم ہے، کوئی باطل اس میں راستہ نہیں پاسکتا (لما روی عن ابن عباس رضی عنہما)۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ۔ آگے اس کتاب کے لئے منجانب اللہ حفاظت کا بیان ہے۔ قتاوہ اور مستدیی نے فرمایا کہ باطل سے مراد شیطان ہے اور مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ یعنی سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے اس سے مراد تمام جوانب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان کا کوئی تصرف و تدبیر اس کتاب میں نہیں چلتی کہ وہ اس کتاب میں کمی و بیشی یا کوئی تحریف کر سکے۔

تفسیر مظہری میں اس کو نقل کر کے فرمایا کہ شیطان اس جگہ عام شیطان الجن ہو یا آدمی شیطان کسی کی تحریف و تبدیل قرآن میں نہیں چلتی جیسے بعض زوافض نے قرآن میں دس پاروں کا، بعض نے

خاص خاص آیات کا اضافہ کرنا چاہا مگر کسی کی بات نہ چلی۔

الوحیانؑ نے بحر محیط میں فرمایا کہ لفظ باطل اپنے الفاظ کے اعتبار سے شیطان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہر باطل و مبطل شیطان کی طرف سے ہو یا کسی دوسرے کی طرف سے قرآن میں وہ نہیں چل سکتا۔ پھر بحوالہ طبری آیت کا یہ مفہوم بتلایا کہ کسی اہل باطل کی مجال نہیں کہ سامنے آکر اس کتاب میں کوئی تغیر و تبدیل کرے اور نہ اس کی مجال ہے کہ پیچھے سے چھپ کر اس کے معانی میں تحریف اور الحاد کرے۔

طبری کی تفسیر اس مقام سے بہت زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ قرآن میں الحاد و تحریف کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ کوئی اہل باطل کھلے طور پر قرآن میں کوئی کمی و بیشی کرنا چاہے اس کو تَوَمِیْنٌ یَدَّیْنِ سے تعبیر فرمایا۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص بظاہر دعویٰ ایمان کا کرے مگر چھپ کر تاویلات باطلہ کے ذریعہ قرآن کے معنی میں تحریف کرے اس کو تَوَمِیْنٌ خَلْفَیْنِ کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کے نزدیک ایسی عزیز و کریم ہے کہ نہ اس کے الفاظ میں کوئی کمی و بیشی اور تحریف و تبدیل پر کسی کو قدرت ہے اور نہ معانی میں تحریف کر کے قرآن کے احکام بدل دینے کی مجال ہے۔ جب تک کسی بد بخت نے اس کا ارادہ کیا وہ ہمیشہ رسوا ہوا۔ قرآن اس کی ناپاک تدبیر سے پاک صاف رہا۔ الفاظ میں تحریف و تبدیل کی راہ نہ ہونا تو ہر شخص دیکھتا سمجھتا ہے کہ تقریباً چودہ سو سال سے ساری دنیا میں پڑھا جاتا ہے۔ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہے۔ ایک زیرِ زیر کی غلطی کسی سے ہو جائے تو پوڑھوں سے لے کر بچوں تک، عالموں سے لیکر جاہلوں تک لاکھوں مسلمان اس کی غلطی پکڑنے والے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ تَوَمِیْنٌ خَلْفَیْنِ کے الفاظ سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ قرآن کی حفاظت جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ وہ صرف الفاظ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اس کے معانی کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ اسی کیل ہے اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بلا واسطہ شاگردوں یعنی صحابہ کرام کے ذریعہ معانی قرآن اور احکام قرآن کو بھی ایسا محفوظ کر دیا ہے کہ کوئی ملحد بے دین اُس میں تاویلات باطلہ کے ذریعہ تحریف کا ارادہ کرے تو ہر جگہ ہر زمانے میں ہزاروں علماء اس کی تردید کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ خائب و خاسر ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ آیت اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ میں ضمیر لہٗ قرآن کی طرف راجع ہے اور قرآن صرف الفاظ کا نام نہیں بلکہ نظم و معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ خلاصہ آیات مذکورہ کے مضمون کا یہ ہو گیا کہ جو لوگ بظاہر مسلمان ہیں، اس لئے کھل کر قرآن کا انکار تو نہیں کرتے مگر آیات قرآنی میں تاویلات باطلہ سے کام لیکر ان کو ایسے مطلب پر محمول کرتے ہیں جو قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قطعی تصریحات کے خلاف ہے۔ ان کی تحریف سے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو ایسا محفوظ کر دیا ہے کہ یہ کھڑے ہوئے معانی کسی کے چل نہیں سکتے۔ قرآن و حدیث کی

دوسری نصوص اور علما راسخین اُس کی قلعی کھول دیتے ہیں۔ اور احادیث صحیحہ کی تصریح کے مطابق قیامت تک مسلمانوں میں ایسی جماعت قائم رہے گی جو تحریف کرنے والوں کی تحریف کا پردہ چاک کر کے قرآن کے صحیح مفہوم کو واضح کر دے۔ اور دنیا سے وہ اپنے کفر کو کیسا ہی چھپا میں۔ اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپا سکتے۔ اور جب التائفا لے ان کی اس سازش سے باخبر ہے تو ان کو اس کی سزا ملنا بھی ضروری ہے۔

عَوَّاجَةً حِجَابٍ وَنَحْوِہَا۔ عرب کے سوا جتنی قومیں دنیا میں ہیں ان سب کو عجم کہا جاتا ہے اور جب اُس پر حرفِ ہمزہ بڑھا کر عجم کہا جائے تو اس کے معنی کلام غیر فصیح کے ہوتے ہیں۔ اسلئے عجمی اُس شخص کو کہیں گے جو عربی نہ ہو، اگرچہ کلام فصیح بولتا ہو۔ اور اعجمی اس کو جو کلام فصیح نہ کر سکے۔

(قرطبی)

آیت مذکورہ میں عَوَّاجَةً فرمایا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم قرآن کو عربی زبان کے علاوہ کسی زبان میں بھیجے تو قریش عرب جو قرآن کے پہلے مخاطب ہیں ان کو یہ شکایت ہوتی کہ یہ کتاب ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اور تعجب سے کہتے کہ نبی تو عربی ہے اور کتاب اعجمی ہے جو فصیح نہیں۔

قُلْ هُوَ الَّذِي يَنْفَعُ الْهَادِيَ وَيُشْفَا عَمًّا۔ یہاں قرآن کریم کی دو صفات بتلائی ہیں ایک یہ کہ وہ ہدایت ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کو ایسا راستہ بتاتا ہے جو اس کے لئے نافع و مفید ہی ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ شفا ہے۔ قرآن کریم کا مراض باطنہ کفر و شرک، کبر و حسد، حرص و طمع وغیرہ سے شفا ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ ظاہری اور جسمانی امراض سے شفا ہونا بھی اس میں داخل ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ بہت سے جسمانی امراض کا علاج قرآنی دعاؤں سے ہوتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔

أُولَئِكَ يَتَنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ۔ یہ ایک تمثیل ہے جو آدمی کلام کر سمجھتا ہو، عرب اس کو کہتے ہیں۔ أَنْتَ تَسْمَعُ مِنْ قَرِيبٍ۔ یعنی تم قریب سے سُن رہے ہو اور جو کلام کو نہ سمجھے اس کو کہتے ہیں أَنْتَ تُنَادِي مِنْ بَعِيدٍ۔ یعنی تمہیں دُور سے آواز دیکر ہی ہے۔ (قرطبی)

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ چونکہ قرآنی ہدایات کو سُننے اور سمجھنے کا ارادہ نہیں رکھتے اس لئے گویا ان کے کان بہرے ہیں، اور آنکھیں اندھی ہیں۔ ان کو ہدایت کی تعلیم دینا ایسا ہے جیسا کسی کو بہت دُور سے پکارا جائے کہ اس کے کانوں تک اس کی آواز نہ پہنچے۔

إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرَاتٍ

اسی کی طرف حوالہ ہے قیامت کی خبر کا اور نہیں نکلتے کوئی میوے

مِّنْ أَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ط

اپنے غلام سے اور نہیں رہتا حمل کسی مادہ کو اور نہ وہ جنے کہ جس کی اس کو خبر نہیں

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِيَ لَا قَالُوا أَاذْنَاكَ لَا مَا مِنَّا

اور جس دن ان کو پکارے گا کہاں میں میرے شریک بولیں گے ہم نے تجھ کو کہہ سنایا

مِّنْ شَهِيدٍ ۝۴۱ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَدْعُونَ مِن

ہم میں کوئی اس کا اقرار نہیں کرتا اور چوک گیا اُن سے جو پکارتے تھے

قَبْلُ وَظَنُوا مَا لَهُم مِّنْ مَّحِيصٍ ۝۴۲ لَا يَسْمَعُ الْإِنْسَانُ

پہلے اور سمجھ گئے کہ ان کو کہیں نہیں خلاصی نہیں تھکتا آدمی

مِّنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنَّ مَصَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ ۝۴۳ وَ

مانگنے سے بھلائی اور اگر لگ جائے اسکو برائی تو اس توڑ بیٹھے ناامید ہو کر اور

لَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِنَّا مِن بَعْدِ ضَرَاءٍ مَّسَّتْهُ

اگر ہم چکھائیں اس کو کچھ اپنی مہربانی پیچھے ایک تکلیف کے جو اس کو پہنچی تھی

لَيَقُولَنَّ هَذَا إِلَىٰ لَا وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً لَا أَسِينُ

تو کہنے لگے یہ ہے میرے لائق اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت آنے والی ہے اور اگر میں

رُجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِنْدَكَ لَلْخُسْرَانِ فَلَنُذِيبَنَّ

پھر بھی گیا اپنے رب کی طرف بیشک میرے لئے ہے اس کے پاس خوبی سو ہم جتلا دیں گے

الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا وَكَانَ يُقْنَهُم مِّنْ عَذَابِ

منکروں کو جو انہوں نے کیا ہے اور چکھائیں گے ان کو ایک گھاڑھا

خَلِيطٍ ۝۴۴ وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَا

عذاب اور جب ہم نعمتیں بھیجیں انسان پر تو ٹلا جاوے اور موڑ لے

بِجَانِبِهِ ۝۴۵ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ ۝۴۶

اپنی کر دھک اور جب لگے اس کو برائی تو دعائیں کرے چوڑی

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنَ عِنْدِ اللَّهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهِ

تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر یہ ہو اللہ کے پاس سے پھر تم نے اس کو نہ مانا

مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝۴۷ سَنُرِيهِمْ

پھر اس سے گمراہ زیادہ کون جو دور چلا جائے مخالف ہو کر اب ہم دکھلائیں گے

اٰیْتِنَا فِی الْاَفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَيَّنَ لَهُمْ

ان کو اپنے منہ دنیائیں اور خود ان کی جانوں میں یہاں تک کہ کھل جائے ان پر کہ یہ

اِنَّهُ الْحَقُّ ۚ اَوَلَمْ یَكْفِ بِرَبِّكَ اَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ

ٹھیک ہے کیا تیرا رب تھوڑا ہے ہر چیز پر گواہ ہونے

شَهِیْدٌ ۝۵۳ اَلَا اِنَّهُمْ فِیْ مَرِیْۃٍ مِّنْ لِّقَاءِ رَبِّهِمْ ۚ

کے لئے سنتا ہے وہ دھوکے میں ہیں اپنے رب کی ملاقات سے سنتا ہے وہ

اَلَا اِنَّتَ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ۝۵۴

گھیر رہا ہے ہر چیز کو

خلاصہ تفسیر

(اور پر جس قیامت کا ذکر ہے کہ اس میں اُن کو جزا ملے گی اُس) قیامت کے علم کا حوالہ خدا ہی کی طرف دیا جاسکتا ہے (یعنی اس سوال کے جواب میں کہ قیامت کب آوے گی جیسا کہ کفار بغرض انکار ایسا کہا کرتے تھے یہی کہا جاوے گا کہ اس کا علم خدا ہی کو ہے مخلوق کو اس کا علم نہ ہونے سے اس کا عدم وقوع لازم نہیں آتا) اور (قیامت ہی کی کیا تخصیص ہے اس کا علم ہر شے کو محیط ہے حتیٰ کہ)

کوئی پھل اپنے خول میں سے نہیں نکلتا اور نہ کسی عورت کو حمل رہتا ہے اور نہ وہ بچہ جنمتی ہے مگر یہ سب اس کی اطلاع سے ہوتا ہے (اور اس اطلاع کی وجہ اس کی صفت علم کا ذاتی ہونا ہے جو بوجہ اعلیٰ درجہ کے کمال ہونے کے دلیل توحید بھی ہے۔ اور دلیل علم قیامت کی بھی ہے۔ پس اس دونوں مضمونوں کی تائید ہو گئی) اور (آگے اُس قیامت کے ایک واقعہ کا ذکر ہے جس سے اثبات توحید و ابطال شرک بھی ہوتا ہے یعنی) جس روز اللہ تعالیٰ ان (مشرکین) کو پکارے گا (اور کہے گا) کہ (جن کو تم نے میرا شریک قرار دے رکھا تھا وہ) میرے شریک (اب) کہاں ہیں (ان کو بلاؤ کہ تم کو اس مصیبت سے بچاویں) وہ کہیں گے کہ (اب تو) ہم آپ سے ہی عرض کرتے ہیں کہ ہم میں کوئی (اس عقیدہ کا) مدعی نہیں (یعنی اپنی غلطی کے مقر نہیں چونکہ وہاں حقائق عقائد منکشف ہو جاویں گے۔ پس یہ اقرار یا تو اضطرابی ہے یا اس لئے ہے کہ اس سے بچد توقع نجات کی ہو) اور جن جن کو یہ لوگ پہلے سے (یعنی دنیا میں) پوجا کرتے تھے وہ سب غائب ہو جاویں گے اور (جب یہ احوال دیکھیں گے تو) یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ ان کے لئے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں (اس وقت بھولے خدا دل کا بے بس ہونا اور الہ واحد کا حق ہونا معلوم ہو جاوے گا) اُسے شرک و کفر کا ایک بڑا اثر طبیعت انسانی پر بیان فرماتے ہیں کہ جو شخص توحید و ایمان سے بے بہرہ

ہے اس آدمی کے اخلاق و عقائد و اعمال ایسے بُرے ہوتے ہیں کہ ایک تو کسی حالت میں یعنی فراخی اور تنگی دونوں میں ترقی کی خواہش سے اس کا جی نہیں بھرتا (جو انتہائی حرص کی علامت ہے) اور (خاص حالت تنگی وغیرہ میں یہ کیفیت ہے کہ) اگر اس کو کچھ تکلیف پہنچتی ہے تو ناامید اور ہراساں ہو جاتا ہے (اور یہ انتہائی ناشکری اور اللہ تعالیٰ کی بدگمانی کی علامت ہے) اور (جب تنگی دور ہو جاتی ہے تو اس وقت اس کی یہ کیفیت ہے کہ) اگر ہم اس کو کسی تکلیف کے بعد جو کہ اس پر واقع ہوئی تھی اپنی مہربانی کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میرے لئے ہو گا چاہیے تھا، کیونکہ میری تدبیر و لیاقت و ذہنیت اسی کی مقتضی تھی اور یہ بھی انتہائی ناشکری اور تکبر ہے) اور اس نعمت میں یہاں تک بھولتا ہے گھولتا ہے کہ یوں بھی کہتا ہے کہ میں قیامت کو آنے والا نہیں خیال کرتا اور اگر بالفرض محال آئی بھی اور میں اپنے رب کے پاس پہنچا یا بھی گیا (جیسا نبیؐ کہتے ہیں) تو میرے لئے اس کے پاس بھی بہتری ہی ہے (کیونکہ میں حق پر ہوں اور اس کا مستحق ہوں)۔ قیامت کا انکار غایت درجہ کفر اور قیامت واقع ہونے کی صورت میں یہ گمان کہ وہاں بھی مجھے انعامات ملیں گے، یہ اللہ کے معاملے میں انتہائی دھوکہ میں مبتلا ہونا ہے۔ غرض کفر و شرک سے یہ مفاسد پیدا ہوئے۔ وہ ایسی بُری چیز ہے) سو یہ لوگ یہاں جو چاہیں دعوتِ احقاق و استحقاق کا کر لیں اب عنقریب ہم ان منکروں کو ان کے (یہ) سب کمرہ ضرور بتلا دیں گے اور ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھا دیں گے اور (نیز کفر و شرک کا ایک اثر یہ ہے کہ) جب ہم (ایسے) آدمی کو نعمت عطا کرتے ہیں تو (ہم سے اور ہمارے احکام سے) مُنہ موڑ لیتا ہے اور کمرہ ٹ پھیر لیتا ہے (جو انتہائی درجہ کی ناشکری ہے) اور (حالت تنگی و ضرر میں آثار کفر و شرک میں سے ایک یہ ہے کہ) جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو (نعمت سلب ہو جانے پر) سرخ کی راہ سے نہ کہ منعم کی طرف التجار کے طور پر (خوب لمبی چوڑی دعائیں کرتا ہے۔ اور یہ غایتِ جہد کی ہے) میری اور حبِ دنیا میں انہماک ہے۔ آگے رسالت اور قرآن کی حقانیت کی طرف دعوت دینے کے لئے ارشاد ہے کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، آپ (ان منکرین سے) کہئے کہ (اے منکرو! قرآن کے حق ہونے پر جو دلائل قائم ہیں جیسے اس کا معجزہ ہونا اور غیب کی خبریں صحیح صحیح دینا، اگر تم عدم تدبیر کی وجہ سے ان کو سببِ یقین نہیں سمجھتے تو کم از کم اس کے احتمال کے درجہ کی تو نفی تم بھی نہیں کر سکتے کیونکہ نفی پر تمہارے پاس کوئی دلیل تو قائم نہیں سو) بھلا یہ بتلاؤ کہ اگر (بنابر علی الاحتمال المذكور) یہ قرآن خدا کے یہاں سے آیا ہو اور پھر تم اس کا انکار کرو تو ایسے شخص سے زیادہ کون غلطی میں ہو گا جو (حق سے) ایسی دور دراز کی مخالفت میں پڑا ہو (اس لئے انکار میں جلد بازی نہ کرو، بلکہ سوچ سمجھ سے کام لو تا کہ حق واضح اور متعین ہو جائے اور ان لوگوں سے تو کیا امید ہے کہ یہ تدبیر کریں مگر خیر) ہم (خود ہی) عنقریب ان کو اپنی

(قدرت کی) نشانیاں (جو کہ دال ہوں صدق قرآن پر) ان کے گرد و نواح میں بھی دکھائیں گے (کہ تمام عرب پیشین گوئی کے موافق فتح ہوگا) اور خود ان کی ذات (خاص) میں بھی (دکھلائیں گے کہ بدر میں مارے جائیں گے اور ان کا مسکن مکہ بھی فتح ہو جاوے گا) یہاں تک کہ (بالاضطرار ان پیشین گوئیوں کے وقوع سے) ان پر ظاہر ہو جاوے گا کہ وہ قرآن حق ہے (کہ اس کی پیشین گوئیاں کس طرح صادق ہو رہی ہیں گو یہ علم اضطراری بدون تصدیق اختیاری کے مقبول نہیں، لیکن اتمام حجت میں توقوت زیادہ ہو جاوے گی۔ غرض اس کی حقیقت ایک روز اس طرح ظاہر ہوگی باقی فی الحال جو یہ لوگ آپ کی وحی رسالت کا انکار کر رہے ہیں آپ معصوم نہ ہوں کیونکہ اگر لوگ اس پر شہادت نہ دیں تو) کیا آپ کے رب کی بات (آپ کی حقانیت کی شہادت اور تسلی کے لئے) کافی نہیں کہ وہ ہر (واقعی) چیز کا شاہد ہے (اور اس نے جا بجا آپ کی رسالت کی شہادت دی ہے، آگے اصل وجہ اس انکار کی بتلائے ہیں اور اس سے تسلی بھی زیادہ ہو سکتی ہے) یاد رکھو کہ وہ لوگ اپنے رب کے روبرو جانے کے طرف سے شک میں پڑے ہیں (اس لئے دل میں ڈر نہیں جس سے حق کو طلب کریں مگر یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو (اپنے علم کے) احاطے میں لئے ہوئے ہے پس ان کے شک و شبہ کو بھی جانتا ہے اور اس پر سزا دے گا)۔

معارف و مسائل

فَدُودُ عَاكِ عِزِّهِ - مقصود یہ ہے کہ کافر انسان کی خصلت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس کو کوئی نعمت و دولت و عزت عافیت دیتے ہیں تو ان میں مگن اور مست ہو کر منعم حقیقی اللہ تعالیٰ سے اور بھی زیادہ دور ہو جاتا ہے اور اس کا تکبر اور غفلت بڑھ جاتی ہے اور جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے لمبی لمبی دعائیں مانگنے لگتا ہے۔ لمبی دعا کو اس جگہ عرض یعنی چوڑی سے تعبیر فرمایا جس میں زیادہ مبالغہ ہے۔ کیونکہ جس چیز کا عرض بڑا ہو اس کا طول اس سے زیادہ بڑا ہونا خود بخود معلوم ہے۔ اسی لئے جنت کی وسعت بیان فرمانے میں بھی حق تعالیٰ نے فرمایا عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ - یعنی جنت اتنی وسیع ہے کہ اس کے عرض میں سب آسمان و زمین سما جائیں۔ اور طویل دعائیں مانگنا اگرچہ فی نفسہ امر محمود و مستحسن ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ میں دعا کے آداب میں ذکر کیا گیا ہے کہ دعا میں الحاح و زاری اور بار بار تکرار کرنا بہتر ہے۔

(لما اخرجہ البخاری و مسلم دعا المحدثین)

لیکن اس جگہ اس کافر انسان کی جو مذمت کی گئی ہے وہ درحقیقت طول دعا پر نہیں بلکہ اسکی اس مجموعی مذموم خصلت پر ہے کہ جب اس پر اللہ تعالیٰ نعمت کی رزائی فرمادیں تو تکبر اور غرور میں مدہوش ہو جاوے اور حبب مصیبت آئے تو اپنی پریشانی کو بار بار پکارتا اور کہتا پھرے جیسا غافل لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اللہ سے دعا کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اپنا دکھڑا روزنا اور لوگوں سے کہتے رہنا مقصود ہوتا ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ۔ یعنی اپنی قدرت کاملہ اور وحدانیت کی نشانیاں ان لوگوں کو دکھلاتے ہیں آفاق میں بھی اور خود ان کے اپنے تن بدن میں بھی۔ آفاق اُفق کی جمع ہے، آسمان کے پچھلے کنارے کو کہا جاتا ہے۔ مراد آفاق سے اطراف عالم ہیں یعنی سارے عالم کی بڑی چھوٹی مصنوعیات و مخلوقات آسمان و زمین اور ان کے درمیانی مخلوقات میں سے ہر چیز کو دیکھو تو وہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے علم و قدرت کے محیط ہونے اور اس کے یکتا ہونے کی شہادت دیتی ہیں اور اس سے زیادہ قریب کی چیز خود انسان کی اپنی جان اور جسم ہے۔ اس کے ایک ایک عضو اور اس میں کام کرنے والی باریک اور نازک مشینوں کو دیکھئے کہ ان میں انسان کی راحت و سہولت کے کیسے کیسے انتظام رکھے گئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ پھر ان نازک مشینوں کو اتنا مضبوط بنایا ہے کہ سترہ اسی سال تک وہ گھستی نہیں۔ انسان کے عام جوڑوں میں جو اسپرنگ لگے ہوئے ہیں اگر انسانی صنعت ہوتی تو نو لادہ اسپرنگ بھی گھس کر ختم ہو جاتے۔ یہاں ہاتھوں کی کھال اور اس پر لکھی ہوئی لکیریں اور خطوط بھی ساری عمر نہیں گھستے۔ جن میں کوئی ادنیٰ عقل و شعور کا آدمی بھی غور کرے تو اس یقین پر مجبور ہوگا کہ اس کی پیدا کرنے والی اور قائم رکھنے والی کوئی ایسی ذات جس کے علم و قدرت کی کوئی انتہا نہیں اور جس کا مثل کوئی نہیں ہو سکتا۔

فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ط

تَمَّتْ سُورَةُ الْحَمِّ السَّجْدَةِ بِعَوْنِ اللَّهِ وَحْدَهُ لِلْعَشْرِينَ

مِنَ الرَّبِّيعِ الثَّانِي سَلَاةً يَوْمَ السَّبْتِ

سُورَةُ الشُّورَى

سُورَةُ الشُّورَى مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلَاثٌ وَخَمْسُونَ آيَةً وَخَمْسُ رُكُوعَاتٍ
سورۃ شوریٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں تریپن آیتیں ہیں اور پانچ رکوع -

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حَمْدٌ ۱ عَسَق ۲ كَذَلِكَ يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ

اسی طرح وحی بھیجتا ہے تیری طرف اور تجھ سے پہلوں

مِنْ قَبْلِكَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۳ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

کی طرف اللہ زبردست حکمتوں والا اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں

وَمَا فِي الْأَرْضِ ۴ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ۵ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ

اور زمین میں اور وہی ہے سب سے الیہر بڑا قریب ہے کہ پھٹ پڑیں

يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ

آسمان الیہر سے اور فرشتے پاکی بولتے ہیں خوبیاں اپنے

رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ ۶ وَالْآنَ

رب کی اور گناہ بخشواتے ہیں زمین والوں کے مستغاث وہی

اللَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۷ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ

ہے اللہ معاف کرنے والا مہربان اور جنہوں نے پکڑے ہیں اس کے

دُونِهِ أَوْلِيَاءَ اللَّهُ حَفِيفٌ عَلَيْهِمْ ۸ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ

سوائے رفیق، اللہ کو وہ سب یاد ہیں اور تجھ پر نہیں ان کا

بِوَكِيلٍ ۹ وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ

ذکر اور اسی طرح اتارا ہم نے تجھ پر قرآن عربی زبان کا کہ تو ڈر مٹائے

أَمَّا الْقُضَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا

بڑے ٹکڑوں کو اور اس کے آس پاس والوں کو اور خبر سنا دے جمع ہونے کے دن کی

رَأَيْبَ فِيهِ طَفَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ ④

اس میں دھوکا نہیں ایک فرقہ بہشت میں اور ایک فرقہ آگ میں

وَكَوْشَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يَدْخُلُ

اور اگر چاہتا تھا کہ سب لوگوں کو کرتا ایک ہی فرقہ لیکن وہ داخل کرتا ہے

مَنْ يَشَاءُ فِي سَخَطِهِ طَوَالِظُ الظَّالِمُونَ مَا لَهُمْ مِنْ وَلِيٍّ

جس کو چاہے اپنی رحمت میں اور گنہگار جو ہیں ان کا کوئی نہیں رہنبر

وَلَا نَصِيرٍ ⑤ أَمَّا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ فَاللَّهُ

اور نہ مددگار کیا انھوں نے پکڑے ہیں اس سے دوسرے کام بنائے والے سوا اللہ جو ہے

هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتَى وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ⑥

وہی ہے کام بنانے والا اور وہی جلاتا ہے مردوں کو اور وہ ہر چیز کر سکتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

الحمد لله - (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں۔ جس طرح اصول دینیہ کی تحقیق اور فوائد

عظیمہ کے لئے یہ سورت آپ پر نازل ہو رہی ہے) اسی طرح آپ پر اور جو (پیغمبر) آپ سے پہلے

ہو چکے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ جو زبردست حکمت والا ہے (دوسری سورتوں اور کتابوں کی) وحی بھیجتا

رہا ہے (اور اس کی یہ شان ہے کہ) اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہی

سب سے بڑا اور عظیم الشان ہے (اس کی عظمت شان کو اگر کچھ زمین والے نہ پہچانیں اور نہ مانیں

مگر آسمانوں میں اس کی معرفت رکھنے والے اور عظمت کو پہچاننے والے فرشتے اس کثرت سے ہیں کہ کچھ بعد

نہیں کہ آسمان (ان کے بوجھ کی وجہ سے) اپنے اوپر سے (کہ بوجھ اووہر ہی سے پڑتا ہے) پھٹ پڑیں

(جیسا کہ حدیث میں آگیا) أَقْلَتِ السَّمَاءُ وَحَقَّ لَهَا أَنْ تَنَظَّطَ مَا فِيهَا مَوْضِعَ أَرْبَعَةِ أَصَابِعَ

الْأَوْمَلِكِ وَاصْبَحَ جَبْهَتُهُ سَاجِدًا لِلَّهِ - رواہ الترمذی وابن ماجہ وبقدر الآیہ فی المذکر

یعنی آسمان میں ایسی آواز پیدا ہونے لگی جیسی کسی چیز پر زیادہ بوجھ پڑ جانے سے ہوا کرتی ہے۔ اور آسمان

ایسی ہی آواز ہونی چاہیے۔ کیونکہ پورے آسمانوں میں چار انگشت کی جگہ بھی ایسی نہیں جس میں کوئی

فرشتہ اپنی پیشانی ٹیک کر سجدہ میں نہ ہو (اور وہ) فرشتے اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں، اور

اہل زمین (میں) جو لوگ اس کی عظمت کا حق ادا نہیں کرتے بلکہ شرک و کفر میں مبتلا ہیں اس لئے مستحق عذاب ہیں۔ وہ فرشتے اُن کے لئے (ایک خاص وقت تک) معافی مانگتے ہیں (اس محدود معافی مانگنے سے مراد یہ ہے کہ فرشتے اس کی دعا کرتے ہیں کہ ان پر دنیا میں کوئی سخت عذاب نہ آجائے۔ جس سے بھی ہلاک ہو جائیں۔ دنیا کی معمولی سزائیں اور آخرت کا اصلی عذاب اس استغفار کے مفہوم سے خارج ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کی اس دعا و درخواست کو قبول فرما کر ان کو دنیا کے عذاب عام سے بچالیتا ہے) خوب سمجھ لو کہ اللہ ہی معاف کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے (اگرچہ کفار کی یہ معافی محدود و رحمت صرف دنیا کی حد تک ہوتی ہے) اور جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے کارساز قرار دے رکھے ہیں اللہ تعالیٰ ان (کے اعمال قبیح) کو دیکھ بھال رہا ہے (جس کی سزا اُن کو مناسب وقت پر ملے گی) اور آپ کو ان پر کوئی اختیار نہیں دیا گیا (کہ آپ جیب چاہیں اُن پر عذاب نازل کر دیں) اور آپ کو ان کو بے پروا نہ رہنے سے حزن و ملال نہ ہونا چاہیے کیونکہ آپ کا کام تبلیغ کرنے کا ہے وہ آپ کو چکے اس سے زیادہ کی فکر آپ نہ کریں، چنانچہ ہم نے اسی طرح (جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں) آپ پر قرآن عربی وحی کے ذریعہ (محض اس لئے) نازل کیا ہے تاکہ آپ (سب سے پہلے) مکہ کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے آس پاس ہیں اُن کو ڈرائیں اور (یہ ڈرنا بھی ایک بڑی چیز سے ہے یعنی) جمع ہونے کے دن سے ڈرائیں۔ (مراد اس سے قیامت ہے جس میں سب اولین و آخرین ایک میدان میں جمع ہوں گے) جس میں ذرا شک نہیں (جس میں فیصلہ یہ ہوگا کہ) ایک گروہ جنت میں (داخل) ہوگا ایک گروہ دوزخ میں (داخل) ہوگا۔ (بس آپ کا کام اتنا ہی ہے کہ اس دن سے اُن کو ڈرائیں) اور (رہبان کا ایمان لانا یا نہ لانا یہ مشیت الہی پر موقوف ہے) اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو تو ان سب کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتا (یعنی سب کو ایمان نصیب ہو جاتا جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا وَكُونُوا عَلَىٰ نَفْسِكُمْ ذَاذِقِينَ هُدَاهَا یعنی اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو صحیح ہدایت پر پہنچا دیتے) لیکن بہت سی حکمتوں کی بنا پر اس کو یہ منظور نہیں ہوا بلکہ وہ جس کو چاہتا ہے (ایمان دیکھ) اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے (اور جس کو چاہتا ہے اس کے کفر و شرک پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ رحمت میں داخل نہیں ہوتا) اور (ان ظالموں کا) جو کہ کفر و شرک میں مبتلا ہیں قیامت کے روز (کوئی حامی اور مددگار نہیں) آگے شرک کا ابطال کیا جاتا ہے، کیا ان لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے کارساز قرار دے رکھے ہیں سو (اگر کارساز بنانا ہے تو) اللہ ہی کارساز (بنانے کا مستحق) ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (تو کارساز بنانے کے لائق وہی ہے جو ہر چیز پر یہاں تک کہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے اس کی قدرت کی خصوصیت یہ ہے کہ اور چیزوں پر تو برائے نام قدرت کچھ دوسروں کو بھی اس وقت حاصل ہے مگر مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت میں کوئی برائے نام بھی شریک نہیں)۔

معارف و مسائل

يَقْطَعُونَ - اس میں بحوالہ حدیث اور بیان ہوا ہے کہ فرشتوں کے بوجھ سے آسمان میں ایسی آواز پیدا ہوتی جیسی کسی چیز پر بڑا بھاری بوجھ رکھ دینے سے ہوا کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں میں ثقل والا بوجھ ہے۔ اور اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ کیونکہ یہ بات تو مسلم ہے کہ فرشتے بھی اجسام ہیں اگرچہ اجسام لطیفہ ہوں۔ اور اجسام لطیفہ جب بہت بڑی تعداد میں ہو جائیں تو ان کا بوجھ پڑنا کوئی مستبعد نہیں۔ (بیان القرآن)

لَقَدْ نَزَّلْنَا الْقُرْآنَ - اُمّ القری کے معنی ہیں ساری بستیوں اور شہروں کی اہل اور بنیاد، مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس کا نام اُمّ القری اس لئے رکھا گیا کہ یہ شہر ساری دنیا کے شہروں اور بستیوں سے اور ساری زمین سے اللہ کے نزدیک اشرف و افضل ہے۔ جیسا کہ امام احمد نے مستند میں حضرت عدی بن حمراء زہری سے روایت کی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت سنا جبکہ آپ (مکہ مکرمہ سے ہجرت کر رہے تھے اور) بازار مکہ کے مقام حذورہ پر تھے کہ آپ نے مکہ مکرمہ کو خطاب کر کے فرمایا:-

تومیرے نزدیک اللہ کی ساری زمین سے بہتر ہے اور ساری زمین سے زیادہ محبوب ہے، اگر مجھے اس زمین سے نکالا جاتا تو میں اپنی مرضی سے کبھی اس زمین کو نہ چھوڑتا۔

انك لخیر ارض اللہ واحب ارض اللہ الیّ ولو لا انی اُخرجت منك لما خیر جت (دروسی مثلہ الترمذی والنسائی و ابن ماجہ وقال الترمذی حدیث حسن صحیح)

وَمَنْ حَوْلَهَا - یعنی مکہ مکرمہ کے آس پاس اس سے مراد اس پاس کے عرب ممالک بھی ہو سکتے ہیں اور پوری زمین کی مشرق و مغرب بھی۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ذَلِكُمُ

اور جس بات میں جھگڑا کرتے ہو تم لوگ کوئی چیز نہ ہو اس کا فیصلہ ہے اللہ کے حوالے وہ اللہ

اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝ فَاطِرُ السَّمَوَاتِ

ہے رب میرا اسی پر ہے مجھ کو بھروسہ اور اسی کی طرف میری رجوع ہے بنا نکالنے والا آسمانوں کا

وَالْأَرْضِ ط جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنْ

اور زمین کا بنا دیئے تمھارے واسطے تم ہی میں سے جوڑے اور جوڑیاؤں

الْأَنْعَامِ أَنْزِلُوا جَاهِ يَدُكُمْ فِيهِ ط لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ

میں سے جوڑے بکھیرنا ہے تم کو اسی طرح نہیں ہے اس کی طرح کا سا کوئی

وَهُوَ السَّابِقُ الْبَصِيرُ ۝۱۱ لَهُ مَقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اور وہی ہے سنے والا دیکھنے والا اسی کے پاس ہیں کنجیاں آسمانوں کی اور زمین کی

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ ۝۱۲ إِنَّهُ بِكُلِّ

پھیلا دیتا ہے روزی جس کے واسطے چاہے اور ماپ کر دیتا ہے وہ ہر چیز کی غیر

شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝۱۲

رکھتا ہے -

خلاصہ تفسیر

اور آپ ان لوگوں سے جو توحید میں آپ سے اختلاف رکھتے ہیں یہ کہئے کہ جس جس بات میں تم (اہل حق کے ساتھ) اختلاف کرتے ہو اس (سب) کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے سپرد ہے (وہ یہ ہے کہ دنیا میں دلائل و معجزات کے ذریعہ توحید کا حق ہونا واضح فرما دیا اور آخرت میں ایمان والوں کو جنت اور ایمان نہ لانے والوں کو جہنم میں ڈالا جائے گا) یہ اللہ (جس کی یہ شان ہے) میرا رب ہے (اور تمہارا) خلافت و مخالفت سے جو کسی تکلیف و نقصان کے پہنچنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے اس کے بارے میں) اسی پر توکل رکھتا ہوں اور (دنیا و دین کے سب کاموں میں) اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں (اس سے توحید کا مضمون خوب مزید ہو گیا۔ آگے دوسری صفات کمال کے بیان سے اس کی مزید تاکید کی جاتی ہے یعنی) وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (اور تمہارا بھی پیدا کرنے والا ہے چنانچہ) اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس کے جوڑے بنائے اور (اسی طرح) مویشی کے جوڑے بنائے (اور) اس (جوڑے ملانے) کے ذریعہ تمہاری نسل چلاتا رہتا ہے (وہ ذات و صفات میں ایسا کامل ہے کہ) کوئی چیز اس کی مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے والا دیکھنے والا ہے (بخلاف دوسروں کے کہ ان کا سنا دیکھنا بہت محدود ہے اور بمقابلہ اللہ کے سمیع و بصیر کے کالعدم ہے) اسی کے اختیار میں ہیں کنجیاں آسمانوں کی اور زمین کی (یعنی ان میں تصرف کرنے کا صرف اسی کو حق ہے جس میں سے ایک تصرف یہ ہے کہ) جس کو چاہے زیادہ روزی دیتا ہے اور (جس کو چاہے) کم دیتا ہے، بے شک وہ ہر چیز کا پورا جاننے والا ہے (ہر ایک کو مصلحت کے مطابق دیتا ہے۔)

معارف و مسائل

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ - یعنی جس معاملہ جس کام میں بھی تمہارے آپس میں کوئی اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ ہی کے سپرد ہے۔ کیونکہ اصل حکم صرف اللہ ہی کا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ **إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ**۔ اور دوسری اکثر آیات میں جو اطاعت کے حکم میں رسول کو اور بعض آیات میں اولوالامر کو بھی شامل کیا گیا ہے وہ اس کے معارض نہیں کیونکہ رسول یا اولوالامر جو کچھ فیصلہ یا حکم کرتے ہیں وہ ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہوتا ہے۔ اگر بذریعہ فہمی یا نفوس کتاب و سنت ہے تو اس کا حکم الہی ہونا ظاہر ہے۔ اور اگر اپنے اجتہاد سے ہے تو چونکہ اجتہاد کا مدار بھی نفوس قرآن و سنت پر ہوتا ہے اس لئے وہ بھی ایک حیثیت سے اللہ ہی کا حکم ہے مجتہدین اُمت کے اجتہادات بھی اس حیثیت سے احکام الہیہ ہیں اخل ہیں۔ اسی لئے علماء نے فرمایا کہ عام آدمی جو قرآن و سنت کو سمجھے کی صلاحیت نہیں رکھتے اُن کے حق میں نفی کا فتویٰ ہی حکم شرعی کہلاتا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا

راہ ڈال دی تمہارے لئے دین میں وہی جس کا حکم کیا تھا نوح کو اور جس کا حکم بھیجا ہم نے

إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا

تیری طرف اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو یہ کہ قائم رکھو

الدِّينَ وَلَا تَفْرَقُوا فِيهِ ط كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ

دین کو اور اختلاف نہ ڈالو اس میں بھاری ہے شرک کرنے والوں کو وہ چیز جس کی طرف تو

إِلَيْهِ ط اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ

ان کو بلاتا ہے اللہ چن لیتا ہے اپنی طرف سے جس کو چاہے اور راہ دیتا ہے اپنی طرف اس کو جو

يُنِيبُ ۝۱۳ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ

رجوع لائے اور جنہوں نے اختلاف ڈالا سو سمجھ آچکنے کے بعد آپس کی

بَغْيًا بَيْنَهُمْ ط وَلَوْ لَا كَلِمَةُ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَى

سے اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو نکلی ہے تیرے رب سے ایک

أَجَلٍ مُّسَمًّى لِّقَضَىٰ بَيْنَهُمْ ط وَإِنَّ الَّذِينَ أُوْرِشُوا

مقررہ وعدہ تک تو فیصلہ ہو جاتا اُن میں اور جن کو ملی ہے

الْكِتَابِ مِنْ بَعْدِهِمْ لَنْفَىٰ شَيْءٍ مِّنْهُ مُرِيبٌ ۝۱۴ قُلْ ذَٰلِكَ

کتاب ان کے پیچھے وہ البتہ اس سے دھوکہ میں ہیں جو چین انہیں آنے دیتا سورۃ اسی طرف

فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ

بلا اور قائم رہ جیسا کہ فرمادیا ہے تجھ کو اور مت چل ان کی خواہشوں پر اور کہہ

أَمِنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ

میں یقین لایا ہر کتاب پر جو اتاری اللہ نے اور مجھ کو حکم ہے کہ انصاف کروں تمہارے بیچ میں

اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حِجَّةَ

اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا ہم کو ملیں گے ہمارے کام اور تم کو تمہارے کام کچھ جھگڑا نہیں

بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝۱۵

ہم میں اور تم میں اللہ اکٹھا کرے گا ہم سب کو اور اسی کی طرف پھر جانا ہے -

خُلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اُس نے نوح (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ (علیہم السلام) کو (مع اُن سب کے اتباع کے) حکم دیا تھا (اور ان کی اُمم کو یہ کہا تھا) کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں نفرت نہ ڈالنا۔ (مُراد اس دین سے اُصول دین ہیں جو مشترک ہیں تمام مشرک میں، مثل تو حید و رسالت و بعث و نحوہ اور قائم رکھنا یہ کہ اس کو تبدیل مت کرنا اور اس کو ترک مت کرنا اور تفریق یہ کہ کسی بات پر ایمان لاؤ میں اور کسی پر ایمان نہ لاؤ میں یا کوئی ایمان لاؤ میں اور کوئی نہ لاؤ میں۔ حاصل یہ کہ تو حید وغیرہ دین قدیم ہے کہ اول سے اس وقت تک تمام مشرک اس میں متفق رہی ہیں اور اسی کے ضمن میں نبوت کی بھی تائید ہو گئی۔ پس چاہیے تھا کہ اس کے قبول کرنے میں لوگوں کو ذرا پس و پیش نہ ہوتا مگر پھر بھی) مشرکین کو وہ بات (یعنی تو حید) بڑی گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ اُن کو بلا رہے ہیں۔ (اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ) اللہ اپنی طرف جس کو چاہے پہنچ لیتا ہے (یعنی دین حق قبول کرنے کی توفیق دیتا ہے) اور جو شخص (خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے (مشائیت کے بعد اجتہاد ہوتا ہے اور اجتہاد یعنی توفیق ایمان کے بعد اگر ثابت و اطاعت ہو تو اُس پر قرب الہی و ثواب غیر متناہی مرتب ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مشرکین متصف بالا بار ہیں اور یونین متصف بالا اجتہاد والا ہندار ہیں) اور (ہمارا جو اُمم سابقہ کو حکم تھا اَقِمْو الدِّینَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا

فیتہ تو بہت لوگ اس پر قائم نہ رہے اور متفرق ہو گئے اس کا سبب کوئی القیاس و اشتباہ نہ تھا کہ احتمال معذوری کا ہو بلکہ وہ لوگ بعد اس کے کہ ان کے پاس (یعنی ان کے اسماع و اذہان تک) علم (صحیح) پہنچ چکا تھا محض آپس کی ضد و ضدی سے باہم متفرق ہو گئے (اس طرح کہ اول طلب مال و دولت و طلب جاہ و ریاست سے اغراض مختلف ہوئیں پھر فرقے بن گئے۔ ایسے وقت میں دین کو بھی آرڈر دوسرے کی تنقیص و تعیب کی بنایا کرتے ہیں، شدہ شدہ مسلک و مذہب مختلف ہو جاتا ہے پھر فروع سے اصول میں جا پہنچتے ہیں) اور (یہ لوگ اس جرم عظیم میں کہ حق کو سمجھ کر مختلف ہوئے ایسے عذاب شدید کے مستحق ہو گئے تھے کہ) اگر آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک وقت معین تک (کے لئے مہلت دینے کی) ایک بات پہلے قرار نہ پا چکتی (کہ ان کا عذاب موعود آخرت میں ہوگا) تو (دنیا ہی میں) ان (کے اختلافات) کا فیصلہ ہو چکا ہوتا (یعنی عذاب سے استیصال کر دیا جاتا اور گوامم سابقہ پر عذاب آیا لیکن غیر مومنین پر آیا۔ مومنین میں سے جنہوں نے تفرق کیا یہ برکت التزام ایمان کے ان پر نہیں آیا۔ اگر کسی پر ثابت ہو جاوے تو سب پر نہیں آیا اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے کہ جن بعض پر نہیں آیا، اس کی وجہ عدم مقتضی کا نہیں بلکہ اس کی وجہ مانع یعنی امہال الی آجل مستہتج کا وجود ہے۔ یہ تو قصۃ امم سابقہ کا ہوا) اور جن لوگوں کو ان (امم سابقہ) کے بعد کتاب دی گئی ہے (مراد اس سے مشرکین عہد نبوی کے ہیں کہ آپ کے ذریعہ سے ان کو قرآن پہنچا) وہ (لوگ) اس (کتاب) کی طرف سے ایسے (قوی) شک میں پڑے ہیں جس لئے (ان کو) تردد میں ڈال رکھا ہے (مطلب یہ کہ امم سابقہ میں سے بعض نے جیسے انکار کیا تھا اسی طرح اب ان کی توبت آئی) سو آپ (کسی کے انکار سے دل شکستہ نہ ہو جائیے بلکہ حیطان آپ ان کو پہلے سے بلا رہے ہیں جس کا ذکر اس آیت میں ہے کَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا سَأَلَكَ اللَّهُمَّ بِالْبَيِّنَاتِ یعنی توحید) اسی طرف (ان کو برابر) بلائے جائیے اور جس طرح آپ کو حکم ہوا ہے (کہ قُلْ لَكَ فَادُّعِ اُنْسُ پر) مستقیم رہیے اور ان کی (فاسد) خواہشوں پر نہ چلیے (یعنی وہ مخالفت کر کے یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو کہنا چھوڑ دیں تو آپ چھوڑ دیتے ہیں) اور آپ کہہ دیجیے کہ (میں جس بات کی طرف تم کو بلاتا ہوں میں خود بھی اُنس پر عامل ہوں چنانچہ) اللہ نے جلتی کتابیں نازل فرمائی ہیں (جن میں قرآن بھی داخل ہے) میں سب پر ایمان لاتا ہوں (جن کے مضامین متفق علیہا میں سے توحید بھی ہے) اور کچھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ (اپنے اور تمہارے درمیان میں عدل و انصاف رکھو) (یعنی جس چیز کو تم پر واجب و لازم کہوں اپنے اپنے پر بھی اس کو لازم رکھوں) یہ نہیں کہ تم کو کلفت میں ڈالوں اور خود آزا دہ ہوں ایسے مضامین و معانی سے سلیم الطبع کو رغبت اتباع کی ہوتی ہے۔ اور اس پر بھی اگر نرم نہ ہوں تو اخیر بات یہ ہے کہ اللہ ہمارا بھی

مالک ہے اور تمہارا بھی مالک ہے (یعنی وہ سب کا حاکم ہے اور) ہمارے عمل ہمارے لئے اور تمہارے عمل تمہارے لئے، ہمارے تمہاری کچھ بحث نہیں اللہ (جو سب کا مالک ہے قیامت میں) ہم سب کو جمع کرے گا (اس میں شک نہیں کہ) اسی کے پاس جانا ہے (وہ سب کا فیصلہ اعمال کے موافق کر دینگا اس وقت تم سے بحث فضول ہے ہاں تبلیغ کئے جا دیں گے)۔

معارف و مسائل

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا آيَةً - سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی ظاہری اور جسمانی نعمتوں کا ذکر تھا، یہاں سے باطنی اور روحانی نعمتوں کا بیان ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایسا مضبوط اور مستحکم دین عطا فرمایا جو تمام انبیاء علیہم السلام میں مشترک اور متفق علیہ ہے۔ آیت میں انبیاء علیہم السلام میں سے پانچ کا ذکر فرمایا۔ سب سے پہلے نوح علیہ السلام اور آخر میں ہمارے رسول خاتم الانبیاء اور درمیان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اس لئے کہ وہ ابوالانبیاء ہیں اور عرب کے لوگ باوجود اپنے کفر و شرک کے ان کی نبوت کے قائل تھے۔ اور ان کے بعد حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ نزول قرآن کے وقت انھیں دو پیغمبروں کے ماننے والے یہود و نصاریٰ موجود تھے۔ سورہ احزاب میں بھی ميثاق انبياء علیہم السلام کے ذکر میں انھیں پانچ کا ذکر آیا ہے۔ (وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ) فرق یہ ہے کہ سورہ احزاب میں خاتم الانبیاء کا ذکر پہلے اور نوح علیہ السلام کا بعد میں ہے، اور سورہ شوریٰ میں نوح علیہ السلام کا ذکر پہلے آیا کا بعد میں ہے۔ اس میں شاید اشارہ اس طرف ہو کہ حضرت خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام اگرچہ زمان ولادت و بعثت کے اعتبار سے سب سے آخر میں ہیں مگر ازلی تقسیم نبوت و رسالت میں سب سے مقدم ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ میں سب انبیاء میں باعتبار تخلیق (ازلی) کے پہلے ہوں اور بعثت کے اعتبار سے سب سے آخر میں ہوں۔

(ابن ماجہ دارمی عن بہز بن حکیم رضی عنہما قال ہذا حدیث حسن کذا فی مشکوٰۃ ص ۵۸۷)

رہا یہ سوال کہ سب سے پہلے پیغمبر تو حضرت آدم علیہ السلام ہیں، ذکر انبیاء کو ان سے کیوں شروع نہ کیا گیا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سب سے پہلے پیغمبر ہیں جو دنیا میں تشریف لائے۔ اصول عقائد اور مہمات دین میں اگرچہ وہ بھی مشترک تھے مگر ان کے زمانہ میں شرک و کفر انسانوں میں نہیں تھا۔ کفر و شرک کا مقابلہ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا ہے، اس لحاظ سے نوح علیہ السلام

پہلے پیغمبر ہیں جن کو اس طرح کے معاملات پیش آئے، جو بعد کے انبیاء کو پیش آنے والے تھے، اس لئے سلسلہ کو نوح علیہ السلام سے شروع کیا گیا۔ واللہ اعلم۔

اَنَّ اَقِيَمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ یہ جملہ پہلے ہی جملہ کی تشریح ہے کہ وہ دین جس میں سب انبیاء علیہم السلام مشترک اور متحد ہیں اُس دین کو قائم رکھو اُس میں اختلافات و تفرق جائز نہیں بلکہ موجب ہلاکت ہے۔

اقامت دین فرض اور اس میں تفرق حرام ہے۔ اس آیت میں دو حکم مذکور ہیں، ایک اقامت دین۔ دوسرے اس کا منفی پہلو یعنی اس میں تفرق کی ممانعت۔ جبکہ جوہر مفسرین کے نزدیک اَنَّ اَقِيَمُوا الدِّيْنَ میں حرف اَنَّ تفسیر کیلئے ہے تو دین

کے معنی متعین ہو گئے کہ مراد وہی دین ہے جو سب انبیاء علیہم السلام میں مشترک چلا آ رہا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دین مشترک بین الانبیاء اصول عقائد یعنی توحید۔ رسالت۔ آخرت پر ایمان اور اصول عبادات۔ نماز۔ روزہ۔ حج، زکوٰۃ کی پابندی ہے۔ نیز جوہری، ڈاکہ، زنا، جھوٹ فریب۔ دوسروں کو بلا وجہ شرعی ایذا دینے وغیرہ اور عہد شکنی کی حرمت ہے جو سب ادیان سماویہ میں مشترک اور متفق علیہ چلے آئے ہیں۔ اور یہ بھی نص قرآن سے ثابت ہے کہ فروع احکام میں انبیاء کی شریعتوں میں جہزوی اختلاف بھی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَ مَذْهَبًا۔ اس مجموعہ سے ثابت ہوا کہ آیت کے اس جملہ میں جس دین کی اقامت کا حکم اور اس میں تفرق کی ممانعت مذکور ہے وہ وہی احکام الہیہ ہیں جو سب انبیاء علیہم السلام کی شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلے آئے ہیں۔ انھیں میں تفرق و اختلاف حرام اور موجب ہلاکت اہم ہے۔

حکایہ ثانی: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ایک سیدھا خط کھینچا، پھر اس خط کے داہنے بائیں دوسرے چھوٹے خط کھینچے اور فرمایا کہ یہ داہنے بائیں کے خطوط وہ طریقے ہیں جو شیاطین نے ایجاد کئے ہیں اور اس کے ہر راستہ پر ایک شیطان مسلط ہے جو لوگوں کو اس طرف چلنے کی تلقین کرتا ہے اور پھر سیدھے خط کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، وَ اِنَّ هٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيْمٌ فَاَتَّبِعُوْهُ۔ یعنی یہ میرا سیدھا راستہ ہے تم اسی کا اتباع کرو۔ (رواہ احمد والنسائی والدارمی۔ منظر ہی)

اس تمثیل میں صراط مستقیم سے وہی دین قیم کا راستہ ہے جو سب انبیاء علیہم السلام میں مشترک چلا آیا ہے۔ اس کے اندر شاخیں نکالتی تفرق حرام اور شیاطین کا عمل ہے۔ اور انہی اجماعی اور متفق احکام میں تفرق ڈالنے کی شدید ممانعت احادیث صحیحہ میں آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَنْ قَارَعَ الْجَمَاعَةَ شَبْرًا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ۔ رواہ احمد والبوداؤنی

یعنی جس شخص نے جماعت مسلمین سے ایک یا اشت بھی جہدائی اختیار کی اس نے اسلام کا حلقہ عقیدت اپنے گلے سے نکال دیا۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کَلِمَةُ اللَّهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ (رواہ الترمذی بسند حسن) یعنی اللہ کا ہاتھ ہے جماعت پر۔ اور حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان انسانوں کے لئے بھیڑیا ہے جیسے بکریوں کے گلے کے پیچھے بھیڑیا لگتا ہے، تو وہ اسی بکری کو کھڑتا ہے جو اپنی ڈار اور گلے سے پیچھے یا ادھر ادھر رہ جائے۔ اس لئے تمہیں چاہیے کہ جماعت کے ساتھ رہو علیحدہ نہ ہو۔

(رواہ احمد یہ سب احادیث تفسیر منطوری میں ہیں)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں حکم اس دین مشترک اور متفق علیہ کے قائم رکھنے کا ہے، جس پر تمام انبیاء علیہم السلام متفق اور مشترک چلے آئے ہیں۔ اس میں اختلاف کو تفرق کے لفظ سے تعبیر کر کے ممنوع کیا گیا ہے۔ انہی قطعی احکام میں اختلاف و تفرق کو احادیث مذکورہ میں ایمان کے لئے خطرہ اور سبب ہلاکت فرمایا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ فروعی مسائل میں جہاں قرآن و حدیث میں کوئی واضح حکم موجود نہیں یا الفصوص قرآن و سنت میں کوئی ظاہری تعارض ہے۔ وہاں ائمہ مجتہدین کا اپنے اپنے اجتہاد سے کوئی حکم متعین کر لینا، جس میں یا ہم اختلاف ہونا، اختلاف رائے و نظر کی بنا پر لازمی ہے، اس تفرق ممنوع سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ایسا اختلاف صحابہ کرامؓ میں خود عہد رسالت سے چلا آیا ہے اور وہ باتفاق فقہاء رحمت ہے۔

اور اقامت دین سے مراد، اس پر قائم دائم رہنا، اس میں کسی شک و شبہ کو راہ نہ دنیا، اور کسی حال اس کو نہ چھوڑنا ہے۔ (قرطبی)۔

کَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ۔ یعنی دین حق کا جس میں توحید رکن اعظم ہے ابتداء عالم سے سب انبیاء علیہم السلام کے اتفاق سے حق ہونا ثابت ہو جانے کے باوجود جو لوگ شرک کے عادی ہو چکے ہیں، ان کو آپ کی دعوت توحید بڑی بھاری معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ اہوار و اغراض اور شیطانی تعلیمات کا اتباع اور صراط مستقیم کو چھوڑنا ہے جس کی اوپر ممانعت مذکور ہے۔ آگے فرماتے ہیں۔

اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔ یعنی صراط مستقیم کی ہدایت کے دو ہی طریقے ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ خود کسی کو اپنے دین اور صراط مستقیم کے لئے منتخب فرما کر اس کی فطرت و طبیعت ہی اس کے مطابق بنادے جیسے انبیاء علیہم السلام اور خاص اولیاء اللہ

جن کے بارے میں قرآن نے فرمایا اِنَّا اَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ كُوْنِ الدَّارِ یعنی ہم نے ان کو ایک خاص کام کے لئے خالص کر دیا ہے جو آخرت کی فکر اور خاص خاص انبیاء کے بارے میں قرآن نے مَخْلَصٌ بفتح لام ہونے کی تصریح فرمائی ہے جس کے معنی منتخب اور مخصوص کے ہیں۔ یہی مفہوم اللہ یَجْتَنِبُ اِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ عَمَّا، یہ طریقہ ہدایت مخصوص و محدود ہے اور دوسرا عام طریقہ ہدایت پائے کا یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی طرف رجوع ہو اور اس کے دین پر چلنے کا ارادہ کر لے تو اس کو اللہ تعالیٰ دین حق کی ہدایت کر دیتا ہے۔ یہ مطلب ہے دوسرے جملے وَيَهْدِي اِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ عَمَّا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت پائے کے صرف دو طریق ہیں، ایک خصوصی کہ اللہ تعالیٰ کسی کو خود ہی صراطِ مستقیم کے لئے منتخب فرمائے۔ دوسرا عمومی کہ جو شخص اللہ کی طرف رجوع ہو اور اس کے دین حق کی تلاش کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کے مقصود ہدایت تک پہنچا دیتا ہے۔ اور مشرکین مکہ کو جو دعوتِ توحید بھاری معلوم ہوتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ دین کے سمجھنے اور اس پر چلنے کا ارادہ بھی نہیں کرتے۔

وَمَا تَفْهَمُوا اِلَّا مِنَ الْاَمْرِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ۔ مَا تَفْهَمُوا کی ضمیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قریش مکہ کی طرف راجع فرمائی اور مطلب یہ قرار دیا کہ کفار قریش نے جو دین حق اور صراطِ مستقیم سے علیحدگی اور بیزاری اختیار کی، یہ فی نفسہ بھی سخت نادانی تھی، اس پر مزید یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے علم آجانے کے بعد بھی انہوں نے ایسا کیا۔ علم آجانے سے مراد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آجانا ہے، جو سارے علوم الہیہ کے سرچشمہ تھے۔ اور بعض حضرات مَا تَفْهَمُوا کی ضمیر پھیلی امتوں کے لوگوں کی طرف پھیری اور معنی یہ قرار دیئے کہ پھیلی امتوں کے لوگوں نے اپنے اپنے انبیاء کے دین سے تفرق اور علیحدگی اختیار کی، باوجودیکہ ان کے پاس انبیاء کے ذریعہ صراطِ مستقیم کا صحیح علم آچکا تھا۔ اُمم سابقہ مخاطب ہوں یا امت محمدیہ کے کفار۔ دونوں کا تقاضا یہ تھا کہ خود تو گمراہی میں پڑے ہی اپنے رسولوں کو بھی اپنے راستہ پر چلانے کے خواہشمند تھے اس لئے اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا:-

فَلِذَا لِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْلٰلِ بَيْنِكُمْ اللّٰهُ سَاطِئًا وَاَسْمٰكُمُ لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا تَبْتَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ۔

حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ آیت دس مستقل جملوں پر مشتمل ہے اور ہر جملہ خاص احکام پر مشتمل ہے۔ گویا اس ایک آیت میں احکام کی دس تفصیلات مذکور ہیں۔ اس کی نظیر پورے قرآن میں ایک آیت الکرسی کے سوا کوئی نہیں۔ آیت الکرسی میں بھی دس احکام کی دس تفصیلات آئی ہیں۔

پہلا حکم فَلِذَا لِكَ فَاذْعُ یعنی اگرچہ مشرکین پر آپ کی دعوت تو حیدر جباری ہے۔ مگر اس کی وجہ سے آپ اپنی دعوت کو نہ چھوڑیں۔ اور مسلسل اس دعوت کا کام جاری رکھیں۔ دوسرا حکم وَاسْتَقِمْ کہتا اُمِرْتَا ہے، یعنی آپ اس دین پر خود مستقیم رہیں۔ جس کی دعوت لوگوں کو دیتے ہیں اور یہ استقامت ایسی ہونی چاہیے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ یعنی تمام احکام عقائد۔ اعمال اخلاق و عادات و معاشرت میں صحیح اعتدال پر قائم رہیں۔ کسی طرف افراط و تفریط کا ادنیٰ اسامیلان نہ ہو۔ اور ظاہر کیے کہ ایسی استقامت آسان کام نہیں۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب بعض صحابہ نے آپ کے سفید بال آجائے کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا شَيْبَتَيْنِ هُوْدُ یعنی مجھے سورہ ہود نے بوڑھا کر دیا سورہ ہود میں بھی یہی حکم انھیں الفاظ کے ساتھ آیا ہے۔ (معارف القرآن جلد چہارم صفحہ ۶۷) تفسیر سورہ ہود کے ضمن میں استقامت کے مفہوم اور اس کی دشواری اور اہمیت پر مستقل مکلام کیا گیا ہے، وہاں دیکھ لیا جائے (تیسرا حکم وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ كَثُورٍ یعنی اپنے فریضہ تبلیغ میں آپ کسی مخالفت کی مخالفت کی پروا نہ کریں۔ چوتھا حکم قُلْ اٰمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ یعنی آپ اعلان فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں میرا ان سب پر ایمان ہے۔ یا بخوال حکم اٰمَنْتُ لَا اَعْبُدُ اِلًا بَدِيتُكُمْ۔ اس کا مفہوم ظاہر تو یہی ہے کہ میرے پاس جو معاملات باہمی جھگڑوں کے آویں مجھے حکم کیا گیا ہے کہ میں ان میں عدل و انصاف کروں۔ بعض حضرات نے یہاں عدل کے معنی برابر ہی کے لیکر آیات کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ میں تمہارے درمیان دین کے سب احکام کو برابر رکھوں کہ ہر نبی اور ہر کتاب پر ایمان لاؤں اور تمام احکام الہیہ کی اطاعت کروں۔ ایسا نہیں کہ بعض پر ایمان ہو بعض پر نہ ہو یا بعض احکام کی تعمیل ہو بعض کی نہ ہو۔ چھٹا حکم اللّٰهُ تَرَبَّيْنَا لَعِنِ اللّٰهُ سِمْا رَاسِبَ کَا پَالِنِ والا ہے۔ ساقواں حکم لَنَا اَعْمَالُکُمْ وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ یعنی ہمارے اعمال ہمارے کام آویں گے تمہیں اُن کا کوئی نفع و نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور تمہارے اعمال تمہارے کام آویں گے ہمیں اس سے کوئی نفع و نقصان نہ پہنچے گا۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں اس وقت نازل ہوئی تھی جبکہ کفار سے جہاد کرنے کے احکام نازل نہ ہوئے تھے۔ احکام جہاد کی آیتوں نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ کیونکہ جہاد کا حائل ہی یہ ہے کہ جو لوگ نصیحت و نہاش کا اثر نہ لیں اُن سے قتال کر کے انھیں مغلوب کیا جائے یہ نہیں کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ حکم منسوخ نہیں اور مطلب آیات کا یہ ہے کہ جب ہم نے حق کو دلائل اور براہین سے ثابت کر دیا تو اب اس کا نہ ماننا صرف عناد اور ریت دھرمی ہی کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور عناد اگر تو اب دلائل کی گفتگو فضول ہوتی تمہارا عمل تمہارے آگے میرا میرے آگے آوے گا (قرطبی)۔ آٹھواں حکم لَا حِجَّةَ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ حُجَّتٌ سے مراد بحث و مباحثہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ حق واضح اور ثابت ہو جانے کے بعد بھی اگر تم عناد سے کام لیتے ہو تو اب گفتگو

تقول ہے، ہمارے اور تمہارے درمیان اب کوئی بحث نہیں۔ تو ان حکم اللہ یجمعہم بیئنا یعنی قیامت کے روز ہم سب کو اللہ تعالیٰ جمع فرما دیں گے اور ہر ایک عمل کا بدلہ دیں گے۔ سو ان حکم والیہ المصیرون یعنی ہم سب اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

وَالَّذِينَ يُجَاجُونَ فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتَجِيبَ لَهُ

اور جو لوگ جھگڑا ڈالتے ہیں اللہ کی بات میں جب لوگ اس کو مان چکے ان کا

حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ

جھگڑا باطل ہے ان کے رب کے یہاں اور ان پر غصہ ہے

وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۱۶) اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ

اور ان کو سخت عذاب ہے اللہ وہی ہے جس نے اتاری کتاب سچے دین پر

وَالْمِيزَانَ ۱۷) وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ۱۸) يَسْتَعْجِلُ

اور ترازو بھی اور کچھ کو کیا خبر ہے شاید وہ گھڑی پاس ہو جلدی کرتے ہیں

بِهِمُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِمْ وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ

اس گھڑی کی وہ لوگ کہ یقین نہیں رکھتے اس پر اور جو یقین رکھتے ہیں ان کو اس کا ڈر

مِنْهُمْ وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ ۱۹) الْآيَاتُ الَّذِينَ يُمَارُونَ

ہے اور جانتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہے سنتا ہے جو لوگ جھگڑتے ہیں اس گھڑی کے

فِي السَّاعَةِ لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ۱۸)

آئے میں وہ بہک کر دُور جا پڑے۔

خلاصہ تفسیر

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ (کے دین) کے بارے میں (مسلمانوں سے) جھگڑنے نکالتے ہیں۔ یعنی اس کے کہ وہ مان لیا گیا (یعنی بہت سے سمجھا رہی عقل آدمی مسلمان ہو کر اس کو مان چکے ہیں۔ اور تحجبت واضح ہو جانے کے بعد مجادلہ اور زیادہ مذہبم ہے سو) ان لوگوں کی حجت ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر خدا کی طرف سے (غضب (آئے والا) ہے اور ان کے لئے (قیامت میں) سخت عذاب (ہونے والا) ہے (اور اس سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کو اور اس کے دین کو مانو، یعنی اس کی کتاب جو

حقوق اللہ اور حقوق العباد سب پر حاوی ہے اس کو واجب العمل جانو کیونکہ اللہ ہی جس نے (اس) کتاب (یعنی قرآن) کو حق کے ساتھ اور (اس میں جو خاص حکم ہے) انصاف (کا اس) کو نازل فرمایا (جب یہ کتاب اللہ کی تو اللہ کو ماننا بغیر اس کتاب کے ماننے کے مستبر نہیں۔ بعض غیر مسلم جو اللہ کو ماننے کا تو دعویٰ کرتے ہیں مگر قرآن کو نہیں مانتے وہ نجات کے لئے کافی نہیں) اور (یہ لوگ جو آپ سے قیامت کا متعین وقت پوچھتے ہیں تو آپ کو (اس کی) کیا خبر (لیکن آپ کو خبر نہونے سے اس دن کی نفی لازم نہیں آتی بلکہ اس کا وقوع یقینی ہے اور تعین وقت کے لئے اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ) عجب نہیں کہ قیامت قریب ہو (مگر) جو لوگ اس کا یقین نہیں رکھتے (وہ اُس دن سے ڈرنے کے بجائے بطور استہزاء و انکار کے) اُس کا تقاضا کرتے ہیں۔ (کہ وہ جلا کیوں نہیں آجاتی) اور جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں وہ اس سے (کانیتے اور) ڈرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ برحق ہے یاد رکھو کہ (ان دونوں قسم کے لوگوں میں قسم اول کے لوگ یعنی جو لوگ قیامت کے (منکر ہیں اور اُسکے بارے میں جھگڑتے ہیں بڑی دور دراز) کی گراہی میں (مبتلا) ہیں۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اُس دینِ تویم کی طرف اہل عالم کو دعوت دی گئی تھی جس پر تمام آسمانی کتابیں اور انبیاء علیہم السلام متفق ہیں۔ اور اس پر قائم رہنے اور استقامت اختیار کرنے کی تلقین تھی۔ مگر بعض اہل کفر جو سنتے اور ماننے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے اور محض اس پر بھی مسلمانوں سے حجّت یا زسی شروع کی۔ بعض روایات میں چک کہ کچھ اہل کتاب یہود و نصاریٰ نے یہ حجّت پیش کی کہ ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے اور ہمارے کتاب تمہاری کتاب سے پہلے ہے۔ اس لئے ہمارا دین تمہارے دین سے افضل ہے۔ اور بعض روایات میں یہی مضمون کفار قریش کی طرف سے ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو دینِ ابراہیم علیہ السلام کا متبع کہتے تھے۔ قرآن کریم نے آیات مذکورہ میں ان کو متنبہ کیا کہ دین اسلام اور قرآن کی حجّت لوگوں پر تمام ہو چکی ہے اور خود تمہارے سمجھدار انصاف پسند لوگ تسلیم کر کے مسلمان ہو چکے ہیں اب یہ تمہاری حجّت یا زسی باطل اور گراہی ہے جس کا کوئی قرار نہیں۔ اب اگر اس کو نہیں مانو گے تو خدا کا غضب تم پر ٹوٹے گا۔ آگے قرآن کے ہر جانب اللہ ہونے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کے لئے جامع قانون ہونے کا ذکر ہے۔ اَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ کتاب سے مراد اس جگہ مطلق آسمانی کتاب ہے جس میں قرآن اور پہلی کتابیں سب داخل ہیں اور حق سے مراد دین حق ہے

جس کا ذکر اور پر آیا ہے اور میزان کے لفظی معنی ترازو کے ہیں وہ چونکہ انصاف قائم کرنے اور حق پورا دینے کا ایک آلہ ہے۔ اس لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے میزان کی تفسیر عدل و انصاف سے کی ہے۔ مجاہد امام تفسیر نے فرمایا کہ یہاں میزان سے مراد وہ عام ترازو ہے جس کو لوگ استعمال کرتے ہیں اور مراد اس سے سب کے حقوق کی پوری ادائیگی اور انصاف ہے۔ تو لفظ حق میں سب حقوق اللہ اور لفظ میزان میں سب حقوق العباد کی طرف اشارہ ہو گیا۔

اور یہ جو ذرا مایہ مومنین قیامت سے ڈرتے ہیں۔ مراد اس سے اعتقاد سی خوف ہے جو قیامت کے احوال سے ہے۔ نیز اپنی غلی کو تاہیوں پر نظر کرنے سے لازمی ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات کسی مومن پر اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا شوق غالب ہو کر اس خوف پر غالب آجاتا ہے وہ اس کے منافی نہیں جیسا کہ قبر میں بعض مردوں کا یہ کہنا ثابت ہے کہ قیامت جلد آجائے، وجہ یہ ہے کہ قبر میں جب فرشتوں کی طرف سے انسان کو بشارت رحمت و مغفرت کی ملجائے گی تو قیامت کا خوف مغلوب ہو جائے گا۔

اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْقَوِيُّ

اللہ نرمی رکھتا ہے اپنے بندوں پر روزی دیتا ہے جس کو چاہے اور وہی ہے زور آور

الْعَزِيزُ ① مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ

زبردست جو کوئی چاہتا ہو آخرت کی کھیتی زیادہ کریں ہم اُس کے واسطے

فِي حَرْثِهِ ② وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ

اس کی کھیتی اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا کی کھیتی اس کو دیں

مِنْهَا ③ وَمَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ تُصِيبٍ ④

ہم کچھ اس میں سے اور اس کے لئے نہیں آخرت میں کچھ حصہ -

خلاصہ تفسیر

اور یہ لوگ جو دنیا کی ناز و نعمت پر مغرور ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھے ہیں اور یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اگر ہمارا عمل اللہ کی رضا کے خلاف ہوتا تو ہم کو یہ عیش و عشرت کیوں دیتا خوب سمجھ لو کہ یہ انکی بھول ہے یہ دنیا کی دولت و نعمت دلیل رضا نہیں بلکہ اس کی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (دنیا میں) اپنے بندوں پر (عام طور سے) مہربان ہے (اسی رحمت عامہ کے سبب سب کو روزی دیتا ہے صحت و تندرستی دیتا ہے جس میں مصالح و حکمت کی بنا پر کسی و بیشی بھی ہوتی ہے کہ جس کو (جس قدر)

چاہتا ہے روزی دیتا ہے (مگر نفس روزی سب میں مشترک ہے) اور دنیا میں اس لطف و مہربانی سے یہ سمجھ لینا کہ ان کا طریقہ حق ہے اور آخرت میں بھی لطف و مہربانی جاری رہے گی نہ کہ دھوکہ ہے۔ وہاں تو ان کے اعمالِ بد پر عذاب ہو گا جو کوئی مستبعد نہیں کیونکہ وہ قوت والا و ابروئے ہے (غرض ان کی ساری خرابیوں کی جڑ دنیا پر مغرور ہونا ہے۔ ان کو چاہیے کہ اس سے باز آجائیں اور آخرت کی فکر کریں کیونکہ جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو، ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے (اعمالِ صالحہ کھیتی اور اس پر ملنے والا ثواب اس کا پھل ہے اور اس کی ترقی یہ ہے کہ ثوابِ معنٰی ملے گا جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے کہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا ملے گا) اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو (یعنی سارے عمل و سعی کا مقصد دنیا کی متاع ہو، آخرت کے لئے کچھ کوشش نہ کرے) تو ہم اس کو کچھ دنیا (اگر چاہیں) دیدیں گے اور آخرت میں اس کو کچھ حصہ نہیں (کیونکہ اس کی شرط ایمان ہے وہ ان میں سے نہیں۔

معارف و مسائل

اللہ کَطِیْفٌ بِعِبَادِهِ۔ لفظ لطیف لغت کے اعتبار سے چند معانی میں استعمال ہوتا ہے یہاں حضرت ابن عباسؓ نے اس کا ترجمہ حقیقی بمعنی مہربان سے اور حضرت عکرمہؓ نے بآثر یعنی محسن سے کیا ہے۔

حضرت مقاتلؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے سبھی بندوں پر مہربان ہے۔ یہاں تک کہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(حاشیہ) ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ روز چہار شنبہ کی صبح کو ”معارف القرآن“ کی تفسیر یہاں تک پہنچانے اور دارالعلوم کے دوسرے کام کرنے کے بعد نمازِ ظہر ادا کی اور یہ اوراقِ تمکین کے نیچے دبا کر رکھے کہ کھانے کے بعد تھوڑا سا آرام کر کے پھر تفسیر کا کام شروع کر دینا

مگر انسان اور اس کے ارادوں کی کمزوری کا اندازہ اس سے سمجھے کہ آج پورے چھتین دن کے بعد ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۹۲ھ روز چہار شنبہ کو دوبارہ اس کا غز پر قلم لگانے کی نوبت اس کے بعد آئی کہ ایک عرصہ تک زندگی سے مایوسی رہی اور ڈیڑھ پارہ قرآن کی تفسیر جو لکھنا باقی تھی اس کی تکمیل کی مصیبت اپنے برخوردارِ صالح مولوی محمد تقی سلمہؒ کو کر کے اپنی حسرت کا تھوڑا سا تذکرہ کر چکا اور دل کو فارغ کر چکا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد ہی میرے سینے میں شدید درد ہوا جو اگلے روز اکثروں کی تشخیص کے مطابق میرے قلب پر شدید حملہ ہارٹ ایکٹائٹ ہوا۔ میرے

کافر ناجبر پہ بھی دنیا میں اس کی نعمتیں برستی ہیں۔ حق تعالیٰ کی عنایات اور لطف و کرم اپنے بندوں پر ہمیشہ انوار و اقسام کے ہیں۔ اس لئے تفسیر قرطبی نے لفظ لطف کے معنی بھی بہت سے بیان فرمائے ہیں۔ اور حامل سب کا لفظ حقی اور بات میں شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا رزق تو ساری مخلوقات کے لئے عام اور شامل ہے۔ دریا اور خشکی میں رہنے والے وہ جانور جن کو کوئی نہیں جانتا اس کا رزق ان کو بھی پہنچتا ہے۔ اس آیت میں حمد یہ ارشاد فرمایا کہ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اس کا حامل زیادہ واضح وہ ہے جس کو تفسیر منطہری نے اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی بے شمار اقسام و انواع ہیں۔ بقدر ضرورت معاش رزق تو سب کے لئے عام ہے۔ پھر خاص خاص اقسام رزق کی تقسیم میں اپنی حکمت بالغہ سے مختلف درجات اور پیمانے رکھے ہیں۔ کسی کو مال و دولت کا رزق زیادہ دیدیا۔ کسی کو صحت و قوت کا، کسی کو علم و

مخلص محبت محترم ڈاکٹر صغیر احمد صاحب دامت بركاتہ کو حق تعالیٰ نے میری دوسری زندگی کا ذریعہ بنادیا۔ انھوں نے اپنی خاص تدبیر مجھے فوراً امراض قلب کے ہسپتال میں داخل کرادیا جبکہ میرے اختیار سے اس کسی طرح آمادہ تھا۔ کیونکہ ہسپتال میں مریضوں کے تشویش کے جو مشاہدات کرتا آیا تھا ان کے سبب میرا دل کسی طرح مطمئن نہ تھا کہ میں کسی ہسپتال میں خصوصاً موت و حیات کی کشمکش کے حال میں داخل ہوں مگر موصوف نے کچھ تدبیریں کر کے مجھے وہاں پہنچا دیا۔ بعد میں ثابت ہو گیا کہ وہ ہی میری دوبارہ زندگی کا ظاہری سبب بنا۔ بغیر ہسپتال میں قیام کے علاج ممکن نہیں تھا۔

۲۵ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ بروز جمعرات کو امراض قلب کے ہسپتال میں داخل ہوا اور بحمد اللہ یہاں کے ڈاکٹر بڑے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ ہمدرد اور مہربان بھی ثابت ہوئے۔ چند روز میں اللہ تعالیٰ نے خطہ سے نکال دیا۔ مزید احتیاطی علاج کے لئے ۳۲ روز مجھے ہسپتال میں رہنا پڑا۔ ۱۱ جولائی ۱۳۹۲ء روز شنبہ کو مجھے ہسپتال سے رخصت کیا گیا اور اپنے مکان واقع سبیلہ میں چند ہفتے قیام کا ارادہ کر لیا۔ یہاں بھی احتیاطی تدبیر اور علاج جاری ہے۔ آج ۲۰ جمادی الثانیہ کو جو اتفاق سے میرے پاکستان کراچی پہنچنے کی تاریخ ہے اور آج پاکستان میں آئے ہوئے مجھے چوبیس سال پورے ہو کر پچیسواں شروع ہو رہا ہے۔ اور بحمد اللہ صحت و قوت بھی اب کچھ تدریجاً بڑھ رہی ہے تو اللہ کے نام پر آج یہ اوراق پھر اٹھائے اور یہ حاشیہ لکھ دیا۔

تفسیر معارف القرآن کی صورت حال یہ ہے کہ جب یہ حادثہ مجھے پیش آیا تو میں معارف القرآن کو تقریباً آخر قرآن تک لکھ چکا تھا ایک خاص سبب سے درمیانی چھٹی منزل رہ گئی تھی اس کو لکھنے کا کام سورۃ شوریٰ کے اس مقام تک پہنچا تھا۔ آگے تقریباً ڈیڑھ پارہ قرآن کریم کا سورۃ حجرات تک لکھنا باقی تھا۔ اب حق تعالیٰ نے گویا دوبارہ زندگی عطا فرمائی اور معالج ڈاکٹروں نے کچھ لکھنے پڑھنے کی اجازت دی تو بر خورار مولوی محمد تقی کو ساتھ لگا کر بنام خدا آج پھر یہ کام شروع کیا ہے۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ !

معرفت کا کسی کو دوسری انواع و اقسام کا اس طرح ہر انسان دوسرے کا محتاج بھی رہتا ہے اور یہی احتیاج ان کو باہمی تعاون و تناصر پر آمادہ کرتی ہے جس پر تمدن انسانی کی بنیاد ہے۔

حضرت جعفر بن محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ رزق کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و مہربانی بندوں پر دو طرح کی ہے اول تو یہ کہ ہر ایک ذی روح کو اس کے مناسب حال غذا اور ضروریات عطا فرماتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی کو اس کا پورا رزق عمر بھر کا بیک وقت نہیں دیدیتا، ورنہ اول تو اس کی حفاظت کرنا مشکل ہو جاتا، اور کتنی بھی حفاظت کرتا وہ پھر بھی سڑنے اور خراب ہونے سے نہ بچتا۔
(مظہری و مثله فی القرطبی)

ایک مجرب عمل | مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جو شخص صبح کو ستر مرتبہ پابندی سے یہ آیت پڑھا کرے وہ رزق کی تنگی سے محفوظ رہے گا۔ اور فرمایا کہ بہت مجرب عمل ہے۔ آیت یہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔
اللّٰهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنَ

کیا ان کے لئے اور شریک ہیں کہ راہِ دہالی ہے انھوں نے ان کے واسطے دین کی کہ جس کا حکم نہیں دیا

بِإِذْنِ اللَّهِ ط وَلَوْ لَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُم وَإِنِ

اللہ نے اور اگر نہ مقرر ہو چکی ہوئی ایک بات فیصلہ کی تو فیصلہ ہو جاتا ان میں اور بیشک

الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۲۱﴾ تَرَى الظَّالِمِينَ

جو گنہگار ہیں ان کو عذاب ہے دردناک تو دیکھے گا گنہگاروں کو کہ ڈرتے

مُشْفِقِينَ مِّمَّا كَسَبُوا وَهُوَ وَاقِعٌ بِهِمْ ط وَالَّذِينَ

ہوں گے اپنی کمائی سے اور وہ پڑ کر رہے گا ان پر اور جو لوگ

آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي رَوْضَتِ الْجَنَّةِ لَهُمْ

یقین لائے اور بھلے کام کئے باغوں میں ہیں جنت کے ان کے

مَا يَشَاءُونَ عِندَ رَبِّهِمْ ط ذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿۲۲﴾

لئے ہے جو وہ چاہیں اپنے رب کے پاس یہی ہے بڑی بزرگی

ذَلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ اللَّهُ عِبَادَهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

یہ ہے جو خوشخبری دیتا ہے اللہ اپنے ایمان دار بندوں کو جو کرتے ہیں

الصَّالِحِينَ طَقْلٌ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا التَّوَدَّةَ

بھلے کام لوگوں میں مانگتا نہیں تم سے اس پر کچھ بدلا مگر دوستی چاہیے

فِي الْقُرْبَىٰ ط وَمَنْ يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا

قربت میں اور جو کوئی کماے نیک نیکی ہم اس کو بڑھا دیں گے

حُسْنًا ط إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ (۲۳)

اس کی خوبی بے شک اللہ معاف کرنے والا حق ماننے والا ہے

خلاصہ تفسیر

دین حق کو تو خدا نے مشروع و مقرر فرمایا ہے، مگر یہ لوگ جو اس کو نہیں مانتے تو کیا ان کے اتجوئے کئے ہوئے، کچھ شریک (خدا کی) ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کر دیا ہے جس کی خدا نے اجازت نہیں دی (مطلب یہ ہے کہ کوئی ذات اس قابل نہیں کہ خدا کے خلاف اس کا مقرر کیا ہو اور دین معتبر ہو سکے، اور اگر (خدا کی طرف سے) ایک قول فیصل (کھٹہا ہوا) نہ ہوتا (یعنی یہ کہ ان پر اصل عذاب موت کے بعد ہوگا) تو دنیا ہی میں، ان کا (عملی) فیصلہ ہو چکا ہوتا اور (آخرت میں) ان ظالموں کو ضرور دردناک عذاب ہوگا (اس روز) آپ ان ظالموں کو دکھیں گے کہ اپنے اعمال (کے وبال) سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ (وبال) ان پر (ضرور) پڑ کر رہے گا (یہ تو منکرین کا حال ہوگا) اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے ہوں گے، وہ بہشتوں کے باغوں میں (داخل) ہوں گے (بہشت کو جمع اس لئے لائے کہ بہشت کے مختلف طبقات اور درجات ہیں، ہر طبقہ ایک بہشت ہے اور ہر طبقہ میں متعدد درجات ہیں، اپنے اپنے رتبہ کے مطابق کوئی کہیں ہوگا، کوئی کہیں ہوگا) وہ جس چیز کو چاہیں ان کے رب کے پاس ان کو میسر ہی پڑا (عام ہے) نہ وہ قانی عیش و عشرت جو دنیا میں موجود ہے، یہی ہے جسکی بشارت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دے رہا ہے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے (اور چونکہ کفار پورا مضمون سننے سے پہلے ہی تکذیب کرنے کے خوگر تھے، اس لئے اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہی ایک جملہ معتزفہ میں کفار کو ایک دلگداز مضمون سنانے کا حکم فرماتے ہیں یعنی، آپ (ان سے) یوں کہیے کہ میں تم سے اور کچھ مطلب نہیں چاہتا بجز رشتہ داری کی محبت کے (یعنی اتنا چاہتا ہوں کہ تمہارے رشتہ داری کے جو تعلقات ہیں، ان کے حقوق کا تو خیال رکھو کیا رشتہ داری کا یہ حق نہیں کہ مجھ سے عداوت میں جلدی نہ کرو بلکہ اطمینان کے ساتھ میری پوری

بات سن لو اور اس کو عقل اور دلیل صحیح کی میزان سے جانچو، اگر معقول ہو تو قبول کر لو، اور اگر کچھ شبہ ہو تو صاف کر لو، اور بغرض محال غلط ہو تو مجھ کو سمجھا دو، غرض جو بات ہو خیر خواہی سے ہو، یہ نہیں کہ فوراً ہی بھڑک اٹھو) اور (اگے مؤمنین کے لئے بشارت کا تمثیل ہے یعنی) جو شخص کوئی نیکی کرے گا ہم اُس (نیکی) میں اور خوبی زیادہ کر دیں گے (یعنی اس خوبی کا مقتضائی نفع جس قدر ثواب ہے ہم اُس سے زیادہ ثواب دیں گے) بے شک اللہ (اطاعت گزار بندوں کے گناہوں کا) بڑا بخشنے والا (اور ان کی نیکیوں کا) بڑا قدر دان (اور ثواب عطا کرنے والا) ہے۔

معارف و مسائل

قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا التَّوَدُّةَ فِي الْقُرْبَىٰ - اس آیت کی جو تفسیر

مذکورہ صدر خلاصہ میں آچکی ہے۔ یہی جمہور مفسرین سے منقول و ماثور اور مختار ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ میرا اصل حق تم سب پر تو یہ ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں تم اس کا احترام کرو اور اپنی صلاح و فلاح کے لئے میری اطاعت کرو۔ مگر میری نبوت و رسالت کو تم تسلیم نہیں کرتے تو نہ سہی مگر میرا ایک انسانی اور خاندانی حق بھی تو ہے جس کا تم انکار نہیں کر سکتے کہ تمہارے اکثر قبائل میں میری رشتہ داری اور قرابتیں ہیں۔ قرابت کے حقوق اور صلہ رحمی کی ضرورت سے تمہیں بھی انکار نہیں تو میں تم سے اپنی اُس خدمت کا جو تمہاری تعلیم و تبلیغ اور اصلاح اعمال و احوال کے لئے کرتا ہوں، کوئی معاوضہ تم سے نہیں مانگتا، صرف اتنا چاہتا ہوں کہ رشتہ داری کے حقوق کا تو خیال کرو۔ بات کا مانتا یا نہ مانتا تمہارے اختیار میں ہے۔ مگر عداوت اور دشمنی تو کم از کم یہ نسب و قرابت کا تعلق مانع ہونا چاہیے۔

اب یہ بات ظاہر ہے کہ رشتہ داری کے حقوق کی رعایت یہ خود ان کا اپنا فرض تھا۔ اس کو کسی خدمت تعلیمی تبلیغی کا معاوضہ نہیں کہا جاسکتا۔ آیت مذکورہ میں جو اس کو بلفظ استثنائاً ذکر فرمایا ہے تو یہ یا تو اصطلاحی الفاظ میں استثنائاً منقطع ہے۔ جس میں مستثنیٰ اس مجموعہ مستثنیٰ منہ کا جز نہیں ہوتا یا پھر اس کو مجازاً اور اقراءً معاوضہ قرار دیا گیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ میں تم سے صرف اتنی بات چاہتا ہوں اگرچہ حقیقتہً کوئی معاوضہ نہیں، تم اس کو معاوضہ سمجھو تو یہ تمہاری اپنی غلطی ہے۔ اس کے نظائر عرب و عجم ہر زبان میں پائے جاتے ہیں۔ متنبی شاعر نے ایک قوم کی شجاعت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ان میں کوئی عیب نہیں بجز اس کے کہ ان کی تلواروں میں کثرتِ حرب و ضرب کی وجہ سے دندائے پڑ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شجاع و بہادر کے لئے یہ کوئی عیب نہیں، بلکہ بہتر ہے۔ اس کا عربی شعر یہ ہے۔

ولا عیب فیہم خیر ان سیوفہم + بحسن فلول من قراع الکتاب

ایک اردو شاعر نے اسی طرح کا مضمون اس طرح لکھا ہے :-
مجھ میں ایک عیب بڑا ہے کہ وفادار ہوں میں + اس نے وفاداری کو عیب کے لفظ سے تعبیر کر کے اپنی بے گناہی کو بہت اونچا کر کے دکھلایا ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ حقوق قرابت کی رعایت جو فی الواقع کوئی معاوضہ نہیں میں تم سے اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔

آیت مذکورہ کی یہی تفسیر صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی سے منقول ہے اور ائمہ تفسیر میں مجاہد قتادہ اور بہت بڑی جماعت نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ یہی تمام انبیاء علیہم السلام کی آداب پر دور میں رہی ہے کہ اپنی قوم کو کھول کر بتا دیا کہ ہم جو کچھ تمہاری بھلائی اور خیر خواہی کے لئے کوشش کرتے ہیں، تم سے اس کا کوئی معاوضہ ہم نہیں مانگتے۔ ہمارا معاوضہ صرف اللہ تعالیٰ دینے والا ہے۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو ان سب میں اعلیٰ وارفع ہے وہ کیسے قوم سے کوئی معاوضہ طلب کرتے۔

ابام حنیفہ سعید بن منصور اور ابن سعد اور عبد بن حمید اور حاکم اور بیہقی امام شعبی سے یہ واقعہ نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام شعبی کہتے ہیں کہ لوگوں نے ہم سے اس آیت کی تفسیر کے متعلق سوالات کئے تو ہم نے حضرت ابن عباس رضی کو خط لکھ کر اسکی صحیح تفسیر دریافت کی آپ نے جواب میں لکھا کہ

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کان وسط النسب فی قریش لیس یطن
من بطونہم الا وقد ولد ولا فقال
اللہ تعالیٰ (قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا) علی
ما اَدعوکم علیہ (اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی)
تودونی لقرابتی منکم وتحفظونی
بھا۔ (روح)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ایسے نسب سے تعلق رکھتے تھے کہ اس کے ہر ذیلی خاندان سے آپ کا رشتہ ولادت قائم تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ”آپ مشرکین سے یہ کہتے کہ اپنی دعوت پر میں تم سے کوئی معاوضہ بجز اس کے نہیں مانگتا کہ تم مجھ سے قرابت داری کی مروت و مودت کا معاملہ کر کے بغیر کسی تکلیف کے اپنے درمیان رہتے دو اور میری حفاظت کرو۔“

اور ابن جریر وغیرہ نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں :-

یا قوم اذا بیتم ان تتابعونی
فاحفظوا قرابتی منکم ولا تکون

اے قوم! اگر تم میری اتباع سے انکار کرتے ہو تو تم سے جو میرا قرابت کا رشتہ ہے اس کی پاسداری

غیرکم من العراب اولیٰ بحفظی و
نصراتی منکم۔ (روح)

توکروء اور ایسا نہ ہو کہ عرب کے دوسرے لوگ
(جن کے ساتھ میری قرابت نہیں) میری حفاظت اور
نصرت میں تم پر بازی لے جائیں۔

اور حضرت ابن عباس رضی سے سند ضعیف کے ساتھ ایک روایت یہ بھی منقول ہے
کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو کچھ لوگوں نے آپ سے یہ سوال کیا کہ آپ کی قرابت میں کون لوگ ہیں آپ نے فرمایا کہ
علیٰ رضا اور فاطمہ رضا اور ان کی اولاد۔ اس روایت کی سند کو درمنثور میں سیوطی نے اور تخریج احادیث
کشاف میں حافظ ابن حجر نے ضعیف قرار دیا ہے اور چونکہ اس کا حامل یہ ہوتا ہے کہ میں اپنی خدمت کا
آتما معاوضہ مانگتا ہوں کہ میری اولاد کی تم رہایت کیا کرو، جو عام انبیاء علیہم السلام خصوصاً سید الانبیاء
کی شان کے مناسب بھی نہیں۔ اس لئے راجح اور مختار تفسیر جمہور امت کے نزدیک وہی ہے جو
اوپر لکھی گئی۔ روافض نے اس روایت کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ اس پر بڑے قلعے تعمیر کر ڈالے جن
کی کوئی بنیاد نہیں۔

آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی
تعلیم و محبت کا مسئلہ

درخواست نہیں کی۔ اس کے یہ معنی کسی کے نزدیک نہیں کہ اپنی جگہ آل رسول مقبول صلی اللہ
علیہ وسلم کی محبت و عظمت کوئی اہمیت نہیں رکھتی، ایسا خیال کوئی بد بخت گمراہ ہی کر سکتا ہے حقیقت
مسئلہ کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و محبت کا ساری کائنات سے زائد
ہونا جزو ایمان بلکہ مدار ایمان ہے۔ اور اس کے لئے لازم ہے کہ جس کو جس قدر نسبت قریب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اسکی تعلیم و محبت بھی اسی پیمانے سے واجب و لازم ہونے
میں کوئی شبہ نہیں، کہ انسان کی صلیبی اولاد کو سب سے زیادہ نسبت قربت حاصل ہے اسلئے انکی
محبت بلا مشبہ جزو ایمان ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ازواج مطہرات اور دوسرے
صحابہ کرام جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ متعدد و شتم کی نسبتیں قربت اور قرابت
کی حامل ہیں ان کو فراموش کر دیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حب اہل بیت آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مسئلہ امت میں کبھی زیر اختلاف
نہیں رہا، باجماع و اتفاق ان کی محبت و عظمت لازم ہے۔ اختلافات وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں
دوسروں کی عظمتوں پر حملہ کیا جاتا ہے۔ ورنہ آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی حیثیت سے عام
سادات خواہ ان کا سلسلہ نسب کتنا ہی بعید بھی ہو ان کی محبت و عظمت عین سعادت و اجر

و ثواب ہے۔ اور چونکہ بہت سے لوگ اس میں کوتاہی برتنے لگے، اسی لئے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے چند اشعار میں اس کی سخت مذمت فرمائی۔ وہ اشعار یہ ہیں اور درحقیقت یہی جمہور امت کا مسلک و مذہب ہے۔

یا ساکباً قف بالمحصب من منیٰ واہتف بساکن خیفھا والناہض
سحرًا اذا فاض الحجيج الی منیٰ فیضاً مکتطعم القرات المناہض
لئن کان رافضاً حبیب الی محمداً فلیشهد الثقلان انی رافضی
یعنی اے شہ سوار، منیٰ کی وادی محصب کے قریب رک جاؤ، اور جب صبح کے وقت عازمین حج کا سیلاب ایک ٹھاٹھ میں مارتے ہوئے دریا کی طرح منیٰ کی طرف روانہ ہو تو اس علاقے کے ہر باشندے اور ہر راہرو سے پکار کر یہ کہہ دو کہ اگر صرف آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی کا نام رافض ہے تو اس کائنات کے تمام جنات و انسان گواہ رہیں کہ میں بھی رافضی ہوں۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ فَإِنْ يَشِإِ اللَّهُ

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے باندھا اللہ پر جھوٹ سو اگر اللہ چاہے

يَخْتِمُ عَلَىٰ قَلْبِكَ ۖ وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ

مہر کر دے تیرے دل پر اور مٹاتا ہے اللہ جھوٹ کو اور ثابت کرتا ہے سچ کو

بِكَلِمَتِهِ إِنَّكَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝۲۶ وَهُوَ

اپنی باتوں سے اس کو معلوم ہے جو دلوں میں ہے اور وہی ہے

الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ

جو قبول کرتا ہے توبہ اپنے بندوں کی اور معاف کرتا ہے

السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ۝۲۷ وَيَسْتَجِيبُ

برائیاں اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو اور دعا سنتا ہے

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَيَزِيدُهُمْ

ایمان والوں کی جو بھلے کام کرتے ہیں اور زیادہ دیتا ہے ان کو

مِّنْ فَضْلِهِ ۖ وَالْكَافِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۝۲۸

اپنے فضل سے اور جو منکر ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے۔

خلاصہ تفسیر

کیا یہ لوگ (آپ کی نسبت لغو ذی اللہ) یوں کہتے ہیں کہ انھوں نے خدا پر جھوٹ بہتان باندھ رکھا ہے (کہ نبوت اور وحی کا خلافت واقع دعویٰ کیا ہے) سو (ان کا یہ قول خود افتر ہے، اس لئے کہ آپ کی زبان حق تر خبان سے اللہ کا یہ معجز کلام جاری ہو رہا ہے جو سچے نبی کے سوا کسی کی زبان پر جاری نہیں ہو سکتا۔ اگر معاذ اللہ آپ اپنے دعوائے رسالت میں سچے نہ ہوتے تو اللہ یہ کلام آپ پر جاری نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ خدا (کو یہ قدرت حاصل ہے کہ) اگر (وہ) چاہے تو آپ کے دل پر بند لگا دے (اور یہ کلام آپ کے قلب پر نہ القا ہو، نہ باقی رہے، بلکہ سلب ہو جائے، اور آپ بالکل بھول جائیں، اور اس صدمت میں ظاہر ہے کہ زبان سے اس کا صدور ہو ہی نہیں سکتا) اور اللہ تعالیٰ (کی یہ عادت ہے کہ وہ نبوت کے) باطل (دعوے) کو مٹایا کرتا ہے (چلتے نہیں دیتا، یعنی ایسے جھوٹے مدعی کے ہاتھ پر معجزات ظاہر نہیں ہوتے) اور (نبوت کے) حق (دعوے) کو اپنے احکام سے ثابت (اور غالب) کیا کرتا ہے (پس آپ صادق اور وہ کاذب ہیں اور چونکہ وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) دلوں تک) کی باتیں جانتا ہے (چہ جائیکہ زبان کے اقوال اور جوارج کے افعال، پس اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے عقائد، اقوال اور اعمال سب کی خبر ہے، ان سب پر خوب سترادے گا، ہاں جو لوگ اپنے کفر اور بد اعمالیوں سے توبہ کر لیں انھیں معاف کر دے گا، کیونکہ یہ اس کا قانون ہے) اور وہ ایسا (رحیم) ہے کہ اپنے بندوں کی توبہ (بشرط ظہار) قبول کرتا ہے اور وہ (اس توبہ کی برکت سے) تمام (گزشتہ) گناہ معاف فرما دیتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس (سب) کو جانتا ہے (پس اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ توبہ خالص کی ہے یا غیر خالص) اور (جب کوئی شخص کفر سے توبہ کر کے مسلمان ہو گیا تو اس کی جو عبادتیں پہلے قبول نہ ہوئی تھیں، اب قبول ہونے لگیں گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ، ان لوگوں کی عبادت (بشرطیکہ ریاء کے لئے نہ ہو) قبول کرتا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے (وہ عبادتیں یہی نیک عمل ہیں اور ان کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ثواب دیتا ہے) اور (علاوہ اس ثواب کے جو فی نفسہ اس عمل کا مقتضا ہے) ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ (ثواب) دیتا ہے (یہ تو ایمان والوں کے لئے ہوا) اور جو لوگ کفر (پراصرار) کر رہے ہیں (اور ایمان نہیں لائے) ان کے لئے سخت عذاب (مقرر) ہے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور قرآن کو غلط اور خدائے تعالیٰ پر افترا کہنے والوں کو اپنا ایک عام ضابطہ بتلا کر جواب دیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ، ایسے کام جو عادتاً انسان نہیں کر سکتے، جن کو خدائی عادت یا معجزہ کہا جاتا ہے، اگرچہ بعض ساحر، جادوگر بھی اپنے سحر سے ایسے کام کر دکھاتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی بغیر اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کے کچھ نہیں کر سکتا۔ حق تعالیٰ ہی اپنے فضل سے انبیاء کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ان کو معجزات عطا فرماتے ہیں جن میں پیغمبر کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

اسی طرح جادوگروں کا جادو بھی اپنی حکمت امتحان و آزمائش کی بنا پر چلنے دیتے ہیں۔ مگر سحر اور معجزہ میں فرق اور نبی اور ساحر میں امتیاز کے لئے اس نے یہ ضابطہ جاری کر رکھا ہے کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ جھوٹا کرے، اس کے ہاتھ سے کوئی سحر یا جادو کامیاب نہیں ہوتا۔ جب تک کہ وہ مدعی نبوت نہ ہو سحر چلتا ہے۔ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے کے بعد اس کا سحر اللہ تعالیٰ نہیں چلنے دیتے۔

اور جن کو اللہ تعالیٰ نبوت و رسالت عطا فرماتے ہیں۔ ان کو معجزات بھی عطا فرماتے ہیں۔ اور ان کے معجزات کا صدد و رر روشن کرتے ہیں۔ اس طرح تکوینی اور تقدیری طور پر ان کی نبوت کو ثابت کر دیتے ہیں۔ دوسرے اپنے کلام کی آیات میں ان کی تصدیق نازل فرما دیتے ہیں۔

جب یہ ضابطہ معلوم ہو گیا تو اب یہ سمجھو کہ قرآن کریم ایک معجزہ ہے کہ تمام دنیا کے جن و بشر اس کی ایک آیت کی مثال بنانے سے عاجز ہیں جن کا عجز زمانہ نبوت میں ثابت ہو چکا اور آج تک ثابت ہے۔ ایسا کھلا ہوا معجزہ کسی جھوٹے مدعی نبوت سے حسب ضابطہ مذکورہ صادر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ کا دعویٰ وحی و رسالت صحیح اور حق ہے، اس کو غلط اور افترا کہنے والے گمراہ مفتری ہیں۔

دوسری آیت میں منکرین و معاندین کو نصیحت کی گئی ہے کہ اب بھی کفر و انکار سے باز آجائیں اور توبہ کر لیں۔ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے، توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول فرما لیتا ہے اور ان کی خطاؤں کو بخشتے رہتا ہے۔

توبہ کے لفظی معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں، اور شرعی اصطلاح میں کسی گناہ کی حقیقت توبہ کی حقیقت سے باز آنے کو توبہ کہتے ہیں۔ اور اس کے صحیح و معتبر ہونے کے لئے تین شرائط ہیں۔

ایک یہ کہ جس گناہ میں فی الحال مبتلا ہے اس کو فوراً ترک کر دے، دوسرے یہ کہ ماضی میں جو گناہ ہوا اس پر نادم ہو، اور تیسرے یہ کہ آئندہ اُسے ترک کرنے کا پختہ عزم کر لے اور کوئی شرعی فریضہ چھوڑا ہوا ہے تو اسے ادا یا قضا کرنے میں لگ جائے اور اگر گناہ حقوق العباد سے متعلق ہے تو اس میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر کسی کا مال اپنے اوپر واجب ہے اور وہ شخص زندہ ہے تو یا اسے وہ مال لوٹائے یا اس سے معاف کرائے اور اگر وہ تہ نہ ہو تو اس کے ورثہ موجود ہیں تو ان کو لوٹائے، اگر ورثہ بھی نہیں ہیں تو بیت المال میں داخل کرائے، بیت المال بھی نہیں ہے یا اس کا انتظام صحیح نہیں ہے تو اس کی طرف سے صدقہ کر دے، اور اگر کوئی غیر مالی حق کسی کا اپنے ذمہ واجب ہے، مثلاً کسی کو ناحق مستایا ہے، بڑا بھلا کہا ہے، یا اس کی غیبت کی ہے تو اسے جس طرح ممکن ہو راضی کر کے اس سے معافی حاصل کرے۔

اور یہ توبہ قسم کی توبہ کے لئے ضروری ہے ہی کہ گناہ کا ترک کرنا اللہ کے لئے ہو، اپنے کسی جسمانی ضعف یا مجبوری کی بنا پر نہ ہو۔ اور شریعت میں اصل مطلوب توبہ ہے کہ توبہ سارے ہی گناہوں سے کی جائے، لیکن اگر صرف کسی خاص گناہ سے توبہ کی گئی تو اہل سنت کے مسلک کے مطابق اس گناہ کی حد تک توبہ معافی ہو جائیگی، دوسرے گناہوں کا وہ بال سر پر رہے گا۔

وَكُوبَسَطَ اللَّهُ الرِّشْقَ لِعِبَادِهِ لِيُبْغُوا فِي الْأَرْضِ

اور اگر پھیلا دے اللہ روزی اپنے بندوں کو تو دھوم اٹھادیں ملک میں

وَلَكِنْ يُنْزِلُ بِقَدَرِ مَا يَشَاءُ ط إِنَّكَ بِعِبَادِهِ خَبِيرٌ

ولیکن اتارتا ہے مابہ کمر جتنی چاہتا ہے بے شک وہ اپنے بندوں کی خبر رکھتا ہے

بَصِيرٌ ۲۷ وَهُوَ الَّذِي يُنْزِلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ

دیکھتا ہے اور وہی ہے جو اتارتا ہے مینہ بعد اس کے کہ آس

مَا قَنْطَرُوا وَدَيْنُ شَرِّ رَحْمَتِهِ ط وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ ۲۸

توڑ چکے اور پھیلاتا ہے اپنی رحمت اور وہی ہے کام بنانے والا سب تعریفوں کے لائق

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

اور ایک اس کی نشانی ہے بنانا آسمانوں کا اور زمین کا اور جس قدر

فِيهِمَا مِنْ دَابَّةٍ ط وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ

بکھیرے ہیں ان میں جانور اور وہ جب چاہے اُن سب کو اکٹھا کر سکتا

قَدْ يُرِىٰ ۴۹ وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِيمَا كَسَبَتْ

ہے اور جو پرٹ سے تم پر کوئی سختی سو وہ بدلہ ہے اس کا جو کمایا

أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ ۵۰ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ

تمہارے ہاتھوں نے اور معاف کرتا ہے بہت سے گناہ اور تم تمہکا دیئے والے نہیں بھاگ کر

فِي الْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا

زمین میں اور کوئی نہیں تمہارا اللہ کے سوائے کام بنانے والا اور نہ

نَصِيرٍ ۵۱ وَمِنْ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ۵۲

مرد و گار اور ایک اس کی نشانی ہے کہ جہاز چلتے ہیں دریا میں جیسے پہاڑ

إِنْ يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلَى ظَهْرِهِ

اگر چاہے تمام دے ہوا کو پھر رہیں سارے دن ٹھہرے ہوئے اس کی پیٹھ پر

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۵۳ أَوْ يُوقِفُهُنَّ

مقرر اس بات میں پستے ہیں ہر قائم رہنے والے کو جو احسان مانے یا تباہ کر دے ان کو

بِمَا كَسَبُوا أَوْ يَعْفُ عَنْ كَثِيرٍ ۵۴ وَيَعْلَمَ الَّذِينَ

بہ سبب ان کی کمائی کے اور معاف بھی کرے بہتوں کو اور تاکہ جان لیں وہ لوگ جو

يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِنَا مَا لَهُمْ مِنْ مَّحْيٍ ۵۵

جھگڑتے ہیں ہماری آیتوں میں کہ نہیں ان کے لئے بھاگنے کی جگہ

خلاصہ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ حکمت کے آثار میں سے یہ ہے کہ اس نے سب آدمیوں کو زیادہ مال

نہیں دیا، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کے لئے (بجالاتِ موجودہ جیسی) ان کی طبیعتیں (پس)

روزِ می فراخ کر دیتا تو وہ دنیا میں (بالعموم) تشرارت کرنے لگتے (کیونکہ جب سارے انسان مالدار ہوتے اور کوئی کسی کا مطلق محتاج نہ ہوتا تو کوئی بھی کسی سے نہ دیتا) لیکن (یہ بھی نہیں کیا کہ بالکل ہی کسی کو کچھ نہ دیا ہو، بلکہ) جتنا رزق چاہتا ہے انداز (مناسب) سے (ہر ایک کے لئے) اتارتا ہے، (کیونکہ) وہ اپنے بندوں کے مصالح کو جاننے والا (اور اُن کا حال) دیکھنے والا ہے اور وہ ایسا (رحیم) ہے جو (بسا اوقات) لوگوں کے نا اُمید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت کے آثار دنیا میں پھیلاتا ہے (آثار سے مراد نباتات اور پھل پھول ہیں) اور وہ سب کا کار ساز (اور اس کا سازِ پر) قابلِ حمد (و ثنا) ہے اور منجملہ اس کی (قدرت کی) نشانیوں کے پیدا کرنا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جانداروں کا جو اُس زمین و آسمان میں پھیلا رکھے ہیں اور وہ (قیامت کے دن دوبارہ زندہ کر کے) اُن (مخلوقات) کے جمع کر لینے پر بھی جب وہ (جمع کرنا) چاہے قادر ہے اور (وہ انتقام لینے والا مگر ساتھ ہی معاف کرنے والا بھی ہے چنانچہ) تم کو (اے گناہگارو) جو کچھ مصیبت (حقیقتاً) پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے (پہنچتی ہے اور پھر بھی ہر گناہ پر نہیں، بلکہ بعض بعض گناہوں پر) اور بہت (سے گناہوں) سے درگزر ہی کر دیتا ہے (خواہ دونوں جہاں میں یا صرف دنیا میں) اور (اگر وہ سب پر مؤاخذہ کرنے لگے تو) تم زمین و آسمان کے کسی حصہ میں (بنا لیکر اس کو) ہٹا نہیں سکتے اور (ایسے وقت میں) خدا کے سوا تمہارا کوئی حامی مددگار نہیں (ہو سکتا) اور منجملہ اُس کی (قدرت کی) نشانیوں کے جہاز ہیں سمندر میں (ایسے اونچے) جیسے پہاڑ (مراد یہ ہے کہ ان کا سمندر میں چلنا دلیل ہے حق تعالیٰ کی عجیب صنّاعی کی اور نہ) اگر وہ چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو وہ (جہاز) سمندر کی سطح پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں (یہ اُسی کا کام ہے) ہوا کو چلاتا ہے اور اُس سے وہ جہاز چلتے ہیں، بے شک اس میں (قدرت پر دلالت کرنے والی) نشانیاں ہیں ہر صابرو شاکر (یعنی مومن) کے لئے (اس کی تشبیح سورۃ لقمان کے آخری کُرع میں اسی قسم کے جملہ کے تحت گزر چکی۔ غرض اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کئے جہازوں کو کھڑا کر دے) یا (اگر وہ چاہے زور کی ہوا چلا کر) اُن جہازوں (کے سواروں) کو اُن کے اعمال (بدکرد و غیرہ) کے سبب تباہ کر دے اور (ان میں) بہت سے آدمیوں سے درگزر کر جاوے (یعنی اُس وقت غرق نہ ہوں) گو آخرت میں سزا یاب ہوں) اور (اس تباہی کے وقت) ان لوگوں کو جو کہ ہماری آیتوں میں جھگڑنے نکالتے ہیں معلوم ہو جاوے کہ (اب) ان کے لئے کہیں بچاؤ (کی صورت) نہیں (کیونکہ ایسے اوقات میں وہ بھی اپنے مژغومہ شرکار کو عاجز سمجھتے تھے)۔

معارف و مسائل

ربط اور شان نزول | ان آیات میں باری تعالیٰ نے عقیدہ توحید کو ثابت کرنے کے لئے اپنی اس حکمت بالغہ کا تذکرہ فرمایا ہے جس کے ذریعہ اس نے کائنات کو ایک مستحکم نظام میں جکڑا ہوا ہے، اور مقصد یہ ہے کہ کائنات کا یہ مستحکم نظام اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کوئی حکیم و خبیر ذات اسے چلا رہی ہے۔

اس مضمون کی ابتدا باری تعالیٰ نے اپنے اس نظام معیشت کی طرف اشارہ فرما کر کی ہے جو اس نے اپنی حکمت سے دنیا میں جاری فرمایا ہے۔ اور مضمون پچھلی آیات سے اس طرح مربوط ہے کہ گذشتہ آیتوں میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کی عبادت کو قبول فرماتا ہے جس میں ان کی دعاؤں کی قبولیت بھی داخل ہے۔ اب یہاں یہ اشکال ہو سکتا تھا کہ یہ بات بکثرت مشاہدہ میں آتی ہے کہ مسلمان اپنے کسی دنیوی مقصد کے لئے دعا کرتا ہے، لیکن وہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس اشکال کا جواب مذکورہ بالا آیات میں سے سب سے پہلی آیت میں دیا گیا ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی خواہش کا پورا ہونا بعض اوقات خود انسان کی انفرادی یا اجتماعی مصلحت کے خلاف ہوتا ہے لہذا اگر کسی وقت کسی انسان کی کوئی دعا بظاہر قبول نہ ہو تو اس کے پیچھے کائنات کی وہ عظیم مصلحتیں ہوتی ہیں جنہیں اس کے عظیم حکیم خالق کے سوا کوئی نہیں جانتا، اگر دنیا کے ہر انسان کو ہر قسم کا رزق اور ہر قسم کی نعمتیں عطا کر دی جائیں تو دنیا کا نظام حکمت کچھ بچل ہی نہیں سکتا، تفسیر کسی چنانچہ بعض روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ آیت ان مومنین کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو کافروں کی مال و دولت دیکھ کر تمنا کیا کرتے تھے کہ یہ وسعت و فراخی ہمیں بھی حاصل ہو جائے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہم نے بنو قریظہ بنو نضیر اور بنو قینقاع کے مال و دولت کو دیکھا تو ہمارے دلوں میں بھی مالداروں کی تمنا پیدا ہوئی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضرت عمر بن حریث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اصحاب صفہ میں سے بعض حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مالدار بنادے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (روح المعانی وغیرہ)۔

بہر کیف! آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اگر دنیا کے ہر فرد پر دنیا میں دولت عام فراوانی ہر قسم کے رزق اور ہر قسم کی نعمت کی فراوانی کر دی جاتی تو انسانوں کا ایک دوسرے کے خلاف بغی و فساد جلد سے بڑھ جاتا۔ اس لئے کہ

دولت کی فراوانی کی وجہ سے نہ کوئی کسی کا محتاج ہوتا اور نہ کوئی کسی سے دیتا، دوسری طرف

دولت مندر کی ایک خاصیت یہ ہے کہ جتنی دولت بڑھتی ہے، اتنا ہی حرص و ہوس میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک دوسرے کی املاک پر قبضہ جانے کے لئے زور و زبردستی کا استعمال عام ہو جاتا۔ لڑائی جھگڑے، سرکشی اور دوسری بد اعمالیاں حد سے زیادہ بڑھ جاتیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کو ہر قسم کا رزق اور ہر قسم کی نعمت دینے کے بجائے ان نعمتوں کو اپنے بندوں پر اس طرح تقسیم کیا ہے کہ کسی کے پاس مال و دولت زیادہ ہے، کوئی صحت و ثروت میں دوسرے سے بڑھا ہوا ہے۔ کوئی حسن و جمال سے مالا مال ہے، کسی کے پاس علم و حکمت کی دولت دوسروں سے زیادہ ہے۔ غرض ہر شخص کسی نہ کسی چیز کے لئے دوسروں کا محتاج ہے، اور اسی باہمی احتیاج پر تمدن کی عمارت قائم ہے۔ وَلٰكِنْ يُّنْزِلُ إِلَيْكُم مِّنْ سَّمَاءٍ مَّاءً لَّا يَكُنِ الشَّجَرُ مِنْهَا شَجَرًا يَّجْبِي ۖ وَكَانَ يَنْبَغِي ۚ (بلکہ وہ اپنے بندوں کو جاننے والا دکھانے والا ہے) فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کس شخص کے لئے کون سی نعمت مناسب ہے اور کون سی نقصان دہ؟ لہذا اس نے ہر شخص کو مناسب نعمتیں دی ہیں، اور اگر کسی سے کوئی نعمت سلب فرمائی ہے تو وہ اس کی اور پورے عالم کی مصلحت ہی کی بنا پر سلب کی ہے۔ اور یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ ہر فرد کے بارے میں یہ مصلحت ہماری سمجھ میں بھی آجائے، کیونکہ یہاں ہر انسان اپنی معلومات کے ایک محدود دائرے میں رہ کر سوچتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پوری کائنات کی مصلحتیں ہیں، اس لئے اس کی تمام حکمتوں تک رسائی ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کی ایک محسوس نظریہ ہے کہ ایک دیندار سربراہ مملکت بسا اوقات ایسے احکام جاری کرتا ہے جو بعض افراد کے خلاف پڑتے ہیں اور وہ ان کی وجہ سے مصائب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جو شخص اس طرح مصائب کا شکار ہوا ہے وہ چونکہ صرف اپنے مفاد کے محدود دائرہ میں رہ کر سوچ رہا ہے، اس لئے ممکن ہے کہ اسے سربراہ مملکت کا یہ اقدام برا محسوس ہو، لیکن جس شخص کی نگاہ پورے ملک و قوم کے حالات پر ہے اور جو یہ سمجھتا ہے کہ کسی ایک شخص کے مفاد پر پورے ملک کو قربان نہیں کیا جاسکتا، وہ اس اقدام کو برا خیال نہیں کرتا، اب جو ذات پوری کائنات کا نظام چلا رہی ہے اس کی حکمتوں کا احاطہ آخر کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اگر یہ نکتہ ذہن میں رہے تو وہ اوہام اور وسوسے خود بخود کا فور ہو سکتے ہیں جو دنیا میں کسی شخص کو گرفتار مصائب دیکھ کر پیدا ہوتے ہیں۔

اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں کا مال و دولت میں مساوی ہونا ممکن ہے، نہ مطلوب اور نہ نظام عالم کی تکوینی مصلحتیں اس کا تقاضا کرتی ہیں۔ اس مسئلہ کی پوری تفصیل انشا اللہ سورہ نہ خوف کی آیت نَحْنُ قَسَمٌ مِّبَيْنَہُمْ وَمَعِیَ شَاہِدُہُمُ الْحَمْدُ

کے تحت آئے گی۔

جنت اور دنیا کا فرق یہاں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ جنت میں تو تمام انسانوں پر ہر قسم کی نعمتوں کی فراوانی کر دی جائے گی، وہاں یہ چیز فساد کا سبب کیوں نہیں ہوگی؟ اس کا

جواب یہ ہے کہ دنیا میں فساد کا سبب مال و دولت کی فراوانی کے ساتھ حرص و ہوس کے وہ جذبات ہیں جو دولت مندی کے ساتھ ساتھ عموماً بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف جنت میں نعمتوں کی عام بارش تو ہوگی لیکن حرص و ہوس اور سرکشی کے یہ جذبات ختم کر دیئے جائیں گے چنانچہ وہاں یہ فساد رونما نہیں ہوگا۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلاصہ تفسیر میں ”بحالات موجودہ“ کے الفاظ اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے بڑھائے ہیں۔ (بیان القرآن)

اب یہاں یہ اعتراض قطعی فضول ہے کہ دنیا میں بھی مال و دولت کی فراوانی کر کے حرص و ہوس کے جذبات کیوں نہ ختم کر دیئے گئے؟ کیونکہ دنیا کی تخلیق کا مقصد ہی ایک ایسا جہان پیدا کرنا ہے جو خیر و شر دونوں کی قوتوں سے مرکب ہو۔ اس کے بغیر انسانوں کی وہ آزمائش ممکن ہی نہیں ہے جو تخلیق عالم کا اصل منشا ہے۔ لہذا اگر یہاں انسانوں میں سے یہ جذبات ختم کر دیئے جاتے تو دنیا کی پیدائش کا مقصد اصلی ہی فوت ہو جاتا۔ اس کے برخلاف جنت خالص خیر پر مشتمل ہوگی اس لئے وہاں یہ جذبات ختم کر دیئے جائیں گے۔

هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قُنِطُوا - اور وہ ایسا ہے جو لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے یوں تو اللہ تعالیٰ کی عام عادت ہے کہ جب زمین کو پانی کی شدید ضرورت ہوتی ہے، بارش برسا دیتے ہیں۔ لیکن یہاں ”ناامید ہو جانے کے بعد“ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ کبھی کبھی باری تعالیٰ مینہ برساتے ہیں عام عادت کے خلاف اتنی تاخیر کر دیتے ہیں جس سے لوگ ناامید ہونے لگیں۔ اس سے آزمائش کے علاوہ اس بات پر تنبیہ مقصود ہوتی ہے کہ بارش اور مخطوب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ جب چاہتا ہے لوگوں کی بد اعمالیوں وغیرہ کی بنا پر بارش روک لیتا ہے تاکہ لوگ اس کی رحمت کی طرف متوجہ ہو کر اس کے سامنے بجز و نیاز کا مظاہرہ کریں۔ ورنہ اگر بارش کا بھی کوئی لگا بندھا وقت ہوتا جس سے کبھی سرمو انحراف نہ ہو تو لوگ اسے خالص طاہر ہی اسباب کے تابع سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بے توجہ ہو جاتے اور یہاں ”ناامید“ ہونے سے مراد اپنی تدبیروں سے ناامید ہونا ہے، ورنہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کا کفر ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ فِيهِمَا مِمَّا دَآبَتِ - ”دآبَتِ“، اصل لغت میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے اختیار سے چلنے اور حرکت کرنے والی ہو، بعد میں یہ لفظ صرف جانوروں کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ اس آیت میں آسمان اور زمین دونوں کی طرف نسبت کر کے یہ کہا گیا ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے

بہت سی چلنے والی مخلوقات پیدا کی ہیں۔ زمین پر یہ چلنے والی مخلوقات تو ظاہر ہیں، آسمان میں ان سے مراد ملائکہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آسمانوں میں کچھ ایسے جانور موجود ہوں جو ابھی تک انسان کے علم میں نہیں آ سکے۔

بہر کیف! مقصد یہ ہے کہ گو نظام عالم کی مصلحت سے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مال و دولت میں وسعت عطا نہیں کی، بلکہ ایک حکیمانہ انداز سے رزق کی تقسیم فرمائی ہے، لیکن کائنات کی جو نعمتیں عمومی فائدے کی ہیں، اُن سے ہر شخص کو بہرہ اندوز کیا ہے۔ بارش، بادل، زمین، آسمان، اور ان کی مخلوقات سب انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور یہ سب چیزیں اللہ کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے بعد کسی شخص کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اس کے اپنے اعمال کی وجہ سے پہنچتی ہے۔ لہذا اُسے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکوہ کرنے کے بجائے اپنے گمراہیوں میں منہ ڈالنا چاہیے۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِصْرٌ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَكَفُّوا عَنْ كَثِيرٍ۔
یہی مطلب ہے۔ حضرت حسن رضی سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے، جس شخص کو کسی لکڑی سے کوئی خراش لگتی ہے، یا کوئی رُگ دھڑکتی ہے یا قدم کو لغزش ہوتی ہے، یہ سب اس کے گناہوں کے سبب ہوتا ہے اور ہر گناہ کی سزا اللہ تعالیٰ نہیں بخشتے بلکہ جو گناہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیتے ہیں وہ ان سے بہت زیادہ ہیں، جن پر کوئی سزا دی جاتی ہے۔ حضرت اشرف المشاخ نے فرمایا کہ جس طرح جسمانی آذیتیں اور تکلیفیں گناہوں کے سبب آتی ہیں اسی طرح باطنی امراض بھی کسی گناہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آدمی سے کوئی ایک گناہ سرزد ہو گیا تو وہ سبب بن جاتا ہے دوسرے گناہوں میں مبتلا ہونے کا، جیسا کہ حافظ ابن قیمؒ نے الدوا الشافی میں لکھا ہے کہ گناہ کی ایک نقد سزا یہ ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ دوسرے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسی طرح نیکی کی ایک نقد جزا یہ ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی کو پہنچ لاتی ہے۔ بیضاویؒ وغیرہ نے فرمایا کہ یہ آیت اُن لوگوں کے لئے مخصوص ہے، جن سے گناہ سرزد ہو سکتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام جو گناہوں سے معصوم ہیں یا نابالغ بچے اور مجنون جن سے کوئی گناہ نہیں ہوتا، اُن کو جو تکلیف و مصیبت پہنچتی ہے وہ اس حکم میں داخل نہیں۔ اس کے دوسرے اسباب اور حکمتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً رفع درجات اور درحقیقت ان کی حکمتوں کا احاطہ انسان نہیں کر سکتا (واللہ اعلم)۔

بعض روایات حدیث سے ثابت ہے کہ جن گناہوں پر کوئی سزا دنیا میں

دی دی جاتی ہے تو من کے لئے اس سے آخرت میں معافی ہو جاتی ہے جیسا کہ حکم

نے مستدرک میں اور۔ نبیؐ نے حضرت علیؓ کو اللہ وجہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ (منظہری)

فَمَا أُوتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا عِنْدَ

سو جو کچھ ملا ہے تم کو کوئی چیز نہ سو وہ برتا لینا ہے دنیا کی زندگی کافی میں اور جو کچھ اللہ کے

اللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَى لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۳۶﴾

یہاں ہے بہتر ہے اور باقی رہنے والا واسطے ایمان والوں کے جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں

وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كِبَائرَ الذُّنُوبِ أَفْوَاحِشَ وَإِذَا مَا

اور جو لوگ کہ بچتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بے حیائی سے اور جب

غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ

غصہ آدے تو وہ معاف کر دیتے ہیں اور جنہوں نے کہ حکم مانا اپنے رب کا

وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا

اور قائم کیا نماز کو اور کام کرتے ہیں مشورہ سے آپس کے اور ہمارا

رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ

دیا کچھ خرچ کرتے ہیں اور وہ لوگ کہ جب ان پر ہودے چڑھائی

هُمْ يَتَصَدَّقُونَ ﴿۳۹﴾ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ

تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ہے برائی ویسی ہی پھر جو

عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿۴۰﴾

کوئی معاف کرے اور صلح کرے سو اس کا ثواب ہے اللہ کے ذمے بیشک اس کو پسند نہیں آئے گنہگار

وَلَمَنْ اُنْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ

اور جو کوئی بدلہ لے اپنے مظلوم ہونے کے بعد سوان پر بھی نہیں کچھ الزام

سَبِيلٍ ﴿۴۱﴾ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ

الزام تو ان پر ہے جو ظلم کرتے ہیں لوگوں پر

وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ

اور دھوم اٹھاتے ہیں ملک میں ناحق ان لوگوں کے لئے ہے عذاب

أَلِيمٌ ﴿۴۲﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿۴۳﴾

دردناک اور البتہ جس نے سہا اور معاف کیا بیشک یہ کام ہمت کے ہیں

خلاصہ تفسیر

(اور تم اور پرہیزگار چکے ہو کہ طالب دنیا کی ہر دنیوی تمنا پوری نہیں ہوتی اور آخرت سے محروم رہتا ہے اور طالب آخرت کو ترقتی ہوتی ہے۔ نیز پرہیزگار چکے ہو کہ زیادہ متاع دنیا کا انجام اچھا نہیں، اکثر اس سے اعمال مُضِرّہ پیدا ہوتے ہیں) سو (اس سے ثابت ہوا کہ مطلوب بنانے کے قابل دنیا نہیں، بلکہ آخرت ہے، اور باقی دنیا کی چیزوں میں سے) جو کچھ تم کو دیا دلائیا گیا ہے وہ محض چند روزہ (دنیوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے) کہ عمر کے خاتمہ کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا، اور جو (اجر و ثواب آخرت میں) اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے (کیفیت کے اعتبار سے بھی) بہتر ہے اور (کمیت کے لحاظ سے بھی) زیادہ یا بیکار (یعنی ہمیشہ رہنے والا ہے، پس دنیا کی طلب چھوڑ کر آخرت کی طلب کرو مگر آخرت کے حصول کے لئے کم سے کم شرط تو ایمان لانا اور کفر کو چھوڑنا ہے، اور آخرت کے مکمل درجات کے لئے تمام واجبات و فرائض کو اختیار کرنا اور تمام گناہوں کو چھوڑنا ضروری ہے۔ اور تقرب کے درجات حاصل کرنے کے لئے نفلی طاعات کو اختیار کرنا اور خلاف اولیٰ مباحات کو ترک کرنا بھی محبوب ہے چنانچہ وہ (ثواب جس کی تفصیل اور پرگزری) ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لے آئے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں اور جو کبیرہ گناہوں سے اور ان میں سے بے حیائی کی باتوں سے (بالخصوص زیادہ) بچتے ہیں اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں اور جن لوگوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور وہ نماز کے پابند ہیں اور ان کا ہر راہم کام جس میں اللہ کی طرف سے کوئی معین حکم نہ ہو) آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو ایسے (منصف) ہیں کہ جب ان پر (کسی طرف سے کچھ) ظلم واقع ہوتا ہے تو وہ (اگر بدلہ لیتے ہیں تو) برابر کا بدلہ لیتے ہیں (زیادتی نہیں کرتے، اور یہ مطلب نہیں کہ معاف نہیں کرتے، اور برابر کا بدلہ لینے کے لئے ہم نے یہ اجازت دے رکھی ہے کہ) برائی کا بدلہ برائی ہے ویسی ہی (بشرطیکہ وہ فعل بذات خود گناہ نہ ہو) پھر (انتقام کی اجازت کے باوجود) جو شخص معاف کر دے اور (باہمی معاملہ کی) اصلاح کر لے (جس سے عداوت جاتی رہے اور دوستی ہو جاوے) تو اس کا ثواب (حسب وعدہ) اللہ کے ذمہ ہے (اور جو بدلہ لینے میں زیادتی کر لے لگے تو پرہیزگار رکھے کہ) واقعی اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور جو (زیادتی نہ کرے بلکہ) اپنے اور پر ظلم ہو چکنے کے بعد برابر کا بدلہ لے لے، سو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں، الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں (خواہ ابتداءً یا انتقام کے وقت، اور ناحق دنیا میں سرکشی (اور تکبر) کرتے (پھرتے) ہیں) اور یہی تکبر ظلم کا سبب ہو جاتا ہے۔ اور ناحق اس لئے کہا کہ سرکشی اور تکبر ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے۔ آگے اس الزام کا بیان ہے کہ) ایسوں کے لئے دردناک عذاب (مقرر) ہے اور جو شخص (دوسرے

کے ظلم پر صبر کرے اور معاف کر دے، یہ البتہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے (یعنی ایسا کرنا بہتر اور
اولوالعزمی کا تقاضا ہے)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں دنیا کی نعمتوں کا ناقص ہونا اور فانی ہونا اور اس کے مقابل آخرت کی نعمتوں کا
کامل بھی ہونا اور دائمی ہونا بیان فرمایا ہے۔ اور آخرت کی نعمتوں کے حصول کے لئے سب سے اہم
اور بڑی شرط تو ایمان ہے کہ اس کے بغیر وہ نعمتیں وہاں کسی کو نہ ملیں گی۔ لیکن ایمان کے ساتھ
اگر اعمال صالحہ کا بھی پورا اہتمام کر لیا تو آخرت کی یہ نعمتیں اڈل ہی مل جائیں گی ورنہ اپنے گناہوں اور
گناہیوں کی سزا بھگتنے کے بعد ملیں گی۔ اس لئے آیات مذکورہ میں سب سے پہلی شرط تو
الَّذِينَ آمَنُوا بیان فرمائی۔ اس کے بعد خاص خاص اعمال کا ذکر فرمایا گیا جن کے بغیر ضابطہ کے مطابق
آخرت کی نعمتیں شروع سے نہ ملیں گی بلکہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد ملیں گی۔ اور ضابطہ کے
مطابق اس لئے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو سب گناہوں کو معاف فرما کر اڈل ہی آخرت کی نعمتیں
بڑے سے بڑے فاسق کو دے سکتے ہیں وہ کسی قانون کے پابند نہیں۔ اب وہ اعمال و صفات دیکھیے
جن کو اس جگہ اہمیت سے ذکر فرمایا ہے۔

پہلی صفت ۱۔ عَلٰی رَءِیْفٍ رَحِیْمٍ۔ یعنی ہر کام اور ہر حال میں اپنے رقیق بھروسہ رکھیں
اس کے سوا کسی کو حقیقی کار ساز نہ سمجھیں۔ دوسری صفت ۲۔ الَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کِبْرًا عَظِیْمًا
اَلَا تُحِیْرُوْا حِشًّا۔ یعنی جو کبیرہ گناہوں سے خصوصاً بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرے
والے ہیں۔ کبیرہ گناہ کیا ہیں؟ اس کی تفصیل سورہ نساء وغیرہ میں پہلے بیان ہو چکی اور احقر نے
ایک مختصر سالہ میں کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کی پوری فہرست بھی لکھ دی ہے۔ جو گناہ بے
لذت، کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

کبیرہ گناہوں میں سبھی گناہ داخل تھے، ان میں سے فواحش کو الگ کر کے بیان فرمانے
میں یہ حکمت ہے کہ فواحش کا گناہ عام کبیرہ گناہوں سے زیادہ سخت بھی ہیں اور وہ ایک مرض متعدی
ہیں، جس سے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں فواحش کا لفظ ان کاموں کے لئے بولا جاتا ہے
جن میں بے حیائی ہو جیسے زنا اور اس کے مقدمات۔ نیز وہ اعمال بد جو ٹوٹھٹائی کے ساتھ
علانیہ کیے جاویں وہ بھی فواحش کہلاتے ہیں کہ ان کا دیال بھی نہایت شدید اور پورے انسانی
معاشرہ کو خراب کرنے والا ہے۔

تیسری صفت: **وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ**۔ یعنی وہ جب غصہ میں آتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں۔ یہ حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ کیونکہ کسی کی محبت یا کسی پر غصہ یہ دونوں چیزیں جب غالب آتی ہیں تو اچھے بھلے عاقل فاضل آدمی کو اندھا بہرا کر دیتی ہیں۔ وہ جائز، ناجائز، حق و باطل اور اپنے کئے کے نتائج پر غور کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ جس پر غصہ آتا ہے اس کی کوشش یہ ہونے لگتی ہے کہ مقدور پھر اس پر غصہ اتارا جائے۔ مومنین و صالحین کی اللہ تعالیٰ نے یہ صفت بیان فرمائی کہ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ غصے کے وقت حق و ناحق کی حدود پر قائم رہیں بلکہ اپنا حق ہونے ہونے بھی معاف کر دیتے ہیں۔

چوتھی صفت: **الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ**۔ استجابت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم ملے اسکو فوراً بے چون و چرا اور بے تاثر قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو جائے وہ اپنی طبیعت کے مطابق ہو یا مخالف، ہر حال میں اس کی تعمیل کرے۔ اس میں اسلام کے تمام فرائض کی ادائیگی اور تمام محرمات و مکروہات سے بچنے کی پابندی شامل ہے مگر فرائض میں چونکہ نماز سب سے اہم فرض ہے۔ اور اس میں یہ خاصہ بھی ہے کہ اس پر عمل کرنے سے دوسرے فرائض کی پابندی اور ممنوع چیزوں سے بچنے کی توفیق بھی ہو جاتی ہے اس لئے اس کو ممتاز کر کے فرما دیا، **وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ** یعنی یہ لوگ نماز کو اس کے تمام واجبات اور آداب کے ساتھ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں۔

پانچویں صفت: **وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ**۔ یعنی ان کے کام آپس میں مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔ شوریٰ بروزن بشریٰ مصدر ہے۔ تقدیر عبارت ذر شوریٰ ہے۔ مراد یہ ہے کہ مہمات امور جن میں شریعت نے کوئی خاص حکم متعین نہیں کر دیا ہے ان کو طے کرنے میں یہ باہمی مشورہ سے کام لیتے ہیں۔ مہمات امور کی قید خود لفظ امر سے مستفاد ہے کیونکہ عرف میں امر ایسے ہی کاموں کے لئے بولا جاتا ہے جن کی اہمیت ہو۔ جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** کے تحت تفصیل گزر چکی ہے اس میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ مہمات امور میں امور مملکت و حکومت بھی داخل ہیں اور عام معاملات مہمات بھی۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ مہمات مملکت میں مشورہ لینا واجب ہے اسلام میں امیر کا انتخاب بھی مشورہ پر موقوف کر کے زمانہ جاہلیت کی شخصی بادشاہتوں کو ختم کیا ہے۔ جنہیں ریاست بطور وراثت کے ملتی تھی۔ اسلام نے سب سے پہلے اس کو ختم کر کے حقیقی جمہوریت کی بنیاد ڈالی مگر مغربی جمہوریت کی طرح عوام کو ہر طرح کے اختیارات نہیں دیتے، اہل شوریٰ پر کچھ پابندیاں عائد فرمائی ہیں۔ اس طرح اسلام کا نظام حکومت شخصی بادشاہت اور مغربی جمہوریت دونوں سے الگ ایک نہایت معتدل دستور ہے۔ اس کی تفصیل معارف القرآن جلد دوم ص ۲۱۵ سے ص ۲۲۲ تک میں

ملاحظہ فرمادیں۔

امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے مشورہ کی اہمیت واضح ہو گئی اور یہ کہ ہم اس پر مامور ہیں کہ ایسے مشورہ طلب اہم کاموں میں جلد بازی اور خود رانی سے کام نہ کریں۔ اہل عقل و بصیرت سے مشورہ لیکر قدم اٹھائیں۔

خطیب بغدادیؒ حضرت علی مرتضیٰؒ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کے بعد اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آئے، جس میں قرآن نے کوئی فیصلہ نہیں کیا اور آپ سے بھی اس کا کوئی حکم نہیں ملا تو ہم کیسے عمل کریں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مشورہ کی اہمیت اور اس کا ظرفیت

اجمعوا لہ العابدین من امی واجعلوا بینکم شوسلای ولا تقضوا برأی واحد۔ (روح المعانی - بحوالہ خطیب)

اس کے لئے میری امت کے عبادت گزاروں کو جمع کر لو اور آپس میں مشورہ کر کے طے کر لو کیسی کی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

اس روایت کے بعض الفاظ میں فقہاء و عابدین کا لفظ آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ مشورہ اُن لوگوں سے لینا چاہیے جو فقہاء یعنی دین کی سمجھ بوجھ رکھنے والے اور عبادت گزار ہوں۔ صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ جو مشورہ اس طریق پر نہیں بلکہ بے علم بے دین لوگوں میں اترے ہو اس کا فساد اس کی صلاح پر غالب رہے گا۔

بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی کام کا ارادہ کیا اور اس میں مشورہ لے کر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو ارشاد امور کی طرف ہدایت فرمادے گا یعنی اس کا رخ اسی طرف پھیر دے گا جو اس کے لئے انجام کار خیر اور بہتر ہو۔ اسی طرح کی ایک حدیث بخاری نے الادب المفرد میں اور عبد بن حمید نے مستدرک میں حضرت حسنؓ سے بھی نقل کی ہے۔ جس میں آپ نے آیت مذکورہ پڑھ کر یہ فرمایا ہے۔

ما تشاور قوم قط الا هداً ولا اشراراً امرهم۔

جب کوئی قوم مشورہ سے کام کرتی ہے تو ضرور ان کو صحیح راستہ کی طرف ہدایت کر دی جاتی ہے۔

حَدِیث: ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک تمھارے اقرار اور حکام وہ لوگ ہوں جو تم سب میں بہتر ہیں اور تمھارے مالدار لوگ سخی ہوں کہ اللہ کی راہ میں اور غریب پر خرچ کریں اور تمھارے کام باہمی مشورہ سے طے ہوا کریں۔ اس وقت تک تمھارے لئے زمین کے اوپر رہنا یعنی زندہ رہنا بہتر ہے اور جب تمھارے امراء و حکام تمھاری قوم کے برے لوگ ہو جاویں اور تمھارے مالدار بخیل ہو جاویں اور تمھارے کام غورتوں کے سپرد ہو جاویں کہ

وہ جس طرح چاہیں کریں۔ اس وقت تمہارے لئے زمین کی پیٹھ کی بجائے زمین کا پیٹ بہتر ہوگا یعنی زندگی سے موت بہتر ہوگی۔ (روح المعانی)

چھٹی صفت۔ وَمِمَّا سَأَرْتُمْ يَفْقَهُونَ۔ یعنی وہ لوگ اللہ کے دئے ہوئے رزق میں سے نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ جس میں زکوٰۃ، فرض اور نفلی صدقات سب شامل ہیں۔ عالم اسلوب قرآن کے مطابق زکوٰۃ و صدقات کا ذکر نماز کے متصل آنا چاہئے تھا یہاں نماز کے ذکر کے بعد مشورہ کا مسئلہ پہلے بیان کر کے پھر زکوٰۃ کا بیان آیا۔ اس میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ اقامت نماز کے لئے مساجد میں پانچ وقت اجتماع ہوتا ہے۔ اس اجتماع سے مشورہ طلب امور میں مشورہ لینے کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ (روح المعانی)

ساتویں صفت۔ وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ۔ یعنی جیسا کہ کوئی ظلم کرتا ہے تو یہ برابر کا انتقام لیتے ہیں اس میں حد مساوات تجاوز نہیں کرتے۔ یہ صفت درحقیقت تیسری صفت کی تشریح و تفصیل ہے۔ کیونکہ تیسری صفت کا مضمون یہ تھا کہ یہ لوگ اپنے مخالف کو معاف کر دیتے ہیں۔ مگر بعض حالات ایسے بھی پیش آسکتے ہیں کہ معاف کر دینے سے فساد بڑھتا ہے تو وہاں انتقام لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اس کا قانون اس آیت میں بتلادیا کہ اگر کسی جگہ انتقام لینا ہی مصلحت سمجھا جائے تو اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس انتقام لینے میں برابر سے آگے نہ بڑھیں ورنہ یہ خود ظالم ہو جائیں گے۔ اسی لئے اس کے بعد فرمایا وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا یعنی برائی کی جزا اس کی برابر برائی کرنا ہے۔ یعنی جتنا نقصان مالی یا جسمانی کسی نے نہیں پہنچایا ہے، ٹھیک اتنا ہی تم پہنچا دو۔ جیسی برائی اس نے تمہارے ساتھ کی ہے ویسی ہی تم کو دے مگر اس میں یہ شرط ہے کہ وہ برائی فی نفسہ گناہ نہ ہو۔ مثلاً کسی شخص نے اس کو شراب جبراً پلا دی تو اس کے جواب میں اس کے لئے جائز نہ ہوگا کہ وہ اس کو زبردستی شراب پلا دے۔

اس آیت میں اگر یہ برابر کا بدلہ لینے کی اجازت دیدی گئی ہے مگر آگے یہ بھی فرما دیا، کہ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ۔ یعنی جو معاف کر دے اور اصلاح کا راستہ اختیار کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ جس میں یہ ہدایت کر دی کہ معاف کر دینا افضل ہے۔ اس کے بعد کی دو آیتوں میں اسی کی مزید تفصیل آئی ہے۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سلف صالحین یہ پسند نہ کرتے تھے کہ مومن عفو و انتقام میں اپنے آپ کو فساد و فحار کے سامنے ذلیل کریں اور ان کی جرأت بڑھ جائے۔ اس لئے جہاں یہ خطرہ ہو کہ معاف کرنے سے فساد و فحار کی جرأت بڑھ گئی وہ اور نیک لوگوں کو ستائیں گے وہاں انتقام لے لینا بہتر ہوگا اور معافی کا افضل ہونا

اس صورت میں ہے جبکہ ظلم کرنے والا اپنے فعل پر تادم ہوا اور ظلم پر اس کی جرأت بڑھ جانے کا خطرہ نہ ہو۔ قاضی ابوبکر ابن عربی نے احکام القرآن میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ عفو و انتقام کے دونوں حکم مختلف حالات کے اعتبار سے ہیں۔ جو ظلم کرنے کے بعد شرم نہ ہو جائے اس سے عفو افضل ہے اور جو اپنی صدا اور ظلم پر اصرار کر رہا ہو اس سے انتقام لینا افضل ہے۔

اور حضرت اشرف المشرخ نے بیان القرآن میں اس کو اختیار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں آیتوں میں مؤمنین، مخلصین اور صالحین کی دو خصوصیتیں ذکر فرمائی ہیں۔ **هُمْ لَعَفْرُونَ**۔ میں تو یہ بتلایا کہ یہ غصہ میں مغلوب نہیں ہوتے۔ بلکہ رحم و کرم ان کے مزاج میں غالب رہتا ہے معاف کر دیتے ہیں۔ اور **هُمْ يَنْصُرُونَ** میں یہ بتلایا کہ یہ بھی صالحین کی خصوصیت ہے کہ اگر کبھی ظلم کا بدلہ لینے کا داعیہ ان کے دل میں پیدا بھی ہوا اور بدلہ لینے لگیں تو اس میں حق سے تجاوز نہیں کرتے، اگرچہ معاف کر دینا ان کے لئے افضل ہے۔

وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ وَلِيٍّ مِّنْ بَعْدِهِ ط وَتَرَى

اور جس کو راہ نہ سمجھائے اللہ تو کوئی نہیں اس کا کام بنانے والا اس کے سوا اور تو دیکھے

الظَّالِمِينَ لَهُمْ آسَاءُ الْعَذَابِ يَقُولُونَ هَلْ إِلَىٰ مَرَدٍّ

گنہگاروں کو جس وقت دیکھیں گے عذاب کہیں گے کسی طرح پھر جانے کی بھی ہوگی

مِّنْ سَبِيلٍ ۚ وَتَرَاهُمْ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا خَشِيعَتِ

کوئی راہ اور تو دیکھے ان کو کہ سامنے لائے جائیں آگ کے آنکھیں جھکائے ہوئے

مِنَ الدُّلِّ يَظُنُّوْنَ مِنْ طَرَفٍ حَقِّي ط وَقَالَ الَّذِينَ

ذلت سے دیکھتے ہوں گے چھپی نگاہ سے اور کہیں وہ لوگ

أَمَنُوا إِنَّ الْخَسِرَافِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ

جو ایمان دار تھے مقرر ہوئے والے وہی ہیں جنہوں نے گنوا یا اپنی جان کو

وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ط إِلَّا أَنَّ الظَّالِمِينَ فِي عَذَابٍ

اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن سزا ہے گنہگار پڑے ہیں سزا کے

مَقْلَبٍ ۚ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ أَوْلِيَاءَ يَنْصُرُهُمْ

عذاب میں اور کوئی نہ ہوئے ان کے حمایتی جو مدد کرتے ان کی

مِّن دُونِ اللَّهِ ط وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ سَبِيلٍ ط

اللہ کے سوا کسی اور جس کو بھٹکائے اللہ اس کے لئے کہیں نہیں راہ

اَسْتَحْيُوا رَبَّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّآتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنْ

مالو اپنے رب کا حکم اس سے پہلے کہ آئے وہ دن جس کو پھرنا نہیں اللہ کے

اللَّهُ ط مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَا يَوْمَئِذٍ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيرٍ ط

یہاں سے نہیں ملے گا تم کو بچاؤ اس دن اور نہ ملے گا الوب ہو جانا

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَا اَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا اِنْ

پھر اگر وہ منہ پھریں تو تجھ کو نہیں بھیجا ہم نے ان پر نگہبان تیرا

عَلَيْكَ اِلَّا الْاَبْلَغُ ط وَاِنَّا اِذَا اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مَنَازِحَةً

ذمہ تو بس یہی ہے پہنچا دنیا اور ہم جب چھٹاتے ہیں آدمی کو اپنی طرف سے رحمت

فَرَحٍ بِمَكَاهٍ وَاِنْ تَصِبْهُمْ سَيِّئَةً يَّمِا قَدْ مَتَّ اَيْدِيْكُمْ

اس پر پھولا نہیں سماتا اور اگر پہنچتی ہے ان کو کچھ برائی بدلے میں اپنی کمائی کے

فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ط لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

تو انسان بڑا ناشکرا ہے اللہ کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں

يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ط يَهْبِ لِمَنْ يَّشَاءُ اِنَّا نَا وَكَفَبُ

پیدا کرتا ہے جو چاہے بھٹتا ہے جس کو چاہے بیٹیاں اور بھٹتا ہے

لِمَنْ يَّشَاءُ الذُّكُوْرُ ط اَوْ يَزُوْجُهُمْ ذُكْرًا وَّاُنَا نَا ط

جس کو چاہے بیٹے یا ان کو دیتا ہے جوڑے بیٹے اور بیٹیاں

وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَاءُ عَقِيْمًا ط اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ط

اور کر دیتا ہے جس کو چاہے بانجھ رہے سب کچھ جانتا کر سکتا

خلاصہ تفسیر

یہ حال تو اہل ہدایت کا تھا کہ وہ دنیا میں اللہ کی طرف سے ہدایت اور آخرت میں تو اب مشرق ہوئے۔ اور آگے اہل ضلالت کا حال سنو، وہ یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کے بعد

اُس شخص کا (دنیا میں بھی) کوئی چارہ ساز نہیں کہ اس کو راہ پر لے آوے) اور (قیامت میں بھی بُرا حال ہوگا، چنانچہ اُس روز) آپ (ان) ظالموں کو دیکھیں گے جس وقت کہ ان کو عذاب کا معائنہ ہوگا کہ (نہایت حسرت سے کہتے ہوں گے کیا (دنیا میں) واپس جانے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے، تاکہ پھر اچھے عمل کر کے آئیں، اور (نیز) آپ ان کو اس حالت میں دیکھیں گے کہ وہ دوزخ کے دروازے پر لڑے جاویں گے، مارے ذلت کے جھکے ہوئے ہوں گے (اور وہ اُس کو) حسرت (حسرت) نگاہ سے دیکھتے ہوں گے) جیسے خوف زدہ آدمی دیکھا کرتا ہے، اور ایک دوسری آیت میں جو نابینا ہونے کی خبر دی ہے وہ حسرت کے وقت ہے اور یہ اُس کے بعد کا واقعہ ہے، چنانچہ وہاں لفظ نَحْشُشٌ کی تصریح ہے) اور (اس وقت) ایمان والے (اپنے بچنے پر شکر کرنے کے لئے اور اُن پر ملامت کرنے کے لئے) کہیں گے کہ یوے خسارہ والے وہ لوگ ہیں جو اپنی جانوں سے اور اپنے متعلقین سے (آج) قیامت کے روز خسارہ میں پڑے (اس کی تفسیر سورہ زمر کے دوسرے رکوع میں گزر چکی ہے) یاد رکھو کہ ظالم (یعنی مشرک و کافر) لوگ عذاب دائمی میں (گرفتار نہیں گئے اور وہاں) ان کے کوئی مددگار نہ ہوں گے جو خدا سے الگ (ہو کر) ان کی مدد کریں اور جس کو خدا گمراہ کر دے اُس (کی نجات) کے لئے کوئی رستہ ہی نہیں (یعنی نہ معذرت، نہ کسی کی مدد، نہ اور کچھ۔ آگے کافروں سے خطاب ہے کہ اے لوگو جب تم نے قیامت کے یہ ہولناک حالات سُن لئے تو) تم اپنے رب کا حکم (ایمان وغیرہ کا) مان لو قبل اسکے کہ ایسا دن آپہنچے جس کے لئے خدا کی طرف سے ہلنا نہ ہوگا (یعنی جس طرح دنیا میں عذاب ہلتا جاتا ہے، آخرت میں ایسی کوئی صورت نہ ہوگی اور) نہ تم کو اس روز کوئی (اور) پناہ ملے گی اور نہ تمہارے بارے میں کوئی (خدا سے) روک ٹوک کرنے والا ہے (کہ اتنا ہی پوچھ لے کہ ان کا یہ حال کیوں بنایا گیا اور اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو یہ مٹنا دیجئے) پھر اگر یہ لوگ (یہ سُن کر بھی) اعراض کریں (اور ایمان نہ لائیں) تو (آپ فکر اور غم میں نہ پڑیں، کیونکہ) ہم نے آپ کو اُن پر نگران کر کے نہیں بھیجا (جس سے باز پرس کا احتمال ہو کہ آپ کی نگرانی میں اُن سے یہ امور کیوں صادر ہوئے، بلکہ) آپ کے ذمہ تو صرف (حکم کا) پہنچا دینا ہے (جس کو آپ کہہ رہے ہیں، پھر آپ اس سے زیادہ فکر کیوں کریں) اور (ان کے حق سے اعراض کرنے کا سبب تعلق مع اللہ کی کمزوری ہے، جس کی علامت یہ ہے کہ) ہم جب (اس قسم کے) آدمی کو کچھ اپنی عنایت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ اُس پر (اترا کر) خوش ہو جاتا ہے (اور منعم پر نگاہ کر کے شکر نہیں کرتا) اور اگر (ایسے) لوگوں پر اُن کے (ان) اعمال (بد) کے بدلے میں جو پہلے اپنے ہاتھوں کر چکے ہیں کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو (ایسا) آدمی ناشکری کرنے لگتا ہے

اور ایسا نہیں کہ تاکہ گناہوں سے توبہ واستغفار کر کے عبادت و طاعت کے ذریعہ اللہ کی طرف رجوع ہو، اور یہ دونوں حالتیں اس بات کی علامت ہیں کہ اس کا تعلق اپنی نفسانی لذتوں کے ساتھ زیادہ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معدوم یا کمزور ہے اور اسی سے وہ کفر میں مبتلا ہوا ہے۔ اور چونکہ یہ حالت ان لوگوں کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ اس لئے اُن سے آپ ایمان کی توقع نہیں کیوں رکھیں جو موجبِ غم ہو۔ آگے پھر توحید کا بیان ہے کہ اللہ ہی کی ہے (سب) سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے (چنانچہ) جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے یا اُن کو (جس کے لئے چاہے) جمع کر دیتا ہے (کہ) بیٹے بھی (دیتا ہے) اور بیٹیاں بھی اور جس کو چاہے بے اولاد رکھتا ہے، بے شک وہ بڑا جاننے والا بڑی قدرت والا ہے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ کی ابتدائی آیات میں ان لوگوں کا انجام مذکور ہے جو مومنین صالحین کے بالمقابل بجائے فکرِ آخرت کے صرف دنیا کی لذت و راحت کے طلبگار رہے۔ اس کے بعد اِستَجِیْبُوا لِیَوْحِیْکُمْ مِیْنِ اَنْ کُوْنُوْا فِیْ سَیْئِرِ الْغَافِلِیْنَ کی گئی ہے کہ قیامت کا عذاب آنے سے پہلے توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں۔ اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپ کی بار بار تبلیغ اور کوشش کے باوجود اگر یہ لوگ ہوش میں نہ آویں تو آپ غم نہ کریں، فَإِنْ اَخْرَجْنَا مِنْهُمُ اَیُّوْمًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ فَکَیْفَ یَعْلَمُوْنَ کہ یہی مطلب ہے۔

آخری آیات میں لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ سے آخر تک تخلیق کائنات میں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا مشاہدہ ہوتا ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں، ان کو بیان کر کے توحید کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا ذکر فرمانے کے بعد ایک ضابطہ قدرت بیان فرمایا کہ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ۔ یعنی اس کو ہر بڑی چھوٹی چیز کے بنانے پر پوری قدرت ہے وہ جب چاہے جو چاہے پیدا کر دیتا ہے۔ اسی سلسلہ میں تخلیق انسانی کا ذکر فرمایا یَهْبِیْطُ لَہُمْ کِیْشَآءُ اِنَّا نَا وِیْہِبُ لَہُمْ کِیْشَآءُ اَلَّذِیْ کُوْنُوْا اَوْ یُزَوِّجُوْہُمْ ذُکْرًا وَاُنْثٰی وَیَجْعَلُ مَسْکٰنَہُمْ کِیْشَآءَ عَظِیْمًا اِنَّہٗ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ط

یعنی انسان کی تخلیق میں کسی کے ارادہ و اختیار بلکہ علم و خبر کا بھی کوئی دخل نہیں اور کسی کا دخل تو کیا ہوتا، انسان کے ماں باپ جو اس کی تخلیق کا ظاہری سبب بنتے ہیں خود ان کے ارادے اور

اختیار کا بھی بچہ کی تخلیق میں کوئی دخل نہیں تخلیق میں دخل ہونا تو دور کی بات، بچہ کی ولادت سے پہلے ماں کو بھی کچھ خبر نہیں ہوتی کہ اس کے پیٹ میں کیا، کیسا اور کس طرح بن رہا ہے۔ یہ صرف حق تعالیٰ کا کام ہے کہ کسی کو اولاد لڑکیاں دیدیتا ہے۔ کسی کو نرینہ اولاد لڑکے بخش دیتا ہے۔ کسی کو لڑکے اور لڑکیاں دونوں عطا فرما دیتا ہے اور کسی کو بالکل بانجھ کر دیتا ہے۔ کہ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوتی ان آیات میں بچوں کے اقسام بیان کرنے میں حق تعالیٰ نے پہلے لڑکیوں کا ذکر فرمایا ہے۔ لڑکوں کا ذکر بعد میں کیا ہے۔ اسی آیت کے اشارہ سے حضرت واثلہ بن اسقعؓ نے فرمایا کہ جس عورت کے بطن سے پہلے لڑکی پیدا ہو وہ مبارک ہوتی ہے۔ (قرطبی)

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُلِمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَآئِ

اور کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارہ سے یا پردے کے پیچھے

حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بآذَانِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ

سے یا بھیجے کوئی پیغام لانے والا پھر پہنچا دے اسکے علم سے جو وہ چاہے

عَلَىٰ حَكِيمٍ ۝۵۱ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا

تحقیق وہ سب اوپر ہے حکمت والا اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے

مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِنْ جَعَلْنَاهُ

تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان لیکن ہم نے رکھی ہے

نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن لَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ

یہ روشنی اس سے راہ بھادیتے ہیں جس کو چاہیں اپنے بندوں میں اور بے شک

لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝۵۲ صِرَاطَ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي

تو سمجھاتا ہے مسیدھی راہ اللہ کی اسی کا ہے جو کچھ ہے

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ طَالِيَ إِلَى اللَّهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ ۝۵۳

آسمانوں میں اور زمین میں سنتا ہے اللہ ہی تک پہنچتے ہیں سب کام

خلاصہ تفسیر

اور کسی بشر کی (بحالت موجودہ) یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرماوے، مگر (تین طریق سے) یا تو الہام سے (کہ قلب میں کوئی اچھی بات ڈال دے) یا حجاب کے باہر سے (کچھ

کلام شہادے جیسے موسیٰ علیہ السلام نے سنا تھا، یا کسی فرشتہ کو بھیج دے کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے، پیغام پہنچا دیتا ہے (اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بڑا عالیشان ہے (اس سے جب تک وہ خود طاقت نہ دے کوئی ہمکلام نہیں ہو سکتا، مگر اس کے ساتھ بڑی حکمت والا بھی) ہے (اسی لئے بندوں کی مصلحت سے اس نے کلام کے تین مذکورہ طریقے مقرر فرما دیئے ہیں) اور (جس طرح بشر کے ساتھ ہمارے ہمکلام ہونے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے) اسی طرح (یعنی اس قاعدے کے مطابق) ہم نے آپ کے پاس (بھی) وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے (اور آپ کو نبی بنایا ہے، اور یہ وحی ایسا ہدایت نامہ ہے کہ آپ کے لئے مثل علوم میں اسی کی بدولت ترقی ہوئی، چنانچہ اس سے پہلے آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان (کا مکمل ترین درجہ جوابِ کامل ہے) کیا چیز ہے (گو نفسِ ایمان نبی کو نبوت سے پہلے بھی حاصل ہوتا ہے، لیکن ہم نے آپ کو نبوت اور قرآن دیا اور اس قرآن کو آپ کے لئے اولا اور دوسروں کے لئے ثانیاً) ایک نور بنایا (جس سے آپ کو یہ عظیم علوم اور بلند مرتبہ احوال حاصل ہوئے اور جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں) پس اس کے نورِ عظیم ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اب جو اندھا ہی ہو وہ اس نور کے نفع سے محروم بلکہ اس کا منکر ہے، جیسے یہ معترضین) اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ اس قرآن اور وحی کے ذریعہ سے عام لوگوں کو، ایک سیدھے رستہ کی ہدایت کر رہے ہیں، یعنی اس خدا کے رستہ کی کہ اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے (آگے ان احکام کے ماننے اور نہ ماننے والوں کی جزا و سزا کا ذکر ہے کہ) یاد رکھو سب امور اسی کی طرف رجوع ہوں گے (پس وہ سب پر جزا و سزا دے گا)۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت یہود کے ایک معاذنہ مطالبہ کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ بغوی اور قرطبی وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم آپ پر کیسے ایمان لے آئیں جبکہ آپ نہ خدا تعالیٰ کو دیکھتے ہیں اور نہ اس سے بالمشافہ کلام کرتے ہیں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کلام کرتے اور اللہ تعالیٰ کو دیکھتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بالمشافہ کلام کرنا اس دنیا میں ممکن نہیں۔ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی

مشافہتہ کلام نہیں سنا بلکہ پس پردہ صرف آواز سنی۔

اس آیت میں یہ بھی بتلادیا گیا کہ کسی بشر سے اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے کی صرف تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وَحْیاً یعنی کسی مضمون کو قلب میں ڈال دینا۔ یہ جاگتے ہوئے بھی ہو سکتا ہے اور نیند میں بصورت خواب بھی، جیسا کہ بہت سی احادیث میں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اَلْقِیَ فِی سَاعِی۔ یعنی یہ بات میرے دل میں القا کی گئی ہے اور انبیاء علیہم السلام کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں۔ اُن میں شیطانی تصرف نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں عموماً الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتے۔ صرف ایک مضمون قلب میں آتا ہے جس کو وہ اپنے الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں۔

دوسری صورت۔ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ہے، یعنی جاگتے ہوئے کوئی کلام پس پردہ سنے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر پیش آیا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنا مگر زیارت نہیں ہوئی اسی لئے زیارت کی درخواست کی رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْكَ، جس کا جواب نفی میں دیا گیا، لَنْ تَرَانِیْ۔

اور یہ حجاب جو انسان کو دنیا میں حق تعالیٰ کی زیارت سے مانع ہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو حق تعالیٰ کو چھپا سکے، کیونکہ اُس کے نور محیط کو کوئی شے چھپا نہیں سکتی۔ بلکہ انسان کی قوت بنیانی کا ضعف ہی اس کے لئے زیارت حق کے درمیان حجاب ہوتا ہے۔ اسی لئے جنت میں جبکہ اس کی بنیانی قوی کر دی جائے گی تو وہاں ہر جنتی حق تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہو گا۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ کی تصریح کے مطابق اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔

یہ قانون جو آیت مذکورہ میں ارشاد ہے، دنیا کے متعلق ہے کہ دنیا میں کوئی انسان اللہ تعالیٰ سے کلام مشافہتہ یعنی بے حجاب نہیں کر سکتا۔ اور انسان کی تخصیص کلام میں اس لئے ہے کہ گفتگو انسان ہی کے متعلق تھی۔ ورنہ ظاہر یہ ہے کہ فرشتوں سے بھی اللہ تعالیٰ کا کلام بالمشافہتہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ترمذی کی روایت میں جبرائیل علیہ السلام سے منقول ہے کہ میں بہت قریب ہو گیا تھا اور پھر بھی ستر ہزار حجاب رہ گئے تھے۔ اور شب معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق تعالیٰ سے بالمشافہتہ کلام اگر ثابت ہو جائے جیسا کہ بعض علماء کا قول ہے تو وہ اس کے منافی نہیں، کیونکہ وہ کلام اس عالم میں نہیں تھا، عالم سموات میں تھا۔ واللہ اعلم۔

تیسری صورت، اَوْیْرِ سَمِعًا رَسُوْلًا ہے۔ یعنی کسی فرشتہ جبرائیل وغیرہ کو اپنا کلام دیکر بھیجا جائے وہ رسول کو پڑھ کر سنا دے۔ اور یہی طریقہ عام رہا ہے، قرآن مجید پورا اسی طرح بواسطہ ملائکہ نازل ہوا ہے۔ مذکورہ تفصیل میں لفظ وحی کو صرف القا فی القلب کے معنی میں لیا گیا ہے

مگر اکثر یہ لفظ تمام اقسام کلام ربانی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک طے میں حدیث میں وحی کی اقسام بذریعہ فرشتہ کلام کو بھی شمار فرمایا ہے۔ اور اس میں یہ بھی تفصیل ہے کہ فرشتہ کے ذریعہ جو وحی آتی ہے اس کی بھی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ کبھی تو فرشتہ اپنی اصلی مہیت میں ہوتا ہے کبھی بشکل انسانی سامنے آتا ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ہوتا ہے یعنی بسکل الہامی سامنے آتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

مَا كُنْتُ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَلَٰكِنَّ الْآيَةَ - یہ آیت پہلی ہی آیت کے
مضمون کا مکملہ ہے۔ جس کا حائل یہ ہے کہ دنیا میں بالمشانہ کلام تو کسی کا نہ ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ البتہ
اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں پر اپنی وحی بھیجتے ہیں جس کے تین طریقے پہلی آیت میں بیان
ہوئے۔ اسی سبب الہامیہ کے مطابق آپ پر بھی وحی بھیجی جاتی ہے۔ یہودیوں کا یہ مطالبہ کہ آپ
اللہ تعالیٰ سے بالمشانہ کیوں مخاطب نہیں ہوتے محض جاہلانہ اور معاندانہ ہے۔ اس لئے یہ فرمایا
کہ کسی انسان کو یہاں تک کہ کسی رسول کو جو کچھ بھی علم ملتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے
اور جب تک اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی ان کو نہ بتلا دیں تو نہ انہیں کسی کتاب کی واقفیت ہو سکتی ہے
نہ تفصیلات ایمان کی کتاب کی واقفیت قبل وحی نہ ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ ایمان سے واقفیت
نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ایمان کی تفصیلات اور شرائع ایمان یا ایمان کا اعلیٰ مقام جو بعد وحی
حاصل ہوتا ہے، وحی سے پہلے اس کی واقفیت نہیں ہوتی۔ ورنہ باجماع امت یہ بات ثابت ہے کہ
اللہ تعالیٰ جس انسان کو اپنا رسول و نبی بناتے ہیں اس کو ابتداء ہی سے ایمان پر پیدا فرماتے
ہیں۔ ان کی فطرت ایمان پر مبنی ہوتی ہے۔ عطار نبوت اور نزول وحی سے پہلے بھی وہ بچے مومن
ہوتے ہیں۔ اصول ایمان ان کی فطرت و خلقت میں داخل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء
علیہم السلام سے جب ان کی قوموں نے مخالفت کی تو ان پر طرح طرح کے الزام لگائے۔ مگر کسی
پیغمبر پر کسی امت نے یہ الزام نہیں لگایا کہ تم بھی تو نبوت کے دعوے سے پہلے ہماری طرح بتوں کو
پوجا کرتے تھے۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اور قاضی عیاض نے شفا میں اس مضمون کو پوری
تفصیل سے لکھا ہے۔

سُورَةُ الزُّخْرُفِ

سُورَةُ الزُّخْرُفِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تَسْعُ وَثَمَانُونَ آيَةً وَسَبْعُ رُكُوعَاتٍ
سورہ زخرف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی نواسی آیتیں ہیں اور سات رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	
شرح اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے	
حَمْدٌ ۱ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ ۲ اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۳ وَانَّهُ فِيْ اُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلُّ حَكِيمٌ ۴ اَفَنْصَرِبُ عَنْكُمْ الَّذِیْ كَرَّ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِیْنَ ۵ وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِیٍّ فِی الْاَوَّلِیْنَ ۶ وَمَا یَنْتَهِمُ مِنْ نَّبِیٍّ اِلَّا كَانُوا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۷ فَاهْلَكْنَا اَسْلَ مِنْهُمْ بَطْشًا وَ	مع عند التقدير
ہم نے اس کتاب کو قرآن عربی زبان کا تاکہ تم سمجھو اور تحقیق یہ قرآن نور محفوظ میں ہمارے پاس ہے برتر مستحکم کیا پھر دیں گے	
ہم تمہاری طرف سے یہ کتاب موڑ کر اس سبب سے کہ تم ہو ایسے لوگ کہ حد پر نہیں رہتے اور بہت بھیجے ہیں ہم نے	
نبی پہلوں میں اور نہیں آتا لوگوں کے پاس کوئی پیغام لانے والا جس سے	
ٹھٹھا نہیں کرتے پھر برباد کر ڈالے ہم نے اُن سے سخت زور والے اور	
مَضٰی مَثَلُ الْاَوَّلِیْنَ ۸	
پہلی آئی ہے مثال پہلوں کی	

خلاصہ تفسیر

الحمد (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) قسم (ہے) اس کتاب واضح کی کہ ہم نے اسکو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ (اے عرب) تم (آسانی سے) سمجھ لو اور وہ ہمارے پاس نور محفوظ میں بڑے رتبہ کی اور حکمت بھری کتاب ہے (پس جب وہ سمجھنے میں آسان اور خاص ہماری زیر حفاظت

اور اعجاز کی وجہ سے بڑے رُتبے والی اور حکیمانہ مضامین پر مشتمل ہے تو ایسی کتاب کو ضرور ماننا چاہیے لیکن اگر تم نہ مانو تب بھی ہم اپنی حکمت کے مقتضائے اسکا بھیجنا اور تم کو اسکا مخاطب بنانا نہ چھوڑینگے چنانچہ ارشاد ہے کہ (کیا ہم تم سے اس نصیحت (نامہ) کو (محض) اس بات پر ہٹالیں گے کہ تم حد (اطاعت) سے اگزر نہ والے ہو) اور اس کو نہیں مانتے، یعنی خواہ تم مانو یا نہ مانو مگر نصیحت تو برابر کی جائے گی اور یہ فیض کامل ہو کر رہے گا تاکہ اس سے مومنین کو نفع ہو اور تم پر حجت قائم ہو) اور ہم پہلے لوگوں میں (باوجود اُن کی تکذیب کے) بہت سے نبی بھیجتے رہے ہیں (یہ نہیں ہوا کہ اُن کے جھٹلانے کی وجہ سے سلسلہ نبوت بند ہو جاتا) اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، جیسے ہم نے اُن کی تکذیب کی پروا نہیں کی اسی طرح آپ بھی کچھ پروا اور غم نہ کیجیے، کیونکہ) اُن (پہلے) لوگوں (کا بھی یہی حال تھا کہ اُن کے پاس کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ انھوں نے استہزاء نہ کیا ہو، پھر جنے اُن لوگوں کو جو کہ ان (اہل مکہ) سے زیادہ زور اور تھے (تکذیب اور استہزاء کی سزائیں) غارت کر ڈالا، اور پہلے لوگوں کی یہ حالت ہو چکی ہے) پس نہ آپ غم کریں کہ ان کا بھی ایسا ہی حال ہونا ہے (جیسا کہ بدر وغیرہ میں ہوا اور نہ یہ بے فکر ہوں کہ نمونہ موجود ہے)

معارف و مسائل

یہ سورت مکی ہے، البتہ حضرت مقاتلؓ کا قول ہے کہ آیت **وَأَنسَلْنَاكَ مِنْ أَثَرِ مَدَنِي** ہے، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ سورت معراج کے وقت آسمان پر نازل ہوئی (روح المعانی) واللہ اعلم **وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ**، (قسم ہے کتاب واضح کی) اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کی قسم کھاتے ہیں تو عموماً وہ چیز بعد کے دعوے کی دلیل ہوا کرتی ہے۔ یہاں قرآن کریم کی قسم کھا کر اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے۔ قرآن بذات خود اپنے اعجاز کی وجہ سے اپنی حقانیت کی دلیل ہے اور قرآن کو واضح کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے وعظ و نصیحت پر مشتمل مضامین باہمی سمجھ میں آجاتے ہیں لیکن جہاں تک اس سے احکام شرعیہ کے استنباط کا تعلق ہے وہ بلاشبہ ایک مشکل کام ہے اجتہاد کی پوری صلاحیت کے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا چنانچہ دوسری جگہ یہ بات واضح کر دی گئی ہے **وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدْرِكٍ** (اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے، پس کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟) اس میں فرما دیا گیا ہے کہ قرآن نصیحت اندوزی کیلئے آسان ہے لہذا اس سے اجتہاد و استنباط کا آسان ہونا لازم نہیں آتا بلکہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے کہ اس کام کے لئے متعلقہ علوم میں پوری جہاد شرط ہے۔

مبلغ کو مایوس ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیے | اَفَتَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَافًۢمًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِیْنَ
(کیا ہم تم سے اس نصیحت کو اس بات پر ہٹالیں گے کہ تم حد سے گزرنے والے ہو؟) مطلب یہ ہے کہ تم اپنی کثرتی
اور نافرمانی میں خواہ کتنے حد سے گزر جاؤ لیکن ہم تمہیں قرآن کے ذریعہ نصیحت کرنا نہیں چھوڑیں گے۔ اس
سے معلوم ہوا کہ جو شخص دعوت و تبلیغ کا کام کرتا ہو اسے ہر شخص کے پاس پیغام حق لیکر جانا چاہیے اور
کسی گروہ یا جماعت کو تبلیغ کرنا محض اس بنا پر نہیں چھوڑنا چاہیے کہ وہ تو انتہا درجے کے ملحد
بے دین یا فاسق و فاجر ہیں انہیں کیا تبلیغ کی جائے۔

وَلٰكِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ

اور اگر تو ان سے پوچھے کس نے بنائے آسمان اور زمین تو کہیں بنائے

الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ ۙ ۹ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمُ

اس زبردست خبر دار نے وہی ہے جس نے بنا دیا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور رکھ دیں تمہارے واسطے

فِیْهَا سَبَیْلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۙ ۱۰ وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَآءً

اسیں راہیں تاکہ تم راہ پاؤ اور جس نے اتارا آسمان سے پانی

یَقْدَرُ ۙ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلَدًا مَّیِّتًا ۙ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۙ ۱۱ وَالَّذِیْ

پا کر پھرا بھار کھڑا کیا ہم نے اس سے ایک ایسے مردہ کو اسی طرح تم کو بھی نکالیں گے اور جس نے

خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَّجَعَلَ لَكُمُ مِنَ الْفَلَکِ وَالْاَنْعَامِ مَا

بنائے سب چیز کے جوڑے اور بنا دیا تمہارے واسطے کشتیوں اور چوپایوں کو

تَرْکَبُوْنَ ۙ ۱۲ لِّتَسْتَوُوْا عَلٰی ظُهُورِہٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّکُمْ اِذَا

جس پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ چڑھ بیٹھو تم اسکی پیٹھ پر پھر یاد کرو اپنے رب کا احسان جب

اَسْتَوِیْتُمْ عَلَیْہِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَاَمَّا کُنَّا

بیٹھ چکے اس پر اور کہو پاک ذات ہے وہ جس نے بس میں کر دیا ہمارے اسکو اور ہم نہ تھے

لَہٗ مُقَرَّنِیْنَ ۙ ۱۳ وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۙ ۱۴ وَجَعَلُوْا لَہٗ مِنْ

اس کو قابو میں لاسکتے اور ہم کو اپنے رب کی طرف پھر جانا ہے اور ٹھہرائی ہے انہوں نے

عِبَادَہٗ جُزْءًا اِنْ اِلَّا نَسَانَ لَّکُفُوْرٍ مُّبِیْنٍ ۙ ۱۵ اِمَّا تَخَذِ مِمَّا

حق تعالیٰ کے واسطے اولاد کے بندوں میں سے، تحقیق انسان بڑا ناشکر ہے صریح کیا اُس نے رکھ لیں اپنی

یَخْلُقُ بَدَنًا وَّاَصْفٰکُمْ بِالْبَیِّنِیْنَ ۙ ۱۶ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُہُمْ بِمَا

مخلوقات میں سے بیٹیاں اور تم کو دیدیے چن کر بیٹے اور جب انہیں کسی کو خوشخبری ملے اُس چیز کی جس

میں سے تم کو بدخبری ملے اُس چیز کی جس

ضَرَبَ لِلرَّحْمَنِ مَثَلًا ظَلًّا وَجْهَهُ مُسْوَدًّا ۖ وَهُوَ كَظِيمٌ ۝۱۷

نورِ رحمن کے نام لگایا تو سارے دن رہے منہ اسکا سیاہ اور وہ دل میں گھٹ رہا ہے کیا

مَنْ يَنْشُرْ فِي الْحَلِيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ۝۱۸

ایسا شخص کہ پرورش پاتا ہے ترپور میں اور وہ جھگڑے میں بات نہ کہہ سکے اور ٹھہرایا انہوں نے

الْمَلَائِكَةُ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ ۖ إِنَّا شَاءَ أَشْهَدُ وَآخِلَقُمْ ۝۱۹

فرشتوں کو جو بندے ہیں رحمن کے عورتیں کیا دیکھتے تھے اُن کا بنا

سَكَّتَبُ شَهَادَتِهِمْ وَيُسْكَوْنَ ۝۱۹

اب کھم رکھیں گے اُن کی گواہی اور اُن سے پوچھ ہوگی اور کہتے ہیں اگر چاہتا رحمن تو ہم

عَبْدُهُمْ مَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِن هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝۲۰

نہ پوچھتے اُن کو کچھ خبر نہیں اُن کو اس کی یہ سب انگلیں دوڑاتے ہیں

أَمْ أَتَيْنَهُمُ كِتَابًا مِنْ قَبْلِهِ فَهُمْ بِهِ مُسْتَمْسِكُونَ ۝۲۱

کیا ہم نے کوئی کتاب دی ہے اُن کو اس سے پہلے سوانہوں نے اس کو مضبوط پکڑ رکھا ہے بلکہ کہتے ہیں ہم نے

وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُهُتَدُونَ ۝۲۲

پایا اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر اور ہم انہی کے قدموں پر ہیں راہ پائے ہوئے اور اسی طرح

مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا ۝۲۳

جس کسی کو بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے ڈر سنانے والا کسی گاؤں میں سو کہنے لگے وہاں کے خوشحال لوگ

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّقْتَدُونَ ۝۲۴

ہم نے تو پایا اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر اور ہم انہی کے قدموں پر چلتے ہیں

قُلْ أَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِآهْدَىٰ مِمَّا وَجَدْتُمْ عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ قُلُوا ۝۲۵

وہ بولا اور جو میں لا دوں تم کو اس سے زیادہ سوجھ کی راہ جس پر تم نے پایا اپنے باپ دادوں کو تو یہی کہنے

لَا تَكْرِهْنَا ۖ أَرْسَلْنَا بِهِ كُفْرًا وَنَ ۝۲۶

لگے ہم تمہارا لایا ہوا نہیں مانیں گے پھر ہم نے اُن سے بدلہ لیا سو دیکھ لے کیسا ہوا

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ ۝۲۷

انجھام جھٹلانے والوں کا

خلاصہ تفسیر

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ

اُن کو زبردست جاننے والے (خدا) نے پیدا کیا ہے (اور ظاہر ہے کہ جس ذات نے تنہا یہ عظیم مخلوقات پیدا کی ہوں عبادت بھی تنہا اسی کی کرنی چاہیے، لہذا توحید خود اُن کے اعتراف سے ثابت ہو گئی۔ آگے اللہ تعالیٰ توحید کو مزید مدلل کرنے کے لئے اپنے وہ افعال بیان فرماتے ہیں جو توحید پر دلالت کر نیوالے ہیں یعنی یہ زمین و آسمان اسے پیدا کیا ہے) جس نے تمہارے (آرام کے) لئے زمین کو (مثل) فرش (کے) بنایا (کہ اس پر آرام کرتے ہو) اور اُس (زمین) میں اُس نے تمہارے (منزل مقصود تک پہنچنے کے) لئے رستے بنائے تاکہ (اُن راستوں پر چل کر) تم منزل مقصود تک پہنچ سکو اور جس نے آسمان سے پانی ایک انداز (خاص) سے (اپنی مشیت اور حکمت کی مطابق) برسایا پھر ہم نے اس (پانی) سے خشک مین کو (اُس کے مناسب) زندہ کیا (اور اس سے توحید پر دلالت کے علاوہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ) اسی طرح تم (بھی اپنی قبروں سے) بکامے جاؤ گے اور جس نے (مختلف اجناس و انواع میں) تمام (مختلف) اقسام (یعنی اصناف) بنائیں اور تمہاری وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ تم اُن (کشتیوں اور چارپائیوں) کی (سطح اور) پیٹھ پر جم کر (اطمینان سے) بیٹھو پھر جب اسپر بیٹھ چکو تو اپنے رب کی (اس) نعمت کو (دل سے) یاد کرو اور (زبان سے استغیا) یوں کہو کہ اُسکی ذات پاک ہے جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا اور ہم تو ایسے (طاقتور اور ہر مند) نہ تھے جو اُن کو قابو میں کر لیتے (کیونکہ جانور سے زیادہ طاقت نہیں، اور الہام حق کے بغیر کشتی چلانے کی تدبیر سے واقف نہیں، دونوں کے متعلق حق تعالیٰ نے تدبیر سکھادی) اور ہم کو اپنے رب کی طرف کوٹ کر جانا ہے (اس لئے ہم اس پر سوار ہو کر شکر سے غفلت یا تکبر نہیں کرتے) اور (یاد وجود دلائل توحید کے واضح ہونے کے) ان لوگوں نے (شرک اختیار کر رکھا ہے) اور وہ بھی کیسا قبیح کہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں اور اُن کی عبادت کرتے ہیں پس ایک فرابی تو یہ ہوئی کہ اُنھوں نے (خدا کے بندوں میں سے) جو مخلوق ہوتے ہیں (خدا کا جزو ٹھہرایا، حالانکہ خدا کا کوئی جزو ہونا عقلاً محال ہے) واقعی (ایسا) انسان سیرج ناشکر ہے (کہ خدا تعالیٰ کیساتھ اتنا بڑا کفر کرتا ہے کہ اُسکو صاحب جزو قرار دیتا ہے جس سے خدا تعالیٰ کا معاذ اللہ حادث ہونا لازم آتا ہے۔ غرض ایک فرابی تو یہ ہوئی اور دوسری فرابی یہ کہ یہ لوگ لڑکی کو ناقص سمجھتے ہیں اور پھر خدا کے لئے بیٹیاں مانتے ہیں تو) کیا خدا نے اپنی مخلوق میں سے (تمہارے زعم میں اپنے لئے تو) بیٹیاں پسند کیں اور تمکو بیٹوں کے ساتھ مخصوص کیا حالانکہ (تم بیٹیوں کو اتنا برا سمجھتے ہو کہ) جب تم میں کسی کو اُس چیز کے ہوئی خبر دیتی ہے جس کو خدا نے رحمان کا نمونہ (یعنی اولاد) بنا رکھا ہے (مُراد بیٹی ہے) تو (استقدر ناراض ہو کہ) سارے دن اُسکا چہرہ بے رونق رہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے (توحیرت ہے کہ خدا کی طرف نقص کی نسبت کرتے ہو یہاں تک انکے فاسد عقیدے کی الزامی تردید تھی جس کی تشریح سورۃ صافات میں گزر چکی ہے۔ آگے اسی عقیدے کی تحقیق تردید کی جاتی ہے کہ اگرچہ لڑکی ہونا بذاتِ خود کوئی ذلت یا عار کی بات نہیں جیسے

کسی بستی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے (اولاً اور متبعین نے ثانیاً) یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی انہی کے چھپے پیچھے چلے جا رہے ہیں (اس پر) انکے (اس) پیغمبر نے (انسے) کہا کہ کیا (آبائی رسوم ہی کا اتباع کئے جاؤ گے) اگرچہ میں اُس سے اچھلا منزل (مقصود پر پہنچا دینے والا طریقہ تمھارے پاس لایا ہوں کہ جس پر تمھنے اپنے باپ دادوں کو پایا ہو، وہ (براہ عناد) کہنے لگے کہ ہم تو اُس (دین) کو مانتے ہی نہیں جس کو دیگر (برغم تمھارے) تم کو بھیجا گیا ہے سو (جب عناد حد سے بڑھ گیا اسوقت) ہم نے اُن سے استقام لیا، سو دیکھئے، تمکذیب کرنے والوں کا کیسا (برا) انجام ہوا۔

معارف و مسائل

جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا (تمھارے لئے زمین کو فرش بنایا) مطلب یہ ہے کہ زمین کی ظاہری صورت اور اسکا آرام فرش کا سا ہے، لہذا یہ زمین کے گول ہونے کے منافی نہیں۔

وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ (اور تمھارے لئے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہو) انسان کی سواریاں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک وہ سواریاں جنہیں انسان اپنی صنعتِ حرفت کے ذریعہ خود بناتا ہے اور دوسرے وہ حیوانات جن کی تخلیق میں انسانی صنعت کا کوئی دخل نہیں۔ ”کشتیاں“ بول کر سواریوں کی پہلی قسم مراد ہے اور ”چوپائے“ سے دوسری قسم۔ بہر حال مقصد یہ ہے کہ انسانی استعمال کی تمام سواریاں، خواہ ان کی تیاری میں انسانی صنعت کو دخل ہو یا نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہیں۔ چوپایوں کا نعمت ہونا تو بالکل ظاہر ہے کہ وہ انسان سے کئی گنا زائد طاقتور ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں انسان کے آگے ایسا رام کر دیا ہے کہ ایک بچہ بھی ان کے منھ میں لگایا یا ناک میں نکیل ڈال کر جہاں چاہتا ہے انھیں لیجاتا ہے۔ اسی طرح وہ سواریاں بھی اللہ کی بڑی نعمت ہیں جن کی تیاری میں انسانی صنعت کو دخل ہے، ہوائی جہاز سے لیکر معمولی سائیکل تک یہ ساری سواریاں اگرچہ بظاہر انسان نے خود بنائی ہیں لیکن اُن کی صنعت کے طریقے سمجھانے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے؟ یہ وہ قادرِ مطلق ہی تو ہے جس نے انسانی دماغ کو وہ طاقت عطا کی ہے جو لوہے کو موم بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اسکے علاوہ ان کی صنعت میں جو خام مواد استعمال ہوتا ہے وہ اور کس کے خواص و آثار تو براہِ راست اللہ تعالیٰ ہی کی تخلیق ہیں۔

ثُمَّ يَذُوقُوا نَجْمًا (اور تاکہ تم یاد کرو اپنے پروردگار کی نعمت کو) اس سے اشارہ فرمادیا گیا کہ ایک صاحبِ عقل و ہوش انسان کا کام یہ ہے کہ وہ نعمِ حقیقی کی نعمتوں کو استعمال کرتے ہوئے غفلت، بے پروائی اور استغناء کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اس بات پر دھیان دے کہ یہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے لہذا مجھ پر اسکے شکر کی ادائیگی اور عجز و نیاز کا اظہار واجب ہے۔ ایک کافر

اور مؤمن میں درحقیقت یہی فرق ہے کہ کائنات کی نعمتوں کو دونوں استعمال کرتے ہیں لیکن کافر انھیں غفلت اور بے پروائی سے استعمال کرتا ہے اور مؤمن اللہ کے انعامات کو مستحضر کر کے اپنا سرنیازا اس کے حضور جھکا دیتا ہے۔ اسی مقصد سے قرآن و حدیث میں مختلف کاموں کی انجام دہی کے وقت صبر و شکر کے مضامین پر مشتمل دعائیں تلقین کی گئی ہیں۔ اور اگر انسان اپنی روزمرہ زندگی میں اٹھتے، بیٹھتے چلتے پھرتے ان دعاؤں کو اپنا معمول بنائے تو اسکا ہر مباح کام بھی عبادت بن جاتا ہے۔ یہ دعائیں علامہ جزریؒ کی کتاب حصن حصینؒ اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی ”مناجات قبول“ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ سفر کے وقت کی دعائیں سُبْحَنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا (پاک ہے وہ ذات جس نے اسکو ہمارے لئے مسخر کر دیا) یہ سواری پر بیٹھ کر پڑھنے کی دعا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد روایات میں منقول ہے کہ آپ سواری پر بیٹھتے وقت یہ کلمات پڑھا کرتے تھے اور سوار مچنے کا پورا مستحب طریقہ حضرت علیؓ سے یہ منقول ہے کہ سواری پر پاؤں رکھتے وقت ”بسم اللہ“ کہے، پھر سوار ہو جائیکے بعد ”الحمد للہ“ اور اسکے بعد یہ کلمات سُبْحَنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا سَافِرًا مِّنْ مَّنْقَلِبُونَ تک (قرطبی) نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر آپ کسی سفر پر جا رہے ہوتے تو مذکورہ کلمات کے بعد یہ دعا بھی پڑھتے تھے۔ اللَّهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيفَةُ فِي الْأَهْلِ وَالْمَالِ اللَّهُمَّ ارِنِي أَعُوذُ بِكَ مِنْ وَعَثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمُنْقَلَبِ، وَالْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ وَسُوءِ الْمَنْظَرِ فِي الْأَهْلِ وَالْمَالِ، اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں اللَّهُمَّ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ ظَلَمْتَ نَفْسِي فَاعْفُرْ لِي إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ (قرطبی)

وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِبِينَ (اور ہم تو ایسے نہ تھے جو ان کو قابو میں کر لیتے) یہ بات مشینی سواروں پر بھی اسی طرح صادق آتی ہے جس طرح جانوروں اور چوپایوں پر۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ ان کا خام مواد پیدا نہ کرتا، یا اس میں وہ خواص و آثار نہ رکھتا یا انسانی دماغ کو ان خواص کے دریافت کرنے کی طاقت نہ بخشتا تو ساری کائنات مل کر بھی ایسی سواریاں پیدا نہ کر سکتی تھی۔

وَأَنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ (اور بلاشبہ ہم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں) ان الفاظ کے ذریعہ تعلیم یہ دی گئی ہے کہ انسان کو اپنے ہر ذیوی سفر کے وقت آخرت کا وہ ٹھکانہ سفر یاد کرنا چاہیے جو ہر حال میں پیش آکر رہے گا اور اسے سہولت کیساتھ طے کرنے کے لئے اعمالِ صالحہ کے سوا کوئی سواری نہیں ہوگی۔

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادٍ جُزْءًا، (اور انھوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا جزو ٹھہرایا) یہاں جزو سے مراد اولاد ہے کہ مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے اور اولاد کے بجائے ”جزو“ کا لفظ اختیار کر کے مشرکین کے اس دعوائے باطل کی عقلی تردید کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اللہ کے کوئی اولاد ہو تو وہ اسکی جزد ہوگی کیونکہ بیباپ کا جزد ہوتا ہے اور یہ عقلی قاعدہ ہے کہ ہر کل اپنے وجود میں جزد کا محتاج ہوتا ہے تو اس سے لازم آئیگا کہ معاذ اللہ خدا تعالیٰ بھی اپنی اولاد کا محتاج ہو۔ اور ظاہر ہے کہ کسی بھی قسم کی احتیاج شان خداوندی کے بالکل منافی ہے، اَوْ مَنْ يَنْشُؤْا فِي الْحَلِيَةِ الْخ (کیا جو آرائش میں نشوونما پائے) اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے لئے زیور کا استعمال اور موافق شرع آرائش کے طریقے اختیار کرنا جائز ہے۔ چنانچہ اس پر اجماع ہے لیکن ساتھ ہی پیرائے بیان یہ بتا رہا ہے کہ آرائش میں اتنا اہتمام کہ صبح و شام بناؤ شکھار ہی میں لگی رہے یہ مناسب نہیں بلکہ یہ ضعیف عقل رائے کی علامت بھی ہے اور اس کا سبب بھی۔

وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ، (اور وہ مباحثہ میں قوت بیان بھی نہ رکھے) مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی اکثریت ایسی ہے کہ وہ مافی الضمیر کو قوت اور وضاحت کیساتھ بیان کرنے پر مردوں کے برابر قادر نہیں ہوتی۔ اسی لئے اگر کہیں مباحثہ ہو جائے تو اپنے دعوے کو ثابت کرنا اور دوسرے کے دلائل کو رد کرنا اسکے لئے مشکل ہوتا ہے لیکن یہ حکم اکثریت کے اعتبار سے ہے۔ لہذا اگر کچھ عورتیں سلیقہ گفتار کی مالک ہوں اور اس معاملہ میں مردوں سے بھی بڑھ جائیں تو اس آیت کے منافی نہیں، کیونکہ حکم اکثریت پر لگتا ہے اور اکثریت بلاشبہ ایسی ہی ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لَآبِيْهِ وَقَوْمِهٖ اِنِّىۤ اَبْرَءُ قَوْمًا عٰبِدُوْنَ ۙ اِلٰهَ

اور جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ کو اور اسکی قوم کو میں الگ ہوں ان چیزوں سے جن کو تم پوجتے ہو

الَّذِىۤ اَفْطَرَنِيۡ فَاِنَّہٗ سَيَهْدِيۡنِ ۙ ۲۷ وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَّاقِيَةً فِىۡ

جس نے مجھ کو بنایا سو وہ مجھ کو راہ بھائے گا اور یہی بات پیچھے چھوڑ گیا اپنی

عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۙ ۲۸ بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَہُمْ حَتّٰى

اولاد میں تاکہ وہ رجوع کریں کوئی نہیں پر میں نے برتنے دیا ان کو اور انکے باپ دادوں کو

جَآءَہُمْ الْحَقُّ وَرَسُولٌ مُّبِيۡنٌ ۙ ۲۹ وَلَمَّا جَآءَہُمْ الْحَقُّ قَالُوْۤا

یہاں تک کہ پہنچا انکے پاس دین سچا اور رسول کھول کر سنا دینے والا اور جب پہنچا ان کے پاس سچا دین کہنے لگے

هٰٓذَا سِحْرٌ وَّآثَآءُ كُفْرٍ وَّۤاِنۡ

یہ جادو ہے اور ہم اس کو نہ مانیں گے

خلاصہ تفسیر

اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جبکہ ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے

فرمایا کہ میں اُن چیزوں (کی عبادت) سے بیزار (اور بے تعلق) ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر ہاں (اُس خدا سے تعلق رکھتا ہوں) جس نے مجھ کو پیدا کیا، پھر وہی مجھ کو (میرے دین و دنیا کی صلتوں تک) رہنمائی کرتا ہے (مطلب یہ کہ ان لوگوں کو ابراہیم علیہ السلام کا حال یاد کرنا چاہیے کہ وہ خود بھی توحید کے معتقد تھے) اور (وصیت کے ذریعہ) وہ اُس (عقیدہ) کو اپنی اولاد میں (بھی) ایک قائم رہنے والی بنا کر گئے (یعنی اپنی اولاد کو بھی وصیت کی جسکا اثر کچھ کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک بھی برابر رہا یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت میں بھی عرب میں بعض لوگ شرک سے نفرت کرتے تھے اور یہ وصیت انھوں نے اس لئے کی تھی تاکہ (ہر زمانے میں شرک) لوگ (موحدین سے توحید کا عقیدہ سن سن کر شرک سے) باز آتے رہیں (مگر یہ لوگ پھر بھی باز نہیں آتے اور اس طرف توجہ نہیں کرتے) بلکہ میں (جو) انکو اور ان کے باپ دادوں کو (دنیا کا) خوب سامان دیا ہے (اس میں نہمک اور غافل ہو رہے ہیں) یہاں تک کہ (اسی انہما اور خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے) ان کے پاس سچا قرآن (جو معجز ہو نیکی وجہ سے اپنی سچائی کی آپ ہی دلیل ہے) اور صاف صاف بتائیوالا رسول (اللہ کریم ص) آیا اور جب انکے پاس یہ سچا قرآن پہنچا (اور اسکا اعجاز ظاہر ہوا) تو کہنے لگے کہ یہ جادو ہے اور ہم اسکو نہیں مانتے۔

معارف و مسائل

وَرَدَّ قَالَ رَبُّهُ يَوْمَ ذَاكَ أَنَّهُ مَرَّ فِي آيَاتِ كَذِبٍ فِي بَيْتِ بَارِي تَعَالَى لَمْ يَبَيِّنْ فَرِيَا تَهَا كَمَا مَشَرَكِينَ
عرب کے پاس اپنے شرک پر سوائے اپنے باپ دادوں کی رسوم کے کوئی دلیل نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ واضح عقلی اور نقلی دلائل کی موجودگی میں محض باپ دادوں کی تقلید پر اصرار کرنا حق و انصاف سے کس قدر بعید ہے۔ اب ان آیات میں اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اگر اپنے آباء و اجداد ہی کے رستے پر چلنا چاہتے ہو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رستے پر کیوں نہیں چلتے جو تمھارے اس شرک ترین جدِ اعلیٰ ہیں اور جن کیساتھ نسی و ابستگی کو تم خود اپنے لئے سر پایہ فخر سمجھتے ہو۔ وہ نہ صرف توحید کے قائل تھے اور اپنی اولاد کو بھی اسکی وصیت کر کے گئے بلکہ خود اُن کا طرز عمل یہ بتاتا ہے کہ کھلے ہوئے عقلی اور نقلی دلائل کی موجودگی میں محض باپ دادوں کی تقلید کرنا جائز نہیں، جب وہ دنیا میں مبعوث ہوئے تو اُن کی ساری قوم اپنے آباء و اجداد کی اتباع میں شرک میں مبتلا تھی، لیکن انھوں نے اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید کے بجائے دلائل واضحہ کا اتباع کرتے ہوئے اپنی قوم سے بیزاری کا اظہار کیا اور فرمایا اِنِّيْ بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (جن چیزوں کی عبادت تم کرتے ہو میں اُن سے بری ہوں)۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی بد عمل یا بد عقیدہ گروہ یا جماعت کے درمیان رہتا ہے اور خاموش رہنے کی صورتیں یہ اندیشہ ہے کہ اس کو بھی اس گروہ کا ہم خیال سمجھا جائیگا تو محض اپنے

عقیدے اور عمل کا درست کر لینا ہی کافی نہیں، بلکہ اس گروہ کے عقائد و اعمال سے اپنی برادرت کا اظہار بھی ضروری ہے۔ چنانچہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اپنے عقائد و اعمال کو مشرکین سے عملاً ممتاز کر لیا بلکہ زبان سے بھی برادرت کا برملا اظہار فرمایا۔

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِيْدِهِ (اور وہ اس کو اپنی اولاد میں ایک قائم رہنے والی بات کر گئے) مطلب یہ ہے کہ اپنے عقیدہ توحید کو انھوں نے اپنی ذات ہی تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اپنی اولاد کو بھی اسی عقیدے پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی۔ چنانچہ آپ کی اولاد میں ایک بڑی تعداد موقدین کی ہوئی اور خود مکہ مکرمہ اور اسکے گرد و نواح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تک ایسے سلیم الفطرت حضرات موجود تھے جو صدیاں گزرنے کے بعد بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصلی دین ہی پر قائم رہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی ذات کے علاوہ اپنی اولاد کو دین صحیح پر کار بند کرنے اور رکھنے کی فکر بھی انسان کے فرائض میں داخل ہے۔ انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں بھی قرآن کریم نے بتایا ہے کہ انھوں نے وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو دین صحیح پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی لہذا جس صورت سے ممکن ہو اولاد کے اعمال و اخلاق کی اصلاح میں اپنی پوری کوشش صرف کر دینا ضروری بھی ہے اور انبیاء کی سنت بھی۔ ادویوں تو اولاد کی اصلاح کے بہت سے طریقے ہیں جنہیں حسب موقع اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن حضرت شیخ عبد الوہاب شمرانی رحمۃ اللہ علیہ نے لطائف المنن والاخلاق میں لکھا ہے کہ اولاد کی اصلاح کے لئے سب سے زیادہ کارگر عمل یہ ہے کہ والدین ان کی دینی اصلاح کے لئے دعا کا اہتمام کریں۔ افسوس ہے کہ اس آسان تدبیر سے آجکل غفلت عام ہوتی جا رہی ہے اور اس کے انجام بد کا مشاہدہ خود والدین کرتے رہتے ہیں۔

وَقَالُوا لَا تَزَلْ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (۳۱)

اور کہتے ہیں کیوں نہ اُترا یہ قرآن کسی بڑے مرد پر ان دونوں بستیوں میں سے
أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي

کیا وہ بانٹتے ہیں تیرے رب کی رحمت کو ہم نے بانٹ دی ہے ان میں روزی ان کی
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ
دُنْيَاكَ زِنْدًا كَافِيًا میں اور بلند کر دیئے درجے بعض کے بعض پر کہ ٹھہراتا ہے

بَعْضُهُمْ بَعْضًا سَخِرَ لَّكَ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۳۲)

ایک دوسرے کو خدمتگار اور تیرے رب کی رحمت بہتر ہے ان چیزوں سے جو سمیٹتے ہیں

خلاصہ تفسیر

(یہ تو کافروں نے قرآن کے بارے میں کہا) اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں) کہنے لگے کہ یہ قرآن (اگر کلام الہی ہے اور بحیثیت رسالت آیا ہے تو) ان دونوں بستیوں (یعنی مکہ اور طائف کے رہنے والوں) میں کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا (یعنی رسول کیلئے عظیم الشان ہونا ضروری ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مال اور ریاست نہیں کہتے تو یہ پیغمبر نہیں ہو سکتے۔ باری تعالیٰ انکے اس شبہ کی تردید فرماتے ہیں کہ) کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت (خاصہ یعنی نبوت) کو (خود) تقسیم کرنا چاہتے ہیں (یعنی یہ چاہنا کہ نبوت ہماری رائے کے مطابق لوگوں کو ملنی چاہیے گویا خود تقسیم کر کے ہوس کرنا ہے کہ تقسیم ہمارے سپرد ہو حالانکہ یہ ہوس نری نادانی ہے کیونکہ) دنیوی زندگی میں (تو) انکی روزی ہم (ہی) نے تقسیم کر رکھی ہے اور (اس تقسیم میں) ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے تاکہ (اس سے مصلحت حاصل ہو کہ) ایک دوسرے سے کام لیتا رہے (اور عالم کا انتظام قائم رہے) اور (ظاہر اور یقینی بات ہے کہ) آپ کے رب کی رحمت (خاصہ یعنی نبوت) بدرجہا اس (دنیوی مال و متاع اور جاہ و منصب) سے بہتر ہے جس کو یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں (پس جب دنیوی معیشت کی تقسیم ہونے ان کی رائے پر نہیں رکھی، حالانکہ وہ ادنیٰ درجہ کی چیز ہے، تو نبوت جو خود بھی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے اور اسکے مصالح بھی نہایت عظیم درجہ کے ہیں وہ کیونکر ان کی رائے پر تقسیم کی جاتی)۔

معارف و مسائل

ان آیات میں باری تعالیٰ نے مشرکین عرب کے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کیا کرتے تھے۔ دراصل شرع میں تو وہ یہ باور کرنے پر ہی تیار نہ تھے کہ اللہ کا کوئی رسول انسان ہو سکتا ہے، چنانچہ ان کا یہ اعتراض قرآن کریم نے جا بجا ذکر فرمایا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم رسول کیسے مان لیں جبکہ وہ عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے ہیں، لیکن جب متعدد آیات قرآنی کے ذریعہ یہ واضح کر دیا گیا کہ یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی خصوصیت نہیں، بلکہ دنیا میں جبکہ انبیاء آئے ہیں وہ سب انسان ہی تھے، تو اب انھوں نے پینترا بد لکر یہ اعتراض کیا کہ اگر کسی انسان ہی کو نبوت سونپی تھی تو حضور مالی اعتبار سے کوئی بڑے صاحب حیثیت نہیں ہیں، یہ منصب حضور کے بجائے مکہ اور طائف کے کسی بڑے دولتمند اور صاحب چاہ و منصب انسان کو کیوں نہیں دیا گیا؟ روایات میں ہے کہ اس سلسلہ میں انھوں نے مکہ مکرمہ سے ولید بن مغیرہ اور عقبہ بن ربیعہ کے اور طائف سے عروہ بن مسعود ثقفی حبیب بن عمرو ثقفی یا کنانہ بن عبد یلیل کے نام پیش کئے تھے (روح المعانی)

مشرکین کے اس اعتراض کے باری تعالیٰ نے دو جواب دیئے ہیں۔ پہلا جواب مذکورہ آیتوں میں
دوسری آیت میں اور دوسرا جواب اگلی آیات میں دیا گیا ہے اسکی تشریح بھی وہیں آئے گی۔ اس پہلے
جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ تمہیں اس معاملے میں دخل دینے کا کوئی حق ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نبوت
کا منصب کس کو دے رہا ہے اور کس کو نہیں دے رہا؟ نبوت کی تقسیم تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے کہ کسی
کو نبی بنانے سے پہلے تم سے رائے لی جائے، یہ کام کلیۃً اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہی اپنی عظیم
مصلحتوں کے مطابق اسے انجام دیتا ہے۔ تمہارا وجود اور عقل و شعور اس عظیم کام کی صلاحیت ہی
نہیں رکھتا کہ تقسیم نبوت کا کام تمہارے سپرد کر دیا جاتا اور نبوت کی تقسیم تو بہت اونچے درجہ کی چیز ہے
تمہاری حیثیت وجود و شعور تو اسکی بھی متحمل نہیں کہ خود تمہاری معیشت اور سامان معیشت کی تقسیم کا
کام تمہارے سپرد کیا جاسکے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسا کیا گیا تو تم ایک دن بھی نظام عالم کو نہ چلا سکو
اور سارا نظام درجہ پر ہم ہو کر رہ جائیگا۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے دنیوی زندگی میں تمہاری روزی کی تقسیم بھی
تمہارے ذمہ نہیں رکھی بلکہ تقسیم معیشت کا کام خود اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ جب یہ ادنیٰ درجہ کا کام
تمہارے حوالہ نہیں کیا جاسکتا تو نبوت کی تقسیم جیسا عظیم کام تمہارے حوالہ کیسے کر دیا جائے۔ آیات کا
مقصد و کلام تو اتنا ہی ہے لیکن شرکین کو جواب دینے کے ضمن میں باری تعالیٰ نے دنیا کے نظام معیشت سے
متعلق جو اشارے کر دیئے ہیں ان سے متعدد معاشی اصول مستنبط ہوتے ہیں یہاں انکی مختصر توضیح ضروری ہے۔
تقسیم معیشت کا قدرتی نظام **اِنَّهُمْ قَسَمْنَا لَبَيْنَكُم مِّنْ مَّعِيشَتِكُمْ** (ہم نے تقسیم کیا ہے انکے درمیان انکی معیشت
کو) مقصد یہ ہے کہ ہم نے اپنی حکمت بالغہ سے دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ یہاں ہر شخص اپنی ضروریات
پوری کرنے کے لئے دوسرے کی امداد کا محتاج ہو اور تمام لوگ اسی باہمی احتیاج کے رشتے میں بندھے
ہوئے پورے معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کر رہے ہیں۔ اس آیت نے کھول کر یہ بات بتلا دی ہے کہ
اللہ تعالیٰ نے تقسیم معیشت کا کام (اشتراکیت کی طرح) کسی با اختیار انسانی ادارے کے سپرد نہیں کیا
جو منصوبہ بندی کے ذریعہ یہ طے کرے کہ معاشرے کی ضروریات کیا ہیں؟ انہیں کس طرح پورا کیا جائے
وسائل پیداوار کو کس تناسب کیساتھ کن کاموں میں لگایا جائے اور ان کے درمیان آمدنی کی تقسیم کس
بنیاد پر کی جائے؟ اس کے بجائے یہ تمام کام اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں اور اپنے ہاتھ میں رکھنے کا مطلب
یہی ہے کہ ہر شخص کو دوسرے کا محتاج بنا کر دنیا کا نظام ہی ایسا بنادیا ہے جہیں اگر (اچارہ داروں
وغیرہ کے ذریعہ) غیر فطری رکاوٹیں پیدا نہ کی جائیں تو وہ نظام خود بخود یہ تمام مسائل حل کر دیتا ہے۔
باہمی احتیاج کے اس نظام کو موجودہ معاشی اصطلاح میں ”طلب رسد“ کا نظام کہا جاتا ہے۔
”طلب رسد“ کا قدرتی قانون یہ ہے کہ جس چیز کی رسد کم ہو اور طلب زیادہ اسکی قیمت بڑھتی ہے لہذا
وسائل پیداوار اس چیز کی تیاری میں زیادہ نفع دیکھ کر اسی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور جب رسد

طلب کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے تو قیمت گھٹ جاتی ہے چنانچہ اس چیز کی مزید تیاری نفع بخش نہیں رہتی اور وسائل پیداوار کے بجائے کسی اور ایسے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں جی ضرورت زیادہ ہو۔ اسلام نے طلب رسد کی انہی قدرتی قوتوں کے ذریعہ دولت کی پیدائش اور تقسیم کا کام لیا ہے اور عام حالات میں تقسیم معیشت کا کام کسی انسانی ادارے کے حوالہ نہیں کیا اسکی وجہ یہ ہے کہ منصوبہ بندی کے خواہ کتنے ترقی یافتہ طریقے دریافت کر لئے جائیں لیکن ان کے ذریعہ معیشت کی ایک ایک جزوی ضرورت کا احاطہ ممکن نہیں اور اس قسم کے معاشرتی مسائل عموماً ایسے ہی قدرتی نظام کے تابع چلتے ہیں۔ زندگی کے بیشتر معاشرتی مسائل اسی طرح قدرتی طور پر خود بخود طے پاتے ہیں، اور انہیں حکومت کی منصوبہ بندی کے حوالہ کرنا زندگی میں ایک مصنوعی جکڑ بند پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات کہ دن کا وقت کام کے لئے ہے اور رات کا سونے کے لئے کسی معاہدہ عمرانی یا انسانی منصوبہ بندی کے تحت نہیں طے پائی، بلکہ قدرت کے خود کار نظام نے خود بخود فیصلہ کر دیا ہے، اسی طرح یہ مسئلہ کہ کون شخص کس سے شادی کرے طبعی مناسبتوں کے فطری نظام کے تحت خود بخود انجام پایا ہے اور اسے منصوبہ بندی کے ذریعہ حل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔ یا مثلاً یہ بات کہ کون شخص علم و فن کے کس شعبہ کو اپنا میدان بنائے، اسے طبعی ذوق اور مناسبت کے بجائے حکومت کی منصوبہ بندی کے حوالہ کر دینا ایک خواہ مخواہ کی زبردستی ہے اور اس سے نظام فطرت درہم برہم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح نظام معیشت کو بھی قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا اور ہر شخص کے دل میں وہی کام ڈال دیا ہے جو اسکے لئے زیادہ مناسب ہے اور جسے وہ بہت طریقے سے انجام دے سکتا ہے چنانچہ ہر شخص خواہ وہ ایک خاکروب ہی کیوں نہ ہو اپنے کام پر خوش ہے اور اسی کو اپنے لئے سرمایہ فخر سمجھتا ہے کل جزئہ مما لک یحمد فیرحون، البتہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح اسلام نے افراد کو اتنی آزادی نہیں دی کہ وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت سمیٹ کر دوسروں کے لئے رزق کے دروازے بند کر دیں، بلکہ ذرائع آمدنی میں حلال و حرام کی تفریق کر کے سود، سٹہ، قمار اور ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دیدیا ہے پھر جائز آمدنی پر بھی زکوٰۃ، عشر وغیرہ کے واجبات عائد کر کے ان خرابیوں کا انسداد کر دیا، جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں پائی جاتی ہیں اسکے باوجود بھی اگر کبھی اجارہ داری قائم ہو جائیں تو ان کو توڑنے کے لئے حکومت کی مداخلت کو جائز رکھا ہے یہاں اسکی تفصیل کا موقع نہیں، اس موضوع پر احقر کے مستقل رسائل ”مسئلہ سود“ اسلام کا نظام تقسیم دولت اور ”اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات“ ملاحظہ فرمائے جائیں۔

معاشی مساوات کی حقیقت | وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ (اور ہم نے ایک کو

دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے) اس سے معلوم ہوا کہ معاشی مساوات (اس معنی میں کہ دنیا کے تمام افراد کی آمدنی بالکل برابر ہو) نہ مطلوب ہے نہ ممکن فعل۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے ہر رکن پر کچھ فرائض عائد کئے ہیں اور کچھ حقوق دیئے ہیں اور دونوں میں اپنی حکمت سے یہ تناسب کھایا کہ جسکے ذمہ جتنے فرائض ہیں اسکے اتنے ہی حقوق ہیں۔ انسان کے علاوہ جتنی مخلوقات ہیں ان کے ذمہ چونکہ فرائض سب سے کم ہیں کہ وہ شرعاً حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے مکلف نہیں ہیں اسلئے ان کے حقوق بھی سب سے کم ہیں چنانچہ انسان کو ان کے معاملہ میں وسیع آزادی عطا کی گئی ہے کہ وہ ان سے چند معمولی سی یا بند یوں کیساتھ جس طرح چاہے نفع اٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ بعض حیوانات کو وہ کاٹ کر کھاتا ہے بعض پر سواری کرتا ہے، بعض مخلوقات کو پامال کرتا ہے مگر اسے ان مخلوقات کی حق تلفی نہیں سمجھا جاتا۔ اسلئے کہ ان مخلوقات پر چونکہ فرائض کم ہیں اسلئے ان کے حقوق بھی بہت کم ہیں۔ پھر کائنات میں سب سے زیادہ فرائض انسان اور جنات پر عائد کئے گئے ہیں کہ وہ اپنے ہر قول و فعل اور ہر نقل و حرکت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہیں اور اگر اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کریں تو آخرت کے عذاب کے مستحق ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ نے انسان اور جنات کو حقوق بھی دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عطا کئے ہیں۔ پھر انسانوں میں بھی یہ لحاظ ہے کہ جس کی ذمہ داری اور فرائض دوسروں سے زیادہ ہیں، اسکے حقوق بھی زائد ہیں۔ انسانوں میں سب سے زیادہ ذمہ داری انبیاء علیہم السلام پر ہوتی ہے، چنانچہ ان کو بہت سے حقوق بھی دوسروں سے زائد عطا کئے گئے ہیں۔

نظام معیشت میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی رعایت رکھی ہے کہ ہر شخص کو اتنے معاشی حقوق دیئے جائیں جتنے فرائض کی ذمہ داری وہ اپنے سر لے، اور ظاہر ہے کہ فرائض میں یکسانیت کا پیدا ہونا بالکل ناممکن اور ان میں تفاوت ناگزیر ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہر شخص کے معاشی وظائف و فرائض دوسروں سے بالکل مساوی ہوں اسلئے کہ معاشی وظائف و فرائض انسانوں کی فطری صلاحیتوں پر موقوف ہیں جنہیں جسمانی طاقت، صحت، دماغی قوی اور عمر، ذہنی معیار، چستی اور پھرتی جیسی چیزیں داخل ہیں اور یہ بات ہر شخص کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے کہ ان اوصاف کے اعتبار سے انسانوں میں یکسانیت اور مساوات پیدا کرنا بڑی سے بڑی ترقی یافتہ اشتراکی حکومت کے بس میں بھی نہیں، جب انسانوں کی صلاحیتوں میں تفاوت ناگزیر ہے تو ان کے فرائض میں بھی لازماً تفاوت ہوگا اور معاشی حقوق چونکہ انہی فرائض پر موقوف ہیں اسلئے معاشی حقوق یعنی آمدنی میں بھی تفاوت ناگزیر ہے کیونکہ اگر سب کی آمدنی بالکل مساوی کر دی جائے اور فرائض میں تفاوت رہے تو اس سے کبھی عدل و انصاف قائم نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ اس صورت میں بعض لوگوں کی آمدنی ان کے فرائض سے زیادہ اور بعض کی ان کے فرائض سے کم ہو جائے گی جو صریح نا انصافی ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ آمدنی میں مکمل مساوات

کسی بھی دور میں قرین انصاف نہیں ہو سکتی لہذا اشتراکیت اپنی ترقی کے انتہائی دور (مکمل کمیونزم) میں بھی جس مساوات کا دعویٰ کرتی ہے وہ کسی بھی حال میں نہ قابل عمل ہے اور نہ قرین عدل انصاف۔ البتہ یہ طے کرنا کہ کس کے فرائض زیادہ اور کس کے کم ہیں، اور ان کی مناسبت سے اسے کتنے حقوق ملنے چاہئیں ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے اور انسان کے پاس کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے جس سے وہ اس بات کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکے۔ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک ماہر اور تجربہ کار انجینئر نے ایک گھنٹہ میں اتنی آمدنی حاصل کر لی ہے جو ایک غیر ہنرمند مزدور نے دن بھر منوں مٹی ڈھوکہ بھی حاصل نہیں کی، لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو قطع نظر اس سے کہ مزدور کی دن بھر کی آزاد محنت ذمہ داری کے اُس بوجھ کے برابر نہیں ہو سکتی جو انجینئر نے اٹھا رکھا ہے۔ انجینئر کی یہ آمدنی صرف اُس ایک گھنٹہ کی محنت کا صلہ نہیں بلکہ اس میں سالہا سال کی اس دماغ سوزی، عرق ریزی اور جانفشانی کے صلے کا ایک حصہ بھی شامل ہے جو اُس نے انجینئرنگ کی تعلیم و تربیت اور پھر اس میں تجربہ و مہارت حاصل کرنے میں برداشت کی ہے۔ اشتراکیت نے اپنے ابتدائی دور میں آمدنی کے اس تفاوت کو تسلیم تو کر لیا ہے چنانچہ تمام اشتراکی ممالک میں آبادی کے مختلف طبقات کے درمیان تنخواہوں کا زبردست تفاوت پایا جاتا ہے لیکن ٹھوکر پھاں کھائی ہے کہ تمام وسائل پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دیکر وسائل کے لئے فرائض کا تعین اور پھر ان کی مناسبت سے ان پر آمدنی کی تقسیم بھی تمام تر حکومت ہی کے حوالہ کر دی ہے۔ حالانکہ جیسا اوپر عرض کیا گیا فرائض اور حقوق کے درمیان تناسب باقی رکھنے کے لئے انسان کے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے چنانچہ اشتراکیت کے طریق کار کے تحت ملک بھر کے انسانوں کی روزی کا تعین حکومت کے چند کارندوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے اور انھیں یہ اختیار مل گیا ہے کہ جس شخص کو جتنا چاہیں دیں، جتنا چاہیں روک لیں۔ اڈل تو اس میں بددیانتیوں اور اقربا و اقاربوں کو ایک بڑا میدان مل جاتا ہے جس کے سہارے افسر شاہی پھلتی پھولتی ہے، دوسرے اگر حکومت کے تمام کارندوں کو فرشتہ بھی تصور کر لیا جائے اور وہ فی الواقعہ یہی چاہیں کہ ملک میں آمدنی کی تقسیم حق و انصاف کی بنیاد پر ہو تو ان کے پاس آخر وہ کونسا پیمانہ ہے جس سے وہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ ایک انجینئر اور ایک مزدور کے فرائض میں کتنا تفاوت ہے اور اس کی نسبت سے ان کی آمدنیوں میں کتنا تفاوت قرین انصاف ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس بات کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ انسانی عقل کے ادراک سے قطعی ماوراء ہے اسی لئے اسے قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ آیت زیر بحث وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ

۱۔ اشتراکیت کا کہنا یہ ہے کہ فی الحال تو آمدنی کی مکمل مساوات ممکن نہیں لیکن اگر اشتراکیت کے ابتدائی ہولوں پر عمل کیا جاتا ہے تو ایک وقت ایسا آجائے گا جب آمدنی میں مکمل مساویا ممالک میں مکمل اشتراک پیدا ہو جائیگا اور یہ مکمل کمیونزم کا دور ہوگا۔

میں اللہ تعالیٰ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس تفاوت کا تعین ہم نے انسانوں کے حوالہ کرنے کے بجائے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اپنے ہاتھ میں رکھنے کا مطلب یہاں بھی یہی ہے کہ دنیا میں ہر شخص کی ضروریات دوسرے کے ساتھ وابستہ کر کے نظام ایسا بنا دیا ہے کہ ہر شخص اپنی حاجت پوری کرنے کے لئے دوسرے کو اتنا دینے پر مجبور ہے جتنے کا وہ مستحق ہے۔ یہاں بھی باہمی احتیاج پر مبنی طلب و رسد کا نظام ہر شخص کی آمدنی کا تعین کرتا ہے، یعنی ہر شخص اس بات کا فیصلہ خود کرتا ہے کہ جتنے فرائض میں نے اپنے ذمہ لئے ہیں ان کا کتنا معاوضہ میرے لئے کافی ہے اس سے کم ملے تو یہ کام کرنے پر راضی نہ ہو اور یہ زیادہ مانگنے لگے تو کام لینے والا اس سے کام نہ لے لے لیتے ہیں۔ بعض سخیوں کا یہی مطلب ہے کہ ہم نے آمدنی میں تفاوت اس لئے رکھا ہے تاکہ ایک شخص دوسرے سے کام لے سکے ورنہ سب کی آمدنی برابر ہوتی تو کوئی کسی کے کام نہ آتا۔

ہاں البتہ بعض غیر معمولی حالات میں بڑے بڑے سرمایہ دار طلب و رسد کے اس قدر قوی نظام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر غریبوں کو اس بات پر مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے حقیقی استحقاق سے کم اجرت پر کام کریں۔ اسلام نے اول تو حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے وسیع احکام کے ذریعہ نیز اخلاقی ہدایات اور تصورِ آخرت کے ذریعہ ایسی صورت حال کو پیدا ہونے سے روکا ہے، اور اگر کبھی کسی مقام پر یہ صورت پیدا ہو جائے تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار دیدیا ہے کہ ان غیر معمولی حالات کی حد تک وہ اجرتوں کا تعین کر سکتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف غیر معمولی حالات کے لئے ہے اسلئے اس مقصد کے لئے تمام وسائل پیداوار کو حکومت کے حوالہ کر دینے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اسکے نقصانات فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔

اسلامی مساوات کا مطلب | مذکورہ بالا اشارات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آمدنی میں مکمل مساوات نہ عدل و انصاف کا تقاضا ہے، نہ عملاً کہیں قائم ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے، اور نہ یہ اسلام کو مطلوب ہے۔ البتہ اسلام نے جس مساوات کو قائم کیا ہے وہ قانون، معاشرت اور دائرے حقوق کی مساوات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا قدرتی طریق کار کے تحت جس شخص کے جتنے حقوق متعین ہو جائیں انھیں حاصل کرنے کے قانونی، تمدنی اور معاشرتی حق میں سب برابر ہیں اس بات کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ ایک امیر یا صاحب جاہ و منصب انسان اپنا حق عزت کیسا سمجھتا یا کسائی چال کر لے اور غریب کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے دربدار کی ٹھوکریں کھانی پڑیں اور ذلیل و حقیر ہونا پڑے۔ قانون امیر کے حقوق کی حفاظت کرے اور غریب کو بے یار و مددگار چھوڑ دے، اسی کو حضرت ابو صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:

واللہ ما عندی اقویٰ من الضعیف حتیٰ اخذ الحق له ولا عندی اضعف من

القویٰ حتیٰ اخذ الحق منه“ خدا کی قسم میرے نزدیک ایک کمزور آدمی سے زیادہ قوی کوئی نہیں تا وقتیکہ میں اسکا حق اسے دلوں اور میرے نزدیک ایک قوی آدمی سے زیادہ کمزور کوئی نہیں، جب تک کہ میں اس سے (کمزور کا) حق وصول نہ کر لوں۔“

اسی طرح ٹھیکہ معاشی نقطہ نظر سے اسلامی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں ہر شخص کو کمائی کے یکساں مواقع حاصل ہیں اور اسلام اس بات کو گوارہ نہیں کرتا کہ چند بڑے بڑے دولت مند دولت کے دہانوں پر قابض ہو کر اپنی اجارہ داریاں قائم کر لیں اور چھوٹے تاجروں کے لئے بازار میں بیٹھنا دو بھر بنادیں۔ چنانچہ سود، سٹہ، قمار، ذخیرہ اندوزی اور اجارہ دارانہ تجارتی معاہدوں کو ممنوع قرار دیکر، نیز زکوٰۃ، عشر، خراج، نفقات، صدقات اور دوسرے واجبات عائد کر کے ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا ہے جس میں ہر انسان اپنی ذاتی صلاحیت، محنت اور سرمایہ کے تناسب سے کمائی کے مناسب مواقع حاصل کر سکتا ہے اور اس سے ایک خوشحال معاشرے کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ اسکے باوجود آدمی کا جو تفاوت باقی رہے وہ درحقیقت ناگزیر ہے اور جس طرح انسانوں کے درمیان حسن و جمال، قوت و صحت، عقل و ذہانت اور آل و اولاد کے تفاوت کو مٹانا ممکن نہیں، اسی طرح اس تفاوت کو بھی مٹایا نہیں جاسکتا۔

وَلَوْلَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ حُمْلًا

اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سب لوگ ہو جائیں ایک دین پر تو ہم دیتے اُن لوگوں کو جو منکر ہیں رحمن سے

لِيُؤْتِيَهُمْ سُقْفًا مِّنْ فَضْلِهِ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ ﴿٣٣﴾ وَلِيُؤْتِيَهُمْ

اُن کے گھروں کے واسطے چھت چاندی کی اور سیڑھیاں جن پر چڑھیں اور اُن کے گھروں کے

اَبْوَابًا وَسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَكُونُونَ ﴿٣٤﴾ وَزُخْرَفًا وَّانْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا

واسطے دروازے اور تخت جن پر تکیہ لگا کر بیٹھیں اور سونے کے اور یہ سب کچھ نہیں ہے مگر

مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٣٥﴾

دنیا کی زندگی کا، اور آخرت تیرے رب کے یہاں اُنہی کے لئے ہے جو ڈرتے ہیں

خلاصہ تفسیر

(اور یہ کافر لوگ مال و دولت کی زیادتی کو نبوت کی صلاحیت کی شرط سمجھتے ہیں حالانکہ نبوت ایک عظیم الشان چیز ہے اس لئے اس کی صلاحیت کی شرط بھی عظیم الشان ہونی چاہیے) اور (دنیا کی دولت و جاہ ہمارے نزدیک اس قدر حقیر ہے کہ) اگر یہ بات (متوقع) نہ ہوتی کہ (قریب

قریب) تمام آدمی ایک ہی طریقہ کے ہو جاویں گے (یعنی کافر ہو جائیں گے) تو جو لوگ خدا کیساتھ کفر کرتے ہیں (اور خدا کے نزدیک سخت مبغوض ہیں) ہم ان (سب) کے لئے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی (چاندی کے کر دیتے) جن پر چڑھا (اُترا) کرتے اور ان کے گھروں کے کواڑ بھی (چاندی کے کر دیتے) اور تخت بھی (چاندی کے کر دیتے) جن پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں اور (یہی چیزیں) سونے کی بھی (کر دیتے) یعنی کچھ چاندی کی کچھ سونے کی۔ مگر یہ سامان سب کفار کو اس لئے نہیں دیا کہ اکثر انسانوں کی طبیعت میں مال و متاع کی حرص غالب ہے اور اس مفروضہ صورت میں کفر اس مال و متاع کے حصول کا یقینی سبب بن جاتا، پس چند تھوڑے سے آدمیوں کو چھوڑ کر قریب قریب بھی کفر اختیار کر لیتے، اس لئے ہم نے تمام کافروں کو مال و دولت کی یہ وسعت نہیں دی، ورنہ اگر مصلحت نہ ہوتی تو ہم ایسا ہی کرتے اور ظاہر ہے کہ دشمن کو قدر و وسعت کی چیز نہیں دیا کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی مال متاع حقیقت میں کوئی عظیم الشان چیز نہیں، پس وہ نبوت جیسے منصب عظیم کے لئے صلاحیت کی شرط بھی نہیں ہوتی سکے بجائے نبوت کی شرط وہ اعلیٰ درجہ کے ملکات ہیں جو اللہ کی طرف سے انبیاء کو عطا ہوتے ہیں اور یہ ملکات محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پوری طرح جمع ہیں، پس نبوت ان ہی کے لئے زیبا تھی نہ کہ مکہ اور طائف کے رسیوں کے لئے) اور (حقارت دنیا کی ایک بالکل ظاہر وجہ بیان فرماتے ہیں کہ) یہ سب (ساز و سامان جسکا اوپر ذکر ہوا) کچھ بھی نہیں، صرف دنیوی زندگی کی چند روزہ کامرانی ہے (پھر فنا آفرینا) اور آخرت (جو ابدی ہے اور اس لئے اس سے بہتر ہے وہ) آپ کے پروردگار کے ہاں خدا ترسوں کے لئے ہے۔

معارف و مسائل

مال دولت کی زیادتی فضیلت کا سبب نہیں ہے [کفار نے جو یہ کہا تھا کہ مکہ اور طائف کے کسی بڑے مالدار کو نبی کیوں نہ بنا دیا گیا؟ ان آیات میں اسکا دو سرا جواب دیا گیا ہے اور اسکا خلاصہ یہ ہے کہ بیشک نبوت کے لئے کچھ شرائط صلاحیت کا پایا جانا ضروری ہے لیکن مال و دولت کی زیادتی کی بناء پر کسی کو نبوت نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ مال و دولت ہماری نگاہ میں اتنی حقیر چیز ہے کہ اگر تمام لوگوں کے کافر بن جائیں گا اندیشہ نہوتا تو ہم سب کافروں پر سونے چاندی کی بارش کر دیتے اور صحیح زندگی کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لو کانک الدنیا تعدل عند اللہ جنتہ بعوضۃ ماسقی کافراً منھا شرب ماء د یعنی اگر دنیا اللہ کے نزدیک مجھ کے ایک پر کے برابر بھی درجہ رکھتی تو اللہ تعالیٰ کسی کافر کو اس سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیتا) اس سے معلوم ہوا کہ نہ مال و دولت کی زیادتی کوئی فضیلت کی چیز ہے نہ اس کی کمی انسان کے کم رتبہ ہونے کی علامت ہے۔ البتہ نبوت کے لئے کچھ اعلیٰ درجہ کے اوصاف ضروری ہیں وہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں، اسلئے یہ اعتراض بالکل لغو اور باطل ہے۔

اور مذکورہ آیات میں یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر کافروں پر مال و دولت کی اتنی فراوانی کر دی جاتی تو سب لوگ کافر ہو جاتے، اس میں مراد لوگوں کی بھاری اکثریت ہے ورنہ اللہ کے کچھ نیک بندے آج بھی ایسے موجود ہیں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ کفر اختیار کر کے وہ مال و دولت سے نہال ہو سکتے ہیں، لیکن وہ مال و دولت کی خاطر کفر کو اختیار نہیں کرتے ایسے کچھ لوگ شاید اس وقت بھی ایمان پر قائم رہ جاتے لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی۔

وَمَنْ يَعْشْ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ﴿۳۶﴾

اور جو کوئی آنکھیں پڑائے رحمن کی یاد سے ہم اس پر مقرر کر دیں ایک شیطان پھر وہ رہے اسکا ساتھی

وَأَنَّهُمْ لَيَصْدُوْنَ عَنْ السَّبِيلِ وَيُحْسِبُوْنَ أَنَّهُمْ مُّهْتَدُونَ ﴿۳۷﴾

اور وہ ان کو روکتے رہتے ہیں راہ سے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہ پر ہیں

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَنَا قَالَ يَلَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ

یہاں تک کہ جب آئے ہمارے پاس کہے کسی طرح مجھ میں اور تجھ میں فرق ہو مشرق مغرب کا سا

فَبُئْسَ الْقَرِينُ ﴿۳۸﴾ وَلَنْ يَنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ إِذْ ظَلَمْتُمْ أَنَّكُمْ

کہ کیا بُرا ساتھی ہے اور کچھ فائدہ نہیں تم کو آج کے دن جبکہ تم ظالم ٹھہریکے اس بات سے

فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿۳۹﴾ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ أَوْ تَهْدِي

کہ تم عذاب میں شامل ہو سو کیا تو سنائے گا بہروں کو یا سمجھائے گا

الْعُمَىٰ وَمَنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۴۰﴾ فَإِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ

اندھوں کو اور صریح غلطی میں بھٹکتوں کو پھر اگر کبھی ہم تجھ کو یہاں سے

فَأَنَّا مِنْهُمْ مُّنتَقِمُونَ ﴿۴۱﴾ أَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ فَإِنَّا

لے جائیں تو ہم کو ان سے بدلہ لینا ہے یا تجھ کو دکھا دیں جو ان سے وعدہ ٹھہرایا ہے تو یہ

عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُونَ ﴿۴۲﴾ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ

ہمارے بس میں ہیں سو تو مضبوط پکڑے وہ اُسی کو جو تجھ کو حکم پہنچا

إِنَّكَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۴۳﴾ وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ

تو ہے بیشک سیدھی راہ پر اور یہ مذکور رہے گا تیرا اور تیری قوم کا اور آگے تم سے

تُسْأَلُونَ ﴿۴۴﴾ وَسَأَلَ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا

پوچھ ہوگی اور پوچھ دیکھ جو رسول بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے کبھی ہم نے رکھے ہیں

مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ إِلَهًا يُعْبَدُونَ ﴿۴۵﴾

رحمن کے سوائے اور حاکم کہ پوچھے جائیں

خلاصہ تفسیر

اور جو شخص اللہ کی نصیحت (یعنی قرآن اور وحی) سے (جان بوجھ کر) اندھا بن جائے (جیسے یہ کفار ہیں کہ کافی شافی دلائل کہہ رہے ہوتے ہوئے تجاہل سے کام لیتے ہیں) ہم اُس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، سو وہ (ہر وقت) اس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ (ساتھ رہنے والے شیاطین) ان (قرآن سے اعراض کرنے والوں) کو (برابر) (راہِ حق) سے رکتے رہتے ہیں (اور تسلط کا یہی اثر ہے) اور یہ لوگ (باوجود راہِ حق سے دُور ہونے کے) یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ہم) راہِ (راست) پر ہیں (سو جس کی گمراہی کی یہ صورت اور یہ حالت ہوا کے راہ پر آنے کی کیا امید ہے۔ سو غم کیوں کیا جائے اور یہ بھی تسلی رکھے کہ ان کا یہ تغافل جلدی ہی ختم ہو گا اور جلدی ہی ان کو اپنی غلطی ظاہر ہو جائے گی کیونکہ یہ تغافل صرف دُنیا ہی دُنیا تک ہے) یہاں تک کہ جب ایسا شخص ہمارے پاس آویگا (اور اس کی غلطی ظاہر ہوگی) تو (اُس شیطانِ قرین سے) کہے گا کہ کاش میرے اور تیرے درمیان میں (دُنیا میں) مشرق و مغرب کے برابر فاصلہ ہوتا (کیوں) کہ تو تو (بُرا) ساتھی تھا کہ تو نے مجھ کو گمراہ کیا، مگر حیرتِ اس وقت کام نہ آئے گی، اور (نیز ان سے کہا جائیگا کہ) جبکہ تم (دُنیا میں) کفر کر چکے تھے تو (جس طرح آج حسرت تمہارے کام نہیں آئی اُسی طرح) آج یہ بات (بھی) تمہارے کام نہ آو گی کہ تم (اور شیاطین) سب عذاب میں شریک ہو (جیسے دُنیا میں بعض اوقات دوسرے کو شریکِ مصیبت دیکھ کر ایک گونہ تسلی ہو جاتی ہے وہاں چونکہ عذاب بہت زیادہ شدید ہو گا اسلئے دوسرے کی طرف التفات بھی نہ ہو گا، ہر شخص اپنے حال میں مبتلا ہو گا اور اپنے ہی کور سے زیادہ مبتلا سمجھے گا) سو (آپ کو جب انکی یہ حالت معلوم ہو گئی کہ انکی ہدایت کی کوئی امید نہیں تو) کیا آپ (ایسے) بہروں کو سنا سکتے ہیں یا (ایسے) اندھوں کو اور ان لوگوں کو جو کہ صریح گمراہی میں (مبتلا) ہیں راہ پر لا سکتے ہیں (یعنی انکی ہدایت آپ کے اختیار سے خارج ہے آپ درپے نہیں) پھر (انکی یہ سرکشی غالی جانے والی نہیں، بلکہ اس پر ضرور سزا مرتب ہوئی ہے خواہ آپکی حیات میں ہو خواہ آپکی وفات کے بعد ہو، پس) اگر ہم (دُنیا سے) آپ کو اٹھالیں تو بھی ہم ان (کافروں) سے بدلہ لینے والے ہیں یا اگر ان سے جو ہم نے عذاب کا وعدہ کر رکھا ہے وہ (آپ کی حیات میں ان پر نازل کر کے) آپ کو (بھی) دکھلا دیں تب بھی (کچھ بعید نہیں کیونکہ) ہم کو ان پر ہر طرح کی قدرت ہے (مطلب یہ کہ عذاب ضرور ہو گا خواہ کب ہی ہو اور جب یہ باتیں تو آپ تسلی رکھنے اور اطمینان سے) اُس قرآن پر قائم رہئے جو آپ پر وحی کے ذریعہ سے نازل کیا گیا ہے (کیونکہ) آپ بیشک سیدھے رستہ پر ہیں (مطلب یہ کہ اپنا کام کئے جائیے اور دوسروں کے کام کا غم نہ کیجئے) اور یہ قرآن (جس پر قائم رہنے کو ہم کہتے ہیں) آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے بڑے شرف کی چیز ہے (آپ کے لئے تو اس لئے کہ آپ بلا واسطہ مخاطب ہیں اور قوم کے لئے اس واسطے کہ وہ بالواسطہ مخاطب ہیں، عام بادشاہوں سے ہم کلامی بڑا شرف سمجھی جاتی ہے چہ جائیکہ ملکِ ملکوں کا مخاطب

بننا، اور عنقریب (قیامت کے دن) تم سب (اپنے اپنے ذمہ کے واجب حقوق سے) پوچھے جاؤ گے، (پس آپ سے صرف تبلیغ کے متعلق سوال ہوگا جس کو آپ خوب ادا کر چکے ہیں اور عمل کے متعلق اُن سے سوال ہوگا، پس جب آپ سے ان کے اعمال کے بارے میں باز پرس نہ ہوگی تو آپ غم کیوں کرتے ہیں) اور (ہمنے جو آپ پر نازل ہونے والی وحی کو حق قرار دیا ہے اس میں کفار کو سب سے بڑا اعتراض عقیدہ توحید پر ہے جس کے حق ہونے میں ان کو بڑا کلام ہے، سو درحقیقت وہ ایسا امر حق ہے کہ اس پر تمام انبیاء علیہم السلام کا اجماع ہے اور چونکہ انبیاء عقلی و نقلی دلائل کے جامع ہیں اسلئے گویا اُس پر ہزاروں عقلی و نقلی دلائل قائم ہیں، چنانچہ اگر آپ کا جی چاہے تو آپ اُن سب پیغمبروں سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے پوچھ لیجئے (یعنی اُن کی کتابوں اور صحیفوں سے جن کا کچھ بقیہ موجود ہے، تحقیق کر لیجئے) کہ کیا ہم نے خدائے رحمان کے سوا (کبھی بھی) دوسرے معبود ٹھہرا دیئے تھے کہ ان کی عبادت کی جاوے (اس سے دوسرے کو سنا نامستور ہے کہ جس کا جی چاہے تحقیق کر لے اور کتابوں میں دیکھنے کو رسولوں سے پوچھنا مجاز اکہدیا)

معارف و مسائل

یا خدائے اعراض بُری صحبت کا سبب ہے | وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ اِنْهُم مُّطْلَبٌ بِهٖ يَكْفُرُ
اللہ کی نصیحت یعنی قرآن اور وحی سے جان بوجھ کر اعراض کرے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو دنیا میں بھی اسکے ساتھ لگا رہتا ہے اور اسے نیکیوں سے روک کر بُرائیوں پر ابھارتا رہتا ہے اور آخرت میں بھی جب یہ شخص قبر سے اٹھے گا تو یہ شیطان اس کے ساتھ ساتھ ہوگا یہاں تک کہ دونوں جہنم میں داخل ہو جائیں (قرطبی) اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی یاد سے اعراض کی اتنی سزا دینا ہی میں مل جاتی ہے کہ انسان کی صحبت خراب ہو جاتی ہے اور شیاطین، خواہ انسانوں میں سے ہوں یا جنات میں سے، اس کو بھلائیوں سے دُور اور بُرائیوں سے قریب کرتے رہتے ہیں وہ کام سارے گمراہی کے کرتا ہے مگر سمجھتا یہ ہے کہ بہت اچھا کر رہا ہے (قرطبی) اور یہاں جس شیطان کو مسلط کرنے کا ذکر ہے وہ اس شیطان کے علاوہ ہے جو ہر مومن و کافر کے ساتھ لگایا گیا ہے کیونکہ وہ مومن سے خاص اوقات میں ہٹ بھی جاتا، اور یہ ہمیشہ ساتھ لگا رہے گا (بیان القرآن)

وَلَا يَنْفَعُكُمْ الْيَوْمَ اِنْ تَدْعُوْنَ اِلٰہَ سِوَا اللّٰہِ اِنَّکُمْ فِی الْعَذَابِ اَنْتُمْ اَنْتُمْ
ثابت ہو چکا ہے تو آخرت میں تمہاری یہ تمنا کچھ کام نہ آئے گی کہ کاش، یہ شیطان مجھ سے دُور ہوتا کیونکہ اس وقت تم سب عذاب میں شریک ہو گے اس صورت میں اِنْتُمْ فِی الْعَذَابِ اَنْتُمْ اَنْتُمْ کے معنی میں ہوگا اور ینفع کی ضمیر فاعل مقولہ کیا کُنْتَ بکنیٰ اِنْ تَدْعُوْا اِلٰہَ سِوَا اللّٰہِ کی طرف راجع ہوگی۔
اور دوسری تفسیر یہ ممکن ہے کہ وہاں پہنچنے کے بعد تمہارا اور شیاطین کا عذاب میں شریک

ہونا اتھارے لئے چنداں فائدہ مند نہیں ہوگا۔ دنیا میں بیشک ایسا ہوتا ہے کہ ایک مصیبت میں چند آدمی شریک ہو جائیں تو ہر ایک کا غم بھکا ہو جاتا ہے لیکن وہاں چونکہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی اور کوئی کسی کا دکھ نہیں بٹا سکے گا اسلئے اس اشتراک سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، اس صورتیں انکم لہ ینفع کا فاعل ہوگا۔

نیک شہرت بھی دین میں پسندیدہ ہے [وَلَا تَكُنْ مِنَ الْكَافِرِينَ] (اور یہ قرآن آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے بڑے شرف کی چیز ہے) ”ذکر“ سے یہاں مراد نیک ناموری ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم آپ کے اور آپ کی قوم کے لئے شرف عظیم اور نیک شہرت کا باعث ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ نیک شہرت ایک قابل رغبت چیز ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں اسکو ایک احسان کے طور پر ذکر فرمایا ہے اور اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی تھی کہ وَجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ (تفسیر کبیر) لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نیک شہرت اسوقت مستحسن ہے جب وہ مقصد زندگی بنائے بغیر انسان کے اعمالِ صالحہ سے خود بخود حاصل ہو جائے اور اگر انسان نیکی صرف اسی مقصد سے کرے کہ ان سے دنیا میں نام ہوگا تو یہ ”ریا“ ہے جس سے نیکیوں کا سارا فائدہ جاتا رہتا ہے اور اٹا گناہ لازم ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں ”آپ کی قوم“ سے مراد بعض مفسرین نے صرف قبیلہ قریش کو قرار دیا ہے اور اس سے قریش کی فضیلت ثابت کی ہے لیکن علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد آپ کی پوری امت ہے خواہ کسی رنگ نسل سے تعلق رکھتی ہو۔ قرآن کریم اُن سب کے لئے عظمت و شرف اور نیک ناموری کا باعث ہے (قرطبی)

وَسْئَلُ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا، (آپ ان سب پیغمبروں سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے پوچھ لیجئے) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام تو وفات پا چکے، اُن سے پوچھنے کا حکم کیسے دیا جا رہا ہے؟ اسکا جواب بعض مفسرین نے تو یہ دیا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی معجزہ کے طور پر سابقہ انبیاء علیہم السلام سے آپ کی ملاقات کرا دے تو اسوقت اُن سے یہ بات پوچھ لیجئے چنانچہ شبِ معراج میں آپ کی ملاقات تمام انبیاء سے ہوئی اور علامہ قرطبی نے بعض روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انبیاء علیہم السلام کی امامت کر نیچے بعد اُن سے یہی بات پوچھی تھی لیکن ان روایات کی سند میں معلوم نہیں ہو سکی چنانچہ اکثر مفسرین نے آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ خود انبیاء علیہم السلام سے پوچھنا مراد نہیں بلکہ اُن پر نازل ہونے والوں صحیفوں سے تحقیق کرنا اور اُن کی امتوں کے علماء سے پوچھنا مراد ہے۔ چنانچہ انبیاء بنی اسرائیل کے جو صحیفے اب موجود ہیں ان میں بہت سی تحریفات کے باوجود توحید کی تعلیم اور شرک سے بیزاری کی تعلیم آج تک شامل ہے مثال کے طور پر موجودہ بائبل کی درج ذیل عبارتیں ملاحظہ فرمائیے۔

انبیاء کے صحیفوں میں توحید کی تعلیم | موجودہ تورات میں ہے :-

”تاکہ توجہ نہ لے کہ خداوند ہی خدا ہے اور اسکے سوا کوئی ہے ہی نہیں“ (استثنا ۳: ۳۵)

اور، ”سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خدا ہے“ (استثنا ۶: ۴)

اور حضرت اشعیا علیہ السلام کے صحیفہ میں ہے :-

”میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں، میرے سوا کوئی خدا نہیں، تاکہ مشرق سے مغرب تک گت جان لیں

کہ میرے سوا کوئی نہیں، میں ہی خداوند ہوں، میرے سوا کوئی دوسرا نہیں“ (یسعیاہ ۴۵: ۶)

اور حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ قول موجودہ انجیلوں میں مذکور ہے :-

”اے اسرائیل، سن! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے

دل اور اپنی ساری جان اور اپنی پیاری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ“

(مرقس ۱۲: ۲۹ و متی ۲۲: ۳۶)

منقول ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ مناجات کرتے ہوئے فرمایا :-

”اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدا کے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں“

(یوحنا ۱۷: ۳)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اسکے سرداروں کے پاس تو کہا میں بھیجا ہوا ہوں

رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۶﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُونَ ﴿۳۷﴾

جہان کے رب کا پھر جب لایا ان کے پاس ہماری نشانیاں وہ تو لگے ان پر ہنسنے

وَمَا نُزِجُهُمْ مِنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا وَأَخَذْنَاهُمْ بِالْعُنَىٰ

اور جو دکھلاتے گئے ہم ان کو نشانی سو پہلی سے بڑی اور پکڑا ہم نے ان کو تکلیف میں

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۳۸﴾ وَقَالُوا يَا أَيُّهُ السَّحَرَاءُ كُتَّارٌ يَكْفُرُونَ ﴿۳۹﴾

تاکہ وہ باز آئیں اور کہنے لگے اے جادوگر پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو جیسا دکھلا

عِنْدَكَ ۖ إِنَّا لَمُهْتَدُونَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ

رکھا ہے تجھ کو ہم ضرور راہ پر آجائیں گے پھر جب اٹھائی ہم نے ان پر سے تکلیف

إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ﴿۴۱﴾ وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ

تسبی وہ وعدہ توڑ ڈالتے اور پکارا فرعون نے اپنی قوم میں بولا اے میری قوم بھلا میرے

لِي مُلْكٌ مِّصْرَ وَهَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي ۖ أَفَلَا

ہاتھ میں نہیں حکومت مصر کی اور یہ نہریں چل رہی ہیں میرے محل کے نیچے کیا تم

تَبْصِرُونَ ۵۱) اَمَّا نَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ وَلَا یَکَادُ

نہیں دیکھتے بھلا میں ہوں بہتر اس شخص سے جس کو کچھ عزت نہیں اور صاف نہیں

یُبَیِّنُ ۵۲) فَلَوْلَا اَلْقِیْ عَلَیْہِ اَسْوَرَةٌ مِّنْ ذَہَبٍ ۙ اَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِکَةُ

بول سکتا پھر کیوں نہ آپڑے اس پر سنگ سونے کے یا آتے اس کے ساتھ فرشتے

مُقْتَرِنٰیۙ ۵۳) فَاسْتَخَفَّ قَوْمُہٗ ۙ فَاَطَاعُوْہٗ ۙ لَّئِنَّمْ کَانَ قَوْمًا

پڑا باندھ کر پھر عقل کھودی اپنی قوم کی، پھر اسی کا کہنا مانا مقرر وہ تھے لوگ

فٰسِقِیۡنَ ۵۴) فَلَمَّا اَسْفَوْۤا نَاۤ اَنْتَقَمْنَا مِنْہُمْ فَاَعْرَضْنَا عَنْہُمْ ۙ اَجْمَعِیۡنَ ۵۵)

نا فرمان پھر جب ہم کو غصہ دلایا تو ہم نے اُن سے بدلہ لیا، پھر ڈھوڑ دیا اُن سب کو

فَجَعَلْنٰہُمْ سَلَکًا وَمَثَلًا لِّلْاٰخِرِیۡنَ ۵۶)

پھر کر ڈالا اُن کو گئے گزرے اور ایک نظیر پچھلوں کے واسطے

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے دلائل (یعنی معجزات عصا اور ید بیضا) دیکر فرعون کے اور اسکے امراء کے پاس بھیجا تھا، سوا انھوں نے (اُن لوگوں کے پاس آکر) فرمایا کہ میں رب العالمین کی طرف سے (تم لوگوں کی ہدایت کے لئے) پیغمبر (ہو کر آیا) ہوں (مگر فرعون و اہل فرعون نے نہیں مانا) پھر (ہم نے دوسرے دلائل سزاؤں کے رنگ میں اُن کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ظاہر کئے، یعنی قحط سالیا وغیرہ مگر اُن لوگوں کی پھر بھی یہ حالت رہی کہ) جب موسیٰ (علیہ السلام) ان کے پاس ہماری (وہ) نشانیاں لیکر آئے (جو آیات تسعہ کہلاتی ہیں) تو وہ بیکار اُن (معجزات) پر لگے ہنسنے (کہ یہ کیا اچھے معجزے ہیں، محض معمولی واقعات و حوادث ہیں کیونکہ قحط وغیرہ ویسے بھی ہو جاتا ہے مگر یہ اُن کی حماقت تھی کیونکہ دوسرے قرآن سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ واقعات غیر معمولی ہیں اور معجزہ کے طور پر ہو رہے ہیں۔ اسی لئے اُنھوں نے ان پر جادو کی ہمت لگائی تھی جیسا کہ سورہ اعراف میں لَشَّخُوۡنَاۤیْہَا کے الفاظ اس پر شاہد ہیں) اور (ان نشانیوں کی کیفیت یہ تھی کہ) ہم ان کو جو نشانی دکھلاتے تھے وہ دوسری نشانی سے بڑھ کر ہوتی تھی (مطلب یہ کہ نشانیاں بڑی ہی تھیں اور یہ مطلب نہیں کہ ہر نشانی ہر نشانی سے بڑی تھی، یہ ایک محاورہ ہے جب کئی چیزوں کا کمال بیان کرنا چاہتے ہیں تو یوں ہی بولتے ہیں کہ ایک سے ایک بڑھ کر۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ بھی ہر انبوی الی نشانیاں پچھلی نشانی سے کچھ فضیلت رکھتی ہو) اور ہم نے (ان نشانیوں کے واقعہ کرنے سے) ان لوگوں کو عذاب میں پکڑا تھا تاکہ وہ (اپنے کفر سے) باز آجادیں (یعنی وہ نشانیاں نبوت کی دلیل بھی تھیں اور اُن کے لئے سزا بھی تھیں مگر وہ لوگ باز نہ آئے، باوجودیکہ ہر نشانی کے وقوع

پراسکا چند بار عہد بھی کیا) اور انھوں نے (موسیٰ علیہ السلام سے ہر نشانی پر یہ) کہا کہ اے جادوگر (یہ لفظ حسبِ عادت سابقہ فریادِ حواسی سے اُن کے منہ سے نکل جاتا ہوگا، ورنہ ایسی عاجزانہ درخواست کے موقع پر یہ شرارت کا لفظ بولنا مستبعد معلوم ہوتا ہے، بہر حال مطلب یہ تھا کہ اے موسیٰ) ہمارے لئے اپنے رب سے اُس بات کی دعا کر دیجئے جس کا اُس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے (اور وہ بات ہے ہمارے باز آجانے پر قہر کا دور کر دینا، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر آپ اس عذاب کو دور کرادیں تو) ہم ضرور راہِ پر آجائیں گے، پھر جب) چمنے وہ عذاب ان سے ہٹا دیا تب ہی انھوں نے (اپنا) عہد توڑ دیا (ان نو نشانیوں کا بیان سورہ اعراف میں آچکا ہے) اور فرعون نے (غالباً اس خیال سے کہ کہیں معجزات دیکھ کر عام لوگ مسلمان ہو جائیں) اپنی قوم میں منادی کرائی (اور اُس منادی میں) یہ بات کہی (یعنی کہلوای) کہ اے میری قوم کیا مصر (مع تواب) کی سلطنت میری نہیں ہے اور (دیکھو) یہ نہیں میرے (محل کے) پائیں میں بہہ رہی ہیں کیا تم (یہ چیزیں) دیکھتے نہیں ہو (اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس کچھ بھی سامان نہیں تو بتلاؤ میں افضل اور قابلِ اتباع ہوں یا موسیٰ علیہ السلام) بلکہ میں (ہی) افضل ہوں اس شخص سے (یعنی موسیٰ علیہ السلام سے) جو کہ (باعتبار مالِ جاہ کے) کم قدر (آدمی) ہے اور قوتِ بیانیہ بھی نہیں رکھتا (اور اگر یہ شخص اپنے آپ کو پیغمبر بتاتا ہے) تو اسکے (ہاتھوں میں) سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے (جیسے شاہانِ دنیا کی عادت ہے کہ جب کسی پر خاص عنایت کرتے ہیں تو اسکو عام دربار میں سونے کے کنگن پہناتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر اس شخص کو نبوت عطا ہوتی تو خدا کی طرف سے اسکے ہاتھ میں سونے کے کنگن ہوتے) یا فرشتے اس کے جلو میں پرا باندھ کر آئے ہوتے (جیسا کہ خاص امراء شاہی کا جلوس اسی طرح نکلتا ہے) غرض اُس نے (ایسی باتیں کر کر کے) اپنی قوم کو مغلوب (یعقل) کر دیا اور وہ اسکے کہنے میں آگئے، (اور) وہ لوگ (کچھ پہلے سے بھی) شرارت کے پھرے تھے (اسوجہ سے فرعون کی باتوں کا اُن پر زیادہ اثر ہوا) پھر جب اُن لوگوں نے (برا بکفر و عناد پر اصرار کر کے) ہم کو غصہ دلایا تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور اُن سب کو ڈبو دیا اور ہم نے اُن کو آئندہ آنے والوں کے لئے خاص طور کے متقدمین اور نمونہ (عبرت) بنا دیا (خاص طور کے متقدمین بنانا کیا مطلب یہ ہے کہ لوگ اُن کا قصہ یاد کر کے عبرت دلاتے ہیں کہ دیکھو متقدمین میں ایسے ایسے ہوئے ہیں اور اُن کا ایسا ایسا حال ہوا)۔

معارف و مسائل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ پیچھے بار بار گزر چکا ہے اور ان آیات میں انکے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ تفصیل کیساتھ سورہ اعراف میں آئے ہیں، یہاں ان کا ذکر یاد دلانے سے مقصد یہ ہے کہ تقاریرِ کتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر آپ کے مالدار نہ ہونے سے جو شبہ کر رہے ہیں یہ کوئی نیا شبہ

نہیں، بلکہ فرعون اور اُس کی قوم نے یہی شبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر کیا تھا۔ فرعون کا کہنا یہ تھا کہ میں ملک مصر کا مالک ہوں اور میرے محلات کے نیچے نہریں بہتی ہیں اسلئے میں موسیٰ علیہ السلام سے (معاذ اللہ) افضل ہوں، پھر میرے مقابلے میں انہیں نبوت کیونکر مل سکتی ہے؛ لیکن جس طرح اسکا یہ شبہ اسکے کچھ کام نہ آسکا اور وہ اپنی قوم سمیت غرق ہو کر رہا، اسی طرح نقار مکہ کا یہ اعتراض بھی انہیں دنیا و آخرت کے وبال سے نہ بچا سکے گا۔

وَلَا يَكْذِبُ يُونُسُ (اور جو قوت بیانیہ بھی نہیں رکھتا) اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان کی لکنت دور کر دی تھی لیکن فرعون کو ان کا پہلا منظر ہی یاد تھا اس لئے اُس نے حضرت موسیٰ پر یہ عیب لگایا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں ”قوت بیانیہ“ سے مراد زبان کی روانی کے بجائے دلائل کی قوت و وضاحت ہو اور فرعون کا مطلب یہ ہو کہ حضرت موسیٰ کے پاس ایسے کافی دلائل نہیں ہیں جو مجھے مطمئن کر سکیں۔ حالانکہ یہ فرعون کا زرا اٹھام تھا، ورنہ حضرت موسیٰ نے دلائل براہین کے مقابلہ میں فرعون کو قطعی لا جواب کر دیا تھا (تفسیر کبیر در روح المعانی)

فَاَسْتَخَفَّ قَوْمَهُ، اس کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ فرعون نے اپنی قوم کو آسانی سے اپنا تابع بنالیا (طلب منهم الخفة فی مطاوعته) اور دوسرے یہ کہ ”اُس نے اپنی قوم کو بیوقوف پایا“ (وجدلهم خيفة احلامهم) (روح المعانی)

فَلَمَّا أَسْفَوْنَا، یہ اُسفُت سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی ہیں افسوس، لہذا اس جملے کے لفظی معنی ہوئے ”پس جب انہوں نے ہمیں افسوس دلایا“ اور افسوس بکثرت غصہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے اسکا با محاورہ ترجمہ عموماً اس طرح کیا جاتا ہے کہ ”جب انہوں نے ہمیں غصہ دلایا“ اور چونکہ باری تعالیٰ افسوس اور غصہ کی انفعالی کیفیات سے پاک ہے اسلئے اسکا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے کام ایسے کئے جس سے ہم نے انہیں سزا دینے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ (روح)

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ۝۵۰

اور جب مثال لائے مریم کے بیٹے کی تبھی قوم تیری اُس سے چلانے لگتے ہیں

وَقَالُوا آءِ إِلَهِنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ

اور کہتے ہیں ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ یہ مثال جو ڈالتے ہیں تجھ پر سو جھگڑنے کو بلکہ یہ لوگ

قَوْمٌ خَصِمُونَ ۝۵۱ إِنَّ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا

ہیں جھگڑالو وہ کیا ہے ایک بندہ ہے کہ ہم نے اس پر فضل کیا اور کھڑا کر دیا اس کو

لِبَنِي إِسْرَءِيلَ ۝۵۲ وَكُنْ نَشَاءً لِّجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي

بنی اسرائیل کے واسطے اور اگر ہم چاہیں نکالیں تم میں سے فرشتے

الْأَرْضِ يَخْلَفُونَ ﴿٦٠﴾ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ فَلَا تَمُوتُنَّ بِهَا وَ

زمین میں تمہاری جگہ اور وہ نشان ہے قیامت کا سو اس میں شک مت کرو اور

اتَّبِعُونَ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ وَلَا يَصُدُّكُمْ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ

میرا کہا مانو یہ ایک سیدھی راہ ہے اور نہ روکدے تم کو شیطان وہ تو

لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٢﴾ وَلَمَّا جَاءَ عِيسَى بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ

تمہارا دشمن ہے صریح اور جب آیا عیسیٰ نشانیاں لے کر بولا میں لایا ہوں تمہارے پاس

بِالْحِكْمَةِ وَالْبَيِّنَاتِ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي تَخْتَلَفُونَ فِيهِ فَاتَّقُوا اللَّهَ

پہلی باتیں اور بتلانے کو بعضی وہ چیز جس میں تم جھگڑاتے تھے سو ڈرو اللہ سے

وَأَطِيعُوا ﴿٦٣﴾ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبُّكُمْ وَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ

اور میرا کہا مانو بیشک اللہ جو ہے وہی ہے رب میرا اور رب تمہارا سو اسی کی بندگی کرو یہ ایک سیدھی

مُسْتَقِيمٌ ﴿٦٤﴾ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ

راہ ہے پھر بھٹ گئے کہتے فرقے ان کے بچ سے سو خرابی ہے

ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ ﴿٦٥﴾

گنہگاروں کو آفت سے دکھ والے دن کی

خلاصہ تفسیر

(ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ کے سوا جتنوں کی ناحق عبادت کی جاتی ہے ان میں سے کسی میں کوئی خیر نہیں اس پر قریش کے بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ نصرانی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں مگر ان کے بارے میں آپ بھی مانتے ہیں کہ ان میں خیر ہی خیر تھی اسکے جواب میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں) اور جب (عیسیٰ) ابن مریم (علیہ السلام) کے متعلق (ایک معترض کی طرف سے) ایک عجیب مضمون بیان کیا گیا (عجیب اس لئے کہ سرسری نظر ہی سے اس کا بطلان خود ان کو معلوم ہو سکتا تھا، پس عقل رکھ کر ایسا اعتراض کرنا بہت عجیب تھا، غرض جب یہ اعتراض کیا گیا) تو یہ ایک آپ کی قوم کے لوگ اُس (اعتراض کے سننے) سے (مارے خوشی کے) چلانے لگے اور (اُس معترض کے ساتھ متفق ہو کر) کہنے لگے کہ (بتلائیے آپ کے نزدیک) ہمارے معبود زیادہ بہتر ہیں یا عیسیٰ (علیہ السلام) بہتر ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ عیسیٰ علیہ السلام کو تو یقیناً بہتر سمجھتے ہیں حالانکہ آپ نے جو یہ کہا تھا کہ اللہ کے سوا جتنوں کی ناحق عبادت کی جاتی ہے ان میں کوئی خیر نہیں، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بالکل بھلائی نہ ہو اس سے ایک تو آپ کا یہ قول (معاداً)

درست نہیں رہا۔ دوسرے معلوم ہوا کہ جن کو آپ خیر کہتے ہیں خود ان کی بھی عبادت ہوئی ہے اس لئے اس سے شرک کی صحت ثابت ہو گئی۔ آگے اس اعتراض کا جواب ہے، پہلے اجمالاً پھر تفصیلاً، اجمالاً تو یہ کہ ان لوگوں نے جو یہ (عجیب اعتراض) آپ سے بیان کیا ہے تو محض جھگڑنے کی غرض سے (نہ کہ طلب حق کے لئے، ورنہ خود ان پر اس اعتراض کی لغویت پوشیدہ نہ رہتی اور ان لوگوں کا جھگڑنا کچھ اسی اعتراض کے ساتھ مخصوص نہیں) بلکہ یہ لوگ (اپنی عادت سے) ہیں ہی جھگڑالو (کہ اکثر حق باتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں۔ آگے تفصیلی جواب ہے یعنی) عیسیٰ (علیہ السلام) تو محض ایک ایسے بندے ہیں جن پر ہم نے (مقبولیت اور کمالات نبوت دیکر اپنا) فضل کیا اور ان کو بنی اسرائیل کے لئے (اولاً اور دوسروں کیلئے بھی ثانیاً) ہم نے (اپنی قدرت کا) ایک نمونہ بنایا تھا (تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ خدا تعالیٰ کو اس طرح بغیر باپ کے پیدا کرنا بھی کچھ مشکل نہیں۔ اس سے ان کے دونوں اعتراضات کا جواب بکھل آیا جسکی تشریح معارف مسائل میں آئیگی) اور (ہم تو اس سے زیادہ عجیب غریب امور پر قادر ہیں، چنانچہ) اگر ہم چاہتے تو ہم تم سے فرشتوں کو پیدا کر دیتے (جس طرح تم سے تمھارے بچے پیدا ہوتے ہیں) کہ وہ زمین پر (انسان کی طرح) یکے بعد دیگرے رہا کرتے (یعنی پیدائش بھی آدمیوں کی طرح ہوتی اور موت بھی۔ پس بغیر باپ کے پیدا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے زیر قدرت نہیں ہے۔ لہذا یہ امر حضرت عیسیٰ کے معبود ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا بلکہ اس طرح پیدا کرنے میں بعض حکمتیں تھیں جنہیں سے ایک تو اوپر بیان ہوئی کہ انھیں اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنانا تھا) اور (دوسری حکمت یہ تھی کہ) وہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) اس طرح پیدا ہونے میں امکان، قیامت کے یقین کا ذریعہ ہیں (اس طرح کہ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے میں اس سے زیادہ اور کیا بعد ہے کہ دوبارہ زندگی خلاف عادت ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے ہونے سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ خلاف عادت امور کے صادر کرنے پر قادر ہے۔ پس اس سے قیامت و آخرت کے عقیدے کا صحیح ہونا ثابت ہو گیا اور جب تم نے عقیدہ آخرت کی یہ دلیل سن لی) تو تم لوگ اُس (کی صحت) میں شک مت کرو، اور (توحید اور آخرت وغیرہ عقائد میں) تم لوگ میرا اتباع کرو، یہ (مجموعہ جس کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں) سیدھا راستہ ہے اور تم کو شیطان (اس راہ پر آنے سے) روکنے نہ پاوے وہ بیشک تمھارا صریح دشمن ہے اور (یہاں تک تو تمھارے مذکورہ اعتراض کا جواب تھا، آگے خود عیسیٰ علیہ السلام کے مضمون دعوت سے توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کی تائید ہے یعنی) جب عیسیٰ (علیہ السلام) ٹھٹھے ٹھٹھے (مہجرنے لیکر آئے تو انھوں نے) (لوگوں سے) کہا کہ میں تمھارے پاس سمجھ کی باتیں لیکر آیا ہوں (تاکہ تمھارے عقائد کی اصلاح کروں) اور تاکہ بعض باتیں (مبطلہ اعمال حلالِ حرام کے) جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تم سے بیان کر دوں (جس سے اختلاف و اشتباہ رفع ہو جاوے، جب میں اس طرح آیا ہوں) تو تم لوگ اللہ سے

ڈرو (اور میری نبوت کا انکار نہ کرو، کیونکہ یہ خدا کی مخالفت ہے) اور میرا کہا مانو (کیونکہ نبوت کی تصدیق کے لئے یہ ضروری ہے اور عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی کہا کہ) بیشک اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے سو (صرف) اُسی کی عبادت کرو (اور) یہی (توحید) سیدھا راستہ ہے سو (باد جو عیسیٰ علیہ السلام کے اس داشکاف بیان توحید کے پھر بھی) مختلف گروہوں نے (اس بارے میں) باہم اختلاف ڈال لیا (یعنی توحید کے خلاف طرح طرح کے مذاہب ایجاد کر لئے، چنانچہ توحید میں نصاریٰ وغیرہ نصاریٰ کا اختلاف بھی معلوم ہے) سو ان ظالموں (یعنی مشرکین اہل کتاب و غیر اہل کتاب) کیلئے ایک پُر درد دن کے عذاب سے بڑی خرابی (ہونیوالی) ہے (پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعوت سے خود توحید کی تائید ہو گئی لہذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ناحق عبادت سے شرک کی صحت پر استدلال مدعی کُست گواہ چست کی مثال ہے)

معارف و مسائل

وَلَمَّا ضَرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ، ان آیات کے شان نزول میں مفسرین نے تین روایتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ قریش کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا، ”یا معشر قریش لا خیرو فی احد یعبد من دون اللہ“ یعنی ”اے قریش کے لوگو! اللہ کے سوا جس کسی کی عبادت کی جاتی ہے اس میں کوئی خیر نہیں“ اس پر مشرکین نے کہا کہ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں لیکن آپ خود مانتے ہیں کہ وہ اللہ کے نیک بندے اور اس کے نبی تھے۔ اُن کے اس اعتراض کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ (قرطبی) دوسری روایت یہ ہے کہ جب قرآن کریم کی آیت اِنْ تَكْفُرُوْا مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبٌ جَعَلَهُمْ بِلَا شَيْءٍ اَعْمٰیۃً تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے) نازل ہوئی تو اسپر عبداللہ بن الزبیری نے جو اس وقت کافر تھے، یہ کہا کہ اس آیت کا تو میرے پاس بہترین جواب موجود ہے اور وہ یہ کہ نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں اور یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی، تو کیا یہ دونوں بھی جہنم کا ایندھن بنیں گے؟ یہ بات سن کر قریش کے مشرکین بہت خوش ہوئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ایک تو یہ آیت نازل فرمائی کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ سَبَقَتْ لَهُمُ مِّنَّا الْحُسْنٰی اُولٰٓئِکَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ، اور دوسرے سورہ زمر کی مذکورہ بالا آیات (ابن کثیر وغیرہ)

تیسری روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ مشرکین مکہ نے یہ یہودہ خیال ظاہر کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدائی کا دعویٰ کرنا چاہتے ہیں، ان کی مرضی یہ ہے کہ جس طرح نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو پوجتے ہیں اس طرح ہم بھی ان کی عبادت کیا کریں، اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں۔ اور درحقیقت تینوں دایوں میں کوئی تعارض نہیں، کفار نے تینوں ہی باتیں کہی ہونگی جن کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ایسی جامع آیات

نازل فرمادیں جن سے انکے تینوں اعتراضات کا جواب ہو گیا۔ اس آخری اعتراض کا جواب مذکورہ آیات میں بالکل واضح ہے کہ جن لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی عبادت شروع کر دی ہے انہوں نے نہ کسی خدائی حکم سے ایسا کیا، نہ خود حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ خواہش تھی اور نہ قرآن اُن کی تائید کرتا ہے انہیں تو حضرت عیسیٰؑ کے باپ کے بغیر پیدا ہونے سے مغالطہ لگاتھا اور قرآن اس مغالطہ کی تردید کرتا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) عیسائیوں کی دیکھا دیکھی اپنی خدائی کا دعویٰ کر بیٹھیں۔

اور پہلی اور دوسری روایتوں میں کفار کے اعتراض کا حاصل تقریباً ایک ہی ہے۔ اُن کا جواب مذکورہ آیات سے اس طرح نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا تھا کہ اللہ کے سوا جتنوں کو لوگوں نے معبود بنا رکھا ہے وہ جہنم کا ایندھن ہونگے، یا حضورؐ نے جو فرمایا تھا کہ ان میں خیر نہیں اس سے مراد وہ معبود تھے جو یا تو بے جان ہوں جیسے پتھر کے بُت، یا جاندار ہوں مگر خود اپنی عبادت کا حکم دیتے یا اُسے پسند کرتے ہوں جیسے شیاطین، فرعون اور غرود وغیرہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں جبکہ وہ کسی بھی مرحلہ پر اپنی عبادت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ نصاریٰ انکی کسی ہدایت کی بنا پر اُن کی عبادت نہیں کرتے، بلکہ اُنھیں ہم نے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا کر بغیر باپ کے پیدا کیا تھا تاکہ لوگوں پر یہ صبح ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی تخلیق میں اسباب کے کسی واسطے کی ضرورت نہیں لیکن نصاریٰ نے اسکا غلط مطلب لیکر اُنھیں معبود بنا لیا، حالانکہ ان کا یہ معبود بننا عقلاً بھی غلط تھا اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بالکل خلاف تھا۔ کیونکہ انھوں نے ہمیشہ توحید کی تعلیم دی تھی۔ غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی عبادت سے بیزار ہونا اس بات سے مانع ہے کہ اُنھیں دوسرے باطل معبودوں کی صف میں شامل کیا جائے۔

اس سے کفار کا یہ اعتراض بھی ختم ہو گیا جس کا ذکر خلاصہ تفسیر میں آیا ہے کہ جن کو آپ خود خیر کہتے ہیں (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام) ان کی بھی عبادت ہوئی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی عبادت کچھ بُری بات نہیں۔ مذکورہ آیات میں اس کا جواب واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو عبادت ہوئی وہ اللہ کی مرضی کے بھی خلاف تھی اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی۔ لہذا اس سے شرک کی صحت پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ مِنْكُمْ مَكَلِّكًا فِي الْأَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ، یہ نصاریٰ کے اُس مغالطہ کا جواب ہے جس کی بنا پر انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود قرار دیا تھا۔ انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے سے اُن کی خدائی پر استدلال کیا تھا۔ باری تعالیٰ ان کی تردید میں فرماتے ہیں کہ یہ تو محض ہماری قدرت کا ایک مظاہرہ تھا، اور ہم تو اس سے بھی بڑھ کر

خلافتِ عادت کاموں پر قادر ہیں۔ بغیر باپ کے پیدا ہونا تو کوئی بہت زیادہ خلافتِ عادت نہیں، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام تو بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے، اگر ہم چاہیں تو ایسا کام بھی کر سکتے ہیں جس کی ابتک کوئی نظیر نہیں اور وہ یہ کہ انسانوں سے فرشتے پیدا کر دیں۔

وَإِنَّكَ لَعَلَّمٌ لِلسَّاعَةِ (اور بلاشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کا یقین کرنے کے لئے ایک ذریعہ ہیں) اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک وہ جو خلاصہ تفسیر میں بیان ہوئی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خلافتِ عادت بغیر باپ کے پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر ظاہری اسباب کے بھی لوگوں کو پیدا کر سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کر دینا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ آسمان و مازل ہونا قیامت کی علامت ہے۔ چنانچہ اچکا آخری زمانے میں دوبارہ تشریف لانا اور دجال کو قتل کرنا احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ اس مسئلہ کی کچھ تفصیل سورہ آل عمران میں آیت اِنِّیْ مُتَوَقِّئُکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ میں ص ۶۹ ج ۳ پر اور کچھ سورہ مائدہ میں ص ۲۴۹ ج ۳ پر گزر چکی ہے۔ مزید تفصیلاً کے لئے احقر کے سالہ التصدیق بما تواتر فی نزول المسیح اور مسیح موعود کی پہچان وغیرہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

وَالَّذِیْنَ لَکُمْ یَعُضُّ الذِّیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْہِ (اور تاکہ میں بیان کروں تم سے بعض وہ باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو) چونکہ بنی اسرائیل میں عناد اور ہٹ دھرمی کا غلبہ تھا اسلئے انہوں نے بعض حکام شرعیہ میں تحریف کر ڈالی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسکی حقیقت واضح فرمادی، اور بعض باتیں اسلئے فرمایا کہ بعض امور خالص دنیوی تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان میں اختلاف رفع کرنے کی ضرورت نہ سمجھی ہوگی (بیان القرآن)

هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِیَہُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝۶۶

اب یہی ہے کہ راہ دیکھتے ہیں قیامت کی کہ آکھری ہو ان پر اچانک اور ان کو خبر بھی نہ ہو

الْاِخْلَاقِ یَوْمَئِذٍ یَعْصُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ۝۶۷ یَعْبَادُ

جتنے دوست ہیں اُس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر جو لوگ ہیں ڈر والے، اے بندو میرے

لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمْ الْیَوْمَ وَلَا اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝۶۸ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا بِاٰیٰتِنَا

نہ ڈر ہے تم پر آج کے دن اور نہ تم غمگین ہو گے جو یقین لائے ہماری باتوں پر

وَكَانُوا مُسْلِمِیْنَ ۝۶۹ اَدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَازْوَاجُکُمْ تُخْبَرُوْنَ ۝۷۰

اور رہے حکم بردار چلے جاؤ بہشت میں تم اور تمہاری عورتیں کہ تمہاری عزت کریں

یُطَافُ عَلَیْہُمْ بِصَافٍ مِّنْ ذَہَبٍ وَّاُكُوَابٍ فِیْہَا مَا تَشْتٰہِیْہِ

لئے پھریں گے ان کے پاس رکابیاں سونے کی اور آبخورے اور وہاں ہے جو

الْأَنفُسُ وَكَذَٰلِكَ الْأَعْيُنُ ۚ وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٤١﴾ وَتِلْكَ

چاہے اور جس سے آنکھیں آرام پائیں اور تم اُن میں ہمیشہ رہو گے اور یہ وہی

الْجَنَّةُ الَّتِي أَوْثَقْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٢﴾ لَكُمْ فِيهَا

بہشت ہے جو میراث پائی تم نے بدلے میں ان کاموں کے جو کرتے تھے تمہارے واسطے انہیں

فَاكِهِهٖ كَثِيرٌ ۖ مِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٤٣﴾ إِنَّ الْمَجْرِمِينَ فِي عَذَابٍ

بہت میوے ہیں ان میں سے کھاتے رہو البتہ جو لوگ کہ گنہگار ہیں وہ دوزخ کے

جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ﴿٤٤﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ﴿٤٥﴾

عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں نہ ہلکا ہوتا ہے اُن پر سے اور وہ اسی میں پڑے ہیں آس ٹوٹے

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا هُمُ الظَّالِمِينَ ﴿٤٦﴾ وَنَادُوا إِلَيْهِمْ

اور ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا لیکن وہی بے انصاف اور پکاریں گے اے مالک

لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۖ قَالَ إِنَّكُمْ مَّا كُنْتُمْ

کہیں ہم پر فیصلہ کر چکے تیرا رب وہ کہے گا تم کو ہمیشہ رہنا ہے

خلاصہ تفسیر

یہ لوگ (حق واضح ہونے کے باوجود باطل پر اصرار کر رہے ہیں تو) بس قیامت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ان پر دفعۃً آپڑے اور ان کو خبر بھی نہ ہو (انکار کے باوجود انتظار سے مراد یہ ہے کہ انکا دلائل کو نہ ماننا ایسا ہے جیسے کوئی شخص مشاہدہ کا منظر ہو کہ جب آنکھوں سے دیکھ لوں گا تب مانوں گا، اور اُس روز قیامت کے واقعات یہ ہیں کہ) تمام (دنیا کے دوست) اُس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جاویں گے، بجز خدا سے ڈرنے والوں (یعنی اہل ایمان) کے (کیونکہ اُس روز باطل کی دوستی کا نقصان محسوس ہو گا تو لا محالہ اُس سے کراہت اور دوستوں سے نفرت ہوگی کہ یہ لوگ نقصان کا سبب بنے اور حق کی دوستی کا نفع اور ثواب محسوس ہو گا اس لئے وہ باقی رہے گی۔ اور ان مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نِدا ہوگی) اے میرے بندو تم پر آج کوئی خوف (کی بات واقع ہونے والی) نہیں، اور نہ تم غمگین ہو گے یعنی وہ بندے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے تھے اور (علماً و عللاً ہمارے) فرمانبردار تھے، تم اور تمہاری (ایمان دار) بیویاں خوش خوش جنت میں داخل ہو جاؤ (اور جنت میں جانے کے بعد اُن کے لئے یہ ہوگا کہ) اُن کے پاس سونے کی رکابیاں (کھانے کی چیزوں سے بھری ہوئی) اور گلاس (مشروبات سے بھرے ہوئے سونے کے، یا اور کسی چیز کے) لائے جاویں گے (یعنی غلمان لائیں گے) اور وہاں وہ چیزیں ملن گی جن کو جی چاہے گا اور جن سے آنکھوں کو لذت ہوگی اور (اُن سے کہا جائیگا کہ) تم یہاں ہمیشہ رہو گے

اور (یہ بھی کہا جائے گا کہ) یہ وہ جنت ہے جس کے تم مالک بنادیے گئے (تم کے بھی نہ لیجاوے گی) اپنے (نیک) اعمال کے عوض میں (اور) تمہارے لئے اس میں بہت سے میوے ہیں جن میں سے کھا رہے ہو (یہ تو اہل ایمان کا حال ہوا۔ آگے کفار کا ذکر ہے کہ) بیشک نافرمان (یعنی کافر) لوگ عذابِ زخ میں ہمیشہ رہیں گے وہ (عذاب) اُن (پر) سے ہلکانہ کیا جاوے گا اور وہ اُسی (عذاب) میں مایوس پڑے رہیں گے اور (آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) ہم نے اُن پر (ذرا) ظلم نہیں کیا (کہ ناحق عذاب دیا ہو) لیکن یہ خود ہی ظالم تھے (کہ کفر و شرک کر کے اپنا نقصان کر لیا) اور (آگے اُن کا باقی حال مذکور ہے کہ جب نجات سے بالکل مایوس ہو جائیں گے اُس وقت موت کی تمنا کریں گے اور دوزخ کے داروغہ مالک نامی فرشتہ کو پکارینگے کہ اے مالک (تم ہی دُعا کرو کہ) تمہارا پروردگار (ہم کو موت دیکر) ہمارا کام ہی تمام کر دے وہ (فرشتہ) جواب دے گا کہ تم ہمیشہ اسی حال میں رہو گے (نہ نکلو گے نہ مرو گے)۔

معارف و مسائل

دوستی در حقیقت وہی ہے جو اللہ کے لئے ہو | اَلَا خَلَقْنَاكُمْ يَوْمَ مِيقَاتِنَا بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اَلَا الْمُتَّقِينَ (تمام دوست اُس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے بجز خدا سے ڈرنے والوں کے) اس آیت نے یہ بات کھول کر بتادی کہ یہ دوستانہ تعلقات جن پر انسان دُنیا میں ناز کرتا ہے اور جن کی خاطر حلالِ حرام ایک کر ڈالتا ہے قیامت کے روز نہ صرف یہ کہ کچھ کام نہ آئیں گی بلکہ عداوت میں تبدیل ہو جائیں گی۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کے تحت حضرت علیؓ کا یہ ارشاد مصنف عبد الرزاقؒ اور ابن ابی حاتمؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ دو دوست مومن تھے اور دو کافر، مومن دوستوں میں سے ایک کا انتقال ہوا اور اُسے جنت کی خوشخبری سنائی گئی تو اُسے اپنا دوست یاد آیا۔ اُس نے دُعا کی کہ یا اللہ! میرا فلاں دوست مجھے آپکی اور آپکے رسولؐ کی اطاعت کی تاکید کرتا، بھلائی کا حکم دیتا اور بُرائی سے روکتا تھا اور یہ یاد دلاتا رہتا تھا کہ مجھے ایک دن آپکے پاس حاضر ہونا ہے، لہذا یا اللہ! اسکو میرے بعد گمراہ نہ کیجئے گا تاکہ وہ بھی (جنت کے) وہ مناظر دیکھ سکے جو آپ نے مجھے دکھائے ہیں، اور آپ جس طرح مجھ سے راضی ہوئے ہیں اُسی طرح اُس سے بھی راضی ہو جائیں۔ اس دُعا کے جواب میں اس سے کہا جائیگا کہ جاؤ، اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں نے تمہارے اُس دوست کے لئے کیا اجر و ثواب رکھا ہے تو تم روؤ کم اور ہنسو زیادہ۔ اسکے بعد جب دوسرے دوست کی وفات ہو چکے گی تو دونوں کی ارواح جمع ہونگی، باری تعالیٰ اُن سے فرمایا جائیگا کہ تم میں سے ہر شخص دوسرے کی تعریف کرے، تو اُن میں سے ہر ایک دوسرے کے بارے میں یہ کہے گا کہ وہ بہترین بھائی، بہترین ساتھی اور بہترین دوست ہے۔

اس کے برخلاف جب دو کافر دوستوں میں سے ایک کا انتقال ہو گا اور اسے بتایا جائیگا کہ اسکو جہنم میں ڈالا جائے گا تو اُسے بھی اپنا دوست یاد آئے گا اُسوقت وہ یہ دعا کرے گا کہ یا اللہ! میرا فلاں دوست مجھے آپ کی اور آپ کے رسول کی نافرمانی کرنیکا حکم دیتا تھا، بُرائی کی تاکید کرتا اور بھلائی سے روکتا تھا، اور مجھ سے کہا کرتا تھا کہ میں کبھی آپ کے حضور حاضر نہ ہونگا، لہذا یا اللہ! اس کو میرے بعد ہدایت نہ دیجئے گا، تاکہ وہ بھی (دوزخ کے) وہ مناظر دیکھے جو آپ نے مجھے دکھائے ہیں، اور آپ جس طرح مجھ سے ناراض ہوئے ہیں اُسی طرح اُس سے بھی ناراض ہوں۔ اسکے بعد دوسرے دوست کا بھی انتقال ہو جائیگا تو دونوں کی رُو میں جمع کیجائیں گی اور ان سے کہا جائیگا کہ تم میں سے ہر شخص اپنے ساتھی کی تعریف کرے، تو ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بارے میں کہیگا کہ یہ بدترین بھائی بدترین ساتھی اور بدترین دوست ہے۔ (ابن کثیر ص ۱۳۴ ج ۴) اسی لئے دنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے بہترین دوستی وہ ہے جو اللہ کے لئے ہو۔ جن دو مسلمانوں میں صرف اللہ کے لئے محبت ہو ان کے بڑے فضائل احادیث میں وارد ہوئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ میدانِ جہنم میں یہ لوگ اللہ کے عرش کے سایہ میں ہونگے اور اللہ کے لئے محبت کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے سے اس بنا پر تعلق ہو کہ وہ اللہ کے دین کا سچا پیرو ہے۔ چنانچہ علوم دین کے استاذ، شیخ دُرشد، علماء اور اہل اللہ سے نیز عالم اسلام کے تمام مسلمانوں سے بے لوث محبت اس میں داخل ہے۔

لَقَدْ جِئْتُمْ بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لَذِقُوا كُرْهُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَمْ

ہم آئے ہیں تمہارے پاس سچا دین پر تم بہت لوگ سچی بات سے بُرا مانتے ہو کیا

اَبْرُمُوْا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۸۹﴾ اَمْ يَحْسِبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سُرُّهُمُ

انہوں نے ٹھہرائی ہے ایک بات تو ہم بھی کچھ ٹھہرائیں گے کیا خیال رکھتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے اُن کا بھید

وَنَجْوَاهُمْ بَلٰی وَّرٰسَلْنَا لَدَيْهِمْ يٰكُتُبُوْنَ ﴿۹۰﴾ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ

اور ان کا مشورہ کیوں نہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے انکے پاس لکھتے رہتے ہیں تو کہہ اگر ہو رحمن کے واسطے

وَلَدٌ فَاِنَّا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿۹۱﴾ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اولاد تو میں سب سے پہلے پوجوں پاک ذات ہے وہ رب آسمانوں کا اور زمین کا

رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَاذْكُرْهُمْ يٰحٰوِضًا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰی

صاحب عرش کا اُن باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں، اب چھوڑ دے ان کو بلکہ بک کریں اور کھیلیں یہاں تک کہ

يَلْقَوْا يَوْمَهُمُ الَّذِیْ یُوعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَاءِ اِلٰہُ

میں اپنے اُس دن سے جس کا اُن کو وعدہ دیا ہے اور وہی ہے جس کی بندگی ہے آسمان میں اور

وَفِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ ط وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ﴿۸۳﴾ وَتَبَارَكَ الَّذِي لَهُ مُلْكُ

اُس کی بندگی ہے زمین میں اور وہی ہے حکمت والا سب کے خبردار اور بڑی برکت ہے اُس کی جس کا راج ہے

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ

آسمانوں میں اور زمین میں اور جو کچھ ان کے پہنچ میں ہے اور اُنکی کے پاس ہے خبر قیامت کی اور اُسی تک

تَرْجِعُونَ ﴿۸۵﴾ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ

پھر کر پہنچ جاؤ گے اور اختیار نہیں رکھتے وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں سفارش کا

إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْمُونَ ﴿۸۶﴾ وَلَكِنْ سَأَلْتُمْ مَنْ

مگر جس نے گواہی دی سچی اور اُن کو خبر سچی اور اگر تو اُن سے پوچھے کہ اُن کو

خَلَقْتُمْ كَيْفَ قَالَ اللَّهُ فَإِنِّي يُوقُونَ ﴿۸۷﴾ وَقِيلَ لَهُ رَبِّ انْ هَؤُلَاءِ

کس نے بنایا تو کہیں گے اللہ نے پھر کہاں سے اُلٹ جلتے ہیں قسم ہے رسول کے اس کہنے کی کہ اے رب یہ

قَوْمٌ لَا يَوْمِنُونَ ﴿۸۸﴾ قَا صَفَحَ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ فَسَوْفَ يَعْمُونَ ﴿۸۹﴾

لوگ ہیں کہ یقین نہیں لاتے سو تو منہ پھیرے انکی طرف سے اور کہہ سلام ہے اب آخر کو معلوم کر لیں گے

خلاصہ تفسیر

(اور اوپر جن سزاؤں کا بیان ہوا اُن کی وجہ یہ ہے کہ) ہم نے سچا دین (جسکا اُکین عظم توحید و

رسالت کا اعتقاد ہے) تمہارے پاس پہنچایا، لیکن تم میں اکثر آدمی سچے دین سے نفرت رکھتے ہیں

(اکثر آدمی یا تو اس لئے کہا کہ بعض لوگ آئندہ ایمان لانے والے تھے، اور یا اسلئے کہ نفرت تو صحیح معنی

میں بعض ہی کو تھی، دوسرے بعض محض تقلیداً راہ حق کو چھوڑے ہوئے تھے، اور یہ نفرت شامل ہی

رسول کی مخالفت اور توحید کی مخالفت دونوں کو۔ آگے دونوں کی تفصیل ہے کہ) ہاں کیا انھوں نے

(رسول کو نقصان پہنچانے کے بارے میں) کوئی انتظام درست کیا ہے، سو ہم نے بھی ایک نظام درست

کیا ہے (اور ظاہر ہے کہ خدائی انتظام کے سامنے اُن کا انتظام نہیں چل سکتا، چنانچہ آپ محفوظ ہے

اور وہ لوگ ناکام، اور آخر کو بدر میں ہلاک ہوئے۔ اسکا مفصل ذکر سورہ انفال رکوع چہارم آیت

وَإِذْ يُلَاقِيكَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاللَّهُ يَمْحُكُ مَا يَشَاءُ) ہاں (یہ لوگ جو آپ کو نقصان پہنچانے کے لئے خفیہ

تدبیریں کرتے ہیں) کیا ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم ان کی چھپکی چھپکی (کہی ہوئی) باتوں کو اور

ان کے (خفیہ) مشوروں کو نہیں سننے (ورنہ اگر ہم کو سننے والا سمجھتے ہیں تو پھر ایسی جرات کیوں

کرتے ہیں؟ آگے انکے اس خیال کی تردید فرماتے ہیں کہ) ہم ضرور سننے ہیں اور (اسکے علاوہ) ہمارے

فرشتے (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہیں

ہوتی) (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہیں

ہوتی) (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہیں

ہوتی) (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہیں

ہوتی) (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہیں

ہوتی) (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہیں

لیکن عام عادت یہ ہے کہ مجرم کے لئے پولیس کی لکھی ہوئی رپورٹ حاکم کے معائنہ سے زیادہ قابل اہم ہوتی ہے۔ یہ تو انکی مخالفت رسول کا بیان ہوا، آگے توحید کی مخالفت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اے پیغمبر اللہ علیہ السلام! آپ (ان مشرکین سے) کہئے کہ (تم جو اپنے بعض مشرکانہ اقوال میں حق تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہو تو) اگر (بفرض محال ایسا ہو یعنی خدائے رحمن کے اولاد ہو تو سب سے اول انکی عبادت کرنے والے ہیں) ہوں (جس طرح تم فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر ان کی عبادت کرتے ہو، اسی طرح میں بھی اُس صورت میں خدا کی اولاد کی عبادت کرتا۔ مطلب یہ کہ مجھ کو تمھاری طرح حق بات کے ماننے سے انکار نہیں، تم اگر ثابت کر دو تو سب سے پہلے میں اس کو مانوں، اور جب اسکو خدا کی اولاد مان لوں تو چونکہ خدا کی اولاد بھی خدای ہی ہونی چاہئے اور خدا مستحق عبادت ہے، اسلئے میں اسکی عبادت بھی کروں، مگر چونکہ یہ امر باطل محض ہے اسلئے نہ میں مانوں گا اور نہ عبادت کروں گا۔ آگے شرک سے اللہ تعالیٰ کے پاکہ نو میکا بیان ہے یعنی) آسمانوں اور زمین کا مالک جو کہ عرش کا بھی مالک ہے اُن باتوں سے منزہ ہے جو یہ (مشرک) لوگ (اس کی جناب میں) بیان کرتے ہیں (جب یہ لوگ حق کے واضح ہونیکے باوجود اپنے عناد سے باز نہیں آتے) تو آپ ان کو اسی شغل اور تفریح میں رہنے دیجئے، یہاں تک کہ ان کو اپنے اُس دن سے سابقہ واقع ہو جسکا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے (اُس وقت سب حقیقت معلوم ہو جائے گی، اور رہنے دیجئے، کا مطلب یہ نہیں کہ تبلیغ نہ کیجئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انکی مخالفت کی طرف التفات نہ کیجئے اور ان کے ایمان نہ لانیسے غمگین نہ ہو جئے) اور وہی ذات جو آسمانوں میں بھی قابل عبادت ہے اور زمین میں بھی قابل عبادت ہے اور وہی بڑی حکمت والا اور بڑے علم والا ہے (اور کوئی علم و حکمت میں اسکا شریک نہیں، پس خدای بھی اسی کیساتھ خاص ہے) اور وہ ذات بڑی عالیشان ہے جس کے لئے آسمانوں کی اور زمین کی اور جو (مخلوق) انکے درمیان میں ہے اسکی سلطنت ثابت ہے اور (علم ایسا کامل ہے کہ) اسکو قیامت کی خبر (بھی) ہے (جسکا کسی مخلوق کو پتہ نہیں) اور (جزا و سزا کا مالک بھی وہی ہے چنانچہ) تم سب اُسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے (اور اُس کو حساب دو گے) اور (اسوقت اللہ تعالیٰ کا بلا شرکت غیرے جزا و سزا کا مالک ہونا ایسا ظاہر و باہر ہو گا کہ) خدا کے سوا جن معبودوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سفارش (تک) کا اختیار نہ رکھیں گے ہاں جن لوگوں نے حق بات (یعنی کلمہ ایمان) کا اقرار کیا تھا اور وہ (دل سے) تصدیق بھی کیا کرتے تھے (وہ البتہ باذن الہی اہل ایمان کی سفارش کر سکیں گے مگر اس سے کفار کو کیا فائدہ؟) اور (ہم نے جو اوپر توحید کا مضمون بیان کیا ہے وہیں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں، سو اُس کے مقدمات کو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں چنانچہ) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو (یعنی تم کو) کس نے پیدا کیا ہے تو یہی کہیں گے کہ اللہ نے (پیدا کیا ہے) سو (ظاہر ہے کہ مستحق عبادت وہی ہو سکتا ہے جو پیدا کرنے پر قادر ہو۔ پس) یہ لوگ (مقدمات کو تو مانتے ہیں مگر پھر مطلوب کے ماننے کے وقت خدا جانے) کدھر لٹے چلے جاتے ہیں (ان تمام باتوں سے واضح ہے کہ ان کافروں

کے جرائم کس قدر سخت ہیں، لہذا سزا بھی یقیناً سخت ہوگی۔ اور آگے سزا کی سختی کو اور زیادہ مؤکد کر نیچے لئے ایک اور بات کا بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح خدا تعالیٰ کو قیامت کی خبر ہے اُسی طرح) اُس کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کہنے کی بھی خبر ہے کہ اے میرے رب یہ ایسے لوگ ہیں کہ (باوجود میری اس درجہ فہمائش کے) ایمان نہیں لاتے (اس سے سزا کی سختی اور بڑھ گئی کہ جرائم تو سخت تھے ہی ان کیساتھ رسول کی نالاش بھی موجود ہے، پس سمجھ لینا چاہیے کہ کیسا سخت عذاب ہوگا۔ اور جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا انجام یہ ہونے والا ہے) تو آپ اُن سے بے رنج رہئے (یعنی ان کے ایمان کی ایسی اُمید نہ رکھئے جو بعد میں موجب رنج ہو) اور (اگر وہ آپ سے مخالفت اور جہالت کی بات کریں تو آپ رنج شر کے لئے) یوں کہہ دیجئے کہ تم کو سلام کرتا ہوں (اور کچھ نہیں کہتا اور نہ کچھ واسطہ رکھتا ہوں، آگے حق تعالیٰ تسلی کیلئے فرماتے ہیں کہ آپ چندے صبر کیجئے) سوان کو ابھی (مرتے ہی) معلوم ہو جاوے گا۔

معارف و مسائل

اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاِنَّ اَوَّلَ الْعٰلَمِيْنَ (اگر خدا کے رحمن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ خدا کی اولاد ہونے کا کسی بھی درجہ میں کوئی امکان ہے، بلکہ مقصد دراصل یہ بتانا ہے کہ میں تمہارے عقائد کا انکار کسی عناد یا ہٹ دھرمی سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ دلائل کی وجہ سے کر رہا ہوں، اگر صحیح دلائل سے خدا کی اولاد کا وجود ثابت ہو جاتا تو میں اُسے ضرور مان لیتا، لیکن عقل و نقل کی ہر دلیل اس کی تردید کرتی ہے، اسلئے ماننے کا کوئی سوال نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل باطل کیساتھ مباحثہ کے وقت اپنی حق پسندی جتلانے کے لئے یہ کہنا جائز اور مناسب ہے کہ اگر تمہارا دعویٰ صحیح دلائل کیساتھ ثابت ہوتا تو میں اُسے تسلیم کر لیتا، کیونکہ بعض اوقات اس اندازِ کلام سے مخالف کئے میں ایسی نرمی پیدا ہو سکتی ہے جو اُسے قبول حق پر آمادہ کر دے۔

وَرَقِیْلَہٗ یَرْبِیْہٖ اِنَّ ہُوَ لَکَ فِیْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ (یہ جملہ اس بات کو واضح کرنے کے لئے لایا گیا ہے کہ ان کافروں پر غضبِ خداوندی نازل نہیں کیونکہ کتنے شدید اسباب موجود ہیں۔ ایک طرف تو ان کے جرائم فی نفسہ سخت ہیں، دوسری طرف وہ رسول جو رحمۃ للعالمین اور شفیع المذنبین بنا کر بھیجے گئے ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جب خود ان لوگوں کی شکایت کریں اور یہ فرمائیں کہ یہ لوگ بار بار فہمائش کے باوجود ایمان نہیں لاتے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر اذیت پہنچائی ہوگی، ورنہ معمولی تکلیف پر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے ایسی پُر درد شکایت نہ فرماتے۔ اس تفسیر کے مطابق رَقِیْلَہٗ ایک آیت پہلے کے لفظ السَّاعَةِ پر معطوف ہے، اس

سُورَةُ الدُّخَانِ

سُورَةُ الدُّخَانِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تِسْعٌ وَخَمْسُونَ آيَةً وَثَلَاثُ رُكُوعَاتٍ
سورہ دخان مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں انسٹھ آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حَمْدٌ ۱ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ ۲ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ

قسم ہے اس کتاب واضح کی ہم نے اس کو اتارا ایک برکت کی رات میں

اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ ۳ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيمٍ ۴ اَمْرًا مِّنْ

ہم ہیں کہہ سنانے والے اسی میں جدا ہوتا ہے ہر کام جانچا ہوا حکم ہو کر ہمارے

عِنْدًا ۵ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ۶ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ

پاس سے ہم ہیں بھیجنے والے رحمت سے تیرے رب کی وہی ہے سننے

الْعَلِيمُ ۷ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوقِنِينَ ۸

جاننے والا رب آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ ہے اگر تم کو یقین ہے

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اَبَائِكُمُ الْاَوَّلِينَ ۹

کسی کی بندگی نہیں سوائے اسکے جلاتا ہے اور مارتا ہے، رب تمہارا اور رب تمہارے اگلے باپ دادوں کا

بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَّلْعَبُونَ ۱۰

کوئی نہیں وہ دھوکے میں ہیں کھیلتے

خلاصہ تفسیر

حَمْدٌ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) قسم ہے اس کتاب واضح (المعنی) کی کہ ہم نے اس کو (بوجہ محفوظ سے آسمان دنیا پر) ایک برکت والی رات (یعنی شب قدر) میں اتارا ہے (کیونکہ) ہم (بوجہ شفقت کے اپنے ارادہ میں اپنے بندوں کو) آگاہ کرنے والے تھے (یعنی ہم کو یہ منظور ہوا کہ ان کو مفسرتوں سے

بچا لینے کے لئے خیر و شر پر مطلع کر دیں، یہ قرآن کو نازل کرنے کا مقصد تھا۔ آگے اُس شب کے برکات و منافع کا بیان ہے کہ اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ ہماری پیشی سے حکم (صادر) ہو کر طے کیا جاتا ہو (یعنی سال بھر کے معاملات جو سارے کے سارے ہی حکمت پر مبنی ہوتے ہیں جس طرح انجام دینے اللہ کو منظور ہوتے ہیں اس طریقے کو متعین کر کے اُن کی اطلاع متعلقہ فرشتوں کو کر کے اُن کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں، چونکہ وہ رات ایسی ہے اور نزول قرآن سب سے زیادہ حکمت والا کام تھا اسلئے اس کے لئے بھی یہی رات منتخب کی گئی اور یہ قرآن اسلئے نازل کیا گیا کہ ہم بوجہ رحمت کے جو آپکے رب کی طرف سے ہوتی ہے آپ کو پیغمبر بنا دیئے تھے (تاکہ آپکی معرفت اپنے بندوں کو آگاہ کر دیں) بیشک بڑا سنسنے والا بڑا جاننے والا ہے (اسلئے بندوں کی رعایت کرتا ہے، اور وہ ایسا ہے) جو کہ مالک ہر آسمانوں اور زمین کا اور جو (مخلوق) ان دونوں کے درمیان میں ہے اسکا بھی، اگر تم یقین لانا چاہو (تو یہ توحید کے دلائل یقین لانے کے لئے کافی موجود ہیں، آگے توحید کی تصریح ہے کہ) اسکے سوا کوئی لائق عبادت کے نہیں، وہی جان ڈالتا ہے وہی جان نکالتا ہے، وہ تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا بھی پروردگار ہے (اور اس تصریح و توضیح کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ لوگ مان لیتے مگر یہ لوگ پھر بھی نہیں مانتے) بلکہ وہ (توحید جیسے حقائق کی طرف سے) شک میں (پڑے) ہیں (اور دنیا کے) کھیل (کود) میں مصروف ہیں (آخرت کی فکر نہیں جو حق کو طلب کریں ہمیں غور سے کام لیں)۔

معارف و مسائل

فضیلتِ سورت | حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کی رات میں سورہ دُخان پڑھ لے تو صبح کو اسکے گناہ معاف ہو چکے ہونگے۔ اور حضرت امام مدنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے جمعہ کی رات یا دن میں سورہ دُخان پڑھ لی اللہ تعالیٰ اسکے لئے جنت میں گھر بنائیں گے (قرطبی بروایت ثعلبی)

آیاتِ مذکورہ میں قرآن کی عظمت اور بعض خاص صفات کا بیان ہے وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ یعنی واضح کتاب سے مراد قرآن ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی قسم کھا کر ارشاد فرمایا ہے کہ اسکو ہم نے ایک مبارک رات میں نازل فرمایا جسکا مقصد غافل انسانوں کو بیدار کرنا ہے۔ اسی طرح کئی قسم انہی الفاظ کے ساتھ سورہ زخرف کے شروع میں بھی گزر چکی ہے وہاں اسکا بیان آچکا ہے۔ لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک شبِ قدر ہے جو رمضان مبارک کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے۔ اس رات کو مبارک فرمانا اس لئے ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر بے شمار خیرات و برکات نازل ہوتی ہیں اور قرآن کریم کا شبِ قدر میں نازل ہونا

قرآن کی سورۃ قدر میں تصریح کے ساتھ آیا ہے اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ اس سے ظاہر ہوا کہ یہاں بھی لیلۃ مبارکہ سے مراد شب قدر ہی ہے۔ اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں ابتداء دُنیا سے آخر تک اپنے انبیاء علیہم السلام پر نازل فرمائی ہیں وہ سب کی سب ماہ رمضان المبارک ہی کی مختلف تاریخوں میں نازل ہوئی ہیں۔ حضرت قتادہ نے بروایت واسئلہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صحف ابراہیم علیہ السلام رمضان کی پہلی تاریخ میں اور تورات رمضان کی چھٹی تاریخ میں، زبور بارہویں میں انجیل اٹھارویں میں، اور قرآن چوبیس تاریخ گزرنے کے بعد یعنی پچیسویں شب میں نازل ہوا (قطبی)

قرآن کے شب قدر میں نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوح محفوظ سے پورا قرآن سماء دُنیا پر اسی رات میں نازل کر دیا گیا تھا پھر تیس سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر سال میں جتنا قرآن نازل ہونا مقدر ہوتا تھا اتنا ہی شب قدر میں لوح محفوظ سے سماء دُنیا پر نازل کر دیا جاتا تھا (قطبی)

اور بعض مفسرین عکرمہ وغیرہ سے منقول ہے کہ انھوں نے اس آیت میں لیلۃ مبارکہ سے مراد شب برات یعنی نصف شعبان کی رات قرار دی ہے مگر اس رات میں نزول قرآن دوسری تمام نصوص مسترآن اور روایات حدیث کے خلاف ہے شہودہٗمَہَٰنَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْآنُ اور اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ جیسی کھلی نصوص کے ہوتے ہوئے بغیر کسی قوی دلیل کے نہیں کہا جاسکتا کہ نزول قرآن شب برات میں ہوا۔ البتہ شعبان کی پندرہویں شب کو بعض روایات حدیث میں شب برات یا لیلۃ القدر کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس رات کا مبارک ہونا اور اسمیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا ذکر ہے۔ اس کے ساتھ بعض روایات میں یہ مضمون بھی آیا ہے جو اس جگہ لیلۃ مبارکہ کی صفت میں بیان فرمایا ہے یعنی خِیْطُهَا یُفْرَقُ خُلُوعًا فَرِحَیْہِہٖ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا یعنی اس رات میں ہر حکمت والے معاملہ کا فیصلہ ہماری طرف سے کیا جاتا ہے جس کے معنی حضرت ابن عباسؓ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ یہ رات جس میں نزول قرآن ہوا، یعنی شب قدر، اسی میں مخلوقات کے متعلق تمام اہم امور جن کے فیصلے اس سال میں اگلی شب قدر تک واقع ہونے والے ہیں طے کئے جاتے ہیں کہ کون کون اس سال میں پیدا ہونگے، کون کون آدمی اس میں مریں گے، کس کو کس قدر رزق اس سال میں دیا جائے گا۔ یہی تفسیر دوسرے ائمہ تفسیر حضرت قتادہؒ، مجاہدؒ، حسنؒ وغیرہم سے بھی منقول ہے اور مہدوی نے فرمایا کہ معنی اسکے یہ ہیں کہ یہ تمام فیصلے جو تقدیر الہی میں پہلے ہی سے طے شدہ تھے اس رات میں متعلقہ فرشتوں کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں، کیونکہ قرآن وحشت کی دوسری نصوص اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلے انسان کی پیدائش سے بھی پہلے ازل ہی میں لکھ دیئے تھے۔ تو

اس رات میں اُن کے طے کرنا حاصل بھی ہو سکتا ہے کہ قضاء و قدر کی تنفیذ جن فرشتوں کے ذریعہ ہوتی ہے اس رات میں یہ سالانہ احکام ان کے سپرد کر دیے جاتے ہیں (قطبی)

چونکہ بعض روایات حدیث میں شرب برات یعنی شعبان کی پندرہویں شب کے متعلق بھی آیا ہے کہ اس میں آجال و ارزاق کے فیصلے لکھے جاتے ہیں۔ اسلئے بعض حضرات نے آیت مذکورہ میں میلہ مبارکہ کی تفسیر لیلة البرات سے کر دی ہے مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ یہاں اس رات میں نزولِ قرآن کا ذکر سب سے پہلے ہے اور اس کا رمضان میں ہونا قرآن کی نصوص سے متعین ہے۔ اور شرب برات کے متعلق جو یہ مضمون بعض روایات میں آیا ہے کہ اس میں ارزاق وغیرہ کے فیصلے ہوتے ہیں اول تو ابن کثیر نے اس کے متعلق فرمایا کہ یہ روایت مرسل ہے اور ایسی روایت نصوص صریحہ کے مقابلہ میں قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح قاضی ابوبکر بن عربی نے فرمایا کہ نصف شعبان کی رات کے بارے میں کوئی قابلِ اعتماد روایت ایسی نہیں جس سے ثابت ہو کہ رزق اور موت و حیات کے فیصلے اس رات میں ہوتے ہیں بلکہ انہوں نے فرمایا کہ اس رات کی فضیلت میں بھی کوئی قابلِ اعتماد حدیث نہیں آئی لیکن روح المعانی میں ایک بلا سند روایت حضرت ابن عباسؓ سے اس مضمون کی نقل کی ہے کہ رزق اور موت و حیات وغیرہ کے فیصلے نصف شعبان کی رات میں لکھے جاتے ہیں اور شرب قدر میں فرشتوں کے حوالے کئے جاتے ہیں اگر یہ روایت ثابت ہو تو اس طرح دونوں قول میں تطبیق ہو سکتی ہے ورنہ اصل بات جو ظاہر قرآن اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے وہ یہی ہے کہ سورۃ دخان کی آیت میں لیلة مبارکہ اور فیہا یفرق وغیرہ کے سب الفاظ شب قدر ہی کے متعلق ہیں۔ رہا شرب برات کی فضیلت کا معاملہ، سودہ ایک مستقل معاملہ ہے جو بعض روایات حدیث میں منقول ہے مگر وہ اکثر ضعیف ہیں اسی لئے قاضی ابوبکر بن عربی نے اس رات کی کسی فضیلت سے انکار کیا ہے لیکن شرب برات کی فضیلت کی روایات اگرچہ باعتبار سند کے ضعیف سے کوئی خالی نہیں لیکن تعدد طرق اور تعدد روایات سے ان کو ایک طرح کی قوت حاصل ہو جاتی ہے اس لئے بہت سے شائخ نے ان کو قبول کیا ہے کیونکہ فضائل اعمال میں ضعیف روایات پر عمل کر لینے کی بھی گنجائش ہے۔ واللہ اعلم

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ١٠ يَغْشَى النَّاسَ

سو تو انتظار کر اُس دن کا کہ لائے آسمان دُھواں صریح جو گھیر بیوے لوگوں کو

هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ١١ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ١٢

یہ ہے عذاب دردناک اے رب کھول دے ہم پر سے یہ آفت ہم یقین لاتے ہیں

إِنَّا لَهُمُ الذِّكْرَى وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ١٣ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا

ہم ان کے لئے الذکر اور آپ کا اُن کے پاس رسول کھول کر منانے والا پھر اُس سے پیٹھ پھری اور کہنے لگے

مَعْلَمٌ فَجُنُونٌ ۱۳ اِنَّا كَاشِفُو الْعَذَابِ اِنْكُمْ عَائِدُونَ ۱۵

سکھایا ہوا ہے باؤلا ہم کھول دیتے ہیں یہ عذاب تھوڑی مدت تک تم پھر وہی کرو گے

يَوْمَ تَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ اِنَّا مُنْتَقِمُونَ ۱۶

جس دن پکڑیں گے ہم بڑی پکڑ تحقیق ہم بدل لینے والے ہیں

خلاصہ تفسیر

(اور جب یہ لوگ حق کے واضح ہونے کے باوجود نہیں مانتے) سو آپ (ان کے لئے) اُس روز کا

انتظار کیجئے کہ آسمان کی طرف ایک نظر آنے والا دھواں پیدا ہو جو ان سب لوگوں پر عام ہو جاوے یہ

(بھی) ایک دردناک سزا ہے (جو ان کو ہوگی، اس سے مراد غلہ کا قحط ہے جس میں اہل مکہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے مبتلا ہو گئے تھے۔ اور یہ دُعا ایک مرتبہ مکہ میں ہوئی تھی اور ایک بار مدینہ

میں، اور قاعدہ ہے کہ ٹھوک کی شدت اور خشکی میں آسمان و زمین کے درمیان آنکھوں کے سامنے

دھواں سا نظر آیا کرتا ہے۔ غرض اہل مکہ اپنی جانوں سے تنگ آ گئے اور لگے عاجزی کرنے، چنانچہ

پیشین گوئی کے طور پر فرماتے ہیں کہ اس وقت جناب باری میں عرض کریں گے کہ) اے ہمارے رب ہم

سے اس مصیبت کو دور کر دیجئے ہم ضرور ایمان لے آویں گے (چنانچہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی

کہ یوسفیان اور دیگر قریش نے آپ کو لکھا بھی اور آئے بھی کہ آپ دُعا کریں اور ثمامہ رئیس پیامہ

کو جسے غلہ بند کر دیا تھا سمجھا دیں، اور صاحب رُوح نے یوسفیان کا وعدہ ایمان بھی نقل کیا ہے،

آگے انکے اس وعدے کا صدق دل سے نہ ہونا ارشاد فرماتے ہیں کہ) ان کو (اس سے) کب نصیحت

ہوتی ہے (جس سے انکے ایمان کی توقع کی جاوے) حالانکہ (اس کے قبل) انکے پاس ظاہر شان کا

پیغمبر آیا (یعنی جس کی شان نبوت ظاہر تھی) پھر بھی یہ لوگ اس سے سرتابی کرتے رہے اور یہی

کہتے رہے کہ (کسی دوسرے بشر کا) سکھایا ہوا ہے (اور) دیوانہ ہے (پس جب اتنے بڑے سول

کے آنے پر جس کے دلائل رسالت میں کوئی تاویل ہی نہیں ہو سکتی، یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو قحط کے

ہونے پر جس میں بے انصاف آدمی یہ بھی احتمال نکال سکتا ہے کہ یہ ایک معمولی واقعہ ہے جو طبعی سباب

کے تحت ہوا ہے اور کفر کی سزا نہیں ہے کب ایمان لانے کی اُمید ہے، اُن کا یہ کہنا محض دفع الوقتی ہے

مگر خیر ہم (حجت تمام کرنے کے لئے) چندے اس عذاب کو ہٹا دیں گے (مگر) تم پھر اپنی اُسی

(پہلی) حالت پر آ جاؤ گے (چنانچہ یہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ آپ نے دُعا فرمائی، بارش ہوئی،

اور ثمامہ کو بھی خط لکھا کہ غلہ آنے دیں، اور اہل مکہ کو فارغ البالی میسر ہوئی مگر ایمان تو کیا لاتے

وہ نرمی اور شکستگی بھی جاتی رہی، پھر وہی زور اور وہی شور اور چندے اس لئے فرمایا کہ اس عذاب

کے ٹلنے کی مدت صرف دُنیوی زندگی تک ہے پھر مرنیکے بعد جو مصیبت آوے گی اسکا کہیں خاتمہ نہیں، چنانچہ ارشاد ہے کہ) جس روز ہم بڑی سخت پکڑ پکڑائیں گے (اُس روز) ہم (پورا) بدلہ لے لیں گے (یعنی آخرت میں پوری سزا ہوگی)

معارف و مسائل

آیت مذکورہ میں جس دُخان میں کا ذکر بطور پیشین گوئی کے آیا ہے کہ آپ انتظار کریں اس واضح دھوئیں کا جو آسمان پر ہوگا اور لوگوں پر چھا جائے گا، اسکے متعلق حضرات صحابہ و تابعین سے تین قول منقول ہیں۔ اول یہ کہ یہ علامات قیامت میں سے ایک علامت ہے جو قیامت کے بالکل قریب واقع ہوگی۔ یہ قول حضرت علی مرتضیٰؓ اور ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابو ہریرہؓ اور زید بن علیؓ اور حسن بصریؓ، ابن ابی لیلیٰؓ وغیرہ کا ہے اور حضرت ابوسعید خدریؓ اور حذیفہ بن اسید غفاریؓ سے یہ قول مرفوعاً بھی روایت کیا گیا ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ پیشین گوئی واقع ہو چکی ہے اور اسکا مصداق مکہ مکرمہ کا قحط ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے اُن پر مسلط ہوا تھا وہ بھوکوں مرنے لگے، مُردار جانور تک کھانے لگے، آسمان پر بجائے بارشِ دل کے اُن کو دھواں نظر آتا تھا۔ یہ قول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ کا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس دُخان سے مراد وہ گرد و غبار ہے جو فتح مکہ کے روز مکہ مکرمہ کے آسمان پر چھا گیا تھا، یہ قول عبد الرحمن اعرجیؓ وغیرہ کا ہے۔ (قطبی) زیادہ معروف پہلے ہی دو قول ہیں، تیسرے قول کے متعلق ابن کثیرؒ نے فرمایا: ہذا القول غریب جداً بل منکر۔ باقی دونوں کا ذکر احادیث صحیحہ میں آیا ہے روح المعانی نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے اور مذکور الصدر خلاصہ تفسیر بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے ابن کثیرؒ اور قرطبیؒ سے پہلے قول کی ترجیح معلوم ہوتی ہے واللہ اعلم، دونوں اقوال کی روایات حسبِ میل میں صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ بن اسیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بالاخانے سے ہم پر نظر فرمائی، ہم آپس میں علاماتِ قیامت کا تذکرہ کر رہے تھے، آپؐ نے فرمایا کہ قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم دس علامتیں نہ دیکھ لو۔ آفتاب کا مغرب کج جانب سے طلوع ہونا، اور دُخان اور دابہ اور یاجوج ماجوج کا خروج۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور دجال کا خروج اور تین خُسف یعنی زمین میں دھنس جانا۔ ایک خُسف مشرق میں دوسرا مغرب میں تیسرا جزیرۃ العرب میں۔ اور آگ جو قعرِ عدن سے نکلے گی لوگوں کو ہکا کر لے چلے گی جہاں رات کو لوگ سونے کے لئے ٹھہریں گے رُک جاوے گی جہاں دو پہر کو آرام کیلئے رکیں گے یہ بھی رُک جائیگی (ابن کثیر) ابن جریر نے ابوالک اشعریؒ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں

تھیں تین چیزوں سے ڈراتا ہوں۔ ایک دُخان (یعنی دُھواں) جو مومن کے لئے صرف ایک طرح کا زکام پیدا کر دے گا اور کافر کے تمام بدن میں بھر جائے گا یہاں تک کہ اسکے ہر مسموع اور مسموم سے نکلنے لگے گا اور دوسری چیز دابہ (یعنی دابۃ الارض کوئی عجیب قسم کا جانور زمین سے نکلے گا) اور تیسری دجال۔ اس روایت کو ابن کثیر نے نقل کر کے فرمایا (ہذا اسناد جید) اسی مضمون کی ایک روایت بحوالہ ابن ابی حاتم حضرت ابوسعید خدری رض سے بھی ابن کثیر نے نقل کی ہے۔ اور بحوالہ ابن ابی حاتم حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ دُخان کی پیشین گوئی گزری نہیں (بلکہ قرب قیامت میں) یہ دُھواں مومن کے لئے ایک طرح کا زکام پیدا کر دے گا اور کافر کے اندر بھر جائے گا یہاں تک کہ اسکے ہر منفذ سے نکلنے لگے گا اسی طرح کا مضمون بحوالہ ابن جریر حضرت عبداللہ بن عمر رض اور حضرت ابن عباس رض سے بھی نقل کیا ہے جس کو نقل کر کے ابن کثیر نے فرمایا:

هذا اسناد صحيح الى ابن عباس رضي عنهما والافقه و ترجمان القرآن وهكذا قول من وافقه من الصحابة والتابعين رضي مع الاحاديث المرفوعة من الصحاح والحسان وغيرها التي اوردوها مما فيه مقنع ودلالة ظاهرة على ان الدخان من الايات المنتظرة مع انه ظاهر القرآن (فارتقب يوم تأتي السماء بدخان مبين) وعلى ما فسر ابن مسعود انما هو خيال رآه في اعينهم من شدة الجوع والحمى وهكذا قوله تعالى (يغشي الناس) اي يتغشاهم ويحطمهم لو كان امرا خياليا لخص اهل مكة المشركين لما قيل فيه يغشي الناس

حضرت ابن عباس جبرأت اور ترجمان القرآن تکت اسناد صحیح ہے اور یہی قول دوسرے حضرات صحابہ و تابعین کا ہے جنہوں نے ابن عباس رض کی موافقت فرمائی ہے اسکے ساتھ وہ احادیث مرفوعہ جن میں بعض صحیح بعض حسن ہیں وہ بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ دُخان اُن علامات قیامت میں سے ہے جن کا انتظار ہے ابھی آئی نہیں، خصوصاً جبکہ ظاہر الفاظ قرآن بھی اس پر شاہد ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی تفسیر مشہور میں جس دُھویں کا ذکر ہے وہ تو ایک خیالی دُھواں تھا جو بھوک کی شدت سے اُن کی آنکھوں کو محسوس ہوتا تھا اسکے لئے لفظ یغشی الناس بعید معلوم ہوتا کیونکہ یہ خیالی دُھواں تو اہل مکہ کے لئے مخصوص تھا اور یغشی الناس کے الفاظ یہ بتلاتے ہیں کہ وہ سب لوگوں پر عام طور پر چھا جائے گا۔

اور پہلے یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود کے قول کی روایت صحیحین اور مسند احمد اور ترمذی نسائی وغیرہ میں اس طرح آئی ہے کہ حضرت مسروق نے روایت کیا ہے کہ ایک روز ہم کوفہ کی مسجد میں داخل ہوئے جو ابواب کندہ کے قریب تھے وہاں دیکھا کہ ایک واعظ لوگوں کو وعظ سنا رہا ہے اور اس آیت یعنی یَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ کے متعلق اُس نے مخاطبین سے سوال کیا کہ تم جانتے ہو کہ اس دُخان سے کیا مراد ہے پھر فرمایا کہ یہ ایک دُھواں ہوگا جو قیامت کے روز نکلے گا

جو منافقین کے کانوں اور آنکھوں کو لے لیگا اور مؤمن کو اس سے صرف زکام کی سی کیفیت پیدا ہوگی۔
 مسروق کہتے ہیں کہ داعط کی یہ بات سن کر ہم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اُن سے اسکا
 ذکر کیا وہ لیٹے ہوئے تھے گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ اللہ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت
 فرمائی ہے کہ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَ مَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ، یعنی میں تم سے تمہاری خدمت
 تعلیم و تبلیغ کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا اور نہ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو تکلف کوئی بات بنائیں۔
 اسلئے علم کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو نہیں جانتا صاف کہہ دے کہ میں نہیں جانتا اسکا علم اللہ ہی
 کو ہے (تکلف سے بات نہ بناوے) پھر فرمایا کہ اب تمہیں اس آیت کی تفسیر کا ایک واقعہ سنانا ہوں،
 وہ یہ ہے کہ جب قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کو قبول کرنے سے انکار اور اپنے
 کفر پر اصرار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے لئے بددعا فرمائی کہ یا اللہ ان پر ایسا قحط ڈال کہ
 جیسا کہ آپ نے یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں ڈالا تھا۔ اس بددعا کا اثر یہ ہوا کہ یہ لوگ شدید
 قحط میں مبتلا ہو گئے یہاں تک کہ ہڈیاں اور مردار جانور تک کھانے لگے۔ یہ لوگ آسمان کی طرف
 نظریں اٹھاتے تھے تو دھویں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ان کا کوئی
 آدمی آسمان کی طرف نظر اٹھاتا تو بھوک کی شدت سے اس کو دھواں سا نظر آتا تھا۔ اسکے بعد عبداللہ
 بن مسعود رضی اللہ عنہ نے استدلال میں یہ آیت تلاوت فرمائی قَدْ تَقَبَّيْتُمْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُحَانٍ مُّبِينٍ۔
 جب واقعہ پیش آیا تو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست
 کی کہ اپنے قبیلہ مضر کے لئے اللہ سے بارش کی دعا کریں ورنہ وہ سب ہلاک ہو جاویں گے، رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تو اللہ نے بارش دیدی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اِنَّا كَاشِفُ الْعَذَابِ
 قَلِيلًا اِنَّكُمْ عَائِدُونَ، یعنی ہم تمہارے اس عذاب کو چند روز کے لئے ہٹائے لیتے ہیں (مگر جب تم
 مصیبت سے نکل جاؤ گے) تو پھر اپنے کفر کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا پھر وہ اپنے
 پچھلے حال کی طرف لوٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ
 اِنَّا مُنْتَقِمُونَ، یعنی جس دن ہم سخت پکڑ پکڑیں گے اُس دن سے ڈرو، پھر ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے
 فرمایا کہ یہ بطشہ کبریٰ یعنی بڑی سخت پکڑ غزوہ بدر میں ہو چکی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ
 واقعہ نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ پانچ چیزیں گزر چکی ہیں، یعنی دُخان، روم، قمر، بطشہ، الزام
 (ازابن کثیر) دُخان سے مراد اس تفسیر پر مکہ کا قحط ہے، اور روم سے مراد وہ پیش گوئی ہے جو سورہ
 روم میں انکے غلبہ کے متعلق آئی ہے وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَلَيْهِمْ سَيِّغْلِبُونَ، اور قمر سے انشاقِ قمر
 مراد ہے جسکا ذکر اقتربت الساعة وانشاق القمر میں ہے، اور بطشہ تفسیر مذکور کے مطابق غزوہ بدر
 میں کفار قریش کا انجام ہے۔ اور الزام سے اشارہ اس آیت کی طرف ہے فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا۔

آیات مذکورہ میں غور کیجئے تو ان میں چند پیشین گوئیاں ہیں۔ اول دھویں کا آسمان پر ظاہر ہونا اور سب لوگوں پر چھا جانا، دوسرے مشرکین کا اس عذاب سے عاجز آکر ایمان کا وعدہ کر کے اللہ سے ڈرنا یا مانگنا۔ تیسرے اُن کے وعدہ کا جھوٹا ہونا اور بعد میں مُکّر جانا۔ چوتھے اللہ تعالیٰ کا اُن کے جھوٹے وعدے پر بھی بطور اتمام حجت کے کچھ عرصہ کیلئے ان سے عذاب کا ہٹا دینا اور یہ جہلا دنیا کہ تم اس وعدہ پر قائم نہ رہو گے پانچویں پھر دوبارہ اُنکو سخت پکڑ میں پکڑ لینا حضرت عبداللہ بن مسعود کی تفسیر کے مطابق یہ سب کی سب پیشین گوئیاں پوری ہو چکیں، پہلی چار تو مکہ والوں پر قحط شدید مسلط ہونے اور پھر اسکے رفع ہونے کے دوران پوری ہوئیں اور پانچویں غزوہ بدر میں پوری ہو گئی، لیکن اس تفسیر پر ظاہر الفاظ قرآنی سے یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ بھوک کی شدت کے سبب آسمان پر خیالی دھواں نظر آنے کو قرآن کریم نے ثاقی السماء اور دخان میں اور لغشی الناس کے الفاظ سے تعبیر کیا ہو کیونکہ بظاہر ان الفاظ سے عام آسمان پر کھلا ہوا دھواں چھا جانا اور سب لوگوں کا اُس دھوئیں سے متاثر ہونا معلوم ہوتا ہے۔ تفسیر مذکور میں نہ آسمان پر دھویں کا چھا جانا ثابت ہوتا ہے اور نہ لوگوں کا اس دھویں سے متاثر ہونا معلوم ہوتا ہے بلکہ یہ دھواں تو خود اُن کی اپنی شدت مصیبت کا اثر تھا اسی لئے حافظ ابن کثیر نے ظاہر قرآن کے مطابق اسکو ترجیح دی کہ یہ دخان مبین علامات قیامت میں سے ہے اور اسکو ترجیح اس لئے بھی ہے کہ وہ روایات مرفوعہ سے ثابت ہے۔ یہ صرف حضرت عبداللہ بن مسعود کا اپنا قول ہے مگر اس تفسیر پر بظاہر اِنّا کاشف العذاب قلیلاً اِنکو عایدون سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ قیامت میں تو کفار سے کوئی عذاب نہیں ہٹایا جائیگا۔ یہاں چند روز کے لئے عذاب ہٹا دینے کا ذکر کیسے درست ہوگا؟ ابن کثیر نے فرمایا کہ اسکے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ مراد اس سے یہ ہو کہ اگر ہم تمہارے کہنے کے مطابق عذاب ہٹا دیں اور تمہیں پھر دنیا میں ٹوٹا دیں تو تم پھر وہی کفر و انکار کرنے لگو گے جیسا کہ دوسری آیت میں یہی مضمون اس طرح آیا ہے وَ لَوْ رَحَّمْنَاهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِنْ ضَرٍّ لَّالْجُوَانِی طَغٰیَا هُمْ یَعْمٰهُوْنَ، اور ایک اور آیت میں فرمایا وَ لَوْ رَدُّوا لَعَادُوا لِمَا نَهَوْا عَنْهُ، دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کاشف العذاب میں کشف عذاب سے مراد یہ ہو کہ اگرچہ عذاب آنے کے اسباب مکمل ہو چکے اور عذاب تمہارے قریب آچکا ہے مگر کچھ روز کے لئے ہم اس کو مؤخر کر دیتے ہیں جیسا کہ قوم یونس علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے كَشَفْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ، حالانکہ قوم یونس علیہ السلام پر عذاب آ نہیں چکا تھا صرف آثار عذاب نظر آئے تھے اسکو کشف عذاب سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر دخان کی پیش گوئی کو علامات قیامت میں شمار کیا جائے تو کاشف العذاب کے الفاظ سے اس پر بھی کوئی اشکال نہیں رہتا اور اس تفسیر پر یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَ الْكُبْرٰی سے مراد روز قیامت کی پکڑ ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی تفسیر میں جو غزوہ بدر کی پکڑ کو فرمایا ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہے وہ بھی ایک پکڑ سخت ہی تھی

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آگے قیامت میں اُس سے بڑی پکڑ نہ ہو۔ اور اس میں بھی کچھ بعد نہیں معلوم ہوتا کہ قرآن کریم نے کفار مکہ کو ایک آئینہ عذاب سے ان آیات میں ڈرایا ہے اسکے بعد جو بھی عذاب اُن پر آیا اُس کو کسی درجہ میں اسکا مصداق سمجھ کر صحابہ کرامؓ نے ان آیات کا ذکر فرمادیا ہو جس سے اس کے علامات قیامت میں سے ہونے کی نفی نہیں ہوتی جیسا کہ روح المعانی میں علامہ سفارینی کی کتاب البحور النخوة کے حوالہ سے خود حضرت ابن مسعودؓ نے روایت کیا ہے۔

ہما دخان ماضی واحد والذی بقی یملأ ما بین السماء والارض ولا یصیب المؤمن الا بالسکۃ واما الکافر فیشق مسامعہ فیبعث اللہ تعالیٰ عند ذلک الریح الجنوب من الیمین فتقبض روح کل مؤمن ویمیت شرا والناس (روح)

دُخان دو ہیں، ایک گزر چکا (یعنی قحط مکہ کے وقت) اور دوسرا جو باقی ہے وہ آسمان اور زمین کی درمیانی فضا کو بھرے گا اور مؤمن کو اس سے صرف زکام کی کیفیت پیدا ہوگی اور کافر کے تمام منافذ کو پھاڑ ڈالے گا اس وقت اللہ تعالیٰ یمن کی طرف سے جنوبی ہوا بھیج دیں گے جو ہر مؤمن کی روح قبض کر لے گی اور صرف کفار شرار الناس باقی رہ جائیں گے۔

اگرچہ صاحب روح المعانی نے اپنی مختار تفسیر کے مطابق اس روایت کی صحت کے متعلق اپنے شک کا اظہار کیا ہے مگر یہ روایت ثابت ہو جائے تو ظواہر قرآن اور روایت مرفوعہ کیساتھ کوئی تعارض نہیں رہتا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ ۝۱۷

اور چاہتے تھے ہم اُن سے پہلے فرعون کی قوم کو اور آیا اُن کے پاس رسول عزت والا کہ حوالہ کرد

اِلٰی عِبَادِ اللّٰهِ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُولٌ اٰمِیْنٌ ۝۱۸

میرے بندے خدا کے میں تمہارے پاس آیا ہوں بھیجا ہوا مستبر اور یہ کہ چڑھے نہ جاؤ اللہ کے مقابل

اِنِّیْ اَتٰیْکُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝۱۹

میں لاتا ہوں تمہارے پاس سند کھلی ہوئی اور میں پہناہ لے چکا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس

تَرْجُومُوْنٌ ۝۲۰

بات سے کہ تم مجھ کو شکسا کرو، اور اگر تم یقین کرتے مجھ پر تو مجھ سے پڑے ہو جاؤ پھر دعا کی اپنے رہے کہ

هُوَ لَا یَرْجُوْکُمْ مَّجْرُمُوْنَ ۝۲۱

یہ لوگ گنہگار ہیں پھر لے نکل رات سے میرے بندوں کو البتہ تمہارا بھیجا کریں گے

وَائْتْرِکِ الْبَحْرَ رَهَواً اِنَّہُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝۲۲

اور چھوڑ جا دریا کو تھا ہوا البتہ وہ لشکر ڈوبنے والے ہیں بہت سے چھوڑ گئے

جَنَّتْ وَ عِیُوْنَ ۝۲۳

باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور گھر خاصے اور آرام کا سامان جس میں

فِيهَا فُكِهَيْنِ ۝ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَمَا بَكَتْ

باتیں بنایا کرتے تھے یونہی ہوا اور وہ سب ہاتھ لگا دیا یعنی ایک دوسری قوم کے، پھر نہ رویا

عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا

اُن پر آسمان اور زمین اور نہ ملی اُن کو ڈھیل اور ہم نے بچا نکالا

بَنِيْٓ اِسْرٰٓءِیْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِیْنِ ۝ مِنْ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ

بنی اسرائیل کو ذلت کی مصیبت سے جو فرعون کی طرف سے تھی بیشک

كَانَ عَلٰی اُمَّةٍ مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ وَلَقَدْ اخْتَرْنَاهُمْ عَلٰی

وہ تھا چرٹھ رہا حد سے بڑھ جانے والا اور ان کو ہم نے پسند کیا جان بوجھ کر جہان کے

الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاَتَيْنَهُم مِّنَ الْاٰیٰتِ مَا فِیْہِ بَلٰٓءٌ مُّبِيْنٌ ۝

لوگوں سے اور دیں ہم نے ان کو نشانیاں جن میں تھی مدد صریح

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے ان سے پہلے قوم فرعون کو آزمایا تھا اور (وہ آزمائش یہ تھی کہ) اُن کے پاس ایک معزز پیغمبر (یعنی موسیٰ علیہ السلام) آئے تھے (پیغمبر کے آنے سے آزمائش یہ ہوتی ہے کہ کون ایمان لاتا ہے اور کون نہیں لاتا اور انہوں نے اگر فرعون اور فرعون کی قوم سے فرمایا) کہ ان اللہ کے بندوں (یعنی بنی اسرائیل) کو (جن کو تم نے طرح طرح کی تکالیف میں پھنسا رکھا ہے) میرے حوالے کر دو (اور ان سے دست بردار ہو جاؤ کہ میں جہاں اور جس طرح مناسب ہوں کو آزاد کر کے رکھوں) میں تمہاری طرف (خدا کا) فرستادہ (ہو کر آیا) ہوں (اور) دیانتدار ہوں (کوئی بات وحی سے کمی بیشی نہیں کرتا ہوں جو حکم ہوتا ہے پہنچاتا ہوں، پس تم کو ماننا چاہیے) اور یہ (بھی فرمایا) کہ تم خدا سے سرکشی مت کرو (اور حق العباد کا امر تھا اور یہاں حق اللہ کا) میں تمہارے سامنے ایک واضح دلیل (اپنی نبوت کی) پیش کرتا ہوں (مراد اس سے معجزہ عصا وید مبینا ہے) اور جب فرعون و اہل فرعون نے نہ مانا بلکہ باہم مشورہ آپکے قتل کا ہوا اس وقت آپ نے سن کر فرمایا کہ) میں اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں اس سے کہ تم لوگ مجھ کو پتھر (وغیرہ) سے قتل کرو اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو تم مجھ سے الگ ہی رہو (یعنی مجھے تکلیف پہنچانے کے درپے مت ہو کہ مجھ کو تو کوئی نقصان نہ پہنچے گا، مجھ سے اللہ کا وعدہ ہے فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْکُمْ اِلٰہٌ لِّیْکُنْ تَحَارًا جُرْمٌ اور شدید ہو جائے گا، اس لئے خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ ایسا مت کرو مگر وہ کب باز آتے تھے) تب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے رب سے دعا کی کہ یہ بڑے سخت مجرم لوگ ہیں (کہ جرائم سے باز نہیں آتے) اب ان کا فیصلہ کر دیجئے۔ ارشاد ہوا

کہ ہم نے دعا قبول کی اور ان کے فیصلہ کا وقت آگیا) تو اب میرے بندوں (یعنی بنی اسرائیل) کو تم رات ہی رات میں لیکر چلے جاؤ (کیونکہ) تم لوگوں کا (فرعون کی طرف سے) تعاقب (بھی) ہو گا (اس لئے رات میں نکل جانے سے اتنی دُور تو نکل جاؤ گے کہ یہ تعاقب کر کے تم کو پا نہ سکے) اور (اٹھائے سفر میں جو دریا حائل ہو گا) تم اس دریا کو (اول عصا مارنا کہ وہ خشک ہو کر رستہ دیدیگا، پھر پار ہونیکے بعد جب اُس کو اُسی حالت پر دیکھو تو فکر نہ کرنا کہ اسی طرح فرعون بھی شاید پار ہو جائیگا بلکہ تم اُس کو اسی) سکون کی حالت میں (یعنی پانی کے ہٹ جانے اور راستہ کے خشک ہو جانے سے دریا کی جو ہیئت پیدا ہوئی ہے اُسی ہیئت پر) چھوڑ دینا (اور بے فکر رہنا، کیونکہ اُسکے اس حالت میں رہنے کی یہ حکمت ہے کہ) اُن (فرعونوں) کا سارا لشکر (اس دریا میں) ڈبو یا جاوے گا (اس طرح کہ وہ اسیں گھسیں گے اور جب اُس میں آجاویں گے تو چہار طرف سے پانی آئے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پار ہو گئے اور فرعون غرق ہوئے اور) وہ لوگ کتنے ہی باغ اور کتنے ہی (چشے (یعنی نہریں) اور کتنے ہی) کھیتیاں اور (کتنے ہی) عمدہ مکانات (اور کتنے ہی) آرام کے سامان جس میں وہ خوش رہا کرتے تھے چھوڑ گئے (یہ قصہ) اسی طرح ہوا اور ہم نے ایک دوسری قوم کو ان کا مالک بنا دیا (مراد بنی اسرائیل ہیں) سو (چونکہ وہ نہایت مغرض تھے اس لئے) نہ تو اُن پر آسمان زمین کو روتا آیا اور نہ ان کو (عذاب سے کچھ اور) مہلت دی گئی (یعنی اگر کچھ اور جیتے تو عذاب جہنم سے کچھ اور دن بچے رہتے) اور ہم نے (اس طرح) بنی اسرائیل کو سخت ذلت کے عذاب یعنی فرعون (کے ظلم و ستم) سے نجات دی۔ واقعی وہ (فرعون) بڑا سرکش (اور) حد (عبودیت) سے نکل جانے والوں میں سے تھا (ایک نعمت تو بنی اسرائیل پر یہ ہوئی) اور (اسکے علاوہ) ہم نے بنی اسرائیل کو (اور بھی نعمتیں دے کر) اپنے علم (اور حکمت) کی رُوسے (بعض اُمور میں تمام) دُنیا جہان والوں پر (یا تمام اُمور میں ایک بڑے حصہ مخلوق پر مثلاً اُس زمانے کے لوگوں پر) فوقیت دی اور (اُن نعمتوں میں انعام ہونے کے علاوہ اللہ کی قدرت پر دلالت بھی تھی جسکا حاصل یہ ہے کہ) ہم نے اُن کو (اپنی قدرت کی) ایسی (بڑی بڑی) نشانیاں دیں جن میں صریح انعام (پایا جاتا) تھا (یعنی جو احسان ان پر کیا گیا اس میں دو وصف پائے جاتے تھے، انعام ہونا بھی اور دلیل قدرت ہونا بھی۔ پھر بعض ان میں حسی نعمتیں تھیں جیسے فرعون سے نجات دلانا اور بعض معنوی تھیں جیسے علم و کتاب مشاہدہ معجزات)

معارف و مسائل

وَلَا تَلِيَّ عُدُوِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُون (میں اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں اس سے کہ تم مجھے رجم کرو) رجم کے معنی سنگسار کرنے یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کے

بھی آتے ہیں اور کسی کو گالی دینے اور برا بھلا کہنے کے بھی۔ یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں لیکن راجح یہ ہے کہ یہاں سنگسار کرنے کے معنی مراد ہیں کیونکہ فرعون کی قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل غیر کی دھمکیاں دے رہی ہوگی۔

وَأَنزَلْنَا الْبَحْرَ دَٰهِيًا (اور دریا کو سکون کی حالت میں چھوڑ دینا) ”دَٰهِيًا“ کے معنی ہیں ”ساکن“ دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے رفقاء کے پار ہو جانے کے بعد اُن کی خواہش طبعی طور پر یہ ہونی چاہئے تھی کہ دریا دوبارہ اپنی اصلی حالت پر آجائے تاکہ فرعون کا لشکر پار نہ ہو سکے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں تنبیہ فرمادی کہ خود پار ہونے کے بعد سمندر کو اُنکی ہیئت پر ساکن ہی چھوڑ دینا، اور دوبارہ پانی کے جاری ہونے کی فکر مت کرنا، تاکہ فرعون خشک راستہ بنا ہوا دیکھ کر دریا کے بیچوں بیچ پہنچ جائے، اُس وقت ہم دریا کو جاری کر دیں گے اور یہ لشکر ڈوب جائے گا (ابن کثیرؒ)

وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ (اور ہم نے اُنکا وارث ایک دوسری قوم کو بنا دیا) سورۃ شعراء میں تصریح ہے کہ اس ”دوسری قوم“ سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ اور اس پر جو مشہور اشکال ہوتا ہے کہ مشہور تواریخ کے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بنی اسرائیل دوبارہ مصر میں آباد ہوئے، اسکا جواب بھی سورۃ شعراء کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ زمین و آسمان کا رونا | فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ (پس اُن پر آسمان و زمین کو رونا نہیں آیا) مطلب یہ ہے کہ انھوں نے زمین پر کوئی ایسا عمل صالح نہیں کیا تھا کہ اُن کے مرنے سے زمین روئے، اور نہ اُن کا کوئی نیک عمل آسمان تک پہنچا تھا کہ اُن کو آسمان روئے۔ اور یہ بات متعدد روایات سے ثابت ہے کہ کسی نیک بندے کی موت پر آسمان و زمین روتے ہیں۔ حافظ ابو یعلیٰؒ نے حضرت انسؓ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آسمان میں ہر بندے کے لئے دو دروازے مقرر ہیں، ایک سے اسکا رزق نازل ہوتا ہے دوسرے سے اسکا عمل اور اس کی گفتگو اور پہنچتی ہے۔ چنانچہ جب وہ بندہ مرتا ہے تو یہ دو دروازے اُسے یاد کر کے روتے ہیں۔ اسکے بعد آپؐ نے (بطور استشہاد) یہی آیت تلاوت فرمائی کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ، حضرت ابن عباسؓ سے بھی اسی قسم کی روایت مروی ہیں (ابن کثیرؒ) ایک اور حدیث میں جو حضرت شریح بن عبید حضرت عائشہؓ سے مروی ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو مومن بھی ایسی غریب لوطنی کی حالت میں مرتا ہے کہ اس پر کوئی رونے والا نہ ہو تو اس پر آسمان زمین روتے ہیں، اس پر بھی آپؐ نے یہی آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ یہ زمین و آسمان کسی کافر پر نہیں روتے (ابن جریرؒ) حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے کہ انھوں نے نیک آدمی کے مرنے پر آسمان و زمین کے رونے کا ذکر فرمایا (ابن کثیرؒ)

اور بعض حضرات نے آیت کے الفاظ کو مجاز و استعارہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ آسمان و زمین کا حقیقہ رونا مراد نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اُن کا وجود ایسا ناقابل التفات تھا کہ اسکے ختم ہو جانے

پر کسی کو افسوس نہیں ہوا۔ لیکن مذکورہ روایات کی روشنی میں راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آسمان و زمین کا حقیقہٴ روزنامہ مراد ہے کیونکہ جب آیت کے حقیقی معنی ممکن ہیں اور روایات سے بھی اُن کی تائید ہوتی ہے تو خواہ مخواہ اسے مجاز و استعارہ پر محمول کرنے کی ضرورت نہیں۔ رہا یہ شبہ کہ آسمان و زمین میں شعور کہاں ہے جو وہ رو سکیں؟ تو اس کا جواب ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق میں کچھ نہ کچھ شعور ضرور موجود ہے جیسا کہ قرآن کریم کی آیت **إِنَّ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ** سے معلوم ہوتا ہے، اور اب رفتہ رفتہ جدید مسائل بھی اسی نتیجے پر پہنچ رہی ہے۔ ہاں یہ ضروری نہیں کہ آسمان و زمین کا روزنامہ ایسا ہی ہو جیسے انسانوں کا روزنامہ ہوتا ہے، اُنکے رونے کی کیفیت یقیناً مختلف ہوگی جس کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں۔

وَلَقَدْ اخْتَرْنَا لَهُمْ عَلَىٰ عِلْمِنَا (اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے علم کی رو سے دنیا جہان والوں پر فوقیت دی) اس سے بنی اسرائیل کا اُمت محمدیہ علی صاحبہا السلام پر فائق ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ اس سے مراد اُس زمانے کے دنیا جہان والے ہیں اور اس وقت بلاشبہ وہ تمام اقوام سے فضل تھے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت مریمؑ کے لئے **نساء العالمین** پر فضیلت کا قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص پہلو سے بنی اسرائیل کو تمام دنیا اور ہر زمانے کے لوگوں پر کوئی فضیلت حاصل ہو لیکن مجموعی حیثیت سے افضلیت اُمت محمدیہ ہی کو حاصل ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ابن کثیر وغیرہ) اور علیؑ (اپنے علم کی رو سے) کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے پس انکو فوقیت دینا چونکہ ہمارے علم میں حکمت و مصلحت کا تقاضا تھا، اسلئے ہم نے اُن کو فوقیت دیدی۔
وَأَتَيْنَاهُم مِّنَ الْآيَاتِ مَا فِيهَا يَكُونُوا أَقْبِلِينَ (اور ہم نے اُن کو ایسی نشانیاں دیں، جنہیں صریح انعام تھا) نشانوں سے مراد عصا اور ید بیضا وغیرہ کے معجزات ہیں۔ اور **يَكُونُوا** کے دو معنی آتے ہیں، ایک انعام اور دوسرے آزمائش، یہاں دونوں معنی بلا تکلف ممکن ہیں۔ (قرطبی)

إِنَّ هَؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ۖ إِنَّمَا مَوْتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ

یہ لوگ کہتے ہیں اور کچھ نہیں ہمارا یہی مرنا ہے پہلا اور ہم کو

بِمُنْشَرِينَ ۖ فَاتُوا يَا بَنِي آدَمَ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۖ أَهَمْ خَيْرٌ

پھر اٹھنا نہیں بھلائے تو آؤ ہمارے باپ دادوں کو اگر تم سچے ہو بھلا یہ بہتر ہیں

أَمْ قَوْمُ تَبِعَ ۖ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ أَهْلُكُمْ زَانِثُهُمْ كَانُوا

یا تبع کی قوم اور جو اُن سے پہلے تھے ہم نے اُن کو غارت کر دیا بیشک وہ تھے

مُجْرِمِينَ ۖ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعِبَادٍ ۖ

گنہگار اور ہم نے جو بنایا آسمان اور زمین اور جو انکے بیچ ہے کھیل نہیں بنایا

مَا خَلَقْنَاهُمْ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۹﴾ إِنَّ يَوْمَ

اُن کو تو بنایا ہم نے ٹھیک کام پر بہت لوگ نہیں سمجھتے تحقیق فیصلہ

الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَوْلًى شَيْئًا وَ

کا دن وعدہ ہے ان سب کا جس دن کام نہ آئے کوئی رفیق کسی رفیق کے کچھ بھی اور

لَهُمْ يَنْصَرُونَ ﴿۴۱﴾ إِلَّا مَنْ رَحِمَ اللَّهُ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۴۲﴾

نہ اُن کو مدد پہنچے مگر جس پر رحمت کرے اللہ بیشک وہی ہے زبردست رحم والا

خلاصہ تفسیر

یہ لوگ (قیامت کی وعیدیں سن کر قیامت کا انکار کرتے ہیں اور) کہتے ہیں کہ اخیرِ حالت بس یہی ہمارا دنیا کا مرنا ہے اور ہم دوبارہ زندہ نہ ہونگے (مطلب یہ کہ اخیرِ حالت وہ اُفروی زندگی نہیں بلکہ یہ دنیوی موت ہی اخیرِ حالت ہے جس کے بعد کچھ ہونا نہیں ہے) سو (اے مسلمانو!) اگر تم (آخرت کے دعوے میں) سچے ہو تو (انتظار کون کرے، ابھی) ہمارے باپ دادوں کو (زندہ کر کے) لاؤ جو (آگے) ان کے کفریات پر تہدید ہے کہ ان کو ذرا سوچنا چاہیے کہ) یہ لوگ (قوت و شوکت میں) زیادہ بڑھے ہوئے ہیں یا ٹہچ (بادشاہِ مین) کی قوم اور جو قومیں اُن سے پہلے ہو گزری ہیں (مثلاً عاد و ثمود وغیرہ) یعنی یہ قومیں زیادہ بڑھی ہوئی تھیں مگر) ہم نے اُن کو (بھی) ہلاک کر ڈالا (محض اسلئے کہ) وہ نافرمان تھے (سو یہ لوگ اگر نافرمانی سے باز نہ آئیں گے تو یہ کیونکر اپنے کو بچالیں گے) اور (آگے قیامت کی صحت اور حکمت کا بیان ہے کہ) ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اُس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعلِ عبث کرنے والے ہوں (بلکہ) ہم نے ان دونوں کو (ان کی دوسری مخلوق سمیت) کسی حکمت ہی سے بنایا ہے (مثلاً ان سے ایک تو اللہ کی قدرتِ کاملہ پر دلالت ہوتی ہے، دوسرے جزا و سزا کا ثبوت ملتا ہے) لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے (کہ جو ذات ایسے عظیم اجسام کو ابتداء پر پیدا کرنے پر قادر ہو وہ ان کی دوبارہ تخلیق پر بھی قادر ہے) بیشک فیصلہ کا دن (یعنی قیامت کا دن) ان سب (کے دوبارہ زندہ ہونے اور جزا و سزا ملنے) کا وقت مقرر ہے (جس کا وقوع اپنے موقع پر ضرور ہوگا، آگے قیامت کے کچھ واقعات ہیں۔ یعنی) جس دن کوئی علاقہ والا کسی علاقہ والے کے ذرا کام نہ آوے گا، اور نہ اور ہی کسی کی طرف سے، مثلاً ان کے مرنے والے خداؤں کی طرف سے، انکی کچھ حمایت کی جاوے گی، ہاں مگر جس پر اللہ رحم فرمائے (کہ رحمت سے اسکے حق میں باری تعالیٰ کی اجازت سے کی گئی سفارش کام آوے گی اور اللہ اسکا ناصر ہوگا) وہ (اللہ) زبردست ہی (کافروں سے انتقام لے گا) مہربان ہے (مسلمانوں پر رحمت فرماوے گا)۔

معارف و مسائل

فَأَنصَرِبَا بَابِ نَصَرَ أَنْ كُنْتُ خَصْمًا قَيْنَ (اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو لا موجود کرو) قرآن کریم نے اُن کے اس اعتراض کا جواب اس لئے نہیں دیا کہ بالکل ظاہر تھا اور وہ یہ کہ تمام انسانوں کی دوبارہ زندگی کا دعویٰ آخرت میں کیا جا رہا ہے، اُسی وقت اللہ تعالیٰ سب کو زندہ کرے گا۔ دنیا میں موت و حیات قدرت کے مخصوص قوانین اور مصالح کی پابند ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس وقت کسی کو دوسری زندگی عطا نہیں فرما رہا تو یہ اس بات کی دلیل کیسے بن گئی کہ آخرت میں بھی وہ دوبارہ زندہ نہ کر سکے گا۔ منطقی اصطلاح میں اس جواب کو یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ مقید کا عدم وقوع مطلق کے عدم وقوع کو مستلزم نہیں ہو سکتا (بیان القرآن)

قوم یثیع کا واقعہ | اَلْهَمُّ خَيْرٌ اَمَّ قَوْمٌ يُثَيِّعُ، (کیا یہ لوگ شان و شوکت کے اعتبار سے بڑھے ہوئے ہیں یا بے شرف؟) قرآن کریم میں قوم یثیع کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ایک یہاں اور دوسرے سورہ ق میں، لیکن دونوں مقامات پر اسکا صرف نام ہی مذکور ہے کوئی مفصل واقعہ مذکور نہیں۔ اس لئے اس بارے میں مفسرین نے طویل بحثیں کی ہیں کہ اس سے کون مراد ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ یثیع کسی فرد معین کا نام نہیں، بلکہ یہ یمن کے ان حمیری بادشاہوں کا متواتر لقب رہا ہے جنہوں نے ایک عرصہ دراز تک یمن کے مغربی حصہ کو دار السلطنت قرار دیکر عرب، شام، عراق اور افریقہ کے بعض حصوں پر حکومت کی۔ اسی لئے یثیع کی جمع تبايعہ آتی ہے اور ان بادشاہوں کو تبايعہ یمن کہا جاتا ہے یہاں ان تبايعہ میں سے کوئی سا یثیع مراد ہے؟ اس بارے میں حافظ ابن کثیرؒ کی تحقیق زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد یثیع اوسط ہے جبکہ نام اسعد ابو کریم بن ملیک ربیعانی ہے یہ بادشاہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کم از کم سات سو سال پہلے گزرا ہے اور حمیری بادشاہوں میں اسکی مدت سلطنت سب سے زیادہ رہی ہے اس نے اپنے عہد حکومت میں بہت سے علاقے فتح کئے یہاں تک کہ سمرقند تک پہنچ گیا۔ محمد بن حنفیہؒ کی روایت ہے کہ انہی فتوحات کے دوران وہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ کی بستی سے گزرا اور اس پر چڑھائی کا ارادہ کیا۔ اہل مدینہ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ دن کے وقت اس سے جنگ کرتے اور رات کو اس کی مہمانی کرتے۔ اس سے اس کو شرم آئی اور اس نے مدینہ والوں سے لڑائی کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ اسی دوران وہاں کے دو بیٹوی عالموں نے اُسے تنبیہ کی کہ اس شہر پر اسکا بس نہیں چل سکتا اس لئے کہ یہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہجرت ہے، چنانچہ وہ ان یہودیوں کو ساتھ لے لیکر یمن چلا آیا، اور ان یہودیوں کی تعلیم و تبلیغ سے متاثر ہو کر اُس نے دین موسوی کو قبول کر لیا جو اس وقت دین برحق تھا، پھر اس کی

قوم بھی اس سے متاثر ہو کر اسلام لے آئی لیکن اسکی وفات کے بعد یہ قوم پھر گمراہ ہو گئی اور اُسے بُت پرستی اور آتش پرستی شروع کر دی جس کے نتیجے میں اُن پر وہ قہر الہی نازل ہوا جسکا مفصل ذکر سورہ سبأ میں چکا ہے (خلاصہ از تفسیر ابن کثیر ص ۴۲ ج ۲) اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس تیغ کا یہاں ذکر ہے وہ بذات خود اسلام لے آیا تھا البتہ اس کی قوم بعد میں گمراہ ہو گئی تھی یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں دونوں جگہ قوم تیغ کا ذکر کیا گیا ہے، تیغ کا نہیں۔ اسکی تائید حضرت سہیل بن سعد رحمہ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایتوں سے بھی ہوتی ہے جنہیں ابن ابی حاتم، امام احمد رحمہ اور طبرانی رحمہ وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، لَا تَسْبُوا تَبْعَافَانَا قَدْ كَانَ اسلم، تیغ کو بُرا بھلا مت کہو، اس لئے کہ وہ اسلام لے آیا تھا (حوالہ مذکور)

مَا خَلَقْنَاهُمْ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (ہم نے ان دونوں یعنی زمین و آسمان کو کسی حکمت ہی سے بنایا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے) مطلب یہ ہے کہ اگر سوچنے سمجھنے والی عقل ہو تو آسمان و زمین اور ان کے اندر جو مخلوقات پیدا کی گئی ہیں وہ سب بہت سے حقائق پر دلالت کرتی ہیں مثلاً ایک تو قدرت خداوندی پر، دوسرے آخرت کے امکان پر، کیونکہ جس ذات نے ان عظیم اجسام کو عدم سے وجود عطا کیا وہ یقیناً اس بات پر بھی قادر ہے کہ انہیں ایک مرتبہ فنا کر کے دوبارہ پیدا کرے۔ تیسرے جزا و سزا کی ضرورت پر، کیونکہ اگر آخرت کی جزا و سزا نہ ہو تو یہ سارا کارخانہ وجود بیکار ہو جاتا ہے۔ اسکی تخلیق کی تو حکمت ہی یہ ہے کہ اسے دارالامتحان بنایا جائے، اور اسکے بعد آخرت میں جزا و سزا دی جائے ورنہ نیک و بد دونوں کا انجام ایک ہونا لازم آتا ہے جو اللہ کی شانِ حکمت سے بعید ہے۔ چوتھے یہ کائنات سوچنے سمجھنے والوں کو اطاعت خداوندی پر ابھارنے والی بھی ہے کیونکہ یہ ساری مخلوقات اسکا بہت بڑا انعام ہیں، اور بندے پر واجب ہے کہ اس نعمت کا شکر اسکے خالق کی اطاعت کر کے ادا کرے۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقْوِمِ طَعَامُ الْآثِمِينَ ۝۳۳ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي لَبْطُونٍ ۝۳۴

مقرر درخت سیوند کا کھانا ہے گنہگار کا جیسے پگھلا ہوا تانبا کھوتا ہے لبٹوں میں

كَغَلِي الْحَمِيمِ ۝۳۶ خَذُوهُ فَاعْتَلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۝۳۷

جیسے کھوتا پانی پکڑو اس کو اور دھکیل کر بجاؤ تیجوں تیج دوزخ کے پھر

صَبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ ۝۳۸ ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ

ڈالو اس کے سر پر جلتے پانی کا عذاب یہ چکھ، تو ہی ہے بڑا عزت والا

الْكَرِيمِ ۝۳۹ إِنَّ هَذَا مَا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ ۝۴۰ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي

سردار یہ وہی ہے جس میں تم دھوکے میں پڑے تھے بیشک ڈرنے والے گھر

مَقَامٍ اَعِيْنٌ ۵۱) فِيْ جَنَّتٍ وَّعِيُوْنٍ ۵۲) يَلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّ

میں ہیں چین کے باغوں میں اور چشموں میں پہنتے ہیں پوشاک ریشمی پتلی اور

اِسْتَبْرَقٍ مُّتَقَبِلِيْنَ ۵۳) كَذٰلِكَ ۵۴) وَرَوْجُهُمْ يُحَوِّرُ عِيْنٌ ۵۵)

گاڑھی ایک دوسرے کے سامنے اسی طرح ہوگا اور بیاہ دیں ہم اُن کو عورتیں بڑی آنکھوں والیاں

يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِيْنٌ ۵۵) لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ

منگوائیں گے وہاں ہر میوہ دلچسپی سے نہ چکھیں گے وہاں موت

اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُولٰٓئِ وَوَقَّعَهُمُ عَذَابُ الْجَحِيْمِ ۵۶) فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ

مگر جو پہلے آچکی اور بچایا اُن کو دوزخ کے عذاب سے فضل سے تیرے رب کے

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۵۷) فَاِنَّمَا يُسْرِنُ رُءُوسَ سٰٓئِرِكَ لَعَلَّهُمْ

یہی ہے بڑی مراد ملنی سو یہ قرآن آسان کیا ہم نے اسکو تیری بولی میں تاکہ

يَتَذَكَّرُوْنَ ۵۸) فَاَرْتَقِبْ اِنَّهُمْ مَّرْتَقِبُوْنَ ۵۹)

دہ یاد رکھیں اب تو راہ دیکھ وہ بھی راہ تھمتے ہیں

خلاصہ تفسیر

بیشک زقوم کا درخت (جس کی تحقیق سورہ صافات کے دوسرے رکوع میں گزر چکی ہے) بڑے مجرم (یعنی کافر) کا کھانا ہوگا جو (صورت کے مکروہ ہونے میں) تیل کی تلچھن جیسا ہوگا (اور) وہ پیٹ میں ایسا کھولیکا جیسا تیز گرم پانی کھولتا ہے (اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس کو پکڑو پھر گھسیٹتے ہو دوزخ کے نیچوں پہنچ تک لیجاؤ پھر اس کے سر کے اوپر تکلیف دینے والا گرم پانی چھوڑو (اور اس سے بطور استہزار کہا جائے گا کہ) لے چکھ! تو بڑا معزز مکرم ہے (یہ تیری تعظیم ہو رہی ہے جیسا تو دنیا میں اپنے آپ کو معظم و مکرم سمجھ کر ہمارے احکام سے عار کیا کرتا تھا اور دوزخیوں سے کہا جائیگا کہ) یہ وہی چیز ہے جس میں تم شک (والکار) کیا کرتے تھے (یہ تو کافر دوزخیوں کا حال ہوا آگے اہل ایمان کا ذکر ہے کہ) بیشک خدا سے ڈرنے والے امن (چین) کی جگہ میں ہوں گے یعنی باغوں میں اور نہروں میں (اور) وہ لباس پہنیں گے باریک اور دبیز ریشم کا، آمنے سامنے بیٹھے ہونگے (اور یہ) بات اسی طرح ہے اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں سے بیاہ کر دیں گے (اور) وہاں اطمینان سے ہر قسم کے میوے منگاتے ہونگے (اور) وہاں وہ بجز اُس موت کے جو دنیا میں آچکی تھی اور موت کا ذائقہ بھی نہ چکھیں گے (یعنی مریں گے نہیں) اور اللہ تعالیٰ اُن کو دوزخ کے عذاب سے (بھی) بچالے گا (اور) یہ سب کچھ آپ کے رب کے فضل سے ہوگا، بڑی کامیابی

یہی ہے (اور اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا کام اتنا ہے کہ آپ ان کو کہتے رہیں) سو (اسی غرض سے) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان (عربی) میں آسان کر دیا تاکہ یہ (اس کو سمجھ کر اس سے) نصیحت قبول کریں تو (اگر یہ لوگ نہ مانیں تو) آپ (ان پر مصائب کے نزول کے) منتظر رہیں، یہ لوگ بھی (آپ پر مصائب کے نزول کے) منتظر ہیں (پس آپ تبلیغ سے زیادہ فکر میں نہ پڑیں، نہ مخالفت پر رنج کیجئے، ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر کے صبر کیجئے، وہ خود سمجھ لے گا)۔

معارف و مسائل

ان آیات میں آخرت کے کچھ احوال بیان کئے گئے ہیں، اور عادت کے مطابق یہاں بھی قرآن کریم نے دوزخ اور جنت دونوں ہی کے احوال یکے بعد دیگرے بیان فرمائے ہیں۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزُّقُومِ، زقوم کی حقیقت سے متعلق کچھ ضروری باتیں سورۃ صافات کی تفسیر میں لکھی جا چکی ہیں وہاں ملاحظہ فرمائی جائیں۔ یہاں اتنی بات قابل ذکر ہے کہ قرآن کریم کی آیات سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ کفار کو زقوم دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے ہی کھلایا جائے گا کیونکہ یہاں زقوم کھلانے کے بعد یہ حکم مذکور ہے کہ ”اے کھینچ کر دوزخ کے بیچوں بیچ لیجاؤ“ اس کے علاوہ سورۃ واقفہ کی آیت هَلْ أَتَاكُمْ يَوْمَ الْآثِنِ سے بھی بعض حضرات نے یہی سمجھا ہے، کیونکہ ”نزل“ ان کے نزدیک اصلاً مہمان کی اس خاطر تواضع کو کہا جاتا ہے جو اصل دعوت سے پہلے کی جائے، بعد کے کھانے کو ”ضیافہ“ یا ”مأدبہ“ کہتے ہیں۔ یوں قرآنی الفاظ میں احتمال اسکا بھی ہے کہ زقوم کا کھلانا دخول جہنم کے بعد ہو۔ اس صورت میں ”نزل“ کا استعمال دعوت کے اصل کھانے کے معنی میں توسعاً ہوگا۔ اور آیت زیر تفسیر میں جو اس کے بعد جہنم کی طرف گھسیٹ لیجانے کا ذکر ہے اسکا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تھا تو پہلے بھی جہنم ہی میں، لیکن زقوم کھلانے کے بعد اسے مزید تذلیل اور ایذا رسانی کے لئے دوزخ کے وسط میں لیجایا جائے گا۔ واللہ اعلم (محض از بیان القرآن)

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ، ان آیات کے ذریعہ جنت کی سرمدی نعمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور نعمت کی تقریباً تمام اصناف کو جمع کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ انسانی ضرورت کی چیزیں عموماً یہ ہوتی ہیں: عمدہ رہائش گاہ، عمدہ لباس، بہتر شریک زندگی، بہتر ماکولات، پھر ان سب نعمتوں کے باقی رہنے کی ضمانت اور رنج و تکلیف سے مکمل طور پر مامون رہنے کا یقین۔ یہاں ان چھ باتوں کو اہل جنت کے لئے ثابت کر دیا گیا ہے جیسا کہ ان چھ باتوں پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہے۔ یہاں اہل جنت کی قیام گاہ کو ”آمین“ (پرامن) کہہ کر اس طرف بھی اشارہ فرما دیا گیا، کہ انسانی رہائش گاہ کی سب سے قابل تعریف صفت اسکا پرامن یعنی خطرات سے محفوظ ہونا ہے۔

سُنْدُسٍ وَاِسْتَبْرَقٍ، یہ دونوں ریشمی کپڑوں کے نام ہیں، سُنْدُس رقیق ریشم کا کپڑا ہے اور استبرق دبیر ریشم کا۔

وَزَوْجَانَهُمَّ يَحُورِعَيْنِ، تزویج کے معنی اصل میں ہیں کسی کو کسی کا جوڑ قرار دیدینا۔ بعد میں یہ لفظ نکاح کرانے کے معنی میں بکثرت استعمال ہونے لگا ہے۔ اس جگہ اسکے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ جنتی مردوں کا حورِ عین سے باقاعدہ عقدِ نکاح کر دیا جائے گا، اور اگرچہ جنت میں کوئی شخص احکام کا مکلف نہیں ہوگا لیکن یہ عقدِ نکاح بطور اعزاز و اکرام کے ہوگا اسلئے کوئی اشکال نہیں، اور اگر پہلے معنی لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ حورِ عین کو جنتی مردوں کا جوڑا قرار دیدیا جائے گا، اور وہ جنتی عورتیں بطور ہیبت انھیں عطا کر دی جائیں گی اور اس کے لئے دنیا کی طرح عقدِ نکاح کی ضرورت نہیں ہوگی۔

لَا يَكُنْ دُفُونٍ فِيهَا الْمَوْتِ إِلَّا الْمَوْتِ الْأُولَى، مطلب یہ ہے کہ جو موت ایک مرتبہ آچکی بس وہ آچکی، اسکے بعد کوئی موت ان پر نہیں آئے گی۔ اور یہ بات اگرچہ اہل جہنم کو بھی حاصل ہوگی، لیکن ظاہر ہے کہ وہ ان کے لئے اور زیادہ تکلیف کا سبب ہوگی اور اہل جنت کیلئے سرور و کیف میں اضافے کا باعث۔ کیونکہ نعمت خواہ کتنی بڑی ہو اسکے زوال کا تصور لازماً کہ دردت کا سبب ہوتا ہے اور اہل جنت جب یہ تصور کریں گے کہ یہ نعمتیں کبھی ہم سے نہیں چھینیں گی تو اس سے ان کی مسرتوں میں اضافہ ہوگا۔

الحمد للہ کہ آج بتائے ۱۳۹۲ھ بروز پنجشنبہ بوقت نماز عشاء سورہ دُخان کی تفسیر مکمل ہوئی

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَاٰخِرًا وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِينَ



سُورَةُ الْجَاثِيَةِ

سُورَةُ الْجَاثِيَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سَبْعٌ وَثَلَاثُونَ آيَةً وَارْبَعٌ رُكُوعًا

سُورَةُ جَاثِيَةِ مکتہ میں نازل ہوئی اس میں سینتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حَمْدٌ ۱ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۲ إِنَّ فِي

اُتارنا کتاب کا ہے اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے حکمتوں والا بیشک

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُنِينٌ ۳ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا

آسمانوں میں اور زمین میں بہت نشانیاں ہیں ماننے والوں کے واسطے اور تمہارے بنانے میں اور

يَبِيتُ مِنْ دَآبَّةٍ آيَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۴ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ

جس قدر پھیلا رکھے ہیں جانور نشانیاں ہیں لوگوں کے واسطے جو یقین رکھتے ہیں اور بدلنے میں رات

وَالنَّهَارِ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ

دن کے اور وہ جو اتاری اللہ نے آسمان سے روزی پھر زندہ کر دیا

الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ آيَةٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۵

اُس سے زمین کو اسکے مرجانے کے بعد اور بدلنے میں ہواؤں کے نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو سمجھ سے کام لیتے ہیں

تِلْكَ آيَةُ اللَّهِ تَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ أَبَعَدَ

یہ باتیں ہیں اللہ کی ہم سناتے ہیں تجھ کو ٹھیک ٹھیک پھر سونسی بات کو اللہ اور

اللَّهُ وَآيَتِهِ يُؤْمِنُونَ ۶ وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۷ يَسْمَعُ

اُس کی باتوں کو چھوڑ کر مانیں گے غرابی ہے ہر جھوٹے گنہگار کے لئے کہ سناتا ہے

آيَةُ اللَّهِ تُنْذِرُ عَلَيْهِ ثُمَّ يَصِرُ مُسْتَكْبِرًا كَانَ لَمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِيرَةً

باتیں اللہ کی کہ اسکے پاس بڑھی جاتی ہیں، مھر منکر تا ہے غور سے گویا سناتا ہی نہیں، سونو شخیری سنا دے

يَعَذَابُ الْيَوْمِ ۝ وَإِذَا عَلِمَ مِنْ آيَاتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَ هَاهُنَا

اس کو ایک عذاب دردناک کی، اور جب خبر پائے ہماری باتوں میں سے کسی کی، اس کو ٹھہرائے ٹھٹھا

أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝ ۹ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمْ جَهَنَّمَ وَلَا يُغْنِي

ایسوں کو ذلت کا عذاب ہے پر سے اُن کے دوزخ ہے اور کام نہ آئے گا

عَنْهُمْ مَا كَسَبُوا شَيْئًا وَلَا مَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ ۝

انکے جو کمایا تھا ذرا بھی اور نہ وہ کہ جن کو پکڑا تھا اللہ کے سوائے رفیق

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ ۱۰ هَذَا هُدًى وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُبَايِعُهُمْ

اور ان کے واسطے بڑا عذاب ہے یہ سمجھا دیا اور جو منکر ہیں اپنے رب کی باتوں سے

لَهُمْ عَذَابٌ مِنْ رَجْزِ الْيَوْمِ ۝ ۱۱

انکے لئے عذاب ہے ایک بلا کا دردناک

خلاصہ تفسیر

حکم، یہ نازل کی ہوئی کتاب، اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے (اور جب یہ ایسی کتاب ہے تو اسکے مضامین کو خوب توجہ سے سننا چاہیے، چنانچہ اس مقام پر ایک مضمون توحید کا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) آسمانوں اور زمین میں اہل ایمان کے (استدلال کے) لئے بہت سے دلائل (قدرت اور توحید کے) ہیں اور (اسی طرح) خود تمھارے اور ان حیوانات کے پیدا کرنے میں جن کو (زمین پر) پھیلا رکھا ہے (نیز) دلائل (قدرت و توحید) ہیں اُن لوگوں کے (سمجھنے کے) لئے جو یقین رکھتے ہیں اور (اسی طرح) یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اور (اسی طرح) اُس (مادہ) رزق میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اُتارا (مراد بارش ہے) پھر اُس (بارش) سے زمین کو تر و تازہ کیا اسکے خشک ہوئے پیچھے اور (اسی طرح) ہواؤں کے بدلنے میں (باعتماد رسمت اور کیفیت کے کہ کبھی پُر واپے کبھی پچھوا۔ کبھی گرم ہے، کبھی سرد۔ غرض ان سب چیزوں میں) دلائل (قدرت و توحید موجود) ہیں اُن لوگوں کے لئے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں (اس سے توحید پر استدلال کا طریقہ پارہ دوم) فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ الْاُخْرٰی میں گزر چکا ہے اور دوسرا مضمون نبوت کا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو صحیح طور پر ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں (جس سے نبوت ثابت ہوتی ہے لیکن اتنی بڑی دلیل عجز کے باوجود بھی اگر یہ لوگ نہیں مانتے) تو پھر اللہ اور اس کی (ایسی) آیتوں کے بعد اذر کوئی بات (اس سے بڑھ کر ہوگی جس) پر یہ لوگ ایمان لا دیں گے (اور تیسرا مضمون آخرت کا ہے جس میں ان مخالفین حق کو سزا بھی ہوگی جس کا بیان یہ ہے کہ) بڑی فراہی ہوگی ہر ایسے شخص کے

لئے جو (عقائد سے متعلق اقوال ہیں) جھوٹا ہو (اور اعمال میں) نافرمان ہو جو (باد جو دیکھ) خدا کی آیتوں کو سنتا (بھی) ہے جبکہ وہ اسکے روبرو بیٹھ جاتی ہیں (اور) پھر بھی وہ تکبر کرتا ہوا (اپنے کفر پر) اس طرح اڑتا رہتا ہے جیسے اُس نے ان (آیتوں) کو سنا ہی نہیں، سو ایسے شخص کو ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے (اور اُس شخص کی شرارت کا یہ حال ہو کہ) جب وہ ہماری آیتوں میں سے کسی آیت کی خبر پاتا ہے تو اسکی ہنسی اڑتا ہے ایسے لوگوں کیلئے (آخرت میں) ذلت کا عذاب (ہو بیوالا) ہے (مطلب یہ کہ جن آیتوں کو تلاوت میں سنتا ہے انکی بھی تکذیب کرتا ہے اور جن آیتوں کی ویسے ہی خبر سن لیتا ہے انکی بھی تکذیب کرتا ہے غرض تکذیب کی بات میں بہت بڑھا ہوا ہے۔ آگے اُس عذاب کی تعیین ہے یعنی) اُنکے آگے جہنم (آ رہا) ہے اور (اُسوقت) نہ تو اُنکے وہ چیزیں ذرا کام آدیں گی جو (دُنیا میں) کما گئے تھے (اسمیں اموال اور اعمال سب آگئے) اور نہ وہ (کام آدیں گے) جن کو اُنھوں نے اللہ کے سوا کارساز (اور معبود) بنا رکھا تھا اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہوگا (اور وجہ اس عذاب کی یہ ہو کہ) یہ قرآن سرتا سر ہدایت (اور واجب التسلیم) اور (اس کا مقتضایہ ہی ہے کہ) جو لوگ اپنے رب کی (ان) آیتوں کو نہیں مانتے ان کیلئے سختی کا دردناک عذاب ہوگا۔

معارف و مسائل

یہ پوری سورت مکی ہے، صرف ایک قول یہ ہو کہ آیت قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ
آيَاتِ اللَّهِ مدنی ہے اور باقی مکی، لیکن جمہور کے قول کے مطابق پوری سورت قبل الهجرة ہی نازل ہوئی ہے۔
اور دوسری مکی سورتوں کی طرح اسکا بنیادی مضمون عقائد ہی کی اصلاح ہے، چنانچہ اسمیں توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد ہی کو مختلف طریقوں سے مدلل کیا گیا ہے، خاص طور سے آخرت کے اثبات کے دلائل، منکرین کے شبہات اور دہریوں کی تردید اس میں زیادہ تفصیل سے آئی ہے۔

لَا يَرْجُونَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَمِنْهُمْ مُّسْتَكْبِرُونَ، ان آیات سے توحید کا اثبات مقصود ہے۔ اس سے ملتی جلتی آیتیں دوسرے پارے کے رکوع اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْ
میں گزر چکی ہیں، وہیں ان کی مفصل تفسیر مذکور ہے اور یہ بھی کہ ان چیزوں سے توحید کیونکر ثابت ہوتی ہے
دونوں مقامات میں عنوان کا جو تھوڑا تھوڑا فرق ہے اس سے متعلق رکات اہل علم امام رازی کی تفسیر کبیر میں
دیکھ سکتے ہیں۔ البتہ ایک بات قابل ذکر ہے کہ یہاں کائنات کی مختلف نشانیاں بیان فرما کر ایک جگہ
یہ فرمایا گیا ہے کہ اسمیں ایمان لانے والوں کے لئے "نشانیاں ہیں، دوسری جگہ ارشاد ہے کہ "یقین
کرنے والوں کے لئے" نشانیاں ہیں اور تیسری جگہ ارشاد ہے کہ "عقل رکھنے والوں کے لئے نشانیاں
ہیں اسمیں اسلوب کے تنوع کے علاوہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ان نشانیوں سے پورا فائدہ تو وہی
اٹھا سکتے ہیں جو ایمان لے آئیں۔ دوسرے نمبر پر یہ اُن لوگوں کے لئے مفید ہو سکتی ہیں جو خواہ فوراً

ایمان نہ لائیں لیکن انکے دل میں یقین پیدا ہو جائے کہ یہ چیزیں توحید پر دلالت کر رہی ہیں کیونکہ یہ یقین کسی نہ کسی دن ایمان کا سبب بن سکتا ہے اور تیسرے درجہ میں اُن لوگوں کے لئے مفید ہیں جو خواہ فی الحال نہ مومن ہوں نہ یقین رکھنے والے، لیکن عقل سلیم رکھتے ہوں اور ان میں بصیرت کے ساتھ غور کریں۔ کیونکہ عقل و بصیرت کے ساتھ جب بھی ان نشانیوں پر غور کیا جائے گا، بالآخر اس سے ایمان و یقین ضرور پیدا ہو کر رہے گا۔ ہاں جو لوگ عقل سلیم نہ رکھتے ہوں یا ان معاملات میں عقل کو تکلیف دینا ہی گوارا نہ کریں ان کے سامنے ہزار دلائل پیش کر لیجئے سب ناکافی رہیں گے۔

وَبَلِّغْ لِّلْكَافِرِ اَقْبَالَ التَّيْمِ، (بڑی خرابی ہوگی اس شخص کے لئے جو جھوٹا اور نافرمان ہو) اس آیت کے شان نزول میں متعدد روایات ہیں۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نصر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی، بعض میں ہے کہ حارث بن کلدہ کے بارے میں، اور بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد ابو جہل اور اسکے اصحاب ہیں (قطبیؒ) اور درحقیقت قرآنی مفہوم کی تشریح کے لئے کسی ایک شخص کو متعین کرنے کی ضرورت نہیں "کُل" کا لفظ بتا رہا ہے کہ خواہ نزول آیت کے پس منظر میں یہ تینوں افراد ہوں لیکن مراد ہر وہ شخص ہے جو ان جیسی صفات کا حامل ہو۔

مِنْ ذُرِّيَّتِهِم مَّتَّحِمَةً، "وراء" کا لفظ عربی میں "پیچھے" کے لئے زیادہ اور سامنے "کیلئے" کم استعمال ہوتا ہے لیکن اکثر مفسرین نے یہاں "سامنے" کے معنی قرار دیے ہیں۔ چنانچہ خلاصہ تفسیر میں ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے البتہ بعض مفسرین نے "پیچھے" کے معنی لئے ہیں اور مطلب یہ قرار دیا ہے کہ دنیا میں وہ جس نخوت و تکبر کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اسکے پیچھے یعنی بعد میں جہنم آئیوالی ہے (قطبیؒ)

اللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلُکَ فِیْهِ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ

الشَّرْءِ وَہے جس نے بس میں کر دیا تمہارے دریا کو کہ چلیں اسیں جہاز اسکے حکم سے اور تاکہ تلاش کر داسکے

فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۝۱۲ وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی

فَضْلُہٗ سے اور تاکہ تم حق مانو اور کام میں لگا دیا تمہارے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور

الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہٗ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۳ قُلْ

زمین میں سب کو اپنی طرف سے، اسیں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو دھیان کرتے ہیں کہدے

لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُ اللّٰہُ لَہُمْ ذُنُوْبَہُمْ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰہِ لَیْجِزِیْ قَوْمًا

ایمان والوں کو درگزر کریں اُن سے جو اُمید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی تاکہ وہ سزا دے

بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۝۱۴ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖۤ اَوْ مِّنْ اَسَآءَ

ایک قوم کو بدلہ اسکا جو کھاتے تھے، جس نے بھلا کام کیا تو اپنے واسطے اور جس نے بُرا کیا

فَعَلَيْهَا نَزَّلْنَا إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ﴿۱۵﴾

سواپنے حق میں، پھر اپنے رب کی طرف پھیرے جاؤ گے

خلاصہ تفسیر

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے (فائدہ کے) لئے دریا کو مسخر (قدرت) بنایا تاکہ اسکے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ (ان کشتیوں میں سفر کر کے) تم اس کی روزی تلاش کرو اور تاکہ (وہ روزی حاصل کر کے) تم شکر کرو اور (اسی طرح) جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان رب کو اپنی طرف سے (یعنی اپنے حکم اور فضل سے) مسخر (قدرت) بنایا تاکہ تمہارے منافع کا سبب ہو) بیشک ان باتوں میں اُن لوگوں کے لئے دلائل (قدرت) ہیں جو غور کرتے رہتے ہیں اور کفار کی شرارتوں پر بعض اوقات مسلمانوں کو غصہ آجایا کرتا تھا، آگے ان کو درگزر کرنے کا حکم ہے) آپ ایمان والوں سے فرمادیجئے کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو خدا تعالیٰ کے معاملات (یعنی آخرت کی جزا و سزا) کا یقین نہیں رکھتے، تاکہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو (یعنی مسلمانوں کو) انکے (اس) عمل (نیک) کا (اچھا) صلہ دے (کیونکہ وہاں کا قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو شخص نیک کام کرتا ہے سواپنے ذاتی نفع (و ثواب) کے لئے (کرتا ہے) اور جو شخص بُرا کام کرتا ہے اس کا وبال اُسی پر پڑتا ہی پھر (سب نیک و بد کام کر نیچے بعد) تم کو اپنے پروردگار کے پاس ٹوٹ کر جانا ہے (پس وہاں تم کو تمہارے اچھے اعمال و اخلاق کا بہترین صلہ اور تمہارے مخالفین کو ان کے کفر و معاصی پر بدترین سزا دی جائیگی، لہذا تم کو یہاں درگزر ہی مناسب ہے)۔

معارف و مسائل

اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ (تا) وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ، قرآن کریم میں فضل تلاش کرنے سے مراد عموماً کسب معاش کی جدوجہد ہوتی ہے۔ یہاں اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں سمندر میں کشتی رانی پر اس لئے قدرت دی گئی تاکہ اسکے ذریعہ تم تجارت کر سکو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ فضل تلاش کرنے کا کشتی رانی سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ یہ تسخیر بحر کی ایک مستقل قسم ہو، اور مطلب یہ ہو کہ سمندر میں بہنے بہت سی نفع بخش چیزیں پیدا کر کے سمندر کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، تاکہ تم انہیں تلاش کر کے نفع اٹھاؤ۔ چنانچہ جدید سائنس کی رو سے یہ معلوم ہے کہ سمندر میں اس قدر معدنی ذخائر اور زمین کی پوشیدہ دولتیں ہیں کہ اتنی خشکی میں بھی نہیں ہیں۔

قُلْ لِلَّهِ يَنْ أَمْسُوا يَغْفِرُ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ آيَاتُ اللَّهِ، (آپ ایمان والوں سے

فرمادیجئے کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو خدا تعالیٰ کے معاملات کا یقین نہیں رکھتے، اس آیت کے شان نزول میں دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مکہ مکرمہ میں کسی مشرک نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر دشنام طرازی کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کے بدلے میں اُسے کچھ تکلیف پہنچانے کا ارادہ فرمایا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس روایت کے مطابق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ غزوہ بنو المصطلق کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے مُریسج نامی ایک کنوئیں کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ نقیب کا سردار عبداللہ بن ابیؓ بھی مسلمانوں کے لشکر میں شامل تھا، اُس نے اپنے غلام کو کنوئیں سے پانی بھرنے کے لئے بھیجا، اُسے واپسی میں دیر ہو گئی۔ عبداللہ بن ابیؓ نے وجہ پوچھی تو اُس نے کہا کہ حضرت عمرؓ کا ایک غلام کنوئیں کے ایک کنارے پر بیٹھا ہوا تھا، اُس نے کسی کو اس وقت تک پانی بھرنے کی اجازت نہیں دی جب تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے مسکیرے نہیں بھر گئے۔ اس پر عبداللہ بن ابیؓ نے کہا کہ ”ہم پر اور ان لوگوں پر تو وہی مثل صادق آتی ہر سمن کلک یا کلک (اپنے کتے کو موٹا کر دو تو وہ تم کو کھا جائے گا)“ حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ تلوار سنبھا کر عبداللہ بن ابیؓ کی طرف چلے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس روایت کے مطابق یہ آیت مدنی (قرطبی) روح المعانی) ان روایتوں کی اسنادی تحقیق سے اگر دونوں کی صحت ثابت ہو تو دونوں تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ دراصل یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکی تھی، پھر جب غزوہ بنو المصطلق کے موقع پر اُسی سے ملتا جلتا واقعہ پیش آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو اُس موقع پر بھی تلاوت فرما کر واقعہ کو اس پر بھی تطبیق فرمایا۔ اور شان نزول کی روایات میں ایسا بکثرت ہوا ہے یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام یا دوہانی کے لئے غزوہ بنو المصطلق کے واقعہ میں دوبارہ یہ آیت لے آئے ہوں کہ یہ موقع اس آیت پر عمل کرنے کا ہے۔ اُصول تفسیر کی اصطلاح میں اسے ”نزول مکرر“ کہا جاتا ہے اور آیت میں آیات اللہ کے لفظ سے مراد بیشتر مفسرین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے وہ معاملات ہیں جو وہ آخرت میں انسانوں کے ساتھ کرے گا، یعنی جزا و سزا۔ کیونکہ آیات اللہ کا لفظ ”واقعات و معاملات“ کے معنی میں عربی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

یہاں دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ بات یوں بھی کہی جاسکتی تھی کہ ”آپ ایمان والوں سے فرمادیجئے کہ وہ مشرکین سے درگزر کریں“ اس کے بجائے کہا یوں گیا ہے کہ ”ان لوگوں سے درگزر کریں، جو خدا تعالیٰ کے معاملات کا یقین نہیں رکھتے“ اس سے شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ان لوگوں کو پہل سزا آخرت میں دی جائیگی اور چونکہ یہ لوگ آخرت کا یقین نہیں رکھتے اس لئے یہ سزا ان کے لئے غیر متوقع اور اچانک ہوگی، اور غیر متوقع تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے اس لئے انکو پہنچنے والا عذاب بہت سخت ہوگا اور اس کے ذریعہ ان کی تمام بدعنوانیوں کا پورا پورا بدلہ لے لیا جائیگا۔

دنیا میں آپ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کی گرفت کی فکر نہ کیجئے۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس آیت کا حکم جہاد کے احکام نازل ہونے کے بعد منسوخ ہو گیا لیکن بیشتر محقق مفسرین کا کہنا ہے کہ آیت کا جہاد کے حکم سے کوئی تعلق نہیں، یہ تو عام معاشرت میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا انتقام نہ لینے کی تعلیم ہے جو ہر زمانے کے لئے عام ہے اور آج بھی اس کا حکم باقی ہے۔ لہذا اسے منسوخ قرار دینا درست نہیں، خصوصاً اگر اس کا شان نزول غزوہ بنو المصطلق کا واقعہ ہو تو آیات جہاد اسکے لئے ناسخ نہیں بن سکتیں کیونکہ آیات جہاد اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَءِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَزَرَقْنَاهُمْ

اور ہم نے دی بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور پیغمبری اور کھانے کو دیں

مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝۱۶ وَأَتَيْنَاهُم بَيِّنَاتٍ مِّن

ستھری چیزیں اور بزرگی دی ان کو جہاں پر اور دیں ان کو کھلی باتیں دین

الْآخِرِ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعِيَّا بَيْنَهُمْ

کی پھر انھوں نے پھوٹ جو ڈالی تو سمجھ آپکنے کے بعد آپس کی ضد سے

إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝۱۷

بیشک تیرا رب فیصلہ کریگا ان میں قیامت کے دن جس بات میں وہ جھگڑتے تھے

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ

پھر تجھ کو رکھا ہم نے ایک رستہ پر دین کے کام کے سوا تو اسی پر چل اور مت چل خواہشوں

الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝۱۸ إِنَّهُمْ كَنُ يُغْوُوا عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَ

پر نادانوں کی وہ ہرگز کام نہ آئیں گے تیرے اللہ کے سامنے ذرا بھی اور

إِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ ۝۱۹

بے انصاف ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اللہ رفیق ہے ڈرنے والوں کا

هَذَا ابْصَارُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝۲۰

یہ سوچہ کی باتیں ہیں لوگوں کے واسطے اور راہ کی اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو یقین لاتے ہیں

خلاصہ تفسیر

اور نبوت کوئی انوکھی چیز نہیں جو اس کا انکار کیا جائے، چنانچہ اس کے قبل ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (آسمانی) اور حکمت (یعنی علم احکام) اور نبوت دی تھی (یعنی ان میں انبیاء پیدا کئے تھے) اور

ہم نے اُن کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں (اس طرح کہ میدانِ تیرہ میں من و سلوی نازل کیا اور ان کو ملک شام کا مالک بنایا جو برکاتِ ارضیہ کا معدن ہے) اور ہم نے (بعض اُمور میں مثلاً سمندر کو چیر دینا، ابر کا سایہ کرنا وغیرہ) ان کو دنیا جہان والوں پر فوقیت دی اور ہم نے ان کو دین کے بارے میں کھلی کھلی دلیلیں دیں (یعنی اُن کو بڑے صریح معجزات دکھلائے، غرض حسی معنوی، علمی ہر طرح کی نعمتیں دیں) سو (چاہیے تو یہ تھا کہ خوب اطاعت کرتے مگر) انھوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلاف کیا بوجہ آپس کی ضدِ اضدی کے (جسکا بیان پارہ دوم رکوع سَلِّ بَنی إِسْرَآئِیل الخ میں ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو علم اختلافاتِ ختم کرنے کا سبب ہونا چاہیے تھا انھوں نے نفسا نفسی کیوجہ سے اُلٹا اسے اختلاف کا موجب بنالیا، سو) آپ کا رب اُن کے آپس میں قیامت کے روز اُن اُمور میں (عملی) فیصلہ کر دے گا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے، پھر (بنی اسرائیل میں دو ربوت ختم ہونے کے بعد) ہم نے آپ کو (نبوت دی اور آپ کو) دین کے ایک خاص طریقے پر کر دیا، سو آپ اسی طریقے پر چلے جائیے (یعنی عمل میں بھی اور تبلیغ میں بھی) اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلئے (یعنی ان کی خواہش تو یہ ہے کہ آپ تبلیغ ترک کر دیں اور اسی لئے یہ طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں تاکہ آپ تنگ ہو کر تبلیغ چھوڑ دیں، سو آپ سے گویہ احتمال نہیں مگر امر تبلیغ کے اہتمام کے لئے آپ کو پھر اسکا حکم ہوتا ہے۔ آگے اسی طرز پر اس حکم کی علت فرماتے ہیں کہ) یہ لوگ خدا کے مقابلے میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے (پس ان کا اتباع نہ ہونے پائے) اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں (اور ایک دوسرے کا کہنا مانتے ہیں) اور اللہ دوست ہے اہل تقویٰ کا (اور اہل تقویٰ اس کا کہنا مانا کرتے ہیں۔ سو جب آپ ظالم نہیں ہیں بلکہ سردارِ متقین ہیں تو آپ کو انکی اتباع سے کیا نسبت؟ البتہ احکامِ الہی کی اتباع سے خاص نسبت ہے، غرض آپ صاحبِ نبوت شرعی حق ہیں اور) یہ قرآن (جو آپ کو ملا ہے یہ) عام لوگوں کے لئے دانشمندوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین (یعنی ایمان) لانے والوں کے لئے بڑی رحمت (کا سبب) ہے۔

معارف و مسائل

ان آیات کا موضوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات ہے اور اسکے ضمن میں کفار کی اپنا رسانیوں پر آپ کی تسلی بھی فرمائی گئی ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمُ اِنْ مَّا تَكُنْ مِثْلُ
آیات سے دو باتیں مستفاد ہوئیں، ایک تو بنی اسرائیل کو کتاب و نبوت دینے سے آپ کی نبوت کی تائید، دوسرے آپ کی تسلی کہ بنی اسرائیل کو اختلاف کی جو وجہ پیش آئی تھی وہی آپ کی قوم کو آپ کے ساتھ اختلاف کرنے میں پیش آئی ہے یعنی حُبِ دُنیا اور حسد و نِفسا نیت۔ یہ نہیں کہ

آپ کے دلائل میں کچھ کمی ہو پس آپ غم نہ کریں۔ (بیلک الفلان)

پچھلی امتوں کی شریعتوں کا حکم ہمارے لئے | ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ (پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا) یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ دین اسلام کے کچھ تو اصولی عقائد ہیں مثلاً توحید و آخرت وغیرہ اور کچھ علیٰ زندگی سے متعلق احکام ہیں، جہاں تک اصولی عقائد کا تعلق ہے وہ تو ہر نبی کی امت میں یکساں رہے ہیں اور ان میں کبھی ترمیم اور تبدیلی نہیں ہوئی لیکن عملی احکام مختلف انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے بدلتے رہے ہیں، آیت مذکورہ میں انہی دوسری قسم کے احکام کو ”دین کے ایک خاص طریقہ“ سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور اسی وجہ سے فقہاء نے اس آیت سے نتیجہ نکالا ہے کہ امت محمدیہ کے لئے صرف شریعت محمدی ہی کے احکام واجب العمل ہیں۔ پچھلی امتوں کو جو احکام دیئے گئے تھے وہ ہمارے لئے اس وقت تک واجب العمل نہیں ہیں جب تک قرآن و سنت سے ان کی تائید نہ ہو جائے۔ پھر تائید کی ایک شکل تو یہ ہے کہ قرآن یا حدیث میں صراحتاً یہ فرمایا گیا ہو کہ فلاں نبی کی امت کا یہ حکم ہمارے لئے بھی واجب العمل ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ قرآن کریم یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی پچھلی امت کا کوئی حکم بطور تحسین و مدح بیان فرمائیں اور اسکے بارے میں یہ نہ فرمائیں کہ یہ حکم ہمارے زمانے میں منسوخ ہو گیا ہے اس سے بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حکم ہماری شریعت میں بھی جاری ہے اور درحقیقت اس حکم کا واجب العمل ہونا بھی اس صورت میں شریعت محمدی کا ایک جز ہونے کی حیثیت ہی سے ہوتا ہے۔ یہاں اتنی بات سلسلہ کی حقیقت سمجھنے کے لئے کافی ہے تفصیلاً اصول فقہ کی کتابوں میں گوریں۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَوْا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ

کیا خیال رکھتے ہیں جنہوں نے کمائی ہیں بُرائیاں کہ ہم کر دیں گے ان کو برابر ان لوگوں کی جو کہ

أَمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا سَوَاءٌ قَحْبَاهُمْ وَمَا تَهُمُ سَاءَ مَا

یقین لائے اور کئے بھلے کام ایک سا ہے ان کا جینا اور مرنا بُرے دعوے ہیں

يُحْكَمُونَ ﴿٢١﴾ وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ

جو کرتے ہیں اور بنائے اللہ نے آسمان اور زمین جیسے چاہیں اور تاکہ بدلہ پائے

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

ہر کوئی اپنی کمائی کا اور ان پر ظلم نہ ہوگا

خلاصہ تفسیر

یہ (قیامت کا انکار کرنے والے) لوگ جو بُرے بُرے کام (کفر و شرک و ظلم و معصیت) کرتے

(رہتے) ہیں، کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اُن کو اُن لوگوں کے برابر رکھیں گے جنہوں نے ایمان اور عمل صالح اختیار کیا کہ اُن سب کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے (یعنی مومنین کا مرنا جینا بایں معنی یکساں ہو جائے کہ جس طرح زندگی میں لذتوں سے بہرہ اندوز نہ ہوئے اسی طرح موت کے بعد بھی محروم رہیں۔ اور اسی طرح کافروں کا مرنا جینا بھی بایں معنی یکساں ہو جائے کہ جیسے اس زندگی میں عذاب اور تکلیفوں سے بچے رہے اسی طرح مرنے کے بعد بھی عذاب سے مامون رہیں۔ مطلب یہ کہ انکارِ معاد سے یہ لازم آتا کہ اطاعتِ بندوں کو کہیں اطاعت کا پھل نہ ملے اور مخالفین پر کبھی مخالفت کا وبال نہ پڑے) یہ برا حکم رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا (ایک حکمت تو یہ ہے کہ ان عظیم الشان مخلوقات کی تخلیق پر قدرتِ مشاہدہ میں آجانے سے ہر ذی عقل یہ بھی سمجھ لے گا کہ جو پہلی مرتبہ ان چیزوں کو پیدا کر سکتا ہے وہ اُن کو فنا کر کے دوبارہ بھی اسی طرح موجود کر سکتا ہے جس سے قیامت و آخرت کا وجود ثابت ہوتا ہے) اور (دوسری حکمت یہ ہے کہ) تاکہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے (اور یہ سب جانتے ہیں کہ دُنیا میں پورا بدلہ ہے نہیں اس لئے آخرت کا ہونا ضروری ہو گیا) اور (اس بدلہ میں) اُن پر ظلم نہ کیا جاوے گا۔

معارف و مسائل

عالمِ آخرت اور ہمیں جزا و سزا عقلاً ضروری ہے | مذکورہ دو آیتوں میں سے پہلی آیت کا حاصل ایک عقلی استدلال ہے کہ جزا کے ضروری ہونے پر۔ وہ یہ ہے کہ یہ بات تو ہر شخص کے مشاہدہ میں ہے کسی کو اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ دُنیا میں اچھے برے اعمال کا بدلہ پورا نہیں ملتا، بلکہ عام طور سے کفار، نجار، دولت دُنیا اور عیش عشرت میں زندگی گزارتے ہیں اور اللہ کے اطاعت شعار بندے فقر و فاقہ اور مصائبِ آفات میں مبتلا رہتے ہیں۔ اول تو دُنیا میں بدکردار مجرموں کے جرم کا علم ہی اکثر نہیں ہوتا، علم بھی ہو گیا تو اکثر پکڑے نہیں جاتے، کبھی پکڑے بھی گئے تو حلالِ حرام جھوٹ سچ کی پروا کئے بغیر سزا سے بچنے کے راستے ڈھونڈ لیتے ہیں اور سیکڑوں میں کسی ایک کو سزا ہو بھی گئی تو وہ بھی اس کے عمل کی پوری سزا نہیں ہوتی۔ اس طرح خدا تعالیٰ کے باغی اپنی خواہشات کے پیرو اس دُنیا کی زندگی میں وندنا تے پھرتے رہتے ہیں اور بیچارے مومن پابندِ شریعت بہت سی دولت اور لذتوں کو تو حرام سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں اور مصائبِ آفات سے بچنے کے لئے بھی صرف جائز طریقے اختیار کرتے ہیں اس لئے دُنیا میں اُن کا بڑی راحتوں اور لذتوں سے محروم رہنا ظاہر ہے۔ اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ اس دُنیا میں اعمال کی پوری جزا نہیں ملتی تو اب اگر اس دُنیا کے بعد دوسرا عالمِ آخرت اور اس میں دوبارہ زندگی اور جزا و سزا کا نفاذ نہ ہو تو پھر دُنیا میں کسی چوری، ڈاکے، زنا، قتل وغیرہ کو جرم کہنا حماقت کے سوا کیا ہے۔ یہ لوگ تو اکثر دُنیا میں بڑی کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔ ایک چور ڈاکو رات بھر میں اتنی دولت

۵۰

۱۰۔ اہل کرلیتا ہے جو ایک گریجویٹ سالوں کی ملازمت اور محنت سے حاصل نہیں کر سکتا۔ تو اگر آخرت اور اسکا حساب کتاب کچھ نہ ہو تو اس چور ڈاکو کو اس شریف گریجویٹ سے بہتر اور فضل کہنا پڑے گا جو کوئی ذی عقل گوارا نہیں کر سکتا۔ رہا یہ کہنا کہ ان لوگوں پر دنیا میں سخت سزائیں ہر حکومت میں مقرر ہیں مگر آجکل کا تجربہ یہ بتلا رہا ہے کہ مجرم صرف وہ پکڑا جاتا ہے جو بے وقوف ہو، ہوشیار عادی مجرم کے لئے سزا سے بچنے کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک رشوت ہی کا چور دروازہ انکے فرار کیلئے کافی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یا تو یہ تسلیم کیا جائے کہ دنیا میں کوئی بھلائی بُرائی، نیکی بدی کوئی چیز نہیں، اپنا مطلب جس طرح حاصل ہو وہ عین ثواب ہے مگر اسکا دنیا میں کوئی قائل نہیں۔ اور جب نیکی بدی کا امتیاز تسلیم کیا جائے تو پھر دونوں کا انجام برابر ہے بلکہ بد اور مجرم نیک سے زیادہ آرام میں رہے اسکی برابر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔ اسی کو قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ مجرم اور غیر مجرم دونوں کو دنیا و آخرت میں برابر کر دیا جائے سَوَاءٌ تَحْيَا تَهُمَّ وَتَمُوتُ تَهُمَّ یہ نہایت احمقانہ فیصلہ ہے جبکہ دنیا میں نیکی بدی کی جزا سزا پوری نہیں ملتی تو آخرت کی دوسری زندگی اور اس میں جزا سزا ہونا لازمی ہے۔ دوسری آیت میں بھی اسی مضمون کی تکمیل کے لئے فرمایا گیا وَلَيُجْزِيَ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُوَ لَا يُظْلَمُونَ، یعنی ظلم و جور کے مٹانے اور انصاف قائم کرنے کے لئے روز جزا ہونا ضروری ہے۔ رہا یہ شبہ کہ دنیا ہی میں ہر عمل کا بدلہ اچھایا برائیوں نہ نمٹا دیا گیا یہ اس حکمت تکوینی کے خلاف ہے کہ اس عالم کو حق تعالیٰ نے دارالعمل اور دارالامتحان بنایا ہر دارالجزا نہیں بنایا۔ واللہ اعلم

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ

بھلا دیکھ تو جس نے ٹھہرایا اپنا حاکم اپنی خواہش کو اور راہ سے بھلا دیا اسکو اللہ نے جانتا بوجھتا اور مہر

عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَنْ يَهْدِيهِ فَمِنْ

رگادی اسکے کان پر اور دل پر اور ڈال دی اسکی آنکھ پر اندھیری پھر کون راہ پر لائے اس کو

بَعْدَ اللَّهِ أَفَلَا تَنۢ كُرۡهُونَ ﴿۲۳﴾ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا

افتد کے سوائے سو کیا تم غور نہیں کرتے اور کہتے ہیں اور کچھ نہیں بس یہی ہے ہمارا جینا دنیا کا

نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمۢ بِذٰلِكَ مِنْ

ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم جو مرتے ہیں سوزمانے سے اور ان کو کچھ خیر نہیں

عِلۡمٍ اِنْ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۲۴﴾ وَاِذَا نُنۢشِلُہُمۡ اَيۡتُنَا بَيِّنٰتٍ

اس کی محض اہمکیں دوڑاتے ہیں اور جب سنائیں جائیں انکو ہماری آیتیں کھلی کھلی

مَا كَانَ مَحۡجَمًاۤ اِلَّا اَنْ قَالُوۡا اِنۡنَا بِاٰیٰتِنَا اِنْ كُنۡتُمْ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾

اور کچھ دلیل نہیں ان کی مگر یہی کہہتے ہیں اے آہ ہمارے باپ دادوں کو اگر تم سچے ہو

قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

تو کہہ کہ اللہ ہی جلاتا ہے تم کو پھر مار بیگا تم کو پھر اکٹھا کر بیگا تم کو قیامت کے دن تک

لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۲۶)

اس میں کچھ شک نہیں پر بہت لوگ نہیں سمجھتے

خلاصہ تفسیر

سو کیا (توحید و آخرت کے ان واضح بیانات کے بعد) آپ نے اُس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے (کہ جو دل میں آتا ہے اُسی کے پیچھے چلتا رہتا ہے) اور خدا تعالیٰ نے اس کو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا ہے (کہ حق کو سنا اور سمجھا بھی مگر نفسانی خواہش کی پیروی سے گمراہ ہو گیا) اور (خدا تعالیٰ نے) اس کے کان اور دل پر قہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے (یعنی نفس پرستی کی بدولت قبول حق کی صلاحیت نہایت کمزور ہو گئی) سو ایسے شخص کو بعد خدا کے (گمراہ کر دینے کے) کون ہدایت کرے (اس میں تسلی بھی ہے۔ آگے ان منکرین کو زجر کے طور پر خطاب کیے کہ) کیا تم (ان بیانات کو سن کر) پھر بھی نہیں سمجھتے (یعنی ایسا سمجھنا جو نافع ہو۔ اگرچہ عام معنی کے اعتبار سے سمجھتے تھے) اور یہ (قیامت کا انکار کرنے والے) لوگ یوں کہتے ہیں کہ بجز ہماری اس دُنیاوی زندگی کے اور کوئی زندگی (آخرت میں) نہیں ہے ہم (بہی ایک مرنا) مرتے ہیں اور (یہی ایک جینا) جیتے ہیں (مقصود یہ کہ موت کی طرح زندگی بھی دُنیا ہی کے ساتھ خاص ہے) اور ہم کو صرف زمانہ (کی گردش) سے موت آجاتی ہے (مطلب یہ کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ جسمانی قوتیں خسر جاتی رہتی ہیں اور ان اسباب طبعیہ سے موت آجاتی ہے اور اسی طرح حیات کا سبب بھی امور طبعیہ ہیں پس جب موت و حیات اسباب طبعیہ کے تابع ہیں اور اسباب طبعیہ آخرت کی زندگی کا تقاضا نہیں کرتے تو آخرت کی زندگی نہ ہوگی) اور ان لوگوں کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں ہے محض اٹکل سے ہانک رہے ہیں (یعنی اُخروی زندگی کی نفی پر کوئی دلیل نہیں) اور (نہ اہل حق کی دلیل کا وہ کچھ جواب دے سکتے ہیں چنانچہ) جسوقت (اس بارہ میں) ان کے سامنے ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں (جو مطلوب ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں) تو ان کا (اس پر) بجز اس کے اور کوئی جواب نہیں ہوتا کہ کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا کو (زندہ کر کے) سامنے لے آؤ اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو (اور اس جواب کے سوا کوئی اور جواب نہیں دے سکتے مثلاً یہ کہ کسی دلیل عقلی سے اس کا عقلاً محال ہونا ثابت کر دیتے) آپ (ان کے جواب میں) یوں کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو (جب تک چاہتا ہے) زندہ رکھتا ہے پھر (جب چاہے گا) تم کو موت دیگا، پھر قیامت کے دن جس (کے دقوت) میں ذرا

شک نہیں تم کو (زندہ کر کے) جمع کر گیا (پس دعویٰ اُس روز میں زندہ کرنے کا ہے اور دنیا میں مردوں کو زندہ نہ کرنے سے اُس روز میں زندہ کرنے کی نفی لازم نہیں آتی) لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے (اور بلا دلیل حق کا انکار کرتے ہیں)

معارف و مسائل

مَنْ اتَّخَذَ إِلَهًا هَوًى، یعنی وہ شخص جس نے اپنی خواہشاتِ نفسانی کو اپنا معبود بنالیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی کافر بھی اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا خدا یا معبود نہیں کہتا مگر قرآن کریم کی اس آیت نے یہ بتلایا کہ عبادت و حقیقت اطاعت کا نام ہے جو شخص خدا کی اطاعت کے مقابلے میں کسی دوسرے کی اطاعت اختیار کرے وہ ہی اس کا معبود کہلائیگا۔ تو جس شخص کو حلال و حرام اور جائز ناجائز کی پروا نہ ہو، خدا تعالیٰ نے جس کو حرام کہا ہے وہ اس میں خدا کا حکم ماننے کے بجائے اپنے نفس کی پیروی کرے تو گو وہ اپنے نفس کو زبان سے اپنا معبود نہ کہے مگر حقیقت وہی اس کا معبود ہوا۔ اسی مضمون کو کسی عارف نے ایک شعر میں کہا ہے ۵

سودہ گشت از سجدہ راہِ بتاں پیشانیم ۶ چہند بر خود تہمتِ دینِ مسلمانی نہم

اس میں خواہشاتِ نفسانی کو بتوں سے تعبیر کیا ہے۔ جس نے اپنی خواہشات کو ہی امام و مقتدا بنالیا اور ان کے پیچھے چلنے لگا تو گویا یہ خواہشات ہی اسکے بت ہیں۔ حضرت ابوامامہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ زیرِ آسمان دنیا میں جتنے معبودوں کی عبادت کی گئی ہے ان میں سب سے زیادہ بغضِ اللہ کے نزدیک ہوئی ہے یعنی خواہشِ نفسانی۔ حضرت شاد بن ادیسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دانشمند وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور مابعد الموت کے اسطے عمل کرے اور فاجر وہ ہے جو اپنے نفس کو اسکی خواہش کے پیچھے چھوڑ دے اور اسکے باوجود اللہ سے آخرت کی بھلائی کی تمنا کرتا ہے۔ اور حضرت سہل بن عبد اللہ تفسیریؓ نے فرمایا کہ تمہاری بیماری تمہاری نفسانی خواہشات ہیں۔ ہاں اگر تم ان کی مخالفت کرو تو یہ بیماری ہی تمہاری دوا بھی ہے (یہ سب روایات قرطبی سے لی گئی ہیں)۔

وَمَا يَهْدِيكُمْ إِلَّا إِلَهُ الْكَافِرِ، لفظ دہر دراصل اس تمام مدت کے مجموعہ کا نام ہے جو اس عالم کی ابتدا سے انتہا تک ہے، اور کبھی بہت بڑی مدت کو بھی دہر کہہ دیا جاتا ہے۔ کفار نے یہ قول بطور دلیل کے پیش کیا ہے کہ ہماری موت و حیات کا خدا کے حکم و مشیت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اسبابِ طبیعیہ کے تابع ہے جس کا مشاہدہ موت کے متعلق تو سب کرتے ہیں کہ اعضاءِ انسانی اور انکی قوتیں استعمال کے سبب گھٹتی رہتی ہیں اور ایک مانہ دراز گزر جانے کے بعد وہ بالکل معطل ہو جاتی ہیں اسی کا نام موت ہے، اسی پر حیات کو بھی قیاس کر لو کہ وہ بھی کسی خدائی حکم سے نہیں بلکہ مادہ کی طبعی حرکتوں سے حاصل ہوتی ہے۔

دہر یا زمانے کو بُرا کہنا اچھا نہیں | کفار و شرکین زمانے کی گردش ہی کو ساری کائنات اور ان کے سارے حالات کی علت قرار دیتے تھے، اور اُسی کی طرف منسوب کرتے تھے جیسا کہ اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے حالانکہ درحقیقت یہ سب افعال اللہ تعالیٰ جل شانہ کی قدرت و ارادے سے ہوتے ہیں۔ اسی لئے احادیث صحیحہ میں دہر یا زمانے کو بُرا کہنے کی ممانعت آئی ہے کیونکہ کفار جس قوت کو دہر کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں درحقیقت وہ قوت و قدرت حق تعالیٰ ہی کی ہے اسلئے دہر کو بُرا کہنے کا نتیجہ درحقیقت خدا تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دہر کو بُرا نہ کہو کیونکہ دہر درحقیقت اللہ ہی ہے، مراد یہ ہے کہ یہ جاہل جس کام کو دہر کا کام کہتے ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی قوت و قدرت کا کام ہے، دہر کوئی چیز نہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دہر اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے کوئی نام ہو کیونکہ یہاں مجازاً اللہ تعالیٰ کو دہر کہا گیا ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ ۖ يَوْمَ يَخْسِرُ

اور اللہ ہی کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جس دن قائم ہوگی قیامت اُس دن خراب ہونگے

الْمُبْطِلُوْنَ ۝۲۷ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۖ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰى اِلٰى كِتٰبِهَا ۖ

جموئے اور تو دیکھے ہر فرقہ کو کہ بیٹھے ہیں گھٹنوں کے بل، ہر فرقہ بلایا جائے اپنے اپنے دفتر کے پاس

اَلْيَوْمَ نَحْزُوْنَ ۖ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۸ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۖ

آج بدلہ پاؤ گے جیسا تم کرتے تھے یہ ہمارا دفتر ہے بولتا ہے تمہارے کام ٹھیک

لَا تَاْكُنَا لِنَفْسِكُمْ ۖ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۹ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

ہم کھواتے جاتے تھے جو کچھ تم کرتے تھے سو جو لوگ یقین لائے ہیں اور بھلے کام

الصَّٰلِحٰتِ فَيَدْخُلُوْنَ اِلَيْهِمْ فِيْ رَحْمَتِيْ ۖ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝۳۰ وَ

کئے سو ان کو داخل کرے گا ان کا رب اپنی رحمت میں یہ جو ہے میری ہے صریح مراد ملنی اور

اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ اَفْلٰكٌ تَكُنْ اٰیٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ

جو منکر ہوئے کیا تم کو سنائی نہ جاتی سنیں باتیں میری پھرتے غرور کیا اور ہو گئے

قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۱ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۖ وَالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ

تم لوگ گنہگار اور جب کہئے کہ وعدہ اللہ کا ٹھیک ہے اور قیامت میں کچھ شبہ نہیں

فِيْهَا قُلْتُمْ قٰنْذَرٰى ۚ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا اَظْهٰرًا وَمَا نَحْنُ

تم کہتے تھے ہم نہیں سمجھتے کیا ہے قیامت ہم کو آتا تو ہے ایک خیال سا اور ہم کو

بِمُسْتَقْبَلِيْنَ ۝۳۲ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتٌ مَّا عَمِلُوْا ۖ وَحَاقَ بِهٖم مَّا كَانُوْا

یقیناً نہیں ہوتا اور کھل جائیں ان پر بُرائیاں ان کاموں کی جو کئے تھے اور الٹ پڑے اُن پر وہ چیز

بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٣٤﴾ وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنسِفُكُمْ كَمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ

جس پر ہنستا کرتے تھے اور حکم ہو گا کہ آج ہم تم کو بھلا دیں گے جیسے تم نے بھلا دیا تھا اپنے اُس دن کی

هَذَا أَوْ مَا وَكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نَّصِيرِينَ ﴿٣٥﴾ ذَلِكُمْ بِأَنكُمْ اتَّخَذْتُمْ

ملاقات کو اور گھر تمہارا دوزخ ہے اور کوئی نہیں تمہارا مددگار یہ تم پر اس واسطے کہ تم نے پھر اللہ

آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا وَغَرَّتْكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا قَالَ يَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا

کی باتوں کو ہنستا اور ہنکے رہے دنیا کی زندگی بھر سواج نہ اُن کو نکالنا منظور ہے وہاں سے

وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿٣٦﴾ فَلِلَّهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَرَبِّ الْأَرْضِ رَبِّ

اور نہ اُن سے مطلوب ہے توبہ، سوائے اس کے واسطے ہے سب خوبی جو رہے آسمانوں کا اور رب زمین کا رب

الْعَالَمِينَ ﴿٣٧﴾ وَلَهُ الْكِبَرُ يَأْتِي فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٣٨﴾

سارے جہان کا اور اُسی کے لئے بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی عزت و دستِ حکمت والا

خلاصہ تفسیر

اور (۱) پر جو کہا گیا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ تم کو جمع کرے گا“ تو اسکو کچھ مشکل نہ سمجھا جائے کیونکہ اللہ

ہی کی سلطنت ہے آسمانوں میں اور زمین میں (وہ جو چاہے تصرف کرے، پس تمہیں موت کے بعد زندہ کر کے جمع کرنا بھی

اُسکے لئے کوئی مشکل نہیں) اور جس روز قیامت قائم ہوگی اُس روز اہل باطل خسارہ میں پڑیں گے اور آپ (مُحَمَّدؐ)

ہر فرقہ کو دیکھیں گے کہ (مارے خوف کے) زانو کے بل گر پڑیں گے، ہر فرقہ اپنے نامہ اعمال (میں لکھے ہوئے اعمال کے

حساب) کی طرف بلایا جائیگا (یہ مطلب ہے نامہ اعمال کی طرف بلانے کا، ورنہ نامہ اعمال تو خود اُسکے پاس ہونگے اور اُن سے

کہا جائیگا کہ) آج تمکو تمہارے کئے کا بدلہ ملے گا (اور کہا جائیگا کہ) یہ (نامہ اعمال) ہمارا (لکھایا ہوا) دفتر ہے جو

تمہارے مقابلے میں ٹھیک ٹھیک ل ہا رہی (یعنی تمہارے اعمال کو ظاہر کر رہا ہے اور) ہم (دنیا میں) تمہارے سب اعمال کو

(فرشتوں) لکھواتے جاتے تھے (اور یہ اُن ہی کا مجموعہ ہی) سو (حساب کے بعد فیصلہ یہ ہو گا کہ) جو لوگ ایمان لائے تھے اور

انہوں نے اچھے کام کئے تھے تو ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور یہ صریح کامیابی ہو اور جو لوگ کافر تھے

(اُن سے کہا جائیگا کہ) کیا میری آیتیں تم کو پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں سو تم نے (اُنکے قبول کرنے سے) تکبر کیا تھا اور

(اسوجہ سے) تم بڑے مجرم تھے اور (تمہارا یہ حال تھا کہ) جب (تم سے) کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ (دوبارہ

زندہ کر کے جزا و سزا دینے کا) حق ہو اور قیامت میں کوئی شک نہیں ہو تو تم (نہایت بے پرواہی سے) کہا کرتے تھے کہ

ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے (صرف سُسنے سُنانے سے) محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہی اور ہم کو (اسکا)

یقین نہیں اور (اُس وقت) اُن پر اپنے تمام بُرے اعمال ظاہر ہو جائیں گے اور جس (عذاب) کے ساتھ وہ سزا کیا کرتے تھے

وہ انکو آگھیرے گا اور اُن سے) کہا جائیگا کہ آج ہم تم کو بھلا دیتے ہیں (یعنی رحمت سے محروم کئے دیتے ہیں جسکو بھلاانا

مجازاً کہلایا) جیسا تم نے اپنے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا اور (آج سے) تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اور کوئی تمہارا مددگار نہیں یہ (سزا) اسوجہ سے کہ تم نے خدا تعالیٰ کی آیتوں کی ہنسی اڑائی تھی اور تم کو دنیادی زندگی نے دھوکہ میں ڈال رکھا تھا کہ اُس میں مشغول ہو کر آخرت سے بالکل غافل بلکہ منکر ہو گئے تھے) سو آج یہ لوگ نہ تو دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے خدا کی خفگی کا تذکرہ چاہا جائیگا (یعنی اسکا موقع نہ دیا جائیگا کہ تو بہ کر کے خدا کو راضی کر لیں۔ جب تمام مضامین سن لئے) تو (ان سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ) تمام خوبیاں اللہ ہی کے لئے (ثابت) ہیں جو پروردگار ہی آسمانوں کا اور پروردگار ہے زمین کا (اور آسمان و زمین ہی کی کیا تخصیص ہو وہ تو) پروردگار ہی تمام عالم کا اور اسی کو بڑائی ہے (جسکا ظہور آثار و علامات ہے) آسمان و زمین میں درہور باہری اور وہی زبردست حکمت والا ہے۔

معارف و مسائل

وَتَوَى كُلُّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً، جُثُو سے مشتق ہے جس کے معنی گھٹنوں کے بل بیٹھنے کے ہیں اور حضرت سفیان نے فرمایا، جُثُو اس طرح بیٹھنے کو کہتے ہیں کہ جس میں زمین پر صرف گھٹنے اور پادوں کے پنجے ٹپک جائیں، اس طرح کی نشست ہول اور خوف کی وجہ سے ہوگی۔ اور ظاہر کُلِّ أُمَّةٍ کے لفظ سے یہ ہے کہ یہ صورت خوف تمام اہل مشرکوں کا فریاد بد سب کو پیش آئے گی اور بعض دوسری آیات اور روایات میں جو محشر کے خوف و فرار سے انبیاء و صلحاء کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے یہ اسکے منافی نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ یہ دہشت و خوف تھوڑی مدت کے لئے انبیاء و صلحاء پر بھی طاری ہو، مگر تھوڑی دیر قلیل ہونے کی بنا پر اسکو نہ ہونے کے حکم میں رکھا گیا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کُلِّ أُمَّةٍ سے مراد عام اہل محشر نہ ہوں بلکہ اکثر مراد ہوں جیسا کہ لفظ کُلِّ بعض اوقات اکثر کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے جاثیہ کے معنی ایسی نشست کے کئے ہیں جیسے نمازیں ہوتی ہے تو پھر وہ اشکال خود ہی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ نشست خوف کی نہیں ادب کی نشست ہے۔ کُلِّ أُمَّةٍ تَدْعِي إِلَى كَيْدِهَا، کتاب سے مراد اس جگہ اکثر مفسرین کے نزدیک نامہ اعمال ہے جو فرشتے دنیا میں لکھتے رہے تھے اور اب محشر میں یہ صحائف اعمال اُڑا دیئے جائیں گے ہر ایک آدمی کا نامہ اعمال اسکے ہاتھ میں پہنچ جائیگا اور اس سے کہا جائے گا اَقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حِجَابًا یعنی اپنا نامہ اعمال پڑھ لو اور خود ہی حساب لگا لو کہ تمہیں ان اعمال کا کیا بدلہ ملنا چاہیے۔ اور اس اعمال نامہ کی طرف بلانے کا مطلب انکے حساب کی طرف بلانا ہے جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں آچکا ہے۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ

تَمَّتْ سُورَةُ الْجَاثِيَةِ الْحَادِي عَشْرَةَ مِنْ رَجَبِ سَنَةِ ١٣٩٥ هـ بِإِذْنِ اللَّهِ الْحَمْدُ لِلَّهِ



سُورَةُ الْاِحْقَافِ

سُورَةُ الْاِحْقَافِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسُونَ وَثَلَاثُونَ آيَةً وَارْبَعُونَ رُكُوعًا
سورۃ احقاف ۵۰ آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حَمْدٌ ۱ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۲ مَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ

اُتارنا کتاب کا ہے اللہ زبردست حکمت والے کی طرف سے ہم نے جو بنائے آسمان

وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَمَّا

اور زمین اور جو اُن کے پیچ میں ہے سو ٹھیک کام پر اور ایک ٹھہرے وعدہ پر اور جو لوگ منکر ہیں وہ

أُنذِرُوا مَعْزُضُونَ ۳ قُلْ أَرَأَيْتُمْ قَاتِلُ دُعُونِ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي

دُرکوشن کر منہ پھیر لیتے ہیں تو کہہ بھلا دیکھو تو جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوائے دکھلاؤ تو مجھ کو

مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَوَاتِ إِيْتُونِي بِكِتَابٍ

انہوں نے کیا بنایا زمین میں یا اُن کا کچھ سا بھاء ہے آسمانوں میں لاؤ میرے پاس کوئی کتاب

مِّنْ قَبْلِ هَذَا أَوْ أَثَرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۴ وَمَنْ

اس سے پہلے کی یا کوئی علم جو چلا آتا ہو اگر ہو تم سچے اور اس سے

أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ

زیادہ گمراہ کون جو بیکار ہے اللہ کے سوائے ایسے کو نہ پہنچے اس کی پکار کو دن قیامت

الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَفِلُونَ ۵ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا

تک اور اُن کو غیر نہیں اُن کے پکارنے کی اور جب لوگ جمع ہوں گے وہ ہونگے

لَهُمْ أَعْدَاءُ وَكَانُوا لِعِبَادَتِهِمْ كُفَرِينَ ۶

انکے دشمن اور ہونگے اُن کے پوجنے سے منکر

خلاصہ تفسیر

حمد (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) یہ کتاب اللہ زبردست حکمت والے کی طرف سے بھیجی گئی ہے (اس لئے اسکے مضامین قابل غور ہیں، آگے توحید اور معاد کا بیان ہو کہ) ہم نے آسمان اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں حکمت کے ساتھ اور ایک میعاد معین (تک) کے لئے پیدا کیا ہے اور جو لوگ کافر ہیں ان کو جس چیز سے ڈرایا جاتا ہے (مثلاً یہ کہ توحید کے انکار پر تم کو قیامت میں عذاب ہوگا) وہ اس سے بے رنجی (اور بے اتفاقی) کرتے ہیں (اور توحید کو قبول نہیں کرتے)۔ آپ (ان سے توحید کے بارہ میں) کہیے کہ یہ تو بتلاؤ جن چیزوں کی تم خدا (کی توحید) کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو (ان کے مستحق عبادت ہونے کی کیا دلیل ہے، اگر دلیل عقلی ہے تو) مجھ کو یہ دکھلاؤ کہ انھوں نے کون سی زمین پیدا کی ہے یا اسکا آسمان (کے پیدا کرنے) میں کچھ حصہ ہے (اور ظاہر ہے کہ تم بھی ان کو خالق نہیں مانتے جو کہ دلیل ہو سکتی ہے مستحق عبادت ہونے کی، بلکہ مخلوق کہتے ہو جو کہ مستحق عبادت ہونے کے منافی ہے پس دلیل عقلی تو مفقود ہوئی اور اگر تمہارے پاس دلیل نقلی ہے تو) میرے پاس کوئی (صحیح) کتاب (لاؤ جس میں شرک کا حکم ہو اور) جو اس (قرآن) سے پہلے کی ہو (کیونکہ تم بھی جانتے ہو کہ قرآن میں شرک کی نفی ہے پس کسی اور ہی کتاب کی ضرورت ہوگی) یا (اگر کتاب نہ ہو تو) کوئی اور (معتبر) مضمون (جو زبانی) منقول (ہونا چلا آتا ہو اور کتاب میں مدون نہ ہو) لاؤ اگر تم (دعویٰ شرک میں) سچے ہو (مطلب یہ کہ دلیل نقلی کا قابل تصدیق اور مستند ہونا ضروری ہے کسی نبی کی کتاب ہو یا ان کا زبانی قول ہو) اور (ظاہر ہے کہ ایسی دلیل کوئی پیش نہیں کر سکتا مگر جو اپنے باطل عقیدے سے پھر بھی باز نہ آئے ایسے شخص کے بارے میں فرماتے ہیں کہ) اُس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو (دلیل سے عاجز ہونے اور اسکے خلاف پر دلیل قائم ہونے کے باوجود) خدا کو چھوڑ کر ایسے معبود کو پکارے جو قیامت تک بھی اسکا کہنا نہ کرے اور ان کو ان کے پکارنے (تک) کی بھی خبر نہ ہو اور (پھر) جب (قیامت میں) سب آدمی (حساب کے لئے) جمع کئے جائیں تو وہ (معبود) ان عبادت کرنے والوں کے دشمن ہو جائیں اور ان کی عبادت ہی کا انکار کر بیٹھیں (پس ایسے معبود کی عبادت کرنے سے بڑھ کر کیا غلطی ہے کہ عبادت کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں اور عبادت نہ کرنے سے اسباب و وجوہ بکثرت ہیں)

معارف و مسائل

قُلْ اَرَأَيْتُمْ مِمَّا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ، ان آیات میں مشرکین کے دعوئے شرک کو باطل کرنے کے لئے ان سے ان کے دعوئے پر دلیل کا مطالبہ کیا گیا ہے کیونکہ کوئی دعویٰ بغیر شہادت و دلیل کے عقلاً یا شرعاً قابل عمل نہیں ہوتا۔ پھر اسمیں جتنی قسمیں دلائل کی ہو سکتی ہیں سب کو جمع کر دیا ہے اور

ثابت کیا ہے کہ تمہارے دعوے پر کسی قسم کی بھی دلیل و شہادت موجود نہیں اس لئے اس بے دلیل دعوے پر قائم رہنا گمراہی ہے۔ دلائل کی اس آیت میں تین قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک عقلی دلیل جس کی نفی کے لئے فرمایا اَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِى السَّمٰوٰتِ، دوسری قسم دلیل نقلی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں دلیل نقلی وہی معتبر ہو سکتی ہے جو خود حق تعالیٰ کی طرف سے آئی ہو جیسے آسمانی کتابیں تو رات انجیل اور قرآن وغیرہ یا ان حضرات کے اقوال جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول و نبی منتخب کیا ہے۔ ان دونوں قسموں میں سے پہلی قسم کی نفی تو اس سے فرمائی اَيُّتُورِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا، یعنی اگر تمہارے پاس بُت پرستی کی کوئی دلیل نقلی موجود ہے تو کسی آسمانی کتاب کو پیش کر دو جس میں بت پرستی اور شرک کی اجازت دی گئی ہو۔ اور دوسری قسم یعنی اقوال انبیاء کی نفی کیلئے فرمایا، اَوْ اَشْرَاقٍ مِّنْ يَّعْلُو، یعنی اگر اللہ کی کسی کتاب میں تم شرک و بُت پرستی کی کوئی دلیل و شہادت نہیں دکھا سکتے تو کم از کم انبیاء میں سے کسی کا قول دکھلاؤ جو سند معتد کے ساتھ اسے ثابت ہو۔ اور جب تم یہ بھی پیش نہیں کر سکتے تو تمہارا قول و عمل بجز گمراہی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ لفظ اَشْرَاقٍ مِّنْ يَّعْلُو میں آثر کا مصدر ہے بروزن شجاعت سماحت وغیرہ جس کے معنی نقل و روایت کے ہیں اسی لئے حضرت عکرمہ اور مقاتل نے اَشْرَاقٍ مِّنْ يَّعْلُو کی تفسیر میں روایت عن الانبياء فرمایا اور قرطبی نے اس کی تفسیر اسناد حسن کے ساتھ فرمائی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ دلیل نقلی کی دو قسمیں معتبر ہیں، ایک آسمانی کتاب جو اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر پر نازل فرمائی، دوسرے پیغمبر کا قول جو اسناد معتبر کے ساتھ پیغمبر سے ثابت ہو۔ اَشْرَاقٍ مِّنْ يَّعْلُو کا یہی مفہوم ہے یہ سب مضمون تفسیر قرطبی سے لیا گیا ہے اور یہی تفسیر مختار اور بے غبار ہے۔ بعض حضرات سے اَشْرَاقٍ مِّنْ يَّعْلُو کی تفسیر میں دوسرے اقوال بھی منقول ہیں مگر وہ ثابت نہیں اور نظم قرآنی کے مناسب بھی نہیں اس لئے ہم ہر کے نزدیک مختار نہیں۔ واللہ اعلم

وَ اِذَا تَنٰثَلٰ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الْحَقُّ لِمَا جَاؤَهُمْ

اور جب مُنَاثَل جائیں اُن کو ہماری باتیں بھلی کھلی کہتے ہیں منکر یہی بات کو جب اُن تک پہنچی

هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۰ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ قُلْ اِنْ افْتَرَيْتُهُ فَلَا

یہ جادو ہے صریح کیا کہتے ہیں یہ بنالایا ہے تو کہہ اگر میں یہ بنالایا ہوں تو تم

تَمْلِكُوْنَ لِیْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۚ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُوْنَ فِیْهِ ۚ كَفَا

میرے اٹھلا نہیں کر سکتے اللہ کے سامنے ذرا بھی اس کو خوب خبر ہے جن باتوں میں تم لگ رہے ہو وہ کافی ہے

بِهٖ شَهِيدًا ۚ بَيِّنٰتٍ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۱۱ قُلْ مَا

حق بتانے والا میرے اور تمہارے بیچ اور وہی ہے بخشنے والا مہربان تو کہہ

كُنْتُ يَدُ عَامِنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يَفْعَلُ بَنِي وَلَا يَكْمُرُ إِنْ

میں کچھ نیا رسول نہیں آیا اور مجھ کو معلوم نہیں کیا ہونا ہے مجھ سے اور تم سے میں اسی

أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ⑨ قُلْ أَرَأَيْتُمْ

پر چلتا ہوں جو حکم آتا ہے مجھ کو اور میرا کام تو یہی ہے ڈرنا دینا کھول کر تو کہہ بھلا دیکھو تو

إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ

اگر یہ آیا ہو اللہ کے یہاں سے اور تم نے اسکو نہیں مانا اور گواہی دے چکا ایک گواہ بنی اسرائیل کا

عَلَىٰ مِثْلِهِ قَامَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ⑩

ایک ایسی کتاب کی، پھر وہ یقین لایا اور تم نے غرور کیا بیشک اللہ راہ نہیں دیتا گنہگاروں کو

خلاصہ تفسیر

اور جب ہماری کھلی کھلی آیتیں (جو کہ معجزہ ہونے کے باعث رسالت کی دلیل ہیں) ان (منکر

رسالت) لوگوں کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو یہ منکر لوگ اس سچی بات کی نسبت جبکہ وہ ان تک پہنچتی ہو

یوں کہتے ہیں کہ یہ صریح جادو ہے (حالانکہ جادو کی نظیر کا ممکن ہونا اور اسکی نظیر کا ممکن نہ ہونا اس قول کے

بطلان کی صریح دلیل ہے اور اس سے بڑھ کر اور سنو) کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے (یعنی آپ نے

نحوذ باللہ) اس (قرآن) کو اپنی طرف سے بنالیا ہے (اور خدا کی طرف منسوب کر دیا۔ آگے اس قول کا

جواب ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں نے اس کو اپنی طرف سے بنالیا ہوگا (اور خدا کے ذمہ لگا دیا ہوگا)

تو (خدا تعالیٰ اپنی عادت کے موافق لوگوں کو دھوکہ سے بچانے کے لئے مجھ کو نبوت کے جھوٹے دعوے

پر جلد ہی ہلاک کر دے گا) پھر (جب وہ مجھ کو ہلاک کرنے لگے گا تو) تم (یا اور) لوگ مجھ کو خدا (کے

عذاب) سے ذرا بھی نہیں بچا سکتے (مطلب یہ کہ نبوت کے جھوٹے دعوے پر عذاب کا ہونا ایسا لازمی

کہ میرا کوئی حامی و مددگار بھی اُسے نہیں روک سکتا، مگر مجھ کو عذاب نہیں ہوا۔ یہ دلیل ہے اس کی کہ میں

اپنے دعویٰ نبوت میں جھوٹا نہیں، اور جب میں جھوٹا نہیں تو یہ سمجھ رکھو کہ) وہ خوب جانتا ہے تم

قرآن میں جو جو باتیں بنا رہے ہو (اسلئے تمکو سزا ہوگی غرض یہ کہ) میرے اور تمہارے درمیان (صدق

و کذب کا فیصلہ کرنے کے لئے) وہ کافی گواہ (یعنی باخبر) ہے (لہذا اگر میں جھوٹا ہوگا مجھ کو فوراً

عذاب دے گا، اور اگر تم جھوٹے ہو گے تو تم کو جلد یا بدیر عذاب دے گا) اور (اگر کسی کو یہ شبہ

ہو کہ جب وہ ہماری باتوں سے واقف ہے اور پھر بھی ہم پر عذاب نہیں آیا تو جس طرح مدعی نبوت پر عذاب

نہ آنا اس کی سچائی کی دلیل ہے اسی طرح ہم منکروں پر عذاب نہ آنا ہماری سچائی کی دلیل بنتی ہے

تو اسکا جواب یہ ہے کہ) وہ بڑی مغفرت والا ہے (اسلئے مغفرت کی بعض اقسام مثلاً دنیا میں

کافروں پر عذاب نہ آتا بھی واقع کر دیتا ہے اور بڑی رحمت والا ہے (اس لئے رحمت کی بعض اقسام بھی جس کو رحمت عامہ کہتے ہیں کفار کے لئے بھی واقع کر دیتا ہے۔ لہذا منکرین کے انکار پر دنیا میں عذاب نہ ہونا ان کے صدق کی دلیل نہیں، برخلاف مدعی نبوت کے کہ وہاں جھوٹا دعویٰ اور عذاب کا نزول دونوں لازم و ملزوم ہیں کیونکہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے کو دنیا میں عذاب نہ دینا لوگوں کی گمراہی کا سبب بن سکتا ہے بخلاف دوسرے مجرموں کے۔ آگے اثبات نبوت کی تاکید ہے کہ آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی انوکھا رسول تو ہوں نہیں (کہ تمہارے لئے باعث تعجب ہو کیونکہ مجھ سے پہلے بہت سے پیغمبر آچکے ہیں جن کی خبر قوا تر سے تم نے بھی سنی ہے) اور (اسی طرح کسی اور عجیب بات کا بھی میں دعویٰ نہیں کرتا جیسا کہ مثلاً علم غیب ہے چنانچہ میں خود کہتا ہوں کہ مجھ کو غیب کی باتوں میں سے صرف وہ معلوم ہیں جو وحی سے مجھے بتادی گئی ہیں، غیب کی اور کسی بات کی خبر مجھے نہیں حتیٰ کہ) میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ (یہ معلوم کہ) تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ لہذا جب اپنے اور تمہارے آئندہ حالات کے علم کا میں مدعی نہیں ہوں تو دُور کی غیبی باتوں کے بارے میں تو کیا دعویٰ کرتا، البتہ جن امور کا علم وحی سے ہو گیا ہے خواہ وہ اپنے متعلق ہوں یا غیر کے اور خواہ دنیا کے حالات ہوں یا آخرت کے اس کا علم بیشک مل ہے چنانچہ آگے ارشاد ہے کہ) میں تو (علم عمل میں) صرف اُسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے آتا ہے اور (اسی کی تبلیغ بھی کرتا ہوں۔ اور اگر تم اسکو نہیں مانتے تو میرا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں (جس کو میں دلائل سے ثابت کر چکا ہوں اور اوپر جو الزام افرا کی تردید ”هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ“ سے اجمالاً کی گئی تھی آگے اسکی تفصیل کے طور پر ارشاد ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ تم مجھ کو یہ بتلا دو کہ اگر یہ قرآن منجانب اللہ ہو اور (پھر) تم اسکو منکر ہو اور (کسی دلیل سے اسکو منجانب اللہ ہونے کی مزید تائید بھی ہو جائے مثلاً اسی دلیل سے کہ) بنی اسرائیل (کے علماء) میں سے کوئی (معتبر) گواہ (جو علم دیانت کے اعتبار سے مسلم و معتبر ہو اور ایک ہو یا زیادہ، ماضی میں ہو یا حال میں یا مستقبل میں) اس حبیبی کتاب (یعنی اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے) پر گواہی دیکر ایمان لے آئے اور تم (باوجود بے علم ہونے کے اس کتاب پر ایمان لانے سے) تکبر ہی میں ہو (تو اس صورت میں تم سے زیادہ بے انصاف کون ہوگا اور بے انصاف لوگوں کی یہ حالت ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ بے انصاف لوگوں کو (اُن کے عناد کے باعث) ہدایت نہیں کیا کرتا (بلکہ ہمیشہ گمراہی میں رہتے ہیں اور گمراہی کا انجام آگ ہے)۔

معارف و مسائل

وَمَا آذَىٰ مَا يَفْعَلُ بِي وَلَا يَكْرَهُ اِنْ اَسْتَعِذَّ مَالًا مَّا تُوحِي رَبِّي، اس آیت میں

جملہ ان اکتب بمعنی استثناء کے ہے یعنی میں نہیں جانتا بجز اسکے جو مجھ پر وحی کی جائے۔ اسی بنا پر امام تفسیر ضحاک سے اس آیت کی تفسیر وہ منقول ہے جو خلاصہ تفسیر مذکور میں اختیار کی گئی ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ امور غیبیہ کا علم مجھے صرف وحی کے ذریعہ ہو سکتا ہے جس معاملے کے متعلق وحی سے مجھے علم نہ ہو خواہ وہ میری ذات سے متعلق ہو یا امت کے مومن و کافروگوں سے اور خواہ وہ معاملہ دنیا کا ہو یا آخرت کا اسکی مجھے کچھ خبر نہیں۔ امور غیبیہ کے متعلق میں جو کچھ کہتا ہوں وہ سب وحی الہی سے کہتا ہوں چنانچہ قرآن کریم میں خود مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے شمار علوم امور غیبیہ کے متعلق عطا فرمائے ہیں، **بَلَدَکَ مِنْ اَنْبَاِ الْغَیْبِ نُوْجْہَا اِلَیْکَ**، کا یہی مطلب ہے۔ امور آخرت، دوزخ، جنت، حساب کتاب، سزا و جزا کے متعلق تو تفصیلاً خود قرآن کریم میں بے شمار مذکور ہیں اور دنیا میں پیش آنے والے واقعات آئندہ کی بہت سی تفصیلات احادیث صحیحہ متواترہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں جس سے ثابت ہوا کہ آیت مذکورہ کا حاصل صرف اتنا ہے کہ میں امور غیبیہ کے علم محیط میں خدا تعالیٰ کی طرح نہیں اور ان کے علم میں خود مختار نہیں بلکہ مجھے بواسطہ وحی خداوندی جو کچھ بتلادیا جاتا ہے وہ میں ذکر کر دیتا ہوں۔

تفسیر روح المعانی میں اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے اُس وقت تک خلصت نہیں ہوئے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور آخرت اور دنیا میں پیش آنی والے اہم معاملات سے آپکو بذریعہ وحی باخبر نہیں کر دیا گیا۔ رہا اشخاص و افراد کے جزوی شخصی حالات و معاملات کا علم کہ زید کل کو کیا کام کرے گا اور اسکا انجام کیا ہوگا، عمر بکر اپنے گھروں میں کیا کیا کام کر رہے ہیں یا کریں گے ان امور غیبیہ کا علم نہ کوئی کمال ہونے انکے ہونے سے کمال نبوت میں کوئی فرق آتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کے متعلق تقاضائے ادب یہ ہے کہ یوں نہ کہا جائے کہ آپ غیب نہیں جانتے تھے بلکہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امور غیب کا بہت بڑا علم دیا تھا جو انبیاء میں کسی دوسرے کو نہیں ملا۔ اور بعض حضرات مفسرین نے جو یہ فرمایا کہ اس آیت میں نفی علم صرف امور دنیویہ سے متعلق ہے آخرت کے متعلق علم غیب کی نفی اس میں شامل نہیں (کما ذکرہ القرطبی) انھوں نے غالباً جملہ **اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُؤْتٰنِیْ** کو بمعنی استثناء قرار نہیں دیا اسلئے نفی علم غیب کو امور دنیا کے ساتھ مخصوص فرمایا کیونکہ آخرت کے متعلق تو کھلے طور پر اپنے بتلادیا کہ کافر دوزخ میں اور مومن جنت میں جائے گا۔

وَشَہِدَ شَہِدٌ مِّنْ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی مِثْلِهِ فَاَمَنَ وَاسْتَکْبَرَ ثُمَّ اَسْآتِیْ
کا مضمون تقریباً وہی ہے جو سورہ شعراء کے آخری رکوع کی آیت کا ہے یعنی **اَوْ لَعَلَّ یُکُنْ لَّہُمْ**

آیۃ اَنْ یَعْلَمَ عُلَمَاءُ بَنی اسرائیل جسکا حاصل یہ ہے کہ یہ جاہل یہود و نصاریٰ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کا انکار کرتے ہیں یہ خود اپنی کتابوں سے بھی ناواقف اور جاہل ہیں کیونکہ بہت سے علمائے بنی اسرائیل اپنی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی علامات کا مشاہدہ کر کے آپ پر ایمان لے آئے ہیں۔ کیا اُن علماء کی شہادت بھی ان جاہل لوگوں کے لئے کافی نہیں۔ اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ میرا دعوائے رسالت اور قرآن کا اللہ کی کتاب ہونا غلط اور افترا ہے اول تو اسکے غلط ہونے کے لئے وہ بات کافی ہے جو پہلے ابھی ذکر کی گئی ہے کہ جو شخص اللہ پر ایسا کھلا افترا کرے کہ مجھے اُس نے نبی بنا کر بھیجا ہے اور واقع میں وہ نبی نہیں ہے تو اس پر اس دنیا ہی میں عذاب کے آجانا اور اسکا ہلاک کیا جانا ضروری ہے تاکہ عام لوگ ہمو کے سے بچ سکیں۔ اور بالفرض تم اسکو بھی نہیں مانتے تو کم از کم اس احتمال کو تو نظر انداز نہ کرو کہ اگر میرا دعویٰ صحیح ہوا اور یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہی ہوئی اور تم اس کو کفر و انکار پر جمے رہو تو تمہارا کیا انجام ہوگا خصوصاً اس صورت میں کہ خود تمہاری قوم بنی اسرائیل ہی میں کوئی بڑا آدمی اسکے منجانب اللہ ہونے کی شہادت دے دے اور مسلمان ہو جائے اور تم اس علم کے بعد بھی اپنی ضد اور تکبر پر جمے ہو تو تم کس قدر عذاب کے مستحق ہو گے۔

اس آیت کے الفاظ میں کسی خاص عالم بنی اسرائیل کا نام نہیں لیا گیا اور نہ یہ متعین کیا کہ یہ شہادت اس آیت کے نزول سے پہلے لوگوں کے سامنے آچکی ہے یا آئندہ آنے والی ہے بلکہ ایک جملہ شرطیہ کے طور پر فرمایا ہے کہ اگر ماضی میں بالفعل یا آئندہ ایسا ہو جائے تو تمہیں اپنی فکر کرنا چاہیے کہ تم عذاب سے کیسے بچو گے۔ اس لئے مضمون آیت کا سمجھنا اس پر موقوف نہیں ہے کہ علمائے بنی اسرائیل میں کسے شاہد معین کو اسکا مصداق قرار دیا جائے بلکہ جتنے حضرات یہود و نصاریٰ میں سے داخل اسلام ہوئے جن میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ زیادہ معروف ہیں وہ سبھی اس میں داخل ہیں اگرچہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا ایمان اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مدینہ منورہ میں ہوا اور یہ یووری سورت مکی ہے۔ (ابن کثیرؒ)

اور بعض روایات میں جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے بارے میں نازل ہوئی (کما رواہ البخاری و مسلم والنسائی من حدیث مالک) نیز حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؓ، ضحاکؓ، قتادہؓ وغیرہ ائمہ تفسیر سب نے باتفاق فرمایا کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے متعلق نازل ہوئی ہے، تو یہ اس آیت کے مکی ہونے کے منافی نہیں، کیونکہ اس صورت میں یہ پیشگوئی آئندہ کے لئے ہو جائے گی۔ (کذا قال ابن کثیرؒ)

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا لِلَّذِیْنَ آمَنُوا كُنتُمْ خَيْرًا مَّا سَبَقْتُمْ

اور کہنے لگے منکر ایمان والوں کو اگر یہ دین بہتر ہوتا تو یہ نہ دوڑتے اس پر

إِلَيْهِ وَإِذْ كَذَبْتُمْ بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَذَا آفَكٌ قَدِيمٌ ۝۱۱ وَمِنْ

ہم سے پہلے، اور جب راہ پر نہیں آئے اسکے بتانے سے تو یہ اب کہیں گے یہ جھوٹ ہے بہت پرانا اور اس

قبلہ کتب موسیٰ اِمَامًا وَرَحْمَةً وَهَذَا كِتَابٌ مُصَدِّقٌ

سے پہلے کتاب موسیٰ کی سچی راہ ڈالنے والی اور رحمت اور یہ کتاب ہے اس کی تصدیق کرتی

لِسَانًا عَرَبِيًّا لِّبَنِي النَّازِلِينَ ظَلَمُوا ۝۱۲ وَبُشْرَىٰ لِلْمُحْسِنِينَ ۝۱۳

عربی زبان میں تاکہ ڈر سنائے گنہگاروں کو اور خوشخبری نیکی والوں کو

خلاصہ تفسیر

اور یہ کافر ایمان والوں (کے ایمان لانے) کی نسبت یوں کہتے ہیں کہ اگر یہ قرآن (جس پر یہ لوگ ایمان لائے ہیں) کوئی اچھی (یعنی سچی) چیز ہوتا تو یہ (کم درجہ کے) لوگ اُس کی طرف ہم سے سبقت نہ کرتے (یعنی ہم لوگ بڑے عاقل ہیں اور یہ لوگ کم عقل ہیں، اور حق بات کو عاقل پہلے قبول کرتا ہے تو اگر یہ حق ہوتا تو ہم پہلے مانتے جب ہم نے نہیں مانا تو یہ حق نہیں یہ لوگ بے عقلی سے ادھر دوڑنے لگے ہیں۔ کافروں کا یہ قول انکے انتہائی تکبر کی دلیل ہے جسکا ذکر اوپر استکبر ٹم میں آیا ہے) اور جب (عناد و تکبر کے باعث) ان لوگوں کو قرآن سے ہدایت نصیب نہ ہوئی تو (اپنے عناد اور ضد کی بنا پر) یہی کہیں گے کہ یہ (بھی مثل) قدیمی (جھوٹے مضامین کے ایک) جھوٹ (مضمون) ہے اور اس (قرآن) سے پہلے موسیٰ (علیہ السلام) کی کتاب (نازل ہو چکی) ہے جو (موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کیلئے بالعموم) رہنما (تھی) اور (اہل ایمان کے لئے بالخصوص) رحمت تھی (اور جس طرح توریت میں اسکی پیشین گوئی ہی یہ اسی طرح کی) ایک کتاب ہے جو اُس (کی پیشین گوئی) کو سچا کرتی ہے (اور) عربی زبان میں (ہے) ظالموں کو ڈرانے کے لئے اور نیک لوگوں کو بشارت دینے کے لئے (نازل ہوئی ہے)۔

معارف و مسائل

لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ، تکبر و غرور انسان کی عقل کو بھی مسخ کر دیتا ہے۔ تکبر آدمی اپنی عقل اور اپنے عمل کو معیار حسن و قبح و خیر و شر سمجھنے لگتا ہے جو چیز اسکو پسند نہ ہو خواہ دوسرے لوگ اسکو کتنا ہی اچھا سمجھیں، یہ اُن سب کو بیوقوف سمجھتا ہے حالانکہ خود بیوقوف ہے۔ کفار کے اسی درجہ غرور و تکبر کا اس آیت میں بیان ہے کہ اسلام و ایمان چونکہ اُن کو پسند نہیں تھا تو دوسرے لوگ جو ایمان کے دلدادہ تھے ان کو یہ کہتے تھے کہ اگر یہ ایمان کوئی اچھی چیز ہوتی تو سب سے پہلے ہمیں پسند آتی، ان دوسرے غریب فقیر لوگوں کی پسند کا کیا اعتبار۔

ابن منذر وغیرہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ عمر بن خطابؓ جب مسلمان نہیں ہوئے تھے انکی ایک کنیز جسکا نام زبیرہ تھا پہلے مسلمان ہو گئی تھی یہ اس کو اسکے اسلام پر اتے اور دھمکاتے تھے کہ کسی طرح یہ اسلام کو چھوڑے اور کفار قریش کہا کرتے تھے کہ اسلام کوئی اچھی چیز ہوتی تو زبیرہ جی جی عورت اس میں ہم سے آگے نہ ہوتی، اسکے متعلق آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ (مظہری)

وَمِنْ قَبْلِهِ كُتِبَ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً، اس کلام سے ایک تو ما کُنتُ بِدُعَا قِنِ الرُّسُلِ کا ثبوت ملا کہ آپ کوئی انوکھے رسول اور قرآن کوئی انوکھی کتاب نہیں کہ اُن پر ایمان لانے میں لوگوں کو آشکال ہو بلکہ آپ سے پہلے موسیٰ علیہ السلام رسول ہو کر آچکے ہیں اور اُن پر تورات نازل ہو چکی ہے جس کو یہ کفار یہود و نصاریٰ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ دوسرے اوپر جو شَہِدَ شَهِدٌ آیا ہے اسکی بھی تقویت ہو گئی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام اور تورات خود قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کے شاہد ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

مقرر جنہوں نے کہا رب ہمارا اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے تو نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ وہ

يُخْزَوْنَ ۝۱۳ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا

عملگین ہوں گے وہ لوگ ہیں بہشت والے سدا رہیں گے اس میں بدلہ ہے ان کاموں

كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۱۴ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا طَحَمَلَتْهُ

کا جو کرتے تھے اور ہم نے حکم کر دیا انسان کو اپنے ماں باپ سے بھلائی کا، بیٹ میں رکھا

أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا طوَحَمَلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا

اسکو اسکی ماں نے تکلیف سے اور جفا اسکو تکلیف سے اور حمل میں رہنا اسکا اور دودھ چھوڑنا تیس مہینے میں سے

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ

یہاں تک کہ جب پہنچا اپنی قوت کو اور پہنچ گیا چالیس برس کو کہنے لگا اے رب میرے

أَوْزَعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ

میری قسمت میں کہ کہ شکر کروں تیرے احسان کا جو تولے مجھ پر کیا اور میرے ماں باپ پر

وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي طوَأَوْثَبْتُ

اور یہ کہ کروں نیک کام جس سے تو راضی ہو اور مجھ کو دے نیک اولاد میری میں نے توبہ کی

إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝۱۵ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ

تیری طرف اور میں ہوں حکم بردار یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم قبول کرتے ہیں

عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ

بہتر سے بہتر کام جو کئے ہیں اور معاف کرتے ہیں ہم بُرائیاں اُن کی رہنے والے جنت

الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ۝۱۶ وَالَّذِي قَالَ

کے لوگوں میں جتنا وعدہ جو ان سے کیا جاتا تھا اور جس شخص نے کہا

لِوَالِدَيْهِ أَفِئْتُمْ لَكُمْ أَنِّي أَخْرَجَ وَقَدْ خَلَيْتَ الْقُرُونُ

اپنے ماں باپ کو میں بیزار ہوں تم سے، کیا مجھ کو وعدہ دیتے ہو کہ میں نکالا جاؤں گا قبر سے اور گزر چکی ہیں

مِنْ قَبْلِي ۚ وَهُمَا يَسْتَغِيثَانِ اللَّهَ وَيْلَكَ امْنُ قَالَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ

بہت جماعتیں مجھ سے پہلے اور وہ دونوں فریاد کرتے ہیں اللہ سے کہ اے فراموش تیری تو ایمان لے آ، بیشک وعدہ اللہ کا

فَيَقُولُ مَا هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝۱۷ أُولَئِكَ الَّذِينَ حَقَّ

ٹھیکے، پھر کہتا ہے یہ سب نقلیں ہیں پہلوں کی یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر ثابت

عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنَّ وَالِإِنْسِ

ہوئی بات عذاب کی شامل اور قوتوں میں جو گزر چکے ہیں ان سے پہلے جنوں کے اور آدمیوں کے

لَهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ۝۱۸ وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوا وَلِيُوَفِّيَهُمْ

بیشک وہ سچے ٹوٹے میں پڑے اور ہر فرقے کے کئی دیبے ہیں اپنے کئے کاموں کے موافق اور تاکہ پورے دے

أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝۱۹ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى

انکو کام ان کے اور ان پر ظلم نہ ہوگا اور جس دن لائے جائیں گے منکر آگ کے

النَّارِ أَذْهَبَتْهُمْ طَيِّبَاتُكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا

کھارہ پر ضائع کئے گئے اپنے مزے دنیا کی زندگانی میں اور ان کو بہت چمکے

فَالْيَوْمَ تُجْرَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي

اب آج سزا پاؤ گے ذلت کا عذاب بدلہ اسکا جو تم غرور کرتے تھے

الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ۝۲۰

ملک میں ناحق اور اسکا جو تم نافرمانی کرتے تھے

خلاصہ تفسیر

جن لوگوں نے (صدق دل سے) کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے (یعنی توحید کو تعلیم رسول کے مطابق قبول کیا) پھر (اس پر) مستقیم رہے (یعنی اس کو چھوڑا نہیں) سو یقیناً (اسکا نتیجہ یہ ہے کہ) ان لوگوں پر (آخرت میں) کوئی خوف (کی بات واقع ہونے والی) نہیں اور نہ وہ (وہاں) غمگین ہونگے (یہ تو انکے مضرت سے بچنے کا بیان تھا، آگے اُس منفعت کا ذکر ہے جو انکو ملنے والی ہے کہ) یہ لوگ اہل جنت ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے بعوض ان (نیک) کاموں

کے جو کہ وہ کرتے تھے (جن میں سے ایمان لانے اور اس پر قائم رہنے کا اور ذکر ہے) اور (جس طرح ہم نے حقوق اللہ کو واجب کیا ہے جبکہ ذکر ہو چکا اسی طرح حقوق العباد کو بھی واجب کیا ہے چنانچہ اُن میں سے ایک بہت بڑا حق والدین کا ہے اسلئے) ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے (اور بالخصوص ماں کے ساتھ اور زیادہ کیونکہ) اُس کی ماں نے اُس کو بڑی مشقت کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور (پھر) بڑی مشقت کے ساتھ اس کو چنا اور اُس کو پیٹ میں رکھنا اور اس کا دودھ چھڑانا (اکثر) تفسیل مہینہ (میں پورا ہوتا) ہے۔ (اتنے دنوں طرح طرح کی مصیبت اٹھاتی ہے اور کم و بیش ان مصیبتوں میں باپ کی بھی شرکت ہوتی ہے بلکہ اکثر امور کا انتظام عادتاً باپ ہی کو کرنا پڑتا ہے اور اپنے آرام میں خلل آجانا یہ دونوں کو مساوی طور پر پیش آتا ہے اسلئے بھی ماں باپ کا حق انسان پر زیادہ واجب کیا گیا ہے۔ غرض اسکے بعد نشو و نما پاتا ہے) یہاں تک کہ جب (نشو و نما پاتے پاتے) اپنی جوانی کو (یعنی بلوغ کو) پہنچ جاتا ہے اور (پھر بلوغ کے بعد ایک زمانہ میں) چالیس برس (کی عمر) کو پہنچتا ہے تو (جو سعادت مند ہوتا ہے وہ) کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو اس پر مداومت دیجئے کہ میں آپ کی اُن نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمایا ہے (اگر ماں باپ مسلمان ہیں تب تو دین کی نعمت بھی، ورنہ دنیا کی نعمت تو ظاہر ہی ہے اور ماں باپ کی نعمت کا اثر اولاد پر بھی پہنچتا ہے۔ چنانچہ اُن کا وجود و بقا جو دنیاوی نعمت ہے اس کی بدولت تو خود اولاد کا وجود ہی ہوتا ہے اور دینی نعمت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اُن کی تعلیم و تربیت اُسکے لئے علم و عمل کا ذریعہ بنتی ہے) اور (وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مجھ کو اس کی بھی پابندی نصیب کیجئے کہ میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں اور میری اولاد میں بھی میرے (نفع کے) لئے صلاحیت پیدا کر دیجئے (دنیاوی نفع یہ کہ دیکھ دیکھ کر راحت ہو اور دینی نفع یہ کہ ابدی ثواب ہو اور) میں آپ کی جناب میں (مغنا ہوں سے بھی) تو یہ کرتا ہوں اور میں (آپ کا) فرمانبردار ہوں (مقصود اس سے اپنی غلامی کا اقرار ہے نہ کہ دعویٰ۔ آگے ان اعمال کا نتیجہ فرماتے ہیں کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ ہم انکے نیک کاموں کو قبول کر لیں گے اور انکے گناہوں سے درگزر کر دیں گے اس طور پر کہ یہ اہل جنت میں سے ہونگے (اور یہ سب) اُس وعدہ صادقہ کی وجہ سے (ہو) جس کا اُن سے (دنیا میں) وعدہ کیا جاتا تھا (یہاں تک تو محسنین اور خوش بخت لوگوں کا بیان ہوا۔ آگے ظالم اور بد بخت لوگوں کا ذکر ہے یعنی) اور جس نے (حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو پامال کر دیا جیسا اُسکے اس حال سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے) اپنے ماں باپ سے کہا (جن کے حق کی حقوق العباد میں سب سے زیادہ تاکید ہے خصوصاً جبکہ وہ مسلمان بھی ہوں اور خصوصاً جبکہ وہ اسکو بھی اسلام کی دعوت دے رہے ہوں) کہ تفسیر تمہیر کیا تم مجھ کو یہ وعدہ (یعنی خبر) دیتے ہو کہ میں (قیامت میں دوبارہ زندہ ہو کر) قبر سے

مکالا جادوں کا حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی اُنٹیں گزر گئیں (جن کو ہر زمانے میں انکے پیغمبر یوں ہی خبریں دیتے چلے آئے مگر آج تک کسی بات کا ظہور نہ ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں) اور وہ دونوں (غریب ماں باپ اسکے اس انکار سے کہ جو کفر عظیم ہے گھبرا کر) اللہ سے فریاد کر رہے ہیں (اور نہایت درد مندی سے اس سے کہہ رہے ہیں) کہ ارے تیرا ناس ہو ایمان لا (اور قیامت کو بھی برحق سمجھ) بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے تو یہ (اس پر بھی) کہتا ہے کہ یہ بے سند باتیں اگلوں سے منقول چلی آرہی ہیں (مطلب یہ کہ ایسا بد نصیب ہے کہ کفر اور ماں باپ سے بد سلوکی دونوں کا مرتکب ہے) اور بد سلوکی بھی اس درجہ کی کہاں باپ کی مخالفت کے ساتھ اُن سے کلام میں بھی بد تمیزی کرتا ہے۔ آگے ان اعمال کا نتیجہ فرماتے ہیں کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے حق میں بھی اُن لوگوں کے ساتھ اللہ کا قول (یعنی وعدہ عذاب) پورا ہو کر رہا جو ان سے پہلے حق اور انسان (کفار) ہو گزرے ہیں بیشک یہ (سب) خسارہ میں رہے۔ اور (آگے مذکورہ بالا تفصیل کو خلاصہ اجمال کے طور پر فرماتے ہیں کہ مذکورہ دونوں فریقوں میں سے) ہر ایک (فریق) کے لئے انکے (مختلف) اعمال کی وجہ سے الگ الگ درجے (کسی کو جنت کے کسی کو دوزخ کے) ملیں گے اور (مختلف درجے اس لئے ملیں گے) تاکہ اللہ تعالیٰ سب کو اُن کے اعمال (کی جزا) پوری کرے اور اُن پر (کسی طرح کا) ظلم نہ ہو گا اور (اوپر بحسنین کی جزا میں توجہ کو متعین طور سے بیان کر دیا گیا تھا مگر ظالمین کا عذاب متعین کر کے نہیں بتایا گیا تھا اجمالاً فرما دیا تھا حق علیہم القول اور کائنات خیرین اس لئے آگے عذاب کی تعیین فرماتے ہیں کہ وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے۔ جس روز کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے (اور اُن سے کہا جائے گا) کہ تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے (یہاں کوئی لذت تم کو نصیب نہ ہوگی) اور انکو خوب بُرت چکے (حتیٰ کہ اُن میں پڑ کر ہمو بھی بھول گئے) سو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی (چنانچہ سزا کے لئے آگ ہے اور ذلت میں سے یہ ملامت اور پھٹکار ہے) اسوجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے (تکبر سے مراد ایسا تکبر ہے جو ایمان سے باز رکھے کیونکہ دائمی عذاب اُسی کے ساتھ خاص ہے) اور اسوجہ سے کہ تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے (اسمیں کفر فسق ظلم اور انکی تمام صورتیں داخل ہو گئیں)۔

معارف و مسائل

مذکورہ صدر آیات میں پہلی دو آیتیں تو پچھلے ہی کلام کا تکرار ہے جو اس سے پہلی آیات میں آیا ہے کہ ظالموں کے لئے وعید عذاب اور مومنین صالحین کے لئے نوز و فلاح کی خوشخبری تھی۔ پہلی آیت یعنی اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا میں بڑی بلاغت کے ساتھ پورے اسلام و ایمان اور اعمال صالحہ سب کو جمع کر دیا گیا۔ رَبُّنَا اللّٰهُ کا اقرار پورا ایمان ہے اور اس پر استقامت

میں ایمان پر تادمِ مرکب رہنا بھی شامل ہے اور اسکے مقتضیات پر پورا پورا عمل بھی۔ لفظ استقامت اور اسکی اہمیت کی تشریح و تفصیل سورہ حمزہ سجدہ میں بیان ہو چکی ہے۔ آیت مذکورہ میں ایمان استقامت پر یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کو نہ آئندہ کسی تکلیف و پریشانی کا خوف ہو گا نہ ماضی کی تکلیف پر رنج و افسوس رہے گا۔ بعد کی آیت میں اس بے نظیر راحت کے دائمی اور غیر منقطع ہونے کی بشارت دی گئی ہے اسکے بعد کی چار آیتوں میں انسان کو اسکے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت اور اسکے خلاف کرنے کی مذمت اور ضمن میں انسان پر اسکے ماں باپ کے احسانات کا اور اولاد کے لئے سخت محنت و مشقت برداشت کرنے کا تذکرہ، اور بڑی عمر کو پہنچنے کے ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع و انابت کی خاص تلقین فرمائی گئی ہے۔ سابقہ آیات سے اسکی مناسبت اور ربط بقول ابن کثیرؒ یہ ہے کہ قرآن کریم کا عام اسلوب یہ ہے کہ وہ جہاں انسان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی طرف دعوت دیتا ہے تو ساتھ ساتھ ہی والدین کے ساتھ حسن سلوک اور خدمت و اطاعت کے احکام بھی دیتا ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات مختلف سورتوں میں اس پر شاہد ہیں۔ اسی اسلوب کے مطابق یہاں بھی اللہ کی توحید کی دعوت کے ساتھ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر کیا گیا۔ اور قرطبی نے بحوالہ تفسیری وجہ ربط یہ بیان کی ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک نئی کا پہلو ہر کہ آپ ایمان و توحید کی دعوت دیتے رہیں کوئی قبول کرے گا کوئی نہ کرے گا اس سے مغرور نہ ہوں کیونکہ انسان کا حال یہی ہے کہ وہ سب اپنے والدین کے ساتھ بھی یکساں نہیں رہتے بعض اچھا سلوک کرتے ہیں اور بعض انکے ساتھ بھی بد سلوکی کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

بہر حال ان چار آیتوں میں اصل مضمون انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرنا ہے اور ضمناً دوسری تعلیمات آئی ہیں۔ اگرچہ بعض روایات حدیث سے ان آیات کا حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں نازل ہونا معلوم ہوتا ہے اور اسی بنا پر تفسیر مظہری نے وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ میں الْإِنْسَانَ کے الف لام کو عہد کا قرار دے کر اس سے مراد صدیق اکبرؓ کو قرار دیا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی آیت قرآن کا سبب نزول کوئی خاص فرد یا خاص واقعہ ہو تو پھر بھی حکم سب کے لئے عام ہی ہوتا ہے۔ شان نزول خاص صدیق اکبرؓ ہوں اور تخصیصات مندرجہ آیات انھیں کی صفات ہوں جب بھی مقصود آیات کا تعلیم عام ہی ہے۔ اور اگر اصل آیات کو عام تعلیم قرار دیا جائے، اس میں بھی صدیق اکبرؓ اس تعلیم کے پہلے مصداق قرار پائیں گے جو ان ہونے اور چالیس سال عمر ہونے کے بعد کی جو تخصیصات ان آیات میں مذکور ہیں وہ تخصیصات بطور تمثیل کے ہونگی اب آیات مذکورہ کے خاص خاص الفاظ کی تشریح دیجئے۔ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِالذِّئْرَةِ الْحَسَنَةِ، لفظ وصیت تاکید کی حکم کے معنی میں آتا ہے اور احسان بمعنی حسن سلوک ہے جس میں ان کی خدمت و اطاعت بھی داخل ہے اور تعظیم و تکریم بھی۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا، لَفْظِ كُرْهًا بضم الکاٹ اُس مشقت کو کہتے ہیں جو انسان کو کسی وجہ سے برداشت کرنا پڑے اور کُرْهًا بفتح کاٹ اس محنت و مشقت کا نام ہے جس پر اُو کو کوئی دوسرا آدمی مجبور کرے۔ اسی سے اکراہ مشتق ہے۔ پہلے جملے میں جو والدین کے ساتھ حُسن سلوک کا حکم دیا ہے یہ دوسرا جملہ اُس کی تاکید کے لئے ہے کہ والدین کی خدمت و اطاعت ضروری ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے تمھاری پیدائش سے لیکر جوانی تک تمھارے لئے بڑی مشقتیں برداشت کیں ہیں، خصوصاً ماں کی محنت و مشقت بہت ہی نمایاں ہے اسلئے یہاں بیان صرف ماں کی مشقت کا کیا گیا ہے کہ اُس نے ایک طویل مدت نو ماہ اپنے پیٹ میں تم کو اٹھائے رکھا جس میں اسکو طرح طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرنا پڑیں، پھر ولادت کے وقت سخت درد اور تکلیف کے ساتھ تمھارا وجود اس دُنیا میں آیا۔

ماں کا حق باپ سے زیادہ ہے | شرع آیت میں حُسن سلوک کا حکم ماں اور باپ دونوں کے لئے ہے مگر اس جگہ صرف ماں کی محنت و مشقت کا ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ماں کی محنت و مشقت لازمی اور ضروری ہے۔ حمل کے زمانے کی تکلیفیں، پھر وضع حمل اور دردِ زہ کی تکلیف ہر حال ہر بچے کے لئے لازمی ہے جو صرف ماں ہی کی محنت ہے، باپ کے لئے پرورش پر محنت اٹھانا اتنا لازمی و ضروری نہیں ہو سکتا ہے کہ کسی باپ کو اولاد کی تربیت میں کوئی بھی محنت و مشقت اٹھانی پڑے جبکہ وہ مالدار صاحبِ حشم و خدم ہو، دوسروں سے اولاد کی خدمت لے یا وہ کسی دوسرے ملک میں چلا گیا اور خرچ بھیجتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد پر ماں کے حق کو سب سے زیادہ رکھا ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے صَلِّ اُمَّكَ ثُمَّ اُمَّكَ ثُمَّ اُمَّكَ ثُمَّ اَبَاكَ ثُمَّ اَبَاكَ ثُمَّ اَدْنَاكَ فَادْنَاكَ (مظہری) یعنی صلہ رحمی اور خدمت کرو اپنی ماں کی پھر اپنی ماں کی پھر اپنی ماں کی، اسکے بعد اپنے باپ کی اور اسکے بعد جو قریب تر رشتہ دار ہو اسکی، پھر جو اسکے بعد ہو۔

وَحَمْلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا، اس جملہ میں بھی ماں کی محنت و مشقت ہی کا بیان ہے کہ بچے کے حمل اور وضع حمل کی مشقت کے بعد بھی ماں کو محنت سے فراغت نہیں ملتی کیونکہ اسکے بعد بچے کی غذا بھی قدرت نے ماں کی چھاتیوں میں اتاری ہے وہ اسکو دودھ پلاتی ہے۔ آیت میں ارشاد یہ فرمایا کہ بچے کا حمل اور دودھ چھڑانا تین سال پہلے میں ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس آیت سے اس بات پر استدلال فرمایا کہ حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ کی ہے کیونکہ قرآن کریم نے اکثر مدتِ رضاع تو دس سال کامل متعین فرمادی ہے جیسا کہ ارشاد ہے وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ، اور یہاں حمل اور رضاع دونوں کی مدت تین سال قرار دی گئی

تو مدت رضاع کے دو سال یعنی چوبیس ماہ تک نہ نکلتے کے بعد چھ ماہ ہی باقی رہ جاتے ہیں جس کو کم سے کم مدت حمل قرار دیا گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں ایک عورت کے بطن سے چھ ماہ ہو جانے پر بچہ پیدا ہو گیا جبکہ عام عادت نو مہینے میں اور کم سے کم ستا مہینے میں بچہ پیدا ہونے کی ہے۔ عثمان غنیؓ نے اسکو حمل ناجائز قرار دیکر سزا کا حکم دیدیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اطلاع ملی تو انھوں نے حضرت عثمانؓ کو اس سزا سے منع کیا اور فرمایا کہ قرآن میں حمل اور رضاع کی مجموعی مدت تیس ماہ ہے پھر رضاع کی مدت کا چوبیس ماہ ہونا دوسری جگہ متعین کر دیا ہے اسلئے باقی ماندہ مدت چھ ماہ ہی حمل کی کم سے کم مدت ہے۔ عثمان غنیؓ نے انکے استدلال کو قبول کر کے اپنا حکم واپس لے لیا (قطبی)

اسی لئے کم سے کم مدت حمل کے بارے میں تمام ائمہ متفق ہیں کہ وہ چھ ماہ ہو سکتی ہے اکثر مدت کتنی ہے اس میں ائمہ کے اقوال مختلف ہیں قرآن نے اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دیا۔

فائدہ | اس آیت میں حمل کی تو اقل مدت کا بیان کیا گیا اور رضاع کی اکثر مدت کا اس میں

اشارہ ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ متعین ہے اس سے کم میں صحیح سالم بچہ پیدا نہیں ہو سکتا مگر زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ بچہ حمل میں رہ سکتا ہے اس میں عادتیں مختلف ہیں یہ متعین نہیں

اسی طرح رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت متعین ہے کہ دو سال تک دودھ پلایا جاسکتا ہے

کم سے کم مدت کچھ متعین نہیں۔ بعض عورتوں کے دودھ ہوتا ہی نہیں، بعض کا دودھ چند مہینوں

میں خشک ہو جاتا ہے، بعض بچے ماں کا دودھ زیادہ نہیں پیتے یا ان کو مضر ہوتا ہے تو دوسرا

دودھ پلانا پڑتا ہے۔

اکثر مدت حمل اور اکثر مدت رضاع | اکثر مدت حمل امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک دو سال ہیں، امام مالکؒ

میں فقہائے ائمہ کا اختلاف | سے مختلف روایات منقول ہیں۔ چار سال، پانچ سال، ستا

سال۔ امام شافعیؒ کے نزدیک چار سال، امام احمدؒ کی بھی مشہور روایت چار ہی سال کی ہے (منظہری)

اور اکثر مدت رضاعت جس کے ساتھ حرمت رضاعت کے احکام متعلق ہوئے ہیں جمہور فقہاءؒ کے

نزدیک دو سال ہیں۔ امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور ائمہ حنفیہؒ میں سے ابو یوسفؒ اور

امام محمدؒ سب اس پر متفق ہیں، اور صحابہ کرام میں حضرت عمرؓ و ابن عباسؓ کا بھی یہ قول ہے (رداۃ الدارقطنی)

علیٰ مرتضیٰؒ، عبداللہ بن مسعودؓ کا بھی یہی ارشاد ہے (آخر جہ ابن ابی شیبہ) صرف امام اعظم ابو حنیفہؒ

سے یہ منقول ہے کہ ڈھائی سال تک بچہ کو دودھ پلایا جاسکتا ہے جسکا حاصل جمہور حنفیہ کے

نزدیک یہ ہے کہ اگر بچہ کمزور ہو، ماں کے دودھ کے سوا کوئی غذا دو سال تک بھی نہ لیتا ہو تو

مزید چھ ماہ دودھ پلانے کی اجازت ہے کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مدت رضاعت

پوری ہونے کے بعد ماں کا دودھ بچے کو پلانا حرام ہے مگر فتویٰ فقہائے حنفیہ کا بھی جمہور ائمہ کے مسلک پر ہے کہ دو سال کی مدت کے بعد اگر دودھ پلایا گیا تو اس سے صرست رضاعت کے احکام ثابت نہیں ہونگے۔ سیدی حضرت حکیم الامت نے بیان القرآن میں فرمایا کہ اگرچہ فتویٰ جمہور کے قول پر ہی مگر عمل میں احتیاط کرنا بہتر ہے کہ ڈھائی سال کی مدت کے اندر جس بچہ کو دودھ پلایا گیا ہے اس کے مناکحت میں احتیاط برتی جائے۔ بعض حضرات نے آیت وَحَمْلُهُ وَفُصْلُهُ تَلْكَوْنَنَّ شَهْرًا سے امام اعظم کے قول کے مطابق اکثر مدت رضاعت ڈھائی سال ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ تفسیر مظہری میں فرمایا کہ یہ درست نہیں کیونکہ صحابہ کرام کی جماعت علی مرتضیٰ عثمان غنیؓ نے آیت کی تفسیر یہ متعین کر دی ہے کہ اس میں چھ ماہ اقل مدت حمل کے اور چوبیس ماہ مدت رضاعت کے مراد ہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قرآن کریم نے حمل اور رضاعت کی مشترک مدت تیس ماہ بتلائی ہے ہر ایک کی الگ الگ حد نہیں بتلائی اسکا سبب یہ ہے کہ عادت عامہ یوں ہے کہ بچہ نو ماہ میں پیدا ہوتا ہے اور جب بچہ پورے نو ماہ میں پیدا ہو تو ماں کا دودھ پلانے کی ضرورت صرف اکیس ماہ رہ جاتی ہے اور اگر بچہ سات مہینے میں پیدا ہو جائے تو تیس ماہ دودھ پلانے کی ضرورت ہوتی ہے اور جو بچہ چھ ماہ میں پیدا ہو جائے تو چوبیس ماہ یعنی پورے دو سال دودھ پلانے کی ضرورت ہوگی (مظہری)

حَتَّىٰ اِذَا بَلَغَ اَشَدُّهُ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ، لَفْظِ اَشَدُّ کے لغوی معنی قوت کے ہیں۔ سورۃ النعام میں حَتَّىٰ يَبْلُغَ اَشَدُّہ کے تحت میں اس کی تفسیر بلوغ سے کی گئی ہے یعنی جب بچہ سن بلوغ کو پہنچ جائے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بلوغ اشد سے مراد اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنا ہے۔ مذکور الصدر آیت میں بھی بعض حضرات نے بَلَغَ اَشَدُّہ کے معنی یہی کئے ہیں کہ بچہ سن بلوغ کو پہنچ جائے اور اسکے بعد بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً کو ایک مستقل منزل عمر قرار دیا۔ یہ قول شعبیؒ اور ابن زید کا ہے اور حسن بصریؒ نے بلوغ اشد اور بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ دونوں کو ہم معنی اور بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ کو بَلَغَ اَشَدُّہ کی تفسیر و تاکید قرار دیا ہے۔ (قطبی)

اور تقدیر عبارت یوں ہے کہ اول بچہ کے حمل کا پھر وضع حمل کا پھر دودھ پینے کے زمانے کا ذکر کرنے کے بعد حَتَّىٰ اِذَا بَلَغَ فَرْمَانِہ کا حاصل یہ ہے کہ فعاش واستمررت حیاتہ حَتَّىٰ اِذَا كَتَمَل واستحکم قوتہ وعقلہ (روح) یعنی دودھ چھوٹنے کے بعد بچہ زندہ رہا اور عمر پائی یہاں تک کہ وہ بالغ اور قوی ہو گیا اور اس کی قوت اور عقل مکمل ہو گئی تو اب اس کو اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کی طرف رجوع ہونے کی توفیق نصیب ہوئی اور وہ یوں دعائیں مانگنے لگا کہ،

رَبِّ اَوْزِعْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى الْاٰلِئِہِ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِیْ ذَرْيَتِيْ بِرَحْمَتِكَ اِنَّیْ اَتُوبُ اِلَيْكَ وَرَافِقِیْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ، یعنی

اے میرے پلنے والے مجھے توفیق عطا کر کہ میں تیری اُس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر مبذول فرمائی اور جو میرے والدین پر مبذول فرمائی اور مجھے یہ توفیق دے کہ میں وہ عمل کروں جس سے تو راضی ہو جائے اور میرے لئے میری اولاد کی بھی اصلاح فرمائے، میں تیری طرف رجوع ہوتا ہوں اور میں تیرے تابع فرمان مسلمانوں میں سے ہوں۔ قرآن نے اس جگہ حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشَدُّہٗ سے لیکر مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ تک سب صیغے ماضی کے استعمال فرمائے جس سے ظاہر یہ ہے کہ یہ بیان کسی خاص واقعہ اور خاص شخص کا ہے جو نزول آیت کے وقت ہو چکا ہے۔ اسی لئے تفسیر مظہری نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ یہ سب آلات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہیں انھیں کا بیان بالفاظ عام اس حکمت سے کیا گیا ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی اسی ترغیب ہو کہ وہ بھی ایسا ہی کیا کریں اور اسی دلیل وہ روایت ہے جو قرطبی نے بروایت عطاء حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی بیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ کے مال سے تجارت کا قصد فرمایا اور مکہ شام کا سفر کیا تو اس سفر میں ابوبکر صدیقؓ آپ کے ساتھ تھے اس وقت اُن کی عمر اٹھارہ سال کی تھی جو مصداق ہے بَلَغَ اَشَدُّہٗ کا۔ پھر اس سفر میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے حالات دیکھے کہ وہ اتنے گرویدہ ہو گئے کہ سفر سے واپسی کے بعد ہر وقت آپ کے ساتھ رہنے لگے، یہاں تک کہ جب آپ کی عمر شریف چالیس سال کی ہو گئی اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کا شرف عطا فرمایا اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عمر اڑتیس سال تھی۔ مردوں میں سب سے پہلے انھوں نے اسلام قبول کیا پھر جب اُن کی عمر چالیس سال کی ہو گئی اس وقت یہ دُعا مانگی جو اوپر آیت میں مذکور ہے رَبِّ اَوْزِعْنِیْ، اور یہی مصداق ہے بَلَغَ اَزْجَعِیْنَ سَنَہٗ کا اور جب یہ دُعا مانگی اُن اَعْمَلْ صَالِحًا تَرْضَاهُ تو اللہ نے یہ دُعا قبول فرمائی، اُن کو تو ایسے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کی توفیق بخشی جو مسلمان ہو گئے تھے اور اُن کے مالک اُن کو اسلام لانے پر طرح طرح کی ایذاؤں دیتے تھے، اسی طرح اُن کی دُعا اَصْلِحْ لِّیْ ذُرِّیَّتِیْ بھی قبول ہوئی، اُن کی اولاد میں کوئی ایسا نہ رہا جو ایمان نہ لایا ہو۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ میں یہ خصوصیت حق تعالیٰ نے صدیق اکبرؓ ہی کو عطا فرمائی کہ وہ خود بھی مسلمان ہوئے، والدین بھی، اولاد بھی اور سب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا اور تفسیر روح المعانی میں ہے کہ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ مہاجرین و انصار میں اس وقت یہ خصوصیت صرف صدیق اکبرؓ کی ہی تھی کہ وہ خود بھی مسلمان ہوئے اور ان کے والدین بھی مسلمان ہو گئے۔ رہا یہ سوال کہ صدیق اکبرؓ کے والد ابو قحافہؓ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے ہیں اور یہ سورت پوری مکتی ہے اس لئے یہ آیات بھی مکہ میں نازل ہوئیں اس وقت والدین پر نعمت الہی مبذول ہونے کا ذکر کیسے مناسب ہو گا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض حضرات نے ان آیات کو مدنی کہا ہے اسپر تو کوئی اشکال نہیں رہتا، اور اگر مکی بھی ہوں تو مراد نعمت اسلام سے مشرف

ہونے کی دعا ہوگی (روح) اس تفسیر کی رُو سے اگرچہ یہ سب حالات صدیق اکبر کے بیان ہوئے مگر حکم عام ہے سب مسلمانوں کو اس کی ہدایت کرنا مقصود ہے کہ آدمی کی عمر جب چالیس سال کے قریب ہو جائے تو اس کو آخرت کی فکر غالب ہو جانی چاہئے۔ پچھلے گناہوں سے توبہ کی تجدید کرے اور آئندہ کے لئے اُن سے بچنے کا پورا اہتمام کرے کیونکہ عادت اور تجربہ یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر میں جو اخلاق و عادات کسی شخص کی ہو جاتی ہیں پھر اُن کا بدلنا مشکل ہوتا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ مؤمن جب چالیس سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا حساب آسمان فرمادیتے ہیں اور جب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچے تو اُس کو اپنی طرف رجوع و انابت نصیب فرمادیتے ہیں اور جب ستر سال کی عمر کو پہنچ جائے تو تمام آسمان والے اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جب اسی سال کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حسنات کو قائم فرمادیتے ہیں اور اس کے سیئات کو مٹا دیتے ہیں، اور جب نوے سال کی عمر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے سب اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیتے ہیں اور اس کو اپنے اہل بیت کے متعلق شفاعت کرنے کا حق دیدیتے ہیں اور آسمان میں اس کے نام کے ساتھ لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ اسیر اللہ فی الارض ہے یعنی زمین میں اللہ کی طرف سے قیدی ہے (ذکرہ ابن کثیر عن ابی اعلیٰ و مسند احمد وغیرہ) اور یہ ظاہر ہے کہ مراد اس سے وہ ہی بندہ مؤمن ہے جس نے اپنی زندگی احکام شرع کے تابع ہو کر تقویٰ کے ساتھ گزاری ہے۔ ابن کثیر نے چونکہ پہلی تفسیر کو اختیار کیا ہے کہ مراد عام انسان ہے تو جو الفاظ خصوصیت کے اسمیں آئے ہیں جیسے حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشْكَاکَ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً الخ وہ سب بطور تمثیل کے ہیں جیسے یہ ہدایت دینا مقصود ہے کہ انسان جب چالیس سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کو اپنی اصلاح اور اپنے اہل و عیال کی اصلاح اور آخرت کی فکر غالب ہو جانی چاہیے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

اُولَئِكَ الَّذِیْنَ تَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَتُحْجَّوْا مِنْ سَبْتِہُمْ یَوْمَئِذٍ، یعنی ایسے مؤمن مسلمان جن کے یہ حالات ہوں جو اوپر گزرے ہیں انکی حسنات قبول کر لی جاتی ہیں اور گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ یہ حکم بھی عام ہے، اگر اس کے سبب نزول صدیق اکبرؑ ہوں تو وہ اس کے پہلے مصداق ہونگے۔ حضرت علیؑ کے ارشاد ذیل سے بھی آیت کے مفہوم کا عام ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں سند کے ساتھ محمد ابن حاطبؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ میں ایک مرتبہ امیر المؤمنین حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر تھا، اس وقت ان کے پاس کچھ دوسرے حضرات بھی موجود تھے جنہوں نے حضرت عثمانؓ پر کچھ عیب لگائے اس پر حضرت علیؑ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

كان عثمان رضي الله عنه من الذين قال الله تعالى
 فيهم أُولَئِكَ الَّذِينَ سَقْبِلْ عَنْهُمُ احْسَنَ مَا عَمِلُوا

عثمان رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جنکے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اُولَئِكَ الَّذِينَ سَقِطُوا

وَنَجَّأُوهُنَّ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعَدَ الصِّدِّيقِ
الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ، قَالَ وَاللَّهِ عُمَانٌ وَأَصْحَابُ
عُمَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ، قَالَهَا ثَلَاثًا (ابن کثیر)
عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَجَّأُوهُنَّ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ
الْجَنَّةِ وَعَدَ الصِّدِّيقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ، بهذا
اس آیت کے مصداق حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھی ہیں۔ یہ
بات حضرت علیؓ نے تین مرتبہ فرمائی۔

وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُتِيَ لَكُمْ سَاعَةٌ مِّنْ دِينِكُمْ فَهَلْ تُؤْمِنُونَ
آیت میں اس شخص کا عذاب سزا مذکور ہے جو اپنے والدین کے ساتھ بدسلوکی، بدزبانی سے پیش آئے، خصوصاً جبکہ
والدین اس کو اسلام اور اعمالِ صالحہ کی طرف دعوت دیتے ہوں انکی بات نہ ماننا وہ ہر گناہ ہے۔ ابن کثیر نے
فرمایا کہ مفہوم آیت کا عام ہے جو شخص بھی اپنے والدین کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آئے وہ اس کا مصداق ہے
مروان نے جو اس آیت کا مصداق حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کو اپنے کسی خطبے میں کہا تھا
اسکی تکذیب صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ مفہوم آیت کا
عام ہے کسی صحیح روایت میں کسی فرد کا مصداق آیت ہونا منقول نہیں۔

أَذْهَبَتْكُمْ طَبِيبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمْ الدُّنْيَا، یعنی کفار کو خطاب کر کے یہ کہا جائیگا کہ تمہارے
کچھ اچھے کام دنیا میں کئے تھے تو ان کا بدلہ بھی تمہیں دنیوی نعمتوں اور عیش و عشرت کی صورت میں دیا
جا چکا ہے اب آخرت میں تمہارا کچھ حصہ باقی نہیں رہا۔ یہ خطاب کفار کو ہے جس سے معلوم ہوتا ہے
کہ کفار کے نیک اعمال جو ایمان نہ لانے کی وجہ سے اللہ کے نزدیک مقبول نہیں آخرت میں تو انکی کوئی قیمت
نہیں مگر دنیا میں اللہ تعالیٰ ان کا بدلہ اس کو دیتے ہیں۔ کفار فجار کو مال و دولت اور عزت و جاہت
وغیرہ جو دنیا میں ملتا ہے وہ انکے نیک اعمال، سخاوت، ہمدردی، سچائی وغیرہ کا بدلہ ہوتا ہے۔ مومنین
کیلئے یہ حکم نہیں ہے کہ اگر انکو دنیا میں کوئی نعمت مال و دولت وغیرہ مل جائے تو آخرت کے حق سے محروم ہو جائیں۔
لَئِنْ دُنِيََا أَوْ تَنَجَّمْ سَے پرہیز کی ترغیب | اس آیت میں کفار کو عقابِ عقاب انکے دنیوی لذتوں میں مٹھک
رہنے کی بنا پر کیا گیا۔ اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ تابعینؓ نے لَئِنْ دُنِيََا کو ترک کرنے کی عادت
بنائی جیسا کہ انکی سیرت اس پر شاہد ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو مین بھیجنے کے
وقت یہ وصیت فرمائی تھی کہ دنیا کے تنگم سے پرہیز کرتے رہنا اور حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے تھوڑا رزق لینے پر راضی ہو جائے تو
اللہ تعالیٰ بھی اسکے تھوڑے عمل پر راضی ہو جائے ہیں (منظہری عن البغوی)

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنْذَرَهُ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَّتِ السُّنُورُ

اور یاد کر عادیؑ کو جب ڈرایا اپنی قوم کو احقاف میں اور گزر چکے تھے ڈرانے والے

مَنْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ إِلَيَّ آخَا فُ

اس کے آگے سے اور پیچھے سے کہ بندگی نہ کرو کسی کی اللہ کے سوائے میں ڈرتا ہوں

عَلَيْكُمْ عَذَابٌ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۳۱ قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَاْفِكُنَا عَنْ آلِهَتِنَا فَأْتِنَا

تم پر آفت سے ایک بڑے دن کی بولے کیا تو آیا ہے ہمارے پاس کہ پھیرے ہم کو ہمارے معبودوں سے، سوئے

بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۳۲ قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ

ہم پر جو وعدہ کرتا ہے اگر ہے تو سچا کہا یہ خبر تو اللہ ہی کو ہے

وَأُبَلِّغُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَكِنِّي أَرٰكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ۳۳ فَلَمَّا

اور میں تو پہنچا دیتا ہوں جو کچھ بھیج دیا میرے ہاتھ لیکن میں دیکھتا ہوں تم لوگ نادانی کرتے ہو پھر جب

رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَّتِهِمْ قَالُوا هَذَا عَارِضٌ مُّطْرُنَا

دیکھا اس کو ابر سامنے آیا اُن کے نالوں کے بولے یہ ابر ہے ہم پر بر سے گا

بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ رِيحٌ فِيْهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۳۴ تَدْمِرُ كُلَّ

کوئی نہیں یہ تو وہ چیز ہے جسکی تم جلدی کرتے تھے، ہوا ہے جس میں عذاب ہے دردناک اُکھاڑ بیٹھنے ہر

شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهٖمَا فَاصْبِرْ هَٰذَا أَلَّا يَكُونَ لَكَ فِجْرٰی

چیز کو اپنے رب کے حکم سے، پھر کل کو وہ گئے کہ کوئی نظر نہیں آتا تھا سوائے انکے گھروں کے، یوں ہم سزا دیتے ہیں

الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ ۳۵ وَلَقَدْ مَكَنَّهٖمْ فِیْمَا لَا مَنَّٰكُمْ فِیْهِ وَجَعَلْنَا

گنہگار لوگوں کو اور ہم نے مقدر دیا تھا اُن کو اُن چیزوں کا جن کا تمکو مقدر نہیں دیا اور بننے انکو

لَهُمْ سَمْعًا وَآبْصَارًا وَآفِئْدَةٌ ۚ فَمَا اسْعٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا

دیئے تھے کان اور آنکھیں اور دل پھر کام نہ آئے اُن کے کان اُنکے اور نہ

آبْصَارُهُمْ وَلَا آفِئْدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۚ إِذْ كَانُوا یَجْحَدُونَ بِآیٰتِ

آنکھیں اُن کی اور نہ دل اُن کے کسی چیز میں اس لئے کہ منکر ہوتے تھے اللہ کی باتوں

اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ قَاكُؤٰیہٗ یَسْتَهْزِءُونَ ۳۶

سے اور اکٹ پڑی ان پر جس بات سے کہ وہ ٹھٹھا کرتے تھے

خلاصہ تفسیر

اور آپ قوم عاد کے بھائی (یعنی ہود علیہ السلام) کا (ان سے) ذکر کیجئے جبکہ انھوں نے اپنی قوم کو جو کہ ایسے مقام پر رہتے تھے کہ وہاں ریک کے مستطیل خمدار تو دے تھے (یہ مقام کی نشان دہی اس لئے کی گئی کہ دیکھنے والوں کے ذہن میں استحضار ہو جائے) اس (بات) پر (عذاب الہی سے)

درا یا کہ تم خدا کے سوا کسی کی عبادت مت کرو (ورنہ تم پر عذاب نازل ہوگا) اور (یہ ایسی ضروری اور صحیح بات ہے کہ) اُن (ہود علیہ السلام) سے پہلے اور اُن کے پیچھے (اسی مضمون کے متعلق) بہت سے ڈرانے والے (پیغمبر اب تک) گزر چکے ہیں (اور عجب نہیں کہ ہود علیہ السلام نے اُن سب کا متفق ہونا دعوت الی التوحید میں اُن کے سامنے بیان بھی کیا ہو پس جملہ وَقَدْ خَلَّتِ السُّلُکُ کا یہ سچ میں بڑھا دینا ان فوائد کے لئے ہے کہ مضمون دعوت کی تاکید ہو جائے اور ہود علیہ السلام نے انداز میں یہ فرمایا کہ) مجھ کو تم پر ایک بڑے (سخت) دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (اگر اس سے بچنا ہے تو توحید قبول کرلو) وہ کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس ارادے سے آئے ہو کہ ہم کو ہمارے معبودوں سے پھیر دو سو (ہم تو پھر نے والے ہیں نہیں باقی) اگر تم سچے ہو تو جس (عذاب) کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو اُس کو ہم پر واقع کر دو۔ انھوں نے فرمایا کہ پورا علم تو خدا ہی کو ہے کہ عذاب کب تک آدے گا) اور مجھ کو تو جو پیغام دیکر بھیجا گیا ہے میں تم کو وہ پہنچا دیتا ہوں (چنانچہ اُس میں مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ تم پر عذاب آویگا میں نے تم کو اطلاع کر دی، اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم ہے اور نہ قدرت) لیکن میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم لوگ زری جہالت کی باتیں کرتے ہو کہ ایک تو توحید کو قبول نہیں کرتے پھر اپنے منہ سے بلا مانگتے ہو، پھر مجھ سے اس کی فرمائش کرتے ہو البتہ اپنے صدق کا میں مدعی ہوں جس پر دلیل قائم کر چکا ہوں اور جس واقعہ میں تم کو شبہ ہے اس کا وقت وقوع مجھ کو نہیں بتلایا گیا ہاں نفس وقوع کو جب اللہ چاہے دیکھ لینا۔ غرض جب کسی طرح انھوں نے حق کو قبول نہ کیا تو اب عذاب کا اس طرح سامان شروع ہوا کہ اول ایک بادل اُٹھا) سو ان لوگوں نے جب اُس بادل کو اپنی دادیوں کے مقابل آتا دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسے گا (ارشاد ہوا کہ) نہیں (برسنے والا بادل نہیں) بلکہ یہ وہی (عذاب) ہے جس کی تم جلدی مچاتے تھے (کہ وہ عذاب جلدی لاؤ اور اس بادل میں) ایک آندھی (جس میں دردناک عذاب ہے وہ آندھی) ہر چیز کو (جس کے ہلاک کرنے کا حکم ہوگا) اپنے رب کے حکم سے ہلاک کر دیگی چنانچہ (وہ آندھی چھٹی اور آدمیوں کو اور مویشی کو اُٹھا اٹھا کر پلک دیتی تھی جس سے) وہ ایسے (تباہ) ہو گئے کہ بجز اُن کے مکانات کے اور کچھ (آدمی اور حیوان) نہ دکھائی دیتا تھا، ہم مجرموں کو یوں ہی سزا دیا کرتے ہیں اور ہم نے اُن کو (یعنی قوم عاد کے) لوگوں کو ان باتوں میں قدرت دی تھی کہ تم کو ان باتوں میں قدرت نہیں دی (مراد ان باتوں سے وہ تصرفات ہیں جو قوت جسمانی و مالی پر موقوف ہیں) اور ہم نے ان کو کان اور آنکھ اور دل (سب ہی کچھ) دیئے تھے، سو چونکہ وہ لوگ آیات اللہ کا انکار کرتے تھے اسلئے (جب اُن پر عذاب آیا ہے تو) نہ انکے کان انکے ذرا کام آئے اور نہ انکی آنکھیں اور نہ انکے دل اور جس (عذاب) کی وہ ہنسی اڑا کر تے تھے اُسی نے اُن کو آگھیرا (یعنی نہ انکے جو اس انکو عذاب بچا سکے اور نہ اُن کی تدبیر جسکا ادراک قلب سے ہوتا ہے، نہ ان کی قوت پس تمھاری تو کیا حقیقت ہے۔)

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِنَ الْقُرَىٰ وَصَرَفْنَا آيَاتِ لَعْنِهِمْ

اور ہم غارت کر چکے ہیں جتنی تمھارے آس پاس ہیں بستیاں اور طرح طرح سے پھیر کر سنائیں اُن کو باتیں تاکہ وہ

بَرْجِعُونَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْلَا نَصْرُهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا

لوٹ آئیں پھر کیوں نہ مدد پہنچی اُن کو اُن لوگوں کی طرف سے جن کو کھڑا تھا اللہ سے دے معبود بڑے

إِلَهَةً بَلْ ضَلُّوا عَنْهُمْ وَذَلِكَ أَفْكَهُمْ وَمَا كَانُوا يَفْقَهُونَ ﴿۲۸﴾

درجے پانے کو، کوئی نہیں گم ہو گئے اُن سے اور یہ جھوٹ تھا ان کا اور جو اپنے جی سے باندھتے تھے۔

خلاصہ تفسیر اور قوم عاد کا قصہ تفصیلاً مذکور تھا، آگے دوسری ایسی ہی قوموں کا ذکر ہے جن پر

کفر اور مخالفت انبیاء کی وجہ سے عذاب آئے اور ہلاک ہوئے اُن کی اُجڑی ہوئی بستیاں

بھی اہل مکہ کے سفروں کے وقت راستے میں آتی تھیں ان سے عبرت حاصل کرنے کے لئے ان کا اجمالی

حال آیات مذکورہ میں آیا ہے۔

اور ہم نے تمھارے آس پاس کی اور بستیاں بھی (اس کفر و شرک کے سبب) غارت کی ہیں (جیسے ثمود

قوم ٹوٹ کر ملک شام کو جاتے ہوئے ان بستیوں سے گزرتے تھے اور چونکہ مکہ سے ایک طرف یمن ہے دوسری

جہت میں شام ہے اس لئے مَا حَوْلَكُمْ فرمادیا) اور ہم نے (ہلاک کرنے سے پہلے ان کی فہمائش کیلئے) بار بار

اپنی نشانیاں (اُن کو) بتلا دی تھیں تاکہ وہ (کفر و شرک سے) باز آئیں (مگر باز نہ آئے اور ہلاک ہوئے)

سو خدا کے سوا جن جن چیزوں کو انھوں نے خدا تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اپنا معبود بنا رکھا

تھا (کہ یہ مصیبت میں ہمارے کام آویں گے ہلاکت و عذاب کے وقت) انھوں نے ان کی مدد کیوں نہ

کی بلکہ وہ سب اُن سے غائب ہو گئے اور وہ (معبود اور شفیع سمجھنا) محض اُن کی تراشی ہوئی اور گھڑی

ہوئی بات ہے (اور کہیں واقع میں وہ شفیع یا معبود تھوڑا ہی تھے)۔

وَاِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ

اور جس وقت متوجہ کر دیے تھے تیری طرف کتنے ایک لوگ جنوں میں سے سُننے لگے قرآن پھر جب وہاں پہنچ گئے

قَالُوا آانُصِتُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ مُنْذِرِينَ ﴿۲۹﴾ قَالُوا

ہوئے چُپ رہو پھر جب ختم ہوا اُلٹے پھرے اپنی قوم کو ڈر سناتے ہوئے

يَقُولُ مِنَّا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ

ہم نے قوم ہماری ہم نے سنی ایک کتاب جو اتری ہے موسیٰ کے بعد سچا کرنے والی سب اگلی

يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَى طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۳۰﴾ يَقُولُ مِنَّا آجِبُوا

تمہاروں کو سمجھاتی ہے سچا دین اور ایک راہ سیدھی اے قوم ہماری مانو اللہ کے

دَاعِيَ اللَّهِ وَأَمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُمْ مَن ذُنُوبَكُمْ وَيَجْزِكم مِّنْ عَذَابِ

بلانے والے کو اور اس پر یقین لاؤ کہ بخشنے تم کو کچھ تمہارے گناہ اور بچا دے تم کو ایک عذاب دردناک

أَلَيْمٌ ۝۳۱ وَمَن لَّا يُحِبِّ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَ

سے اور جو کوئی نہ مانے گا اللہ کے بلانے والے کو تو وہ نہ تھکا سکے گا بھاگ کر زمین میں اور

لَيْسَ لَهُ مَن دُونَهُ أَوْلِيَاءُ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝۳۲

کوئی نہیں اسکا اس کے سوائے مددگار وہ لوگ بھٹکتے ہیں صریح

خلاصہ تفسیر

اور (اُن سے اس وقت کا قصہ ذکر کیجئے) جبکہ ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے گئے جو (آخر میں یہاں پہنچ کر) قرآن سننے لگے تھے غرض جب وہ لوگ قرآن (کے پڑھے جانے کے موقع) کے پاس پہنچے تو (آپس میں) کہنے لگے کہ خاموش رہو (اور اس کلام کو سنو) پھر جب قرآن پڑھا جا چکا (یعنی جتنا اس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں پڑھنا تھا ختم ہو چکا) تو وہ لوگ (اُس پر ایمان لے آئے اور) اپنی قوم کے پاس (اسکی) خبر پہنچانے کے واسطے واپس گئے (اور جا کر اُن سے) کہنے لگے اے بھائیو ہم ایک (عجیب) کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نازل کی گئی ہے جو اپنے سے پہلی کتاب نبی تصدیق کرتی ہے (اور دین) حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے (یہ تو دین اسلام کی حقانیت کا اثبات و اظہار ہے، آگے امر ہے اس کے قبول کرنے کا اول ترغیباً پھر ترہیباً یعنی) اے بھائیو تم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا (تو) مراد داعی سے قرآن یا نبی ذیشان ہیں) اور (کہنا ماننا یہ ہے کہ) اُس پر ایمان لے آؤ (اس میں اشارہ ہو گیا کہ وہ ایمان لانے کی طرف داعی ہے نہ کہ اور کسی دنیوی غرض کی طرف، پس اگر تم ایسا کرو گے تو) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دیگا اور تم کو عذاب دردناک سے محفوظ رکھے گا اور جو شخص اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا نہ مانے گا تو وہ زمین (کے کسی حصہ) میں (بھاگ کر خدا کو) ہرا نہیں سکتا (یعنی اس طرح کہ ہاتھ نہ آئے) اور (جیسا وہ خود نہیں بچ سکتا اسی طرح) خدا کے سوا اور کوئی اس کا حامی بھی نہ ہوگا (کہ وہ اس کو بچا سکے اور) ایسے لوگ صریح گمراہی میں (مبتلا) ہیں کہ باوجود قیام دلائل کے داعی کے حق ہونے پر پھر بھی اُس کی اجابت نہ کریں۔

معارف و مسائل

کفار مکہ کو مٹانے کے لئے اس سے پہلی آیات میں کفر اور استکبار کی مذمت اور اُن کا مہلک ہونا بیان ہوا ہے۔ مذکورہ صدر آیات میں اہل مکہ کو عار دلانے کے لئے جنات کے ایمان لانے کا واقعہ بیان

کیا گیا ہے کہ جنات تو تکبر و غرور میں تم سے بھی زیادہ ہیں مگر قرآن سن کر انکے دل بھی موم ہو گئے وہ مسلمان ہو گئے۔ تمہیں تو اللہ تعالیٰ نے جنات سے زیادہ عقل و شعور بخشا ہے مگر اسکے باوجود تم ایمان نہیں لاتے اور واقعہ جنات کے قرآن سننے اور ایمان لانے کا احادیث صحیحہ میں اس طرح آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت جب جنات کو آسمانی خبریں سننے سے روک دیا گیا تو آپ کی نبوت و بعثت کے بعد جو جن آسمانی خبریں سننے کے لئے اوپر جاتا تو اس پر شہاب ثاقب پھینک کر دفع کر دیا جائے لگا۔

جنات میں اس کا تذکرہ ہوا کہ اس کا سبب معلوم کرنا چاہیے کہ کونسا نیا واقعہ دنیا میں ہوا ہے جسکی وجہ سے جنات کو آسمانی خبروں سے روک دیا گیا۔ جنات کے مختلف گروہ دنیا کے مختلف خطوں میں اس کی تحقیقات کے لئے پھیل گئے، ان کا ایک گروہ حجاز کی طرف بھی پہنچا اس روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند صحابہ کے ساتھ مقام بطن نخلہ میں تشریف فرما تھے اور مشوق عکاظ کی طرف جانے کا قصد تھا۔ (عرب کے لوگ تجارتی اور معاشرتی امور کے لئے مختلف مقامات پر خاص خاص ایام میں بازار لگاتے تھے جس میں ہر خطے کے لوگ جمع ہوتے دکانیں لگتیں اور اجتماعات اور جلسے ہوتے تھے جیسے ہمارے زمانے میں اسی طرح کی نمائشیں جا بجا ہوتی ہیں انھیں میں سے ایک بازار مقام عکاظ میں لگتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غالباً دعوت و تبلیغ اسلام کے لئے تشریف لے جا رہے تھے) اس مقام بطن نخلہ میں آپ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے کہ وہ جنات یہاں پہنچے، قرآن سن کر کہنے لگے کہ بس وہ نئی بات سہی ہے جو ہمارے اور آسمانی خبروں کے درمیان حائل ہوئی ہے (رواہ الامام احمد و البخاری و مسلم و الترمذی و النسائی و جماعة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما)

اور ایک روایت میں ہے کہ وہ جنات جب یہاں آئے تو باہم کہنے لگے کہ خاموش ہو کر قرآن سنو، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو اسلام کی حقانیت پر یقین و ایمان لا کر اپنی قوم کے پاس واپس گئے اور ان کو اس واقعہ کے اصلی سبب کی اور اس کی خبر دی کہ تم تو مسلمان ہو گئے تم کو بھی چاہئے کہ ایمان لے آؤ، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان جنات کے آنے جانے اور قرآن سن کر ایمان لے آنے کی خبر نہیں ہوئی یہاں تک کہ سورہ جن کا نزول ہوا جس میں آپ کو اس واقعہ کی خبر دی گئی (رواہ ابن المنذر عن عبد الملک)

اور ایک روایت میں ہے کہ یہ جنات مقام نصیبین کے رہنے والے تھے اور کل تو یا بعض روایات کے مطابق سات تھے جب اُنھوں نے اپنی قوم کو یہ خبر سنائی اور ایمان لانے کی ترغیب دی تو پھر ان میں سے تین سوا شخاص اسلام لانے کے لئے حاضر خدمت ہوئے (رواہ ابو نعیم والواقدی عن کعب الاحبار والروایات کلبانی الریح) اور دوسری حدیثوں میں جنات کے آنے کی روایت دوسری طرح کی بھی آئی ہیں مگر چونکہ متعدد واقعات مختلف اوقات میں پیش آئے ہیں اس لئے کوئی تعارض نہیں اور اس کی تائید اس روایت بھی ہوتی ہے جو طبرانی نے اوسط میں اور ابن مرددہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ جنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بار بار حاضر ہوئے۔ خفاجی نے فرمایا کہ احادیث کی روایات جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرنے کے واقعات چھ مرتبہ پیش آئے ہیں (کذا فی الروح واخذتہ عن بیان القرآن) اسی واقعہ کی تفصیل مذکورہ صدر آیات میں بیان کی گئی ہے۔

کِتَابًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوسٰی، اس میں بَعْدِ مُوسٰی کی قید سے بعض حضرات نے سمجھا ہے کہ یہ جنات یہودی تھے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد تو عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل ہوئی اسکا ذکر نہیں کیا لیکن اسکی کوئی صریح روایت تو ہے نہیں اور انجیل کا ذکر نہ کرنے سے اُن کے یہودی ہونے پر استدلال ناکافی ہے کیونکہ انجیل کے ذکر نہ کرنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ انجیل اکثر احکام میں تورات کے تابع ہے اور قرآن مثل تورات کے مستقل کتاب ہے اسکے احکام و شرائع تورات سے بہت مختلف ہیں۔ تو یہ ہو سکتا ہے کہ مقصود یہ بتلانا ہو کہ تورات جیسی کتاب مستقل قرآن ہی ہے۔

يَغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ حَرْفٌ مِنْ اَصْلِ مِثْقَلٍ يُعْطٰی جَزَئِيَّتُہٗ كَيْلًا اَتَاہٗ اَگر یہی معنی یہاں لئے جاویں تو حرف مِنْ کے بڑھانے کا فائدہ یہ ہو گا کہ اسلام قبول کر لیئے سو حقوق العباد معاف نہیں ہوتے۔ اسلئے یہ فرمانا مناسب ہوا کہ بعض گناہ یعنی حقوق اللہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور بعض حضرات نے اس حرف مِنْ کو زائد قرار دیا ہے تو اس توجیہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَكُنْ لَّہٗ

یاد نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے بنائے آسمان اور زمین اور نہ تھکا اُن کے

بِخَلْقِہُمْ یَقْدِرُ عَلٰی اَنْ یَّجِیْعَہٗ الْمَوْتُ بَلٰی اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ

بنانے میں وہ قدرت رکھتا ہے کہ زندہ کرے مردوں کو؟ کیوں نہیں وہ ہر چیز

قَدِیْرٌ ۝۳۳ وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا عَلٰی النَّارِ اَلِیْسَ ہٰذَا بِالْحَقِّ ط

کر سکتا ہے۔ اور جس دن سامنے لائیں مسکروں کو آگ کے کیا یہ ٹھیک نہیں؟

قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوْا الْعَذٰبَ اِیْمًا کُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۳۴

کہیں گے کیوں نہیں تم پر ہمارے اب کی، کہا تو چکھو عذاب بدلہ اسکا جو تم مسکرہ ہو تے تھے

فَاَصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُو الْعِزِّ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَہُمْ ط

سو تو ٹھہرا رہے جیسے ٹھہرے رہے ہیں ہمت والے رسول اور جلدی نہ کر اُن کے معاملہ میں

کَانَتْہُمْ یَوْمَ یَوْمٍ مَّا یُوْعَدُوْنَ لَمْ یَلْبَثُوْا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّہَارٍ ط

یہ لوگ جس دن دیکھ لیں گے اس چیز کو جسکا اُن سے وعدہ ہے جیسے ڈھیل نہ پائی تھی مگر ایک گھڑی دن کی

بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ یُهْلِكُ اِلَّا الْقَوْمَ الْفٰسِقُوْنَ ۝۳۵

یہ پہنچا دینا ہے، اب وہی غارت ہونگے جو لوگ فاسقان ہیں

خلاصہ تفسیر

کیا ان لوگوں نے یہ نہ جانا کہ جس خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے میں خدا نہیں تھا وہ اس پر (بدرجہ اولیٰ) قدرت رکھتا ہے کہ مردوں کو (قیامت میں) زندہ کر دے (اور وہ اس پر قادر) کیوں نہ ہو، بے شک وہ (تو) ہر چیز پر قادر ہے (یہ تو امکان ثابت ہوا) اور جس روز (اس کا دُور ہوگا اور) کافر لوگ دوزخ کے سامنے لائے جاویں گے (اور ان سے پوچھا جاوے گا کہ) کیا یہ دوزخ امر واقعی نہیں ہے (جیسا کہ دُنیا میں اس کی واقعیت کی نفی کیا کرتے تھے) کما قال تعالیٰ عَنْهُمْ مَا هُمْ بِمُعْذِرِينَ (وہ کہیں گے کہ ہم کو اپنے پروردگار کی قسم ضرور امر واقعی ہے ارشاد ہوگا (اچھا) اپنے کفر کے بدلہ میں (جس میں انکار دوزخ بھی آگیا) اس (دوسرخ) کا عذاب چکھو۔ (آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے فرمایا کہ جب ان سے انتقام کفر کا لیا جانا معلوم ہو گیا) تو آپ (ولیا ہی) صبر کھیئے جیسا اور ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا تھا اور ان لوگوں کیلئے (انتقام الہی کی) جلدی نہ کھیئے (جس کو آپ مسلمانوں کی دلجوئی کے لئے چاہتے اور عجیب تر یہ ہے کہ وہ مستحق عذاب خود جلد بازی کرتے ہیں اور عجیب تر ہونا ظاہر ہے کہ مدعی اگر مدعا علیہ کی سزا جلدی چاہے تو عید نہیں لیکن مدعا علیہ اگر سزا جلدی چاہے تو نہایت امر غریب ہے سو گو حکمت الہیہ سے عذاب فوری نہیں ہوگا لیکن مشاہدہ کے وقت ان پر اس کا وہی اثر ہوگا جو فوری عذاب کا ہوتا ہے کیونکہ جس روز یہ لوگ اس چیز کو (یعنی عذاب کو) دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو (اس وقت غایت شدت عذاب الہی معلوم ہوگا کہ) گویا یہ لوگ (دُنیا میں) دن بھر میں ایک گھڑی رہے ہیں (یعنی دُنیا کی مدت طویلہ قصیر معلوم ہوگی اور یہی معلوم ہوگا کہ فوری عذاب آگے کفار کو تنبیہ ہے کہ) یہ (خدا کی طرف سے) تمام حجت کے لئے پہنچا دینا ہو (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ہو چکا) سو (اس کے بعد) وہی برباد ہوں گے جو نافرمانی کریں گے۔ (کیونکہ بعد یسین کے کوئی عذر نہ رہا اور رسول کا اسمیں کوئی ضرر نہیں اس سے تاکید تسلیہ کی بھی ہو گئی)۔

معارف و مسائل

أُولَ الْأَعْزَمِ مِنَ الرُّسُلِ اِیْمِنُ مِنَ الرُّسُلِ کاحرف من متعین کے نزدیک بیان یہ بعض کیلئے نہیں۔ معنی یہ ہیں کہ تمام رسول جو صاحب عزم و ہمت ہی ہوتے ہیں معلوم ہوا کہ صاحب عزم و ہمت ہونا بھی انبیاء کی صفت ہے البتہ رسولوں کے درمیان صفات کے درجات میں تفاضل اور کئی بیشی خود قرآن کے ارشاد سے ثابت ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ۔ اس لئے جو انبیاء علیہم السلام صفت عزم و ہمت میں دوسروں سے زیادہ امتیاز رکھتے خاص ان رسولوں کیلئے یہ لقب کے طور پر مشہور ہو گیا اور ان کی تعین میں بھی اختلاف ہے اور اکثر کقولہ سے کہ لقب اولو العزم جن کو دیا گیا ہے یہ وہ حضرات ہیں جن کا ذکر سورۃ احزاب کی اس آیت میں ہے وَ اِذَا اخَذْنَا مِنَ النَّبِیِّنَ مِیثَاقَهُمْ وَ مِیثَاقَ نُوْحٍ وَ اِبْرٰهیمَ وَ مُوسٰی وَ عِیْسٰی ابْنِ مَرْیَمَ اِنْ هُمْ عَلٰی عٰثِرٍ رَوٰیثٌ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی عیش و عشرت اور نعم محمد و آل محمد کے شایان نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اولو العزم سے بجز صبر کے اور کسی چیز پر راضی نہیں۔ اور مجھے یہی حکم دیا ہے کہ فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولَ الْأَعْزَمِ مِنَ الرُّسُلِ۔

تمت سورۃ الاحقاف بعون اللہ للشافی والعشرین من رجب ۱۳۹۲ ھ یوم السبت ولله الحمد